اردو دائرہ معارف اسلامیہ

زیر اہتمام

دانش گاہ پنجاب لاہور

شعبہ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

اردو

دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیرِ اہتمام

دانش گاہِ پنجاب، لاہور

جلد نمبر ۱۷

(ک ...... الملان)

ادارۂ تحریر

بار دوم: ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

زیر نگرانی: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

اختصارات ورموز وغیرہ

اختصارات

(الف)

عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ کتب اور ان کے تراجم اور بعض مخطوطات، جن کے حوالے اس موسوعہ میں بکثرت آئے ہیں

آ آ = اردو دائرہ معارف اسلامیہ

آ آ، ت = اسلام انسائکلوپیدیسی (= انسائکلوپیڈیا آف اسلام، ترکی)

آ آ، ع = دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (= انسائکلوپیڈیا آف اسلام، عربی)

آ آ، لائیڈن ۱/۲ = Encyclopaedia of Islam (= انسائکلوپیڈیا آف اسلام، انگریزی)، بار اوّل یا دوم، لائیڈن.

ابن الابّار = کتاب تکملۃ الصلۃ، طبع کودیرا F.Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء (BAH, V-VI).

ابن الابّار = تکملہ = M.Alarcony Palencia - C.A.Gonzalez: Apendice a la adicion Codera de Tecmila، در Misc de estudios y textos arabes، میڈرڈ ۱۹۱۵ء.

ابن الابّار، جلد اوّل = ابن الابار = تکملۃ الصلہ، Texte arabe d' apres un ms.de Fes, tome I, completant les deux vol. edites par F. Codera، طبع A. Bel و محمد ابن شنب، الجزائر ۱۹۱۸ء.

ابن الاثیر ۱/۲/۳ = کتاب الکامل، طبع ٹورنبرگ C.J.Tornberg، بار اول، لائیڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، یا بار چہارم، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۹ جلدیں.

ابن الاثیر، ترجمہ فانیان = Annales du Maghreb et de l'Espagne، ترجمہ فانیان E.Fagnon، الجزائر ۱۹۰۱ء.

ابن بشکوال = کتاب الصلۃ فی اخبار ائمۃ الاندلس، طبع کودیرا F. (Codera)، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH, II).

ابن بطوطہ = تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار (Voyages d' Ibn Bato cota)، عربی متن، طبع فرانسیسی مع ترجمہ از B.R.sanguinetti و C.Defremery، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۸ء.

ابن تغری بردی = النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، طبع W. Popper، برکلے و لائیڈن ۱۹۰۸ تا ۱۹۳۶ء.

ابن تغری بردی، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، بعد.

ابن حوقل، کریمرز۔ وائٹ = ابن حوقل، ترجمہ J.H.Kramers and G. Wiet، بیروت ۱۹۶۴ء، دو جلدیں.

ابن حوقل = کتاب صورۃ الارض، طبع J.H.Kramers لائیڈن ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹ء (BGA,II، بار دوم)، ۲ جلدیں.

ابن خرداذبہ = المسالک والممالک، طبع ڈخویا (M.J.de Goeje) لائیڈن ۱۸۸۹ء (BGA, VI).

ابن خلدون: عبر (یا العبر): کتاب العبر و دیوان المبتداء والخبر ...... بولاق ۱۲۸۴ھ.

ابن خلدون: مقدمہ = Prolegomenes d'Ebn Khaldoun، طبع E.Quatremere، پیرس ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۸ء (Notices et lExtraits,XVI-XVII).

ابن خلدون: روزنتھال = The Muqaddimah، مترجمہ Franz Rosenthal، ۳ جلدیں، لنڈن ۱۹۵۸ء.

ابن خلدون: مقدمہ، دیسلان Les Prolegomensesd' Ibn Khaldun، ترجمہ و حواشی M.de Slane، پیرس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء (طبع دوم) ۱۹۳۴ء

ابن خلکان = وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان، طبع وسٹنفلٹ (F.Wustenfeld)، گوٹنجن ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۰ء (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں).

ابن خلکان = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۸ جلد، بیروت ۱۹۶۸ تا ۱۹۷۲ء.

ابن خلکان = کتاب مذکور، مطبوعہ بولاق ۱۲۷۵ھ، قاہرہ ۱۳۱۰ھ.

ابن خلکان، ترجمہ دیسلان Biographical dictionarol
دیسلان: کتاب وفیات الاعیان، ترجمہ M. de Slane، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۴۲ تا ۱۸۷۱ء.

ابن رستہ = الاعلاق النفیسہ، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۲۹۲ تا ۱۸۹۲ء (BGA, VII).

ابن رستہ، ویت Wiet: *Les Atours precieux*، مترجمہ G.wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء.

ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H.Sachau) وغیرہ، لائیڈن ۱۹۰۴ء تا ۱۹۴۰ء.

ابن عذاری: کتاب البیان المغرب، طبع کولن (G.S.Colin) و لیوی پرووونسال (E.Levi-provencal)، لائیڈن ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۱ء؛ جلد سوم، پیرس ۱۹۳۰ء.

ابن العماد: شذرات = شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ تا ۱۳۵۱ء (سنین وفیات کے اعتبار سے حوالے دیے گئے ہیں).

ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۸۶ء (BGA, V).

ابن قتیبہ: شعر (یا الشعر) = کتاب الشعر والشعراء، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۴ء

ابن قتیبہ: معارف (یا المعارف) = کتاب المعارف، طبع وستنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۰ء.

ابن ہشام: کتاب سیرۃ رسول اللہ، طبع وستنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۰ء.

ابوالفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو (J.T.Reinaud) و دیسلان (M.de Slane)، پیرس ۱۸۴۰ء.

ابوالفداء: تقویم، ترجمہ = *Geographie d' Aboulfeda traduite de l' arabe en franciaz*، ج ۱ و ۲/۱، از رینو، پیرس ۱۸۴۸ء و ج ۲/۲، از St.Guyard، ۱۸۸۳ء.

الادریسی: المغرب = *Description de l' Afrique et de Espagne*، طبع ڈوزی R. Dozy و ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

الادریسی، ترجمہ جوبار = Geographie d' Edrisi، مترجمہ P.A.Jauber، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶ تا ۱۸۴۰ء.

الاستیعاب = ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۸ء/۱۳۱۹ھ.

الاشتقاق = ابن درید: الاشتقاق، طبع وستنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۴ء (اناستاتیک).

الاصابہ = ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴ جلد، کلکتہ ۱۸۵۶ تا ۱۸۷۳ء.

الاصطخری = المسالک والممالک، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۰ء (BGA, I) و بار دوم (نقل بار اول) ۱۹۲۷ء.

الاغانی ۱، یا ۲، یا ۳: ابوالفرج الاصفہانی: الاغانی، بار اول، بولاق ۱۲۸۵ھ، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۴۵ھ ببعد.

الاغانی، برونو = کتاب الاغانی، ج ۲۱، طبع برونو R.E.Brunnow، لائیڈن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ء.

الانباری: نزہۃ = نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ.

البغدادی: الفرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء.

البلاذری: انساب = انساب الاشراف، ج ۴ و ۵، طبع M.Schlossinger، S.D.F.Goitein، بیت المقدس (یروشلم) ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء.

البلاذری: انساب، ج ۱ = انساب الاشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء.

البلاذری: فتوح = فتوح البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

بیہقی: تاریخ بیہق = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تاریخ بیہق، طبع احمد بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ش.

بیہقی: تتمہ = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۳۵ء.

بیہقی، ابوالفضل = ابوالفضل بیہقی: تاریخ مسعودی، Bibl.Indica.

ت ۱۱ = تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

تاج العروس: محمد مرتضی بن محمد الزبیدی: تاج العروس.

تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۴ جلدیں، قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء.

تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلدیں، دمشق ۱۳۲۹ء/۱۹۱۱ء تا ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۱ء.

تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء تا ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء.

الثعالبی: یتیمۃ = الثعالبی: یتیمۃ الدہر، دمشق ۱۳۰۴ھ.

الثعالبی: یتیمۃ، قاہرہ = کتاب مذکور، قاہرہ ۱۹۳۴ء.

جوینی = تاریخ جہاں کشا، طبع محمد قزوینی، لائڈن ۱۹۵۶ تا ۱۹۳۷ء (GMS XVI)

حاجی خلیفہ: جہان نما = حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء.

حاجی خلیفہ = کشف الظنون، طبع محمد شرف الدین یالتقایا (S.Yaltkaya) و محمد رفعت بیلگہ انکلیسلی (Rifat Bilge Kilisli)، استانبول ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۳ء.

حاجی خلیفہ، طبع فلوگل = کشف الظنون، طبع فلوگل (Gustavus Flugel)، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء.

حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلدیں، استانبول ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۱ھ.

حدود العالم = The Regions of the World، مترجمہ منورسکی V.Minorsky، لنڈن ۱۹۳۷ء (GMS, XI، سلسلہ جدید).

حمد اللہ مستوفی: نزہۃ = حمد اللہ مستوفی: نزہۃ القلوب، طبع لی سٹرینج (Le Strange)، لائیڈن ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۹ء (GMS, XXIII).

خواندامیر: حبیب السیر تہران ۱۲۷۱ھ و بمبئی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء.

الدرر الکامنۃ = ابن حجر العسقلانی: الدرر الکامنۃ، حیدر آباد ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۰ھ.

الدمیری = الدمیری: حیوۃ الحیوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں).

دولت شاہ = دولت شاہ: تذکرہ الشعراء، طبع براؤن E.G. Browne، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۱ء.

ذہبی: حفاظ = الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۴ جلدیں، حیدر آباد (دکن) ۱۳۱۵ھ.

رحمان علی = رحمان علی: تذکرہ علماے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء.

روضات الجنات = محمد باقر خوانساری: روضات الجنات، تہران ۱۳۰۶ھ.

زامباور، عربی = عربی ترجمہ، از محمد حسن و حسن احمد محمود، ۲ جلدیں، قاہرہ ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۲ء.

زبیری، نسب = معصب الزبیری: نسب قریش، طبع پروونسال، القاہرہ ۱۹۵۳ء

الزرکلی، اعلام = خیر الدین الزرکلی: الاعلام قاموس تراجم الاشہر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین، ۱۵ جلدیں، دمشق ۱۳۷۳ تا ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۹ء.

السبکی = السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۶ جلد، قاہرہ ۱۳۲۴ھ.

سجل عثمانی = محمد ثریا: سجل عثمانی، استانبول ۱۳۰۸ تا ۱۳۱۶ھ.

سرکیس = سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۱ء.

السمعانی، عکسی = کتاب الانساب، طبع باعتناء مرجلیوث D.S.Margoliouth، لائیڈن ۱۹۱۲ء (GMS, XX).

السمعانی، طبع حیدر آباد = کتاب مذکور، طبع محمد عبد المعید خاں، ۱۳ جلدیں، حیدر آباد، ۱۳۸۲ھ، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۶۲-۱۹۸۲ء.

السیوطی: بغیۃ = بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ.

الشہرستانی = الملل والنحل، طبع کیورٹن W.Cureton، لنڈن ۱۸۴۶ء.

الضبی، الضبی = بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبع کودیرا (Codera) و ربیرا (J.Ribera)، میڈرڈ ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۵ء (BAH, III).

الضوء اللامع = السخاوی: الضوء اللامع، ۱۲ جلد، قاہرہ ۱۳۵۳ تا ۱۳۵۵ھ.

الطبری: تاریخ الرسل والملوک، طبع ڈخویا وغیرہ، لائیڈن ۱۸۷۹ تا ۱۹۰۱ء.

عثمانلی مؤلفلری = بروسہ لی محمد طاہر، استانبول ۱۳۳۳ھ.

العقد الفرید = ابن عبد ربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ.

علی جواد = علی جواد: ممالک عثمانیین تاریخ و جغرافیہ لغاتی، استانبول ۱۳۱۳-۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۹ء.

عوفی: لباب = لباب الالباب، طبع براؤن، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۶ء.

عیون الانباء = طبع ملر A.Muller، قاہرہ ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء.

غلام سرور = غلام سرور، مفتی: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ء.

غوثی مانڈوی: گلزار ابرار = ترجمہ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ.

فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع سنگی، ممبئی ۱۸۳۲ء.
فرہنگ = فرہنگ جغرافیائی ایران، از انتشارات دائرۂ جغرافیائی ستاد ارتش، ۱۳۲۸ تا ۱۳۲۹ھ۔ش.
فرہنگ آنندراج = منشی محمد بادشاہ: فرہنگ آنندراج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹ تا ۱۸۹۴ء.
فقیر محمد = فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء.
فلٹن و لنگز: Alexander S. Fulton و Martin Lings: Second Supplementary Catalogue of Arabic printed Books in the British Museum، لنڈن ۱۹۵۹ء.
فہرست (یا الفہرست) = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲ء.
(ابن) القفطی = ابن القفطی: تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ J. Lippert، لائپزگ ۱۹۰۳ء.
الکتبی، طبع بولاق، فوات = ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات، ۲ جلد بولاق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء.
الکتبی، فوات طبع عباس = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۵ جلد، بیروت ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۴ء.
لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲۰ جلدیں، قاہرہ ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۸ھ.
م آ = مختصر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ.
مآثر الامراء = شاہنواز خان: مآثر الامراء، Bibl. Indica.
مجالس المؤمنین = نور اللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ ش.
مرآۃ الجنان = الیافعی: مرآۃ الجنان، ۴ جلد، حیدر آباد (دکن) ۱۳۳۹ھ.
مسعود کیہان = مسعود کیہان: جغرافیائی مفصل ایران، ۲ جلد، تہران ۱۳۱۰ و ۱۳۱۱ھ ش.
المسعودی: مروج: مروج الذہب، طبع باربیہ مینارد (C.Barbier de Meynard) و پاوہ دکورتی (Pevet de Courteille)، پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء.
المسعودی: التنبیہ = المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۴ء (BGA, VIII).
المقدسی = المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۷ء (BGA, VIII).
المقری: Analectes = المقری: نفح الطیب فی غصن الاندلس الرطیب، Analectes sur l' histoire et la litterature des Arabes de l' Espagne، لائیڈن ۱۸۵۵ تا ۱۸۶۱ء.
المقری، بولاق = کتاب مذکور، بولاق ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء.
منجم باشی: صحائف الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ.
میر خواند: روضۃ الصفاء، بمبئی ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء.
نزہۃ الخواطر = حکیم عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدر آباد ۱۹۴۷ء ببعد.
نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پرووانسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء.
الوافی = الصفدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رٹر (Ritter)، استانبول ۱۹۳۱ء؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳ء.
الہمدانی = الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع ملر (D.H.Muller)، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء.
یاقوت طبع وستنفلٹ: معجم البلدان، طبع وستنفلٹ، ۵ جلدیں لائپزگ ۱۸۶۶ تا ۱۸۷۳ء (طبع اناستاتیک، ۱۹۲۴ء).
یاقوت: ارشاد (یا ادباء) = ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب، طبع مرجلیوث، لائیڈن ۱۹۰۷ تا ۱۹۲۷ء (GMS.VI)؛ معجم الادباء، (طبع اناستاتیک، قاہرہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء.
یعقوبی (یا الیعقوبی) = الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما (W. Th. Houtsma) لائیڈن ۱۸۸۳ء؛ تاریخ الیعقوبی، ۳ جلد، نجف ۱۳۵۸ھ؛ ۲ جلد، بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء.
یعقوبی: بلدان (یا البلدان) = الیعقوبی: (کتاب) البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۲ء (BGA, VII).
یعقوبی، ویت = Wiet Yaqubi, Les pays، مترجمہ G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ء.

(ب)

کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghani:*Tables=Tables Alphabetiques du Kitab al-aghani, redigees par I. Guidi*, Leiden 1900.

Babinger= F. Babinger: *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*, 1st ed.,Leiden 1927.

Barkan: Kanunlar= *Omar Lutfi Barkan: XV ve XVI inci Asirlarda Osmanli. Imparat orlugunda Zirai Ekonominin Hukuki ve Mali Esaxlari, I. Kanunlar*. Istanbul 1943.

Blachere: *Litt.*=R. Blachere: *Histoire de la Litterature arabe, i*, Paris 1952.

Brockelmann, I, II=C. Brockelmann: *Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplement-banden angepasste Auflage*. Leiden 1943-1949.

Brockelmann, *SI*, II, III=*G.d A.L., Erster (Zweiter, Dritter). Supplementband*, Leiden 1937-42.

Brown i = E.G.Brown: *Al literary History of Persia, from the earliest times until Firdowsi* London 1902.

Browne, ii=*A Literary History of Persia, from Firdawsi to Sadi*, London 1908.

Browne, iii=*A History of Persian Literarture under Tartar Dominion*, Cambridge 1920.

Browne, iv=*A History of Persian Literature in Modern Times*, Cambridge 1924.

Caetani: *Annali*=L. Caetani: *Annali dell' Islam, Milano* 1905-26.

Chauvin: *Bibliographie*=V. Chauvin: *Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes*, Lille 1892.

Dorn: *Quelen*=B. Dorn: *Muhammedanische Quellen zur Geschichte der sudlichen Kustenlander des Kaspischen, Meeres*, St. Petersburg 1850-58.

Dozy: *Notices*=R. Dozy: *Notices sur quelques manuscrits arabes*, Leiden 1847-51 and D.S. Margoliouth, London 1937.

Dozy :*Recherches*= R. Dozy : *Recherches sur l'histoire et la litterature de l' Espagne Pendant le maoyen-age*, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.

Dozy, *Suppl.*=R.Dozy :*Supplement aux dictionnaires* arabes, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.

Fagnan :*Extraits* =E. Fagnan: *Extraits incdits relatifs au Maghreb*, Alger 1924.

Gesch. *des Qor.*=Th. Noldeke: *Geshichte des Qorans*, new edition by F. Schwally, G. Bergst rrasser and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.

Gibb: *Ottoman Poetry*= E.J.W. Gibb: *A History of Ottoman Poetry*, London 1900-09.

Gibb-Bowen= H.A.R. Gibb and Harold Bowen: *Islamic Society and the West*, London 1950-57.

Goldziher:*Muh.St.*=I.Goldziher: *Muhammedanische Studien*, 2 Vols., Halle 1888-90

Goldziher :*Vorlesungen*= I Goldziher :*Vorlesungen uber den Islam*, Heidelburg 1910.

Goldziher:Vorlesungen^2=2nd ed., Heidelberg 1925.

Goldziher: Dogme= *Le dogme et la loi del Islam*, tr. F. Amin, Paris 1920.

Hammer-Purgstall: GOR=J.von Hammer (purgstall) : *Geschichte des Osmanischen Reiches*, Pest 1828-35.

Hammer-Purgstall:*GOR*^{2}=the same, 2nd ed., Pest 1840.

Hammer-Purgstall,:*Histoire*=the same, trans by J.J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.)

1835-43.

Hammer-Purgstall:*Staatsverfassung*=J. von Hammer: *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*,2 vols., Vienna 1815.

Houtsma: *Recueil*= M.Th. Houtsma: *Recueil des texes relatifs a l'histoire des Seldjoucides*. Leiden 1886-1902.

Juynboll: Handbuch=Th. W. Juynboll: *Handbuch des islamischen Gesetzes*, Leiden 1910.

Juynboll: *Handleiding*= *Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.

Lane=E.W. Lane: *An Arabic-English Lexicon*, London 1863-93 (Reprint, New York 1955-56).

Lane-Poole: *Cat*=S. Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.

Lavoix: Cat.=H. Lavoix: *catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliotheque Nationale*, Paris 1887-96.

Le Strange=G Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate* 2ne ed., Cambridge 1930 (Reprint, 1966).

Le Strange: *Baghdad*=G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*. Oxford 1924.

Le Strange: Palestine=G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*, London 1890 (Reprint, 1965).

Levi-Provencal:Hist. Esp. Mus.=E.Levi-Provencal: *Histoire de l' Espagne Musulmane*, nouv. ed., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.

Levi-Provencal: Hist.Chorfa=E. Levi-Provencal: Les *Historiens des Chorfa*, Paris 1922.

Maspero-Wiet: *Materiaux*=J Maspero et G. Wiet: *Materiaux pour servir a la Geographie de l'Egypte*, Le Caire 1914 (Mifao, XXXVI).

Mayer: Architects= L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1958.

Mayer: Astrolabists=L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.

Mayer:Metalworkers=L.A. Mayer: *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1959.

Mayer: Woodcarvers=L.A. Mayer: *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.

Mez: Renaissance= A. Mez: *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922, (Spanish Translation by s. vila, Madrid- Granadal 1936).

Mez: *Renaissance*, Eng. tr.=the same, English translation by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S Margoliouth Londen 1937.

Nallino: Scritti=C.A. Nallino: *Raccolta di Scritti editi e inediri*, Roma 1939-48.

Pakahn=Mehmet Zeki Pakahn: *Osmanli Tarih Deyimleri ve Terimleri Sozlugu*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.

Pauly-Wissowa=*Realenzyklopaedie* des klassischen Altertums.

Pearson=J.D. Pearson: *Index Islamicus*, Cambridge 1958.

Pons Boigues=*Ensayo bio-bibliografico sobre los historiadores y geografos arabio-espanole*, Madrid 1898.

Rypka, *Hist of Iramican litteratuare*= J.Rypka et alii, *History of Iramian literature*, Dordrecht 1968.

Santillana: *Istituzioni*=D. Santillana: *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Roma 1926-38.

Schlimmer=John L. Schlimmer: *Terminologie medico-Pharmaceutique et Anthropologique*, Tehran 1874.

Schwarz: *Iran*=P. Schwarz: *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.

Smith=W.=Smith: *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*
Hurgronje: *Verspr. Ged Geography*, London

1853.

Snouck Hurgronje: *Verspr. Geschr.*=C. Snouck Hurgronje: *Verspreide Geschriften* Bonn Leipzig-Leiden 1923-27.

Sources ined=Comte Henri de Castries: *Les Sources inedites de l' Histoire du Maroc*, Paris 1905, 1922.

Spuler: *Horde*= B. Spuler: *Die Golaene Horde* eipzig 1943.

Spuler: Iran=B.Spuler: *Iran in fruh-Islamischer Zeit*, Wiesbaden 1952.

Spuler: Mongolenz=B. Spuler: *Die Mongolen in Iran*, 2nd. ed, Berlin 1955.

SNR=Stephan and Naudy Ronart:*Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization*, Djamb-atán Amsterdam 1959.

Storey=C.A. Storey: *Persian Litrerature: a biobibliographical survey*, London 1927.

Survey of Persian Art = ed.by A.U.Pope,Oxford 1938.

Suter=H.Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*, Leipzig 1900.

Taeschner:*Wegenetz*=F.Taeschner: *Die Verkehrsiage und den Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*, Gotha 1926.

Tomaschek=W.Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*, Vienna 1891.

Wensinck: *Handbook*=A.J. Wensinck: *A Hand book of Early Muhammadan Tradition*, Leiden 1927.

Wiel: *Chalifen*=G.Weil: *Geschichte der Chalifen, Mannheim*-Stuttgart 1846-82.

Zambaur=E.de Zambaur: *Manual de de genealogie et de chronologie pour l'histoire de l'Islam*. Hanover 1927 (anastatic reprint, Bad Pyrmont 1955).

Zinkeisen=J. Zinkeisen:*Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*, Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad=*The Contribution of India to Arabic Literature*, Allahbad 1946 (reprint, Lahore 1968).

(ج)

مجلات، سلسلہ ہائے کتب، وغیرہ، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

AB=*Archives Berbers.*

Abh. G. W. Gott=*Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Gottingen.*

Abh. K.M.=*Abhandlungen f.d. Kunde des Morgenlandes.*

Abh. Pr. AK. W.= *Abhandiungen d. preuss. Akad. d. Wiss.*

Afr. Fr.=*Bulletin du Comite de l'Afrique francaise.*

Afr. Fr. RC=*Bulletin du Com. de l' Afr. franc., Renseignements Coloniaux.*

AIEO Alger=*Annales de l' Institute d' Etudes Orientales de l' Universite d' Alger.*

AIUON=*Annali dell' Instituto Univ. Orient, di Napoli.*

AM=*Archives Marocaines.*

And=*Al-Andalus.*

Anth=*Anthropos.*

Anz. wien=*Anzeiger der philos-histor. Ki. d. Ak. der Wiss. Wien.*

AO=*Acta Orientalia.*

Arab.=*Arabica*

ArO=*Archiv Orientalni*

ARW=*Archiv fur Religionswissenschaft.*

ASI=*Archaelogical Survey of India.*

ASI, NIS=*the same, New Imperial Series.*

ASI, AR=*the same, Annual Reports.*

AUDTCFD=*Ankara Universitesi Dil ve arihcografya Fakultesi Dergisi.*

As. Fr. B= *Bulletin du Comite de l' Asie Francaise.*

BAH=*Bibliotheca Arabico-Hispana.*

BASOR=*Bulletin of the American School of Oriental Research.*

Bell=*Turk Tarih Kurumu Belleten.*

BFac. Ar. = *Bulletin of the Faculty of the Egyptian University.*

BEt. Or. = *Bulletin d' Etudes Orientales de l'Institut Francaise Damas.*

BGA=*Bibliotheca geographorum arabicorum.*

BIE=*Bulletin de l' Instutut Egyptien.*

BIFAO=*Bulletin de l' Institut Francais J' Arachcologie Orientale du Caire.*

BIS=*Bibliotheca Indica series.*

BRAH=*Boletin de la Real Academia de la Historia de Espana.*

BSE=*Bolshaya Sovetskaya Entsiklopediya (Large Soviet Encyclopaedia), Ist ed.*

BSE[2]=*the Same, 2nd ed.*

BSL(P)=*Bulletin de la Societe de Linguisttq (de Paris).*

BSO(A)S=*Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.*

BTLV=*Bijdragen tot de Taal, Land-en Volkenkunde (van Ned-Indie).*

BZ=*Byzantinische Zeitschrift.*

COC=*Cahiers de l' Orient Contemporain.*

CT=*Cahiers deTunisie.*

EI[1]=*Encyclopaedia of Islam, 1st edition.*

EI[2]=*Encyclopaedia of Islam, 2nd edition.*

EIM=*Epigraphia Indo-Moslemica.*

ERE=*Encyclopaedia of Religion and Ethics.*

GGA=*Gottinger Gelehrte Anzeigen.*

GJ=*Geogra phical Journal.*

GMS=*Gibb Memorial Series.*

Gr. I. ph=*Grundriss der Iranischen Philologie.*

GSAI=Giornale della Soc. Asiatica Italiana.

Hesp.=Hesperis.

IA=Islam Ansiklopedisi (Turkish).

IBLA=Revue de l'Institut des Belles Letters Arabes, Tunis.

IC=Islamic Culture.

IFD=Ilahiyat Fakultesi.

IG=Indische Gids.

IHQ=Indian Historical Quarterly.

IQ=The Islamic Quarterly.

IRM=International Review of Missions.

Isl.=Der Islam.

JA=Journal Asiatique.

JAfr. S.=Journal of the African Society.

JAOS=Journal of the American Oriental Society.

JAnthr. I=Journal of the Anthropological Institute.

JBBRAS=Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society.

JE.=Jewish Encyclopaedia.

JESHO=Journal of the Economic and Social History of the Orient.

JNES=Journal of Near Eastern Studies.

JPak.HS=Journal of the Pakistan Historical Society.

JPHS=Journal of the Punjab Historical Society.

JQR=Jewish Quarterly Review.

JRAS=Journal of the Royal Asiatic Society.

J(R)ASB=Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal.

J(R)Num.S=Journal of the (Royal) Numismatic Society.

JRGeog.S=Journal of the Royal Geographical Society.

JSFO=Journal de la Societe Finno-ougreine.

JSS=Journal of Semetic studies.

KCA=Korosi Csoma Archivum.

KS=Keleti Szemle (Revue Orientale).

KSIE=Kratkie Soobshceniya Instituta Etnografiy (Short Communications of the Institute of Ethnography).

LE=Literaturnaya Entsiklopediya (Literary Encyclopaedia).

Mash.=Al-Mashrik.

MDOG=Mitteilungen der Deutschen Orient- Gesells chaft.

MDVP= Mitteilungen und Nachr. des. Deutschen Palistina- vereins.

MEA=Middle Eastern Affairs.

MEJ=Middle East Journal.

MFOB=Melanges de la Faculte Orientale de Beyrouth.

MGG Wien=Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.

MGMN=Mitt. Geschichte der Medizin und der naturwissenshaften.

MGWJ=Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissen schaft des Judentums.

MI=Mir Islama.

MIDEO=Melanges de l' Institut Dominicain d' Etudes Orintales du Caire.

MIE=Memoires de l' Institut d' Egyptien.

MIFAO=Memories publies par les members de l' Inst. Franc d' Aracheologie Orientale du Caire.

MMAF=Memoires de la Mission Archeologique Franc au Caire.

MMIA=Madjallat al-Madjmaal-ilmi al Arabi Damascus.

MO=Le Monde oriental.

MOG=Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.

MSE=Malaya Sovetskaya Entsiklopediya-(Small Soviet Encyclopaedia).

MSFO=Memoires de la Societe Finno-ougrienne.

MSL=Memoires de la Societe Linguistique de Paris.

MSOS Afr.=Mitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Afr. Studien.

MSOS As.= fitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Westasiatische Studien.

MTM=Mili Taebbuler medjmuast.

MVAG=Mitteilungen der Vorderasiatisch -agyptischen Gesellschaft.

MW=The Muslim World.

NC=Numismatic Chronicle.

NGW Gott.=Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Gottingen.

OA=Orientalisches Archiv.

OC=Oriens Christianus.

OCM=Oriental College Magazine, Lahore.

OCMD=Oriental College Magazine, Damima, Lahore

OLZ=Orientalistische Literaturzeitung.

OM=Oriente Moderno.

Or.=Oriens.

PEFQS=Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.

PELOV=Publications de l' Ecole des langues orientales vivantes.

Pet.Mitt.=Petermanns Mitteilungen.

PRGS=Proceedings of the R. Geographical Society.

QDAP=Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine.

RAfr.=Revue Africaine.

RCEA=Repertoire Chronologique d'Epigrapie arabe.

REI=Revue des Etudes Islamiques.

REJ=Revue des Etudes Juives.

Rend. Lin.=Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei, Cl. di sc. mor., stor. e filol.

RHR=Revue de l' Histoire des Religions.

RI=Revue Indigene.

RIMA=Revue de l' Institut des manuscrits Arabes.

RMM=Revue du Monde Musulman.

RO=Rocznik Orientalistyczny.

ROC=Revue de l' Orient Chretien.

ROL=Revue de l' Orient Latin.

RRAH=Rev. de la R. Academia de la Histoira, Madrid.

RSO=Rivista degli Studi Orientali.

RT=Revue Tunistenne.

SBAK. Heid.=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Heidelberg.

SBAK. Wien=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Wien.

SBBayr. AK.=Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften.

SBPMS Erlg.=Sitzungsberichte d. Phys. medizin. Sozietat in Erlangen.

SBPr. AK. W.=Sitzungsberichte der preuss. AK. der wiss. zu Berlin.

SE=Sovetskaya Etnografiya (Soviet Ethnography).

SI=Studai Islamica.

SO=Sovetkoe Vostokovedenie (Soviet Orientalism).

Stud. Isl.= Studia Islamica.

S.Ya.=Sovetskoe Yazikoznanie (Soviet Linguistics).

SYB=The Statesman's Year Book.

TBG=Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.

TD=Tarih Dergisi.

TIE=Trudi instituta Etnografih (Works of the Institute of Ethnography).

TM=Turkiyat Mecmuasi

TOEM=Tarikh i Othmani (Turk Tarikhi) Endjumeni medjmu ast.

TTLV=Tijdschrift. v. Indische Taal, Land en Volkenkunde.

Verh. Ak. Amst.=Verhandelingen der Koninklijke

Akademie van Westenschappen te Amsterdam.

Versl.Med. AK. Amst = Verslagen en Mededeelingen der Koninklijke Akademie van wetenschappen te Amsterdam.

VI=Voprosi Istority (Historical problems).

WI=Die Welt des Islams.

WI.NS=the same, New Series.

Wiss. Veroff. DOG=Wissenschaftliche Veroffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.

WMG=World Muslim Gazetteer, Karachi.

WZKM=Wiener Zeitschrift fur die Kunde des Morgenlandes.

ZA=Zeltschrift fur Assyriologie.

Zap.=Zapiski.

ZATW=Zeitschrift fur die alttestamentliche Wissenschaft.

ZDMG=Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft.

ZDPV=Zeitschrift des Deutschen Palasatinavereins.

ZGErdk. Berl.=Zeitschrift der Gesellschaft fur Erdkunde in Berlin.

ZK=Zeitschrift fur Klonialsprachen.

ZOEG=Zeitschrift f. Osteuropaische Geschichte.

ZS=Zeitschrift fur Semitistik.

علامات و رموز و اعراب

(۱)

علامات

※ مقالہ، ترجمہ از آ، لائیڈن

⊗ جدید مقالہ، برائے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

[] اضافہ، از ادارہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

(۲)

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجہ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے ہیں:

f.,ff.,sq.,sqq. = بعد

s. v. = بذیل مادّہ (یا کلمہ)

see; s. = دیکھیے: کسی کتاب کے حوالے کے لیے

q.v. = رک بہ (رجوع کنید بہ) یا رک باں (رجوع کنید باں): آ کے کسی مقالے کے حوالے کے لیے

passim. = بمواضع کثیرہ

op.cit. = کتاب مذکور

cf. = دیکھیے لغوی مفہوم (قارب یا قابل)

B.C. = ق۔م (قبل مسیح)

d. = م (متوفی)

loc. cit. = محل مذکور

ibid. = کتاب مذکور

idem. = وہی مصنف

A.H. = ھ (سنہ ہجری)

A.D. = ء (سنہ عیسوی)

(۳)

اعراب

(ا)

Vowels

فتحہ (َ) = a

کسرہ (ِ) = i

ضمہ (ُ) = u

(ب)

Long Vowels

ا،آ = ā (آج کل: āj kal)

ی = ī (رَحیم: Sim)

و = ū (ہارون الرشید: Harūn al-Rashīd)

اے = ai (سیر: Sair)

(ج)

ٖ = e آواز کو ظاہر کرتی ہے (پن: pen)

ٗ = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول: mole)

ٗ = u کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (تورکیہ: Turkiya)

ٗ = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کورل: kol)

ٗ = ȁ کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (اُرَجَب: ȁrȁdjȁb: رَجَب rȁdjȁb)

ْ = علامت سکون یا جزم (بِسْمِل: bismil)

متبادل اردو عربی حروف

ب	=	b	ح	=	ḥ	س	=	s	گ	=	g
بھ	=	bh	خ	=	Kh	ش	=	sh‹ch	گھ	=	gh
پ	=	p	د	=	d	ص	=	ṣ	ل	=	l
پھ	=	ph	دھ	=	dh	ض	=	ḍ	لھ	=	lh
ت	=	t	ڈ	=	d̄	ط	=	ṭ	م	=	m
تھ	=	th	ذ	=	dط	ظ	=	ẓ	مھ	=	mh
ٹ	=	t	ڈھ	=	dh	ع	=	‹	ن	=	n
ٹھ	=	ṭh	ر	=	r	غ	=	gh	نھ	=	nh
ث	=	th	رھ	=	rh	ف	=	f	و	=	w
ج	=	dj	ڑ	=	ṛ	ق	=	ḳ	ہ	=	h
جھ	=	djh	ڑھ	=	ṛh	ک	=	k	ء	=	ʼ
چ	=	č	ز	=	z	کھ	=	kh	ی	=	y
چھ	=	ch	ژ	=	ž, zh						

* **ک : (کاف)**؛ مروجہ عربی حروف تہجی کا بائیسواں، فارسی کا پچیسواں اور اردو کا اڑتیسواں حرف (ابجد کے لحاظ سے اس کے عدد ۲۰ ہوتے ہیں : دیکھیے مقالۂ ابجد) ۔ ک کا تلفظ ایک ایسے جنگی زوردار (explosive) حرف کی مانند ہے جس کی حلقی آواز نہیں ہوتی ۔ سیبویہ کے زمانے سے اب تک یہ علمی حلقوں کی بول چال میں اسی طرح پایا جاتا ہے ۔ آج کل کی مروجہ زبان میں ہمیں اس کی بعض مختلف شکلیں ملتی ہیں (علاوہ ک کے) بالخصوص رگڑدار (affricate) (چ č) (جس سے c′ اور پھر اس سے k′ بنا ہے) دیکھیے مقالۂ عرب، عربی بولیاں اور Schaade: *Sibawaih's Lautlehre* اشاریہ .

(A. SCHAADE)

* **کابُل** : (۱) افغانستان کے ایک دریا کا نام؛ (۲) افغانستان کا دارالسلطنت، دریاے کابل ۳۴°-۲۱′ عرض بلد شمالی اور ۶۸°-۲۰′ طول بلد مشرقی پردرہ اُنَی کے قریب سے نکل کر شہر کابل میں سے گزرتا ہے ۔ تھوڑی ہی دور جنوب کی طرف سے اس میں دریاے لوگر اور شمال کی طرف سے دریاے پنج شیر آ ملتے ہیں ۔ یہ دریا سطح مرتفع کابل سے نکل کر پہاڑی دروں میں سے بہتا ہوا جلال آباد کی زیریں وادی میں داخل ہوتا ہے جہاں اس میں جنوب کی طرف سے دریاے سرخاب اور شمال کی طرف سے دریاے کُنَر شامل ہو جاتے ہیں ۔ اس کے بعد یہ مُہمند کی پہاڑیوں میں ایک گھاٹی سے گزرتا ہوا مِچْنی کے قریب پاکستان کے ضلع پشاور میں داخل ہوتا ہے ۔ یہاں پہنچ کر اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں ۔ شمالی شاخ میں دریاے سوات آ ملتا ہے اور آگے چل کر یہ دونوں شاخیں پھر آپس میں مل جاتی ہیں ۔ دریاے کابل ۳۱۶ میل لمبے علاقے میں سے بہتا ہوا اٹک کے قریب دریاے سندھ میں جا گرتا ہے .

دریاے کابل بہت قدیم زمانے سے بہتا آرہا ہے ۔ کبھی اسے کُبھا ندی کہا جاتا تھا ۔ قدیمی مؤرخین Arrian اور Strabo نے اسے "کوپھین" Kōphen اور "کوپھیس" Kōphes اور بطلمیوس نے "کوآ" Kōa لکھا ہے ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کُبھا ان سات دریاؤں میں سے ایک تھا جن کا رگ وید میں ذکر آیا ہے ۔ عرب جغرافیہ دانوں نے اس دریا کے مختلف نام بتائے ہیں ۔ البیرونی نے دریاے غوروند کا ذکر کیا ہے جو قندھار (یعنی گندھارا) کے دارالحکومت وَیْہَنْد سے نیچے بہتا ہوا دریاے سندھ میں جا گرتا ہے ۔ یہ نام اسے "درۂ غور بند" کی نسبت سے دیا گیا ہے جس کے قریب سے دریاے "پنج شِیر" نکلتا ہے ۔ المسعودی لکھتا ہے کہ "پنجاب کا چوتھا دریا شہر کابل اور اس کے پہاڑوں سے آتا ہے، جو "السند کی سرحد کا کام دیتے ہیں ۔" پشتو میں اس دریا کا جدید نام "سِیند" ہے (جو "دریا" کے لیے عام اصطلاح کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے) ۔ بابر نے دریاے سند کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک پہاڑ سے نکلتا ہے جو کابل کے مغرب میں واقع ہے؛ بلاشبہہ یہاں اس کی مراد دریاے کابل سے ہے، اگرچہ کسی دوسری جگہ وہ دریاے سندھ کے لیے سندھی کا نام استعمال کرتا ہے ۔ الفنسٹن نے اس کا نام "کامہ" لکھا ہے (دریاؤں کے متعلق ضمیمہ)، لیکن

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس نے غلط نام استعمال کیا ہے کیونکہ کامہ محض اس کے ایک معاون کا نام ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کابل کے شہر اور ضلع کا نام دریا کے نام پر رکھا گیا ہے ۔

(۲) ایک اہم شہر، آج کل افغانستان کا دارالحکومت، ۳۴°-۳۰′ طول بلد شمالی اور ۶۹°-۱۳′ عرض بلد مشرقی پر سطح سمندر سے ۵۷۸۰ فٹ بلند، ایک زرخیز سطح مرتفع پر واقع ہے جہاں آبپاشی خوب ہوتی ہے، آبادی تقریباً ۱.۵ لاکھ ہے ۔

اگرچہ قدیم ترین زمانے سے دریاے کابل کا ذکر مختلف ناموں سے ملتا ہے، لیکن ایسے کسی شہر کا حال معلوم نہیں ہوتا جسے کابل کی جگہ تصور کیا جائے ۔ بعض لوگوں نے بطلمیوس کے "کرورہ" Karaura کو "کبُورہ" Kaboura فرض کیا ہے اور جن لوگوں کو اس نے بولتائی Bolitai کے نام سے یاد کیا ہے ، ان کا نام اس کے خیال میں کابلتای Kābolitai تھا، یعنی کابل کے باشندے، لیکن ان مفروضوں کی بنیاد کسی شہادت پر نہیں، غالباً "کوپھینی" پوری وادی کا نام ہے جو دریاے کوپھین سے ماخوذ ہے ۔

اس علاقے پر رومی بادشاہ دیمتریوس Demetrios نے دوبارہ قبضہ کیا اور یہاں ایک یونانی سلطنت قائم ہوئی جو سنۂ عیسوی کے زمانۂ آغاز کے لگ بھگ تک قائم رہی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کچھ عرصے کے لیے پارتھیا (خراسان) کے بادشاہ گوندوفیرس Gondophares کا قبضہ رہا اور پھر پہلی صدی عیسوی میں کوشانی حملہ آور اس پر قابض رہے ۔ کابل کے قریب وَرْدَک کے مقام سے ایک چینی کا برتن برآمد ہوا ہے جس پر ہُووِشکا کا ایک کتبہ کندہ ہے ۔ اس زمانے میں بدھ مت سرکاری مذہب تھا ۔ کچھ عرصے کے لیے ہپتالیوں ="افتالیوں" Ephthalites نے کوشانیوں کا تختہ الٹ دیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوشانی نسل کے لوگ آگے چل کر ایک بار پھر بر سر اقتدار آ گئے ۔ جب ۶۵۷ء میں چینی سیاح ہیئون سانگ کا ادھر سے گزر ہوا، اس وقت انھیں کی حکومت تھی ۔ اس نے کابل کے لیے "کوفو" Kao-fu کا نام استعمال کیا ہے ۔ رفتہ رفتہ برھمنی دھرم نے بدھ مت کی جگہ لے لی ، چنانچہ آخری کوشانی فرمانرواؤں کا جو "شاھی" کے لقب سے مشہور تھے ، یہی مذہب تھا اور جنھیں بقول البیرونی غالباً ابتدائی اسلامی حملوں کے زمانے کے لگ بھگ ان کے برھمن وزیروں نے معزول کیا ۔ غالباً ابتدائی حملوں کے وقت گندھارا کی ہندو سلطنت پر اس کے صدر مقام اُدَبھَنْدَہ (یا وَیَہند) سے حکومت کی جاتی تھی جو دریاے سندھ کے کنارے واقع تھا اور یہ سلطنت ان پہاڑوں کے دامن تک پھیلی ہوئی تھی جو جلال آباد کے مغرب میں ہیں، لیکن خاص کابل اس میں شامل نہیں تھا ۔ یہاں ایک علٰحدہ ریاست قائم تھی جہاں کا حکمران الگ تھا ۔ سبکتگین کے زمانے تک یہ ریاست کبھی تو مسلمانوں کے زیر اثر رہی اور کبھی خود مختار ہوئی ۔ قدیم ترین عرب وقائع نگاروں کے مطابق یہ ملک بحیثیت مجموعی قندھار یعنی گندھارا کے نام سے مشہور تھا جسے بسا اوقات غلطی سے شہر قندھار سمجھ لیا جاتا ہے، چنانچہ الطبری بتاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عاصم بن عمرو اور عبداللہ بن عُمیر ۲۳ھ میں سیستان سے ہوتے ہوے ہندوستان کی سرحد اور قندھار تک بڑھتے چلے گئے ۔ کابل کے شہر کا ذکر واضح طور پر نہیں کیا گیا ۔ وادی کابل اور اس کے ساتھ ہندوکش کے دروں تک کے کوھستان کو کابل شاہ کا ملک بتایا ہے اور دارالحکومت کے بارے میں یہ کہا ہے کہ یہ ایک ناقابل تسخیر پہاڑی قلعہ ہے جس کا نام یقینی طور پر معلوم نہیں (Le Strange نے اسے جُرُوس پڑھا ہے) الیعقوبی لکھتا ہے کہ اسے خلافت عثمانی کے دوران میں عبدالرحمٰن بن سمرۃ نے فتح کیا، لیکن جب اس نے یہ

لکھا تھا اس وقت اس کا حال صرف کابلی ھلیلہ کی برآمد کی بدولت معلوم ھوا ۔ ایک اور مہم (امیر) معاویہؓ کے زمانے میں بھیجی گئی۔ ۱۷۶ھ/۷۹۳ء میں ھارون الرشید کے ماتحت ایک فوج نے بلخ سے چل کر شمالی جانب سے درۂ بامیان کے راستے وادی پر حملہ کیا ۔ مامون الرشید کے زمانے میں ایک اور حملہ ھوا جس کے نتیجے میں کابل شاہ نے اطاعت اختیار کرکے دین اسلام قبول کر لیا ۔ اور یہاں کے لوگ بھی حلقہ بگوش اسلام ھو گئے ، لیکن ۲۵۷ھ/۸۷۱ء میں یعنی ایران کی صفّاری حکومت سے قبل یہاں صحیح معنوں میں قبضہ نہیں ھو سکا ۔ اس میں شک نہیں کہ چاندی کی کانوں کے باعث "پنج ھیر" میں بے حد کشش تھی اور یعقوب بن لیث صفاری، نے سکے بھی ضرب کرائے تھے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کابل کا نام کسی خاص شہر کے لیے کہیں استعمال ھوا ھو۔ بہرحال یہ کوئی اھم مرکزی شہر نہیں تھا ۔ یہ امر بھی قابل توجہ ھے کہ یعقوب بن لیث نے زیادہ سیدھے راستے یعنی سجستان سے وادی ارغنداب اور غزنہ سے ھوکر حملہ کرنے کے بجاے شمال سے ھندوکش کے دروں کے راستے حملہ کیا تھا ۔ بتایا جاتا ھے کہ اس زمانے میں کابل کا فرمانروا نسلاً ترک اور مذھباً بدھ تھا اور یہ امر قرین قیاس ھے کہ وہ آخری کوشانی بادشاھوں کا وارث ھو [رک بہ افغانستان] .

مغل شہنشاھوں کے زمانے سے قبل یہ کبھی دارالضرب نہیں رھا ۔ سب سے پہلے یہاں بابر نے سکے ضرب کروائے [رک بہ مادۂ بابر] ۔ غزنوی [رک بہ غزنویہ] اور غوری [رک باں] باشاھوں کے تمام تر دور حکومت میں دارالسلطنت غزنہ ھی رھا ۔ الادریسی نے کابل کا ذکر کرتے ھوے لکھا ھے کہ یہ طخارستان کی سرحد پر ایک بڑا ھندی شہر ھے اور یہ بھی بتاتا ھے کہ کوئی فرمانروا کابل میں اپنی بادشاھت کا باضابطہ آغاز کرنے سے قبل "شاہ" کا لقب اختیار نہیں کر سکتا تھا ۔ غالباً اس نے اپنی معلومات ان مآخذ سے حاصل کیں جو اس سے بہت پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتی تھیں کیونکہ اس کے اپنے زمانے میں تو "شاھوں" کی بادشاھت کو ختم ھوے ایک عرصہ گزر چکا تھا .

یہ امر قرین قیاس معلوم ھوتا ھے کہ غزنہ پر بارہا تباھی آنے کے باعث کابل زیادہ آباد ھوتا گیا اور آخر اسے عروج حاصل ھوا ۔ تیمور کے زمانے کے بعد یہ ایک ریاست کا مرکز بن گیا جس پر اس کے خاندان کے بعض افراد حکمران ھوے ۔ ابوسعید [رک باں] کے وفات پانے کے بعد کابل اس کے بیٹے الغ بیگ کے قبضے میں آ گیا اور وہ یہاں تا دم مرگ حکومت کرتا رھا ۔ اس کے بیٹے کو ذوالنون بیگ ارغون کے ایک بیٹے مقیم نے حکومت سے علیحدہ کر دیا اور پھر خود اسے ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں بابر نے نکال باھر کیا ۔ اس نے بابر کی سلطنت ہند کے لیے بنیاد کا کام دیا، حتٰی کہ جب اس کے بیٹے ھمایوں کو ھندوستان سے نکلنا پڑا تو کابل اس خاندان کے ھاتھ سے نہیں نکلا اور اس پر پہلے کامران اور پھر خود ھمایوں قابض رھا تا آنکہ ھمایوں نے ھندوستان دوبارہ فتح کر لیا ۔ بابر کو کابل بہت پسند تھا؛ اس نے بڑے پُرجوش انداز سے اس کی آب و ھوا ، اس کی ندیوں اور اس کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ھے ۔ آگرے میں وفات پانے کے بعد اس کی میت کابل لے جائی گئی جہاں شہر کے نزدیک ایک باغ میں جس کا نقشہ خود اس نے تیار کیا تھا، اسے دفن کیا گیا ۔ اس کا مقبرہ آج تک موجود ھے ۔ اس زمانے سے کابل کی تاریخ ھندوستان کی مغل سلطنت سے وابستہ ھو گئی ۔ یہاں سونے چاندی اور تانبے کے سکوں کی ٹکسال قائم ھوئی ۔ عہد محمد شاھی تک کے اکثر و بیشتر بادشاھوں کے سکے یہاں سے دستیاب ھوے ھیں ۔ ۱۷۳۸ء میں یہاں نادر شاہ کا قبضہ ھوگیا ۔ نادر شاہ

کے انتقال کے بعد اگرچہ شہنشاہ عالمگیر ثانی کا ایک روپیہ یہاں ڈھالا گیا، لیکن اس کے بعد یہ شہر کبھی مغل سلطنت میں شامل نہ ہوا اور بہت جلد اس پر احمد شاہ درانی [رکّ بآں] کی حکومت قائم ہوگئی ـ کچھ ہی عرصے میں اس نے درانی مقبوضات کے دارالحکومت کی حیثیت سے قندھار کی جگہ لے لی اور اس کی یہ حیثیت سدوزئیوں اور بارک زئیوں کے ماتحت آج تک بدستور قائم ہے [رکّ به مادۂ افغانستان] ـ اگرچہ مختلف لڑائیوں خصوصاً جو ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک سدوزئی اور بارک زئی قبیلوں کے درمیان ہوئیں اور جن میں قبضہ مخالفانہ کرنے والی برطانوی فوج نے حصہ لیا تھا اور پھر شیر علی اور اس کے بھائیوں کے درمیان خانہ جنگی کے باعث اسے بہت نقصان اٹھانا پڑا تاہم ایک اہم سلطنت کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے شہر کی رونق اور خوشحالی میں اضافہ ہوتا رہا ـ عبدالرحمن خان [رکّ بآں] اور حبیب اللہ کے عہد میں شہر کی حالت بہتر ہو گئی اور اچھی اچھی سڑکیں اور بازار تعمیر ہوئے ـ بالاحصار یا پہاڑی پر بنے ہوے قدیم سکونتی قلعے کی مورچہ بندیاں توڑ دی گئیں اور اس کے بالائی حصے میں سلاح خانہ بنا دیا گیا ـ عبدالرحمٰن نے ایک نیا مستحکم قصر جو "ارک" کے نام سے مشہور ہے، شہر سے باہر شیر پور اور عالم گنج کے درمیان تعمیر کرایا .

بابر کے مقبرے کے علاوہ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، تیمور شاہ درانی کا مقبرہ بھی کابل کے نزدیک واقع ہے .

کابل اس صوبے کا نام بھی ہے جس میں دارالحکومت کابل واقع ہے ـ اس کے شمال میں افغانی ترکستان، مغرب میں ہرات، جنوب میں قندھار اور مشرق میں جلال آباد واقع ہیں ـ اس کے شمال مغرب میں کوہستان پغمان اور جنوب مغرب میں ہزارہ‌جات شامل ہیں ـ کابل اور جلال آباد کی سرحد جگدلک پر واقع ہے ـ نسبةً جدید زمانے کے کابل کے لیے رکّ به افغانستان .

مآخذ : (۱) Elphiustone : *Caubul*، لنڈن ۱۸۳۹ تا ۱۸۴۲ء؛ (۲) Burnes : *Cabool*، لنڈن ۱۸۴۲ء؛ (۳) *The Babur-nama (Memoirs of Babur) in English* ترجمه A.S.Beveridge، لنڈن ۱۹۲۲ء ۱ : ۱۹۹ ببعد و دیکھیے اشاریه؛ (۴) Yate : *Northern Afghanistan* لنڈن ۱۸۸۸ء؛ (۵) Gray : *At the court of the Amir*، لنڈن ۱۸۹۵ء؛ (۶) Holdich : *Indian Borderland*، لنڈن ۱۹۰۱ء؛ (۷) Martin : *Under the absolute Amir*، لنڈن ۱۹۰۷ء نیز رکّ به *Imperial Gazetteer of India*، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ج ۱۴؛ (۸) Zotenberg : *Chronique de Tabari* پیرس ۱۸۷۱ء ۳ : ۵۱۷، ۸۱۵؛ (۹) Marquart : *Eransahr* (= *Abhandl. der. Kön Gesellsch. der wiss zu Gottingen*، philol-hist. Cl. Neue Eolge بند ۳، عدد ۲) برلن ۱۹۰۱ء، رکّ به اشاریه؛ (۱۰) ایضاً *Osteuropäische und Ostasiatische Streifzüge*، ص ۴۷۶؛ (۱۱) G. Le Strange : *The Lands of Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، تاریخی تصنیفات کے لیے رکّ به تحت مادۂ افغانستان .

(M. LONGWORTH DAMES)

* **کاتِب** : محرر یا لکھنے والا، یه لفظ ک ت ب مادّے سے مشتق ہے اور آگے چل کر ان دونوں لفظوں سے فعل کَتَبَ (اس نے لکھا) بنا ـ عربوں کو یه لفظ فن تحریر کے ساتھ ساتھ غالبًا اپنے شمالی آرامی ہمسایوں سے ملا ہوگا ـ ہمارے پاس قدیم شاعری کے جو نمونے محفوظ ہیں، ان میں یه لفظ صرف عربی رسم الخط لکھنے والوں کے لیے ہی استعمال نہیں ہوا بلکه شعراے قدیم نے حمیری کاتبوں کا بھی ذکر کیا ہے ـ اگرچہ زمانۂ قبل از اسلام میں فن تحریر کا وجود عرب کے ہر حصے میں ملتا تھا، لیکن اسے پوری طرح جاننے والے چند ایک ہی تھے، چنانچه طبقات ابن سعد میں ہر دور کے صحابه کے ذکر میں یه خاص طور پر

لکھا ہے کہ فلاں صحابی لکھنا جانتے تھے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بہت کم لوگ فن تحریر سے واقف تھے ۔ مدینے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے صرف دس اصحاب کو کاتب بیان کیا گیا ہے [بعض مآخذ (مثلاً تاریخ دمشق اور الاستیعاب) کی رُو سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے کاتبوں کی تعداد تیئیس اور پچیس تک پہنچتی ہے (جوامع السیرۃ، ص ۲۶، حاشیہ ۳)]یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مکّے کے کئی ممتاز افراد بھی کاتب تھے اور اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاہانِ الحِیرۃ کے کاتبوں (مثلاً عدی بن زَید) کی خدمات نیک چلنی کی تحریروں یعنی حلف ناموں (جن کا ذکر طفیل الغنوی نے کیا ہے) کے سلسلے میں حاصل کی گئی تھیں اور جن کے حوالے نقائض اور الحارث بن حِلّزۃ کے مُعلّقۃ میں ملتے ہیں اور جو عربی میں لکھے گئے تھے ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ کاتب بہت زیادہ اہمیت کے مالک ہیں جو آنحضرتؐ کی وحی لکھنے پر مأمور تھے ۔ یہ کاتب الوحی کے نام سے مشہور ہیں ۔ ابیؓ بن کعب اور زیدؓ بن ثابت ایسے ہی حضرات تھے ۔ حضرتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسلام قبول کرنے کے لیے جو متعدد دعوت نامے عمائدین عرب کو ارسال فرمائے تھے، ان کے لکھوانے کے لیے بھی انھیں اصحاب کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا تھا ۔ کاتب کا عہدہ بہت باعزت اور بلند پایہ سمجھا جاتا تھا اور آگے چل کر اس عہدے کے حامل وزیر کہلانے لگے ۔ سارے خلفاے راشدین اور بنو امیہ کے عہد میں اس عہدے پر جس شخص کو مأمور کیا جاتا تھا، اسے محض کاتب ہی کہتے تھے۔ خلیفہ ابو العباس کے عہد میں پہلی بار اس کے لیے وزیر کا لقب استعمال ہونے لگا ۔ اس زمانے میں ایرانی نظم و نسق کے طرز پر سرکاری دفاتر کا ایک پیچیدہ نظام نشو و نما پا چکا تھا ۔ کاتبِ اعلٰی کا لقب کاتب السِّر یعنی "پرائیویٹ سیکرٹری" تھا ۔ دوسرے کاتبوں کو جو کسی دفتری دستاویز کا ابتدائی مسودہ لکھتے تھے، کاتب الانشاء کہا جاتا تھا ۔ فوج کا نظم و نسق اور لشکریوں کی تنخواہ دینے کے فرائض کاتب الجیش کے سپرد تھے، جسے ہم "وزیر جنگ" کے برابر کا عہدہ قرار دے سکتے ہیں ۔ دوسرے کاتب بادشاہ وقت کی جائداد اراضی کی دیکھ بھال پر مأمور ہوتے تھے ۔ کاتبوں کے اس پورے نظام کا نام دیوان [رک بآں] تھا ۔ ساری قوت و اقتدار اسی طبقے کے ہاتھ میں تھی اور حکومت کے اعلٰی ترین عہدے دار انھیں میں سے منتخب کیے جاتے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ طبقہ دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رہتا تھا ؛ چنانچہ محدثین اور ائمۂ دین کی طویل فہرست میں ان کا نام بہت کم نظر آتا ہے، البتہ دیگر اصناف علم و ادب کے مصنفین اور شعرا میں ان کا ذکر مل جاتا ہے ۔ چونکہ ان لوگوں کے لیے تقریباً ہر مضمون کے سرسری علم سے واقف ہونا ضروری تھا، اس لیے ابتدائی زمانے ہی سے مصنفین اس طبقے کے استفادے کے لیے کتابیں لکھنے لگے اور چونکہ انھوں نے اپنے عہدے کی اہمیت برقرار رکھی تھی لہٰذا ان کے مفید مطلب کتابوں کی متعدد نقول ہم تک پہنچی ہیں ۔ کاتب کی تعلیم و تربیت کے لیے جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے بڑی بڑی یہ ہیں : ابن قتیبۃ [رک بآں] ادب الکاتب؛ ابن درستویہ : کتاب الکُتّاب، الصولی : ادب الکاتب اور بالخصوص القلقشندی کی ضخیم تصنیف ۔ جہاں اوّل الذکر تین کتابوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ ایک اچھے کاتب کی ضروریات کیا ہیں وہاں القلقشندی کی صبح الاعشٰی میں علمی طور پر اس موضوع کے متعلق وہ سب باتیں موجود ہیں جنھیں جاننا ضروری ہے ۔ ہمیں عربی ادب کی انشا میں وہ سارے اثرات نظر آتے ہیں جو شروع سے لے کر آخر تک کاتب نے اس پر ڈالے ۔ ابتدائی زمانے کے سادے اور واضح رسائل کے بعد ہم زمانۂ مابعد کی

مغلق عبارات تک پہنچتے ھیں جن کے ادق اور مشکل الفاظ کی وجہ سے اکثر اوقات ان دستاویزات کا مقصد و موضوع تلاش کرنا بھی مشکل ھو جاتا ھے۔ اس "بیماری" کا سبب یہ تھا کہ ھر کاتب عبارت آرائی اور خیال آرائی میں اپنے معاصرین اور پیش رووں سے گوے سبقت لے جانے میں کوشاں رھتا تھا۔ ھم کئی تصنیفات کے لیے ان کے مصنفین کی اس خواھش کے مرھون منت ھیں کہ کاتبوں کے لیے ان کی دستاویزات کا مواد بہم پہنچایا جائے، لیکن چونکہ پرشکوہ الفاظ کی تلاش اور ان کا استعمال ھمیشہ ان کے مدنظر رھتا تھا اس لیے مغربی ذوق مشرقی ادب کو بہ آسانی اخذ نہیں کر سکتا۔ ایرانی، ترکی اور ھندوستانی کاتبوں نے اسے مبالغے کی حد تک پہنچا دیا۔ جب وہ الفاظ کی بھول بھلیوں کا مطلب حل کر لیتے تھے تو فخر محسوس کرتے تھے۔ اس ذھنیت کی ایک جھلک ھمیں اس وقت نظر آتی ھے جب صاحب اسمعیل عبّاد جیسا شہرۂ آفاق کاتب ایک خط پر صرف اس وجہ سے اعتراض کرتا ھے کہ اس کے الفاظ بالکل واضح طور پر لکھے ھوے ھیں اور ان پر اعراب دیے ھوے ھیں، کیونکہ اس کے خیال میں ایسا کرنے سے اس کے علم و فضل کی توھین کی گئی ھے۔ اگرچہ کاتب بڑے اونچے اونچے عہدوں تک پہنچے، مگر ان کا سارا طبقہ کچھ بزدل سا معلوم ھوتا ھے کیونکہ وہ سوا سازشوں کے اور کسی کام کے اھل نہیں تھے اور مجھے یقین ھے کہ کوئی کاتب بھی تخت سلطنت پر نہیں بیٹھا، حالانکہ گزشتہ بارہ صدیوں میں کئی جواں مرد اور بلند حوصلہ لوگ تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب ھوے ھیں۔

مآخذ: (۱) ابن قُتَیْبَہ: ادب الکاتب، طبع Grünert اور کئی مشرقی طباعتیں، خصوصًا شرح البَطَلْیُوسی بعنوان الاِقْتِضَاب؛ (۲) ابن دُرُسْتَوَیہ: کتاب الکُتَّاب، طبع شیخو؛ (۳) الصّولی: ادب الکاتب، طبع بیروت؛ (۴) القَلْقَشَنْدی: صبح الاعشٰی، طبع قاھرہ، ۱۴ جلدوں میں اور آخرالذکر کا ملخص بعنوان الضوء۔

(F. KRENKOW)

* **کاتب چلبی**: رکّ بہ حاجی خلیفہ۔

* **کاتب رومی**: رکّ بہ علی بن حسین۔

* **کاتبی**: شمس‌الدین محمد بن عبداللہ، ایک فارسی شاعر، خراسان میں تُرشِیز کے ایک گاؤں طَرق وراوش میں پیدا ھوا۔ نیشاپور میں تعلیم پائی۔ تیموری بادشاھوں کے دربار میں حاضر ھونے کے لیے ھرات گیا، لیکن امید کے برخلاف اسے وھاں باریابی نہ ھو سکی اور وہ ایک طویل عرصے تک شیروان میں مقیم رھا جہاں شہزادۂ مرزا شیخ ابراھیم (م ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) نے اس کی سرپرستی قبول کر لی تھی۔ بعد ازاں اس نے آذر بیْجان میں سکونت اختیار کر لی جہاں اسکندر بن قرہ یوسف نے اس کی قدر دانی نہیں کی پھر اصفہان میں، جہاں وہ تصوف کے مطالعے میں منہمک ھوگیا اور ۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء اور ۸۳۹ھ/۱۴۳۶ء کے درمیان بعارضۂ طاعون استر آباد میں رحلت کر گیا۔ اسی آخرالذکر شہر میں اس نے نظامی اور امیر خسرو کی تقلید میں خمسہ لکھنا شروع کیا، لیکن صرف گلشن ابرار اور لیلٰی مجنوں ھی پایۂ تکمیل کو پہنچا سکا جس کے صرف ایک قلمی نسخے کا ھمیں علم ھے اور وہ سینٹ پیٹرزبرگ میں ھے۔ اخلاق اور موعظانہ شاعری کے میدان میں اس نے ایک کتاب دہ باب یا تجنیسات لکھی۔ اس نے ایک دیوان بھی چھوڑا ھے جس کی دس غزلیں مع ترجمہ Bland نے *Century* ص ۱۸ تا ۲۱، میں طبع کرائی ھیں۔ علٰی ھٰذا سی نامہ، جس میں عشق حقیقی کا بیان ھے اور مثنویوں میں مجمع البحرین جس میں ایک تمثیلی اور رزمیہ داستان ھے۔ یہ ایک ذوقافیتین نظم ھے اور اسے دو مختلف بحروں میں پڑھا جا سکتا ھے اور اس میں دو اشخاص ناظر اور منظور کے عشق حقیقی کا قصہ بیان کیا گیا ھے، نیز دل ربای

جو یمن کے بادشاہ قباد اور اس کے چالباز وزیر کی تمثیلی داستان ہے ۔ اس کے تخلص کاتبی کی وجہ تسمیہ غالبًا یہ ہے کہ وہ ایک کاتب تھا ۔ اس نے یہ فن نیشاپور میں مولانا سیمی سے سیکھا تھا جن سے بعد میں جھگڑا ہو گیا ۔ اس نے اپنی ساری زندگی غربت اور افلاس میں بسر کی کیونکہ اس کا اسراف حماقت کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور اسے اپنے سرپرستوں کے ہاں سے جو شاہانہ انعام و اکرام ملتے انہیں وہ چند ہی روز میں خرچ کر ڈالتا تھا ۔

مآخذ : (۱) دولت شاہ : تَذْکِرَۃ الشُّعَراء ، طبع براؤن ، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۱ء، ص ۳۸۱ تا ۳۹۱ ؛ (۲) لطف علی بیگ : آتش کدہ ، بمبئی ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) ، ص ۷۰؛ (۳) رضا قلی خان : مَجْمَع الْفُصَحاء، تہران ۱۲۹۴ھ، ۲ : ۲۸؛ (۴) J. Von Hammer : *Schone Redekünste* *Persiens*، ویانا ۱۸۱۸ء، ص ۲۸۱ (۵) H. Ethé، در *Grundriss der iran. Philologi*، ۲ : ۲۵۵ تا ۲۹۶؛ ۲۹۷ (۶) Cl. Huart : *Calligraphes et miniaturistes*، پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۲۱۳ ؛ (۷) E. G. Browne : *A Literary History of Persia Under Tartar Dominion*، کیمبرج ۱۹۲۰ء، ص ۴۸۳ تا ۴۹۵؛ (۸) *Cat. of the Persian and Arabic Manuscr . . . at Bankipore*، ۲ : ۱۶ ببعد .

(CL. HUART)

* **اَلکَاتِبی** : (دبیران) نجم الدین علی بن عمر القزوینی ، (م ۶۷۵ھ/۱۲۷۶ء اور بعض روایات کے مطابق ۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء) ایک ایرانی فلسفی جس نے عربی زبان میں کتابیں تصنیف کیں ۔ اس کی سوانح حیات سے متعلق اس کے سوا کہ وہ نصیر الدین الطوسی [رک بآں] کا شاگرد تھا اور کچھ معلوم نہیں ۔ اس نے اپنے استاد طوسی سے جو خط و کتابت "واجب الوجود" کے مسئلے پر قدما کے دلائل سے متعلق کی وہ موزۂ بریطانیہ میں تاحال ایک مخطوطے کی شکل میں [رسالۃ فی اثبات واجب الوجود] محفوظ ہے (فہرست، عدد ۴۲۹، سطور ۱ تا ۳) اور اسکوریال میں (Derenbourg : *Les mss. ar. de l'Esc.*، عدد ۷۰۳، سطر ۸) .

اس کی سب سے بڑی تصنیف "جامعُ الدَّقائق فی کشف الحقائق" ہے جو منطق ؛ طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے مسائل کی تشریح ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بہت زیادہ مقبول نہیں ہوئی ۔ اس کے مخطوطات پیرس (de Slane، عدد ۲۳۷۰) میں اور قاہرہ (فہرست، بار اول، ۷ : ۶۴۷) میں موجود ہیں۔ انہیں مسائل کی تشریح میں اس کی دیگر دو کتب نے زیادہ شہرت حاصل کی ، جو اس نے یکے بعد دیگرے لکھیں : (۱) "عین القواعد فی المنطق و الحکمۃ" (مخطوطات در لائیڈن ، فہرست، عدد ۱۵۲۵ اور دراسکوریال Derenbourg ، عدد ۶۶۸) جس کے ساتھ مصنف ہی کی شرح "بحرالفوائد" بھی ہے (لائیڈن= کتاب مذکور، عدد ۱۵۲۶، .Esc، کتاب مذکور، عدد ۶۶۵) اور (۲) کتاب حکمۃ العین، طبیعیات اور مافوق الطبیعیات میں جو بہت سے مخطوطات کی صورت میں تاحال موجود ہے ۔ آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں میرک شمس الدین محمد بن مبارک شاہ البخاری نے اس کتاب کی شرح لکھی ۔ یہ شرح مع تعلیقات از محمد الجُرجانی (م ۸۱۶ھ / ۱۴۱۳ء)، و قطب الدین محمود بن مسعود الشیرازی (م ۷۱۰ / ۱۳۱۱ء)، و حبیب اللہ میرزا جان (م ۹۹۴ھ / ۱۵۸۶ء) ، و المحقق الباغندی دو جلدوں میں ۱۳۱۹ء و ۱۳۲۴ء میں قازان سے شائع ہوئی ۔ ۱۸۴۵ء میں کلکتے سے صرف جُرجانی کی تعلیقات شائع ہوئیں ۔

اس کی شہرت کی بڑی وجہ علم منطق میں اس کا رسالہ موسوم بہ "الرسالۃ الشمسیۃ فی القواعد المنطقیۃ" ہے ۔ یہ رسالہ اس نے شمس الدین محمد بن بہاء الدین محمد الجُوینی کی فرمائش پر لکھا جو مغول بادشاہوں ہلاگو ، اباقہ اور احمد (م ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء) قب

۱ - ۱ ج ۱ بذیل مادّہ کا صاحب دیوان تھا ۔ یہ کتاب کلکتے میں ۱۸۱۶ء و ۱۸۲۷ء؛ استانبول میں ۱۲۶۳ھ؛ لکھنئو میں ۱۸۹۱ء کشاف اصطلاحات الفنون طبع A. Sprenger کے ضمیمہ ۱ کے طور پر کلکتے میں ۱۸۵۴ء میں طبع ہوئی ۔ شمسیہ کی کثیر التعداد شروح میں سے مشہور ترین وہ شرح ہے جو اس کے حصۂ اول (قسم التصورات) کی قطب الدین محمد بن محمد الرازی التحتانی (م ۷۶۶ھ / ۱۳۶۴ء) نے "تحریر القواعد المنطقیہ" کے نام سے لکھی اور وہ کلکتے میں ۱۸۱۵ء/۱۲۵۹ھ" کانپور میں ۱۲۸۸ھ؛ لکھنئو میں ۱۲۶۳ھ، ۱۲۷۹ھ، ۱۸۷۶ء، ۱۸۸۶ء اور قاہرہ میں ۱۲۹۳ھ، ۱۳۰۷ھ میں طبع ہوئی ۔ اس کے برابر کی شہرت السید الجُرجانی کے اس کتاب پر حواشی کو حاصل ہے جو کلکتے میں الکوچک کے نام سے ۱۲۴۰ھ، ۱۲۶۱ھ؛ دہلی میں ۱۳۰۹ھ، ۱۳۲۶ھ، لکھنئو میں ۱۸۹۵ء؛ قازان میں ۱۸۸۸ء؛ استانبول میں ۱۲۶۶ھ؛ قاہرہ میں ۱۳۲۳ - ۱۳۲۷ھ، اور بعنوان حاشیۃ الجرجانی علی التصورات استانبول میں ۱۲۹۳ھ طبع ہوئی۔ سید الجرجانی کی تعلیقات پر عبدالحکیم السیالکوٹی (سیالکوٹی، م ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء) نے حواشی لکھے؛ طبع دہلی ۱۸۷۰ء؛ لکھنئو ۱۸۷۸ء، ۱۳۰۸ھ؛ استانبول ۱۲۵۹ھ، ۱۳۱۰ھ، عصام الدین الاسفرائینی (م ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء) کے حواشی سنگی طباعت میں، بمقام نامعلوم، ۱۲۷۵ھ میں چھپے ۔ سعد الدین التفتازانی (م ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء) کی شرح التحتانی کے حاشیے پر مع حواشی از رونق علی لکھنئو میں ۱۹۰۵ء طبع ہو کر شائع ہوئی ۔ یہ کتاب بالخصوص ہندوستان میں دور حاضر تک نہایت اشتیاق کے ساتھ پڑھی پڑھائی جاتی رہی۔ میر محمد زاہد الہروی (م ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۸۹ء) نے اس پر تعلیقات لکھیں اور یہ تعلیقات کانپور میں ۱۲۸۷ھ؛ لکھنئو میں ۱۳۰۲ھ میں مع حواشی غلام یحیی البہائی اور ان حواشی پر حواشی از عبدالحی لکھنوی طبع ہوئیں ، نیز ایک مجہول الاسم محشی کے حاشیے کے ساتھ ہندوستان میں ۱۲۸۷ھ طبع ہوئی ۔ "تعلیقات" مصنفۂ علی لکھنوی ۱۲۹۲ھ میں لکھنئو سے شائع ہوئی ۔ عبدالحلیم لکھنوی نے دوسری اور تیسری فصل پر شرح المختلطات، طبع لکھنئو ۱۸۶۲ء لکھی ۔ محمد السنجانی مفتی زادہ نے ایک حصے یعنی فصل التصدیق پر حواشی لکھے ، طبع استانبول ۱۲۵۴ھ اور فصل التصورات کتاب مذکور پر بھی حواشی لکھے، طبع ۱۲۵۴ھ، ۱۲۵۹ھ۔ "شمسیہ" کی ایک تلخیص "میزان المنطق" جس کا مصنف معلوم نہیں ، مجموعۂ منطق "کانپور ۱۸۸۱ء، ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی اور عبداللہ بن الحداد العثمانی التلنبی نے بعنوان "بدیع المیزان" اس کی شرح لکھی ، طبع کانپور ۱۸۷۷ء؛ لکھنئو ۱۳۱۱ھ۔ میزان خاص کی ایک شرح محمد فضل الامام الخیر آبادی نے لکھی طبع Tamasgand ۱۲۸۶ھ، اس کی ایک شرح فارسی میں بنعوان "الکلام الفائق" احمد حسین آرّاکانی نے لکھی طبع کانپور ۱۳۱۷ھ ۔

بالآخر الکاتبی نے فخر الدین الرازی (م ۶۰۶ھ/ ۱۲۰۹ء) کے فلسفے کے دو رسالوں المحصل اور الملخص کی شرحیں بھی لکھیں جن میں سے پہلی کا نام "المفصل" اور دوسری کا نام المنصص ہے ۔

مآخذ : (۱) القزوینی : تاریخ گزیدہ ، ص ۸۴۵؛ (۲) خواند امیر : حبیب السیر ، بمبئی ۱۸۵۷ء جلد ۳، ص ۶۱؛ (۳) C. Brockelmann : *GAL* ، ۱ : ۴۶۷، ۵۰۷؛ [تکملہ، ۱ : ۸۴۵ ببعد] .

(C. Brockelmann)

* **کَاث:** خوارزم موجودہ خیوا کا قدیم دارالحکومت۔ یاقوت (معجم، طبع وستنفلٹ، ۴: ۲۲۲) کی رو سے اہل خوارزم کی زبان میں اس نام کے معنی تھے صحرا میں ایک دیوار (حائط)، چاہے اس کے اندر کوئی عمارت نہ بھی ہو ۔ فیل یا فیر کے قدیم شہر یا قلعے کے بارے

میں مفصل ترین بیانات، جسے آمودریا (جیحون) بتدریج بہا لے گیا تھا (اس کے آخری نشانات، بعض بیانات کے مطابق ۳۸۴ھ/۹۹۴ء میں صفحۂ ہستی سے معدوم ہوئے تھے) البیرونی [رک بآں] کی کتاب الآثار الباقیة، ص ۳۵، میں ملتے ھیں اور انھیں پر E. Sachau کی کتاب *Zur Geschichte una Chronologie von Khwarizm* (*Sitzungsber. der phil.-hist. cl. d. k. k. Akad. der Wiss.*، ج ۷۳، وی انا، ۱۸۷۳ء، خصوصاً ص ۴۸۹ ببعد پر مبنی ھے - چوتھی (دسویں) صدی کے جغرافیہ نگاروں نے اس شہر کے متعلق جو کچھ لکھا ھے اس کے لیے قب G. Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate* کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۴۴۶ ببعد، W. Barthold: *Turkestan w epokhu mongolskago nashestwiya* ج ۲، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۰ء، ص ۱۴۳ ببعد - اس کے بارے میں مکمل ترین حالات المقدسی، طبع ڈخویه، بار دوم، ۱۹۰۶ء، ص ۲۸۷ ببعد، میں ملتے ھیں - جب ۳۸۵ھ/۹۹۵ء میں گرگانج کے فرمانروا ابوالعباس مامون بن محمد کے ھاتھوں پہلے خوارزم شاھی خاندان کا تخته الٹا تو اس شہر کی سیاسی اھمیت جاتی رھی، دیکھیے W. Barthold: *Turkestan etc.*، ۲ : ۲۷۵ ببعد، کاث کا ذکر کرتے ہوئے ابن بطوطه نے لکھا ھے کہ (وہ اسے الکات لکھتا ھے، دیکھیے طبع Defrémery and Sanguinetti، ۳ : ۲۰) کہ یہ خوارزم اور اُرگنج (قدیم گرگانج) کے درمیان واحد آباد مقام ھے - خوارزم میں مقامی حکمران خاندان کے برسر اقتدار آنے سے قبل آٹھویں ھجری (چودھویں مسیح) صدی میں خیوا کے ساتھ کاث بھی سلطنت چغتائی میں شامل تھا (ظفر نامه، کلکته ۱۸۸۷ء، ۱ : ۲۳۲) - مثال کے طور پر یہ امر ۱۳۳۱ء کے چین کے نقشے Bretschneider: *Mediaeval Researches from Eastern Asiatic Sources*، ۱۸۸۸ء، ۲ : ۶۳) سے بھی ظاھر ھوتا ھے ۱۳۷۲ء میں کاث پر تیمور کی یلغار کے بارے میں دیکھیے ظفر نامه، ۱ : ۲۳۷ ببعد، P. Lerch: *Khiwa oder kh warizm*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۷۳ء، ص ۲۱) کے اس دعوے کے متعلق متن میں کوئی سند نہیں ملتی کہ فوج نے سه پایه اور کاث کے درمیان آمودریا کو عبور کیا تھا، جس کا مطلب اس نے یہ نکالا تھا کہ کاث اس زمانے میں دریا کے بائیں کنارے پر واقع تھا - گیارھویں صدی ھجری/سترھویں صدی عیسوی) میں کاث ایک خشک نہر کے کنارے آباد، تھا لہٰذا خیوا کے خان انوشه (۱۶۶۳ تا ۱۶۸۷ء) نے اصل ندی کے مغرب میں نہر یارمشی کے کنارے جسے اس نے خود کھدوایا تھا، ایک نیا کاث آباد کیا W. Barthold: *Kistoric orosheniya Turkestana*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۴ء، ص ۹۵، از مخطوطۂ ایشیاٹک میوزیم ob ۵۹۰، تاریخ خیوا، ورق ۳۳ الف) قدیم کاث کے کھنڈر جو آمودریا کے مشرق میں واقع ھیں، آجکل دور اسلامی کے ابتدائی ایام کے ایک بزرگ شیخ عباس ولی کے روضے کے نام سے موسوم ھیں - ۱۸۷۳ء میں A. Kuhn یہاں پہنچا تھا، اس نے یہاں کے حالات قلمبند کیے ھیں (Materiali dlya statistiki Turk. Kraya، ۳ : ۲۵۲) - ولی موصوف کے مقبرے کے علاوہ جو روغنی اینٹوں سے آراستہ یہاں کی واحد عمارت ھے، A. Kuhn نے ایک نیم منہدم مینار اور فصیل شہر کے بچے کچھے آثار کا ذکر کیا ھے - ان سب کی تعمیر میں پکی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں - موجودہ گاؤں (۲۰۰ مکانات، ۱۵ دکانیں، ۲ مسجدیں مع مکاتب) قدیم محل وقوع کے صرف تھوڑے سے حصے پر آباد ھے اور موجودہ قلعه قدیم قلعے کے صرف چوتھائی رقبے پر مشتمل ھے - بقول V. Masalskiy: *Turkestankiy Kray*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۳ء، ص ۴۷۹) یہ کھنڈر پیٹروالگزنڈروسک Petroalexdrovsk (جو انقلاب کے بعد سے ترتکل Turtkul کے نام سے مشہور ھے) سے ۳۱ ورسٹ Verst (روسی میل = ۲/۳ میل

انگریزی) اور آمودریا کے موجودہ دائیں کنارے سے ۷ ورسٹ کے فاصلے پر واقع ہیں .

(W. BARTHOLD)

* **کارته :** سینیگال Senegal فرانسیسی سوڈان کا ایک علاقه ہے جو ۲۱ ہزار مربع میل تک پھیلا ہوا ہے اور سینیگال کے بالائی سمندر اور صحرامے اعظم کے درمیان واقع ہے ۔ اس کے شمال کی جانب دربش موروں کا ملک اور ہوذ کا علاقه ہے ۔ مغرب میں سینیگال، مشرق میں بخنو اور جنوب میں بلدگو اور قلدگو ۔ (سطح کے اعتبار سے یہ ایک وسیع سطح مرتفع ہے جس میں قدیم زمانے کا Schistose زیادہ ہے اور Mesozoic اور Teritiary طبقات ارضی بھی زیادہ ہیں، اس میدان مرتفع کا نشیب جنوب مشرق کی طرف ہے، چنانچه اس علاقے کے تقریباً سب دریا سینیگال ہی کی جانب بہتے ہیں .

آب و ہوا ھلکی خشک ہے، اوسط درجۂ حرارت عام طور پر ۸۰ درجے (ف) رہتا ہے سالانه اوسط حرارت کی تدریجی حد ۶۵ ۲۲ درجے (ف) ہے، ماهانه حرارت ۸۵ درجے (ف) ہے، سالانه حرارت کا درجۂ اوسط حرارت مئی اور ستمبر میں دگنے تک پہنچ جاتا ہے ۔ یہاں بارش عموماً موسم گرما میں جنوب مغربی ہواؤں سے ہوتی ہے جو خلیج گنی کے گرم سمندر کے اوپر سے گذر کر آتی ہیں ۔ سالانه بارش تقریباً ۲۵ انچ ہوتی ہے، جس کے ساتھ بادلوں کی گرج بھی ضرور سنائی دیتی ہے ۔ صحرا کی طرف سے جو گرم اور غبار آلود آندھیاں آتی ہیں، ان کی وجه سے موسم اکثر خراب ہو جاتا ہے ۔ مختصراً کارته کی آب و ہوا کی خصوصیات یه ہیں : درجۂ حرارت بہت زیادہ، موسم گرما میں چند روزہ خفیف بارش اور اس کے بعد طویل خشک سالی اور ہوا میں نمی کی کمی .

اس علاقے میں دریا بہت کم ہیں اس لیے بستیاں زیادہ تر کنوؤں کے ارد گرد بس گئی ہیں، پانی کی سطح بہت نیچی ہے لیکن پانی کا دباؤ بہت زیادہ ہے، جہاں کہیں زمین دوز کنویں بنائے جاتے ہیں، پانی بہت جلد اوپر ابھر آتا ہے .

اپنی خصوصیات کے اعتبار سے یہ علاقه سرسبز میدانی ہے ۔ دور دور تک وسیع گھاس کے خشک میدان ہیں جن میں جا بجا ایسے درخت ہیں جن پر خشک‌سالی کا یہ اثر ہوتا ہے که وہ سال کے بڑے حصے میں خشک نظر آتے ہیں، مثال کے طور پر کیکر ۔ کارته جہاں کہیں آبپاشی کے وسائل مہیا ہوں، زراعت کے لیے موزوں ہے ۔ دریاؤں کے کناروں کے علاقے زرخیز ہیں اور ان میں یہاں کی مخصوص خوراک چاول کی کاشت ہوتی ہے ۔ دوسرے ریتلے اور مرطوب علاقوں میں کپاس، پھلیوں اور باجرے کی کاشت ہوتی ہے، اقتصادی زندگی کی بنیاد زیادہ تر تیل کے بیجوں اور پھلوں پر ہے، جن کا یہاں کی تجارت میں آدھا حصه ہے ۔ دوسری پیداوار جس کی اهمیت رفته رفته بڑھ رہی ہے، کپاس ہے ۔ اس علاقے میں کپاس کی ان مختلف اقسام کی کاشت کو رائج کیا گیا ہے جو مختلف طرح کی آب و ہوا کی شدت کو برداشت کر سکیں ۔ کپاس کا بیج کاشتکاروں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور مقامی کپاس کی حوصله افزائی کی جاتی ہے ۔ اس بات کے وسیع امکانات موجود ہیں که یہاں بھیڑیں پال کر آمدنی کے ذرائع کو بڑھایا جا سکے ۔ حال ہی میں یہاں مہرینو قسم کی بھیڑیں پالنے کا تجربه کیا گیا تھا جو زیادہ ناکام نہیں رہا .

یہاں کی آبادی بہت کم ہے، یعنی کوئی پانچ چھے کس فی مربع میل ۔ جو لوگ یہاں آباد ہیں زیادہ تر سوننکی اور بمبرہ قوم کے لوگ ہیں ۔ مخلوط آبادی میں خسونکے Khassonke پیوھل Peuhl اور مور شامل ہیں، بمبرہ قوم کے سوا باقی سب مسلمان ہیں کارته کے مختلف حصوں کی تفصیل یه ہے : (۱) Diafunu (تمبرکه) اور Diomboko (کونیاکری) جو سینیگال کے دائیں کنارے پر واقع ہیں؛ (۲) Giudiumé (نیو گومبیرہ) Diafun کے شمال میں واقع ہے؛ (۳)

Tomoo (دیالہ) وسط میں واقع ہے ؛ (۴) بگھے Baghe اور کارتہ بنے Kaarta-Bine، فلدگو Fuladugu کے شمال میں واقع ہے؛ (۵) دیان غرتہ مشرق میں؛ (۶) کنگوی (نیورا) موروں کی سرحد پر Luniakori اس علاقے کا پاے تخت ہے جہاں کی آبادی پانچ ہزار ہے۔ نیورا جو شمال میں واقع ہے جہاں کی آبادی بھی پانچ ہزار کے لگ بھگ ہے، ایک اچھا تجارتی مرکز ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اس علاقے کی تحقیقات ھاٹن Houghton اور منگو پارک Mungo Park (۱۷۹۵ء) نے اور پھر ڈوراٹن Duranton (۱۸۲۸)، ریفنل Raffenel (۱۸۴۶)، Mage & Quintin (۱۸۶۳) اور Lenz (۱۸۸۰) نے کی۔

تاریخ: سترھویں صدی کے اختتام پر سلطنت ملّی کو زوال آیا، قوم بمبرہ مساسی Bambara Massassi کے لوگوں نے جو سیگو سے آئے تھے، سونسہ Sunsa نامی سردار کی سرکردگی میں کارتہ کو فتح کر لیا اس کے جانشینوں کو سیگو کے بمبرہ کے خلاف جنگ کرنی پڑی، اٹھارھویں صدی کے آخر میں سیگو کے بمبرہ نے مساسیوں کو مغلوب کر لیا لیکن مساسیوں کے ایک شہزادے موسیٰ کُرابو نے اپنی قوت بڑھا کر نہ صرف تمام مفتوحہ علاقے واپس لے لیے بلکہ کونیا کاری کا علاقہ بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ کودیہ Kaudia نے جو اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا، نیورو اور دیاورہ کے علاقے بھی فتح کر لیے اور اس طرح کارتہ ایک زبردست اور طاقتور سلطنت بن گئی جو مشرق سے مغرب تک ۱۹۰ میل اور شمال تا جنوب ۱۱۰ میل لمبی تھی۔ اقتدار و اختیار ایک سردار کُلوبر Kulubar کا تھا جس کا لقب فامہ Fama تھا۔

کارتہ کی سلطنت کو تکولر Tuculor نے مطیع و مغلوب کر لیا۔ کارتہ قتل کر دیا گیا اور فامہ کو اطاعت قبول کرنی پڑی۔ اب کارتہ کا علاقہ تکولر کی سلطنت سے ملحق ہو گیا اور اس پر ۱۸۹۴ء تک ایک وائسرائے حکومت کرتا رہا۔ ۱۸۹۰ء میں کرنل Gallieni کی فوجیں کارتہ میں داخل ہو گئیں، انھوں نے کونیا کاری پر بھی قبضہ کر لیا، یکم جنوری ۱۸۹۱ء کو انھوں نے نیوود پر بھی قبضہ کرکے سارے ملک کو مطیع کر لیا اور کارتہ کو مملکت فرانس میں شامل کر لیا گیا اور اس کو انتظامیہ طور پر تین مختلف اضلاع نیورو، کتہ Kita اور کیز Kayes میں تقسیم کر دیا۔

مآخذ: (۱) Raffenel : *Nouvean voyage au pays*، پیرس ۱۸۵۶ء ج ۲ ؛ (۲) Mage : *Du Sénégal au Niger*، پیرس ۱۸۶۷ء؛ (۳) Gallién : *Veyage au Soudon Francais*، پیرس ۱۸۵۸ء، ص ۵۸۹ - ۶۰۵؛ (۴) Pietri : *Les Français au Niger*، پیرس ۱۸۸۵ء، ص ۶۳؛ (۵) Lenz : *Voyage au Sénégal et au Maroc*، ج ۲، پیرس ۱۸۸۶ء؛ (۶) Gatelet : *Histoire de la conquste du Soudon Français*، پیرس ۱۹۰۱ء ص ۱۹۷؛ (۷) M. Delafosse : *"Hant Senegal, Niger"*، پیرس ۱۹۱۲ء، ج ۱۱ ؛ (۸) Suggatels : *Africa* ؛ (۹) Walter Fitzgerald : *Africa* ؛ (۱۰) *Arid zone* Hydvology : *Q. U. N. E. S. C. O. Fullicatriv*؛ (۱۱) The Columbia Lippivcott Gazetteer of the World.

(G. YVER)

کارتہیج: رک بہ قرطاجنہ۔ *

کاروان: * (قدیم شکل "کار - بان"، وہ شخص جو تجارت کی حفاظت کرتا ہے)، انگریزی میں اس لفظ کی صورت Caravan ہو گئی ہے۔ فارسی میں اس کے معنی ہیں سوداگروں کی ایک جماعت جو ڈاکوؤں اور رہزنوں کے مقابلے میں اپنے جان و مال کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو منظم کرتی ہے، (عربی قافلہ)۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ سامان لانے لے جانے کے لیے اونٹ، گھوڑے اور خچر استعمال ہوتے ہیں، اونٹوں کو سات سات کی قطار میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ شتربان گدھے پر سوار ہو کر

قافلے کے آگے آگے چلتا ہے - کاروان چلانے والے سست رو ہوتے ہیں اور عجلت سے کام نہیں لیتے، لیکن ان کا کام بڑا سخت اور تھکا دینے والا ہوتا ہے؛ ایک آدمی کو اکثر دس بارہ اونٹوں کی دیکھ بھال اور رہبری کرنا پڑتی ہے - بعض اوقات تیس چالیس اونٹ صرف تین آدمیوں کے سپرد ہوتے ہیں - ان شتربانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ ہر منزل پر پہنچ کر اپنے جانوروں کا مال اتاریں، انہیں چارہ دیں اور ان کی دیکھ بھال کریں - ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد کہیں وہ اپنے کھانے پینے کے متعلق سوچتے ہیں - ازمنۂ وسطٰی میں کوچ کا اشارہ ڈھول (کوس) بجا کر دیا جاتا تھا .

صحرائی علاقوں میں قافلہ ان خیموں میں ٹھیرتا ہے جو وہ ساتھ لاتے ہیں، لیکن بادشاھوں اور مخیر لوگوں نے منزل بمنزل اور ایسے مقامات پر جہاں کاروان سستانے کے لیے رکتے ہیں، عمارتیں بنوا دی ہیں جنھیں کاروان سرائیں کہتے ہیں - ان عمارتوں کا نقشہ عموماً ایک سا ہوتا ہے - یعنی ایک مربع صحن، اس کے چاروں طرف دیواریں جن میں ایسی کوئی کھڑکی نہیں ہوتی جو باھر کی طرف کھلتی ہو - ان کے ساتھ ساتھ کمروں کا ایک سلسلہ چلا جاتا ہے؛ ہر کمرے میں ایک دروازہ اور ایک کھڑکی ہوتی ہے - بعض اوقات ان کاروانسراؤں میں کمروں کے بجاے بغیر چھت کی جھونپڑیاں بھی ہوتی ہیں - ان کی تعمیر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سوداگر وھاں رات بھر ٹھیر سکیں اور اپنا سامان رکھ سکیں - بار برداری کے جانوروں کو بندھن باندھ کر صحن میں چھوڑ دیتے ہیں، ان کاروان سراؤں میں جہاں تک ممکن ہو پانی کی بہم رسانی کے لیے کہیں سے آب رواں لایا جاتا ہے یا کم از کم وھاں ایک کنواں بنوا دیا جاتا ہے - ایران میں اکثر ایسی عمارتیں جو اب تک موجود ہیں، صفویوں کے عہد سے تعلق رکھتی ہیں اوران کی تعمیر شاہ عباس اعظم سے منسوب کی جاتی ہے - ان کاروانسراؤں میں اب صرف خالی چار دیواری کے سوا اور کچھ نہیں - ضروری استعمال کی چیزیں مثلاً بستر، قالین اور کھانا پکانے کے برتن وغیرہ مسافر اپنے ساتھ لاتے ہیں، تاھم شہروں میں خصوصاً کاروانسراے کے قریب ایک نانبائی ہوتا ہے جس کے ھاں اھل مشرق کے پسندیدہ کھانے ہر وقت تیار ملتے ہیں .

شیعیوں کے نزدیک نجف میں ضریح حضرت علی رضؓ (مشہد علی) اور کربلا میں ضریح امام حسین رضؓ (مشہد حسین) کے قریب دفن ہونا ایک با برکت عمل سمجھا جاتا ہے - یہ دونوں مقامات پہلے سلطنت عثمانیہ کی حدود میں تھے، اب مملکت عراق میں ہیں - اس مقصد کے لیے لوگ ہزاروں کی تعداد میں نعشوں کو لے کر ایران کے بعید ترین گوشوں سے میت کے قافلے بنا کر یہاں آتے ہیں - نعشوں کو لکڑی کے تابوتوں میں یا قالینوں اور چٹائیوں میں لپیٹ کر دو دو، تین تین یا چار چار کی تعداد میں گھوڑوں کی پشت پر باندھ دیا جاتا ہے - ہر منزل پر ان میتوں کو بالکل اسی طرح اتارا اور لادا جاتا ہے جس طرح سامان کے گٹھوں کو - چونکہ اس سفر میں کئی ہفتے لگ جاتے ہیں - اس لیے ان قافلوں میں ناقابل برداشت تعفن پیدا ہو جاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ کسی گاؤں کے قریب قیام کرتے وقت وہ وھاں سے تین یا چار میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالتے ہیں .

مآخذ : G. A. Olivier : *Voyage dans l' empire othoman*، ۳ : ۵۵م تا ۵۸م؛ (۲) H. Binder : *Au Kurdistan*، ص ۳۱۹، ۳۲۰؛ (۳) E. G. Browne : *A year amongst the Persians*، ص ۲۷؛ (۴) J. E. Polak : *Persien*، ii : ۵۵ .

(CL. HUART)

* **کاروان سراے :** رک بہ فندق .

* **کارو مَنڈل :** رک بہ معبر .

* **کارُون :** جنوبی ایران کا سب سے بڑا دریا ،

یہ ضلع عربستان (جسے پہلے خوزستان کہتے تھے) کے شمال مشرق حصے میں ۳۲° عرض بلد شمالی سے ذرا اوپر زردہ کوہ سے نکلتا ہے (کوہ زرد، جس کا پندرھویں صدی عیسوی ہی میں حمد اللہ مستوفی کے یہاں ذکر ملتا ہے (دیکھیے مآخذ) اس کا تعلق سلسلۂ کوہ بختیاری سے ہے اور اگر زیادہ صحت سے کام لیں تو کہنا چاہیے کہ یہ اس پہاڑ سے نکلتا ہے جس کا نام کوہ رنگ ہے اور جو جنوب مغربی ایران کے بلند ترین پہاڑوں میں شمار ہوتا ہے (تخمیناً ۱۳۰۰۰ فٹ) Sawyer (رک بہ مآخذ: در آخر ترجمۂ کتاب جس کا نام وہاں درج ہے ص ۳۸۶، مع ایک تصویر) کے قول کے مطابق اس دریا کا اصل منبع چشمۂ کرنگ (کرنگ (کرن) کا بڑا منبع) نامی مقام سے ۱۰ میل اوپر کی طرف واقع ہے، "زائندہ" یا "زیندہ رود" بھی جسے اصفہان رُود بھی کہتے ہیں اسی طرح زردہ کوہ سے نکلتا اور مشرق میں اصفہان کی جانب بہتا ہے .... [تفصیل کے لیے دیکھیے وا لائیڈن بار دوم و بار اول بذیل مادّہ].

مآخذ: (۱) *BGA*، بمواضع کثیرہ، خصوصاً اشاریہ بذیل مادّہ (نہر) دُجیل و (نہر) مسرُقان؛ (۲) ابن سرپین، طبع DeGoeje در *JRAS*، ۱۸۹۵ء، ص ۳۰، سطر ۵ تا ۹؛ ۳۲ ببعد (متن) اور ص ۳۰۷ تا ۳۱۳ (ترجمہ و حواشی؛ (۳) یاقوت: معجم، طبع Wüstenfeld، ۲: ۵۵۵، ۲۰ ببعد؛ ۴: ۵۲۷، ۱۱ ببعد؛ (۴) حمد اللہ مستوفی: نزہۃ القلوب، طبع Le Strange، ص ۱۹۵، سطر ۱۹، ۲۱۵، سطر ۳؛ (۵) ابن بطوطہ، طبع Sanguinetti و Defrémery، ۲: ۲۳ تا ۲۴؛ (۶) G. Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ۲۰۷، ۲۳۲ تا ۲۴۷؛ (۷) P. Schwarz: *Iran in Mittelalter nach den arab. Geograph*، ج ۴، لائپزگ ۱۹۲۱ء، ص ۲۹۵ تا ۳۰۸، ۳۱۰ تا ۳۱۱؛ (۸) J. M. Kinneir: *A Geogr. Memoire of the Persian Empire*، لندن ۱۸۱۳ء، ص ۸۷ تا ۹۰، ۹۶ تا ۹۹، ۱۰۲ تا ۱۰۵؛ (۹) H. C. Rawlinson، در *JRGS*، لندن ۱۸۳۹ء، ۹: ۶۳ ببعد، ۷۳ تا ۸۷، ۸۱، ۸۸ ببعد؛ (۱۰) Selby، وہی کتاب ۱۸۴۴ء، ۱۴: ۲۱۹، ۲۳۱؛ (۱۱) Layard، وہی کتاب ۱۸۴۶ء، ۱۶: ۲۷ تا ۲۸، ۴۴، ۵۰ تا ۶۵؛ (۱۲) Ritter: *Erdkunde*، ۹: ۶۳، ۱۶۲ تا ۲۰۴، ۲۱۹ تا ۲۲۰، ۲۲۵ تا ۲۲۷؛ ۱۰: ۲۶، ۲۸، ۳۱؛ ۱۱: ۱۰۲۳ تا ۱۰۲۵، ۱۰۲۸ تا ۱۰۳۰؛ (۱۳) C. A. von Bode: *Travels in Luristan and Arabistan*، لندن ۱۸۴۵ء، ۲ بمواضع کثیرہ (خصوصاً ص ۱۶۲، ببعد ۱۹۳، ۲۷۳ ببعد)؛ (۱۴) W. K. Loftus: *Travels and Research. in Chaldaea and Susiana*، لندن ۱۸۵۷ء، ص ۲۸۹ تا ۲۹۳، ۲۹۸ تا ۳۰۰، ۳۲۹، ۳۴۳، ۳۴۶، ۳۲۳ تا ۴۳۱؛ (۱۵) Fr. Spiegel: *Eranische Altertumskunde*، ۱، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ص ۱۰۸ تا ۱۱۱؛ (۱۶) A. Arnold: *Through Persia by Caravan*، لندن ۱۸۷۷ء، ۲: ۳۹ ببعد؛ (۱۷) H. Schindler در *Z.G. Erdk. Berl.*، ۱۸۷۹ء، ۱۴: ۳۸ ببعد ۱۸۸۱ء، ۱۶، ۳۰۷ ببعد؛ (۱۸) H. L. Wells در *PRGS*، ج ۵، لندن ۱۸۸۳ء، ص ۱۳۸ ببعد، ۱۴۴ ببعد، ۱۵۳ ببعد؛ (۱۹) Bateman Champain، وہی کتاب، ۱۸۸۳ء، ۵: ۱۲۱ تا ۱۳۸، ۱۴۶ تا ۱۴۹، ۱۵۲ (مع حواشی Fr. Goldsmid و Mackenzie)؛ (۲۰) Stolze و Andreas در *Petermanns Geogr Mitteil*، تکملہ حصہ عدد ۷۷، ص ۴۸، ۵۶، Gotha ۱۸۸۵ء؛ (۲۱) J. Dieulafoy: *Le Perse, la Chaldée et la Susiane*، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۲۲) W. Fr. Anisworth: *A Personal Narrative of the Euphrates Expedition*، لندن ۱۸۸۸ء، ۲: ۱۶۸ تا ۱۸۹، ۲۰۵ ببعد ۲۱۹ تا ۲۳۲؛ (۲۳) W. F. Ainsworth: *The River Karun*، لندن ۱۸۹۰ء؛ (۲۴) H. B. Lynch: *Karun Valley*، در *PRGS*، ۱۸۹۰ء، ۱۲؛ (۲۵) Tomaschek: *Kustenfhart Nearchs*، در *S. B. Ak. Wien*، جلد ۱۲۱: Abh. ۸: ص ۳۷ تا ۴۸ (۱۸۹۰ء)؛

(۲۶) G. N. Curzon : *The Karun River*، در *P.R.G.S* ۱۲ : ۵۰۹ تا ۵۳۲ ؛ (۲۷) Curzon : *Persia and the Persian Question*، لنڈن ۱۸۹۲ء، بمواضع کثیرہ (دیکھیے اشاریہ؛ خصوصاً ۲ : ۳۱۴ ببعد، ۳۳۰ ببعد، ۳۳۶)؛ (۲۸) Mrs. Bishop : *Journeys iu Persia and Kurdistan*، لنڈن ۱۸۹۲ء ؛ (۲۹) H. A. Sawyer در *The Geographical Journal*، ج ۴، لنڈن ۱۸۹۴ء، ص ۴۸۱ تا ۵۰۱ (مع حواشی از Lynch, Mackenzie، ص ۵۰۲ ببعد)؛ (۳۰) Th. E. Gordon : *Persia Revisited*، لنڈن ۱۸۹۶ء، ص ۱۰۰ ببعد؛ (۳۱) *The Persian Gulf Pilot* (ابتداءً مرتبهٔ Constable و Stiffe) لنڈن ۱۸۹۸ء، ص۲۸۴ تا ۲۹۳، ۲۹۶ تا ۲۹۹ ؛ (۳۲) Billerbeck، در *Mitt. VAG*، ۳ حصه ۲ : ص ۲۹ تا ۳۴، ۳۶ تا ۵۰ (۱۸۹۸ء)؛ (۳۳) Graadt von Roggen، در *Mém de la Délégation en Perse*، ۷، پیرس ۱۹۰۵ء، ص ۱۶۷ تا ۲۰۷؛ (۳۴) E. Herzfeld در *Petermann's Geogr. Mitteil*، ج ۵۳ Gotha ۱۹۰۷ء، ص ۳۷ تا ۹۷، مع الواح ۶ و ۷، ھر راستے کا نقشه (کارون کی گزرگاہ شستر سے اھوازـ ناصریه تک)؛ (۳۵) W. Schweer : *Das türkischpersische Erdölvorkommen*، ھمبرگ ۱۹۱۹ء = *Abh. des Hamburg. Kolonialinstituts*، جلد ۳۰ : ۲۲، ۵۷ تا ۷۲، ۱۱۰ تا ۱۱۷، ۱۳۰ تا ۱۳۲، ۱۷۷ تا ۲۱۹، مع نقشه ۳ (وادی کارون) اس سلسلے میں مطالعے کے لیے مزید تصنیفات اور نقشوں کا حواله Schweer نے ص ۱۵۳ ببعد اور ۱۶۵ ببعد پر دیا ھے ۔

(M. Streck [تلخیص از ادارہ])

* **کَازَرُوْن** : ایران کا ایک شہر جو صوبهٔ فارس میں، سمندر اور شیراز کے درمیان . . . ۳ فٹ کی بلندی پر واقع ھے اور شیراز سے ۵۵ میل کے فاصلے پر ھے ۔

مآخذ : (۱) یاقوت، طبع وُسٹنفلٹ، ۴ : ۲۲۵؛ (۲) Barbier de Meynard : *Dictionnaire de la Perse*، ص ۴۷۲ و حاشیه ؛ (۳) G. le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ۲۶۶ ؛ (۴) J. P. Morier : *Second Journey*، لنڈن ۱۸۱۸ء ؛ (۵) E. S. Waring : *A tour to Sheeraz*، لنڈن ۱۸۰۷ء ص ۲۲ ۔

(Cl. Huart [تلخیص از ادارہ])

* **کَازَرُونی** : شیخ مرشد ابو اسحٰق ابراهیم بن شهر یار ـ ناحیهٔ کازرون کے بزرگ علما و عرفا میں سے تھے اور درویشوں کے ایک سلسلے کے بانی جو ان کے نام کی نسبت سے اسحٰقیه یا "کازرونیّه" کہلاتا ھے ـ کازرون (ولایت قشطائی) میں ۳۵۲ھ سے ۴۲۶ھ (۹۶۳ء تا ۱۰۳۴ء) تک بقید حیات تھے اور اسی شہر میں اپنی خانقاہ میں مدفون ھیں ـ مستوفی کے زمانے میں ان کا مزار "حریم" تصور ھوتا تھا (نزهة القلوب ص ۱۲۵) وہ آتش پرستوں کے خاندان سے تھے اور اس خاندان میں ان کا باپ ھی پہلا شخص تھا جو مشرف باسلام ھوا، شیخ کی ولادت ان کے باپ کے اسلام لانے کے بعد ھوئی ـ (جامی ـ نفحات الانس طبع کلکته ص ۲۸۶، لامعی کا ترکی ترجمه استانبول، تاریخ طباعت ندارد، ص ۲۹۷) لیکن باوجود اس کے وہ اسلام کے ایک سرگرم مبلغ تھے اور بیان کیا جاتا ھے که انھوں نے چوبیس ھزار آتش پرستوں اور یہودیوں کو مشرف باسلام کیا اور لاکھ مسلمانوں نے توبه کرکے ان سے بیعت کی ـ (فرید الدین عطار : تذکرة الاولیاء مرتبهٔ نکلسن ۲ : ۲۹۶، خزینة الاصفیا، طبع لاھور ۱۲۸۳ء، ص ۸۴۷) ـ ان کے سلسلے کے ارکان ھمیشه سرگرم مبلغ رھے جو کفار کے خلاف جہاد اور غزاء کی تلقین کیا کرتے تھے ـ اسحٰقیّه سلسله ایران سے ھوتا ھوا ھندوستان اور چین تک پھیل گیا، جہاں انھوں نے اپنی شاخیں قائم کیں ؛ بالخصوص بندرگاھوں پر (مثلاً کالی کٹ اور زیتون میں) دیکھیے ابن بطوطه طبع ڈیفریری و سنگینٹی Defrémery, Sanguinetti ۲ : ۶۴، ۸۸ تا ۹۲، ۳ : ۲۴۴ تا ۲۴۸، ۴ : ۱۰۳) یه سلسله آناطولی تک بھی پہنچا، جہاں بیان کیا جاتا ھے که

بانی سلسلہ نے اپنی زندگی ھی میں اپنے پیرووں کو جہاد کے لیے روانہ کیا تھا ۔ لیکن اس علاقے میں اس سلسلے کی موجودگی کا پورا ثبوت چودھویں صدی ھی سے ملتا ھے (W. Caskel : در .ISL ۱۹ : ۲۸۴ ببعد) اپنے مجاھدانہ تبلیغی جوش و خروش کی وجہ سے "اسحٰقیّہ" سلسلے نے پندرھویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں لازمی طور پر نمایاں حصہ لیا ھوگا۔ Spandugino (سولھویں صدی کی ابتدا) نے اپنے ایک رسالے میں (در سانسووی‌نو Sansovino وینس ۱۶۵۴ ص ۱۲۹) اس سلسلے کو چار بڑے سلسلوں میں شمار کیا ھے ۔ قدرتی طور پر اس کا نفوذ روم ایلی میں بھی ھوا (ادرنہ کے تکیۂ حضرت ابو اسحٰق کازرونی کا ذکر اولیا چلبی ج ۳، ص ۴۵۴ میں موجود ھے) آناطولی سے یہ سلسلہ حلب پہنچا ۔ بروسہ، قونیہ اور ارزروم میں ان کے ادارے (ابو اسحٰق خانے موجود) تھے ، Caskel : کتاب مذکور) ۔ چودھویں صدی میں اس سلسلے کی تنظیم یقینا اعلٰی درجے کی ھوگی کیونکہ زاویۂ شیخ کے خادم شیخ کی مہر لگا کر ضرورت مندوں کو ان لوگوں کے نام =چیک Cheque دیا کرتے تھے جنھوں نے کازرونی سلسلے کا حلف اٹھایا ھوتا تھا، وصولی کے بعد وصول کنندہ امر کے پیچھے رسید درج کرتا تھا ۔ شیخ کی تربت کو "تریاک اکبر" کہتے تھے، اس لیے کہ آپ کی خاک مزار کے متعلق معتقدین (بالخصوص ملاحوں اور عطار) کا عقیدہ تھا کہ وہ حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ھے، سلطان شاھرخ بن تیمور نے ۸۱۸ھ (۱۴۱۵-۱۴۱۶ء) میں مزار شیخ کی زیارت نہایت عقیدت کے ساتھ کی (مطلع سعد بن، جلد ۲، ص ۳۴۴) ۔ ترکی میں سترھویں صدی کے دوران میں "اسحٰقیّہ" نے اپنے آپ کو ایک نسبۃً متأخر سلسلے میں مدغم کر دیا ۔ لیکن عوام میں کازرونی سے عقیدت کے مظاھرے اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آتے ھیں ۔

مآخذ : (۱) ماسینوں Massignon : *La passion d'al-Halladj*، ۱ : ۱۰۴ ببعد ؛ (۲) کوپریلو زادہ محمد فواد Köprülüzade Mehmed Fu'ad (اور میرے اضافے) : در *ISL*، ۱۹ : ۱۸ ببعد) اس مقالے میں ناموں کے حوالے بھی ھیں جن کو ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا تھا مناقب ؛ (۳) Meier : *Die Vita des Sckeik Abu Ishaq ai-Kazaruni*، لائپزگ ۱۹۴۸ء؛ (۴) بستان السیاحۃ، ۲ : ص ۴۶۰ ؛ (۵) فارس نامۂ ناصری ، ۲ : ۲۴۹) (بہ زیادات) .

(P. WITTEK)

* **کازموف** : رک بہ قاسموف .

* **کاسا بلانکا** : (Casa Blanca) : رک بہ دارالبیضاء .

* **اَلْکاسانی** : ابوبکربن مسعود بن احمد علاءالدین ملک العلماء، حنفی فقیہ، جنھیں غلطی سے "الکاشانی" بھی کہا جاتا ھے ؛ ان کی نسبت "کاسان" سے ھے جو "الشّاش سے پرے ھے" (قُرَشی، ابن دُقماق)، یعنی فرغانہ میں [دریای] سیحون کے جانب شمال، دیکھیے المستوفی : نزھۃ القلوب، ص ۲۴۶ ؛ السمعانی، ص ۴۷۱ ؛ یاقوت، ۴ : ص ۲۲۷؛ وہ علاءالدین محمد بن احمد بن ابی احمد السمرقندی (۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء) کے شاگرد تھے ۔ انھوں نے اپنے استاد کی دختر فاطمہ سے جو فقیہیہ کہلاتی تھیں شادی کی اور تحفۂ عروسی کے طور پر اپنے استاد کی تصنیف "تحفۃ" پر اپنی شرح پیش کی ۔ ابتدا میں وہ سلجوقی دربار سے وابستہ تھے، لیکن ایک بحث کے دوران میں وہ دست درازی پر اتر آئے اور انھیں دربار سے اپنا تعلق منقطع کرنا پڑا ۔ اس واقعے کے بعد سلجوقی حکمران نے اپنے وزیر کے مشورے سے انھیں حلب میں نورالدین بن زنگی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیج دیا، جہاں ان کا بڑی تعظیم و تکریم سے خیر مقدم کیا گیا (۵۴۱ھ اور ۵۴۴ھ کے درمیان) ۔ بعد ازآں نور الدین نے انھیں علمائے حلب کی درخواست پر رضی الدین السَرَخسی(۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء-۱۱۵۰ء) کے

بجاے "مدرسۃ الحلاویہ" (قائم شدۂ ۵۴۳ھ) میں معلم کی حیثیت سے مامور کر دیا، کیونکہ طلبہ السَّرَخْسی سے قوت بیان میں ایک نقص کی وجہ سے بہت غیر مطمئن تھے ("ابن قُطْلُوبُغا" اور طاش کوپروزادہ کا یہ بیان کہ انھیں یہ منصب السَّرَخْسی کی وفات کے بعد ملا غلطی پر مبنی ہے - دیکھیے علاوہ ازیں ابن العدیم : تاریخ حلب، ترجمہ Blochet در ROL، ج ۳ (۱۸۹۵ء) ص ۵۱۹ - وہ ایک نہایت ثقہ اور صحیح العقیدہ عالم تھے اور معتزلہ اور اهل البدعة کا اکثر ردّ کرتے رہتے تھے- دمشق میں ایک دفعہ ان کا شافعی علما سے مناظرہ ہوا، جس میں انھوں نے شافعیوں کے ہر ایک سوال کے جواب میں کسی حنفی مستند عالم کی سند پیش کی - ان کا انتقال حلب میں بتاریخ ۱۰ رجب ۵۸۷ھ/۳ اگست ۱۱۹۱ء اتوار کے روز ہوا اور انھیں حلب سے باہر مقام ابراہیم الخلیل میں ان کی اہلیہ کی قبر کے نزدیک دفن کیا گیا - ایوبی سلطان الظاہر غازی نے ان کے بیٹے کی تعلیم کا اہتمام اپنے ذمے لے لیا .

ان کی اہم ترین تصنیف کتاب "بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع" (۷ جلد، قاہرہ ۱۳۱۷-۱۳۱۸ھ) فقہ سے متعلق ہے - یہ کتاب ان کے سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق ان کے استاد علاءالدین السمرقندی کی تصنیف "التحفہ" مبنی بر "قدوری" کی شرح ہے (حاجی خلیفہ، ۲ : ۲۳۵، نے بھی یہی لکھا ہے) مگر یہ تصنیف "شرح" کی معمولی خصوصیات کی حامل نہیں اور خود کتاب میں اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ السمرقندی کی کتاب کی تقلید میں لکھی گئی ہے - غالبًا یہ سب سے پہلی اور اپنی نوع کی واحد حنفی فقہ کی کتاب ہے جو الغزالی کی "الوجیز" اور ابن رشد کی "البدایۃ" کی مانند چھوٹی سے چھوٹی جزئیات تک پوری باقاعدگی کے ساتھ مرتب کی گئی ہے - مصنف خود کتاب کی تمہید میں اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ وہ سختی سے ایک منتظم طریقے (الترتیب الصنائعی) کی پابندی کرے گا - اس نے ایک اور کتاب بھی لکھی تھی جو اب موجود نہیں، یعنی السلطان المبین فی اصول الدین (القرشی؛ ابن قُطْلُوبُغا، حاجی خلیفہ، عدد ۲۱۵۷) - براکلمان اس کی ایک تفسیر قرآن کتاب التاویلات کا ذکر کرتا ہے جو بشکل مخطوطہ محفوظ ہے .

مآخذ : بڑا ماخذ (۱) ابن العدیم : تاریخ حلب، اکثر حصہ غیر مطبوعہ - مندرجۂ ذیل نے اس سے استفادہ کیا ہے : (۲) القُرَشی : الجواهر المُضیئۃ، ۲ : ۲۴۴، ۲۴۶؛ (دیکھیے ۲ : ۱۲۹ و ۲۷۸)؛ (۳) ابن دقماق : نظم الجمان فی طبقات اصحاب النُّعمان، مخطوطۂ برلن، پیٹرزبرگ، جلد ۲، ص ۴۲، ورق ۴۱ تا ۵۱ ب؛ (۴) ابن قُطْلُوبُغا : تاج التَّراجم، طبع Flügel، شمارہ ۲۶۲؛ (۵) طاش کوپرو زادہ : مفتاح السّعادۃ، حیدر آباد ۱۳۲۹ھ، ۲ : ۱۳۵؛ (۶) الکَفَوی : طبقات الحنفیّہ، مخطوطۂ برلن، Sprenger، شمارہ ۳۰۱، ورق ۱۰۴ (اقتباس از لکھنوی : الفوائد البہیّہ، قاہرہ ۱۳۲۴ھ ص ۵۳)؛ (۷) G. Flügel : *Die Classen der Hanafit Rechtsgelehrten*، لائپزگ ۱۸۶۰ء، ص ۳۰۶؛ (۸) Brockelmann : *GAL*، ۱ : ۳۷۵ ص؛ (۹) Sarkis : *Dictionnaire de Bibliographie Arabe*، قاہرہ ۱۹۲۸ء، عمود ۱۵۴ .

(HEFFENING)

* **کاسٹیوم :** Costume رک بہ لباس .

* **کاشان :** (عرب مصنفین کے یہاں اکثر قاشان) عراق عجمی (الجبال، میڈیا) کا ایک شہر جو اصفہان سے تین روز کی مسافت اور قم سے ۱۲ فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے - یہ ایک قدیم شہر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ نے اسے از سرنو آباد کیا تھا .

مآخذ : (۱) اصطخری، ص ۱۹۷، ۲۰۱؛ (۲) ابن حوقل، ص ۲۵۹، سطر ۱۶ تا ۱۷ ص ۲۶۴؛ (۳)

المقدسی، ص ۳۹۰، ۳۹۲ ؛ بلا تاریخ ؛ (۴) یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۱۱ : ۱۵ ؛ (۵) حمد اللہ مستوفی : نزهة القلوب، سلسلۂ یادگار گب، ۲۳ : ۶۷، ۶۸ (ترجمہ ص ۷۱، ۷۲) ؛ (۶) Barbier de Meynard : *Dict. de la Perse*، ص ۴۳۴، ۴۳۵ ؛ (۷) Schefer : *Chrest Persane*، ۲ : ۱۲۹ ؛ (۸) Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۲۰۹ ؛ (۹) Olivier : *Voyage etc*، پیرس ۱۸۰۷ء، ۳ : ۹۶ تا ۹۷ ؛ (۱۰) Morier : *A second Journey through Persia*، ۱۸۱۸ء، ص ۱۶۱، ۱۹۲ ؛ (۱۱) W. Ousley : *Travels* لنڈن ۱۸۱۹ء، ۳ : ۸۶ تا ۹۴ ؛ (۱۲) Mme Dieulafoy : *La Perse etc*، پیرس ۱۸۸۷ء، ص ۱۹۴ تا ۲۱۲ ؛ (۱۳) R. Binning : *Journey of two years travel*، لنڈن ۱۸۵۷ء، ۲ : ۱۸۶ ببعد ؛ (۱۴) E. Aubin : *Rev. du Monde musulman*، ۱۹۰۷ء، ۲ : ۴۶۱ تا ۴۶۴ ؛ (۱۵) Chardin : *Voyages*، طبع Langles، پیرس ۱۸۱۱ء، ۲ : ۴۶۱ تا ۴۶۳، ۳ : ۱ تا ۱۱ .

(CL. HUART [تلخیص از ادارہ])

* **کاشانی :** رکّ بہ عبدالرزّاق .

* **کاشانی :** حاجی میرزا جانی، بابی مؤرخ، کاشان کا ایک تاجر جو اپنے تین بھائیوں میں سے دو یعنی حاجی میرزا اسمٰعیل ذبیح اور حاجی میرزا احمد کے ساتھ میرزا علی محمد باب کے اوّلین پیرووں میں سے تھا ۔ جب ۱۸۴۷ء میں باب کو اصفہان سے ماکو کے زندان میں بھیجا جا رہا تھا تو ان بھائیوں نے اس کے نگران دستے کو رشوت دے کر اسے دو دن اور دو رات کے لیے اپنے ہاں بطور مہمان رہنے پر آمادہ کر لیا ۔ ایک سال بعد کاشانی نے بہاء اللہ، صُبح ازل اور باب کے دوسرے ممتاز مریدوں کے ساتھ مل کر مازندران میں بار فُرُوش کے مقام پر شیخ طَبْرِسی کے باغیوں میں شامل ہونے کی کوشش کی، لیکن شاہی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر کچھ عرصے کے لیے آمل میں قید رہا، تاآنکہ کاشان کے دو تاجروں نے فدیہ دے کر اسے رہائی دلائی ۔ "وہ ہمیں ہمیشہ ایک خاص مذہبی جوش و جذبے سے سرشار نظر آتا ہے، کبھی بار فُرُوش میں، کبھی مشہد میں اور کبھی تہران میں" باب کو ۹ جولائی ۱۸۵۰ء کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ اس کے بعد کے دو سال کاشانی بابی تحریک کی تاریخ لکھنے میں منہمک رہا ۔ اور وہ اس کام کے لیے موزوں بھی تھا، کیونکہ وہ نہ صرف باب سے بلکہ صُبح ازل، بہاء اللہ اور بابی مذہب کے تقریباً تمام اوّلین قائدوں سے ذاتی طور پر شناسا تھا اور اس تحریک کے ابتدائی آٹھ سال میں جتنے بھی واقعات پیش آئے، ان کے بارے میں اسے مفصل اور صحیح معلومات حاصل تھیں ۔ اس کی تاریخ میں (جس کا نام اس نے کسی متصوفانہ بنیاد پر جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی، نقطة الکاف رکھا تھا) سب حالات صحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں لیکن اس میں اس نے اپنے ممدوح کے لیے حد سے زائد اور تقریباً بت پرستانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے اور اس پر جبر و تشدد کرنے والوں کے خلاف جو دشنام طرازی کی ہے، اس سے یہ کتاب مسخ ہو کر رہ گئی ہے ۔ جب ناصر الدین شاہ قاجار نے اس نئے مذہب کے پیرووں پر ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا تو کاشانی کو شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ سے جو تہران سے چھے میل جنوب میں واقع ہے اور جہاں اس نے پناہ لے لی تھی جبرًا نکال کر قید خانے میں ڈال دیا گیا ۔ یہاں اسے بہاء اللہ کے ساتھ ایک ہی کوٹھڑی میں جگہ ملی ۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۵۲ء کو اسے تہران میں اس کے ۱۷ ہم مذہبوں کے ساتھ سزاے موت دی گئی ۔ حکمت عملی کے تقاضے سے شاہ نے انھیں سزاے موت دینے کے لیے مختلف جماعتوں کے سپرد کر دیا تھا تاکہ وہ خود اور اس کا وزیر ہدف انتقام نہ بن سکیں، چنانچہ کاشانی کو آقا مہدی ملک التجّار کے حوالے کیا گیا ۔ ایک بیان کی رو سے اسے کمان کی تانت سے گلا گھونٹ کر

مارا گیا اور ایک دوسرے بیان کے مطابق شہر کے تاجروں اور دکانداروں نے اسے اتنے زخم لگائے کہ بالآخر اس نے دم توڑ دیا۔

اس کے بھائیوں میں سے اسمعیل نے تہران میں وفات پائی اور احمد، جس نے باب کی موت کے بعد صبح ازل کو اس کا جانشین تسلیم کر لیا تھا، بغداد میں چند بہائیوں کے ہاتھوں جو بہاء اللہ کے پیرو تھے، مارا گیا۔

مآخذ: (۱) حاجی میرزا جانی: نقطۃ الکاف طبع E.G. Browne در سلسلۂ یادگار گب (*Gibb Memorial Series*)؛ (۲) Browne: *A Traveller's Narrative Written to illustrate the Episode of the Bab*، کیمبرج ۱۸۹۱ء؛ (۳) وهی مصنف: *The Ta'rikh-i-Jadid, or 'New History of Mirzā 'Ali Muhammad the Bāb* کیمبرج ۱۸۹۳ء۔

(T. W. HAIG)

* **کاشغر**: [عوامی جمهوریۂ چین کے صوبۂ سنکیانگ کا] ایک شہر، جس کا ذکر قدیم ترین چینی مآخذ میں سولے Su-le (یا سولو، شولو) کے نام سے ملتا ہے۔ تانگ شو *T'ang-Shu* میں یہ نام اپنے چینی املا کنوچہ Kiu-cha کے ساتھ مذکور ہے (E. Chavannes: *Documents sur les Tou-Kine (Turcs) Occidetaux*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۱۲۱ ببعد)، [کاشغر دو الفاظ "کاش" (بمعنی رنگا رنگ) اور "غر" (بمعنی خشتی مکان) سے مرکب ہے اور دراصل دو شہروں کا مجموعہ ہے، یعنی چینی شہر لائی ننگ Lai-ning (یعنی شولو) اور اس کے مغرب میں اس سے کہیں بڑا اویغوری شہر شوفو (یا سوفو)۔ هن اور تانگ حکمرانوں کے ادوار میں یہاں شولو سلطنت قائم تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح ایک انڈوسیتھین قوم یہ‌چی Yueh Chi کنسوہ کے علاقے سے آ کر اس پر قابض ہو گئی۔ پہلی صدی قبل مسیح میں چینیوں نے کاشغر سمیت پورا چینی ترکستان فتح کر لیا اور کہا جاتا ہے کہ مشہور چینی سپہ سالار پان چاؤ Pan Chao کاشغر هی میں مدفون ہے۔ اس کے بعد یہ چی نے ایک بار پھر کاشغر فتح کر لیا اور انهیں کی بدولت یہاں بدھ مت کی اشاعت ہوئی]۔ زمانۂ قبل از اسلام کے کاشغر اور اس کے مضافات میں بدھ عمارات کے لیے دیکھیے A.Stein: *Ancient Khotan*، آوکسفرڈ ۱۹۲۱ء، ص ۸۰ ببعد؛ وهی مصنف: *Serindia*، آوکسفرڈ ۱۹۲۱ء، ص ۸۰ ببعد۔

[ابن الأثیر، ابن خلدون اور دوسرے مسلمان مؤرخین کے مطابق خلیفہ ولید بن عبدالملک کے نامور سپہ سالار مسلم بن قتیبہ نے کاشغر فتح کیا (۹۶ھ/ ۷۱۵ء)، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ مستقل طور پر اسلامی سلطنت میں شامل نہیں کیا گیا (دیکھیے H. A. R. Gibb، در *Bull. of the School of Or. Stud.*، ۲: ۴۶۷ ببعد)۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں چینیوں کی فوج متعین تھی، لیکن وہ مغرب سے آنے والے ترکوں کا مقابلہ نہ کر سکی]۔ کاشغر کے پہلے مسلمان خان کی حیثیت سے ہمیں ستق بغرا خان (م ۳۴۴ھ/۹۵۵ء) کا نام ملتا ہے (جمال قرشی، در Barthold: *Turkestan etc.*، سینٹ پیٹرز برگ، ۱: ۱۳۰ ببعد)، جس کا مقبرہ کاشغر کے شمال میں ارتوج (موجودہ ارتش) کے مقام پر آج بھی موجود ہے۔

دور ایلک خانیہ [رک بآں] میں کاشغر سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے چینی ترکستان کا اهم ترین شہر تھا۔ پانچویں صدی هجری/گیارھویں صدی عیسوی میں اس شہر کی ایک تاریخ عربی زبان میں لکھی جا چکی تھی (السمعانی: کتاب الانساب، طبع Margoliouth، لائیڈن و لنڈن ۱۹۱۲ء، ورق ۴۷۰ الف تا ۴۷۲ الف؛ جمال قرشی، در Barthlod، ۱: ۱۲۳)۔ فرمانرواؤں کو تومن Tumen کے کنارے ایک مخصوص مقبرے (الجنبذۃ الخاقانیہ) میں دفن کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے فرمانروا نے، جسے وہاں دفن کیا گیا تھا، محرم

۴۲۴ھ/دسمبر ۱۰۳۲ء میں اور آخری نے رجب ۶۰۱ھ/ مارچ ۱۲۰۵ء میں وفات پائی تھی ۔ عہد مغول میں مسعود بیگ [رک بہ بخارا] نے کاشغر میں ایک مدرسہ بنوایا تھا ۔ اس کے کتاب خانے میں الجوہری کی صحاح کا وہ نسخہ موجود تھا جسے جمال قرشی نے ترجمہ لکھتے وقت استعمال کیا تھا ۔ E. Sachau و Ethe : *Cat. of the Persian . . . Mss of the Bodleian Library*، آوکسفرڈ ۱۸۸۹ء، عمود ۹۸۳) .

[۱۲۱۹ء میں چنگیز خان نے کاشغر کا ضلع اپنی حدود سلطنت میں شامل کر لیا ۔ قبلای خان کے عہد میں مارکوپولو یہاں آیا تھا (۱۲۷۵ء) ۔ چودھویں صدی عیسوی میں امیر تیمور کے لشکر نے اسے تاخت و تاراج کیا] ۔ آگے چل کر کاشغر پر امرامے دوغلات [رک بآں] کی حکومت قائم ہو گئی ۔ ان میں سے آخری امیر ابوبکر (م ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء) جدید شہر کا بانی تھا ۔ اس نے پرانا قلعہ منہدم کرکے دریامے تومن کے دوسرے کنارے ایک نیا قلعہ تعمیر کرایا (تاریخ رشیدی، انگریزی ترجمہ، ص ۲۵۳، ۲۸۶ ببعد، ۲۹۵، ۳۲۶) .

[۱۷۵۵ء میں چینیوں نے ایک بار پھر کاشغر فتح کر لیا، جو تنگن بغاوت (۱۸۶۲ء) تک انھیں کے ماتحت رہا ۔ ۱۸۶۴ء میں ایک مسلمان سپہ سالار یعقوب بیگ نے کاشغر کے امیر کو معزول کرکے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی] ۔ مغول خوانین کے زمانے سے کاشغر اس علاقے کا صدر مقام نہ رہا تھا، اس کی جگہ یارقند نے لے لی تھی ۔ ۱۸۷۷ء میں چینیوں کا دوبارہ قبضہ ہو جانے کے بعد کاشغر کو پھر اهمیت حاصل ہو گئی کیونکہ اسے تاؤتای Tao--tai کا صدر مقام بنا دیا گیا، جس کے ماتحت چینی ترکستان کے مغربی اور جنوبی حصے چرچن کے نخلستان تک شامل ہیں ۔ یہاں روسی اور انگریز قونصل رہنے لگے ۔ ۱۸۷۳ء میں کاشغر کے حالات کے لیے دیکھیے H. W. Bollow، در Sir J.D. Fonsyth : *Mission to Jarkand in 1873.*، لنڈن ۱۸۷۵ء، جدید شہر کے لیے دیکھیے Kornilow : *Kashghariya*، تاشکنت ۱۹۰۳ء، مع نقشہ (ص ۲۶۸)؛ M. Hartmann : *Chinsisch-Turkestan*، Halle ۱۹۰۸ء، ص ۵۴ ببعد ۸۹۷ ببعد ۔ کاشغر اور مضافات کی سب سے اہم عمارت گیارھویں صدی ھجری/سترھویں صدی عیسوی کے مشہور ولی حضرت اپاق کا مقبرہ ہے ۔ [۱۹۵۸ء میں یہاں کی آبادی ایک لاکھ تھی ۔ کاشغر سنکیانگ کے کپاس پیدا کرنے والے علاقے کا مرکز ہے ۔ ۱۹۴۰ء میں شہر کے شمال مغرب میں واقع پہاڑوں میں تانبے کی کانیں دریافت ہوئی ہیں] .

مآخذ : متن مقالہ میں دے دیے گئے ہیں ؛ [نیز دیکھیے *Encyclopaedia Britannica*، طبع ۱۹۶۹ء، ۱۳ : ۲۴۳، ۲۴۴] .

(W. BARTHOLD [و ادارہ])

* **کاشف** : محمد شریف بن شمس الدین المتخلص بہ کاشف کُمیت، گیارھویں صدی ھجری/سترھویں صدی عیسوی کا ایک ایرانی مصنف ۔ ھمیں اس کی زندگی کے جو تھوڑے بہت حالات معلوم ہیں، وہ زیادہ تر اس کی کتاب خزان و بہار کے خاتمے سے ماخوذ ہیں ۔ مصنف کی پیدائش کے وقت اس کا باپ شمس الدین محمد المعروف بہ شمسامے شیرازی کربلا میں رہتا تھا ۔ وہ ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۷ - ۱۵۹۸ء میں وہاں سے اصفہان چلا گیا ۔ اس وقت اس کے بیٹے محمد کا سن تین برس کا تھا، جو ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۴ - ۱۵۹۵ء میں پیدا ہوا تھا ۔ ۱۰۰۸ھ/ ۱۵۹۹ - ۱۶۰۰ء میں شمس الدین مشہد گیا اور سات ماہ بعد اصفہان لوٹ آیا ۔ Rieu کی *Catalogue* کی رو سے یہ تاریخیں برٹش میوزیم کے قلمی نسخے میں دی گئی ہیں ۔ سینٹ پیٹرز برگ کے قلمی نسخے کا جو حال Rosen نے قلمبند کیا ہے، اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف ۱۰۰۶ھ میں پانچ برس کا تھا اور مشہد کا سفر ۱۰۱۰ھ/ ۱۶۰۱-

۱۶۰۲ء میں پیش آیا تھا ۔ ۲۳ برس اصفہان میں بسر کرنے کے بعد یہ خاندان رے چلا گیا جہاں کاشف کے باپ نے ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵-۱۶۲۶ء میں وفات پائی ۔ خود محمد شریف پندرہ سال تک رے کا قاضی رہا ۔

تذکرۂ نصیرآبادی (ملخص در Sprenger : *Catal. of the . . . . . . manuscripts of the Libraries of the King of Oudh*، ۱ : ۸۸ ببعد) میں کاشف اور اس کے دو بھائیوں اسمعیل مُنْصف اور مُقیما کا ذکر ملتا ہے ۔ مصنف موصوف کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اس نے لازماً ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۲-۱۶۵۳ء کے بعد انتقال کیا ہو گا ۔ خزان و بہار کا جو قلمی نسخہ لنڈن میں موجود ہے اس کے خاتمے پر جو مادۂ تاریخ درج ہے، اس سے اس تصنیف کی تکمیل کی یہی تاریخ نکلتی ہے ۔ خاتمے میں مصنف نے اپنی دوسری تصنیفات کا ذکر کرتے ہوے لکھا ہے کہ یہ اس وقت تک لکھی جا چکی تھیں، لہذا خزان و بہار اس کی آخری کتاب ہے ۔

تصنیفات : جیسا کہ خود کاشف بتاتا ہے اس کی باقاعدہ علمی و ادبی تربیت ہوئی تھی اور اس نے تحصیل علم میں کافی مدت صرف کی تھی ۔ اس نے نظم و نثر دونوں صنفوں میں لکھا ہے ۔ کاشف نے تین مثنویاں لکھیں جن میں سے دو (لیلی مجنوں اور ہفت پیکر) زمانۂ متأخر کی بیشتر مثنویوں ہی کی مانند ہیں اور ان کا موضوع وہی ہے جو نظامی کے زمانے سے بہت مقبول ہو چکا تھا ۔ تیسری کا نام عباس نامہ ہے ۔ یہ غالباً شاہ عباس دوم (؟) صفوی کی مدح میں لکھی گئی تھی ۔ علاوہ ازیں اس کی کئی ایک مختصر نظمیں، قصائد اور رباعیات بھی ہیں ۔ نثر میں اس کی کتابیں حسب ذیل ہیں : سراج المنیر، یہ کتاب گلستان سعدی سے متأثر ہو کر لکھی گئی تھی ۔ اس کا اسلوب مرصّع ہے اور اس میں جا بجا اشعار بھی آ گئے ہیں ۔ متن ۲۰ حصوں (لمعات) میں منقسم ہے ۔ ان میں مختلف محاسن اور مکارم اخلاق کا بیان ہے اور ان کی تشریح حکایات کے ذریعے کی گئی ہے ۔ مخطوطۂ لنڈن میں اس کی تاریخ تکمیل ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۰-۱۶۲۱ء دی گئی ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ وہ سن ہو جس میں اس قلمی نسخے کو نقل کیا گیا تھا اور اصل کتاب اس سے چند سال قبل لکھی جا چکی ہو ۔ اس کی آخری کتاب خزان و بہار بھی مرصع نثر میں ہے ۔ یہ ایک مجموعۂ حکایات ہے جسے لکھنے کی اس کے چھوٹے بھائی منصف نے فرمائش کی تھی ۔ اکثر حکایات ایک پرانی کتاب الفرج بعد الشدّۃ مصنفۂ حسین الدہستانی سے لی گئی ہیں، لیکن تفصیلات کا اضافہ اس نے خود کیا ہے، چنانچہ مثال کے طور پر اس نے ایک واقعہ ایسا بھی درج کیا ہے جو اس کے باپ شمس الدولہ کو پیش آیا تھا ۔ یہ کتاب ایک مقدمے، ۱۴ حصوں (اساس) اور خاتمے پر مشتمل ہے (طبع سنگی، تبریز ۱۳۲۴ء)، یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نثر میں اس نے دو کتابیں اور بھی لکھی تھیں یعنی دُرِّ مکنون اور حواس باطن .

مآخذ : Rieu : *Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum*، ص ۸۶۱، تکملہ، ص ۲۵۰ ببعد؛ (۲) Rosen : *Les manuscrits persane de l'Institut des langues orientales*، ص ۲۸۵ ببعد؛ (۳) Ethé: در *Grundr. der Ir. Phil.*، ۲ : ۲۳۶، ۲۳۸، ۳۳۰ .

(V. F. Buchner)

* **کاشفی** : حسین واعظ، ایک بسیار نویس مصنف جسے ہرات میں (سلطان حسین میرزا کے عہد میں [رک بآں]) بڑا عروج نصیب ہوا ۔ اس نے ۹۱۰ھ/۱۵۰۵ء میں وفات پائی ۔ اس کی مشہور ترین تصنیفات حسب ذیل ہیں : (۱) اخلاقیات پر ایک کتاب بعنوان اخلاق مُحْسنی جو سلطان حسین میرزا کے ایک بیٹے ابوالمحسن کے نام سے منتسب کی گئی اور ۹۰۰ھ/۱۴۹۵ء میں مکمل ہوئی ۔ یہ پہلی بار ۱۸۰۹ء میں کلکتے سے اور اس کے بعد کئی بار شائع ہوئی؛ (۲) نصراللہ بن محمد

بن الحمید[رک بآں] نے قبل ازیں کلیله و دمنه کا جو فارسی ترجمه کیا تھا، اس کا کاشفی نے جدید فارسی میں ترجمه کیا ۔ اس نے نظام الدین شیخ احمد السُّہیلی (م ۹۰۷ھ/ ۱۵۰۱ تا ۱۵۰۳ء) کے کہنے پر اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اپنی کتاب کا نام انوار سُہیلی رکھا ۔ اس کا اسلوب بڑا پر تکلف ھے اور اس میں صنائع و بدائع بکثرت استعمال کیے گئے ھیں ۔ اسی وجه سے مشرق میں اس کتاب کو بہت سراها جاتا ھے ۔ اس کے قلمی نسخے عام ھیں اور یه کئی بار طبع ھو چکی ھے ۔ پہلی بار یه ۱۸۰۴ء میں کلکتے سے شائع ھوئی تھی ۔ اس کی دیگر تصنیفات یه ھیں : جواهر التفسیر لتحفة الامیر، فارسی میں قرآن مجید کی تفسیر، ۸۹۹ھ میں علی شیر کی درخواست پر لکھی گئی، لیکن وہ اپنی مجوزہ چار جلدوں میں سے صرف ایک جلد مکمل کر سکا کیونکه اسے اپنے سرپرست کے لیے ایک مختصر تفسیر لکھنے کی خاطر اس سے ھاتھ اٹھانا پڑا ۔ اس مختصر تفسیر کا نام مواهب علیه رکھا گیا تھا لیکن عام طور پر یه تفسیر حسینی کے نام سے مشہور ھے، روضة الشهداء، حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کی شہادت کی تاریخ (اس کے ملخص ده مجلس اور منتخب روضة الشهدا کے نام سے موجود ھیں)، بدائع الافکار فی صنائع الاشعار، ایک رساله مخزن الانشاء اصناف کلام ، صنائع و بدائع نیز معائب سخن پر (۹۰۷ھ میں تحریر ھوا اور حسین میرزا کے نام سے منتسب کیا گیا) اور بعد ازاں صحیفهٔ شاھی، دونوں کتابیں خطوط نویسی اور انشا پر ھیں، قصص و آثار حاتم طائی (یا رسالهٔ حاتمیه) ۸۹۱ھ میں مکمل ھوئی ۔ اس میں حاتم طائی [رک بآں] کی کہانی بیان کی گئی ھے ۔ تحفة الصلوات، ۔ ۔ ۔ رسالة العلیة فی الاحادیث النبویة، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جلال الدین رومی کی مثنوی کا انتخاب بعنوان لُباب معنوی، اس کے اقتباسات کے مختصر مجموعے لُبّ لباب کے نام سے مرتب کیے گئے ۔ مذکورۂ بالا تصنیفات میں سے کئی ایک کا ترجمه ترکی میں اور اوّل الذکر دو کا ترجمه انگریزی میں ھو چکا ھے ۔

مآخذ : (۱) Schefer : *Chrest. Pers.*، ۱ : ۱۹۰ ببعد؛ (۲) Ethé : *Grundriss. d. Iranischen Philologie*، ۵ : اشاریه ، بذیل مادۂ حسین واعظ ؛ (۳) وھی مصنف : *Cat. Pers. Mss., India office*، اعداد ۲۱۸۸، ۲۶۸۰ .

(T. W. ARNOLD)

* **کاشی** : (یاقوت میں قاشانی، قاشی ؛ ابن بطوطه میں قشانی)، یه نام جو ایران کے شہر کاشان [رک بآں] سے نکلا ھے، چینی Faience کی ان مربع یا مسدس تختیوں کو دیا جاتا ھے جو عمارتوں کی بیرونی یا اندرونی دیواروں کی آرائش میں استعمال ھوتی ھیں .

کاشی سازی کا شمار ایشیاے قریب کے قدیم ترین فنون میں ھوتا ھے (جس سے آشوری اور ان کے بعد هخامنشی بھی واقف تھے) اور جو ایران میں ازمنۂ وسطی تک اور جیسا که معلوم ھوتا ھے خاص طور پر شہر کاشان میں باقی رھا ۔ شاہان صفویه کے زمانے سے لے کر عصر حاضر تک کی جدید ایران کی یاد گار عمارتیں (جن میں سے نسبةً پرانی عمارتیں کھنڈر ھو چکی ھیں) چینی کی ان تختیوں سے مزیّن ھیں ۔ ان میں رواجی بیل بوٹے نقش کیے گئے ھیں (کاشی کاری) جن میں زیادہ تر نیلا، فیروزی اور سبز رنگ استعمال ھوا ھے اور سرخ اور زرد رنگ ان سے کم تر ۔ ایسی تختیاں بہت کمیاب ھیں جن میں مختلف تصویروں کی مبنت کاری کی گئی ھو اور اسی لیے ان کی سب سے زیادہ قدر کی جاتی ھے .

جب ایرانی کاریگر، جو شاید عیسائی تھے (بعض تختیوں یا چوکوں پر سریانی زبان کے کتبے کنده ھیں) اس صنعت کو شہر دمشق میں لائے ، تو شامی ان چوکوں کو قاشانی (عربی ا.١لا=قاشاذ سے) کہنے لگے ۔ غالبًا اب سے صدی قبل یه فن بالکل معدوم ھو گیا ۔ جس کارخانے میں یه تیار ھوتے تھے، اس کے کھنڈر آج بھی باب شرق کے باھر نظر آتے ھیں ۔ ترکی میں ان

تختیوں کی نقل ازنیق اور کوتاھیہ میں کی گئی - حال ھی میں کارخانۂ مذکور کو دوبارہ جاری کرنے کی کوشش کی گئی تھی ، لیکن موجودہ زمانے کا کام قدیم فن پاروں کے حسن کی کسی طرح بھی برابری نہیں کر سکتا - ایران میں بھی یہی حال ھے؛ وھاں آج کل قدیم زمانے کے خوبصورت نمونوں کی نقلیں تیار کی جاتی ھیں .

مآخذ : (۱) یاقوت : معجم ' طبع وُسٹینفلٹ ، ۴ : ۱۵؛ (۲) ابن بطوطہ، طبع پیرس ' ۱ : ۱۵۴ ' ۲ : ۴۶ ' ۱۳۰ ' ۲۲۵ ' ۲۹۷؛ ۳ : ۷۹؛ (۲) Chardin : *Voyage*' ایمسٹرڈم ۱۷۳۵؛ ۳ : ۴؛ (۴) Pétis de la Croix : *Relation de Dourry-Effendi* ' Langlès طبع *Journal* پیرس ۱۸۱۰ھ ، ص ۱۳۴؛ (۵) Morier : *Deuxième Voyage* ' ص ۲۵؛ (۶) A. von Kremer : *Topographie von Damascus* ج ۲ (*Denkscher . d. K. Akad. d. Wiss*)، ویانا ۱۸۵۵ء ، ۶ : ۹) .

(Cl. Huart)

* **الکاشی** : جمشید بن مسعود بن محمود بن غیاث الدین،ا یک ایرانی جو سمرقند میں الغ بیگ کی رصدگاہ کا پہلا ناظم تھا اور جب اس فرمانروا نے جداول ھیئت [زیج] تیار کیں تو وہ اس کا شریک کار تھا - علم ھیئت اور ریاضی میں تحقیقات کرنے کے علاوہ اس نے طب کا مطالعہ بھی کیا تھا - اس نے تقریباً ۸۴۰ھ/۱۴۳۶-۱۴۳۷ء میں وفات پائی ھوگی - اس کی تصنیفات میں حسب ذیل باقی بچی ھیں : (۱) زیج خاقانی (خاقانی کی جداول)، فارسی میں قسطنطنیہ (ایاصوفیا) میں قلمی نسخہ موجود ھے - یہ زیج ایلخانی (تیار کردۂ نصیرالدین الطوسی) کا تکملہ ھے؛ (۲) مفتاح الحساب، برلن، لائیڈن، برٹش میوزیم، انڈیا آفس وغیرہ میں موجود ھے - اس کے دیباچے کا ترجمہ F. Woepcke نے کیا ھے (رک بہ مآخذ)؛ (۳) الرسالة الکمالیّة نیز المعروف بہ سلّم السماء (آسمان کا زینہ)، اجسام فلکی کے حجم اور درمیانی فاصلے کے بارے میں ھے، آوکسفرڈ، لائیڈن، انڈیا آفس میں موجود ھے؛ (۴) رسالة فی استخراج جیب درجة واحدة، وغیرہ (کسی درجے کے جیب زاویے کے تخمینے پر ایک مقالہ) قاھرہ میں موجود ھے - اس میں الکاشی نے تیسرے درجے کی ایک مساوات (equation) تخمینے کے ایک نہایت دلچسپ عمل سے حل کی ھے (دیکھیے نیچے Hankel کی تصنیف).

مآخذ : (۱) دیباچۂ مفتاح الحساب ، مخطوطۂ برلن دیکھیے؛ (۲) Ahlwardt : *Verzeichn*، ۵ : ۲۴۴ ؛ (۳) H. Hankel : *Zur Gesch. der Mathematic im Altertum u. Mittelalter*، لائپزگ ۱۸۷۴ء، ص ۲۸۹ ببعد؛ (۴) F. Woepcke : *Passages relat. á des sommes de séries de cubes*، روم ۱۸۶۴ء؛ (۵) H. Suter در *Abhandl. z. Gesch. der mathem. wissensch*، ۱۰ : ۱۷۳ .

(H. Suter)

⊗ **کاظم خان شیدا** : رک بہ پشتو .

* **کاظمی** : وہ نام جو ٹیپو سلطان، فرمانروائے میسور ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۲ء تا ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۹ء نے چاندی کے بنے ھوئے روپیے کے سولھویں حصے (ایک آنہ) کو دیا تھا؛ یہ نام ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظمؒ کی یادگار کے طور پر رکھا گیا تھا .

(J. Allan)

⊗ **کاظمَین** : عراق کے چار شہر مزارات ائمہ کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت رکھتے ھیں، نجف جہاں حضرت امیرالمؤمنین علیؓ بن ابو طالب کا روضہ ھے اور جو شیعیوں کا علمی مرکز ھے؛ دوسرا کربلا جہاں حضرت امام حسینؓ اور حضرت عباسؓ کے روضے اور بعض شہدائے کربلا کے مزارات ھیں؛ تیسرا شہر سامّرہ ھے جس میں امام علی النقی اور امام حسین العسکری [رک باں] کے روضے ھیں؛ چوتھا کاظمین ھے جو اس مضمون میں زیر نظر ھے .

وجہ تسمیہ : اس شہر میں دو اماموں کے مزار یکجا ھیں - ایک امام موسیٰ الکاظمؓ م ۱۸۶ھ/ ۸۰۲ء

بن جعفرؓ دوسرے امام الجواد محمد م ۲۱۹ھ/۸۳۴ء بن علی بن موسیٰ ۔ چنانچہ اس شہر کا نام "کاظمین" دو کاظم یا "الجوادین" دو جواد ہو گیا، جیسے ظہرین، مغربین وغیرہ ۔ دراصل یہ نام روضے کا تھا، لیکن اب شہر کا یہی نام پڑ چکا ہے اور شہر کے سٹیشن کا نام "الجوادین" رکھا گیا ہے۔ اسی طرح اندرون حرم کتب خانہ ہبة الدین شہرستانی کا نام بھی "مکتبة الجوادین" ہے ۔ یہ شہر آبادی کے بعد مشہد الکاظم، کاظمیہ اور پھر کاظمین کہلایا ۔ بغداد سے شمال مغرب کی طرف کم و بیش دس کیلومیٹر اور دریائے دجلہ کے دائیں کنارے سے پانچ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے (عماد الدین : مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم، ج ۲، ص ۳۷۷) دجلے کا پل "کرخ" عبور کرتے ہی کاظمین کی حد شروع ہو جاتی ہے ۔ یہاں کھجوروں کے باغ، مختلف پھلوں کے درخت اور خوشنما سبزہ زار ہیں موسم یہاں کا خوش گوار ہے ۔ عراق کا مشہور دریا قریب ہے ۔ اس کی ایک نہر شہر کی زرخیز زمین کو سیراب کرتی ہے ۔ زیارت گاہ ہونے کی وجہ سے آبادی بہت زیادہ ہے ۔ بڑے بڑے بازار، اچھے اچھے مکان، مسافر خانے، مہمان خانے، ہوٹل، چائے خانے دکانیں اور ہر قسم کا سامان تجارت فراوانی سے ملتا ہے ۔ بغداد کے راستے آنے والے قافلے اور زائرین پہلے کاظمین آتے ہیں پھر یہاں سے کربلا اور نجف کا رخ کرتے ہیں ۔ یہاں ہمیشہ زائرین کا مجمع رہتا ہے ۔ لیکن خصوصیت سے محرم، صفر، رجب، ۱۵ شعبان، رمضان، عیدالفطر، عیدالاضحی میں خاص خاص دن اور اصطلاحاً "مخصوصی" کے دنوں میں یہاں لاکھ دو لاکھ زائر جمع ہوتے ہیں اور قیام کے لیے جگہ ملنا مشکل ہوتی ہے ۔

پاکستانیوں کے بعض مخصوص مہمان خانے بھی ہیں ۔ اسی طرح کویت، بحرین، حجاز، لبنان، شام، پاکستان، ہندوستان، افغانستان اور افریقہ کے لوگوں نے بھی کچھ نہ کچھ مکانات مخصوص کر رکھے ہیں ۔ عموماً یہاں کے خدام مہمان داری کے فرائض انجام دیتے ہیں ۔ لیکن سب سے زیادہ اہمیت عراقیوں اور ایرانیوں کو حاصل ہے، عراقی یہاں کے قدیم باشندے ہیں اور ایرانی قرب مکانی اور صدیوں پرانے مسلسل روابط دینی کی وجہ سے یہاں رہتے ہیں، ان کے مکانات و آثار بھی سب سے زیادہ ہیں ۔ بلکہ درحقیقت یہ روضہ تو صرف انہیں کی عقیدت و دولت کا تعمیر کردہ ہے ۔

تاریخی نقطۂ نظر سے کاظمین کی آبادی کا واقعہ عجیب ہے، جب خلیفہ ابو جعفر المنصور نے بغداد تعمیر کرایا اور دارالخلافہ یہاں منتقل ہوا تو ۱۵۰ھ میں پہلی موت خلیفہ کے بڑے لڑکے جعفر کی ہوئی ۔ اس وقت دریا پار ایک قریہ شونیز یا شونیزی صغیر یہاں آباد تھا ۔ اس قریے کا قبرستان شہزادے کے لیے پسند کیا گیا اور مسجد کے قریب اسے دفن کیا گیا ۔ قبر پر موزوں عمارت و قبہ بنا، مقبرے کی دیکھ بھال، قرآن خوانی اور دوسرے امور خیر کے لیے کچھ ملازم بھی رکھے گئے ۔ قبر پر فاتحہ کے لیے شاہی خاندان اور متوسلین کی آمد و رفت شروع ہو گئی (عمادالدین : مجموعۂ زندگی چہاردہ معصوم، ص ۳۷۸؛ میرزا عباس فیض : تاریخ کاظمین، ص ۱۸ ۔

جعفر کی قبر کے بعد دوسرے مشاہیر بھی مرنے کے بعد یہاں دفن کیے گئے، خاندان نوفل کے سردار عیسیٰ بن عبداللہ اور مشہور عالم ابن الماحسون، ابو عبداللہ عبدالعزیر بن عبداللہ (م ۱۶۴ھ) (تاریخ کاظمین، ص ۱۸) لیکن قبرستان شونیزی کی عظمت کا دن وہ تھا جب ۱۸۳ھ میں امام الکاظم موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی السجاد علیہم السلام کا تابوت جسے بغداد سے ہارون الرشید کے چچا سلیمان بن ابی جعفر المنصور نے اپنے قبضے میں لیا اور شاہانہ احترام کے ساتھ وہ تابوت بغداد سے یہاں لا کر امام کو مسجد کے قریب سپرد لحد کیا (مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم، ص ۳۸، نیز رک بہ موسیٰ الکاظم) ۔ سلیمان سلطنت کا نامور رکن،

بنی عباس کا بزرگ مرتبہ شہزادہ تھا، وہ دمشق و بصرہ کا والی رہ چکا تھا، اس کے بڑھاپے اور اعزاز کے دن تھے (سلیمان ۱۹۹ھ میں فوت ہوا) ۔ اس نے امام کی قبر پر عمارت اور عمارات پر قبہ تعمیر کرایا (باقر شریف القرشی : حیاۃ الامام موسیٰ بن جعفر، ج ۲، ص ۵۸۴) امام کے وہ عقیدت مند جو بغداد میں رہتے تھے اسی وقت سے زیارت کو آنے لگے ۔

امام علی رضاؓ اور ان کے بعد امام محمد تقیؓ بھی لوگوں سے زیارت مزار امام موسیٰ الکاظمؓ کی فضیلت بیان کرتے رہے ۔ عموماً لوگ زیارت مدینہ، نجف اور کربلا کے لیے آتے جاتے تھے۔ ائمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور دوسرے ائمۂ معصومین کی زیارت کے آداب بتائے تھے۔ اب اس مزار کی زیارت کے ثواب و آداب بھی بتائے جانے لگے اور لوگ دور دراز سے یہاں حاضر ہونے لگے ۔ زیارت و آداب زیارت کے لیے دیکھیے، مجلسی : تحفۃ الزائر، ص ۳۶۳؛ عباس قمی : مفاتیح الجنان، ص ۴۷۵ ۔

امام علیہ السلام کے مزار کی وجہ سے اس قبرستان کا نام "مقابر قریش" پھر مشہد الکاظم اور اس کے بعد کاظمیہ ہوگیا (تاریخ کاظمین، ص ۱۹) سنہ ۱۹۸ھ/۸۱۳ء میں محمد امین بھی مقابر قریش میں دفن ہوا ۔ اس کا مقبرہ بھی تعمیر ہوا ۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ۲۱۶ھ/ ۸۳۱ء میں مامون کی والدہ زبیدہ بھی یہاں سپرد لحد ہوئی (بحث کے لیے وہی کتاب، ص ۱۹) ۔

۲۲۰ھ/۸۳۵ء میں امام موسیٰ الکاظم کے پوتے امام الجواد، محمد بن علی الرضا علیہ السلام [رک بآں] یہیں دفن ہوے اور ام الفضل بنت مامون الرشید نے اس مزار پر عمارت و قبہ بنوایا (تاریخ کاظمین، ص ۲۱) نویں امام کے لیے بھی سادات و علویین و دوستداران اہل بیت کا آنا جانا بڑھا، ان کے زیارت مشہد کے ثواب بھی حدیثوں میں بیان کیے گئے (تحفۃ الزائر، ص ۳۶۳؛ مفاتیح الجنان، ص ۴۷۵) ۔ کچھ عرصے تک تو اس جگہ کو بھی مقابر قریش یا مشہد الکاظم ہی کہا جاتا رہا، لیکن آہستہ آہستہ دونوں اماموں کی اہمیت کے پیش نظر دونوں کے ناموں کی ترکیب سے نام پڑا ۔ چونکہ امام الکاظمؓ بزرگ تھے، ان کی لحد بھی پہلے بنی تھی، لہٰذا کاظمین کہنا اچھا معلوم ہوا ۔

مشہد الکاظم والجواد یا کاظمین کی تعمیر : تاریخ و کتب زیارات و احادیث ائمۂ اہل بیت (کتاب المزار از ابن قولویہ اور جامع الاخبار و بحار الانوار) سے دونوں اماموں کے دو الگ الگ مزاروں کا اندازہ ہوتا ہے ۔ جیساکہ اوپر لکھا گیا ۔ چونکہ امام موسیٰ کاظمؓ، امام محمد الجوادؓ کے جد بزرگوار تھے اس لیے رسماً لوگ پہلے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور دعائیں کرتے تھے اور دعاؤں کی مقبولیت کے چرچے ہونے لگے ۔ قاضی ابو محمد حسن بن الحسین الجلال کی روایت ہے کہ مجھے جب بھی کوئی مشکل پیش آئی ہے، میں امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام کے آستانے پر جا کر ان سے توسل اختیار کرکے خدا سے دعا کرتا ہوں؛ میری مشکل آسان ہو جاتی ہے (ابن الخطیب : تاریخ بغداد، ج ۱، ص ۱۲۰؛ مفاتیح الجنان ۴۷۵، تاریخ کاظمین، ص ۲۴) اس کے علاوہ اور بہت سے واقعات ہیں ۔ جن کی وجہ سے عراق میں امام موسیٰ کاظمؑ کا لقب ہی "باب الحوائج" زبان زد ہے ۔ یہ شہرت و عظمت شروع ہی سے ہو گئی تھی ۔ اس لیے حاجت مند بکثرت آتے اور روضے پر مجمع روز بروز بڑھتا رہتا تھا ۔

تیسری صدی ہجری میں بغداد کے ایک طالع آزما خاندان "آل نو بخت" نے عروج حاصل کر لیا ۔ یہ لوگ اماموں سے خاص عقیدت رکھتے تھے لہٰذا مشہد الکاظم و مشہد الجواد کی تعمیر و تزئین میں دوسرا حصہ ان لوگوں کا ہے (تاریخ کاظمین، ص ۳۰) ان کے بعد بویہی خاندان نے اقتدار حاصل کیا، ان میں معزالدولہ اور عضدالدولہ نہ صرف شیعہ تھے، بلکہ انھیں تعمیرات

سے خاص شغف تھا ۔ ان کی عقیدت نے مدینۂ منورہ کی تعمیر کروائی (عمدة الاخبار فی مدینة المختار، ص ۱۸۴، قاهرہ)، کربلا و نجف کے مزاروں کو از سرنو بنوایا اور وقف کرائے [رک بہ کربلا] نیز تاریخ النجف ماضیہا و حاضرہا) .

۳۵۳ھ میں بغداد کی مسجدوں کو رونق دی ۔ عاشور کے روز ماتم سید الشہداء کے لیے جلوس نکلوائے ۔ ظاہر ہے کہ ان جلوسوں کا ایک مرکز کاظمیہ قرار پا گیا ۔ عضدالدولہ نے ۳۷۲ھ کے بعد کربلا و نجف کی زیارت کی اور وہاں کے روضوں کی از سرنو تعمیر کا حکم دیا ۔ تعمیر کے بعد قیمتی ہدیوں اور اوقاف کی خدمت بجا لایا (محمد حسن : مدینة الحسین، ص ۱۰۶، نیز رک بہ کربلا) ۔ اس کی ان خدمتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بغداد سے قریب کاظمین کی تعمیر و آرائش و نگہداشت سے غفلت نہ برتی ہوگی ۔ ۳۶۹ھ میں بغداد کے عظیم المرتبت عالم اور شیخ مفید کے استاد جناب ابوالقاسم ابن قولویہ نے رحلت کی تو انھیں مشہد الکاظم میں دفن کیا گیا .

۴۰۰ھ سلطان الدولہ بویہی کا وزیر کربلا کی زیارت سے مشرف ہوا اور اس نے وہاں قابل ذکر تعمیرات کا اہتمام کیا ۔ ممکن ہے وہ کاظمین بھی آیا ہو اور یہاں کی تعمیرات کی اصلاح کرائی ہو ۔ ۴۱۳ھ میں شیخ مفید کے انتقال پر بویہیوں نے اپنے مذہبی عالم کا جنازہ بڑی شان سے اٹھایا اور انھیں مشہد الکاظم میں دفن کیا ۔ ۴۲۳ھ میں قم کا ایک اہم قافلہ زیارات مزارات ائمہ کے لیے آیا ۔ ۴۳۱ھ میں جلال الدولہ بویہی بغداد سے کربلا و نجف کی زیارت کو گیا، بلاشبہہ اس نے کاظمین میں بھی حاضری دی ہوگی ۔ اس دور میں بویہیوں کے زوال اور سلجوقیوں کے عروج، فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ کا تذکرہ ابن الاثیر نے قلم بند کیا ہے ۔ ان حالات نے کرخ و کاظمین کے لوگوں کو ترک وطن پر مجبور کیا اور شیخ مفید و سید مرتضی کے جانشین محدث و فقیہ بزرگ شیخ ابو جعفر محمد بن حسن الطوسی نے ۴۴۸ھ میں نجف کی طرف ہجرت کی ۔ اس سے فرقۂ امامیہ کا مرکز علم و تدریس بغداد سے منتقل ہو گیا .

سلجوقیوں کے تسلط اور بغداد میں امن کی بحالی ہوئی تو کاظمین بھی رفتہ رفتہ زائرین کے مجمع سے آباد ہونے لگا ۔ کہتے ہیں کہ ۴۶۶ھ میں شرف الدولہ نے ایک ہزار دینار کے خرچ سے شہر پناہ اور دوسری عمارتیں بنوائیں (ابن الاثیر، سال ۴۶۶ھ) .

۴۷۹ھ میں ملک شاہ سلجوقی نے زیارات ائمہ کے لیے سفر کیا اور مزاروں کی ترمیم و تجدید کے احکام دیے (رک بہ کربلا؛ نیز مدینة الحسین، ص ۱۱۴، ۱۲۰) .

خلیفۂ عباسی کی اہم تعمیریں : بویہیوں کے بعد ناصر لدین اللہ الخلیفہ اور ابن علقمی نے کاظمین کی ترقی و تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ۔ شہر پناہ کے علاوہ عمارت مشہدین، مہمان خانہ ۶۰۴ھ میں اور ۶۰۸ھ میں شیعہ سنی علوم و عقائد کا بڑا مدرسہ اور ایک یتیم خانہ بنوا کر کاظمین کو نئی زندگی بخشی، لیکن پانچ سال بعد دجلے نے اس رونق پر پانی پھیر دیا ۔ اس مرتبہ سیلاب کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ امام احمد بن حنبلؒ کا مزار دریا برد ہو گیا اور کاظمین کی تمام عمارتیں منہدم ہو گئیں ۔ پانی اترتے ہی ابن علقمی نے پھر تعمیرات کا کام شروع کر دیا اور ۶۱۴ھ میں شہر اور مزار پھر تیار ہو گیا ۔

۶۲۲ھ میں شہر کو آگ نے گھیر لیا ۔ کتب خانے اور مدرسے، روضوں کی عمارتیں اور اس کا سامان ضائع ہوا اور ناصر لدین اللہ کا قیمتی صندوق بھی زد میں آیا ۔ اس نقصان کی تلافی کے لیے الظاہر باللہ نے حکم جاری کر دیا اور مؤید الدین علقمی نے پھر تعمیرات کا آغاز کیا ۔ الظاہر باللہ نے رحلت کی تو مستنصر باللہ

اخراجات کا کفیل ہوا - اب کی مرتبہ دجلے کا پل اور شہر کا بند بھی نیا بنایا گیا - روضوں کی عمارتیں بھی مستحکم ہوئیں اور غالباً ۶۲۴ھ میں یہ کام ختم ہوا کیونکہ اب تک قیمتی لکڑی کا وہ نفیس منبت و طلا کار صندوق کاظمین میں موجود ہے جس پر خطِ کوفی جلی میں یہ عبارت تحریر ہے :

صندوق خاتم : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ھذا ضریح الامام ابی‌الحسن، موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن ابی عبداللہ الحسین بن علی بن ابیطالب علیوم السلام .

پھر اسی خوبصورت نقش و نگار اور طلائی حاشیوں پر خط ثلث میں سونے سے لکھا ہے :

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا [الآیہ] ھذا ماتقرب الی اللہ تعالی بعملہٖ، خلیفتہ فی ارضہ ونائبہ فی خلقہ سیدنا و مولانا امام المسلمین المفروض الطاعۃ علی الخلق اجمعین ابوجعفر المنصور المستنصر باللہ امیرالمومنین ثبت اللہ دعوتہ - فی سنۃ ستمائۃ و اربع و عشرون .

فارسی اصطلاح میں اس ساخت کے بکس کو "صندوق خاتم" کہتے ہیں - تعویذ قبر پر صندوق خاتم تھا، اس کے گرد شمعدان - زمین پر قیمتی فرش، دیواروں پر حریر و دیبا کے پردے، بالائے سقف مخروطی گنبد و مینار تھا جیسے زمرد خاتون اور زبیدہ خاتون کے مقبروں کے آثار سے اندازہ لگایا گیا ہے - امام موسیٰ کاظم کے روضے کے قریب امام محمد الجواد کا مزار بھی اسی شان سے تعمیر ہوا تھا - ان مزاروں کے ادھر ادھر مسجد، مدرسے، علما کے گھر، سادات کے مکان، متولیوں اور خادموں کے مسکن اور مسافروں کے لیے سرائیں تھیں - سلاطین، خلفا، امرا زیارت کو آتے تو درھم و دینار کے انبار ساتھ لاتے اور نذرو ھدیہ و امور خیر میں صرف کرتے، سونے چاندی کی قندیلیں اور نادر و نایاب آلات روضوں پر رکھتے (رک بہ، کربلا)۔

نقیب الاشراف ان تمام معاملات کا نگران اعلیٰ ہوتا تھا.

کاظمین میں عباسی خلیفہ کی حاضری : کاظمین بغداد سے قریب تھا لہٰذا خلفا و وزرا کی آمد و رفت کوئی خاص بات نہ تھی - مؤرخ بھی اسے عام بات سمجھ کر نہ لکھ سکے - اتفاق سے دو ایک خلفا کے بارے میں کچھ تذکرے قلم بند ہو گئے ھیں، مثلاً خود المستنصر باللہ ۳ رجب ۶۳۳ھ کو شاھانہ تزک و احتشام کے ساتھ آیا، مزاروں کی تعمیر کا معائنہ کیا، زیارت کی، نذرانہ چڑھایا اور نقیب الاشراف ابو عبداللہ حسین القساسی کو شاھی نوازشات سے مفتخر کیا اور تین ہزار دینارکاظمین و نجف کے علویین کی خدمت کے لیے پیش کرکے واپس گیا (تاریخ کاظمین، ص ۱۰۳).

۶۴۱ھ میں المستعصم باللہ خلیفہ ہوا تو مؤیدالدین ابن عاقمی کے ساتھ بغداد سے زیارت کاظمین کے لیے آیا - راستے میں سخت بارش ہوئی لیکن شاھی جلوس نہ رکا اور بھیگتا ہوا قافلہ مشھد الکاظم پر حاضر ہوا .

۶۴۶ھ میں سیلاب نے پھر کاظمین کا رخ کیا - ۶۴۷ھ میں المستعصم نے شہر و مشہدکو پھر نیا کر دیا اور ۱۱ ذی القعدہ کو تکمیل تعمیر کے ساتھ دونوں قبّوں پر بنی عباس کا شاھی اعزازی نشان نصب کیا گیا (تاریخ بغداد، ص ۱۱۸) .

کاظمین کی تعمیر میں بنی عباس کا یہ آخری حصہ تھا - اس تعمیر کا چشم دید بیان وہ ہے جسے مشہور ادیب و مصنف یعنی نور الدین علی بن موسیٰ بن سعید المغربی (م ۶۷۳ھ) مؤلف کنوز المطالب فی اخبار آل ابی طالب، نے لکھا ہے "و لمّا و صلنا إلیٰ باب مشھد موسیٰ ابن جعفر تلقانا من خُدّامہ من اَنْزَلنا علیٰ بعد و وجدنا فی الطریق الیہ قبرا مُتطمّساً یُداسُ فسئلنا عنہ، فقیل ھذا قبر الحسن بن الحجاج الشاعر، اوصی ان یدفن فی طریق ھذا المشھد لِیُداسَ باقدام زوارہ.

فلمّا وصانا الی الباب تلقانا الزُوّار من ولد الکاظم، فامرونا بنزع الاخفاف .

فَلَمّا دخلنا رأینا من الجمع المحتفل و اوانی الذهب و الفضة والستور و الطیب ملک ابصارنا و لما حللنا بالروضة التی فیها قبرالکاظم رأینا قبرا آخر ذکروا انه قبر حفیده محمد الجواد بن علی الرضا ابن موسی الکاظم و فی ذلک المشهد مایطول ذکره و یهول امره"۔

اور جب ہم "شہر مشہد موسیٰ ابن جعفر" میں پہنچے تو خدام نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں دور ہی سے سواریوں سے اتار لیا، ہم نے راستے میں ایک بے نشان سی قبر دیکھی جو پیروں تلے روندی جاتی تھی، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ حسین ابن الحجاج شاعر (م ۳۹۱ھ) کی قبر ہے جس نے وصیت کی تھی کہ اسے اس بارگاہ کے راستے میں دفن کیا جائے تاکہ زائرین کے قدم اس پر پڑیں۔

ہم دروازۂ مزار پر پہنچے تو سادات کاظمی نے ہمارا استقبال کیا اور ہم سے جوتے اتارنے کی فرمائش کی۔ ہم اندر داخل ہوئے تو بہت بڑا مجمع وہاں موجود تھا، سونے چاندی کے آلات، پردے اور عطر و خوشبو نے ہمارے حواس پر غلبہ کر لیا۔ ہم نے روضے میں امام موسی الکاظم کی قبر کے علاوہ ان کے پوتے امام محمد الجواد کی قبر بھی دیکھی۔ اس مزار میں جو کچھ پایا جاتا ہے اس کی تفصیل طویل اور اہم ہے (تاریخ کاظمی، ص ۱۱۴)۔

اس بیان سے کاظمین کے خدام، زائرین، آداب زیارت اور شان عمارت کا بڑی حد تک نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ اسی زمانے کے ایک علوی عالم رضی الدین علی بن موسیٰ بن طاؤس (م ۶۶۴ھ) حلے سے کاظمین آئے اور یہاں قیام کیا۔ ان کے اصل الفاظ ہیں "وتوجہت الی مشہد مولانا الکاظم واقمت بہ" (کشف المحجۃ، ص ۲۱۱)۔

کاظمین کا دوسرا دور: ۶۵۶ھ میں ہلاکو نے بغداد پر حملہ کیا تو اس طوفان میں کاظمین بھی تاراج ہوا، لیکن امن امان قائم ہوتے ہی علاء الدین جوینی و نصیر الدین طوسی نے شہر و مزار، قبہ و بارگاہ کی گزشتہ شان و شوکت کو بحال کیا اور جب یہ دونوں فوت ہوئے تو حسب خواہش اسی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

خواجہ علاءالدین جوینی نے ۴ ذی الحجۃ ۶۷۱ھ کو رحلت کی ان کا مقبرہ غربی رواق میں اب تک موجود ہے (تاریخ کاظمین، ص ۱۱۹)۔

خواجہ نصیر الدین الطوسی نے ۲۸ ذی الحجۃ ۶۷۲ھ کو رحلت کی اور کاظمین میں دفن ہوئے۔ ان کی قبر بھی موجود و معلوم ہے۔

یاقوت نے معجم البلدان میں ۶۵۶ھ کے بعد کاظمین کو بڑا آباد شہر اور فصیل بند لکھا ہے۔ ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) نے احوال امام موسیٰ الکاظم میں لکھا ہے "و قبرہ هناک مشہور یزار و علیه مشهد عظیم فیه من قنادیل الذهب و الفضة و انواع الآلات و الفرش مالا یحد و هو فی جانب الغربی "وہاں ان کی قبر مشہور ہے، زیارت کی جاتی ہے اس پر عظیم الشان روضہ بنا ہوا ہے، جس میں سونے، چاندی کی قندیلیں اور طرح طرح کے سامان اور فرش و فروش کی عظمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ مزار شہر کے مغربی حصّے میں ہے"۔

۷۲۵ھ/۱۳۲۶ء کے سیلاب کے ایک سال بعد سلطان ابو سعید بہادر خان ابن خدا بندہ نے اس نقصان کی تلافی کی۔ اسی زمانے میں ابن بطوطہ نے کاظمین کی زیارت کی اور اس کے دو نقرہ کوب صندوقوں کا خاص طور پر ذکر لکھا (مجموعۂ زندگانیِ چہاردہ معصوم، ص ۳۸۷)۔ ۷۳۶ھ میں صلاح الدین خلیل ابن ایبک نے لکھا کہ "شہر باقاعدہ چہار دیواری کے اندر ہے اور تمام ضروریات زندگی دستیاب ہیں" (تاریخ کاظمین، ص ۱۲۰)۔

۷۶۹ھ میں خواجہ مرجان نے کربلا و نجف کے ساتھ کاظمین کی اصلاح و تعمیر کے علاوہ ایک مدرسے کی بھی تاسیس کی جس کے آثار اب تک باقی ہیں۔

سلطان حسن بن ادریس جلائری (م ۷۵۷ھ) نے دونوں مزاروں پر دو نفیس صندوق، اور عمارت پر دو گنبد اور دو مینار بنوائے (تاریخ کاظمین، ص ۱۲۱؛ مدینۃ الحسین، ص ۴۳۱).

ساتویں صدی سے نویں صدی کے آخر تک کاظمین کی شان و شوکت میں اضافہ ھی ھوتا رہا۔ پہلے یہ عمارت عراقی طرز کی تھی اب اس میں ترکوں کے فن تعمیر کی نمود ھوئی.

کاظمین کا تیسرا دور: دسویں صدی کے ربع اول میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے بغداد کو فتح کیا اور ۹۲۶ھ/ ۱۵۱۹ء میں کاظمین کی خستگی کے پیش نظر تمام عمارت کی نئے نقشے پر تعمیر کا حکم دیا، جس میں وسطی ایوان، ایوان کے گرد رواق، بڑی بڑی محرابیں، مقرنس چھتیں، رنگین نقشی کاشی کارائنٹیں، آیات و احادیث، اسماے الٰہیّہ، چہاردہ معصوم کے نام، اشعار، تاریخیں اور آئینہ کاری، سامان آرائش، قالین اور دوسرے لوازم مہیا کیے۔ عمارت پر دو کاشی کار گنبد، دو مینار بنائے، بلند و بالا دیواریں اور شاندار نقرہ پوش دروازے نصب کیے۔ اندرون ایوان قبر پر اس عمارت کے کچھ حصے محفوظ ھیں اور ان پر ۹۲۶ھ و ۹۳۵ھ سنین اور شاہ اسمٰعیل و شاہ خدا بندۂ صفوی کے نام درج ھیں.

جامع صفوی کاظمین: شاہ خدا بندہ نے نذر و نیاز کے علاوہ، روضے کی کہنہ مسجد کی جگہ بڑی شاندار ۲۷ ستونوں کی بلند و بالا، کاشی کار اور کتبوں سے آراستہ مسجد و محراب بنوائی.

منبر سلیمانی عثمانی: ۹۴۰ھ میں بغداد پر صفویوں کا قبضہ ختم ھوا اور عثمانی خلیفہ سلطان سلیمان کربلا و نجف و کاظمین و سامرے کی زیارت کے لیے آئے۔ انھوں نے ھر روضے کی خدمت کی۔ کاظمین کی جامع مسجد کا خشتی منبر بنوایا جس کی تاریخ تکمیل کاشی رنگ و روغن میں ۹۴۱ھ تحریر ھے۔ ترکی طرز کا یہ منبر اسی انداز کا ھے جیسے مسجد الحرام میں سنگ مرمر کا۔

مینار اسی بادشاہ نے نذر کیا تھا، جس کے دروازے کی پیشانی پر "انه من سلیمان و انه بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم" لکھا ھوا ھے.

مینار سلیمی: ترکی کے سلطان سلیم ثانی کے عہد میں والی بغداد سلیمان پاشا نے تعمیر و اصلاح عمارت کے ساتھ شمال شرقی زاویے کے مینار کو چھت کی سطح سے بلند ترکیا جس کی تاریخ اب تک درج ھے (۹۷۸ھ).

جہاں تک مینار کا تعلق ھے اس کی تعمیر ۱۰۴۵ھ میں شاہ صفی صفوی نے کرائی۔ یہ بات قابل ذکر ھے کہ اس نے نہ صرف میناروں کو بلند کیا بلکہ عمارت کے چاروں گوشوں پر چار مینار بنوائے۔ (تاریخ ص ۱۲۳)۔ ۱۲۱۱ھ میں محمد شاہ قاجار نے ان میناروں کو خوبصورت کیا، ان کے بالائی حصے کو چاندی سونے کی اینٹوں سے نقرئی و طلائی کر دیا۔ اب یہ مینار گول ھو کر بلند ھوتے اور بالائی حصے میں محراب دار چھوٹے چھوٹے مدور حلقے میں برج نما صورت اختیار کر لیتے ھیں جو اوپر سے مسقف، پھر ذرا پتلا ھوتا ھے اور تقریباً تین فٹ کی اونچائی پر کمرکھی ٹوپی اور کلس پر ختم ھوتا ھے۔ اس کلس اور گمزی میناروں کے پورے گلدستوں پر ۱۲۱۱ھ میں پہلے قاجار بادشاہ نے طلائی چادریں چڑھوا دیں.

گنبد: یہ بیان کیا جا چکا ھے کہ اس روضے کی خصوصیت ھمیشہ سے یہ چلی آتی ھے کہ میناروں کے درمیان۔ چھت کے اوپر دو گنبد تھے، جو اب تک کاشی کار تھے، ان کے کلس اب سنہری ھو گئے اور محمد شاہ قاجار نے دونوں گنبدوں اور کلسوں کو طلائی کر دیا.

ضریح: صدیوں سے ائمہ کی قبروں پر قیمتی لکڑی کے خوبصورت اور منقش صندوق رکھے جاتے تھے، جو شمعوں کے گرنے یا بخور کی انگیٹھیوں کی آگ سے متأثر ھو جایا کرتے تھے۔ ۱۰۳۳ھ میں جب شاہ عباس بزرگ دوسری مرتبہ زیارت کے لیے نجف سے کربلا اور کربلا سے کاظمین پیدل حاضر ھوے انھوں نے بہت

سے ہدایا و انتظامات کے ساتھ ساتھ دو نفیس لکڑی کے "صندوق خاتم" پرانے صندوق مستنصری کے اوپر رکھے۔ اور ان کی حفاظت کے لیے، جالی دار، نقرئی وطلائی نقش و نگار سے آراستہ چوکور فولادی جنگلا نصب کیا یہ جنگلا ضریح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ضریح طول میں چھے میٹر اور عرض میں تقریباً چار میٹر ہے اور اب تک موجود ہے (مجموعۂ زندگانی چہار دہ معصوم، ۲ : ۳۸۳)۔

۱۳۸۳ھ میں ناصر الدین شاہ قاجار نے فولادی ضریح کے گرد ایک اس سے بڑی نقرئی منقش ضریح نصب کی۔

طلا کاری : اب تک کاظمین کے در و دیوار اور سقف و ایوان پر عموماً طلائی نقش و نگار ہوا کرتے تھے یا زیادہ سے زیادہ کلس پر سونے کا پانی چڑھا دیا جاتا تھا، صفوی، افشاری اور قاجاز بادشاہوں نے جہاں قیمتی کاشی کاری کی طرف خاص توجہ دی، اسی طرح عمارت کے نمایاں حصوں پر سونے کا پانی چڑھایا۔ میناروں، گنبدوں، دروازوں اور ایوانوں پر سیکڑوں سیر سونے کے پترے اور اینٹیں لگوا دیں۔

۱۲۱۱ھ میں محمد شاہ قاجار نے دونوں بڑے بڑے گنبدوں کو از اول تا آخر سونے کے پتروں سے مطلا کرکے عمارت کی نئی شان اجاگر کی، ان گنبدوں کی کرسی پر طلائی حرفوں میں آیات، احادیث، سلام، اشعار اور تاریخ بڑی خوبصورتی سے تحریر ہے۔ محمد شاہ نے اندرون ایوان کے خشتی فرش کی جگہ سنگ مرمر کی سلیں لگائیں اور دیواروں کے زیریں حصوں پر بھی مرمر کی موٹی موٹی سلیں چاروں طرف لگوائیں۔ صحن کا جنوب مغربی حصہ کچھ تنگ تھا، اس نے ملحقہ مکان بڑی بڑی قیمتیں ادا کرکے خریدے اور صحن کو وسعت دی۔ فرش کی مزید مرمت و اضافہ ۱۲۸۰ھ میں ناصرالدین شاہ قاجار نے کرایا۔ اس کے فوراً بعد والیِ بغداد مدحت پاشا نے اندرونی حصے میں طلا کاری کروائی۔ پھر کچھ رؤسا و تجار نے سونے کے پترے چڑھائے۔

ایوان طلا : ۱۲۸۵ھ میں ناصرالدین شاہ قاجار نے برآمدے کے اندر ایوان کے داخلے والے در قبلہ کے بیرونی حصے پر بہت اونچا اور چوڑا در بنوایا اور اس کے اندر اور باہر نصف بالائی حصے اور روکار اور اندرونی دروازے کے بالائی حصے پر سونے کا نفیس پانی چڑھوایا۔ ایوان طلائی، دونوں گنبدوں چاروں میناروں اور دو ساعتی میناروں کی گمزیان دن کی دھوپ اور رات کو بجلی کی روشنی میں چکا چوند پیدا کرتی ہیں اور عجب نظر افروز جلوے پھیلاتی ہیں۔ یوں تو نجف، کربلا اور مشہد ہر جگہ گنبد و مینار اور طلائی ایوان ہیں مگر طلا کاری کا جو منظر کاظمین میں ہے وہ کہیں نہیں۔

آئینہ کاری : گزشتہ صدیوں میں کاظمین کے سقف اور در و دیوار پر مقرلس کاری، رنگا رنگی اور آئینہ بندی تھی، مگر آئینے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ہندسی ترکیبوں سے شہد کے چھتّوں کے مانند بناوٹ اور عجیب قسم کی سجاوٹ سے چسپاں کرنے کی صنعت نے ایوان، سقف اور در و بام کو نئی آب و تاب بخشی ہے۔ ۱۲۳۱ھ میں فتح علی شاہ قاجار نے شاہ اسمٰعیل صفوی کی کاشی کاری کے بجائے بڑے پیمانے پر اندرون ایوان اور بالائی حصوں کو آئینہ کاری سے مزین کیا۔ ۱۲۸۰ھ میں ناصرالدین شاہ قاجار نے اور زیادہ آئینہ کاری کرائی۔ پھر فرہاد میرزا اور دوسرے مخیر عقیدت مندوں نے اس میں اضافے کیے اور اس وقت ایوان میں جب قمقمے، ٹیوب اور مرکری بلب روشن ہوتے ہیں اور جھاڑ فانوسوں کے رنگین فانوس چمک کر ان آئینوں میں عکس ڈالتے ہیں تو فضا میں ستارے ہی ستارے دکھائی دیتے ہیں اور بام و در چاندی، سونے اور رنگین روغنی اینٹوں سے آب و تاب پیدا کرتے ہیں۔

کاظمین کی موجودہ تعمیر : ۱۲۹۸ھ میں، اعتماد الدولہ فرہاد میرزا ابن عباس میرزا (م ۱۳۰۵ھ)

نے بڑے جذب و شوق سے عمارت کا نیا نقشہ بنوایا ، بوسیدہ عمارتوں کو گرا کر نئی بنیادوں کو استوار کیا، پختہ تعمیرات کو کاشی، آئینہ، سونا، چاندی، آیات و احادیث و اشعار سے مزین کیا، پانچ سال تک شہزادہ دن رات کام کی نگرانی میں مصروف رہا ۔ یہ پوری عمارت اب تک نئی نئی تعمیر نظر آتی ہے ۔ یہ تعمیر نجف و کربلا و مشہد اور دوسرے عتبات عالیات کے بعد ہوئی تھی اس لیے اس کا صحن و ایوان، غلام گردش اور دالان، برآمدے اور رواق، حرم اور مزار سب سے زیادہ کشادہ، روشن، وسیع اور ھندسی ھیں ۔

کم و بیش میل دو میل سے چاروں مینار اور ان کے وسط میں متناسب گول لمبی گردنی بلندی کے یکساں دو پیازی گنبد ان پر بڑے بڑے کاس نظر آتے ھیں ۔ شارع کاظمین ایک گول باغیچے پر ختم ہوتی ہے، سامنے باب القبلہ جس کے منقش چوبی دروازے کی چوکھٹ بازو، بالائی محراب و در اور اوپر مربع مینار پر چار رخوں والی گھڑی، اس کے اوپر چھوٹی سی طلائی گول گمزی اور کلغی ہے ۔ دروازے پر آئیے تو سامنے صحن، ایوان طلا، رواق کا بھاری بھر کم سنہری روپہلی دروازہ اور اندرونی ایوان کے وسط میں بڑی سی جالی دار چاندی سونے کی ضریح ہے ۔

تازہ ترین صورت حال : راقم مقالہ نے ۱۹۶۹ء میں کاظمین کی زیارت کی ۔ اس عمارت کی قدیم تصویر تاریخ آل امجاد میں اور نئی تصویریں متعدد کتابوں اور اخباروں میں دیکھی تھیں، خود تاریخ کاظمین کے مطالعے سے عمارت کا نقشہ ذہن میں پہلے سے موجود تھا، مگر کاظمین پہنچ کر محسوس ہوا کہ یہ عمارت جو انجنیئرنگ، جمالیات، تعمیر و تزئین کے لحاظ سے بہت عمدہ عمارت ہے، اب خاصی بدل چکی ہے ۔ اب شہر کاظمین کی شہر پناہ غائب ہو چکی ہے ۔ بلند و بالا جدید طرز کی عمارتوں کا سلسلہ بغداد و دجلہ سے جا ملا ہے اور شہر کے تقریباً وسط میں روضۂ مبارک ہے، صدیوں کی شکست و ریخت نے شہر کی آبادی اور سڑکیں بلند کر دی ھیں، لیکن روضہ کی خوشنما بلند اور چمک دار دیواریں، دیواروں کے بالائی حاشیے اور آٹھ دروازوں کی قوسوں اور پیشانیوں کے نفیس کتبے اور نصراللہ المشہدی کی خطاطی ۱۲۹۸ اور ۱۳۰۱ھ کے فن کی نشان دہی کرتے ھیں ۔ جن سے عمارت کا جلال و جمال نمایاں ہے ۔

دروازے : طویل و عریض روضے کے بیرونی حصے کی چار دیواری آٹھ دروازوں کے ذریعے صحن میں راستہ دیتی ہے ۔

۱۔ باب القبلہ، ایوان طلا کے بالمقابل ہے، عموماً زائرین اسی دروازے سے صحن میں داخل ہوتے ھیں ۔ اس دروازے کے اوپر چوکور مینار پر چو رخی گھڑی ہے ۔ گھڑی کے اوپر مخروطی مینار ، گمزی اور کاس پر ختم ہوتا ہے اس پر سونا چڑھا ہوا ہے ۔

۲۔ باب المراد، مشرق میں واقع ہے، اس پر بھی باب القبلہ کی طرح مینار الساعۃ بنا ہے ۔ یہ بھی طلا پوش ہے ۔ یہ دروازہ بہت قدیم راستہ ہے ۔

۳۔ باب صاحب الزمان، غربی سمت میں ہے ۔

۴۔ باب فرہاد، حاجی فرہاد میرزا کا بنا کردہ دروازہ شرقی شمالی سمت میں ہے۔

۵۔ باب قاضی الحاجات ، شمالی مشرق سمت میں ہے ۔

۶۔ باب قریش، شمالی غربی سمت میں ہے ۔

۷۔ باب صافی، غربی و جنوبی سمت کی حد پر واقع ہے ۔

۸۔ باب جدید، جنوب مشرقی سمت میں ہے ۔ یہ دروازہ آیۃ اللہ ہبۃ الدین شہرستانی نے ۱۳۵۹ھ میں تعمیر کروایا تھا، اس میں داخل ہو کر بائیں طرف کے بڑے حجرے میں مکتبۃ الجوادین یا کتب خانۂ شہرستانی ہے ۔

دروازوں سے صحن میں آتے ھیں ۔ بیرونی دیوار

کے اندرونی حصے میں حجروں کی خوبصورت قطار ہے، یہ بڑے بڑے حجرے اور ہر حجرے کے سامنے چبوترے اور در بنے ہیں۔ حجروں کے اندر امرا و علما کی قبریں ہیں۔ قالین و آلات زیبائش سے آراستہ کمروں میں سے باب المراد کے شمالی حجرے میں فرہاد میرزا کی قبر ہے، یہ حجرے پورے دروں کے ستر اور نیم دروں کے سولہ ہیں۔

صحن میں تین طرف تعمیرات و بیوتات ہے، شمالی سمت میں مسجد جامع صفوی اور جنوب مشرق میں مقبرۂ امام زادگان ابراہیم و موسیٰ ہے۔ جس کی تعمیر عثمانی وضع کی ہے۔

صحن شمالاً جنوباً طول میں ۱۳۵ میٹر اور عرض میں ۱۳۰ میٹر ہے (تاریخ کاظمین، ص ۱۲۹)۔ چار دیواری سمیت پورا رقبہ تقریباً چھبیس ہزار میٹر ہے۔

صحن کے تقریباً وسط میں عمارتِ روضہ ہے جس کے سامنے کے تین رخوں پر بلند ستونوں اور پہلو کے نسبۃً چھوٹے ستونوں پر برآمدے ہیں، ایک جنوب میں، ایک مشرق میں اور ایک مغرب میں۔ ہر برآمدے کے وسطی حصے کے دونوں طرف "کفش کنی" کے کھلے مسقف کمرے ہیں۔ ہزاروں زائر یہاں جوتے اتارتے ہیں اور خدام انتہائی چابک دستی سے ایک لکڑی کی مدد سے انہیں اٹھا کر دیواری خولوں میں رکھ کر ایک نمبر آنے والوں کو دیتے ہیں۔ کتنا ہی بڑا مجمع اور کیسے ہی اجنبی آدمی ہوں جوتا ہمیشہ اصل آدمی کو واپس ملے گا۔ کفش کنی سے مسقف برآمدے میں آتے ہیں، یہاں قالین کا فرش ہے اور سامنے دروازۂ رواق باب قبلہ کی محراب و دیوار پر سونا چڑھا ہے۔ دوسرے دروازوں پر آئینہ کاری، کاشی کاری، نقش اور کتبے ہیں۔ ہر دروازہ چاندی کا ہے۔ دروازے کے دونوں پہلووں میں بڑے فریموں میں "دعاے اذن" لکھی ہے اسے پڑھ کر رواق میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ رواق کشادہ ہیں اور جھاڑ فانوس، آئینہ کاری، کتبات، پنکھوں اور ٹیوبوں سے آراستہ ہیں۔

اہم قبریں: مغربی رواق میں پائے مزار کی طرف شیخ العلامہ ابوالقاسم جعفر بن محمد بن قولویہ (م ۳۶۹ھ) کی قبر ہے جسے ایک محراب اور سامنے پیتل کے جنگلے اور کتبے سے ممتاز کیا گیا ہے۔ ابن قولویہ کامل الزیارات کے مؤلف اور شیخ مفید کے استاد تھے۔

دوسری قبر جو اسی سے متصل ہے اور کتبے اور جنگلے سے مزین ہے،اس کے احاطے میں شیخ المفید، محمد بن محمد بن نعمان تلعکبری البغدادی (م ۴۱۳ھ) مؤلف الارشاد وغیرہ محو خواب ہیں۔ تیسری اہم قبر، خواجہ نصیر الدین محمد بن حسن الطوسی (م ۶۷۲ھ) کی ہے جو وسیع محراب، بڑے برنجی جنگلے اور بڑے کتبے سے آراستہ ہے۔

رواق سے ہو کر ایوان خاص جاتے ہیں، اس کے دروازے بھی نقرئی ہیں اور ایرانی کاریگروں کی صنعت کے عمدہ نمونے ہیں۔ اس کے پہلووں میں بھی فریموں کے اندر زیارت امامین عربی و مروی طریقے پر لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر اندر جاتے ہیں۔ اندر نقرئی ضریح اور اس کے ارد گرد قیمتی قالینوں کا فرش ہے۔ موٹے موٹے ستونوں پر قالب دار مقرنس چھت ہے جس کے قالب میں آئینہ کاری و طلا کاری اور نفیس کتبات ہیں، اسماے حسنٰی الٰہیہ، اسماے رسول و ائمہ، آیات و احادیث، طغرے اور تاریخیں ہیں، جن جس میں قدیم تاریخ ۹۲۶ھ ہے۔ چھت میں بھاری اور بڑے بڑے جھاڑ ہیں، وسط میں زردوز شامیانہ، اس کے نیچے مخملی چھت کی مستطیل وزنی، شاندار اور نقرئی ضریح ہے، جس کے بالائی حاشیے پر عربی اشعار تحریر ہیں۔ پھر محرابیں اوز جالی ہے۔ اندر جانے کا ایک دروازہ ہے جس میں قفل لگا ہے، یہاں ایک خادم ہر وقت موجود رہتا ہے۔ ضریح پر سنہری کنگرے اور بیل بوٹے، ستون اور حاشیے فنی نفاستوں کے آئینہ دار ہیں۔ ضریح کے چاروں طرف زیارت پڑھنے اور دعائیں کرنے والوں کا ہر وقت مجمع رہتا ہے۔ ارد گرد

کے کشادہ پہلوؤں میں نماز، تلاوت قرآن، دعا کی گونج اور صلوٰۃ کی صداؤں سے ایوان گونجتا رہتا ہے ۔ یہاں دو اماموں کی قبریں ہیں اس لیے دو زیارتیں پڑھی جاتی ہیں (رک بہ مفاتیح الجنان و زاد المعاد وغیرہ) نماز کے حرم میں اذان دی جاتی ہے پانچوں وقت ہزاروں نمازی نماز با جماعت ادا کرتے ہیں ۔ امامت کے فرائض شہر کے نامور اور مقدس علما ادا کرتے ہیں ۔

تولیت : اوقاف و مشہد کی تولیت عظمٰی خانۂ کعبہ کے ہزار برس پرانے کلید بردار خاندان بنی شیبہ کی ایک شاخ "البوشیخ" کے ذمے ہے؛ یہ حجازی خاندان تقریباً چار سو برس سے کاظمین کا متولی ہے دیکھیے (مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم، ج ۲، ص ۳۸۶) ۔

دکن، دہلی، اودھ، لاہور کے سلاطین اور امرا و نوابین نے اس کی مرمت و تزئین وغیرہ میں بڑی بڑی خدمات انجام دیں ۔ کاظمین کی عمارت کے علاوہ وہاں مدارس، کتب خانے اور علما کے مقبرے بہت ہیں۔

مآخذ : (۱) میرزا عباس قمی: تاریخ کاظمین و بغداد، ۱۳۲۷ ش؛ (۲) عمادالدین حسین اصفہانی : مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم ، ج ۲ ، طہران ۱۳۳۳ ش ؛ (۳) محمد حسن مصطفٰی : مدینۃ الحسین ، طہران ۱۳۶۸ھ ؛ (۴) محمد عباس شروانی : تاریخ آل امجاد، دہلی ۱۳۱۲ھ؛ (۵) علامۂ مجلسی : تحفۃ الزائر ، تبریز؛ (۶) غلام علی احسن : رہبر زائران، آگرہ، ۱۳۵۳ھ؛ (۷) محمد ہاشم خراسانی : منتخب التواریخ، طہران ۱۳۴۷ھ ؛ (۸) مرتضٰی حسین فاضل : سفرنامۂ حج و زیارات ، خطی ۱۳۹۱ھ؛ (۹) شیخ عباس قمی : مفاتیح الجنان ، طہران ۱۳۲۹ھ ۔

(سید مرتضٰی حسین فاضل)

* **کاغَذ :** کاغِد (فارسی لفظ کاغذ سے ماخوذ، شاید اصل کے اعتبار سے چینی) اسلامی ثقافت کے ارتقا کے زمانۂ آغاز میں اہل مشرق کے پاس صرف قرطاس (اوراق بردی، Papyrus) ہی ایک ایسی چیز تھی جس پر لکھا جا سکے، تالاس کے قریب اطلخ کی لڑائی میں چین کے جو جنگی قیدی اسیر بنا کر سمرقند لائے گئے تھے، پہلے پہل انھوں نے ۱۳۴ھ/۷۵۱ء میں چین میں مروجہ طریقے کے مطابق کتان اور سن کے چیتھڑوں اور ریشوں سے کاغذ بنانے کی صنعت رائج کی ۔ اس زمانے میں کاغذ کی جو مختلف قسمیں تیار کی جاتی تویں، وہ حسب ذیل ہیں ۱۔ فرعونی : تہ وہ قسم تھی جو قرطاس (Papyrus) سے اس کے اپنے ملک (مصر) میں مقابلہ کرتی تھی ۔ عربی تحریر کا سب سے پرانا کاغذ جو مصر میں دستیاب ہوا ہے، ۱۸۰ھ تا ۲۰۰ھ/۷۹۶ء تا ۸۱۵ء ہے؛ سلیمانی سلیمان بن رشید کے نام سے موسوم ہے جو ھارون الرشید کے عہد میں خراسان کا خازن تھا؛ جعفری : جعفر البرمکی کے نام سے مشہور ہے؛ طلحی، طاہریہ خاندان کے دوسرے فرمانروا طلحہ بن طاہر کے نام پر مشہور ہے ؛ طاہری، اسی خاندان کے بادشاہ طاہر دوم کے نام پر، نوحی : اس میں سامانی بادشاہ نوح اول کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے ۔

سمرقند کے کارخانوں کے نمونے پر دوسرے مقامات پر بھی کاغذ بنانے کے کارخانے قائم ہوئے ۔ جعفر البرمکی کے بھائی الفضل نے جو ۱۷۸ھ/۷۹۴ء میں خراسان کا عامل تھا، غالباً بغداد کے محلے دار القز میں کاغذ کا کارخانہ قائم کیا ۔ تھوڑے ہی عرصے میں تہامہ، یمن اور مصر میں کارخانے بن گئے جہاں کاغذ نے آخر کار قرطاس (اوراق بردی Papyrus) کا استعمال ختم کر دیا ۔ اسی طرح دمشق، طرابلس، حما، منبج، طبریہ، المغرب، ہسپانیا، (بمقام شاطبہ Xatiua)، ایران اور ہندوستان میں بھی کاغذ بننے لگا ۔ آذربیجان میں زنجان سے دو دن کی مسافت پر خونج یا خونا کے باشندوں نے اس وجہ سے کاغذ کنان کا نام اختیار کر لیا تھا کہ وہاں بہترین کاغذ تیار ہوتا تھا ۔ مغلوں نے یہ مقام بالکل تباہ کر دیا تاہم انھوں نے وہاں ایک نو آبادی مغلیہ کے نام سے قائم کی (*Perse* : Barbier de Meynard *Dict. de la Perse* ، ص ۲۱۹ ؛ (۲) حاجی خلیفہ :

جہان نما، قسطنطینیہ ۱۱۴۵ھ، ص ۲۹۸، و مترجمۂ Norberg، ۱ : ۳۶۵).

کاغذ بنانے اور اسے رنگنے کے مختلف طریقوں کے متعلق J. V. Karabaček نے *Neue Quellen z. Papiergeschichte* میں بڑی دلچسپ تفصیلات دی ہیں، (در *Mitt. aus der Samml. der Papyrus Erzh. Rainer*، ۴ : ۷۵ ببعد).

المَقْریزی (الخطط، طبع Wiet، ۲ : ۳۴) کے ایک بیان کے مطابق جعفر البرمکی نے سرکاری دفاتر میں رَق (parchment) کی جگہ کاغذ کو رائج کیا.

[جنگ عظیم سے قبل] مشرق ممالک میں جو کاغذ استعمال ہوتا تھا وہ تقریباً سارے کا سارا یورپ سے بن کر آتا تھا، [لیکن اب ان ممالک میں کاغذ کے کارخانے قائم ہو گئے ہیں] - ایران میں ایک چینی کاغذ بہت تھوڑی مقدار میں ملتا تھا جسے خان بالیق (پیکنگ کا ترکی نام) کہتے تھے - دیرپا ہونے کی وجہ سے اس کی بڑی مانگ رہتی تھی - قاہرہ کے مطابع زرد رنگ کا ایک مضبوط کاغذ "نباتی" پسند کرتے ہیں (فارسی نبات : مصری).

قسطنطینیہ میں "آبہای شیرین یوروپ" (The Sweet Waters of Europe) کی عام سیر گاہ اور شاہی کوشک کاغذ کے ایک کارخانے (کاغذ خانہ، عوامی تلفظ کت خانہ) کے نام سے منسوب ہے جو مدت گزری تباہ ہوچکا ہے.

مآخذ : (۱) الفہرست، طبع Flügel، ص ۲۱؛ (۲) القلقشندی : ضوء الصبح، ۱ : ۱۲۴؛ (۳) وہی مصنف : صبح الاعشی، ۱ : ۴۷۴، ۴۷۶؛ (۴) Karabacek : *Mitt. aus der Samml. der Papyrus Erzh. Rainer*، ۲/۳ : ۸۷ تا ۱۷۸؛ (۵) Chavannes : *Doc. sur les Tou-Kiue Occidentaux*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۲۹۷؛ (۶) Cl. Huart : *Les calligraphes et les miniaturistes de l'orient musulman*، ص ۸ تا ۱۱؛ (۷) J. E. Polak : *Persien*، لائپزگ ۱۸۶۵ء، ۱ : ۲۶۸؛ (۸) Jouannin و Van Gaver : *Turquie*، ص ۳۵۷؛ (۹) d' Ohsson : *Tableau de l'empire othoman*، ۳ : ۱۵۵.

(Cl. Huart)

* **الکاف :** (al-kef)، تونس کا ایک شہر۔ یہ تونس سے ۱۱۰ میل جنوب مغرب میں اور الجیریا کی سرحد سے تقریباً ۲۰ میل کے فاصلے پر ۳۶ درجے ۱۱ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۸ درجے ۴۰ دقیقے طول بلد مشرق میں واقع ہے.

مآخذ : (۱) کتاب الاستبصار، طبع von Kremer، وی انا ۱۸۵۲ء، ص ۵۱ تا ۵۲ و مترجمۂ Fagnan : *L 'Afrique Septentrionale*، قسطنطینیہ، ص ۹۴ تا ۹۵؛ (۲) *Récit d'un voyage de Tunis au Kef exécuté en 1744*، طبع G. Dupont؛ (۳) Peyssonnel و Desfontaines : *Voyages dans les Régences de Tunis et d'Alger*، طبع Dureau de la Malle، پیرس ۱۸۳۸ء؛ (۴) Berbrügger : *Itinéraires archéologiques en Tunisie*، در *Rev. Afr.* ۱۸۵۷ء؛ (۵) Guérin : *Voyage archéol. dans la Régence de Tunis*، پیرس ۱۸۶۲ء، ۲ : ۵۳ تا ۶۷؛ (۶) G. Musset : *Reveue de l'Afrique française*، ۱۸۸۸ء؛ (۷) A. de la Beıve : *En Tunisie*، پیرس ۱۸۸۱ء، ص ۱۴ تا ۴۴؛ (۸) Espérandieu : *Etude sur le Kef*، پیرس ۱۸۸۹ء؛ (۹) Cagnat و Saladin : *Voyage en Tunisie*، پیرس ۱۸۹۴ء؛ (۱۰) C. Monchi-court : *La Région du Haut-Tell en Tunisie*، پیرس ۱۹۱۳ء؛ نیز دیکھیے مآخذ مقالۂ تونس.

(G. Yver [تلخیص از ادارہ])

⊗ **کافر :** (ع؛ جمع: کُفّار)؛ اس کا مادہ ک ف ر ہے، جس کے لفظی معنی ہیں چھپانا، ڈھانکنا۔ اسی لیے لغت میں لفظ "کافر" کا اطلاق رات، سمندر، عظیم وادی، بڑے دریا، سیاہ بادل اور زرہ کے لیے بھی ہوتا ہے (الفیروز آبادی: القاموس المحیط، قاہرہ ۱۳۵۷ھ، ۲ : ۱۲۸، بذیل مادۂ کفر) - اسی طرح کاشتکار کو بھی لغت میں "کافر" کہہ دیتے ہیں، کیونکہ وہ دانہ زمین میں

چھپاتا ہے، بلکہ آیت قرآنی اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ (۵۷ [الحدید] : ۲۰) کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اس آیت میں کفار سے مراد کاشتکار ہیں ۔ اسی مناسبت سے کَفُور اور کُفْران کے معنی نا شکری کرنے کے ہیں اور قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہی معنی مراد ہیں (مثلا ۱۱ [ھود] : ۹ ؛ ۲۲ [الحج] : ۶۶ ؛ ۷۶ [الدھر] : ۳، ۲۴ وغیرہ) ۔ پھر کفر کا زیادہ تر استعمال دین حق کے بجائے کسی اور دین کا پیرو ہونے کے لیے ہونے لگا اور کافر کا لفظ "غیر مسلم" کا مرادف ہو گیا؛ چنانچہ قرآن مجید کی اکثر آیات میں یہی معنی مراد ہیں ۔

"کفر" کی جو اصطلاحی تعریف علماے فقہ و کلام میں مشہور اور متفق علیہ ہے وہ یہ ہے : ھو جَحْدُ کُلِّ ماثَبَتَ عَنِ النَّبی صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم ادّعاؤہٗ ضَرُورَۃً (ابن الہمام : المسایرہ، دیوبند ۱۳۷۷ھ ص ۱۴۹، ۱۵۰) ۔ یہی تعریف معمولی لفظی فرق سے ابن نجیم کی البحر الرائق (مطبوعۂ قاہرہ، ۵ : ۱۲۹) میں بھی موجود ہے، یعنی کسی بھی ایسی چیز کا انکار کفر ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلّی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلّم سے بداھۃً یہ ثابت ہو کہ آپؐ نے اس کا دعوٰی فرمایا تھا، مثلاً توحید، آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی رسالت، آپؐ پر سلسلۂ نبوت کا ختم ہو جانا، آخرت کی زندگی، پانچوں نمازوں، زکٰوۃ، حج اور رمضان کے روزوں کی فرضیت، شراب اور زنا کی حرمت وغیرہ ۔ یہ سب چیزیں آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم سے یقینی اور بدیہی طور پر ثابت ہیں ۔ اس قسم کی جس چیز کا بھی انکار کیا جائے وہ کفر ہے اور ایسا انکار کرنے والے کو کافر کہتے ہیں ۔

جمہور اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ اصولاً "کفر" کا تعلق اعتقاد سے ہے ۔ اگر ایک شخص عمل میں کمزور ہو، مگر اسلام کے اساسی عقائد پر ایمان رکھتا ہو تو وہ کافر نہیں ہوگا ۔ اسے بے عمل، فاسق، فاجر اور اسی طرح کے کسی اور لفظ سے یاد کیا جائے گا ۔ انکار (عقیدہ) سے کفر لازم آتا ہے ۔ سستی عمل یا کسی بد عملی یا گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا، ہاں فاسق [رک بآں] ہو جاتا ہے (ابو منصور الماتریدی : شرح الفقہ الاکبر، ص ۴۰ ؛ حیدر آباد، دکن ۱۳۲۱ھ) ۔ [یہ اس لیے ہے کہ انکار کے بعد نیک عمل کا سوال ھی پیدا نہیں ہوتا، لیکن انکار نہ کرنے کی صورت میں نیک عمل کی توقع رکھی جا سکتی ہے] ۔ بایں ہمہ یہ مد نظر رہے کہ اس نقطۂ نظر کے سلسلے میں جمہور امت کے خلاف بعض قدیم فرقوں نے اس سے اختلاف کر کے افراط یا تفریط کا راستہ اختیار کیا ہے ؛ چنانچہ فرقۂ کرّامیہ کا کہنا یہ تھا کہ ایمان صرف شہادتَین کے زبانی اقرار کا نام ہے، لہٰذا جو شخص زبان سے صرف یہ اقرار کر لے [شہادتَین کے ذریعے] وہ کفر سے محفوظ ہے، خواہ اس کا قلبی اعتقاد اور عملی زندگی اس کے اقرار کے خلاف ہو (الفرہاریؒ : النبراس علی شرح العقائد، ملتان ۱۳۱۸ھ، ص ۳۹۹) ۔ دوسری طرف بعض خوارج کا کہنا یہ تھا کہ ہر طاعت جزو ایمان ہے، خواہ فرض ہو یا نفل، لہٰذا ایک طاعت کو چھوڑ دینے سے بھی انسان کافر ہو جاتا ہے، لیکن اکثر خوارج گناہ صغیرہ کے بجائے صرف گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر کفر کا اطلاق کرتے تھے (الآلوسی : روح المعانی، مطبوعۂ لاہور، ۱ : ۱۱۱) ۔ معتزلہ میں سے عبدالجبار اور ابوالہذیل وغیرہ کی طرف منسوب ہے کہ وہ کسی بھی فرض یا مستحب کے ترک یا گناہ صغیرہ تک کے ارتکاب کی بنا پر انسان کو ایمان سے خارج قرار دے دیتے تھے، اگرچہ ان کے نزدیک وہ کفر میں داخل نہیں ہوتا تھا ؛ البتہ اکثر معتزلہ کے نزدیک کسی نفلی عبادت کے ترک یا گناہ صغیرہ کے ارتکاب سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا ؛ ہاں اگر کوئی فریضہ چھوڑ دے یا کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر لے تو اس سے وہ ان کے نزدیک ایمان اور کفر کے درمیان معلق ہو جاتا ہے، یوں کہ نہ اسے مومن کہا جا سکتا ہے نہ کافر ۔ اس نظریے کو

منزلۃ بین المنزلتین کا عقیدہ کہتے ہیں (اس بحث کی تفصیلات کے لیے دیکھیے العینی: عمدۃ القاری، استانبول ۱۳۰۸ھ، ۱: ۱۲۱، ۱۲۲ ببعد؛ نیز فخر الدین الرازی: التفسیر الکبیر، مطبوعۂ قاہرہ، ۱: ۱۶۳ ببعد).

قرآن مجید میں کفار کے چھے گروہوں کا بطور خاص ذکر آیا ہے: (۱) مشرکین مکّہ، جو بت پرست تھے؛ مثلاً قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (۱۰۹ [الکٰفرون]: ۱) میں یہی گروہ براہ راست مخاطب ہے؛ (۲) نصرانی یا عیسائی (تثلیث پرست)؛ چنانچہ ارشاد ہے: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (۵ [المائدة]: ۷۳)=وہ لوگ کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے؛ (۳) یہودی، [حضرت عزیر[ع] کو ابن اللہ کہنے والے]۔ قرآن مجید (۵ [النسآء]: ۱۵۵، ۱۵۶) میں ان پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے؛ (۴) صابی (۲ [البقرة]: ۶۲؛ ۵ [المائدة]: ۶۹؛ ۲۲ [الحج]: ۱۷)، یعنی ستارہ پرست (ابن کثیر: التفسیر، قاہرہ ۱۳۵۶ھ، ۱: ۱۰۴)؛ (۵) مجوسی، یعنی آتش پرست (۲۲ [الحج]: ۱۷)؛ (۶) منافقین، یعنی وہ لوگ جو زبان سے اپنے آپ کو مؤمن کہتے، لیکن دل سے کافر تھے (۶۳ [المنٰفقون]: ۱).

قرآن مجید نے بتایا ہے کہ تمام کافروں کا انجام آخرت میں جہنم ہے (۲ [البقرة]: ۴۲؛ ۳ [اٰل عمرٰن]: ۱۰ وغیرہ)، البتہ دنیوی احکام کے لحاظ سے کافروں کی متعدد قسمیں ہیں:

(۱) ذمّی [رک بہ ذمّہ]: ان کافروں کو کہتے ہیں جو کسی اسلامی حکومت میں حکومت کی اجازت سے مقیم ہوں۔ ان سے ایک معمولی ٹیکس (جزیہ) وصول کیا جاتا ہے اور ان کی جان، مال اور آبرو مسلمانوں کی طرح محفوظ ہوتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے تو (حنفی مسلک کے مطابق) اس سے قصاص لیا جائے گا اور اس کے مال اور آبرو کی حفاظت سے متعلق بھی جملہ قوانین وہی ہیں جو مسلمانوں سے متعلق ہیں (ابن نجیم: البحرالرائق، مطبوعۂ قاہرہ، ۵: ۱۸۱؛ [نیز ابن القیم: احکام اھل الذمۃ]).

(۲) کافر مستأمن: اس کافر کو کہتے ہیں جو اسلامی مملکت میں حکومت سے اجازت لے کر زیادہ سے زیادہ ایک سال کے لیے آیا ہو۔ اس مدت میں اس سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا اور اکثر احکام میں ایسا شخص بھی ذمّی ہی کی طرح ہوگا؛ مسلمانوں کے لیے اس کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت واجب ہے (الشّامی[رح]: ردّ المحتار، مطبوعۂ استانبول، ۳: ۴۴۳).

(۳) کافر حربی: وہ کافر ہے جو کسی [غیر معاہد] غیر مسلم حکومت کا باشندہ ہو۔ اگر اس غیر مسلم حکومت سے صلح کا کوئی معاہدہ ہے تو اس معاہدے کی شرائط کے مطابق عمل ہوگا اور اگر کوئی معاہدہ نہیں ہے تو ایسے کافروں کے جان و مال کی کوئی ذمے داری مسلمانوں پر نہیں ہے؛ ہاں مسلمانوں کے لیے ان سے غدر و خیانت اور دھوکا فریب جائز نہیں (ابن نجیم: البحرالرائق، ۵: ۱۰۷)؛ نیز حالت جنگ میں بھی غیر محارب عورتوں، بچوں، بوڑھوں، اپاھجوں، پاگلوں اور راہبوں کا قتل کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح جو لوگ دوران جنگ میں اسیر ہو کر آئے ہوں ان کا مُثلہ کرنا (کسی عضو کو کاٹ ڈالنا) یا انھیں آگ میں جلانا جائز نہیں (الشّامی: ردّ المحتار، ۳: ۳۰۹).

(۴) مُرتد [رک بآں]: وہ شخص ہے جو پہلے مسلمان ہو، پھر کافر ہو گیا ہو۔ دارالاسلام میں رہتے ہوئے ایسا کرنا بنصّ حدیث سزاے قتل کا مستوجب ہے (البخاری، کتاب استتابۃ المرتدین، دہلی ۱۳۵۷ھ، ۲: ۱۰۲۳)؛ لیکن اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسے دوبارہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے گی اور اگر اس کے دل میں کچھ اعتراضات و شبہات پیدا ہو گئے ہوں تو انھیں دور کیا جائے گا۔ اگر وہ پھر بھی اسلام نہ لائے تو تین دن تک اسے قید میں رکھ کر مہلت دی جائے گی؛ اس کے بعد قتل کر دیا جائے گا (ابن نجیم:

البحرالرائق، ۵ : ۱۳۵)۔ [دور جدید کے بعض مبصرین کی رائے یہ ہے کہ قتل مرتد کا حکم قرآن مجید میں موجود نہیں اور ایسا کرنا نص لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ (۲ [البقرة] : ۲۵۶) کے منافی سمجھتے ہیں، لیکن علما کی غالب اکثریت قتل مرتد کی قائل ہے] .

(۵) زِنْدیق : اس کافر کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی نبوت کا اعتراف کرتا ہو، لیکن اس کے دوسرے عقائد کافرانہ ہوں (التہانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، ۱۸۶۱ء، ۳ : ۱۲۵۲) .

جہاں تک کافروں کے ساتھ معاشرتی تعلقات کا معاملہ ہے، اس کے بارے میں قرآن مجید، حدیث اور فقہ میں وسیع احکام ملتے ہیں، مثلاً کافروں کے معبودوں کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے (۶ [الانعام] : ۱۰۸) اور کافر پر ظلم کر کے اس کی بد دعا لینے سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے (احمد بن حنبل: المسند، مطبوعۂ بیروت، ۳ : ۱۵۳)۔ اس بات پر تقریبًا اتفاق ہے کہ کافر کا بدن محض کفر کی وجہ سے ناپاک نہیں ہوتا؛ لہٰذا اس سے مصافحہ وغیرہ نہ کرنا محض شدت ہے، جس کے لیے کوئی سند نہیں(قاضی ثنا اللہ : تفسیر مظہری، دہلی ۱۳۸۰ھ، ۴: ۱۷۶)۔ [غیر مسلموں کے ساتھ معاشرتی سطح پر رواداری اور حسن معاملت کی تاکید ہے (البابرتی : العنایة مع فتح القدیر، مطبوعۂ قاہرہ، ۱ : ۵۷؛ ابن رشد: بدایة المجتہد، قاہرہ ۱۳۷۹ھ، ۱ : ۲۸)] ۔ اگر کافروں کے برتنوں کے بارے میں یہ علم نہ ہو کہ وہ پاک ہیں یا ناپاک، تو [بغرض احتیاط طہارت] انھیں دھوئے بغیر کھانے پینے میں استعمال کرنا پسندیدہ نہیں؛ [یہ حکم عام ہے ۔ خود مسلمانوں میں سے فساق و فجار کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے]، لیکن اگر کوئی [یہ سمجھ کر کہ یہ پاک ہیں] استعمال کر لے تو جائز ہے ۔ اسی طرح ان کی بیمار پرسی کرنا، ان کی دعوت کرنا اور دعوت قبول کرنا، ان کو ہدیہ دینا یا ان کا ہدیہ قبول کرنا، اگر کسی دینی مصلحت کے خلاف نہ ہو تو جائز ہے۔ کسی یہودی یا مجوسی کو "اے کافر" کہ کر پکارنا بھی مناسب نہیں، کیونکہ یہ اس کو گراں گزرے گا اور یہ دل آزاری ناجائز ہے؛ لیکن کافر کو "السَّلامُ عَلَيْكُم" کہنا یا لکھنا درست نہیں [کیونکہ السلام علیکم شعائر اسلام میں سے ہے اور اس سے ملت کی انفرادیت متعین ہوتی ہے] ۔ اس کے بجائے السلام علٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى لکھنا چاہیے (یہ اور اس جیسے بہت سے احکام فتاوٰی عالمگیری، بولاق ۔ قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۵ : ۳۴۶ تا ۳۴۸ میں مذکور ہیں) .

[اسی معاشرتی انفرادیت اور تشخص کی خاطر] اہل کتاب کے سوا غیر مسلموں سے نہ شادی بیاہ کا تعلق قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے، لیکن ذبیحہ کے سوا ان کے ہاتھوں کے تیار کیے ہوے دوسرے کھانے مسلمانوں کے لیے جائز ہیں، بشرطیکہ ان میں کوئی حرام چیز نہ ہو ۔ اہل کتاب (یہود و نصارٰی) کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح بھی جائز ہے (۵ [المائدة] : ۵) .

تصوف کی اصطلاح میں "کفر" اور "کافر" کے کچھ اور معانی بھی بیان کیے گئے ہیں ، [لیکن وہ مجازی و اصطلاحی ہیں] ، (دیکھیے التہانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، ۱۸۶۳ء، ۳: ۱۲۵۲).

مآخذ : متن مقالہ میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ دیکھیے (۱) ابن منظور : لسان العرب، بولاق ۱۳۰۰ھ، ۶ : ۴۵۹ تا ۴۶۷ ؛ (۲) الجوہری : الصحاح، قاہرہ ۱۳۷۵ھ، ۲ : ۸۰۷؛ (۳) وینسنک : المعجم المفہرس، لائیڈن ۱۹۶۷ء، ۶: ۴، بذیل مادّہ؛ (۴) انورشاہ کشمیری : اکفار الملحدین، کراچی ۱۳۸۷ھ، (نیز اردو ترجمہ از مولانا محمد ادریس میرٹھی، مطبوعۂ کراچی)؛ (۶) مفتی محمد شفیع: ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں، کراچی ۱۳۹۳ھ؛ [(۷) مفتاح کنوز السنة، بذیل مادۃ الکافر] .

(محمد تقی عثمانی)

* **کافِرستان** : ایک پہاڑی علاقہ، جو ھندوکش میں ۳۵ اور ۳۶ درجے عرض بلد شمالی اور ۷۰ اور ۷۱ درجے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ھے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۵ ھزار مربع میل ھے ۔ اس کا کچھ حصہ مملکت افغانستان میں شامل ھے، جسے نورستان کے نام سے موسوم کر دیا گیا ھے؛ اور کچھ پاکستان کے ضلع چترال میں ھے ۔ اس کی شمالی سرحد بڑی حد تک وہ فاصل آب ھے جو دریاے جیحون اور دریاے سندھ کے معاون ندی نالوں سے سیراب ھونے والے علاقوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ھے اورجس کے شمال کی وادیاں قبیلۂ غلچہ (رک باں) کے قبضے میں ھیں۔ کوہ ھندوکش کا وہ سلسلہ کافرستان کی مغربی سرحد سمجھا جاتا ھے جو درۂ خاوک کے قرب و جوار سے جنوب کی طرف چلا گیا ھے اور اسے پنج شیر اور نجراؤ کی وادیوں سے جدا کرتا ھے۔ مشرق میں کنر اور بشگل کی وادیوں کا درمیانی سلسلۂ کوہ اور جنوب میں کُنَر اور کابل کی وادیوں کے شمال کا سلسلۂ کوہ اس کی سرحدیں متعین کرتا ھے ۔ یہ ملک متعدد وادیوں پر مشتمل ھے، جنھیں ایک دوسرے سے بلند پہاڑ جدا کرتے ھیں ۔ اس کے بڑے بڑے دریاؤں کا فالتو پانی دریاے کابل یا دریاے کنر میں جا گرتا ھے، لٰھذا ان کا تعلق دریاے سندھ کے طاس سے ھے ۔ مشہور دریا یہ ھیں: النگار یا کاؤ مع اپنے معاون الشنگ کے؛ پیچ (کامہ یا پریسن) اور بشگل ۔ یہاں کے باشندے اپنے شرک اور تاریک خیالی پر سختی سے جمے رھنے کے باعث بہت مدت سے کافر کے نام سے مشہور ھیں اور انھیں سے ملک کا نام کافرستان نکلا ھے ۔ قدیم زمانے ھی سے سیاہ پوش کا نام بھی مستعمل ھے، لیکن دراصل یہ صرف ان کے ایک حصے کا نام ھے (باقی سب کو ، جموعی طور پر سفید پوش کہتے ھیں)۔

اس میں شک نہیں کہ سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں یہ علاقہ سلطنت کشان میں شامل تھا اور یہ ثابت ھو چکا ھے کہ کپیسہ (Kapisa) کا کوھستانی ملک یہی تھا ۔ تیمور نے اس ملک اور اس کے حکمران قبیلے کے لیے کتور کا نام استعمال کیا ھے ۔ یہ نام چترال کے ھمسایہ ملک کے حکمرانوں کے لقب کے مماثل ھے اور بلاشبہہ موجودہ زمانے کے سب سے بڑے قبیلے کا نام کتیر، دراصل کتور ھی ھے ۔ یہ امر بہت حد تک قرین قیاس ھے کہ یہ نام کشان فرمانرواؤں کے لقب کداره سے نکلا ھو۔ Wodd اور Yule نے یہ خیال ظاھر کیا ھے کہ مارکو پولو کسم (Casem، یعنی کشم، وادی کوکچہ میں) کے نزدیک جن شراب نوش قبیلوں سے ملا تھا وہ یہی کافر تھے، جو غالبًا اس زمانے میں ھندوکش کی شمالی وادیوں تک پھیلے ھوے تھے؛ تاھم ان کا تذکرہ قطعی طور پر پہلی بار شہنشاہ تیمور کی توزک میں ملتا ھے ۔ ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء میں ھندوستان پر چڑھائی کرتے وقت تیمور درۂ خاوک کے راستے ان کے ملک میں داخل ھوا تاکہ انھیں اندراب پر حملے کرنے کی سزا دے ۔ وہ انھیں کتور اور سیاہ پوش کے نام سے یاد کرتا ھے ۔ باوجودیکہ تیمور فتح کا دعوٰی کرتا ھے، لیکن یہ صاف ظاھر ھے کہ دشمن نے تاک لگا کر اس کی فوج کا بڑا حصہ تباہ کر دیا تھا اور اسے کوئی مستقل کامیابی حاصل کیے بغیر خاوک کی سمت لوٹنا پڑا تھا ۔ بابر نے اپنی توزک میں اس ملک اور یہاں کے باشندوں کا بڑا صحیح صحیح حال بیان کیا ھے ۔ اس نے کئی دریاؤں اور اضلاع کے وھی نام لکھے ھیں جو آج تک مستعمل ھیں ۔ موجودہ زمانے میں الفنسٹن Elphinstone (۱۸۰۹ء) نے اپنے مشاھدات سے اور میسن Masson (۱۸۲۶ء) اور بڈلف Biddulph (۱۸۸۰ء) نے ملک میں داخل ھوے بغیر ان تمام معلومات کو جمع کر دیا جو اس کے بارے میں دستیاب ھو سکتی تھیں ۔ ان میں سے الفنسٹن کا بیان خاص طور پر بہت قابل قدر ھے ۔ لاک ھارٹ Lockhart پہلا یورپین تھا جو ۱۸۸۵ء میں کافرستان میں داخل ھوا۔ اس کے بعد ۱۸۸۹ - ۱۸۹۰ء میں رابرٹسن Robertson پہنچا، جس نے ھندوکش کے کافروں پر اپنی تصنیف میں اس

ملک اور اس کے باشندوں ان کی رسوم، عقائد اور تنظیم کے بارے میں بہترین حال قلمبند کیا ہے۔

۱۸۹۳ء میں حکومت ہند اور افغانستان کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے کافرستان کا علاقہ قطعی طور پر انگریزی سرحد سے خارج قرار دیا گیا؛ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں امیر عبدالرحمٰن اس سارے علاقے کو فتح کرنے اور یہاں کے باشندوں میں تبلیغ اسلام کے لیے روانہ ہوا۔ قبیلۂ رام گلی نے جو کتیر کی شاخ تھا سب سے آخر میں اطاعت قبول کی۔ رابرٹسن نے انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے؛ (۱) سیاہ پوش قبیلے، جن کا ایک دوسرے سے بہت نزدیکی تعلق ہے (ان میں سب سے بڑا قبیلہ کتیر تھا)؛ (۲) متفرق قبائل، جن میں کوئی رابطۂ نسلی موجود نہیں۔ انھیں وہ سفید پوش کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ان میں سے بڑے بڑے قبیلے ویگلی (اور اشگن، جو اس کا قرابت دار ہے) اور پریسنگلی یا ویرون ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام قبیلے آریائی نسل کی ایک قدیم قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی زبانیں پساچہ زبان کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ کوھن Kuhn اور گرئیرسن Grierson کے نزدیک ان میں ایک ایسی زبان کی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ھندی زبانوں کے جدا ہونے کے بعد لیکن ایرانی زبانوں کے تشخص سے پہلے بولی جاتی تھی۔ یہاں کی خالص بولیاں بشگلی، وای الا (Wai-ala) اور ویرون ہیں، جو ملک کے وسطی حصے میں مستعمل ہیں۔ گوربتی، کلاشا اور پشائی بیرونی زبانیں ہیں۔ پشائی فی الحقیقت کافرستان کی حدود سے باہر جلال آباد میں بولی جاتی ہے۔ ایک اور زبان اشکند ہے، لیکن اس کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک یہاں جس قسم کی جاھلیت رائج تھی؛ اس میں مظاہر پرستی کے بہت سے عقائد شامل تھے، لیکن بعض بڑے بڑے دیوتا بھی عام طور پر مانے جاتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے دیوتا یہ تھے: امرا (خالق)، جس کا بڑا مندر پریسنگل میں تھا؛ مونی (پیغمبر)؛ گیش اور دیزانے (جنگ کا دیوتا اور دیوی)۔ افغانوں کے فتح پانے سے پہلے ھی سرحدی علاقے کے بہت سے اضلاع مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ یہ نومسلم شیخ کے نام سے مشہور تھے؛ بکروں کی قربانیاں اور مذہبی ناچ عام تھے۔

یہاں کا معاشرتی نظام یکسر قبائلی ہے۔ ہر قبیلہ متعدد خیلوں اور کنبوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ قبائلی حکومت کا انتظام ایک مجلس کرتی ہے، جو زیادہ تر سرداروں یعنی جُشت پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ سردار مختلف برادریوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قبیلے کی اصل حکومت چلانے کے لیے ہر سال اُرروں، یعنی مجسٹریٹوں کا انتخاب ہوتا ہے۔ مکان بہت اچھے بنائے جاتے ہیں اور ان سے بڑے مستحکم گاؤں بنتے ہیں۔ عام طور پر کافر ذکی اور چالاک، لیکن جھوٹے، سازشی اور خود پسند ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ مہمان نواز ہیں۔ کافر عموماً ظالم نہیں ہوتے۔ وہ بہادر ہیں اور آزادی کے دلدادہ اور اپنے ملک میں بڑے وقار سے کام کرتے ہیں۔ وہ بہت جھگڑالو ہیں، لیکن دوسروں کے جھگڑے طے کرانے پر ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ ان کے ہاں چوری اور قتل قابل سزا جرائم نہیں سمجھے جاتے۔ غلامی کا رواج عام ہے۔ کچھ غلام تو موروثی ہوتے ہیں اور کچھ قبائلی لڑائیوں میں پکڑ کر بنائے جاتے ہیں، یا خریدے جاتے ہیں۔

مآخذ: (۱) ملفوظات تیموری، در Dowson و Elliot : *Hist. of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء، جلد ۳؛ (۲) بابر نامہ، مترجمۂ A. S. Beveridge : *Memoirs of Babur*، لنڈن ۱۹۲۲ء؛ (۳) *The Book of Ser Marco Polo*، مترجمۂ Yule و Cordier، لنڈن ۱۹۰۳ء، ۱ : ۵۵، ۱۶۵؛ (۴) Elphinstone : *Caubul*، بار دوم، لنڈن ۱۸۳۹ء-۱۸۴۲ء؛ (۵) Biddulph : *Tribes of the Hindoo Koosh*، کلکتہ ۱۸۸۰ء؛ (۶) Masson :

Travels in Afghanistan، لنڈن ۱۸۸۳ء؛ (۷) G. S. Robertson : The Kafirs of the Hindu-Kush، بار دوم، لنڈن ۱۹۰۰ء؛ [(۸) محمود دانشور : کافرستان (اردو ترجمہ از خلیل احمد)، لاہور ۱۹۵۳ء] .

(M. Longworth Dames)

* **کافور** (نیز قافور ، قفور ؛ قب لسان العرب، بذیل مادۂ ق۔ ف۔ ر اور ک۔ ف۔ ر؛ سنسکرت میں کرپورا؛ پراکرت میں کپورا، کاپورا؛ ملائی میں کپور)، انگریزی میں Camphor، جو Laurus Camphora اور Dryobalanops aromatica کی رال ہے ۔ قدیم ایرانیوں کے عہد سے اس کی تجارت ہندوستان سے ہوتی آئی ہے ۔ جب مدائن فتح ہوا تو عرب فاتحین کو وہاں کافور کا بہت بڑا ذخیرہ ملا ۔ یہ لوگ اس کا استعمال نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے اسے نمک سمجھا (البلاذری، طبع de Goeje، ص ۲۶۴؛ ابن الاثیر ، طبع Tornberg، ۲ : ۴۰۱) ۔ [یہ روایت ناقابل قبول ہے، کیونکہ کافور کا ذکر بلکہ اس کا استعمال قرآن مجید (۷۶ [الدھر]: ۵) ۔ میں مذکور ہے مقالہ نگار نے آگے خود اس کاحوالہ دیا ہے ۔ علاوہ ازیں احادیث میں غسل میت کے تحت یہ حکم وارد ہوا ہے کہ کافور کا بھی استعمال کیا جائے (الترمذی : جامع، ج ۱، ابواب الجنائز : باب ماجاء فی غسل المیت) ۔ ابن بیطار نے مختلف قسم کے کافوروں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے قنصوری اور ریاحی بہترین سمجھے جاتے تھے ۔ یہ سب قسم کے کافور استعمال سے پہلے صاف کر لیے جاتے تھے ۔ بقول مارکوپولو (طبع Soc. de Geogr.، پیرس ۱۸۶۵ء ، ۱ : ۲۷۴؛ مترجمۂ Yule، بتصحیح H. Cordier، لنڈن ۱۹۰۳ء، ۲ : ۲۹۹؛ نیز تعلیقہ ۳، ص ۳۰۲ تا ۳۰۴) سب سے اچھا اور قیمتی کافور قنصور کا ہوتا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سونے کے بھاؤ فروخت ہوتا تھا ۔ قنصور غالباً بارس Barus کا قدیم نام ہے (قب Tijdschr. van het Kon. Nederl. Aardrijkskundig Genootschap، سلسلۂ دوم، ۱۷ (۱۹۰۴ء) : ۱۸ تا ۲۲، ۲۷ تا ۲۹؛ Encycl. van Nederl. - Indiē، بار دوم، ۱: ۱۲۳ ببعد)، جو سماٹرا کے مغربی ساحل پر واقع ہے (تپنولی کی ریزیڈنسی) اور جہاں سے کافور قنصوری (Kapur Barus) آیا کرتا تھا ۔ عرب مصنفین قنصور کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں ۔ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے نصف اول سے ہمیں تاریخی اور جغرافیائی کتابوں میں اس جگہ کا ذکر ملتا ہے کہ یہیں سے بہترین کافور حاصل کیا جاتا تھا .

اس گوند کا نام قرآن مجید (۷۶ [الدھر] : ۵) میں بھی پایا جاتا ہے [اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُھَا کَافُوْرًا] : "بے شک نیک لوگ پییں گے اس پیالے سے جس کی ملونی کافور ہے" ۔ مفسرین کے نزدیک یا تو یہاں کافور سے مشروب کی خوشبو مراد ہے، یا پھر جنت میں اس نام کا کوئی چشمہ ہے (الطبری : التفسیر، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ۲۹ : ۱۱۱ ببعد) ۔ آخر الذکر تفسیر کی بنیاد یہ ہے کہ آیہ ۶ کے شروع میں عین (چشمہ) کا ذکر آیا ہے .

مآخذ : (۱) ابن بیطار : الجامع لمفردات الادویۃ ، قاہرہ ۱۲۹۱ھ، ۴ : ۴۲ تا ۴۴ ، فرانسیسی ترجمہ از Leclerc ، ۳ : ۱۲۷؛ (۲) المسعودی : مروج، مطبوعۂ پیرس، ۱ : ۳۳۸، ۳۴۰ ببعد ؛ (۳) القزوینی: آثارالبلاد، طبع Wüstenfeld، ص ۶۸؛ (۴) ابن بطوطہ، مطبوعۂ پیرس، ۴ : ۲۴۱ ؛ G. Ferrand : Textes géographiques ، ۱۹۱۳ء ، ۱ : ۲، نیز بمدد اشاریہ، بذیل مادۂ Camphre؛ (۶) Yule و Burnell : Hobson-Jobson، طبع جدید، از W. Crooke، لنڈن ۱۹۰۳ء، بذیل مادۂ Camphor؛ (۷) W. Heyd : Hist. du Commerce du Levant du Moyen-Age، لائپزگ ۱۸۸۵ - ۱۸۸۶ء، ۱ : ۱۶۵، ۱۴۷، ۲ : ۱۵۱، ۵۰۰، ۵۹۰ و ۳۷۹ ببعد .

(Cl. Huart)

* **کافور** : ابوالمسک الاخشیدی (المتنبی نے ایک

قصیدے میں اسے حبشہ کے ایک مقام کی نسبت سے اللابی بھی لکھا ہے) ، چوتھی صدی ھجری میں شام اور مصر کا حکمران تھا، جس کی پیدائش نوبیہ یا حبشہ میں ۲۹۲ھ/۹۰۵ء اور ۳۰۸ھ/۹۲۰ء کے درمیانی برسوں میں ہوئی (سال پیدائش کے بارے میں مؤرخین کے بیانات میں اختلاف ہے) ۔ وہ ایک انتہائی بدصورت غلام کے درجے سے ترقی کرکے شام اور مصر کا حکمران ہوگیا ۔ اس نے علما کی سرپرستی کی ۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور ترین شاعر المتنبّی (رک بآں) کا دوست تھا ۔ ان وجوہات کی بنا پر عرب مؤرخین نے اس کے حالات نہایت ذوق و شوق سے لکھے ہیں اور استحقاق سے زیادہ اسے شہرت دی ہے ۔ چونکہ وہ علما اور شعرا کا مربی و قدردان تھا، اس لیے سوانح نگاروں نے اسے وفاداری اور نمک حلالی کا اعلٰی نمونہ بنا کر پیش کیا ہے، اگرچہ وہ اخشیدیوں [رک بآں] سے یہ وفاداری نہ نباہ سکا ۔ اس کے سوانح اس کے معمولی حسب و نسب، اس کے عروج اور المتنبّی کے ساتھ اس کی رفاقت کے بارے میں لطائف و ظرائف سے مزیّن ہیں ۔ تاریخ میں اس کی اھمیت کی وجہ یہ ہے کہ اس نے المغرب میں فاطمیوں [رک بآں] اور شمالی شام میں عرب خانوادوں کی پیش قدمی کو روکے رکھا اور اپنی لیاقت و صلاحیت سے اخشیدیوں کی مملکت کو، جس کی تاسیس ۳۲۳ھ/۹۳۵ء میں ہوئی تھی، بیس برس تک تھامے رکھا ۔ اس کی وفات کے بعد یہ مملکت زوال پذیر ھوگئی ۔ جب وہ نو عمر غلام تھا تو اس نے اپنے ایک ساتھی سے، جسے باورچی بننے کا شوق تھا تاکہ وہ اپنے تنور شکم کو اچھی طرح روٹی سے بھر سکے، مصر کا حکمران بننے کا اشتیاق ظاھر کیا تھا ۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ والی مصر محمد الاخشید (۳۲۳ھ/۹۳۵ء تا ۳۳۴ھ/۹۴۶ء) نے اسے خرید لیا ۔ مؤرخین کا یہ بیان کہ اسے جلدی بیماری کی وجہ سے واپس کرکے دوبارہ خرید لیا گیا، محض ملمع سازی ہے تاکہ وہ اس کی پستی کا اس کے حیرت انگیز عروج سے موازلہ کر سکیں ۔ ایک دوسرے راوی کا بیان ہے کہ اس کے سابق آقا نے رقم سمیت اسے والی الاخشید کے پاس واپس بھیج دیا، لیکن مؤخرالذکر نے رقم واپس کر دی اور کافور کو رکھ لیا ۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب کافور کے دوسرے رفقا ھاتھی دیکھنے کے لیے اپنے آقا کو کمرے میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تو وہ اپنی جگہ پر قائم رہا ۔ دونوں حکایتوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے آقا کا منظور نظر غلام بن گیا تھا ۔ والی نے اس کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوے اسے اپنا معتمد علیہ بنا لیا تھا اور اس کی مکروہ صورت کے باوجود اسے اپنے بچوں کا اتالیق اور سپہ سالار مقرر کر دیا تھا ۔ اس کی فوجی صلاحیتیں ۳۲۹ھ/۹۴۰ء میں حلب کے قریب ایک جنگ میں ظاھر ھوئیں اور اس نے حلب فتح کر لیا ۔ ۳۳۴ھ/اواخر جولائی ۹۴۶ء میں جب الاخشید کو یہ محسوس ھوا کہ اب اس کی موت کا وقت قریب ہے تو اس نے کافور کو اپنے چھوٹے بیٹے انوجور کا سرپرست مقرر کر دیا، جسے اس نے اس سے پیشتر اپنے باپ کے ساتھ مشترک حکمران مقرر کیا تھا ۔ انوجور کی بلوغت کے بعد بھی حقیقی اقتدار کافور ھی کے ھاتھ میں رہا ۔ ۳۳۸ھ / ۹۴۹ء میں اس نے انوجور کے بھائی علی بن الاخشید کو مشترک حاکم اور جانشین تسلیم کرا کے اخشیدی خاندان کو تباھی سے بچایا ۔ بعد ازاں ۳۴۳ھ/۹۵۴ء میں بعض دوستوں کے ایما پر انوجور نے کافور کی اتالیقی سے اپنا دامن چھڑانا چاھا کیونکہ اس کی آزادی عمل محدود تھی اور اس کے اخراجات پر بھی قدغن تھی ۔ اسے کافور کے گران بہا محاصل سے صرف چار لاکھ درھم ملا کرتے تھے ۔ وہ فلسطین میں رملہ چلا گیا تاکہ وھاں سے شام اور مصر پر آزادی سے حکومت کر سکے، لیکن یہ منصوبہ بروے کار نہ آ سکا ۔ اس کی والدہ اور کافور کو اس امر کی بروقت اطلاع مل گئی اور انھوں نے انوجور کو راضی کر لیا ۔

انوجور نے ذوالقعدہ ۳۴۹ھ/دسمبر ۹۶۰ء میں وفات پائی ۔ اس کی وفات کے بعد اس سال کے خاتمے پر کافور نے خلیفہ سے علی بن الاخشید کی حکمرانی کی توثیق کرا لی ۔ علی اس وقت چوبیس برس کا ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی کافور کی سرپرستی میں تھا اور اسے چار لاکھ درہم کی رقم ملتی تھی ۔ مصر کی فرمانروائی دوبارہ شام پر قائم ہو گئی اور حلب سے لے کر شمال میں طرسوس تک تمام مساجد میں جمعے کے خطبوں میں خلیفہ کے ساتھ علی کا نام لیا جانے لگا ۔ جب علی نے چھے برس بعد ۳۵۵ھ/۹۶۶ء میں انتقال کیا تو کافور نے حکومت کی زمام کار خود سنبھال لی اور خلیفہ نے بھی اس کے تقرر کی توثیق کر دی کیونکہ اس وقت علی کا بیٹا احمد صرف نو برس کا تھا ۔ کافور اپنی آزادی اور خود مختاری سے زیادہ دیر تک متمتّع نہ ہو سکا ۔ اس نے ۳۵۷ھ/۹۶۸ء میں وفات پائی ۔ اس کا جانشین احمد ہوا جس کے اختیارات اس نے خود سنبھال رکھے تھے ۔

کافور نے شام اور مصر میں امن و امان قائم رکھا ۔ الاخشید کی وفات کے بعد اس نے حلب کے فرمانروا سیف الدولہ سے دمشق چھین لیا جس پر مؤخرالذکر نے قبضہ کر لیا تھا ۔ کافور نے بیدار مغزی سے خلیفۂ بغداد اور شمالی افریقیہ کے فاطمی حکمران سے یکساں تعلقات رکھے ۔ کافور کے مال و دولت کی بڑی شہرت تھی اور اس کی ریاست میں سونے کے بجائے فنون لطیفہ کے بہترین خزائن تھے ۔ وہ شان و شوکت کا دلدادہ تھا ۔ سیف الدولہ کی طرح وہ علما اور شعرا پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا ۔ اس کا دربار مقبول عام تھا اور ارباب علم اس کی قدردانی کے جویا رہتے تھے ۔ جب المتنبّی سیف الدولہ سے کبیدہ خاطر ہو گیا تو کافور نے اسے قاہرہ بلا لیا جہاں المتنبّی نے چند سال قیام کیا ۔ قیام کے ابتدائی دور میں اس نے کافور کی مدح میں مشہور قصائد لکھے ۔ یہ رفاقت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ کافور نے وعدے کے مطابق اسے کوئی انتظامیہ عہدہ نہ دیا ۔ کافور کا عذر یہ تھا کہ وہ اس شخص پر کیسے اعتماد کر سکتا ہے جو نبوت کا دعوے دار ہو ۔ کافور علم و ادب کا شائق تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتا تھا ۔ اس کے دامن دولت سے بہت سے علما و فضلا وابستہ تھے ۔ ان میں مشہورترین الکندی ہے جس نے اس کے لیے تاریخ مصر لکھی تھی ۔

مآخذ : (۱) ابن سعید : کتاب المُغرِب فی حلی المغرب، جلد چہارم، جسے الکندی کی تاریخ مصر سے اقتباس سمیت Kn-L-Tallquist نے طبع کیا ہے ۔ اس میں کافور کی مفصل سوانح کی ابتدا میں مآخذ بھی مندرج ہیں (ص ۸۷ تا ۸۶، عربی متن ص ۳۶ تا ۳۸)؛ (۲) الحلبی، در *Die Statthalter Von Aegypten Zur* : Wüstenfeld *Zeit der Chalifen*، ۳: ص ۷۳ تا ۷۵، ص ۵۹ تا ۶۱ (*D. K.* *Abh. Ges d. Wiss. Zu Göttingen*) ۲۱ (۱۸۷۶ء)؛ (۳) ابن خلّکان، طبع Wüstenfeld، عدد ۵۶۵ نیز بمدد اشاریہ؛ (۴) المقریزی: الخطط، بولاق ۱۲۷۰ھ، ۲: ص ۲۶ ببعد؛ (۵) ابوالمحاسن ابن تغری بردی : النجوم، ۲: ص ۳۷۳ تا ۳۹۵ بمواضع کثیرہ ؛ (۶) المتنبّی : دیوان، (طبع دیتریسی) الکافوریات، ص ۶۲۳ ببعد اور مزید مآخذ منقولہ، در Tallquist؛ (۷) Sadrud Din : *Saif-al-Dawla and his times*، مطبوعۂ لاہور ؛ (۸) جلیل الرحمٰن اعظمی : ابو الطیب المتنبّی، ص ۱۴۱ تا ۱۶۴، مطبوعۂ کراچی)] .

(M. Sober Nheim [و ادارہ])

* **کاکاصاحب** : شیخ رحمکار (۹۸۳ تا ۱۰۶۳ھ)، صوبۂ سرحد کے مشاہیر اولیاء اللہ میں سے ہیں ۔ کرامات اور خوارق عادات کی وجہ سے "قطب حقیقی" مشہور ہوئے اور تجلّی ذات سے متجلی ہونے کی شہرت پائی ۔ صوبۂ سرحد، کابل اور افغانستان میں ان کے مریدوں کی تعداد ہزاروں [بلکہ لاکھوں] تک پہنچتی ہے [اور ان کے مزار پر زائرین کا ھجوم صوبۂ سرحد کے دیگر تمام مزارات سے زیادہ ہوتا ہے] ۔

صوبۂ سرحد کا قبیلۂ کاکا خیل ان کی نسل سے ہے۔ پشتو زبان میں ان کا اصلی نام "کستیرگل" تھا جو ایک خوشبودار پھول [یا زعفران] کا نام ہے، لیکن انھوں نے اپنے مریدوں میں "کاکا صاحب" اور "شیخ رحمکار" کے القاب سے شہرت پائی۔ وہ یکم رمضان ۹۸۳ھ بروزجمعہ صبح صادق کے وقت کاکا صاحب کی موجودہ زیارت سے چھے میل جانب جنوب و غرب، جو نوشہرے کے جنوب میں چھے میل کے فاصلے پر واقع ہے، ایک گاؤں میں "بختی" نامی ایک نیک بخت بی بی کے بطن سے پیدا ہوے۔ ان کے اصل و نسب کے متعلق دو قول مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ آپ حسینی سادات کی نسل سے ہیں جو ۳۲ پشت میں حضرت امام حسین تک پہنچتی ہے۔ ان کے اجداد عراق، مشہد، بخارا، پشین (بلوچستان)، غزنی اور خوست میں مدفون ہیں۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں سید آدم [علاقۂ] کوہاٹ آئے۔ ان کا مزار موضع کربوغہ میں ہے۔ بعدازاں [ان کے بیٹے] سید غالب نوشہرے کے علاقے میں وارد ہوے۔ ان کا مزار کوہ چراٹ کے دامن میں ہے۔ ان کے بیٹے سید نادر مست بابا کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے [بیٹے] بہادر دار مست نے ابک صاحب کے نام سے بہت شہرت پائی۔ [مست بابا] اور ابک صاحب خٹک نوشہرہ کے علاقے میں [باہم دو میل کے فاصلے پر] مدفون ہیں۔ حضرت کاکا صاحب انھیں ابک صاحب کے فرزند تھے۔ اس روایت کا مأخذ عبدالحلیم بن کاکا صاحب کی تالیف مقامات قطبیہ [کے ناشر نے کتاب بطور ضمیمہ درج کی ہے] جو بعد کے مؤلفین نے بھی نقل کی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کاکا صاحب خٹک قوم کے افغان تھے۔ *Central Asia*، ۲: ص ۸۷، طبع ۱۸۷۳ء، قاموس قبائل، ۲: ص ۹۳ ھء، طبع ۱۹۱۱ء، گزیٹیرصوبۂ سرحد، ۲: ص ۹۰۹، تاریخ پشاور، ص ۳۲۳ میں کاکا خیل کو خٹک قوم میں شمار کیا ہے۔ بہر صورت کاکا خیل [اور ان کے آبا و اجداد] کئی نسلوں اور کئی صدیوں سے خٹک قوم میں زندگانی بسر کر رہے ہیں اور ان کی زبان اور ان کے آداب و رسوم کو پوری طرح اپنا چکے ہیں۔

کاکا صاحب نے خٹک کے علاقے میں [شیخ اخ الدین المعروف بہ] اخون دین صاحب [جن کا مزار اکوڑہ میں ہے] اور اپنے [والد] ابک صاحب سے تعلیم حاصل کی اور [بعض روایات کے مطابق] والد ہی سے سلسلۂ چشتیہ [یا سہروردیہ یا ہر دو] کی اجازت پائی، لیکن وہ اپنے طریقے کو اویسی ظاہر فرمایا کرتے تھے۔ ایک ہزار ہجری کے قریب ان کی شہرت کا آوازہ تمام سرحد اور افغانستان میں دور دور تک پھیل گیا۔ ان کے زہد و ریاضت، کرامات و تبلیغ دین، اخلاق و احکام دین کا بہت چرچا ہونے لگا۔ انھوں نے اخوند پنجو [رکؔ بآں] اور سید آدم بنوری خلیفۂ حضرت مجددؒ سرھندی سے [بھی] روحانی فیض پایا اور عمر کا خاصا حصہ ریاضت و عبادت [زہد و تقوٰی] اور لوگوں کی ہدایت میں صرف کیا۔ [حضرت کاکا صاحب کے فیوض و برکات سے علاقے کے لوگ متعدد طریقوں سے مستفیض ہوے۔ بہت باکمال بزرگوں نے ان سے روحانی کسب فیض کیا اور خرقۂ خلافت حاصل کیا، مثلاً خواجہ شمس الدین ہروی، کمال الدین بلخی، فقیر جمیل بیگ، (برادر خوشحال خان)، خواجہ شیخ بابر، شیخ دریا خان چمکنی اور حضرت مرزا گل بابا۔ قاضی عبدالحلیم اثر نے ان کے علاوہ تیس سے زائد مشہور خلفا کے نام تحریر کیے ہیں۔

عام مسلمانوں نے ان کے وعظ و نصیحت اور ارکان اسلام کی تلقین، تزکیہ و تربیت، درس و تعلیم اور جاری کردہ مدارس سے دینی فائدہ اٹھایا۔ ان کی مقبول دعاؤں، مخلوق خدا کی خیر خواہی، ان کو مفید مشورے دینے اور مسلمانوں کے آپس میں صلح و آشتی قائم رکھنے کی بدولت علاقے کے لوگوں کو عمومی فائدہ پہنچا۔ روحانی برکات کا فیض اس پر

مستزاد ہے ۔ انہوں نے انتہائی سادہ زندگی گزاری، خودداری، حلم و بردباری، شفقت و ہمدردی اور بے انتہا جود و سخا ان کے اخلاقی کمالات کے نمایاں جوہر تھے] ۔ جمعہ ۲۴ رجب ۱۰۶۳ھ / ۲۱ جون ۱۶۵۲ء کو اسّی سال [یا بقول بعض ۸۲ سال] کی عمر میں وفات پائی اور اس مقام پر دفن ہوے جو [تحصیل] نوشہرہ میں زیارت کاکا صاحب کے نام سے مشہور ہے ۔ [ان کے صاحبزادے شیخ عبدالحلیم نے ۱۰۸۱ھ میں ہندوستان سے معمار بلا کر ان کے مزار پر گنبد تعمیر کرایا جو اس علاقے میں مغلیہ فن تعمیر کا واحد شاہکار ہے] خوشحال خان خٹک ان کے مریدوں میں سے تھا .

کاکا صاحب کے بیٹوں کے نام : (۱) شیخ ضیاء الدین شہید [معروف بہ شہید بابا، کاکا صاحب کے گنبد کے پاس ایک دوسرے گنبد میں ان کا مزار ہے]؛ (۲) شیخ گل محمد معروف بہ حاجی بابا [ان کی قبر کاکا صاحب کی قبر سے متصل جانب مشرق ہے]؛ (۳) شیخ خلیل گل معروف بہ مزری بابا [مزار موضع کوٹ مالاکنڈ ایجنسی میں ہے]؛ (۴) شیخ عبدالحلیم صاحب معروف بہ حلیم گل بابا مؤلف مقامات قطبیہ [و شمس العارفین م-۱۰۹۶ھ، مزار زیارت کاکا صاحب میں ہے]، کاکا صاحب کے یہ چاروں فرزند صاحب نسبت بزرگ تھے ۔ خصوصاً شیخ عبدالحلیمؒ جن کے خاندان کو خصوصی تقدس حاصل ہے]؛ (۵) نجم الدین جو بچپن میں فوت ہوے .

[کاکا صاحب کی سکونت وفات کے وقت تک موجودہ قصبے سے، ایک میل جنوب مغرب کی طرف دامن کوہ میں ایک کچے مکان میں تھی ۔ یہ مقام اب "میلہ" (گھر) کے نام سے مشہور ہے ۔ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد اور دیگر متعلقین نے مزار کے قریب سکونت اختیار کی ۔ رفتہ رفتہ یہاں موجودہ قصبہ زیارت کاکا صاحب کے نام سے آباد ہوا ۔ آج کل اس کی آبادی تقریباً سات ہزار ہے ۔ اکثریت کاکا صاحب کی اولاد کی ہے ۔ سکونت پذیر لوگوں میں دوسرا مشہور خاندان (خاندان قضاۃ) کاکا صاحب کے استاد شیخ اخ الدین کی اولاد کا ہے ۔ جو اسی زمانے سے یہاں مقیم ہے] .

[کاکا صاحب کی اولاد کاکا خیل کہلاتی ہے ۔ یہ علاقۂ پشاور کی ایک با اثر قوم ہے اور قصبے کے علاوہ دوسرے مقامات میں بھی پھیلی ہوئی ہے ۔ عوام میں ان کا روحانی اثر و نفوذ مسلم ہے ۔ قوم کاکا خیل میں بہت سے افراد صاحب شہرت گزرے ہیں، مثلاً خان بہادر میاں رحیم شاہ (جنھوں نے اسلامیہ کالج کی بِنا اور ترقی میں حصہ لیا اسلامیہ کالج پشاور)، فخر قوم میاں حمید گل، مولوی سید میرانجان (تحریک خلافت کے زعما)، مولانا عزیز گل، اسیر مالٹا خلیفۂ شیخ الہند] .

مآخذ : [حضرت کاکا صاحب کے تفصیلی حالات کے لیے مستند مآخذ کم ملتے ہیں ۔ شیخ عبد الحلیمؒ اور فقیر جمیل بیگؒ کی کتابیں مستند مگر تشنگی دور کرنے کے لیے نا کافی ہیں ۔ دوسرے معاصر اصحاب اور خلفا کے تذکرے جو اب مخطوطوں کی شکل میں بمشکل دستیاب ہوتے ہیں، عموماً مناقب اور کرامات پر مشتمل ہیں ۔ موجودہ صدی میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں عموماً کسی خاص نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر قیاس آرائیاں شامل کی گئی ہیں اور ان کو حقائق کا رنگ دیا گیا ہے ۔ اس لیے معروضی مطالعے کے لیے ان سے استفادے میں احتیاط کی ضرورت ہے] : (۱) شیخ عبدالحلیم بن کاکا صاحب : مقامات قطبیہ، تصنیف ۱۰۶۶ھ دہلی ۱۳۱۸ھ؛ (۲) سیاح الدین کاکا خیل : تذکرۂ شیخ رحمکار، (اردو) لاہور ۱۹۵۱ء؛ (۳) نصراللہ نصر : کاکا صاحب رحمکار (پشتو)، پشاور ۱۹۵۱ء؛ (۴) Mac. Gregah : *Gazetteer of the Frontier Province*، طبع ۱۸۸۷ء؛ (۵) *Central Asie*، طبع ۱۸۷۳ء، ج ۲؛ (۶) *Glossary of the tribes of the Punjab and North West Frontier*، ج ۲، طبع ۱۹۱۱ء؛ (۷) گوپال داس : تاریخ پشاور، [اردو] لاہور ۱۸۷۰ء؛ (۸) میر احمد شاہ رضوانی : تحفۃ الاولیاء، لاہور ۱۳۲۱ھ؛

(۹) سید عبداللہ شاہ بخاری: مجمع البرکات [فارسی]، تالیف ۱۸۸۵ء، مخطوطۂ [مملوکۂ میاں فجر من اللہ کاکا خیل]؛ (۱۰) محمد امجد: تاریخ زیارت کاکا صاحب، از حکیم محمد امجد مطبوعہ لاهور؛ (۱۱) شمس الدین هروی: اسرار المسالکین ای مناقب کاکا صاحب، مخطوطۂ مقاله‌نگار؛ (۱۲) جمال الدین: مناقب کاکا صاحب، مخطوطۂ مقاله نگار؛ (۱۳) شیخ اسمعیل: مناقب کاکا صاحب، مخطوطۂ مقاله نگار؛ (۱۴) گل نور ننگر هاری: مناقب شیخ رحمکار، مخطوطۂ مقاله نگار؛ (۱۵) میاں محمد مبین: مناقب منظوم کاکا صاحب، مخطوطۂ مقاله‌نگار؛ (۱۷) غلام احمد نوشهروی: مناقب کاکا صاحب مع شجره، لاهور ۱۹۰۸ء؛ (۱۸) فقیر جمیل بیگ دل: تذکرة الاولیاء، مخطوطه، در پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی؛ (۱۹) عبدالحلیم اثر: روحانی رابطه، پشاور ۱۹۶۵ء، ص ۵۷۳ تا ۵۹۳؛ (۲۰) اعجاز الحق قدوسی: تذکرۂ صوفیاے سرحد، مرکزی ادبی بورڈ ۱۹۶۶ء، ص ۲۶۸ تا ۳۱۸.

(عبدالحی حبیبی و محمد عبدالقدوس)

* **کاکَوَیْه (بنو)**: ایک شاهی خاندان جس نے ۳۹۸ھ/۱۰۰۷ء سے ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء تک اصفهان اور همذان کے صوبوں پر حکومت کی۔ یه خاندان دشمنزیار رستم بن المرزبان کی نسل سے تھا جو دیلم کا رهنے والا تھا۔ اس کے پاس شهریار کی جاگیر تھی اور آل بویه کے فرمانروا مجد الدوله نے اسے اسپهبذ کا خطاب دیا هوا تھا (دیکھیے ابن اسفندیار: تاریخ طبرستان، مترجمۂ براؤن، ص ۲۴۸، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۹؛ ظهیرالدین: تاریخ طبرستان، طبع Dorn، ص ۱۹۵، ۲۰۹؛ میرخواند: روضة الصفاء، ۴: ص ۲۶).

کاکویه دیلم کی مقامی بولی میں کاکو (ماموں) کا اسم تصغیر ہے (دیکھیے J. de Morgan: *Mission Scientifique en Perse*، ۵: ص ۱۲۶، شماره ۳۶۳؛ رضا قلی خان: فرهنگ [انجمن آرای] ناصری، بذیل مادّه)۔ مؤسس خاندان [ابو جعفر] کو ابن کاکویه کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا کیونکه وه مجدالدوله کے ماموں کا بیٹا تھا۔ مجدالدوله کی ماں [ابو جعفر ابن کاکویه] کے والد دشمنزیار، جو مجدالدوله کا سرپرست تھا، کی بهن تھی (ابن الأثیر، ۹: ص ۲۰۷، جهاں صفحه ۱۴۶ کی به نسبت بهتر تشریح دی هوئی ہے).

سکون پر دشمنزیار کے بجاے دشمن‌زار نام لکھا ہے (*Iranisches Namenbuach*: F. Justi، ص ۸۸؛ شجرۂ نسب، ص ۴۴۵)۔ اس خاندان میں پانچ بادشاه گزرے هیں:

۱- علاءالدوله ابو جعفر محمد بن دشمنزیار الملقب به ابن کاکویه جس نے ۳۹۸ھ/۱۰۰۷ء کے فوراً بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے میں سبقت کی آل بویه کے فرمانروا فخرالدوله [رک بآں] کی بیوی یعنی مجدالدوله (جس نے اسے اصفهان کا عامل مقرر کر دیا تھا) کی ماں کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس نے همذان پر ۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء، رے پر ۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء اور اصفهان پر ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں قبضه کیا۔ کردوں، طبرستان کے اسپهبذوں اور غزوں سے مسلسل جنگوں کے باعث وه امن چین کے ساتھ ان مقبوضات پر حکومت نه کر سکا۔ ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں سلطان مسعود نے جو اپنے باپ کے بعد تخت نشین هوا تھا، اس کے لیے اصفهان کی ولایت کی توثیق کر دی۔ ۴۲۵ھ/۱۰۳۴ء میں اس نے بغاوت کی اور دو بار شکست کھا کر اصفهان کھو بیٹھا۔ دو سال بعد اس نے اسے دوباره حاصل کرنے کی کوشش شروع کی اور بالآخر کچھ مدت بعد اس پر قبضه کرنے میں کامیاب هو گیا۔ تاج الدوله بویهی کی ملازمت سے برخاست هونے کے بعد طبیب و حکیم ابن سینا [رک بآں] نے اسی کے دربار میں قلمدان وزرات سنبھالا تھا (ابن خلّکان، طبع Wüstenfeld عدد ۱۸۹، مترجمۂ de Slane، ۱: ۴۴۲)؛ ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء میں اپنے انتقال کے وقت بھی وه وزیر هی تھا۔ علاءالدین نے ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء میں اپنے دارالحکومت کے گرد

فصیل بنوائی اور اس کے بعد ۴۳۳ھ/۱۰۴۱/۲ء میں اس کی وفات ہو گئی ۔

۲- ظهیرالدین ابو منصور فرامرز، علاء الدوله کا سب سے بڑا بیٹا، اصفهان میں اس کا جانشین قرار پایا ۔ اس نے اپنے بھائی ابوحرب کے خلاف جنگ کی ۔ ابوحرب نے غز سلجوقوں سے اعانت طلب کی جن کا مستقر رے تھا ۔ لڑائی میں مؤخرالذکر نے شکست کھائی ۔ ظهیر نے ابو کالیجار بن سلطان الدوله بویهی [رک باں] کے هاں پناہ لی اور اس بویهی سلطان کو اصفهان کا محاصرہ کرنے پر اکسایا ۔ دونوں بھائیوں کے درمیان یه لڑائی، جو ۴۳۵ھ/۱۰۴۴ء تک جاری رهی، بالآخر ایک معاهدے کے ذریعے ختم هو گئی ۔ اس کے بعد ظهیر نے کرمان کے دو قلعوں پر قبضه کر لیا جو ابو کالیجار کے علاقے میں تھے ۔ انھیں واپس لینے کے لیے ابو کالیجار نے ابرقوہ فتح کیا اور اصفهانی فوج کو شکست دے دی ۔ ۴۳۸ھ/۱۰۴۷ء میں طغرل بیگ نے اسے اس کے دارالحکومت اصفهان میں محصور کر لیا اور اسے اس شرط پر اپنی جاگیر پر قابض رهنے دیا که وہ اطاعت گزار بن کر رهے گا ۔ یه صورت حال ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء تک قائم رهی کیونکه سلجوق فرمانروا نے ایک طویل محاصرے کے بعد اس سال اصفهان کو فتح کر لیا اور اسی کو اپنا دارالحکومت بنا لیا ۔ یه کهتے هوے اس کی فصیلیں منهدم کرا دیں که حفاظت کے لیے دیواروں کی ضرورت فقط اس بادشاہ کو هوتی هے جو کمزور هو ۔ ابو منصور کو بطور جاگیر دو اضلاع یزد اور ابرقوہ ملے ۔ جب ۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء میں، طغرل بیگ خلیفه القائم کی بیٹی سے شادی کرنے بغداد گیا تو ظهیر اس کا هم رکاب تھا ۔

۳- ابو کالیجار گرشاسپ، سابق الذکر کا بھائی تھا اور جب ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں غزوں نے همذان کا محاصرہ کیا تو اس شهر کا حاکم تھا ۔ اس نے ان کے سردار گوکتاش سے صلح کرکے اس کی بیٹی سے شادی کر لی ، لیکن رے کی تسخیر کے بعد غزوں نے دوبارہ حملے شروع کر دیے اور اسے کِنکَوَر کے قلعے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ۔ یه ترک همذان میں ۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء میں داخل هوے ۔ جب اس طرح ترک اپنے تعاقب میں ابو کالیجار کو باهر نکالنے میں کامیاب هو گئے تو انھوں نے اس پر حمله کر دیا، لیکن وہ بچ نکلا ۔ اس واقعے کے فوراً بعد اس کے باپ علاءالدوله نے ترکوں پر اچانک حمله کرکے انھیں شکست دی ۔ علاءالدوله کی وفات کے بعد گرشاسپ نهاوند میں اقامت پذیر هوگیا ۔ فرامرز نے همذان فتح کرکے اسے اس شرط پر اپنے بھائی کو بطور جاگیر عطا کر دیا که وهاں خطبه اسی (فرامرز) کے نام کا پڑھا جائے گا ۔ ۴۳۳ھ/۱۰۴۲ء میں طغرل بیگ نے همذان فتح کر لیا اور گرشاسپ سے مطالبه کیا که کِنکَوَر اس کے حوالے کر دے، لیکن اس کے محافظوں نے یه بات ماننے سے انکار کر دیا ۔ ۴۳۶ھ/۱۰۴۴ء میں گرشاسپ نے همذان دوبارہ حاصل کر لیا اور ابو کالیجار بویهی کے باجگزار هونے کا اعلان کر دیا ۔ اس سے اگلے سال طغرل بیگ نے اپنے بھائی ینّال کو اس شهر پر دوبارہ قبضه کرنے کے لیے روانه کیا جهاں سے وهاں کا فرمانروا فرار هو کر جوزقان کے کردوں کے هاں پناہ گزین تھا ۔ ینّال نے ۴۳۹ھ/۱۰۴۷ء میں کنکور فتح کر لیا جس کا فرمانروا گرشاسپ کا ایک عامل عقبر بن فارس تھا اور اس نے اپنے لیے هتیار ڈالنے کی مفید مطلب شرائط منوانے کے لیے یه ظاهر کر رکھا تھا که ابھی اس کے پاس کافی سامان اور رسد موجود هے ۔ اپنے مقبوضات سے محروم هونے کے بعد گرشاسپ نے ابو کالیجار بویهی کے هاں پناہ لی ۔ ۴۴۱ھ/۱۰۴۹ء میں وہ اصفهان میں موجود تھا جهاں اس نے مودود غزنوی کی تجاویز کو بخوشی منظور کیا جو سلاجقه کے مقابلے کے لیے مدد کا طالب تھا، لیکن صحرا میں اس کے بهت سے سپاهی ضائع هو گئے اور خود بیمار پڑ گیا

اور اس کی وجہ سے اسے واپس آنا پڑا - ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء میں اہواز کے مقام پر وفات پا گیا .

۴- علی بن فرامرز، اس نے ۴۶۹ھ/۱۰۷۶ء میں سلجوق داؤد کی بیٹی ارسلان خاتون سے شادی کی، جو سلطان ملک شاہ کی پھوپی تھی - جب اس نے کرمان میں پناہ لی تو اسے یزد کی جاگیر عطا کر دی گئی (*Rec. de Textes rel. a l'hist. des Seljoucides*، ۱: ۲۶) - وہ ۴۸۸ھ/۱۰۹۵ء میں تُتُش کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا (ابن الأثیر، ۱۰ : ۲۱۲) .

۵- علاءالدولہ ابو کالیجار گرشاسپ بن علی، یزد کا شاہزادہ ہونے کی وجہ سے وہ شاہان سلجوق کے حلقۂ ملازمت میں شامل تھا - اس نے سلطان محمد اور سنجر کی بہن سے شادی کی تھی - اپنی جاگیر سے محرُوم ہونے کے بعد، جو سلطان محمود نے اپنے ساقی قرجہ کو عطا کر دی تھی، علاءالدولہ نے سنجر کے سائے میں پناہ لی - وہ اس جنگ میں شریک تھا جس میں سنجر نے اپنے بھتیجے کو شکست دی تھی (۵۱۳ھ/۱۱۱۹ء) - وہ فرزین کے قلعے سے جہاں محمود نے اسے قید کر رکھا تھا، فرار ہو گیا تھا (*Rec. de textes rel. à l'hist. des Seljoucides*، ۲ : ۱۳۳) .

مآخذ : (۱) ابن الأثیر، طبع Tornberg، جلد۹، ۱۰، بذیل مادّۂ دشمنز یار، فرامرز، گرشاسپ، علی بن ابی منصور؛ (۲) *Rec. de textes rel. á l'hist. des Seljoucides*، طبع Houstsma، ۲ : ۱۹، ۲۵، ۵۲، ۱۳۳، ۱۵۱؛ (۳) منجم باشی : تاریخ، طبع ۱۲۸۵ء، ۲ : ۵۰۳ تا ۵۰۴؛ (۴) Edw. G. Browne: *Rare. Ms. history of Isfàhàn*، در *Journ. Roy. As. Soc.*، ۱۹۰۱ء، ص ۴۳۳؛ (۵) D. Tornberg : *Revue de la numismatique belge*، سلسلۂ سوم، ۲ : (برسلز ۱۸۰۸ء)؛ (۶) H. Sauvaire : وهی کتاب، سلسلۂ سوم، جلد ۶، ۱۸۶۲ء؛ (۷) J. G. Stickel، در *Zeitschr. d. Deutsch. Morg. Gesellsch*، ۱۸ : ۲۹۲ ببعد، ۳۹ : ۲۱؛ (۸) P. Horn، در *Grundriss der iran. Philologie*، ۲ : ۵۶۵ .

(CL. HUART)

کالی کَٹ : (یا کالی گوڈ = قلعۂ مرغ)، احاطۂ * مدراس (کیرالا) کے ضلع مالا بار میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع ایک بندرگاہ - [۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رو سے باشندوں کی تعداد چار لاکھ کے لگ بھگ ہے جن میں مسلمان خاصی تعداد میں ہیں، جو موپلا [رَکَ بآں] کہلاتے ہیں] - یہ عرب مہاجرین کی اولاد سے ہیں جنھوں نے ہندو عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں - زمانۂ قدیم سے کالی کٹ بحری تجارت کا مرکز رہا ہے - یہاں ابن بطوطہ (۱۳۴۵ء) اور عبدالرزاق (۱۴۴۲ء) سیاحت کرتے ہوے آئے تھے - دونوں ہندو راجہ زمورن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جس نے ملک میں امن و امان قائم کرکے تجارت کی حفاظت کا سامان کر دیا تھا - راجہ زمورن کے اخلاف ابھی تک زندہ ہیں - کالی کٹ، پہلا ہندوستانی مقام ہے جہاں واسکوڈی گاما ۱۴۹۸ء میں آیا تھا - یہاں چالیس مساجد ہیں - ان میں شیک کندہ پلی کی بھی جامع مسجد ہے، جو شیخ مأمون کویا کے مزار پر تعمیر ہوئی ہے - یہ عرب تھے اور سولھویں صدی عیسوی میں مصر سے آئے تھے - ان کی نیکی و پارسائی کی بڑی شہرت تھی .

موپلوں کے دیوانی مقدمات اور دیگر تنازعات کا تصفیہ بھی اسی جامع مسجد میں ہوتا ہے - کالی کٹ سے Calicot (چھینٹ = چھپا ہوا کپڑا) نکلا ہے - [کالی کٹ کیرالا کے مسلمانوں کا علمی و ثقافتی مرکز ہے - ایک اسلامیہ کالج کے علاوہ عربی کے کئی مدارس ہیں - یہاں سے ناریل، چاے اور قہوہ دساور جاتے ہیں - شہر میں سوتی کپڑا بننے، ناریل کا تیل نکالنے اور صابن بنانے کے کئی کارخانے ہیں] .

مآخذ : (۱) *Madras District Gazetteers*، مالا بار (مدارس ۱۹۰۸ء)؛ [(۲) *Encyclopaedia Brit-*

tannica، ج ۲ بذیل مادّہ] .

(J. S. Cotton و [ادارہ])

* **کامران :** بحیرۂ قلزم میں ایک چھوٹا سا جزیرہ جو تہامہ کے ساحل پر زبید کے مقابل واقع ہے ۔ کامران کا مورچہ بند شہر ہمیشہ سے تہامہ کے فرمانرواؤں کے زیر نگین رہا ہے ۔ المقدسی کے زمانے میں یہاں شاہ یمن کے جیل خانے تھے اور میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا جسے العقد کہتے تھے ۔ یہاں محصول اور چنگیاں وصول کی جاتی تھیں .

مشہور فقیہ محمد بن عبدویۃ ، جو ابواسحٰق الشیرازی کا شاگرد اور اصول الفقہ کی چند کتابوں کا مصنف تھا، کامران کا باشندہ تھا اور یہیں مدفون بھی ہے ۔ جب کبھی طوفان اٹھتا ہے اور جہازوں کے لیے خطرہ نظر آتا ہے تو لوگ اس کی قبر کی مٹی سمندر میں پھینکتے ہیں کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ ایسا کرنے سے طوفان ٹل جاتا ہے .

آج کل کامران حاجیوں کے قرنطینے کا مستقر بن گیا ہے؛ اس موضوع پر دیکھیے Snouck Hurgronje: *Mekka*، ۲ : ۲۹۹ حاشیہ ۱؛ وهی مصنف: *Verspreide Geschriften* (بون و لائپزگ ۱۹۲۳ء ببعد)، ۳ : ۲۷، ۳۲ .

مآخذ : (۱) المقدسی (طبع de Goeje)، در *B G A.*، ۳ : ۱۰۳؛ (۲) یاقوت : معجم (طبع Wüstenfeld)، ۴ : ۸۰ .

(V. Vacea)

* **کامران شاہ درّانی :** افغانستان کے سدوزئی خاندان کا آخری فرمانروا، جس نے ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں اپنے باپ محمود شاہ سے ہرات کی محدود بادشاہت ورثے میں پائی اور اس پر ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء تک حکومت کرتا رہا ۔ تیمور شاہ کے بیٹوں، یعنی شہزادگان زمان، شجاع الملک اور محمود کے درمیان جو خانہ جنگیاں ہوئیں ان میں شہزادۂ کامران نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک بہادر سپاہی ہے ۔ ۱۲۲۱ھ میں اس نے شجاع الملک سے قندھار چھین لیا، لیکن چند ہی روز بعد یہ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا ۔ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں اس نے ان حوادث میں بڑا نمایاں حصہ لیا جن کے نتیجے کے طور پر درّانی سلطنت کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ۔ اس نے دوست محمد سے اپنی بہن کی توہین کا یہ بدلہ لیا کہ (دوست محمد کے باپ) فتح خان بارک زئی وزیر کی، جس کی بدولت محمود شاہ کو بادشاہت ملی تھی، آنکھیں نکلوا کر اس کا سر قلم کر دیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبۂ ہرات کے سوا باقی سارا ملک ہاتھ سے نکل گیا ۔ کامران آخر عمر میں عیاش اور آرام طلب ہو گیا لیکن اپنے لائق اور بے باک وزیر یار محمد الکزئی کی کوششوں سے وہ ہرات پر قابض و متصرف رہا ۔ اس کے عہد کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۳۷ تا ۱۸۳۹ء میں ایران کے قاجاری بادشاہ نے ہرات کا محاصرہ کیا ۔ اس محاصرے کے اہم اسباب میں سے ایک سبب انگلستان اور روس کی باہمی رقابت تھی ۔ ایرانیوں کے مشیر کار روسی افسر تھے ۔ اس کے برعکس دفاع کا روح و روان ایک نوجوان انگریز افسر لفٹیننٹ ای ۔ پوٹنجر (E. Pottinger) تھا ۔ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں یار محمد نے ، جو ایرانیوں کے ساتھ ملا ہوا تھا، کامران شاہ کو قتل کر دیا اور ہرات پر خود قابض ہو گیا ۔ کامران نے ہرات میں اپنے سکّے ضرب کرکے چلائے .

مآخذ : (۱) Elphinstone : *Caubul* ، بار دوم، لنڈن ۱۸۳۹ - ۱۸۴۲ء؛ (۲) Ferrier : *History of the Afghans*، لنڈن ۱۸۵۸ء؛ (۳) Kaye : *History of the War in Afghanistan*، لنڈن ۱۸۴۴ء؛ (۴) Mohan Lal: *Life of Dost Muhammed*، لنڈن ۱۸۴۶ء .

(M. Longwohth Dames)

* **کامران میرزا :** بابر کا دوسرا بیٹا اور ہمایوں کا سوتیلا بھائی ۔ اس کی ماں کا نام گلرخ بیگم تھا ۔ ۱۵۰۹ء کے لگ بھگ وہ شہر کابل میں پیدا ہوا، شاعرانہ طبیعت پائی تھی؛ لیکن بے حد ظالم اور بدخصال

تھا اور ہمیشہ نئی نئی چالیں سوچتا رہتا تھا ۔ اس نے ہمایوں کے خلاف بار بار علم بغاوت بلند کیا ۔ آخر اواخر ۱۵۵۳ء میں سرداروں نے ہمایوں کو مجبور کر دیا کہ وہ کامران کو بصارت سے محروم کرکے اس کی ضرر رسانی سے نجات حاصل کرے ۔ ۱۵۵۴ء میں کامران مکۂ معظمہ چلا گیا اور اکتوبر ۱۵۵۷ء میں اس نے وہیں وفات پائی ۔ اس کے بارے میں سب سے دلچسپ بات اس کی بیوی ماہ چیچک بیگم ارغون کی وفاداری ہے جو سندھ کے فرمانروا شاہ حسن کی بیٹی تھی ۔ ماہ چیچک بیگم نے اپنے باپ کے روکنے کے باوجود شوہر کے ساتھ جہاز پر بیٹھ کر مکۂ معظمہ جانے پر اصرار کیا اور اس کے باپ نے جو اعتراضات کیے تھے ان کے جواب میں یہ کہا کہ آپ نے کامران کے عروج کے دنوں (۱۵۴۶ء) میں مجھے اس کے حوالے کیا تھا ، اب مصیبت کے وقت میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہوں ۔ اس نے اپنے خاوند کی وفات کے چند ماہ بعد مکۂ معظمہ میں وفات پائی ۔

کامران کو بابر نے قندھار کی حکومت سپرد کی تھی ۔ ہمایوں کے ابتدائے عہد میں وہ پنجاب کا صوبیدار مقرر ہوا ۔ جن دنوں تخت سلطنت خالی تھا اور ہمایوں ترک وطن کرکے ایران گیا ہوا تھا، کامران اور اس کا چھوٹا بھائی عسکری افغانستان پر حکومت کر رہے تھے ۔ کامران نے اپنے پیچھے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں چھوڑیں ۔ لڑکے کو جس کا نام ابوالقاسم تھا اور جس نے شاعری اپنے باپ سے ورثے میں پائی تھی، اکبر نے ۱۵۵۷ء میں گوالیار میں قید کر دیا اور چند سال بعد اسے ایک خطرناک حریف سمجھتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ تینوں لڑکیاں بیاھی گئیں ۔ ان میں سے ایک لڑکی نے جس کا نام گلرخ تھا مردانہ ہمت پائی تھی ۔ اس کی شادی ابراہیم حسین سلطان سے ہوئی اور وہ اور اس کا بیٹا اکبر کے پہلو میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے (فرشتہ، طبع سنگی، ص ۲۲۱ و محمد حسین آزاد : دربار اکبری) .

مآخذ : (۱) ابوالفضل : اکبر نامہ ، جلد ۱؛ (۲) محمد حیدر : تاریخ رشیدی انگریزی مترجمۂ N. Elias و E. Denison Ross؛ (۳) جوہر آفتابچی : *Memoirs of the Emperor Humāyūn* ، مترجمۂ Major Stewart (O.T.F. ۱۸۳۲ء) ؛ (۴) توزک بابری : (۵) Erskine : *Memoirs of Baber* ؛ (۶) گلبدن بیگم : ہمایوں نامہ، (*O.T.F.*) لنڈن ۱۹۰۲ء؛ (۷) بدایونی : منتخب التواریخ، ۱ : ۴۵۱ ببعد ؛ (۸) Elliot Dowson ، ۴ : ۳۹۸ ، جلد ۵ و ۶؛ [(۹) کامران : دیوان، مطبوعۂ اعظم گڑھ]؛ مخطوطۂ بانکی پور (*Cat.*، ۲، ۱۴۵، ۲۱۵) میں کامران کے سوانح حیات دیے گئے ہیں .

(H. Beveridge)

کام رُوپ : [بھارت کے صوبۂ آسام کا ایک ضلع، جس کا موجودہ رقبہ ۳۸۰۴ مربع میل اور آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۰۶۲۵۷۲ ہے ۔ * ۴۰۰ء کے قریب کامروپ کی ریاستؔ کی حدود بھوٹان سے خلیج بنگالہ تک پھیلی ہوئی تھیں اور پراگ جیوتش پور (موجودہ گوہاٹی) اس کی راجدھانی تھا ۔ ہندوؤں کے تنتری فرقے کا آغاز اسی علاقے سے ہوا ہے]۔ محمد بختیار خلجی اور اس کے بعد بنگالے کے دوسرے حاکموں نے کامروپ کو اسلامی حکومت میں شامل کرنے کے سلسلے میں جو کوششیں کیں وہ یہاں کے گھنے جنگلات اور مرطوب [اور مضر صحت] آب و ہوا کے باعث بار آور نہ ہوئیں ۔ ۱۲۵۶ء میں اختیارالدین یُوزبک طغرل خان نے کامروپ پر حملہ کیا اور اپنی فتوحات کی یادگار میں ایک مسجد بھی یہاں بنائی [لیکن یہاں مستقل حکومت قائم نہ ہو سکی]۔ ۱۶۳۸ء میں کہیں جا کر مسلمانوں کو کام روپ میں قدم جمانے کا موقع نصیب ہوا اور یوں گوہاٹی مسلم حاکموں کا صدر مقام بنا، [لیکن جب شاھجہان کے بیٹوں کے درمیان جنگ تخت نشینی شروع ہوئی (۱۶۵۸ء) اور

مغل لشکر اس میں حصہ لینے کے لیے یہاں سے نکل گیا تو اهوم راجا نے، جس کی ریاست کامروپ کے پڑوس میں واقع تھی، کامروپ پر قبضہ کرکے پورے علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی ۔ عالمگیر [رک بآں] نے زمام حکومت سنبھالنے کے بعد میر جملہ کو بنگالے کا صوبیدار مقرر کیا، جس نے کوچ بہار کو مغلیہ سلطنت میں شامل کرنے کے بعد آسام کی طرف پیش قدمی کی (جنوری ۱۶۶۲ء) ۔ اهوم فوجیں پسپا ہوتے ہوتے برهم پتر کے کنارے تک پہنچ گئیں ۔ ۱۳ مارچ کو ایک بحری لڑائی میں میر جملہ نے دشمن کا بیڑا بھی تباہ و برباد کر دیا اور ۱۷ مارچ کو وہ اس کے صدر مقام گڑھ گاؤں میں داخل ہوگیا، جہاں کثیر مال غنیمت اس کے هاتھ لگا ۔ راجا اپنے ساتھیوں سمیت پہاڑوں میں جا چھپا، تاهم موسم برسات کا آغاز ہوتے ہی اس نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں اور کئی چوکیوں پر قبضہ کر لیا ۔ اسی دوران میں مغل لشکر میں وبا پھوٹ پڑی، جس سے بہت سے فوجی هلاک ہوگئے ۔ میر جملہ نے ان مشکلات کا بڑی همت اور استقلال سے مقابلہ کیا اور برسات ختم ہونے پر دوبارہ دشمن پر حملہ کر دیا ۔ اهوم راجا اور اس کے امرا نے ایک بار پھر پہاڑوں میں پناہ لی اور بالآخر اس نے بیس هزار تولے سونا، سوا چار لاکھ تولے چاندی، ۱۰۰ هاتھی اور حرم شاهی کے لیے اپنی بیٹی پیش کرکے صلح کی درخواست کی ۔ آسام کے یہ علاقے چار سال تک مغلوں کے قبضے میں رہے ۔ ۱۶۶۷ء میں اهوم راجا نے پھر لڑائی چھیڑ دی اور تمام چھنے ہوئے علاقوں کی بازیابی کے علاوہ گوهاٹی پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا ۔ اس کے بعد کامروپ پر دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم نہ ہو سکی ۔ ۱۸۲۶ء میں یہ علاقہ برطانوی حکومت کی حدود میں شامل ہو گیا [اور اب بھارت کا حصہ ہے] ۔

مآخذ : (۱) H. Blochmann : *Koch Bihár, Koch Háje, and Asám, in the 16th and 17th centuries, according to the Akbarnámah, the Pádishâhnámah, and the Fathiya i, Ibriyah.*، در *JASB*، جلد ۴۱، حصہ ۱ (۱۸۹۴ء)، ص ۲۷۹ ببعد؛ (۲) E.A. Gait : *The Koch Kings of Kamarupa*، در *JASB*، ۶۲/۱ (۱۸۹۴ء) : ۲۷۹ ببعد؛ (۳) B. C. Allen : *Gazetteer of Kamrup*، الٰہ آباد، ۱۹۰۳ء، ص ۲۷ ببعد؛ [(۴) *Encyclopaodia Britannica*، طبع ۱۹۶۹ء، ۱۳ : ۲۰۱؛ (۵) *The Cambridge History of India*، ۴ (۱۹۶۳ء) : ۲۳۳، ۲۳۶؛ (۶) Majumdar : *An Advanced History of India*، بمدد اشاریہ؛ (۷) سید ہاشمی فرید آبادی : تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، مطبوعۂ کراچی، ۱ : ۵۵۴ ببعد] ۔

(اا، لائیڈن، بار اول [و ادارہ])

* **کامل** : عربی علم عروض کی پانچویں بحر، سالم بحر کے ہر مصرع میں مُتَفاعِلُنْ تین بار ہوتا ہے ۔ اس کے تین عروض اور نو ضربیں ہیں :

پہلا عروض مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ
مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ
مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلانْ
مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلْ
مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ
مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفا

دوسرا عروض مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفا
مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفا
مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفا
مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفا

تیسرا عروض مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلاتُنْ
مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلانْ
مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ
مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلْ

مُتَفا اور مُتَفا کے علاوہ تمام ارکان میں دوسرے

حرف کی حرکت کو متفاعلن میں ساکن کیا جا سکتا ہے (مُتْفَاعِلُنْ) یا دوسرا حرف صحیح مع حرکت کے گرا دیا جا سکتا ہے ۔ (مُفَاعِلُنْ) یا مُتَفاعِلُنْ میں دوسری حرکت صحیح کے ساتھ والا حرف مد گرا دیا جا سکتا ہے (مُتَفْعِلُنْ) لیکن یہ بہت ہی شاذ و نادر ہے ۔

ان زحافات کے نتیجے کے طور پر مُتَفَاعِلُنْ کا رکن مُتْفَاعِلُنْ (=پر غلط ہے) (مُسْتَفْعِلُنْ ہونا چاہیے ؟) مَفَاعِلُنْ (=مُتَفاعِلُنْ)، مُتَفْعِلُنْ (=مُفْتَعِلُنْ) بن جائے گا ایسا کرنے سے (یعنی مُتَفَاعِلُنْ کی تا کو اضمار سے ساکن کر دینے سے) اگر تمام قصیدے کے اندر کہیں بھی سالم مُتَفاعِلُنْ نہ آئے تو پھر بحر رجز بن جائے گی ۔

(MOH. BEN CHENEB)

⊗ **تعلیقہ :** علم عروض کی بحر کامل بھی وافر کی طرح عربی سے مخصوص کی جاتی ہے اور وافر ہی کے ارکان کے اجزا کو مقدم مؤخر کرکے مستخرج ہوتی ہے، یعنی مَفاعِلَتُنْ کو عِلَتُنْ مَفا بنا کے مُتَفاعِلُنْ سے بدل لیتے ہیں، لیکن یہ فارسی اور اردو میں بھی رائج ہے اور اس کے بعض اوزان فارسی اور اردو میں بہت دلپذیر اور مقبول عام ہیں ۔

اس کے عروض : (۱) مُتَفاعِلُنْ (سالم)، (۲) مُتْفاعِلُنْ=مُسْتَفْعِلُنْ (مضمر)؛ (۳) مُتْفاعِلَتُنْ=مُسْتَفْعِلاتُنْ (مضمر مرفّل)؛ (۴) مُتَفا =فَعِلُنْ (احذ)؛ (۵) مُتاعِلُنْ= مَفاعِلُنْ (موقوص)؛ (۶) مُتَفْعِلُنْ=مُفْتَعِلُنْ (مخزول) چھے قسم کے آئے ہیں ۔

اس کی ضربیں : (۱) مُتَفاعِلُنْ (سالم) (۲) مُتْفاعِلُنْ=مُسْتَفْعِلُنْ (مضمر ؛ (۳) مُتَفاعِلَتُنْ=مُتَفاعِلاتُنْ (مرفّل)؛ (۴) مُتَفاعِلان (مذال)؛ (۵) مُتَفالُنْ=فَعِلاتُنْ (مقطوع)؛ (۶) مُتَفا=فَعِلُنْ (احذ)؛ (۷) مُتَفْعِلُنْ=مُفْتَعِلُنْ (مخزول) ؛ (۸) مُتْفاعِلَتُنْ=مُسْتَفْعِلاتُنْ (مضمر مرفّل)؛ (۹) مُتْفاعِلان=مُسْتَفْعِلان (مضمر مذال)؛ (۱۰) مُتْفا= فَعْلُنْ (مضمر احذ)؛ (۱۱) مُتاعِلُنْ=مَفاعِلُنْ (موقوص)؛ (۱۲) مُتَفْعِلاتُنْ=مُفْتَعِلاتُنْ (مخزول مرفّل) ؛ (۱۳) مَفاعِلَتُنْ=مَفاعِلاتُنْ (مرفّل موقوص)؛ (۱۴) مُتْفالُنْ= مَفْعولُنْ (مضمر مقطوع)؛ (۱۵) مُتْفَعِلان=مُفْتَعِلان (مخزول مذال)؛ (۱۶) مُتاعِلان=مَفاعِلان (موقوص مذال) سولہ قسم کی آئی ہیں ۔

عربی میں بحر کامل مسدس الاصل ہے ۔ اسے وافی و مجزو دو طریقوں سے استعمال کیا گیا ہے ۔ دونوں کو ملا کر چوبیس وزن آئے ہیں ۔

وافی : (۱) مسدس، سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ چھے بار؛ (۲) مسدس، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ فَعِلاتُنْ؛ (۳) مسدس، صرف ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ فَعْلُنْ ۔ بسکون عین ؛ (۴) مسدس، عروض و ضرب احذ، باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بحرکت عین ۔ دو بار ؛ (۵) مسدس، عروض احذ، ضرب احذ مضمر باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بحرکت عین ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ فَعْلُنْ ۔ بسکون عین؛ (۶) مسدس، صرف ضرب احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بحرکت عین؛ (۷) مسدس، سب ارکان مضمر مُسْتَفْعِلُنْ چھے بار؛ (۸) مسدس، سب ارکان موقوص ۔ مَفاعِلُنْ چھے بار اس وزن کو ہزج مقبوض شمار کرنا اولی ہے، اس لیے کہ ہزج میں صرف ایک عمل سے یہ وزن حاصل ہو جاتا ہے اور کامل میں تین مرتبہ عمل کرنا پڑتا ہے ؛ (۹) مسدس، سب ارکان مخزول ۔ مُفْتَعِلُنْ چھے بار ؛ (۱۰) مسدس، ابتدا مضمر، ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مَفْعولُنْ ؛ (۱۱) مسدس ، عروض و ضرب مضمر مرفّل باقی ارکان مضمر ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ مُسْتَفْعِلاتُنْ ۔ دوبار؛ (۱۲) مسدس، صدر، ابتدا و حشو دوم مضمر، ضرب مذال باقی ارکان سالم ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفاعِلان ؛ (۱۳) پانچ ارکان کا پورا شعر ۔ پہلا، دوسرا سالم ، تیسرا

چوتھا مضمر اور پانچواں رکن احذ مضمر ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُستَفعِلُن مُستَفعِلُن فَعلُن ۔ بسکون عین ۔ یہ تیرھواں وزن پانچ رکن کا معقد آیا ہے اور وافی ھی میں شامل ہے ۔

مجزو : (۱) مربع ، صرف ضرب مرفل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلاتُن؛ (۲) مربع، صرف ضرب مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان؛ (۳) مربع، سالم، مُتَفاعِلُن چار بار؛ (۴) مربع، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن؛ (۵) مربع، صرف ضرب مضمر مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مَفعُولُن؛ (۶) مربع، صرف ضرب مرفل مضمر باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُستَفعِلاتُن؛ (۷) مربع، صرف ضرب مضمر مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُستَفعِلان؛ (۸) مربع، صرف ضرب موقوص مرفل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن ۔ مَفاعِلاتُن؛ (۹) مربع، صرف ضرب مخزول مرفل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُفتَعِلاتُن؛ (۱۰) مربع، صرف ضرب موقوص مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مَفاعِلان؛ (۱۱) مربع، صرف ضرب مخزول مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُفتَعِلان؛ یہاں تک عربی کے چوبیس اوزان ختم ہو گئے ۔

فارسی اور اردو میں یہ بحر از روے اصل دائرہ مثمن ہے ۔ وافی کے نو، مجزو کے تیرہ اور مشطور کے دس کل بتّیس اوزان رائج ھیں ۔

وافی : مثمن سالم ۔ مُتَفاعِلُن آٹھ بار؛ (۲) مثمن، عروض و ضرب مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان ۔ دو بار؛ (۳) مثمن، پے در پے ایک رکن سالم ایک مضمر ۔ مُتَفاعِلُن مُستَفعِلُن مُتَفاعِلُن مُستَفعِلُن ۔ دو بار؛ (۴) مثمن، عروض و ضرب مذال، صدر و ابتدا مضمر ، دونوں مصرعوں کے پہلے حشو سالم دوسرے مضمر ۔ مُستَفعِلُن مُتَفاعِلُن مُستَفعِلُن مُتَفاعِلان دو بار؛ (۵) مثمن، ہر رکن موقوص ۔ مَفاعِلُن آٹھ بار ۔ ہمارے نزدیک اس وزن کو ہزج مقبوض شمار کرنا اولی ہے، اس لیے کہ ہزج میں صرف ایک عمل سے یہ وزن حاصل ہو جاتا ہے اور کامل میں تین بار عمل کرنا پڑتا ہے؛ (۶) مثمن، ترتیب وار ایک رکن سالم ایک موقوص ۔ مُتَفاعِلُن مَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مَفاعِلُن ۔ دو بار؛ (۷) مثمن، عروض و ضرب موقوص مذال باقی ترتیب وار ایک رکن سالم ایک موقوص ۔ مُتَفاعِلُن مَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مَفاعِلان ۔ دو بار؛ (۸) مثمن، صدر سے ضرب تک ایک رکن سالم ایک مخزول ۔ مُتَفاعِلُن مُفتَعِلُن چار بار؛ مثمن، عروض و ضرب مضمر مقطوع، حشو اول و سوم مخزول مسکن باقی ارکان سالم ، مُتَفاعِلُن مَفعُولُن مُتَفاعِلُن مَفعُولُن ۔ دو بار ۔

مجزو : (۱) مسدس، ہر رکن سالم، مُتَفاعِلُن چھے بار؛ (۲) مسدس ، عروض و ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن ۔ دو بار؛ (۳) مسدس، عروض و ضرب سالم، دونوں حشو موقوص، صدر و ابتدا مضمر ۔ مُستَفعِلُن مَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ دو بار؛ (۴) مسدس، عروض و ضرب مضمر مذال، دونوں حشو مضمر باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُستَفعِلُن مُستَفعِلان ۔ دو بار؛ (۵) مسدس، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن؛ (۶) مسدس، عروض و ضرب مضمر مقطوع ، دونوں حشو موقوص باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مَفاعِلُن مَفعُولُن ۔ دو بار؛ (۷) مسدس، صرف ضرب احذ باقی سب ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلُن ۔ بحرکت عین؛ (۸) مسدس، صرف ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعلُن ۔ بسکون عین ؛ (۹) مسدس ، عروض مقطوع ، ضرب احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلُن ۔ بحرکت عین؛

(۱۰) مسدس، عروض مقطوع، ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعْلُن ۔ بسکون عین؛ (۱۱) مسدس، عروض و ضرب احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلُن ۔ بحرکت عین دو بار؛ (۱۲) مسدس، عروض احذ، ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلُن ۔ بحرکت عین ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعْلُن ۔ بسکون عین؛ (۱۳) مسدس، عروض و ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعْلُن ۔ بسکون عین ۔ دو بار ۔

مَشْطُور: (۱) مربع، ہر رکن سالم ۔ مُتَفاعِلُن چار بار؛ (۲) مُربع، عروض و ضرب مُرفّل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلاتُن ۔ دو بار؛ (۳) مربع، عروض و ضرب احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن فَعِلُن ۔ بحرکت عین ۔ دو بار؛ (۴) مربع، صرف ضرب مرفّل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلاتُن؛ (۵) مربع، صرف ضرب مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان؛ (۶) مربع، عروض مذال، ضرب مرفل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان ۔ مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلاتُن؛ (۷) مربع عروض و ضرب مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان ۔ دو بار؛ (۸) مربع، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن؛ (۹) مربع، عروض و ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن فَعْلُن ۔ بسکون عین ۔ دو بار؛ (۱۰) مربع، عروض احذ، ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن فَعِلُن ۔ بحرکت عین ۔ مُتَفاعِلُن فَعْلُن ۔ بسکون عین ۔

مآخذ: (۱) السّکاکی: مفتاح العلوم؛ (۲) محقق طوسی: معیار الاشعار؛ (۳) مظفر علی اسیر: زر کامل العیار؛ (۴) مرزا محمد جعفر اوج: مقیاس الاشعار؛ (۵) مظفر علی اسیر: شجرة العروض؛ (۶) قدر بلگرامی: قواعد العروض؛ (۷) میزان الافکار شرح معیار الاشعار؛ (۷) میر شمس الدین فقیر: حدائق البلاغت؛ (۸) صہبائی: معیار البلاغت؛ (۹) فان دک: محیط الدائرہ.

(مرزا ہادی علی بیگ)

* **الکامل**: رک بہ الملک الکامل .

* **کانسو**: [یا کنسو؛ عوامی جمہوریۂ چین کا ایک صوبہ، جس کے شمال میں چینی منگولیا، جنوب میں چن گھائی اور سزچوان، مشرق میں ننگسیہ ھوی اور شینسی اور مغرب میں سن کیانگ، اویغور کے صوبے واقع ھیں ۔ سن کیانگ یا چینی ترکستان کا علاقہ پہلے کانسو ھی میں شامل تھا، لیکن ۱۸۸۳ء میں اسے علحدہ کر دیا گیا ۔ صوبۂ کانسو کا رقبہ ۳۶۵۰۰ مربع میل اور آبادی ایک کروڑ تیس لاکھ (۱۹۷۱ء میں) ھے] ۔ یہ صوبہ سب سے پہلے شہنشاہ قبلای کے عہد میں ۱۲۸۲ء میں قائم ہوا تھا ۔ کہا جاتا ھے کہ اس کا نام انتہائی شمال مغربی علاقے کے دو شہروں کانچوفو Kaučou-fu اور سچاؤ Sučou پر رکھا گیا تھا ۔ ان دونوں شہروں کا ذکر حدودُ العالم اور گردیزی (قب Barthold : *Otčet o poiezdke v Irednyuyn Aziyu*، ص ۹۲) میں پہلے ھی آ چکا ھے، اول الذکر کا بشکل خامچو Khamčū (مغلوں کے عہد میں قَمْچو Kamčū یا قَمْچی Kamči) اور ثانی الذکر کا بشکل سَخْچو Sakhčū (بعد ازاں شُکْچُو Shukčū یا سُوکچی Sūkči) .

تیرھویں صدی عیسوی تک اس علاقے پر ترک (اویغور Uigur) یا تبتی (تنگوت Tangut) نسل کے غیر ملکیوں کی حکومت رھی ۔ مغلوں کی فتح سے فورًا پہلے یہاں ایک تنگوت [تنگ قُوت] سلطنت قائم تھی، جس پر ھیا Hia یا سی ھیا Si-hia خاندان (۱۰۳۲ تا ۱۲۲۷ء) حکمران تھا اور اس کا دارالحکومت ننگ ھیا Ning-hia تھا ۔ رشیدالدین (طبع Blochet، ص ۴۸۴ ببعد) نے بارہ صوبوں (شینک shīnk، چینی: شِن shin) کی جو فہرست دی ھے اس میں دو صوبوں کو، جن کے صدر مقام علی الترتیب کِین

چانْ فُو Kinčanfū (موجودہ سیان فُو Sian-fū، شِنْسِی کا دارالحکومت) اور قمْچُو Kamčū (کانچو Kančou) تھے، تنگوت (تنگ قوت) کی سلطنت میں شمار کیا ھے۔ در حقیقت قمچو Kamčū اس زمانے میں کانسُو کا صدر مقام تھا ۔ کانسو اور شِنْسِی دونوں ایک ھی حاکم کے ماتحت تھے، لیکن یہ حاکم کانسو کے نہیں بلکہ شنسی کے صدر مقام میں رہا کرتا تھا ۔ کانسو اور شنسی کے درمیان دریاے ھوانگ ھو Hoang-ho حد فاصل کا کام دیتا تھا، چنانچہ کانسو کا موجودہ صدر مقام لن‌چاؤ فُو Lanchou-fu اس زمانے میں شِنسی میں شامل تھا ۔ کِیْن چان فُو Kinčainfū کے ضمن میں مارکوپولو (طبع Yule و Cordier، ۲ : ۲۴) نے منگلای Mangalai (م ۱۲۸۰ء، جسے رشیدالدین نے مِینگ قالا Mingkālā لکھا ھے) کا ذکر کیا ھے کہ وہ قبلای Kūbilai کا تیسرا بیٹا اور تنگوت کا حکمران تھا۔ اس کے برخلاف رشیدالدین (ص ۴۹۵ ببعد) کے نزدیک اس مرتبے پر اس کا بیٹا اننده Ananda فائز تھا ۔ رشید الدین لکھتا ھے کہ اس علاقے میں اسلام کے غلبے کا باعث اننده تھا ۔ وہ ۱۲۷۰ء کے لگ بھگ پیدا ھوا تھا (آٹھویں / چودھویں صدی کے اوائل میں اس کی عمر تیس سال تھی، وھی کتاب ص، ۳۶۰، س ۶) اور اس نے اپنے مسلمان رضاعی والدین کے ھاں پرورش پائی تھی ۔ اس نے اپنے اسلام لانے کا کھلم کھلا اعلان اس وقت کیا جب ایران میں سلطان غازان مسلمان ھوگیا (یعنی تقریباً ۱۲۹۵ء میں؛ [رک به غازان]؛ نیز دیکھیے رشید الدین، ص ۶۰۲) ۔ کہا جاتا ھے کہ اس کی فوج ڈیڑھ لاکھ افراد پر مشتمل تھی اور ان میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا تھا (کتاب مذکورہ، ص ۶۰۰) ۔ اسی طرح کسانوں کو چھوڑ کر تنگوت کے باقی باشندے بھی مسلمان ھو گئے (وھی کتاب، ص ۵۹۹) ۔ اس کے چچا زاد بھائی اور قبلای کے جانشین تیمور (۱۲۹۴ تا ۱۳۰۷ء) نے اس تبدیلی مذھب پر اس سے مؤاخذہ کیا، لیکن اننده بدستور اسلام پر قائم رہا اور کچھ مدت تک معطل رھنے کے بعد پھر اپنے مقبوضات پر بحال کر دیا گیا ۔ ۱۳۰۷ء میں ایک گروہ نے اسے تخت نشیں کرنے کی کوشش کی؛ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ جب ایک اور مدعی سلطنت، یعنی تیمور کا بھتیجا خَیْشان (۱۳۰۷ تا ۱۳۱۱ء) تخت نشین ھو گیا تو اننده کو قتل کر دیا گیا (d'Ohsson : *Histoire des Mongols*، ۲ : ۵۲۵ ببعد) کہیں ۱۳۲۳ء میں اننده کے بیٹے اورک تیمور کو تنگوت کا حاکم بنایا گیا (Blochet، در رشید الدین، ص ۳۶۲، حاشیہc) .

جیسا کہ مارکوپولو (طبع Yule و Cordier، ۱ : ۲۰۳، ۲۱۹) نے لکھا ھے، اننده سے پہلے بھی کانسو میں مسلمان موجود تھے۔ دوسری طرف وہ ھوانگ ھو کے جنوب میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کوئی ذکر نہیں کرتا (آآ، انگریزی، مادۂ چین، ۱ : ۸۵۱، میں غلطی سے *Mission d'Ollone*، ص ۴۳۵، کی پیروی کرتے ھوے مارکوپولو سے یہ بیان منسوب کیا گیا ھے کہ صرف صوبۂ یُنّان Yünan ھی میں مسلمان موجود ھیں) ۔ کہا جاتا ھے کہ ترکی بولنے والے سَلَر Salar جو آج کل ھوانگ ھو کے جنوبی کنارے پر آباد ھیں، منگ خاندان کے عہد (۱۳۶۸ تا ۱۶۴۴ء) ھی سے وھاں رہتے چلے آ رھے ھیں اور ان کو سرکش رعایا بتایا گیا ھے (W. W. Rockhill : *The Land of the Lamas*، لنڈن ۱۸۹۱ء، ص ۴۰)، اگرچہ اس زمانے میں مسلمانوں کی کسی بغاوت کا ذکر نہیں ملتا ۔ ۱۳۹۸ء کے قریب تیمور کی سر زمین تک یہ قصہ پہنچا کہ منگ خاندان کے بانی نے تقریباً ایک لاکھ مسلمان قتل کر ڈالے اور اپنی سلطنت سے اسلام کا نام و نشان مٹا ڈالا ہے (نظام الدین شامی و عبدالرزاق سمرقندی، در Barthold : *Uluglek*، پیٹروگراڈ ۱۹۱۸ء، ص ۴۲ ببعد، حاشیہ ۶)، لیکن اس کی تصدیق چینی مآخذ سے نہیں ھوتی ۔ ھاں مانچو عہد (از ۱۶۴۴ء)

میں کانسو کے مسلمانوں کی بغاوتوں کا ذکر ملتا ہے، جو ۱۶۴۶ء میں رونما ہوئیں اور پھر اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں کئی بار ان کا اعادہ ہوا۔

زمانۂ حال میں جتنے مسلمان کانسو میں ہیں اتنے یقیناً دوسرے صوبوں میں نہیں ہیں (ان کی تعداد کے اندازے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے)۔ اب سے کچھ پہلے تک اسلامی تہذیب و تمدن اور سرگرمیوں کا اہم ترین مرکز اِلوچاؤ Iločou (دارالحکومت لِن‌چاؤفو کے جنوب مغرب میں) تھا، جسے "چینی مکہ" کہتے تھے۔ اس سے پہلے بھی اِلوچاؤ کو خاص اسلامی شہر سمجھا جاتا تھا، (آبادی تقریباً ۳۰۰۰۰)؛ ۱۸۸۴ء میں سیاح G. Potanin (*Tangustko-Tibetskaya Okraine Kitaya*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۳ء، ۱ : ۱۶۹) کو بتایا گیا تھا کہ اب وہاں ایک مسلمان بھی باقی نہیں۔ آگے چل کر مسلمانوں کو فقط اتنی اجازت تھی کہ وہ وہاں علٰحدہ بیرونی بستیاں بنا کر رہیں (*Mission d'Ollone*، ص ۲۳۵)۔ کانسو میں مسلمانوں کا علاقہ دو علٰحدہ علٰحدہ حصوں میں منقسم ہے، یعنی جنوب مغرب میں اِلوچاؤ سِننگ Iločou-Sining اور شمال مشرق میں ننگھیہ کِنت سِپ‌ئو Ninghia-Kintsip'u؛ درمیانی علاقے میں چینیوں نے پہاڑی قلعے تعمیر کر لیے ہیں (کتاب مذکور، ص ۲۵۳)۔ کِنت سِپ‌ئو کو، جسے بعض اوقات "چینی مدینہ" کہا گیا ہے، سب سے پہلے مشہور مصلح دین اور ایک بغاوت کے قائد ماھوا لُنگ Ma Hua-Lung نے بسایا تھا۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں بھی کانسو کی بہ‌نسبت شِنسی میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے (Dabry de Thiersant : *Le Mhométisme en Chine*، ۱ : ۴۱، ۱۵۶)۔ ان کی زبان اور لباس بھی چینیوں سے مختلف تھا (کتاب مذکور، ص ۱۵۵)۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ عصر حاضر کے ڈُنگن Dungans یا تُنگن Tungans نے اس زمانے کے کہیں بعد چینی زبان اختیار کی ہوگی۔

یہاں کی بغاوتیں مقامی نوعیت کی تھیں اور انھیں اسلام کے جھنڈے تلے عام بغاوت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کانسو کی بڑی بغاوت میں، جو ۱۸۷۱ء میں شروع ہوئی تھی، شنسی میں مکمل امن و امان رہا (Dabry کتاب مذکور، ۱ : ۱۵۹)۔ شنسی میں جس بغاوت کا آغاز ۱۸۶۱ یا ۱۸۶۲ء میں ہوا تھا وہ کانسو میں اس وقت جا کر پھیلی جب شنسی سے نکالے ہوئے باغی وہاں پہنچے۔ کانسو میں شنسی سے کہیں زیادہ شدت سے یہ جنگ جاری رہی، جس کا وہاں کے مسلمان باشندوں پر، نیز صوبے کی عام معاشی خوشحالی پر تباہ کن اثر پڑا۔ جس طرح اس سے کچھ پہلے شنسی سے کانسو میں باغیوں کے اخراج کی وجہ سے شنسی کے مسلمانوں کی تعداد میں خاصی کمی ہو گئی تھی، اسی طرح اب (از ۱۸۷۲ء) کانسو سے بہت سے مسلمان اپنے دلیر رہنما بویان اَخُون Boyan-akhūn کے زیر قیادت مغرب کی جانب ترک وطن کر گئے۔ بویان اخون (اسے چینی میں بویان ھو Bo-yan-ho یا پای ین ھو Pai-yen-ho بھی لکھا جاتا ہے؛ اس (اسلامی نام محمد ایوب تھا) کی جاے ولادت کے متعلق مختلف بیانات ملتے ہیں۔ وہ مدت تک پیکنگ میں رہ چکا تھا اور بغاوت سے کچھ ہی دن پہلے کانسو میں آیا تھا۔ دسمبر ۱۸۷۷ء میں بویان اخون اپنی باقی ماندہ فوج کے ساتھ روسی سرحد عبور کرکے سِمِرہ چیہ Semirečye میں داخل ہوگیا۔ چینی حکام نے مطالبہ کیا (جو ظاہر بات ہے کہ منظور نہیں ہوا) کہ اسے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ ۱۸۸۳ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد سِمِرہ چیہ میں مقیم ڈنگنوں نے اسے بطل قوم کی حیثیت دے دی اور اس کی شان میں گیت لکھے گئے۔ اس امر کا پتا نہیں چل سکا کہ کانسو میں بھی اس کی یاد احترام و عقیدت کے ساتھ منائی جاتی ہے یا نہیں۔ آخری بغاوت کا آغاز (۱۸۹۵-۱۸۹۶ء) سَلَر نے کیا اور کہا جاتا ہے کہ اس کا باعث ان کے حاکم کا

ایک فرمان تھا، جس کی رو سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آئندہ ایک چینی قدر و قیمت کے لحاظ سے دس مسلمانوں کے برابر سمجھا جائے۔ موجودہ جمہوری حکومت کے خلاف کانسو میں کسی قسم کی تحریک نظر نہیں آتی۔

[چین کے مسلمانوں کی مجموعی آبادی بدر الدین (چینی مسلمان) کی رائے کے مطابق کروڑوں تک پہنچی ہے، لیکن مصدقہ اطلاعات میسر نہیں۔ بہرحال ۱۹۵۵ء میں ایک کروڑ کے قریب بتائی گئی تھی اور ان میں هوی، اویغور، قازق، خَلخَه، تاجیک، تاتاری، لاریک، چنگ سیانگ، سَلَس اور پاوآن شامل تھے۔ زیادہ تر مسلمان چین کے شمال مغرب میں سنکیانگ، کانسو اور چنگ های کے صوبوں میں پائے جاتے ہیں، لیکن هوی، چین کے اور حصوں میں بھی موجود ہیں۔ جمہوریۂ چین کے قیام (۱۹۴۹ء) کے بعد سے مسلمانوں پر سے پابندیوں کو ختم کرکے انھیں دوسرے چینیوں کے مساوی حقوق مل گئے ہیں اور انھیں شخصی قانون کی حد تک مذہبی آزادی حاصل ہے۔ چین میں مسجدیں موجود ہیں اور ان میں سے اکثر کے ساتھ مذہبی تعلیم کے مدارس بھی ہیں۔ کانسو کے صوبے میں لینسیا Linsia کی جامع مسجد میں عیدالفطر کے موقع پر بیس ہزار سے زائد لوگوں نے نماز ادا کی (دیکھیے مرقع تصاویر، المسلمون فی الصین، مطبوعۂ حکومت چین ۱۹۵۵ء)۔ مزید تفصیلات کے لیے رک بہ الصین]۔

مآخذ: (۱) P. Darby de Thiersant : *Le Mohamétisme en Chine*، ۲ جلد، پیرس ۱۸۷۸ء؛ (۲) وهی مصنف: *De l'insurrection mohametane dans la Chine occidentale*، در *Journ. As.*، ۱۸۷۴ء، سلسلۂ هفتم، ۳: ۱۷ تا ۵۴؛ (۳) بغاوت ۱۸۷۱ء کے متعلق ایک معاصر کا بیان، در *Mémoires concernants les Chinois*، ۹: ۳۲۲ ببعد؛ (۴) W. Wassiljew : *Der Mohammedanismus in China*، جرمن ترجمہ: *Der Erschliessung Chinas*، از A. Conrady، مع اضافات از Dr. R. Hübe، لائپزگ ۱۹۰۹ء، ص ۸۰ تا ۱۱۰، ۲۲۰ تا ۲۳۶؛ (۵) *Mission d'Ollone 1906-1909*، پیرس ۱۹۱۱ء اور اس میں مندرج تصنیفات، نیز اس تصنیف کے بارے میں روسی رسالوں میں شائع شدہ مضامین، خصوصاً (۶) F. Payarkow : *Postliedniy epizod dunganskago vozstaniya* (*Pamyatnaya Kinizku Semir. Oblasti*)، *na 1901 god*، نیز علٰحدہ شکل میں، ۵۷ صفحات)؛ جو زیادہ تر دنگنی مآخذ سے لیا گیا ہے اور اس میں ایک دستاویز بھی شامل ہے (ایک مختصر سی روداد، جو مصنف کی درخواست پر دنگن طبیب لکوکنی Likokni نے لکھی اور جس کا M. Stashkow نے روسی میں ترجمہ کیا)؛ سَلَر اور ان کی زبان (فہرست الفاظ) کے بارے میں (۷) P. Potanin : *Tangutsko-Tibetskaya okraina Kitaya*، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۸۹۳ء، ۱: ۱۶۹ ببعد، ۲: ۲۲۶ تا ۲۳۴؛ (۸) F. Poyarkon، در *Salari* : V. Ladigin، در *Etnograf. Obozrieniye*، ۱۸۹۳ء، شمارہ ۱، ص ۱ تا ۳۴۔

(W. Barthold)

* **کانگو**: افریقہ کے ایک ملک اور ایک دریا کا نام۔ دریا وسطی افریقہ کے عظیم طاس کے پانی کا تنہا نکاس ہے۔ یہ طاس مشرق میں "جوف عظیم" (The Great Rift) کے مغربی کناروں، شمال میں کوهستان مونگا Monga، مغرب میں کرسٹل Cristal کے سلسلۂ کوہ اور جنوب میں سطح مرتفع لنڈا Lunda سے گھرا ہوا ہے۔ چونکہ اس دریا کے معاون، خط استوا کے شمالی اور جنوبی دونوں حصوں کا پانی اس میں لا کر ڈالتے ہیں، اس لیے دوسرے دریاؤں کے مقابلے میں یہ متواتر جاری رہتا ہے۔ اس دریا کے راستے میں جا بجا آبشار واقع ہیں، خصوصاً اس علاقے میں جو سٹینلے پول Stanley Pool اور سمندر کے درمیان واقع ہیں؛ لیکن اس کے باوجود دریا میں اس طرح کے طویل ٹکڑے موجود ہیں جن میں جہاز آسانی سے چل سکتا ہے اور

یوں ایک قطعی ناقابل عبور جنگلی علاقے میں آدمیوں اور سامان تجارت کی تھوڑی بہت نقل و حرکت ممکن رهی هے ۔ ان گھنے جنگلوں کے اندرونی علاقوں میں افریقه کے قدیم ترین باشندے، جو "بونے" (Pygmies) هیں، اب بھی اپنے مخصوص اور امتیازی انداز میں شکار کھیل کر اور درختوں کے پھل کھا کر زندگی بسر کرتے هیں ۔ دریاؤں کے کناروں پر یا دریاؤں کے قریب کے علاقوں میں اور آج کل زیادہ تعداد میں ان سڑکوں کے کنارے جو جنگلی علاقوں کو قطع کرکے بنائی جا رهی هیں، وہ حبشی قبیلے آباد هیں جن میں سے اکثر "بنتو" زبانیں بولتے هیں ۔ یه لوگ آهنی آلات استعمال کرتے هیں اور تھوڑی بہت زراعت کرنے کے علاوہ شکار کرکے اور مچھلیاں پکڑ کر بسر اوقات کرتے هیں ۔ یه جنگلی قبیلے "بنتو" نسل کے لوگوں میں سب سے زیادہ پس مانده هیں اور اس کی وجه بلاشبهه یه هے که کسی کا ان تک پهنچنا بہت دشوار هے ۔

لیکن کانگو کی وادی کے صرف درمیانی حصے میں گھنے جنگل هیں ۔ اس کے آس پاس کے مرتفع گھیرے کو "نباتاتی جھاڑیوں" (Ochard Bush) کا علاقه کہتے هیں اور اس میں جھاڑیوں کو کاٹ چھانٹ اور جلا کر غلے کی کاشت کی جا سکتی هے ۔ مشرق اور مغرب کی طرف گھاس کے وسیع میدان هیں، جهاں مویشی پالے جا سکتے هیں ۔ گرد و پیش کے ان علاقوں پر هجرت اور فتح کے اثرات کا دروازہ همیشه کھلا رها هے اور اس کا نتیجه یه هوا هے که مقامی باشندوں نے انهیں علاقوں میں سیاسی جماعتیں قائم کر لی هیں ۔ نیل اور کانگو کے پن دھارے میں واقع جنگل کے شمال میں Zande کی متعدد ریاستوں کا وجود سترھویں صدی هجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کی اس نو آبادکاری اور فتوحات کا نتیجه هے جن کا آغاز سوڈان کے جنوبی کناروں کی طرف سے هوا تھا ۔ جنگل کے مشرقی جانب، مغربی وادی کی سطح مرتفع میں رواندا Ruanda اوروندی Urunde کی حکومتیں اور ان کی متعلقه ریاستیں ان فاتحین کی یادگار هیں، جو سوڈان یا جنوب مغربی حبش کی طرف سے یہاں آئے تھے اور جن کی چودھویں یا پندرھویں صدی عیسوی میں اس علاقے میں موجودگی کی شهادتیں ملی هیں ۔ جنگل کی مغربی جانب، هلکی جھاڑیوں کی سطح مرتفع اور گھاس کے اس کھلے میدان میں جو کانگو کی وادی کو اطلانتک کی ساحلی سطح مرتفع سے جدا کرتا هے، بکانگو کی بہت بڑی حکومت بھی ان تھوڑے سے مهاجروں نے قائم کی جو شاید جھیل چاڈ Chad کی طرف سے یہاں آئے تھے ۔ اس حکومت سے پرتگالیوں نے پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں تعلقات قائم کر لیے اور پھر اس کا اثر و رسوخ غابون Gaboon سے انگولا Angola تک پھیل گیا ۔ جنوب کی طرف کانگو کی حکومت کی بہت سی شاخیں تھیں جن میں سے ایک یقیناً کسائی Kasai کے بالائی علاقے کی ریاست باکوبه Bakuba هے ۔ لوبا کنڈا Luba-Kunda کی ریاستیں بھی، جو کانگو زمبزی Congo-ZambaZi کی درمیانی بلند سرزمین پر واقع هیں، مهاجروں هی کی قائم کی هوئی هیں، لیکن ابھی یه بات تحقیق طلب هے که یه لوگ مغرب کی طرف سے یہاں آئے یا مشرق کی طرف سے ۔

لوگوں کی آمد و رفت سے جو خیالات مغربی بنتو افریقه میں پھیلے وہ بنیادی طور پر وادی نیل کی قدیم دنیا کے باقیات تھے ۔ یه خیالات یہاں سوڈان کے ان جنوبی اطراف سے آئے جو اس وقت تک اسلام کے زیر اثر نہیں آئے تھے ۔ اسی اثنا میں تقریباً چار صدیوں تک، یعنی پندرھویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی کے وسط تک کانگو کی وادی پر، جس کے باشندے هنوز کافر اور فطرت پرست تھے ، یورپ دور هی سے اپنا اثر ڈالتا رها ۔ اس علاقے میں یورپ کا زیادہ تر مفاد غلاموں کی تجارت سے وابسته تھا جس نے عیسائیوں کی ابتدائی تبلیغی کوششوں کو سخت نقصان

پہنچایا اور بالآخر ان کا گلا گھونٹ دیا - پرتگال کے مخلوط النسل سوداگروں نے، جو Pombeiros کہلاتے تھے، سترھویں اور اٹھارھویں صدی ھجری میں لونڈا اور انگولا کی دوسری بندرگاھوں سے اپنی سرگرمیاں شروع کیں اور کانگو کی وادی کے جنوبی کناروں سے دور تک پھیلتے چلے گئے - غالب گمان یہ ھے کہ تانبے کی کانوں والے Katanga کے علاقے میں کبھی ان کی مڈ بھیڑ مشرق افریقہ کے سمندری ساحل کی سواحلی بندرگاھوں کے سوداگروں سے ھوئی ھو جو ایسے ھی کچے مسلمان تھے، جیسے کچے عیسائی Pombieros تھے - درحقیقت بعض آثار سے پتا چلتا ھے کہ جو تجارت انیسویں صدی سے پہلے بنتو افریقیہ کے دور دراز علاقے میں ھوتی تھی اس میں زیادہ تر افریقیہ کے نیام وزی (Nyamwezi) اور بِسا (Bisa) جیسے قبائل کی کارفرمائی تھی اور ساحلی لوگوں کا خواہ عرب ھوں یا سواحلی، اس تجارت میں زیادہ ھاتھ نہ تھا .

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ھوا کہ کہیں انیسویں صدی میں جا کر جب مصر سے غلاموں اور ھاتھی دانت کے تاجر جنوبی سوڈان میں داخل ھوے یا اس سے بھی بڑھ کر، جب زنجبار کے ابوسعیدی خاندان کی رعایا مشرق افریقیہ میں داخل ھوئی تو مسلمانوں کی کچھ تعداد وادی کانگو کے اطراف میں پہنچنی شروع ھوئی - اجیجی (Ujiji) کی عرب نوآبادی کی بنیاد ۱۸۴۰ء کے چند سال بعد پڑی اور یوں ایک مستول والے جہاز سمندر پار کرکے تانگا نیکا کی جھیل کے کناروں پر پہنچنے شروع ھوے - یہ وہ زمانہ ھے جب وادی کانگو کے مشرقی اور وسطی علاقوں میں عرب مسلمانوں اور سواحلیوں نے کاروبار پر مکمل قبضہ کرلیا تھا تاآنکہ انیسویں صدی کے نویں عشرے کے اواخر اور دسویں عشرے کے اوائل میں بڑی طاقتوں نے استوائی افریقہ کے علاقے پر قبضہ کرکے اس کے حصے بخرے کر لیے - جب بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ دوم نے کانگو کی خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی تو غلاموں کی تجارت کا خاتمہ ھوا اور عرب اور سواحلی جنگجو جن کی سرگرمیوں کا حال لِونگ سٹون، اسٹینلی اور دوسرے سیاحوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ھے، نابود ھو گئے - بہت سے عرب اور ان کے مشرقی افریقیہ کے ھم مذھب، جدید نوآبادیاتی نظام حکومت کے تحت مستقل طور پر کانگو میں آباد ھو گئے - افریقیہ کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی لوٹ مار کے بجاے ایک پُرامن تجارتی زندگی شروع ھو گئی اور اس کے بعد سے اسلام کی تبلیغ میں بھی باقاعدگی اور تیزی پیدا ھوگئی .

کانگو کے مسلمانوں کی موجودہ تعداد تقریباً دو لاکھ ھے اور ان کی عظیم اکثریت شافعی مذھب کی پیرو ھے اور طریقۂ قادریہ سے تعلق رکھتی ھے - ان میں خوجے [رک بآں] بھی ھیں، جو زیادہ تر رواندا - اروندی اور صوبۂ کیوو کے مشرقی حصے میں آباد ھیں اور کچھ سٹینلے وِل (Staneley-ville) اور کسنگو (Kasongo) میں رھتے ھیں - یہ لوگ سرگرم تاجر ھیں اور خاصے منظم ھونے کے علاوہ تعلیم یافتہ بھی ھیں - احمدیوں [رک بآں] کی تعداد صرف چند درجن ھے، لیکن وہ کتابوں اور رسالوں کی تقسیم کے ذریعے اپنے مسلک کی تبلیغ کا کام بڑے انہماک سے کر رھے ھیں .

صوبۂ مشرقی، صوبۂ کیوو اور رواندا - اروندی میں کم سے کم ۱۷۵ منظور شدہ مسجدیں ھیں - رومنگوے (Rumungwe)، جھیل نیانزا (Lake Nyanza)، سٹینلے ویلے، پونتھیر ویلے، کرنڈو (Kirundu) اور کنڈو (Kindu) میں قرآنی مکاتب ھیں، لیکن کشش اور توجہ کا سب سے بڑا مرکز اجیجی (Ujiji) ھے، جہاں ایک بڑا مدرسہ ھے، جس میں بچوں کو عربی پڑھائی جاتی ھے .

مسلمانوں کے ھر ایک گاؤں میں ایک مسجد ایک (Drapeau de confrerie) لواء الاخوۃ (اسلامی

برادری کا جھنڈا)، ایک معلم اور ایک امام ہوتا ہے۔ زنجبار کے برخلاف، مشرقی کانگو کے مسلمانوں میں تعلیم کم ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو الدمیری یا السیوطی کی کتابیں پڑھتے ہیں، لیکن عموماً ان کی تعلیم قادریہ اشغال کی چند عام کتابوں تک محدود ہے۔ طریقے میں داخل ہونے کا دستور جسے مریدی کہتے ہیں، سینیغال (Senegal) میں بھی بہت عام ہے اور زنگیوں میں بڑی عزت و وقعت رکھتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس کے حصول سے عزت اور مرتبہ دونوں چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ مسجدیں جو ایک خاص نقشے کے مطابق بنی ہوئی ہیں زنجبار کے نمونے کی ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر کی حیثیت ایک بڑے جھونپڑے سے زیادہ نہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں سے صرف تھوڑے ہی سے ایسے ہیں جو عربی جانتے ہیں۔ یہاں کی عام بولی کسواہلی (Kiswahili) ہے، جو حقیقت میں ایسی بنتو ہے، جو عربی سے متأثر ہے۔ یہی زبان ساحل زنجبار کے باشندوں کی مادری زبان ہے۔ زنگی مسلمان جنھوں نے شمال سے جمہوریۂ وسطی کانگو اور چاڈ سے مغربی کانگو میں داخل ہونا شروع کر دیا ہے، ثقافتی اعتبار سے بہت اونچا معیار رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر سوداگر ہیں، جو عبادات سے متعلق کتابیں اور عربی میں لکھے ہوئے تعویذ فروخت کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی جو عام عدالتیں یہاں قائم ہیں روز بروز شافعی مسلک اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

عام طور سے زنگی مسلمانوں کی تعلیم بڑی محدود ہوتی ہے اور انھیں اتنی عربی اور سواحلی بھی نہیں آتی کہ اسلام کی تبلیغ کا جو پروگرام ریڈیو سے نشر ہوتا ہے وہ اسے بھی اچھی طرح سمجھ سکیں۔ جو کتابیں عام طور سے مقبول ہیں، ان میں قرآن حکیم کے علاوہ زنجبار کے ایک شیخ حسن بن امیر الشیرازی کی تصنیف، المعراج الدردیر، العقد العقیان علی مولد الجیلانی، دلائل الخیرات، جس میں اور بہت سے متون، مثلاً شاذلی کی حزب البر، حزب البحر اور حزب النصر شامل ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ قرآن مجید کے مکمل یا نامکمل ترجمے بھی سواحلی زبان میں موجود ہیں۔ سواحلی میں سورۂ یٰسٓ کا ترجمہ، میراث پر شیخ الشیرازی کا رسالہ اور نماز پر ایک بہت ہی مقبول عام رسالہ جس کا نام "Sula na Manrisho Yake" ہے، بھی قابل ذکر ہیں۔

مآخذ : (۱) J. B. Labat: *Relation historique de l'Ethiopie occidentale, contenant la description des royaumes du Congo, Angolla et Matamba*، پیرس ۱۷۵۳ء؛ (۲) Abbé Proyart: *Histoire du Loango, Kakongo et autres royaumes d'Afrique*، پیرس ۱۷۷۸ء؛ (۳) R. Avelot: *Les grands mouvements de peuples en Afrique, Jaga et Zimba*، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۴) Delafosse et Poutrin: *Enquête coloniale. . . .*، پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۵) P. Marty: *Études sur L'Islam au Sénégal, au Soudan, en Guinee Sural Côte d'Lvoire an Dahoney*، پیرس ۱۹۱۷ تا ۱۹۲۶ء؛ (۶) A. Gouilly: *L'Islam en A O F.*، پیرس ۱۹۲۶ء، *Notes et Études Docmentaires*، عدد ۱۹۵۲ (۱۹۴۷ء)، عدد ۱۶۴۳ (۱۹۵۲ء)؛ (۷) Lieut. L. Nekkech: *Le Mouridisme depuis 1912*، St. Louis du Senegal ۱۹۵۲ء؛ (۸) J. Maes and Boone: *Les Peuplades du Congo Belge*، برسلز ۱۹۳۰ء؛ (۹) وهی مصنف: *Bibliographie du Musée du Congo Belge sous le titre : Bibliographie éthnographique du Congo Belge*، برسلز ۱۹۳۲ء؛ (۱۰) Foureau: *D'Alger au Congo par le Tchad*، پیرس ۱۹۰۲ء؛ (۱۱) Casati: *Dieci anni in Equatoria*، میلان ۱۸۹۱ء؛ (۱۲) R. P. Sacleux: *Dictionnaire Swahili-Français* (مع عربی اشتقاقات)، پیرس ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۱ء؛ (۱۳) R. P. Vanden Eynde: *Grammarire Swahili*، برسلز بلا تاریخ؛ (۱۴) Cornet :

Le Congo physique، برسلز ۱۹۳۸ء؛ (۱۵) G. Hardy:
Vue génerale de l'Histoire d'Afrique، بارچہارم پیرس
۱۹۳۲ء؛ (۱۶) Deschamps: Les religions de l'Afique،
پیرس بلاتاریخ؛ (۱۷) H. Baumann and Westermann:
Les Peuples et les civilisations d l'Afrique، مترجمۂ
Hamburger، پیرس ۱۹۵۱ء؛ (۱۸) V.L. Grottanelli:
I. Bantu (Le Razze e i Popoli della Terra di R.
Biasutti)، ۳: ۵۴۴ تا ۶۳۴، Turin، بلاتاریخ ۱۹۵۵ء؛ (۱۹)
Revue de l'Université de Bruxelles، ۱۹۵۴ء، ص ۵ تا
۱۶ اور ۱۹۵۷ء، ص ۲ تا ۴، مسائل کانگو کے لیے مخصوص ہے؛
(۲۰) P. Ceulemans: La Qustion Arabe et le Congo
1883-92' برسلز ۱۹۵۹ء؛ (۲۱) H.M. Stanley: Through
the dark continent، ۲ جلد، لنڈن ۱۸۷۸ء؛ (۲۲) مصنف
مذکور: Twenty-five years' progress in Equatorial
Africa، لنڈن ۱۸۹۷ء؛ (۲۳) مصنف مذکور: In darkest
Africa، لنڈن ۱۹۰۴ء؛ (۲۴) R. P. Henri Neyrand:
L'Evolution religieuse de L'AEF.، در E'tudes
Américaines, L'AEF.، پیرس بلا تاریخ: ۱۷؛ (۲۵)
G. Eichtal: De l'état actuel et de l'avenir de l'
Islamisme dans l'Afrique centrale، پیرس ۱۸۴۱ء؛
(۲۵) D. Westermann: Geschichte Afrikas، Wiemer
۱۹۵۲ء؛ (۲۵) A. Abel: Documents concernant le
(1893-1894) Bahr al Ghazal، در Bulletin de l'Aca-
démie Royale des Sciences coloniales، ۱۹۵۴ء،
۱۳۸۵ تا ۱۴۰۹؛ (۲۶) مصنف مذکور: Les masulmans
noirs du Manié'ma et de la Province Orientale'
Coll. de l'Institut de Sociologie Solovay، برسلز
۱۹۵۹ء؛ (۲۷) Annuaire du Monde Musulam. (مقالے
کی بنیاد ان معلومات پر ہے جو A. Abel و R. A. Oliver
نے مہیا کی ہیں).

(ادارہ، وآ، لائیڈن بار دوم)

* **کانم**: وسط سوڈان میں ایک علاقہ جو جھیل
چاڈ Tchad کے مشرق اور شمال مشرق میں واقع ہے۔
چند برس قبل کانم کے متعلق ہماری معلومات صرف
Bath، جس نے ۱۸۵۱ء میں اس کے کچھ حصے کا سفر
کیا تھا اور Nachtigal جو بورکو (Borku) جاتے ہوے
یہاں سے گزرا تھا، کے بیانات تک محدود تھیں۔ ۱۹۰۰ء
کے بعد علمی وفود اور ان افسروں اور اہلکاروں
کے اکتشافات سے جنہیں چاڈ کے فوجی علاقے کا
نظم و نسق سپرد تھا، اس امر کا امکان پیدا ہوگیا ہے
کہ مذکورۂ بالا دونوں سیاحوں کی ابتدائی معلومات کی
تصدیق و تکمیل کی جا سکے۔

اگر کانم کے نام کے وسیع ترین مفہوم کو
پیش نظر رکھا جائے تو Nachtigal کی رائے میں اس کا
اطلاق اس علاقے پر ہوتا ہے جس کے شمال میں کوار
(Kawar) سے جھیل چاڈ کو جانے والی تجارتی شاہراہ
گزرتی ہے، جنوب میں بحر الغزال [رَکّ باں]، مشرق میں
ایگوئی (Eguei) کا نشیبی حصہ اور مغرب میں جھیل
ہے اور یہ ۱۴ سے ۱۶ عرض بلد شمالی اور ۱۲ سے
۱۴ طول بلد مشرقی (گرینوچ) کے درمیان واقع ہے۔
اس کے رقبے کا اندازہ ۲۷۰۰۰ سے ۳۰۰۰۰ مربع میل
تک لگایا جا سکتا ہے۔ محدود معنوں میں کانم اس
وسیع رقبے کے صرف ایک حصے پر مشتمل ہے جس کے
مغرب میں جھیل چاڈ، جنوب میں بحرالغزال اور مشرق
میں منگہ Mnaga کا پہاڑی علاقہ ہے جو اسے ایگوئی
سے جدا کرتا ہے۔

مآخذ: H. Barth: Travels and Discoveries
in North and Central Africa، لنڈن ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء جلد
۵، اشاریہ، بذیل مادّۂ Kánembú, Kánem؛ (۲) Nachtigal:
Sahara und Sudan، لائپزگ و برلن ۱۸۷۹ تا ۱۸۸۹ء،
جلد ۲، فصل ۵؛ (۳) H. Carbou: La région du
Tchad et du Ouadaï، پیرس ۱۹۱۲ء (Publications de
l'Ecole des Lettres d'Alger، جلد ۴۷ و ۴۸)؛ (۴)
Cornet: Au Tchad، پیرس ۱۹۱۰ء؛ (۵) G. Destenave:

Le lac Tchad Rev. Génerale des Sciences، ۱۹۰۳ء؛
(۶) Fouques: Le Kanem, Revue, des troupes
coloniales، ۱۹۰۶ء؛ (۷) F. Foureau: D'Alger au
Congo par le Tchad، پیرس ۱۹۰۲ء؛ (۸) Mission
Foureau-Lamy: Documents scientifiques، پیرس
۱۹۰۲ء؛ (۹) A. Foureau: Deux annees dans le
région du Tchad, Bull. du Comité de l'Afrique
française, Renseignements coloniaux، ۱۹۰۴ء؛
(۱۰) Hartmann: Schao und Tundscher (Der
Islamische Orient جلد ۱)؛ (۱۱) Cl. Huart: Le Tchad
et ses habitants, La Géographie، ۱۹۰۴ء؛ (۱۲)
P. Joalland: De Zinder au Tchad et conquéte du
Kanem, La Geographie، ۱۹۰۱ء؛ (۱۳) Labatut:
Le territoire militaire du Tchad Bull. de la Soc. de
géogr. D'Alger et de, l'Afrique du Nord، ۱۹۱۱ء؛
(۱۴) C. Largeau: Situation des pays et protec-
torats du Tchad au point de vue économique Revue
Coloniale، ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۴ء؛ (۱۵) Marquart:
Die Benin Sammlung، ص ۸۱ تا ۸۸؛ (۱۶) Becker:
Zur Gesch. des Östlichen Sudan (Der Islam) ۱:
۵۳ ببعد)؛ (۱۷) S. Passarge: Zur Oberflächenges-
taltung von Kanem, Petermann's Mitteil، ۱۹۰۴ء؛
(۱۸) H. A. MacMichael: The Arabs in the Sudan،
کیمبرج، ۱۹۲۲ء؛ (۱۹) G. J. Lethem: Colloquial
Arabic of the Shuwa Dialect، لنڈن ۱۹۲۰؛ (۲۰)
O. Temple: Notes on the Tribes ete, of Northern
Nigeria، طبع دوم لاگوس ۱۹۲۲ء ص ۲۰۵ ببعد؛ (۲۱)
نیز رک بہ ماخذ تحت مادّہ ہاے بورنو وادی .

(G. Yver [تلخیص از ادارہ])

⊛ **کانم، بورنو**: کانم کے متعلق قدیم ترین حوالہ مسعودی کی مروج الذہب و معدن الجواہر میں ملتا ہے جو ۳۳۲ھ/۹۴۳ء میں لکھی گئی تھی ۔ اس کتاب کے تینتیسویں باب میں وہ بنو کشع (حبشیوں) کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ان میں سے نوبیہ، بجہ اور زنج کے قبائل تو المغرب کی جانب جا کر آباد ہو گئے ۔ یہ علاقہ زغاوہ، کانم، مرکہ اور غانہ کے اطراف میں ہے ۔ اس کے علاوہ وہ ممالک حبش کے دوسرے علاقوں اور دمدمہ میں بھی آباد ہیں (مسعودی : مروج، طبع de Meynard و Courteille، پیرس ۱۸۶۳ء، ۳ : ۱ و ۲) .

اندلسی جغرافیہ نویس ابو عبیداللہ البکری، کتاب المسالک و الممالک (طبع Slane، الجزائر، ۱۹۱۱ء)، میں طرابلس کے جنوب مغرب میں ایک زویلہ کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے کہ زویلہ کے صحرا سے پرے اور اس شہر سے چالیس روز کے فاصلے پر کانم کا ملک واقع ہے جہاں حبشی بت پرستوں کی ایک نسل آباد ہے اور ان تک پہنچنا بہت مشکل ہے (ص ۱۱) .

المقریزی (م ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء) نوبیہ کے حالات کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے: "نیل کے ایک پہلو پر ایک ملک ہے جس کا نام کانم ہے اور وہاں کا بادشاہ مسلمان ہے ۔ یہ ملک ملی (مالی) سے بہت دور ہے ۔ اس کے صدر مقام کو الجمی (الجمع) کہتے ہیں ۔ اس ملک کا پہلا شہر جو مصر کی جانب ہے، زلہ کے نام سے مشہور ہے ۔ اس شہر اور ککہ (کاکا) کے درمیان جہاں سے دوسری حد شروع ہوتی ہے، پورے تین ماہ کا سفر ہے ۔ یہ سلطنت جو افریقیہ اور برقہ کے درمیان واقع ہے، جنوب کی جانب تک غرب الاوسط کے متوازی پھیلتی چلی گئی ہے ۔ یہاں کی زمین خشک، پتھریلی اور بنجر ہے" (اقتباس در Quartremere: *Memoires*، ۲ : ۲۷ و ۲۸) ۔ عرب مصنفین نیل کا نام نائیجر کو دیتے رہے ۔ ان کا یہ خیال تھا کہ نیل ابیض سوڈان کے جنوب میں پہنچ کر نائیجر سے جا ملتا ہے اور "الکانم وہ بہت بڑا علاقہ ہے جسے نیل مبارک خوب سیراب کرتا ہے

اور الجمع اور التاجو کی حکومت کا درمیانی فاصلہ دس منزلوں کے برابر ہے" (اقتباس، در Hamker : *Spec. Cat.*، ص ۲۰۶) اور ان (اہل نوبیہ) کے نزدیک الکانم ہے ۔ یہ ایک بڑی قوم ہے جس میں زیادہ تر مسلمان ہیں ۔ ان کا شہر الجِمہ (الجمع) ہے (کتاب مذکور، ص ۲۰۵)۔ المقریزی کے زمانے میں کانم کا بادشاہ الحاج ابراہیم بن آل سیف بن ذویزن تھا اور یہاں کا بڑا شہر کانم تھا جو بورنو کا صدر مقام تھا (کتاب مذکور، ص ۲۰۷)۔ ظاہر ہے کہ صدر مقام کا نام اس ملک کے نام سے ملتبس ہو جاتا ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰۰ھ/۱۰۰۰ء سے کچھ پہلے سلطنت کانم یا بورنو میں جس کا بڑا شہر الجمہ (جمی Njimye درکانم) تھا، ایک بادشاہ ہیوم Hume نامی حکومت کرتا تھا ۔ وہ مسلمان تھا جس نے ایک نئے شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی تھی ۔ وہ نسلاً بربری اور بردوعہ کے قبیلے سے تھا ۔ وہاں کے باشندے آہستہ آہستہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے ۔ H. Barthotd (*Travels and Discoveries in North and Central Africa*، انگریزی ترجمہ ۱۸۵۷ - ۱۸۵۸، ص ۲۶۴ و ۲۶۵، حاشیہ) اہالی بورنو کی ایک عام روایت کے حوالے سے لکھتا ہے کہ سیفوہ Séfuwa نے اس وقت اسلام قبول کیا جب وہ مصر ہی میں آباد تھے اور ان کو اسلام کی تبلیغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک خاص ایلچی نے کی تھی ۔ اس کے لیے کوئی سند موجود نہیں اور صرف یہ سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ یہ ایک عام روایتی بیان ہے جو بورنو میں زبان زد خلائق ہے ۔ Mischlich : *Contributions to the History of the Hausa States*، در *Journ Afr. Socy.*، ۴ (۱۹۰۴ - ۱۹۰۵ : ص ۴۵۵ تا ۴۷۹) میں یہ روایت ذرا اختلاف سے بیان ہوئی ہے ۔ اس روایت کے مطابق بورنو کے ایک پادشاہ دلمی نامی نے اسلام کی ترقی کا حال سنا اور اس نے اپنا ایک نمائندہ مکۂ معظمہ میں اس غرض سے بھیجا کہ وہاں سے ایک مبلّغ بورنو بھی بھجوایا جائے ۔ اس درخواست کی تعمیل میں خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ نے (۱۳ھ تا ۲۳ھ) عمرو بن العاصؓ کو چند صحابیوں کے ساتھ وہاں بھیج دیا ۔ ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور بورنو کے تمام لوگ [اسلام کے اصولوں اور اچھائیوں سے متأثر ہوکر بہت جلد مسلمان ہوگئے] ۔ البکری کے بیانات کہ اس کے زمانے میں اہالی بورنو بت پرست تھے اور ان کے ہاں جانا کوئی آسان کام نہ تھا، [محل نظر ہیں]۔

المقریزی کے زمانے میں جو مسلم خاندان وہاں حکومت کرتا تھا، اس کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ وہ تین صدیوں سے زیادہ عرصے سے وہاں حکومت کر رہا تھا ۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اس ملک میں سب سے پہلا مبلّغ اسلام ایک شخص حاجی ہادی العثمانی پہنچا، جو اپنے آپ کو حضرت عثمانؓ کی اولاد میں سے بتاتا تھا ۔ اس کے بعد اس ملک کی حکومت قبیلۂ یزنی میں منتقل ہو گئی جو سعید بن ذویزن کی اولاد میں سے ہیں ۔ یہ لوگ امام مالکؒ کے پیرو ہیں اور مذہبی عقائد و فرائض کے پورے پابند ہیں ۔ شہر فسطاط (قاہرۂ قدیم) میں انہوں نے ۶۴۰ھ/۱۲۴۲ء میں مالکی فقہ کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کیا اور یہ مدرسہ ابن راشق کے نام سے موسوم تھا ۔ یہ وہی مدرسہ ہے جس میں ان کے سفیر آ کر ٹھیرا کرتے تھے (المقریزی نیز Quatremere : *Memoires*، ۲ : ۲۸)۔ ہادی کے متعلق، جو ویسے تو ایک غیر معروف شخص ہے، یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کے خاندان سے تھا جس کی تصدیق اس کے نام کی ترکیب سے ہوتی ہے ، لیکن اس کا براہ راست حضرت عمرؓ کی اولاد سے ہونا ظاہر نہیں ہوتا ۔ حضرت عثمانؓ قبیلۂ قریش کے اموی خاندان سے تھے ۔ اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ یہ اور قسم کی روایت ہو اور کسی بعد کے زمانے میں اموی خاندان کے کچھ پناہ گزینوں نے یا ان کے حلیفوں نے

افریقیه کے کسی دور دراز مقام میں جا کر پناہ لے لی ہو۔ المقریزی اپنی تصنیف میں کسی دوسری جگہ اپنے زمانے میں یہ لکھتا ہے کہ کانم میں بنو سیف حکومت کرتے تھے (مذکورۂ بالا) اور اس بات کی تصدیق تاریخ بورنو (Chronicle of Bornu) سے بھی ہوتی ہے جو دسویں صدی ہجری کی ایک تصنیف ہے اور اس کے اقتباسات لائپزگ اورینٹل سوسائٹی (۱۸۵۲ء، ص ۳۰۵ ببعد) کے "جرنل" میں M. Blau کے ترجمے اور حواشی کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی رو سے بھی بورنو کے مسلم حکمران خاندان کا سلسلۂ نسب سیف بن ذویزن تک پہنچتا ہے جس کی وجہ سے وہ "سیفوہ" یا "یزنی" کہلانے لگے۔ سیفوہ یا سفوہ کے نام سے، جو اس خاندان نے اختیار کیا تھا، اب بورنو میں کوئی بھی واقف نہیں (Doc. scient. de la Mission Tilho، پیرس ۱۹۱۱ء، ص ۳۵۲)۔ قدیم زمانے کے حکمرانوں کو تُبّع کہتے تھے اور یہ نام یمن کے قدیم حکمرانوں کے لیے استعمال ہوا کرتا تھا۔ سلاطین کانم و بورنو کی فہرست کے مطابق (کتاب مذکور، ص ۳۴۲ تا ۳۵۱) مورث اعلٰی سیف بن ایسّتہ Aissata تھا جسے مکّتہ (مکّی) کہہ کر پکارتے تھے۔ اس طرح یہ دعوٰی کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ عربی نسل سے تھے۔ کوئیوں کی اصل بھی وہی تھی جو تبّعوں کی تھی۔ تبّعوں کی طرح وہ بھی رفتہ رفتہ یمن سے کانم آئے تھے اور سفر میں غریب طلبہ کی طرح بسر اوقات کرتے تھے۔ یمن سے کانم تک کے سفر کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا ہوگا۔ وہ دائرویہ Dieraoua کے علاقے میں سترھویں صدی ہجری کے نصف میں آباد ہونے لگے۔ اس زمانے میں تبع کزرسومو Kazer Soumo یہ حکومت کرتے تھے اور انھوں نے سارے ملک پر اپنا تسلط جما لیا تھا اور ان کی مملکت کی حدود چاڈ سے لے کر نائیجر تک وسیع ہو گئی تھیں (کتاب مذکور، ص ۲۹۶)۔ یہ کوئی مستند تاریخی بات نہیں بلکہ محض زبانی روایت ہے اور غالبًا بعد کے زمانے میں وضع ہوئی کہ سفوہ یا تبع یمنی یا مکّی الاصل تھے۔ عبدالرحمن بن عبداللہ بن عمران بن عامر جو سیدی ٹمبکٹو کے لقب سے مشہور ہیں، اپنی تصنیف تاریخ السودان (طبع و مترجمۂ O. Houdas، پیرس ج ۱، متن ۱۸۹۸ء، ج ۲، ترجمہ ۱۹۰۰ء) میں لکھتے ہیں کہ حکمران خاندان یمن سے آیا تھا، لیکن یہ تاریخ سترھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی اور اس اعتبار سے صرف مروجہ روایات ہی کی حامل ہو سکتی ہے۔ بقول المقریزی اسلام کے بعد پہلا بادشاہ محمد بن جبل بن عبداللہ بن عثمان بن محمد (Spec. Cat. : Hamaker، ص ۲۰۵) تھا، لیکن فہرست (مذکورۂ بالا) میں اس کا نام ہیوم Hume درج ہے جو دگ یا دک کی اولاد میں سے تھا۔ قدیم کافر خاندان دگوہ یا آل دگ کے نام سے مشہور تھا اور بعد کا مسلم خاندان آل ہیوم کہلاتا تھا۔ Barth کے اعداد و شمار کے مطابق عہد ہیوم ۴۷۹ھ تا ۴۹۱ھ کے لگ بھگ ہے، نختیگل Nachtigal ۴۶۰ تا ۵۲۴ھ کے زمانے کو ترجیح دیتا ہے اور مشن تلہو Mission Tilho کی رائے میں یہ زمانہ ۴۶۳ تا ۴۸۶ھ کے درمیان کا ہے (Doc. scient de la. Miss. Tilho، ص ۳۴۸ تا ۳۴۹)۔ زیادہ معقول بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کانم کے مسلم حکمرانوں کا عہد حکومت پانچویں صدی ہجری کے آخری حصے سے شمار کیا جائے اور المقریزی کے اس بیان سے کہ "اس کے بعد (ہادی العثمانی) حکومت یزنیوں میں منتقل ہو گئی" (مذکورۂ بالا) یہ مراد لی جائے گی کہ ہادی پہلا شخص تھا جس نے اسی صدی کے پہلے حصے میں اس ملک میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی۔

پانچویں صدی سے کانم کے مسلمانوں اور مسلمان بادشاہوں کے متعلق تو بہت حوالے ملتے ہیں، لیکن اس سے پہلے زمانے کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں احیاے دین کے جذبے

سے سرشار ہو کر مسلمان شمال کی جانب سے مغربی سوڈان میں آہستہ آہستہ داخل ہو رہے تھے ۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کانم میں اسلام شمال کی جانب سے آیا ؟ آرنلڈ *Preaching of Islam* ، ص ۳۲۰ میں لکھتا ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت اس ملک میں مصر کی جانب سے ہوئی، لیکن اپنے اس بیان کی تائید میں وہ کوئی سند پیش نہیں کرتا ۔ غالباً اس استدلال کی وجہ یہ ہے کہ ایک قدیم راستہ جبل النری J. en-Nari سے ہوتا ہوا ایک نخلستان میں سے گزرتا تھا، جو اب غیر آباد ہے اور وہاں سے مشرق شمال مشرق کی جانب مصر جا پہنچتا تھا ۔ اس راستے کے قدیم آثار ابھی باقی ہیں ۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی علم ہے کہ بورنو کے علاقے کے حاجی پہلے زمانے میں بھی اور اب بھی اکثر اوقات مصر کے راستے ہی مکۂ معظمہ آتے جاتے ہیں ۔

تاریخ بورنو (مذکورۂ بالا) میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو صنہاجہ بربریوں (*Jour. Leipz. Or. Soc*، ص ۳۰۵ ببعد) سے منسوب کیا گیا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ ہوسہ زبان میں بربریوں کے نام سے "بورنو قوم" مراد لی ہے ۔

اسلامی دنیا میں بورنو کے تعلقات رسل و رسائل تین اطراف سے قائم تھے، شمال مشرق بذریعۂ مصر بالائی، شمال بذریعۂ طرابلس اور شمال مغرب بذریعۂ المغرب (تونس، الجیریا، مراکو) ۔ مشرق کی طرف کو نظر انداز کر دینا چاہیے کیونکہ سولھویں صدی عیسوی تک اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ جب اسلام پہلے پہل کوردوفان Kordofan اور دارفور کے علاقوں میں پھیلا تو اس وقت اس جانب سے کوئی اسلامی یا عرب اثر اس ملک پر پڑا ہو ۔ اس وقت تک نوبیہ اور حبشہ (ابی سینیا) کی وجہ سے راستوں میں رکاوٹ تھی لیکن جب نوبیہ میں نصرانی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تو آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوگیا ۔

۷۸۸ھ/۱۳۸۸ء میں حکمران خاندان بورنو کو ملک سے خارج کرکے اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ بلالہ Bulala کے رستے مغرب کی طرف چلے جائیں ۔ اس کے بعد مائی علی غجدنی Mai ʻAli Ghejideni نے برنی یا بورنو جدید کی حکومت قائم کی ۔ ۱۸۰۸ء میں حکومت فلہ نے بورنو پر حملہ کیا اور اس سے اگلے سال اِسی حکومت نے بورنو قدیم کو تباہ کر دیا ۔

۱۸۹۳ء کے لگ بھگ ربہ حبشی نے جو زبیر پاشا کا غلام تھا، بجرمی Bagermi کی جانب پیش قدمی کی اور بورنو پر حملہ کر دیا ۔ احسم Ahsem شاہ بورنو نے راہ فرار اختیار کی اور ربہ نے شہر میں داخل ہو کر اسے پوری طرح تباہ کرکے دکوہ Dikwa میں نیا صدر مقام بنا لیا ۔ ربہ ۱۹۰۰ء میں مارا گیا اور اس کے دو سال بعد انگریزوں نے Shehu Garbai کو کوکہ Kuka میں تخت نشین کر دیا ۔

(DE LACY O'LEARY [و تلخیص از ادارہ])

* **کانو** (الحوصۃ کی زبان میں کانُو): وسط سوڈان کا ایک شہر جو قوقہ (قاموس الاعلام، ۵ : ۳۷۵۱) سے ۳۰۰ میل مغرب اور سکوتو Sokoto سے ۲۹۰ میل مشرق جنوب مشرق میں، سطح سمندر سے ۱۲۰۰ فٹ کی بلندی اور ۱۲ درجے ۲۷ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۸ درجے ۲۰ دقیقے طول بلد مشرق (گرینچ) پر واقع ہے ۔ کانو ایک دلدلی میدان کے وسط میں آباد ہے جس پر گورون دُچی Goron Duchi اور دَلَہ کی منفصل خشک چٹان والی پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں ۔

مآخذ : (۱) Leo Africanus، طبع R. Brown، لنڈن (Hakluyt Society)، ۱۸۹۶ء، ۳ : ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۸ ۸۳۹؛ (۲) *Description de l'Africuc*، ج ۷، طبع Schefer، ۳ : ۳۰۵؛ (۳) O. Temple : *Notes on the Tribes etc. of Northern Nigeria*، ۱۹۲۲ء، ص ۳۶۳ تا ۳۸۶؛ (۴) H. Barth : *Travels and Discoveries in North and Central Africa*، ۱۸۵۶-۱۸۵۸ء،

۲ : ۹۴، ۱۰۷، ۱۲۱ تا ۱۲۵، ۱۴۳؛ ۵ : ۳۵۸ ؛ (۵) Schön : *Dictionary of the Hausa Language*، لنڈن ۱۸۷۶ء بذیل مادۂ قاؤ، ص ۱۰۳، ۱۰۴؛ (۶) *Nigerian District. Gazetteers*؛ (۷) Schön : *Magána Hausa*، لنڈن ۱۸۸۵ء، ص ۲۶۳ تا ۲۶۵؛ (۸) Harris : *Hausa Stories*، Weston Super Mare تاریخ ندارد، ص ۸۲ تا ۹۸؛ (۹) P. L. Monteil : *De Saint Louis à Tripoli par le Tchad*، پیرس ۱۸۹۴ء، باب ۱۰؛ (۱۰) C. H. Robinson: *Hausaland*، لنڈن ۱۸۹۶ء، باب ۸؛ (۱۱) C. P. Lucas : *Historical Geography of the British Colonies*، ج ۳، ۱۹۱۳ء؛ (۱۲) *Le Commerce des caravanes tripolitaines dans la région du lac Tchad et le Sokoto.— Bulletin du Comité de l'Afrique Française*، ۱۸۹۸ء، *Renseigrements coloniaux*؛ (۱۳) Marquart : *Die Benin-Sammlung*، ص xcx تا xcxii؛ (۱۴) Mischlich و Lippert : *Beiträge zur Geschichte der Haussastaaten Mitth. d. Sem. f. Or. Sprachen*، سلسلۂ ششم، ۳ : ۵ تا ۷؛ (۱۵) Paul Staudinger : *Im Herzen der Haussaländer*، لائپزگ ۱۸۹۱ء نیز رک بہ ماخذ بذیل مادۂ ہوسہ (Hausa).

(G. YVER [تلخیص از ادارہ])

* **کانَ و کانْ** : جدید عربی نظم کی ایک قسم ہے۔ یہ اہل بغداد کی ایجاد ہے اور اس کا یہ نام اس لیے پڑا کہ قصہ گو اپنے قصے کے شروع میں کَان و کَان کہا کرتے تھے، جس کا مطلب ہے "ایک زمانے میں ایسا ہوا"۔ ابتدا میں "کان و کان" قصے کہانیوں کو کہتے تھے جن کی عبارت میں قافیہ بندی کا اہتمام کیا جاتا تھا، بعد میں دیگر مواضع کے لیے اور بالخصوص اخلاقی رجحان رکھنے والے مواضع کے لیے یہ طرز بیان استعمال کرنے لگے۔ عامی زبان میں اس کا استعمال صرف مشرق میں ہوتا تھا، خاص کر بغداد میں جہاں یہ اسلوب ایجاد ہوا۔ "کان و کان" ایک قسم کی نظم ہے جس میں دو ابیات کا ایک بند ہوتا ہے۔ اس کا وزن ماہرین عروض یہ بتاتے ہیں:

مستفعلن فاعلاتن مستفعلن مستفعلان
" " " فعْلان

لیکن راقم مقالہ نے جو ۴۲ نمونے اس قسم کی نظم کے دیکھے ہیں، ان میں پہلے مصرع کا آخر رکن مستفعلن ہوتا ہے، مستفعلان نہیں، لہذا ہر بند کے دوسرے بیت کا آخری مصرع ہم قافیہ ہوگا۔ اس کے اہم ترین زحافات یہ ہیں: مستفعلن سے س یا ف گر جاتی ہے اور فعْلان کو اکثر فاعلان کر لیتے ہیں۔ الابشیہی: المستطرف، بولاق ۱۲۹۲ھ، ۲ : ۲۷۳ ببعد؛ ابوالفداء: تاریخ، قسطنطینیہ ۱۲۸۶ھ)، ۴ : ۱۵۸؛ اور بالخصوص حَرَیفیش: الرَوض الفائق، قاہرہ ۱۳۱۱ھ ص ۲۳، ۲۶، ۲۹، ۳۳، ۳۴، ۴۲، ۵۳، ۵۵، ۷۱، ۷۴، ۷۷، ۸۰، ۸۶، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۴۴، ۱۶۹، ۱۸۱، ۱۹۱، ۲۰۴، ۲۱۷ میں کان و کان کے نمونے دیے ہیں۔

مآخذ : ان مآخذ کے علاوہ جن کا ذکر مقالۂ عروض میں آیا ہے، دیکھیے (۱) الخفاجی : شفاء الغلیل، قاہرہ ۱۳۲۵، ص ۹؛ (۲) المحبّی: خلاصة الاثر، قاہرہ ۱۲۸۴ھ، ۱ : ۱۰۹؛ (۳) الابشیہی : المستطرف، بولاق ۱۲۹۲ھ، ۲ : ۲۵۲ تا ۲۷۷؛ (۴) محمد طلعت : غایة الارب فی صناعات شعر العرب، قاہرہ ۱۳۱۶ھ، ص ۹۲ تا ۱۰۱؛ (۵) محمد زیات : تاریخ آداب اللغة العربیه، قاہرہ (بلا تاریخ)، ۱ : ۱۲۹ تا ۱۵۰؛ (۶) H. Gies : *al-Funūn-al-Sab'a.-Ein Beitrag z. rennin. sieben neuerer arab. Versarten*، مقالہ، لائپزگ ۱۸۷۹ء، ص ۵۳ تا ۶۲.

(MOH. BEN CHENEB)

* **کانُون** : ایک مہینے کا نام جو تَدْمُر (Palmyra) کے قدیم کتبوں میں بھی ملتا ہے (دیکھیے S. A. Cook: *A Glossary of Aramaic Inscriptions*، بذیل مادّہ) اور مَرْحیشْوان کا مرادف ہے۔ بعد کے زمانے میں یہ مہینوں

کے سریانی ناموں میں (دیکھیے Payne Smith : *Thesau-rus Syr.*، بذیل مادّہ) کانون قدم (k^edēm) یا قدمایا (kadmāyā) اور کانون حرای ḥrāy یا حرایا ḥrāyā کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ یہاں دونوں کانون بالترتیب نواں اور دسواں مہینا ہیں ۔ البیرونی اپنی کتاب الآثارالباقیہ، (طبع Sachau، ص ۶۰) میں سریانی ناموں کو صحیح طور پر کانون قدیم اور کانون حرای کی شکل میں نقل کرتا ہے ۔ عربی اصطلاح میں یہ مہینے کانون الاوّل اور کانون الآخر کہلاتے ہیں ۔ ان میں سے پہلے کا ذکر حدیث میں ایک قابل لحاظ عنوان سے آیا ہے ۔ مسلم: صحیح، کتاب الاشربۃ، حدیث ۹۹، میں پانی کے برتنوں کو ڈھانپ کر رکھنے کے قاعدے کے ضمن میں جس کا ذکر دوسرے مقامات پر بھی آیا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ "سال میں ایک رات ایسی بھی آتی ہے جس میں وبا کسی بے ڈھکے برتن کو نہیں چھوڑتی" ۔ اسی حدیث کی ایک اور روایت میں یہ اضافہ کیا گیا ہے : "ہمارے درمیان رہنے والے باہر کے لوگ (اعاجم) اس کا خدشہ کانون الاوّل میں ظاہر کیا کرتے تھے"۔

(A. J. Wensinck)

* **کانی ابوبکر** : دور عثمانیہ میں قدیم دبستان ادب کا ایک قابل ذکر شاعر اور ایک صاحب طرز نثر نگار، ایشیاے کوچک میں توقاد Tokad کے مقام پر ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں پیدا ہوا ۔ ابھی نوجوان ھی تھا کہ اس نے اپنے آبائی شہر میں ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کر لی ۔ وہ سلسلۂ مولویہ سے وابستہ تھا اور اسے توقاد کی خانقاہ مولویہ کے شیخ کی خدمت تفویض کی گئی تھی ۔ اس کی زندگی کا ایک اہم انقلاب انگیز واقعہ یہ ہے کہ ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴-۱۷۵۵ء میں حکیم اوغلو علی پاشا کا توقاد سے گزر ہوا، جسے طربزون Trebizond سے قسطنطینیہ تیسری بار صدر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے لیے لایا گیا تھا ۔ کانی نے اس کی خدمت میں ایک قصیدۂ استقبالیہ اور ایک مادّۂ تاریخ پیش کیا، جس سے وہ سن رسیدہ سیاست دان اس قدر متأثر ہوا کہ اس کے شیخ طریقت سے اجازت لے کر کانی کو اسی وقت اپنے ساتھ قسطنطینیہ لے گیا اور دیوان شاہی میں ایک عہدہ عطا کر دیا ۔ اس طرح کانی کے سامنے اعلٰی سرکاری عہدے حاصل کرنے کا راستہ کھل گیا، لیکن جاہ طلبی کا مادّہ اس کی فطرت ھی میں نہیں تھا: اسے تو وھی بے نیازی کی اور ایک حد تک پابندیوں سے آزاد زندگی پسند تھی جو وہ اپنے آبائی شہر میں بسر کرتا رہا تھا ۔ وہ ایک سست همت شخص تھا اور اپنی طویل عمر کے آخری ایام میں کہیں جا کر اس نے اپنے طریقے کی سالکانہ زندگی کی طرف رجوع کیا تھا، چنانچہ اس نے اپنے سرپرست کی معزولی سے جو صرف دو ماہ تک عہدہ سنبھالنے کے بعد پیش آئی، یہ فائدہ اٹھایا کہ قسطنطینیہ کی ملازمت ترک کر دی ۔ اس کے بعد اس کی سرگرمیاں صرف صوبوں، یعنی سالسترہ (Silistria)، افلاق (Wallachia) اور بخارسٹ Bucharest، تک محدود رہیں ۔ وہ خاصے عرصے تک گورنر الیگزنڈر کے ہاں معتمد دیوان رہا ۔ سنایہ Sinaya کے عجائب گھر میں ایک تصویر ہے، جس میں یہ دونوں اکھٹے نظر آتے ہیں۔ بالآخر جب یکن محمدّ پاشا، جو پیشتر ازیں کانی کا بہت گہرا دوست رہا تھا، صدارت عظمٰی کے عہدے پر فائز ہوا (۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء) تو اس نے کانی کو قسطنطینیہ بلا لیا، لیکن اس طلبی سے بدبختی کے سوا کانی کے ہاتھ کچھ نہ آیا ۔ کانی نے رسوم و آداب کا مطلقاً خیال نہ کیا اور صدر اعظم سے پرانے زمانے کی طرح، جب ان دونوں کے مرتبے میں کوئی فرق نہیں تھا، بے تکلفی سے پیش آتا رہا ۔ اس کے علاوہ اس نے بے پروائی سے کچھ ایسی باتیں بھی منہ سے نکل

دیں جنھیں پوشیدہ رکھنا ضروری تھا۔ یکن پاشا نے اس کی ان حرکات سے برافروختہ ہو کر اس کے لیے سزاے موت کا حکم صادر کر دیا، جسے بڑی مشکل سے لِمنوس Lemnos میں جلاوطنی کی سزا میں تبدیل کرایا گیا ۔ اس کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی، چنانچہ اب اسے غربت کے مصائب کا بھی سامنا کرنا پڑا ۔ اس نے ربیع الآخر ۱۲۰۶ھ/جنوری ۔ فروری ۱۷۹۲ء میں وفات پائی اور [قبرستان] ایّوب میں دفن ھوا ۔ سروری اور سنبل زادہ نے اس کی وفات کی تاریخیں لکھیں ۔

کانی عثمانی ادب کے اس زمانے کی ایک اھم شخصیت ھے جب کلاسیکی طرز نگارش کے بعد رومانی دور شروع ھوا، جس کے دوران میں ایرانی اثرات ختم ھو گئے اور ان کی جگہ زیادہ تر جذبۂ قومیت نے لے لی ۔ کانی بحیثیت شاعر کچھ ایسا ممتاز نہیں، بلکہ اس میں عثمانی شعرا کی بنیادی خصوصیات، یعنی زبان کی سلاست اور صفائی کا بھی فقدان پایا جاتا ھے ۔ اس کے کلام میں بہت سی ناھمواریاں اور زبان کی درشتی پائی جاتی ھے، جس کا تعلق اس کے عام طرز عمل سے بہت گہرا ھے ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ھے کہ وہ ہر واقعے اور موقع پر فی‌البدیہہ شعر کہہ دیتا تھا ۔ یہاں یہ ذکر بھی کر دینا چاھیے کہ کانی نے خود نہ تو کبھی اپنے کلام کو جمع یا مرتب کیا اور نہ اپنے دیوان پر نظرثانی کی ۔ یہ محض رئیس الکتاب محمّد راشد افندی کی تحریک تھی کہ نوری نے اس کا وہ تمام کلام جو اس وقت دستیاب ھو سکا، جمع کر لیا اور دیوان شائع ھوگیا ۔ اس کے کلام کا ایک حصہ ضائع ھو چکا ھے ۔ اس نے ترکی کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ھے ۔

اس کی منظومات میں متعدد حمدیہ نظمیں، نظیرے، تخمیسات، قصائد، تاریخی مادّے اور سیکڑوں غزلیات موجود ھیں ۔ جو چیز کانی کے کلام کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ھے وہ اس کی بذلہ سنجی، مزاح اور اس کا ظریفانہ اسلوب بیان ھے، ورنہ اس سے پہلے قدیم ترکی شعرا کے ھاں ظرافت کا فقدان نظر آتا ھے ۔

ایک نثرنگار کی حیثیت سے کانی کو اس کی منشئات کی بنا پر بہت بلند مرتبہ دینا چاھیے۔ اس کے بارے میں ابوالضیا توفیق کی بہت اعلیٰ رائے تھی : ”جہاں تک اس کے اسلوب نگارش کا تعلق ھے کسی قوم میں اس مرتبے کے نثر نگار پانچ یا چھے سے زیادہ نہیں ھوا کرتے“ ۔ کانی اپنے مکتوبات میں اپنی طبیعت کی شوخی و ظرافت کا بڑی آزادی سے مظاھرہ کرتا ھے اور نہایت عجیب و غریب شگفتہ آرائشی جملے لکھتا ھے ۔ اس کا مقابلہ [ایک مشہور فرانسیسی مصنّف] Rabelais [م ۱۵۵۳ء] سے کیا جا سکتا ھے ۔ اس کے کئی ظریفانہ اقوال اور حکایات محفوظ ھیں ۔ وہ اپنی خوش باش طبیعت اور ظرافت کی بدولت بے حد ھردلعزیز ھو گیا اور اس کے خطوط (جن میں سے صرف ۱۲۰ موجود ھیں) اور منظومات پر سامعین اور قارئین اس طرح داد دینے لگے کہ موجودہ زمانے کے مذاق اور فکر کو پیش نظر رکھتے ھوے اس کا اندازہ پوری طرح لگانا محال ھے ۔ اس کی تصنیفات کو خاص طور پر اھمیت اس کے اسلوب بیان کی بدولت حاصل ھے کیونکہ وہ بسا اوقات ایسے عام پسند جملے استعمال کر جاتا ھے جو ادبی زبان میں نہیں ملتے اور ایسی باتیں کہہ جاتا ھے جو غیر متوقع بھی ھوتی ھیں اور غیر معمولی بھی ۔

مآخذ : (۱) احمد رفعت : لغات تاریخیہ و جغرافیہ، قسطنطینیہ، ۱۳۰۰ھ، ۶ : ۷۰؛ (۲) نُوری : مُنشَئات عزیزیّہ، قسطنطینیہ، ۱۳۰۳ھ، ص ۶۲ تا ۶۳؛ (۳) ابوالضّیا توفیق : نمونۂ ادبیات عثمانیہ، قسطنطینیہ، ۱۳۰۸ھ، ص ۴۳ تا ۶۱؛

(۴) معلم ناجی، اسامی، قسطنطینیه، ۱۳۰۸ھ، ص ۲۶۱ تا ۲۶۳؛ (۵) جودت : تاریخ، قسطنطینیه، ۱۳۰۹ھ، ۵ : ۲۳۴ تا ۲۳۵؛ (۶) سامی : قاموس الأعلام، قسطنطینیه، ۱۳۰۶ تا ۱۳۱۴ھ، ۵ : ۲۸۱۹؛ (۷) ثریّا : سجلِ عثمانی، قسطنطینیه، ۱۳۱۵ھ، ۴ : ۷۴؛ (۸) شہاب الدّین سلیمان : تاریخ ادبیّاتِ عثمانیه، قسطنطینیه ۱۳۲۸ھ، ص ۲۳۱ تا ۲۳۹؛ (۹) v. Hammer : *Gesch. d. Osman. Dichtkunst*، ۴ : ۳۶۶ تا ۳۶۷؛ (۱۰) Gibb : *A History of Ottoman Poetry*، ۴ : ۱۵۹ تا ۱۷۴ .

(Th. Menzel)

* **کاوِین [کابِین]** : مہر؛ رک به مہر و نکاح .

* **کاہن** : رک به الکُہّان .

* **الکاہِنہ** : اس کا نام (دَمْیَة یا دھیه) مشکوک ہے، کیونکہ کاہنہ صرف ایک لقب ہے۔ ابن خَلْدون کے بیان کے مطابق اس کا تعلّق اَوْراس [رک بآن] کے ایک یہودی (؟) قبیلے جَرْوَہ سے تھا ۔ بربروں کے ان شیوخ کا تعلق اسی قبیلے سے تھا جو الابتر کی نسل سے تھے۔ جب حسّان بن النّعمان [رک بآن] نے بوزنطیوں پر فتح پائی تو وہ اَوْراس کی طرف بڑھا، جہاں کاہنہ حکومت کرتی تھی ۔ کاہنہ نے اسے مِسْکِیانَة (عَیْن بَیْضاء اور تِبِسّة کے درمیان—موجودہ ضلع قسنطینہ میں) کے مقام پر اور بعض دوسرے مآخذ کی رو سے قابِس (Gabcs) کے علاقے یا نِنِی (Nini) کے نخلستان میں شکست فاش دی اور افریقیه کی حدود سے باہر نکال دیا ۔ چونکہ خلیفہ عبدالملک ان دنوں مشرقی ممالک میں اپنی جنگوں کی وجہ سے مشکلات میں گرفتار تھا، اس لیے کمک بھیجنے میں دیر ہوگئی ۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں کاہنہ نے سارے ملک کو اپنے حلقۂ اقتدار میں شامل کر لیا اور عربوں کے نئے حملوں کو روکنے کے لیے کئی شہر تباہ کر دیے، جنگل کاٹ دیے اور ملک کو ویران کر ڈالا ۔ کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں کاہنہ نے ایک قیدی خالد بن یزید القَیْسی کو، جس کے ساتھ اسے رضاعی قرابت کا دعوٰی تھا، اپنا متبنّٰی بنا لیا، لیکن یہ حسن سلوک اس متبنّٰی کو اس سے بے وفائی کرنے سے باز نہ رکھ سکا ۔ ملک کو تاخت و تاراج کردینے کے باعث رعایا کاہنہ سے کشیدہ خاطر ہوگئی؛ چنانچہ پانچ سال بعد جب حسّان بن النّعمان کمک لے کر واپس آیا تو طَبْرَقَه کے مقام پر ایک خونریز جنگ (۸۲ یا ۸۴ھ/۷۰۱ یا ۷۰۳ء) میں کاہنہ کو شکست ہوئی، اور وہ اَوْراس میں اس جگہ ماری گئی جو بیرالکاہنہ کے نام سے مشہور ہے ۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے کاہنہ کے مشورے سے اس کے دو بیٹے عربوں سے جا ملے تھے اور انھیں اسلامی فوج میں، جس نے بربروں کے خلاف جنگ جاری رکھی، عہدے بھی دے دیے گئے تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں وثوق سے اتنا بھی معلوم نہیں کہ کاہنہ کوئی ملکہ تھی یا فاطمہ کی طرح، جو للہ ۱۸۵۷ء میں فرانسیسیوں کے خلاف القبائل کی مدافعت کی روح و رواں للہ فاطمہ کی طرح اس کے بارے میں بھی جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، (مثلاً جان بوجھ کر شمالی افریقہ کو تاخت و تاراج کرنا، قلعة الجم (Thysdrus کی مدور تماشاگاہ) میں اس کی مدافعانہ جنگ، اور اس کی موت سے متعلّق حالات و واقعات) وہ تقریباً سب افسانوی باتیں ہیں ۔ ایک بربر ماہر الانساب ہانی بن بکور تو یہاں تک کہتا ہے کہ اس نے ۶۵ سال حکومت کی اور ۱۲۷ سال کی عمر پائی .

مآخذ : (۱) ابن خَلْدون : العِبَر، ۷ : ۸ ببعد، جزوی فرانسیسی ترجمه از de Slane : *Histoire des Berbéres*، ۱ : ۲۱۳ تا ۲۱۵؛ ۳ : ۱۹۳ ببعد؛ (۲) البَلاذُری : فتوحُ البُلدان، طبع de Goeje، ص ۲۲۹؛ (۳) ابن عذاری :

البیان المُغْرِب، طبع Dozy، ۱ : ۲۰ تا ۲۴؛ (۴) البَکْری : المسالک و الممالک، جزوی طبع از de Slane : *Description de l'Afrique septentrionale*، ص ۷ ببعد، ۳۱؛ (۵) التِجّانی: الرحلة، مترجمۂ روسو Rousseau، ص۴۶ تا ۶۹؛ (۶) النُّوَیْری، در *Histoire des Berbéres*، ۱: ۳۴۰ تا ۳۴۲ (ضمیمه ۲)؛ (۷) ابن النّاجی : مَعَالِم الایمان (تونس ۱۳۲۰ھ، ۴ جلد)، ۱ : ۵۶ تا ۶۱؛ (۸) محمود بن سعید مقدِش السَّفاقُصِی : نُزْهَةُ الاَنْظار (تونس ۱۳۲۱ھ، ۲ جلد)، ۱ : ۶۷ تا ۸۰؛ (۹) ابن ابی دینار القیروانی : کتاب المؤنس، تونس ۱۲۸۶ھ، ص ۱۳ ببعد؛ (۱۰) مولیٰ احمد: رحلة، مطبوعۂ فاس، ص ۴۸ تا ۵۱ و مترجمۂ Peirugger : *Voyages dans. le sud de l' Algérie*، در *Explor. scient. de l' Algerie*، پیرس ۱۸۴۶ء، ۹ : ۲۳۴ تا ۲۴۱؛ (۱۱) الْأُرثِلانی: نُزْهَةُ الاَنْظار، الجزائر ۱۳۲۶ھ، ص ۱۰۱ تا ۱۰۴؛ (۱۲) Mercier : *Histoire de l' Afrique septentrionals*، ۱ : ۲۱۲ تا ۲۱۸؛ (۱۳) Fournel : *Les Berbers*، ۱ : ۲۲۴ تا ۲۲۸؛ (۱۴) Faure-Biguet : *Histoire de l' Afrique septentrionale*، مطبوعۂ پیرس ، ص ۲۵ تا ۲۷؛ (۱۵) Masqueray : *Traditions de l' Auras Oriental*، در *Bulletin de Correspondance Africaine* ۱۸۸۵ء (حصه ۱ و ۲)، ص ۸۰ تا ۸۳ (جہاں اسے جمعَه کا نام دیا گیا ہے)؛ (۱۶) De Lartigues : *Monographie de l' Aurés*، قُسَنْطِینَه ۱۹۰۴ء، ص ۱۸۲ .

[RENE BASSET]

⊗ **کائتانی :** (Leone Caetani) اٹلی کا ایک مشہور اور ممتاز مستشرق، جسے اسلامی تاریخ کے مطالعے اور تصنیف و تالیف کے ساتھ شغف جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا ۔ وہ تیانو Teano کی ریاست کا رئیس تھا اور اپنی ریاست کی آمدنی کا خاصا حصه اپنے علمی شوق کی تسکین میں صرف کرتا تھا ۔ اسی دھن میں اس نے اپنے محل میں ایک وسیع کتاب خانه قائم کر رکھا تھا، جس میں مطبوعه کتابوں کے علاوہ بہت سے مخطوطات بھی تھے، جو اس نے مشرقی ملکوں میں اپنے خاص گماشتے بھیج کر حاصل کیے تھے ۔

کائتانی کی سب سے مشہور تصنیف *Annali de ll'Islam* ہے ۔ یه کتاب عہد رسالت اور خلافت راشده کی مفصل تاریخ ہے اور جس تفصیل سے یه کتاب لکھی گئی ہے، اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے که اس کتاب کی دس ضخیم جلدیں ہیں، جن کے صفحات کی مجموعی تعداد آٹھ ہزار کے قریب ہے۔ اس تاریخ کی اشاعت میں بیس سال صرف ہوے، جو ۱۹۲۶ء میں تکمیل کو پہنچی ۔ پرنس کائتانی نے کئی بار مشرقی ملکوں کا سفر کیا اور وہاں کے تاریخی مقامات خصوصًا میدان ہاے جنگ کے فوٹو لیے، جو اس کی کتاب میں شامل ہیں.

راقم مقاله نے پرنس کائتانی اور اس کی تصنیف کو اردو دان طبقے سے روشناس کرایا ۔ مصنف نے اپنی تاریخ کی ابتدا میں ایک دیباچه لکھ کر اس میں اپنے اغراض و مقاصد اور طرز تالیف کی وضاحت کی تھی ۔ مقاله نگار نے اس دیباچے کا اردو ترجمه کیا، جو ۱۹۲۸ء میں معارف (اعظم گڑھ) کے کئی شماروں میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ۔

کائتانی کی دوسری اہم کتاب *Chronographia Islamica* ہے، جس میں ۱ھ سے لے کر ۱۳۲ھ تک کے واقعات اختصار کے ساتھ درج کیے گئے ہیں، گویا اس میں عہد رسالت اور خلافت راشده کے علاوہ اموی عہد بھی شامل ہے ۔ ہر واقعے کے اندراج کے بعد اس کے مآخذ دے دیے گئے ہیں اور ان میں مطبوعه کتابوں کے علاوہ قلمی نسخوں کے حوالے بھی شامل ہیں ۔ ہر سال کے اختتام پر وفیات کی فہرست ہے، یعنی جن مشاہیر نے کسی خاص سال میں وفات پائی، ان کے اسما

کو حوالۂ کتاب کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے ۔ اس کی ضخامت ۱۶۱۷ صفحات ہے ۔

پرنس کائتانی اٹلی کی پارلیمنٹ کا رکن تھا اور اپنی ریاست کے انتظام کے علاوہ سیاسی معاملات میں بھی حصہ لیتا تھا ۔ عمر کے آخری حصے میں وہ ترک وطن کر کے کینیڈا چلا گیا اور وہیں ۱۹۳۵ء میں وفات پائی ۔

پرنس کائتانی نے جو کتب خانہ جمع کیا تھا وہ ایک وقف کی صورت میں La Fondazione Caetani کے نام سے شہر روم میں اب تک محفوظ ہے ۔

مآخذ : (۱) نجیب العقیقی : المستشرقون، ۱ : ۳۷۲ تا ۳۷۳؛ (۲) T. Fück : *Die Arabische Studien in Europa, Isp.*، لائپزگ ۱۹۵۵ء ۔

(شیخ عنایت اللہ)

⊛ **کَبائِر :** [ع]؛ کبیرۃ کی جمع؛ اس کی ضد صغیرۃ ہے جس کی جمع صغائر آتی ہے؛ لغوی معنی : بڑی چیز، بڑی بات [مفردات] ؛ شرعی اصطلاح کے مطابق کبیرۃ اس (بڑے کام یا) بڑے گناہ کو کہتے ہیں جو حرام محض ہو اور شریعت نے اس کے مرتکب کے لیے نصِّ قطعی کے ذریعے دنیا و آخرت میں کوئی سزا تجویز کی ہو ۔ علامہ دوّانی (شرح العقائد العضدیہ، مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی، ورق ۶۶) کہتے ہیں : کبیرۃ کی تعریف میں علما کا اختلاف ہے، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کبیرۃ ایسا کام ہے جس کے ارتکاب کی کوئی حد (سزا) مقرر کی گئی ہو؛ کچھ علما کی رائے میں کبیرہ وہ ہے، جس کے لیے کتاب و سنت کی نص کے مطابق حد یا تعزیر یا وعید مقرر ہو، یا یہ معلوم ہو جائے کہ اس کام کا فساد اس قسم کا ہے جس کے مطابق تینوں سزاؤں میں سے کوئی ایک دی جا سکتی ہے ۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ کبیرہ ہر وہ گناہ ہے، جس کے نتیجے کے طور پر دوزخ یا اللہ کا غضب یا اس کی طرف سے لعنت یا کسی اور عذاب کا تعین کیا گیا ہو (التفسیر المظہری، ج ۲، سورۃ النساء، بذیل آیۃ ۳۱)۔ ابن سیرین کے نزدیک اس کام کا ارتکاب، جس سے اللہ تعالٰی نے روکا ہے، کبیرہ ہے اور امام حسن بصری، سعید بن جبیر اور ضحاک وغیرہم کا کہنا ہے کہ ہر وہ کام کبیرہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں وعید کے ساتھ آتا ہے (ملاعلی القاری : شرح الفقہ الاکبر، ص ۶۸) ۔

کبیرۃ کا لفظ قرآن مجید میں تین مقامات پر آتا ہے : (البقرۃ : ۴۵ و ۱۴۳؛ الکہف : ۴۹)، مگر تینوں آیتوں میں کبیرۃ سے مراد "بڑی چیز" یا "بوجھل چیز" ہے؛ البتہ قرآن مجید میں بڑے "کاموں" یا "گناہوں" کے لیے (کبیرۃ کی جمع) کبائر کا لفظ استعمال ہوا ہے اور وہ حسب ذیل تین مقامات ہیں: ۴ [النساء] : ۳۱؛ ۴۲ [الشورٰی] : ۳۷؛ ۵۳ [النجم] : ۳۲ ۔

تفاسیر اور احادیث نبویہ میں مختلف اعمال سَیِّئہ کا "کبائر" میں ذکر کیا گیا ہے ۔ حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے فرمایا :"سات مہلک چیزوں سے بچو اور وہ یہ ہیں : شرک باللہ، جادو، بغیر حق کسی کا قتل، اکلِ سود، اکلِ مالِ یتیم، جہاد کے وقت میدان جنگ سے فرار، پاکباز مؤمن خواتین پر بدکاری کا الزام" ۔ عبید بن عمیر کی روایت میں بشمول مسلمان والدین کی نافرمانی اور بیت اللہ کی ہتک، نومہلکات کا ذکر ہے (ابو داوٗد ، کتاب الوصایا، حدیث ۲۸۷۴، ۲۸۷۵) ۔ ایک اور روایت کے مطابق کسی نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا : "کیا کبائر کی تعداد سات ہے ؟" آپ نے جواب دیا : "کبائر سات سو کے قریب ہیں، مگر یاد رکھو کہ توبہ و استغفار کی صورت میں کوئی گناہ کبیرہ باقی

نہیں رہتا اور اصرار کرنے سے کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا'' - شرح عقائد عضدیہ میں حسب ذیل امور کو کبائر کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے : قتلِ نفس بغیرالحق، زنا، لواطت، شراب نوشی، کسی کا مال (کم از کم ایک دینار) کا چھین لینا، قذف (زنا وغیرہ کی تہمت)، ہر ایسی مسکِر چیز کا استعمال جس کا انجام شربِ خمر کی طرح ہو، جھوٹی گواہی، سود خوری، رمضان میں دن کے وقت (بلا عذر) روزہ توڑنا، جھوٹی قسم، قطعِ رحم، والدین کی نافرمانی، دشمن کے مقابلے میں پیٹھ دکھانا، یتیم کا مال کھانا، ناپ اور تول میں خیانت، بلا عذر نماز کا وقت سے پہلے یا وقت گزرنے کے بعد ادا کرنا، کسی مسلمان کو بغیر حق مار ڈالنا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے بارے میں جان بوجھ کر غلط بات کہنا، صحابہؓ کو گالی دینا، بلا عذر گواہی کا چھپانا، رشوت لینا، عورتوں اور مردوں میں فواحش کے لیے دلالی کا کام انجام دینا، حاکم کے پاس چغلی کھانا، زکٰوۃ نہ دینا، استطاعت کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دینا، قرآن مجید کا علم حاصل کر کے بھلا دینا، کسی حیوان کو آگ میں زندہ جلانا، بلا سبب بیوی کا خاوند سے دور رہنا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی اور تدبیر (مکر) کے ذریعے اس سے اپنے آپ کو مأمون سمجھنا، اہل علم اور حاملین قرآن مجید کی اہانت، ظہار (بیوی کو ماں کہ دینا) اور خنزیر کا گوشت کھانا .

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے کہ کبائر کے تین مراتب ہیں :

۱ - اکبر الکبائر : یعنی شرک باللہ؛ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ الاشتراک باللہ، الامنِ مِن مکر اللہ، القنوط مِن رحمة اللہ اور الیاس مِن روح اللہ، اکبر الکبائر ہیں .

۲ - وہ کبائر جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے؛ ان میں کسی مسلمان کے خون، مال اور عزت پر ناجائز طور پر ہاتھ ڈالنا شامل ہے؛ نیز قتلِ اولاد (اس سبب سے کہ وہ بھی رزق کھانے میں شریک ہو جائے گی)، ہمسائے کی بیوی سے بدکاری اور سبُّ الوالدین (کسی کے باپ یا ماں کو گالی دی جائے اور وہ جواباً گالی دینے والے کے ماں یا باپ کو گالی دے) اس کے تحت آتے ہیں .

۳ - وہ کبائر جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، جیسے زنا، شراب خوری، لواطت، ڈاکہ، وغیرہ .

ارتکابِ کبائر کے سلسلے میں علما کے درمیان یہ اہم اختلاف چلا آ رہا ہے کہ ان کا مرتکب شریعت کی نظر میں کیسا ہے ؟

خوارج کے نزدیک صغیرة و کبیرة دونوں کا مرتکب کافر ہے؛ اگر وہ مرنے سے پیشتر توبہ نہیں کر لیتا تو خلود فی النار کا مستحق ہوگا اور اللہ اسے معاف نہیں کرے گا .

معتزلہ کے نزدیک مرتکب کبیرہ ایمان سے نکل جاتا ہے، لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا - واصل بن عطاء کا یہی مذہب تھا؛ وہ مرتکب کبیرہ کے لیے منزلة بین المنزلتین کا قائل تھا .

مرجئہ کا کہنا ہے کہ مؤمن کو بحالتِ ایمان کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا جیسا کہ کافر کے لیے بحالت کفر کوئی طاعت نفع بخش نہیں ہوتی .

ازارقہ [خوارج کا ایک گروہ] مرتکب کبیرہ کو مشرک کہتے ہیں اور زیدیہ کا قول ہے کہ وہ شخص اللہ کی نعمتوں کا مُنکر ہے - امام حسن بصری نے ایسے شخص کو منافق قرار دیا ہے .

علماے اہل السنة والجماعة کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ بسبب بقاے تصدیق دائرۂ ایمان سے خارج نہیں ہوتا، شرح المواقف میں بیان کیا گیا ہے : اِنَّ مرتکبَ الکبیرة مِن اھلِ الصَّلاةِ ای مِن

اهل القبلۃ مومنٌ (جملۂ ثانی، ورق ۷۹ ب)۔ عقائد نسفی (صفحہ ۸) میں ہے : والکبیرۃ تُخرج المؤمن من الایمان ولا تدخله فی الکفر۔

اہل السنت کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اگر کوئی گنہگار توبہ کے بغیر مر جائے تو وہ اللہ کی مشیت کے تابع اور اس کے رحم و کرم پر ہے ۔ اللہ چاہے تو اسے معاف کر دے اور جنت میں داخل کر دے اور چاہے تو اسے اس کے گناہوں کے مطابق عذاب دے ۔

امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول بھی موجود ہے: "ہم کسی مسلمان کی تکفیر اس کے گناہوں کے سبب نہیں کرتے ، اگرچہ وہ کبیرہ ھی کیوں نہ ہوں، بلکہ اس شرط سے کرتے ہیں کہ وہ اس ارتکاب گناہ کو حلال جانتا ہو، کیونکہ معصیت کو حلال سمجھنا بدلیل قطعی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی تکذیب کرنا ہے اور ایسا انسان کافر ہو جاتا ہے" (المغنیساوی: شرح الفقہ الاکبر، ص ۷۲)۔ اس سلسلے میں ملا علی القاری نے مزید لکھا ہے کہ فرض اور واجب کا بلا عذر ترک کرنا، اگرچہ ایک مرتبہ ھی کیوں نہ ہو، گناہ کبیرہ ہے اور اسی طرح ترک سنت، ارتکاب مکروہ پر اصرار بھی کبائر میں شامل ہے (شرح الفقہ الاکبر، ص ۹۸)؛ نیز دیکھیے شاہ ولی اللہ دہلوی : حجۃ اللہ البالغۃ ۔

مآخذ : (۱) الجرجانی : شرح المواقف، ج ۲ ، مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور؛ (۲) امام ابوحنیفہ: الفقہ الاکبر نیز اس کی شرح از؛ (۳) ملا علی القاری، دہلی؛ و (۴) ابومنصور الماتریدی، حیدرآباد دکن ۱۳۲۱ھ؛ اور (۵) ابوالمنتھی احمد بن محمد المغنیساوی، حیدرآباد دکن ۱۳۲۱ھ؛ (۶) الرازی : محصّل افکار المتقدمین و المتأخرین من العلماء والحکماء و المتکلمین، قاہرہ (۷) الرازی : کتاب الاربعین، حیدر آباد دکن ۱۳۵۳ھ ؛ (۸) الدوّانی : شرح العقائد العضدیۃ، مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور ؛ (۹) البغدادی، عبدالقاہر : اصول الدین، جلد اول، استانبول ۱۳۴۶ھ ؛ (۱۰) الشہرستانی : الملل والنحل (الجزءالاول)، قاہرہ ۱۳۶۸ء؛ (۱۱) الشہرستانی: نہایۃ الاقدام فی علم الکلام (مع انگریزی ترجمہ، از A. Guellaume، لنڈن ۱۹۳۴ء؛ (۱۲) التفتازانی : شرح العقائد النسفیۃ، قاہرہ ۱۳۳۰ھ؛ (۱۳) ابن حزم : الفصل فی الملل والاھواء والنحل (الجزء الثالث) ؛ (۱۴) النسفی ابوالبرکات : عمدۃ عقیدۃ اہل السنۃ والجماعۃ، لنڈن ۱۸۴۳ء (مع نجم الدین النسفی : عقائد)؛ (۱۵) *A Commentry of the Creed of Islam* : E.E. Elder؛ نیویارک ۱۹۵۰ء؛ (۱۶) شاہ ولی اللہ دہلوی : الخیر الکثیر، بجنور ۱۳۵۲ھ ؛ (۱۷) ابن منظور : لسان العرب ؛ (۱۸) محمد طاہر پٹنی: مجمع بحار الانوار، مطبع نول کشور، لکھنؤ؛ (۱۹) قاضی عبدالنبی : دستور العلماء (جزو ثالث)، بار اول، حیدر آباد دکن ؛ (۲۰) ابن الاثیر : النھایۃ فی غریب الحدیث ، المطبعۃ الخیریۃ، قاہرہ ؛ (۲۱) *Arabic-English Lexicon* : E.W. Lane؛ (۲۲) الراغب الاصفہانی : مفردات القرآن، بذیل مادّہ (نیز دیکھیے اس کا اردو ترجمہ، از محمد عبداللہ الفلاح، لاہور ۱۳۸۳ھ)؛ (۲۳) الزمخشری : الکشّاف (الجزء الاول)، دارالکتاب العربی، بیروت ؛ (۲۴) ملاجیون جونپوری : التفسیرات الأحمدیۃ، بمبئی ۱۲۲۷ھ ؛ (۲۵) قاضی ثناء اللہ پانی پتی : التفسیر المظہری، ج ۲، جید برقی پریس دہلی ؛ (۲۶) *Dictionary of Islam* : Hughes، لاہور ۱۹۶۴ء ؛ (۲۷) محمد فؤاد الباقی : مفتاح کنوزالسنّۃ، لاہور ۱۳۹۱ھ ؛ (۲۸) ابن حجر المکّی: الزواجر عن اقتراف الکبائر (تین جلدیں)، قاہرہ ۱۳۸۴ھ ۔

(امین اللہ وثیر)

کَبْتاش : رک بہ استانبول ۔ *

کبد : (لغات نویسوں کے قول کے مطابق* صحیح شکل صرف یہی ہے)، یا کَبِد، کِبْد، بمعنی جگر (کلیجا، کلیجی) ۔

۱ - جگر کے نام اور ان پر معنویاتی بحث : دوسرے لوگوں کی طرح مسلمان بھی بدن انسانی کے اندرونی اعضا کو پہچانتے اور انھیں جانوروں کے متماثل اعضا سے مطابقت دیتے تھے- علاوہ ازیں وہ اپنے مشاہدات کی بنا پر ان اعضا سے کوئی نہ کوئی جسمانی یا نفسی جسمی (Psychosomatic) فعل بھی منسوب کرتے اور اس کی تعبیر ہر شخص کی ذہنی ساخت کی رو سے کرتے تھے، جسے ہم صرف جزوی طور پر سمجھ سکتے ہیں .

خود زبان سے بھی ان ابتدائی مطابقتوں کی شہادت ملتی ہے، جیسا کہ E. Bargheer نے کہا ہے : ”یہ ایسی اہم خصوصیتیں ہیں جو بسا اوقات لوگوں کی تصوراتی دنیا میں کسی عضو کو ایک نمایاں مقام دے دیتی ہیں؛ چنانچہ دل میں یہ خصوصیت اس کی دھڑکن یا متوازن حرکت ہے، پھیپھڑوں میں سانس لینا اور جگر میں اس کی مرکزیت ، دیگر اعضا کے مقابلے میں اس کا غیر معمولی حجم، اس کی قابل تغیر شکل اور اس کا خوردنی ہونا ہے“ (*Handwörterbuch des deutschen Aberglaubens*، طبع von. E. Hoffmannkrayer، برلن ۱۹۲۷ تا ۱۹۴۲ء، ج ۵، عمود ۹۷۶، بذیل مادّۂ Leber) - عربی میں جگر کا کلاسیکی نام کَبِد ہے، لیکن عربی بولیوں میں اس کی متبادل شکلیں کَبْد اور کِبْد بھی، جو عام طور پر مستعمل ہیں، بہت قدیم زمانے سے دیکھنے میں آتی ہیں (*Wörterbuch der Klassischen Arabischen Sprache*، ویزباڈن ۱۹۷۰ء، ۱ : ۱۸) - دوسری سامی زبانوں کی طرح عربی میں بھی جگر کی طرف توجہ اس کے بڑے وزن کی وجہ سے مبذول ہوئی - جگر کے لیے جو اسم تمام سامی زبانوں میں مشترک ہے اس کا مادہ ک ب د دیا گیا ہے- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ب کی مناسبت سے اکادی ت کو مغربی سامی د میں تبدیل کر دیا گیا ہے (کَبَتُّو، بعد ازآن کَبِتُّو، شعر میں کَبْتَتُو، جو خیال کیا جاتا ہے کہ اصلی یا ابتدائی شکل تھی (براکلمان : *Grundriss der vergleichenden Grammatik d. semit. Sprachen*، برلن ۱۹۰۸ - ۱۹۱۳ء، ۱ : ۱۵۲)- ہمیں اکادی میں کَبِدُو، کَبِدُو بھی ملتے ہیں، جو غالباً مغربی سامی سے مستعار ہیں- یہ واضح ہے کہ یہ اسم صفت ”بھاری“ سے مجازاً مشتق ہیں (اکادی: کَبتُّو، مؤنث: کَبَتُّو، کَبِتُّو ؛ عبرانی : کَبید ؛ اوغر: کَبد ؛ گیئز : کِبود وغیرہ)- یہی صورت متعلقہ فعل کی ہے، یعنی عربی : کَابَدَ = جھیلنا، سہارنا (H. Holma : *Die Namen der Körperteil im Assyrisch-Babylonischen*، لائپزگ ۱۹۱۱ء، ص ۸۷ ؛ P. Fronzaroli: *Studi sul lessico comune semitico*، سلسلہ ۸، ج ۱۹، کراسہ ۵ تا ۶، ۱۹۶۴ء، ص ۳۲ ببعد، ۴۷، ۵۴) - جگر کا ذکر کرنے کے لیے اس استعارے کا استعمال (”سب سے وزنی اور سب سے موٹا برتن“، Galen : *De usu partium*، ۶ : ۱۷ = طبع C.G.Kühn، ۳ : ۴۹۵ و طبع G. Helmreich، ۱ : ۳۶۰، س ۱۹ ببعد) ایک سامی جدّت ہے؛ اس کے مقابلے میں ’حامی - سامی‘ زبانوں میں اس کے لیے متعدد مختلف نام ہیں - جیسا کہ A. Cuny کا خیال ہے، یہ امر مشتبہ ہے کہ یہ لفظ انڈو - یورپی زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے *Recherches sur le vocalisme...en "nostratique"*، پیرس ۱۹۴۳ء، ص ۶۸ ببعد) - انڈو- یورپی زبانوں میں جو لفظ سب سے زیادہ مستعمل ہے (مأخوذ از مادّۂ یکورت) اس کا تعلق گو مڑے، گلٹی یا رسولی کے مفہوم سے ہے (J. Pokorny : *Indo-germanisches Etymologisches Wörterbuch*، برن - میونخ ۱۹۴۸ - ۱۹۵۹ء، ۱ : ۵۰۴) - ہمارے موضوع بحث میں اس کی نمائندگی زیادہ تر فارسی لفظ ”جگر“ کرتا ہے (لاطینی : iecur ؛ یونانی ἧπαρ،

وغیرہ) جیسے ترکان عثمانی نے بھی اختیار کر لیا (اور سربی کروٹ زبانوں میں جانوروں کے جگر کے لیے) .

۳ جگر کے لیے ترکی مترادف کی سب سے زیادہ مروجہ شکل باغر ہے (جس کی شہادت ینی سای Yenisei کے قدیم Runiform کتبوں سے بھی ملتی ہے، دیکھیے V.G. Egorov : *Etimologiceskiy slovar' cuvasskog Yazika*، چبق ساری ۱۹۶۴ء، ص ۱۵۵، جس نے اس لفظ کی ترکی زبانوں میں سب شکلیں دی ہیں) اور غالباً اس کا تعلق گرہ، پلندے، بوری، جیب کے مفہوم سے ہے (دیکھیے ترکی اسم باغ اور فعل باغلامق؛ لیکن L. Bazin کا خیال ہے کہ اس تعلق میں بعض صوتی دشواریاں پیش آتی ہیں) .

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مذکورۂ بالا الفاظ بہت شروع کے زمانے سے ایک "معیاری" یا "مرکزی" مفہوم کے مطابق پوری طرح مروج ہوچکے تھے (L. Bloomfield : *Language*، بار دوم، لنڈن ۱۹۳۵ء، ص ۱۴۹)، جس سے مراد وہ عضو تھا جسے ہم جگر کہتے ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی شبہہ نہیں کہ اتنے ہی قدیم زمانے سے معنویاتی طور پر ان کا تعلق ضمنی یا مجازی اقدار پر مشتمل مفاہیم سے رہا ہے، جسے ہم "انتقالات معنی" کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں .

معنوں کے اتصال کے باعث ان میں سے بعض "انتقالات" (S. Ullmann : *The Principles of semantics*، گلاسگو ۱۹۵۷ء، ص ۲۳۰ ببعد) کے ذریعے زیر بحث الفاظ بدن کے ان حصوں کے لیے بھی استعمال ہونے لگے جو جگر کے قریب ہیں؛ چنانچہ کلاسیکی عربی میں کبد سے مراد بدن کی ان سطحات کے علاوہ جو کم و بیش جگر کے نزدیک ہیں، سینہ بلکہ پیٹ بھی ہے، مثلاً کسی عورت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کَبِدٌ مَلْسَاءُ = اس کا جگر چکنا ہے، یعنی پیٹ نرم و نازک ہے (الاعشٰی : دیوان، طبع R. Geyar، لنڈن ۱۹۲۸ء، ص ۷۷، شعر ۱۵ الف = طرفہ : دیوان، در W. Ahlwardt : *The divans of the six ancient Arabic Poets*، لنڈن ۱۸۷۰ء، ص ۱۱ شعر ۶ - الف) وغیرہ؛ مزید حوالوں کے لیے دیکھیے *Wörter buch der klassischen Arabischen Sprache*، ویزباڈن ۱۹۷۰ء، ۱ : ۱۸ تا ۲۰) - اسی طرح اویغور میں کہا جاتا ہے :"باغرغہ باصمق" = سینے یا دل سے لگا لینا ؛ "باغری یوغان پیلوان" = ایک بہادر (یا ورزشی) آدمی، جس کا سینہ زبردست ہو (E. N. Nadzip : *Uygursko-russkiys slovar*، ماسکو ۱۸۹۸ء، ص ۲۲۶) - علٰی ہٰذا آذری میں "باغرینہ باصمق" کے معنی ہوتے ہیں، گلے لگانا بغل گیر ہونا، اپنے سینے سے چمٹا لینا (H. A. Azizbekov : *Azerbaydzanskoyrusskiy solvar'*، باکو ۱۹۶۵ء، ص ۷۴) .

فارسی میں مرکّب لفظ جگر بند، یعنی جگر مع متعلقات (جس کی شہادت مثلاً سعدی اور شمس تبریزی کے ہاں ملتی ہے) سے مراد ہمت و حوصلہ اور باعتبار مجموعی سینے کے اندرونی اعضا، یعنی پھیپھڑے، دل اور جگر ہوتی ہے - ترکی زبانوں نے اسی زمانے میں لفظ جگر کو اپنا لیا تھا جب سیف سرای نے مصر میں گلستان کا ترکی ترجمہ (۱۳۹۱ء) تیار کیا تھا ، نیز دیکھیے É. Fazylov : *Starouzbek-skiy Yazik*، تاشقند ۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۱ء، ۱ : ۳۷۰)، لیکن اسی مفہوم کے حامل ایک اور لفظ (باغر، وغیرہ) کی موجودگی، نیز غالباً جگر کے مذکورۂ بالا معنوں میں استعمال کی وجہ سے خود جگر کے معنوں کو وسعت دے کر ایک صدری عضو، یعنی پھیپھڑے کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا حالانکہ اس کے لیے ایک ترکی لفظ (اوفقہ، اوپقہ، اووقہ،

اوقیه، وغیره) پہلے سے موجود تھا، جس کے مجازی معنی، یعنی غصہ، رنج، بے اطمینانی، مصیبت، کا ذکر قدیم زمانے میں بھی ملتا ہے (دیکھیے Egorov : *'Étim Slovar'*، ص ۲۸ ببعد) اور جو اب مروّجه عثمانی ترکی میں لاطینی لفظ اوفقه Ofke کا تنہا مفہوم رہ گیا ہے اور جس کے ساتھ عوامی بولی کی اصلاح اویغان (= پھیپھڑا) بھی مستعمل ہے ؛ لہذا یہ ضروری ہو گیا کہ ''سیاہ جگر'' (آذری : گره جیار ؛ عثمانی ترکی : قره جگر ؛ لاطینی رسم الخط میں Kara ciğer) — یعنی خود جگر — اور ''سفید جگر'' (آذری : آغ جیار ؛ عثمانی ترکی : آق جگر ؛ لاطینی رسم خط میں ak ciğer)، یعنی پھیپھڑے کے مابین تمیز کرنے کے لیے کسی اسم صفت سے کام لیا جائے ۔ سلطنت عثمانیه کے حلقۂ اثر میں بولی جانے والی دوسری زبانوں نے بھی معنوں کے اس فرق کو قبول کر لیا، مثلاً بلغاری (جس میں صفت تمییزی سلاوی لفظ drob کے ساتھ لگائی جاتی تھی نہ کہ لفظ مستعار džiger (= پھیپھڑے اور جگر) کے ساتھ؛ دیکھیے *Bălgariski etimologičen Rečnik*، صوفیا ۱۹۰۶ء، ۵ : ۳۶۲)، یا سربی کروٹ زبان (Crna Džigerica = ''جگر؛ Bijela Džigerica = پھیپھڑا؛ دیکھیے Abdullah Škaljić : *Turcizmi u Srpskohrvatskom jeziku*، سراجیو ۱۹۶۵ء، ص ۲۰۴ ببعد)، بحالیکه انڈو یورپی لفظ Jetra علم تشریح الابدان کے ایک اصطلاحی مفہوم کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے ۔ ''سفید جگر'' کی اصطلاح (کبود بیض) عربی میں بھی، کم از کم بعض موقعوں پر، غالباً پھیپھڑوں کے لیے استعمال ہوتی تھی (ابن جزله : منهاج البیان، بذیل مادۂ کبد، مخطوطۂ کتاب خانۂ ملی، پیرس، عدد ۲۹۴۹ .Ar، ورق ۱۵۹- ب، وغیره) .

اتصال کی بنا پر انتقال معنی کے عمل نے اس تغییر معانی (Semantic) کے میدان کو، جس پر لفظ جگر محتوی تھا، نہ صرف صدری اعضا تک وسعت دے دی بلکه بدن کے سب اندرونی اعضا بھی اس میں شامل ہو گئے ۔ مزید برآں بحیثیت مجموعی ان سب اعضا کا ذکر، ایک کم و بیش مبہم اور محدود طریقے سے لفظ ''جگر'' کے اسم جمع سے کیا جانے لگا ؛ چنانچه الطبری کے فارسی ترجمے (چوتھی/دسویں صدی) میں لفظ ''جگران'' سے مراد آنتیں ہیں (G. Lazard : *La langue des plus anciens monuments de la prose persane*، پیرس ۱۹۶۳ء، ص ۱۹۵)؛ تاہم ترکی میں خود لفظ باغر (یا ایک لاحقے کے ساتھ باغرسک) اور اس کی مختلف اشکال) سے مراد ہے پیٹ، تونڈ، نیز آنتیں (حوالوں کے لیے دیکھیے *'Drevnetyurskiy slovar'*، لینن گراڈ ۱۹۶۹ء، ص ۷۷، ۷۸) ۔ اسی سے مثال کے طور پر اویغوری لفظ باغریماق ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں رینگنا، اپنے کو پیٹ کے بل گھسیٹنا ۔ حبشه کی جدید زبانوں میں بھی ''گیز کبد''، یعنی جگر، کے مرادف قدیم حبشی لفظ، پیٹ، دل، اندرون، آنتوں، تونڈ کے معنی لیے جانے لگے ہیں (تگرہ : کبد ؛ تگرینا : کبدی) اور امہری زبان میں ''ھود'' (از ''کبد''، دیکھیے براکلمان : *Gundriss*، ۱ : ۲۰۴) کے صرف یہی معنی رہ گئے ہیں؛ لہٰذا جگر کے لیے اس زبان میں ایک اور لفظ (Gubbät) استعمال کرنا پڑا .

معنوں کے اس ہیر پھیر سے ان الفاظ کو کسی چیز کے درمیانی حصے، مرکز، اندرونی حصے (اور ہم یه بھی کہ سکتے ہیں که قلب) کے لیے استعمال ہونے کی توجیه ہو جاتی ہے، مثلاً عربی میں کہتے ہیں : فی کَبِدِ جَبَلٍ (= کسی پہاڑ کے قلب میں) ؛ علی کَبِدِ الْبَحْرِ (= کسی سمندر کے قلب میں)، وغیره (حوالوں کے لیے دیکھیے *Wörterbuch*، ص ۲) ۔

قدیم ترکی میں باغری (= کسی کمان کا جگر) کمان کے مرکزی خم کے لیے استعمال ہوتا ہے (محمود کاشغری : دیوان لغات الترک، استانبول ۱۳۳۳ تا ۱۳۳۵ھ، ۱ : ۳۰۱ ؛ C. Brockelmann : *Mittel turkischer Wörtschatz*، بوڈاپسٹ ۱۹۲۸ء، ص ۲۸)- کَبِدُالقَوس (F. W. Schwarzlose : *Die Waffen der alten Araber*، لائپزگ ۱۸۸۶ء، ص ۲۶۰، ۲۶۵ ببعد؛ A. Boudot-Lamottee : *Contrbuton à l'étude de l' archerie musulmane*، دمشق ۱۹۶۸ء، ص ۳۶۱؛ نیز دیکھیے اشاریہ، ص ۱۹۷ و لوحہ ۳) کی بھی یہی صورت ہے - تاتاری میں یورال باوری سے مراد ہے کوهستان یورال کا مرکز *Tatar' sko-russkiy slovar'*، ماسکو ۱۹۶۶ء، ص ۱۵)- اسی طرح مثلاً فارسی میں ہے جگر گِل (= ''امعاے زمین، "قبر") - مکان سے زمان کی طرف رجوع کرتے ہوے ہمیں فی کبد لیل" (= رات کے وسط یا قلب میں) کی سی اصطلاحیں ملتی ہیں (ابن سعد : طبقات، ۳/۱: ۲۰۵ س ۲۲).

ترکی میں ان عام معنوں کے اندر بسا اوقات آگے، پیش اور پہلو کا مفہوم بھی شامل ہو جاتا تھا - مثال کے طور پر اوزبک میں طوغ باغریدہ کے معنی "پہاڑ کے پہلو پر'' کے ہوتے ہیں (A. K. Borovkov : *Uzbekso-russkiy slovar'*، ماسکو ۱۹۵۹ء، ص ۵۸) - آلتائی کی شور بولی میں لفظ پاغرینده (= بجانب) میں اس کا مفہوم ایک حرف جار کا سا بھی ہو جاتا ہے (W. Radloff : *Versuch eines Wörterbuch der Türk-Dialacte*، سینٹ پیڑ زبرگ ۱۸۹۳ تا ۱۹۱۱ء، ج ۴، عمود ۱۳۴۱).

۲ - جگر کا قدیم اور مقبول عام نفسی جسمی مفہوم (psycho physiology) : جگر کے لیے (عربی) لفظ کے اعضا اور بدن یا دنیا کے مختلف حصوں کو ظاہر کرنے کے لیے جو بھی ضمنی معنی بنتے گئے، ان سے قطع نظر، قبل نظریاتی دور ہی سے، ایک نہ ایک جسمانی یا نفسیاتی وظیفہ بھی اس عضو سے منسوب رہا ہے .

یہی وجہ ہے کہ قلب کے ساتھ جگر کو بھی عام طور پر نفسیاتی زندگی کا مرکز (یا مرکزوں میں سے ایک) یا دوسرے الفاظ میں روح انسانی (یا کسی بھی روح) کا ایک سہارا سمجھا جاتا تھا (W. Wundt : *Völke rpsychologie*، بارسوم، لائپزگ ۱۹۲۰ء، ۴ : ۱۰۵ ببعد ؛ A. Merx : *Le rôle du foie dans la littérature des peuples semitques*، در *Florilegium ... Melchior de Vogue*، پیرس ۱۹۰۹ء، ص ۴۲۷ تا ۴۴۴ ؛ M. Jastrow : *The liver as the seat of the soul*، در *Studies in the History of Religion, presented to C. H. Toy*، نیویارک ۱۹۱۲ء، ص ۱۴۳ تا ۱۶۸؛ E. Clements : *Primitive Concepts of Disease*، یکے از مطبوعات جامعۂ کیلیفورنیا، در بارۂ آثار قدیمہ و نسلیات امریکہ، ۲/۳۳ (۱۹۳۲ء) : ۲۳۲ ببعد؛ Bargheer : *Leber*، *Eingeweide, Lebens- u. Seelenkräfte des Leibensinneren*، برلن و لائپزگ ۱۹۳۱ء، ص ۹۳؛ W. D. Wallis : *ERE*، ۱۰ : ۳۷۳ ببعد) - چونکہ جگر کو یہ اہمیت حاصل تھی کہ وہ بعض ایسی صفات کا مسکن ہے جن میں ساحرانہ خصائل مضمر ہیں، اسی لیے غالباً سامی زبانوں میں اسے اکثر مؤنث مانا جاتا ہے ؛ چنانچہ یہ سریانی ہی میں نہیں بلکہ عام روایت کے برخلاف قدیم عبرانی میں بھی مؤنث ہے (G. R. Driver، در *JRAS*، ۱۹۴۸ء، ص ۱۷۵، حاشیہ ۲) اور سب سے زیادہ عربی میں؛ اگرچہ عربی میں یہ مذکر بھی ہو سکتا ہے اور نحوی عام طور پر دونوں جنسوں میں شمار کرتے ہیں (A. J. Wensinck : *Some Aspects of Gender in the*

Semitic Languages، ایمسٹرڈم ۱۹۲۷ء [.Verh .Ak. Amst، ج ۲٦/۳]، ص ۳۰، نیز ص ۳٦ ببعد؛ A. Cuny و M. Feghali: Der genre grammatical en semitique، پیرس ۱۹۲۴ء، ص ۵۵).

زیادہ تجزیاتی طریقے پر، اندرونی اعضا سے عام طور پر ایک ایسا متحرک عمل منسوب کیا جاتا ہے جس سے احساسات، جذبات اور خواهشیں پیدا هوتی هیں (یہ ایک ایسا تصور ہے جسے یکسر غلط نہیں کہا جا سکتا)؛ لهذا میسوپوٹامیا کے لوگوں اور شاید ایک حد تک عبرانیوں کے نزدیک بھی، جگر نہ صرف خوشی کا مسکن تھا (جب یہ صحت و تندرستی کی حالت میں ''منور'' هو جاتا ہے) بلکہ رنج و غم (جب یہ ''بیمار''، یا دکھتا هوا هو) غصّے (جب یہ جل جائے)، سکون (جب یہ خود پرسکون هو) اور آخر میں قلب کے ساتھ ساتھ خواهش کا بھی (دیکھیے E. Dhorme: L' emploi mètaphorique des noms des parties du corps en hébreu et en akkadien پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۲۸ ببعد؛ Merx: Le role du foie، ص۱۳٦ ببعد، ۱۳۹ ببعد) ۔ عربوں کے نزدیک دل سے منسوب هونے والے غموں، یعنی آلام عشق سے جگر زخمی هو جاتا ہے ۔ شرمیلے عاشق یا اسی طرح کا رنج اٹھانے والے کسی شخص کا جگر ٹکڑے ٹکڑے هو جاتا ہے (صدع، فطر، فلق)، ٹوٹ جاتا ہے (کبد مرضوضہ، الحریری: مقامات، طبع Silvestre de Sacy، بار دوم، پیرس ۱۸۴۷ تا ۱۸۵۳ء، ص ۵۷)، گھل جاتا ہے، پیاسا، بوجھل اور سوختہ هوجاتا ہے ۔ کسی کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''عشق کا رنج و الم اسے کھائے جا رہا ہے'' ۔ پتلا اور نازک جگر ایک نرم طبیعت اور حساس دل کی علامت ہے ۔ نیک آدمی کا جسم سیاہ هو سکتا ہے، لیکن اس کا جگر سفید هوتا ہے (ابن جبیر، ص ۳۰۲)، یعنی روح پاک و صاف هوتی ہے (یہ ایک بہت عام استعارہ ہے، جو زمبیا Zambia کے ندمبو باشندوں کے هاں بھی پایا جاتا ہے (دیکھیے V. W. Turner: The Drums of Affliction، اوکسفرڈ ۱۹٦۸ء، ص ۳۸، ۲۸۳؛ نیز Bargheer: Leber، ص ۱۷۹؛ وهی مصنف: Eingeweide، ص ۹۵ ببعد) ۔ جگر کھانا یا اس پر ضرب لگانا سے مراد بہت رنج دینا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ جگر کو جسم کا ایک خاص طور پر بیش قیمت حصہ سمجھا جاتا ہے اور محبوب لوگوں کا مسکن جگر میں مانا جاتا ہے یا انھیں اس کے ٹکڑوں سے مشابہ قرار دیا جاتا ہے ۔ بچہ جگر کے گھرے خون (مہجہ) کی طرح ہے ۔ کسی عزیز دوست یا محترم انسان کی جگہ جگر اور غشاے جگر کے مابین هوتی ہے ۔ زیادہ عام طور پر جو لوگ کسی کو عزیز هوں وہ جگر کے ٹکڑے (قطعات) هیں (حوالوں کے لیے دیکھیے A. Merx: Wörterbuch، ص ۹۱ ببعد؛ Le rôle du foie، ص ۹ ۲۴ تا ۳۳۴) ۔ یہ آخرالذکر تعبیر ابھی تک رائج ہے، مثلاً تونس کے گاؤں تکرونہ میں (W. Marçais: Textes arabes de Takrouna، پیرس ۱۹۲۵ء، ۱: ۸۰، ۸۱، ۲۷۲، ۲۹۲، حاشیہ ۲۴، جہاں قدیم متون سے مأخوذ معلومات دی گئی هیں اور جن میں چھٹی صدی هجری/بارهویں صدی عیسوی کا ایک مذارب Mozarab وثاق بھی شامل ہے، جو عیسائیوں کے مابین هوا تھا) ۔ اس گاؤں میں لفظ جگر سے مراد محض کوئی محبوب هستی هوتی ہے یا بالخصوص کوئی بچہ: ''یاکبدی'' = میرے محبوب (W. Marçais: کتاب مذکور، پیرس ۱۹٦۰ء، ۲/۷: ۳۳۵۴ تا ۳۳۵٦) ۔ قسنطینہ کے علاقے میں بچوں کو کباد (اکباد) یعنی اپنے ماں باپ کے جگر کہا جاتا ہے (M. S. Belguedj: La médecine traditionelle dans le Constantinois، سٹراسبرگ ۱۹٦٦ء، ص ۱۳۱)؛ [دیکھیے الحماسۃ:

آنما اولادنافی بیننا

اکبادنا تمشی علی الارض] .

بالکل اسی طرح کی تعبیریں فارسی ادب میں بھی پائی جاتی ہیں، جنھیں Merx عربی سے براہ راست مأخوذ سمجھتا ہے (مثال کے طور پر ان تعبیروں کے لیے دیکھیے Merx : *Le role du foie*، ص ۴۳۴ تا ۴۳۵؛ فرہنگ زبان تاجیکی، ماسکو ۱۹۶۹ء، ص ۵۷۷؛ نیز متفرق کتب لغات) ۔ باپ کے لیے اس کا بیٹا اس کے خون جگر کی طرح ہے، اس کی مثال فردوسی : شاهنامه (طبع Mohl، ۱ : ۲۵۶) میں بھی موجود ہے۔ اسی طرح پیارے اور لاڈلے بچے کے لیے جگر پارہ اور جگر گوشہ کے الفاظ آج بھی عام طور پر رائج ہیں.

یہی تصور بعض مذہبی رسوم کی تہ میں بھی مضمر ہے، مثلاً کسی بچے کا نام رکھنے کی تقریب پر باقاعدہ جگر کا کھانا ۔ مراکش میں اس موقع پر ایک بھیڑ قربان کی جاتی ہے اور اس کا جگر خاندان کے افراد میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کے دلوں میں بچے کے لیے الفت و محبت پیدا ہو جائے (J. Jouin : *Hespéris*، ۴۴ (۱۹۵۷ء) : ۳۰۸؛ Legey : *Essai de folklore moracain*، پیرس ۱۹۲۶ء، ص ۹۵؛ E. Westermarck : *Ritual and Belief in Morocco*، لنڈن ۱۹۲۶ء، ۲ : ۳۹۰) ۔ مراکش میں جگر کا تعلق ازدواجی محبت سے بھی سمجھا جاتا ہے؛ بعض قبائل میں دولھا اور دلھن اپنے ایک وقت کے ساتھ کھانے میں اس بھیڑ کا جگر کھاتے ہیں جسے ان کی شادی کے موقع پر ذبح کیا گیا ہو (E. Westermarck : *Marriage ceremonies in Morocco*، لنڈن ۱۹۱۴ء، ۱۰۱؛ یورپ میں اسی قسم کی مثالوں کے لیے دیکھیے Bargheer : *Leber*، ص ۹۷۸ ببعد؛ وهی مصنف : *Eingeweide*، ص ۲۱۶) .

علم الابدان کے ان نظریات میں جو عوام میں رائج ہیں، جگر کو ان [مائعات] کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے جنھیں انسان پیتا ہے یا اپنے بدن سے خارج کرتا ہے ۔ یہ خیال، جسے تیرھویں صدی عیسوی میں Hildegerd، باشندۂ Bingen، نے بہت واضح طور پر بیان کیا تھا (*Causae et curae*، ص ۹۸، ۱۰۰) اور جس کا اظہار اکثر رائج الوقت جرمن محاوروں میں ہوتا ہے (Bargheer : *Leber*، ص ۹۸۴؛ وهی مصنف : *Eingeweide*، ص ۳۸۷)، اسلامی دنیا میں بھی پایا جاتا تھا؛ اس کی شہادت رسائل اخوان الصفا (۲ : ۱۶۲) میں ملتی ہے، جہاں جگر کا فعل مائی غذا پر اثرانداز ہونا بتایا گیا ہے (''بیت الشّراب'') .

۳ ۔ سائنسی علم اور عالمانہ نظریات : مسلمان مصنّفین نے علم و فکر کی روشنی میں جگر سے متعلق جو مطالعات کیے ہیں وہ ان اقسام پر مشتمل ہیں : اس عضو کی جسمانی ساخت کا بیان؛ اس کا جسمی نفسی عمل (جو فلسفیوں کے لیے بھی ایسا ہی دلچسپ ہے جیسا کہ ماہرین علم الابدان اور طبیبوں کے لیے)؛ اس کی بیماریوں کی نوعیت، ان کے اسباب اور علاج؛ دواسازی میں جانوروں کے جگر کا استعمال .

طب کے عام رسائل میں بالالتزام جگر کے بارے میں بڑی تفصیل سے بحث ملتی ہے کیونکہ جالینوس کے علم الابدان (Physiology) میں، جسے مسلم سائنس دانوں نے اختیار کر لیا تھا، اس عضو کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ مثال کے طور پر Rufus، باشندۂ Ephesus، اور Philagrius کے تصنیف کردہ یونانی رسائل کی طرز میں قسطا بن لُوقا اور محمد بن زکریا الرازی نے جگر کے متعلق مخصوص رسالے مرتب کیے تھے (F. Sezgin : *Geschichte des arabischen schrifttums*، لائیڈن ۱۹۷۰ء، ۳ : ۶۸، ۱۵۶، ۲۷۳، ۲۹۲)، اگرچہ ممکن ہے کہ یہ رسالے ان کی عام طبّی تصانیف کے باب ہوں .

جہاں تک جگر کی جسمانی ساخت کا تعلق ہے،

مسلم مصنّفین نے، جنھیں بیشتر یونانی مصنفین کی طرح چیر پھاڑ کرنے کی ممانعت تھی، جالینوس کے ان بیانات سے کام چلایا ہے جو اس نے جگر کے بارے میں دیے ہیں - خود جالینوس نے Herophilos، باشندۂ Chalcedon (تیسری صدی قبل مسیح)، کا تتبع کیا تھا، جس نے اسکندریہ میں مردہ لاشوں کی چیر پھاڑ کرنے کے علاوہ جگر کا مطالعہ کیا تھا، لیکن جس نے بظاہر غیر صحت مند انسانی جگروں اور حیوانی جگروں کے مشاہدات کو بھی تندرست جگر کے مطالعے میں شامل کر دیا تھا - بندروں کی چیر پھاڑ سے اس معاملے میں Herophilos پر جالینوس کے اعتماد کی تصدیق ہو گئی ہے (دیکھیے Ch. Daremberg : *Oeuvres anatomiques, physiologiques et médicales de Galien*، پیرس ۱۸۵۴ تا ۱۸۵۶ء، ۱ : ۲۹۳، حاشیہ ۱؛ Max Simon : *Sieben Bücher Anatamie des Galen*، لائپزگ ۱۹۰۶ء، ۲ : xxxiv ببعد)۔ اس کی پیروی کرتے ہوے مسلمان طبیبوں نے یہ بتایا کہ جگر کے بعض اوقات دو یا تین کونے (اطراف)، یا زائد حصے (زوائد) ہوتے ہیں اور زیادہ تر چار یا پانچ، جو معدے کے گردا گرد ہوتے ہیں۔ جگر کے بارے میں اس قسم کے بیانات محمّد بن زکریا الرازی : منصوری اور علی بن عباس : ملکی میں پائے جاتے ہیں (دیکھیے طبع P. de Koning: *Trois Traités d'anatomie arabe* ..... لائیڈن ۱۹۰۳ء، ص ۶۸ تا ۷۱، ۳۲۷ تا ۳۲۹)، جس میں عربی متن کے بالمقابل فرانسیسی ترجمہ درج ہے - اسی طرح ابن سینا : قانون، کتاب ۳، فن ۱۴، باب اول، کے فرانسیسی ترجمے میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے (وہی کتاب، ص ۷۰۶ تا ۷۱۵ و روم ۱۵۹۳ء، ص ۳۵۵ - ۳۵۶ و لاطینی ترجمہ، وینس ۱۵۶۴ء، ص ۲۰۷ تا ۲۴۷)، جس میں یونانی مصنفین کے متوازی متون بھی شامل ہیں .

جگر کے جسمی نفسی فعل سے متعلق عربوں کے خیالات ابتداءً اخلاط (humours) کے اس جسمانی نظام سے مأخوذ ہیں جو جالینوس نے قدیم تر کتابوں کی مدد سے مرتب کیا تھا - یہ وہ نظام تھا جو عربوں کے مفتوحہ ممالک اور مغربی یورپ میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا (دیکھیے اس معاملے میں Luis Garcia Ballester کا ایک نہایت عمدہ اور تازہ بیان، جو P. Lain Entralgo : *Historia Universal de la Medicina*، برشلونہ ۱۹۷۲ء، ۲ : ۲۰۹ تا ۲۶۸، میں دیا ہے؛ نیز دیکھیے وہی مصنف : *Galeno en la sociedad y en la ciencia de su tiempo*، میڈرڈ ۱۹۷۲ و سہل تلخیص، از G. Sarton : *Galen of Pergamon*، لارنس [کینساس] ۱۹۵۴ء؛ تولید و تقسیم خون کے نقشے کے لیے دیکھیے *Historia Universal*، ص ۲۴۴ و A. C. Crombie : *Augustine to Galileo, A. D. 400-1695*، لنڈن، ۱۹۵۲ء، ۱ : ۱۳۲)۔ اس نظام میں جگر کو اولیں اہمیت حاصل ہے: ”سب اعضا اسی کی مدد سے کام کرتے ہیں، لیکن یہ اپنا کام بغیر کسی کی مدد کے کرتا ہے“ (ابن سینا : ارجوزۃ فی الطب، شعر ۱۷۴، طبع و مترجمۂ H. Jahier و A. Noureddine، پیرس ۱۹۵۶ء، ص ۴۰) - خون اس غذا کے تصفیے اور اجتماع کے ذریعے، جو پہلے سے معدے میں ہضم ہو کر کیلوس (Chyle) یا کیموس (Chyme) کی شکل میں تبدیل ہوچکی ہو، جگر ہی میں بنتا ہے (کیلُوس اور کیمُوس کو بعض اوقات کَیلُوس اور کَیمُوس بھی لکھتے ہیں اور یہ دونوں لفظ اسی طرح باہم وارد ہوتے ہیں جیسے یونانی Χυλος اور Χυμος ؛ دیکھیے الخوارزمی : مفاتیح العلوم، طبع G. van Vloten، لائیڈن ۱۸۹۵ء، ص ۱۸۱ و قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء، ص ۱۰۷)۔ ہاضمے کا ایک اور ابتدائی عمل تنضیج (Coction) ممکن ہے

ماساریْق یا مسارِیق (mesenteric veins؛ یونانی: φλεβες μεσραιχαι؛ لاطینی: mesaraicae) میں ہوچکا ہو، جن میں جگر کی خاصیت موجود ہوتی ہے اور جو کیلوس کو جزوی طور پر خون میں تبدیل کر دیتی ہیں (ابن سینا : قانون، ج ۳، فن ۱۴، مقالہ ۱، شروع میں؛ جالینوس کو اس امر میں جو شبہات تھے ان کے لیے دیکھیے Mani، ۱ : ۶۸، جن کی وجہ سے قرون وسطٰی اور دور احیاے علوم میں مناقشات پیدا ہوتے رہے) ۔ تنضیج ہضم جگر کے ابتدائی اثر کے تحت پہلے ہی واقع ہو چکی تھی، جو حرارت کا منبع ہے اور جس کی اطراف کے بارے میں خیال تھا کہ وہ انگلیوں کی طرح معدے کو گھیرے ہوے ہیں .

کیلوس، جو پہلے ہی ایک حد تک تبدیل ہو چکتا ہے، جگر تک العِرق الأسطوانی (vena porta؛ یونانی: πνληφλεψ:ηεπι) کے ذریعے پہنچتا ہے (Simon: ....Sieben Bücher، ۳ : ۱۴۶؛ اسے بعد میں الباب بھی کہنے لگے تھے)، جس میں ماساریق جا کر گرتی ہیں ۔ وہاں وہ خون صالح میں تبدیل ہوجاتا ہے، جو بدن کی غذا کے لیے موزوں ہوتا ہے (انیسویں صدی عیسوی تک یہ کہاوت مستند مانی جاتی تھی : sanguificatic est chyli in sanguinem mutatio = "تولید خون کیلوس (chyle) کے خون میں تبدیل ہونے کا نام ہے"، دیکھیے Mani، ۱ : ۵۹) ۔ اس خون کا ایک حصہ جگر کا جزو بن جاتا ہے، جسے عَلَق (= منجمد خون) کہا جا سکتا ہے (ابن سینا : قانون، ج ۱، فن ۱، تعلیم ۳، فصل ۲؛ وہی کتاب، ج ۳، فن ۱۴، مقالہ ۱) اور جگر کی یہ ترکیب کم از کم قپادوقیہ Cappadocia کے Aretaios کے زمانے (دوسری صدی؛ Mani، ۱: ۵۸، نیز ص ۴۶) سے بیان کی جاتی رہی ہے ۔ صحیح خون بننے کے عضو کی حیثیت سے جگر کو وہ مقام سمجھا جا سکتا ہے جہاں چاروں اخلاط (homours) پیدا ہوتے ہیں (منشاء الاخلاط؛ ابن سینا: أرجوزۃ، شعر ۱۴۶؛ دیکھیے قانون، ج ۱، فن ۱، تعلیم ۴، فصل ۲) ۔ ان چار میں سے دو فوراً ہی پیدا ہو جاتی ہیں، یعنی ایک تو وہ بھاری تل‌چھٹ جن پر السِمرّ السّوداء (کالا پِتّا : Atrabile؛ یونانی: χολη μελιαυα؛ لاطینی: Atra bilis) مشتمل ہوتا ہے اور دوسری دقیق، یعنی ہلکے اجزا یا ایک قسم کا جھاگ، جو المرّۃ الصّفراء (زرد پِتّا؛ یونانی: χολμEανθη؛ لاطینی Cholera) کہلاتا ہے۔ ان دونوں کو زیادہ تر دو ظرف (وعاء) کھینچتے ہیں، جو کم و بیش گردنوں کی طرح (بمنزلۃ العنق، در جالینوس) ہوتے ہیں اور تلّی اور پتّے دونوں سے جگر کو ملاتے ہیں (الرازی: منصوری، در Koning : *Troités*، ص ۶۷ ببعد؛ علی بن العباس، ملکی، در کتاب مذکور، ص ۱۷۷، ۳۷۸ ببعد؛ ابن سینا : قانون، در کتاب مذکور، ص ۶۰۷، جس کے بالمقابل متوازی یونانی متون ہیں؛ سب سے پہلے جالینوس: *De usu partium*، ۴: ۴، جس پر ایک نہایت مفید شرح کے لیے دیکھیے Deremberg : *Oeuvres......de Galien*، ۱ : ۲۸۲، حاشیہ ۱).

خون، جس میں ابھی دیگر عناصر کی آلائش موجود ہوتی ہے، جگر سے شروع ہو کر رگوں کے نظام کے ذریعے تقسیم ہوتا ہے (یہ صحیح معنوں میں دوران خون نہیں ہوتا بلکہ مد و جزر ہوتا ہے، جس کے ساتھ آہستہ آہستہ تجدید خون بھی ہوتی رہتی ہے)۔ سب رگیں (veins؛ عَورِدَۃ) یا العروق السّواکن جگر ہی سے شروع ہوتی ہیں جب کہ دل وہ مقام ہے جہاں سے العروق المتحرکہ (arteries) کے نظام کا آغاز ہوتا ہے ۔ رگیں العِرق الأسطوانی (vena porta) سے ادھر ادھر پھیلتی ہیں، جو جوف جگر سے چلتی ہے اور اسی طرح العرق الاجوف (vena cava) سے، جو جگر کے

محدّب پہلو سے شروع ہوتی ہے (قانون، ج ۱، فن ۱، تعلیم ۵، جملہ ۵) .

جن نظریات کی رو سے مختلف سطحات پر پائے جانے والے عناصر کائنات کے مابین تعلق بیان قائم کیا جاتا ہے، ان میں زرد پتّے کو اور اس کے ساتھ اس آتشیں عنصر کو جس کا وہاں غلبہ ہے، لہٰذ مزاج (χρασις) کو جگر کے ساتھ ایک خاص رشتے میں منسلک کرتے ہیں؛ لیکن ایک مختلف نظریہ جگر کا تعلق خون سے، جس میں ہوا کا غلبہ ہوتا ہے، اور اس طرح قدرتی طور پر دموی (Sanguine) مزاج سے قائم کرتا ہے (دیکھیے شکل، در M. Ullmann : *Die Medizin im Islam*، لائیڈن و کولون ۱۹۷۰ء، ص ۹۹، نیز R. Herrlinger کی وہ رنگین شکل جس میں بقراط کی تصنیف کے زمانے سے لےکر ارتقا دکھایا گیا ہے اور جو E. Schöner : *Das Viererschema in der antiken Humoral-pathologie*، ویزباڈن ۱۹۶۴ء، کے آخر میں درج ہے؛ موجودہ زمانے کی مروّجہ شکل کے لیے، جو مقبول عام مجلّات سے مأخوذ ہے، دیکھیے T. Canaan : *Aberglaube und Volksmedizin im Lande der Bibel*، ھامبورگ ۱۹۱۴ء، ص ۳۳) .

جالینوس نے روحانی تعلیم کے اصولوں کو اخلاط کے نظریے سے جس طرح منسلک کیا تھا، مسلمان اطبا نے بھی قدرتی طور پر اس کا تتبع کیا ہے، جس کی ابتدا ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ بعض ارواح (spirits؛ یونانی: πνευματα)، یعنی غیر مرئی ابخرات، جسم میں کارفرما ہوتے ہیں اور خیال ہے کہ انھیں سے اعضاے رئیسہ کے کام کی توجیہ ہوسکتی ہے ۔ مسلم طب کی رو سے ان میں سے ایک، یعنی طبعی روح (الروح الطبیعی یا الطبیعیہ؛ یونانی : πνευματαφυιχον) کا مقام جگر ہے ۔ یہاں جالینوس کی، جسے کچھ شبہات تھے اور جو اس معاملے میں متذبذب تھا، اس حد تک پیروی نہیں کی گئی جتنی کہ اسکندریہ اور شام کے اطبا کی، جنھوں نے ایک سادہ اور آسان پیرائے میں اس کے نظریات کو منظم کر دیا تھا ۔ اس "روح" کو اسی سطح پر رکھا جاتا ہے جس پر روح حیوانی اور روح انسانی کو، جن کا مقام علی الترتیب دل اور دماغ ہے (قدیم بیان، از حنین بن اسحٰق : المدخل فی الطب؛ Temkin : *On Galen's Gesnerus Pharmacology* (Aarau)، ۸ (۱۹۵۱ء) : ۱۸۰ تا ۱۸۹) ۔ یہ خون کے ساتھ رگوں کے ذریعے تقسیم ہوتی ہے .

ان میں سے ہر ایک روح، جالینوس کے نظریے ھی سے، ایک بڑی قوۃ (Faculty) یا قوی (یونانی: δυναμεις؛ لاطینی: virtutes) کے ایک گروہ سے مطابقت رکھتی ہے اور ان کے افعال سے جسمانی اور نفسیاتی مظاہر منسوب کیے جاتے ہیں؛ چنانچہ اطبّا کا دعوی ہے کہ "طبعی" قوۃ یا قوی کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : ایک وہ جن کا فعل یہ ہے کہ کسی فرد کو محفوظ رکھیں اور اس کی شخصیت قائم کریں۔ یہ قوۃ غذا کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اس کا مقام جگر ہے؛ دوسری قوۃ وہ ہے جو نوع کی حفاظت کرتی ہے اور جو اعضاے تناسل میں رہتی ہے ۔ ارسطو کی پیروی کرتے ہوے ابن سینا اور بہت سے اور لوگ اس نظریے سے کسی حد تک اختلاف کرتے ہیں اور دل کے قوی ھی کو اصلی بنیاد اور بڑا سرچشمہ قرار دیتے ہیں (دیکھیے Mani، ۲: ۳۱) ۔ قوۃ تغذیہ دل سے جگر کی طرف پھیلتی ہے (ابن سینا : شفاء، طبیعیات، فن ۶، مقالہ ۵، فصل ۸، طبع J. Bakos: *Psyeholgie d' Ibn Sīnā...*، پراگ ۱۹۵۶ء، ص ۲۶۵؛ قانون ج ۱، فن ۱، تعلیم ۶) ۔ زیادہ صحیح معنوں میں خالص پیروان ارسطو نے جالینوس سے اس لیے اختلاف کیا کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ غذا یا تغذیے کا اصول دل میں رہتا ہے نہ کہ جگر

میں (کلیات، ج ۲، باب۹، نیز دیکھیے J. C. Bürgel : Averroes "contra Galenum، در NG W, Gott.، ج ۱، ۱۹٦۷ء، عدد ۹، ص ۲۹۲ ببعد) ۔ قوٰی کی مختلف فہرستیں دی جاتی ہیں اور ان کے بارے میں تصور یہ ہے کہ وہ یکساں طور پر دوسرے اعضا پر اثرانداز ہوتے ہیں.

ہم یہاں مسلم اطبّا کے علم اسباب امراض یا علم معالجات سے بحث نہیں کریں گے ۔ ان کی ایک واضح اور سیدھی سادی بحث ایک قدیم ترین کتاب، یعنی علی بن سہل الطبری : فردوس الحکمة (طبع محمد زبیر صدیقی، برلن ۱۹۲۸ء، ص ۴۰ ببعد، ۲۱۸ ببعد) میں مل سکتی ہے اور ایک بہت مفصل بیان، جسے کلاسیکی حیثیت حاصل ہے، ابن سینا : القانون (فن ۱۴، کتاب ۳، روم ۱۵۹۳ء، ص ۴۵۵ تا ۴۷۹ و تہران ۱۲۹۵ھ، ص ۱۷۹ تا ۲۰۴ و لاطینی ترجمہ، وینس ۱۵٦۴ء، ص ۷۴۰ تا ۷۸۱) میں موجود ہے، اس کا پہلا مقالہ کبد (دیکھیے اوپر) کی ساخت سے متعلق ہے ۔ تشریح الابدان کی کتابوں میں جگر کے ماؤف ہو جانے کی حالت میں اسے داغنے کا ذکر کیا گیا ہے (دیکھیے P. Huard و M. D. Grmek : Le premier manuscrit chirurgical turc، پیرس ۱۹٦۰ء، ص ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۲۱، شکل ۲۷، ۳۱؛ زمانۂ حال میں اسے داغنے کے سلسلے میں دیکھیے M. S. Belguedj : La médecine traditionalle... ص ۱۴۸).

القانون میں جگر کے بارے میں متعدد منتشر معلومات بھی دی گئی ہیں، جو اس کے لاطینی ترجمے (وینس ۱۵٦۴ء) میں نہایت احتیاط سے مرتب کی گئی ہیں، اور اشاریے کی بدولت بآسانی مل سکتی ہیں ۔ کتاب ۲ میں مفردات کے بارے میں ایک طویل رسالے (روم ۱۵۹۳ء، ۱ : ۲۴۹ تا ۳۴۷؛ نیز ترجمہ وینس ۱۵٦۴ء، ۱: ۱۲۴ تا ۲۸۰ء، جہاں یہ لاطینی حروف ہجا کی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے) اور کتاب ۵ کے باب ادویہ میں ان جڑی بوٹیوں اور غذاؤں، نیز مفرد اور مرکب دواؤں پر کئی حواشی موجود ہیں، جن کے بارے میں معلوم ہے کہ ان کا جگر پر کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے ۔ ان مرکب دواؤں کی فہرست کا خلاصہ کتاب ۵، جملہ ۱، مقالہ ۱۲، میں موجود ہے (روم ۱۵۹۳ء، ۲ : ۲۴۳ و لاطینی ترجمہ، وینس ۱۵٦۴ء، ۲ : ۳۰۵ - ۳۰٦) اور ان دواؤں کو ان بیماریوں کے مطابق مرتب کیا گیا ہے جن میں انہیں استعمال کیا جاتا ہے .

القانون، کتاب ۲، میں دواؤں سے متعلق ایک باب میں حیوانوں کے جگر سے بحث کی گئی ہے (طبع مذکور، ۱ : ۱۹٦ و ترجمۂ مذکور، ۱ : ۲۹۹) ابن سینا کے اکتشافات بھی ان چیزوں میں شامل ہیں جنھیں غذائی نقطۂ نظر سے مزید تفصیل کے ساتھ ابن جزلہ کے معروف رسالۂ اغذیہ منہاج البیان میں بیان کیا گیا ہے (مخطوطہ، در کتاب خانۂ ملی، پیرس، عدد Ar ۲۹۴۹، ورق ۱۵۹-ب، عدد ۲۹۵۰، ورق ۲۷۹-الف، عدد ۲۹۵۲، ورق ۲۳۱- الف و ب) ۔ جگر کھانے کا ایک عام نقصان یہ ہے کہ ہاضمے کے فعل کے دوران میں اس سے ایسا گاڑھا خون پیدا ہوتا ہے جو شریانوں میں بہت سستی سے حرکت کرتا ہے اس کا مداوا یہ ہے کہ اسے سومور شراب یا تیل کے ساتھ کھایا جائے ۔ چوپایوں کے جگر سے بالعموم اجتناب کرنا چاہیے ۔ موٹی بطخ یا مرغی کا جگر سب سے اچھا ہوتا ہے ۔ پلی ہوئی بڑی بطخ کا جگر بھی بہت عمدہ ہوتا ہے، بالخصوص اگر اسے گاڑھے دودھ کے ساتھ کھایا جائے ۔ اس کے ساتھ نمک اور تیل شامل کر لینا چاہیے تاکہ معدے پر بوجھ نہ پڑے ۔ بھیڑ کا تلا ہوا جگر اسہال کے لیے فائدہ مند ہے ۔ بکری

(خصوصاً بکرے) کا جگر مرگی کی جانچ کے لیے کارآمد ہے کیونکہ اس سے دورہ پڑ جاتا ہے ۔ اسے کھانا یا اس کی دھونی دینا آنکھ کی صفائی کے لیے بہت مفید ہے ۔ آنکھ کے پردے کی خرابیوں کے لیے بھی یہ فائدہ مند ہے (اسی طرح کے ایک علاج کے لیے، جو آج کل حضر موت میں مستعمل ہے، دیکھیے R. B. Serjeant، در *BSOAS*، ج ۱۸، ۱۹۵۶ء، ص ۷) ۔ تیتر کا خشک اور چورا کیا ہوا جگر بھی، جس کا خمیرہ بنا لیا جائے، مرگی کے لیے مفید ہے ۔ اسی طرح گدھے کا بھنا ہوا جگر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اسے خالی پیٹ کھایا جائے ۔ بھیڑیے کا جگر بھی جگر کی شکایتوں کے لیے مؤثر ہوتا ہے ۔ وَزَغہ (ایک قسم کی بڑی چھپکلی)، نیز مینڈک کا جگر دانت کے درد میں کمی کرتا ہے ۔ دیوانے کتے کے جگر سے سگ گزیدہ کو شفا ہو جاتی ہے، بالخصوص اگر یہ اسی کتے کا ہو جس نے اسے کاٹا ہو ۔ یہ علاج، جس کا بلینوس (Pliny) نے بھی ذکر کیا ہے (۲۹ : ۳۲) اور جو یورپ میں انیسویں صدی تک عام طور پر رائج تھا (دیکھیے Bargheer : *Eingeweide*، ورق ۲۸۳) غالبًا بیسویں صدی کے شروع میں یروشلم میں بھی معلوم تھا، کیونکہ اس کا ذکر S. Y. Agnon کے ناول *Tmōl Shilshōm*، ۴: ۱۸، (فرانسیسی ترجمہ : *Le Chien Balak*، پیرس ۱۹۷۱ء، ص ۵۶۵ ببعد) میں آیا ہے ۔

۴ ـ جادو، مذہب اور داستانوں میں : مقبول عام علم نفسیات و الابدان کے پہلو بہ پہلو، جس میں علم نفسیات اور علم الابدان کی طرح جسم میں جگر کے فعل سے بحث کی گئی ہے اور علم سائنسی تشخیص الامراض، علم الاغذیہ اور علم الادویہ کی روشنی میں، جن سے (اصولاً) امراض کے علاج مأخوذ ہیں، جگر کی بطور غذا یا دوا قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے، بنیادی طور پر بعض علامتی اور ساحرانہ عقائد کے ابتدائی عناصر بھی موجود رہے ہیں، جن کی نشو و نما ان کے عملی استعمال کے ذریعے ہوتی ہے ۔ بعض اوقات یہ سائنسی رسائل میں بھی نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی وہاں ان کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے ۔

جالینوس کے تتبع میں ابن سینا، اگرچہ کسی قدر شبہے کے ساتھ، کہتا ہے کہ کسی جانور کے جگر کا حجم اس کی حرص و آز اور اس کے شرمیلے پن کے مطابق ہوتا ہے (دیکھیے P. de Koning: کتاب مذکور، ص ۲۰۸، ۱۱۷) ۔ مثل بالمثل کا ساحرانہ اصول استعمال کرتے ہوے، یہ سمجھا جاتا تھا کہ بھیڑ کا جگر، کھانے سے انسان کے جگر کو تقویت ملتی ہے (داود الانطاکی : تذکرہ، قاہرہ ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء، ۱ : ۲۰۷) ۔

جگر کے متعلق علما کے ہاں یہ بھی تصور ملتا ہے کہ جگر (کہا جا سکتا ہے کہ بروے علم جنین منجمد خون سے بنتا ہے ۔ اسے یا تو لفظی معنوں میں لیا جاتا ہے یا اسے ایک عوامی تصور سے وابستہ کر دیا جاتا ہے، چنانچہ ایک حدیث ملتی ہے، جس میں خون کھانے کی عام تحریم سے جگر اور تلی کو مستثنٰی قرار دیا گیا ہے : "ہمارے لیے دو خون (جگر اور تلی) حلال ہیں" (دیکھیے ابن ماجہ، ۲۹ : ۳۱ ؛ احمد بن حنبل، ۲ : ۹۷) ۔

جگر کی خرابیوں کی صورت میں تعویذ استعمال کیے جاتے ہیں؛ چنانچہ علم الکیمیا کے ایک مجموعے ذخائر الاسکندر میں، جسے یونانی الاصل خیال کیا جاتا ہے، ایک تعویذ کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو جگر کی شکل کے ایک سرخ پتھر کا بنا ہوا تھا اور جس پر پہاڑی بکرے کی تصویر اور ایک طلسماتی کتبہ نقش تھا ۔ یہ درد جگر کے لیے ایک مفید علاج ہے J. Ruska : *Tabula Smaragdina*، ہائیڈل برگ ۱۹۲۶ء، ص ۹۸ ببعد) ۔ عملی علاج پر

کتابوں میں بہت سے ایسے نسخے شامل ھیں جن میں تجرباتی مشاهدے، ساحرانه استخراج (مثلاً بھیڑیے کے تیل میں پسے ھوے جگر کا استعمال) نیم حکیمانه علاج (اونٹ کا پیشاب) اور ڈھلے ھوے تعویذ، وغیرہ کا امتزاج ھے (مثال کے طور پر دیکھیے نام نہاد جلال الدین السّیوطی، یعنی محمد الصنوبری، م ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء : الرحمة فی الطب والحکمة، قاهره ۱۳۵۷ھ، ص ۱۰۶، باب ۱۰۲) مراکش میں ناگ پھنی کے جگر کی شکل میں کٹے ھوے ٹکڑے کسی مرابط خانقاہ کی بیرونی دیواروں پر لٹکا دیے جاتے ھیں اور عقیدہ یه ھے که وہ خشک ھوکر بیماروں کو شفا بخشتے ھیں (E. Westermarck : *Ritual and belief in Morocco*، لنڈن ۱۹۲۶ء، ۱ : ۲۰۲) مراکش میں ایک اور دستور یه ھے که کسی چھت پر بھیڑ کے جگر اور گردے کو بیمار آدمی کے جوتے کے تلے کی شکل میں کاٹ کر اور ان پر کئی بار چاقو سے کچوکے لگا کر اور ناگ پھنی کے ٹکڑے میں پرو کر خشک کیا جاتا ھے (*Pratiques des harems marocains* : A.R de Lens)، پیرس ۱۹۲۵ء، ص ۱۲) - وسطی عرب کے بدوی ناشتے کے وقت دارچینی کھاتے ہیں جسے قرف الکُبود (= جگر کے چھلکے) بھی کہتے ھیں اور یه جگر کی شکایتوں کا علاج سمجھی جاتی ھے (J.-J. Hess : *Von den Beduinen des Innern Arabiens*، زیورخ و لائپزگ ۱۹۳۸ء، ص ۱۴۸ ببعد) .

جگر کے ذریعے کہانت کا عمل ("کبدیت"، hepatoscopy)، جو قدیم میسوپوٹامیا اور ایتروریا Etrruria میں بہت اھمیت رکھتا تھا، لیکن جسے تیسری صدی ھی میں عرب کی ملکه زنوبیا نے ترک کر دیا تھا (Zosimus، ۱ : ۵۹)، عربوں کے ھاں رائج نه تھا (دیکھیے T. Fohd : *La divination arabe*، لائیڈن ۱۹۶۶ء، ص ۳۹۷، ۵۲۷)، تاھم کہانت کے طریقوں کی ایک عام فہرست میں ابن خلدون(مقدمه، ۱: ۱۹۱، ۱۹۴، طبع Quatremère، ۱: ۳۶۹، ۱۷۴) کے علاوہ اس کا ذکر ایک شخص ربی لیوی Rabbi Levi نے بھی کیا ھے، جس کا زمانه غیر یقینی ھے - اس نے بابل کے بادشاہ کے عمل "کبدیت" کو، جو Ezekid، ۲۱ : ۲۶، میں مذکور ھے، عربوں کے ایک ایسے طریقے سے تشبیه دی ھے جس میں بھیڑ کو ذبح کر کے اس کے جگر کا مطالعه کیا جاتا ھے"Midrash Rabba to Eccles تا Eccles، ۱۲ : ۷ وغیرہ، در *Monumenta Talmudica*، ج ۵ : *Geschichte* لائپزگ ۱۹۱۴ء، ص ۴۸، فصل ۸۴) .

عوامی کہانیوں میں جگر ایک ادنٰی کردار ادا کرتا ھے اور وہ بھی زیادہ تر ایک دوا کے طور پر - ترکی کہانیوں میں ایک دیوانی شہزادی کا واحد علاج کسی شہزادے کا جگر بتایا گیا ھے (W. Eberhard و P. N. Boratv : *Typen Türkischer Volksmärchen* ویزباڈن ۱۹۵۳ء، ص ۳۰۲) - ایک جوان لڑکی کسی جانور کا جگر ایک بوسے کے عوض فروخت کرتی ھے (کتاب مذکور، ص ۲۴۳) اور ایک مردم خور انسانی جگر کھاتا ھے (کتاب مذکور، ص ۱۷۲) - جادوئی پرندے کا دل ایک عالمگیر موضوع ھے (A. Aarne و S. Tompson : *The Types of the Folktate*، بار دوم، ھلسنکی ۱۹۶۴ء، ص ۲۰۸، نوع ۵۶۷) - اس سلسلے کی ایک روایت میں دل کی جگه جگر مذکور ھے - اس کی جگه بعض اوقات گردوں، پوٹے، یا پھر دل کا ذکر ھوتا ھے (Eberhard و Boratav : *Typen*...، ص ۹۶ تا ۹۸) - اداکال Adakale کی ایک کہانی میں ایک کنجوس کا ذکر ھے جو کفایت کے خیال سے جگر کھاتا ھے - اس سے ظاهر ھوتا ھے که یه کہانی زمانۂ حال کی تصنیف ھے (کتاب مذکور، ص ۸۸ ؛ نیز

دیکھیے نیچے) .

کسی جسمانی عضو کے ذریعے شفا حاصل ہونے اور اس کے ساتھ ھی عجیب و غریب ھستیوں کی غیر معمولی طاقتوں کا موضوع شاھنامہ کے اس بیان کی تہ میں ملتا ھے جس میں کیکاؤس اور ان ایرانیوں کے علاج کا ذکر ھے جنھیں مازندران پر حملے کے دوران میں سفید دیو نے جادو سے اندھا کر دیا تھا (رک بہ دیو) - اس سفید دیو کے جگر کے خون سے، جسے رستم نے شکست دینے کے بعد اس کے سینے سے کھینچ کر نکال دیا تھا، ان لوگوں کی بینائی عود کر آئی تھی (طبع J. Mohl، پیرس ۱۸۳۸ تا ۱۸۷۶، کیکاؤس، شعر ۶۵۲ ببعد و طبع E. E. Bertels، ماسکو ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۹، مازندران، شعر ۶۱۳، ببعد و مترجمۂ J. Mohl، پیرس ۱۸۷۶، ص ۴۲۸ ببعد) - اس موقع پر اژدھے پن کے لیے جگر کی نفع بخش خاصیت تاؤ (Taoist) کے ساحرانہ علم حیوانات و نباتات کے ایک اصول سے بہت قریب آگئی ھے (J. C. Coyajee، در *Journal and Proceedings of the Asiatic Society of Bengal*، سلسلۂ جدید، ج ۲۴، ۱۹۲۸ء، ص ۱۸۷ ببعد)، لیکن جیسا کہ ھم اوپر دیکھ چکے ھیں، بکری کے جگر کا آنکھ کی شکایتوں کے لیے استعمال ابن سینا کی سائنسی طب میں نظر آتا ھے اور اسی طرح توبت Tobit کی کتاب میں مچھلی کا جگر، دل اور پتّا جن بھوت کو نکال باھر کرنے میں مدد دیتے ھیں (Tobit، ۶: ۵،۸: ۲) - اسی وجہ سے بلا شبہہ جگر کو عوامی امراض چشم میں اکثر استعمال کیا جاتا تھا (Bargheer: Eingeweide، ص ۲۸۴ ببعد) .

جسم میں جگر کی اوّلیں اھمیت سے بلا شبہہ ساحرانہ استخراج کے ذریعے متّعدد طور طریقوں کی توجیہ کی جا سکتی ھے - کسی دشمن کا جگر چبانے یا کم از کم اس پر دانت لگانے سے بظاھر فنا کر دینے یا بڑی سے بڑی لعنت بھیجنے کا مفہوم نکلتا ھے - جنگ احد کے موقع پر ھندہ کی یہی حرکت، یعنی (حضرت) حمزہؓ کے جگر کو دانتوں سے چبانا (ابن ھشام، ص ۵۸۱) امیر معاویہ کے تحقیری لقب ابن آکلة الاکباد (= جگر کھانے والی کا بیٹا) کا باعث تھی (المسعودی: مروج، ۴: ۳۴۹ و فرانسیسی ترجمہ از Pellat، پیرا ۲۳۷۱، جعلی (؟) المسعودی: کتاب اثبات الوصیة الامام علی، جس کا حوالہ Ch. Pellat: *Le Shiisme imamite*، پیرس ۱۹۷۰ء، ص ۸۵، میں ملتا ھے) - جزیرہ نمائے سینا کے بدویوں کا عقیدہ ھے کہ دروز مسلمانوں کا جگر کھاتے ھیں (W. P. Zenner، در *Middle Eastern Studies*، ج ۸، عدد ۳، اکتوبر ۱۹۷۲ء، ص ۴۱۱) - اس کے متوازی مثالوں کے لیے دیکھیے Bargheer، Leber ص ۷۷؛ وھی مصنف: *Eingeweide*، ص ۹۳، ۲۱۶؛ W.D. Wallis، در *ERE*: ۱۰: ۳۲۷، ببعد .

عید الاضحی کی قربانی کے موقع پر ذبح کردہ جانور کا جگر پہلے کھانا ضروری ھے، جو المغرب کے ایک بخوبی مصدقہ دستور کی پیروی ھے - کہا جاتا ھے کہ اس کی تائید بعض فقہا نے بھی کی ھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے بھی ھوتی ھے (E. Doutté: *Magie et religion dans l' Afrique du Nord*، الجزائر ۱۹۰۹ء، ص ۴۷۳؛ J. Desparment: *Coutumes, institutions, croyances der indigénes Algérie*، الجزائر ۱۹۳۹ء، ۱: ۲۷۵؛ E. Westermarck: *Ritual and Belief in Morocco*، لنڈن، ۱۹۲۹ء، ۱: ۲۳۴ ببعد، ۲: ۱۲۰ ببعد؛ J. Chelhod: *Le sacrifice chez les Arabes* پیرس ۱۹۵۵ء، ص ۱۱۳ ببعد؛ J. Jouin، *Hesperis* (۱۹۵۷ء)، ۴۴: ۳۲؛ A. M. Goichon: *La vie feminine an Mzab*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۲۶۳) .

مراکش کے بعض قبائل میں دولھا اپنے بن بیاہے دوستوں کو تحفۃً ایک بیل دیتا ہے ۔ اس کا جگر، جسے سب سے پہلے کھانا ضروری ہوتا ہے، باعث برکت سمجھا جاتا ہے ۔ اسے ان سب لوگوں میں تقسیم کرنا ہوتا ہے جو حاضر ہوں، لیکن عورتوں میں نہیں (E. Westermarck : *Marriage Ceremanies in Morocco*، لنڈن ۱۹۱۴ء، ص ۱۲۶) .

۵ - جانوروں کا جگر بطور خوراک: جگر سے، جسے اکثر بیکار گوشت اور اوجھڑی کی ذیل میں شمار کیا جاتا ہے، نفرت کی جاتی تھی اور اسے مفلس و قلاش لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا؛ چنانچہ جنوبی لیبیا میں ایک کہاوت ہے : ''مثل النوار علی الکبد''، یعنی مفلس لوگ کسی چیز پر اس طرح تیزی سے ہاتھ مارتے ہیں، جس طرح نوار (= خانہ بدوش) جگر پر (F. J. Abela : *Proverbes populaires, adages et locutions proverbiales du Liban-Sud*، زیر طبع)، لیکن بعض اور علاقوں میں جگر اور دل کو بہت لذیذ غذا سمجھا جاتا ہے، جیسے کہ حضر موت میں (F. Stark : *The Southern Gates Hamondsworth of Arabia* ۱۹۴۵ء، ص ۸۷) - عدن میں آج کل بیکار گوشت سمالی لینڈ سے درآمد کیا جاتا ہے، جہاں (بقول یوسف طالب) لوگ اسے نہیں کھاتے ۔ کچا جگر بھی بعض اوقات ایک عمدہ غذا سمجھا جاتا ہے، جیسے لبنان اور اردن میں (A. Jaussen : *Coutumes des Arabes au pays de Moab*، پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۶۵)۔ صحرا میں جو جانور شکار میں مارا جاتا ہے، اس کا پیٹ جلدی سے چاک کر لیا جاتا ہے اور جگر، دل اور پھیپڑے دہکتے ہوئے کوئلوں پر رکھ دیے جاتے ہیں اور فوراً یا دوسرے دن کھائے جاتے ہیں (M. Gast : *Alime-ntation des populations de l' Ahagger*، پیرس ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۶) .

قرون وسطی میں عرب کی منڈیوں میں ہمیشہ کبودی (جگر فروش) موجود ہوتے تھے، جو لہسن کے ساتھ پکایا ہوا یا سیخوں پر لگا کر بھنا ہوا جگر ان لوگوں کے ہاتھ بیچتے تھے جو بازار میں کھانا کھاتے تھے ۔ رسائل حِسْبہ میں بکری یا گاے بھینس کے جگر کو بھیڑ کے جگر کے ساتھ ملانے کی ممالعت کی گئی ہے ۔ ان میں بہت تفصیل سے ان اجزا کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو ملانے چاہییں (''ابن الاخوۃ : معالم القربۃ، طبع R. Levy، لنڈن ۱۹۳۸ء و عربی متن، ص ۹۵ ببعد) ۔ اس قسم کی غذا میں اکثر ملاوٹ کی جاتی تھی ۔ رسالۂ کیمیاء الطبائخ کو، جس میں ان لوگوں کو برا بھلا کہا گیا ہے ''جو کہنے کو تو جگر بیچتے ہیں، لیکن دراصل وہ جگر نہیں ہوتا،'' فلسفی یعقوب الکندی (تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی) سے منسوب کیا جاتا ہے (الشّیزری : نہایۃ الرتبہ، در ابن الاخوۃ : کتاب مذکور، ص ۱۰۸، حاشیہ ۸ ؛ ابن بَسّام : نہایۃ الرتبہ، در مشرق، ۱۹۰۷ء، ۳۳ : ۱۰۸۱) ۔ دوسری طرف خشک یا بھنے ہوے اور کوبیدہ جگر کی کھرچن کو نقلی مشک کی طرح استعمال کیا جاتا تھا (سقطی : *Un manuel hispanique de hisba*، طبع G. S. Colin و E. Levi-Provençal، پیرس ۱۹۳۱ء، ۱ : ۳۶ و ترجمہ از P.Chalmeta-Gendron : الکتاب فی آداب الحِسْبۃ، میڈرڈ ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۶ = الاندلس، ۱۹۶۸ء، ۳۳ : ۱۹۳) اور ہسپانیہ اور مراکش کا بلاجہ (ایک قسم کا سموسہ، جو گوشت اور چھیچھڑوں سے تیار کیا جاتا ہے) میں خراب شدہ جگر نیز کچھ روٹیوں اور گرم مسالوں وغیرہ، کی ملاوٹ بھی کر دی جاتی ہے (کتاب مذکور، متن : ص ۳۹ س ۱۳ و ترجمہ : ص ۱۸۰) .

قرون وسطٰی کی کھانا پکانے سے متعلق کتابوں میں جس طرح کے پرتکلف کھانوں کا ذکر ہوتا ہے ان میں جگر کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے ۔ اس قسم کے کثیر التعداد مشرقی رسائل میں سے صرف الوُصْلَۃ میں جگر پکانے کی ترکیبیں دی گئی ہیں ۔ ایک ترکیب کی رو سے ابلے ہوئے جگر کو جھلّی (caul) میں لپیٹ کر سیخوں پر بھونا جاتا ہے (شرائح کُرجیّہ کے طریقے پر، جو مرغابی کے ان بیکار اعضا سے تیار کیا جاتا ہے جنھیں پکانے سے پہلے الگ کر دیتے ہیں اور ان میں جگر بھی شامل ہوتا ہے)؛ دوسری ترکیب کی رو سے جگر کو ابال کر اس میں سالم یا کوبیدہ گرم مسالا بھر دیتے ہیں (الوُصْلَۃ، مخطوطہ A، ورق ۹۵ الف و ب؛ نیز دیکھیے Rodinson: ...Recherches، ص ۱۳۵) ۔ علاوہ ازیں جگر کا ذکر، "مصنوعی دماغ" کے ضمن میں دنبے کی چکتی (اَلیَہ) کے ساتھ ملا کر قیمہ کرنے کے طور پر بھی آیا ہے (الوُصْلَۃ، دیکھیے Rodinson : کتاب مذکور، ص ۱۵۸) اور تل کے تیل میں مرغی کے اندرونی حصوں یا بھیڑ کے گوشت کے ٹکڑوں کے ہمراہ اتنے تلے ہوئے جگر کا بھی کہ اس کا رنگ سیاہ ہو جائے اور اس سے ایک قسم کی چٹنی بن جائے جو مختلف کھانوں میں استعمال ہوتی ہے (الوُصْلَۃ؛ دیکھیے Rodnsion: کتاب مذکور، ص ۱۳۳ حاشیہ، ص ۱۵٦) ۔ شمس الدین محمّد ابن الحسن البغدادی کی بغدادی کھانوں کی کتاب (ساتویں/تیرھویں صدی) میں جگر پکانے کی کوئی حقیقی ترکیب نہیں دی گئی اور نہ اسی زمانے کی اندلس اور المغرب کے کھانوں کی اس کتاب میں جسے A. Huici Miranda نے طبع و ترجمہ کیا ہے ۔

لبنان میں آج کل بکری یا گائے کا جگر پکانے کی ترکیبیں ملتی ہیں، جنھیں عام طور پر سیخوں پر چڑھا کر انگیٹھی میں سینک لیا جاتا ہے ۔ انھیں "معلق" کہتے ہیں، یعنی صحیح معنوں میں "بدن کے اوپر کے حصے کے اعضا، دل، جگر وغیرہ" (M. K. Khayat و M. C Keating : *Food from the Arab World*، بیروت ۱۹٦۱ء، ص ۳۲ ببعد؛ P. Bazantay : *Enquête sur l'artisanat a Antioche*، بیروت ۱۹۳٦ء، ص ۷۴؛ سرکے میں تلے ہوئے جگر کے ایک نسخے کے لیے دیکھیے Claudia Roden : *A Book of Middle Eastern Food* لنڈن ۱۹٦۸ء، ص ۱۸۰)۔ ہلکی آگ پر تلے ہوئے جگر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے گرم یا ٹھنڈے ہونے کے بعد چٹپٹی چیز کے طور پر کسی اشتہا افزا مشروب کے ساتھ کھانے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں (Roden، ص ۳۳) ۔ المغرب میں جگر اور دل کے کباب، جو کسی زمانے میں غربا کا کھانا تھا، زمانۂ حال میں ایک وضعدار کھانا بن گیا ہے ۔ ان ٹکڑوں کو جھلی میں لپیٹ دینے کی وجہ سے "ملفوف کہتے ہیں" (M. Beaussie : *Dictionaire pratique arabe.—francais*، بار دوم، الجزائر ۱۹۳۱ء، ص ۹۰۴ ب ؛ M. Gast : *Alimentation des populations de l' Ahaggar*، پیرس ۱۹٦۸ء، ص ۱۳۴، ۱۳۵، حاشیہ ۲) اور مراکش میں "بولفاف" (L. Brunot : *Textes arabes de Rabat*، پیرس ۱۹۵۲ء، ۲ : ۲۴۴ ؛ Z. Guinaudeau : *Fès ve par sa cuisine*، رباط ۱۹۵۷ء، ص ۳۹) ۔ جب جگر کے ٹکڑوں کے بیچ میں بکری کی چربی کے قتلے رکھ دیے جاتے ہیں تو اس کھانے کو مراکش میں "کواح" (= اوجھڑی، جگر، دل وغیرہ) کہتے ہیں (Z. Guinaudeau، : کتاب مذکور، ص ۱۴: نیز H. Mercier : *Dictionnair arabe-francais*، رباط ۱۹۵۱ء، ص ۱۰۱) ۔ انگیٹھی پر سینکے ہوئے اس کھانے کا خاص باورچی "کویحی" کہلاتا ہے (کتاب مذکور) ۔

مصر میں مختلف قسم کی مرغیوں کو اکثر ان میں جگر اور پوٹوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے

ملا کر اور ان میں کوبیدہ کچا گیہوں یا گوشت کا قیمہ بھر کر کھایا جاتا ہے (C. Wissa Wassef : Pratiques rituelles et alimentaires des Coptes، قاهره ۱۹۷۱ء، ص ۳۸۱) .

ایران میں بھیڑ یا مرغی کا بیکار گوشت کئی کھانوں میں استعمال ہوتا ہے ، لیکن جگر کا ذکر صرف کھانا پکانے کی ایک جامع کتاب میں آیا ہے، جسے غالباً شاہ کے باورچی نے مرتب کیا تھا اور جو ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں طبع ہوئی - یہ ذکر کبابوں اور ایک قسم کے سالن کے ضمن میں، جسے حسرۃالملوک (= بادشاہوں کی تمنا) کہتے ہیں، ملتا ہے (علی اکبر بن مہدی کاشانی : سفرۂ اطعمه، مجموعۂ مخطوطات P. Ikowski، طبع و مترجمۂ م - قوام نجاد، غیر مطبوعه تحقیقی مقاله، پیرس ۱۹۶۷ء، ص ۲۶، ۲۷؛ پہلی ترکیب کچھ بعد کے زمانے میں Josophine Richard الملقب به نشاط الدولة : طباخی نشاط، تہران، بلا تاریخ، ص ۲۲ و بدر الملوک بامداد : راهنمای طباخی، بار ششم، تہران، بلا تاریخ، ص ۳۶، میں بھی ملتا ہے) .

ترکیه میں زمانۂ حال تک جگر نہیں کھایا جاتا تھا اور قصاب اسے کتوں اور بلیوں کو ڈال دیتے تھے، تاہم جگر اور پھیپڑوں (جنھیں طاقم یعنی پورا کہتے ہیں) اور اسی طرح دل، پھیپڑوں وغیرہ اور اوجھڑی کے کھانے کا دستور حال ہی میں کسی قدر ہو گیا ہے اور انھیں پکانے میں چلتے پھرتے البانوی سوداگروں کو، جنھیں سکتچی (اوجھڑی بیچنے والے) کہتے ہیں، خاص مہارت حاصل ہے (یه بیان P. Boratav کا ہے؛ دیکھیے W. Eberhard و P. N. Boratav : Typen türkischer Volksmarchen، ویزباڈن ۱۹۵۳ء، ص ۸۸)- پلاؤ پکانے کی ایسی ترکیبیں جن میں جگر استعمال ہوتا ہے، آج کل کی کھانا پکانے کی کتابوں میں ملتی ہیں (فوزلو پلاؤ کے لیے دیکھیے I. Orga : Turkish cooking، لنڈن ۱۹۵۸ء، ص ۱۲۵؛ بطخ یا مرغی کے جگر والے ایچ پلاؤ کے لیے C. Roden: کتاب مذکور، ص ۲۸۴)- یه ترکی کے ایک نسلیاتی جائزے کے دوران میں برسه میں فراہم کی گئی تھیں (H. Z. Kosay اور A. Ulkucan انادولو یمکلری و ترک متفقی، انقره ۱۹۶۱ء، ص ۱۰۱؛ نیز دیکھیے جگر کے تکے کباب کے لیے، جنھیں یوغورت میں لپیٹ دیا جاتا ہے، I. Orga : Cooking with yoghurt، لنڈن ۱۹۵۶ء، ص ۴۰) .

اوزبکستان میں بھی ''جگر کباب'' تیار کیے جاتے ہیں اور بعض دفعہ، جیسے که سوویٹ آذربیجان میں بھی ہوتا ہے، جگر کے ٹکڑوں کے بیچ بیچ میں دنبے کی چکتی کے ٹکڑے بھی رکھ دیے جاتے ہیں (دنبه کباب)؛ جگر کو انگیٹھی پر بھون کر اس میں کچھ بھر بھی دیتے ہیں (قوورلغان جگر) (K. Mahmudov : Uzbekshie bljuda، تاشقند ۱۹۶۲ء، ص ۹۸، ۱۰۲؛ N. K. Alhazov : Azerbajdzanskaja kulinariya، باکو ۱۹۶۳ء، ص ۳۴) .

مآخذ : متن مقاله میں مذکور ہیں؛ نیز دیکھیے Nikolaus Mani : Die historischen Grundlagen der Leberforschung، ۲ جلدیں، Basle ۱۹۵۹ تا ۱۹۶۷ء .

(M. RODINSON)

* **کَبَرد** : قفقاز کا ایک مسلمان قبیله - روسی زبان میں انھیں کَبَردنتسی Kabardintsi اور ترکی میں کَبَرتایلر کہتے ہیں؛ ایک اور نام قازق (Käsäg) ہے - کبردوں کا ذکر سب سے پہلے Cheuerthei کے نام سے Barbaro کے ہاں ملتا ہے، جس نے ۱۴۳۶ء میں قفقاز کی سیاحت کی تھی - اس کا اشتقاق ابھی تک غیر یقینی ہے -

کبردی زبان اَدیغه (چرکس) لسانی گروه میں سے ہے، جسے ''ادیغۂ بلند'' بھی کہا جاتا ہے .

۱۹۲۶ء کی سوویت مردم شماری کے مطابق کبردوں کی تعداد نسلی اعتبار سے ۱۳۹۹۲۵ اور لسانی اعتبار سے ۱۳۸۹۲۵ تھی - ۱۹۳۹ء کی مردم شماری کی رو سے کبردوں کی تعداد ۱۶۴۰۰۰ تھی .

کبرد دریاے ترک کے بالائی حصے اور اس کے بعض معاونوں کے طاس میں آباد اور دوگروھوں میں منقسم ھیں: ایک گروہ، جو کبردۂ عظیم کے قبائل پر مشتمل ھے، دریاے ترک کے مغرب میں دریاے ترک اور دریاے ملکہ کے مابین آباد ھے؛ دوسرا، جو کبردۂ صغیر کہلاتا ھے دریاے ترک کے مشرق میں دریاے سنجہ اور ترک کے درمیان آباد ھے.

کبرد اپنے اصلی وطن سے، جو زیادہ مغرب کی جانب تھا، تیرھویں صدی عیسوی میں اپنے موجودہ علاقے میں اس وقت آئے جب الان مغول کے حملوں کی وجہ سے کمزور ھو چکے تھے - آلتون اردو کے زوال کے بعد سے انھوں نے قفقاز کی تاریخ میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا شروع کر دیا - سولھویں صدی عیسوی میں کبرد حکمرانوں کے ماسکو کے فرمانرواؤں سے دوستانہ تعلقات قائم تھے: چنانچہ ایوان Ivan چہارم کی دوسری بیوی میری Marie بنت تمروک Temrük ایک کبرد شہزادی تھی - سترھویں صدی میں کبردوں نے قالموقوں کے خلاف قفقازی باشندوں کے وفاق کی قیادت کی - چونکہ انھوں نے وسطی قفقاز میں بہت اھم کردار ادا کیا تھا اور وہ درۂ دریال Daryal کے قریب آباد تھے، اس لیے انیسویں صدی میں وھی سب سے پہلے روسی اقتدار کے ماتحت آئے اور اسے انھوں نے بغیر کسی خاص مزاحمت کے قبول کر لیا - روسی فتح کے زمانے میں بعض کبرد بالائی کوبان Kuban اور زیلن چک Zelenchuk کے درمیان جا بسے اور مہاجر یا پناہ گیر کبرد کہلانے لگے - ۱۸۶۴ء کے بعد مہاجر گروہ کے کچھ کبرد ھجرت کر کے سلطنت عثمانیہ میں آ گئے .

سولھویں صدی کے نصف آخر میں قریم (کریمیا) کے تاتاریوں نے کبردوں میں عیسائیت کے مقابلے میں اھلسنت کے حنفی مذھب کی ترویج کی اور سترھویں صدی کے آخر تک وہ سب کے سب مسلمان ھو گئے .

کبردوں کی معیشت کا انحصار روایتی طور پر گھوڑوں کی پرورش، زراعت، باغبانی، شہد کی مکھیوں کی پرورش اور گھریلو صنعتوں پر تھا - روایتی کبردی معاشرے کا ڈھانچا بڑا پیچیدہ سا تھا اور گیارہ طبقوں پر مشتمل تھا، جنھیں دو بڑی شاخوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا: طبقۂ امرا یا آزاد گروہ اور ''پشتلی''، یعنی غیر آزاد گروہ - معاشرے کی صف اوّل میں شہزادے تھے اور والی، یعنی کبردوں کا سربراہ، بھی انھیں میں سے ھوتا تھا - ان کے بعد امرا اورک یا اورخ کا درجہ آتا تھا اور یہ ان حقوق و فرائض کی بنا پر جو انھیں شہزادوں سے وابستہ کیے ھوے تھے، چار طبقوں میں منقسم تھے - امرا کے بعد آزاد مزارعین تفو خوتل تھے - غیر آزاد گروہ حسب ذیل پر مشتمل تھا: آزاد (Azat، یعنی آزاد شدہ کسان، جو ایک حد تک اپنے سابق آقاؤں کی خدمت گزاری کے پابند تھے)؛ اوگ Og (وابستۂ زمین مزارعین Serfs)؛ لوکا ناپت Loganaput (اوگ اور غلاموں کے مابین) اور اونات Unaut (غلام) .

انیسویں صدی میں K.Atazkun نے ایک ادبی زبان تخلیق کرنے کی کوشش کی اور ۱۸۶۵ء میں اس نے سریلی Cyrillie رسم الخط پر مبنی کبردی ابجد شائع کی - بایں ھمہ کبردی زبان کو ۱۹۲۴ء سے پہلے ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل نہیں ھوئی - کبرد عظیم کی بولی کو

ھی اس ادبی زبان کی بنیاد قرار دیا گیا، چنانچہ یہ زبان خودمختارسوویت اشتراکیۂ کبرد و بالکار(-Kabardo Balkar A.S.S.R.) اور خود مختار علاقۂ قرہ چای چرکس(Karacay-Cerkes A. R.) میں سرکاری طور پر مستعمل ہے ۔ کبردی زبان میں پہلا اخبار قرہ خلق کے نام سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا ۔ *Letopis'* *Periodiceskikh izdanij S.S.S.R* کے بیان کے مطابق ۱۹۶۰ء میں دو کبردی اخبار اور دو رسالے شائع ہوتے تھے ۔

کبردوں کی پہلی بار اپنے خود مختار علاقے میں تنظیم یکم ستمبر ۱۹۲۱ء کو عمل میں آئی ۔ ۱۶ جنوری ۱۹۲۲ء کو انھیں قومی ضلع بالکار میں شامل کر دیا گیا، جو ۵ دسمبر ۱۹۳۶ء کو کبردو بالکارخود مختار خود مختار علاقہ بن گیا ۔ ۱۹۴۴ء میں سوویت جمہوریۂ اشتراکیہ کبرد کا اعلان ہوا، جو ۹ فروری ۱۹۵۷ء کو سوویت جمہوریۂ اشتراکیۂ کبرد و بالکار میں تبدیل ہو گئی ۔ اس جمہوریہ کا علاقہ ۱۲۴۰۰ مربع کیلومیٹر پر مشتمل ہے ۔ ۱۹۵۹ء میں اس جمہوریہ کی آبادی ۴۲۰۱۱۵ تھی، جس میں ۴۵ فی صد کبرد، ۸۱ فی صد بالکار، ۳۸٫۷ فی صد روسی اور باقی قفقاز کے دیگر گروہ تھے۔

مآخذ : (۱) B. Geiger، T. Halasi-Kun، A. Kuipers و K. Menges : *Peoples and languages of the Caucasus*، ھیگ ۱۹۵۸ء؛ (۲) *Istoriya kabardino Balkarskoya A. S. S. R.*، ماسکو ۱۹۶۷ء؛ (۳) *Kabardiskaya A.S.S.R.* Nalchik ۱۹۴۶ : (۴) B. Kalmikov : *Ocerki revolutsionnogo dvizeniya v.Kabarde*، Nolchik ۱۹۴۶ء؛ (۵) A.Kuipers : *Introduction to Morpheme and phoneme in kabardian*، ھیگ ۱۹۶۰ء؛ (۶) Sh. B. Nogmov : *Istoriya Adigeyskogo Naroda Sostavlennaya po predaniyam Kabardintsev*، بار پنجم، Nalchik ۱۹۵۲ء؛ (۷) *Sbornik Slatey po Istorii Kabardy*، ص ۱ تا ۲، Nalchik ۱۹۵۷ء؛ نیز رک بہ آباز؛ چرکس؛ القبق ۔

(HÜLYA SALIHOGLU)

الکِبْرِیْت : (گندھک) : القزوینی اسے * سیماب، مختلف قسم کے تارکول، نفت اور خاکستری عنبر کے ساتھ روغنی چیزوں میں شمار کرتا ہے ۔ دوسرے مصنفین اسے اثیروں، اڑ جانے والی اشیا، زرنیخ کی دو قسموں (ھڑتال اور مینڈھل)، نوشادر اور پارے میں شامل کرتے ھیں ۔

عربوں اور ان سے بھی پہلے ارسطو[؟] نے گندھک کی تین مختلف قسمیں قرار دی تھیں : عمدہ قسم کی سرخ گندھک (الجید الجوھر)، خالص زرد گندھک اور سفید گندھک ۔ مؤخرالذکر سے گندھک کی وہ قسم مراد ہے جو عرف عام میں "Bath-Sulphur" کہلاتی ہے ۔ اس میں سے گندھک ملی ھائیڈروجن کی سی بو آتی ہے ۔ سرخ گندھک کے متعلق، جو غالباً بالکل فرضی چیز ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ مغرب میں سمندر کے قریب پائی جاتی ہے اور بہت کمیاب ہے ۔ اسی وجہ سے جو شخص خوبیوں میں بے مثل ھو اسے استعارۃً "کبریت احمر" کہتے ھیں ۔ "گردکوگرد" یا آنولاسارگندھک، فیرس سلفائیڈ کو بھون کر تیار کی جاتی ہے ۔ گندھک سے آتش بازی، بھک سے اڑنے والی چیزوں کی تیاری اور دھاتوں کو رنگ دینے کا کام لیا جاتا ہے ۔ بعض دھاتوں مثلاً سیسے اور چاندی کو گندھک سیاہ کر دیتی ہے ۔ کبریتی چاندی نقرئی ظروف پر سیاہ رنگ کی میناکاری (Niello Inlaying) میں استعمال کی جاتی ہے ۔ سیماب بھی پہلے سیاہ ھو جاتا ہے، لیکن گرم کرنے پر سرخ (شنگرف) بن جاتا ہے ۔ گندھک دواؤں میں بھی بہت کام آتی ہے (دیکھیے ابن البیطار، القزوینی وغیرہ) ۔

طبعی حالت میں گندھک تین شکلوں میں پائی

جاتی ہے اور عربوں کو ان تینوں کا علم تھا :-

۱ - جپسم اور کھریا کے طبقات وغیرہ میں گندھک کے ڈلے پائے جاتے ہیں - دریاے اردن کے علاقے میں الغور، یعنی بحیرۂ مردار وغیرہ کے پست علاقوں سے یہ اسی شکل میں برآمد کی جاتی تھی (المقدسی، ص ۱۸۴) - ایران، بلوچستان اور صقلیہ میں بھی یہ اسی شکل میں پائی جاتی تھی ؛

۲ - فعال اور غیرفعال آتش فشاں پہاڑوں، مثلاً کوہِ ایٹنا Etna اور کوہِ دماوند وغیرہ میں بھی یہ پائی جاتی ہے .

۳ - یہ گندھک کے چشموں سے بھی حاصل ہوتی ہے، مثلاً خوزستان کے علاقے میں دورق الفُرس کے مقام پر گندھک کے گرم چشمے موجود ہیں، جہاں سے زرد گندھک دستیاب ہوتی ہے (Guy Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ۱۹۰۵ء، ص ۲۴۲ - مشرقی علاقوں میں گندھک کی موجودگی کے متعلق معلومات کے لیے دیکھیے C. Hintze : *Handbuch der Mineralogie*، حصہ ۱، ۱۹۰۴ء، ص ۸۰، ۸۷؛ و B. Dammer O. Tietze : *Die nutzbaren Mineralien*، حصہ ۱، ۱۹۱۳ء، ص۹۳؛ O. Stutzer : *Die wichtigsten Lagerstätten der "Nichht-Erze"*، ۱۹۱۱ء، ۱ : ۲۵۱) .

کیمیا گروں کے ہاں گندھک کے بہت سے صفاتی نام رائج ہو گئے تھے (دیکھیے J. Ruska و E. Wiedemann : *Beitr.*، lvii : *Alchemistische Decknamen*، در *S. B. P. M. S.*، ۵٦ (۱۹۲۴ء): ۱۷تا۳٦) - یہ زرد، سرخ یا سفید عروس یا موم کے ناموں سے موسوم تھی - رنگ اور خواص کی وجہ سے اسے ''الروح الصابغ'' بھی کہتے تھے - جلتی ہوئی گندھک کی گلوگیر بو کے باعث اس کا نام الخنّاق پڑ گیا تھا - اسے قید الآبق (نکل بھاگنے والے کی زنجیر)، یعنی سیماب کی زنجیر بھی کہتے تھے، کیونکہ وہ گندھک کے ساتھ کیمیائی طور پر مل کر ٹھوس شنگرف بن جاتا ہے - اس کے بعض اور نام شمس الدین الدمشقی (کتاب مذکور) نے لکھے ہیں، مثلاً اعراف الدیکہ (مرغ کی کلغی)، طائر البحر (سمندری پرندہ)، حبّ الرّمانہ (دانۂ انار، انار دانہ) الیاقوت الذائب (یاقوت مائع) وغیرہ؛ دیکھیے M. Berthelot : *La chimie au Moyenage*، ج ۲؛ الطغرائی، در کتاب الجوھر النضیر فی صناعۃ الاکسیر (مخطوطہ، عدد ۱۳٦۱۸)، در Ahlwardts: فہرست کتاب خانۂ برلن .

ماہرین علوم طبیعیہ کی راے میں گندھک پانی، ہوا اور مٹی کے اجزا (Atoms) سے پیدا ہوتی ہے - یہ اجزا آمیزش پر تیز حرارت کے زیر اثر باہم پیوست ہو جاتے اور تیل کی سی شکل اختیار کر لیتے ہیں، جو سرد ہوکر ٹھوس بن جاتے ہیں .

کیمیاگروں کی یہ راے ہے کہ گندھک اور سیماب کا بہت سی مختلف اشیا، بالخصوص دھاتوں کی بناوٹ میں، بہت اہم حصہ ہے، لیکن یہاں گندھک اور سیماب کے الفاظ صرف عام اصطلاحات کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں اور ان کا معمولی گندھک یا سیماب سے کوئی تعلق نہیں ہے .

مآخذ : (۱) القزوینی : کتاب عجائب المخلوقات، طبع وسٹنفلٹ، ص ۲۴۳؛ (۲) J. Ruska : *Das Steinbuch aus der Kosmographie etc.*، در *Jahresbericht der Oberrealsschule Heidelberg 1895/96*، ص ۳۲؛ (۳) ابن البیطار : جامع المفردات، جس میں الکبریت کے زیر عنوان اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے؛ (۴) شمس الدین الدمشقی . نخبۃ الدھر فی عجائب البرّ والبحر، ص ۵۸ و مترجمۂ Mehren، ص ٦۲ ببعد؛ (۵) J. Ruska : *Das Steinbuch des Aristoteles*، ص ۱۰۱، ہائیڈلبرگ ۱۹۱۲ء؛ (٦) E. Wiedemann : *Beiträge*، ۱ :

SBPMS در *Beiträge zur Geschichte der Chemie*، ۳۴ (۱۹۰۲ء): ۵۵ تا ۵۸؛ (۷) وهی مصنف : *Beiträge zur geschichte der chemie, ebenda*، ۲ : ۴۳ (۱۹۱۱ء) ؛ ۹۱ (۸) E. von Lippmann : *Entstehung und Ausbreitung der Alchemie*، برلن ۱۹۱۹ء ؛ نیز مادۂ الکیمیا کے زیر عنوان دیگر تصانیف .

(E. WIEDEMANN)

* **کَبکْچی اوغلو مصطفٰی:** اس بغاوت کاقائد جس کے نتیجے میں سلطان سلیم ثالث کی حکومت کا تختہ الٹ گیا ۔ وہ دراصل شمال مغربی آناطولی کے ایک شہر قَسْطَمُونی کا باشندہ تھا ۔ باسفورس کے کنارے پر واقع قلعۂ روم ایلی کاواک کے یاماقوں (یعنی فاضل ینی چریوں) نے، جنھوں نے ۷ ربیع الاول ۱۲۲۲ھ/۲۵ مئی ۱۸۰۷ء کو صدر اعظم کے قائم مقام کوسہ موسٰی پاشا اور شیخ الاسلام عطاءاللہ افندی کی انگیخت پر بغاوت کردی تھی، اسے اپنا قائد منتخب کیا تھا ۔ اس نے بغاوت کا کام منظم طریقے پر انجام دیا، نظام جدید [رک بآں] کے بڑے بڑے منتظموں کو قتل کر دیا اور سلطان مصطفٰی رابع [رک بآں] کی تخت نشینی (۱۲ ربیع الاول/۲۹ مئی) کے لیے راہ ہموار کرنے کی غرض سے بغاوت برپا کرنے والوں کے مقاصد پورے کیے ۔ اسے روم ایلی کی جانب باسفورس پر واقع قلعوں کا کماندار مقرر کر کے ''تورنہ جی باشی'' کا منصب دے دیا گیا ۔ پہلے شیخ الاسلام کی معاونت سے، بعد ازاں محمود طیّار پاشا کی، جسے شعبان/اکتوبر میں قائم مقام نامزد کر دیا گیا تھا، اور پھر دوبارہ شیخ الاسلام کی معاونت سے وہ امور سلطنت پر اثر انداز ہوتا رہا ۔ اسے پینار حصار کے ''اعیان'' علی آغا نے ۱۹ جمادی الاولٰی ۱۲۲۳ھ/۱۳ جولائی ۱۸۰۸ء کو روم ایلی پینار میں قتل کر دیا گیا ۔ وھاں علی آغا کو مصطفٰی پاشا بیرقدار [رک بآں] نے اس زمانے میں ایک دستۂ فوج دے کر بھیجا تھا جب وہ خود استانبول کی طرف سلطان سلیم ثالث [رک بآں] کو تخت پر بحال کرنے کی غرض سے بڑھ رہا تھا ۔ اگرچہ کبکچی اوغلو مصطفٰی ناخواندہ تھا، تاہم اس نے بغاوت کی قیادت میں نمایاں صلاحیت کا ثبوت دیا، لیکن اس کے خلاف یہ اعتراض حق بجانب ہے کہ اس نے اس اصلاحی تحریک کو کچلنے کی کوشش کی، جس پر سلطان سلیم ثالث کے عہد میں عمل ہو رہا تھا .

مآخذ : (۱) سجلّ عثمانی، ۴ : ۴۵۹ ببعد؛ (۲) *Révolution de* : A.D. Juchereau de Saint-Denis *Coastantinople en 1807 et 1808*، پیرس ۱۸۱۹ء، ۲ : ۱۱۳ تا ۱۱۷؛ (۳) عاصم : تاریخ، مطبوعۂ استانبول ، ج ۲، بمواضع کثیرہ؛ (۴) احمد جودت : تاریخ، استانبول ۱۳۰۹ھ، ۸ : ۱۵۷ تا ۲۹۷؛ (۵) مصطفٰی نوری : نتائج الوقوعات، استانبول ۱۲۹۴ تا ۱۳۲۷ھ، ۴ : ۴۸ تا ۵۵؛ (۶) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی : مشہور روم ایلی اعیان لرندن علمدار مصطفٰی پاشا، استانبول ۱۹۴۲ء، بمدد اشاریہ؛ (۷) وهی مصنف : کبکچی مصطفٰی عصیانینہ دائریا یزلمش برتاریخچہ، در *Belleten*، ج ۶ (۱۹۴۲) : ۲۵۳ تا ۲۶۷؛ (۸) وهی مصنف : کبکچی وقعہ عصینہ دائر بر مکتوب، در *Belletin*، ۲۹ (۱۹۶۵) : ۵۹۹ تا ۶۰۴؛ (۹) Zinkeisen، ۷ : ۴۶۳ تا ۴۷۲، ۵۵۲ تا ۵۵۷؛ (۱۰) N.Jorga : *Geschiehte des Osmanischen Reiches*، گوتھا ۱۹۱۰ء، ج ۵، بمدد اشاریہ؛ (۱۱) A. F. Miller : *Mustafa Pasha Bayraktar*، ماسکو و لینن گراڈ ۱۹۴۷ء؛ (۱۲) S. I. Shaw: *Between old and new: the Ottoman Empire under Salim III (1789-1807)*.، کیمبرج (میسا چوسٹس) ۱۹۷۱ء؛ (۱۳) H.D.Andreasyan (ترجمہ) : جارج اوغلوقیانک روزنامہ سی، ۱۸۰۶ تا ۱۸۱۰ عصیانلری، ۳ : سلیم رابع مصطفٰی ثانی و علمدار مصطفٰی پاشا، استانبول ۱۹۷۲ء؛ (۱۴) احمد رفیق : کبکچی مصطفٰی، استانبول ۱۳۳۱ھ.

(E. KURAN)

* کُبُو : [جمہوریۂ انڈونیشیا کے صوبۂ مغربی کالی منتان کا ایک ضلع]، جو دریاے کپواس Kapuas کے ڈیلٹا کے جنوبی حصے میں واقع ہے ۔ ولندیزی دور حکومت میں اسے حکومت خود مختاری حاصل تھی اور انتظامی لحاظ سے بہ بورنیو کے مغربی حصے کی ریزیڈنسی (Westerafdeeling von Boaneo) کی قسمت پونتیانک Pontianak [رک بآن] کے ماتحت تھا ۔ شمال میں کپواس کا طویل و عریض دریا اسے ریاست پونتیانک سے جدا کرتا ہے، مشرق میں تیان Tayan اور سمپانگ Simpang کے اضلاع ہیں اور جنوب اور مغرب میں بحیرۂ چین ۔ ریاست کبو کی بنیاد ۱۷۸۰ء کے لگ بھگ ایک عرب سید عیدروس العیدروس نے رکھی تھی، جو دریاے ترنتانگ Terentang کے دہانے کے قریب اپنے چند عرب، بوگنی Bugniese اور ملائی پیرووں کے ہمراہ مقیم ہوگیا تھا (اس سے تھوڑی ہی مدت بعد ایک اور مہم جو عرب شریف عبدالرحمٰن القادری نے، جو اس کا برادر نسبتی تھا، ریاست پونتیانک کی بنیاد رکھی)۔ ریاست کبو اور اس کے صدر مقام کا نام ایک خندق (ملائی : کبو) سے منسوب ہے، جو بحری لٹیروں کے حملوں سے بچنے کے لیے کھودی گئی تھی ۔ العیدروس نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر حفاظت آنا قبول کیا اور کمپنی نے اسے توان (Tuwan = حاکم) کے خطاب کے ساتھ یہاں کا حکمران تسلیم کر لیا ۔ زمین کے اعتبار سے اس ضلع کی اہمیت بہت کم ہے ۔ بیشتر علاقہ جنگلوں سے پٹی ہوئی دلدلوں پر مشتمل ہے، جنھیں کہیں کہیں (زیادہ تر شمال مغربی ضلع امباونگ Ambawang میں) پانی نکال کر خشک کردیا گیا ہے ۔ یہ اراضی نہایت قدیم طرز کی کاشتکاری اور ناریل پیدا کرنے ہی کے لیے موزوں ہے ۔ آبادی زیادہ نہیں اور جو ہے وہ بکھری ہوئی ہے۔ یہاں تقریباً سب کے سب تارکین وطن ہی آباد ہیں ۔ مخلوط النسل عربوں اور قلیل التعداد چینیوں کو چھوڑ کر باقی آبادی زیادہ تر بوگنیوں پر مشتمل ہے ۔ ڈیاک Dayaks تعداد میں بہت ہی کم ہیں ۔ اکثریت اسلام کی پیرو ہے ۔ ریاست کے حکمران کا صدر مقام ایک معمولی سی بستی تھی اور وہ تین وکیلوں کی مدد سے حکومت کرتا تھا ۔ یہ وکیل اس کے اپنے خاندان کے رکن ہوتے تھے، جنھیں گزر اوقات کے لیے کچھ زمین دے دی جاتی تھی ۔ [۱۹۵۰ء میں جب ولندیزیوں کا وفاقی نظام ختم کر دیا گیا اور اس کے بجاے وحدانی طرز حکومت کا نفاذ ہوا تو بورنیو کی ریاستیں بھی جمہوریۂ انڈونیشیا کی متحدہ مملکت میں شامل ہوگئیں ۔ مزید تفصیلات کے لیے رک بہ انڈونیشیا؛ پونتیانک] ۔

مآخذ : (۱) P. J. Veth : *Borneo's Westerafdeeling*، ۲ جلد، Zaltbommel ۱۸۵۴-۱۸۵۶ء؛ (۲) H. von Dewall : *Matan, Simpang, Soekadana, de karimata-eilanden en Koeboe*، در *TBGKW*، ج ۱۱/۱ (۱۸۶۲ء)؛ (۳) J. J. K. Enthoven : *Bijdrgen tot de geographie van Borneo's Westerafdeeling*، لائیڈن ۱۹۰۳ء، ۲ : ۸۶۹؛ (۴) *Encyclopaedie van Nederlandsch Indie* بار دوم، ۲ (۱۹۱۸ء) : ۳۵۷ (بذیل مادۂ KOEBOE)؛ [(۵) شاھد حسین رزاقی : انڈونیشیا، لاھور ۱۹۶۳ء؛ مزید مآخذ کے لیے رک بہ انڈونیشیا] .

(W. H. Rassers [و ادارہ])

* کبیر ۔ پندرھویں صدی کا ایک ھندوستانی صوفی، جس کے بارے میں ھندو اور مسلمان دونوں نے دعوی کیا کہ وہ ان کے مذھب کا پیرو تھا ۔ اس سے ھندی دوھوں کی ایک کثیر تعداد منسوب کی جاتی ہے، لیکن ان کا مستند ھونا مشتبہ ہے ۔ اسی طرح اس کے حالات زندگی کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اصل

حقیقت افسانوی روایات کے نیچے دب کر رہ گئی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مسلمان جلاہے کا بیٹا یا متبنٰی تھا اور ویشنو مت کے ایک مصلح رامانند کا چیلا بن گیا تھا ۔ وہ بنارس میں رامانند کے چرنوں میں بیٹھتا اور ان مذہبی اور فلسفیانہ مباحث میں حصہ لیتا رہا، جن میں اس کا گرو برھمنوں اور صوفیوں کے ساتھ حصہ لیا کرتا تھا ۔ ایسا معلوم ھوتا ہے کہ بافندگی اس کی گزر اوقات کا ذریعہ تھی ۔ اس نے شادی بھی کی تھی اور اس کے بچے بھی ھوے ۔ وہ جہاں یوگیوں کی پیشہ ورانہ رھبانیت کو حقارت سے دیکھتا تھا وہاں کٹر مذہبی لوگوں کے عقائد و ضوابط سے بھی بے پروا تھا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ۔ اس نے اپنے صوفیانہ عقیدے کے مطابق توحید الٰہی کے گیت گائے، جس کے باعث اسے جبر و تشدد کا ہدف بھی بننا پڑا ۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۴۹۵ء میں، جب اس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی، اسے بنارس سے نکال دیا گیا ۔ اس نے بالاخر ۱۵۱۵ء میں مگّھر (ضلع بستی) میں وفات پائی ۔ مشہور ہے کہ اس کی میّت کی آخری رسوم ادا کرنے کے سلسلے میں اس کے ہندو اور مسلمان چیلوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا کیونکہ ہندو اسے جلانا اور مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے ۔ جب انھوں نے وہ کپڑا اٹھایا جس سے لاش ڈھکی ہوئی تھی تو کیا دیکھتے ہیں کہ میت کے بجاے پھولوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے ۔ ان میں سے نصف پھول ہندووں نے بنارس میں نذر آتش کر دیے اور باقی نصف مسلمانوں نے مگھر میں سپرد خاک کیے، جہاں ان کی خانقاہ مسلمان کبیر پنتھیوں کے زیر نگرانی آج تک موجود ہے ۔ کبیر کے معاصرین کی طرح عصر حاضر کے علما میں بھی یہ اختلاف راے موجود ہے کہ وہ ان دو متخالف مذہبوں میں سے کس کا پیرو تھا ۔ ایچ ۔ ایچ ۔ ولسن H. H. Wilson (ص ۶۹، ۴۷) اور آر ۔ جی ۔ بھنڈارکر (ص ۶۹) اسے ہندو مانتے ہیں، اور جی ۔ ایچ ۔ ویسٹ کوٹ G. H. Westcott (ص ۲۹ ببعد) مسلمان ۔ گریرسن G. H. Grierson کا نظریہ (*JRAS*، ۱۹۰۷ء، ص ۳۲۵، ۴۹۲) کہ اس نے اپنے خیالات عیسائی مآخذ سے حاصل کیے تھے ، ایک بے بنیاد خوش فہمی ہے اور اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے کلام کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اسے کسی منظم مذہب سے منسلک ہونے کی کوئی خواہش نہیں تھی:

["اپنے بچار اسواری کیجیے
سہج کے پائڈے پاو جب دیجیے
جن کبیر ایسا اسوارا
بید کتیب دوہوں تھے نیارا

(کبیر گرنتھاولی، بتصحیح شیام سندر داس، بار چہارم، سمت ۲۰۰۸/۱۹۵۱ء، ص ۹۶)]، یعنی مجھ بچارے کو اپنی زین بنانے دو اور عشق الٰہی کی رکاب میں پاؤں رکھنے دو ۔ کبیر کہتا ہے کہ اچھے سوار وہی ہیں جو ویدوں اور قرآن مجید سے دور رہتے ہیں"۔ ایسے ہی اس نے اپنے کسی مذہبی یا فلسفیانہ نظام کو تشکیل دینے کی بھی کوشش نہیں کی ۔ بایں ہمہ اس نے کسی خاص اوتار سے تعلق قائم کیے بغیر اپنے زمانے کی ویشنو دھرم کی تعلیمات کو عام کیا اور آزادانہ طور پر خدا کو رام، ہری، علی، یا اللہ کے نام سے پکارا ۔ اس نے ہندو دھرم کے ظواہر، مثلاً جنیو، ذات پات کی تمیز اور مندروں میں پوجا پاٹ کی رسوم کو رد کر دیا؛ اسی طرح اسلامی اسناد و تاسیسات (مثلاً قرآن مجید، ختنہ، حج، ملّا، قاضی، وغیرہ) کے بارے میں اس نے جو اشارے کیے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اسے انھیں تسلیم کرنے سے انکار تھا ۔ اس کے نزدیک خدا ایک ایسی حقیقت

ہے جو ہر جگہ موجود ہے ۔ اس کے ساتھ ہی وہ روح انسانی کی جداگانہ انفرادیت کا قائل تھا، جسے وصال الٰہی کسی علم یا رسمی عبادت کے ذریعے سے نہیں، بلکہ عشق کے ذریعے سے حاصل ہوسکتا ہے ۔ اس نے سادہ مثالوں اور روز مرہ کی زندگی سے گہرے تعلق کی مدد سے اپنے عقائد ایسی شکل میں پیش کیے کہ ان پڑھ لوگوں نے، جن پر اس کے پیرووں کی اکثریت مشتمل نظر آتی ہے، انھیں بلا تامل قبول کر لیا۔

مآخذ : (۱) دبستان مذاہب، کلکتہ، ۱۸۰۹ء، ص ۲۳۶ تا ۲۳۸ و مترجمۂ Shea و Troyer، پیرس ۱۸۴۳ء، ۲ : ۱۸۶ تا ۱۹۱؛ (۲) H. H. Wilson : *Essays on the Religion of the Hindus*، ۵۸ ببعد (لنڈن ۱۸۶۲ء، ۱ : ۶۸ ببعد)؛ (۳) *Gli scritti de Padre Marco della Tomba* طبع Gubernatis (Firenze ۱۸۷۸ء)، ص ۱۹۱ ببعد، ۲۰۵ ببعد؛ (۴) E. Trumpp : *Bemerkungen über den indischen Reformator Kabir*، در *Atti del iv. Congresso internat. degli Orientalisti*، Firenze ۱۸۸۰ تا ۱۸۸۱ء، ۲ : ۵۹ ببعد؛ (۵) کبیر چرترا طبع پنڈت والجی بیچر، سورت ۱۸۸۱ء؛ (۶) G. H. Westcott : *Kabir and the Kabir Panth*، کانپور ۱۹۰۷ء؛ (۷) M. A. Macauliffe : *The Sikh Religion*، (آکسفرڈ ۱۹۰۹ء، ۶ : ۱۲۲ ببعد؛ (۸) *One Hundred Poems of Kabir*، مترجمۂ رابندر ناتھ ٹیگور به اعانت Evelyn Underhill، لنڈن ۱۹۱۴ء؛ (۹) رام چندر بوس *Hindu Heterodoxy*، کلکتہ، ۱۸۸۷ء، باب ۱۰؛ (۱۰) Sir. R. G. Bhandarkar : *Vaisnavism, Śaivism, and Minor religious Systems*، در *Encyclopaedia of Indo-Aryan Research*، Strassburg ۱۹۱۳ء، ۳/۶ : ۶۷ تا ۷۳؛ (۱۱) *The Bijak of Kabir*، مترجمۂ پادری احمد شاہ، ہمیر پور ۱۹۱۷ء؛ (۱۲) G. N. Farquhar : *An Outline of the Religious Literature of India*، آکسفرڈ ۱۹۲۰ء، ص ۳۳۱ تا ۳۳۵؛ [(۱۳) پنڈت منوہر لال زتشی : کبیر صاحب، اللہ آباد، ۱۹۳۰ء، جس کے آخر میں رجوع کرنے کے لیے کتابوں کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے] ۔ کبیر سے منسوب تصنیفات کا کوئی تنقیدی نسخہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ ان کی فہرست کے لیے دیکھیے Westcott : کتاب مذکور، ص ۳، ۳۷، ۴۷، ۱۶۹ تا ۱۷۲ ۔

(T. W. ARNOLD)

* **الکَبیر** : باری تعالٰی کا ایک نام، رک بہ اللہ ؛ الاسماء الحسنٰی ۔

* **کبیر پنتھی** : (ہندی میں پنتھ کے معنی ہیں طریقہ، مذہبی فرقہ) ۔ کبیر کی تعلیم کی اس خصوصیت کے باوجود کہ وہ فرقہ بندی کے خلاف تھی، آج کل اس کے پیرووں کا ایک مخصوص فرقہ ملتا ہے، جس کی غالب اکثریت ہندووں پر مشتمل ہے ۔ کبیر پنتھیوں کی تنظیم کے بارے میں بہترین بیان Westcott: *Kabir and Kabir Panth*، کانپور ۱۹۰۷ء، باب ۵، ۶، میں ملتا ہے ۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد صوبجات متوسطہ میں ۵۹۷۱۹۹ اور صوبجات متحدہ میں ۲۹۶۰۰۵ تھی ۔ دوسرے صوبوں میں وہ یا تو ہیں ہی نہیں اور اگر ہیں تو بہت کم ۔

مآخذ : (۱) W. Crooke : *Tribes and Castes of the North-Western Provinces and Oudh*، کلکتہ ۱۸۹۶ء، ۳ : ۷۳ تا ۷۷ ؛ (۲) R. V. Russell : *Tribes and Castes of the Central Provinces of India*، لنڈن ۱۹۱۶ء، ۱ : ۲۳۲ ببعد؛ (۳) *Gazetteer of the United Provinces*، اللہ آباد ۱۹۰۷ء، ۳۲ : ۲۲۵، ۲۲۶؛ (۴) *Central Provinces Gazetteer : Bilaspur District*، اللہ آباد ۱۹۱۰ء، ص ۷۸ تا ۸۰ ۔

(T. W. ARNOLD)

کتاب . (ع؛ جمع : کُتُب) عربوں نے لکھے ×

کا فن اپنے سامی النسّل شمالی پڑوسیوں سے سیکھا اور انھیں سے کتاب اور کتابت سے متعلّق اصطلاحیں اخذ کیں ۔ ان کی ابتدائی عبارتوں میں ہر تحریر شدہ چیز ''کتاب'' کہلاتی تھی ۔ یہ ضروری نہ تھا کہ وہ واقعی ''کتاب'' ہی ہو اور سچ تو یہ ہے کہ خط اور مراسلے تک کو محض ''کتاب'' ہی کہتے ہیں ۔ چونکہ ہمارے سامنے قرآن مجید سے پہلے کی کوئی کتاب نہیں اور پتھروں پر کندہ بعض تحریروں کے علاوہ اگر کوئی اور چیز باقی ہے تو پرانے زمانے کے شعرا کی چند نظمیں ہیں جن کے ساتھ ہم ان قصوں (رک بہ قصّہ) کا اضافہ کر سکتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظمیں کن مواقع پر کہی گئی تھیں، لہٰذا ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس سے پہلے کتابوں کا وجود تھا یا نہیں ۔ قرآن مجید میں لفظ ''کتاب'' اکثر جگہ مختلف معانی میں آیا ہے، لیکن اپنے نمایاں ترین مفہوم میں ''کتاب'' عبارت ہے اس مقدس نوشتے سے جو وحی الٰہی پر مشتمل ہو اور اللہ نے اپنے بندوں کے لیے اسے نازل کیا ہو؛ لہٰذا ان تین مذاہب کے پیرو، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے زمانے کے نصارٰی، یہود اور مجوسی ''اہل الکتاب'' کہلائے [مجوسی اہل کتاب نہیں، البتہ ان کی عورتوں سے نکاح کے علاوہ باقی امور میں ان سے اہل کتاب کا سا برتاؤ کرنے کا حکم حضرت عمر فاروق^{رض} نے دیا تھا] ۔ نصارٰی کی کتاب سے مراد ''انجیل'' یعنی عہد نامۂ جدید اور یہود کی کتاب سے مراد غالباً حضرت موسٰی علیہ السلام کے ''اسفار الخمسۃ (Pentateuch)''، نیز مزامیر ہیں ۔ مجوسیوں کی کسی کتاب کا ذکر نہیں، البتہ قرآن مجید میں ایک اور ''کتاب'' [یعنی ''لوح محفوظ''] کا ذکر ملتا ہے، جس میں اللہ تعالٰی نے ہر انسان کی تقدیر لکھ دی ہے اور کوئی شخص اپنی زندگی میں جو بھی اچھے برے کام کرتا ہے وہ برابر اس میں لکھ دیے جاتے ہیں تاکہ بطور شہادت پیش ہو سکیں اور قیامت کے دن اسی کے مطابق جزا اور سزا ملے ۔

بہر حال سب سے ارفع و اعلٰی کتاب [= الکتاب] قرآن مجید ہے ۔ یہ وحی من جانب اللہ ہے، جو تمام ایسی تحریفات سے مبرّا و منزہ ہے جو بد نیّتی یا انسانی سہوو نسیان کا نتیجہ ہوں ۔ خود اس کا اپنا دعوٰی ہے کہ دنیا میں کوئی کتاب اس کی ہمسری نہیں کر سکتی اور نہ آئندہ کر سکے گی، اس لیے کہ وہ اللہ کا سچا کلام ہے ۔ چونکہ ''الکتاب'' اللہ کا کلام ہے اس لیے قرآن مجید میں یہ لفظ ''حکم خداوندی'' کے مفہوم میں بھی آیا ہے، یا اس سے مراد وہ ''نقش'' بھی ہے جو اللہ آدمی کے دل پر لگا دیتا ہے ۔ پھر چونکہ جو چیز لکھ دی جائے وہ باقی رہتی ہے، اس لیے اللہ نے اپنی طرف سے یہ ''لکھ دیا''، یعنی اپنے اوپر واجب کرلیا کہ وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا ۔ آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کتاب کے معنی ایک معمولی خط یا اس پیغام کے بھی ہیں جو کسی دور افتادہ شخص کو لکھا جائے ۔

اگر ہم عہد جاہلیت کے عرب شعرا کے کلام میں اس لفظ کے معنی تلاش کریں، تو مذکورۂ بالا تمام معنی میں اس لفظ کا مستعمل ہونا پایا جاتا ہے، لیکن اگر وحی الٰہی کے معنوں میں اس کا استعمال کہیں نظر آئے تو پھر ہمیں اسے شک کی نگاہ سے دیکھنا ہو گا ۔ عَدِی بن زید ایک نصرانی شاعر تھا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے کچھ ہی پہلے گزرا ہے ۔ اس کے متعلق اگرچہ یہ کہا گیا ہے کہ اس نے فعل ''کتب'' تنقید کے معنوں میں استعمال کیا ہے (جَمْہَرَۃَ الاَ شْعار النّصرانیّۃ، طبع شیخو Cheikho، ص ۹۲ ببعد)، لیکن ہو سکتا ہے کہ بعد کے زمانے کے کسی

جعلساز نے یہ نظم اس سے منسوب کر دی ہو ۔ بہر حال اعتماد کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن مجید میں جن معنوں کا اظہار کیا گیا ہے ان کے بارے میں اگر ایسے قدیم شواهد ملیں تو لازمی طور پر وہ جھوٹے ہی ہوں گے ۔ پرانی نظموں میں غیر زبانوں کے رسم الخط میں لکھی ہوئی تحریروں کے حوالے زیادہ کثرت سے ملتے ہیں اور اس کی کافی شہادت موجود ہے کہ قدیم شعرا کم از کم ایسی قلمی کتابوں کی ظاہری شکل و صورت سے بخوبی آشنا تھے جنھیں مطلاّ و مذهب سرورقوں سے مزّین کیا گیا ہو ۔ شاعر طفیل الغَنَوی (۱۰/۵ : ۳) نے اپنے ایک شعر میں ''پروانۂ راهداری'' کو ''کتاب'' لکھا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ لفظ کتاب کے معنوں میں بحیثیت ایک ادبی تالیف یا تخلیق کے ملتا ہے اور اگرچہ مجھے یقین ہے کہ بعض منظومات ابتدائی زمانے ہی میں ضبط تحریر میں آ چکی تھیں، تاهم کوئی تصنیف یا تالیف اس وقت تک کاغذ یا رَقّ (Parchment) پر نہیں لکھی گئی جب تک کہ قرآن مجید کے ضبط تحریر میں آنے کے بعد کچھ مدت نہیں گزر چکی تھی ۔ اسی طرح یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ عربی میں کون سی تالیف یا تصنیف پہلی مرتبہ کتاب کی شکل میں لکھی گئی ۔ جامعین احادیث نبویہ عرصۂ دراز تک حدیث کی زبانی روایت پر مصر رہے ۔ غالباً یہی صورت حضرت ابن عباس رضؓ کی تفسیر قرآن کی رهی ۔ یہ تفسیر خاصی مبسوط ہو گی کیونکہ البَغوی نے معالِم التّنزیل میں بیان کیا ہے کہ یہ کتاب انھیں تین مختلف واسطوں سے ملی تھی ۔ مغازی یا سیرت نبوی کے متعلق کتابیں بھی بہت شروع زمانے میں تحریری شکل میں آ گئی تھیں۔ چونکہ تمام قدیم تصانیف و تالیفات آج ناپید ہیں اور ان کے صرف اقتباسات باقی ہیں، اس لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ واقعی وہ ''کتابیں'' تھیں ۔ بہر حال ایک بات یقینی ہے کہ شاعر لَبِیْد کے دیوان کے چند قلمی نسخے پہلی صدی ہجری میں موجود تھے، جس کی شہادت الفرزدق کے ایک شعر سے ملتی ہے (نقائض، طبع Bevan، ۱ : ۲۰۱ س ٦) ۔ اس شعر میں الفرزدق نے بیان کیا ہے کہ اس کے پاس لبید کے اشعار کی پوری کتاب ہے ۔ اس کے بعد ممالک اسلامیہ میں نہایت سرگرمی سے کتابیں لکھی جانے لگیں ۔ اس کی تصدیق مختلف تذکروں سے ہوتی ہے جن میں هزارها ایسی کتابوں کے نام ملتے ہیں جو ضائع ہو چکی ہیں ۔ آخر میں یہ ذکر کر دینا مناسب ہو گا کہ ایک اور کتاب کو بھی محض ''الکتاب'' کہلوانے کا امتیاز حاصل ہوا اور وہ ہے سیبوَیہ البصری کی قواعد نحو پر عظیم تالیف ۔ اوائل اسلام کی یہی وہ نہایت مبسوط تالیف ہے جو هم تک پہنچی ہے ۔

عربی لغویوں نے کوشش کی ہے کہ عربی زبان میں اس مادّے کے دیگر مشتقات سے، جو مختلف معانی رکھتے ہیں، اس لفظ کے مفہوم کا استخراج کریں ۔ ان معانی کے متعلق لغت کی کتابوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک ایسا لفظ جو فن کتابت کے ساتھ شمال سے آیا ہو اس کا کوئی اشتقاق وهاں تلاش کرنا لا حاصل ہو گا ۔

(F. KRENKOW)

کتاب الأُسْطُقُص : (Tabula Samaragdina)، *

هرمِس تریسمجیست Hermes Trismegistos سے منسوب کیمیا گری کی تعلیمات ۔ اگرچہ یورپ اس کتاب کے ترجمے سے بارهویں صدی عیسوی کے وسط سے واقف تھا، لیکن اصل کتاب کی دستیابی آج تک علم الکیمیا کی تاریخ کا لاینحل مسئلہ رہا ہے [دیکھیے ابن القفطی: تاریخ الحکماء،

ص ۱۲۹، "کتاب الاُسْطُقّصات (= الاُسطُقسات) نقل حنین"، در حالات جالینوس] ۔ بیکن کی تصانیف کی اشاعت (۱۹۲۰ء) میں R. Steele نے ثابت کیا ہے کہ *Tabula* کا متن نام نہاد ارسطا طالیس کی تصنیف سرالاسرار کے عربی اور لاطینی ترجمے میں محفوظ ہے ۔ ۱۹۲۳ءمیں E. J. Holmyard نے جابر بن حیان کی کتاب الاسطقس الثانی کی صورت میں ایک قدیم تر متن کا پتا چلایا ہے ۔ J. Ruska نے بھی ثابت کیا ہے کہ کتاب کے بعض ژولیدہ مقامات کا مأخذ سِرُّالخلیقہ کا خاتمہ ہے، جو Hermes کی تالیف ہے اور بلینوس کو ہرمس کی قبر سے ملی تھی ۔ شاید اس کے مطالعے سے *Tabula* کی تاریخ کے بعض مقامات پر Hugo Sartelliensis کے زمانے سے عصر حاضر تک روشنی پڑ سکے ۔ وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جابر بن حیان بلینوس (Appollonius) کی کتاب سے پہلے سے متعارف تھا اور یہ بات یقینی ہے کہ کتاب باطنی حلقوں کی پیداوار ہے ۔

مآخذ: *Opera hactenus* : R. Steele *inedita Rogeri Baconi*، اوکسفرڈ ۱۹۲۰ء، ج ۵؛ (۲) E. J. Holmyard : *The Emerald Table*، در *Nature*، ۱۹۲۳ء، ۲ : ۵۲۵؛ (۳) J. Ruska : *Tabula Smaragdina*، ہائڈلبرگ ۱۹۲۶ء؛ (۴) M. Plessner : *Neue Materialien zur Geschichte der Tabula Smaragdina*، در *ISL*، ۱۹۲۷ء، ص ۷۷ ببعد؛ (۵) J. Ruska : *Die siebzig Bücher des Ġabir ibn Hajjan*، در *Studien zur Gesch. d. Chemie, Festschrift für E. O. V. Lippmann*، برلن ۱۹۲۷ء، ص ۳۴؛ [(۶) ابن ابی اصیبعۃ : عیون الانباء، ص ۱۵۵] ۔

(J. RUSKA)

* **کتابُ اللّٰہ** : رک بہ قرآن ۔

* **کتابُ الجِلْوَہ** : فرقۂ یَزیدیّہ [رک بآن] کی دو مقدس کتابوں میں سے ایک کتاب؛ اس میں اور مُصْحَف راش میں ان کے مذہب کی بنیادی چیزیں دی گئی ہیں ۔ چونکہ یزیدیوں کی مذہبی زبان کُردی ہے اور ان کی جن دعاؤں کا ہمیں علم ہے وہ سب بھی کردی زبان میں ہیں (مثلاً سب سے بڑی یعنی صبح کی دعا، اصطباغ اور ختنے کے وقت پڑھے جانے والے کلمات، مجلس سنجاق میں کیے جانے والا اعلان؛ مُصْحَف راش کے مشکوک الصحۃ بیانات کے سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود خدا بھی کردی زبان بولتا ہے) ۔ عجیب بات ہے کہ یزیدیوں کی دونوں مقدس کتابیں، جن کا وجود مدتوں سے معلوم ہے اور جن کے اصل نسخے یورپیوں کے قبضے میں آ چکے ہیں، عربی میں ہیں، یعنی (۱) کتاب الجلوۃ (کُتَیِّبِ جَلْوۃ) یا "کتاب الوحی" (شرف الدّین نے ان مخطوطات کی بنا پر جو اس کی دسترس میں تھے اس لفظ کو جِلْو لکھا ہے، مگر یہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے)؛ (۲) مصْحَف راش (= "سیاہ کتاب") : ظاہر ہے یہاں سیاہ سے مراد کوئی مقدس چیز ہے، مثلاً یہ کہ خدا "سیاہ پہاڑ" پر اترتا ہے (مُصْحَف، عدد ۱۶)۔ نام کی یہ تشریح کہ ممنوعہ کلمات کی نسبت چونکہ کہا جاتا ہے کہ انھیں سیاہ موم سے ڈھانک دیتے ہیں، اس لیے اس کتاب کا یہ نام ہوا، غلط ہے، کیونکہ یہاں قرآن مجید کا ذکر یزیدیوں کی مقدس کتاب کے متبادل کے طور پر کیا گیا ہے ۔

پادری انستاس ماری (Father Anstase Marie) البغدادی پہلا شخص ہے جو ۱۹۰۴ تا ۱۹۰۶ء میں سِنْجار کے ناظر کتب کو رشوت دے کر ان دو مقدس کتابوں کے مزعومہ اصل نسخوں کے چربے لینے میں کامیاب ہوا جو رقّ پر لکھے ہوئے ہیں ۔ یہ کتابیں مخفی رسم الخط میں اس قدیم کُردی میں لکھی گئی ہیں جو ارمنی زبان کی

یاد تازہ کرتی ہے ۔ اس مخفی رسم الخط میں لکھے ہوئے متن سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اسے جس اصل نسخے سے نقل کیا گیا وہ عربی میں تھا ۔ بایں‌ہمہ جعل سازی کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً اس لیے کہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یورپی فضلا کو یزیدی مذہب میں دلچسپی ہے تو موصل میں کئی دھوکے باز نئے متون دریافت کرنے کی کوشش میں رہنے لگے ۔ منگانا Mingana نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دیرالکوش (Alkosh) کے ایک سابق نسطوری راہب شماس ایریمیا شامر Shammas Eremia Shamir (م ۱۹۰۶ء) نے، جو استفیۂ کرکوک کا باشندہ تھا، ان تمام متون کی جعلسازی کی تھی جنھیں Chabot، Giamil، Isya Joseph اور Browne نے شائع کیا تھا: تاہم معلوم ہوتا ہے کہ Maxim Bittner نے اس موضوع پر اپنے تحقیقی مقالے *Die heiligen Bücher der Yeziden oder Teufelsan-better* ، مع *Nachtrag*، در *Denkschriften d. Wiener Ak. d. Wiss*، میں تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کرکے اس کردی متن کو مستند ثابت کر دیا ہے ۔ اس متن میں کردی زبان کی ایک حقیقی متروک شکل ملتی ہے، جو اب بولی نہیں جاتی اور جس کا مُکری Mukri بولی سے، جو سنجاق سلیمانیہ کے بہ Bebe کردوں کی زبان ہے، قریبی تعلق ہے؛ لہٰذا کسی مشرقی جعل ساز کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ اپنے محدود ذرائع سے اسے از سر نو ترتیب دے سکے ۔ ان کتابوں کی زبان وہ نہیں ہے جو یزیدی آج کل بولتے ہیں ۔

بہر حال یہ سوال ابھی حل طلب ہے کہ آیا کردی نسخہ اپنی قدیم زبان کے باوجود عربی نسخے سے در حقیقت قدیم تر ہے، یا جیسا کہ بعض لسانی خصوصیات غمازی کرتی ہیں (مثلاً ضلع جکت کا استعمال جو کردی زبان میں نا قابل فہم ہے) محض عربی سے دوبارہ کردی زبان میں ترجمہ ہے، جو قدیم زمانے میں کیا گیا ۔

ہو سکتا ہے کہ در اصل کتاب الَجلوہ کردی زبان میں لکھی گئی ہو کیونکہ کئی مقامات پر عربی متن کے مقابلے میں کردی متن کی عبارت زیادہ واضح اور مربوط ہے ۔ اس کے برعکس مصحف راش کا عربی متن کردی متن سے بہتر ہے ۔ بقول شرف الدّین کتاب الجلوہ اپنی موجودہ شکل میں کسی عرب کی لکھی ہوئی نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اس کی زبان جدید ہے؛ بہت سی تعبیرات ایسی ہیں جنھیں کلاسیکی عربی میں استعمال ہی نہیں کیا جاتا تھا، یا ان کا استعمال بہت بعد کے زمانے میں ہونے لگا تھا ۔ کئی ایک مقامات پر جملوں کی ساخت بھی غیر عربی ہے ۔ مصحف راش کی عربی اس سے بھی زیادہ جدید ہے کیونکہ اس میں عثمانی ترکی کے اثرات ناقابل انکار طور پر پائے جاتے ہیں ۔

اب تک ہمیں ان دو مقدس کتابوں کے کم از کم چار نسخوں کا علم ہے : ان میں سے ایک ۱۸۹۵ء میں O. Parry کی ملکیت تھا؛ دوسرا نسخہ Isya Joseph کے پاس ہے، جسے *Amer. Journ. of Sem. Lang.*، ج ۲۵، میں شائع کیا گیا تھا؛ اس کے علاوہ اس کے پاس اس کتاب کے دو اور نسخے بھی ہیں ۔ یہ دو نسخے Father Anastase Marie نے حاصل کیے تھے جن میں سے ایک کو سِنجاری نسخہ کہا جاتا ہے، جسے ۱۸۹۹ء میں ایک یزیدی مرتد کے لیے کسی سنجاری یزیدی نے نقل کیا تھا، بحالیکہ دوسرا خود انستاس نے ایک موصلی کے اصل نسخے سے ۱۹۰۴ء میں نقل کیا تھا ۔

کِتِیب جَلوہ، جس کی اصل بقول Joseph ۱۸۹۲ء میں بھی ملا حیدر کے مکان، واقع

باعدریہ، میں تھی اور جسے سال میں دو بار شیخ عدی کے مزار پر لے جایا جاتا تھا، بہت مختصر ہے۔ کتابی صورت میں اس کے آٹھ صفحے بنتے ہیں اور اس کی ۱۰۹ سطریں ہیں۔ اسے اس مذہب کے مشہور بانی شیخ عدی [رکّ بان] (م ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء یا ۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے یہ کتاب شیخ فخر الدّین کو املا کرائی تھی۔

چونکہ کتاب الجلوہ کا ذکر الردّعلی الرّافضۃ والیزیدیۃ المخالفین للملّۃ الاسلامیّۃ المحمّدیہ میں نہیں آیا، جسے ابن جمیل (ابو فراس عبید اللہ) جیسے باخبر مصنّف نے، جو رستاق فرات کا رہنے والا تھا، ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں تصنیف کیا تھا اور نہ المقریزی ہی نے اس کا کوئی ذکر ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں شیخ عدی کے مزار کی تباہی اور اس کی ہڈیوں کو جلانے کی کیفیت لکھتے وقت کیا ہے؛ لہٰذا شرف الدّین اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس کتاب کی تاریخ تالیف ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء یا ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء سے پہلے متعین نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ اولیا چلبی نے بھی اس کتاب کا ذکر نہیں کیا، اس لیے اس کتاب کی تاریخ تالیف کو اور پیچھے، یعنی ۱۶۵۵ء تک، لانا ہوگا۔

بہرحال مذکورۂ بالا حقائق سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یزیدیوں کو اس کتاب کا راز مخفی رکھنے میں بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ باوجود ان فوائد کے جو انھیں اہل الکتاب کی حیثیت سے حاصل ہو سکتے تھے انھوں نے اپنی مقدس کتابوں کے وجود سے انکار کرنے کو ترجیح دی۔ [اسلام میں ہر صاحب کتاب قوم کو اہل کتاب نہیں کہا گیا۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں اہل الکتاب کہا گیا ہے اس سے مراد خصوصاً یہودی اور عیسائی ہی ہیں]۔ صرف شیخ میران اسمٰعیل بِک عَبدی بِک اوغلو نازلی رحانی یزید کی مسائل آموز (Catechism) کتاب میں، جو اس نے روسی یزیدیوں کے لیے لکھی تھی، "شاندار جلوہ" (*Gyliazim*) کا حوالہ یزیدی روایت کے ایک مأخذ کی حیثیت سے دیا گیا ہے۔

کُتیِّب جَلوہ کے محتویات، جن کی ہیئت اور متن دونوں اس کے بلند مقاصد کے مطابق ہیں، مندرجۂ ذیل ہیں: مَلِک طاؤس نے، جو تمام کائنات سے پہلے موجود تھا، عَبطاؤس (= عبد طاؤس= شیخ عدی) کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ اس کے برگزیدہ بندوں یعنی یزیدیوں کو زبانی طور پر اور بعد ازاں کُتیِّب جلوہ کے ذریعے ہدایت دے، جسے پڑھنے کی کسی غیر یزیدی کو اجازت نہیں (دیباچہ)۔ اس کے بعد وہ صیغۂ متکلم میں اپنے ازلی اور ابدی ہونے، تمام دیگرخالقوں اور دیوتاؤں (نہ کہ مخلوقات، جیسا کہ عربی متن میں ہے) پر قدرت مطلق رکھنے اور اپنے حاضر و ناظر اور رزّاق ہونے کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام دیگر کتب مقدسہ غلط ہیں؛ خیر و شر واضح طور پر قابل ادراک ہیں؛ دنیا پر اسی کی فرمانروائی ہے اور اس کے نا قابل فہم حکم کی رو سے ہر دور میں ایک بڑا آدمی ہماری ہدایت کے لیے دنیا میں بھیجا جاتا ہے (باب اوّل)۔ اس کے بعد وہ اپنے جزا و سزا دینے کے اختیار کا ذکر کرتا ہے، جس سے نا اہل لوگوں کو بھی فوائد سے محروم نہیں کیا جاتا۔ پھر ایک سچے یزیدی کی موت اور تناسخ ارواح کا ذکر کرتا ہے (باب ۲)۔ وہ کہتا ہے کہ صرف اسی کو مخلوقات اور کائنات کو فنا کرنے کی قدرت حاصل ہے (باب۳)۔ وہ لوگوں کو ان اجنبی تعلیمات کے بارے میں خبردار کرتا ہے جو اس کی اپنی تعلیمات کی نقیض ہیں؛ علاوہ ازیں وہ تین ایسی چیزوں کے خلاف بھی تنبیہ کرتا ہے جن

کا نام نہیں دیا گیا؛ نیز اپنے متبّعین کے لیے اپنی پرقوت حفاظت و نگہداشت کا وعدہ کرتا ہے، بشرطیکہ وہ متحد رہیں (باب ۴) ۔ وہ ان سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اس کے مذہب اور اس کے خادموں کے احکام کی اطاعت کریں (باب ۵) ۔

مصحف راش زیادہ جامع اور یزیدی کردی زبان میں ہے ۔ اصل کتاب طومار کی شکل میں ہے اور مخفی رسم الخط میں لکھی گئی ہے اور اس میں ۱۵۲ سطریں ہیں ۔ یہ کتیب جلوہ کے مقابلے میں زیادہ دنیادارانہ، پیش پا افتادہ اور اس سے کم مربوط ہے، تضادات سے پر ہے اور یکایک ختم ہو جاتی ہے ۔ روایت کے مطابق اس کتاب کو شیخ عدی کی وفات (تقریباً ۷۴۳ھ/۱۳۴۲ء) کے دو سو سال بعد عظیم المرتبت بزرگ حسن البصری" [رکّ بآن] نے تالیف کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک وقت میں اصل کتاب سملی Semali کے قریب، جو دریاے دجلہ پر ہے، قصر عز الدین میں کہا یا [کذا، کہیا] علی کے گھر میں تھی؛ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کتیب جلوہ کی طرح یہ کتاب بھی سنجار میں ہے ۔

نظریۂ خلق عالم : مصحف راش میں تخلیق عالم کا ذکر تین متضاد نسخوں میں، ابواب میں تقسیم کیے بغیر، پراگندہ اور ملتبس طریقے سے کیا گیا ہے ۔ اس کہانی کے مطابق، جو تخلیق عالم کے متعلق نسبتاً زیادہ اصلی معلوم ہوتی ہے، خدا نے خلق عالم کو تنہا مکمل کیا ۔ اس نے ایک سفید موتی بنا کر اسے ایک پرندے اَنْفَر (بہت سے مخطوطات میں اَنْغَر) کی پشت پر رکھ دیا، جسے اس نے پیدا کیا تھا اور اسی پر چالیس ہزار سال تک تخت نشین رہا ۔ اس کے بعد اس نے سات خدائی فرشتے پیدا کیے، جنھیں صوفی شیوخ کا مرادف قرار دیا جاتا ہے ۔

خدا نے یک شنبے کو عَزْرائیل (ازازیل، زَزائیل)، یعنی ملک طاؤس کو پیدا کیا، جو ہرشے سے برتر ہے؛ دو شنبے کو ملک دَرْدائیل شیخ حسن (البصری) کو۔ [ان کے نام کا] یزیدی تلفظ شیخو سن (Shekhüsin) ہے، جیسا کہ یزیدیوں کی سب سے بڑی دعا سے ثابت ہے (سِیجَدِن شیخِیسِن، یعنی سجّاد الدین شیخ حسن؛ ایک مزعومہ شیخ سِنّ کا چاند دیوتا سن سے مقابلہ کر کے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں، ان کے لیے دیکھیے ماسینوں Massignon : *Essai sur les origines du lexique technique*، پیرس ۱۹۲۲ء، ص ۱۲۸۔الف، لیکن یہ بالکل غلط ہیں) ؛ سہ شنبے کو خدا نے ملک اِسْرافائیل(اسرافیل)، یعنی شیخ شمس (الدّین) کو پیدا کیا؛ چہار شنبے کو ملک میکائیل، یعنی شیخ ابوبکر کو؛ پنج شنبے کو ملک جبْرائیل، یعنی سجّادین (سِجا دِین، سجّادالدّین) کو؛ جمعے کو ملک شَمْنائیل (شَتْمائیل، سَمَنْسائیل)، یعنی ناصرالدّین کو اور شنبے کو ملک طُورائیل (نورائیل)، یعنی فخر الدّین کو ۔

اس کے بعد اس نے سات آسمانوں، زمین، سورج اور چاند کو پیدا کیا اور پھر آخرالذکر خدائی فرشتے فخر الدّین نے تخلیق کا باقی کام اپنے ذمّے لے کر انسانوں اور حیوانوں کو پیدا کیا ۔

اب خدا فرشتوں کو لے کر موتی میں سے باھر نکلا اور ایک زور دار چیخ سے اس نے اس کے چار ٹکڑے کر دیے ۔ اس موتی میں سے پانی کے بہنے سے جو سمندر بنا اس پر خدا اپنے پیدا کیے ہوے ایک جہاز میں تیس ہزار سال تک چلتا رہا ۔ جبرائیل نے، جو ایک پرندے کی شکل میں پیدا کیا گیا تھا، اس موتی کے ٹکڑوں سے سورج، چاند اور ستارے، پہاڑ، پودے، پھلدار درخت اور آسمان بنائے ۔

اس تصور کے ساتھ ساتھ سات خداؤں کا ایک قدرے مختلف تصور بھی ہے جو بذریعۂ صدور پیدا ہوئے اور بعینہٖ اسی طرح نور الٰہی کا نور ہیں جس طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے، اور ان میں سب سے بڑے معبود خدا کا ذکر محض اپنے امثال میں اولین کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

وہ بیانات جو فرقۂ عزرائیل (ملک طاؤس) یعنی یزیدیوں کے متعلق دیے گئے ہیں جن کی طرف خدا نے شام سے لالیش کی جانب شیخ عدی کو مبعوث کیا، ناقص ہیں اور اس طرح وہ بیانات بھی جو بنی نوع انسان کے آبا و اجداد یعنی آدم اور حوّاء کے بیٹوں شہر بن سَفَر کی اولاد کے متعلق ہیں - جب تیس ہزار نئے تخلیق شدہ فرشتے چالیس ہزار سال تک اللہ کی عبادت کر چکے، تو اللہ نے جبرائیل کی عملی اعانت سے آدم کو عناصر اربعہ سے پیدا کیا اور اسے جنت میں جگہ دے کر حکم دیا کہ گندم کے سوا دنیا کے تمام پھل کھا سکتا ہے (ایک یزیدی روایت کے مطابق یہ ممانعت انگوروں کے بارے میں تھی)۔

جب ایک سو سال کے بعد ملک طاؤس نے خدا کو یاد دلایا کہ آدم کی نسل میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا تو خدا نے اسے وہ سب کچھ کرنے کی اجازت دے دی جسے وہ مناسب سمجھے - ملک طاؤس نے آدم کو ممنوعہ گندم کے کھانے پر اکسایا - اس پر ملک طاؤس نے آدم کو جس کے جسم میں اس وقت تک بول و براز کی کوئی راہ نہ تھی جنت سے نکال دیا - آدم کو بہت تکلیف محسوس ہوئی تاآنکہ خدا نے ایک پرندے کو بھیج کر اس کے جسم میں سوراخ کروا دیا - اس کے اور سو سال بعد خدا نے جبرائیل کو بھیج کر آدم کی بائیں بغل کے زیریں حصے سے حوّاء کو پیدا کیا۔

مصحف راش میں خلق عالم کے متعلق ایک دوسری کہانی یوں دی ہے کہ خدا نے جو اپنے پیدا کردہ جہاز پر سمندر کے اوپر سیر کر رہا تھا، ایک موتی پیدا کیا، لیکن چالیس سال بعد اسے توڑ دیا - اس کی دردناک چیخ سے پہاڑ پیدا ہوئے، شور سے پہاڑیاں، اور بخارات سے آسمان پیدا ہوئے - اس کے بعد خدا نے اپنے نور سے بذریعۂ صدور چھے اور دیوتا پیدا کیے - پھر ان چھے دیوتاؤں نے اپنی اپنی باری پر کچھ نہ کچھ پیدا کیا: پہلے دیوتا نے آسمان خلق کیے، دوسرا سورج بن گیا، تیسرا چاند، چوتھے نے آفاق پیدا کیے، پانچویں نے ستارۂ صبح اور چھٹے نے کرۂ ہوا پیدا کیا۔

اس سے آگے مصحف میں یزیدیوں کی بہت ہی ابتدائی تاریخ کے متعلق کچھ پراگندہ و مخلوط بیانات ہیں جن میں سے محض چند باتیں قابل توجہ ہیں: جب ملک طاؤس نے حواء کو آدم کی مصاحبت میں دے دیا تو وہ زمین پر اتر کر یزیدیوں کی طرف آیا جو محض آدم کی نسل میں سے تھے اور اس لیے باقی انسانوں اور ان کے درمیان کوئی مشترک بات نہ تھی - اس نے ان کے اور آشوریوں کے لیے جو قدیم ترین زمانے سے موجود تھے، مندرجۂ ذیل حکمران مقرر کیے: نَشْرُوح (نَسْروخ، آشوری: Nisroch) = ناصر الدّین، جَمبُوش (کاموش Kamos) = ملک فخر الدّین اور ارتیمش (ارتیموس Artemis) = ملک شمس الدّین - ان کے بعد شابور (شاپور) اوّل اور ثانی نے ایک سو پچاس سال حکومت کی - ان کی تمام نامور شخصیتیں بالخصوص یزیدی شہزادوں کا خاندان اسی کی نسل سے ہوا - یزیدیوں کے چار حکمران ہوئے ہیں جن کے نام بالصراحۃ نہیں دیے گئے - ان کے ایک بادشاہ آحاب نے حکم دیا کہ انہیں ان کے اپنے نام دیے جائیں (جس کی تصریح نہیں کی گئی) - اِلٰہ آحاب

(یعنی بعْل زبوب) کو اب پیر بوب کہتے ھیں ۔ دیگر یزیدی حکمرانوں میں یہ لوگ تھے: بخت نصّر (Nebucchadnezzar) بابل میں، اَخَشْ ویروش (Akhashperosh) ایران میں، اور اغْرِن قالوس (Aghrikalus) قسطنطینیہ میں ۔

اس کے علاوہ مصحف میں بعض نواهی بھی مذکور ھیں ۔ حرام اشیاےخوردنی میں کاھو یا سلاد (یزیدی زبان میں کاھو، عربی = خَسْ) شامل ھے ۔ اس کے کھانے سے اس لیے منع کیا گیا کہ اس کا نام نبیّہ خاسیہ سے مشابہ تھا، اس کے علاوہ لوبیا، مچھلی (ماسی = ماھی، پغمبر یونان = [حضرت] یونس[ع] کی وجہ سے)، ھرن (آسِک) بھی ممنوع ھیں ۔ شیخ اور اس کے مریدوں کے لیے مرغیوں (کلاشیر Käläshir) کا گوشت اور کدو (Külükä) کا کھانا حرام تھا ۔

صابیوں کی طرح یزیدیوں کے ھاں بھی گہرا نیلا رنگ ممنوع تھا ۔ مندرجۂ ذیل باتیں بھی واضح طور پر ممنوع ھیں : کھڑے ھو کر پیشاب کرنا، بیٹھ کر کپڑے پہننا، بیت الخلا کا استعمال اور غسل خانے میں نہانا (غسل خانے اور بیت الخلا کو ارواح خبیثہ کا مسکن خیال کیا جاتا ھے) ۔ مندرجۂ ذیل الفاظ کا بولنا بھی منع ھے : شیطان ("ان کے خدا کا نام") قَیطان (پھندا)، شَطّ (ندی)، شرّ (بدی)، ملعون، لعنۃ اور نَعْل ۔

اگرچہ اس کا مصحف میں کہیں ذکر نہیں لیکن روایتی طور پر وہ لفظ جو شین سے شروع ھوتے ھیں ان کا بولنا بھی منع ھے، نیز سرطان (کیکڑا)، حیْطان (باڑھیں)، بستان (سبزیوں کا باغ) بَطْ، نَطْ (کودنا) وغیرہ، پڑھنا اور لکھنا، ڈاڑھی مونڈنا اور مونچھوں کا صفایا کر دینا بھی منع ھے اس طرح دوسروں کی کنگھی اور استرا استعمال کرنا، مقدس جنگلوں سے لکڑی لینا، اولادالزّنا کا پرورش کرنا اور قلقل کرنے والے برتنوں سے پانی پینا منع ھے ۔

مآخذ : دیکھیے مآخذ متعلّقہ مادّۂ یزیدی و (۱) اسمعیل بیگ چول : الیزیدیّہ قدیماً و حدیثاً . . . (قدیم اور موجودہ یزیدی) طبع Dr. Konstantin Zuraik، بیروت کی امریکی یونیورسٹی، سلسلۂ شرق، عدد ۶، بیروت ۱۹۳۴ء اس پر دیکھیے (۲) R. Strothmann در *Isl.*، ج ۲۲، ۱۹۳۵ء ص ۳۲۳ تا ۳۲۴ ۔

(Th. Menzel)

* **کِتاب خانہ :** کتاب خانہ، بمعنی لائبریری ایک فارسی لفظ ھے جس کا عربی مترادف لفظ مکتبہ بھی استعمال ھوتا ھے ۔ اس کا اطلاق ان عام کتاب خانوں پر ھوتا ھے جو متعلمین کے فائدے کے لیے سلاطین نے یا عام افراد نے قائم کرکے وقف کیے ۔ بعض اوقات یہ کتاب خانے کسی خاص فرقے یا کسی خاص علم کے مطالعے کے لیے مخصوص ھوتے تھے ۔ عہد فتوحات کے بعد جب لوگوں میں علم و ادب کا ذوق و شوق پیدا ھوا اور کتابوں کی تصنیف و تالیف میں روز افزوں اضافہ ھونے لگا تو ادبی ذوق رکھنے والے اصحاب نے کتابیں جمع کر کے بڑے اچھے اچھے ذاتی کتاب خانے قائم کر لیے اور کوئی ماھر لسانیات ابو عمْرو الشّیبانی کی مثال سے ھم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ھیں کہ مصنفین کا یہ دستور تھا کہ وہ حوالے کے لیے اپنی تصنیفات کی نقول اپنے شہر یا محلّے کی مسجد میں رکھوا دیتے تھے ۔ جہاں تک عام کتب خانوں کا تعلق ھے، اس قسم کے قدیم ترین کتاب خانے کا ذکر ھمیں خالد بن یزید بن معاویہ[رض] کے حال میں ملتا ھے، جس نے اپنی زندگی یونانی علوم، بالخصوص کیمیا اور طبّ کی تحصیل کے لیے وقف کر دی تھی ۔ ھمیں پتا چلتا ھے کہ اس نے اس قسم کی کتابیں ترجمہ کرائیں اور جب حضرت عمر بن عبدالعزیز[رح] کے

آغاز عہد میں ایک وبا پھیلی تو حکم دیا کہ تمام
کتابیں کتاب خانے (خزانہ) سے باہر نکال لی جائیں،
تاکہ عام لوگوں کی ان تک رسائی ہو سکے ۔
بہر حال بڑے پیمانے پر سب سے پہلا عام کتاب خانہ
دارالحکمۃ تھا جسے عباسی خلیفہ المأمون نے بغداد
میں قائم کیا ۔ اس کتاب خانے کو حتی الامکان
جامع بنانے کے لیے اس نے کئی قیمتی یونانی
مخطوطات بوزنطی سلطنت میں سے خریدے اور عربی
میں ان کے ترجمے ایسے علما سے کرائے جو اس کام
کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ اس کتاب خانے میں ان
تمام علوم کی کتابیں جمع کر دی گئی تھیں جنھیں
عربوں نے فروغ دیا تھا ۔ یہ کتاب خانہ بدستور ترقی
کرتا رہا تا آنکہ ۶۵۶ھ میں مغلوں نے بغداد کو
فتح کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ۔ مصر
کے فاطمی خلفا نے قاہرہ میں جو کتاب خانہ قائم
کیا تھا وہ بھی ایسا ہی اہم تھا ۔ اس میں بے اندازہ
علمی خزینے جمع تھے اور ہمیں پتا چلتا ہے کہ
۴۳۵ھ/۱۰۴۳ - ۱۰۴۴ء میں وزیر ابوالقاسم علی
بن احمد الجَرجرائی نے یہ ہدایات جاری کی تھیں
کہ کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور
ان کی نئے سرے سے جلدیں باندھی جائیں ۔ اس کام
کی نگرانی کے لیے اس نے ابو خَلَف القضاعی اور
ابن خَلَف الورّاق کو مقرر کیا ۔ یہ کتاب خانہ آخری
فاطمی خلیفہ العاضد کی وفات تک بجنسہٖ محفوظ رہا،
اس کی بیشتر کتابیں قاضی الفاضل [رکّ بآں] نے خرید
لیں اور اپنے قائم کردہ فاضلیۃ مدرسے کے کتاب خانے
میں جمع کرا دیں، لیکن تھوڑی ہی مدّت بعد یہ
بے پروائی کا شکار ہو گئیں، چنانچہ القلقشندی کے
زمانے تک ان میں سے بیشتر کتابیں غائب ہو چکی
تھیں ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب خانے میں ۶۵۰۰
کتابیں صرف علوم عقلیہ، مثلاً ریاضی، علم ہیئت
وغیرہ پر ہی تھیں ۔ اس کے خزائن میں تانبے کا
ایک کرہ تھا جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسے
بطلمیوس [رکّ بآں] نے تیار کیا تھا اور اس پر
ایک تحریر کندہ تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ اسے
خالد بن یزید بن معاویۃؓ نے حاصل کیا تھا ۔ تیسرا
بڑا کتاب خانہ قرطبہ کے اموی خلفا کا تھا ۔ اس کی
کتابیں بھی پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں
المرابطون کی فتح اندلس کے بعد منتشر ہو گئیں ۔
چھوٹے کتاب خانوں میں سے ایک تو سلطان مسعود
غزنوی نے قائم کیا تھا جس کے بیشتر خزائن آگے
چل کر بخارا میں منتقل ہو گئے ۔ ہمیں اکثر ایسے
قیمتی نجی کتاب خانوں کا بھی ذکر ملتا ہے
جو علما کو استعمال کے لیے دے دیے جاتے تھے ۔
مثلاً الصُولی [رکّ بآں] کے سوانح حیات سے معلوم
ہوتا ہے کہ اس کے پاس ایک بڑا ذخیرۂ کتب
موجود تھا اور ان کتابوں کی سرخ اور زرد رنگ
کے چمڑے کی بڑی خوشنما جلدیں بندھی ہوئی
تھیں ۔ الصَّفَدی [رکّ بآں] نے غَرْس النِعمۃالصّابی،
[=محمد بن ہلال (م ۴۸۰ھ/۱۰۸۷ء)، بغداد کا
مؤرخ اور ادیب، عیون التواریخ اور الھفوات کا
مصنف] کے سوانح حیات میں لکھا ہے کہ اس نے
بغداد میں ایک کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں
طلبہ کے استعمال کے لیے [چار ہزار] کتابیں رکھی
گئی تھیں لیکن اس سے بھی پہلے ہم ابو تمّام کے
کے متعلق پڑھتے ہیں کہ اسے موسم سرما کے باعث
ہمدان میں رکنا پڑا، جہاں اس نے اپنے مشہور و
معروف مجموعۂ اشعار الحَماسۃ، کا مواد ان کتابوں
سے منتخب کیا جو اسے وہاں کے کتاب خانوں میں
ملی تھیں ۔ جب سلطان ملک شاہ سلجوقی کے وزیر
نظام الملک نے تعلیم عامّہ کے لیے نیشا پور، بغداد
اور دیگر مقامات میں مدارس کھولے تو کتاب خانوں
کے قیام کو بہت زیادہ تحریک ملی ۔ صرف ان
مدارس کے اساتذہ کی تنخواہ ہی کے لیے نہیں بلکہ

یہاں جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی ان کی کتابوں کے بیش قیمت مخطوطات کے لیے بھی رقوم وقف کی جاتی تھیں ۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں جب مغول سارے ایران پر چھا گئے تو جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے نہ صرف انسانی جانوں کا نقصان ہوا اور قیمتی جائدادوں پر تباہی آئی، بلکہ ان گنت اور انمول کتابیں بھی بے دردی سے برباد کر دی گئیں ۔ مصر اور شام کے ایوبی امرا نے قیام مدارس کے سلسلے میں جلیل القدر سلجوقی وزیر کی مثال پر عمل کیا، لیکن القَلْقَشَنْدی کی ایک تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود ان کے اور ان مدارس کے منتظمین کے ذہن میں بڑے بڑے عام کتاب خانوں کی قدر و قیمت کا کوئی صحیح تصوّر موجود نہیں تھا (صبحؔ الاَعْشیٰ، ۱ : ۴۶۷) ۔ اس کے بعد کئی صدیوں تک ہمیں ایسے علما و فضلا کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے مساجد اور مدارس کو اپنی کتابوں کے عطیات دیے ۔ یہ عطیات بطور وَقْف یعنی نا قابل انتقال جائداد دیے جاتے تھے، لیکن ان کے نگران اپنی نا قابل اعتبار حد تک پہنچی ہوئی بد دیانتی کے باعث اکثر اوقات نہ صرف ان قیمتی کتابوں کے ضائع ہونے کی روک تھام نہیں کرتے تھے، بلکہ اس سے چشم پوشی کر جاتے تھے ۔ ایسے کتنے ہی مخطوطات ہیں، جنھیں ان کتاب خانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رکھا گیا تھا، لیکن وہ مختلف لوگوں کے ذاتی قبضے میں آ گئے یا یورپ کے بڑے بڑے کتاب خانوں میں جا پہنچے ۔ علاوہ ازیں بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی کتاب خانہ معرض وجود میں آنے کے فوراً بعد ھی بے پروائی کا شکار ہو جاتا تھا اور یہاں کی کتابیں طلبہ کے علم میں اضافہ کرنے کے بجائے حشرات الارض کی خوراک بننے لگتی تھیں ۔ چونکہ کتاب خانوں کے محافظین کی قرار وَاقعی نگرانی نہیں کی جاتی تھی، اس لیے جو کتابیں ان کی تحویل میں دی جاتیں وہ بسا اوقات اس حال کو پہنچ جاتیں کہ پڑھنے کے لیے اٹھایا اور اوراق ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ۔ اس کی ایک واضح اور بین مثال وہ کتابیں ھیں جو کسی زمانے میں دہلی کے شاھی کتاب خانے کی زینت تھیں اور آج کل لنڈن کے انڈیا آفس میں موجود ھیں ۔ خواہ یہ کتابیں کیسی ھی قابل قدر تصنیفات ھی کیوں نہ ھوں دیمک اور عرصۂ دراز کی بے پروائی نے ان کی یہ حالت کر دی ھے کہ مہتمم کتب خانہ طلبہ کو کتابیں مہیا کرنے سے مایوس ھو کر رہ جاتا ھے، موجودہ زمانے میں صورت حال بہتر ھو گئی ھے ۔ کتاب خانۂ خدیویہ (اب سرکاری) نے ایک بار پھر ان علمی خزائن کو جمع کرنے کا کام شروع کر دیا ھے جو صدیوں کی بے پروائی سے بچ رہے ھیں ۔ جو طلبہ قاھرہ جانے کی استطاعت رکھتے ھیں وہ ان خزینوں سے مستفید ھو سکتے ھیں ۔ قسطنطینیہ کے متعدد کتاب خانوں میں قیمتی کتابوں کی صورت میں بڑے بے بہا خزانے محفوظ ھیں، جن کی فہرستیں چھپ چکی ھیں، اگرچہ ان میں بہت سی کتابوں کے بارے میں غلط معلومات درج ھو گئی ھیں ۔ مدینۂ منورہ اور عراق میں بھی متعدد پیش قیمت کتاب خانے ھیں ۔ ان ممالک میں جن لوگوں کے مسلمان دوست موجود ھیں، وہ بعض اوقات وھاں کے نادر مخطوطات کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتے ھیں ۔ دمشق کے کتاب خانۂ ظاھریہ اور فاس اور تونس کی جامع مساجد کے کتاب خانوں کی نا مکمل فہرستیں بھی ملتی ھیں، لیکن تاحال یورپی طلبہ کے لیے ان کتاب خانوں کے خزانوں سے استفادہ کرنا بہت مشکل ھے ۔ برصغیر پاکستان و ھندوستان میں بھی ایک نئے دور کا آغاز ھو چکا ھے ۔ اس کی تصدیق اس احتیاط سے ھوتی ھے جو حیدر آباد کے کتاب خانۂ آصفیہ، بانکی پور کے

کتاب خانۂ خدا بخش، رام پور کی رضا لائبریری اور بمبئی کے کتاب خانۂ ملا فیروز میں برتی جاتی ہے ۔ اب صنعاء (یمن) کے کتاب خانوں تک بھی شائقین کی دسترس ہونے لگی ہے ۔ کربلا اور نجف میں شیعیوں کی زیارت گاہوں میں بھی قیمتی کتاب خانے ہیں، لیکن اس امید کے پورا ہونے میں شاید ابھی بہت عرصہ باقی ہے کہ انھیں اور عراق کے دوسرے مراکز کے مخطوطات کو یکجا کر کے ایک مرکزی سرکاری کتاب خانے میں رکھوا دیا جائے ۔ یہ واقعہ کہ بلاد مشرق سے قیمتی اور قدیم مخطوطات برابر یورپ میں چلے آ رہے ہیں، اس بات کا ثبوت ہے کہ صدیوں کی بے پروائی کے باوجود قدیم زمانے کے نسخے ابھی تک اس سے بہت زیادہ تعداد میں محفوظ ہیں جتنی کہ توقع کی جا سکتی تھی، لیکن پرانے زمانے میں کتابت کے لیے جو بہترین قسم کا کاغذ اور سیاہی استعمال ہوتی تھی، اس کی وجہ سے کئی ایسی کتابیں محفوظ ہو گئیں جو بصورت دیگر مٹ جاتیں ۔ علاوہ بریں یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ بڑے بڑے کتاب خانوں کے ختم ہونے پر یہ کتابیں لوگوں کی ذاتی ملکیت بن گئیں اور اب وہاں سے نکل کر دوبارہ منظر عام پر آ رہی ہیں ۔ اس کی شہادت اس امر سے بھی ملتی ہے کہ مشرقی ممالک میں قدیم مخطوطات کے کئی قیمتی نجی کتاب خانے موجود ہیں، مثلاً بغداد میں سیّد صدر الدّین کا اور قاہرہ میں احمد تیمور پاشا کا کتاب خانہ ۔ ان کے علاوہ بھی ہمیں بعض کتاب خانوں کا حال معلوم ہے ۔ بدقسمتی سے بیشتر کتاب خانوں کے مالک اپنی مقبوضہ کتابوں کے متعلق معلومات مہیا کرنے میں بہت بخل سے کام لیتے ہیں، البتہ اس سلسلے میں مذکورۂ بالا دونوں کتاب خانے مستثنٰی ہیں ۔ جوں جوں لوگوں میں یہ احساس بڑھتا چلا جا رہا ہے کہ قدیم ادب کی یادگاروں تک، خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی میں، عوام کی رسائی ہونی چاہیے، ان کے مالک بعض نسبۃً نادر تصنیفات کو طبع کر کے منظرِ عام پر لانے لگے ہیں ۔ جب ان کی قدر و قیمت کا پورا اندازہ ہو جائے گا تو ہمیں امید ہے کہ جو مواد اس وقت مشرقی ممالک کے کتاب خانوں میں چھپا پڑا ہے، اس کا بیشتر حصّہ آئندہ پچاس برس کے اندر اندر طلبہ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا ۔

(F. KRENKOW)

کتاب خانوں کی ترتیب، انتظام اور استعمال :
چوتھی/دسویں صدی میں بھی ایسی عمارتیں موجود تھیں جو محض کتاب خانوں کے لیے مخصوص تھیں اور خاص طور سے اسی مقصد کے لیے تعمیر کی گئی تھیں؛ مثلاً ۳۸۱ھ/۹۹۱ء میں بہاءُ الدَّوْلَة کے وزیر سابور بن اَرْدشیر نے بغداد کے محلۂ کَرْخ میں ایک دارالکتب بنوایا جس میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود تھیں (ابن الأثیر : الکامل، ۹ : ۲۴۶؛ یاقوت : المعجم، ۱ : ۷۹۹) ۔ مشہور جغرافیہ نویس المقدسی (ص ۴۴۹) نے شیراز میں ایک عظیم الشان کتاب خانہ دیکھا تھا، جسے عضدالدّولہ بویہی (۳۳۸/۹۴۹ تا ۳۷۲ھ/۹۸۲ء) نے قائم کیا تھا ۔ اس کتاب خانے کی ایک علٰحدہ عمارت تھی جس میں ایک وسیع و عریض دالان تھا اور یہ ایک طویل مضبوط محرابی چھت کی عمارت تھی جس کے تین طرف حجروں (خزائن) کی قطار چلی گئی تھی ۔ محرابی چھت والے مرکزی کمرے اور بغلی کمروں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ تین ہاتھ (ell = ۴۵") اونچی اور تین ہاتھ چوڑی چوبی الماریاں نصب تھیں ۔ ان الماریوں پر منبت کاری کی گئی تھی اور ان کے کواڑ اوپر سے نیچے کو کھلتے تھے ۔ کتابیں ان کے خانوں میں اوپر تلے رکھی جاتی تھیں ۔ قاہرہ کے فاطمی

کتاب خانے میں جو الماریاں استعمال کی جاتی تھیں وہ ان سے کچھ مختلف تھیں (المقریزی : الخطط، قاهره ۱۲۷۰ھ، ۱ : ۴۰۹) ۔ کتابوں کی الماریوں (رفوف) میں تختوں کے ذریعے علىحده علىحده خانے (حاجز) بنائے گئے تھے ۔ ہر خانے کے جدا جدا کواڑ تھے اور ان کواڑوں میں قلّابے اور تالے لگے ہوے تھے ۔ کھلی الماریوں میں بھی چھوٹے چھوٹے خانے ہوتے تھے۔ اس قسم کی الماریوں کو ایک چھوٹی سی تصویر میں دکھایا گیا ھے جسے یحیی بن محمود نے ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء میں بنایا تھا اور جو الحریری کے ایک قلمی نسخے موجودۂ پیرس (عربی مخطوطات عدد ۵۸۴۷) میں ھے ۔ اس تصویر میں بصرے کا ایک کتاب خانہ دکھایا گیا ھے (Blochet : *Les enlumineurs des Mss. orientaux*، پیرس ۱۹۲۶ء، لوحہ ۱۰) ۔ همارے دستور کے خلاف چھوٹے چھوٹے خانوں میں اوپر تلے دھری ھیں اور بلادِ مشرق میں یہ رواج ابھی تک چلا آتا ھے۔ اس سے اس بات کی بھی توضیح ھو جاتی ھےکہ تصنیفات کے بالائی یا زیریں کنارے پر ان کا مختصر نام کیوں لکھا جاتا ھے (یہ بات کبھی کبھی مغربی ممالک میں بھی دیکھنے میں آتی ھے) ۔

کتابیں بڑی باقاعدگی سے ترتیب دی جاتی تھیں اور علوم کے مختلف شعبوں کے اعتبار سے انھیں تقسیم کیا جاتا تھا ۔ قرآن مجید کے نسخوں کے لیے عام طور پر ایک خاص جگہ مقرر ہوتی تھی، مثلاً فاطمی کتاب خانے میں انھیں دوسری کتابوں کی نسبت بلند تر مقام پر رکھا جاتا تھا ۔ بہت سی کتابوں کے اکثر اوقات کئی کئی نسخے ہوتے تھے ۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ایک ھی کتاب کا مطالعہ بیک وقت متعدد اشخاص کر سکتے تھے بلکہ قاری کسی غلط عبارت کو دوسرے نسخے کی مدد سے فوراً پڑھ سکتا تھا ۔ مثال کے طور پر قاہرہ کے کتاب خانۂ فاطمیہ میں خلیل کی کتاب العَین کے تیس نسخے، تاریخ الطّبری کے بیس نسخے اور اگر غلط نہیں تو ابن دُرَید کی الجَمہرۃ کے ایک سو نسخے موجود تھے۔

فہرستیں یا تو کئی کئی جلدوں میں ہوتی تھیں، جن میں (غالباً مختلف اصناف علم کے اعتبار سے) کتابوں کے نام ترتیب وار درج ہوتے تھے اور یا کتاب خانۂ فاطمیہ کی طرح ہر کمرے کے دروازے کے اندر کی طرف وہاں کی کتابوں کی فہرست چپکا دی جاتی تھی ۔

عموماً کتاب خانوں کا ایک مہتمم (صاحب) اور کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک یا ایک سے زیادہ لائبریرین (خازن)، نیز کاتب (ناسخ) اور چپراسی (فرّاش) ہوتے تھے ۔ ھمیں پتا چلتا ھے کہ بعض مشہور و معروف علما خازن تھے: چنانچہ مؤرخ ابن مسکَویہ، رَے میں وزیر ابوالفضل بن العَمید، کا خازن تھا (ابن مسکَویہ : تَجارِب الاُمَم، طبع Amedroz و Morgoliouth، اوکسفرڈ ۱۹۲۱ء، متن ۲ : ۲۲۳، ترجمه ۵ : ۲۳۷) اور الشّابُشتی م ۳۹۰ھ/۹۹۹ء) جس نے عیسائی خانقاھوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی، العزیز کے عہد میں قاہرہ کے کتاب خانۂ فاطمیّہ کا خازن تھا (ابن خَلّکان : وَفیات، ۱ : ۳۳۸) ۔

کتابیں کچھ تو خرید لی جاتی تھیں اور کچھ کاتب جو کتاب خانوں میں ملازم ہوتے تھے، قلمی نسخوں سے نقل کر لیتے تھے ۔ اَلمقریزی نے ایک کتاب خانے کا میزانیہ قلمبند کیا ھے (۱ : ۴۵۹) ۔ اس کی رُو سے خلیفہ الحاکم [بامر اللہ] ۳۸۶ تا ۴۱۱ھ/۹۹۶ تا ۱۰۲۰ء) ہر سال اپنے قائم کردہ دارالعلم پر ۲۵۷ دینار (تقریباً ۱۵۰ پونڈ) خرچ کیا کرتا تھا ۔ یہ رقم حسب ذیل طریق سے خرچ ہوتی تھی ۔

عبّادان سے آئی ہوئی چٹائیاں وغیرہ	= ۱۰ دینار
کاتبوں کے لیے کاغذ	= ۹۰ دینار
خازن کی تنخواہ	= ۴۸ دینار
پینے کا پانی	= ۱۰ دینار
فراشوں کی اجرت	= ۱۵ دینار
کاغذ، دوات، قلم رکھنے والے کی اجرت	= ۱۲ دینار
دروازوں کے پردوں کی مرمت	= ۱ دینار
کتابوں کی مرمت	= ۱۲ دینار
موسم سرما کے لیے نمدے کے فرش	= ۵ دینار
موسم سرما کے لیے کمبل	= ۴ دینار

کتاب خانے ہر شخص کے لیے کھلے رہتے تھے اور کسی سے کوئی چندہ وغیرہ نہیں لیا جاتا تھا - کاغذ، دوات، اور قلم منتظمین کی طرف سے مہیا کیے جاتے تھے - بعض نجی کتاب خانوں میں تو دور دراز سے آئے ہوئے متعلمین کو گزارے کے لیے مالی مدد بھی دی جاتی تھی - کتاب خانے کی عمارت سے باہر کتابیں لے جانے کی صورت میں کچھ رقم جمع کرانی پڑتی تھی - یاقوت (م ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء) مرو کے کتاب خانوں سے متعلق فراخ دلی کی بڑی تعریف کرتا ہے (مُعجم، ۴ : ۵۰۹ ببعد)، جہاں سے وہ بغیر رقم جمع کرائے دو سو دینار کی مالیت کی دو سو بلکہ اس سے بھی زیادہ کتابیں لے کر ہمیشہ اپنے گھر میں رکھا کرتا تھا - اس سلسلے میں ۲۱ صفر ۷۹۹ھ/۲۴ نومبر ۱۳۹۶ء کا لکھا ہوا وہ وقف نامہ بھی پر از معلومات ہے جس کی رو سے ابن خلدون نے اپنی کتاب العبر، فاس کی جامع القرویین کے کتاب خانے کو عطا کی تھی - اس کے مطابق یہ مخطوطہ ایک اچھی خاصی رقم جمع کرانے کے بعد صرف کسی قابل اعتبار شخص کو زیادہ سے زیادہ دو ماہ کے لیے دیا جا سکتا تھا، کیونکہ یہ عرصہ مستعار لی ہوئی کتاب کو نقل کرنے یا پڑھنے کے لیے کافی ہوتا تھا - مہتمم کتاب خانہ کو ہدایت تھی کہ وہ اس قاعدے پر عمل در آمد کرائے (Levi-Provençal در *JA*، ج ۲۰۳ (۱۹۲۳ء) ص ۱۶۴) .

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلامی ملکوں میں ایسے کتاب خانے بھی تھے جہاں لوگ صرف مطالعہ کر سکتے تھے - مَدْرَسۃ المَحْمودیّہ کا کتاب خانہ جو ۷۹۷ھ/۱۳۹۵ء میں قاہرہ میں کھولا گیا تھا، اسی ذیل میں آتا ہے - اس کے بانی اُستادار جمال الدّین محمود بن علی (م ۷۹۹ھ/ ۱۳۹۷ء) کی وصیّت کی رُو سے کوئی کتاب مدرسے کے کمروں سے باہر نہیں نکالی جا سکتی تھی - ابن مسکوَیہ کی تجارب الاُمَم کا قلمی نسخہ جس کا کائتانی Caetani نے ایک عکسی نسخہ شائع کیا ہے (سلسلۂ یادگار گب، ۷/۶) اسی کتاب خانے کی ملکیت تھا - اس مخطوطے کے پہلے صفحے پر ۱۵ شعبان ۷۹۷ھ/۵ جون ۱۳۹۵ء کی تحریر کردہ دستاویز وقف درج ہے - اس میں لکھا ہے کہ ”مذکورۂ بالا معطی کی طرف سے یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ پوری کتاب یا اس کی کوئی جلد کتب خانے سے مستعار نہیں دی جا سکتی، خواہ اس کے لیے کوئی رقم جمع کرا دی جائے“ - بایں ہمہ جب ۸۲۶ھ/۱۴۲۳ء میں کتابوں کی جانچ پڑتال کی گئی، تو پتا چلا کہ کلّ تعداد کا دسواں حصہ یعنی چار سو کتابیں غائب ہیں - اس پر مسجد کے منتظم وقت کو برخاست کر دیا گیا (دیکھیے - ابن حَجر العَسْقَلانی در Quatremere : کتاب مذکور ص ۶۴، ۷۰؛ المقریزی : الخطَط، ۲ : ۳۹۵) .

اگر ہم مندرجۂ بالا بیانات کو پیش نظر رکھیں جو چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کی بھی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں تو ہم بڑے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی کتاب خانے ہر لحاظ سے یورپ کے کتاب خانوں سے

صدیوں آگے تھے اور مغرب سے بہت عرصہ پہلے اسلامی ملکوں نے عوامی کتاب خانوں کی عام ضرورت کو محسوس کر لیا تھا ۔

مآخذ: (۱) Quatremère : *Mémoire sur le goût des livres chez les Orientaux*، در *JA*، ۱۸۳۸ء، سلسلہ ۳، ۶ : ۳۵ تا ۷۸؛ اور (۲) اضافی حاشیے از Hammer Purgstall، در *JA*، ۱۸۴۸ء، سلسلہ ۴، ۱۱ : ۱۸۷ تا ۱۹۸؛ (۳) von Kremer : *Renaissance des Islâms*، ہائیڈل برگ ۱۹۲۲ء، ص ۱۶۳ ببعد؛ (۴) Ribera : *Bibliofilos y bibliotécas en la España musulmana*، سَرَقُسطہ ۱۸۹۶ء (میں اس کا مطالعہ نہیں کر سکا)؛ (۵) Grohmann : *Bibliotheken und Bibliophilen im islamischen Orient*، در *Festschrift der Nationalbibliothek in Wien*، ویانا ۱۹۲۶ء، ص ۴۳۱ تا ۴۴۲؛ (۶) M. Hartmann : *Das Bibliothekswesen in den islamischen Ländern*، در *Centralblatt f. Bibliothekswesen*، ۱۸۹۹ء، ۱۶ : ۱۸۶ ببعد؛ (۷) وہی مصنف : *Zur litterarischen Bewegung und zum Buch-u-Bibliothekswesen in den islamischen Ländern*، در فہرست عدد ۴ از Halle, Buchhandlung Rudolf Haupt ۱۹۰۵ء؛ مغربی ممالک کے کتاب خانوں سے مقابلے کے لیے دیکھیے (۸) Milkau : *Die Bibliotheken*، در *Kultur der Gegenwart*، ۱/۱ : بار دوم، ۱۹۱۲ء، ص ۵۸۷ ببعد.

(HEFFENING)

⊗ **کتاب الفہرست :** رک بہ الندیم ۔

⊗ **کتابیات:** اس مقالے میں یہ لفظ کتابوں کی اس باقاعدہ مدون فہرست کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو ان لوگوں کے فائدے کے لیے مرتب کی گئی ہو جو کسی خاص موضوع پر لکھے ہوئے مواد کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں ۔

ممالک اسلامیہ میں طباعت کے رواج سے پہلے اسلامی کتابیات میں جو سب سے نمایاں کارنامہ انجام دیا گیا، وہ کتاب الفہرست کی تدوین ہے ۔ اس کا مصنف ابن الندیم [رک بہ الندیم] بغداد کا ایک کتب فروش (وراق) تھا ۔ اس نے یہ کتاب ۳۷۷ھ/۹۸۷-۹۸۸ء میں علم ادب کی کتابیاتی تاریخ کے طور پر دس ابواب میں تالیف کی ۔ ان میں سے پہلے چھے "اسلامی تصنیفات" (قرآن مجید، صرف و نحو، تاریخ، شعر، کلام، اور قانون) سے تعلق رکھتے ہیں ۔ باقی چار فلسفے، سائنس، قصص و حکایات ملل و نحل اور الکیمیا سے متعلق ہیں ۔ ہر باب میں موضوع زیر بحث کے مطالعے کے آغاز اور نشو و نما کے بیان، اس پر جو کتابیں قابل حصول ہیں ان سب کی فہرست اور ان کتابوں کے مصنفوں کی کتابیاتی تفصیلات قدیم ترین زمانے سے دی گئی ہیں ۔

اسلامی کتابیات میں سے ایک اور اہم تالیف کشف الظنون عن اسماء الکتب الفنون ہے، جس کے لیے مواد جمع کرنے میں عثمانی عالم متبحر حاجی خلیفہ نے بیس سال کے قریب صرف کیے ۔ اس کی پہلی جلد ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء-۱۶۵۴ء میں الفہرست سے کوئی ۶۵۰ سال بعد مکمل ہوئی ۔ ایک مقدمے کے بعد جس میں مختلف علوم کی ماہیت، قدر و قیمت، اقسام اور تاریخ بالتفصیل درج ہے، مصنف نے ان سب کتابوں کے ناموں کی ردیف وار فہرست دی ہے جو عربی فارسی اور ترکی میں ان علوم پر لکھی گئیں اور جنھیں مصنف نے خود دیکھا یا جن کا نام اسے معلوم ہوا ۔ ہر تصنیف سے متعلق وہ اس کے مصنف، سال تصنیف، اس کے حصص و ابواب کی تقسیم کا اصول اور اس کی مختلف شرحوں، فرہنگوں اور تردیدات و تنقیدات کی تفصیلات بیان کرتا ہے ۔ اس نے ان تمام کتابوں کا جو اس نے دیکھیں، پہلا جملہ لکھ دیا ہے تاکہ

نامعلوم کتابوں کے پہنچاننے میں آسانی ہو ۔ بعد کے لوگوں نے اس کتاب کے متعدد ضمیمے مرتب کیے ۔ ان میں سے آخری ضمیمہ [ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون کے نام سے] اسمٰعیل پاشا البغدادی (م ۱۹۲۰ء) کا ہے، جس میں ۱۸۰۰۰ کے قریب عنوانات دیے گئے ہیں ۔ [یہ کتاب دو جلدوں میں استانبول سے (۱۹۴۵ - ۱۹۴۷ء) سے شائع ہو چکی ہے] .

باقی ماندہ کتابیاتی تصانیف کے متعلق، جو اس وقت تک موجود ہیں، کچھ زیادہ کہنا ضروری نہیں ۔ ابن خیر الاشبیلی (۵۰۲ تا ۵۷۲ھ) نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اندلس میں مشائی طالب علم کی حیثیت سے گزارا تھا ۔ اس نے ایک فہرست (طبع Codera و Ribera، در *BAH*، ج ۹ و ۱۰، سرقسطہ ۱۸۹۴ء) مرتب کی تھی، جس میں اس نے عربی کی کوئی ۱۴۰۰ ایسی کتابوں کے نام درج کیے ہیں جو ہسپانیہ اور مشرق میں لکھی گئیں اور جن کو اس نے خود پڑھا یا ان کا نام سنا؛ اس میں ہر کتاب کے راویوں کا سلسلہ اس کے اصل مصنف تک پہنچایا گیا ہے ۔ انفرادی مصنفین کی تصنیفات کی فہرستیں بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً الرازی کی تصنیفات کی فہرست (مؤلفۂ البیرونی، طبع کراؤز P. Kraus، پیرس ۱۹۳۶ء)، جالینوس کے تراجم کی فہرست (تالیف حسین بن اسحٰق، طبع Bergstrasser، لائپزگ ۱۹۲۵ء و ۱۹۳۳ء) اور سیوطی کی خود نوشت کتابیات (براکلمان، ۲: ۱۵۴ و تکملہ، ۲: ۱۷۹)؛ [نیز امام غزالی کی تصانیف کی فہرست، مؤلفہ محمد رضا] ۔ شیعوں نے اپنے فرقے کے مصنفین کی کتابیات کی ترتیب میں بہت انہماک سے کام لیا ہے ۔ سب سے پہلی فہرست محمد بن الحسن الطوسی (م ۴۶۰ھ) نے لکھی اور شپرینگر Sprenger، عبدالحق اور غلام قادر نے *Bibliotheca Indica* کے لیے اس کی تدوین کی ۔ اس اشاعت کے دیباچے میں کتابیات کی اسی قسم کی تین اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس سے قریب تر زمانے میں اعجاز حسین (۱۲۴۰ تا ۱۲۸۶ھ) کی کتاب کشف الحجب و الاستار عن اسماء الکتب و الاسفار میں ۳۴۱۴ شیعی کتابوں کی کیفیت ردیف وار درج ہے ۔ آغا بزرگ الطّہرانی کی کتاب الذّریعہ اِلٰی تصانیف الشّیعہ بھی قابل ذکر ہے .

علوم اسلام کے مغربی فضلا اور طلبہ کی تصنیفات کی فہرست پہلے پہل Schnurrer نے مرتب کی ۔ اس کی *Bibliotheca Arabica* کی طبع دوم ۱۸۱۱ء میں شائع ہوئی ۔ اس میں موضوعات کی ترتیب کے مطابق کتب مطبوعہ کی فہرست قدیم زمانے سے ۱۸۱۰ء تک دی گئی ہے اور تاریخ وار اشاریہ بھی اس کے ساتھ ہے ۔ Zenker کی *Bibliotheca Orientalis* (لائپزگ ۱۸۴۰ء، ۱۸۴۶ء، بار دیگر ۱۸۶۱ء)، جس کا مقصد طباعت کی ایجاد سے لے کر اس وقت تک کی عام عربی، فارسی اور ترکی مطبوعات کے نام جمع کرنا تھا، توقع کے مطابق ثابت نہیں ہوئی ۔ شوفن Chauvin نے Schnurrer کا کام زیادہ مہارت سے جاری رکھا اور اس نے Bibliotheca Arabica کے ساتھ ضمناً مصنفین کا اشاریہ بھی لگا دیا ۔ اس کی کتاب *Bibliographie des ouvrages arabes on relatifs aux Arabes publies dans l' Europe chretienne de 1810 a 1885* کی کل بارہ جلدیں ۱۸۹۲ء سے ۱۹۲۲ء تک طبع ہوئیں اور اس تصنیف کے باقی ماندہ حصے کے لیے مواد مخطوطات کی صورت میں Liege یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے ۔ شوفن Chauvin کا ارادہ یہ تھا کہ Schnurrer اور *Orientalische Bibliography* کے مابین جو خلا رہ گیا ہے اسے پر

کیا جائے - آخرالذکر کی طباعت ۱۸۸۷ءمیں شروع ہوئی تھی اور یہ اسلامی موضوعات، نیز مشرقی علوم کی تحقیق کے تمام شعبوں کے متعلق ۱۹۱۱ء تک شائع ہونے والی جملہ مطبوعات کی، ایک نہایت مکمل فہرست مہیا کرتی تھی۔

اگر شوفن کی کتاب پوری طبع ہو جاتی تو دنیا کے ہاتھ میں شروع سے لے کر ۱۹۱۱ء تک کی اسلامی موضوعات پر تمام مغربی مطبوعہ کتب کا خاصا مکمل مجموعہ تینوں فہرستہائے کتب Schnurrer، شوفن اور *Orientalische Bibliography* کو ملا کر استعمال کے لیے موجود ہوتا - اس وقت سے اسلامی علوم کے متعلق تحقیق کے روز افزوں کام اور اس وجہ سے مطبوعات کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس بات کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے کہ ایک خاص مدت کے اندر کی تمام مطبوعات کی تفصیل ایک ہی کتاب میں جمع کر دی جائے؛ اس لیے ۱۹۱۱ء کے بعد سے جو مطبوعات وجود میں آئیں انھیں معلوم کرنے کے لیے علما کو تمام انواع کی کتابیات کی ایک بڑی تعداد کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جن کا بالتفصیل ذکر یہاں ممکن نہیں - Pfannmüller نے اپنی کتاب *Handbuch der Islamliterature* (برلن و لائپزگ ۱۹۲۳ء) میں اس موضوع پر ایک مفید دیباچہ اور ہدایات قلم بند کی ہیں، لیکن اس کا مقصد اس کی مکمل کتابیات مرتب کرنا نہ تھا) - بڑے بڑے رسالوں کے ذریعے بھی اس مسئلے کے حل کی کوشش کی گئی ہے - یہاں صرف اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ *Kritische Bibliographe* وقتاً فوقتاً، ۱۹۱۳ سے ۱۹۳۳ء تک، *Der Islam* میں شائع ہوتی رہی ہے اور *Abstracta Islamica* ۱۹۲۷ء سے *Revue des études Islamiques* کا مستقل طور پر ایک خاص حصہ رہا ہے - پیرسن Pearson نے یہ کوشش کی ہے کہ *Index Islamicus* (کیمبرج ۱۹۵۸ء)میں رسالوں میں چھپنے والے، نیز ۱۹۰۶ سے ۱۹۵۵ء تک پچاس سال میں لکھے گئے مقالات کی فہرست مہیا کی جائے۔

کتابیاتی تواریخ ادبیات کی ترتیب کے ضمن میں جو روایت ابن الندیم اور حاجی خلیفہ نے قائم کی تھی، اس کو ہمارے زمانے میں براکلمان اور سٹوری Storey نے علی الترتیب عربی اور فارسی ادبیات کے متعلق اپنی یادگار تصانیف سے جاری رکھا ہے - ان دونوں مؤلفوں نے مصنفین کی سیرت کے متعلق مواد کے علاوہ مخطوطات کی تاحد امکان مکمل فہرست مہیا کی ہے اور تمام کتاب خانوں کے مجموعوں کی مطبوعہ فہرستوں، نیز انفرادی مصنفین کی کتابوں کی خاص خاص طباعتوں، ترجموں اور تاریخ یا تنقید کی تصانیف کی کیفیت یکجا کر دی ہے - براکلمان نے اپنے مواد کو تاریخ وار ترتیب دی ہے اور سٹوری نے اس کو موضوعات کی بنیاد پر مرتب کیا ہے - یہ دونوں عربی اور فارسی ادبیات کے طالب علموں اور عربی اور فارسی کتابوں کی فہرستیں تیار کرنے والوں کے لیے ناگزیر ہیں - [فؤاد سزگین نے براکلمان کی تاریخ ادب عربی کے تکملے کے طور پر تین جلدیں جرمن زبان میں تالیف کی ہیں، جن کا عربی ترجمہ تاریخ التراث العربی (جلد اول) شائع ہو چکا ہے - فؤاد سزگین کی یہ کتاب بھی کتابیات کے سلسلے میں بڑی مفید اور اہم ہے] - ایک اسی قسم کی تصنیف *Geschichts schreiber der Osmanen*، لائپزگ ۱۹۲۷ء، جس کا احاطہ نظر محدود تر ہے، Babinger نے تیار کی ہے۔

عربی میں عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابیں ایک علٰحدہ موضوع ہے، جس پر G. Graf: *Gessch de. christlichen arabt ite*، ۵ جلدیں Vatican

City ۱۹۴۴-۱۹۵۳ء اور M. Steinschneider : Arab.Lit. der Juden، فرینکفرٹ ۱۹۰۲ء، لکھی جا چکی ھیں۔

زمانۂ حال میں خود اسلامی ممالک نے اپنی کتابیات مرتب کرنے میں بہت کچھ حصہ لیا ھے۔ ۱۹۱۸ء میں یوسف الیان سرکیس نے اپنی کتاب معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ شائع کی ۔ اس میں تمام عربی مطبوعہ کتب کے نام، طباعت کے شروع ہونے سے لے کر ۱۹۱۹ء کے آخر تک، مصنف کے معروف ترین نام کے اعتبار سے (خواہ وہ اسم ھو یا لقب، کنیت ھو یا نسبت) حروف تہجّی کے لحاظ سے درج ھیں ۔ اس کتاب میں تصنیفات کے نام کا اشاریہ بھی شامل ھے ۔ مصر میں السّجل الثقافی کی متعدد جلدیں شائع ہوئی ھیں، جو علمی لحاظ سے درحقیقت قومی کتابیات مقصود ھو سکتی ھیں ۔ ایک فارسی قومی کتابیات، مرتبۂ ڈاکٹر ایرج افشار، فرھنگ ایران زمین میں ۱۹۵۴ء سے شائع ھو رھی ھے ۔ فارسی کی مطبوعہ کتب کی ایک فہرست کی پہلی جلد، مرتبۂ خان بابا مشار، ۱۳۳۶ شمسی/۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی ۔ برسلی محمد طاھر کی عثمانلی مؤلفلری عثمانی مصنفین کی سیرت اور کتابیات کی معجم ھے، جو تذکروں کی طرز پر لکھی گئی ھے ۔ یہ ترکی ثقافت کے تمام طلبہ کے لیے بڑی قابل قدر کتاب ھے، اگرچہ کتابیاتی تفصیل میں صحت کے لیے مشہور نہیں ۔ بقول Babinger اس کے اشاریے میں کسی نام کا ڈھونڈھ نکالنا اکثر قسمت کی یاوری پر منحصر اور بڑے صبر و تحمل کا متقاضی ہوتا ھے ۔ تورک ببلیو گرافیاسی میں ۱۹۲۸ء سے ترکی کی تمام مطبوعات درج ھیں ۔ کتاب خانۂ ملّی نے اس تجویز کا اعلان کیا ھے کہ ترکی کی تمام مطبوعہ کتب کی فہرست اٹھارھویں صدی سے جبکہ اس ملک میں طباعت کا آغاز ہوا، شائع کی جائے گی ۔ تورکیہ مقالہ لر ببلیو گرافیاسی، ترکی رسالوں میں چھپنے والے مقالات کا اشاریہ ھے، جو ۱۹۵۲ء سے باقاعدہ شائع ھو رھا ھے۔

مآخذ : ابن النّدیم کی فہرست فلوگل نے مرتب کی اور اس کی وفات کے بعد J. Roediger اور A. Mueller نے شائع کی (۲ جلدیں، لائپزگ ۱۸۷۱-۱۸۷۲ء؛ بار دوم قاھرہ ۱۳۴۸ھ)؛ ایک نیا نسخہ J. Fuck نے مرتب کیا ھے - اس کے مضامین کا فلوگل نے ZDMG، ۱۳ : ۵۵۹ تا ۶۵۰ میں بالتفصیل تجزیہ کیا اور براؤن نے اپنی کتاب (۱: ۳۸۳ تا ۳۸۷) میں اسے بشکل جدول مرتب کیا؛ نیز دیکھیے حوالے، در پیرسن (Pearson) : Index Islamicus، شمارہ ۲۳۲۸۱ تا ۲۳۳۸۷، ۲۳ (بہ استثنائے ۲۳۲۸۵) ؛ حاجی خلیفہ کے لیے دیکھیے Babinger : G. O.، ۱۹۵ تا ۲۰۳ ۔ کشف الظنون کی فلوگل نے تدوین کی (مطبوعۂ Oriental Translation Fund، ۷ جلدیں، لائپزگ ۱۸۳۵-۱۸۵۸ء؛ نیز بولاق، ۱۸۵۸ء، استانبول ۱۳۱۰-۱۳۱۱ھ و ۱۹۴۱-۱۹۴۳ء) - اسمٰعیل پاشا بغدادی کی ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون استانبول میں ۱۹۴۵-۱۹۴۷ء میں طبع ہوئی؛ علم ھیئت پر : نلینو (Nallino): Ilm al-Falak، ص ۴۷ اور اطالوی ترجمہ، Storia dell astronomia presso gli Arabi در Raccolta dei Scritti، ص ۱۴۳ تا ۱۵۰؛ شیعی کتابیات کے لیے دیکھیے براؤن، جلد ۴، باب ۸، خصوصاً ص ۳۵۵ تا ۳۵۸؛ G. Gabrieli : Manuale di bibliografia musulmana (روم ۱۹۱۶ء) اپنی نوع کی منفرد کتاب ھے اور عام کتابیاتی تصانیف کے متعلق اپنی فہرستوں کی وجہ سے بہت ھی قابل قدر ھے (افسوس ھے کہ اس کا صرف پہلا ھی حصہ شائع ھو سکا ھے)؛ Schnurrer اور Zenker کی تصانیف کے لیے دیکھیے شوفن : Bibliographie des ouvrages arabes، دیباچہ، خصوصاً ص xx تا xxx۔ شوفن کی Bibliographie کے غیر مطبوعہ حصوں کے لیے دیکھیے J. Gobeaux - Thoret : Notes from the Liege

Library on Victor Chauvin and on Ibn Butlan، در *Unity and variety in Muslim civilisation*، طبع Grunebaum، ۱۹۵۵ء، ص ۳۶۳-۳۶۴: Schnurrer کا اشاریہ ص cxvii تا *cxli* پر مشتمل ہے۔ براکلمان: *Geschichte der arabischen literatur*، ۲ جلدیں، وائیمر و برلن ۱۸۹۸ء—۱۹۰۲ء، و .Supp، ۳ جلدیں، لائیڈن ۱۹۳۷ء—۱۹۴۲ء: سٹوری: *Persian Literature*، لنڈن ۱۹۲۷ء وما بعد۔

(J. D. PEARSON)

* **کُتامہ:** (یا کُتَیمہ Kotaıma)، بربروں کے عظیم خاندانوں میں سے ایک ۔ جب اسلام شمالی افریقہ میں پہنچا تو اس وقت یہ خاندان موجودہ زمانے کے ضلع قُسَنْطِیْنَہ (Constantine) کے سارے شمالی علاقے پر [قاموس الاعلام]، جو اَوْراس (رکّ بآن) اور سمندر کے درمیان واقع ہے، پھیلا ہوا تھا، یہ دوسرے الفاظ میں اس علاقے پر جس میں اِیْکجَان سطیف، باغایہ، نقاوس، تکسْت، میلہ، قسنطینہ (ابن خَلْدون، ۶ : ۱۴۹)، سکیکدہ (-Philippe ville)، اَلقُل (Collo)، جِجلی [= جیجل] اور بِلّزمہ کے شہروں کے علاوہ الجزائر کا علاقۂ قبائلیہ، یعنی ود (وادی سہل Wed Sahel) اور سِیبن Seban کے درمیان کا علاقہ شامل ہے ۔ ایک افسانے کی رو سے، جس سے ان کے افتخار قومی کو بڑھاوا ملتا ہے، وہ ان حِمْیَریوں کی اولاد ہیں جنھیں افْرِیقُوس یہاں لایا تھا ۔ کُتامہ، جس کے نام سے یہ قبیلہ موسوم ہوا، برنِس کا بیٹا بیان کیا جاتا ہے ۔ اس کے دو بیٹے تھے، غرسین اور اِسْودہ؛ کتامہ کے تمام قبائل انھیں کی اولاد سے ہیں (معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان خانہ جنگیوں اور مذہبی لڑائیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا جو عُقْبہ کے زمانے سے لے کر بنو اَغْلَب کے عہد تک شمالی افریقہ کو ویران کرتی رہیں ۔ ان کے خوارج میں شامل ہونے کا کسی نے ذکر نہیں کیا ۔ جب عُبَید اللہ نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کیا تو اس کے داعیوں کی کتامہ کے بعض حاجیوں سے عرب میں ملاقات ہوئی ۔ ان داعیوں نے انھیں اسمٰعیلی عقائد کا معتقد بنا لیا ۔ اسمٰعیلی مذہب قبول کرنے والے ان نئے لوگوں میں سب سے ممتاز شخص جمیلہ کی شاخ سَکْیَان کا رئیس موسٰی تھا، جس کا نام ایک قصبے کے نام میں آج تک باقی ہے ۔ ابو عبد اللہ الشّیعی [رکّ بآن] نامی داعی نے ایکجان میں سکونت اختیار کر لی اور بنو اغلب کی انسدادی کوششوں کے باوجود اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہا ۔ یہاں سے اس نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے اور المہدی کو، جو سجِلْماسہ میں مقید تھا، چھڑانے میں کامیابی حاصل کی ۔ اس کے بعد بنو کتامہ کی اعانت سے فاطمی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی ۔ یہی لوگ اس سلطنت کی سب سے بڑی طاقت تھے اور مصر فتح کرنے کے وسائل بھی انھیں کی بدولت مہیّا ہوے؛ لیکن اس مسلسل جدوجہد نے انھیں مضمحل کر دیا ۔ جیسا کہ ابن خَلْدون نے لکھا ہے، جو لوگ المعزّ کے مصر چلے جانے کے بعد المغرب میں باقی رہ گئے تھے انھیں مقامی حکمرانوں کی اطاعت تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا ۔ ہمارے زمانے میں کتامہ کے بڑے نمائندے جُرجرہ کے زواوۃ اور وہ لوگ ہیں جو جیجل اور قبائلیہ خرد کے گرد و نواح میں آباد ہیں ۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان کے اسمٰعیلی عقائد کب محو ہوے، لیکن اس مذہب سے منسلک ہونے کے بہت عرصے بعد تک انھیں مورد ملامت سمجھا جاتا رہا اور یہی وجہ تھی کہ سِدویکش کے طاقتور قبیلے نے، جو کتامہ کی نسل سے تھا، اس خاندان سے اپنے آپ کو بالکل علٰحدہ کر لیا ۔ آج کل اس خطّے کے تمام بربر سنّی المذہب ہیں ۔

مآخذ: (۱) ابن خلدون: کتاب العبر، ۶: ۳۲ ببعد و ۶: ۱۳۸ تا ۱۵۲؛ (۲) *Hist. des Berbères*، مترجمهٔ de Slanes، ۱: ۲۹۱ تا ۲۹۹ و ۲: ۱۰ ببعد؛ (۳) Fournel: *Les Berbers*، ۲: ۵۱ ببعد، نیز وہ مصنفین جن کا حوالہ دیا گیا ہے۔

(RENÉ BASSET)

⊗ **کُتُب سَماویه:** رک بہ انجیل؛ تورات؛ زبور؛ صحیفہ؛ قرآن۔

⊗ **الکُتُبی:** رک بہ ابن شاکر الکتبی۔

* **الکتّانی،** محمّد بن جعفر بن ادریس، [۱۲۷۴ـ۱۳۴۵ھ] جس کا تعلق کتانیین کے مشہور گھرانے سے ہے اور وہ نسلاً اشراف میں سے ہے؛ عصر حاضر کا ایک مراکشی ادیب (وہ ۱۳۱۴ھ میں بھی تصنیف و تالیف میں مصروف تھا)؛ بہت سی کتابوں کا مصنف ہے، جن میں سے ایک کتاب اس نے اپنے جد امجد ادریس کے اعزاز و احترام میں لکھی ہے، یعنی الأزهار العاطرة الأنفاس فاس ۱۳۱۴ھ۔ اس کی اہم ترین تصنیف سلوة الأنفاس و محادثة الاکیاس بمن اقبر من العلماء و الصلحاء بفاس (۳ جلدیں، فاس ۱۳۱۶/۱۸۹۸ـ۱۸۹۹ء) ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ ان فوائد کے بیان کے لیے مخصوص ہے جو زاویوں میں اور اولیاے کرام کے مقبروں پر حاضر ہونے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے محلّہ وار ان مشہور و معروف ہستیوں کا ذکر کیا ہے جو فاس میں رہتے تھے یا وہاں دفن ہوے، کتاب کے اس حصے میں شہر کے تاریخی مقامی جغرافیے سے متعلق بڑی قیمتی معلومات موجود ہیں۔ اس نے متعدد کتابوں سے استفادہ کیا ہے، جن کی ایک فہرست اس کتاب کی تیسری جلد کے آخر میں درج ہے۔ [اس کی تصنیف الرسالة المستطرفة بھی قابل ذکر ہے۔ اس خاندان میں بہت سے اہل علم اور صاحب تصنیف بزرگ ہوے ہیں دیکھیے الزرکلی: الاعلام، بذیل مادۂ الکتانی و محمد بن جعفر الکتانی مع مآخذ]۔

مآخذ: (۱) R. Basset: *Recherches bibliographiques sur les sources de la Salouat al-Anfās*، الجزائر ۱۹۰۵ء؛ (۲) Codera y Zaidin: *Considerable numero de libros antiquos y modernos existentes in Marruecos, Actes du XIVe Congrés international des Orientalistes (Algiers)*، پیرس ۱۹۰۸ء، ۳/۲: ۵۸۷ تا ۵۹۰۔

(RENE BASSET)

* **کَتْخُدا:** (ف: کدخدا، ''کد'' بمعنی گھر، ''خُدا'' بمعنی مالک، آقا)، دراصل اس کا مطلب تھا مالک خانہ یا بزرگِ خاندان؛ بعد ازاں ایران میں یہ نام دیہات میں مقدم یا سرکاری کارندے کے لیے اور شہروں میں حلقے کے ''صاحب عشر'' (dixenier) ''de quartier''، دیکھیے Chardin: *Voyages*، ۱۸۱۱ء، ۳: ۷۷) کے لیے استعمال ہونے لگا، جو ایک قسم کا عہدیدار پولیس تھا، اور جس کا فرض تھا کہ اپنے حلقے کا معائنہ کرے۔ وہ ''کلانتر'' [رک بآن] کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ جنگ عظیم سے پہلے ایران میں جو انتظامی اصلاحات نافذ کی گئیں ان کا مقصد یہ تھا کہ کتخدا کو قریہ (گاؤں) میں، جو انتظامی اعتبار سے مملکت کی سب سے چھوٹی وحدت ہوتی ہے، عوامی حکومت کا نمائندہ (یعنی میربلدیہ = mayor) بنا دیا جائے۔ بد قسمتی سے یہ عہدیدار، جن کے فرائض پیشتر ازیں محاصل وصول کرنے تک محدود تھے، بڑے بڑے زمینداروں کے سامنے بالکل بے دست و پا تھے (*RMM*، جون ۱۹۱۴ء، ۲۷: ۱۹۴) کیونکہ وہ انھیں کے کارندے ہوتے تھے اور انھیں وہی مقرر کرتے تھے۔ بایں همه بعض ایسے دیہات بھی ہیں جہاں یہ نمائندے

والی صوبہ کی طرف سے مقرر کیے جاتے یا وہاں باشندے ہی خود انھیں منتخب کرتے تھے۔

یہ لفظ عثمانی ترکی زبان میں داخل ہوا ہے، جہاں یہ بگڑ کر کہیا یا کیایا ہو گیا ہے، جس کا مطلب ہے گھر کا داروغہ۔ ''اصناف کیا یا سی'' مزدوروں کی انجمن کے رکن یا صدر کو کہتے ہیں۔ ''کیا کدِن'' محل کی سب سے معزز خاتون، یعنی گھریلو انتظامات اور ملازمین کی مہتمم ہوتی ہے۔ ''کَپو کیایا'' وہ نمائندہ یا گماشتہ ہوتا ہے جو صوبوں کے والیوں کی طرف سے باب عالی میں مقرر کیا جاتا ہے۔ ''دوْلت کیایاسی'' کا نام اس عہدیدار کے لیے استعمال ہوا کرتا تھا جس کے فرائض جدید حکومتوں کے وزیر داخلہ سے ملتے جلتے تھے۔ ''قُل کیایاسی'' ینی چری فوج کا ناظر اور آغا کا نائب اور اس کے ذاتی عملے کا سردار ہوتا تھا، جسے اوجق [= اُوجاق] کے تمام افراد کی منظوری ہی سے برطرف کیا جا سکتا تھا۔ خود اس کا ایک نائب، آغا کے ساتھ رہتا تھا، جو سردار کے احکام قلعوں کے سپہ سالاروں کے پاس پہنچاتا تھا اور ''کیایایری'' یعنی نائب ناظر کہلاتا تھا۔

مآخذ: (۱) Barbier de Meynard: *Dictionnaire turc-français*، ۲: ۶۱۲؛ (۲) G. Demorgny: *Essai sur l' administration de la Perse*، پیرس ۱۹۱۳ء، ص ۵۰، ۵۵.

(Cl. Huart)

* **کِتمان:** رک بہ تَقِیّۃ

* **کَتَنگَہ:** [جمہوریۂ زائر، یعنی سابق] بلجین کانگو کا ایک صوبہ۔

تاریخ و جغرافیہ: کتنگہ [جمہوریۂ زائر کا] انتہائی جنوبی، زرخیز ترین اور بہت کم آباد صوبہ ہے۔ یہ ۵ درجے اور ۱۳ درجے ۳۰ دقیقے عرض بلد جنوبی اور ۲۱ درجے تیس دقیقے اور ۳۰ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں مشرقی صوبہ اور صوبۂ کانگو کسائی واقع ہیں، مشرق میں خلیج تانگا نیکا اسے سابق جرمن مشرقی افریقہ اور شمالی رھوڈیشیا سے جدا کرتی ہے، جنوب میں شمالی رھوڈیشیا اور [جمہوریۂ] انگولا اور مغرب میں انگولا اور صوبۂ کانگو کسائی ہیں۔ صوبۂ کتنگہ کا رقبہ دو لاکھ مربع میل ہے، جو سارے ملک کے چوتھائی کے برابر ہے۔ [۱۹۷۰ء کی مردم شماری کی رو سے صوبے کی آبادی ستائیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے جس میں اکثریت بنتو قبائل کی ہے۔ سفید فام باشندوں میں بلجمی، ولندیزی اور انگریز ہیں۔ بھارتی اور پاکستانی باشندے بھی پائے جاتے ہیں]۔ کتنگہ کا صوبہ چار اضلاع: بالائی لواپولا، لومامی، لولوا اور تانگا نیکا موئیرو پر مشتمل ہے۔ معاشی آسودگی کی بدولت یہاں بہت سے شہر آباد ہوگئے ہیں، مثلاً الزبتھ ویل Elisabethville، لکاسی Likasi، البرٹ ویل Albertville، کانگولولو Kongolo، کبنڈا Kabinda، سنڈورا Sandora اور کمبووہ Kambove وغیرہ۔

کتنگہ کی آب و ہوا عام طور پر معتدل ہے، بالخصوص دس درجے عرض بلد کے جنوب میں، جہاں سطح سمندر سے بلندی ساڑھے تین ہزار سے ساڑھے پانچ ہزار فٹ کے درمیان ہے۔ اسے لوالبہ Lualaba (دریاے کانگو کی بالائی شاخ) جیسی عظیم الشان ندیاں سیراب کرتی ہیں۔ یہ دریا اور ندیاں جنوب سے شمال کو بہتی ہیں۔ ان میں بہت سی معاون ندیاں بھی آ کر مل جاتی ہیں، جن کا منبع خلیج تانگا نیکا ہے۔ کتنگہ کی سرزمین جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ یہ دوسرے صوبوں کی طرح زرخیز نہیں اور نہ سیاحوں کے لیے ہی فرحت بخش ہے، البتہ یہ معدنیات کی بے اندازہ دولت سے مالا مال ہے۔ بلجیم سے آمدہ آباد کاروں

کی معاشی حکمت عملی کا رخ بھی معدنیات سے استفادے کی طرف رہا ھے ۔

ٹیـن کے بکثرت ذخائر لوالبہ اور خلیج تانگا نیکا کے درمیانی علاقے میں پائے جاتے ھیں ۔ البرٹ ویل اور لیونہ Leuna میں دو اہم کانوں سے کوئلا نکالا جا رہا ھے ۔ بعض مقامات سے سونے، لوھے اور ھیروں کے ذخیرے بھی ملے ھیں ۔ ۱۹۲۲ء میں انجمن کان کنی (Mining Union) کو شیوکولوبیوہ Shiukolobiwe میں یورینیم کے قیمتی ذخائر بھی ملے تھے ۔ حکومت بلجیم کتنگہ سے یورینیم درآمد کرکے ریڈیم بناتی رھی ھے ۔

کتنگہ کی ثروت کا اصل وسیلہ تانبے کی کانیں ھیں ۔ یہاں یہ دھات وافر مقدار میں پائی جاتی ھے ۔ اھل بلجیم کی آمد سے قبل ھیٔ ملکی باشندے ان سے تانبا نکالتے رھے ھیں ۔ کچا تانبا کثرت سے چودہ درجے کی گہرائی تک پایا جاتا ھے اور ھر سال لاکھوں ٹن برآمد کیا جاتا ھے ۔ برقی قوت کے استعمال سے معدنی صنعت نے بے حد فروغ پایا ھے ۔

انیسویں صدی کے وسط تک اھلِ یورپ اس سرزمین سے قطعاً نا آشنا تھے ۔ جب ۱۸۷۷ء میں مشہور سیاح سٹینلے Stanley دریائے کانگو کے دہانے تک جا پہنچا تو بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ ثانی کو اس علاقے کی اھمیت اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لا محدود امکانات کا احساس ہوا ۔ "کانگو فری سٹیٹ" کا قیام عمل میں آیا اور برلن کانفرنس (۱۸۸۴-۱۸۸۵ء) میں لیوپولڈ کو اس کا سربراہ تسلیم کر لیا گیا ۔ ۲۸ نومبر ۱۹۰۷ء کے معاھدے کی رو سے اس ریاست کا بلجیم کے ساتھ با ضابطہ الحاق کر لیا گیا ۔

[بالآخر کانگو ۳۰ جون ۱۹۶۰ء کو آزاد ہوگیا اور آزادی کے بعد ملک کا نام جمہوریۂ کانگو قرار پایا ۔ ملک کی آزادی کے بعد اباکو پارٹی کے صدر جوزف کاساووبو Goseph Kasavubs اور کانگو کی قومی تحریک آزادی کے قائد پیٹرک لوممبا Patrice Lumumba علی الترتیب صدر اور وزیر اعظم منتخب ہوئے، لیکن ملک میں سیاسی استحکام نہ پیدا ہو سکا ۔ قبائلی اور علاقائی عصبیتیں ابھرنے لگیں، جن کے نتیجے میں کتنگہ وزیر اعظم شومبے کی سرکردگی میں ملک سے علٰحدہ ہوگیا ۔ جولائی ۱۹۶۰ء میں جمہوریہ کی فوجوں نے بغاوت کر کے تمام بلجمی افسروں کو ملک سے باھر نکال دیا ۔ لوممبا نے اقوام متحدہ اور روس سے امداد کی درخواست کی ۔ اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری نے بیس ہزار سپاھیوں پر مشتمل فوج روانہ کی ۔ فروری ۱۹۶۱ء میں کتنگہ کے قبائل نے لوممبا کو اغوا کر کے قتل کر دیا ۔ ستمبر ۱۹۶۱ء میں اقوام متحدہ کی افواج نے کتنگہ پر حملہ کر کے جنوری ۱۹۶۳ء تک کتنگہ کے تمام مرکزی شہروں پر قبضہ کر لیا ۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں صدر کاساووبو نے وزیر اعظم شومبے کو برخاست کردیا ۔ اس کے بعد کمانڈر انچیف جوزف مابوٹو Goseph Mabuto نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ملک کا انتظام و انصرام خود سنبھال لیا ۔ جون ۱۹۶۷ء میں ملک میں استصواب عام کی رو سے ایک نیا دستور وضع کیا گیا، جس کے نتیجے میں ملک میں صدارتی طرز کی جمہوریہ قائم کر دی گئی اور کتنگہ اس کا ایک صوبہ قرار پایا ۔ ۱۹۷۱ء میں ملک کا نام جمہوریۂ زائرے Zaire رکھا گیا ۔ ۱۹۷۰ء کی مردم شماری کی رو سے کتنگہ کی آبادی ستائیس لاکھ نفوس پر مشتمل ھے ۔ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں کتنگہ نے صنعتی اعتبار سے خاصی ترقی کی ھے ۔ تانبے اور ھیرے کی کانیں حکومت نے ۱۹۶۷ء سے قومی تحویل میں لے لی ھیں ۔ ان سے ملک کو کثیر زر مبادلہ حاصل ہوتا ھے ۔ لوبمباشی Lubumbashi (سابق الزبتھ ویل) میں ایک

یونیورسٹی بھی قائم ہے]۔

مسلمانوں کی آمد : تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہجرت سے پیشتر ھی بحیرۂ قلزم اور خلیج فارس کا درمیانی سمندر عربوں کے جہازوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا ۔ اسلامی فتوحات کے بعد جب صحابۂ کرامؓ اور عام مسلمان جوق در جوق شمالی افریقہ میں چلے آئے تو عربوں کو بحر ھند کے اردگرد کے ممالک کی باقاعدہ تسخیر کرنے اور وھاں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنے کا خیال دامن گیر ھوا ۔ ان میں سوفالہ اور زنجبار ایسی بڑی سلطنتیں بھی تھیں جن پر عروج و اقتدار کے مختلف ادوار گزرے ھیں ۔

یہ سیاسی اقتدار جلد ھی مائل بہ تنزل ھوگیا اور اس کی جگہ تاجروں اور پیداواری وسائل سے منفعت اٹھانے والوں نے لے لی ۔ بقول Privelle یہ تاجر اور نفع خور اپنے استحصال کے لیے معاشرے کی عام اور طبعی حالت کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

اسی زمانے میں عرب سردار مشرقی افریقہ کے اندرونی حصے میں راہ پانے لگے ۔ ملکی باشندے ان کی مزاحمت نہ کر سکے ۔ اندرون ملک ان سرداروں کو ھاتھی دانت کے بیش بہا ذخیرے اور غلاموں کی بڑی تعداد ملی، جنھیں وہ مسلمان تاجروں اور امریکی آبادکاروں کے ھاتھ سہنگے داموں فروخت کر دیا کرتے تھے۔

زنجبار اور ساحل موزمبیق سے نکل کر مسلم آباد کار انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں خلیج تانگا نیکا تک پہنچ گئے ۔ وہ خلیج متوآ M'Toa سے ھوتے ھوے کتنگہ تک پھیل گئے اور سڑک کے راستے مشرقی صوبے میں کابمبیر Kabambare اور کاسونگو Kasongo تک جا پہنچے ۔ ایک سردار ٹپوٹپ Tippo-Tip اور اس کے بھتیجے رشید کی سرکردگی میں تانگانیکا کے کناروں سے سٹینلے ویل Stanleyville تک ایک عرب ریاست قائم ھو گئی۔

عربوں کی یلغار (جس کی تفصیلات سٹینلے اور لِونگ سٹون Livingstone نے اپنے سفرناموں میں بیان کی ھیں)، ان کی مفروضہ زیادتیوں اور ملکی باشندوں کے معاشرے کے تنزل اور مسلسل جنگوں کے باعث ان کی اندرون ملک نقل مکانی کی بنا پر یورپ میں زبردست رد عمل ھوا ۔ Cardinal de Lavigerie نے عربوں کے خلاف جنگ کی تبلیغ شروع کر دی ۔ لیوپولڈ ثانی کی درخواست پر یورپ کی ”مہذب قوموں“ کا اجتماع ۱۸۸۹ء میں غلامی کی روک تھام کے لیے ھوا اور (اس کے بہانے) رشید، سیفو اور کمالیزا وغیرہ عرب سرداروں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا ۔ Dhanis نے کانگو کے جنوب میں اور کماندار جیکوئٹ Jacques اور اس کے نائبوں نے خلیج تانگا نیکا، البرٹ ویل اور مپالا وغیرہ مقامات پر عربوں کے خلاف گھمسان کی جنگیں لڑیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ یہ علاقے ھمیشہ کے لیے عربوں کے اقتدار سے آزاد ھو گئے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کی تبلیغی کوششوں کا کتنگہ کے بنتو قبائل پر کیا اثر پڑا ؟ خلیج تانگا نیکا سے لے کر آبشار سٹینلے تک آج بھی زنگی ملتے ھیں، جو اسلام کے حلقہ بگوش ھیں اور انھیں ونگوانہ عرب کہتے ھیں ۔ ھم وثوق سے کہہ سکتے ھیں کہ عرب ھمیشہ سے تبلیغ اسلام کے لیے کوشاں رہے ھیں اور یہ بھی یقینی ہے کہ اسلام [اپنی تعلیمات کی بنا پر اور غلامی کی مخالفت کے باعث ھمیشہ سے] افریقہ کے ملکی باشندوں کے لیے کشش کا باعث رھا ہے۔

مشرقی صوبے میں یہ اثر نمایاں ہے، لیکن کتنگہ میں خلیج تانگانیکا کے کنارے اور قدیم عرب شاھراھوں پر بھی زنگی ملتے ھیں، جنھوں نے عربوں کے طور طریقے اپنا لیے ھیں ۔ ان کی دینی تعلیم اگرچہ ابتدائی درجے تک محدود ہے، لیکن

دوسرے زنگیوں پر اپنی برتری کا نقش قائم کرنے کے لیے یہ مسلم زنگی سفید لباس پہنتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور رمضان میں روزے بھی رکھتے ہیں - زنگی مشرف باسلام ہو کر غیر مسلموں اور ان کے اقتدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دیگر مسلمان بھی ان جذبات کی پرورش میں لگے رہتے ہیں .

کتنکہ کے مسلم زنگیوں کے ساتھ عرب بھی آباد ہیں، جن میں ہندوستانی [اور پاکستانی] مسلمان بھی آ ملے ہیں - ان کی بڑی بڑی دکانیں ہیں اور وہ آسودہ حال ہو گئے ہیں .

[۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رو سے کتنکہ میں عربوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہے اور ان کی سیاسی اہمیت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا] -

مآخذ : (۱) *Travaux du groupe d'etudes des coloniales, Le Katanga*؛ (۲) A de Bauw : *Le Katanga*، برسلز ۱۹۲۰ء؛ (۳) O Meynier : *L' Afrique noire*، پیرس ۱۹۱۳ء؛ (۴) A de Préville: *Les Sociétés africaines*، پیرس ۱۸۹۴ء؛ (۵) P. Daye: *L' empire colonial belge*، ۱۹۲۳ء؛ (۶) E. Van der Straeten : *l'Afrique Orientale*، در *Bulletin de la Société belge d'études coloniales*، ۱۹۲۴ء؛ (۷) Sidney Langford-Hinde: *La chute de la domination des Arabes du Congo*، در *Publications de la Societe belge d' études Coloniales*، بلجیمی کانگو کا دستور العمل، مطبوعۂ امارت بحریہ، لنڈن ۱۹۱۹ء؛ [(۸) *Statesman's year Book* ۱۹۷۴/۱۹۷۵ء] .

(E. VAN DER STRAETEN [و ادارہ])

* **کُتَی :** (Kutai)، مشرقی بورنیو Borneo کی ایک خود مختار ریاست، جو [ولندیزی عہد حکومت میں] بورنیوریزیڈنسی (Zuider-en Oosterafdeeling van Borneo) کی قسمت سمارندہ Samarinde میں شامل تھی؛ [آج کل انڈونیشیا کے صوبۂ مشرقی کالی منتان کا ضلع، جو] زیادہ تر دریاے مَہکَم Mahakam کی وادی پر مشتمل اور مورہ مجب Muara Mujub تک پھیلا ہوا ہے - یہ ایک بہت اہم دریا ہے اور اس کا بڑا حصہ جہاز رانی کے قابل ہے - مَکَسر سے آنے والی سڑک اس کی مشرقی سرحد معیّن کرتی ہے - ولندیزی نائب ریزیڈنٹ مَہکَم کے کنارے سمارندہ میں رہتا تھا۔ سلطان کا دارالحکومت، تنگّرنگ Tenggarung، دریا کے بالائی جانب ذرا فاصلے پر واقع تھا۔ ملک خوشحال ہے، یہاں کی زمین میں عمدہ قسم کا کوئلا اور پٹرولیم کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے - اگر حالات حسب معمول ہوں تو جنگل کی پیداوار اور خشک اور نمکین مچھلی کی تجارت زوروں پر ہوتی ہے - بعض لوگوں نے یہ راے ظاہر کی ہے کہ اس سلطنت کا نام مشتق ہے یَوَہ کوٹی سے (سنسکرت : کوٹی = الجام، نقطہ)، جو ہندوستان کی کتب جغرافیہ میں مذکور ہے - یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ پانچویں صدی عیسوی سے قبل یہاں ہندووں نے جاوا کے راستے سے نہیں بلکہ براہ راست ایک نو آبادی قائم کر لی تھی - کسی زمانے میں یہاں مُولَوَرمَن نامی ایک راجا کے ماتحت ہندووں کی ایک خوشحال سلطنت موجود تھی - اس کا ثبوت پتھر کی چار اہدائی (dedicative) لاٹھوں پر خالص سنسکرت میں لکھے ہوے کتبوں سے ملتا ہے، جو کُتَی میں دستیاب ہوئی ہیں - ممکن ہے دیگر قدیم نوادر، بالخصوص کوہ کومبنگ Kombeng کے ایک غار سے دستیاب ہونے والے برہمنی دیوتاؤں کے بتوں کا تعلق بھی اسی سلطنت سے ہو - بورنیو میں زمانۂ مابعد کی جس ہندو تہذیب کے آثار نظر آتے ہیں وہ در حقیقت جاوا سے یہاں آئی تھی - چودھویں صدی عیسوی میں کُتَی مجاپائت کی جاوی سلطنت کے علاقوں میں شامل تھا - ریاست کُتَی کی ابتدا

اور اس کے حکمران خاندان کے سلسلۂ نسب کے بارے میں ایک مقامی روایت کا پتا ایک ملائی مسودے سے چلتا ہے، جو سلطان تنگّرنگ کے قبضے میں تھا (اس کی ایک اور نقل برلن میں موجود ہے)۔ اس سلسلۂ نسب (''سَلْسِلہ'') کی رو سے، جس کا پہلا حصہ بہت حد تک اساطیری ہے اور ولندیزی ترجمے کے ساتھ چھپ چکا ہے، یہاں اسلام ۱۶۰۰ء کے لگ بھگ، راجا مکوئتہ Mokoeta کے عہد میں، سلاویسی (Celebes) سے پہنچا تھا .

یہاں کی آبادی بہت مخلوط نوعیت کی ہے - ملک کے اصل باشندے دیاک Dayakes ہیں، جو ابھی تک زیادہ تر اصنام پرست ہیں - اب فی‌الواقع مَہکم کے کنارے ان کی کوئی بستی باقی نہیں رہی - دوسرے لوگ جو یہاں آباد ہو رہے ہیں، وہ انھیں روز بروز تیزی سے اندرونی علاقوں کی طرف ڈھکیلتے جا رہے ہیں - بیان کیا جاتا ہے کہ تُنْجنگ دیاکوں کے سردار کُتی کے حکمران خاندان کے رشتے دار ہیں - مذکورۂ بالا "سَلْسِلہ" کی رو سے تُنْجنگ کے شہزادے کرن (Kerna) نے ۱۳۵۰ء کے قریب اس وقت کے حکمران راجا پتیری Poteri کی ایک بہن سے شادی کی تھی - دور افتادہ اندرونی علاقوں میں ابھی تک چند خانہ بدوش قبائل ملتے ہیں - یہاں کی دوسری قومیں کُتَیْنی، بُگنی، بنجری اور بجَوْ، سب مسلمان ہیں - کُتَیْنی، جن پر یہاں کی آبادی کا زیادہ تر حصہ مشتمل ہے، غالبًا قدیم مختلف‌النسل ملائی نو آبادکاروں کی اولاد ہیں - یہ لوگ سارے ملک میں پائے جاتے ہیں- بگنی کی نوآبادیوں کے آغاز کا پتا بھی ہمیں ایک مقامی روایت سے چلتا ہے، جو ایک کتاب *Salasila Bugis* میں محفوظ ہے - یہ لوگ غالبًا ۱۶۸۶ء کے آغاز میں یہاں آباد ہونا شروع ہوے تھے اور وجو Wadjo سے آئے تھے- ان کے آنے کا سلسلہ اب تک جاری ہے - شروع شروع میں بُگنی تمام تر سَمارندہ میں رہتے تھے اور وہاں کی آبادی میں ان کی خاصی معقول تعداد تھی - یہ لوگ عملی طورپر سلطان کُتی کی حکومت سے آزاد تھے اور ان پر ان کا اپنا سردار (پُؤا اَدو) حکومت کرتا تھا، جسے مختلف خاندانوں اور گھرانوں کے بزرگ منتخب کرتے تھے- [آگے چل کر] کُتی میں یہ بُگنی جمہوریہ باقی نہیں رہی اور بُگنی بھی یہاں کے دوسرے باشندوں ھی کی طرح سلطان کے ماتحت آ گئے - وہ سارے ملک میں آباد ہو چکے ہیں اور زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں - بَنْجری آباد کار بھی، جو بورنیو کے جنوب سے آئے ہیں، روز بروز بڑھ رہے ہیں - ان کا بڑا پیشہ جنگل کی پیداواروں کا جمع کرنا ہے - بَجَوْ جزائر سُلُو سے آئے تھے - پہلے یہ لوگ بحری قزاق تھے، لیکن اب وہ مَہکم کے دہانے پر مستقلاً آباد ہو گئے ہیں اور ماہی گیری پر گزر اوقات کرتے ہیں - آبادی کے مختلف النسل ہونے کا اثر زبان پر بھی نمایاں ہے، جو ملائی کی ایک مبدّل شکل ہے اس پر ابھی تحقیق ہونا باقی ہے، البتہ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جاوی زبان کے الفاظ بڑی تعداد میں شامل ہیں - کُتی کو ولندیزیوں سے پہلی بار سابقہ ۱۶۳۵ء میں پڑا، جب ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہاں کے حکمران سے پہلا معاہدہ ہوا - ۱۸۲۵ء اور ۱۸۴۴ء کے معاهدوں کی رو سے سلطان نے ولندیزی سیادت تسلیم کرلی - یہ بھی طے پایا کہ سلطان چار سربرآوردہ اشخاص کی اعانت سے حکومت کرے گا، دیاک اپنے اپنے حکمرانوں کے ماتحت رہیں گے اور جن حکمرانوں کا عہدہ موروثی ہوگا سلطان اس کی توثیق کرے گا .

مآخذ : (۱) J. H. Moore : *Notices of the Indian archipelago and adjacent conntries*، سنگاپور ۱۸۳۷ء؛ (۲) A. L. Weddik : *Overzigt van hetrijk van Koetei*، در *Indisch Archief*، ۱۸۴۹ء، ج ۱؛ (۳)

John Dalton en zijne xx: *berigten over Koeti en* *Tijdschrift voor Neder-* در *،den majoor Müller* J.G.A. (۳) :۲۷۳ : ۱۸ ،۱۸۵۶ء *،landsch Indië* *Korte aanteekeningen, gehouden* : Gallois *،gedurende eene reis langs de Oostkust van Borneo* : J. Zwager (۵) : ۲۲ : ۳ ،۱۸۵۹ء *،BTLV* در *Het rijk van Koetei op de Oostkust van Borneo, in* *Tijdschrift voor Nederlandsch* در *،het jaar 1853* :P. J. Veth (۶) :۲۳۱ :۳ ،۱۸۶۶ء، سلسلۂ جدید، *،Indië* *Tidjschrift voor* در *،Het Koeteische vorstenhuis* ؛ ۳۵۳ : ۳ ،۱۸۷۰ء، سلسلۂ سوم، *،Nederlandsch Indië* *Verslag van het verhandelde tot regeling der* (۷) *betrekkingen tusschen de Maleische en Boeginees-che nederzettingen aan de Koetei-rivier onder den vorigen Sultan van Koeti, vertaald uit het oorspr-* : ۲۳ ،۱۸۷۷ء *،TBGKW* در *،onkelijke Maleische* *Reis in Oost-en Zuid-Borneo* : Carl Bock (۸) :۲ ۱۲ *،'s-Gravenhage* *،von Koetei naar Banjarmassin* *Over de Opsch-* :H. Kern (۹) :۲ جلد ،۱۸۸۲-۱۸۸۱ء *riften uit Koetei in Verband met de geschiedenis* *Versp-* در *،van het schrift in den Indischen Archipel* J. van (۱۰) :۵۵ : ۷ ،۱۹۱۷ء *،rede Geschriften* *Exploitatie door Nederlanders van* : Nieuwkuyke *Tijdschrift voor* در *،de Noordoost-kust van Borneo* :۳۰۱ : ۱۱ ،۱۸۸۲ء، سلسلۂ جدید، *Nederlandsch Indië* *Eenige mededeelingen omtrent* : S.W. Tromp (۱۱) :۳۶ ،۱۸۸۷ء *،BTLV* در *،de Boegineezen van Koetei* ۱۶۷ ؛ (۱۲) وہی مصنف : *،Uit de Salasila van Koetei* C. Snouck (۱۳) : ۱ : ۳۷ ،۱۸۸۸ء *،BTLV* در *،Nog iets over de Salasila van Koetei* : Hurgronje *Gesammelte* در (منقول در ۱۰۹ در مجلۂ مذکور، ص : S. W. Tromp (۱۴) : (۱۳۵ : ۵ ،۱۹۲۵ء *،Schriften* در *،Een reis naar de bovenlanden van Koetei* : وہی مصنف (۱۵) : ۲۷۳ : ۳۲ ،۱۸۸۹ء *،TBGKW* *Tijdschrift van het* در *،Mededeelingen uit Borneo* ،۱۸۹۰ء *،Kon. Ned. Aardrijkskundig Genootschap* *Quer* : A. W. Nieuwenhuis (۱۶) ،۲۷۸ :۷ ،۲ سلسلہ (۱۷) :۲ جلد ،۱۹۰۷ و ۱۹۰۴ء لائیڈن *،durch Borneo* *Beschrijving van de onderafdeel-* : S. C. Knappert (۱۸) : ۵۷۵ : ۵۸ ،۱۹۰۵ء *،BTLV* در *،ing Koetei* *Een bezoek aan eenige oudheden* : H. Witkamp *Tijdschrift van het Kon. Ned. Aardrij-* در *،in Koetei* ؛۵۸۷ : ۳۱ ،۲ سلسلہ ،۱۹۱۴ء *،kskundig Genootschap* *Reischerinneringen uit* : M. L. R. Rutten (۱۹) *،Noord-Koetei, bewesten de Sangkoelirangbaai* *Encyc-* (۲۰) ؛ ۱۱۷ : ۳۳ ،۱۹۱۷ء، در مجلۂ مذکور *،lopaedie van Nederlandsch Indië* ،بار دوم J. Ph. (۲۱) :Koetei بذیل مادۂ ،۳۷۳ : ۲ ،۱۹۱۸ء *The Yupa inscriptions of King Mulavarman,* :Vogel ،۱۹۱۸ء *،BTLV* در *،from Koetei (East Broneo)* ۱۶۷ : ۷۴.

(W. H. Rassers)

* **کٹک** : (Cuttack)، ایک ضلع، جو بھارت کے صوبۂ اڑیسہ [رک بان] میں واقع ہے۔

* **کَتای** : (خِطای)، رک بہ الصین.

* **کُثَیِّر عَزّہ** : ابو صَخر کثیر بن عبدالرحمٰن الخزاعی، جسے اس کے نانا کی طرف منسوب کر کے ابن ابی جُمعۃ بھی کہتے ہیں، عہد بنی امیہ کے بڑے نام آور شعراء میں سے ہے ۔ اس کی محبوبہ عَزّۃ کی وجہ سے، جس کی مدح و ثنا میں اس نے بہت کچھ لکھا ہے، اسے کُثَیِّر عَزّۃ کہتے تھے ۔

اس کی مستقل سکونت تو مدینے ہی میں تھی لیکن ویسے وہ حجاز کے اور مقامات میں بھی رہتا رہا تھا ۔ اس کا شمار خزاعہ میں ہے، لیکن اسے

اپنا تعلق الصَلْت بن النَضر بن کِنانَہ سے جوڑنے کا شوق تھا ۔ یہ، بقول الیعقوبی، ایک گروہ تھا، جو خزاعہ میں شامل ہوگیا تھا ۔ کچھ لوگ اس وجہ سے اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ پھر اس کا کریہ المنظر ٹھنگنا ڈیل ڈول بھی کچھ ایسا تھا کہ دیکھتے ہی ھنسی آتی تھی ۔ کہتے ھیں کہ اس کی حماقت اور غباوت کی وجہ سے بھی لوگ اسے خواہ مخواہ چھیڑا کرتے تھے۔

عقائد کے لحاظ سے وہ غالی شیعہ تھا اور اپنے شاعر دوست خِنِدف (الاسدی) کے زیر اثر وہ غیبۃ (رک بآں) کے بعد دوبارہ دنیا میں لوٹ آنے (رَجعۃ، رک بآں) اور تناسخ کا بھی قائل تھا ۔

بایں ہمہ کُثیر کے یہ اعتقادات اس بات سے مانع نہیں ہوے کہ وہ بنو مروان کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھے ۔ خلیفہ عبدالملک اس کے اشعار کی بہت قدر کرتا تھا، چنانچہ اس نے کئی بار کُثیّر کو وافر انعام دیے ۔ اس خلیفہ کی وفات کے بعد کُثیّر نے اس کا خاص طور پر مرثیہ لکھا ۔ ایک مدت انتظار کرنے کے بعد جب شاعروں کو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (عمر ثانیؒ) کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت ملی تو ان کے ساتھ کُثیّر بھی باریاب ہوا اور اس نے انھیں نہایت برمحل اشعار سنا کر داد و تحسین وصول کی ۔ کُثیّر کو بنو مہلب کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔

کُثیّر کا عَزّۃ کے ساتھ، جس کا ذکر وہ اپنے بہت سے اشعار میں کرتا ھے، کیا علاقہ تھا ؟ اس کی بابت بہت سی متضاد حکایات موجود ھیں ۔ ناقدین ادب وثوق کے ساتھ کہتے ھیں کہ جمیل [رک بآں] کے عشق کے مقابلے میں اگر دیکھا جائے تو کُثیّر کا عشق حقیقی نہیں، بلکہ مجازی تھا ۔ کُثیّر جمیل کے اشعار کی روایت کرنے والا (راوِیۃ) تھا ۔ وہ جمیل کو سب شعرا سے افضل مانتا تھا اور اس کی کی تقلید کیا کرتا تھا ۔ خود کُثیّر کا راوِیۃ سائب ابن ذَکوان تھا (مثلاً دیکھیے الاغانی، ۱۱ : ۱۸ س ۳ و ۱۱؛ ۱۳ : ۱۵۵ س ۵؛ نیز دیکھیے ۱۱ : ۵۰ حصۂ زیریں : السائب بن الحکیم السدوسی).

کُثیّر نے بعہد یزید ثانی ۱۰۵ھ/۷۲۳ء میں وفات پائی ۔ اکثر مصنفین نے لکھا ھے کہ اسی روز مشہور عالم دین عِکرِمہ کی وفات ہوئی تھی (دیکھیے ابن حجر : تہذیب التہذیب، حیدر آباد ۱۳۲۵ - ۱۳۲۷ھ، ۷ : ۲۷۱) ۔ دوسری صدی ھجری / آٹھویں صدی عیسوی کے بعض فضلا کی رائے میں کُثیّر زمانۂ اسلام کا سب سے بڑا شاعر ھے ۔ ابن سَلّام الجُمَحی رقم طراز ھے کہ اھل حجاز کُثیّر کو سب سے بڑا شاعر مانتے ھیں، لیکن اھل عراق اس کے اتنے قائل نہیں ۔ بعض کہتے ھیں کہ اس کا کمال مدیح میں ظاھر ہوتا ھے اور بعض کہتے ھیں کہ قصیدے کی نسیب میں اس کا جوھر کھلتا ھے؛ تاھم بیشتر نقاد نسیب کے میدان میں جمیل کو متقدم مانتے ھیں (الموازنۃ، ص ۴ ببعد) ۔ کُثیّر کی بہت سی نظمیں موسیقی میں ڈھالی اور گائی گئی ھیں۔

کُثیّر کی بابت معلومات الزُبیر بن بَکّار اور اسحٰق بن ابراھیم الموصِلی نے جمع کی ھیں (اخبار کُثیّر، ابن الندیم : الفہرست، ص ۱۱۱ س ۱۰، ص ۱۴۲ س ۲۰) ۔ ایک اور تالیف کتاب کُثیّر و عزہ بھی متداول تھی (الفہرست ص ۳۰۶ س ۱۱) ۔ دیوان کُثیّر کا ذکر القالی نے کیا ھے کہ کامل دو جزء میں تھا اور ابن دُرَید سے اس نے پڑھا تھا (ابن خیر : فہرست، ج ۱ [Bibl Arabico Hispana، ج ۹]، ص ۳۹۶ س ۴) ۔ اس کا ذکر حاجی خلیفہ : کشف الظنون (طبع Flugel، ۳ : ۳۰۳، عدد ۵۶۳۰) میں بھی موجود ھے، مگر اس وقت یہ مخطوطے

نا پید ھیں - مخطوطۂ اسکوریال، عدد ۹۰۴ (H. Derenbourg : Les manuscrits arabes de l' Escurial، پیرس ۱۸۸۴ء، ۱ : ۲۷۳) میں دیوان موجود نہیں ہے بلکہ اس میں فقط ایک قصیدہ ہے (دیکھیے P. Schwarz : *Escorial studien Zur Arab. litratur-und Sprachkunde*، Stuttgart، ۱۹۲۲ء ۱:۱تا ۷۱)، چند قلمی قصیدے برلن میں موجود ھیں (Ahlwardt : *Verzeichn*، عدد ۷۵۲۴، ۲ : ۸۲۵۵، ۴، ۱۷۸۴، ۶) دیوان مع شرح عربی طبع H. Peres، ۱ و ۲ (الجزائر-پیرس ۱۹۲۸ و ۱۹۳۰ء (Bibl. Arabe) مجموعۂ مقطوعات).

مآخذ : (۱) ابن سلّام الجُمَحی : طبقات الشعراء، طبع Hell، ص ۱۲۱، س ۸ ببعد، ۱۲۲ - ۱۲۵؛ (۲) ابن قتیبہ : الشعر و الشعراء، طبع ڈخویہ : ص ۳۱۶ تا ۳۲۹، دیکھیے ص ۱۸، س ۸ ببعد، ص ۵۹ س ۱۱ ببعد، ص ۶۲، س ۹ ببعد، ۲۶۱ تا ۲۶۳ : (۳) المبرد : الکامل، طبع Wright، ص ۳۲۰ ببعد، ۴۱۶ س ۹، ۴۹۷، ص ۹ ببعد، ص ۵۵۴، س ۶ ببعد: (۴) القالی : الامالی، قاھرہ ۱۳۴۴ھ، ۱: ۴۶ ببعد، ۶۵ ببعد، ۱۷۸، ۲: ۵، ۵۶، ۶۲ تا ۶۴، ۱۰۷ تا ۱۱۰، ۱۲۹؛ ۳ : ۶۷، ۱۱۹ ببعد، ۲۲۰ ببعد: (۴ الف) الاغانی، ۸ (بولاق) : ۲۷ تا ۴۴ :۱۱(بولاق) : ۴۶ تا ۵۲ و مواضع کثیرہ : (۵) البلاذری : انساب الاشراف، طبع، Ahlwardt، Greifswald، ۱۸۸۳ء، ۱۱: ۲۱۱ ببعد، ۲۳۵، ۲۶۶، س ۱ : (۶) ابن واضح الیعقوبی : تاریخ، طبع Houtsma، ۲ : ۳۶۶؛ (۷) الطبری : تاریخ، طبع ڈخویہ، ۳ : ۲۴۸۴ ببعد: (۸) المسعودی : مروج الذھب، پیرس ۱۸۶۱ - ۱۸۷۷ء، ۵ : ۱۷۶ ببعد، ۱۸۱ ببعد ۴۵۵؛ ۶ : ۲۶۴؛ (۹) وھی مصنف : التنبیه والاشراف، *B.G.A.*، ۸: ۳۱۰؛ (۱۰) ابن خلّکان : وفیات الاعیان، قاھرہ ۱۳۱۰ھ، ۱: ۴۳۳ - ۴۳۵ : (۱۱) یاقوت : معجم البلدان، طبع Wüstenfeld، بمدد اشاریہ؛ (۱۲) عبدالقادر البغدادی : خزانة الادب، بولاق ۱۲۹۹ھ، ۲ : ۳۷۷ تا ۳۸۳؛ (۱۳) جرجی زیدان : تاریخ آداب اللغة العربیه، قاھرہ، ۱۹۲۴ء، ج ۱؛ طبع دوم : ۲۹۱ ببعد، (۱۴) Brockelmann : *G A L.*، ۱ : ۴۸، و [(۱۵) تکملہ، ۱ : ۹۷ تمریب، ۱ : ۱۹۵، ۱۹۶]. (۱۶) المرزبانی : الموشح، ۱۴۳، ۱۵۸ مطبوعۂ قاھرہ؛ (۱۷) وھی مصنف؛ معجم الشعراء، ص ۲۵۰، مطبوعۂ قاھرہ؛ (۱۸) السیوطی : شرح شواھدالمغنی، ص۴۳، مطبوعۂ قاھرہ ؛ (۱۹) طه حسین : حدیث الاربعاء، ۲ :۱۱۶ تا ۱۲۶، قاھرہ].

(C. Van Arendonk)

* **کَچھ :** (بعض اوقات کَچ؛ البلاذری اور الیعقوبی : قصّہ؛ البیرونی: کچ؛ یاقوت، طبع وسٹنفلٹ، ۴ : ۱۲۶ سطر ۱ : **القصّہ**، لیکن ۱ : ۵۰۵، سطر ۲۲، ۴ : ۴۹، سطر ۱۰ : **القص**، انگریزی : "کچھ" Cutch؛ [اس کا چھ ڈیویٹ اور کنجر کوٹ کا علاقہ پاکستان میں شامل ہے] کل رقبہ ۸۴۶۱ مربع میل اور آبادی تقریباً آٹھ لاکھ ہے - اس کے جنوب مغرب میں بُحیرۂ عرب، جنوب میں خلیج کَچھ اور شمال میں صحرائے تھر ہے - نمک کی عظیم دلدلیں جنھیں رن آو کَچھ کہتے ھیں، اسے سندھ کی اصل زمین (پاکستان) اور سوراشٹر (بھارت) سے علٰحدہ کرتی ھیں اور اس طرح یہ قطعۂ زمین ایک قسم کے جزیرے کی صورت اختیار کر لیتا ہے - یہ سارا علاقہ بنجر ہے، جہاں کوئی درخت نظر نہیں آتا ؛ جنوب میں کچھ پہاڑیاں ھیں، جن پر سبزی مائل آتشیں مادّہ ہے جو آتش فشاں پہاڑوں کی آتش فشانی کے زمانے کا لاوا ہے - یہاں زلزلے اکثر آئے ھیں ؛ چنانچہ ۱۸۱۹ء کے زلزلے میں تو سب کچھ تباہ ہو گیا تھا.

لوگوں کا عام مقبول روز گار زراعت ہے، خاص خاص فصلیں بگی گندم، جَو اور کپاس ھیں -

کنو کے علاقے میں رن کے نمک کے ذخیروں میں سے نمک بھی حاصل کیا جاتا ہے اور یہاں کے لوگوں کا اہم روزگار ہے ۔ منڈوی اور کَودلہ یہاں کی دو بڑی بندرگاهیں هیں ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ رن کچھ کسی زمانے میں سمندر هی کا ایک بازو ہو گا اور غالباً یہ وهی جگہ ہے جسے Arrian نے ایک بڑی جھیل کے نام سے تعبیر کیا ہے اور دہانۂ سندھ کے قریب یہاں سے سکندر اعظم بھی گزرا ہے ۔ V. de St. Martin، Watters Sgulien اور V. Smith کا خیال ہے کہ چینی سیاح هوان سانگ نے جس علاقے کو کچ لکھا ہے وہ بھی علاقہ ہے ۔ اس کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہ ملک "ولّہ" بھی راجاؤں کے ماتحت ہے، لیکن یہ بات مشکوک ہے کیونکہ جس صوبے کا هوان سانگ ذکر کرتا ہے وہ سمندر کے قریب نہیں ہے.

البلاذری قصہ کے ایک بادشاہ کا ذکر کرتا ہے جسے راسک (راسِک) کہتے تھے اور جو خلیفہ الولید اول (۸۶تا۹۶ھ/۷۰۵ تا ۷۱۵ء) کا هم‌عصر تھا ۔ نویں صدی عیسوی میں بھی خلیج کچھ میں سرستہ (سوراشٹر) کا شہر آباد تھا ۔ یہاں سید لوگ رہا کرتے تھے جو مشہور بحری قزّاق تھے ۔ بقول البلاذری خلیفہ هشام (۱۰۵ تا ۱۲۵ھ/۷۲۴ تا ۷۴۳ء) کے زمانے میں خلیج کَچھ کے باشندے مسلمان تھے ۔ جب علاقۂ سندھ میں مسلمانوں کی قوت کو زوال هوا تو انہوں نے اپنے آپ کو علاقۂ "قصّہ" میں برقرار رکھنے کی کوشش کی (الیعقوبی) ۔ البیرونی بیان کرتا ہے کہ دریاے سندھ کی مشرقی شاخ مہران اُس مقام پر سمندر میں جا گرتی تھی جسے کچھ میں سندھ ساگر کہتے تھے اور صاف ظاهر ہے کہ یہ رن آو کَچھ (Rann of Kacch) هی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۰۰۰ء تک یہ رن سمندر هی کا ایک بازو بنا رہا اور دریاے سندھ کی ایک شاخ اس میں سے بہتی رهی ۔ البیرونی نے بھی کچھ کے متعلق لکھا ہے کہ بحری قزّاقوں کا گھر تھا۔ (بَوارج) سمّہ راجپوت حکمرانانِ سندھ نے اس علاقے کو غالباً چودھویں صدی عیسوی میں فتح کر لیا ۔ ان میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا، لیکن جھریجہ خاندان نے جس کا اقتدار منڈوی (۱۲۷۰ تا ۱۲۹۸ء) میں قائم تھا ایک ایسا هندو مذهب اختیار کر لیا جو عام هندو مت سے ذرا مختلف تھا ۔ وہ اس ملک میں برابر حکومت کرتے رہے ۔ پہلے وہ گجرات کے بادشاهوں کے ماتحت تھے، اس کے بعد مغلوں کے اور سب سے آخر میں انگریز برسر اقتدار آگئے ۔ سندھ کے کلہوڑا خاندان نے اٹھارھویں صدی عیسوی (۱۷۶۲/۵ء) میں کچھ پر حملہ کیا ۔ ابتدائی زمانے میں علاقۂ کچھ بحری ڈاکوؤں کی جائے پناہ ہونے کی وجہ سے بے حد بد نام تھا، انگریز آئے تو پھر وهی حالت هوگئی ؛ چنانچہ ۱۸۱۹ء میں انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا ۔ جھریجہ خاندان کے حکمران راؤ کے لقب سے کوئی ایک صدی تک یہاں حکومت کرتے رہے ۔ ۱۸۴۸ء میں هندوستانی ریاستوں کا الحاق برطانوی هند سے ہو گیا ۔ [نیز رک بہ پاکستان، ۵ : ۴۵۱]۔

کچھی زبان اس صوبے کی خاص بولی ہے ۔ یہ زبان مغربی هند کی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور عام طور پر اسے گجراتی زبان کی ایک بولی شمار کیا جاتا ہے، گو بقول گریرسن اسے زیادہ تر سندھی زبان کی ایک بولی سمجھنا چاهیے ۔ اپنے جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر یہ زبان دونوں زبانوں کے درمیان ایک رابطے کا کام دیتی ہے.

مآخذ : (۱) البلاذری، طبع ڈخویہ، ص ۴۳۸، ص ۹، ص ۴۴۰، س ۱۱ تا ۱۳، ص ۴۴۴، س ۲ ؛ (۲) الیعقوبی، طبع Houtsma، ۲ : ۳۸۰، س ۱۲ ببعد ؛ (۳) البیرونی : کتاب الهند، طبع زخاؤ، ص ۱۰۲، س ۹ و ۱۱، ص

۱۳۰؛ ص ٦ و ۱۲؛ ترجمه ص ۲۰۸ و ۲٦۰؛ (۴) Reinaud : *Mem......sur l' Inde Mem de l'Acad. des Inscr. et Belles Lettres, XVIII* (و 2)، ص ۱۸۷ تا ۱۸۸؛ (۵) V. Smith : *Early Histroy of India*، طبع سوم، آوکسفرڈ ۱۹۱۵ء؛ (٦) Sivewright : *Cutch and the Rann* (Geogr. Journal ۱۹۰۷ء)؛ (۷) J. Burnes : *Narrative of a visit to the court of Sinde*؛ (۸) *A sketch of the History of Cutch*؛ لنڈن ۱۸۳۱ء، ضمیمه ص ۱۳۵ ببعد؛ (۹) Pertsch : در *Zeitschr. der Dtsch. Morg. Cesellsch.*، ۲۵ : ٦۱۱ تا ٦۱۳ (سکوں پر)؛ (۱۰) D.P. Khakhar : *Arch. Survey of Western India* (صوبه کچھ)، عدد ۱۵۲، بمبئی ۱۸٦۸ء.

(M. LONGWORTH DAMES)

* ® **کچھی** : یا کچھ گنداوه؛ پاکستانی بلوچستان کا مثلث نما چپٹا علاقه جو ۲۷ درجے ۵۳ دقیقے تا ۲۹ درجے ۳۵ دقیقے شمال میں اور ٦۷ درجے ۱۱ دقیقے تا ٦۸ درجے ۲۸ دقیقے مشرق میں واقع ہے [اس کا رقبه بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے مطابق ۵۳۱۰ مربع میل ہے] - اس کے شمال مشرق میں کوه سلیمان کا سلسله ہے اور مغرب میں کرتهار کی پہاڑیاں - جنوبی گوشه خالی ہے اور شمالی سنده کا میدان اس طرف حدبندی کرتا ہے .

اس علاقے کی تاریخ بلوچستان کی نسبت سنده سے زیاده قریبی تعلق رکھتی ہے - [ابن حوقل اس کا صدر مقام قندابیل لکھتا ہے جو آج کل گنداوه کہلاتا ہے]- کہا جاتا ہے که ساتویں صدی عیسوی میں برہمن راجه چچ نے اس پر قبضه کیا تھا - عرب وارد ہوے تو ان کے زیر تصرف آ گیا - بعد میں سنده کے سومره اور سمّه خاندانوں کے قبضے میں چلا گیا - بلوچ نویں صدی ہجری، پندرھویں صدی عیسوی میں آئے، لیکن وه کبھی بھی مضبوط سیاسی قوت کے مالک نه بنے، اس لیے اس علاقے کا اقتدار پہلے ارغون خاندان کے ہاتھ میں چلا گیا اور بعد میں مغلوں کے ہاتھ میں - انجام کار سنده کے کلهوڑے اس کے مالک بنے - ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں میر عبداللّٰہ احمد زئی خان قلات کو کلهوڑوں نے قتل کر دیا اور نادر شاه نے یه علاقه تلافی کے لیے بروہیوں کے حوالے کر دیا - پاکستان کے قیام سے قبل یه علاقه ریاست قلات [رک بآں] کا حصه تھا - کچھی کے مشرقی نصف علاقے میں جو قبائل آباد ہیں، یعنی ڈومبکی، امرانی اور کھیری وه برائے نام خان قلات کے ماتحت سمجھے جاتے تھے - یه قبائل اس ریلوے لائن کے مشرق میں ہیں جو جیکب آباد سے کوئٹه کو جاتی ہے اور سارے صوبے میں سے جنوباً شمالاً گزرتی ہے - لائن کے مغرب میں بھی زیاده تر بلوچ قبائل ہی آباد ہیں، سوا اس علاقے کے جو شمال میں دھادھر کے قریب ہے، جہاں ایک خانه بدوش قبیله بروہی آباد ہے - یہاں ہر جگه جاٹ [رک بآں] لوگوں کی بڑی تعداد میں بستیاں ہیں - بڑے بڑے قصبے بالکل نہیں - گنداوه، شوران، دھادھر، سبی، لاہری [بھاگ اور جھل] اہم مقامات ہیں - [بلوچی [رک بآں] اور براہوئی [رک بآں] زبانیں بولی جاتی ہیں، سندھی کا دخل بھی ہے - خانه بدوش لوگوں کی زبان پشتو ہے - باہمی گفتگو کے لیے اردو استعمال ہوتی ہے] .

[آب و ہوا سخت گرم ہے اور بارش کم اور شاذ و نادر ہوتی ہے] - کاشتکاری کے لیے ندیوں اور پہاڑی نالوں سے پانی حاصل کیا جاتا ہے - ناری اور بولان شمال میں، مُولا اور سُکلیجی مغرب میں، اور لاہری اور چھتّر مشرق میں بہنے والے دریا ہیں - مُولا، بولان اور ناری کی وادیاں ان دروں کا کام دیتی ہیں، جن کے ذریعے بالائی علاقوں سے رسل و رسائل اور نقل و حمل کا سلسله قدیم الایّام سے قائم ہے - اول الذکر دو وادیوں

میں سے ریل گزرتی ہے، جو بولان اور ہرنائی کے علاقوں میں سے ہوتی ہوئی کوئٹے اور پشین کو جاتی ہے ۔ آبادی منتشر ہے لیکن بلوچستان کے اکثر حصوں کی نسبت زیادہ گنجان ہے ۔

[پاکستان بننے کے بعد علاقے کی پیش رفت کے لیے نئے بند تعمیر ہوے ہیں، مثلاً دھادھر کے جنوب میں بند اللہ یار شاہ، صرف اسی بند سے سالانہ چونتیس ہزار ایکڑ سیراب ہوتے ہیں ۔ دریاے سندھ سے بھی آبپاشی کا انتظام ہے ۔ ان تمام منصوبوں کی وجہ سے قابل کاشت رقبے اور پیداوار میں اضافہ ہوا ہے ۔گندم، جو اور کپاس کی کاشت ہوتی ہے ۔ کپاس کی کاشت ۱۹۳۲ء میں نہر کرتھار کے کھلنے سے شروع ہوئی تھی ۔ خواندگی بڑھانے کے لیے بالخصوص ۱۹۷۱ء کے بعد بلوچستان بھر میں نئے پرائمری، مڈل اور ہائی سکول کھولے گئے ہیں ۔ اس سے کچھی کا علاقہ بھی مستفید ہوا ہے ۔ دھادھر اور بھاگ میں ہائی سکول تو ۱۹۵۴ء میں کھل گئے تھے ۔ آمد و رفت کے لیے پختہ سڑک ہے ۔ بسیں دیہات تک بھی جاتی ہیں ۔ خبررسانی کے لیے ریڈیو سیٹ ہیں ۔ بھاگ میں سول ہسپتال ہے اور مختلف مقامات پر ڈسپنسریاں ہیں ۔ سفری ڈسپنسریاں اور صحت کے دیہاتی مراکز بھی ہیں ۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی ذاتی توجہ کے باعث ترقیات جاری ہیں، سرداری نظام کی منسوخی سے استبداد کا خاتمہ ہو گیا ہے] ۔

مآخذ : (۱) *Census of India 1901 and 1911*، بلوچستان: (۲) *Imperial Gazetteer of India*، ۱۹۰۸ء، بذیل مادۂ کچھی؛ [(۳) *Encyclopaedia Britannica*، مطبوعۂ نیویارک ۱۹۷۴ء؛ (۴) *Baluchistan District Gazetteer Series*، ساراوان، کچھی و جھلاوان، بمبئی ۱۹۰۷ء: (۵) *Census of Pakistan*، جلد ۳، مغربی پاکستان مردم شماری ۱۹۶۱ء؛ (۶) میر احمد یار خان بلوچ، خان اعظم : *Inside Baluchistan*، کراچی ۳، ۱۹۷۵ء؛ (۷) *Bench-Mark Survey, Kachhi and Harnai Development Areas, Quetta and Kalat Region*، سلسلہ نمبر ۴، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۰ء؛ (۸) *District Census Report* قلات ۱۹۶۱ء ؛ نیز [رک بہ بلوچستان، سندھ] .

(M. Longworth Dames و [ادارہ]

اَلْکُحْل : اول تو ایک دھات، یعنی کبریت * آمیز سرمے ("stibnite") اور دوسرے کبریتی سیسے (lead sulphide) کا نام؛ ان دونوں کے لیے اِثْمِد کا لفظ بھی مستعمل ہے ۔ اِثْمِد یونانی لفظ σγικκι سے نکلا ہے اور J. Ruska کے بیان کے مطابق antimony اور bismuth کے الفاظ اِثْمِد سے مشتق ہیں ۔ فارسی میں الکحل کو اس جگہ کے نام پر جہاں سے یہ آتا ہے، سرمہ کہا جاتا ہے ۔ عربی میں اس کے مرادفات النحاس اَلْمُحْرَق (جلا ہوا تانبا)، الاصفہانی، کحل جلاء، کحل سلیمان، کحل اسود، وغیرہ ہیں .

اگرچہ صاحب مَفَاتیح العُلُوم (طبع van Vloten، ص ۲۶۲) کُحْل کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ اُسْرُب، یعنی سیسے کا جوہر ہے اور ارسطو کی Petrology (= حجریات) میں بھی یہ لکھا ہے کہ اثمد میں اسرب پایا جاتا ہے، لیکن بقول E. Seidel (Mechithar، عدد ۲۱۵، ص ۱۸۵) وہ اثمِد جو کحل کا مرادف ہے ہمیشہ سرمے کا مرکب (antimonite) ہوتا ہے ۔ اسی وجہ سے قدرتی طور پر التباسات پیدا ہو گئے ہیں ۔ M. Meyerhof کے بیان کے مطابق الکُحْل خالص سرمہ (antimony) ہے .

حَمْدُ اللہ اَلْمُسْتَوفی نے نُزْهَة القلوب (طبع Le Strange: سلسلۂ یادگار گب، ۲۳/۲: ۱۹۲۷)میں ان جگہوں کا ذکر کیا ہے جہاں الکُحْل پایا جاتا ہے، یعنی اصفہان میں، دماوند پر اور اندلس میں ۔ کہا

جاتا ہے کہ اندلس میں ہر مہینے کے دوسرے ہفتے میں اس دھات کی خاص طور پر فراوانی ہوتی ہے ۔ اب بھی ایران اور اندلس میں کحل یا کبریت آمیز سرمہ پایا جاتا ہے ۔ ایران میں کچھ پہاڑ ہیں جنھیں کوہ سرمہ کہا جاتا ہے؛ چنانچہ القزوینی بسطہ کے قریب ایک جبل الکحل کا ذکر کرتا ہے (متن، ص ۱۷۱) ۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سرمے کو کوٹ کر سیسے کی نسبت زیادہ باریک سفوف بنایا جا سکتا ہے کیونکہ وہ سیسے کے مقابلے میں بہت زیادہ نرم دھات ہے ۔ چونکہ کحل سے زیادہ تر سنگار کا کام لیا جاتا تھا، لہذا اس سے سنگار کی جو چیز بنی، وہ پہلے اسی نام سے موسوم ہوئی اور پھر اس سے آرائش کی سب چیزیں مراد لی جانے لگیں ۔ چونکہ یہ نہایت باریک پیسا جاتا ہے، لہذا عام طور پر اسے بہت باریک سفوف کے معنوں میں بھی بولنے لگے ۔

عورتیں الکحل کو دوسری اشیا سے ملا کر کوٹنے کے بعد اپنی آنکھوں کی زینت کے لیے، نیز ابرو، پلکوں اور پپوٹوں کے کناروں کو سیاہ کرنے کے لیے خاص طور پر استعمال کرتی ہیں ۔ غالباً عربوں نے یہ رسم قدیم مصریوں سے لی ہوگی کیونکہ ان کی اشیاے زینت میں کبریت آمیز سرمہ اکثر پایا گیا ہے (X. Fischer : *Archiv für pharma kologie*، ۲۳۰ (۱۸۹۲ء):۹)؛ لیکن مصریوں کی زینت کی اشیا عام طور پر پسے ہوے کحل الحجر (galena) سے بنائی جاتی ہیں، جس میں اور چیزیں بھی ملی ہوتی ہیں ۔ M. Meyerhof (*Der Bazar der Drogen etc. in Kairo*، *Archiv für Wirtschafts for schung im orient* ۱۹۱۸ء، ۳/۴: ۲۱) کے بیان کے مطابق کبریتی سرمہ یا سیسہ (جسے کحل کہتے ہیں) آنکھوں کو خوبصورت بنانے کے لیے بعینہٖ اسی طرح اب بھی قاہرہ میں بکتا ہے جس طرح قدیم زمانے میں بکتا تھا ۔ بہترین سرمہ اب بھی ایران سے آتا ہے (الاصفہانی)۔ وہ سرمہ جسے حاجی لاتے ہیں، بہت مقبول ہے (المکّی اور الحجازی) ۔ تہران میں بھی سرمہ سنگار کے طور پر مستعمل ہے ۔ آرائش کی نقلی اشیا میں کحل الحجر اور انزروت (isinglass) شامل ہوتے ہیں ۔ کحل الحجر کے بجاے پنسل کا سرمہ (graphite)، کاجل (بالخصوص جو سستی قسم کے لوبان سے حاصل کیا جاتا ہے) اور قشر بادام سوختہ وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں ۔

مذکورۂ بالا سیاہ مادوں کے علاوہ کچھ اور رنگ بھی کحل کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے ۔ الموفق اپنی "اصول قرابا دین" میں ایک گہرے سیاہ اور ایک ہلکے سیاہ، ایک سیاہ بنفشی، ایک پیازی، ایک بالکل سفید اور ایک زرد رنگ کے کحل کا بھی ذکر کرتا ہے ۔ اس طرح اسم صفت "کحلی" صرف سیاہ رنگ ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام گہرے رنگوں کے مثلاً گہرے نیلے، ارغوانی اور گہرے سرخ رنگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔

الکحل سرمے کے طور پر ایک چھوٹی سی سلائی (میل یا مروند) سے لگایا جاتا ہے، جس کا سرا بعض اوقات گلاب سے تر کر لیتے ہیں ۔ سرمہ ایک مکحلہ (=سرمے دانی) میں رکھا جاتا ہے ۔ لین Lane نے اس کی جو تصویر دی ہے وہ گلاب پاش (bear glass) سے مشابہ ہے ۔ مکحلہ دھوپ گھڑی اور اس مخروطی شکل کو بھی کہتے ہیں جس کا سر کٹا ہوا ہو (دیکھیے E. W. Lane: *Manners and Customs of the Modern Egyptions*، ص ۲۹ ببعد، ۳۰۳؛ E. Wiedemann و J. Würschmidt : *Über eine arabische Kegelförmige Sonnenuh,r Archiv. f. Gesch. der Naturwissensch. und Technik*، ۱۹۱۶ء، ۷ : ۳۵۹) ۔

الکُحل کا استعمال آنکھوں کی دوا کے طور پر بکثرت ھوتا ھے ۔ ابن البیْطار اور دیگر مصنفین نے اس موضوع پر بالتفصیل لکھا ھے ۔

الجوھری کی کتاب المختار فی کشف الأسرار کے باب "کشف أسرار الکحّالین" میں کئی نقلی کحلوں کا ذکر ملتا ھے؛ اس جگہ الکُحل کا لفظ سرمے کے بجاے آنکھوں کی دوا کے معنوں میں استعمال کیا گیا ھے ۔

شعرا ان عورتوں کی خاص طور پر تعریف کرتے ھیں جن کی آنکھوں میں سرمہ لگا ھوا ھو یا جو قدرتی طور پر سرمگیں ھوں اور انھیں سرمے کی ضرورت ھی محسوس نہ ھو ۔ E. von Lippmann نے اس سلسلے میں المتنبی، حافظ اور فردوسی کے اشعار نقل کیے ھیں ۔

Paracelsus نے محض خودرائی سے کام لیتے ہوئے لفظ الکحل کو کوفتہ و بیختہ اور نہایت باریک اور لطیف سفوف کے معنوں میں، جو ھر شراب کے مفہوم میں استعمال کیا، غالباً اس لیے کہ شراب کا بہترین جزو ترکیبی الکحل ھے؛ چنانچہ بعد ازاں یہ نام شراب کے لیے بتدریج استعمال ھونے لگا ۔

تقریبًا تیرھویں صدی سے پہلے مسلمان روح شراب (= الکحل Alcohol) کو عمل تقطیر سے حاصل نہیں کرسکتے تھے کیونکہ مناسب آلات کے نہ ھونے کی وجہ سے وہ ان بخارات کو جو الکحل کے محلول سے خارج ھوتے تھے، منجمد نہیں کر سکتے تھے ۔ الکُحل سب سے پہلے غالبًا بارھویں صدی میں مغربی یورپ میں بنائی گئی (دیکھیے E. von Lippmann کی تحقیقات، در *Beiträge zur Geschichte der Natur-wissenschaften und der Technik*، برلن ۱۹۲۳ء، ص ۵۶ تا ۱۲۷)۔

زمانۂ مابعد (یعنی سولھویں صدی کے نصف آخر) میں مغل شہنشاہ اکبر کے زمانے سے "عرق" تیار کرنے کی تحریری تفصیل موجود ھے (ابوالفضل علامی: آئین اکبری، مترجمۂ H. Blochmann و J. Jarret، ۱۸۹۳ء، ۱: ۶۹؛ نیز دیکھیے E. Wiede-mann، در *Beiträge zur Geschichte des Zuckers*، *Die deutsche Zuckerindustrie Aie*، ۱۹۱۲ء، ص ۳۰۳؛ E. von Lippmenn: کتاب مذکور، ص ۱۲۳) ۔

الکُحل سے لفظ الکحّال بمعنی، معالج چشم، نکلا ھے ۔ اس کے لیے M. Meyerhof کے متعدد مقالوں کے علاوہ دیکھیے J. Hirschberg کا اس موضوع پر مکمل اور جامع بیان، در *Geschichte der Augenheilkunde*، کتاب ثانی: *Gesch. d Augenheil Kunde im Mittelalter* جسے Graefen Saemisch: *Handbuch der allgemeinen Augenheil Kunde*، ج ۱۳، لائپزگ ۱۹۰۸ء، میں شامل کر دیا گیا ھے ۔ J. Hirschberg کا خلاصہ یہ ھے :

عرب کحّالین نے جو کام انجام دیا، اس کی اھمیّت کے متعلق مختلف اندازے ھیں ۔ ان کی تصانیف کے متعلق ناواقفیت کی وجہ سے اکثر حلقوں میں ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکا، لیکن بہت پہلے یعنی ۱۳۹۰ء ھی میں پیڈوا Padua کے پروفیسر A. Beneditti نے کہا تھا کہ "آج کل کے نہایت ذھین کحّال ایشیا، یعنی شام اور عراق عجم (Media) میں ھیں؛ دیگر ممالک میں، جن میں اٹلی بھی شامل ھے، ایسے نامور اھل کمال کی تعداد بہت ھی کم ھے"۔ پھر تاریخ معالجۂ چشم کا سب سے مستند عالم J. Hirschberg اسی سلسلے میں لکھتا ھے کہ عربوں کا نام امراض چشم کی ادویہ اور جراحی کی تحقیقات کی تاریخ سے کبھی محو نہ ھوگا (کتاب مذکور، ص ۲۴۳) ۔

مآخذ : متن میں مذکور ھیں ۔

(E. WIEDEMANN)

* **کَخْتا** : (یا کیَخْتہ Kiakhta یا کختہ؛ بعض اوقات الکختا)؛ ایک مقام، جو دریاے فرات کے ایک معاون کختا صو کے کنارے مَلَطیہ سے ۴۰ میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ ایک قائم مقام کی سکونت گاہ تھی اور اسی نام کی قضا کا، جو تین ناحیوں (گرگر، شیرو اور میردیس) پر مشتمل تھی، صدر مقام تھا۔ اس کی کل آبادی چھیالیس ہزار کے لگ بھگ تھی (جس میں بقول Cuinet زیادہ تر کرد تھے اور ان کے علاوہ چار ہزار سے زیادہ ارمن تھے)۔ کختا صوبۂ مَعْمُورَۃ العزیز (خرپوت) کے لواے مَلَطیہ میں شامل تھا۔ آج کل کختا میں صرف چند سو جھونپڑیاں نظر آتی ہیں، جہاں ایک ہزار کے قریب باشندے آباد ہیں، جو تقریباً سب کے سب کرد ہیں۔ ازمنۂ وسطٰی میں یہ مقام اپنے انتہائی مستحکم قلعے کی وجہ سے بہت مشہور تھا، جو ایک بلند ڈھلوان چٹان پر بنا ہوا تھا۔ یہ قلعۂ سُمیساط سے ملطیہ جانے والی مشرقی سڑک کی نگہبانی کرتا تھا اور بلاد اسلامیہ کے سرحدی قلعوں (ثُغُور) میں سے تھا۔ عصر حاضر میں اس نے پھر نئے سرے سے شہرت حاصل کی ہے کیونکہ یہاں نمرود طاغ کے قریب ہی Commagene کے Antiochus اول کے آثار برآمد ہوے ہیں، جن کا تعلق پہلی صدی ق۔م سے ہے۔ سب سے پہلے اس کا نام ہمیں صلیبی محاربات کے مشرقی مؤرخین کے بیان میں ملتا ہے۔ Michael Syrus کے ہاں اسے گختہ لکھا ہے۔ [ابن العبری : مختصر الدول، بیروت ۱۹۵۸ء، ص ۲۵۰، حاشیہ، میں کاختا درج ہے، متن کے 'کاختین' کا واحد]۔ اس کے قدیم اور بوزنطی نام معلوم نہیں ہو سکے، لیکن کختا میں ۲۰۰ء کے قریب، Septimius Severus کے عہد میں، بولام صُو پر جو پل بنایا گیا تھا اس سے اور قلعے میں بوزنطی عمارات کے بچے کھچے آثار سے یہ پتا چلتا ہے کہ عہد قدیم اور ازمنۂ وُسطٰی کے ابتدائی ایام میں بھی یہ مقام ایک اہم سرحدی مستقر تھا۔ Ainsworth کا یہ مفروضہ قابل قبول نہیں کہ کختا وہی پرانا شہر Claudias ہے جسے عرب قَلَوْذِیَہ (رکّ بآں) کہتے تھے۔

۱۹ اگست ۱۰۷۱ء کو مَلا زجِرْد کی لڑائی ہوئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سرحدی اضلاع ہمیشہ کے لیے بوزنطی سلطنت سے نکل گئے اور ملطیہ کے دانشمند اوغلو، روم کے سلجوق اور خرپوت کے ارتقی فرمانرواؤں (جو کختا پر قابض ہونے کے لیے باہم دست و گریبان تھے) اور صلیبیوں (جو اَلرُّہا اور مَرْعَش کے حکمران تھے) کے درمیان گوے بازی بن کر رہ گئے۔ اسی زمانے میں ارمنوں نے، جو گیارھویں صدی کے نصف آخر تک کافی تعداد میں ان علاقوں میں نقل مکانی کر آئے تھے، مَلَطیہ، حصْن مَنْصور، گرگر اور کختا جیسے مستحکم مقامات میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا (Michael Syrus، طبع Chabot، ۳ : ۱۵۸ ببعد، ۱۹۸، ۲۰۵ ببعد) اور قرب و جوار کے مسلمان فرمانرواؤں کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔ کختا کے قلعے کا ایک کتبہ، جو ۵۲۵ھ/۱۱۳۰-۱۱۳۱ء میں لکھا گیا تھا، اسی زمانے کا ہے۔ اس میں ایک شخص ملک المنصور کا ذکر ہے کہ اس نے دفاعی مورچوں کو دوبارہ بنوایا تھا (O. Hamdy Bey : *Le Tumulus de Nemroud Dagh*، ص ۲ ببعد)؛ [لیکن Cl. Cahen نے اس کی تردید کرتے ہوے بتایا ہے کہ یہ کتبہ دراصل ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء کا ہے (لاز، لائیڈن، بار دوم، ۴ : ۴۶۴)]۔

بھسنی کا فرمانروا (Count) بالڈون Baldwin اور اس کا جانشین ریناڈ Reinaud یکے بعد دیگرے تھوڑے ہی عرصے میں نورالدّین سے برسرپیکار ہو کر جان گنوا بیٹھے تو اَلرُّہا کے جنگجو حکمران

جوسلین Joccelin نے ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا، جن میں گرگر اور کختا بھی شامل تھے۔ مئی ۱۱۵۰ء میں وہ بھی نورالدین کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور کختا اور اس کے قرب و جوار کے قلعے، مثلاً گرگر، حصن منصور، وغیرہ خرپوت کے قرا ارسلان کے ہاتھ لگے۔ کختا کے آخری ارمن فرمانروا کرکور (Krikor) کو فاتح نے ایک اور ضلع عطا کر دیا (Michael Syrus، ۳ : ۲۹۴ ببعد؛ Chalaudan: *Les Comnène*، ۲ : ۱۲۴، ۲۳۴)۔ اس طرح ان علاقوں میں عیسائی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

۲۵۔ اکتوبر ۱۱۷۷ء کو سلطان قِلیْج اَرْسَلان نے ملطیہ فتح کیا اور آخری دانشمند اوغلو حکمران کو نکال باہر کیا، جو خرپوت کی جانب بھاگ گیا (Michael Syrus، ۳ : ۳۷۲)؛ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک سرحدی قلعوں، مثلاً حصن منصور، کختا، وغیرہ پر سلاجقہ کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔

۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء میں علاء الدین کیقباد [رک بہ کیقباد اول] اور آمد اور ساردین کے ارتقی فرمانروا مسعود سے لڑائی چھڑ گئی۔ اسی سال شوّال کے مہینے میں مسعود اور اس کے حلیفوں نے کختا کے مقام پر شکست فاش کھائی اور یہ قلعہ، جو اب تک مسعود کے زیرنگیں تھا، فاتح کے ہاتھ آ گیا (ابن الأثیر : طبع Tornberg، ۱۲ : ۳۰۰؛ ابوالفداء : تاریخ، مطبوعۂ قسطنطنیہ، ۳ : ۱۴۴؛ Houtsma : *Recueil etc.*، ۳ : ۲۸۰ و ۴ : ۱۱۸ ببعد)۔ اس کے بعد یہ سلاجقۂ روم کے قبضے میں رہا حتّٰی کہ اس زمانے میں بھی جب وہ ایلخانیوں کے باجگزار بن چکے تھے۔ بابا رسول اللہ کی بغاوت (۶۳۸ھ/۱۲۴۰-۱۲۴۱ء) کے دوران میں اس جنونی شخص کے مریدوں نے کختا اور اس کے گردو نواح کے علاقے کو خوب لوٹا (Bar Hebraeus : *K'tābā d' Makt'bānūt.Zabnè*، طبع Bedjan، ص ۴۷۳؛ *Chronik*، طبع Bruns و Kirsch، ۲ : ۵۱۷ = تاریخ مُخْتَصَر الدوَل، طبع صالحانی، بیروت ۱۸۹۰ء، ص ۴۳۹)۔ اس سے چند سال قبل روم سے نکالے ہوئے خوارزمی یہاں تاخت و تاراج کر چکے تھے (Bar Hebraeus : تاریخ وغیرہ، ص ۴۷۳ ببعد)؛ بعد ازاں کیکاؤس دوم کے عہد میں وقتاً فوقتاً جلا وطنی کی سزا پانے والوں کو یہاں بھیجا جاتا رہا (Houtsma : *Recueil*، وغیرہ، ۴ : ۲۵۹، ۲۶۲)۔ علاوہ ازیں اس کا ذکر اور سلسلوں میں بھی ملتا ہے (Bar-Hebraeus : کتاب مذکور، ص ۴۹۹، س ۱۴ = تاریخ وغیرہ، ص ۴۷۶ ببعد، بذیل ۱۲۵۷ء)۔ بقول منجم باشی (تاریخ، ۳ : ۱۷۲) قونیہ کے آخری علاء الدین نے عثمان کے ایک بیٹے اور ارطغرل کے پوتے کو کختا کے قریب پیْغی اِلی میں ایک جاگیر عطا کی تھی اور اِرتْنَہ، جو ایشیائے کوچک میں ایلخانیوں کے عامل کی حیثیت سے (۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء تا ۷۵۳ھ/۱۳۵۲ء) اپنی خود مختاری کا اعلان کر چکا تھا، ملطیہ کے علاقے پر حکومت کرتا تھا (ارتنہ کے بارے میں دیکھیے M. Von Berchem و Halil Edhem : *Matériaux pour un Corpus Inscr. Arabicarum*، قاہرہ ۱۹۱۰ء، ص ۱۴ ببعد)۔ مغول کے خلاف مصر کے مملوک سلاطین کی مہمات کے دوران میں کختا کا ذکر بار بار آتا ہے (المقریزی : السُلوک لَمعرفۃ دُوَل المُلوک؛ فرانسیسی، ترجمہ از Quatremère : *Hist. des Sultans Mamelouks*، ۲/۱ : ۶۱)۔

۶۸۲ھ/۱۲۸۳-۱۲۸۴ء میں حلب کے مصری عامل قَرَاسُنْقُر نے شہر پر قبضہ کر لیا اور یہاں از سر نو بڑی مستحکم مورچہ بندی کی (المقریزی : کتاب مذکور؛ ابوالفداء : تاریخ، ۴ : ۱۸)۔ یہی وجہ ہے کہ یکم ربیع الآخر ۶۸۴ء کو آرمینیای کوچک کے بادشاہ لیون Leon سے معاهدے

میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا کہ یہ سلطان قلاوون کے علاقے میں شامل ہے (المقریزی: کتاب مذکور، ۲/۱: ۱۶۸)؛ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ چند دوسرے مقامات کے ساتھ کختا عارضی طور پر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۷۱۵ھ/۱۳۱۵-۱۳۱۶ء میں مغول کے خلاف مصری مہم کے سلسلے میں، جس کے دوران میں مملوکوں نے ملطیہ فتح کرکے اسے تباہ و برباد کیا، کہا جاتا ہے کہ قَلْعَة الرُّوم، بہسنا، کختا اور گرگر کے باشندے مسلمانوں کے علاقے میں دھاوے مارا کرتے تھے (ابوالفداء: کتاب مذکور، ۴: ۷۷)۔ آگے چل کر یہ علاقہ ترکوں کی پہلی فتح کے زمانے تک ضرور مرعش کے ذوالقدر اوغلو کے ماتحت رہا ہوگا، جو مملوک سلاطین کے باجگزار تھے۔ جب بایزید اول نے ۸۰۱ھ/۱۳۹۷-۱۳۹۸ء میں (مصری مآخذ کی رو سے ۸۰۰ھ میں، دیکھیے Weil: *Gesch. der Chalifen*، ۵: ۷۰، ۷۴؛ نشری، در *Zeitschr.d. Deutsch.Morgenl.Gesellsch.*، ۵: ۲۵۴؛ قدیم عثمانی وقائع نگاروں کی رو سے ۷۹۸ھ میں دیکھیے Leunclavius: *Histor. Musulm*، عمود ۳۳۷ س ۴۳ ببعد، ۳۳۸، س ۱۷ ببعد و طبع Giese، ص ۴۳ ببعد؛ نیز عاشق پاشا زادہ: تاریخ، ص ۶۷) مصر کے خلاف جنگ و جدل کا آغاز کیا تو اس نے سب سے پہلے ملطیہ پر قبضہ کرکے وہاں سے ترکمانوں، یعنی ذوالقدر اوغلو کو، جو اب تک وہاں حکومت کر رہا تھا، نکال دیا۔ ۸۰۳ھ/۱۴۰۰-۱۴۰۱ء کے ابتدائی مہینوں میں امیر تیمور نے شام پر لشکر کشی کے دوران میں ملطیہ اور گرد کا سارا علاقہ کختا تک فتح کر لیا، بایزید کی متعینہ فوج کو نکال باہر کیا اور "ترکمان" قرہ عثمان کو یہاں مامور کر دیا (شرف الدّین علی یزدی: ظفر نامہ، مطبوعۂ کلکتہ، ۲: ۲۷۱ ببعد، ۲۷۸؛ Weil: کتاب مذکور، ۵: ۸۲)۔ تیمور کی واپسی کے بعد مملوک سلاطین پھر اس علاقے میں داخل ہوگئے اور برابر اس پر قابض رہے تاآنکہ سلطان سلیم اول نے ان کا سارا اقتدار ملیا میٹ کر دیا۔ اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے ۸۲۰ھ/۱۴۱۷-۱۴۱۸ء میں کختا فتح کیا (المقریزی: کتاب مذکور، ۲/۱: ۶۱ حاشیہ؛ Weil، ص ۱۳۹)۔ ابن ایاس: بدائع الظہور، قاہرہ ۱۳۱۱ھ، ۲: ۱۴۱، میں لکھا ہے کہ ۸۷۷ھ/۱۴۷۲-۱۴۷۳ء میں اوزون حسن نے یہ قلعہ تسخیر کیا۔ حلب کے بارے میں اپنے فتح نامہ (آخر ماہ رجب ۹۲۲ھ) میں سلیم اول خاص طور پر گرگر اور کختا کی فتح کا ذکر کرتا ہے۔ ترکوں کی حکومت میں سرحدی قلعے کی حیثیت سے کختا کی وہ اہمیت نہ رہی جو اسے ازمنۂ وسطیٰ میں حاصل تھی اور جس کا تذکرہ ابوالفداء (تقویم، طبع Reinaud، ص ۲۶۲ ببعد) اور الدمشقی (طبع Mehren، ص ۲۰۶) خاص طور پر کرتے ہیں۔ جلال زادہ نے (سولھویں صدی کے وسط میں) سلطنت عثمانیہ کا ذکر کرتے ہوے گرگر اور کختا کے اضلاع کے بیان میں اس کے لیے ایک پورا باب مخصوص کیا ہے (von Hammer: *Des Osm. Reiches Staats-verf*، ۲: ۴۴۹)؛ اولیا کے یہاں بھی اس کا کہیں کہیں ذکر ملتا ہے (سیاحت نامہ، ۴: ۲۲)، لیکن سترھویں صدی کی بلند پایہ تصنیفات جغرافیہ (یعنی محمّد عاشق: مناظر العوالم ورق ۱۶۷، مخطوطۂ وی انا؛ کاتب چلبی: جہان نما، قسطنطینیہ ۱۱۴۵ھ، ص ۶۰۰ ببعد) سے پتا چلتا ہے کہ کختا کے بارے میں ان کی معلومات صرف ابوالفداء تک محدود ہیں، جس کے بیانات کا انھوں نے لفظ بلفظ ترجمہ کر دیا ہے۔ آناطولی کی قضاؤں میں کختا کو ساتویں درجے کی بیرونی چوکیوں میں رکھا گیا ہے (v. Hammer: *Gesch. d. Osm. Reiches*، ۹: ۸، شمارہ ۷۰۴)۔ گزشتہ تین صدیوں میں ان دُور افتادہ اور ناقابل گزر اضلاع

میں کرد آباد ہوگئے ہیں ۔ کاتب چلبی (کتاب مذکور) ان کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ رہزن ڈاکوؤں کی ایک باغی، شورش پسند اور ناکارہ جماعت ہے ۔ وہ صرف اپنے سرداروں (بای بیگاری) کے اطاعت گزار ہیں اور جن علاقوں میں وہ آباد تھے وہاں باب عالی کا اقتدار قائم رکھنے کے لیے گزشتہ صدی میں بار بار فوجی مہمیں بھیجنے کی ضرورت پڑتی تھی ۔ ان لڑائیوں میں کختا کے قلعے نے بھی حصہ لیا کیونکہ ایک کُرد بے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں حصار بند ہوکر بیٹھ رہا تھا ۔ ۱۸۳۸ء میں ترکی دستوں نے اس پر یلغار کی اور اسی واقعے نے Ainsworth اور v. Moltke کی روئدادوں کے ذریعے اسے سارے یورپ میں مشہور کر دیا (دیکھیے C. Ritter : *Erdkunde*، ۱۰ : ۸۷۰، ۸۷۴، ۸۸۳ ببعد) ۔ ابھی قلعے کے آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام باقی ہے ۔ ۱۸۸۳ء کی ترکی مہم کے بارے میں حمدی بے کی تصنیف کے اندر مختصر سا ذکر ملتا ہے ۔ اس نے اسلامی کتبات کی جانب خاص طور پر توجہ کی ہے (یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں) ۔ خرپوت کے سالنامے میں اس کے بیانات بالتفصیل بطور تتمہ درج کیے گئے ہیں ۔ عظیم الشان آہنی دروازہ، جس کا ذکر ۱۲۳۶ء میں سلجوقوں کی فتح کے سلسلے میں بھی ملتا ہے، ۱۸۸۲ء میں قلعۂ گرگر کے دروازے کے ساتھ دیاربکر میں لایا گیا [مزید معلومات کے لیے دیکھیے لا، لائیڈن، بار دوم، بذیل مادّہ] ۔

مآخذ : (مندرجۂ ذیل کا ذکر اوپر نہیں آیا) : (۱) W. F. Ainsworth : *Travels and Researches in Asia Minor, Mesopotamia*، لنڈن ۱۸۴۲ء، ۱ : ۲۵۶ ببعد؛ (۲) O. Hamdy Bey و Osgan Efendi : *Le Tumulus de Nemroud-Dagh*، قسطنطینیہ ۱۸۸۳ء، مع فوٹو گراف : (۳) Humann و Puchstein : *Reisen in Kleinasien und Nordsyrien*، برلن ۱۸۹۰ء، مع تصاویر؛ (۴) Vincent W. Yorke : *Geographical Journal*، ج ۸ (۱۸۹۶ء)؛ (۵) سالنامہ، ولایت مَعْمُورَةَ العَزِیْز، بابت ۱۳۰۵ھ؛ (۶) Cuinet : *La Turquie d' Asie*، ۲ : ۳۷۹ ببعد؛ (۷) F. Chalandon : *Les Comnène*، ج ۲، پیرس ۱۹۱۲ء، بمواضع کثیرہ : (۸) J. Laurent : *Byzance et les Turcs Seldjoucides dans l' Asie Occidentale Jusqu'en 1081*، پیرس ۔ نینسی ۱۹۱۳ء، بمواضع کثیرہ؛ [(۹) ابن الأثیر، ۱۲ : ۵۸ھ؛ (۱۰) ابن بی بی، مترجمۂ H. Duda، ص ۱۲۲ ببعد، ۲۴۸ ببعد؛ (۱۱) ابن تغری بردی، مترجمۂ Popper، ۲ : ۳۶۷ ببعد، ۵۹۳؛ (۱۲) ابن ایاس، مترجمۂ Wiet، ۱ : ۲۶۷؛ (۱۳) اولیا چلبی، ۳ : ۲۲] ۔

(J. H. MORDTMANN)

(۲) ایک شہر جو ماورائے بیکال (Trans-baikalia) کے علاقے میں، ۳۰ درجے ۱۹ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۱۰۶ درجے ۴۰ دقیقے طول بلد جنوبی پر سطح سمندر، سے ۲۵۵۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے ۔ ایک پچاس گز چوڑا آزاد غیر جانبدار علاقہ کختا کو مَیمچن (Dai Oergö) سے جدا کرتا ہے اور تقریباً ساڑھے تین ورسٹ (verst) لمبی اس ضلع کی واحد شاہراہ اسے Trioskosawsk سے ملاتی ہے ۔ کختا ندی (مغولی : ککتوگورخون) کے کنارے اور پہاڑوں (برگُلتی Burgultei = کوہ عقاب) سے گھرا ہوا شہر کختا ایک روسی سرحدی چوکی سے ظہور میں آیا ہے، جو کختا ندی کے جنوب میں رورو (Roro) ندی پر واقع تھی ۔ یہ ندی سرحد کا کام دیتی ہے اور اسے اس وجہ سے شہرت نصیب ہوئی کہ یہاں ۱۰ اگست ۱۷۲۷ء کو معاہدۂ کختا پر دستخط ہوئے تھے ۔ چینیوں نے روس اور چین کے درمیان تجارت کے لیے اس جگہ کو مرکز بنایا اور چینیوں نے یہاں میمچن (تجارتی سرحد) اور روسیوں نے کختا کی سرحدی چوکی قائم کی ۔ اس

زمانے سے کختا منگولیا اور چین میں علوم، سیاست، تجارت (چاے کی تجارت) اور باھمی راہ و رسم کے داخل ہونے اور ان ممالک کے بارے میں تحقیق و تفتیش کرنے کے لیے ایک "غلام گردش" کا کام دیتا ہے - مضبوط کٹھروں کے ذریعے محفوظ کیا ہوا یہ مقام آج تک سوداگروں کی ایک چھوٹی سی اپنی مملکت ہے، جس کے اندر اپنا ٹیکس (چاے کا ٹیکس) ہے، اپنے رسم و رواج ہیں اور اپنا نظام حکومت ہے، اپنے ممتاز نمائندوں کی مشاورتی مجلس ہے، آگ بجھانے کا انجن ہے اور گرجا ہے - پتھر کے بنے ہوے مکانوں کے علاوہ کختا میں چوبی عمارتیں اور بڑی بڑی تجارتی عمارات ہیں، جن میں قافلوں کے لیے وسیع صحن بنے ہوے ہیں، لیکن دکان کوئی نہیں ہے - روس کے ساتھ تھوک تجارت کے علاوہ مغولوں اور چینیوں کے درمیان چھوٹی تجارت بھی ہوتی ہے - ۱۷۲۷ء سے دسمبر کا مشہور میلا ہر سال کختا میں منعقد ہوتا ہے - قافلے کی چاے کے نام سے جو چاے مشہور ہے اس کا سب سے بڑا گودام اور اس کی برآمد کا مرکز کختا ہے - ایک زمانے میں یہاں سے ریوند چینی کی ناجائز طریقے سے روس میں درآمد ہوتی تھی - آج کل چین میں سونا چوری چھپے لے جایا جاتا ہے - معاہدۂ پیکن (۱۸۹۸ء) ہو جانے اور سائبیریا کی مشہور ریل کے چلنے کی وجہ سے چاے، ریشم اور سوتی سامان کی درآمد کافی گھٹ گئی ہے، البتہ کپڑے سمور اور چمڑے کی تجارت نسبتہً زیادہ ہوتی ہے - یہاں ایک صحرائی ڈاک خانہ اور تار گھر قائم ہے اور ارگہ (Urga) کے راستے پیکن کو خطوط اور تار بھیجے جا سکتے ہیں .

مآخذ : (۱) *Meng-Ku-Yu Mu-Ki*، مترجمۂ P. S. Popow، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۵ء، ص ۶۸، ۳۳۶، ۳۵۳ تا ۳۵۵، ۳۵۹؛ (۲) Pallas : *Reise d. verschiedene Provinzen d. Russ.' Reichs*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۷۷۱-۱۷۷۳ء، ۳ : ۱۰۹ تا ۱۱۲؛ (۳) Ritter : *Asien*، برلن ۱۸۳۲ء، حصہ ۲/کتاب ۲ : ۱۰۲ تا ۱۱۱ (قدیم سفر ناموں کی تفصیل)، ۱۲۰؛ (۴) Jakynth : *Zapiski o Mongolii*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۲۸ء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۵؛ (۵) Timkowski : *Reise n. China*، لائپزگ ۱۸۲۵ء، ۱ : ۱۹ تا ۲۰ و ۳ : ۱۴۳؛ (۶) *Inscription de l' Expèdition Finnoise 1890* : *Orkhon*، هلسنگفورس ۱۸۹۲ء، ص iii؛ (۷) W. Obrutschew : *Aus China*، لائپزگ ۱۸۹۶ء، ص ۱۲ تا ۱۷؛ (۸) Wenyukow : *Die russ.-asiat. Grenz-lande*، لائپزگ ۱۸۷۴ء، ص ۱۸۰ ببعد، ۲۰۰ ببعد، ۲۱۰؛ (۹) Wilda : *Von Hongkong nach Moskau*، Altenburg ۱۹۰۲ء، ص ۲۸۶ تا ۲۹۶؛ (۱۰) Consten: *Weideplätze d. Mongolen*، برلن ۱۹۱۹ - ۱۹۲۰ء؛ (۱۱) Perry : *With the Russians in Mongolia*، لنڈن ۱۹۱۳ء، بمدد اشاریہ، ص ۳۳۵؛ (۱۲) Prschewalski : *Mongolia i strana Tangutow*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۵ء، ۱ : ۱ تا ۵؛ (۱۳) وهی مصنف : *Reisen in der Mongolei*، Jena ۱۸۷۷ء، ص ۱ تا ۶، xxx؛ (۱۴) وهی مصنف : *Ot K'achty na istoki r'eki*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۸ء، ص ۰۷ تا ۷۳؛ (۱۵) Bogolepow : *Očerki Russko-Mongolskoi Torgowli*، Tomsk ۱۹۱۰ء، ص ۱۱۵؛ (۱۶) وهی مصنف : *MoskowskayaTorgowaya ekspediciya w Mongoliyu*، ماسکو ۱۹۱۲ء؛ (۱۷) H. P. Lw'ecnikow : *Russkiye w Mongolii*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۲ء، ص ۱۸، ۳۲، ۴۳، ۴۵ تا ۵۰؛ (۱۸) J. Maiski : *Sororemennaya Mongoliya*، Irkutsk ۱۹۲۳ء، ص ۱۹۹ تا ۲۰۶؛ (۱۹) A. Palladiya : *Dorozhniya Zamyetki na puti po Mongolii 1847 i 1859*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۲ء، ص ۸۰ .

(H. CONSTEN)

* **کُدُمُّل** : ایک چھوٹا سا آتش فشانی جزیرہ، جو بحیرۂ قلزم میں ۱۷ درجے ۵۲ دقیقے عرض بلد شمالی پر واقع ھے ۔ انگریزی وزارت بحریہ کے نقشوں میں اس کا نام Kotumble کی شکل میں درج ھے ۔ اس جزیرے میں قسم قسم کے پھول پودے کثرت سے پائے جاتے ھیں، جن کا مطالعہ ماہر نباتات اہرن برگ Ehrenberg نے کیا ھے ۔ یہ جزیرہ اپنی لوھے کی کانوں کے لیے بھی قابل ذکر ھے، جن کا ذکر ابن المُجَاوِر (م ۶۳۰ھ) تک کے قدیم عہد میں بھی ملتا ھے ۔ کُدُمُّل کا یہ سنگلاخ جزیرہ ساحل عرب پر حَمِیدَۃ کے قریب واقع ھے اور کسی زمانے میں سر زمین کنانۃ اور یمن کے مابین سرحد کی نشان دہی کرتا تھا ۔

مآخذ : (۱) الھمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع D. H. Müller، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء، ص ۵۱؛ (۲) C. Ritter : *Die Erdkunde von Asien*، برلن ۱۸۴۶ء، ۸/۱ : ۱۰۲۳؛ (۳) A. Sprenger : *Die Post-und Reiseroutendes Orients*، در Abhandl. f. d. *Kunde des Morgenlandes*، لائپزگ ۱۸۶۴ء، ۳/۳ : ۱۳۳؛ (۴) وھی مصنف: *Die alte Geograp! Arabiens*، برن ۱۸۷۵ء، ص ۳۲؛ (۵) A. Grohmann : *Südarabien als Wirtschaftsgebiet*، ج ۱، *Osten undOrient* طبع R. Geyer و H. übersberger، I. Reihe، Forschungen، Bd. ۴، Wien ۱۹۲۲ء، ص ۱۶۸ .

(ADOLF GROHMANN)

* **کُر** : روسی میں کُرَہ Kura ، عرب جغرافیہ نویسوں کے ھاں قفقاز کا سب سے طویل دریا، جس کی لمبائی ۶۰۰ میل سے زیادہ اور بقول حَمْد اللہ القَزْوِینی (نُزْھَۃُ القُلوب (سلسلۂ یادگار گب)، ۱ : ۲۱۸) ۲۰۰ فرسخ ھے ۔ الاصْطَخْری، (در BGA، ۱ : ۱۸۹) بیان کرتا ھے کہ یہاں کشتی رانی ہو سکتی ھے اور اس میں بکثرت مچھلیاں ھیں ۔ آج بھی اس دریا میں مِنگچَور Mingecaur (اَلْاَزَن Alazan کے دہانے سے ذرا نیچے) سے بحیرۂ خَزَر تک جدید دخانی جہاز چلانے کے لیے صرف تھوڑی سی کمی پوری کرنے کی حاجت ھوگی ۔ دریائے سیحُون کو، جو قدیم زمانے میں ایک علٰحدہ دریا متصور ھوتا تھا اسلامی مآخذ میں ھمیشہ کُر کا معاون دکھایا گیا ھے ۔ بقول حَمْد اللہ القَزْوِینی (کتاب مذکور) اُن دنوں بحیرۂ خزر میں کُر کے دہانے کے علاوہ اس کی ایک شاخ باہر نکل کر بحیرۂ شمکُور میں جا گرتی تھی: یہ بیان (جو محض یہیں ملتا ھے) لازمی طور پر کسی غلط فہمی پر مبنی ھوگا ۔ حَمْد اللہ القزوینی کے ھاں ھمیں کسی ایسے بحیرے کا ذکر نہیں ملتا ۔ اس نے صرف ایک قصبہ شَمْکُور (روسی : شَمخور) کا ذکر کیا ھے، جو گنجہ سے تفلس جانے والی سڑک سے دو فرسخ کے فاصلے پر واقع تھا (کتاب مذکور، ص ۱۸۱ ببعد) اور جو آج کی طرح اس کے زمانے میں بھی کھنڈر ھو چکا تھا ۔ کُر میں جہاز رانی سے سیاسی تاریخ میں صرف ایک ھی دفعہ کام لیا گیا، یعنی جب ۳۳۲ھ/۹۴۳-۹۴۴ء میں روسیوں نے بَرْذَعہ کے قصبے کو تباہ و برباد کیا تھا (رک بہ برذعہ؛ نیز دیکھیے (۱) D.S. Margoliouth : *The Russian Seizure of Bardha'a in 943 A.D.*، در *Bull. of the School of Oriental Studies*، ۱۹۱۸ء، ص ۸۲ ببعد؛ (۲) A. Yakubovskiy : *Ibn Miska-veikh o pokhode Rusov v Berdaa v 332g.=943/4g*، یعنی *Vremennik*، ۱۹۲۳-۱۹۲۶ء، ۲۴ : ۶۳ ببعد) .

مآخذ : (۱) G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۱۷۹؛ (۲) E. Weidenbaum : *Putevoditel' po Kavkazu*، تفلس ۱۸۸۸ء، ص ۱۴ ببعد؛

(W. BARTHOLD)

* **الکَرَبِیْسی** : یعنی بزّاز؛ متعدد عرب مصنفین کی نسبت جن کے نام یہ ھیں : (۱) ریاضی دان

احمد بن عمر، جس کی تاریخ وفات معلوم نہیں اور جس کی تصنیفات میں اقلیدس کے ترجمے کی ایک شرح خاص طور پر مشہور ہے (دیکھیے الفہرست، ص ۲۶۵ س ۲۵، ص ۲۸۲ س۳؛ ابن القفطی : تاریخ الحکماء، قاہرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۵۷ س ۵) .

اس کی صرف ایک تصنیف ہم تک پہنچی ہے، یعنی کتاب مساحۃ الحلق (آوکسفرڈ و قاہرہ میں مخطوطات، دیکھیے *Bibl., Bodl. Codd. Mss. Or.*، ج ۱، عدد ۹۱۳؛ اور فہرسۃ الکتب العربیۃ فی کتبخانۃ الخدیویۃ، ۵ : ۲۰۴) .

(۲) محدث اور فقیہ ابو علی الحسین بن علی بن یزید المہلبی، جس کا شروع میں اہل الرّاے سے تعلق تھا، لیکن جب امام شافعیؒ بغداد میں آئے تو ان سے وابستہ ہوگیا ۔ بایں ہمہ وہ عقیدۂ جبر کا پورا حامی بھی رہا ۔ رجال حدیث اور فقہ کی تنقید پر اس کی تصانیف میں سے کوئی چیز باقی نہیں بچی ۔ اس نے ۲۴۵ھ/۸۵۹ء میں اور بعض کے نزدیک ۲۴۸ھ/۸۶۲ء میں وفات پائی .

مآخذ : (۱) [ابن ندیم] : الفہرست، طبع فلوگل، ص ۱۸۱ س ۴؛ (۲) السمعانی : الانساب، طبع عکسی از Margoliouth، سلسلۂ یادگار گب، جلد ۲۰، ۱۹۱۲ء، ورق ۴۷۶ ب؛ (۳) ابن خلّکان، طبع Wüstenfeld، عدد ۱۸۰ و قاہرہ ۱۲۹۹ھ، ۱ : ۱۸۱؛ (۴) الشّہرستانی: الملل، طبع Cureton، ص ۹۶؛ (۵) النّووی : تہذیب، طبع Wüstenfeld، ص ۴۷۷؛ (۶) السّبکی : طبقات، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۱ : ۲۵۱ تا ۲۵۶؛ (۷) ابن الأثیر : الکامل، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، ۷ : ۲۹؛ (۸) ابوالفداء : تاریخ، قسطنطینیہ ۱۲۸۷ھ، ۲ : ۳۹، و طبع Reiske-Adler، ۲ : ۲۰۴؛ (۹) ابن تغری بردی، طبع Juynboll، ۱ : ۷۵۳، ۷۶۳ .

(۳) حنفی فقیہ اسعد بن محمّد (م ۵۷۰ھ/۱۱۷۴ء)؛ اس کی کتاب الفروق فی الفروع کا، جسے حاجی خلیفۃ (کشف الظّنون، طبع فلوگل، ۴ : ۹۱۹، عدد ۹۰۴۱) نے المحبوبی کی تنقیح العقول (براکلمان، ۱ : ۳۸۰، عدد ۳۴) سے ملتبس کر دیا ہے، ایک نسخہ قاہرہ میں محفوظ ہے ۔ (دیکھیے فہرسۃ الکتب العربیۃ فی الکتب خانۃ الخدیویۃ، ۳ : ۹۶) .

(C. BROCKELMANN)

کراچی : [پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور ⊗ بہترین بندرگاہ، جو دریاے سندھ کے ڈیلٹا کے عین شمال مغرب میں بحیرۂ عرب کے کنارے ۲۴ درجے ۵۱ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۶۷ درجے ۴ دقیقے طول بلد مشرقی پر واقع ہے ۔ یہ صوبۂ سندھ کے اسی نام کے ضلع اور قسمت کا صدر مقام اور ملک کا تجارتی و صنعتی مرکز اور بین الاقوامی فضائی مستقر ہے ۔ خاص شہر کا رقبہ ۲۲۸ مربع میل اور عظیم کراچی کا رقبہ ۵۶۰ مربع میل ہوگا ۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے اس کی آبادی ۱۰۶۸۴۵۹ تھی، جو ۱۹۶۱ء میں بڑھ کر ۱۹۱۳۵۹۸ ہوگئی۔ اب یہ تیس لاکھ سے متجاوز ہوچکی ہے] .

کراچی کے نام کا تعلق زیادہ قدیم زمانے سے نہیں ہے ۔ شہر کے لوگوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ کوئی دو سو برس ہوے یہ صرف ماہی گیروں کی ایک بستی تھی، جہاں کُلاچی نامی ایک عورت حکمران تھی اور یہ بستی اسی کے نام سے موسوم تھی ۔ یہ نام بعد میں "کراچی" کی صورت میں بدل گیا؛ لیکن دراصل نام کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں بلوچوں کا ایک قبیلہ، جسے کُلاچی کہتے تھے، آباد ہوگیا تھا ۔ یہ لوگ اصل میں راجپوت تھے، (دیکھیے *Glossary of Punjab Castes*، لاہور ۱۹۱۱ء)؛ صوبۂ سرحد کے ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ایک قصبے کُلاچی کی وجہ تسمیہ بھی غالبًا یہی ہے ۔ سندھی زبان کے عام دستور کے مطابق کُلاچی کا لام، رے میں تبدیل ہو کر "کراچی" بن گیا (دیکھیے پنجابی : کوٹلی، اور سندھی : کوٹری) .

تاریخی پس منظر : [ایک عام روایت یہ بھی ہے کہ کراچی وہی مقام ہے جو محمّد بن قاسم کی آمد کے وقت دیبل کے نام سے مشہور تھا ۔ دیبل کے معنی ہیں مندر اور یہ شہر اس مندر کے باعث دیبل کہلاتا تھا جو آج بھی منوڑا میں واقع ہے ۔ سیٹھ ناؤ مل ہوت چند کا بیان ہے کہ کراچی سے ۱۶ میل مغرب میں دریاے حب کے دوسرے کنارے پر ایک بندرگاہ کھڑک بندر واقع تھی، جہاں اٹھارھویں صدی کے اوائل میں سیٹھ ناؤ مل کے دادا سیٹھ بھوجو مل کا شمار بڑے تاجروں میں ہوتا تھا ۔ جب یہ بندرگاہ ریت سے اٹ جانے کے باعث ناکارہ ہوگئی تو سیٹھ بھوجو مل اور اس کے ساتھی نئی بندرگاہ کی تلاش میں نکلے اور ماہی گیروں کی اس بستی میں منتقل ہو گئے جو ان دنوں "کلاچی جو گوٹھ" کہلاتی تھی ۔ تاجروں کی آمد سے یہ بندرگاہ ترقی کرنے لگی اور جب ایک اور نواحی بندرگاہ شاہ بندر میں بھی کیچڑ آ گئی تو وہاں کے لوگ بھی یہاں چلے آئے اور اس مقام کی رونق میں اور بھی اضافہ ہو گیا ۔ مانک پتھو والا کو اس سے اختلاف ہے ۔ کیونکہ] کھڑک خلیج فارس میں ایک جزیرہ ہے، جس پر ولندیزی ۱۷۴۸ سے لے کر ۱۷۶۵ء تک قابض رہے اور یہ کسی طرح کراچی پر اثرانداز نہ ہو سکتا تھا ۔ رہا شاہ بندر، تو وہ تو سندھ ڈیلٹا کی مشرق جانب سے اتنا دور ہے کہ اس کا کوئی اثر کراچی پر پڑ ہی نہیں سکتا ۔ اصلی سبب یہ تھا کہ دیول اور سندی (مشمولہ طور پر دیول سندی بھی مذکور ہے) کی دونوں بندرگاہیں، جو دریاے سندھ کے مغربی دہانے پر واقع تھیں آہستہ آہستہ بیکار ہو رہی تھیں ۔ یہ بندرگاہیں Thevenot (*Travels in India*، ۱۶۶۸ء) کے وقت میں بھی استعمال ہوا کرتی تھیں اور منوچی Manucci ۱۶۵۵ء میں ہندوستان جاتے وقت سندی میں بھی آیا تھا ۔ اٹھارھویں صدی میں خشکی کا حصہ بڑھ جانے کی وجہ سے ان بندرگاہوں کا تعلق سمندر سے منقطع ہوگیا، لیکن کراچی، جو ڈیلٹا سے کہیں باہر مغرب کی طرف واقع تھی، ریت اور گاد کی تیز تر بھرائی سے محفوظ تھی ۔ اس طرح جنوب مغربی سندھ کے بڑے شہر ٹھٹھہ کی جگہ بھی کراچی نے لے لی ۔

[۱۷۸۲ء میں بھوجومل کی موت کے وقت یہاں خاصی آبادی ہوچکی تھی ۔ کئی سال تک یہاں کا نظم و نسق بنیوں اور سیٹھوں کے ہاتھ میں رہا ۔ لیکن جلد ہی اس پر کلہوروں نے قبضہ کر لیا ۔ بعد ازاں خان قلات سے جنگ کے بعد کلہوروں نے اس کے بھائیوں کے قصاص کے طور پر کراچی کو خان قلات کے حوالے کر دیا ۔ کلہورہ خاندان کے زوال کے بعد امیر فتح علی خان تالپور نے اسے چھیننے کے لیے دوبارہ چڑھائی کی، مگر ناکام رہا، تاہم تیسری بار ۱۷۹۵-۱۷۹۶ء میں اس کا کراچی پر قبضہ ہوگیا ۔ ۱۷۹۶ء میں] اس نے بندرگاہ کی حفاظت کے لیے منوڑا کے مقام پر ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا ۔ اس وقت سے تجارتی کاروبار زیادہ بڑھ گیا ۔ ۱۸۰۸ء میں بوٹنجر نے یہاں کی سیاحت کی تو اس کی آبادی نو ہزار تھی اور اس کا شمار سندھ کے خوشحال شہروں میں ہوتا تھا ۔ ۱۸۳۱ء میں برنز (Burnes) کی تحقیقات کے مطابق یہاں کی آبادی پندرہ ہزار ہو چکی تھی ۔

۱۸۴۱ء میں سرچارلس نیپیئر نے یہاں آ کر لنگر ڈال دیے اور ۱۸۴۳ء میں سندھ کے الحاق [تفصیل کے لیے رک بہ سندھ] کے بعد وہ اس کی ترقی اور خوشحالی کی طرف متوجہ ہوا تاکہ اسے فوجی اور انتظامی مرکز کے علاوہ ایک اہم بندرگاہ بھی بنا دے، جو پنجاب اور سندھ کے تجارتی کاروبار کو ہاتھ میں لے سکے ۔

اپنی صحیح راے اور پیش بینی کی بدولت وہ

اس ترق کی بنیادیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جو زمانۂ حال میں ہو رہی ہے۔ ۱۸۵۴ء میں سربارٹل فریئر (Bartle Frere) نے نیپیئر مول (Mole = مصنوعی بندرگاہ) کی تعمیر سے، جو جزیرۂ کیماڑی کو برعظیم سے ملا دیتی ہے، اس بندرگاہ کی اصلاح اور درستی کی۔ ۱۸۶۹ تا ۱۸۷۳ء میں منوڑا کا بند تعمیر ہوا اور بندرگاہ کے رقبے کو رفتہ رفتہ محدود کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس رقبے کو زیادہ گہرا کرنے اور کارآمد بنانے کا کام بھی جاری رہا ۔ ۱۸۸۳ء میں دریاے ملیر سے کافی مقدار میں پانی لایا گیا۔

جنرل ھیگ [دیکھیے مآخذ] نے لکھا ھے کہ کراچی وھی مقام ھے جو سکندر اعظم کے زمانے میں ھیون Haven کے نام سے مشہور ھوا اور جہاں نیارکس Nearchus دریاے سندھ کے مغربی دہانے کے مغرب کی جانب سفر کرتا ھوا پہنچا تھا ۔ چونکہ اس مقام پر اصلی ڈیلٹے کی نسبت کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ھوئی اس لیے یہاں بعض موقعوں کی شناخت ممکن ھے۔ ببکتہ Bibakta کا ٹاپو غالباً وھی ھے جو آج کل منوڑا پائنٹ (Manora Point) ھے اور ایروس Eiros وہ سطح مرتفع ھے جو کیوورا Kiovra کی بندرگاہ کے مشرق میں ھے ۔ Clifton کا مقام ھمیشہ ایک جاے پناہ کے طور پر استعمال ھوتا رھا ھوگا ۔ موجودہ زمانے میں اس مقام کی زبردست ترقی کی وجہ یہ ھے کہ یہ پاکستان کی واحد بندرگاہ ھے، جہاں سے پاکستان کے علاوہ افغانستان اور [کسی حد تک] ایران کا مال، یعنی گندم، کپاس، روغنی تخم، کھالیں اور کھیل کود کا سامان باھر کے ملکوں میں جاتا ھے۔

[کراچی کا موسم سال کے زیادہ تر حصے میں خوشگوار رھتا ھے] ۔ یہاں نہ تو جنوب مغربی مون سون ھوائیں پہنچتی ھیں اور نہ جنوب مشرقی؛ اس لیے یہاں صرف دو موسم ھی ممکن ھیں ۔ سردی کا موسم ماہ نومبر میں شروع ھوتا ھے اور ماہ مارچ میں ختم ھو جاتا ھے [کم سے کم درجۂ حرارت ۵٦ درجے فارن ھائیٹ/۱۳ درجے سینٹی گریڈ؛ بعض اوقات تیز سرد ھوائیں چلنے سے درجۂ حرارت ۴۰ درجے فارن ھائیٹ/۴ درجے سینٹی گریڈ تک گر جاتا ھے] ۔ موسم گرما اپریل سے لےکر اکتوبر تک رھتا ھے [زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت ۹۳ درجے فارن ھائیٹ/۳۴ درجے سینٹی گریڈ، جو بعض اوقات ۱۰۵ درجے فارن ھائیٹ/۴۱ درجے سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ھے] ۔ برسات کا موسم زیادہ تر جون، جولائی اور اگست تک محدود رھتا ھے اور اس عرصے میں کوئی ۸ انچ کے قریب بارش ھو جاتی ہے ۔ ھواؤں کی رفتار بھی مختلف ھے؛ ۲۵ میل فی گھنٹے سے زیادہ رفتار کی ھوائیں تو موسمی ھواؤں کے زمانے میں چلتی ھیں، لیکن عام طور پر موسم گرما میں مغربی اور جنوب مغربی ھوائیں چلتی ھیں اور موسم سرما میں شمال مشرقی اور شمال مغربی ھواؤں کا زور ھوتا ھے ۔ دسمبر کا مہینا سب سے زیادہ خشک ھوتا ھے اس وقت درجۂ رطوبت صرف ۵۰ فیصد کے قریب ھوتا ھے؛ سب سے زیادہ مرطوب مہینا اگست کا ھوتا ھے، جب کہ کراچی میں درجۂ رطوبت ۸۴ فیصد کے قریب ھو جاتا ھے۔

زمانۂ حال کی ترقی اور توسیع : [قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے بعد کراچی ملک کا دارالحکومت مقرر ھوا تو یہ طے پایا] کہ کراچی کو زیادہ وسیع کیا جائے اور اسے ایک مرکزی شہر کی شکل میں تبدیل کرکے بیس ہزار ایکڑ کے رقبے میں پھیلا دیا جائے تاکہ اس علاقے میں ایک ایسا بڑا اور عظیم‌الشان شہر آباد ھو جائے جو اس سب سے بڑی اسلامی حکومت کے شایان شان ھو ۔ اس شہر کو اپنی شان اور زندگی کی بالیدگی حاصل ھو چکی ھے ۔ بندر روڈ کے دونوں طرف، جو کراچی کی سب سے زیادہ بارونق

اور اہم شارع عام ہے، ایک مستزاد حاشیے کی صورت میں نئی آبادیاں قائم ہوچکی ہیں ۔ دوسری بڑی بڑی سڑکوں کے ذریعے ایک نو وارد کراچی کے ان مضافات اور قصبات تک پہنچ جاتا ہے جو زیر تعمیر عظیم کراچی کا جزو لاینفک بن رہے ہیں ۔ [۱۹۵۹ء میں ملک کا دارالحکومت راولپنڈی ۔ اسلام آباد میں منتقل کر دیا گیا اور کراچی محض صوبۂ سندھ کا صدر مقام رہ گیا ۔ پھر صوبۂ سندھ کا صدر مقام بھی حیدرآباد قرار پایا ۔ بایں ہمہ کراچی کی توسیع و ترقی کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی] ۔

کراچی کی آبادی ۱۸۸۳ء میں دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی؛ ۱۹۴۱ء میں یہ تعداد پچھتر ہزار ہوگئی اور ۱۹۵۱ء میں گیارہ لاکھ[اور ۱۹٦۱ء میں انیس لاکھ] سے متجاوز ہوگئی۔ تقریباً ۹۵ فیصد مسلمانوں کی آبادی ہے۔ ان میں سے کم از کم تین چوتھائی آبادی [قیام پاکستان کے بعد بھارت یا ملک کے دوسرے صوبوں سے آنے والے مہاجرین یا نوواردوں کی ہے ۔ جہاں تک دوسری قوموں کا تعلق ہے ۔ ۱۹٦۱ء کی مردم شماری کی رو سے ان کی تعداد یہ ہے : ۷۹۳۰۱ ہندو، ٦۷۸٦ پسماندہ اقوام، ۳۵۱٦۵ عیسائی اور ٦۲۲٦٦ پارسی وغیرہ] ۔ آبادی میں ان انقلاب آمیز اور اچانک تبدیلیوں کے باوجود کراچی کی وہی مخلوط شان اب تک باقی ہے ۔ مختلف قوموں نے اس شہر کی ترقی اور بہبود میں برابر کا حصہ لیا ہے ۔ [قیام پاکستان کے بعد] مسلمانوں نے ہر میدان میں ترقی کی ہے اور اس شہر میں انگریز آبادکاروں اور ہندوؤں کی جگہ لے کر صنعت و حرفت کو بھی کافی فروغ دیا ہے ۔

[کراچی شہر کا نقشہ : کراچی ایک نہایت خوبصورت قدرتی بندرگاہ ہے، جو جزیرۂ منوڑا، جزیرۂ کیماڑی اور آئسٹر راکس Oyster Rocks کے باعث بحری طوفانوں اور حملوں سے محفوظ ہے ۔ بندرگاہ کے ساتھ ساتھ ایک طویل ساحلی پٹی چلی گئی ہے ۔ اس کے شمال اور مشرق میں سطح زمین بتدریج ۵ سے ۱۲۰ فٹ تک بلند ہوتی چلی گئی ہے اور اس وسیع میدان میں کراچی آباد ہے ۔ شمال اور مشرق میں چند پہاڑیاں بھی ہیں، جن میں سے بلند ترین منگھو پیر (۵۸۵ فٹ) ہے ۔ دو برساتی ندیاں، ملیر اور لیاری، علی الترتیب شہر کے مشرق اور شمالی حصے میں سے ہوکر گزرتی ہیں ۔ کراچی کے نقشے میں خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ اس کی چار بڑی سڑکیں، یعنی لارنس روڈ، بندر روڈ، فریئر روڈ اور میکلوڈ روڈ، میری ویدر ٹاور Mereweather Tower سے شروع ہوکر ایک دوسرے کے متوازی غرباً شرقاً چلی گئی ہیں اور انہیں مختلف مقامات پر متعدد سڑکیں، مثلاً نیپئر روڈ، کچہری روڈ اور گارڈن روڈ، شمالاً جنوباً قطع کرتی ہیں ۔ مرکزی شہر انہیں سڑکوں کے اردگرد آباد ہے ۔ پرانا شہر بندر روڈ کے شمال میں بندرگاہ کے قریب واقع ہے اور تقریباً ایک میل تک بے قاعدہ طور پر پھیلتا چلا گیا ہے ۔ اس کے مشرق میں ڈرگ چھاؤنی، سول لائن اور صدر بازار کے علاقے ہیں، جو یورپی طرز پر تعمیر ہوے ہیں ۔ ان سے آگے کئی سڑکیں نکل کر مضافات کی نئی بستیوں، مثلاً ناظم آباد، دہلی کالونی، سندھی ہاؤسنگ سوسائٹی، حیدرآباد کالونی، پیر الٰہی بخش کالونی، کورنگی کی طرف چلی جاتی ہیں ۔ نقشے پر کراچی شہر کچھ اس طرح نظر آتا ہے جیسے ایک بڑی سی مکڑی اپنی ٹانگیں چاروں طرف پھیلائے بیٹھی ہو (*Ency. Brit.*)] ۔

حمل و نقل : کراچی، جو ہمیشہ سے دنیا بھر کے لوگوں کا شہر سمجھا جاتا رہا ہے، اب ایسی بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس کی نظیر اس مقام کی تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اس شہر میں خشکی، تری اور ہوائی راستوں کے ذریعے آ جاسکنے

ہیں۔ [پشاور جانے والی شاہراہ اعظم اسے اندرون ملک سے اور زاھدان جانے والی سڑک ایران اور مشرق وسطیٰ سے ملاتی ہے ۔ شہر کے وسطی علاقوں میں سڑکوں کی لمبائی تقریباً چار سو میل اور مضافات میں ۱۶۰۰ میل سے زیادہ ہے ۔ کراچی پاکستان ریلوے کا آخری سٹیشن ہے] ۔ یہ ریلوے، جو وادی سندھ کے بیچ میں سے ہوکرگزرتی ہے، سمندر کے عقبی علاقے کی تمام پیداوار اس کے دروازے پر لاپھینکتی ہے اور درآمد شدہ مال اندرون ملک پہنچاتی ہے ۔ کوئی درجن بھر مال گاڑیاں یہاں روزانہ پہنچتی اور اتنی ہی تعداد میں یہاں سے روانہ ہوتی ہیں ۔ مال کے نقل و حمل میں ٹرک بھی بڑی تعداد میں استعمال ہوتے ہیں ۔

دنیا کے مختلف حصوں سے جو جہاز اب آتے ہیں وہ کیماڑی میں آ کر لنگر انداز ہوتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بعض ایسے سمندری راستوں کے مرکز میں واقع ہے جن پر بہت زیادہ آمد و رفت رہتی ہے ۔ کراچی بحری تجارت کے لیے ایک مرکزی مقام ہے، خصوصاً وہ تجارت جو ایک طرف تو خلیج فارس، نہر سویز اور راس اسید وغیرہ کے درمیان ہوتی ہے اور دوسری طرف لنکا، برما، جاپان، انڈونیشیا (ھند چینی) اور آسٹریلیا تک پھیلی ہوئی ہے ۔ الغرض کراچی سے ہر طرف بہتیرے بحری راستے پھوٹتے ہیں ۔ یہاں کی بندرگاہ ہر قسم کے جہازوں کے لیے ہر موسم میں محفوظ ہے کیونکہ منوڑا ٹاپو، جو بندر گاہ کے جنوب مغرب میں ہے، غیر معمولی محل وقوع کا حامل ہے ۔ آج کل کراچی کی بحری تجارت کی مجموعی مقدار لاکھوں ٹن تک پہنچ چکی ہے ۔ [۱۹۷۰-۱۹۷۱ء میں یہاں کی بیس سے زیادہ گودیوں میں ۶۳ لاکھ ٹن مال اتارا اور تقریباً ۳۲ لاکھ ٹن مال لادا گیا ۔ یہاں سترہ سو سے زیادہ جہاز سالانہ لنگر انداز ہوتے ہیں] ۔ اس کے علاوہ ھمسایہ ملکوں کے ساتھ ساحلی تجارتی کاروبار بھی مقامی طور پر بڑے پیمانے پر ہوتا رہتا ہے ۔

[کراچی ایک بین‌الاقوامی فضائی مستقر ہے، جہاں روز و شب یورپ، مشرق بعید، مشرق وسطیٰ، آسٹریلیا اور امریکہ کے درمیان ہوائی جہازوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے] ۔ ہوائی جہازوں کے اترنے کے لیے غیرمعمولی طور پر عمدہ زمین موجود ہے، جو ایک وسیع کف دست چٹیل میدان کی صورت میں پھیلی چلی گئی ہے ۔ سال بھر میں زیادہ عرصے کے لیے آب و ہوا بھی عموماً خشک ہی رہتی ہے، اس لیے کراچی کے دونوں ہوائی اڈے، ڈرگ روڈ (سول) اور ماڑی پور (فوجی) پوری رونق پر رہتے ہیں ۔ متعدد بین الاقوامی اور بین المملکتی کمپنیوں کے کاروبار کی وجہ سے یہاں شب و روز بڑی چہل پہل رہتی ہے ۔ ہزاروں مسافر، بھاری ڈاک اور تجارتی مال وغیرہ کی آمد و رفت اور نقل و حرکت ہر مہینے متواتر ہوتی رہتی ہے ۔ رات کے وقت پرواز کرنے کے لیے ضروری ساز و سامان مہیا ہے اور اس بات کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے کہ جیٹ قسم کے طیارے اور بھاری بھرکم ہوائی جہاز یہاں اتر سکیں ۔

[صنعت و تجارت : کراچی پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی اور تجارتی مرکز ہے ۔ یہاں تین ہزار سے زیادہ کارخانے چل رہے ہیں، جن میں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں ۔ پارچہ بافی اورکفش سازی کی صنعتوں پر خاص توجہ دی گئی ہے ۔ تیل صاف کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم ہے ۔ مشینیں، ادویات، ظروف، فرنیچر، کاغذ، بجلی کا سامان، چمڑے کی چیزیں وغیرہ بھی بڑی مقدار میں تیار ہوتی ہیں ۔ فولاد کا کارخانہ لگ جانے کے بعد اس کی صنعت و حرفت میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا ۔

یہاں تقریباً تیس بڑے بنکوں کے مرکزی دفاتر اوران کی شاخیں کام کر رہی ہیں ۔ دو درجن سے زیادہ بیمہ کمپنیاں ہیں اور ملک سب سے بڑا سٹاک ایکسچنج بھی یہاں قائم ہے .

عظیم کراچی کا نظم و نسق پانچ ادارے چلا رہے ہیں، یعنی کراچی میونسپل کارپوریشن، کورنگی لانڈھی میونسپل کمیٹی، ڈرگ ملیر میونسپل کمیٹی، کراچی کنٹونمنٹ بورڈ اور کراچی پورٹ ٹرسٹ ۔ کراچی میں آب رسانی کے مندرجۂ ذیل وسائل ہیں : (۱) جھیل ہالیجی سے، جو کراچی سے ۵۵ میل کے فاصلے پر ہے اور اس میں دریاے سندھ کا پانی آتا ہے؛ (۲) دریاے ملیر کی خشک تلیٹی میں کھودے ہوے کنووں سے؛ (۳) یہاں سے ۶۰ میل دور جھیل کالری سے ۔ شہر میں تقریباً دس کروڑ گیلن پانی روزانہ استعمال ہوتا ہے ۔ اس کے باوجود اس کے بعض حصوں، بالخصوص لانڈھی، ملیر اور ساڑی پور کی مضافاتی بستیوں میں قلت کی شکایت ہے .

کراچی تعلیمی مرکز بھی ہے، یہاں یونیورسٹی کے علاوہ ثانوی، اعلٰی اور صنعتی تعلیم دینے کے متعدد ادارے قائم ہیں] .

کراچی کا مستقبل نہایت درخشاں ہے ۔ بحرعرب کے ساحل پر یہ شہر اور اس کی بندرگاہ بے مثال ہے ۔ زمانۂ گزشتہ میں اس کی ترقی عظیم الشان رہی ہے اور اگر صحیح طریقے سے اس کی دیکھ بھال اور توسیع ہوتی رہی تو اس کی آبادی میں بھی کسی حد تک بڑھنے کے علاوہ یہاں کی دولت اور صحت میں بھی معتد بہ اضافہ ہو سکتا ہے .

مآخذ : (۱) Kaye و Pithawalla : *Geology and Geography of Karachi and its Neighbourhood*، دو حصے، کراچی ۱۹۴۶ء؛ (۲) مانک پیٹھا والا و خان محمّد شمشاد : *Climate of Karachi and how to live in it*؛ (۳) A. W. Hughes : *Gazetteer of the Province of Sind*، ۱۸۷۶ء؛ (۴) James Evans : *Memoires of Seth Naomal Hotchand, C.S.I.—1804 to 1879*، ۱۹۱۵ء؛ (۵) *Karachi District Gazetteer*، ۱۹۲۷ء؛ (۶) Postans : *Personal Observations on Sindh*، لنڈن ۱۸۴۳ء؛ (۷) Burton : *Sindh Revisited*، لنڈن ۱۸۹۷ء؛ (۸) عبدالحمید خان : *Towns of Pakistan*، ۱۹۵۰ء؛ [(۹) *District Census Repot, Karachi*، ۱۹۶۱ء؛ (۱۰) نذیر احمد : *Survey of Shelterless People in Karachi*، ۱۹۵۹ء؛ (۱۱) *The Great Karachi Resettlement Housing Programme*، مطبوعۂ کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی، ۱۹۶۱ء؛ (۱۲) A. F. Balie : *Kurrachee—Past, Present and Future*، ۱۸۹۰ء؛ (۱۳) H. Feldman ; *Karachi Through A Hundred Years*، ۱۹۶۰ء؛ (۱۴) G. Rains : *Indus-trial Efficiency and Economic Growth : A Case Study of Karachi*، ۱۹۶۱ء؛ (۱۵) امتیاز الدّین حسین، محمّد افضل و امجد علی بہادر رضوی : *The Social Characteristics of the People of Karachi*، ۱۹۶۵ء؛ (۱۶) *Encyclopaedia Britannica*، ۱۹۷۴ء، ج ۱۰؛ (۱۷) *Pakistan Year Book, 1971*؛ (۱۸) *The States-man Year Book 1974-75*؛ (۱۹) کیمی مارپوا : آج کا پاکستان (مترجمۂ محمّد حسن رابع)، لاہور ۱۹۶۶ء .

(MANECK B. PITHAWALLA [و ادارہ])

* **کَرَامَة** : [ع]؛ دراصل کَرُمَ (= کریم یا "نیک" ہونا، وسیع ترین معنی میں) کا مصدر، لیکن استعمال میں یہ ایک اسم ہے، جس کے معنی وہی ہیں جو اِکْرام اور تَکْرِیْم کے ہیں، یعنی کسی کے سامنے اپنے آپ کو نیک خو ثابت کرنا (لسان، ۱۵ : ۴۵۶ س ۳ ببعد) ۔ اگرچہ کریم کا لفظ بکثرت اللہ اور اس کے کاموں کے لیے قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے (راغب الاصفہانی : المفردات، بذیل مادّہ)، لیکن

کراسه کا لفظ کہیں نہیں آیا، لہٰذا اسلام کی دینی زبان میں اس کے معنی ہوے : اللہ کا اپنے احسان و انعام، حفظ و نصر کا کسی بندے پر مبذول فرمانا، مثال کے طور پر دیکھیے البیضاوی : تفسیر القرآن، بذیل ۱۰ [یونس] : ۶۳ (طبع Fleischer، ۱ : ۴۱۹ آخر صفحہ) جو اولیاء اللہ کی بابت معتبر ترین بیان ہے ؟ اور کرامات اس بذل کی جزئی صورتوں کو کہتے ہیں؛ چنانچہ کرامات کے مخصوص معنے ہوے ایک خارق عادت انعام و اکرام جس کو اللہ اپنے اولیا کے حفظ و حمایت کا ذریعہ قرار دیتا ہے ۔ قرآن مجید میں کرامات کا پتا ان آیات میں لگایا گیا ہے : ۳ [اٰل عمرٰن] : ۳۷ جس میں حضرت مریمؑ کے پاس مُقفّل محراب میں خرق عادت کے طور پر آپ ھی آپ خوراک پہنچ جانے کا ذکر ہے اور وہ آیات جن میں تخت بلقیس کو ایک مصاحب سلیمان کے، جس کا نام نہیں لیا گیا، آن کی آن میں یمن سے شام پہنچا دینے کا ذکر ہے (۲۷ [النمل] : ۴۰) ۔ چونکہ نہ تو حضرت مریمؑ پیغمبر تھیں اور نہ بے نام ساتھی پیغمبر تھا اس لیے اس خرق عادت کو دونوں صورتوں میں معجزہ نہیں کہہ سکتے۔ اس کی پوری بحث کے لیے دیکھیے شرح تفتازانی بر عقائد نسفی، قاهره ۱۳۲۱ھ، ص ۱۴۴ ببعد؛ لیکن حقیقت میں ان کی اصل سیر اولیاء میں ہے جن میں ان کے بے شمار خارق عادت کارنامے درج ھیں جو ان کی باطنی زندگی کے ناقابل شک احوال و مواجید کے مبالغہ آمیز اور محرف خیالی بیانات ھیں ۔ ان واقعات یا کارناموں کی تہ میں جو حقیقت واقعیہ کارفرما ہے اس کو تمام راسخ العقیدہ مسلمان، تسلیم کرتے ھیں، یہاں تک کہ ابن خلدون (طبع Quatremere)، ۱ : ۱۶۹، ۱۹۹، مترجمۂ دیسلان، ۱ : ۱۹۰، ۲۲۷) جیسا فلسفی مؤرخ اور ابن سینا جیسا مَشّائی فلسفی تک

بھی مانتے ھیں (اشارات، طبع Farget، ص ۲۰۹، ۲۱۹، ۲۲۱ ببعد)۔ ظاھر یہی ہے کہ یہ لوگ واقعات کے دباؤ کی وجہ سے اس مفروضے کی پناہ لینے پر مجبور ہوگئے کہ کائنات میں ابھی تک ایسے بہت سے راز پوشیدہ ھیں جو حل نہیں ہوے (دیکھیے Goldziher : *Die Richtungen desislamischen Koranauslegung*، لائیڈن ۱۹۲۰ء، ص ۱۳۹ حاشیہ ۳) ۔ صرف معتزلہ نے جنھیں اس بات کا یقین تھا کہ کائنات میں ایسے راز نہیں ھیں جو ان سے پوشیدہ رکھ چھوڑے ھیں، لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے دینی مسائل کی تحقیق کے لیے فقط عقل کو رہنما بنائیں، اس کے خلاف احتجاج کیا اور خود قرآن مجید میں اپنے احتجاج کی اصل بھی ڈھونڈ لی (دیکھیے الزمخشری : الکشاف، طبع Nassau Lees، ۲ : ۱۵۳۹ بذیل ۷۲ [الجن] : ۲۶، ۲۷)، اور اس مسئلے کی پوری تفصیل کے لیے دیکھیے Goldziher : کتاب مذکور، ص ۱۴۴ ببعد ۔ لفظ کرامات اور قدیم مسیحی مذھب (I cor. xii) کے لفظ χαρίσματα (قرنیتان اول باب ۱۲) تلفظ، اشتقاق اور معنی میں باھمی توافق عجیب ترین امر ہے اور اس کا اتفاق ہونا مشکل سے باور کیا جا سکتا ہے ۔ دونوں کے مذھبی مظاھر ایک جیسے ھیں، لیکن لفظی تعلق واضح نہیں، شام کے عیسائی χαρίσματα کو محض "تحفے" *Mauhᵉbhāthā* کہا کرتے تھے جس کی عربی مواھب ہے اور یہ لفظ سچ مچ کرامات کے لیے استعمال بھی ہوتا ہے ۔ ممکن ہے کہ یونانی لفظ جب سریانی میں منتقل ہوا تو اس نے عربی زبان بولنے والوں کو ان کا اپنا لفظ کرامات سمجھا دیا ہو ۔ اصطلاحاً کرامت بمفہوم بالا خارق العادۃ "عادت یا معمول کو توڑنے والوں" میں داخل ہے کیونکہ راسخ الاعتقاد اسلام میں Nature کوئی شے نہیں، اگر ہے تو فقط یا زیادہ سے زیادہ

اللہ کی ایک مقرر کی ہوئی عادت یا رسم ہے جس کے مطابق امور عالم عموماً ظہور پذیر ہوتے ہیں (Vorlesungen : Goldziher، ص ۱۳۰)۔ کرامت اور معجزہ (دلیل نبوت) میں فرق یہ ہے کہ کرامت کسی نبی سے اپنی نبوت کے ثبوت میں اللہ کی طرف سے صادر نہیں ہوتی اور اس کے ساتھ نبوت کا دعوٰی نہیں ہوتا نہ مخالفوں کو مقابلے کی دعوت دی جاتی ہے۔

معونت (مدد) اور کرامت میں یہ فرق ہے کہ معونت حاصل کرنے والا گو مسلم ہوتا ہے، لیکن اس پر کوئی دینی (باطنی) حال طاری نہیں ہوتا اور نہ اسے مذہبی تجربہ ہوتا ہے۔ یہ ارہاص سے بھی علیحدہ ہے جو اس غیر معمولی واقعے کو کہتے ہیں جو کسی نبی کی بعثت سے پہلے اس کے لیے میدان تیار کرنے کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کرامت استدراج اور اہانہ سے بھی مختلف ہے کیونکہ استدراج اور اہانہ کفار کی خاطر ظہور پذیر ہوتے ہیں تاکہ انہیں گمراہ اور شرمندہ کیا جائے (کشّاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۴۴۴ ببعد، النسفی: عقائد، محل مذکور مع اس کی شروح کے)۔ ولی کو اپنی کرامتیں چھپانی چاہییں حالانکہ نبی کے لیے ان کا اظہار ضروری ہے۔ ولی کو اپنی کرامات سے با خبر ہونا ضروری نہیں، لیکن نبی کو لا محالہ ان کا علم ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے، کہ ولی کی کرامت کو اس نبی کا معجزہ سمجھا جائے گا جس کا وہ پیرو ہے اور آخری بات یہ ہے کہ ولی کو جہاں تک ہو سکے اپنی کرامات کو نظر انداز کرنا چاہیے اور اسے بجائے عنایات ربّانی سمجھنے کے ذرائع ابتلا سمجھنا چاہیے۔

مآخذ : (۱) القشیری : الرسالہ، بولاق ۱۲۹۰ھ، مع شروح، ۴ : ۱۴۶ ببعد (دیکھیے Richard Hartman : *Das Ṣûfîtum nach al-kuschairi*)؛ (۲) Goldziher : *Muhammed. Studien*، ۲ : ۳۷۲ ببعد؛ (۳) الایجیؒ : المواقف، بولاق ۱۲۶۶ھ، مع شرح الجرجانی، ص ۵۷۸ ببعد، ۵۷۴ ببعد؛ (۴) ہجویری : کشف المحجوب، ترجمۂ آر۔ اے نکلسن، بمدد اشاریہ؛ (۵) الشعرانی : الطبقات الکبرٰی، بمواضع کثیرہ؛ (۶) یوسف النبہانی : جامع کرامات الاولیاء، قاہرہ ۱۳۲۹ھ، (حکایات کا بہت بڑا مجموعہ ہے)؛ (۷) ابن بطوطہ : تحفۃ النُظّار، بمواضع کثیرہ؛ (۸) D. B. Macdonald : *Religious Attitude and Life in Islam*، لیکچر، ۳ تا ۷، ۹۔

(D. B. MACDONALD)

* **کرامت علی :** جونپور [رک بآں] کے ایک شیخ گھرانے میں پیدا ہوئے (صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں غالباً انیسویں صدی کے اوائل میں) جس کے افراد اسلامی دور حکومت میں خطیب کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ کرامت علی کے والد کلکٹر جونپور کے دفتر میں سررشتہ دار تھے، انھوں نے دینیات اور دیگر علوم اسلامی کی تحصیل اپنے زمانے کے مشہور و معروف علما، خصوصاً شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی سے کی جو پہلے سید احمدؒ بریلوی کے استاد تھے اور جنھوں نے بعد میں ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ۱۸۲۰ اور ۱۸۲۴ء کے درمیان سید احمدؒ نے بنگال اور شمالی ہند کا دورہ کیا اور پیروؤں کی ایک جماعت فراہم کر لی۔ کرامت علی ان کے مخلص ترین نوجوان پیروؤں میں سے تھے، لیکن بظاہر انھوں نے اس جہاد میں شرکت نہیں کی جو سید احمدؒ نے سکھوں [رک بآں] کے خلاف کیا اور نہ وہ افغانستان کے اس سرحدی علاقے میں کبھی گئے جہاں ۱۸۳۱ء کی جنگ میں سید احمدؒ نے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ سید موصوف کی شہادت کے بعد ان کے معمر استاد شاہ عبدالعزیزؒ ان کے خلیفہ ہوئے اور بہار و بنگال میں تجدید اسلام کی تحریک بڑی سرگرمی سے شروع ہوئی۔ اس پر امن تحریک

میں کرامت علی بھی بدل و جان شامل ہوے اور انھیں اس تحریک کا سب سے کامیاب حامی اور داعی کہا جاسکتا ہے اور یقیناً وہ اس کے لائق ترین نمائندے تھے - انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشرات کے دوران میں مشرق بنگال میں کئی ایک چھوٹی چھوٹی اصلاحی تحریکیں چلیں، لیکن ان کے قائد ایسے لوگ تھے جن میں بہ نسبت علم و فضل کے جوش اور سرگرمی زیادہ تھی، مثلاً حاجی شریعت اللہ [رک بہ فرائضی]، جنھوں نے ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۶ - ۱۸۳۷ء میں کرامت علی سے کلکتے میں ملاقات کی - ۱۸۵۵ء تک دو مختلف الخیال گروھوں کے درمیان مصالحت کی کوششیں کسی حد تک کامیاب ھوچکی تھیں؛ چنانچہ ایک جلسے میں، جو باریسال میں منعقد ھوا، کرامت علی دوسرے گروہ کے نمائندے مولوی عبدالجبّار سے کئی ایک مسائل پر متفق ھوگئے، لیکن برطانوی ھند میں جمعے اور عید کی نمازوں کے شرعی جواز کے مسئلے پر مولوی عبدالجبّار کی شدید مخالفت پر غالب نہ آ سکے اور مولوی عبدالجبّار کے متبعین کو خوش کرنے کے لیے ظریفانہ انداز میں کہا کہ ان کے رھنما نے ملخ (ٹڈیوں) کو (جو حلال ھیں) غلطی سے گھاس کے ٹڈے (جو حرام ھیں) سمجھ لیا ھے (حجّت قاطعہ، ص ۲۹ تا ۳۲).

اپنی دعوت کے سلسلے میں کرامت علی کو دُہری کشمکش سے پالا پڑا - ایک طرف تو انھیں ان ھندوانہ رسوم اور توھمات کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی شرعی زندگی میں داخل ھوچکی تھیں (چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تصنیفات میں ان پر رد و قدح کرنے کے علاوہ ایک کتاب ردّ البدعۃ خاص اسی موضوع پر لکھی) اور دوسری طرف ان کی یہ کوشش تھی کہ راہ راست سے ھٹے ھوے سب فرقوں کو، جن کے خلاف انھوں نے کامیابی سے مسلسل جنگ کی تھی، سنت قائمہ کے دائرے میں لایا جائے - ان کی ضخیم کتابوں میں ان جہلا کا صراحۃً و کنایۃً بار بار ذکر آتا ھے - اس کے علاوہ اسی موضوع پر انھوں نے ایک اور مخصوص کتاب ہدایۃ الرّافضیّین تصنیف کی - وہ بنگال کے مسلم عوام کے ساتھ ھمیشہ ربط ضبط رکھتے تھے اور تمام نذرانے، جوانھیں وصول ھوتے تھے، حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے - وہ ایک مشاق قاری اور ماھر فن خوشنویس تھے.

گارساں دتاسی Garcin de Tassy (کتاب مذکور، ۲ : ۱۶۲) لکھتا ھے کہ Sir Charles Trevelyan نے اعلان کیا تھا کہ یورپ کی جدید نہضۃ علمیہ پر یونان اور عرب کے اثر کے موضوع پر جو ھندوستانی بہترین مقالہ لکھے گا اسے انعام دیا جائے گا - اس مقابلے میں کرامت علی نے بھی حصہ لیا تھا، لیکن انگریزی ترجمہ نہ ھونے کی وجہ سے، جس کا ساتھ ھونا شرائط کی رو سے ضروری تھا، ان کا مقالہ مقابلے میں شامل نہ کیا جا سکا - اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ وہ اپنے اکثر ھم عصر ھندوستانی مولویوں کے برعکس اس بات کے قائل تھے کہ بیرونی دنیا کے عام مسائل سے اسلام کا بھی تعلق ھے اور اس موضوع میں دلچسپی لیتے تھے - کرامت علی نے ۳ ربیع الآخر ۱۲۹۰ھ/ ۳۱ مئی ۱۸۷۳ء کو وفات پائی اور رنگ پور میں مدفون ھوے (تجلّی نور، ۲ : ۱۳۶)؛ گویا وفات کے بعد بھی وہ اسی صوبے میں رھے جہاں زندگی بھر احیاے اسلام کی کوشش میں مصروف رھے تھے - ان کے بعد یہ کام ان کے بیٹے مولوی حافظ احمد (م ۱۸۹۸ء) اور بھتیجے محمد محسن نے سنبھالا - کرامت علی کے متبعین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بنگال میں بمشکل کوئی ایسا گاؤں ھوگا جہاں ان کے شاگرد نہ ھوں - اس صوبے کے بعض اضلاع میں آج

تک ان کا اثر زندہ و پائندہ ہے ۔

ان کی تصنیفات زیادہ تر اردو میں ہیں ۔ رحمٰن علی (کتاب مذکور، ص ۱۷۱، ۱۷۲) نے ان کی ۴۶ کتابوں کی فہرست دی ہے اور یہ دعوٰی نہیں کیا کہ یہ فہرست جامع اور مکمل ہے ۔ ان کی ایک کتاب مِفْتاحُ الجنّۃ بار بار طبع ہو کر شائع ہوچکی ہے اور یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ اس کتاب میں اسلامی قواعد و مسائل کا بالکل درست اور صحیح بیان ہے ۔ ان کی تصنیفات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے : (۱) عام تصنیفات، مثلاً مفتاح الجنّۃ؛ (۲) قرآن مجید کی قراءت، اس کی لفظی تفسیر اور نماز و طہارت کے مسائل پر تصنیفات؛ (۳) پیری مریدی کے مسئلے پر تصنیفات، جو پاک و ہند کے اہل السنت و الجماعۃ مسلمانوں کے ہاں خاصا اہم ہے ۔ اس مسئلے کی اہمیت تسلیم کر لینے سے کرامت علی وہابی فرقے سے صاف طور پر جدا نظر آتے ہیں اور غیرمحسوس طور پر زمرۂ متصوفین سے جا ملتے ہیں اور انہیں اہل السنۃ کے مستند فرقوں سے مربوط و منسلک کرتے ہیں؛ (۴) شریعت اللہ، دُودُو میاں اور وہابیوں کے بارے میں مناظرانہ تصنیفات .

عام طور پر جو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کرامت علی وہابی تھے، اس کی تردید ان کے اپنے عقائد کے بارے میں اس مشرح و مبسوط بیان سے ہوتی ہے جو انھوں نے اپنی کتاب مکا شفات رحمت میں دیا ہے ۔ انھوں نے وہابیوں کی کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن ان کی بابت زبانی استفسارات ضرور کیے تھے ۔ کرامت علی اور ان کے پیرووں نے بڑی احتیاط سے شرک اور بدعت میں فرق بتایا ہے ۔ شرک کا مطلب سرے سے نفی اسلام ہے اور بدعت کا مطلب فقط کسی جزوی مسئلے یا عقیدے میں غلط فہمی ہے (ص ۳۹) ۔ انھوں نے حجت قاطعہ میں فاسق (گنہگار) اور کافر میں فرق واضح کیا ہے اور ان لوگوں پر سخت لعن طعن کی ہے جو ایسے لوگوں کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں جنھوں نے زندگی میں نماز نہیں پڑھی بلکہ فقط کلمہ ہی پڑھ کر بیٹھے رہے (ص ۲۱) اور یہ بھی بتایا ہے کہ اگر کسی اسلامی ملک کو غیر مسلم فتح کر لیں تو ان کے ماتحت ملک میں نماز جمعہ و عیدین [رکَ بآں] شرعی اعتبار سے نہ فقط جائز بلکہ واجب ہے (ص ۳۱، دو بار) ۔ انھوں نے اجازت روایت اور سند پر، جو مستند اساتذہ اپنے شاگردوں کو عطا کرتے ہیں، بڑا زور دیا ہے ۔ انھوں نے اپنے اصولی مسائل کی بنیاد حنفی المذہب راسخ العقیدہ سنی مسلمانوں کی کتابوں پر رکھی ہے (مکا شفات رحمت، ص ۷۳) ۔ صحاح سِتّہ، تفا سیر، اصول فقہ، مسالک تصوف اور پیری مریدی کے سلسلے ان کے نزدیک مسلّم تھے (ص ۳۸، ۳۵)، حتٰی کہ سید احمدؒ کی تحریک بھی ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث پرمبنی ہونا ثابت کرتے تھے (ص ۳۲) ۔ وہ مانتے تھے کہ ہر صدی میں احیاے دین کے لیے ایک مجدد پیدا ہوتا ہے ۔ سید احمدؒ تیرھویں صدی ہجری کے ایک ایسے ہی مجدد تھے اور ان کی پیروی لازم ہے، تاآنکہ چودھویں صدی میں کوئی اور مجدد پیدا ہو جائے (ص ۴۳) ۔ ان کی "اصلاح" فقط یہیں تک محدود تھی کہ ہندوانہ رسم و رواج کو مٹایا جائے یا ان باتوں کی بیخ کنی کی جائے جو لا علمی کی وجہ سے مسلمانوں میں رواج پا گئی ہیں (ص ۳۶) اور مسلمہ مذاہب اہل السّنۃ کے مطابق اسلام کو رواج دیا جائے (ص ۵۰) ۔ سیّد احمدؒ کی زندگی کے سیاسی اثرات نے ان کے متبعین کو ارباب حکومت سے متصادم کر دیا تھا، لیکن جماعت کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاست یا عقیدے کے اعتبار سے ان کا اس فرقے سے کوئی تعلق نہیں تھا جس کی بنیاد محمّد بن عبدالوھاب

[رک بآن] نے عرب میں رکھی تھی .

مآخذ : کرامت علی کے جو حالات یورپی مصنفین کے ہاں ملتے ہیں وہ غیر تسلی بخش ہیں، کیونکہ یہ بیانات سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اور یہ مصنفین اس اصلاحی فرقے اور وھابیت کے درمیان تمیز نہیں کر سکے بلکہ انھوں نے بعض جگہ مادۂ مندرجۂ بالا کے کرامت علی کو مولوی سید کرامت علی جونپوری (۱۷۹۶ تا ۱۸۷۶ء) سے ملتبس کر دیا ہے، جنھوں نے ۱۸۳۲ سے ۱۸۳۵ء تک کابل میں امیر دوست محمّد خان کے دربار میں برطانوی حکومت کی سفارت کی تھی اور ۱۸۳۷ تا ۱۸۷۶ء ھگلی کے امام باڑے کے متولی رہے تھے (*Nineteenth Century*، مئی ۱۹۰۵ء، ص ۸۰۷ تا ۸۲۷) - نیز دیکھیے (۱) *The Indian Musalmans* : W.W. Hunter، ص ۱۱۳؛ (۲) *Dictionary of Indian Biography* :C. E. Buckland، ص ۲۲۹؛ (۳) نور الدّین زیدی : تجلی نور، ۲ : ۱۳۹؛ (۴) *Census of India* (۱۹۰۱ء)، ۶/۱ (بنگال) : ۳۷ (کلکتہ ۱۹۰۲ء)؛ (۵) *Journal Asiatic Society of Bengal*، ۳/۶۳ : ۵۳ تا ۵۶ (کلکتہ ۱۸۹۴ء)؛ (۶) Garcin de Tassy : *Hist. de la litterature Hindouie et Hindoustanie*، پیرس ۱۸۷۰ء، ۲ : ۱۶۲ (یہ امر مشکوک ہے کہ کیا معجزۂ رشک مسیحا، دہلی ۱۸۶۸ء جس کا ذکر اس میں آیا ہے، زیر بحث کرامت علی ھی کی تصنیف ہے)؛ (۷) سیّد نور الدّین زیدی : تجلّی نور (جونپور کے مشہور لوگوں کے حالات زندگی)، جونپور ۱۹۰۰ء، ص ۱۳۵ و ۱۳۶ .

کرامت علی کے اعتقادات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ان کی اپنی تصنیفات کے مطالعے ھی سے ھو سکتا ہے، جن میں سب سے اہم مندرجۂ ذیل ہیں : (۱) مفتاح الجنّة، کلکتہ ۱۲۴۳ھ، (بارھا طبع ہوئی)؛ (۲) کوکب درّی، کلکتہ ۱۲۵۳ھ (اس میں ان لوگوں کے فائدے کے لیے جو عربی کا محض واجبی علم ھی رکھتے ھیں عبارات قرآنی کا ترجمہ دیا گیا ہے)؛ (۳) بیعت توبہ، کلکتہ ۱۲۵۴ھ (اس میں پیر کے ھاتھ پر بیعت توبہ اور دیگر اشغال مسالک دینیہ کا شرعی جواز پیش کیا گیا ہے)؛ (۴) زینة القاری، کلکتہ ۱۲۶۴ھ (قراءت قرآن مجید کے صحیح اصول و قواعد کے بارے میں)؛ (۵) فیض عام، کلکتہ ۱۲۸۲ھ (تفکر دینی پر ایک رسالہ، جس میں شیخ احمد سرھندیؒ کے نظریات کی تشریح پیش کی گئی ہے)؛ (۶) حجّت قاطعہ، کلکتہ ۱۲۸۲ھ (ایک مناظرانہ رسالہ، جو شریعت اللہ اور ان کے بیٹے دُودُو میاں [عام طور پر اس کا تلفظ دوُدھو میاں کہا جاتا ہے، مگر کرامت علی اسے ھمیشہ اسی طرح لکھتے ھیں] کے خلاف لکھا گیا ہے)؛ (۷) نور الھُدٰی، کلکتہ ۱۲۸۶ھ (عقائد تصوف اور مجددیہ مذھب کے بارے میں، جس سے بظاھر سید احمدؒ بریلوی کا نیا مذھب مراد ہے)؛ (۸) مکاشفات رحمت، کلکتہ ۱۲۸۶ھ (اس میں سید احمدؒ بریلوی کی زندگی اور کارناموں کے حالات ملتے ھیں اور وھابیوں کو زیر بحث لا کر ان سے اپنی بے تعلقی ظاھر کی ہے)؛ (۹) زینة المُصَلّی، کلکتہ ۱۲۵۹ھ (وضو اور نماز وغیرہ کے متعلق ھدایات)؛ (۱۰) زاد التّقوٰی، کلکتہ ۱۲۸۷ھ، (اسلامی عقائد و اعمال اور تصوف کے بیان میں - اس میں نقشبندیہ تعلیم کو قبول کیا گیا ہے)؛ کرامت علی کی تصنیفات کی ایک نامکمل فہرست کے لیے دیکھیے (۱۱) رحمٰن علی : تذکرۂ علماے ھند، لکھنؤ ۱۸۹۴ء، ص ۱۷۱، جس میں ۴۶ مختلف کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے .

(عبداللہ یوسف علی)

⊗ **کَرامَرس :** (J. H. Kramers)، بیسویں صدی کا ایک ولندیزی مستشرق، ۱۸۹۱ء میں پیدا ھوا اور ۱۹۵۱ء میں وفات پائی - کرامرس نے لائیڈن یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی - فارغ التحصیل ھونے کے بعد اس نے استانبول کے ولندیزی سفارت خانے میں ترجمان کے فرائض ادا کیے (۱۹۱۵ تا ۱۹۲۲ء) - بعد ازاں وہ لائیڈن یونیورسٹی میں ترکی اور فارسی زبانوں کا استاد اور ۱۹۳۹ء

میں پروفیسر ونسنک Wensinck کی وفات پر اس کی جگہ عربی کا پروفیسر مقرر ہوا اور تا دم مرگ اسی عہدے پر فائز رہا .

کرامرس نے ترکوں کے فن تاریخ پر ایک کتاب تالیف کی، جو ۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی - اس نے ابن حوقل کی کتاب المسالک و الممالک کو بھی از سرنو، مرتب کیا، جو لائیڈن میں ۱۹۳۸ء میں طبع ہوئی۔ اس نے *Encyclopaedia of Islam* میں متعدد مقالے لکھے، جو اس کے علم و فضل پر دلالت کرتے ہیں۔ اس نے پروفیسر ہملٹن گب H. Gibb کے ساتھ مل کر *Encyclopaedia of Islam* کا ایک مختصر اڈیشن مرتب کیا اور اس میں صرف ان مقالوں کو شامل کیا جو مذہبی حیثیت رکھتے تھے اور چند ایک نئے مقالوں کا بھی اضافہ کیا - یہ منتخب اڈیشن ۱۹۵۳ء میں *Shorter Encyclopaedia of Islam* کے نام سے شائع ہوا - اسی طرح کرامرس نے پروفیسر ونسنک کے ساتھ مل کر اسی انسائیکلوپیڈیا کے جرمن اڈیشن کا ایک اختصار بھی مرتب کیا اور اس میں صرف ان مقالوں کو شامل کیا جو براہ راست دین اسلام کے ساتھ تعلق رکھتے تھے - یہ مختصر جرمن اڈیشن ۱۹۴۱ء میں لائیڈن میں طبع ہوا - اس میں بعض مقالوں میں جزوی ترمیم کی گئی ہے، بعض کو مختصر کر دیا گیا ہے اور بعض نئے مقالے شامل کیے گئے ہیں .

جب ۱۹۳۱ء میں پروفیسر آرنلڈ T. Arnold اور پروفیسر گیوم A. Guillaume نے مل کر *The Legacy of Islam* کو شائع کیا تو کرامرس نے بھی اس کتاب میں ایک باب Geography and Commerce کے موضوع پر لکھا، جو قیمتی معلومات سے بھرپور ہے.

کرامرس کی ایک قابل ذکر علمی خدمت یہ ہے کہ اس نے قرآن مجید کا ولندیزی زبان میں ترجمہ کیا، جو ایمسٹرڈم سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا - اس ترجمے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں قرآن مجید کے مضامین کا ایک مفصل اشاریہ بھی شامل ہے .

اس نے ولندیزی میں سامی زبانوں پر ایک مختصر کتاب بھی لکھی تھی، جو لائیڈن میں ۱۹۴۹ء میں طبع ہوئی .

مآخذ : (۱) نجیب العقیقی : المستشرقون، ۲ : ۶۷۰؛ (۲) مقالہ نگار کی ذاتی معلومات .

(شیخ عنایت اللہ)

⊗ **کَرْبَلاء** : (کربلاے معلّٰی) عراق کا ایک مشہور شہر، جو حضرت امام حسینؓ، حضرت عبّاسؓ، حُرّؓ بن یزید الرّیاحی اور حبیبؓ بن مُظاہر کے مزاروں اور واقعۂ عاشورا کی وجہ سے زیارت گاہ و مرکز عقیدت ہے .

تاریخ قدیم میں کربلاء کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے، مثلاً غاضِریّہ، نینوٰی (غالباً حائر کے جنوب مشرق میں ایک قریہ، جسے اب ایک محلے کی شکل حاصل ہو گئی ہے؛ تاریخ کربلاء و حائر الحسین، ص ۹۸)، عَمّورا، شاطیء الفرات، شطّ الفُرات، طَفّ الفرات، طَفّ ماریہ، نَواوِیس، صَفُّورا، حائر .

آثار قدیمہ کے ماہر گزشتہ ہزار برس کی تاریخ اور نام و نشان پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں : (۱) کربلا کُور بابل ہے، یعنی بابل کے قریے؛ (۲) کربلا اشوری نام ہے، جو "کرب" و "ایلا" سے مرکب ہے اور اس کے معنی ہیں "حرم اللہ"؛ (۳) کربلاء مشرق سے جنوب تک پھیلے ہوئے ٹیلوں کا نام ہے اور اسی مناسبت سے اس آبادی کو کربلاء کہا گیا .

لغت نگاروں اور عوامی روایات کے مطابق اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے : (۱) کربلا : پاؤں کی نرم روی کو کہتے ہیں۔ یہ زمین چونکہ نرم و کشادہ تھی اس لیے کربلا نام پایا؛ (۲) کُرْبَلَتِ الحِنْطَۃ :

گیہوں چھانے اور پھٹکے گئے ۔ چونکہ یہ زمین کنکروں سے خالی ہے، لہذا کربلاء کہلائی ۔

(۳) کَرْبَل : ایک کڑوی جنگلی گھاس کا نام ہے ، جو اس میدان میں بھی اُگتی تھی ۔

یہ ایک آشوری نام (کرب وایلا سے مرکب) ہے، اس خیال کی تائیداس سے ہوتی ہے کہ عراق اوراس کے مضافات میں مختلف بستیوں کے نام میں "کَر" موجود ہے، جیسے کَرکُوک اور کَرخ ۔ توفیق وھبی کے نزدیک آشوری میں کار کے معنی ہیں قلعه یا چاردیواری سے گھرا ہوا قریه (اصل اسم کرکوک، در مجلّة العِرفان، بیروت، رجب ۱۳۹۱ھ) ۔

دریاے فرات اپنے کناروں کی زرخیزی کی وجه سے صدیوں سے آباد چلا آ رہا ہے ۔ عراق کی قدیم تاریخ میں کلدانی، تنوخی، لخمی اور مناذرہ سلطنتیں مشہور تھیں ۔ اس زمانے میں شہر حیرہ حکومت کا صدر مقام اور عین التَّمر یہاں کا مشہور تجارتی مرکز تھا ۔ کربلاء ان دونوں شہروں کے درمیان آباد تھا ۔

عرب نسل کی شاخیں بنو فارم، ایاد اور عرب قبائل کے چند ایک خاندان قدیم زمانے سے ان علاقوں میں آباد چلے آتے ہیں ۔ موجودہ شہر کربلاء کے گرد دور تک پھیلے ہوے ٹیلے ہزار دو ہزار صدی قبل مسیح کے برباد شدہ شہروں کے آثار ہیں ۔ ٹیلوں کے نیچے آشوری ، بابلی ، ساسانی، اموی اور غزنوی، عہد کی تہذیبیں دفن ہیں ۔ سیّد محمّد حسن مصطفٰی کلیدار نے مدینة الحسین میں چوالیس ٹیلوں کے نام دیے ہیں ، جن میں خیط نینوی الکاظمی، سلسله تُلول نینوٰی السّاقیات بھی ہیں ۔ قریب قریب بستیوں کے آثار اور ناموں کی شہرت کے سبب تاریخ واقعۂ کربلاء کے آغاز میں جب امام حسین رضی اللہ عنه کی آمد سے متعلق روایات کا مطالعه کیا جاتا ہے تو ہمیں متعدد نام ملتے ہیں ۔ حقائق سے بے خبر شخص ان ناموں کو سن کر روایات میں تضاد محسوس کرتا ہے، حالانکه اس کی مثال یوں سمجھی جا سکتی ہے جیسے کوئی دہلی کو ہستناپور، تغلق آباد، دلّی اور شاہجہان آباد کے ناموں سے یاد کرے ۔

کربلاء کا میدان فرات کی موجودگی پر بھی قحط آب کے لیے مشہور تھا، اس لیے پرانے بادشاہوں نے نہریں کھدوائی تھیں ۔ سابور ذوالاَکتاف (۳۰۹ تا ۳۷۹ء) نے تو ایک بہت بڑا نہری سلسله قائم کیا تھا، جس کے مٹے ہوے آثار اب بھی ملتے ہیں ۔ اس کے بعد ایک اور نہری نظام بنا، جس کی ایک نہر ایک شخص علقمه سے منسوب ہے ۔ یه نہریں زمین کی نرمی، خاک کی باریکی اور دریائی مٹی کی آمد سے اٹ جاتی تھیں اور حکومتوں کی افراتفری کی وجه سے بے آب ہو کر لوگوں کی پریشانی کا سبب بنتی تھیں ۔ لوگ کنویں کھودتے تھے، لیکن وہ بھی زیادہ کارآمد نه تھے ۔ اس سلسلے میں احتیاطی تدبیریں کیا ہوتی تھیں اور نہروں کی صفائی کب سے ختم ہوئی ؟ اس کا پتا تاریخ سے نہیں چلتا ۔ کہتے ہیں کہ غازان خان ایلخانی نے فرات سے حِلّه و کربلاء کے لیے نہر کھدوائی تھی اور ۷۰۳ھ میں جب وہ زیارت مشہد حسینی کے لیے آیا تو اہل کربلاء کو غلے اور خوراک کی وافر امداد دی ۔ تاریخ قدیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ میدان فرات کا کربلائی علاقه بے آبی کی وجه سے مشہور تھا اور تاریخ کے بعض خطرناک واقعات کی بنا پر خاص نظر سے دیکھا جاتا تھا ۔

کربلاء عہد اسلام میں : امام حسینؓ کی شہادت کا تذکرہ اور آنحضرت صلّی اللہ علیه وآله وسلم کا خاک کربلا ملاحظه فرمانا اور اسے سونگھنا ، نیز کربلاء کی مٹی کا حضرت ام المؤمنین ام سلمهؓ کو بطور امانت دینا، متعدد

شیعی مآخذ میں مذکور ہے (الصّواعق المُحْرقہ، قاھرہ ۱۳۱۲ھ، ص ۱۱۵ و ۱۳۸۵ھ، ص ۱۹۲) ۔ ۳۹ھ میں جب حضرت علیؓ جنگ صفین کے زمانے میں اس طرف تشریف لائے تو کربلاء کا نام سن کر زار و قطار رونے لگے ۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس قدر رونے کا کیا سبب ہے ؟ فرمایا : ”ایک دن میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں حاضر تھا ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا کہ جبریلؑ نے مجھے بتایا ہے کہ حسینؓ شاطی الفرات میں کربلاء نامی جگہ شہید ہوں گے ۔ آپؐ نے مٹھی میں خاک کربلاء لے کر مجھے سونگھنے کو دی تھی، اسی لیے مجھے رونا آ گیا“ (الذّھبی : سیر اعلام النبلاء، ۳ : ۱۹۴، ۱۹۵) ۔ ایک روایت کے مطابق حضرت علیؓ مقام کربلا سے گزرتے ہوے ایک جگہ رکے، نماز پڑھی اور فرمایا : ”ھہنا مناخ رکابھم و ھہنا موضع رحالھم و ھہنا مھراق دمائھم فتیۃ من آل محمّد یقتلون بھذہ العرصۃ تبکی علیھم، السمّاء والارض“ یعنی یہاں ان کے اونٹ بیٹھیں گے، یہاں ان کے کجاوے رکھے جائیں گے اور یہاں ان کے خون بہائے جائیں گے، آل محمد کے کچھ جوانمرد یہاں قتل ہوں گے اور ان پر زمین و آسمان روئیں گے (الصّواعق المحرقہ، طبع ۱۳۸۵ھ، ص ۱۹۲؛ کمال الدّین و تمام النعمۃ، تہران ۱۳۹۱ھ، ص ۵۳۳؛ کتاب الصّفین، ص ۱۴۰، ۱۴۲) ۔

محرم ۶۱ھ کی دوسری تاریخ کو امام حسینؓ کربلاء میں خیمہ زن ہوے ۔ انھوں نے یہاں زمین خریدی (المقرّم : مقتل الحسین، ص ۲۳۵) اور ۱۰ محرم ۶۱ھ کو انھوں نے اسی زمین پر اپنی دائمی منزل بنائی ۔ ان کی قبر مبارک ایک نشیب میں تھی، جس کے گرد کچھ اونچے ٹیلے تھے ۔ اسی لیے اس مقام کو شروع میں ”الحائر“ کہا گیا (مَراصدُ الاطلاع، ۲ایران ۱۳۱۵ھ، ص ۱۲۶؛ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر عبد الجواد : تاریخ کربلاء و حائرالحسین، ص ۱۷ ببعد) ۔

صفر ۶۲ھ/۶۸۲ء میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کربلا آئے تھے اور اھل بیت بھی شام سے رھائی حاصل ھونے کے بعد یہاں آئے (المقرّم : مقتل الحسین، ص ۴۶۷) ۔ اس زیارت کی یاد میں اب تک ۲۰ صفر کو کربلا میں خاص دن منایا جاتا ہے ۔

شعبان ۶۵ھ/۶۸۵ء تک کربلا کی آبادی کا باعث یا تو زائرین تھے یا غاضریہ اور نینوا کے باشندے ۔ ۶۵ھ میں ابو اسحٰق مختار بن ابی عبید الثقفی نے بنو امیّہ کے خلاف بغاوت کی اور اسی زمانے میں مزار امام حسینؓ پر ایک چھوٹی سی عمارت بنوائی، جس کا ایک دروازہ مشرق کی طرف تھا اور ایک مغرب کی جانب ۔ ایک مسجد بھی تعمیر ہوئی ۔ اس سے قبل وھاں ایک بیری کا درخت تھا جسے باقی رکھا گیا ۔ اس عمارت اور درخت کو ھارون الرشید نے ختم کر دیا ۔ المامون نے اپنے دور میں دوبارہ یہ عمارت بنوائی، لیکن المتوکل نے اسے گرا دیا (الطبری، ۱۱ : ۴۴؛ تاریخ الرّوضۃ الحُسینیہ، ص ۹؛ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مقالہ کربلا، تاریخ و تعمیر، در رضا کار، لاھور، محرم ۱۳۹۱ھ) ۔ اس کے بعد تاریخ وار تعمیر و تجدید کا خلاصہ یہ ہے :

المنتصر باللہ (۲۴۷ھ/۸۵۹ء ببعد) نے نئے سرے سے روضہ بنوایا اور راستے میں نشان راہ نصب کیے ۔ ۲۷۳ھ/۸۸۵ء میں یہ عمارت عرفے کے دن منہدم ھوگئی (محمّد حسن : تاریخ کربلاء، ص ۸۹) ۔

۲۸۳ھ/۸۹۶ء میں محمّد بن محمّد بن زید، حاکم طبرستان، نے ایران سے پتھر بھیج کر شاندار عمارت تیار کرائی ۔

بقول ابن حوقل (طبع ڈخویہ، ص ۱۶۶) - ۳۶۱ھ/۹۷۲ء میں یہاں ایک وسیع گنبد دار عمارت موجود تھی اور زائرین کثیر تعداد میں آتے تھے - کچھ عرصے بعد ضبّہ بن محمد الاسدی نے، جو عین التمر کے متعدد قبائل کا سردار تھا، مشہد الحائر اور دیگر عمارات کو منہدم کرا دیا، جس پر ۳۶۹ھ/۹۷۹ء میں اس کے خلاف ایک مہم بھیجی گئی اور وہ صحرا کی طرف بھاگ گیا (ابن مسکویہ، در *The Eclipse of the Abbasid Caliphate*، ۲ : ۳۳۸، ۴۱۴) - اسی سال عضد الدّولہ بویہی نے مشہد، نجف اور مشہد کربلاء کی نگرانی اپنے ذمّے لے لی (ابن الأثیر، ۸ : ۵۱۸ ؛ المستوفی، محل مذکور] اور عمران بن شاهین نے روضے کی تجدید کی .

۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں عضد الدولہ بویہی نے زیارت کے لیے حاضری دی اور دو شاندار کشادہ حرم اور ضریح کے ایوان پر بڑا گنبد تعمیر کرنے کے علاوہ اندرونِ حرم آرائش و زیبائش، روشنی اور آبادی کا انتظام کیا .

۴۰۲ھ میں بہاء الدّولہ کے وزیر نے قیمتی هدیے نذر کیے - ۴۰۷ یا ۴۰۸ھ میں حسن بن فضل وزیر نے آتش زنی کے بعد از سر نو روضے کی رونق بحال کی .

۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں ملک شاہ سلجوقی زیارت سے مشرف ہوا - اسی نے شہر پناہ کی تعمیر اور تجدید عمارت کا فریضہ انجام دیا - ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء میں ناصرالدّین اللہ نے تزئین کرائی - ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں سلطان ابوسعید بہادر خاں بن خدا بندہ کے عہد میں ابن بطّوطہ زیارت کے لیے آیا - اس کا بیان ہے: "یہ چھوٹا سا شہر کھجور کے باغوں سے گھرا ہوا ہے - فرات کا پانی زمین سیراب کرتا ہے - وسط شہر میں روضہ ہے - اس میں ایک بہت بڑا مدرسہ اور مہمان خانہ [زاویہ] ہے، جہاں مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے - روضے کے دروازے پر حاجب و دربان ہیں، جن کی اجازت کے بغیر اندر جانا ممکن نہیں - آستانۂ مقدس کا دروازہ چاندی کا ہے ؛ [ضریح مبارک پر سونے اور چاندی کی قندیلیں آویزاں ہیں] اور دروازوں پر ریشم کے پردے ہیں" (تُحفَۃُ النُّظّار، [قاهرہ ۱۲۸۸ھ، ۱ : ۱۳۲] .

۷۴۰ سے ۸۲۷ھ تک ایلخانی امرا اور آل جلائر کی بغداد پر حکمرانی رہی، جنھوں نے روضے کی نگہداشت کی - حسن [الجلائری] ۷۵۷ھ میں فوت ہوا تو نجف اشرف میں دفن کیا گیا - مرجان نے، جو اس کے فرزند اُویس کی طرف سے بغداد کا نائب مقرر تھا، بغاوت کرکے کربلاء میں پناہ لی اور اپنی تمام املاک روضے کے لیے وقف کر دیں - اس نے صحن کے شمال مشرق میں ایک شاندار عمارت بنوائی، حرم میں مینار بنوائے اور ان پر سونا چڑھوایا (۷۶۷ھ)؛ مَرجان کا مینار اور کچھ اور آثار ۱۳۵۴ھ میں منہدم کرا دیے گئے (تاریخ کربلاء، ص ۱۱۴) - اس کے بعد دو تین سو برس میں کربلاء زیارت گاہ عام اور ایک آباد و با رونق شہر ہو گیا - (مدینۃ الحسین، ص ۱۰۵ ببعد) .

دسویں صدی کے آغاز میں صفویوں نے عراق کا رخ کیا - [۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء تک] شاہ اسمٰعیل عراق اور الجزیرہ وغیرہ پر قابض ہو گیا اور روضۂ امام حسین رضؓ پر حاضری دی - اس نے شاہانہ حوصلے سے روضے کی تجدید کی اور ایک چاندی کی ضریح نذر کی - [سلطان سلیمان قانونی کے عہد میں عراق ایک بار پھر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا - ۹۴۲ھ/ ۱۵۳۴ء میں سلطان زیارت کے لیے آیا اور نہر الحسینیہ کی مرمت کرانے کے علاوہ ویران اراضی پر باغات لگوائے - ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں منارۃ العبد (قبل ازیں موسوم بہ انگشت یار) تعمیر ہوا - ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء میں سلطان مراد ثالث کے حکم سے بغداد کے والی]

علی پاشا نے گنبد اور عمارت کو دوبارہ بنوایا ۔ ۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس اوّل نے قبر کو سادہ دیکھ کر فولادی ضریح نصب کروائی اور ایوان میں کاشی کاری اور فرش کے لیے قالین کا انتظام کیا ۔ ۱۰۴۷ھ میں سلطان مراد رابع نے گنبد کی مرمت اور بورق سفید سے پوری عمارت پر استر کاری کروائی .

۱۱۳۵ھ میں نادر شاہ افشار کی ملکہ نے بڑے پیمانے پر تمام عمارتوں کو بنوایا اور بہت بڑا وقف قائم کیا ۔ ۱۱۵۵ھ میں نادر شاہ خود حاضر ہوا اور حرم میں از سر نو کاشی کاری، آئینہ کاری، اور سونے چاندی کا کام کروایا ، بیش بہا ھدیے پیش کیے اور انتہائی آب و تاب بخشی (بیان واقع، مطبوعۂ لاہور، ص ۱۳۱) .

۱۲۱۱ھ میں محمّد شاہ قاجار نے گنبد اور میناروں پر سونا چڑھوایا .

۱۸ ذوالحجہ ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۲ء میں [محمّد بن] عبدالوھّاب نجدی کے متبعین نے کربلاء پر حملہ کیا، قتل و غارت گری کے علاوہ ان لوگوں نے کربلاء کے روضے لوٹ لیے اور تمام اسباب لے گئے (اَعْیان الشیعہ، ۴/۱ : ۳۰۴) ۔ فتح علی شاہ قاجار نے اس نقصان عظیم کی شاندار تلافی کی ۔ اب کی مرتبہ کربلاء کی تاریخی تعمیر و آرائش ہوئی اور ۱۲۲۷ھ میں روضۂ انور از سرنو مطلاّ کیا گیا ۔ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء میں اسی بادشاہ نے حضرت امام حسینؓ اور حضرت عباسؓ کے روضوں کے گنبدوں پر سونا چڑھوایا ۔ ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۵۹ء میں ناصر الدّین شاہ قاجار نے دوبارہ زرکثیر خرچ کرکے طلا کاری کرائی ۔ ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء میں وہ خود زیارت کے لیے حاضر ہوا اور بہت سے مکانات خرید کر حرم کی توسیع کی اور اوقاف قائم کیے .

اس کے بعد سے اب تک کم و بیش کربلاء اور اس کے مقدس مزارات مسلسل دیکھ بھال کی وجہ سے محفوظ ھیں ۔ اھل دل حسب حیثیت خدمت کرتے رھتے ھیں، مثلاً ۱۳۴۱ھ میں سیّد محمّد خزینہ نے مشرقی دروازے پر گھڑی نصب کی ؛ ۱۳۵۸ھ میں بوھروں کے داعی اعظم مُلاّ طاھر سیف الدین نے کئی لاکھ روپے کے صرف سے گنگا جمنی ضریح نذر کی، جو قبر اقدس پر موجود ھے ؛ ۱۳۸۶ھ میں ایک ایرانی تاجر قنبر رحیمی نے سبز رنگ کا بہترین ایرانی سنگ مرمر بھیجا تاکہ از سر نو ایوان تیار کیا جائے ۔ اسی انداز پر روضۂ حضرت عباس [اور دوسرے بزرگوں کے مقابر] کی تعمیر و تزئین ھوتی رھی .

راقم الحروف نے ۱۳۸۹ھ میں زیارت کے موقع پر پورا شہر، سرسبز و شاداب، صاف و شفاف اور حضرت امام حسینؓ اور حضرت عباسؓ کے روضوں کو انتہائی شان و شوکت کے عالم میں دیکھا تھا ۔ ۲۰ صفر کو دنیا بھر کے زائر شہر میں جمع ھوتے ھیں اور دن رات شدید ماتم ھوتا ھے ۔ اس دن کو "اربعین" کی مخصوصی کہتے ھیں ۔ دوسرا اھم اجتماع ۹ ذوالحجّہ کو ھوتا ھے ۔ اس کے علاوہ رجب، شعبان اور محرم کے دس دن کربلاء میں دیکھنے کے قابل ھوتے ھیں .

برصغیر پاک و ھند کے سلاطین ، امرا ، تجار ، اور اھل خیر حضرات بھی صدیوں سے ان روضوں کی خدمت کرتے چلے آ رھے ھیں ، سلاطین ھند میں سے محمّد بن تغلق (م ۷۵۲ھ) نے بُغْدن نامی امیر کے ھاتھ ایک کروڑ تنکے (تقریباً ڈھائی لاکھ روپے) عراق کے مقامات مقدسہ کے لیے بھیجے (خلیق احمد : سلاطین دہلی کے مذھبی رجحانات، دہلی، ص ۳۸۰) ۔ سلاطین دکن نے بھی ھدیے بھیجے ۔ کچھ بعید نہیں کہ عہد تیموریان ھند میں بھی کچھ خدمتیں انجام دی گئی ھوں .

سلطان ٹیپو کے ترکی وفد کا ذکر کرتے ہوے احمد جودت پاشا (تاریخ دولت علیہ، استانبول ۱۲۹۸ھ) نے لکھا ہے : "سید غلام علی شاہ، نور اللہ خان، وغیرہ نے ۲۱ ربیع الآخر ۱۲۰۱ھ میں رئیس الکتّاب سلیمان فیضی افندی سے ملاقات کی اور مختلف مسائل کے علاوہ یہ بھی کہا کہ ٹیپو سلطان التماس کرتے ہیں کہ مکّۂ مکرّمہ، مدینۂ منوّرہ، نجف اشرف، کربلاے معلّٰی، مشہد امام علی المرتضٰی (شاید علی نقی، یعنی کاظمین) اور خانقاہ پیر عبدالقادر جیلانی میں چاندی کے دروازے نصب کرنے اور ان سب کے ساتھ ایک ایک مسافر خانہ اور اس کے اوپر ایک ایک نوبت خانہ، جہاں طبل و کوس بجایا جائے گا، تعمیر کرنے کے لیے اجازت شاہانہ دی جائے (شریف الحسن: در مجلۂ اردو، کراچی، جون ۱۹۷۰ء، ص۵)۔ اسی طرح آصف الدّولہ نواب اودھ (م ۱۲۱۲ھ) نے کربلاء اور نجف میں متعدد عمارتیں بنوائیں؛ نجف کی نہر آصفی آج تک اسی کے نام سے منسوب ہے (نجم الغنی، ۲ : ۳۴۵؛ ماضی النجف و حاضرها، ص ۱۳۱)۔ [اودھ کی] نواب بہو بیگم صاحبہ نے اپنے وقف نامے میں ایک لاکھ روپیہ سالانہ کربلا و نجف کے لیے وقف کیا (طوطا رام : طلسم ھند، ص ۳۷۵)۔ محمّد علی شاہ کی اہلیہ نواب ملکۂ جہاں (م ۹ جولائی ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء) جب زیارت کو گئیں تو اپنے مرحوم شوہر کا تاج اور شمشیر مرصع روضۂ حضرت علی رض کی نذر کرکے لاکھوں روپے اهل کربلاء و نجف پر خرچ کرکے آئیں (حکیم محمّد نقی : منہاجُ الزائرین، لکھنؤ ۱۳۳۱ھ، ص ۵۰) اور بہت بڑی املاک وقف کی۔

نوابان اودھ کے بعد ریاست ہاے رام پور، محمود آباد اور خیر آباد کے فرمانرواؤں اور لاهور کے قزلباش خاندان نے بھی بڑی دریا دلی سے کربلاء کی خدمت کی۔ ان کے اوقاف اور مقابر و عمارات اب تک کربلاے معلّٰی میں باقی ہیں۔

[کربلا جمہوریۂ عراق میں اسی نام کے ایک صوبے کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۷۰ء میں یہاں کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی]۔ بغداد سے کربلاء تک بہت اچھی سڑک جاتی ہے، جس پر اعلٰی درجے کی بسیں اور ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ کئی میل دور سے فضا میں چمکتے ہوے چار سنہری مینار اور دو طلائی گنبد نظر آتے ہیں۔ اس خوبصورت اور نو تعمیر شہر میں حضرت عباس رض اور حضرت امام حسین رض کے روضے فن تعمیر و تزئین کے اعلٰی نمونے ہیں، جہاں شب و روز ہزاروں زائرین نماز و تلاوت قرآن، زیارت اور دعا کرتے نظر آتے ہیں۔

مآخذ : متن مقالہ میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ دیکھیے (۱) ڈاکٹر عبدالجواد الکلیدار : **تاریخ کربلاء و حائر الحسین علیہ السلام**، بغداد ۱۳۶۸ھ؛ (۲) سیّد محمّد حسن مصطفٰی آل کلیدار : **مدینة الحسین** اور **مختصر تاریخ کربلا**، ایران ۱۳۶۸ھ؛ (۳) عبدالحمید الخیّاط : **تاریخ الرّوضة الحسینیه**، المصور، بغداد ۱۳۷۶ھ؛ (۴) سیّد غلام علی احسن : **رهبر زائران**، آگرہ ۱۳۵۳ھ؛ (۵) سیّد طیب آغا الجزائری : **تاریخ کربلاء و نجف**، لاهور ۱۹۶۲ء؛ (۶) مرتضٰی حسین فاضل : **تاریخ کربلا، تاریخ و تعمیر**، در هفت روزۂ رضاکار، لاهور محرم ۱۳۹۱ھ؛ (۷) وهی مصنف : **تاریخ روضۂ حضرت عبّاس**، در هفت روزۂ شیعہ، لاهور، محرم ۱۳۹۱ھ۔

(مرتضٰی حسین فاضل [و ادارہ])

* **کَرْت** : ایک شاهی خاندان، جس نے [۶۴۳ھ/] ۱۲۴۵ء سے [۷۹۱ھ/] ۱۳۸۹ء تک هرات پر حکومت کی۔ اس کی بنیاد شمس الدّین محمّد اول کَرت نے رکھی تھی جو غور کے شَنْسَبانی گھرانے سے تھا۔ یہ گھرانا وهی ہے جس کے افراد میں غیاث الدّین محمّد اور معزّالدّین محمّد بن سام دونوں بھائی شامل ہیں۔

چنگیز خان کی فوجوں کی تاخت و تاراج کے بعد جب هرات کی حالت کچھ سدھر گئی تو شمس الدّین نے رفته رفته اقتدار حاصل کر لیا اور ۱۲۴۵ء تک یہاں اس کی حکومت قائم ہو گئی ۔ اس نے بالآخر مَلِک کا خطاب اختیار کیا، جسے اس کے جانشین بھی استعمال کرتے رہے ۔ ۱۲۵۱ء میں جب خان اعظم مَنْگو [قاآن] اپنی سلطنت کا نظم و نسق درست کر رہا تھا تو اس نے شمس الدّین کرت کو هرات، سیْستان، بَلخ اور اس علاقے کا والی برقرار رکھا جو ان صوبوں اور هندوستان کی سرحد کے درمیان تھا ۔ شمس الدّین کے عہد کے آخری ایام میں اس کا بیٹا رکن الدین کاروبار حکومت میں اس کا شریک رہا، لیکن ۱۲۸۳ء میں وہ باپ کی زندگی ھی میں وفات پا گیا ۔ ۱۲۸۵ء میں شمس الدین کا انتقال ہوا تو رکن الدّین کا بیٹا فخر الدّین اس کا جانشین ہوا ۔ جس وقت ایران کے ایلخانی مغول بادشاهوں کی طاقت زوال پذیر تھی، هرات کے کرت ملوک کا اقتدار بڑھ رہا تھا ۔ فخر الدین نے اس زمانے کے طاقتور امیر چوبان سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے، جو چودھویں ایلخانی بادشاہ ابوسعید بہادر خان کی کمسنی کے دوران میں ایران کا نائب السطنت رہ چکا تھا [دیکھیے ذیلِ جامع رشیدی، ص ۶۹] ۔ جب ابوسعید بہادر نے چوبان کے خاندان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف ہو کر اس پر حملہ کیا تو امیر چوبان نے غیاث الدّین کے هاں پناہ لی ۔ غیاث الدّین نے اسے پناہ تو دے دی، لیکن ۱۳۲۷ء میں اسے اور اس کے بیٹے جَلَو خان کو غداری سے قتل کر ڈالا [دیکھیے ذیل جامع رشیدی، ص ۱۳۲ ببعد] ۔ خود غیاث الدّین ۱۳۲۸ء میں فوت ہو گیا اور اس کے دو بڑے بیٹے شمس الدّین ثانی اور حافظ، جو یکے بعد دیگرے اس کے جانشین قرار پائے تھے، علی الترتیب ۱۳۲۹ء اور ۱۳۳۱ء میں وفات پا گئے ۔ حمْدالله المستوفی مؤرخ کا کہنا ہے کہ اتنے مختصر وقفوں سے ان باپ بیٹوں کا لقمۂ اجل ہو جانا قہر خداوندی کا نتیجه تھا، جو ان پر امیر چوبان سے غیاث الدین کی غداری کی وجه سے ٹوٹا .

حافظ کے بعد اس کا تیسرا بھائی معز الدین تخت نشین ہوا ۔ اس نے کرمان کے ملک قطب الدین کی مدد کے لیے جسے امیر مبارز الدّین نے اس کے دارلسلطنت سے نکال باھر کیا تھا، فوج روانہ کی ، لیکن فوج نے هزیمت اٹھائی ۔ پھر قطب الدّین کی اعانت کے لیے ایک اور لشکر بھیجا گیا جو کرمان میں محصور ہو گیا اور بالآخر ۱۳۴۰ء کے اواخر میں اسے هتیار ڈالنے پڑے ۔ معزّ الدّین کا انتقال ۱۳۷۰ء میں ہوا ۔ اس نے دو بیٹے چھوڑے : محمّد، جو سَرخْس کا والی تھا، باپ کی وفات کے بعد بدستور وهاں کا والی رہا اور دوسرا بیٹا غیاث الدّین پیر علی هرات میں معزّ الدّین کا جانشیں قرار پایا۔ ۱۳۸۰ء میں امیر تیمور نے ایک قاصد هرات بھیجا تا که [آغاز بہار میں جب امرا اور بڑے بڑے نواب "قور لتای" کے لیے جمع ہوں تو] وہ بھی ایک دستۂ فوج کے ساتھ حاضر ہو، لیکن غیاث الدّین پیر علی نے قاصد کو لطائف الحیل سے روکے رکھا اور اس دوران میں شہر کے اندر ضروری سامان خوراک جمع کر کے اس کے دفاعی استحکامات مکمل کر لیے ۔ قاصد کو ناچار اپنی سفارت کی ناکامی کی اطلاع دینے کے لیے سمرقند لوٹنا پڑا [ظفرنامۂ یزدی، ۱ : ۳۰۳]۔ ۱۳۸۱ء کے موسم بہار میں امیر تیمور نے هرات کی جانب یلغار کی اور چند روز کے محاصرے کے بعد شہر پر قبضه کر لیا اور وهاں کے والی اور اس کے سب سے بڑے بیٹے پیر محمّد کو گرفتار کر لیا، هرات کے بعض ممتاز شہریوں کو شہرِ سبز میں جلا وطن کر دیا گیا، تمام استحکامات مسمار کر دے گئے [اور هرات کے آهنیں دروازے جنهیں نقوش اور

کتبوں سے آراستہ کیا گیا تھا سمرقند منتقل کر دیے گئے] ۔ مَلِک اور اس کے دو بیٹوں کو معاف کر دیا ۔ ان میں سے چھوٹے بیٹے (امیر غوری) کو اشکلچہ کا مستحکم قلعہ حوالے کر دینے پر آمادہ کر لیا گیا تھا ۔ غیاث الدّین پیر علی کو تیمور کے باج گزار کی حیثیت سے ہرات پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی گئی، تاآنکہ ۱۳۸۹ء میں اس خاندان کا چراغ گل ہوگیا .

مآخذ : (۱) الجُوَینی : تاریخ جہان کشای؛ (۲) حَمْد اللّٰہ المُسْتوفی القزوینی : تاریخ گزیدہ، یہ دونوں کتابیں سلسلۂ یادگار گب میں شامل ہیں؛ (۳) کرت نامہ صدرالدّین خطیب بوشَنْجی جو اب ناپید ہے، مگر تاریخ نامۂ ہرات کے مختلف مقامات میں بقول مصحح کتاب مذکور اس کے ۲۵۰ بیت نقل ہوے ہیں)؛ (۴) مولانا شرف الدّین علی یزدی : ظفر نامہ، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے سلسلۂ مطبوعات میں؛ (۵) شہاب الدّین احمد بن عرب شاہ : عجائب المقدور فی اخبار تیمور، طبع کبیر الدّین احمد، کلکتہ ۱۸۸۲ء؛ (۶) سیف بن محمّد الہروی : تاریخ نامۂ ہرات طبع محمّد زبیر صدیقی، کلکتہ ۱۹۴۳ء، ص ۱۳۱ تا ۷۸۶؛ (۷) حافظ ابرو : تاریخ و نسب ملوک کرت، دیکھیے فہرست مخطوطات تاریخی، در کتاب خانہ ہاے استانبول؛ (۸) حافظ ابرو : ذیل جامع التّواریخ رشیدی، طبع دکترخان بابا بیانی، تہران ۱۳۱۷ھ، ص ۱۸ ببعد و بمواضع دیگر بمدد اشاریہ خصوصًا بذیل فخر الدّین ملک، غیاث الدّین ملک و امیر چُوبان؛ (۹) معین الدّین اسفزاری : رَوْضات الجَنّات فی تاریخ ہرات، نسخۂ دانش گاہ پنجاب، ورق ۷۹ تا ۱۶۱]؛ (۱۰) Stanley Lane Pool : *The Mohammadan Dynasties*، لنڈن ۱۸۹۴ء .

(T. W. HAIG)

* **الکُرَۃ** :(ع؛ گلوب، Sphere)؛ عربوں نے کُرے کے خواص کا اقلیدس، آرشمیدس اور تھیوڈوسیس کے تتبع میں مطالعہ کیا تھا ۔ انھوں نے علمِ مثلث کروی کے بعض ایسے اصولوں سے بھی بحث کی تھی جو نظریۂ علم ہیئت کے بنیادی اصول ہیں، یعنی "شکل اَلقطاع" (Transversal) کا اصول، چار مقادیر کا اصول (شکل المُغْنی) اور سائے یعنی Tangent کے اصول سے (الشّکل الظِلّی)، مینلاس Menelaus اور بطلمیوس کے تتبع میں (ترجموں کے بارے میں دیکھیے M. Steinschneider، در .ZDMG، ۱۸۹۶ء، ۱ : ۱۶۱ ببعد؛ ریاضیات کے اصولوں سے H. Bürger و K. Kohl نے بحث کی ہے : *Axel Bjornbo Thabits Werk über den Transversalensatz*، در *Abhandl. zur Gesch. Der Naturwissenschaft und Medizin*، ۱۹۲۴ء، جزو ۷، ص ۱ تا ۹۱، وہاں قدیم تر کتابوں کے حوالے بھی دیے گئے ہیں .

۲۔ الکرۃ ذات الکرسی (گولا مع محور axe کے) دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے :

(الف) آسمانوں یا افلاک کا کرہ (کرہ کے بدلے ہم اسی مفہوم میں لفظ البیضۃ (= انڈا) بھی پاتے ہیں جیسے مثلًا در مفاتیح العلوم؛ ص ۲۳۵؛ البتانی : *Opus Astronomicun*، طبع C. A. Nallino، ۱۹۱۳ء، ۱ : ۱۳۸؛ E. Wiedemann : *Beitr*، ج۳، *SBPMS*، *Erlg*، ۱۹۰۵ء، ۳۷ : ۲۳۹ ببعد) ۔ مجموعۂ نجوم (Constellations) کو کرے پر نقش کیا جاتا ہے ۔ اسے ایک چُوڑی (ring) میں رکھ دیا جاتا ہے جو تین یا چار پایوں پر نصب ہوتی ہے ۔ ایسے کرے شاید ہپارکس Hipparchus نے بھی اپنے زمانے میں تیار کیے تھے اور ان کا بیان لکھا تھا، اور بہرحال بطلمیوس نے تو یہ کرے بنائے تھے ۔ بطلمیوس کا بیان المجسطی کے عربی ترجموں اور بعض علٰحدہ رسالوں میں دیا گیا ہے ۔ تانبے کا ایک کرہ، جو غلط طریقے پر بطلمیوس سے منسوب کیا جاتا ہے، ابن السندبدی [= ابن السنبدی] نے ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ -

۴۴۰۱ء میں قاہرہ میں دیکھا تھا (دیکھیے ابن القفطی، ص ۴۴۰ [جہاں چاندی کے ایک بڑے وزنی کرے کا بھی ذکر ہے جو صوفی ابو الحسین نے عضد الدّولہ کے لیے بنایا تھا]) ۔ کچھ کرے لکڑی کے بنائے جاتے تھے اور ان پر کاغذ یا مختلف دھاتوں کا خول چڑھا دیا جاتا تھا ۔ دھات کے کھوکھلے کرے بھی بنائے جاتے تھے اور انھیں پھر لکڑی کے کروں سے باندھ دیا جاتا تھا ۔ عَلَم الدّین قیصر التعاسیف ایک لکڑی کا کرہ استعمال کرتا تھا جس پر سنہری ملمع تھا (ابو الفداء، طبع Reiske، ۴ : ۹۷۴؛ H. Suter، عدد ۳۵۸)۔ ان کروں کی تیاری اور ان غلطیوں سے جو ان میں واقع ہوتی ہیں، البیرونی نے تفصیلی بحث کی ہے (*Beiträge zur Gesch. der Mathematik.* وغیرہ، در *Abhandl. zur Gesch. der Naturwiss. und Medizin.* جزو ۴، ۱۹۲۲ء، ص ۹۷ تا ۹۳) .

وہ آلۂ ہیئت جو الادریسی نے (صقلیہ کے) شاہ روجر Roger کے لیے تیار کیا تھا ، بظاہر ایک چوڑی دار کرہ تھا .

(ب) "الکرۃ ذات الکرسی" ایک ایسا آلہ بھی ہے جس سے افلاک کی حرکتوں کا پتا چلتا ہے ۔ افقی چوڑی کا رخ افق کی جانب رکھا جاتا ہے ۔ اس میں دو متقابل نقطوں پر زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے دو کھانچے بنائے جاتے ہیں ۔ ان کھانچوں میں دائرۂ نصف النہار (meridian) کی چوڑی رکھی جاتی ہے اور اسے ایک نالی (groove) میں اپنی سب سے نیچے کی جگہ پر جانے دیا جاتا ہے ۔ خود کرہ ایک محور کے گرد گھومتا ہے جسے نصف النہار کی چوڑی میں دو متقابل نقطوں پر گول سوراخوں میں رکھ دیا جاتا ہے ۔ افقی اور نصف النہار کی چوڑیوں پر تقسیم کے نشانات بنا دیے جاتے ہیں ۔ نصف النہار کی جوڑی کو اس کے کھانچوں میں گھمانے سے کرے کے محور کو حسب مرضی افق کی جانب جھکایا جا سکتا ہے اور اس طرح یہ آلہ سب اعراض البلد (latitudes) کے لیے استعمال ہوسکتا ہے ۔ ایک ربع دائرۂ زاویہ پیما (quadrant) کے ذریعے جس پر تقسیم کے نشانات ہوتے ہیں اور جسے کرے پر ٹکا سکتے ہیں کئی اقسام کی پیمائشیں کی جا سکتی ہیں ۔ اس کرے سے ہیئت کی اہم مقادیر، الطالع، المطالع، زمین کے سہاروں (props.) وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں .

اس موضوع پر قدیم ترین عربی تصنیف قُسطا بن لوقا [رک بآں] کی ہے، مثلاً طبع المرّاکشی۔ ممکن ہے کہ اس کا تعلق اصل کلاسیکی تصانیف سے ہو، جوان تعلقات کی بنا پر جو مصنف کے یونانیوں سے تھے ، اغلب معلوم ہوتا ہے ۔ اس کا لاطینی میں ترجمہ بھی ہوا تھا اور اسپانوی زبان میں قشتالہ کے الفانسو Alfonso نے بھی کیا تھا (*Libros del Saber*)، ج ۱) .

اگر کرے کو خارج کر دیا جائے اور افقی اور نصف النہار کی چوڑیوں میں کئی ایسی چوڑیوں کا اضافہ کر دیا جائے، جو دوائر افلاک کے مطابق ہوں تو یہ چوڑی دار (armillary) کرہ بن جاتا ہے (آلۃ ذات الحَلَق)، یعنی وہ چوڑی دار آلہ جس پر قدیم لوگوں، عربوں اور بالخصوص قشتالہ کے الفانسو نے بہت محنت اور توجہ سے کام کیا ہے .

مآخذ : (۱) B. Dorn : *Drei astrononische Instrumente*، در *Mém. de l' Acad. impériale des Sciences de St. Petersbourg.*، سلسلہ ۷، ج ۹، عدد ۱، ص ۱؛ (۲) L. Am. Sedillot : *Mém. sur les instruments astronomiques des Arabes*، در *Memoires preséntes par divers savants 'a l' Acad. R. des inscriptions,* پیرس ۱۸۴۴ء، سلسلہ ۱، ۱ : ۱ تا ۲۲۹؛ (۳) F. Nolte : *Über die Armillarsphäre*

abhandl. zur gesch. Natuwissensch، وغیرہ ۲ : ۱ تا ۵۰، Nolte نے قدیم تر کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

۳۔ الکرۃ المحرّقہ : جلانے والا کرہ، قدیم لوگوں کو بھی بلور اور شیشے کے بنے ہوے کروں کی یہ خاصیت معلوم تھی کہ وہ سورج کی اس روشنی کو جو ان پر پڑتی ہے ایک نقطے پر مرتکز کر دیتے ہیں اور وہاں جو جلنے کے قابل چیز ہو اسے جلا دیتے ہیں، لیکن ہمیں ایسی کچھ علامات نظر نہیں آتیں کہ کسی قدیم عالم نے اس مظہر کے نظریے سے بحث کی ہو۔ ابن الہیثم اور کمال الدّین الفارسی نے اس نظریے کا بہت قابلیت سے مطالعہ کیا۔ ابن الہیثم اپنی بحث کی ابتدا اور روشنی کی کسی ایسی شعاع کے، جو شیشے کی صاف اور چکنی سطح پر پڑتی ہے، زاویۂ وقوع، زاویۂ انحراف اور زاویۂ انتشار کی اقدار سے کرتا ہے، جنھیں بطلمیوس کی ایک جدول میں بیان کیا گیا ہے اور جنھیں اس نے خود بھی جمع کیا تھا۔ وہ اس راستے کی تحقیق کرتا ہے جو شعاعیں اس وقت اختیار کرتی ہیں جب وہ محور سے، جسے سورج اور کرے کے درمیان کھینچا گیا ہو، کرے کی سطح پر مختلف فاصلوں سے آ کر گرتی ہیں۔ ان تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انتشار کے بعد یہ سب شعاعیں کرے کی بالمقابل سطح پر ایک چھوٹی سی جگہ (Section) میں باہم مل جاتی ہیں اور وہاں سے وہ پھر اس طرح باہر نکلتی ہیں کہ ان کی سمت بدل جاتی ہے اور وہ محور کو کرے سے مختلف فاصلوں پر قطع کرتی ہیں؛ تاہم ان میں سے بیشتر ایک نقطے پر مل جاتی ہیں جو کرے کے نصف قطر سے کم فاصلے پر ہوتا ہے اور یہی جلانے کا نقطہ ہوتا ہے۔ اگر شعاعوں کی اس مخروط (cone) میں جو اس نقطے سے نکلتی ہوئی شعاعوں سے بنتی ہے، کچھ اشکال یا تصاویر (.drawings) رکھ دی جاتی ہیں، مثلاً ایک مدور سرخ سطح جس پر ایک سیاہ چوڑی ہو اور انھیں کرے کے سامنے سے دیکھا جائے تو عجیب و غریب شکلیں نظر آئیں گی۔ ابن الہیثم اور کمال الدّین نے ان سے بھی بہت مفصل بحث کی تھی اور وہ اسی زمانے میں ان نتائج تک پہنچ گئے تھے جن تک ان کے بعد کے زمانے میں Schellbach پہنچا۔

مآخذ (۱) J. Wurschmidt : *Die Brennkugal*، در *Monatschefte für den naturwissenschaftl unterricht*، ۱۹۱۱ء، ۴ : ۹۸ تا ۱۱۳؛ (۲) E. Wiedemann : *Beitr.*، ج ۹، *Über die Brechung des Lichtes in kugeln nach Ibn al-Haitam una Kamal al Din al-Farisi*، در *Erlg. SBPMS*، ۱۹۱۰ء، ۴۲ : ۱۵ تا ۲۸؛ نیز دیکھیے حوالے، در مقالات قوس، قزح، کمال الدّین الفارسی۔

(E. WIEDEMANN)

* **کُرْج** : (گرجستان) (روسی = گرزجہ Gruzija؛ فارسی اور ترکی = گُرْدُسْتان اور گُرْجِسْتان اور گرجستانی = Sakharthvello) وسیع تر مفہوم میں مغربی اور وسطی ماوراے قفقاز (Transcaucasia) کا وہ علاقہ جس میں خرتویلی (Khartwelian) زبان بولنے والے لوگ بستے ہیں اور جو بحیرۂ اسود سے لے کر تفْلس کے شمال مشرق میں ۶۰ میل سے زیادہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سے محدود تر معنوں میں مراد عملی طور پر تفلس کا ضلع یا صوبہ (gouverne-ment) ہے۔ جغرافیے کے نقطۂ نظر سے جو اب بھی کسی حد تک درست سمجھا جاتا ہے، گرجستان کختھیا Kakhethia کے صوبوں اور ضلعوں نیز تھشتھیا Thushethia، پشویا Pshawia و خوسریا Khewsuria، کرتھلیا Karthlia، امرتھیا Imerethia، گُریا Guria، مِنگرلیا Mingrelia اور مشْخیا Meskhia

کے کوھستانی اضلاع پر مشتمل ہے - خرتویلی (Kharthwelion) زبانوں میں گرجستانی، منگرل، لیسی (Lasian) (آخرالذکر زبان صرف ترکی سرحد کے انتہائی جنوب مشرقی گوشوں میں بولی جاتی ہے بحالیکہ لیْسی Lases جنھیں Ts' ans تشْن بھی کہا جاتا ہے ترکی میں رہتے ھیں) اور سَوانی (Swanian) زبانیں شامل ھیں - مؤخرالذکر زبان سَوَنتْھیا Swanethia میں اور منگرل زبان منگرلیا میں بولی جاتی ہے - بیشتر خرتویلی (Kharthwel) لوگ عیسائی ھیں اور قدیم یونانی کلیسا سے تعلق رکھتے ھیں - صرف بعض مقامات پر انھوں نے اسلام قبول کر لیا ہے، جیسے انتہائی مشرقی علاقے میں، سَکَتھَل Sakathal کے ضلع میں اِنگلوس Engiloes نے (گرجستانی زبان) نیز سارے جنوب مشرقی علاقے اور باطوم کے ضلع میں Adjars اجر نے (لَیْسی Lases بھی مسلمان ھیں) - گرجستان میں ضلع چُروچ Čoroch میں اور کُورَہ نْدی کے بالائی مجْری، یعنی ضلع اردگن Ardagan اور اضلاع اَخْلَچِخْ Akhalcikh [رکّ بآں] اور اَخَلْخَلَخی Akhalkhalakhi میں بہت سے لوگ گرجستانی زبان ترک کر چکے ھیں حالانکہ ان علاقوں میں آج سے دو سو سال پہلے تک گرجستانی زبان بولی جاتی تھی، لیکن اب اس کی جگہ ترکی زبان نے لے لی ہے - یہ لوگ اپنی زبان اور اصل کو فراموش کر چکے ھیں اور اپنے آپ کو ترک کہتے ھیں .

گرجستان کی تاریخ کے ابتدائی ادوار تاریکی کے پردے میں پوشیدہ ھیں - کرتھلیا Karthlia اور کختھیا Kakhethia کے علاقے ایک نئی ریاست کا مرکز تھے - شروع زمانے ھی میں خرتھول Kharthwel کا مغربی حصہ بوزنطی حکومت کے ماتحت ھوگیا تھا اور یہیں سے عیسائی مذھب، جو مشرقی رومی کلیسا کی شکل میں تھا، سارے مغربی ماورائے قفقاز میں پھیلا - خیال کیا جاتا ہے کہ سینٹ نینو Nino نے یہاں کے لوگوں کو عیسائیت سے روشناس کیا - روایت ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں (تاریخوں میں اختلاف ہے) اس خاتون کی دعوت پر شاہ مریان Mirian نے عیسائی مذھب قبول کیا - ۶۸۰ء میں قسطنطینیہ میں عیسائیوں کے چھٹے اجتماع میں گرجستانی کلیسا کو آزادی عطا کی گئی .

چونکہ گرجستان ایک ایسے حلقے کے مرکز میں واقع ہے، جس کے اطراف میں بہت سی طاقتور حکومتیں قائم ھوتی رھی ھیں، اس لیے ۱۸۰۱ء تک، یعنی جب تک اسے سلطنت روس میں شامل نہیں کر لیا گیا، یہ ملک خوفناک انقلابات سے دوچار رھا - ساتویں صدی عیسوی تک بوزنطی اور ایرانی اس پر قبضہ کرنے کے لیے باھم لڑتے رھے - ۶۲۷ء (ساسانیوں پر ھرقل (Heracleus) کی فتح) کے بعد تھوڑا ھی عرصہ گزرا تھا کہ عربوں نے گرجستان پر چڑھائی کردی - آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر سے (بوزنطیوں کی اعانت سے) جنوبی گرجستان میں بگرتیوں (Bagratids) کی طاقت بڑھنے لگی - گیارھویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ آل سلجوق نے فتح کر لیا - جب صلیبی جنگجو بیت المقدس میں داخل ھوگئے تو "داؤد المجدد" (David the Renovator) ۱۱۰۰ء میں ترکوں کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب ھوگیا - اس بادشاہ کے عہد میں (۱۰۸۹ تا ۱۱۲۵ء) گرجستان میں خوش حالی کا دور شروع ھوا، جو تھمر Thamar (۱۱۸۴ تا ۱۲۱۲ء) کی موت کے بعد تک جاری رھا - تیرھویں سے سولھویں صدی عیسوی تک اس نے بہت سے انقلاب دیکھے - تاتاری حملوں نے ملک پر نہایت تباہ کن اثرات چھوڑے (صرف تیمور ھی نے ۱۲۰۳ء کے درمیان اس ملک پر چھے بار حملے کیے) - بگرتیوں کی قیادت میں ملک ابھی مشکل سے متحد ھونے پایا تھا کہ پندرھویں

صدی عیسوی میں یہ تین بادشاھتوں، یعنی کرتھلیا Karthlia، کختھیا Kakhethia اور اِمرتھیا Imerethia کی تین مملکتوں اور دیگر پانچ ریاستوں میں منقسم ھو گیا ۔ اس کے بعد سے اس کی تاریخ صرف ایک ملک کی تاریخ نہیں رھی ۔ بوزنطی سلطنت کے زوال کے بعد گرجستان کا کوئی محافظ باقی نہ رھا اور اب تاتاریوں، ترکوں، ایرانیوں اور لسغیوں Lesghia کے حملے جلد جلد ھونے لگے ۔ ایرانی اثر خاص طور پر بہت بڑھ گیا، حتّٰی کہ سترھویں صدی عیسوی میں کرتھلیا اور کختھیا کے بادشاہ کی حیثیت صرف شاہ ایران کے ایک والی کی سی رہ گئی ۔

گرجستان کی امیدوں کا واحد مرکز روس تھا اور قدیم زمانے میں گرجستان نے امداد کے لیے اس کی طرف رجوع کیا تھا ۔ ۱۵۵۸ء میں کختھیا کے بادشاہ لیون دوم (Lewan II) نے ایرانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے زار ایوان چہارم (Iwan IV) کی اعانت طلب کی ۔ اسی طرح شاہ عباس اعظم کے زمانے میں الیگزنڈر نے بورس فیوڈ وروچ گوڈونوف Boris Feodorowitch Godunow سے مدد مانگی ۔ ۱۶۱۹ء میں تیموراز Teimuraz نے خاندان رومانوف (Romanow) کے پہلے زار مائیکل فیو ڈوروچ Micahil Feodorowitch کے پاس ایک سفیر بھیجا، لیکن تا حال روس کو گرجستان میں اپنا کوئی مفاد نظر نہیں آتا تھا، اس لیے وھاں صورت حال جوں کی توں قائم رھی ۔ کہیں اٹھارھویں صدی عیسوی میں جا کر گرجستان نے شاہ وختنگ Wakhtang ششم کے دور حکومت میں ایک بار پھر قوت حاصل کی ۔ ھِرّقل (Heraclur) دوم (۱۷۶۲ تا ۱۷۹۸ء) نے ایک بار پھر ترکوں، ایرانیوں اور لسغیوں کے حملوں کا سیلاب کامیابی سے روکا، لیکن جب وہ فوت ھو گیا تو ملک اندرونی مصائب (۱۷۷۰ء میں طاعون کی وبا، ۱۷۹۵ء میں آغا محمّد خان ایرانی کے ھاتھوں تِفلس کی تباھی) اور دیگر اسباب سے اس قدر کمزور ھو چکا تھا کہ ھِرقل کے جانشین جارج George دوازدھم نے اپنا ملک روس کی حفاظت میں دے دینے کا ارادہ کر لیا ۔ چند سال بعد (۱۸۰۴ء میں) اِمرتھیا بھی روسی صوبہ بن گیا ۔ اس سے ایک سال پہلے منگریلیا بھی روسی سلطنت میں شامل ھو چکا تھا اور ترکوں اور روسیوں کی آخری جنگ کے بعد کرتھولز Kharthwels، کاغزمان Kaghizman، اردگان Ardgan، اولٹی Olty، ارْتون Artwin، باطوم (اور کرس [قارص]) کے جنوب مغربی اسلامی اضلاع پر بھی روس کا قبضہ ھو گیا [رکّ بہ آرمینیا] .

مآخذ : (۱) دیکھیے Brosset کی تصانیف خصوصاً *Histoire de la Géorgie*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۸ء؛ (۲) W. E. Romanowskij : *Skizzen oūs der Geschichte Georgiens* (Russisch)، تفلس ۱۹۰۲ء؛ (۳) Arth. Leist : *Das Georgische Volk*، *Dresden* ۱۹۰۳ء؛ (۴) J. Marquart : *Osteurop. und ostasiat. Streifzüge*، ص ۱۷۷ تا ۱۸۸ و ۳۹۱ تا ۴۳۶ [۱۹۳۹ء سے گرجستان Georgian Soviet Socialist Republic کے نام سے USSR کی ایک جمہوری ریاست ھے؛ جس کا رقبہ ۲۹۴۰۰ مربع میل ھے اور آبادی جنوری ۱۹۷۱ء میں پچاس لاکھ دس ہزار تھی، دارلحکومت تفلس (Thilesi) ھے] .

(A. Dirr)

کِرچ : Kertch جزیرۂ قریم (کریمیا) کا ایک * قصبہ اور قلعہ؛ [۱۹۶۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی پچاس ہزار تھی] ۔ قدیم زمانے میں یہاں Pantikapaion کی یونانی نو آبادی تھی جو آگے چل کر بوس پروس Bosporos کے نام سے مشہور ھوئی اور اسی نام کی سلطنت کا دارالحکومت بنی ۔ سترھویں صدی عیسوی کے آخری ایام سے یہاں قریم کے مشرقی حصے کے خَزَروں کے اسیر

(جس کا لقب تدُن تھا) کا صدر مقام رہا (مغربی حصہ جس کا دارالحکومت خرسونوس Khersonesos تھا ان دنوں بوزنطی سلطنت ھی میں شامل تھا) ۔ کرچ کا نام سب سے پہلے اسلامی مآخذ میں آیا ھے، جہاں اسے مختلف شکلوں میں لکھا گیا ھے (کرز اور الکرش کے بارے میں) جو حوالے J. Marquart : *Osteuropaische und ostasiatische Streifzüge*، لائپزگ ۱۹۰۳ء، ص ۵۰۶ میں ھیں، ان میں رکن الدّین بیبرس، در W.Tiesenhausen : *Sbornik Materialov, otnosyashcikhsya k istori Zolotio Ordi*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۸۴ء ص ۸۹، ۵ (جہاں کرچ لکھا ھے) کا اضافہ کر لیجیے ۔ Marquart کتاب مذکور میں بعض روسی محققین (Wassilyewski، Bruun، Harkavy Kunik) نے یہ خیال ظاھر کیا ھے کہ یہ نام یونانی لفظ Κυρὶξος یا Κόρὶξος سے نکلا ھے، جو کرچ کے قریب ایک خانقاہ کا نام ھے (قدیم روسی مآخذ میں اس قصبے کا نام کورچو Korčew لکھا ھے، مثلاً اس مشہور کتبے میں جو ۶۵۷۶ (۱۰۶۸ء میں لکھا گیا ھے اور جسے Karamzin نے *Istoriya gosudarstva Rossiyskago*، ج ۲، حاشیہ ۱۲۰ میں نقل کیا ھے) .

روسیوں اور بوزنطیوں کی متحدہ فوجوں کے ھاتھوں سلطنت خزر کی آخری تباھی کے بعد ۱۰۱۶ء کے قریب قریم کا مشرقی حصہ جس میں کرچ بھی شامل تھا، ایک روسی ریاست T' mutarakan کے قبضے میں آ گیا ۔ اس ریاست کا اسی نام کا صدر مقام جزیرہ نمائے تَمن Taman میں کرچ کے بالمقابل واقع تھا ۔ تقریباً ایک صدی بعد اس ریاست کے چٹیل میدانوں پر قپچاق یا کومن Koman قابض ہو گئے اور بندرگاھیں بوزنطی سلطنت کے قبضے میں آ گئیں جیسا کہ Yu. Kulakowski (*Proshloye Tavridi*، بار دوم، کیف ۱۹۱۴ء، ص ۹۳، میں Miklosich و Müller = *Acta et dipl. gr. medi aevi*، ۳ : ۲۵ کی سند پر) خیال ظاھر کیا ھے ۔ Ρωσία کے شہر کو جس کا شہنشاہ مینول گومننوس Manuel Komnenos اور جمہوریۂ جینوآ کے درمیان ۱۱۶۹ء ایک معاھدے کے سلسلے میں ذکر آیا ھے، روسی کورچو Korcew ھی سمجھنا چاھیے ۔ تیرھویں صدی عیسوی کے بعد جزیرہ نمائے قدیم التون اردو کی تاتاری حکومت میں شامل کر لیا گیا ۔ ۶۹۸ھ/ اکتوبر ۱۲۹۸ء تا ستمبر ۱۲۹۹ء میں نوغای نے اپنے پوتے کا انتقام لینے کے لیے جو کَفّہ میں مارا گیا تھا، کرچ اور اس کے ساتھ کریمیا کے چند دوسرے شہروں کو تباہ و برباد کر دیا (Tiesenhausen : کتاب مذکور) ۔ پندرھویں صدی عیسوی میں کرچ پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ھوگیا ۔ ازوف Azov کی فتح کے بعد ۱۶۹۸ء میں پیٹر اعظم نے وی انا میں اپنے قیام کے دوران میں جب کہ ترکوں سے صلح کی گفت وشنید ھونے والی تھی، یہ مطالبہ کیا کہ کرچ کا الحاق روس کے ساتھ ھو جائے، لیکن یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا ۔ اسی سال صلح نامہ قارلووچ Carlowicz طے پایا تو کرچ بدستور ترکوں کے قبضے میں رہا (J. Von Hammer : *Geschichte des Osmānischen Reiches*، بار دوم، ۳ : ۹۰۹؛ S. Solowyew : *Istoriya rosii, izd. tovar. Obshčestv. Pol'za*، ۳ : ۱۱۷۱) ۔ روسی حملے کا خطرہ محسوس کرکے سلطان مصطفٰی ثانی نے ۱۷۰۲ء میں کرچ کے قریب ھی ایک نیا قلعہ تعمیر کرایا (جسے اب ینی قلعہ کہتے ھیں، V. Hammer : کتاب مذکورہ، ۴ : ۴۷) ۔ ۱۷۷۱ء میں کرچ اور ینی قلعہ پر روسی بغیر مزاحمت قابض ھو گئے ۔ ابازہ پاشا کو جسے ینی قلعہ کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا تھا، اپنی فوجیں مقابلے پر لانے کی ایک بار بھی جرأت نہ ھوئی اور وہ سینوب Sinope واپس چلا گیا (کتاب مذکور، ۴ : ۶۲۲؛

Solovjew، کتاب مذکور، ۶ : ۳۸۷) ۔ بخارسٹ میں صلح کی گفت و شنید کے دوران میں (۱۷۷۳ء) کرچ کے الحاق کے روسی مطالبے کو ترک برابر نامنظور کرتے رہے (v. Hammer، کتاب مذکور، ۴ : ۶۳۸)، لیکن بالآخر عہد نامۂ کوچوک قینارجہ (۱۷۷۴ء) میں انھیں یہ مطالبہ ماننا ہی پڑا ۔ اس کے بعد کرچ کو ایک دوسرے درجے کے روسی قلعے کی حیثیت حاصل رہی ۔ جنگ قریم (کریمیا) کے دوران میں اس پر مئی ۱۸۵۵ء میں اتحادی فوجوں کا قبضہ ہو گیا تھا ۔

اس بستی میں یونانی، رومی اور ابتدائی مسیحی ادوار کی یادگار عمارتیں موجود ہیں اور ان کی بنا پر یہ دنیا میں مشہور ہے، لیکن چونکہ اسلامی دور حکومت میں اسے یہ اہمیت حاصل نہ رہی، لہٰذا یہاں کوئی لائق ذکر اسلامی عمارت نظر نہیں آتی ۔

(W. BARTHOLD)

* **الکَرْخ** : قدیم بغداد کے ایک مشہور محلے کا نام ۔ کرخ آرامی لفظ کرکا Karkā سے نکلا ہے ۔ یونانی اور رومی مصنفین اسے کرچہ (Carcha)، چرچہ (Charcha) اور چَرَسَہ (Charase) لکھتے ہیں (دیکھیے Pauly Wissowa : *Realenzykl. d. klass. Altertumswiss*، تکملہ، ۱ : ۲۷۵، ۲۸۳) اور اس کے معنی ہیں قصبہ (دیکھیے یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۲۵۲ س ۱۸ ؛ Streck، ص ۹۲، ۱۸۶ ؛ G. Le. Strange : *Baghdad*، ص ۶۳) ۔ مسلمانوں کے زمانے میں بھی آرامی تمدن سے متأثر علاقوں، یعنی عراق، خوزستان اور الجزیرہ میں متعدد قصبے یا قصبوں کے محلے اس نام سے موسوم تھے ۔ انھیں ایک دوسرے سے یوں متمیز کیا جاتا تھا کہ ان کے ساتھ کسی جغرافیائی نام (مثلاً میسان، سامرا) کا اضافہ کر دیا جاتا تھا ۔ یاقوت (۴ : ۲۵۲ تا ۲۵۷) کے ہاں ایسے مقامات کا ذکر ملتا ہے؛ نیز دیکھیے الطبری (طبع ڈخویہ، بمدد اشاریہ، ص ۶۲۷) ۔ زیربحث کرخ کو صحیح لفظوں میں عموماً کرخ بغداد کہا جاتا ہے ۔

جیسا کہ اس کے آرامی نام سے ظاہر ہوتا ہے، الکرخ کا محلہ اس سے پیشتر موجود تھا جب المنصور نے بغداد شہر کی بنیاد رکھی (۱۴۵ھ/۷۶۲ء)۔ ان دنوں یہ ایک چھوٹا سا خود مختار قصبہ تھا، جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اسے ساسانی بادشاہ شاپور ثانی (۳۰۹ تا ۳۷۹ء) نے بسایا تھا۔ دوسری قدیم بستیوں کی طرح، جو اس مقام پر واقع تھیں جہاں خلفا کا آئندہ دارالحکومت آباد ہونا تھا، یہاں کی آبادی بھی زیادہ تر آرامی عیسائیوں پر مشتمل تھی (دیکھیے سطور بالا، ۱ : ۵۴۲) ۔ اسلام سے پہلے کے قصبۂ کرخ کو خلیفہ المنصور نے تجارتی مرکز بنانے کے لیے منتخب کیا اور تھوڑی ہی مدت میں یہ اپنی تجارتی حیثیت کے باعث شہر کا سب سے پررونق محلہ بن گیا ۔ شروع شروع میں الکرخ ایک بالکل علٰحدہ آبادی تھی، جو المنصور کے مدوّر شہر سے خاصے فاصلے پر شمال مشرق میں واقع تھی، لیکن شہر کے اردگرد بسرعت نئی سڑکیں اور چوک تعمیر ہو گئے اور یہ بھی اس عظیم الشان دارالخلافہ کی عمارتوں میں مدغم ہو گیا ۔

الکرخ میں پانی کی بہم رسانی نہر عیسٰی اور اس کی شاخوں نہر صراۃ اور نہر کرخایا سے ہوتی تھی ۔ نہر عیسٰی عراق کے انتہائی شمالی علاقوں میں فرات کی بڑی نہر ہے ۔ نہر کرخایا (دیکھیے Frankel : *Die aram. Fremdw. im Arab.*، لائیڈن ۱۸۸۶ء، ص ۲) جو قصبہ المحوّل سے نیچے موضع البراثا (دیکھیے ۱ : ۶۵۵) کے قریب نہر عیسی سے نکلتی ہے، بغداد کے مغربی نصف علاقے کے جنوبی حصے، یعنی تجارتی مرکز اور اس کے گرد و

نواح کو پانی بہم پہنچاتی ہے ۔ اس کی معاون شاخیں بعض مقامات پر زمین کے نیچے نیچے بہتی تھیں ۔ اس کے اوپر متعدد پل تھے، جن پر بڑی آمد و رفت رہا کرتی تھی ۔ نہر کرخایا اور اس کے نہری نظام کے بارے میں دیکھیے ابن سیرپین Ibn Serapion، طبع G.Le Strange، در *JRAS*، ۱۸۹۵ء، ص ۳۲ س ۱۷ تا ۲۶ و ص ۲۸۶ تا ۲۸۸، ۲۹۲ تا ۲۹۳؛ الخطیب البغدادی، طبع Salmon، ص ٦٦ تا ٦٨، ۱۵۴، ۱۵۵؛ یاقوت، ۴ : ۲۵۲؛ Streck، ص ۸۵ تا ۹۰؛ *Baghdad* : G. Le Strange، ص ۵۲ تا ۵٦، ٦۳ تا ۸۰؛ Herzfeld، در Sarre-Herzfeld، ۲ : ۱۱۰ .

الکرخ کا، جسے شیعیوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا، بغداد کی شہری تاریخ، خصوصاً بویہی دور کی تاریخ (دسویں سے گیارھویں صدی عیسوی تک) میں بار بار ذکر آتا ہے (رک به بغداد) ۔ عہد آل بویہ میں، جن کی ہمدردیاں علویوں کے ساتھ تھیں، دارالحکومت کے شیعہ سنی تنازعات اور مناقشات، جو پہلے بھی اکثر ہوتے رہتے تھے، بہت زور پکڑ گئے ۔ ان متخالف فرقوں کے درمیان گلی کوچوں میں خونریز جھڑپیں گویا روز مرہ کا معمول ہو گیا تھا، جن میں اکثر لوٹ مار اور آتش زنی بھی ہوتی تھی ۔ ان خانہ جنگیوں اور باہمی فساد میں عموماً کرخ ہی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی ۔ یہاں کے باشندے آس پاس کے محلوں (باب البصرہ وغیرہ) میں رہنے والے سنیوں کے خلاف ہمیشہ شمشیر بکف رہتے تھے ۔ سلطان جلال الدّولہ (۴۱٦ھ/۱۰۲۵ء تا ۴۳۵ھ/۱۰۴۴ء) کے عہد میں صورت حال حد سے زیادہ بگڑ گئی تھی؛ چنانچہ ایک بار (۴۲۲ھ/ ۱۰۳۱ء) خود اس کی ایسی گت بنی کہ اسے بھاگ کر اپنے ہم مذہب شیعیوں کے پاس کرخ میں پناہ لینی پڑی ۔ ان فسادات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۴۵ھ / ۱۰۵۳ء میں الکرخ کا بڑا حصہ جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا ۔ اس سے قبل خلیفہ الواثق کے عہد (۲۲۷ھ/۸۴۲ء تا ۲۳۲ھ / ۸۴۷ء) میں بھی کرخ ایک زبردست آگ لگنے سے تباہ ہو گیا تھا، لیکن بہت جلد اس تباہی کی تلافی کر دی گئی .

الکرخ زیادہ وسیع معنوں میں دریاے دجلہ کے مغرب میں بغداد کے سارے جنوبی علاقے کا نام تھا ۔ مرور زمانہ سے یہاں متعدد مسجدیں اور مقبرے تعمیر ہوے ۔ سب سے زیادہ مشہور مقبرہ، جس کے ساتھ مسجد بھی ہے، یہاں کے ایک مقامی ولی معروف بن الفیزران الکرخی (م ۲۰۰ھ/ ۸۱٦ء) کا ہے ۔ اس سے کوئی ۳۰۰ گز جنوب میں وہ مقبرہ ہے جو ہارون الرّشید کی بیوی زبیدہ کا بتایا جاتا ہے ۔ یہ دونوں مقبرے (نیز رک به بغداد) آج بھی موجود ہیں اور قدیم بغداد کے مکانوں اور عمارات کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ اہم عمارتیں نقطۂ آغاز کا کام دے سکتی ہیں ۔ موجودہ شکل میں ان کی تجدید و ترمیم خلیفہ الناصر (۵۷۵ھ/۱۱۸۰ء تا ٦۲۲ھ/۱۲۲۵ء) نے کی تھی ، لیکن اس وقت سے اب تک بارہا ان کی اصلاح اور درستی ہوتی رہی ہے ۔ الکرخی کی قبر نویں صدی ہجری ھی میں بغداد کی مشہور ترین زیارت گاہ بن چکی تھی اور آج بھی اسی طرح ایک عظیم الشان قبرستان میں موجود ہے جس طرح کہ عہد عباسیہ میں تھی ۔ اس سے متعلق دیکھیے Streck، ص ۱۵۹ ؛ G. Le Strange : کتاب مذکور، ص ۱۰، ۸۹، ۳۵۰ ؛ Massignon، ص ۱۰۸ ببعد ؛ Herzfeld، ص ۱۷۳ ۔ بغداد کے مغربی جانب جو دیگر مساجد اور مقبرے واقع ہیں ان کے حالات کے لیے دیکھیے Herzfled، ص ٦۴ ببعد یا ۹۴ ببعد .

الکرخ بغداد کے مغربی نصف حصے کا نہ فقط

سب سے بڑا محلہ تھا بلکہ یہ ایک طویل عرصے تک آباد بھی رہا ، بحالیکہ آس پاس کے محلے کھنڈر بن گئے؛ مثلاً یاقوت کے وقت (تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل) میں یہ ایک علحدہ قصبے کی صورت میں بدستور موجود تھا، بالکل اسی طرح جیسے بغداد کی بنیاد پڑنے کے بعد قدیم ترین زمانے میں تھا۔ ان دنوں یہ باب البصرہ کے محلے (المنصور کے قدیم مدور شہر کے جنوب مشرق میں) سے، جو اس وقت تک آباد تھا، کوئی ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ازمنۂ وسطٰی کے آخری ایام میں (دیکھیے مثال کے طور پر ابن بطوطہ، چودھویں صدی عیسوی میں) محلہ باب البصرہ کا نام مغربی بغداد کے ان تمام محلوں کے لیے اکثر استعمال ہونے لگا تھا جو ابھی تک آباد تھے؛ چنانچہ الکرخ بھی انھیں میں شامل تھا دیکھیے G. Le Strange : کتاب مذکور، ص ۳۳۶؛ Herzfeld ، ۲ : ۱۱۴ ببعد۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ دلا دینی چاہیے کہ الکرخ اور اس کے مضافات کے جو جغرافیائی حالات یاقوت نے پیش کیے ہیں وہ دوسرے مآخذ سے پوری طرح نہیں ملتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معجم البلدان لکھتے وقت مصنف کی اس مقام کے بارے میں معلومات زیادہ معتبر نہیں رہی تھیں (دیکھیے G. Le Strange، ص ۸۴، ۱۵۹)۔

الکرخ ایک ایسے دارالضرب کی حیثیت سے بھی مشہور ہے جہاں کبھی کبھار سکّے ڈھالے جاتے تھے۔ عباسی خلفا المقتدر، القاہر اور الراضی کے عہد کے سکّے ملتے ہیں، جو ۳۰۸، ۳۱۵، ۳۱۸، ۳۲۱ اور ۳۲۵ھ کے ہیں (دیکھیے *Numismatische Zeitschrift*، وی انا ۱۸۹۳ء، ۳۴ : ۳۲۱؛ Lavoix : *Cat. des Monn. Mus. de la Bib. Nat.*، ۱ : ۲۸۵؛ *Numismatic Chronicle*، ۱۹۰۲ء، ص ۲۷۲ و ۱۹۱۹ء، ص ۷۹)۔ الکرخ کی شراب کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ عہد عباسیہ کے پہلے دور کے قصائد (مثلاً ابو نواس، ابن معتز) میں اس کا اکثر ذکر ملتا ہے (دیکھیے G. Jacob : *Oriental Studien*، در *Th. Noldeke .... Gewidmet*، Giessen ۱۹۰۶ء، ص ۱۰۶۵)۔

آج کل بغداد کا وہ حصہ جو دریائے دجلہ کے دائیں کنارے پر واقع ہے اور شہر کے مجموعی رقبے کا بمشکل تیسرا حصہ ہے قرشیا کہلاتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ (ترکی) قرشی یقا (= دوسری جانب) ہے (کیونکہ (یہ اصل شہر کے، جو مشرقی کنارے ہے، بالکل مقابل واقع ہے) اور ایک عامی عربی لفظ "جانب الجانب" کی دوسری صورت ہے؛ لہٰذا اس نام کا کرخ سے کوئی تعلق نہیں۔ لیسٹرینج : کتاب مذکور، ص ۶۶، میں اس کے خلاف نظریہ اختیار کیا گیا ہے۔ مدت تک قرشیا نواح شہر کا ایک حقیر سا حصہ رہا، لیکن حال میں اس کی اہمیت کچھ بڑھ گئی ہے اور یقیناً اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا کیونکہ بغداد کا ریلوے سٹیشن یہیں بنا ہے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے بنو عقیل (عوگیل، عگیل) کے عرب یہاں آباد ہیں اور آج کل اس مغربی شہر کی خاصی آبادی ان عربوں اور دوسرے تجارت پیشہ لوگوں پر مشتمل ہے (اس سلسلے میں Cernik کی تفتیشی مہم کے لیے دیکھیے *Petermans Geograph. Mitteil.*، تکملہ، حصہ ۴۴، Gotha ۱۸۷۵ء، ص ۲۸، ۳۰؛ v. Oppenheim : *Vom Mittelmeer zum Persischen Golf*، برلن ۱۹۰۰ء، ۲ : ۲۷۴، ۲۳۸؛ Cl. Huart : *His. de Bagdad dans les temps modernes*، پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۱۱ ببعد، ۱۸۸ ببعد؛ Massignon ، ص ۹۹۔

مآخذ : (۱) *Bibliotheca Geographorum Arabicorum*، بمدد اشاریہ ؛ (۲) الطبری، طبع ڈخویہ ، بمدد اشاریہ، ص ۲۶۲؛ (۳) الخطیب البغدادی، طبع Selmon

(دیکھیے Selmon : *Introduct. topograph. à l'hist. de Bagdad*، پیرس ۱۹۰۳ء، ص ۲۰ تا ۲۳، ۹۸ تا ۱۰۲؛ (۴) یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۲۵۴ ببعد؛ (۵) ابن الأثیر : الکامل، طبع Tornberg، ۱۳ : ۲۹۳، بمدد اشاریہ؛ (۶) القزوینی : آثار البلاد، طبع Wüstenfeld، ص۲۹۸؛ (۷) Streck : *Babylonien nach den arab. Geographen*، لائیڈن ۱۹۰۰ء، ۱ : ۹۲ تا ۹۷؛ (۸) G. Le Strange : *Baghdad during the Abbasid Caliphate*، آوکسفرڈ ۱۹۲۴ء، ص ۶۳ تا ۸۰ و بمواضع کثیرہ (بمدد اشاریہ)؛ (۹) وهی مصنف : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۳۱؛ (۱۰) L. Masignon (1907-8) : *Mission en Mésopotamie*، ج ۳۱، پیرس ۱۹۱۲ء، ۲ : ۳۹، ۹۹، ۱۰۸؛ (۱۱) E. Herzfeld، در Serre Herzfeld : *Archäol Reise im Euphrat und Tigrisgebeit*، برلن ۱۹۲۰ء، ۲ : ۱۰۵، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۴ ببعد؛ بغداد کے نقشوں کے لیے دیکھیے G. Le Strange : *Baghdad*، نقشہ ۳ و ۷؛ نیز Herzfeld، جو الکرخ کے ٹھیک ٹھیک محل وقوع کے متعلق G. Le Strange کی رائے سے کسی قدر اظہار اختلاف کرتا ہے اور غالباً وہ حق بجانب ہے .

(M. STRECK)

* **کرخا** : Kerkha، خوزستان کا ایک دریا، جس کا منبع عراق میں نہاوند کے مشرق و جنوب میں واقع ہے ۔ چشم کاظم کو اس کا اصل سرچشمہ سمجھا جاتا ہے اور یہ کوہ چہل نبلغان سے نکلتا ہے ۔ نقشے میں یہاں ایک چھوٹی سی ندی سرہ کنچ نظر آتی ہے، جس میں مشرق سے کرسرہ ندی آ کر مل جاتی ہے ۔ پھر نہاوند کے قریب مشرق ھی کی جانب سے آب کلن آ ملتا ہے، جو کوہ فروزان سے نکلتا ہے ۔ اس کے بعد دولت آباد سے سیروان رود اس میں آ گرتی ہے ۔ اس علاقے میں یہ دریا گمساب کے نام سے مشہور ہے جس کا صحیح تلفظ گمسیاب (اور بگڑی ہوئی شکل گرسیاب) ہے .

دریا کا رخ شروع شروع میں شمال مغرب کی سمت ہے، لیکن پھر بتدریج مغرب کی جانب مڑ جاتا ہے ۔ بیستون تک پہنچنے سے پہلے اس میں شاجو رود مل گئی ہے، جو کنگر شاہ کے مل جانے سے اور بڑی ہو گئی ہے ۔ اس کے بعد کرخا جنوب کی طرف مڑ جاتا ہے اور اس میں کرمان شاھان کا دریا قرہ صو آ ملتا ہے ۔ آگے چل کر آب کرند بھی شامل ہو جاتا ہے، جس کے اپنے کئی اہم معاون ہیں ۔ اب تک جتنے معاونوں کا ذکر ہوا ہے، وہ سب کے سب اس میں دائیں طرف سے آ کر ملتے ہیں ۔ ان کے برعکس کشگن رود بائیں جانب سے آتی ہے، جس کے معاون یہ ہیں : مدین رود دائیں طرف سے اور رود خرم آباد مع رود کول کو بائیں طرف سے ۔ اس کے بعد دائیں جانب ھی سے نیلم رود اور آب زال آتے ہیں ۔ اب دریاے کرخا کا رخ کچھ دور تک جنوب سے مغرب اور پھر جنوب کی طرف ہو جاتا ہے ۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے میں دریا کو کرخہ (کرخہ) کہتے ہیں ۔ نیلم رود اور آب زال کے درمیان کچھ فاصلے کے لیے اس کا نام آب صیمرہ ہو جاتا ہے ۔ یہ قصبۂ صیمرہ [رک بآں] کے نام پر ہے، جو دریا کے مغرب میں کچھ فاصلے پر واقع ہے ۔ آب زال کے ساتھ مل جانے کے بعد دریا ایک بار پھر جنوب کی طرف مڑ جاتا ہے ۔ پای پل کے علاقے میں پہنچتے ھی اس میں سے کئی نہریں نکلتی ہیں ۔ ان نہروں سے اس کا اتصال آب دز اور اس کے معاونین نہر تبل خن اور نہر دغ دری سے ہو جاتا ہے ۔ سوس کے کھنڈر اس کی ایک مشرقی گزرگاہ آب کے کنارے واقع ہیں، جسے آگے چل کر دریاے شور کے نام سے یاد کیا ۔

جاتا ہے ۔ کرخا کا بہاؤ نہر ہاشم کے جنوبی علاقے میں آ کر ختم ہو جاتا ہے، جہاں اس میں شطّ الجَمز کا پانی آ ملتا ہے ۔ ایک مدت پہلے دریا یہاں سے شمال مغرب کو حَوِیزَہ (حُوَیْزہ) تک بہتا تھا ۔

اس دریا کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں جو سڑکیں جاتی تھیں، ان میں وہ شاہراہ قابل ذکر ہے جو علاقہ بیستون میں ہمذان اور عراق کو ملاتی ہے، نیز وہ سڑک جو حُلوان سے صَیْمَرہ کو جاتی ہے ۔

قدیم جغرافیہ نویس اس دریا کو Choaspes کہتے تھے ۔ کرخا کا نام عرب جغرافیہ نویسوں کے ہاں نہیں ملتا ۔ بقول Rawlinson یہ پہلی بار چودھویں صدی عیسوی کے ایک فارسی نسخے میں آیا ہے ۔ بہرکیف یہ لفظ کچھ پرانا ہی ہوگا ۔ ابن الأثیر نے ۵۵۳ھ/۱۱۵۸ء کے ذیل میں ایک کَرْخَانا کا ذکر کیا ہے ۔ اگر اس سے یہ دریا ہی مراد ہو تو اس کا نام ضرور بارھویں صدی عیسوی میں موجود تھا ۔ ابن الأثیر عموماً جغرافیائی تفصیلات دینے سے حتی الامکان پرہیز کرتا ہے؛ اس نے ضرور یہ نام کسی قدیم مآخذ سے لیا ہوگا ۔ کرخانا لازمی طور پر آرامی لفظ ہوگا جس کا مطلب ہے "کرخا کا (دریا)" یعنی کرخا دہ لیدن Karkha de Lëdan .

عرب جغرافیہ نویسوں نے اس دریا کا ذکر دو بار یقیناً کیا ہے، اگرچہ اس کا نام نہیں لیا ۔ ابن الفقیہ کے بیان کی رو سے نہاوند کے قریب اس کے کنارے سے ایک اعلٰی قسم کی سیاہ رنگ کی مہر لگانے کی چکنی مٹی نکلتی ہے ۔ ابن رُستہ نے بیستون کے قریب جس "بڑے دریا" کا ذکر ہے، وہ بھی لازماً گَمَسی آب ہوگا ۔ صَیْمَرہ اور طَرْحان کے درمیان اس پل کو بھی جسے فن تعمیر کا شاہکار سمجھا جاتا تھا، پل خسرو ہی سمجھ سکتے ہیں، جو کرخا پر بنا ہوا ہے ۔ کرخا کو عام طور پر "دریاے سُوس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مثلاً بہت پہلے ابن خرّداذبہ کے وقت میں یہ نام آیا ہے ۔ اس کے منبعوں کے بارے میں جغرافیہ نویسوں کو قابل اعتماد معلومات حاصل نہیں تھیں ۔ ابن خرّداذبہ کہتا ہے کہ یہ دِیْنَوَر سے نکلتا ہے اور ابن واضح کا کہنا ہے کہ ہَمذان سے ۔ کم از کم گَمْسی آب کے معاونین کے بارے میں یہ رائے ہے، بشرطیکہ ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہاں دِیْنَوَر اور ہَمَذان کے شہر نہیں بلکہ صوبے مراد ہیں ۔ عرب جغرافیہ نویسوں کے قول کے مطابق یہ دریا اہواز کے دُجَیْل میں جا گرتا ہے ۔ یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ پانی چڑھنے کے وقت، سوس کے مقام پر اس دریا کا پاٹ دو میل کے قریب ہو جاتا ہے ۔ ابن واضح کے بیان کی رو سے یہ دریا ہِندُوان کے نام سے مشہور تھا ۔ غالباً بَصِنّا کی ندی یا "دجلۃ بَصِنّا" جس کے پانی سے سات پن چکیاں چلتی تھیں اور جو شہر بَصِنّا سے ایک پرتاب تیر کے فاصلے پر بہتا تھا اور جس کا ذکر المقدسی اور یاقوت کے ہاں ملتا ہے، وہ اور کرخا ایک ہی دریا ہیں ۔

مآخذ : (۱) Rawlinson در *JRGS*، ۹ : ۸۹؛ (۲) Ritter : *Erdkunde*، ج ۹؛ (۳) Reclus : *Nouvelle Goegraph. Univ.*، ۹ : ۲۹۰، ۳۰۶؛ (۴) Graadt von Ruggen (در Morgan : *Délégation en Perse*، ج ۷)، ص ۱۶۸، ۱۹۰؛ (۵) Herzfeld : *Petermanns Mittei-lungen*، ۵۳ : ۴۹، ۶۰، ۶۳؛ (۶) G. le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۲۳۳، ۲۴۰؛ (۷) Schawrz : *Iran in M. A.*، ۴ : ۳۰۴ ببعد، ۳۶۴ ببعد، ۳۹۳؛ ۵ : ۴۵۳، ۴۷۲، ۴۸۸، ۵۰۱ .

(P. SCHWARZ)

الکرخی : ابوبکر بن الحسن (یا الحسین) *

ریاضی دان وہ اپنے آپ کو الحاسب (حساب دان) بھی کہتا تھا ۔ اس کا قیام بغداد میں رہا ۔ سلطان بہاء الدولہ [رک بآں] کے وزیر ابو غالب محمد بن خلف فخرالملک اور اس کے بیٹے سلطان الدولہ ابو شجاع کے زمانے میں ۔ تاریخ وفات معلوم نہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰ ۴ھ/۱۰۱۹ اور ۴۲۰ھ/ ۱۰۲۹ کے درمیان ہوگی ۔ ریاضی میں کرخی کی صرف دو تصنیفیں باقی رہ گئی ہیں : الکافی فی الحساب (حساب کے لیے کافی) اور الفخری (معنون بہ وزیر فخر الملک) ۔ پہلی تصنیف کا ایک مخطوطہ جو اپنی جگہ پر لاجواب ہے، گوتھا میں موجود ہے، دوسری کا پیرس، آوکسفڑڈ اور قاہرہ میں ۔ عربی متن ابھی تک کسی کا بھی شائع نہیں ہوا البتہ اول الذکر کا تین حصوں میں ایک جرمن ترجمہ موجود ہے : A. Hochheim : *Kāfī fil Hisāb des Abu Bèkr Muh. b. Alhussain Al Karkhi*، Halle ۱۸۷۸-۱۸۸۰ء؛ اور دوسری کی ایک تلخیص فرانسیسی میں، F. Woepcke : *Extrait du Fakhrī*، پیرس ۱۸۵۳ء ۔ الخیامی کے جبر اور مقابلے کے بعد ریاضی کی اس شاخ میں الفخری اہم ترین کتاب ہے، جس میں الکرخی نے اسکندریہ کے یونانی ریاضی دان ڈیوفانٹوس Diophantus کا تتبع کیا ہے؛ چنانچہ یہ پہلا موقع تھا جب عربوں نے اس کتاب میں غیر معین مساوات سے بحث کی اور ان کا حل یونانی طریق میں پیش کیا البتہ اس امر کا تصفیہ مشکل ہے کہ الکرخی نے قصداً ہندی طریقوں کو نظر انداز کر دیا یا وہ ان سے بے خبر تھا ۔ اپنے رسالہ حساب میں مشرق کے تقریباً سب عرب ریاضی دانوں کی طرح (مگر علی بن احمد النسوی (۹۸۰ تا ۱۰۴۰ء کے سوا) وہ ہندی اعداد استعمال نہیں کرتا بلکہ سب رقمیں الفاظ میں لکھتا ہے ۔

مآخذ : اب تک کی مطبوعہ عرب سوانحی تصانیف میں کسی میں بھی الکرخی پر کوئی علحدہ مقالہ نہیں ۔ اس کا ذکر (۱) ابن خلکان، قاہرہ، ۱۳۱۰ھ، ۲ : ٦۵ میں کہیں کہیں ہے؛ مترجمہ de Slane، ۳ : ۲۷۹؛ نیز دیکھیے (۲) M. Cantor : *Vorlesungen uber Gesch. d. Mathem*، بار دوم، ۱ : ۷۱۸ تا ۷۲۹؛ (۳) H.Suter، در *Abhandl z. Gesch. d. mathem. Wissensch*، ۱ : ۸۳ ۔

(H. SUTER)

کِرد : رک بہ اقریطش (Crete) ۔ *

کُرد : مشرق قریب کی ایک ایرانی قوم جو * ایران، ماوراے قفقاز ترکی اور العراق [رک بہ کردستان] میں آباد ہے ۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے ان کردوں کی تعداد کا، جو مجتمع یا الگ الگ بستیوں میں آباد تھے (خراسان، ایشیاے کوچک، کیلیکیا (سلیشیا) جنوبی شام) اندازہ بیس تیس لاکھ کے قریب کیا گیا تھا ۔

اگرچہ بہت سے سیاح کردستان سے ہو کر گزرے ہیں اور کردوں کے بارے میں لسانی، تاریخی، نسلیاتی اور سیاسی اعتبار سے کثیر تعداد میں تصنیفات بھی ملتی ہیں، لیکن ابھی تک ہم کسی عام تحقیقی مقالے سے محروم ہیں جو خاص اسی قوم سے متعلق ہو ۔ ایسی تصنیف کی تیاری میں مشکلات کا سامنا اس لیے ہے کہ ہماری معلومات جزوی ہیں اور منتشر، اور پھر یہ کہ جن مصنفوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے ان کے طریق کار میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔

(الف) اصل و نسل

کردوں کی ایرانیوں میں شمولیت زیادہ تر لسانی اور تاریخی مواد کی بنیاد پر کی جاتی ہے، لیکن اس سے اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ ان میں مختلف النسل عناصر جمع ہو گئے ہیں ۔ ان مؤخر الذکر عناصر کی نوعیت عیاناً جابجا مختلف ہے ۔ ممکن ہے کہ کرد عناصر کی افزائش کا رخ مشرق (مغربی ایران) سے مغرب (وسطی کردستان)

کی ۔انب ہوا ہو، لیکن ایسی کسی قوم کا وجود تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں جو کردوں کی آمد سے قبل وسطی کردستان میں رہتی تھی، یعنی نسلًا ان سے مختلف اور اسمًا مشابہ (قَرْدو) اور جو آگے چل کر ایرانی کردوں میں مدغم ہو گئی ۔

تقریبًا ۲۰۰۰ ق م ۔ دو سمیری کتبوں میں Theureau Dangin (*Revue d'Assiyriologie*، ۵ : ۹۹؛ ۶ : ۶۷) نے کردوں کے ایک علاقے "کَرْدَہ کہ" نامی کا ذکر دیکھا تھا (مرتب نے مجھے نجی طور پر بتایا ہے کہ اس میں پہلا حرف ک ہے، ق نہیں اور جزو کہ کا مفہوم غیر یقینی ہے) ۔ یہ ملک "اہل سو" (دیکھیے *ZA*، ۳۵ : ۲۳۰، حاشیہ ۳) کے علاقے سے متصل تھا جس کا محل وقوع ڈرائیور Driver نے بحیرۂ وان کے جنوب میں بتایا ہے ۔ علاقۂ بِدْلِیْس میں ایک قدیم قلعہ سوی موجود ہے (شرف نامہ، ۱ : ۳۶۱)۔ ایک ہزار سال بعد تگلتہ پلیسر Tiglath Pilesar نے آزُو کے پہاڑوں میں بسنے والی قوم قرطی (Kur-ṭi-e) کے خلاف جنگ کی تھی ۔ Driver (کتاب مذکور، ص ۴۰۰) نے اسے وہی پہاڑ قرار دیا ہے جو آج کل حزو (سَسُن Sasun) کہلاتا ہے ۔ قرطی کی قراءت غیر یقینی ہے ۔

پانچویں صدی میں Herodotos نے ایسے کسی نام کا ذکر نہیں کیا، لیکن بقول اس کے (۳ : ۹۳) ھخامنشی سلطنت کے تیرھویں نوم (Nome صوبہ) میں جو آرمینیوں کے بعد آتا تھا ایک علاقہ Παχτυιχή نامی شامل تھا جس کے نام کا رشتہ Nöldeke (*Gramm. d. neusyrischen Spr.*، لائپزگ ۱۸۶۸ ، ص ۱۸) اور Kiepert (*Alt. Geogr*، پیرا ۸۱) نے بُخْتان (= بہْتان) سے جوڑا ہے ۔

دس ہزار [کے عسکر] کی پسپائی نے جس کا حال Xenophon (۴۰۱ - ۴۰۰ ق-م) نے بیان کیا ہے کَرْدُکوئی (Καρδοῦχοι) کے نام کو شہرت بخشی، جن کا ملک کنترتیس Kentritēs (بہتان) کے مشرق میں واقع تھا ۔ اس زمانے سے یہ نام ہمیں تسلسل کے ساتھ دریاے دجلہ کے بائیں کنارے پر کوہ جودی [رک بآن] کے قریب ملتا ہے اور کلاسیکی مصنفوں کے ہاں اس ملک کا نام کردوئن Corduene ہو گیا ۔ (اس نام کی متعدد شکلوں کے بارے میں جو سامی حرف ق کو ادا کرنے میں مشکل کے باعث وجود میں آئیں، دیکھیے Driver، کتاب مذکور)۔ آرامی میں یہ ضلع بث قَرْدو (Beth-Kardū) کہلاتا تھا اور موجودہ شہر جزیرۃ ابن عمر قردو کا گَزَرتا کہلاتا تھا ۔ آرمینی اسے کوردذ کہتے تھے اور عرب (البَلاذُری، ص۱۷۶؛ الطّبری، ۳ : ۱۰۶۱) بَقَرْدا (قَرْدَی)۔ یاقوت (۴ : ۵۶) نے ابن الأثیر کی سند پر اعتماد کرکے بیان کیا ہے کہ ضلع بَاقَرْدا، جزیرۃ ابن عمر کا ایک حصہ تھا ۔ اس میں دو سو گاؤں (الثّمانین، جُودی، فیروز شابور) شامل تھے اور یہ دجلے کے بائیں کنارے پر بازلدا کے بالمقابل آباد تھا، جو دجلے کے دائیں کنارے پر واقع تھا (متون کے مفصل تجزیہ کے لیے دیکھیے M. Hartmann : *Bohtan*، ص ۳۳ تا ۳۵) ۔ یہ نام جس کا اطلاق صرف ضلع پر ہوتا تھا، آگے چل کر مسلمانوں کی کتابوں سے ناپید ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ جزیرۃ ابن عمر، بہتان وغیرہ لے لیتے ہیں ۔ ارمینیوں اور عربوں کے نزدیک علاقہ قَرْدو کا اطلاق صحیح معنوں میں ایک بہت محدود سے علاقے پر ہوتا تھا ۔ ہمیں Corduene کی صحیح صحیح سرحدوں کا علم نہیں ۔ اس کے تین قصبے سریسہ Sareisa سَتَلکا Satalka اور پِنَکا Pinaka (فِنیق) دریاے دجلہ کے کنارے واقع تھے ، لیکن اس سلسلے میں Strabo کا بیان (۱۲ : ۹، س ۴) قابل توجہ ہے، جس کی رو سے Γορδυαῖα ὄρη کی اصطلاح کا اطلاق بعض اوقات ان پہاڑوں پر ہوتا تھا جو موجودہ دیار بکر اور مُوش کے درمیان واقع ہیں ۔

اب سوال پیدا ھوتا ھے کہ یہ Καρδοῦχοι کون تھے جن کا نام بلاشبہہ اسمائے مابعد میں بھی قائم رہا (آخری جزو χοι- کو لازمًا ارمنی صیغۂ جمع کی خ کا مترادف سمجھنا چاھیے ۔ غالبًا اس کی توجیہ یہ ہو سکے گی کہ یہ نام یونانیوں نے کسی ارمنی سے سیکھا ہوگا) ؟ بقول زینوفون (۴ : ۳، س ۱) Karduchoi نہ تو شاہ Artaxerxes کی حکومت تسلیم کرتے تھے نہ آرمینیا کی ۔ جب پہلی صدی قبل مسیح میں Tigranes ثانی نے Corduene کوفتح کیا تو اس نے وھاں کے بادشاہ Zarbienus کو مر واڈالا ۔ Corduene کے بادشاہ کو ۱۱۵ء میں Manisarus کہتے تھے ۔ بقول Hübschmann (*Die altarm. Ortsnamen*، ص۹۳۲و*Arm. Gramm.*، ۱۸۹۷ء، ۱/۲ : ۵۱۸ تا ۵۲۰) صوبۂ کردوئن نے آرمینیا کا بڑا سطحی سا اثر قبول کیا تھا ۔

یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ Xenophon کے زمانے میں دریاے دجلہ کے شمال میں ایک ایرانی قبیلہ آباد تھا ، لیکن ھمارے پاس کرد چوی Karduchoi کی نسل کے بارے میں اس کے نام کے سوا کوئی دوسری شہادت موجود نہیں ۔ سامی زبانوں میں اس نام کے مماثل اور بھی نام ھیں (عکّادی، آشوری: قَرْدُو، مضبوط، سورما، قرادُو، "مضبوط ھونا")۔ دوسری طرف اس کی صوتی مماثلت ایک قوم خَلْدِی کے نام سے بھی پائی جاتی ھے جس کا آشوری تلفظ اُرَرْطُو اُرَشْطُو زیادہ مشہور ھے اور جسے عبرانی میں اَرَرَطْ (اَراراط ، ارارات ، جبل الحارث) اور یونانیوں کے ھاں Αλαρόδιοι, Χάλδοι کہتے ھیں اور بعض اوقات Χαλδαῖοι ، یہ قوم آرمینیا میں نویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں نمودار ھوئی تھی اور بعد ازاں اس نے بحیرۂ وان کے علاقے میں ایک طاقت ور سلطنت قائم کر لی تھی ۔ یہ سلطنت چھٹی صدی کے اوائل تک باقی رھی ۔ Lehmann-Haupt : *Mater. z. älter Gesch. Armeniens* ، گوٹنگن ۱۹۰۷ء، ص ۱۲۳، کی نظر میں خلدی تارکین وطن ھیں جو مغرب سے آئے تھے ۔ E. Mayer : *Gesch. des Altertums* ۱/۲ (۱۹۱۳ء)، فصل ۴۷۴ کا خیال ھے کہ ان کا اصلی وطن وسطی Araxes کے کنارے تھا ۔ ساتویں صدی کے قریب ارمنیوں کے آنے کا نتیجہ یہ ھوا کہ خلدی منتشر ھو گئے اور پہاڑوں کی جانب دھکیل دیے گئے (*Cyropaedia*، ۳ : ۱ تا ۳)، لیکن ان کا نام ان مقامات کے ناموں کی شکل میں زندہ رہا جو بحیرۂ وان کے شمالی علاقے میں ھیں (بوزنطی صوبۂ Χαλδία میں طربزون کے قریب قصبۂ خِلاط، اَخْلاط وغیرہ، دیکھیے Belck و Lehmann : *ZA*، ۱۸۹۴ء، ۹ : ۸۴؛ de Goeje : کتاب مذکور، ۱۰ : ۱۰۰؛ Streck : کتاب مذکور، ۱۴ : ۱۱۲) ۔ خَلْدی سے مشابہ نام قفقاز کے دوسری طرف بھی پائے گئے ھیں ۔ گرجیوں کو خرتھوالی، خرتھولی Kharth-veli-Kharth-ul-i کہا گیا ھے (سوانی میں خیَرد ؛ منگرلی میں خورتُو) دیکھیے Adontz : *Armenia v epokhu Iustiniana* ، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۸ء، ص ۳۹۸ ۔

ھم قَرْدُوکو خواہ سامی سمجھیں یا مقامی لوگ کم از کم ایک بات یقینی ھے کہ قدیم کرد چوی Karduchoi کی سر زمین آج کل کردوں کے اھم مراکز میں سے ھے، لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ھے کہ کردچوی ھی کرد تھے اور یہی نظریہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک بھی بدیہی سمجھا جاتا تھا، دیکھیے Grundriss : *d. Iran. Phil*، ۲ : ۴۶۴ ۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کردوں کا تعلق براہ راست Χάλδοι سے ملا دیا جاتا تھا ۔

Reiske نے *De Ceremoniis*، کتاب ۳، ص ۲۱۳ ، س ۱۱ میں Constantine Porphyro-

genealogy کی شرح میں لکھا ہے : "Chaldi et Kordi vel. Curti, Gordyai iidem" [= خلدی اور کوردی یا کرتی اور گوردیائی ایک ہی ہیں] - اسی قسم کی رائے Lerch کی تصنیف (۱۸۵٦ء) کے عنوان *Récherches sur les Kurdes Iraniens et sur leurs Ancêtres, les Chaldéens Septentrionaux* میں بھی ظاہر کی گئی ہے ۔

اس مسئلے کا ایک نیا پہلو Nöldeke اور Weissbach کی تحقیقات سے M. Hartmann سامنے آیا، جنھوں نے کُرد اور قَرْدو کی اصل کا لسانی اعتبار سے فرق پیش نظر رکھنے کی ضرورت ظاہر کی - علاوہ ازیں ان علما نے یہ تجویز پیش کی کہ کرد کو Κύρτιοι تسلیم کیا جائے، یعنی سیرتی Cyrtii، جن کا ذکر کلاسیکی مصنفوں نے میڈیا اور ایران میں کیا ہے (Strabo، ۱۱ : ۱۳، س ۳ و ۱۵ : ۳، س ۱) - اس مفروضے کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ ساسانیوں کے عہد میں کردوں کے متعدد قبیلے فارس میں موجود تھے (دیکھیے کارنامۂ اردشیرِ بابکان، مترجمۂ Nöldeke، گوٹنجن ۱۸۷۹ء، ص ۳۷، ۴۸؛ نیز عرب مصنفین کی شہادتیں) ۔

کُرد اور قَرْدو کے ناموں میں قابل قبول امتیاز کے باوجود یہ اہم مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا کہ سیرتیوں (Cyrtii = ایرانی کردوں) نے اپنی نو آبادیاں ان علاقوں میں کیسے بنائیں جو زغروس Zagros کے مغرب میں واقع ہیں، یعنی قدیم قَرْدو کا ملک اور مقابل تاوروس (Anti-Taurus) کے پہاڑ، جو شمالی شام تک پھیلے ہوے ہیں - اس مسئلے پر ابھی بڑی احتیاط سے تحقیق کی ضرورت ہے - پہلی بات تو یہ ہے کہ میڈیا اور ایران کی فتوحات کے دوران میں ایرانی اقوام بہت حد تک جگہ سے بے جگہ ہوئی ہوں گی - اس کی ایک مثال ہمیں سگرتیوں (Asagartiya) کے ایک گروہ کے ترک وطن میں ملتی ہے، جن کا اصل وطن سیستان تھا - آشوری عہد میں ان سگرتیوں Sagartians کو ہم میڈیا (ذِکرتو Zikirtu یا ذَکْرُتی Zakruti؛ دیکھیے Streck، *ZA*، ۱۳ : ۱۰٦) میں پاتے ہیں - دارا Darius کے زمانے میں (بیستون، کتبہ ۲ س ۹۰) ان کا دارالحکومت دشت آشوری میں اربلہ Arbela کے مقام پر قائم ہو چکا تھا، جہاں دارا نے ان کے سردار چِتْرَنْتَخْمَہ Citranta<u>kh</u>ma کو قتل کیا، جس کی اس تصویر سے جو بیستون کی چٹان پر کھدی ہوئی ہے، کردی وضع قطع ظاہر ہوتی ہے (L.W. King : *The Sculptures of Behistan*، لنڈن ۱۹۰۷ء) - یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سیرتیوں کی اجیر فوج نے ۲۲۰ ق - م اور ۱۷۱ ق - م کے مابین روم، سلوقیوں (Seleucids) اور شاہان پرگمہ (Pergamon) کے درمیان لڑائیوں میں حصہ لیا تھا (Livy، ۴۲ : ۵۸ س ۱۳ و ۳۷ : ۴۰ س ۹؛ Polybius، ۵ : ۵۲ س ۵؛ نیز دیکھیے Weissbach، در Pauly-Wissowa، بار دوم، بذیل مادّۂ Cyrtii؛ A. J. Reinach : *Les Mercenaires de Pergame*، *Revue Archéologique*، ۱۹۰۹ء، ص ۱۱۵ تا ۱۱۹) - ساتویں صدی عیسوی میں ارمینیہ کے جغرافیے میں صوبۂ کورچیخ Korcēkh کے سلسلے میں بڑے دلچسپ تغیر و تبدل کا حال معلوم ہوتا ہے (بقول Adontz : *Armenia*، ص ۴۱۸، کورچیخ دراصل کورتچ ایخ Kortič-aikh سے بنا ہے جس میں کورتچ Kortič سے مراد کرد ہے، جیسے Atrpatic سے مراد Atropatene کا باشندہ ہے) - فوسطوس بوزنطینوس Faustus Byzantinus کے زمانے (چوتھی صدی) میں کورچیخ سَلْماس [رک باں] کے قریب محض ایک ضلع تھا؛ کورچیخ بحیثیت ایک صوبے کے جُولَا مرگ سے جزیرۂ ابن عمر تک پھیلا ہوا تھا اور اس میں حسب ذیل اضلاع شامل تھے: کوردخ، تین کوردِخ (کوردِخ)، اَیْتونخ، اَیگرخ، موتھو لاوُخ (اوتھولنخ)

اورسروخ (اورسِنخ)، کرتھنخ (سرپونخ)، چہک اور کوچک البک (*Bohtan* : Hartmann[n]، ص ۹۳؛ Hübschmann : *Die altarm. Ortsnamen*، ص ۲۵۵ تا ۲۵۹).

ھمیں ان تغیرات کا بھی پتا چلتا ھے جو یہاں بتدریج رونما ھوتے رھے۔ کوردخ، کوردِخ اور تمورِخ (جس کا ذکر فوسطوس Faustus نے قدیم Corduene کی جگہ کیا ھے) کے تین اضلاع میں سے کوردخ کورچیخ کا محض ایک ضلع بن گیا تھا، اور تمورِخ بالکل محو ھوگیا تھا۔ اس سے کوردِرِخ (کوردِخ) کو پورا فائدہ پہنچا، جسے صرف بالائی وسطی اور زیریں اضلاع میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

Hübschmann (موضوع مذکور، ص ۳۸۵) نے صرف کوردرِخ اور کوردِخ کے درمیان فرق واضح کرنے پر اکتفا کیا ھے، لیکن عموماً M. Hartmann اور Nöldeke نے جو لسانی فرق قائم کیا تھا اس سے مخلوط یا مسخ شدہ شکلوں کا وجود خارج از امکان نہیں ھوتا (M. Hartmann، موضع مذکور، ص ۹۲: "es gingen wohl schon früh die Namen durch-einander" [= بہت ممکن ھے کہ ان ناموں میں خاصی مدت پہلے التباس واقع ھو چکا تھا])۔ Noldeke نے تو اسما کا ایک تیسرا گروہ بھی علحدہ قائم کیا ھے، یعنی آرامی قَرْ تِوَایہ Kartewāyē (عربی قَرْتاوِیة ؟) جس کا مطلب ھے اصل کرد؛ دیکھیے Hoffmann : *Auszüge* وغیرہ، ص ۲۰۷، حاشیہ ۱۶۳۹.

اس طرح ھم اس نتیجے پر پہنچتے ھیں کہ عرب فتوحات کے زمانے کے قریب ایرانی یا ایرانی نما قبائل پر مشتمل ایک ملی جلی قوم کے لیے صرف ایک نسلی اصطلاح کرد (جمع: اَکراد) استعمال ھونے لگی تھی۔ مؤخرالذکر قبائل میں سے بعض تو یہاں کے اصلی قدیمی باشندے تھے (قَرْدو، تمورِخ Tmorikh یا طمورایہ Tamurāyē اس ضلع میں جس کا صدر مقام الفی (Elk) تھا)۔ الخُوَیثیّہ (Χοθαῖται) ساسون کے ضلع خوئت Khoit میں، اورطایہ Orṭāyē (= الارطان) فرات کے موڑ پر؛ بعض سامی تھے (دیکھیے کرد قبائل کے معروف شجرہ ھائے نسب) اور بعض غالباً ارمن تھے (کہا جاتا ھے کہ قبیلۂ مَمْکان مَمْکونی النسل ھے).

بیسویں صدی میں یہ بات قطعی طور پر ثابت ھو چکی ھے کہ ایک غیر کرد ایرانی عنصر کردوں میں شامل ھو چکا تھا (یعنی گوران زا زا گروہ)۔ متعدد اضلاع میں ایک طرح کی معاشرتی طبقہ‌بندی ھوگئی تھی، جس کی بنیاد نوواردوں کے سیاسی غلبے پر قائم تھی، یعنی سلیمانیہ [رَک بآں] میں، ساوج بُلاق [رَک بآں] میں اور کوتور میں، جہاں شَقاق کے زیر تسلط بچے کھچے کورہ سِنلی(؟) ملتے ھیں۔ اگر باقاعدہ تحقیق کی جائے تو ممکن ھے کہ ایسی قدیم اقوام کے آثار کا پتا چل سکے جن پر کرد عنصر کے چھا جانے سے ایک واحد قوم کی شکل بن گئی.

شجرہ ھائے نسب اور معروف اشتقاقات: کُردوں کی ابتدا کے مسئلے کے بارے میں اسلامی مآخذ اور کردی روایات سے ھمیں کوئی مدد نہیں ملتی۔ المسعودی نے بتایا ھے کہ وہ ان ایرانیوں کی نسل سے ھیں جو ظالم بادشاہ ضحّاک [تازی] کے پنجے سے نکل کر یہاں چلے آئے تھے۔ (مروج، طبع Barbier de Meynard، ۳: ۲۵۱)۔ اس روایت کی بہترین تفصیل شاہنامہ (طبع Macan، ۱: ۲۷ تا ۲۸؛ طبع Mahl، ۱: ۴۷؛ طبع Vullers، ۱: ۳۶ اشعار ۲۹ تا ۳۸) میں ملتی ھے۔ ۱۸۱۲ء میں Morier (*Second Journey*، ص ۳۵۷) نے دماوند میں (۱۲ اگست کو) ایک تہوار کا ذکر کیا ھے، جو ضحّاک کے استبداد سے ایران کے نجات پانے کی یاد میں منایا جاتا تھا اور اسے عید کُردی کہتے تھے۔ دوسری طرف کردوں نے اپنا سلسلۂ نسب عربوں سے ملانے کی کوشش کی ھے۔ بعض (مروج، ۳: ۲۵۳) کا دعوٰی تھا کہ رَبیعة بن نزار بن مَعَد ان

کاجد امجد ہے اور بعض مُضر بن نزار کی نسل سے ہونے کے مدعی تھے؛ چنانچہ ان دونوں کے نام پر دیار ربیعۃ (موصل) اور دیار مضر (رقّۃ) کے اضلاع کے نام رکھے گئے تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ غسّانیوں کے خلاف لڑائیوں کے باعث اپنے عرب خاندان سے علٰحدہ ہو گئے اور پہاڑوں میں پناہ لینے اور اجنبیوں کے ساتھ خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے اپنی مادری زبان بھول گئے۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ اسلاف کے ناموں کا وہ سلسلہ ہے جس میں ہمیں کُرد بن مَرْد (دیکھیے οἱ Μαρδοί، کردوں کے ہمسائے) بن صَعْصَعَۃ بن حَرْب بن ھوازن (المسعودی : کتاب مذکور؛ نیز التنبیہ، ص ۸۸ تا ۹۱ : کرد بن اَسْفَندیاذ بن منو شہر؛ ابن حَوقل، ص ۱۸۵ تا ۱۸۷ : کُرد بن مَرْد بن عَمرو) کے نام ملتے ہیں۔ ان تمام شجرہ ہاے نسب میں تاریخی حقیقت کا بھی کچھ شائبہ ہوسکتا ہے (مثلاً سامیوں کا ایرانی رنگ قبول کرلینا اور زغروس Zagros اور فارس کے قبائل کا باھمی امتزاج)۔

عوام پسند اشتقاقات کی بھی کوئی کمی نہیں۔ کوشش کی گئی ہے (مُروج، ۳ : ۲۴۹) کہ اس نام کا سلسلہ عربی مادّۂ کَرَدَ سے ملایا جائے؛ اس اعتبار سے کُرد نوجوان کنیزوں اور جَسَد نامی دیو (جسے حضرت سلیمانؑ نے نکال باھر کیا تھا) کی اولاد ٹھیرتے ہیں۔ بسا اوقات (دیکھیے Driver، در JRAS، ۱۹۲۳ء، ص ۳۰۴) اسم کرد کا رشتہ فارسی لفظ گُرد (= قہرمان: بطل) سے جوڑا جاتا ہے، اگرچہ پہلوی زبان میں اس مادّے میں دراصل "گ" تھا اور اس کا تعلق مادّۂ "ور" (بمعنی حفاظت کرنا) سے ہے (Horn : *Neuper. Etymol.*، ص ۲۰۰).

زمانۂ مابعد میں قبائل کے ناموں کی توضیح اکثر ان ناموں سے کی جاتی تھی جن کی طرف وہ منسوب ہوتے تھے؛ شرف نامہ (۱ : ۱۵۸) کی رو سے تمام کرد (بَجْنَوی اور بُخْتی قبائل) بَجَن اور بُخت سے آئے تھے۔ ان میں سے اوّل الذکر کا سلسلہ بسناو Basn-āw سے قائم کیا جاسکتا ہے، جو دریاے دجلہ کا ایک معاون ہے (Andreas، در Hartmann، ص ۱۳۱) اور آخر الذّکر سے ہیروڈوٹس Herodotos کے Πακτυική یا شاہ اژدر (کُرد؟) ھفتان بُخت کی یاد تازہ ہوتی ہے، جسے اردشیر بابکان نے ہلاک کیا تھا (دیکھیے Nöldeke : *Tabari*، ص ۱۱)۔ ایک اور داستان کے مطابق، جو شمال اور مغرب میں بالخصوص مقبول ہے، ایک زمانے میں کرد دو شاخوں میں منقسم تھے: مِلان اور زِلان؛ پہلی شاخ عرب سے آئی تھی اور دوسری مشرق سے۔ زلان کو کمتر درجے کی نسل شمار کیا جاتا تھا (دیکھیے M. Sykes، در *Jour. R. Anthrop. Inst.*، ۱۹۰۸ء، ۳۸ : ۴۷۰).

مآخذ : (۱) F. Justi : *Kurdische Grammatik*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۰ء، ص ۲۲؛ (۲) W.Tomaschek : *Sasun und d. Quellengebiet d. Tigris*، در *S. Ak. Wien*، ۱۸۹۵ء، ج ۱۳۳/۴؛ (۳) M. Hartmann : *Bohtan*، *Mitt. d. Vorderasiat. Gesell.*، ۱۸۹۶ء/۲، ۱۸۹۷ء/۱، ص ۹۰ تا ۱۰۳؛ (۴) Nöldeke : *Kardu und Kurden*، در *Festschrift f. H. Kiepert*، برلن ۱۸۹۸ء، ص ۷۳ تا ۸۱؛ (۵) Hübschmann : *Die altarmen. Ortsnamen*، در *Indogerm. Forsch.*، ۱۹۰۴ء، ۱۶ : ۲۵۵ تا ۲۵۹؛ (۶) Weissbach، در Pauly-Wissowa : *Real-Encyclopädie*، بذیل مادّۂ Καρδοῦχοι و Κύρτιοι؛ (۷) Driver : *The name Kurd and its philological connexions*، در *JRAS*، ۱۹۲۳ء، ص ۳۹۳ تا ۴۰۳.

ب۔ تاریخ

عربوں کی فتح کے بعد کے زمانے سے ہمیں کردوں کی بابت بڑے مفصل حالات ملتے ہیں۔ سن ہجری کی پہلی پانچ صدیوں میں پیش آنے والے واقعات میں کردوں کا خاصا حصہ تھا، بلکہ

اکثر واقعات کے سلسلے میں کرد ھی پیش پیش نظر آتے ھیں - اس زمانے میں کردوں کے بہت سے شاھی خاندان منظر عام پر آئے - معلوم ھوتا ھے کہ چوٹی سے دسویں صدی ھجری تک ترک اور مغل حملہ آوروں کی یورشوں سے کرد دبے دبے رھے، لیکن سلاطین عثمانیہ اور شاھان صفوی کے درمیان جنگوں کے زمانے میں کردستان میں ایسے حالات پیدا ھوگئے جو وھاں جاگیردارانہ نظام کی نشوونما کے لیے سازگار تھے - اس کی ایک صحیح تصویر ھمیں شرف نامہ (۱۰۰۳ھ/۱۵۹٦ء) میں ملتی ھے - ترکیہ اور ایران کی سرحد آھستہ آھستہ مستحکم ھوگئی اور ایرانی کوہ زغروس اور اس کی شمالی شاخوں کے پیچھے ھٹ آئے - اب ترکیہ نے اپنے مشرقی صوبوں میں مرکزی حکومت کے اقتدار کو مضبوط کرنے کا کام شروع کر دیا - انیسویں صدی کے اواخر میں بچی کھچی کرد ریاستیں بھی مملکت ترکیہ (ھکّاری، بِدْلیس، سلیمانیہ) اور ایران (اَرْدَلان) میں مدغم ھو کر نیست و نابود ھوگئیں، لیکن بڑے بڑے کرد قبائل کا وجود اب تک باقی ھے اور ان کی اندرونی تشکیل کرد قوم اور اس کی معاشری و نسلی خصوصیات کی بقا کی ضامن ھے - ایران تو شاید ھی کبھی کرد قبائل کے داخلی مسائل میں دخل اندازی کرتا مگر ترکیہ کی کوشش ھوتی کہ کردوں کو اپنے مرکزی اقتدار کا سہارا قرار دے اور اسی حیثیت سے ان سے کام لے - بعض اوقات تو یہ کرد انعام و اکرام کے بوجھ تلے دبے رھتے اور کبھی انھیں اپنی قدیم خود مختاری کے بچے کچھے آثار کو دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے مزاحمت کرنا پڑتی - انیسویں صدی میں کردوں نے متعدد بار علم بغاوت بلند کیا - بیسویں صدی میں ایک کردی تحریک کا آغاز ھوا، جس سے اس شورش پسندی میں اضافہ ھو گیا جو ترکی سلطنت کے اندر موجود تھی - ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے کردوں کو سیاست کے میدان میں کھینچ لیا - کردوں کے اخباروں، رسالوں اور جماعتوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ھونے لگا - عالمی جنگ (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء) میں پہلی بار بڑی طاقتوں نے ایک خود مختار کردستان کا تصور پیدا کیا، لیکن اس تجویز کو ابھی تک صرف جزوی طور پر عملی جامہ پہنایا جا سکا ھے اور اس کا محل وقوع محض موصل کی قدیم ولایت کے ایک حصے تک، جو عراق کی نئی مملکت میں شامل ھے، محدود ھے۔

کُرد عرب فتوحات کے بعد: بہتر ھوگا کہ ھم اپنے بیان کا آغاز ان معلومات سے کریں جو عرب مصنفین نے کرد قبائل کی تعیین و تعداد کے بارے میں جمع کی ھیں۔

چونکہ عہد سلاجقہ سے قبل کردستان کے نام سے کوئی آشنا نہ تھا، لہٰذا عرب مصنفین کردوں کا ذکر عموماً زَوْزَان، خِلاط، اَرْمینیہ، آذربیجان، جبال، فارس وغیرہ کے عنوانات کی ذیل میں کرتے ھیں (دیکھیے Driver: *Dispersion of the Kurds in Ancient Times*، در *JRAS*، اکتوبر ۱۹۲٦ء، ص ۵٦۳ تا ۵۷۲)۔

المَسْعودی (تقریباً ۳۳۲ھ/۹۴۳ء) اور الاِصْطَخْری (۳۴۰ھ/۹۵۱ء) پہلے مصنف ھیں جنھوں نے کردوں کے بارے میں باقاعدہ معلومات مہیا کی ھیں - مُروج الذَّھب (۳ : ۲۵۳) میں المَسْعودی نے حسب ذیل قبائل شمار کیے ھیں : دِیْنَور اور ھَمَذان میں شُہْجَان : کَنْگَور میں ماجردان ؛ آذربیجان (متن میں تصحیح فرما لیجیے) میں ھَذْبانی اور سَرَاة (غالباً شُرَاة = خوارج [رک باں]؛ دیکھیے (داستان دَیْسَم نیچے)؛ جبال میں شَادَنْجان، لَزْبَة (لُرّی ؟)، مَادَنْجان، مَزْدانکان، بارسَان، خَالی (جلالی)، جابارق، جَاوانی، مُسْتَکان؛ شام میں دَبَابِلَة، وغیرہ؛ موصل اور جُودی میں عیسائی کرد، یعنی الیَعْقوبِیّة

(Jacobite) اور جُرْقان (جُرْغان) ۔ اس فہرست
میں اسی مصنف کی دوسری کتاب التّنبیہ (ص ۸۸
تا ۹۱) سے صرف بازنجان (دیکھیے الاصطخری،
ص ۱۱۵)، نَشُورہ ، بوذیکان اور کیکان (جو آج کل
مَرْغَش کے قریب ملتے ہیں) کا اضافہ ہوتا ہے، لیکن
اس نے ان مقامات، یعنی رُمُوم (زُموم؟) کی ایک
فہرست دی ہے، جہاں کرد مقیم تھے: فارس، کرمان،
سجستان، خراسان (الاصطخری ، ص ۲۸۲ : ضلع
اسد آباد میں ایک کرد گاؤں)، اصفہان (قبیلۂ بَازَنْجان
کا ایک حصہ اور ایک بارونق قصبہ جسے کرد بیان
کیا گیا ہے؛ دیکھیے الیعقوبی، ص ۲۷۵؛ الاَصْطَخری،
ص ۱۲۵)، جبال، بالخصوص ماہ کوفہ، ماہ بصرہ،
ماہ سَبذان (ماَ سَبَذان) اور دو اِیغار (یعنی کَرَج ابن
دُلَف اور بُرْج)، ہَمذان، شَہر زُور، جس میں اس کی
دونوں ماتحت ریاستیں دَرآباد اور صَمْغان (زمْکان)
شامل ہیں، آذربیجان، ارمینیہ (دریاے جیحون کے
کنارے کُرد دَوِین کے مقام پر گارے اور پتھر کے
بنے ہوے مکانوں میں رہتے تھے، المقدسی، ص ۳۷۷)،
اَرّان (بَرْدَعۃ کا ایک دروازہ "باب الاکراد" کہلاتا
تھا۔ ابن مسْکوَیہ کا بیان ہے کہ ۳۳۲/۹۴۳ء میں
روس کے حملے کے وقت یہاں کے مقامی حاکم کے
ماتحت کرد سپاہی تھے)، بَیْلقان، باب الاَبْواب
(دَربَند)، الجزیرہ، شام اور الثُغور، (یعنی کیلیکیا
(Cilicia) کی سرحد پر قلعوں کی قطار).

الاِصْطَخری نے ص ۹۸ پر بالخصوص فارس
میں پانچ رُمُوم کا ذکر کیا ہے جو ان اضلاع کو
کہا جاتا تھا جن میں کرد پھیلے ہوے تھے۔
ڈخویہ (*BGA*، ۴ : ۲۵۰) کے بیان کے باوجود ہم
اس لفظ کا املا بصورت 'رَمْ رَمُوم' (فارسی لفظ رَم
[رمہ] سے مشتق بمعنی ریوڑ، بھیڑ) کو ترجیح
دیں گے، کیونکہ زُومہ سے صیغۂ جمع زُموم بنانا
قرین قیاس نہیں ۔ ہر رَمّ کا اپنا قصبہ اور ایک
اپنا کرد سردار ہوتا تھا، جس پر خراج اور عوام کی
حفاظت کی ذمّےداری عائد ہوتی تھی ۔ یہ رموم
حسب ذیل تھے : (۱) جِلُویہ، یا رَامجان، جس کی
سرحدوں پر اصفہان اور خوزستان واقع تھے؛ (۲)
لَوالجان، شیراز اور خلیج فارس کے درمیان؛ (۳)
دیوان، کورۂ سابُور میں؛ (۴) کاریان، کرمان کی سمت
میں؛ (۵) شاہریار، اصفہان کے نزدیک، جسے وہاں
کے بڑے قبیلے کے نام پر بَازَنْجان بھی کہتے تھے۔
اس قبیلے کا ایک حصہ صوبۂ اصفہان میں نقل
مکانی کر گیا تھا ۔ رموم کی فہرست کے ضمیمے کے
طور پر الاصْطَخری نے فارس کے ۳۳ خانہ بدوش
قبائل (حیّ؛ جمع : اَحْیا) کی فہرست بھی دی ہے، جو
دیوان الصّدقات کے بیانات پر مبنی ہے اور جسے
ابن حَوْقَل (ص۱۸۵ تا ۱۸۷) اور المَقَدّسی(ص۳۴۶)
نے بھی نقل کیا ہے: کرمانی، رامانی، مُدثّر، محمّد بن
بَشَر، بَقیلی (المُقَدّسی: الثَعلبی)، بُنداد مَہری، محمّد بن
اسْحق، سباحی، اسْحقی، اَذَرکانی، شَہْرکی، طَہمادہنی،
زِیادی، شَہْروی، بُندادکی ، خُسْروی، زَنْجی، صَفَری،
شَہْیاری، مُہرکی، مُبارکی، اُشتام ھری، شاھونی، فُراتی،
سَلْمونی، سیری، آزاد دوختی، بَراز دوختی، مُطّلبی،
مَمالی، شاہکانی، کَجْتی، جَلیلی ؛ یہ کل پانچ لاکھ
گھرانے تھے، جو خیموں میں رہتے تھے .

فارس نامہ (تقریباً ۵۰۰ھ/۱۱۰۷ء) میں
لکھا ہے (ص ۱٦۸) کہ فارس کی قدیم فوج کا بہترین
حصہ جِلُویہ، ذِیْوان، لَوالِجان، کارِیان اور بَازَنْجان
کے پرانے اور وسیع رموم کے کردوں پر مشتمل تھا۔
یہ سب ان جنگوں میں ہلاک ہو گئے جو اسلام کی
آمد پر لڑی گئیں؛ صرف ایک عَلَک باقی بچا، جو
مسلمان ہو گیا اور اس کی نسل جاری رہی ۔ باقی
کردوں کو عضد الدّولہ نے اصفہان سے فارس میں
منتقل کر دیا۔ یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ کردوں
کے پانچ لاکھ (؟) گھرانے بالکل نیست و نابود

ہو گئے؛ البتہ یہ امکان قابل قبول ہے کہ فارس کے کرد قبیلے آپس میں مل جل گئے ہوں اور ان کے ازسر نو نئے قبیلے بن گئے ہوں اور انہوں نے اپنی پرانی قومیت کو ترک کردیا ہو۔ آج کل جِلُویہ کے قدیم رَمّ (کوہگلّو) میں اب لُر آباد ہیں۔ ہمیں یہ علم نہیں کہ وہ کب سے وہاں آباد ہیں، تاہم الاِصْطَخری کی فہرست میں فارس کے کردوں میں ایک قبیلے لُرّیہ (یا لَزْبَہ ؟) کا ذکر آیا ہے۔ دوسری جانب فارس نامہ میں کردوں اور شَبان کارہ [رَکَ بآں] قبائل کے درمیان امتیاز کیا گیا ہے۔ آل بُوَیہ کے آخری بادشاہوں کے عہد میں یہ شَبان کارہ قبائل فارس میں بے حد قوت حاصل کر چکے تھے۔ العُمَری : مَسالِکُ الاَبْصار میں شَبان کارہ کا ذکر ایک جداگانہ عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔ شرف نامہ میں ان کا ذکر کرد خانوادوں کی ذیل میں نہیں ملتا؛ ہاں ان کا ایک قبیلہ (رامانی) ایسا ہے جس کا نام الاِصْطَخری کی کرد قبائل کی فہرست میں موجود ہے۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فارس کے کرد کردستان کے قبائل سے بہت کچھ مختلف تھے [رَکَ بہ شُول اور لُر].

اصطلاح الزَّوزَان کا جو ایک حد تک وسطی کردستان کے مرادف ہے (کردی زبان میں اس کا مفہوم موسم گرما کی چراگاہیں ہے) مفہوم واضح نہیں۔ بقول ابن حَوْقل (ص ۲۰۵) زَوْزان کا بادشاہ الدِّیرانی کہلاتا تھا (= دِرَنک، وَسِپْرکان کا ارمنی بادشاہ)۔ المُقَدَّسی (ص ۱۳۷) زوزان کو جزیرۃ ابن عمر کا ایک ناحیۃ قرار دیتا ہے۔ اس علاقے میں کردوں اور عیسائیوں کی مخلوط آبادی تھی اور آگے چل کر اس کی حدود وسیع ہوگئیں۔ ابن الأثیر (در یاقوت : ۲ : ۲۵۷) کے بیان کے مطابق الزّوزان کا علاقہ موصل سے دو روزہ مسافت کے بعد شروع ہوتا تھا اور وہ خِلَاط کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا؛ آذربیجان کی طرف یہ علاقہ سَلْماس تک پہنچتا تھا۔ بہت سے مستحکم مقامات بَشْنَوی اور بوختی کردوں کے قبضے میں تھے۔ اوّل الذّکر کے پاس بَرْقا، بَشِیر [اور فَنَک] تھے؛ آخر الذّکر کے پاس جِرذَقِیل (گُرگیل)، یعنی ان کے مَلِک اتِل (شرف نامہ، ۱ : ۱۱۷ : نَش اَتِل ؟) کے صدر مقام کے علاوہ عَلُوس اور باز اَلْحَمرا تھے؛ فرمانروایان موصل (زَنگی) کے قبضے میں حسب ذیل مقامات تھے : الْتِي (= اِلک)، اَرْوَخ، بَخوخَۃ (= بِکوکی، در بَرْواری)، برخو، کَنْگَور(؟)، نِیرَوۃ (عَکرؔ؟ کے مشرق میں؟) اور خَوْشَب۔ یاقوت کا متن زیادہ قابل وثوق نہیں ہے۔ بہرحال یہ ان کرد قلعوں کے نام ہو سکتے ہیں جو آہستہ آہستہ حَمدانی اور زنگی فرمانرواؤں نے اپنی قلمروؤں میں شامل کر لیے.

کرد خلفاے بنو عباس اور آل بویہ کے عہد میں : المسعودی (مُرُوج، ۳ : ۲۴۹) نے عہد جاہلیت کی وہ روایات محفوظ کر دی ہیں جن میں غسّانی عرب [رَکَ بہ غسّان] حکمرانوں اور کردوں کے مابین جنگوں کا ذکر ہے۔ عرب مسلمانوں کے ۱۶ھ/۶۳۷ء میں تَکْرِیت اور حُلْوان پر قبضہ کر لینے کے بعد ان کا کردوں سے واسطہ پڑا۔ سَعْد بن ابی وقّاص نے موصل پر چڑھائی کی، جس سے وہ اضلاع قبضے میں آ گئے جہاں کرد آباد تھے (اَلْمرج یا نُہَذْرا، با عَذْرا، حِبْتُون، داسن، وغیرہ) دیکھیے ابن الأثیر : الکامل، طبع Tornberg، ۲ : ۴۰۸۔ اس علاقے کی فتح عِیاض بن غَنَم اور العُتْبۃ کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی (البَلاذُری: فتوح البلدان، طبع de Goeje، ص ۳۳۱)۔ ۱۹ھ/۶۴۰ء میں الزّوزان کے بطریق نے خراج ادا کرنا منظور کرکے اپنے اقتدار کی توثیق کر لی (فُتوح، ص ۱۷۶)۔ ۱۸ھ/۶۳۹ء میں عربوں کی کردوں سے سوسہ (*S*usiana) میں لڑائی ہوئی کیونکہ کردوں نے اہواز کے ایرانی حاکم الہُرْمُزان کی

حمایت کا اعلان کر دیا تھا (الکامل، ۲ : ۳۲۵) ۔ اسی طرح فارس میں کردوں نے ۲۳ھ/۶۴۳ء میں فَسا اور داراب جِرد کے دفاع کے سلسلے میں ایرانیوں کا ساتھ دیا (کتاب مذکور، ۳ : ۳۲)۔ حضرت عمرؓ نے اہواز کے کردوں کے مقابلے کے لیے کئی بار فوج بھیجی (فُتوح، ص۳۸۲، ۳۸۹؛ الکامل ۳: ۳۷)۔ دوسری طرف حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں کردوں نے وسطی کَرْخا کے علاقے (صَیْمَرہ، ماسَبذان) پر حملہ کیا جہاں الیعقوبی کے زمانے تک فارسی زبان ھی بولی جاتی تھی (BGA، ۷ : ۲۳۶) ۔ قبل از اسلام یوں تو عرب شہرزُور تک پہنچ چکے تھے (ابن الفقیہ، ص ۱۳۰) ، لیکن شہرزور، دَار باذ اور صِمْغان پر فیصلہ کن قبضہ ۲۲ھ/۶۴۳ء میں ایک خونریز جنگ کے بعد ھی ھو سکا (فتوح ، ص ۳۳۴؛ الکامل، ۳ : ۲۹) ۔ جنوب میں ۲۵ھ/۶۴۵ء میں بصرے کے عامل ابو موسٰی کو بِیْروذ اور بَلْسجان میں کردوں کی بغاوتوں کو فرو کرنا پڑا۔ لیکن کُرد جنھوں نے اسلام قبول توکر لیہ تھا، لیکن بعد میں بڑی تعداد میں مرتد ھوگئے (الکامل، ۲ : ۶۶، ۶۷)۔ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں کردوں نے ایرانیوں اور عیسائیوں کے دوش بدوش اہواز کے قریب الخِرّیت اور فارس کی بغاوتوں میں شرکت کی، لیکن ان کے سردار کو رام ھرمز کے مقام پر شکست ھوئی (کتاب مذکور، ۳ : ۳۰۹) .

اموی خلیفہ عبدالملک کے عہد میں المختار نے ارمینیہ اور آذربیجان پر قبضہ کر لیا ۔ اس نے ۶۶ھ/۶۸۵ء میں حلوان میں ایک عامل مقرر کیا جس کے ذمے یہ کام تھا کہ کردوں کے خلاف جنگ کرے (الکامل، ۴: ۱۸۷)، لیکن المختار کی وفات کے باعث یہ تجویز عمل میں نہ آ سکی ۔ اسی خلیفہ کے عہد میں باغی عبدالرحمٰن نے فارس میں سابور کے کردوں سے ۸۳ھ/۷۰۲ء میں ساز باز کر لی (کتاب مذکور، ۴ : ۳۵۲) ۔ ۹۰ھ/۷۰۸ء میں کردوں نے فارس کو تاراج کیا اور الحجّاج نے انھیں سزا دی ۔ ۱۲۹ھ/۷۴۶ء میں سابور کے کردوں نے خارجیوں کے حلیف سلیمان کا مقابلہ کیا جس نے خلیفہ مَرْوان ثانی سے باغی ھوکر سابور کا محاصرہ کر لیا تھا (کتاب مذکور، ۴ : ۳۸۷، ۳۴۱؛ ۵ : ۲۸۳) ۔ خلیفہ مروان خود ایک کرد کنیز کے بطن سے تھا (الطبری، ج ۳، ۱ : ۵۱) اور نیلی آنکھیں اور گورا رنگ اسی سے ورثے میں پایا تھا (Sir W. Muir : *The Caliphate*، لنڈن ۱۸۹۱ء، ص ۴۲۹) .

عباسی خلیفہ المنصور کے عہد میں جب خزاروں نے ۱۴۷ھ/۷۶۴ء میں ارمینیہ پر حملہ کیا تومتعدد بغاوتیں برپا ھوئیں ۔ اس سے چند سال بعد کردوں کا ذکر (انتشار الاکراد) پھر اس شورش کے سلسلے میں ملتا ھے جو موصل میں ھوئی اور جس کی صداے بازگشت ھمدان میں بھی سنائی دی (الکامل، ۵ : ۴۴۸ و ۶ : ۹) ۔ المنصور کے بیٹے جعفر کی ماں بھی ایک کرد کنیز تھی (الطبری، ۳ : ۴۴۲) .

المستعصم کے زمانے میں ۲۲۵ھ/۸۳۹ء کے حالات کے تحت ایک کرد بغاوت کا ذکر آتا ھے جو موصل کے ضلع میں ھوئی ۔ اس بغاوت کا ذمّے دار ایک اعلٰی کرد خاندان کا نو عمر رکن جعفر بن فَہر تھا ۔ بادِغیس میں شکست کھانے کے بعد جعفر نے دامن کے پہاڑوں میں پناہ لی اور یہاں اس نے خلیفہ کے لشکر کو شکست دی ۔ ترک سردار آیتاخ کے ماتحت ایک نئی فوج ترتیب دی گئی جس نے اس بغاوت کو فرو کیا (الکامل، ۶ : ۳۶۰، ۳۶۱) ۔ ۲۳۱ھ/۸۴۵ء میں کردوں کی ایک اور بغاوت اصفہان، جبال اور فارس کے علاقوں میں رونما ھوئی، لیکن اسے ترک سپہ‌سالار وَصِیف نے جلد ھی فرو کر دیا .

۲۵۲ھ/۸۶۶ء میں موصل کے کرد مساور خارجی کے ساتھ مل گئے جس نے موصل پر قبضہ کر لیا تھا ۔ ۲۶۲ھ/۸۷۵ء میں انھوں نے زنجی غلاموں کی شورش میں خاصا حصہ لیا (دیکھیے Nöldeke : *Sketches from Eastern History* لنڈن، ص ۱۴۶ تا ۱۷۵ : *A Servile war in the East*)، جن کی قیادت ایک علوی خارجی (؟) علی محمّد المعروف بہ الخَبِیث کے ہاتھ میں تھی، نیز خاندان صفّاریہ [رک باں] کے بانی یعقوب الصفّار کی بغاوت میں بھی انھوں نے اچھا خاصا حصہ لیا ۔ یعقوب نے اہواز میں اپنا ایک کرد نائب محمّد عبیداللہ بن ہزار مَرْد مقرر کیا ۔ اس کے ارادے بہت بلند تھے، چنانچہ وہ الخبیث سے خفیہ نامہ و پیام کرنے لگا ۔ الخَبِیث کی مرسلہ کمک لے کر محمّد نے سوس پر چڑھائی کی ، لیکن احمد لَیْثویہ کے ہاتھوں شکست کھائی ۔ احمد بن لَیْثویہ خود ایک کرد تھا اور اس کرد امدادی فوج کا سپہ سالار تھا جو خلیفہ نے یعقوب کی بغاوت کچلنے کے لیے بھیجی تھی (ابن خلکان : وَفَیات، طبع de Slane، ۴ : ۳۰۴ تا ۳۰۸)۔ جب احمد وہاں سے رخصت ہوگیا تو محمّد نے الخبیث سے مزید کمک حاصل کرکے، جس کا کچھ حصہ کردوں پر مشتمل تھا، شوستر پر قبضہ کرلیا ۔ یہاں اگرچہ یہ طے پا چکا تھا کہ الخبیث کے نام کا خطبہ پڑھا جائے گا، پھر بھی اس کی جگہ اس نے خلیفہ المعتمد اور اس کے حریف یعقوب الصفّار کے نام کا خطبہ پڑھ دیا ۔ اس پر محمّد کے زنجی حلیفوں نے اس سے قطع تعلق کرلیا اور شوستر پر دوبارہ ابن لَیْثُویہ کا قبضہ ہوگیا ۔ محمّد نے رام ہُرمُز میں پناہ لی، لیکن الخبیث کے سپہ سالاروں نے اسے وہاں سے نکال دیا ۔ محمّد کو جب 'دارنان کردوں' کی جانب سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے الخبیث سے پھر مدد چاہی ۔ الخبیث نے اسے کچھ فوج بھیجی جسے اس نے فوراً میدان جنگ میں بھیج دیا اور جب اس فوج کے سپاہی گھر گئے تو اس نے دفعۃً ان پر حملہ کر دیا، لیکن محمّد، الخبیث سے ترک تعلق نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے وہ اسے خلیفہ تسلیم کر لینے پر رضا مند ہوگیا ۔ یعقوب کی وفات (۲۶۵ھ/۸۷۹ء) اور الخبیث کی وفات (۲۷۰ھ/۸۸۳ء) سے ان مہمات کا خاتمہ ہوگیا (الکامل، ۷ : ۲۶۴) ۔

جب تقریباً ۲۸۱ھ/۸۹۴ء میں ایک عرب حَمْدان بن حَمْدُون نے موصل میں اپنی حکومت قائم کی تو کرد اس کے حامیوں میں شامل تھے۔ ۲۸۴ھ/۸۹۷ء میں ابولیلی نے کُردوں کی ایک بغاوت برپا کی جو زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکی (کتاب مذکور، ۷ : ۳۲۵، ۳۳۷) - ۲۹۳ھ/۹۰۶ء میں ہَذبانی کردوں نے اپنے شیخ محمّد بن بلال کی قیادت میں نینوا کے علاقے کو تاخت و تاراج کیا ۔ موصل کے نئے عامل عبداللہ بن حمدان نے ان کا تعاقب کیا، لیکن اسے مَعْطوبۃ کے مقام پر ہزیمت اٹھانی پڑی ۔ اگلے سال اس نے خلیفہ کی ارسال کردہ کمک ساتھ لے کر پانچ ہزار ہذبانی گھرانوں کا تعاقب پھر شروع کیا ۔ کردوں نے مہلت حاصل کرنے کے لیے نامہ و پیام شروع کیا اور آذربیجان میں ہٹ آئے ۔ عبداللہ نے موصل واپس آ کر نئی فوج ساتھ لی اور ایک بار پھر ہذبانیوں پر چڑھائی کر دی جو جبل السَّلَق (غالباً لاہجان، دیکھیے ساوج بولاک) میں خندقیں کھود کر محصور ہو بیٹھے تھے۔ ہذبانی ہتیار ڈالنے پر مجبور کر دیے گئے اور ان کے بعد حُمَیدی قبیلے اور جبل داسن کے باشندوں کی شورشیں فرو ہوگئیں (کتاب مذکور ۷ : ۳۷۱) ۔ خلیفہ المقتدر کے عہد میں کردوں نے موصل کے مضافات میں لوٹ مار کی، لیکن حمدانی حکومت کے ہاتھوں سزا پائی ۔ قبیلۂ جلالی نے بالخصوص شدید مقاومت کی ۔ ۳۳۲ھ/۹۴۳ء کے احوال میں ابن

مِسکویه (: تجارِبُ الأمم، ۶ : ۱۰۵) ایک فوج کشی کا ذکر کرتا ہے جو حسین حمْدانی نے آذربیجان پر کی تھی۔ اس موقع پر اس کا ایک حلیف هذبانی قبیلے کا شیخ جعفر بن شَکّویَه تھا جو سَلْماس میں سکونت پذیر تھا ۔

تقریباً اسی زمانے میں دَیْسَم بن ابراهیم تاریخ کے صفحات پر نمودار ہوتا ہے ۔ اس کی زندگی کے دلیرانہ کارناموں کا کردوں سے بڑا قریبی تعلق رہا ۔ وہ خود ایک عرب باپ اور کرد ماں کا بیٹا تھا اور دَیْلَمیوں کے ایک مختصر گروہ کے سوا اس کے تمام پیرو کرد تھے ۔ دَیْسَم خارجی تھا ۔ اس نے یوسف بن ابی السّاج کے بعد آذربیجان پر قبضہ کر لیا اور ۳۲۷ھ/۹۳۸ء میں لَشکَاری بن مَرْدی کو ملک سے نکال دینے کے لیے اپنے کردوں سے کام لیا جو وَشْمگیر زیاری کے عاملوں میں سے تھا ۔ ایک مشہور شیعی مسافری مَرْزُبان دَیْسَم سے آذربیجان چھین لینے میں کامیاب ہو گیا ۔ دَیْسَم نے اپنے دوست حاجِیک بن الدَّیرانی (وَسْپُرکَن کا ارمنی بادشاہ خَچِک گجِک بن دِرَنک) کے ہاں پناہ لی۔ اب اهل تبریز نے دَیْسَم سے مدد کی التجا کی، لیکن یہاں پھر اس نے هزیمت اٹھائی اور پسپا ہو کر مسافریوں کی رضامندی سے طَرم چلا گیا ۔ ۳۳۷ھ میں رکن الدّوله بویہی نے مرزبان کو قید کر لیا اور آذربیجان میں اپنا ایک نائب بھیج دیا ۔ اس وقت مرزبان کے بھائی وَهْسودان کو دَیْسَم کا خیال آیا جس کے کرد سپاہی ابھی تک اس کے وفادار تھے۔ اس نے دَیْسَم کو رکن الدّوله کے نائب کے مقابلے میں روانہ کیا ۔ دَیْسَم کو شکست ہوئی، لیکن وہ اَردبیل اور بَرْذَعه میں ڈٹا رہا ۔ جب مَرْزُبان قید سے رہا ہو کر لوٹا تو دَیْسَم کو پہلے ارمینیه میں اور پھر بغداد میں پناہ لینی پڑی جہاں معزّالدّوله بویہی نے اس سے بہت فیاضانہ سلوک کیا ۔ اس کے دوست اسے آذربیجان واپس جانے پر اکسا رہے تھے، اس لیے وہ موصل اور شام کے حمدانی فرمانرواؤں کے پاس اعانت حاصل کرنے کے لیے گیا ۔ ۳۴۴ھ میں دَیْسَم مَرْزُبان کی عدم موجودگی میں سَلْماس واپس آیا اور وہاں سیف الدّوله فرمانروا ے شام کے نام کا خطبه پڑھوایا۔ لیکن مَرْزُبان نے دَیْسَم کو پھر وہاں سے نکال دیا اور اس نے اپنے ارمنی دوستوں سے پناہ دینے کی درخواست کی۔ ابنِ الدَّیرانی (دِرِنِک بن خَچِک) کو اسے بجبر و اکراه مَرْزُبان کے حوالے کرنا پڑا ۔ دَیْسَم کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔ بالآخر اس نے ۳۴۵ھ میں قید خانے میں وفات پائی (تَجارِب، طبع Amedroz، ۱ : ۳۴۵؛ ۲ : ۱۴۸ تا ۱۵۱؛ الکامل، ۸ : ۲۸۹، ۳۶۱، ۳۷۵ تا ۳۷۷) .

جن دنوں مَرْزُبان رے میں اسیر تھا، ایران کے شمال مغرب میں کئی صوبیدار خود مختار ہو گئے۔ ان میں سے ایک (تقریباً ۳۴۰ھ/۹۵۱ء) محمّد شدّاد بن قَرْطُو تھا جو قبیلۂ رَوَادی سے تھا اور جس کی نسل سے آگے چل کر آل ایّوب کا عظیم خاندان وجود میں آیا ۔ آل شدّاد کی بڑی جاگیریں دَبِیْل اور گنجه تھیں اور وہ بوزنطیوں اور سلاجقه کے حلیف تھے ۔ ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء میں ابوسَوار نے اپنے نو عمر بیٹے مَنوچه کے لیے شہر اَنِی خرید لیا ۔ اس وقت سے یہ خاندان دو شاخوں میں منقسم ہوگیا ۔ ایک شاخ گنجه کی تھی، دوسری اَنِی کی ۔ ۱۱۲۴ء میں اَنِی پر گرجستانی قابض ہو گئے، لیکن ۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء اور ۵۵۷ھ/۱۱۶۱ء کے مابین اور پھر ۱۱۶۵ سے ۱۱۷۴ء تک اس پر آل شدّاد کا قبضه رہا ۔ آل شدّاد بڑے روشن خیال فرما نروا تھے، انہوں نے بہت سی قابل توجه عمارتیں بطور یادگار چھوڑیں [رک بہ دُوِین ، گنجه ، شداد] ؛ ارمنی مآخذ در Lynch : *Armenia*، ۱ : ۳۶۳ تا ۳۶۷؛ دیکھیے نیز Barthold، اس کے Lane-Poole کی

Muham. Dynasties کے روسی ترجمے کے ضمیمے میں، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۹ء، ص ۲۹۳؛ Barthold : Aniyskaya *'Pers. nadpis na......meceti Manuče Ešče o slove "celebi"* :N. Marr؛ شمارہ ۵، Seriya، *Zapiski*، ۱۹۱۱ء، ۲۰ : ۱۲۰؛ E. D. Ross : *on Three Muhammadan Dynasties*، Asia Major. ۲/۲(۱۹۲۵ء) : ۲۱۵ .

۳۴۹ھ/۹۶۰ء میں آذربیجان میں ایک مدّعی حکومت پیدا ہوا جو اسحٰق بن عیسیٰ کے نام سے مشہور تھا اور جسے قحطانی (؟) کردوں کے سردار فضل کی تائید و حمایت حاصل تھی ۔ اس کے مقابلے میں اس کے حریف جُسْتان بن مَرْزُبان سسافری کو ھَذْبانیوں کی امداد پر بھروسا تھا ۔ اسحٰق کو بہت جلد ٹھکانے لگا دیا گیا (تجارب، ۲: ۱۷۹)۔ کردوں اور دیلمیوں نے ان لڑائیوں میں بھی خاصا حصہ لیا جو جُسْتان اور اس کے بھائی ناصر الدّولہ اور ابراھیم بن مَرْزُبان اور اس کے چچا زاد بھائی اسمٰعیل بن وَھسُودان کے درمیان ہوئیں (تجارب، ۲ : ۲۱۹، ۲۲۹؛ الکامل، ۸ : ۴۲۰ تا ۴۲۳) .

۳۴۸ھ/۹۵۹ء کے قریب الجبال میں کردوں کا دوسرا شاہی خاندان ظہور میں آیا (Lane. Poole : *Mohamm. Dynasties* ، شمارہ ۵۷)، جس کی بنیاد قبیلۂ بَرْزیکانی (بَرْزِینی) کے شیخ حَسْنُوَیہ (حَسنُوْیہ) بن حسن [رک بآں] نے رکھی تھی (دیکھیے نیز شرف نامہ، ۱ : ۲۰ تا ۲۳) اور جس نے خراسان پر لشکر کشی کے موقع پر رکن الدّولہ بویہی کی مدد کی تھی ۔ رکن الدّولہ نے کردوں سے بڑی روا داری کا سلوک کیا اور جب کبھی کوئی اس سے ان کی زیادتیوں کی شکایت کرتا تو وہ یہی جواب دیتا تھا کہ آخر کردوں کو بھی زندہ رہنا ہے (تجارب، ۲ : ۲۸۱)۔ ابن الأثیر (۸ : ۵۱۹) نے حَسْنَوَیہ کے اعلٰی کردار، اس کی دانشمندانہ حکمت عملی اور پاکیزہ اخلاق کی تعریف کی ہے۔ جب ۳۶۹ھ/۹۷۹ء میں حَسنویہ نے اپنے دارالحکومت سرماج (بیستون کے جنوب) میں وفات پائی تو عَضد الدّولہ نے اس کے مقبوضات (ھَمَدان، دِیْنور، نِہاوند) پر قبضہ کر لیا تاکہ انھیں اپنی مملکت میں شامل کر لے، لیکن انجام کار اس نے بدْر بن حسنَوَیہ (۳۶۹ھ/۹۷۹ء تا ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء) [رک بآں] کے نام فرمان مسند نشینی جاری کر دیا ۔ بدر نہ صرف ہمیشہ عَضد الدّولہ کا وفادار رہا، بلکہ اپنے بھائیوں کے خلاف معرکہ آرا بھی ہوا، کیونکہ وہ باغی فَخرالدّولہ سے جا ملے تھے ۔ خلیفہ نے بدر کو ناصر الدّین والدّولۃ کا خطاب عطا کیا ۔ مؤرخین نے بدر کی انتہائی تعریف و توصیف کی ہے اس نے اپنے قبیلے میں تعلیم پھیلائی، محصول مقرر کرنے میں عدل و انصاف سے کام لیا اور کسانوں کے حقوق کی حفاظت کی [ابوشجاع] : تجارب، ص ۲۸۷ تا ۲۹۹ ۳۲۷؛ (ابن مُحَسّن) ص ۴۲۹، ۴۴۹ تا ۴۵۳؛ العتبیؒ : کتاب یمینی، مترجمۂ Reynolds، ص ۴۲۴)۔ بدر کا جانشین ظاہر (طاہر ؟) صرف ایک سال تک حکومت کر سکا اور ۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء میں شمس الدّولہ بویہی نے اسے نکال باہر کیا ۔ حَسنویہ کا چچا وَنْداد جو اسی قبیلے کی ایک شاخ عَیْشیۃ کا رئیس تھا، ۳۴۹ھ/۹۶۰ء میں فوت ہوا، اس کا بھائی ابو الغَنائِم ۳۵۰ھ/۹۶۱ء میں چل بسا ۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے بیٹے ابو سالم دَیْسم کو جو اس ھم جَد شاخ کا آخری حکمران تھا، اس کے قلعوں (قَسان یا قَسْنان [قَسْلان ؟ نزد بابا یادگار، ذَہاب کے کنارے]، غانم آباد وغیرہ) سے محروم کر دیا گیا .

عَضد الدّولہ کو کئی موقعوں پر کردوں سے سابقہ پڑا، لیکن وہ ان کے ساتھ اپنے باپ رکن الدّولہ کی نسبت کہیں زیادہ متشدّد تھا ۔ ۳۶۸ھ/۹۷۸ء میں ایک کرد ابن بادَّوَیہ نے ابو تَغْلب الحمدانی کی

مدد سے اَرْدَمُشت (کَواشی، نزد جبلِ جُودی، یاقوت ۱ : ۹۹) میں خودمختار حکومت قائم کر لی، لیکن کچھ ہی دن بعد وہ عَضدُ الدّولہ کے بہکانے میں آ گیا ۔ ۳۶۹ھ/۹۷۹ء میں عضدُ الدّولہ نے شہرِ زُور کے کردوں کے خلاف ایک فوجی مہم روانہ کی ۔ وہ چاهتا تھا کہ انھیں بنو شَیْبان کے بدویوں سے علٰحدہ کر دے جن سے ان کے تجارتی اور ازدواجی روابط تھے ۔ شہْرِ زُور کا قصبہ فتح ہو گیا اور عرب صحرا کو واپس چلے گئے (تجارب، ۲ : ۳۹۸، الکامل، ۸ : ۵۱۶) .

ایک اور مہم ۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں ھَکّاری کردوں کے خلاف بھیجی گئی اور انھیں محصور کر لیا گیا، انھوں نے اس وعدے پر بھروسا کرتے ہوے ہتیار ڈال دیے کہ ان کی جانوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا، لیکن اس مہم کے قائد نے انھیں مَعَلْسایا اور موصل کے درمیان سڑک کے کنارے کنارے پانچ فرسخ تک سولیوں پر چڑھا دیا (الکامل، ۸ : ۵۲۱) .

عَضُد الدّولہ کی زندگی ہی میں حُمَیْدی سردار ابو عبداللہ حسین بن دُشَنج (یا ابو شجاع باذ بن دُوْسْتَاک) المعروف بہ باذ بہت کچھ بد نام ہو چکا تھا ۔ ابتدا میں وہ ایک گڈریا تھا، لیکن آہستہ آہستہ اَرْجِیش، آمِد اور میّافارِقِین کا والی بن بیٹھا ۔ نَصِیْبِیْن کی ایک شورش کے دوران میں اس کا اور صمصام الدّولہ کا مقابلہ ہو گیا ۔ باذ نے صمصام الدّولہ کی فوجوں کو باجُلّائیا (خابُور الحسینیہ کے کنارے ضلع کَواشی = اردَمُشت میں) کے مقام پر شکست دی اور موصل پر قبضہ کر لیا ۔ وہ ابھی یہ منصوبہ بنا ہی رہا تھا کہ بغداد پر چڑھائی کرکے بویہی سلطنت کو ختم کر دے، کہ اتنے میں صمصام الدّولہ کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی ۔ وہ میّافارِقین میں ہٹ آیا اور اس کے مُقابلے میں بھیجی ہوئی فوج کے سالار سے بات چیت کرکے دیار بکر اور ترعابِدِین کے مغربی حصے کا قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ باذ موصل پر قبضہ کرنے کے خیال سے ابھی دستبردار نہیں ہوا تھا ۔ چنانچہ ۳۷۹ھ/۹۹۰ء میں بَشْنَوی کردوں کی ایک کثیر جماعت جمع کرکے اس نے اس شہر کی فصیلوں کے ساتھ ہی چھاؤنی ڈال دی اور وہاں کے باشندوں سے گفت و شنید میں مصروف ہو گیا، لیکن حَمدانی فرمانرواؤں نے جنھیں حال ہی میں اپنی موروثی جاگیر پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی، بنو عُقَیل کے عربوں سے اعانت طلب کی اور حملہ آوروں پر دھاوا بول دیا ۔ باذ ایک ناگہانی حادثے کی وجہ سے سخت مجروح ہو گیا اور بالآخر قتل کر دیا گیا ۔ اس کی لاش سولی پر لٹکائی گئی، لیکن اہل موصل نے اسے حاصل کرکے تمام رسوم کے ساتھ اس کی تجہیز و تکفین کی، کیونکہ وہ کُفّار کے خلاف لڑ چکا تھا (الکامل، ۹ : ۲۵، ۲۷، ۳۸، ۴۹؛ [ابو شجاع] : تجارب، ص ۸۳، ۸۴، ۱۶۷ تا ۱۷۸؛ ابوالفرج : مختصر الدول، طبع Pococke، ص ۳۲۱ تا ۳۲۳) .

۳۸۰ سے ۳۹۰ء تک صمصام الدّولہ نے اپنی حالت کو زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش کی اور اس غرض سے اس نے فُولاد بن مُنْذر سے اتحاد کر لیا جسے شیراز میں بھرتی کیے ہوے کرد رسالے کی اعانت حاصل تھی ۔ اس اقدام میں بھی اسے ناکامی ہوئی تو اس نے کردوں سے پناہ کی درخواست کی، لیکن انھوں نے اسے دھوکا دیا اور وہ فخرالدّولہ کے ہاں پناہ گزین ہو گیا جو کردوں سے نفرت کرنے میں نام پیدا کر چکا تھا، ([ابو شجاع] : تجارب، ص ۱۸۴؛ ابن فُولاد کے لیے دیکھیے العتبی، محل مذکور، ص ۳۲۴، ۳۲۵) .

بنو مروان کے کرد خاندان (Lane-Poole، شمارہ ۷۴) کا باذ سے قریبی تعلق تھا ۔ موصل میں

شکست کھانے کے بعد اس کا بھانجا اور حلیف ابوعلی بن مروان بن دُستَاک، حِصْن کَیفْا [رک بآں] چلا آیا، جہاں باذ کی دَیلمی بیوی رہتی تھی ۔ اس نے اس سے شادی کر لی اور باذ کے مقبوضہ قلعوں میں سے ایک پر قبضہ کر لیا ۔ اس نے دو بار ابو عبداللہ الحمدانی کو، جس نے باذ کو شکست دی تھی، گرفتار کرلیا، لیکن اس سے فیاضانہ سلوک کیا ۔ ابن مروان نے دیار بکر میں اپنی حکومت قائم کر لی اور اس کے صلح جویانہ رویے کے باعث وہاں کے باشندے اس کے حامی ہوگئے ۔ بنو مروان نے ۳۸۰ھ/۹۹۰ء سے ۴۸۹ھ/۱۰۹٦ء تک حکومت کی ۔ ان کی قلمرو میں صرف دیاربکر (آمِد، اَرْزان، میّافارقِین، حِصْن کَیفْا) ہی نہیں بلکہ خِلاط، ملاز گِرد، اَرْجِیش اور جھیل وان کے شمال مشرق کا علاقہ بھی شامل تھا ۔ مغرب میں کچھ عرصے تک اُرْفة بھی ان کے قبضے میں رہا ۔ ۳۸۱ھ/۹۹۱ء میں ابو علی حسن نے شام پر حملہ کیا اور اسے بوزنطی بادشاہ باسل Basil دوم سے چھین لیا ۔ وہ ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں دیار بکر کے لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا جنھوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی تھی ۔ اس کا بھائی ابو منصور مُمَہّد الدولہ جس نے باذ کی وفات پر میّافارقِین پر قبضہ کر لیا تھا، وہاں ۴۰۲ھ/۱۰۱۱ء تک حکومت کرتا رہا (ابو الفداء: *Annales Moslemici*، طبع *Reiske*، ۲ : ۵٦۹) ۔ اس کا جانشین اس کا بھائی ابونصراحمد (ابن خَلِّکان، ۱ : ۱۵۷، ۱۵۸) ہوا جس نے ۴۰۲ھ سے ۴۵۳ھ تک حکومت کی ۔ ۴۱٦ھ/۱۰۲۵ء میں اس نے اُرْفَہ فتح کرلیا، لیکن ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں بوزنطیوں نے وہاں پھر اپنی حکومت قائم کر لی (ابو الفرج، ص ۲۴۳) ۔ اگرچہ اس کا میلان طبع عیاشی کی طرف تھا، لیکن اسے ایک عادل، روشن خیال اور قابل حکمران کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی ۔ ۴۴۲ھ/۱۰۵۰ء میں ابو نَصْر کو سلجوقی بادشاہ طُغْرِل کے سامنے سر اطاعت خم کرنا پڑا ۔ اس کے بیٹے اور جانشین ابو القاسم نَصْرالمعروف بہ نظام الدّولہ (۴۵۳ تا ۴۷۲ھ) کی حکومت میں اس کا بھائی سعید (م ۴۷۵ھ) شریک تھا ۔ اس نے اپنی مملکت میں حرّان، سُوَیْدا وغیرہ کا اضافہ کیا ۔ اس کا جانشین منصور ابن سعید ہوا جو ۴۷۲ھ سے ۴۸۹ھ تک برائے نام حکومت کرتا رہا، لیکن ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء تک سلجوق سپہ سالار فخرالدّولہ بن جَہِیْر اس کے تقریباً تمام علاقوں پر قابض ہو چکا تھا، جنھیں اتابک موصل (ابو الفِداء، ۳ : ۷۷ تا ۷۹، ۸۷، ۱۲۱، ۱۲۵، ۲۴۹) کے ماتحت کر دیا گیا ۔ آل مروان کے بارے میں دیکھیے خصوصی مطالعہ از Amedroz، *JRAS*، ۱۹۰۳ء، ص ۱۲۳ تا ۱۵۴ ۔

ترکوں کے حملے سے کچھ دن پہلے ہمیں کردوں کی متعدد مہمات اور کارناموں کا ذکر ملتا ہے ۔ القادر کے عہد (۳۸۱ تا ۴۲۲ھ) میں مؤرخین نے ایک کرد احمد بن الضّحاک کا یہ کارنامہ بیان کیا ہے کہ اس نے باسل Basil دوم کے سپہسالار کو ہلاک کر دیا اور اس طرح بوزنطیوں کی پیش قدمی روک دی ۔ ([ابو شجاع] : تجارب، ص ۲۴۷) ۔ ۳٦٦ اور ۳۸۸ھ کے مابین کردوں نے آل بویہ اور آل زیَار کی باہمی کشمکش میں حصہ لیا جو جُرجان پر قبضہ کرنے کے لیے جاری تھی (العُتبی، ص ۲۹۸ تا ۳۰۲؛ ابن اسفندیار، *GMS*، ص ۲۲٦ تا ۲۲۸) ۔ اس کے چند سال بعد ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ محمود غزنوی نے قرہ خانیوں کے خلاف کردوں کو استعمال کیا (العتبی، ص ۳۳٦) ۔

کردوں نے آل بویہ کی خانہ جنگیوں میں اور موصل پر قابض ہونے کے لیے بنو عُقَیل کی جدّو جہد میں حصہ لیا ۔ ۴۱۱ھ/۱۰۲۰ء میں وہ ان ترک دستوں سے نبرد آزما ہوے جنھوں نے حمدان

[کذا، ہمدان ؟] میں بغاوت کر دی تھی۔ ۴۱۵ سے ۴۲۰ھ تک وہ آل بویہ کے آخری فرمانروا ابو کالیجار کے خلاف فارس اور خوزستان میں لڑتے رہے (الکامل، ۹ : ۱۰۰، ۱۳۴، ۲۲۶، ۲۳۲، ۲۳۹، ۲۴۷، ۲۴۹، ۲۵۴، ۲۶۵؛ [ابن محسن :] تجارب، ص ۳۴۸، ۳۷۶، ۳۸۱) ۔ اس طرح جنگوں میں مسلسل حصہ لیتے ہوئے کرد قوم رفتہ رفتہ کمزور ہوتی رہی، یہاں تک کہ ترک عسا کر یہاں آ پہنچے، جن کے مقدر میں نسلی اعتبار سے مشرق قریب میں ایک انقلابی تغیر پیدا کرنا تھا ۔

ترکوں کی فتوحات : ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں سلاجقہ کے پیشرو غز رے میں پہنچے تو غزنویوں کا ترک سپہ سالار تاش فرّاش تین ہزار سوار لے کر مقابلے کے لیے نکلا، جن میں کردوں کی بھی ایک جماعت شامل تھی ۔ کردوں کے سردار کو غزوں نے گرفتار کر لیا تو اس نے اپنے آدمیوں کو پیغام بھیجا کہ لڑائی بند کردو ۔ اس سے شور و شغب پھیل گیا اور تاش مارا گیا (الکامل، ۹ : ۲۶۸)۔ اسی سال غز مَراغا پہنچ گئے اور متعدد ھذبانی کردوں کو تہ تیغ کردیا ۔ کردوں نے آذربیجان کے فرمانروا (وَھسُودان دوم) سے معاہدہ کرلیا اور غز پسپا ہونے پر مجبور ہوگئے۔ غزوں کی ایک دوسری جماعت ارمینیہ پر یورش کرنے کے بعد اُرمِیہ اور ابو الہَیْجاء ھَذْبانی کے علاقے میں پھر آدھمکی ۔ کردوں نے اس پر حملہ کیا، مگر شکست کھائی ۔ ۴۳۲ھ/۱۰۴۱ء میں آل مُسافر کے فرمانروا وَھْسُودان دوم بن مَمْلان نے تبریز میں غزوں کی ایک بڑی جماعت کو قتل کردیا ۔ اُرمِیہ کے غز ھکّاری چلے گئے، جو موصل کے ماتحت ایک ریاست تھی اور ملک میں تاخت و تاراج کا بازار گرم کر دیا، لیکن جن دنوں وہ پہاڑوں میں پھنسے ہوئے تھے، کردوں نے ان پر حملہ کر دیا ور ان کے ڈیرھ ہزار آدمی مار ڈالے اور بہت سے قیدی اور بیش بہا مال غنیمت اپنے ساتھ لے گئے (الکامل، ص ۲۷۰ تا ۲۷۲) ۔

طُغْرِل بیگ کے دستوں کی آمد پر غُز دہشت زدہ ہو کر آگے بڑھتے چلے گئے اور ان کے قائدین انھیں الزّوزان کے راستے الجزیرہ میں لے گئے ۔ غزوں کی ایک جماعت تو منصور بن غز اوغلی کی ماتحتی میں الجزیرہ کے مشرق کی جانب ٹھیر گئی اور دوسری بُوقا کے ماتحت دیار بکر کی طرف بڑھتی گئی ۔ اس نے راستے میں قَرْدُو، بازَبْدا، حُسَینیہ (یاقوت، ۲ : ۲۷۰، موصل اور الجزیرہ کے درمیان ایک قصبہ) اور نیشابور کے اضلاع میں خوب لوٹ مار کی ۔ الجزیرہ کے فرمانروا سلیمان بن نصرالدّولہ مروانی نے غزوں کو ترغیب دی کہ وہ شام میں بسے ہوئے غزوں سے جا ملنے کے لیے بہار کے موسم تک انتظار کریں اور اس سے پہلے اس غرض کے لیے اس کی مملکت سے نہ گزریں ۔ اس کے بعد اس نے مکر و فریب سے منصور کو گرفتار کر لیا اور فنیک کے بَشْنَوی کردوں کی مدد سے غزوں کا پیچھا کیا، لیکن وہ اپنی غارتگری سے باز نہ آئے ۔ انھوں نے ضلع دیار بکر کو لوٹا کھسوٹا اور موصل پر قبضہ کر لیا (الکامل، ۹ : ۲۷۲ تا ۲۷۳) ۔

اس دوران میں آلِ حَسنویہ پر زوال آ چکا تھا اور جبال کی حکومت ایک نئے خاندان بنو عَنّاز (دیکھیے Sachau : *Ein Verezeichnis Muham. Dynastien*، ص ۹؛ شرف نامہ، ۱ : ۲۲ : عَیّار) کے ہاتھ میں جا چکی تھی، جسے اکثر ابو الشّوق بھی کہتے ھیں ۔ قبل ازیں ۴۳۰ھ/۱۰۵۱ء میں ھَمَدان میں ترکوں کی ایک بغاوت کے دوران میں معزّ الدّولہ بُوَیہی کو حُلوان کے شیخ ابن ابیؔ الشوق کی خدمات سے فائدہ اٹھانا پڑا تھا (تجارب، ۲ : ۲) ۔ معلوم ھوتا ھے کہ اس خاندان کا اصل مؤسّس ابو الفتح محمّد بن عنّاز (الکامل، ۹ : ۱۵۸) تھا، جس نے ۳۸۰ سے

۴۰۱ھ تک حکومت کی ۔ اس کے بیٹے ابو الشّوق نے ۴۰۶ھ میں آلِ حَسَنویه کے آخری فرمانروا ظاهر (طاهر) کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ بنو عَنّاز کے مقبوضات میں شَہرزُور، کرمان شاه (۴۳۱ھ میں قبضه هوا، الکامل، ۹ : ۳۰۰، ۳۱۶)، بِیْلَوار، صَمْغان دَقُوقه، خُفْتذَکان شامل تھے ۔ ۴۳۷ھ میں طُغْرِل نے اپنے بھائی ابراهیم ینّال [کذا، اینال ؟] کو جبال میں امن و امان قائم کرنے کے لیے بھیجا، جس نے گر شاسپ بُوَیہی کو ھَمَدان سے نکال باهر کیا اور اس نے جوزْقان کردوں کے هاں پناه لی۔ کرمان شاه میں ابوالشّوق کا ایک حفاظتی دسته مقیم تھا، جو دیلمیوں اور شاجَنجْانی کردوں پر مشتمل تھا ۔ کرمان شاه فتح هوگیا اور ابو الشّوق نے ۴۳۸ھ/۱۰۴۶ء میں سِیْروان میں وفات پائی ۔ ابراهیم نے صَمیْران (شَمران ؟ صَیْمَره ؟) پر قبضه کرکے جوزقان کو زیر کر لیا ۔ سعدی بن ابو الشّوق نے سلاجقه کی اطاعت قبول کر لی ۔ اس خاندان کی حکومت ۵۱۰ھ/ ۱۱۱۶ء تک قائم رهی (منجّم باشی، حواله در Sachau، محل مذکور) ۔

مَلازْ گرد میں شنهشاه رومانوس Romanus چهارم کو شکست هوئی (۴۶۳ھ/۱۰۷۱ء) اور سارے ارمینیه پر آلپ آرْسلان کا قبضه هوگیا ۔ سلاجقه کے عظیم خاندان کے دوران حکومت میں شَبانکاره [رک بآں] کا شورش پسند خاندان فارس میں اٹھ کھڑا هوا۔ اس خاندان کی کیفیت احوال کا پتا ۴۲۱ سے ۷۵۶ھ تک چلایا جا سکتا ہے، لیکن یه بات مشکوک ہے که یه خاندان واقعی کرد تھا یا نہیں (دیکھیے اوپر) ۔ دوسری جانب کردوں کے چھوٹے چھوٹے خاندان بڑی بیدردی سے مٹا دیے گئے اور ان کی جگه ترکوں کو آباد کر دیا گیا ۔ ۴۹۳ھ/۱۱۰۰ء میں آخری مروانی فرمانروا خلاط کے علاقے میں سے نکل گیا اور وهاں ایک ترک سُقمان قُطْبی نے خاندانِ شاه ارمن کی بنیاد رکھی ۔ یه خاندان ایک صدی تک، یعنی آل ایّوب کی آمد تک حکومت کرتا رها ۔ ۴۹۵ھ/۱۱۰۱ء کے ذیل میں ابن الأثیر (۱۰ : ۲۳۸) نے سُلْغُور قَره بُولی کے ترکمانوں کے هاتھوں بنو عَنّاز کی ایک شاخ سَرخاب بن بدر کے دو هزار کردوں کے مارے جانے کا ذکر کیا ہے ۔ آگے چل کر دوسرے ترکمانوں نے شَہْرزُور، دَقُوقه اور خُفْتذِکان کے سوا سَرخاب کا سارا علاقه لے لیا ۔ ان کچل دینے والی ضربوں کے باوجود گیارهویں اور بارهویں صدی میں کردوں کا ذکر اکثر آتا ہے ۔ ملک شاه نے قاوِرد، حاکم کرمان، کے خلاف لڑائی کے دوران میں کرد اور عرب فوجوں سے کام لیا اور اس کے صلے میں انھیں بعد ازاں کرمان میں جاگیریں عطا کیں (الکامل، ۱۰ : ۵۳)، جهاں کردوں کی آبادیاں پہلے سے موجود تھیں (دیکھیے المسعودی : التنبیه، ص ۸۸؛ ابن خَلّکان، ۱ : ۵۱۶) ۔ ۴۹۶، ۴۹۸ اور ۵۰۳ھ میں کردوں نے دُجَیْل، ماردِین، وغیره پر یلغاریں کیں ۔ ۵۰۴ھ/۱۱۱۰ء میں محمّد بن ملک شاه کی شام پر لشکر کشی میں اَحْمدایل بن وَهْسودان، حاکم مَراغه، جو قبیلۂ رَوادی کا کرد تھا (دیکھیے الکامل، ۱۰ : ۳۹۱) اور سُقْمان، شاه ارمینیه، نے حصه لیا ۔ اس لشکر کشی کا نتیجه ناکامی رها اور کردوں کو ترکوں [کے قلعے] سُقْمان کا محاصره کرنے کا موقع مل گیا (Recueil des Hist. des Croisades Docum Orientaux، ۳ : ۵۴۲، ۵۹۹) ۔

اس زمانے میں همیں شام میں کردوں کا ذکر اکثر ملتا ہے؛ یہیں ان کا فرنگیوں سے سابقه پڑا تھا (دیکھیے Derenbourg : اُسامه بن مُنقِذ) ۔ سنجر کے عہد میں جبال کے مغربی حصے کو صوبۂ کردستان بنا دیا گیا اور سنجر کا بھتیجا سلیمان یہاں کا والی مقرر هوا ۔ اس نے بَہار (هَمَدان کے شمال مشرق میں) کو اپنا صدر مقام بنایا ۔ صوبے میں

خوشحالی کا دور دورہ تھا ۔ سنجر ھی کے زمانے میں کردوں نے ۵۱۳ھ کی شورشوں میں حصہ لیا ۔ ۵۱۶ھ میں ایک تادیبی فوج نے ھکّاری، زوزان اور بَشْنَوی کے اضلاع کا دورہ کیا (الکامل، ۱۰ : ۳۷۴، ۳۷۷، ۴۲۶)، لیکن تھوڑی ھی مدت بعد کردوں نے طُور عابِدِین کے مسیحی اُسْقف کے قلعے پر قبضہ کر لیا (*Bibl. Or.* : Assemani، ۲ : ۲۲۱) .

موصل کے اتابک : یہ اتابک وسطی کردستان کے ھمسائے تھے، جہاں انھوں نے بڑے نمایاں کام انجام دیے ۔ عماد الدّین زنگی نے کئی بار کردوں کے علاقے پر حملے کیے ۔ ۵۲۸ھ/۱۱۳۴ء میں اس نے طَنْزہ (بُخْتان کے بائیں کنارے پر) پر قبضہ کر لیا اور حُمَیدی حکمران کو، جس نے موصل کے محاصرے کے وقت خلیفہ المسترشد کی مدد کی تھی، سزا دینے کے لیے اس کے قلعے العَقر، شُوش، وغیرہ چھین لیے (شمس الدّین، در *Recueil*، ۳ : ۶۶۶، ۶۶۷؛ ابن الأثیر : الاتابکیہ، در کتاب مذکور، ۲ : ۸۷) ۔ ابو الھَیْجا والی اِرْبیل و آشِب وغیرہ نے زنگی کی اطاعت قبول کر لی (یہ ابو الھَیْجا ضرور ھکّاری ھوگا ؟ یہ قبیلہ ان دنوں اس علاقے کے جنوب میں رھتا تھا، جو اب اس کے نام سے منسوب ھے؛ دیکھیے Hoffman : *Auszüge*، ص ۲۰۳) ۔ ابو الھیجا کی وفات کے بعد زنگی نے اس کے جانشینوں کے جھگڑوں میں دخل اندازی کرکے آشِب پر قبضہ کر لیا اور اس کے استحکامات منہدم کرا دیے؛ قلعۂ جَلاب کا نام عَمادِیّہ (عِمادیّہ، عماد الدّین کے اعزاز میں) رکھا گیا ۔ ۵۳۴ھ/۱۱۳۹ء میں زنگی نے قِفْجاق بن آرسلان تاش ترکمان سے شَہرِزُور چھین لیا ۔ ۵۳۷ھ/۱۱۴۲ء میں اس نے ھکّاری پر چڑھائی کی اور قلعۂ شَعْبانی (= آشب ؟) فتح کر لیا اور اسے از سر نو تعمیر کرایا ۔ ۵۳۸ھ میں اس نے اِیرُوْن اور خیزان پر قبضہ کر لیا (شمس الدّین، در *Recueil*، ۳ : ۶۸۵) ۔ رابیہ (دیکھیے شرف نامہ، ۱ : ۲۸۴)، فَرَح اور عَلْقا (Elk) کا فرمانروا علی اپنی مرضی سے زنگی سے مل گیا ۔ زنگی کی آخری فوجی مہم فَنَک (فِنک) کے بِشنویوں پر چڑھائی تھی، لیکن ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء میں اتابک کی وفات پر شہر کا محاصرہ اٹھا لیا گیا (ابن الأثیر : الاتابکیہ، در *Recueil*، ۲ : ۸۶، ۱۱۴، ۱۲۹، ۱۸۸) ۔ قَراجَہ تاجنہ مُقْطَع(؟) ھکّاری، جسے ۵۴۷ھ میں اتابک موصل نے اتابک آذربیجان کے مقابلے میں بھیجا تھا، ترک معلوم ھوتا ھے اور اس کا اس قبیلے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا .

آگے چل کر صلاح الدّین کی وفات (۵۸۹ھ) کے بعد زنگیوں نے وسطی کردستان میں اپنی حیثیت مستحکم کر لی ۔ ۶۰۷ھ/۱۲۱۱ء میں آرسلان شاہ زنگی کے ایک چھوٹے بیٹے عماد الدّین کو حُمَیدی کے قلعے (عَقَر اور شُوش) جاگیر میں دیے گئے ۔ ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء میں اسی حکمران نے عمادیّہ اور ھکّاری اور زُوزان کے باقی ماندہ قلعے بھی قبضے میں کر لیے، جو مظفرالدّین کوک بوری، والیِ اربیل، نے اس کے حوالے کیے تھے (ابو الفَرج، ص ۴۳۳، ۴۳۸) ۔ یقینًا انھیں حوادث نے ھکّاری کو زاب کلاں کے منبعوں کے علاقوں کی طرف دھکیل دیا ھوگا .

دیار بکر کے اُرْتُقی اتابکوں کی کُردوں سے کئی بار لڑائیاں چھڑیں (ابوالفِداء، ۳ : ۵۸۳؛ اسامۃ، ۱ : ۳۲۱) ۔ عباسی خلفا نے اپنے محافظوں کی سرپرستی سے پیچھا چھڑا کر کردوں سے نامہ و پیام شروع کیا (دیکھیے ۵۲۸ھ میں عیسٰی حُمَیدی کا واقعہ اور الکامل، ۱۱ : ۷، ۱۸۸) اور ترکوں کی قوت توڑنے کی کوشش کی ۔ ۵۸۱ھ میں خلیفہ النّاصر کے عہد میں ایک معمولی سے واقعے سے کردوں اور ترکمانوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی (الکامل، ۳ : ۳۴۲)، جو ایک وسیع علاقے (شام،

دیار بکر، الجزیرہ، موصل، شَہْرِزُور، خِلاط اور آذربیجان) میں پھیل گئی ۔ دو سال بعد ان دونوں حریفوں نے جنگ بند کر دی تاکہ متحد ہو کر ارمینیہ، آشوریا، میسوپوٹیمیا (عراق عجم)، شام اور قپادوقیہ Cappadocia کے عیسائیوں کا مقابلہ کریں، لیکن تھوڑے ھی عرصے بعد کردوں اور ترکمانوں کے درمیان نئے جھگڑے پیدا ہو گئے ۔ بہت سی خونریز لڑائیوں کے بعد کرد کیلیکیا (Cilicia) واپس آ گئے ۔ ترکوں نے عملی طور پر کیلیکیا اور شام کے کردوں کو ختم کر دیا ۔ کرد اپنے پرانے گھروں کو چھوڑتے وقت اپنا سامان عیسائی ہمسایوں کے سپرد کر آئے تھے اور عیسائیوں نے کچھ کردوں کو اپنے ھاں چھپا رکھا تھا، اس لیے ترک بالآخر تل مَزن (؟) اور اَرَب تِل (= اربَکْر ؟) کے عیسائیوں پر ٹوٹ پڑے (میخائل Michael شامی، در *Recueil Doc. Armen*، ص ۳۹۵) .

آل ایّوب : یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ھے کہ یہ ممتاز خاندان کردی الاصل تھا (شرف نامہ، ۱ : ۵۵ تا ۸۲) ۔ ارمنی مؤرخ ھیٹن Hayton (Hethum) اس سلسلے میں لکھتا ھے : Postea vero Saraceni amiserunt dominium Egipti et Medi, qui Cordins vulgariter diceban-tur, regni Egipti dominium Occupaverunt، در *Recueil Doc. Arm.*، ۲ : ۲۲۵، ۳۴۳) ۔ صلاح الدّین کا دادا شاذی بن مروان دَوِین [رک بآں] کا ایک رَوادی (رَاوَدی، رَوَنْدَہ، ھَذْبانی کی ایک شاخ) کرد تھا .

اھم بات یہ ھے کہ شدّادی خاندان دوین ھی سے آیا تھا، جس کے تذکرے شاذی کے زمانے میں بھی ہوتے ہوں گے ۔ ایوب [رک بآں] اور شیر کوہ [رک بآں] بن شاذی اپنے پرانے وطن (موضع اَجْدَنْکان) میں پیدا ہوئے تھے ۔ صلاح الدّین [رک بآں] کی ولادت تَکْرِیت میں ہوئی، لیکن وہ یقیناً اپنے والد اور چچا کے ذریعے کرد روایات سے آشنا تھا ۔ یہ بات کہ خاندان ایوبی میں ھمیشہ ایرانی نام رکھے جاتے تھے، معنی خیز ھے، تاھم اس خاندان کے نمایاں کارناموں کے میدان زیادہ تر مصر اور شام تھے ۔ قدیم سلجوق اتابکوں کے خاندان آل ایّوب کے باجگزار ہونے کے بعد بھی دیار بکر (اُرتقی)، موصل (زنگی) اور اَربیل (بُکْتِگینی، جو ابتدا میں زنگیوں کے نائب تھے) میں حکومت کرتے رھے ۔ ۵۸۵ھ/۱۱۸۷ء میں عزّالدّین زنگی سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے صلاح الدّین نے صرف حلب اور شَہْرِزُور کا الحاق کیا تھا (ابن الأثیر : الاتابکیہ، در *Recueil*، ۲ : ۳۴۳؛ الکامل، ۱۱ : ۳۴۰؛ بہاء الدّین، در *Recueil*، ۳ : ۸۵) ۔ ۵۸۵ھ میں صلاح الدّین نے شہرزور اپنے مملوک کش توغدی (؟) کو عطا کردیا، جو یعقوب بن قِفْجاق کا رشتے دار تھا ۔ آل ایّوب صرف خِلاط ھی کے راستے سے کردستان میں آزادانہ طور پر داخل ہوے ۔ یہ ضلع پہلے پہل تقی الدّین نے ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں فتح کیا تھا (الکامل، ۱۲ : ۴۰)، لیکن باقاعدہ طور پر وھاں حکومت کی باگ ڈور صلاح الدّین کی وفات کے بعد اس کے بھتیجے اوحد ایّوب نے ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں سنبھالی؛ بعدازاں خلاط اس کے بھائی اشرف کے قبضے میں آ گیا، جس نے شاہ ارمن کا لقب اختیار کیا اور بالآخر تیسرے بھائی مظفر کے ھاتھ لگا، جو وھاں ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء تک حکومت کرتا رھا ۔ گرجستانیوں، خوارزمشاھوں اور مغول کے حملوں کی وجہ سے اس جاگیر کا امن و امان کئی بار غارت ہوا ۔ اس زمانے میں جو گرجستانی دستے خِلاط کے گرد و نواح میں مصروف پیکار تھے، ان کی قیادت ارمن حکمرانوں ذَکرہ Zakare اور آئیوین Iwane کے ھاتھوں میں

تھی . ان حکمرانوں کے شجرۂ نسب سے پتا چلتا ہے کہ وہ خِل بِبَرکن، یعنی باپیرکان نامی کرد قبیلے کی نسل سے تھے (دیکھیے Marr، در *Zap*، ۱۹۱۱ء، ۲۰ : ۱۲۰) .

ایّوبی لشکر زیادہ تر ترکوں پر مشتمل تھا، لیکن اس میں کردوں کی تعداد بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھی - ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں صلاح الدّین نے بالائی دجلے کے کردوں کو دعوت جہاد دی - ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء میں الجزیرۃ کی فوجوں کو خدمت سے سبکدوش کر دیا گیا، لیکن دیار بکر کے دستوں اور مخصوص قبیلوں کا ذکر اکثر ملتا ہے - بعض اوقات ان کردوں کے تعلقات ترکمانوں سے ناخوشگوار رہے (بہاء الدّین، *Recueil*، ۳ : ۸۶، ۳۱۳، ۳۸۱) .

عہد ایّوبی میں کرد بہت سی فوجی اور شہری ملازمتوں پر مامور تھے، لیکن اکثر اوقات وہ اس خاندان کے مفاد کے منافی کام کرتے تھے، چنانچہ شیر کوہ کی وفات پر صلاح الدّین کی جانشینی کی مخالفت کردوں ھی نے کی تھی (ابن خَلّکان، ۴ : ۴۹۴) .

اَرْبیل (؟) کے موروثی شیخ ابو الہَیْجا (ھَذْبانی) کے خاندان نے بڑا اھم کام انجام دیا - اس نے صلیبی جنگجوؤں کے مقابلے میں عکّا کی حفاظت کا اہتمام کیا اور وہ فوج کا سپہ سالار اور بیت المقدس کا حاکم مقرر ہوگیا - ۱۱۹۶ء میں اسے بغداد میں منتقل کر دیا گیا - اس نے ھَمدان پر حملہ کرنے والی فوج کی قیادت کی اور دَقُوقَہ میں وفات پائی - اس کے بھتیجے قطب الدّین نے قاھرہ میں مدرسۂ قطبیہ تعمیر کیا - ایک اور کرد سیف الدّین بن احمد اَلْمَشْطُوب، جو قبیلۂ ھکّاری سے تعلق رکھتا تھا، عکّا میں ابو الہَیْجا کا جانشین مقرر ھوا - اس کے اخلاف نے بڑی ہنگامہ خیز زندگی بسر کی - اس کے بیٹے احمد نے حرّان کے زندان میں دم توڑا اور پوتے قاضی عماد الدّین کو الکامل کے خلاف سازش کرنے کی بنا پر جلا وطن ھونا پڑا .

خوارزمشاہ جلال الدّین : ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء میں زغروس Zagros کے کردوں نے خوارزمشاہ کے ان فوجی دستوں کو شکست دی جو ھمدان سے بغداد بھیجے گئے تھے - خِلاط پر خوارزمشاہ کے حملے (۶۲۳ تا ۶۲۶ھ) نے ملک بھر میں ابتری ڈال دی اور قحط کی وجہ سے کردوں کی ایک بڑی تعداد ہلاک ہو گئی (الکامل، ۱۲ : ۲۰۷، ۳۰۸) - جب مغول نے جلال الدّین کو شکست دے کر اس کا تعاقب کیا تو اس نے دیار بکر کے کردوں کے ہاں پناہ لی اور ۶۲۸ھ/۱۳۲۱ء میں غالبًا انھیں میں سے کسی کے ہاتھوں مارا گیا (الجُوَیْنِي، طبع محمّد القزوینی، ۲ : ۱۹۰؛ الکامل، ۱۲: ۳۲۵؛ d'Ohsson: *Histoire des Mongols*، ۳ : ۶۲) - ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء میں باقی ماندہ خوارزمی لشکر نے پھر علاقۂ خَرپوت کے طول و عرض میں لوٹ مار کی (ابو الفرج : کتاب مذکور، ص ۴۷۷) - جلال الدّین کی وفات کے بعد مغول نے دیار بکر اور خِلاط کا علاقہ تباہ و برباد کر دیا - ایک اور گروہ مراغہ سے اَرْبیل میں وارد ھوا - اس علاقے پر تین بار حملہ ھوا - ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں شَہرِ زور اور ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء میں دیار بکر تباہ و برباد کیے گئے .

ایلخانی مغول : ایلخانی عہد میں کردوں کا ذکر بہت کم ملتا ہے - یہ فرمانروا پہلے اصنام پرست تھے اور بعد ازاں حلقہ بگوش اسلام ہوے - ان کے تعلقات عیسائیوں سے خوشگوار تھے اور عیسائیوں کو اپنے مسلمان پڑوسیوں سے خاصی شکایات تھیں، اس لیے کردوں کو، جو تھوڑا ھی عرصہ پہلے آل ایوب کے ساتھ صلیبی جنگوں میں شرکت کرتے رہے تھے، اپنے پہاڑوں کے اندر

بند ہونا پڑا اور وہیں وہ مغول کے دشمنوں کی کامیابی کی دعائیں مانگتے رہے ۔

عہد سلاجقہ میں "کردستان" کا جو صوبہ تشکیل کیا گیا تھا، اس کا دارالحکومت بہار (نزد ہمدان) تھا ۔ یہ صوبہ مشہور و معروف امیر چوبان کے والد مَلِک بن تُودان نے فتح کیا ۔ ۶۵۵ھ میں ہلاکو ہمدان سے بغداد کی طرف بڑھا؛ کرمانشاہ میں مغول نے قتل و غارت کا آغاز کر دیا (رشیدالدّین، طبع Quatremère، ص ۲۲۵، ۲۵۵، ۲۶۷) ۔ بغداد پر قبضہ کرنے سے قبل ہلاکو نے اَرْبیل فتح کرنے کے لیے فوجیں بھیجیں ۔ اس قلعے کے حاکم تاج الدّین صَلابَہ (دیکھیے رشید الدّین، طبع Blochet، ص ۶۱) نے مغول کی اطاعت قبول کر لی، لیکن کردوں کے حفاظتی دستے نے اس کی تقلید کرنے سے انکار کر دیا ۔ بدر الدّین لؤلؤ، اتابک موصل، کی مدد سے اَرْبیل فتح ہوا (d' Ohsson : ۳ : ۲۵۶) ۔ بغداد پر قبضے کا نتیجہ شَہْرزُور [رک بآں] کی ویرانی کی شکل میں نمودار ہوا اور بقول شہاب الدّین العُمَری یہاں کے کرد باشندے شام و مصر میں ہجرت کر گئے (دیکھیے d' Ohsson، کتاب مذکور، ۳ : ۳۰۹، ۳۳۰، ۳۳۷) ۔ ان واقعات کی ایک یادگار الجزائر میں دو کُرد قبیلوں لَوِیْن اور بَبِیْن کا وجود ہے (ابن خَلْدون : Hist. des Berbères، مترجمۂ de Slane، ۲ : ۶۱ م و ۳ : ۱۳ م) ۔

آذربیجان واپس آ کر ۶۵۷ھ میں ہلاکو نے شام کی جانب کوچ کیا ۔ مملکت ہکّاری میں مغول کو جو کرد نظر آیا اسے تہ تیغ کر دیا گیا (رشید الدّین، طبع Quatremére، ص ۳۲۸) ۔ الجزیرہ دیار بکر، میّا فارقین (جو ملک الکامل ایوبی کے پاس تھا) اور ماردین، یکے بعد دیگرے فتح ہو گئے ۔ اتابک بدر الدّین لُؤلُؤ کی وفات کے بعد، جو ہمیشہ ہلاکو کا وفادار رہا تھا، اس کا بیٹا صالح مصر کے سلطان بیبرس سے مل گیا اور اس سے اپنی حکومت کے بارے میں فرمان توثیق حاصل کر لیا ۔ موصل کے گرد و نواح کے کرد فوراً عیسائیوں پر ٹوٹ پڑے ۔ موصل کے حفاظتی دستے نے، جو کردوں، ترکمانوں اور شولوں پر مشتمل تھا، بڑی جرأت سے مغول کے حملے کو روکا ۔

شام میں بھی کرد مملوکوں کے حلیف ہوگئے ۔ خان برقای کے نام ایک خط میں بیبرس نے اپنی فوجوں کی تعداد پر فخر کا اظہار کیا ہے، جن میں ترک، کرد اور عرب تھے (d' Ohsson، ۳ : ۳۸۵) ارمنی مؤرخ ہیٹن نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اباقا کے زمانے میں مصری فوجوں کے ایک حملے کے بعد (۶۷۷ھ/۱۲۷۸ء سے قبل) کردوں نے شمالی شام میں رہنے والے پانچ ہزار کردوں (Gordins) کے گھروں پر قبضہ کر لیا تھا (*Recueil, Doc. Armén.*، ۲ : ۱۷۹)، لیکن ۶۸۰ھ/۱۲۸۱ء میں مغول کی شکست کے بعد اسلامی فوج کے ایک دستے نے، جو ترکمانوں اور کردوں پر مشتمل تھا، کیلیکیا (Cilicia) کو تباہ کر دیا ۔ ایسے شاذ و نادر واقعے جن میں کرد، مغول کے حلیف نظر آتے ہیں، عموماً فارس کے دور دراز علاقے میں پیش آئے ۔ الجایتو کے عہد میں جن دستوں نے ۷۰۶ھ میں گیلان پر حملہ کیا، ان میں کرد بھی شامل تھے ۔ کچھ مدت کے بعد موسٰی نامی ایک کرد کو، جس نے شیعیوں کے مہدی ہونے کا اعلان کیا تھا، الجایتو نے سزاے موت دی ۔ ۷۱۲ھ میں رحبہ کے کرد حاکم بدر الدّین نے مغول کا مقابلہ کیا ۔

کردوں کے صوبوں میں مغول امرا کی حکومت تھی ۔ اربیل میں جنگ کبھی بند نہ ہوئی ۔ قیاچی عیسائی کوہستانیوں نے، جو مغول فوج ہی کا ایک حصہ تھے، اپنے سپہ سالار زین الدّین بالو پر ایک الزام

لگا کر کردوں سے جنگ چھیڑ دی اور عربوں نے کردوں کا ساتھ دیا ۔ ان حوادث کا آغاز ۱۲۹۷ء میں ہوا، لیکن ۱۳۱۰ء میں صورت حال زیادہ بگڑ گئی۔ مغول نے مشکل سے عیسائیوں کو قلعے سے باہر نکالا۔ مغول نے محاصرے میں امداد دینے کے لیے کردوں کو طلب کیا تھا، لیکن ان کے امراء، جو عیسائیوں کے ساتھ دوستانہ روابط رکھتے تھے، چاہتے تھے کہ عربوں کے ہاتھوں عیسائیوں کا قتل عام روکنے کے سلسلے میں کردوں سے کام لیں ۔ قتل عام تو ہوا، لیکن اس میں کردوں نے کوئی حصہ نہ لیا (*Histoire de Mar Jabalaha III*، مترجمۂ Chabot، پیرس ۱۸۹۵ء، ص ۱۵۲ تا ۱۸۸) .

مراغہ اور اربیل کا درمیانی علاقہ مغول فوجوں کے لیے ایک طرح کی شاہراہ کا کام دیتا تھا ۔ اس زمانے تک بھی جھیل ارمیہ کے جنوب کا بیشتر علاقہ ترکوں اور مغول کے قبضے میں تھا [رک بہ ساوج بلاق] .

الجایتو کے عہد میں صوبۂ "کردستان" کا دارالحکومت بہار سے سلطان آباد (چمچمال) میں منتقل کر دیا گیا ۔ اس صوبے کو جس حد تک مصائب کا سامنا کرنا پڑا، اس کا اندازہ نزہۃ القلوب (ص ۱۰۷) کے ایک بیان سے ہو سکتا ہے، جس کی رو سے یہاں کا مالیانہ عہد سلاجقہ کے مالیانے کا دسواں حصہ رہ گیا تھا .

جب ایلخانی میدان سے غائب ہو گئے تو سُلدُوز [رک بآں] اور جلائر [رک بآں] قبائل کے مغول امرا کے دو گھرانے حکومت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے حریف بن گئے ۔ جب جاگیروں کی تقسیم (۷۳۸ھ/۱۳۳۸ء میں) "حسن" نام کے دو اشخاص میں ہوئی، تو (ایرانی) کردستان اور خوزستان کے علاقے امیر اکرنج یا اکرش (؟) کے بچوں کو واپس مل گئے - ۷۸۴ تا ۷۸۵ھ میں بایزید جلائری نے ایرانی کردستان اور عراق عجم کے کچھ علاقوں پر قبضہ کرکے اپنے لیے ایک جاگیر بنا لی (Lane-poole : کتاب مذکور، شمارہ ۸۶؛ d'Ohsson، ۴ : ۷۴۷) .

مملوک سلاطین کے عہد میں کرد قبائل کی فہرست : مغول کی فتوحات کی وجہ سے کرد قبائل کی سیاسی سرگرمیاں بالکل ماند پڑ گئی تھیں، لیکن مصر میں، جہاں مملوک سلاطین ایلخانیوں کے خلاف خفیہ طور پر تجاویز سوچ رہے تھے، اس وقت اس مسلمان عنصر کے معاملات کی طرف بہت دلچسپی ظاہر کی گئی ۔ شہاب الدین العمری (م ۷۴۹ھ/ ۱۳۴۸ء) کی کتاب مسالک الابصار سے پتا چلتا ہے کہ مملوک سلاطین کے دیوانِ وزرات کو کردوں کے حالات کا کیسا صحیح علم تھا ۔ بقول العمری کرد عراق اور دیار عرب کے نزدیک اور شام اور یمن میں آباد تھے ۔ کردوں سے آباد پہاڑی علاقہ (الجبال) ہمدان سے شروع ہو کر کیلیکیا (بلاد التکفور) تک ختم ہوتا تھا ۔ دریاے دجلہ کے مغرب میں الجزیرہ اور ماردین کے کردوں کا اپنے تمام پڑوسیوں کے رحم و کرم پر دار و مدار تھا، البتہ ماردین میں کچھ عرصہ قبل ایک شخص ابراہیم العرس بالو (؟) نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اور خاصی طاقت حاصل کر لی تھی ۔ اس کے بعد مصنف مذکور نے ہمدان اور الجزیرہ کے اس حصے میں آباد بیس قبائل کی ایک فہرست دی ہے جو موصل اور کوار کے درمیان واقع ہے (دیکھیے کیُور، در شرف نامہ) : (۱) گورانی جو جنگجو اور زراعت پیشہ (جند و رعیۃ) تھے؛ (۲) گلالی (دیکھیے ایک پہاڑ، جسے گلالۂ سُہران کہتے ہیں، شرف نامہ، ۱ : ۲۸۶؛ Narrative : Rich، ۱ : ۱۲۳ : Ghellali) ۔ اس قبیلے کا ایک گروہ ہجرت کرکے شام چلا گیا ۔ ان کا حکمران شرف الدین

مغول کے ماتحت اربیل کا گورنر تھا اور ایک مغول ھی کے ھاتھ سے مارا گیا تھا؛ (۳) زنگلی (= زنگنة؟)؛ (۴) شھر زور [رک باں] کے کوہہ اور مہر (؟)، جو مصر و شام کو ھجرت کر گئے تھے ؛ (۵) سبولی (ستونی ؟)، جو شھرزور اور اشنو میں رھتے تھے۔ ان کے قریب قرتاوی (؟ دیکھیے Hoffmann : *Auszüge*، ص ۲۰۷) آباد تھے؛ (۶) حسنانی (خشناوی ؟) ان کی تعداد کئی ھزار تھی اور تین شاخوں میں منقسم تھے - ایک شاخ قرتاوی (؟) کے ساتھ ساتھ کرکار میں آباد تھی اور درۂ دربند قرہ بولی (زاب کوچک کی تنگ گھاٹی، دیکھیے Hoffmann : کتاب مذکور، ص ۲۶۳) سے آمد و رفت کا محصول وصول کرتی تھی؛ (۷) کرحین (= کرکوک ؟) اور دقوق کے قریب ۷۰۰ افراد کا ایک قبیلہ آباد تھا ؛ (۸) علاقۂ اربیل میں "دو پہاڑوں کے درمیان" (بین الجبلین) ایک قبیلہ رھتا تھا، جو موسم سرما میں مغول سے مراعات کا طالب ھوتا تھا اور گرمیوں میں مصری حملہ آور فوجوں کی اعانت کرتا تھا؛ (۹) مازنجان(؟)، جس کے افراد کی تعداد ۵۰۰ تک تھی اور یہ قبیلہ اربیل اور مازنجان، نیروہ اور بیخمہ کے قریب آباد تھا (مؤخر الذکر دو اضلاع زاب کلاں کے کنارے عقر کے مشرق میں واقع ھیں) - مازنجان کے شیوخ اپنے رشتے دار قبیلۂ حمیدی (جس کے افراد کی تعداد ۱۰۰۰ تھی) پر بھی حکومت کرتے تھے - مازنجان کے شیخ کو، جو ککک کہلاتا تھا، خلفاے عباسیہ کی طرف سے مبارز الدین کا خطاب ملا تھا - مغول نے اس مملکت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور ککک بدستور اربیل کا نائب رھا - ارغون کے عہد میں اسے کچھ عرصے کے لیے معزول کیا گیا تھا، لیکن صبح الاعشی کی رو سے اس کے بیٹوں اور پوتوں کی جاگیریں (عقر اور شوش) برقرار رھیں؛ (۱۰) نسل حفتون کے قریب کثیر التعداد سُہری قبیلہ (سُہران) کا علاقہ تھا؛ (۱۱) ان کے ھمسائے زرزاری (یعنی اولاد زر) تھے - یہ ملاز گرد (= روبار براز گرد) اور رستاق (شمدینان کے جنوبی حصے) پر بھی قابض تھے ؛ (۱۲) جولا مرگ، اموی النسل قبیلہ تھا اور اس کے افراد کی تعداد تین ھزار تھی ؛ (۱۳) ضلع مرکوان (جسے مرگور پڑھنا چاھیے) کے کرد اپنے جولا مرگی اور زرزاری پڑوسیوں کے حلیف تھے ؛ (۱۴) جولا مرگ کے قریب گوار کا علاقہ واقع تھا؛ (۱۵) جولا مرگ کے نزدیک عقر اور عمادیہ کے پہلو میں زباری کا علاقہ تھا، جس میں ۵۰۰ افراد آباد تھے - (۱۶) ھکاری عمادیہ کے قریب آباد تھے اور ان کی تعداد ۴۰۰۰ تھی؛ (۱۷) قبیلۂ ھکاری کے قریب مرج کے پہلو میں جبل العمرانی اور کہف داؤد کا غار تھا، جہاں بسیتکی (؟) آباد تھے؛ (۱۸) جولا مرگ کے نزدیک موصل کی جانب بختی رھتے تھے، جو قبیلۂ حمیدی کے حریف تھے ؛ (۱۹) داسنی کی تعداد بہت تھی، لیکن ان کا سردار بدر الدّین ایک ایسے علاقے میں اتر آیا جہاں تک رسائی بہت آسان تھی؛ چنانچہ صوبۂ موصل میں داسنی کی تعداد ایک ھزار سے زیادہ نہ تھی - ۵۰۰ داسنی عقر میں آباد تھے؛ (۲۰) دمبولی (؟) بلند پہاڑوں میں آباد تھے .

مسالک کی ان معلومات میں صبح الاعشی سے ۲۵ کرد سرداروں کی ایک فہرست کا اضافہ کیا جا سکتا ھے، جو کتاب التثقیف، مؤلفۂ تقی الدّین (۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء کے لگ بھگ) پر مبنی ھے - یہ وہ شیوخ تھے جن کے ساتھ قاھرہ کے دیوانِ وزارت کی خط و کتابت رھتی تھی .

تیمور اور ترکمان خانوادے : مغول کے بعد ان کے حریف ترکمان خانوادوں نے اپنا اقتدار کردستان میں قائم کر لیا - ھمیں اس زمانے کے بارے میں بہت کم صحیح معلومات حاصل ھیں،

لیکن کردوں کے لیے یہ خاصا بڑا اہم دور تھا ۔ قرہ قویونلو خاندان کے افراد کردستان کے مرکز تک پہنچ گئے، کرد قبائل کو سیاسی اور مذہبی الجھنوں میں پھنسا دیا (دیکھیے قرہ قویونلو کے غالی شیعہ) اور آبادی کی خاصی تعداد کو نقلِ مکانی کے لیے مجبور کر دیا : اسی زمانے میں مکری کردوں نے جھیل ارمیہ کا جنوبی علاقہ فتح کیا [رک بہ ساوج بلاق] ۔ اس کے مقابلے میں تیمور کی فتح جس نے عارضی طور پر قرہ قویونلو کا خاتمہ کر دیا تھا، وقتی حیثیت رکھتی تھی ۔

۷۹۶ سے ۸۹۷ھ تک (۱۳۹۳ تا ۱۴۹۱ء) حِصْنِ کیفا اور الجزیرہ کی تاریخ میں جو متعدد واقعات پیش آئے، ان کا حال سریانی وقائع (مکتوبہ، در ہیتھم Haitham) طبع Behnsch : *Rerum seculo XV*، در *Mesopotamia gestarum liber*، برسلو ۱۸۳۸ء، میں محفوظ ہے ۔ تیمور کو اپنی ۷۹۶ اور ۸۰۳ھ کی مہموں میں کردوں سے واسطہ پڑا ۔ بغداد اور دیار بکر کو پامال کرنے کے بعد تیمور نے الجزیرہ پر حملہ کیا اور اسے تہس نہس کر دیا ۔ علٰی ھٰذا الجزیرہ کی ماتحت ریاستوں کو بھی فتح کر لیا ۔ اس کے بعد تیمور نے ان پہاڑوں کو عبور کیا جو دیار بکر کو مُوش سے علٰحدہ کرتے ہیں اور شرف الدّین حاکم بدلیس سے جو "سارے کردستان میں اپنے عدل و کرم کے باعث شہرت رکھتا تھا" حسن سلوک سے پیش آیا ۔ ۸۰۳ھ میں تیمور بغداد سے آذربیجان کو لوٹا اور راستے میں اس پر کردوں کا حملہ ہوا ۔

تیمور کی وفات کے بعد قرہ یوسف قرہ قویونلو کردستان واپس آ گیا اور پہلے شمس الدّین حاکم بدلیس کے ہاں پناہ لی ۔ شمس الدّین نے اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی اور دوبارہ حکومت قائم کرنے میں اسے مدد دی ۔ ۸۲۰ھ میں قرہ یوسف نے ایک "نشان" عطا کر کے فرمانروایانِ بدلیس کو ان کے مقبوضات پر حاکم قرار دیا ۔ جب ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں تیمور کا بیٹا شاہرخ ارمینیہ پہنچا تو شمس الدّین حاکم بدلیس، ملک محمّد ھکّاری، ملک خلیل حاکم حصن کیفا، امرامے خزان وغیرہ نے اس کے سامنے اقرار اطاعت کیا ۔ خوی کے کرد بھی شاہ رخ کے حاکم کے وفادار رہے (مطلع السعدین، *N. E.*، ۱۴ : ۱۵۳)۔

آق قویونلو (خاندان بیندر) نے جن کا اہم ترین مرکز دیار بکر میں تھا، بڑے بڑے کرد گھرانوں کو فنا کرنے کے منصوبے کو باقاعدہ طور پر عملی جامہ پہنانا شروع کیا (شرف نامہ، ۱ : ۱۶۴: "استیصال خانوادہ ہاے کردستان") اور عام طور سے ان تمام قبائل کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جو چمشگزک کے عظیم قبیلے کی طرح قرہ قویونلو کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے ۔ صوفی خلیل اور عرب شاہ نے جو اوزون حسن کے سپہ سالار تھے، ھکّاری کو فتح کیا جسے آگے چل کر ایک مختصر عرصے کے لیے قبیلۂ دنبلی نے قبیلۂ بوھتان سے چھین لیا تھا ۔ ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء میں (دیکھیے Behnsch : کتاب مذکورہ، ص ۱۴) سارے الجزیرہ پر آق قویونلو کا قبضہ ہو گیا اور وہاں انھوں نے خود اپنا گورنر چلبی بیگ مقرر کیا جس کے محاسن کا اعتراف شرف نامہ (۱ : ۱۲۳) تک میں کیا گیا ہے ۔ آق قویونلو کے سپہ سالار سلیمان بن بیژن نے ابراھیم کر بدلیس سے باھر نکال دیا جو بعد ازاں یعقوب بن اوزون حسن کے ہاتھوں مارا گیا ۔

شاہان صفویہ اور سلاطین عثمانیہ: شاہ اسمٰعیل نے آق قویونلو سے جنگ کے آغاز ھی میں ارمینیہ پر حملہ کر دیا تھا ۔ جنگ شرور، ۹۰۷ھ/۱۵۰۲ء کے بعد بغداد اور مرعش کا سارا درمیانی علاقہ اس کے قبضے میں آ گیا ۔ کردوں کے ساتھ اسمٰعیل کا

طرزعمل آق قویونلو سے مختلف نہ تھا ۔ آق قویونلو کی طرح شاہ کو بھی ترکمانوں پر زیادہ بھروسہ تھا ۔ علاوہ ازیں ایک پرجوش انتہا پسند شیعہ (دیکھیے خطائی) ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں سنی کردوں کے خلاف اور بھی زیادہ تعصب تھا ۔ جب خوی میں گیارہ کرد سردار اظہار اطاعت کے لیے حاضر ہوے تو اسمعیل نے ان میں سے اکثر کو قید کر دیا اور ان کی جگہ قزلباش قبائل سے حاکم چن کر مقرر کر دیے ۔

تقریباً تین صدی تک کردستان سلاطین عثمانیہ اور شاہان صفویہ کی لڑائیوں کا اکھاڑا بنا رہا ۔ چلدران کے مقام پر شکست (۱۵۱۴ء) ایران کے اس نئے شاہی خاندان پر ایک کاری ضرب تھی ۔ شاہ اسمعیل کے جانشینوں نے کچھ عارضی کامیابیاں حاصل کیں ، لیکن یہ سب اس کی ابتدائی فتوحات کا درجہ حاصل نہ کر سکیں اور ایرانی حکومت زاگروس کے مغرب میں آہستہ آہستہ ختم ہو گئی ۔ شاہ اسمعیل کی یہ کوشش کہ کردوں پر ایرانی حاکم مسلط کیے جائیں، حکومت عثمانیہ کے اس طرز عمل کے بالکل برعکس تھی، جسے حکیم ادریس نے اختیار کیا ۔ حکیم ادریس بڑا عقلمند شخص تھا اور خود بھی کرد تھا ۔ اس نے کردستان میں ایک ایسا جاگیردارانہ نظام قائم کرنے کی کوشش کی جس میں کرد امرا کو فوقیت حاصل رہے ۔

جنگ چلدارن کا کردستان پر بڑا گہرا اثر پڑا ۔ حصن کیفا کے معزول حاکم ملک خلیل (شرف نامہ، ۱ : ۱۵۵) نے سعرد پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا اور اپنی موروثی جاگیر حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ محمّد بیگ حاکم صاصون ایرانیوں سے جنگ آزما تھا ۔ احمد بیگ حاکم میافارقین، قاسم بیگ حاکم اگیل، جمشید بیگ حاکم پالو نے حکومت عثمانیہ کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا ۔ الجزیرہ کا حاکم موصل کے ایرانیوں کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا ۔ سعید بیگ سہران نے اربیل اور کرکوک پر قبضہ کر لیا تھا ۔ تقریباً بیس دیگر سرداروں کی ایرانیوں سے وفاداری متزلزل ہو رہی تھی ۔ ادریس بذات خود ان سرداروں کے پاس گیا اور ان میں سے پچیس سلطان کے ساتھ مل گئے ۔

جب سلیم تبریز سے رخصت ہو گیا تو اسمعیل نے دیار بکر اور حصن کیفا میں کمک بھیجی ۔ ادریس نے اپنے جھنڈے تلے کرد فوجوں کو جمع کیا اور کرد بیگ کو جو کردستان کا ایک سابق ایرانی حاکم تھا، شکست دی ۔ دیار بکر کے کرد ایرانیوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے حتّی کہ بیقلی محمّد پاشا کی جانب سے مدد پہنچ گئی ۔ بیقلی اور ادریس حصن کیفا کے مقام پر مل گئے اور ایرانیوں کو شکست دی ۔ اس کے بعد (عمادیہ سے سے آئے ہوے ؟) ۵۰۰۰ کردوں کی کمک حاصل کرکے انھوں نے دیار بکر کو ایرانیوں سے نجات دلائی اور ماردین فتح کیا ۔ صرف وہاں کا قلعہ ایرانیوں کے قبضے میں رہ گیا ۔ ایرانی سپہ‌سالار نے حریف کو مغالطے میں ڈالنے کی ایک کامیاب چال چلی اور بغداد اور کرکوک کے راستے موقع پر آ پہنچا ۔ اہل ماردین نے کردوں کو باہر نکال دیا اور ایرانیوں کو شہر پر دوبارہ قابض ہو جانے کی دعوت دی ۔ نصیبین سے ارفہ جانے والی سڑک پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا ۔ ایرانیوں کو شکست ہوئی اور بیقلی نے سلیمان خان کو، جو ابھی تک ماردین میں تھا، ہتیار ڈالنے پر مجبور کر دیا ۔ اس کے بعد نصیبین، دارا، میافارقین، دیار بکر اور سنجر پر قبضہ ہو گیا اور ادریس نے اس سنجق کے کل انتظامی امور مکمل کر لیے ۔ صوبۂ دیار بکر کی ۱۱ سنجقوں کو ترک افسروں اور ۸ کو کردوں

(اکراد بیلیگی) کے ماتحت رکھا گیا ۔ والی نئے بیگوں کی مسند نشینی کی توثیق کرتے تھے، لیکن یہ بیگ ہمیشہ ایک ہی خاندان سے لیے جاتے تھے ۔ پانچ موروثی حکومتوں (کرد حکومتی) میں پرانے خاندان برقرار رہے اور حکومت براہ راست باپ بیٹے کو منتقل ہوتی رہی (دیکھیے Tischendorf : *Das Lehnwesen in d. moslem. Staaten*، لائپزگ ۱۸۷۲ء باب ۲ و ۳، جس میں عین علی مؤذن زادہ سے اقتباس کیا گیا ہے جس نے گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اپنی کتاب لکھی) ۔ اسی قسم کا نظام آگے چل کر سارے کردستان میں ملاطیہ سے بایزید اور شہر زور تک رائج کیا گیا (دیکھیے در سطور ذیل شرف نامہ، اور اولیاء چلبی (۴ : ۱۷٦ تا ۱۸۰ و ۲۷۱ تا ۳۱٦) کے نہایت دلچسپ ملاحظات : ان ۳۷ سنجقوں کے بارے میں جو سلیمان اول کے قانون کی رو سے وان سے ملحق ہوئیں اور مقامی فوج کو کوچ کا حکم ملا) ۔ صرف کرمان شاہ کا صوبہ ایرانیوں کے قبضے میں رہا ۔ ادریس کو بیش بہا انعامات سے نوازا گیا اور ایسے فرمان ہائے عطا و توثیق بھیجے گئے، جن میں وصول کنندوں کے نام کی جگہ اس کے اپنے ہاتھ سے بھرنے کے لیے خالی چھوڑ دی گئی تھی (Von Hammer : *G O R*، بار دوم، ۱ : ۷۹۴) .

۹۳٦ھ/۱۵۳۰ء میں شاہ طہماسپ نے قبیلۂ موصلو (موصلو ؟) کے ایک کرد ذوالفقار سے بغداد دوبارہ چھین لیا اور لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ پھر شروع ہو گیا ۔ سلطان سلیمان نے ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۴۸، ۱۵۵۳، اور ۱۵۵۴ء میں ایران پر لشکر کشی کی ۔ ۱۵۵۴ء میں بغداد کے فوجی دستوں نے بلقاس اور شہر زور کے کردوں کو مغلوب کر لیا جبکہ ایرانی گرجستان میں مصروف تھے (Von Hammer : کتاب مذکور، ۲ : ۲۳٦) .

۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء کے صلح نامے کی رو سے عباس اول کو مغربی صوبے جن میں آذربیجان شہر زور اور لرستان شامل تھے، ترکوں کے حوالے کرنے پڑے (کتاب مذکور، ۲: ۵۵۹)، لیکن ۱۰۱۰ھ/۱٦۰۱ء میں پھر لڑائی چھڑ گئی اور صلح نامہ ۱۰۲۱ھ/۱٦۱۲ء کی رو سے شہر زور کے علاوہ تمام کھوئے ہوئے صوبے ایران کو واپس مل گئے (کتاب مذکور، ۲ : ۷۴۵) ۔ شاہ عباس نے پندرہ ہزار کردوں کو خراسان کی سرحد پر منتقل کردیا تاکہ ترکمانوں کے مقابل کام دے سکیں .

شاہ عباس کی حکومت کے آخری دنوں میں ترکی حکومت کی تمام کوششیں بغداد پر مرکوز ہو گئیں ۔ حافظ پاشا کی اولین مہم کے دوران میں (۱٦۲۵ء) اس کی فوج میں کرد دستے بھی شامل تھے ۔ کرد بڑی بہادری سے لڑے ۔ ایرانیوں نے حملہ آوروں کو شکست دینے کے بعد تادیبی دستے ماردین میں بھیجے ۔ شاہ عباس کے انتقال کے بعد وزیراعظم خسرو پاشا نے ۱۰۳۹ھ/۱٦۲۹ء میں بغداد کی طرف پیش قدمی کی ۔ سید خان حاکم عمادیہ، میرہ بیگ سہران اور باجلان کے کرد و عرب مخلوط قبیلے نے خسرو پاشا کا ساتھ دیا جبکہ ترکی فوج کے ایک پہلو کو احمد خان اردلان کے حملے کا خطرہ تھا ۔ خسرو پاشا سنہ [رک بآں] اور ہمدان تک بڑھتا چلا گیا ۔ واپسی پر ترکوں نے چمچمال اور در تنگ کے مقامات پر ایک ایرانی فوج کو شکست دی ۔ بغداد کی فوجیں بدستور جمی رہیں اور جب خسرو پاشا واپس چلا گیا تو احمد خان اردلان نے شہر زور پر دوبارہ قبضہ کر لیا (Von Hammer : کتاب مذکور، ۳ : ۱۷، ۲۳، ۴۹، ۸٦، ۹۳) ۔ ۱۰۴۸ھ/۱٦۳۸ء میں

کہیں جا کر مراد چہارم نے بالآخر بغداد فتح کیا اور اگلے سال ایران کے ساتھ Grosso Modo معاهدے پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے انیسویں صدی عیسوی تک ترکی اور ایران کی سرحد متعین رهی (تاریخ نعیمی، ۱ : ۶۸۶) ایران کی حدود اب پوری طرح زاگروس(Zagros) سلسلۂ کوہ کے پیچھے آ گئیں .

صفویوں اور عثمانیوں کی باهمدگر عظیم کشمکش کے باعث کردوں کو اپنی سیاسی اهمیت کا احساس ہو گیا ۔ شرف نامه میں همیں کرد قبائل کے جاگیردارانه نظام و معاشرت اور ان کی ریاستوں کی ایک صحیح تصویر ملتی ھے جب که ۱۰۰۵ھ/ ۱۵۹۶ء کے قریب ان کی ترق اوج کمال کو پہنچ چکی تھی .

شرف نامه، شیخ شرف الدّین بدلیسی [رک به بدلیس] کی تصنیف ھے جو ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ۔ کردوں کی تاریخ کے مآخذ میں یه ممتاز ترین درجه رکھتی ھے ۔ کردوں کی یه تاریخ ، صحیح معنوں میں (ج ۱ ، طبع Veliaminof Zernof) چار حصوں (صحیفه) میں منقسم ھے ۔ ان میں سے پہلے حصے میں ان کرد خاندانوں کے حالات هیں جو واقعی اقتدار شاهانه (سلطنت) کے مالک تھے، دوسرے میں ان خانوادوں کا ذکر ھے جن کے افراد نے مختلف اوقات میں اپنے نام کے سکے ضرب کرائے اور خطبے پڑھوائے، تیسرے میں موروثی حکام کے خانوادوں کا ذکر ھے اور چوتھے میں صرف بدلیس کے رؤسا کی مفصل تاریخ ھے ۔ حصۂ اول میں پانچ خاندانوں کے حالات هیں : دیار بکر اور الجزیره کا خاندان مروانیه [رک به مروان، آل]؛ دینور اور شهر زور کا خاندان حسنویه [رک باں]؛ لرکلان کا خاندان فضلویه (رک باں)؛ لرکوچک کے بادشاه اور آل ایوب [رک به ایوبیه] .

چونکه دوسرے اور تیسرے گروہ کے حاکموں میں بڑا باریک فرق پایا جاتا ھے اور شرف الدّین نے ان خاندانوں کو کسی اصول کے مدنظر رکھے بغیر ترتیب دیا ھے، اس لیے بہتر ہوگا که ان خاندانوں کو ان کی جاگیروں کے جغرافیائی محل وقوع کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیں اور اس سلسلے میں جزیره ابن عمر کو مرکز مان لیا جائے ۔ اس فہرست کے بعد ان کرد قبائل کی فہرست درج کی جائے گی جو ایران میں آباد هیں ۔ دوسرے گروہ کی جاگیروں پر (جن میں بدلیس شامل ھے) ستارے کا نشان بنا دیا جائے گا .

شرف الدّین نے جہاں تک ہو سکتا ھے قبائل اور ان کے رؤسا کے گھرانوں کے درمیان امتیاز قائم رکھا ھے اور یه ضروری ھے که کردستان میں جاگیردارانه نظام کی اساس کو همیشه ذهن میں رکھا جائے ۔ مختلف النسل رؤسا کردوں، کردوں سے متأثر لوگوں اور مسیحی قبائل پر جنگجو کرد قبائل (عشیرة) کی مدد سے حکومت کرتے هیں ۔ یه قبائل بعض اوقات مستقل طور پر کسی جگه سکونت رکھتے اور بعض اوقات بدوی یا نیم بدوی ہوتے هیں .

فریق ۔ الف، الجزیرة اور درسیم کے درمیان

(۱) الجزیرة کے رؤسا اموی النسل ہونے کا دعوی کرتے تھے، لیکن خالد بن ولید رض کو اپنا جد امجد کہتے تھے ۔ اس قسم کے ملتبس شجره هائے نسب میں امویوں کے کرد موالی اور مشہور سپه سالار خالد بن ولید رض [رک باں] کے قابل التعظیم مقامی اخلاف کا تذکره ھے، جن کے مقبرے سعرد کے قریب بتائے جاتے هیں(Hartmann : بوهتان، ۹ ، ۱۲۴) ۔ یه رؤسا پہلے یزیدی مسلک کے پیرو تھے ۔ کٹر سنی عقائد انهوں نے کہیں بعد میں جا کر اختیار کیے ۔ سلیمان بن خالد کی وفات کے بعد اس کے تین بیٹوں نے اپنی مقبوضات اس طرح تقسیم کیں : الجزیرة میر عبدالعزیز کے

پاس آیا، گُرگیل میر حاجی بیگ کے ہاتھ لگا اور فنیک میرابدال کے حصے میں آیا ۔ یہ تینوں شاخیں آگے چل کر اپنی جاگیروں پر قبضہ کیے رہیں ۔

شرف نامہ میں اس گھرانے کے مقبوضات کا ذکر "ولایت بوختی" کے نام سے آیا ہے (۱ : ۳۲۰) اور اس اہم جاگیر کے ۱۴ نواحی (مواضع) کی فہرست بڑی تفصیل سے، لیکن کسی نظم و ترتیب کے بغیر، درج کی گئی ہے : گرگیل، اروخ، پِروز، بادان اور طنزی (کاھوک)، جن پر کارسی قبیلے کا قبضہ تھا؛ فنیک، تنُور، ہیتسم (ہیتھم) اور شاخ میں عیسائی آباد تھے؛ نِیش اتل، ارمشات، جہاں کا قبیلہ (براسپی)، قبائل بوخت میں سب سے بڑا ہے؛ کیوَر یا قمیز (؟)، دیردہ جو طنزی کے قبضے میں تھا ۔ M. Hartmann کے دقیق مطالعہ : *Bohtan, Mitteil. d. Vorderasiat. Gesell.*، ۱۸۹۶ء، ۲ و ۱۸۹۷ء، ۱، ص ۱ تا ۱۶۳، کے باوجود ان میں سے بعض مقامات کے محل وقوع پورے وثوق کے ساتھ معلوم نہیں ۔

جزیرۃ ابن عمر کی جاگیر بوھتان کے دائیں کنارے اور دجلہ کے درمیان واقع تھی ۔ اس میں بوھتان کے منابع شامل نہیں تھے ۔ مشرق جانب سِندیان [رک بہ عمادیہ] بوختی کے ہمسائے تھے اور خابوُر کے کنارے آباد تھے ۔

(۲) خِیزان، اسبایرد (سپرھت، اسپرت، اولیاء چلبی کے ہاں : اسبعرد) اور مُکُس (مُکُس) کے فرمانرواؤں کے اجداد تین بھائی تھے، جو عہد سلاجقہ میں بلیجان (خنِس) سے آئے تھے (شرف نامہ، ۱ : ۲۱۷)، مرکزی جاگیر پر قبیلۂ نمیرن قابض تھا اور یہ جاگیر بوھتان کے دائیں کنارے کے معاونین کے ساتھ ساتھ مروانان تک پھیلی ہوئی تھی ۔

(۳) شیروان (بوھتان کے دائیں کنارے پر خیزان کے نیچے اور سعِرد کے شمال مشرق میں) ۔ "شیروی" رؤسا کے اجداد آل ایّوب کی ملازمت میں تھے اور اسی زمانے میں شیروان آئے جب ملکان "حصن کیفا" آئے تھے بلکہ شیرویوں نے ملکان کے وزیروں کے فرائض بھی انجام دیے (کتاب مذکور، ۱ : ۱۵۵) ۔ شیروان کا صدر مقام کُفرا تھا ۔ دوسری ماتحت ریاستیں اویل، شبستان (نیز المعروف بہ گرنی = کِرنک) اور ایڑون تھیں ۔

(۴) بدلیس ۔ کہا جاتا ہے کہ قبیلۂ رُوزگی (رُوزگی) کا یہ نام اس لیے پڑا کہ ایک روز ۲۴ قبائل موضع طاب، ضلع خوئت (آج کل بدلیس کے مغرب میں 'مود کی' قضا) میں جمع ہوے اور باہم وفاق کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر دو فریقوں میں یعنی بلباسی اور قوالیسی میں منقسم ہو گئی ۔ شرف الدّین (۱ : ۳۶۱) نے روزگی کے ۲۴ (۲۵ پڑھیے) قبائل کی فہرست دی ہے، جن میں سے ۵ یہاں قدیم سے آباد چلے آتے تھے اور باقی نووارد تھے : بلباسی (۱۰) قبیلے اور قوالیسی (۱۰) قبیلے ۔

روزگی نے گرجستان کے بادشاہ تاویت (David، ص ۹۸۴ تا ۱۰۰۱؟) سے بدلیس اور حازو (صاصون) لے لیے ۔ بعد ازاں اختلاط سے وہ ساسانی نسل کے دو بھائیوں کو لے آئے جن میں سے ایک بدلیس کا اور دوسرا صاصون کا والی بنا دیا گیا ۔ ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء تک ضیاء الدین کی نسل سے ۱۸ فرمانرواؤں نے بدلیس پر حکومت کی ۔ صرف عہد سلاجقہ (۵۳۴ تا ۵۷۶ھ)، عہد آق قویونلو (۸۷۱ تا ۹۰۰ھ)، عہد شاہ اسمٰعیل (۹۱۳ تا ۹۲۰ھ) میں اور ۹۴۱ سے ۹۸۶ھ تک وہ حکومت سے محروم رہے ۔ ۹۸۶ھ میں سلطان سلیمان نے ملاطیہ کا امیر شمس الدین کی موروثی جاگیر سے تبادلہ کرنا چاہا ۔ شمس الدّین کو بدلیس چھوڑنا پڑا، لیکن نئی سازشوں سے بچنے کے لیے شاہ طہماسپ کے

دربار میں چلا گیا جس نے اس سے بڑا فراخدلانہ سلوک کیا ۔ شمس الدّین نے ۹۶۵ھ میں ایران میں وفات پائی ۔ اس کا بیٹا شرف الدّین ۹۴۰ھ میں جلاوطنی کی حالت میں پیدا ھوا اور اسے دربار شاھی میں اعلٰی تعلیم دلائی گئی (شاہ نے اس کو نقاشی تک کی تعلیم دلوائی تھی) ۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی ایرانی صوبوں پر حکومت کی اور تمام ایرانی کردوں کی سرداری کے منصب پر فائز ھوا ۔ اسمٰعیل دوم کے تخت نشین ھونے پر شرف الدّین کو شک و شبہہ سے دیکھا جانے لگا اور اسے نخجوان بھیج دیا گیا ۔ یہاں سے وہ وان پہنچنے میں کامیاب ھوگیا اور مراد اول سے بدلیس کی حکومت کا فرمان حاصل کر لیا، جس میں ۹۹۱ھ میں موش کا اضافہ ھوا ۔ ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۵ء میں بدلیس کی حالت کا اولیا چلبی (۴ : ۸۱ تا ۱۲۱) نے مفصل تذکرہ کیا ھے ۔ ۱۸۴۹ء میں بدلیس کے آخری فرمانروا شرف بیگ کو ترکوں نے معزول کر دیا (*Armenia* : Lynch، ۲ : ۱۴۹) ۔

(۵) صاصون (حاذو) کے فرمانروا اپنے جد، یعنی عزّالدّین جو بدلیس کے ضیاء الدّین کا بھائی تھا، کے نام پر عزّین کہلاتے تھے ۔ صاصون کے عشائر (قرابت‌دار) پہلے شیروی، بابوسی، سوسانی اور طموق تھے ۔ روزگی [رک بہ بدلیس] یہاں بعد میں آئے ۔ آگے چل کر ارزن کے الحاق کے بعد اس ضلع کے قبائل : خالدی، دیرِ مغانی ، عزیزان، جو پہلے حصن کیفا میں رھتے تھے، صاصون کے قبائل کے ساتھ مل کر رھنے کے لیے یہاں چلے آئے ۔

(۶) سُوَیدی رؤسا برامکہ کی اولاد ھونے کے مدعی ھیں ۔ ان کے اجداد کو قبیلۂ سُوَیدی نے اپنے اندر شامل کر لیا تھا ۔ سُوَیدی کی موروثی جاگیر گنج (اسے کیخ کی جگہ جو Véliamenof-Zernof، ۱ : ۲۶۰ میں لکھا ھے، یوں پڑھنا چاھیے) تھی ۔

(۷) پازوک کے قبیلہ جسے شرف الدّین نے ایران کے قبائل میں شمار کیا ھے (۱ : ۳۲۸)، کے بارے میں کہا جاتا ھے کہ یہ سُوَیدی الاصل تھا ۔ شرف نامہ (۱ : ۳۲۸) کی رو سے اس کا کوئی خاص مذھب نہیں تھا اور اس کے ھاں عقائد فاسدہ (رفض والحاد) کی علامات بھی ظاھر تھیں ۔ یہ قبیلہ دو شاخوں میں منقسم تھا : خالد بیگلو اور شِکر بیگلو، اور جن میں سے ایک امرائے بِدلیس کے ماتحت تھی ۔ خالد کو جاگیر میں خَنس، ملازگرد اور موش کا ضلع اَخْکان (؟) ملے تھے ۔ وہ کچھ ایسے اترائے کہ خود مختاری کا اعلان کر بیٹھے ۔ جنگ چالدران کے بعد سُوَیدی قبیلے نے پازوکی کو ان کی بہت سی جاگیروں سے نکال دیا (کتاب مذکور، ۱ : ۲۵۷) ۔ شاہ طہماسپ کے عہد میں قلیچ بیگ کو جسے پازوکی کا سردار مقرر کیا گیا تھا، زگم (نزد تفلس) مل گیا ۔ بعد ازاں پازوکی کو الشکرت میں منتقل کر دیا گیا جہاں یہ قبیلہ خوب پھلا پھولا ۔

(۸) مِرداسی رؤسا (سلیم نامہ میں اسے مِردیسی لکھا ھے) بنو عبّاس کی نسل سے ھونے کے دعویدار تھے ۔ ان کا جد اعلٰی ایک دیندار شخص تھا جو ھکّاری سے اَگِیل آیا تھا اور مرداسی اس کے مرید ھو گئے تھے ۔ خود قبیلے والوں کا دعوٰی تھا کہ وہ عربی النسل ھیں اور بنو کلاب سے ھیں، جو حلب کے گرد و نواح میں آباد تھے اور ۴۲۰ھ میں فاطمیوں کے ستانے کے باعث ھجرت کرکے چلے آئے تھے (دیکھیے *The Muham. Dynasties* : Lane-Poole، عدد ۴۵ : حلب کے بنو مرداس) ۔ اس کی تین شاخوں میں سے بڑی اور اھم شاخ بُلْدقانی اَگیل میں آباد تھی ۔ اس کے آق قویونلو سے خوشگوار تعلقات تھے، لیکن

شاہ اسمٰعیل کے عہد میں اگیل پر ایران نے قبضہ کر لیا ۔ مرداسی قبیلے کی باق دو شاخوں میں سے ایک پالُو، بَاغِن (کِیغی کے نیچے) اور خَرپُوت میں حکومت کرتی تھی اور دوسری نے پہلے بُردَنج میں اور بعد ازاں جَرسوک (اَرغنه مَعدَن کے جنوب میں) میں حکومت کی ۔

(۹) چَمشْگزک کے فرمانروا آل عبّاس سے ہونے کا دعوٰی کرتے تھے، لیکن ان کے نام بیشتر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ترکی النسل (سلجوق) تھے ۔ ان کا عشیرہ (خانوادہ) ملکیشی (ملک شاهی ؟) کہلاتا تھا ۔ ملکیشی کے تقریباً ایک ہزار گھرانے ایرانی حکومت کی ملازمت میں (ایران میں؟) تھے ۔ ملکیشی کے علاقے اتنے کثیرالتعداد تھے کہ کردستان کا نام چمشگزک کا مترادف ہو کر رہ گیا تھا (شرف نامه، ۱ : ۱۶۳) ۔ مغول عہد حکومت میں تیمور اور قرہ یوسف کے تحت یہ ان پر قابض رہے ، لیکن آق قویونلو نے ان تمام قبائل کو کمزور کرنے کی ہر ممکن سعی کی، جو قرہ قویونلو کی وفاداری کا دم بھرتے تھے، چنانچہ انھوں نے چمشگزک کے مقابلے کے لیے ترک قبیلہ خربندلو کو بھیجا ۔ شیخ حسن نے خربندلو کو نکال دیا اور شاہ اسمٰعیل کی اطاعت قبول کر لی ۔ شاہ اسمٰعیل نے اس کی جگہ ایک ایرانی حاکم مقرر کر دیا ۔ سلیم اول نے یہ علاقہ وہاں کے موروثی امیر پیر حسین کو واگزار کر دیا ۔

فریق ب ۔ الجزیرۃ اور کیس کے درمیان

(۱۰) حسن کیف [رک بہ حِصْن کَیْفا]۔ یہاں کے مقامی رؤسا (ملکان) ایوبیوں کے اخلاف ہونے کے مدعی تھے جو بہت اغلب معلوم ہوتا ہے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے جد اعلٰی نے حصْن کَیْفا کی جاگیر فرمانروائے ماردین سے پائی تھی ۔ اس خاندان کا پہلا رئیس، جس کا ذکر شرف نامه میں آیا ہے، ملک سلیمان ہے جس نے ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء میں وفات پائی ۔ آق قویونلو نے حِصْن کَیْفا پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن بعد ازاں ملک خلیل نے جو حمّاۃ میں پناہ گزیں ہو گیا تھا، اپنی جاگیر پر دوبارہ قبضہ کر لیا ۔ زمانۂ مابعد میں حکومت عثمانیہ نے ملک خلیل کے بیٹوں کو معزول کردیا ۔ صاحب شرف نامه نے حِصْن کَیْفا کی ماتحت ریاستوں میں سے سعرْد، بشیری، طور (جسے بعض اوقات مقبوضات الجزیرۃ میں بھی شمار کیا جاتا ہے، دیکھیے کتاب مذکور : ص ۱۱۷، ۱۲۷، ۱۵۷) اور اَرْزَن کا ذکر کیا ہے ۔

(۱۱) سلیمانی، مروانی النّسل (اموی) فرمانروا، انھوں نے پہلے تو خوخ میں حکومت قائم کی، جو ضلع غزالی (قُلْب اور بطمان صُو کے درمیان، ان کے سنگھم سے اوپر) میں واقع ہے اور پھر آہستہ آہستہ بہت سے قلعے اور علاقے دجلہ تک فتح کر لیے ۔ وہ قبائل کے ایک طاقتور وفاق پر حکومت کرتے تھے، جن میں سے اکثر بدوی تھے اور موسم گرما میں الطاغ (Niphates) کی طرف منتقل ہو جاتے تھے ۔ ان میں سے سب سے بڑا قبیلہ بانوکی تھا، لیکن بسیان ان میں سب سے زیادہ منچلا تھا ۔ اس کے ایک ہزار گھرانے اپنے شیخ شاهسوار کے زیر قیادت بایزید میں ہجرت کر گئے ۔ ان میں سے چند قبائل یزیدی عقائد کے پیرو تھے ۔ سلیمانی قبیلے کے تعلقات اپنے پڑوسیوں، یعنی صاصون والوں سے بہت خراب تھے ۔ ان کی دو شاخیں تھیں : ایک قُلْپ اور بَطمان کی اور دوسری میّافارقین کی ۔

(۱۲) زرق (موجودہ تلفظ مصدقه از Addai Scher، *JA*، ۱۹۱۰ء، ص ۱۱۹ تا ۱۳۹)، بقول شرف الدّین، زرق عربی لفظ اَزْرَق کا مخفف ہے ۔ اس گھرانے کے جدّ اعلٰی ایک عرب بزرگ تھے جو علوی النّسل تھے اور اورتوق (م ۵۱۶ھ/۱۱۲۲ء؛

ابوالفرج : مختصر، ص ۳۷۹) کے عہد میں ماردین آئے تھے۔ اس خاندان نے ارتقیوں اور بعد ازاں آق قویونلو سے ازدواجی تعلقات قائم کر لیے - زرق کی چار شاخیں تھیں : بڑی شاخیں ترجیل (بطمان صو کے مغرب میں) اور عتاق تھیں؛ باقی دو شاخیں دَرْ زینی (ایک قدیم مسیحی خانقاہ دی زیر ؟) اور کرد کان (دیار بکر اور میافارقین کے درمیان) تھیں ۔ آخری شاخ ایک زرقی رئیس اور اس کی خانہ بدوش بیوی (دختر کابلی) کی اولاد میں سے تھی ۔

(۱۳) کِلِیس کے حکمران خاندان کا عقیدہ تھا کہ وہ ھکّاری اور عَمادیّہ کے حکمران خاندانوں کے قرابتدار ھیں ۔ ان کے جد اعلٰی مَنْد (مَنْتَشا) نے شاھان ایوبیہ کی خدمات انجام دی تھیں جس پر انھوں نے اسے ضلع قُصَیر (نزد انطاکیا) عطا کیا تھا۔ اس نے اپنے عہد میں قُصَیر کے یزیدیوں اور حماۃ اور مَرْعَش کے درمیان بسنے والے لوگوں، نیز جوم اور کلِیس کے کردوں کو متحد کیا ۔ مملوک سلاطین اور سلیم اوّل کے عہد میں یزیدیوں (شیخ عزّالدّین) اور خاندان مند کے درمیان جھگڑے اٹھ کھڑے ھوے جن کا فیصلہ مند کے حق میں ھوا، لیکن معلوم ھوتا ھے کہ شمالی شام کی اس جاگیر کے موروثی حقوق کی بنیاد کچھ بہت زیادہ مضبوط نہیں تھی ۔

فریق ج ۔ الجزیرۃ اور خوی کے درمیان

(۱۴) [رک بہ ھکّاری؛ شَمْدینان] ۔ معلوم ھوتا ھے کہ شرف الدّین کو عَمادیّہ کے قریب اس قبیلے کی قدیم جاے سکونت کا علم نہ تھا، جہاں سے زنگی اتابکوں نے انھیں شمال کی طرف دھکیل دیا تھا ۔ اس کے امرا عباسی ھونے کا دعوٰی کرتے تھے ۔ عزّ الدّین شیر (یزدان شیر نام کا معرب) پہلا امیر ھے جس کا ذکر شرف نامہ میں آیا ھے اور جو ۷۸۹ھ/ ۱۳۸۷ء میں تیمور کے مقابلے میں وان کے قلعے میں ڈٹا رہا تھا ۔ آق قویونلو کے عہد میں (الجزیرۃ کے) قبیلۂ دُنْبُلی نے ھکّاری کے مقبوضات چھین لیے، لیکن دز کے عیسائی (آشوری = نسطوری) اس خاندان کے ایک نو عمر رکن اسد الدّین زرّیں چنگ (سنہرے پنجے والا) کو واپس لانے کے لیے مصر گئے۔ بحال شدہ خاندان کو شَمْبو کا نام ملا (M. Garzoni : *Grammatica dellal ingua kurda*، روم ۱۷۸۷ء، ص ۴ : *Sciambo*) ۔ اسمٰعیل اوّل کے عہد میں شَمْبو کے رؤسا قلعہ بای (شَمْدینان میں) میں رہتے تھے۔ اس خاندان کا ایک فرد ووستان پر (وان کے جنوب مغرب میں) حکومت کرتا تھا، لیکن ووستان کے مغرب میں کواش کے ناحیے کے قبضے کے بارے روزکی کا ھکّاری سے جھگڑا تھا ۔ ھکّاری کی حکومت شمال میں اَلْباق تک پھیل گئی تھی ۔ حکومت عثمانیہ نے بوختان کے بدر خان بیگ کی بغاوت کے بعد خاندان ھکّاری کے آخری نمائندے نور اللہ بیگ کو معزول کر دیا اور ۱۸۴۵ء میں حلیمہ خانم نے باش قلعہ ترکوں کے حوالے کر دیا ۔ بیان کیا جاتا ھے کہ قبیلہ پِنْیانِش (کتاب مذکور، ۱ : ۹۷، ۱۰۰) جو آج بھی موجود ھے، ھکّاری کے قریب آباد تھا ۔

(۱۵) محمودی جاگیر ھکّاری کے شمال میں ان دریاؤں کے کنارے تھی جو وان اور اَرْچک کی جھیلوں میں گرتے ھیں ۔ یہاں کے فرمانروا (بوختان کے عباسی یا مروانی) جو ابتداءً یزیدی عقیدے کے پیرو ھونے کے مدعی تھے (شرف نامہ، ۱ : ۳۰۷) قرہ قویونلو کے عہد میں یہاں آباد ھوے اور چند ھی دنوں میں ان کی ھکّاری اور دنبلی سے جنگ چھڑ گئی ۔

(۱۶) دُنْبُلی بوختان کے ایک قبیلے سے تعلق رکھتے ھیں (شرف نامہ، ۱ : ۱۱۸، ۳۱۰ :

دُنْبلی بوخت، جو مدت تک یزیدی رہا) ۔ دُنبلی بعد میں آذربیجان آ گئے، جہاں انھیں خوی (اب : زورآوا) کے شمال مغرب میں سگمن آباد (Sögmanabad) جاگیر میں مل گیا ۔ آق قویونلو کے عہد میں دُنْبلی نے بای کا قلعہ (شَمْدِینان میں) اور ھَکّاری کا ایک حصہ فتح کر لیا تھا (کتاب مذکور، ۱: ۱۹۳) ۔ سگمن آباد میں ان کے اوجاق میں شاہ طہماسپ نے خوی کا اضافہ کر دیا ۔ سلطان سلیمان کے عہد میں دُنْبلی کو قُطُر [رک بآں] اور بارگیری مل گئے اور بعد ازاں انھوں نے اَلْبغا، سلیمان سرای (موجودہ سرای) اور چِلْدران کا بھی الحاق کر لیا ۔ زین العابدین شیروانی اپنی کتاب بستان السیاحۃ (انیسویں صدی عیسوی کے اوائل) میں لکھتا ہے کہ تمام دُنْبلی شیعی ھیں (دیکھیے اس کا ضمنی ذکر، شرف نامہ، ۱: ۳۲۱) اور ترکی بولتے ھیں ۔

(۱۷) برادوست ۔ اس کا حکمران خاندان گُورانی یا حَسَنویہی [رک بہ حَسَنْوَیہ] نسل سے تھا ۔ اس کے مقبوضات اُرمیہ کے مغرب میں واقع تھے ۔ ایک شاخ کی حکومت صُومای [رک بآں] میں تھی اور ایک اور شاخ کی ترگوِر اور قلعۂ داؤد میں ۔ برادوست کے بچے کھچے افراد اب شَمْدِینان کے جنوب میں رود بار برادوست (زاب کلاں کا ایک معاون جس کا منبع اُشْنُو کے مغرب میں واقع ھے) کے کنارے آباد ھیں ۔

(۱۸) اُسْتُونی ۔ قلمی نسخوں میں جو باب ناپید ھے، وہ یقیناً شَمْدِینان کے پہلے حکمران خاندان کے بارے میں ہوگا، جس کا صدر مقام ھَرکی کے ناحیے میں سُتُونی تھا (دیکھیے شَمْدِینان)

(۱۹) زَرْزا ۔ (دیکھیے زَرْزری، شہاب الدّین العمری کے مطابق) کی تاریخ جس کا ذکر شرف نامہ کے مقدمے میں کیا گیا ھے، متن میں موجود نہیں ۔

(۲۰) ترزا ۔ قلمی نسخوں میں متعلقہ عبارت محذوف ھے اور ھمیں اس قبیلے کے بارے میں کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ۔

فریق د ۔ ھکّاری کے جنوب میں

(۲۱) عَمادیہ [رک بآں] ۔ یہ بیان کیا جا چکا ھے کہ عَمادیہ کا قصبہ ایک قدیم قلعے کے محل وقوع پر عماد الدّین زنگی (۵۲۱ تا ۵۴۱ھ) کے حکم سے بسایا گیا تھا ۔ معلوم ھوتا ھے کہ بَہْدِینان کا مقامی خاندان جس کا ذکر شرف نامہ میں آیا ھے، اس ملک میں زنگیوں کے عہد کے اختتام پر (ساتویں/آٹھویں صدی میں) آباد ھوا ھوگا ۔ عمادیہ کے سردار اپنے علوم دینی میں شغف کی وجہ سے مشہور تھے ۔ شرف نامہ میں ان شیوخ کے نام درج ھیں جو تیموری عہد میں تھے ۔ بعد ازاں (اسمعیل اول کے عہد میں) بَہْدِینان نے ضلع زاخو کو جس میں سِندی اور سلیمانی آباد تھے، اپنی مملکت میں شامل کر لیا، اس ضلع کو کسی زمانے میں ایک علٰحدہ جاگیر (ولایت سِندیان) کی حیثیت حاصل تھی ۔ اس طرح بَہْدِینان کی ولایت میں اس پہاڑی علاقے کا پیشتر حصہ شامل ھوگیا تھا جو موصل کے شمال میں واقع ھے (کوہ گارہ، وغیرہ) ۔

(۲۲) طاسِنی (داسِنی) : قلمی نسخوں میں اس اھم یزیدی قبیلے سے متعلقہ باب موجود نہیں، البتہ متن کے اندر عبارات میں ضمناً یہ ذکر ملتا ھے کہ امرائے عَمادیہ نے سنجاق تاسنی میں سے دُھوک چھین لیا (۱: ۱۰۹) اور یہ کہ ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء میں سلطان سلیم اول نے سنجاق اُربیل اور سُہْران کی پوری ولایت ایک یزیدی سردار، حسین بیگ داسنی کو عطا کر دی تھی جس سے سُہْران سے ایک خونریز جنگ کا آغاز ھو گیا (۱: ۲۷۴ تا ۲۷۷) ۔ اس جنگ کا خاتمہ یوں ہوا کہ سہران اپنی آبائی جاگیر دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ھو گئے اور حسین بیگ کو قسطنطینیہ میں سزائے موت دی گئی ۔

جو علاقہ داسین کے نام سے مشہور تھا، اس کے بارے میں دیکھیے Hoffmann : *Auszüge*، ص ۲۰۲ تا ۲۰۷.

(۲۳) سُہران (سرخے) : بغداد کے ایک عرب چرواھے کَاؤس کی اولاد تھے جو آوان کے ناحیے (علاقۂ سُہران) کے ایک گاؤں ھودیان میں بھاگ آیا تھا ۔ اس کا بیٹا بَلَکان (روان دز کے مشرق میں) کا امیر بن بیٹھا اور اس نے آوان کے قلعے پر قبضہ کر لیا ۔ سہران کا صدر مقام حَرِیر (روان دز کے نیچے، زاب کلاں کے معاون دریا پر) تھا جسے کو ان کی عمارات نے شاندار اور مزیّن کر رکھا تھا (Rich : *Narrative*، ۱ : ۱۵۷) ۔ تقریباً ۱۰۰۵ھ تک بھی سُہران ایک طاقتور قبیلہ تھا، لیکن آگے چل کر اپنے پڑوسیوں کے حملوں کا شکار ہو گیا اور اس کے زوال سے بابان نے فائدہ اٹھایا (*Narrative*، ۱ : ۱۵۷) .

(۲۴) بابان : اس نام کا اطلاق درحقیقت کئی خاندانوں پر ھوتا ھے جو یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آئے ۔ ان کی بڑی جاگیر زاب کوچک کے جنوب میں واقع تھی اور اس کا صدر مقام شارِ باژیر تھا، لیکن ۱۱۹۹ھ/۸۴-۱۷۸۳ء میں بابان نے ایک نیا دارالحکومت سلیمانیہ [رک باں] تعمیر کیا .

(۲۵) مُکْری : جو جھیل اُرمیہ کے جنوبی علاقے پر قابض ھیں [تفصیل کے لیے رک بہ ساوج بولاق] قبیلۂ بابان سے ٹوٹ کر الگ ھو گئے تھے .

(۲۶) بانہ : سرداران اختیار الدّین نے لقب اختیار الدّین اس لیے پسند کیا تھا کہ وہ اپنی مرضی (اختیار) سے مشرف بہ اسلام ھوے تھے [تفصیل کے لیے رک بہ ساوج بولاق] .

(۲۷) اَرْدَلان [رک بہ اَرْدَلان، شہرزُور، سِنّۃ، سِیْسَر] .

(۲۸) کَلْ باغی : (شرف نامہ، ۲ : (ضمیمہ ۳۶ تا ۴۵، ضمیمہ کا اضافہ ۱۰۹۲ھ میں کیا گیا) ۔ ان کے سردار عباس آغا کو جو ترک قبیلے اُسْتاجلو میں سے تھا، بیگہ بیگ اَرْدَلان (۹۰۰ تا ۹۴۲ھ) نے مَرِیْوان [رک بہ سِنّہ] میں "پانی کا ایک چشمہ" عطا کیا ۔ بعد ازاں عباس آغا نے کَلْہُر کی ایک سابقہ جاگیر بِیلاَور میں سکونت اختیار کر لی ۔ اس کی جماعت مختلف قبائل میں سے بھرتی کی گئی تھی ۔ شاہ طہماسپ نے بیلاور اور "دوازدہ اویماق" پر اس کی حکومت کی توثیق کر دی .

بعد ازاں باب عالی خان کَلْباغی کو کِرِنْد، شَیْخان، چِکَران (؟)، خور خورہ اور زند وغیرہ پر مشتمل سنجاق عطا کی اور یار اللہ کو اَرَکلہ (؟)، رنگرزان اور سُہبانان (؟) کی تیمار ملی .

کَلْہُر (کَلْہُر) : یہاں کے سردار گودَرز بن گِیو کی نسل سے ھونے کے دعویدار تھے جس کا ذکر ایران کے رزمنامے [فردوسی : شاہ نامہ] میں آیا ھے ۔ عشیرت کلہر کو گوران کہتے تھے (۱ : ۳۱۷)، لیکن بعض قلمی نسخوں میں "کَلْہر و گوران" بھی آیا ھے (شرف نامہ، ۲، (ضمیمہ) : ۶) ۔ کلہر کی تین شاخیں تھیں، یعنی پَلَنگان [رک بہ سنّہ]، درتنگ (رک بہ زُھاب) اور ماھی دشت [رک بہ کرمان شاہ] کی .

درنہ اور درتنگ (آج کل ریجاب، ضلع زھاب میں) کے سرداروں کے مقبوضات اور قدیم حلوان [رک باں] بقول شرف الدّین، ۱ : ۳۱۹، آپس میں مطابقت رکھتے تھے ۔ ۱۰۰۵ھ کے قریب قباد بیگ کا اقتدار دِینَور اور بیلاوَر سے بغداد تک پھیل گیا ۔ کَلْہر کی تیسری شاخ کی آبائی جاگیر (اوجاق) ماھی دشت اور بیلاوَر (درہ مُرواری کے جنوب میں) پر مشتمل تھی ۔ ماھی دشت شاخ خانہ بدوش تھی ۔ ان تمام امور سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ھے کہ

رشید الدّین کی مہیا کردہ معلومات کیوں ناکافی ہیں ۔ آج کل گوران اپنی آبائی جاگیر پر قابض ہیں، لیکن قبیلۂ کلہر کے قبضے میں وہ علاقہ ہے جو بغداد سے کرمان شاہ جانے والی شاہراہ کے جنوب میں واقع ہے ۔

فریق ۲ - ایرانی کرد

شرف نامہ میں اس فرقے کا بیان جو ایران کے کردوں سے متعلق ہے، کچھ زیادہ واضح نہیں ۔ مصنف اسے اس زمانے میں قلمبند کر رہا تھا جب ایرانی، ترکی سرحد متعین نہیں ہوئی تھی ۔

ایران کے بڑے قبیلوں کی تعداد تین تھی : سیاہ منصور، چِگنی اور زَنْگَنہ ۔ ان کے نام ان تین بھائیوں کے نام سے مأخوذ ہیں جو لرستان یا "گُوران و اَرْدَلان" سے آئے تھے ۔ ان قبائل کے علاوہ اور خرد تر قبائل کے جن کا ذکر شرف الدّین نے کیا ہے، قرہ باغ (ماوراے قفقاز میں) کے ۲۴ (یکرمی ذات) قبیلے اور تھے جن کے افراد کی تعداد تیس ہزار تھی اور وہ سب ایک فرمانروا کے ماتحت تھے، اور خراسان کا ایک قبیلہ گیل تھا، بعض اور قبیلے بھی تھے جن کی کچھ اہمیت نہیں تھی ۔

قبیلۂ سیاہ منصور : شاہ طہماسپ کے عہد میں اس کا شیخ ایران کے تمام کردوں کا (جو ۲۴ قبائل سے زیادہ تھے) امیر الامرا بن گیا تھا ۔

چِگنی کا ایک حصہ غَرچِستان میں ہجرت کر گیا ۔

قبیلۂ زَنْگَنہ (زنگنہ) نے العراق اور خراسان میں ناموری حاصل کی - ۱۶۵۰ سے ۱۷۳۰ء تک شرف الدّین نے جسے کردستان عظیم کہا ہے (اور جس کا تصور یہ ہے کہ وہ خود مختار کرد ریاستوں کے ایک سلسلے پر مشتمل تھا) اس کی وسعت میں وان اور دیار بکر کی سنجاقوں میں ترکی حکومت قائم ہونے کی وجہ سے، پہلے ہی کمی آ چکی تھی ۔ صرف ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء کے معاہدے ہی سے ایرانی حکومت کی مغرب کی جانب مزید توسیع ختم نہیں ہوئی بلکہ ترکی نے صفوی [بادشاہ صفی اول (م ۱۶۴۲)] کے عہد میں ایران کے مغربی صوبوں نیز ماوراے قفقاز پر دوبارہ قبضہ کر لیا (von. Hammer : *G.O.R*، طبع دوم، ۳ : ۲۳۵) - اس طرح حکومت عثمانیہ کے ماتحت عملی طور پر تمام کرد یکجا ہوگئے - اب چونکہ ایرانیوں سے کسی قسم کا خدشہ نہ رہا تھا، اس لیے ترکوں نے بڑے قاعدے سے سب کو ایک مرکز کے گرد اکٹھا کرنے کا کام شروع کر دیا ۔

سب سے پہلے مراد چہارم کے عہد میں ہمیں ملک احمد پاشا کا ذکر ملتا ہے جسے ۱۶۳۸ء میں دیار بکر کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا ۔ اس نے سنجار کے یزیدیوں پر چڑھائی کی - بعد ازاں (۱۰۶۵ھ/۱۶۵۵ء) میں اسی پاشا نے وان میں اپنے تبادلے کے بعد اس علاقے کے تمام کردوں کو مطیع کیا ۔

۱۶۶۶ء میں ایک کرد نے جو کسی شیخ کا بیٹا تھا، اپنے [امام] مہدی ہونے کا اعلان کر دیا، لیکن موصل اور عمادیہ کے حاکموں نے اسے گرفتار کر لیا ۔ سلطان محمد چہارم نے اس خود ساختہ مہدی کو اپنی ذاتی ملازمت میں لے کر اس معاملے کو بغیر کسی جنگ و جدال کے نمٹا دیا (v. Hammer، ۳ : ۵۸۹) ۔

شاہ حسین کے عہد میں جو ایک کمزور بادشاہ تھا، العراق کے کردوں نے ۱۷۱۹ء میں ہمدان کا محاصرہ کر لیا اور لوٹ مار کرتے ہوئے دارالحکومت تک پہنچ گئے - ۱۷۲۲ء میں شاہ طہماسپ دوم کے حکم سے ایک کرد شیخ فَنْدُن (فریدون ؟) نے اصفہان کو جس پر افغانوں کا قبضہ

ہو چکا تھا، دوبارہ لے لینے کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش ارمنی محلے پر ایک حملے تک محدود رہی۔ افغانوں نے قندن کو پسپا کردیا اور اس نے واپس اپنے علاقے میں جا کر ترکوں کی اطاعت قبول کر لی (A Historical Account of the British : Hanway Trade، ۱۷۵۳ء، ج ۳) - قسمت نے صفویوں کا ساتھ چھوڑ دیا چنانچہ عباس قلی خان اردلان تک نے حسن پاشا کی اطاعت قبول کر لی (v. Hammer، ۴ : ۲۱۱ ؛ نیز دیکھیے RMM ، ۴۹ : ۸۷) - جوان رود، دزنہ، جاف، ہرسین کے سرداروں نے اور بالآخر سپہ سالار علی مردان بختیاری (فیلی ؟) نے اس کی مثال کی تقلید کی (v. Hammer، ۴ : ۲۲۷) .

افغان، اصفہان میں : افغان حکومت کے خونریز اور عبوری دور میں اشرف نے ترکوں کو شکست دی (جنگ انجیدان، ۱۷۲۶ء میں) جن کی صفوں میں بیک سلیمان اوغلو (سلیمان بابان) کے ماتحت ۲۰ ہزار کرد تھے - ترکوں نے اس شکست کی ذمے داری کردوں کے طرز عمل پر ڈالی، جنھیں اشرف نے بڑے بڑے وعدوں سے سبز باغ دکھائے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ شکست سے کچھ ہی دیر پہلے بعض کرد، افغانوں سے جا ملے تھے۔ اپنی ابتدائی کامیابی کے باوجود اشرف نے اگلے ہی سال، یعنی ۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۷ء میں مغربی ایران جس میں کرد اور لر اضلاع بھی شامل تھے، ترکوں کے حوالے کر دیے اور اس کے عوض حقوق بادشاہی دوبارہ حاصل کر لیے .

نادر شاہ سلطان احمد ثالث کے عہد کے اواخر ایام میں صورت حال میں انقلاب آنے لگا - معاہدہ ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۲ء کی رو سے ایرانیوں کو مغربی صوبے واپس مل گئے اور چند ہی دن میں نادر نے ترکی مملکت پر حملہ کر دیا اور بغداد کے دروازوں تک جا پہنچا - ترکوں نے کرد دستوں کی مدد سے اس کی پیش قدمی روکنے کی ناکام کوشش کی، تاآنکہ ۱۷۳۳ء میں طوپال عثمان پاشا کرد امدادی فوجیں لے کر، جنھیں اس نے موصل میں بھرتی کیا تھا، میدان میں نکلا - نادر نے شکست کھائی - ۱۷۳۴ء میں اسے قفقاز کے معرکوں میں کامیابی ہوئی اور اس نے تفلس پر قبضہ کر لیا جہاں ۶ ہزار کردوں پر مشتمل ایک حفاظتی دستہ متعین تھا - ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء کے صلح نامے کی رو ۱۰۴۹ھ/۱۶۲۹ء کی قدیم سرحدیں دوبارہ قائم ہو گئیں - ۱۷۴۳ء میں نادر نے دوبارہ ترک علاقے پر حملہ کیا، لیکن کردوں اور عربوں کی امداد کے باوجود اسے سِنّہ تک پسپا کر دیا گیا جہاں اسے بالآخر شکست ہوئی (کتاب مذکور، ۴ : ۳۱۷، ۳۹۸ تا ۳۹۹) .

نادر کردوں میں مقبول نہیں تھا، اگرچہ اس کی طوپال عثمان پاشا سے لڑائی کے بارے میں گورانی بولی میں ایک رزمیہ نظم ملتی ہے - نادر نے اردلان کے سردار سبحان وِردی خان کی جگہ اس کے بھائی کو مقرر کر دیا تھا جس کے باعث ایک عوامی شورش برپا ہوئی (RMM، ۴۹ : ۸۸) - ۱۷۴۷ء میں ترکمانوں کی ایک بغاوت کے دوران میں خراسان کے کردوں (چمشگزک، قرہ چولی) نے نادر کو مدد دینے سے انکار کر دیا جس پر نادر نے انھیں سزا دی اور انھیں مشہد میں منتقل کر دیا - ۱۷۴۷ء میں نادر خراسان کے باغی کردوں کو پور سزا دینے جا رہا تھا کہ راستے میں قتل ہو گیا (Histoire de Nadir : Jones، لنڈن ۱۷۷۰ء، ص ۱۱۸ تا ۱۲۰) - نادر کی وفات کے بعد جو طوائف الملوکی پھیلی، اس میں کردوں (دُنبلی وغیرہ) نے بھی حصہ لیا، لیکن باب عالی نے اس میں دخل دینے سے احتراز کیا .

خاندان زند : نادر شاہ کے انتقال کے بعد

کریم خان زند [رک بآں] نے جس کا شمار ایران کے بہترین فرمانرواؤں میں ہوتا ہے، ملک کے بیشتر حصے پر حکومت کی ۔ زند ایک کرد قبیلہ تھا جسے ثانوی اہمیت حاصل تھی (شرف نامہ، ۱ : ۳۲۳) ۔ یہ قبیلہ ہمدان اور ملایر کے درمیان اس ضلع میں آباد تھا جس کا نام پہلے ایغار تھا ۔ نادر کے عہد میں یہ لوگ خراسان میں منتقل کر دیے گئے تھے، لیکن اس کی موت پر وہ اپنے آبائی وطن میں واپس چلے آئے (تاریخ زندیہ : طبع Beer : ص Xviii 'Xi) ۔ ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں لطف علی خان کی وفات کے ساتھ اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا ۔ در حقیقت زند قبیلہ اتنا کمزور تھا کہ وہ اس خاندان کو کچھ زیادہ مدد نہیں دے سکتا تھا، لیکن کریم خان نے اپنے پیش روؤں کی مثال پر عمل کرتے ہوئے کئی کرد قبائل کردستان سے شیراز میں بلوا لیے تھے (احمد آوند : R M M، ج ۳۸، کوروُنی : جو شیراز کے ایک مخصوص محلے میں رہتے تھے، O.Mann : *Die Tajik Mundarten d. Provinz Fars*، برلن ۱۹۰۹ء، ج ۲۹) .

خاندان قاجار : آغا محمّد شاہ قاجار کی وفات (۱۲۱۱ھ/۱۷۹۷ء) پر صادق خان شقاقی نے تاج شاہی کے جواہرات پر قبضہ کر لیا اور کچھ مدت تک تخت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا (*The Dynasty of the Kajars*، مترجمۂ Harford Jones Brydges، لنڈن ۱۸۳۳ء، ۲۰، ۲۷ تا ۳۲، ۳۷، ۵۰، ۷۸، ۱۰۶؛ R. G. Watson : *A History of Persia*، لنڈن ۱۸۶۶ء، ص ۱۰۷، ۱۱۵، ۱۲۵)۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۵ء میں ایرانیوں نے سُلیمانیہ [رک بآں] کے عبدالرّحمٰن پاشا کی حمایت میں حصہ لیا تھا (Rich : *Narrative*، ۱ : ۳۸۳؛ Watson، کتاب مذکور، ص ۱۵۵ اور مُکری کرد گیت، در مجموعۂ مرتبۂ O. Mann، شمارہ ۱۶) ۔ ۱۲۳۶ھ/

۱۸۲۱ء میں کرد قبائل حیدرانلو اور سپکان کی شورشوں سے جو حالات پیدا ہوگئے تھے ان کی وجہ سے ایرانیوں نے ترکی مملکت پر حملہ کیا اور بدلیس اور مُوش تک بڑھ گئے اور اسی زمانے میں کرمان شاہ کی شاہراہ پر شہرابان تک، جو بغداد کے نزدیک واقع ہے، بڑھ آئے ۔ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء میں ارزروم میں صلح نامے پر دستخط ہوے جس کی رو سے ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء کی سرحدیں دوبارہ قائم ہوئیں، لیکن ایرانیوں نے ضلع زہاب کے (جہاں کرد آباد تھے) چھوڑ دینے سے انکار کر دیا ۔ سلیمانیہ کی قسمت کا فیصلہ معلق رہا ۔ ۱۸۴۲ء میں ایک نئی لڑائی چھڑنے ہی والی تھی کہ برطانیۂ عظمٰی اور روس بیچ بچاؤ کرانے کے لیے سامنے آگئے اور ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں ارزروم کے مقام پر ایک نیا معاہدہ طے پایا جس کی رو سے زہاب دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اس کے بدلے ایران ترکی کے حق میں سلیمانیہ پر اپنے تمام حقوق سے دست بردار ہوگیا ۔ ۱۸۴۸ سے ۱۸۵۲ء تک چار طاقتوں پر مشتمل ایک کمیشن نے سرحدوں کا دورہ کیا، لیکن ترکی نمائندے درویش پاشا کے رویّے کے باعث کوئی معاہدہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا ۔ درویش پاشا نے نہ صرف قُطور کے ضلع پر اپنے سپاہیوں کا قبضہ کرایا، بلکہ ایک خفیہ یاد داشت میں (جو ۱۲۸۶ھ اور ۱۳۲۱ھ میں قسطنطینیہ سے شائع ہوئی) یہ نظریہ پیش کیا کہ جھیل اُرمیہ کے جنوب اور مغرب میں جتنے کرد اضلاع ہیں، ان پر ترکی کا حق ہے .

ترکی انیسویں صدی میں : ۱۸۲۶ء میں رشید محمّد پاشا والی سیواس کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ کردوں کے درمیان امن و امان قائم کرے اور کردستان میں ترکی حاکم مقرر کرے ۔ ۱۸۳۰ء کے قریب کئی مقامات پر کردوں نے زبردست بغاوت کر دی ۔ اس بغاوت کے سرغنہ بدر خان اور

سعید بیگ، اسمٰعیل بیگ اور محمّد پاشا والی رواں دز تھے۔ ۱۸۲۰ء (۱۸۲۰ء؟) کے لگ بھگ محمّد پاشا نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور خُشناؤ کے قبائل پر حملہ کیا، ۱۸۳۱ء میں اس نے اَربیل آلتون کُوپرو، کوی سنجاق اور رانیہ پر قبضہ کر لیا ۔ اگلے سال اس نے اپنی فوج موصل کی جانب بڑھائی ۔ بعد ازاں اس نے عَکرہ، زِیبا اور عَمادیہ فتح کیے ۔ ۱۸۳۳ء میں رواں دز کے فوجی دستے اندرون ملک میں زاخو اور الجزیرہ تک بڑھتے چلے گئے تاکہ وہاں دوبارہ بدر خان کی حکومت قائم کی جا سکے ۔ کئی موقعوں پر یزیدیوں کو بڑی سخت سزائیں دی گئیں اور قویون جق کی پہاڑی پر یزیدیوں کی ایک پوری جماعت کو تہ تیغ کر دیا گیا ۔ ۱۸۳۵ء میں بغداد، موصل اور سیواس سے ترک فوجیں محمّد پاشا کے مقابلے میں بھیجی گئیں اور ۱۸۳۶ء میں رواں دز کا امیر ایک حیلے سے گرفتار کر لیا گیا ۔ ان بغاوتوں اور ان کے فرو کرنے کا سلسلہ اس کے بعد بھی کئی سال تک جاری رہا (دیکھیے Poujoulat : *Voyages*، ۱ : ۳۷۳؛ Moltke : *Briefe*، برلن ۱۸۴۱، ص ۲۵۹ تا ۲۸۴) ۔

جب نِزِیب کے مقام پر مصریوں نے ترکوں کو شکست دی (۱۸۳۹ء) تو کردستان میں نئے سرے سے شورشیں ہونے لگیں ۔ ۱۸۴۳ء میں ھکّاری کے نور اللہ بیگ اور الجزیرہ کے بدر خان کی بغاوت کا آغاز ہوا ۔ ھکّاری کے نسطوریوں نے نور اللہ بیگ کے جبرو تشدد کے خلاف موصل میں اپنی شکایت پیش کر رکھی تھی۔ اس کے جواب میں نور اللہ بیگ نے بَرواری کے نسطوری ضلع کو تاخت و تاراج کیا ۔ کئی سال تک قتل عام جاری رہا اور کہا جاتا ھے کہ مقتولین کی تعداد دس ھزار تک پہنچ گئی ۔ [مغربی] طاقتوں کے نمائندوں نے قسطنطینیہ میں عرضداشت پیش کی اور ۱۸۴۷ء میں عثمان پاشا کے ماتحت ایک بہت بڑی فوج نے کردوں پر حملہ کیا ۔ بدر خان اور نور اللہ نے کئی مقامات پر شکست کھا کر ہتیار ڈال دیے اور کردستان سے جلاوطن کر دیے گئے (دیکھیے Layard : *Nineveh*، باب ۷؛ *Revue de L' Orient Chrétien*، ۱۹۰۰ء، ۵ : ۶۴۹ تا ۶۵۳؛ Addai Scher، در *JA*، ۱۹۱۰ء، محل مذکور؛ کردوں اور نسطوریوں کے عام حالات و واقعات کے بارے میں، دیکھیے Grant : *The Nestorians*، نیویارک ۱۸۴۱ء؛ Badger : *The Nestarians*، لنڈن ۱۸۵۲ء؛ Perkins : *A residence of 8 yrears .... among the Nestorian Christians*، نیویارک ۱۸۵۲ء؛ Sandreezki : *Reise nach Mosul*، Stuttgart ۱۸۵۷ء؛ Riley : *Christians and Kurds*، در *Contemporary Review*، ستمبر ۱۸۸۹ء؛ Heazell : *Kurds and Christians*، لنڈن ۱۹۱۳ء؛ Wigram : *The cradle of mankind*، لنڈن ۱۹۱۴ء؛ Rockwell : *The Pitiful Plight of the Assyrian Christians*، نیویارک ۱۹۰۶ء؛ H. Luke : *Mosul and its minorities*، لنڈن ۱۹۲۵ء) ۔

روس اور ترکی کی جنگیں : ۱۸۰۴ تا ۱۸۰۵ء میں روسیوں کے کردوں سے روابط قائم ہوئے اور جلد ھی اس کا اثر نمودار ہونے لگا ۔ ۱۸۲۸ سے ۱۸۲۹ء تک، ۱۸۵۳ سے ۱۸۵۸ء تک اور ۱۸۷۷ سے ۱۸۷۸ء تک روسیوں اور ترکوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں اور ہر ایک کے اثرات کردستان پر بڑے دور رس ثابت ہوئے (اس مسئلے کا خصوصی مطالعہ، Averianov : *Kurdi v. voinakh Rossii*، تفلس ۱۹۰۰ء) ۔ ۱۸۲۹ء ھی میں روسیوں نے ایک کرد رجمنٹ بھرتی کر لی تھی ۔ عیسائیوں کے جلاوطن کر دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی کے بعد کرد شمال اور مغرب کی طرف خاصی

دور تک پھیلنے لگے ۔ جنگ قریم (کریمیا) کے دوران میں روسیوں نے کردوں کی دو رجمنٹیں بنائیں ۔ دوسری طرف، جب ترک شمال کی طرف روانہ ہوگئے تو بوھتان میں ایک خاصی شدید بغاوت رونما ہوگئی جس کی قیادت بدر خان کے سابق حریف اور اس کے ہر دلعزیز بھتیجے یزدان شیر کے ہاتھ میں تھی ۔

جنگ ۱۸۷۷ تا ۱۸۷۸ء کے فوراً بعد بہدینان اور بوھتان کے ھکاری کردوں کی بغاوت رونما ہوئی جس کی رہنمائی اول بدر خان کے بیٹوں کے ہاتھ میں رہی اور پھر یہ بغاوت شیخ عبیداللہ نقشبندی کی بغاوت میں مدغم ہوگئی ۔ ۱۸۸۰ء میں کرد حملہ آوروں نے ایرانی اضلاع، اُرمیہ، ساوج بُلاق، مِیَندوآب اور مَراغہ میں غارتگری کی اور خود تبریز کو خطرہ لاحق ہوگیا ۔ اس کا وبال زیادہ تر شیعیوں پر پڑا ۔ روس نے سرحد سر دریا (Araxes) کی حفاظت کے لیے اپنی فوج کا ایک دستہ بھیج دیا ۔ ایران نے بڑی تعداد میں فوجیں بھرتی کیں جن میں ماکو [رکّ باں] کا رسالہ بھی شامل تھا ۔ ترکی نے جو اس وقت روس کے خلاف جنگ سے بمشکل فارغ ہوا تھا، کوشش کی کہ کسی قسم کی الجھنوں میں نہ پھنسے ۔ بالآخر شیخ شمدینان واپس آ گیا اور وہاں سے اسے زیر حراست قسطنطینیہ بھیج دیا گیا ۔ وہ دارالخلافہ سے تھوڑے ہی دن میں فرار ہوگیا اور قفقاز کے راستے شمدینان لوٹ آیا، لیکن دوبارہ پکڑا گیا اور اس نے ۱۸۸۳ء میں مکۂ معظمہ میں وفات پائی ۔

حمیدیہ دستے : ۱۸۷۸ء کے بعد ترکی کی حکومت کمزور ہوگئی ۔ معاہدۂ برلن کی شق ۶۱ کی رو سے آرمینیا میں اصلاحات اور کردوں اور چرکسوں سے اس کی حفاظت کی ذمّے داری کی قرار داد طے پائی، حکومت ترکی کی طرف سے اصلاحات کے خلاف بڑے شدید رد عمل کا اظہار ہوا، اور ۱۸۸۵ء سے ارمنی انقلابی تحریک کی نشو و نما شروع ہوئی اور اس کی شاخیں روس، سوئٹزر لینڈ اور لنڈن میں قائم ہوگئیں ۔ ان تمام امور کی بنا پر کردوں اور ارمنیوں کے تعلقات پیچیدہ اور کشیدہ ہونے لگے جو قبل ازیں کم سے کم اس لحاظ سے پر امن ہو چکے تھے کہ ارمنیوں نے کرد جاگیرداروں کی سیادت کے سامنے سر تسلیم خم کر رکھا تھا ۔ ۱۸۹۱ء کے لگ بھگ شاکر پاشا کے، جسے بعد ازاں آناطولی میں اصلاحات بروےکار لانے کا کام سونپا گیا، دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ رُوسی قزاقوں (Cossacks) کی طرح کردوں کی بے قاعدہ رجمنٹیں بنائی جائیں ۔ اس اصلاحی تجویز کی غرض و غایت یہ تھی کہ کردوں کی تربیت کی جائے اور انھیں حکومت عثمانیہ سے وابستہ کر دیا جائے ۔ اس کوشش کو اطمینان بخش خیال نہ کیا گیا کیونکہ آگے جاکر حمیدیہ دستے باقاعدہ فوج (خفیف سواری) میں تبدیل کر دیے گئے ۔ بہر حال حمیدیہ کی تشکیل میں کردوں کو جو حصہ ملا اور ان سے جو توقعات پیدا ہوئیں، اس سے خاصا جوش پیدا ہوگیا؛ یہاں تک کہ قبائل کے درمیان خونریز جھگڑے بھی رو نما ہوے ۔

ارمنی کرد تعلقات : اسی زمانے میں ارمنیوں اور کردوں (یورپی سفارت خانوں کی ایک اصطلاح کی رو سے "خشکی تری کے دو بھائی") کے درمیان تعلقات بد سے بدتر ہو رہے تھے ۔ ۱۸۹۴ء کا موسم گرما صاصون کے مقام پر خونریز جھڑپوں کے لیے مشہور ہے ۔ ان کا خاتمہ پانچ دیہات اور تلوری (Dalvorikh) کے پورے ضلع کی تباہی پر ہوا جہاں ارمنی آباد تھے ۔ صاصون کے ان واقعات سے ارمنیوں کے مظاہروں اور انھیں خونریز جنگوں کے ذریعے فرو کرنے کے ایک طویل سلسلے کا آغاز ہوا

جس میں کردوں نے عملاً حصہ لیا ۔ ۱۸۹۵ء میں ھکّاری کردوں کے درمیان ایک شورش برپا کرنے کی کوشش ھوئی، لیکن اسے بہت جلد دبا دیا گیا ۔ اس شورش کا نشانہ عیسائی نہیں تھے ۔ بیسویں صدی کے آغاز سے جنگ عظیم تک ارمنیوں اور کردوں کے باھمی تعلقات خاصے پر امن نظر آتے ھیں ۔ اس مسئلے پر عام معلومات کے لیے دیکھیے Abowian : *Kurdi*، در جریدۂ *Kawkaz*، تفلس ۱۸۴۸ء، شمارہ ۴۶، ۴۷، ۴۹، ۵۰، ۵۱ (جہاں "بابائے ادب ارمنی" نے کرد کردار کی بڑی دل نشین تصویر پیش کی ھے) ۔

مآخذ : (۱) Creagh : *Armenians, Koords and Turks*، لنڈن ۱۸۸۰ء؛ (۲) A. S. Zelenoy : *Zapiska k karte raspredeleniya armiansk. naseleniya, Zapis. Kawkaz. Otd. Geogr. Obshč.*، تفلس ۱۸۹۵ء، ج ۱۸؛ (۳) Vambery : *Armenier u. Kurden*، *Deutsche Rundschau* (۱۸۹۰ء) ۸۶ : ۲۱۶ تا ۲۳۱؛ (۴) Rohrbach : *Armenier u. Kurden, Verhand d. Gesell f. Erdkunde*، برلن ۱۹۰۰ء، ص ۱۲۸ تا ۱۳۳؛ (۵) Contenson : *Chrétiens et Musulmans*، پیرس ۱۹۰۱ء؛ (۶) Lynch : *Armenia*، بمواضع کثیرہ؛ (۷) Mayewski : *Opisaniye Wanskago i Bitils Wilayetow*، تفلس ۱۹۰۴ء (مستند کتاب)؛ (۸) N. Marr : *Yeshce o Slove "Celebi" Zap.*، ۱۹۱۰ء، ج ۲۰؛ (۹) Zarzecki (قنصل فرانس متعینۂ وان) : *La question kurdo-armenienne* و *La Revue de Paris*، شمارہ ۱۵ اپریل ۱۹۱۴ء؛ اور (۱۰) سفارتی خط و کتابت، طبع در "Livres jaunes"؛ (۱۱) پارلیمنٹ کی رپورٹیں (Blue Books) اور Russian Orange Book بابت ۱۹۱۴ء ۔

بیسویں صدی : بیسویں صدی کے آغاز میں کردوں کے افق پر ایک نئی شخصیت کا ظہور ھوا جس کا کردوں کے عام مراکز عمل سے کوئی تعلق نہ تھا : یہ ابراھیم پاشا بن محمود بن تِمّوی بن ایّوب ضلع شیرویران (دیار بکر اور حلب کے درمیان) کے قبیلۂ مِلّی (مِلان) کا سردار تھا ۔ ابراھیم پاشا نے قریب قریب اپنی ایک خود مختارانہ حیثیت قائم کر لی تھی ۔ جب ۱۹۰۸ء کے دستور کا اعلان ھوا تو اس نے کھلم کھلا بغاوت کر دی اور کوھستان عبدالعزیز میں چلا گیا اور وھاں مارا گیا (M. Wiedemann : *Ibrahim Pascha's Glück*، *Asien und Ende*، ۱۹۰۰ء، ۸ : ۳۴ تا ۳۷، ۵۲ تا ۵۴ اور M. Sykes : *The Caliph's Last Heritage*، ص ۳۱۷ تا ۳۲۷) ۔

جب ترکی اور ایران کی سرحد کا مسئلہ دوبارہ زیر بحث آیا تو کردوں میں خاصی ھاچل مچ گئی۔ مشرق بعید میں روسیوں کی روک تھام (جنگ روس و جاپان) کے بعد ۱۹۰۵ء میں ترکی نے اُرمیہ اور ساوج بلاق کے متنازع فیہ اضلاع پر جہاں کرد آباد تھے، قبضہ کر لیا ۔ اس سے کرد ایک بڑی پیچیدہ سیاسی چال میں پھنس گئے ۔ ترکوں کا قبضہ جنگ بلقان کے شروع ھونے پر (اکتوبر ۱۹۱۲ء میں) ختم ھوا ۔ لیکن فوراً ان کی جگہ روسی دستے خوی اور اُرمیہ کے اضلاع میں گھس آئے ۔ کرد قبائل کے معزز نوجوان روس میں سیر و سیاحت کرنے لگے ۔ ۱۷ نومبر ۱۹۱۳ء کو قسطنطینیہ میں حد بندی کی ایک دستاویز پر دستخط ھوے اور جنگ عالمگیر کے آغاز سے کچھ ھی دن قبل چار طاقتوں (ترکی، ایران، انگلستان اور روس) کے ایک کمیشن نے سرحد کا جھگڑا طے کرنے میں کامیابی حاصل کی اس صورت سے کہ عموماً وھی سرحدیں دوبارہ قائم کر دیں جو انیسویں صدی کے آغاز میں تھیں (دیکھیے Minorsky : *Turetsko-persidsk. razgraniceniye, Izvestia Russ. Geogr. Obsh.*، پیڑوگراڈ ۱۹۱۶ء، ۵۲ : ۳۵۱ تا ۳۹۲) ۔

جنگ ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء : اس جنگ کے دوران میں کرد دو طرف سے زد میں آ گئے ۔ اسمعیل آغا سِمکو کی کارروائیوں کے بارے میں [رک بہ شکاک] . . . کردستان کے بارے میں اتحادیوں کی تجاویز (مارچ ۱۹۱۶ء) کے لیے دیکھیے دستاویزات، در *Razdel Aziatskoi Turtsii*، ماسکو ۱۹۲۴ء، ص ۱۸۵ تا ۱۸۷، ۲۲۵ .

۱۹۱۷ تا ۱۹۱۸ء کے بعد صورت حال میں ایک اساسی تغیر رونما ہوا ۔ کردوں کی جمعیتیں ہر جگہ قائم ہو گئیں (دیکھیے *Report on* : Driver *Kurdistan*، Mount Carmel، فلسطین ۱۹۱۹ء، یہ کتاب برٹش میوزیم میں ہے) ۔ شریف پاشا نے پیرس میں کرد نمائندے کے فرائض انجام دیے اور ۲۲ مارچ ۱۹۱۹ء اور یکم مارچ ۱۹۲۰ء کو مجلس مصالحت کے سامنے کردوں کے دعاوی کی بابت دوبارہ یاد داشتیں، "متحدہ کردستان" کے ایک نقشے سمیت پیش کیں (دیکھیے *L' Asie Française*، ۱۹۱۹ء، شمارہ ۱۷۵، ص ۱۹۲، ۱۹۳) ۔ اسی زمانے میں ۲۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو شریف پاشا اور ارمنی نمائندوں کے مابین مفاہمت ہوگئی اور دونوں فریقوں نے کانفرنس میں متحدہ مطالبات پیش کر دیے (دیکھیے مفاہمت کا متن، در جریدۂ پیام صباح، قسطنطینیہ، ۲۴ فروری ۱۹۲۰ء؛ نیز دیکھیے *Le Temps*، پیرس، ۱۰ مارچ ۱۹۲۰ء) ۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو عہد نامۂ سیورے (*Sèvres*) کی رو سے چار ولایتوں (طربزون، ارزروم، وان اور بِدلیس) پر مشتمل مملکت ارمینیہ وجود میں آئی (دفعہ ۸۸ تا ۹۳) اور دفعہ ۶۲ تا ۶۴ میں قرار پایا کہ فرات کے مشرق کی جانب کے علاقے میں جو سرحد ارمینیہ کے جنوب اور ترکی کی شامی اور عراق سرحد کے شمال میں واقع ہے اور جس میں کردوں کو اکثریت حاصل ہے، ایک آزاد مقامی حکومت قائم کر دی جائے ۔ علاوہ بریں اگر مذکورہ حدود میں بسنے والی کرد آبادی اقوام متحدہ کی کونسل کے روبرو ثابت کر دے کہ "ان علاقوں کی آبادی کی اکثریت ترکی سے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے اور کونسل اس وقت یہ محسوس کرے کہ وہ آزادی کے اہل ہیں" تو ترکی اس پر رضامند ہے کہ اس سفارش کو منظور کر لے اور اس صورت میں دول متحدہ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا، اگر ولایت موصل کے کرد اپنا الحاق "آزاد کرد ریاست" سے کر لیں ۔ بعد کے واقعات کی بنا پر کردوں کا مسئلہ محض ولایت موصل کے کردوں سے مستقبل تک محدود ہو کر رہ گیا ۔ ترکی کے نمائندوں نے اصرار کیا کہ "کرد کسی اعتبار سے بھی ترکوں سے مختلف نہیں اور مختلف زبانیں بولنے کے باوجود یہ دونوں قومیں نسلی، مذہبی اور معاشری اعتبار سے ایک وحدت کی حامل ہیں" (لوزان کانفرنس میں ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کے اجلاس میں عصمت پاشا کی تقریر) ۔ اقوام متحدہ کی کونسل کے ۱۶ دسمبر ۱۹۲۵ء کے فیصلے کے مطابق ولایت موصل عراق میں شامل کر دی گئی اور شرط یہ ٹھیری کہ کردوں کے مطالبات کو پورا کیا جائے گا، بالخصوص یہ کہ ان کے ملک میں حکومت کا کاروبار اور عدالتی نظام چلانے اور مدرسوں میں تعلیم دینے کے لیے کرد ملازمین کو مامور کیا جائے گا اور ان تمام محکموں کی سرکاری زبان کردی ہوگی .

موصل کے بارے میں طویل گفتگو کے دوران میں شیخ سعید نقشبندی کی بغاوت کے باعث خرپوت اور دیار بکر کے علاقوں میں خطرناک شورشیں برپا ہوئیں ۔ ۱۶ اپریل ۱۹۲۵ء کو شیخ سعید کی گرفتاری عمل میں آئی اور اسے دیار بکر میں موت کی سزا دی گئی ۔ موصل کا مسئلہ طے ہو جانے کے بعد سے حکومت انقرہ کے طرز عمل کا رجحان کردستان میں

جاگیرداری اور قبائلی اثرات ختم کر دینے کی طرف ہے (دیکھیے Gentizon : *L' insurrection Kurde*، *La Revue de Paris*، ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء) .

مآخذ : مقالہ نگار کو ان کے ایک ہم عصر ـ جی۔ آر۔ ڈرائیور سے بہت سا تاریخی مواد حاصل ہوا جس کا انھوں نے شکر گزاری کے ساتھ اعتراف کیا ہے ـ کردوں کی تاریخ کا ایک خاکہ اوپر دے دیا گیا ہے، لیکن اس سلسلے میں بہت سے ابتدائی کام (وہ عربی، فارسی، ارمنی اور آرامی زبانوں کے مآخذ کے بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ سلیم ادریس اور اس کے بیٹے ابو الفضل کی تصنیف سلیم ادریس اور تاریخ عالم آرای عباسی کی باقاعدہ چھان بین سے بہت عمدہ نتائج برآمد ہوں گے ـ کرد تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات شرف نامہ پر مبنی ہیں (۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء تک) ـ اس کا متن (جو زیادہ تر اس قلمی نسخے پر مبنی ہے جس کا مقابلہ مرتب نے خود کیا تھا (طبع Veliaminof-Zernof : *Scheref-nameh*، ج ۱ (کردوں کی تاریخ)، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۰ء، ج ۲ (ج ۱ کے مختلف نسخے اور سلطنت عثمانیہ کے آغاز سے ۱۰۰۵ھ/ ۱۵۹۶ء تک ایران اور ترکی کی عمومی تاریخ، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۲ء)، فرانسیسی ترجمہ از F. Charmoy : *Fastes de la nation kurde* یا *Cheref-nâmah*، دو جلدوں اور چار حصوں میں، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۸ تا ۱۸۷۵ء، مشتمل بر حواشی (اس میں حاجی خلیفہ : جہان نما کے متعلقہ ابواب کا ترجمہ بھی شامل ہے)، لیکن اب یہ کئی اعتبارات سے فرسودہ ہو چکا ہے اور اس میں اشاریہ بھی موجود نہیں ـ ان کے علاوہ دیکھیے (۱) H. Barb : *Geschichtliche Über die Kurden Chronik von Scheref Skizze de. 33 verschiedenen kurdischen Fürstenges-chlechter*، *Geschichte Kurden-Dynastien* ج ۵ : (۲) *Gesch v. weiteren Kurden—Dynastien* : *Geschichte d. kurdischen Fürstenherrschaft in Bidlis*، جو علی الترتیب A. W. Wien، ۱۰ (۱۸۵۳ء) : ۲۵۸ تا ۲۷۶ و ۲۲ (۱۸۵۷ء) : ۳ تا ۲۸ و ۲۸ (۱۸۵۸ء) : ۳ تا ۵۳ و ۱/۳۰ (۱۸۵۹ء) و ۳۲ (۱۸۵۹ء): ۱۳۵ تا ۲۵۰ میں شائع ہوئیں : (۳) گم شدہ تاریخ کردستان مصنفۂ محمد افندی شہر زوری (م ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۲ء، بمقام مدینہ، دیکھیے تاج العروس، بذیل مادۂ کرد) ابھی تک (۱۹۲۷ء) دوبارہ منظر عام پر نہیں آئی؛ (۴) خاندان اردلان کی تواریخ کے لیے رک بہ سنّہ، جہان خسرو بن محمد بن منوچہر کی تاریخ (۱۲۵۳ھ/۱۸۳۴ء تک) کا اضافہ کر لیجیے؛ نیز دیکھیے (۵) Blochet : *Catalogue des manuscrits persans de la Bibl. Nationale*، ۱ : ۳۰۵، شمارہ ۴۹۸ : (۶) رسالۃ انساب الاکراد، ایشیاٹک میوزیم، پیٹرو گراڈ، کے سلسلے میں دیکھیے Romaskewič، در *Mélanges Asiatique*، سلسلۂ جدید، پیٹرو گراڈ ۱۹۱۸ء، ص ۳۹۲؛ (۷) جریدۂ زارکرمان جی (روان دز) نے کردی میں ایک مختصر تاریخ غنچۂ بہارستان کے نام سے شائع کی ہے (۱۹۲۶ء) اور زین العابدین بیگ : تاریخ کردان کی جلد ہی اشاعت کا اعلان کیا ہے ـ کردوں کی تاریخ کے بارے میں عام معلومات حسب ذیل کتابوں میں بھی مل جائیں گی: (۸) G. Campanille : *Storia della regione di Kurdistan e delle sette di religione ivi existenti*، نیپلز ۱۸۱۸ء؛ (۹) Quatremère : *Notice sur le Masâlik al-Absâr*، *NE*، ج ۱۳ (۱۸۳۸ء)؛ (۱۰) Rich : *Narrative* (دیکھیے سلیمانیہ)؛ (۱۱) Charmoy دیباچہ ترجمۂ شرف نامہ : (۱۲) Lerch : *Izsledowaniya ob iranskikh Kurdakh*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۵۶ء، ۱ : ۲۰ تا ۳۳؛ (۱۳) Hoffmann : *Auszüge aus Syrisch. Akten*، ۱۸۸۰ء؛ (۱۴) Tomaschek : *Sasun Sitzh.*، *AWW*، ص ۱۳۳ و ۱۳۴، ۱۸۹۵ء؛ (۱۵) Bittner : *Der Kurden gau Uschnuje*، *Sitzb. A.W.Wien*، ص ۱۳۳، ۱۸۹۵ء؛ (۱۶) Rawlinson و Wilson، در *Encyclop. Britannica*، ۱۹۱۱ء، ۱۵ : ۹۴۹ تا ۹۵۱؛ (۱۷) Addai Scher : *Episodes de l' histoire*

du Kurdistan، *J.A.* ۱۹۱۰ء، ۱۵: ۱۱۱ تا ۱۰۲؛ واقعات بذیل سال ۱۲۰۲ء، ۱۵۰۸ء، ۱۵۱۰ تا ۱۵۱۲ء (الجزیرہ)، ۱۵۲۳ء، ۱۶۸۹ء، ۱۷۱۲ء (عمادیہ)، ۱۸۲۰ تا ۱۸۳۶ء (رواں دُز)؛ (۱۸) Soane: *To Mespotamia.........in disguise*، لنڈن ۱۹۱۲ء، باب ۱۶؛ (۱۹) Minorsky: *Kurdi*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۵ء؛ (۲۰) Driver: *Studies in Kurdish History*، در *Bull. School of Orient Studies*، لنڈن ۱۹۲۲ء، ۲/۳: ۴۹۱ تا ۵۱۳... نومبر ۱۹۲۶ء میں Cl. Huart نے کردوں کی تاریخ کے بارے میں Institute des Inscriptions کو متعدد مراسلات بھیجے تھے، لیکن مصنف کی وفات کے باعث ان کی اشاعت میں تعویق ہو گئی۔

ج ۔ علم الانسان، عمرانیات، علم الاقوام

مَلّی (عرب)، گِردی (مُکری)، کُوچکَری (عہد قدیم کے یہودی)، شَمدِینان ("نسطوری" اور "ہکّاری") کردوں کی عکسی تصاویر جو Mark Sykes: *The Caliph's Last Heritage*، ص ۳۲۱، ۳۴۳، ۳۴۷، ۳۴۵ تا ۳۴۹ پر درج ہیں، یا Lynch: *Armenia*، ج ۲، مشکل ۱۰۹ ("ترکمانی") اور مشکل ۱۰۴ (اصلی اور بہت ممتاز) میں شمالی کردوں کی شکلوں کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ "کردی" شکل کا معیار قائم کرنے کے لیے کسی ایسی خاص معین طرز کا ڈھونڈھ نکالنا جو سب میں مشترک ہو، ایک موہوم بات ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انتہائی محتاط محققین نے بھی اس سلسلے میں جو کلیات قائم کیے ہیں، انھیں ہم محض ان کی ذاتی آرا کے طور پر پیش کر سکتے ہیں جیسے (۱) Duhoussett: *Etudes sur les Populations de la Perse*، پیرس ۱۸۶۳، ص ۱۲ تا ۱۶؛ (۲) Khanikoff: *Memoire sur l'ethnogr. de la Perse*، پیرس ۱۸۶۶ء، ص ۱۰۷؛ (۳) Chantre: *Apercu sur les caracteres ethniques des Ansaries et des Kurdes*، *Bull. Soc. Anthrop. de Lyon*، ۱۸۸۲ء، ۱: ۱۶۲؛ (۴) v. Luschan: *Early inhabitants of Western Asia*، *Smithsonian Ins.* کی سالانہ روئداد بابت ۱۹۱۴ء، ص ۵۶۱ و ۵۶۲؛ (۵) وہی مصنف: *Die Wanderrolker Kleinasiens*، *Verh. d. Gesell. f. Anthrop*، ۱۸۸۶ء اور *Völker*، *Rassen*، *Sprachen* برلن ۱۹۲۲ء؛ (۶) *Das. Volk d. Kurden Globus* ج ۵۷، عدد ۲۵، ص ۳۵۵ تا ۳۶۳؛ (۷) Pisson: *Races des hautes vallees du Tigre et de l'Euphrate*، *Revue Scient.*، ۱۸۹۲ء، ۴۹: ۵۵۷ تا ۵۶۰، ۵۸۱ تا ۵۸۸۔

یہ تمام خصوصیات اپنے تضادات سمیت، ظاہر ہے کہ ان افراد سے متعلق ہیں جنھیں ان مصنفین نے دیکھا تھا۔ کسی نے سارے کرد قبائل کا کبھی مشاہدہ نہیں کیا۔ صحیح علمی اندازہ لگانے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے، دیکھیے Duhaussett: *O. L.*، جدول ۷ و ۸؛ Khanikoff: کتاب مذکور، ص ۱۳۸ اور روسی تصانیف از Dr. Eliseyew: *Anthropol. exkursiya*، *Izw. Geogr. Obsh.*، ج ۳۲ اور *Po belu Svetu*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۶ء، ۳: ۳۱۹، ۳۳۲؛ از Dr. Danilow، A. A. Iwanowski، (*Yezidi*)، در *Russki Anthrop. Jonrnal*، ۱۹۰۰ء، شمارہ ۳ مع روسی مآخذ) اور Dr. Pantukhow (دیکھیے C. H.: *Einige Notizen über die Kurden und Karapapachen nach pantjuchow Ausland*، ۳۶: ۲۱۹۔

اس وقت ہمارے پاس کرد قبائل کے ناموں کی خاصی مکمل فہرست اور ان کی تخمینی تقسیم کے بارے میں خاصی مکمل معلومات موجود ہیں لیکن ایک مکمل جائزے کے لیے جس میں امور تاریخی کو پیش نظر رکھا جائے اور جو ایک ہی اصول اور قاعدے کے مطابق حاصل کردہ معلومات پر

مبنی ہو، بڑے وسیع بنیادی کام کی ضرورت ہے ۔ ۱۸۵۶ء میں ہمارے پاس جتنا بھی مواد موجود تھا، اس کے بارے میں بڑی دقیق تحقیق Lerch : *Izsledovaniya ob iranskikh Kurdakh*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۵۶ء، ص ۵۹ تا ۱۲۱ میں کی گئی ہے (Lerch کی کتاب کا یہ حصہ اس کے جرمن ترجمے، *Forschungen über die Kurden*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء میں شامل نہیں کیا گیا) ۔ بعد کی تالیفات میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں: (۱) Jaba : *Recueil de notices et recits kourdes*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۰ء، ص ۱ تا ۷؛ (۲) Spiegel : *Eranische Altertumskunde*، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ج ۱؛ (۳) Col. Kartsew : *Zametki o Kurdakh*، در *Zap. Kawk. Otd. Geog. Obsh*، تفلس ۱۸۹۷ء، ۱۹ : ۳۳۹ تا ۳۶۸ (مع نقشہ) اور (۴) سب سے زیادہ مفصل (۳۰۵ نام) از Sir Mark Sykes : *The Kurdish Tribes of the Ottoman Empire*، *J. R. Anthrop. Inst. of Gr. Brit.*، ۱۹۰۸ء، ص ۴۵۱ تا ۴۸۰ (مع ایک نقشہ)، بار دوم، در (۵) مصنف مذکور : *The Caliph's Last Heritage*، لنڈن ۱۹۱۵ء، ص ۵۵۳ تا ۵۹۲؛ (۶) Driver : *Report on Kurdistan*، مؤلث کارمل ۱۹۱۹ء، ص ۱۹ تا ۴۷ ۔ ایرانی قبائل کے لیے رک بہ کرمان شاہ؛ زنگ؛ ماکو؛ ساوج بلاق؛ سِنّہ اور اُرمیہ؛ ماورائے قفقاز کے کردوں کے لیے دیکھیے E. Kondratenko : *Ethnogr. Karti Zakawkazya Zap. Kawk. Otd. Geogr. Obsh.*، تفلیس ۱۸۹۶ء، ضمیمہ ج ۱۸ ۔

کردوں کے طرز معاشرت میں تین باتیں ان کے ساتھ مخصوص ہیں : (۱) کردوں میں تاریخی طور پر یہ رجحان کہ وہ علاقائی جاگیروں میں اپنے سردار کے مقبوضہ قلعوں کے اردگرد گروہوں کی صورت میں مجتمع ہو جاتے ہیں اور یہ سردار بسا اوقات مقامی قبیلے سے نہیں بلکہ نسلی اعتبار سے غیر ملکی ہوتے ہیں؛ (۲) ایک جنگی جماعت کا وجود جو سردار کے لیے معاون ہو اور مختلف نسلوں کے اجتماع کو محفوظ رکھے؛ (۳) کردوں میں چرواہوں (خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش) اور کاشتکاروں (مقیم اور نیم مقیم) کی پہلو بہ پہلو موجودگی ۔

ایسے مکمل خانہ بدوش قبائل کی تعداد بہت کم ہے جو سارے سال خیموں میں زندگی بسر کرتے ہوں اور سردیوں کا موسم عراق کے گرم میدانوں میں عربوں کے پڑوس میں گزاریں (دیکھیے Sir Mark Sykes کی دی ہوئی فہرست) ۔ کردوں کی اکثریت نیم خانہ بدوش یامقیم ہے ۔ نیم خانہ بدوش قبیلے ملک کے موسمی حالات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں ۔ وہ سال بھر میں پانچ سے آٹھ ماہ تک دیہات میں رہتے ہیں اور گرمی میں فصلوں کی کٹائی کے بعد پہاڑوں میں چلے جاتے ہیں، جہاں انھوں نے پوری حد بندی کے ساتھ اپنے لیے علاقے متعین کر رکھے ہیں حتّٰی کہ جاف [رک بہ سِنّہ] جیسے قبائل کے ہاں بھی نقل مکانی کی حدود کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے ۔ اکثر اوقات اس طبقے کے کرد اپنے دیہات کی قریبی بلندیوں پر (جنھیں علاقہ ساوج بوق میں "سراں" کہتے ہیں) چڑھ جانے پر ہی اکتفا کرتے ہیں ۔

"مقیم" کرد اکثر صورتوں میں اس قدیم آبادی کی یادگار معلوم ہوتے ہیں جنھیں "عشیرت" سپاہیوں نے مغلوب کر لیا تھا یا اس نے اپنے پڑوسیوں سے محفوظ رہنے کے لیے ان کی اطاعت قبول کر لی تھی [رک بہ ساوج بوق] ۔ Strabo، ۱۶ : ۳، ۱، نے فارس کے سرتیوں (Cyrtee) میں زراعت پیشہ افراد بھی پائے ۔ ایک زمانے میں موش کے خانہ بدوش قبیلے موسم سرما میں

ارمنی دیہات کے مسطح میدانوں میں پناہ لیا کرتے تھے، لیکن بتدریج (۱۸۴۲ء سے) ارمنی دیہات کے پہلو بہ پہلو خالص کرد دیہات بھی پیدا ہو گئے، دیکھیے *Correspondence respecting the condition of population in Asia Minor and Syria*، روئداد پالیمنٹ، ترکی ۱۸۷۹ء، شمارہ ۱۰، ۱۸۸۰ء، شمارہ ۴ و ۲۳؛ ۱۸۸۱ء، شمارہ ۶ (Trotter کی رپورٹیں روسی میں *Izw. Kawk. Otd. Geogr. Obsh.*، تفلس ۱۸۸۲ء، ج ۷ کے ضمیمے میں ترجمہ ہوئیں)؛ Lynch : *Armenia*، ۱۹۰۱ء، ۲ : ۲۳۴؛ Mayewski : *Wanskii i Bitlis. Wilayeti*، تفلس ۱۹۰۴ء (ارمنی اور کرد دیہات کی فہرستیں)۔

کردوں کا عام رجحان کسی مقام پر باقاعدہ سکونت پذیر ہو جانے کی طرف ہے ۔ شمالی عراق میں کرد خاصے ہوشیار کاشت کار ثابت ہوے ہیں اور اس وجہ سے انھیں بدوی عربوں پر فوقیت حاصل ہے، دیکھیے *Handbook* (شمارہ ۵۷) "*Turkey in Asia*"، مطبوعۂ محکمۂ خارجہ، ص ۱۰۴ : "معلوم ہوتا ہے کہ شمالی عراق کی قسمت میں ایک کرد ملک بننا لکھا ہے" .

کردستان کے ہر قبیلے کی قومی خصوصیات (لباس، پیشے، کھیل وغیرہ) کے بارے میں بیانات مختلف ہیں ۔ ان سے قبل از وقت کلیات کا اخذ کرنا غلط راستے پر ڈال سکتا ہے ۔ صرف اریوان کے کرد (جو بڑے بڑے کرد مراکز سے دور رہتے ہیں) ایک مکمل مقالۂ خصوصی کا موضوع قرار دیے گئے ہیں، جو Eginzarov (ایک پروفیسر قانون جو بچپن ہی سے کردی زبان بولتا تھا) نے لکھا ہے : *Kratkii ethnogr. ocerk. kurdow Erlwan. gubernii*، *Zap. Kawk. Otd. Georgr. obsh.*، تفلس ۱۸۹۱ء، ج ۱۳ /۲؛ نیز دیکھیے Khacaturaw : *Kurdi, certi ylkh Kharaktera i bita, Sborn. mater. po Kawkaz*، تفلس ۱۸۹۳ء، ج ۲۰ /۱، ص ۶۴ تا ۹۰ - سلیمانیہ کے کردوں کے لیے دیکھیے Rich : *Narrative of a residence* اور Soane : *To Mesopotamia and Kurdistan in disguise*، باب ۱۶؛ علاقۂ مکری و ارمیہ کے لیے : (۱) Arakelian : *Kurdi v Persii Izw. Otd. Geogr. Obsh*، ج ۱۷ /۱، ۱۹۰۴ء؛ (۲) de Morgan : *Miss. Scientifique*، *Etudes geogr.* ج ۲؛ (۳) Nikitine : *Quelques observations sur les Kurdes*، *Mercure de France*، ۱ / ۲ (۱۹۲۱ء) : ۶۶۲ تا ۶۷۴؛ (۴) *La vie domestique Kurde*، *Revue ethnogr. et des traditions populaires*، ۱۹۲۳ء، ص ۳۳۴ تا ۳۴۴ .

کردوں کی معاشرت میں عورتوں کو جو حیثیت حاصل ہے اس کی عجیب و غریب خصوصیات کا شرف نامہ (۱ : ۹۸، ۱۳۱، ۱۷۳ و ۱۷۴، ۳۸۱؛ ۲ (تکملہ) : ۴۴) سے پتا چلتا ہے۔ انھیں ترکمان عورتوں کے مقابلے میں نسبۃً کم آزادی حاصل تھی، لیکن وہ عمومی مسائل میں بڑی سرگرمی سے دخل دیتی تھیں، حتی کہ کبھی کبھی قبائل پر حکمرانی کرتی تھیں۔ ہکاری کی حلیمہ خانم کے بارے میں دیکھیے Cuinet : *La Turquie d' Asie*، ۲ : ۷۱۷؛ ألبجہ کی عادلہ خانم (م - ۱۹۲۴ء جسے حکومت بریطالیہ نے "خان بہادر" کا خطاب دے رکھا تھا) کے لیے دیکھیے Soane : *To Mesopotamia*، بار دوم، ۱۹۲۶ء اور Minorsky : *Kurdi*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۵ء، ص ۲۷؛ نیز دیکھیے Rich : *Narrative*، ۲ : ۲۸۵ و بمواضع کثیرہ؛ Jaba : *Recueil*، ص ۸۹، ۹۰۔۹۹؛ Hyvernat : *Du Caucase au Golfe Persique*، ۱۸۹۲ء، ص ۱۷۴ .

مآخذ : کردوں کی زندگی کے بارے میں دیگر مقالات: (۱) de Morgan : *La féodalite en porse Revue*،

d'ethnogr. et de social، پیرس ۱۹۱۲ء، ص ۱۸۰ تا ۱۸۲؛ (۲) Nikitine : La féodalité kurde، RMM، ۶۰ : ۱ تا ۲۷؛ (۳) Kurdische Textil-und Bekleid.-Industrie، Osterr. Monatsschrift' f. d. Orient، ۱۸۷۶ء، ص ۱۲۶ تا ۱۲۷؛ (۴) V. Luschan : Zwei mit Menschenhaaren besetzte Teppiche, Zeitschr. Ethnol. ۲۰/۶ (۱۸۸۸ء) : ۳۹۶؛ (۵) Kustarn. promish.na kawkaze، Kowrow. promish. kurdow. Eriwan. gubernii، تفلس ۱۹۰۳ء (اریوان کے کردی قالین)؛ (۶) Berliner و Borchart : Silberschmiedarbeiten aus Kurdistan، ۱۹۲۲ء؛ (۷) Volland : Beitrage z. Ethnogr. d. Bewohner v. Armenien und Kurdistan, Arch. f. Anthrop.، ۳۶ (۱۹۰۹ء) : ۱۸۳ تا ۱۹۶؛ (۸) مرزا محمد جواد القاضی : Studien aus dem Rechtsleben in kurdistan, Zeitschr. f. vergl. Rechtswiss ۲۲ (۱۹۰۹ء) : ۳۲۱ تا ۳۴۷؛ (۹) وہی مصنف : Der Kurdenstamm Globus، Manggur، ۹۸ : ۲۱۳ تا ۲۱۵؛ (۱۰) E. Noel : The Character of the Kurds as illustrated by their proverbs and popular Sayings Bull. School of Orient Stud.، ۱/۴ (۱۹۲۱ء) : ۷۹ تا ۹۰.

د - مذہب

خود کردوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کے اجداد مجوسی (زرتشتی) تھے، دیکھیے M. Sykes : The Caliph's Last Heritage، ص ۵۵۴ اور ممکن ہے کہ بہدینان(عمادیہ)کا نام مزد کی اصطلاحات کی یادگارھو (بہدین : "راسخ العقیدہ، عاسی")؛ لیکن آرامی زبان کے مسیحی ماخذ سے یہ مترشح ھوتا ہے کہ ابتداء کرد بت پرست تھے - تیسری صدی میں اربہ کے مار ساری (م - ۲۲۶ء) نے شاہ گیرت (شہر گرت، ذقوقا اور اربیل کے درمیان، دیکھیے Hoffmann : Auszüge، ص ۲۷۰) میں بادشاہ اور رعایا کو عیسائی بنایا - یہ لوگ پہلے "درختوں کو پوجتے تھے اور ایک تالیے کے بت کے سامنے قربانیاں دیتے تھے" (Raabe : Mar Mari، ص ۲۹) - ایشوعیبہ Ishōyabh نے ثمانین (لزد جزیرۃ ابن عمر) کے قریب اس مقام پر ایک خانقاہ تعمیر کی "جہاں کرد شیاطین کے سامنے قربانی دیا کرتے تھے" - جن کردوں کو مار سابہا (م - ۴۸۵ء) نے عیسائی کیا وہ آفتاب پرست تھے (دیکھیے Hoffmann : Auszüge، ص ۵۷) .

کردوں کو عیسائی بنانے کی جو کوششیں ھوئیں ان کے بارے میں بہت ھی کم بیانات ملتے ھیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بقول المسعودی (مروج، ۳ : ۲۵۴) کردوں میں موصل اور جبل الجودی کے قریب الیعقوبیۃ اور جورقان عیسائی موجود تھے (دیکھیے مارکوپولو، باب ۲۴)- حلقہ بگوش اسلام ھونے کے بعد کرد اکثر خارجی تحریک کی حمایت کرتے رہے (علاقۂ بصرہ میں زنجی غلاموں کی اور آذربیجان میں دیسم کی بغاوت (المسعودی : کتاب مذکور، ۵ : ۲۳۱)، آذربیجان میں منتشر کرد شراۃ = خوراج کہلاتے ھیں) - ایسے کرد بھی تھے جنھوں نے حضرت عثمان رض اور حضرت علی رض کی خلافت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا (المسعودی : وھی کتاب، ۳ : ۲۳۳) - شرف نامہ (۱ : ۱۴) کی رو سے سارے مسلمان کرد شافعی سنی مسلک کے پیرو تھے (اولیاء چلبی، ۴ : ۷۵، کا بھی یہی بیان ہے) - بہرحال یہ بات شک و شبہہ سے بالا ہے کہ ایرانی عہد حکومت میں کردوں میں شیعہ بھی موجود تھے - الجایتو کے عہد میں تو کردوں میں ایک مہدی بھی پیدا ھوا - شقاق [رک بآں] جو شاہ سیوں ترکوں میں رہتے تھے، شیعہ بھی ھو گئے، نیز شرف نامہ (۱ : ۳۱۶) کی شہادت دیکھیے جہاں شیعی مسلک ماننے والے دنبلی کا ذکر ہے (اسی

مصنف نے (۱ : ۱۱۷) الجزیرہ کے چار قبیلوں کو تین یزیدی قبائل کے مقابلے میں حسینی کہا ہے، لیکن یہ واضح نہیں کہ حسینی سے کیا مراد ہے) .

دوسری جانب کردوں میں یزیدی عقائد کی نشر و اشاعت کے بارے میں شرف نامہ (۱ : ۴۱) کی شہادت بہت حد تک قابل یقین ہے (داسنی، خالدی، بسیان قبائل اور بختی، محمودی اور دُنبلی قبائل کے کچھ حصوں میں، علاوہ سنجار کے جس کا ذکر شرف نامہ میں نہیں آیا) [= رک بہ یزیدی] .

قبیلۂ پازوکی کے بارے میں شرف نامہ (۱ : ۳۲۸) کا بیان ہے کہ اس کا کوئی مخصوص مذہب نہیں ہے ۔ ان کے صفویوں سے بہت گہرے روابط ہونے کی بنا پر ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ وہ انتہا پسند شیعی مسلک کے پیرو تھے .

زمانۂ حال میں کردوں کی غالب اکثریت ابھی تک شافعی سنّی ہے ۔ سنّہ تک میں صرف ولی اَرْدلان کا سابق حکمران خاندان شیعی تھا ۔ صوبجات کرمان شاہ کے شیعی قبائل میں سے اکثر انتہا پسند ہیں (Minorsky : *Notes Sur Les Ahli-Hakk*، *RMM*، ۱۹۲۰ء، ۱۱ : ۹۴)؛ ضلع موصل کے بارے میں رک بہ شَبَک ۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ انتہا پسند جو عموماً شیعی مذہب کے ہوتے ہیں، زیادہ تر کردستان کے ایرانی قبائل میں پائے جاتے ہیں جو خالص کرد نہیں ہیں (گوران، زازا) ۔ دوسری جانب کرد زیادہ تر متعدد سنّی سلسلوں کے شیوخ کے زیر اثر ہیں (بالخصوص نقشبندیہ اور قادریہ، جن کے مراکز اَوْرامان، سلیمانیہ مُکری، شَمْدِیْنان، خَرپوت، وغیرہ میں ہیں) ۔ ان کا اثر بدر خان (دیکھیے Layard : *Discoveries*، لنڈن ۱۸۵۳ء، ص ۳۷۵)، عبیداللہ (۱۸۸۰ء)، شیخ سعید (۱۹۲۰ء) وغیرہ کی شورشوں میں نمایاں تھا ۔

رک بہ شَمْدِیْنان اور Nikitine کے مقالے جن کا اس میں ذکر ہے .

مآخذ : مذکورہ تصانیف کے علاوہ، دیکھیے: (۱) N. Marr : *Yeshce o Slove "celebi"*، *Zap*، ۱۹۱۰ء، ج ۲۰ (کردوں کا ایشیاے قریب کی ثقافت میں جو حصہ ہے، مصنف نے اس پر روشنی ڈالی ہے اور اس کا خیال ہے کہ کردوں (یزیدی؟) میں مشرکانہ عقائد کا سراغ لگایا جا سکتا ہے، [رک بہ چلبی]؛ (۲) S. Reinach : *Charme pour obtenir la pluie* (در کردستان)، *L'Anthropologie*، ۱۹۰۶ء، ۱۷ : ۶۳۳؛ (۳) Volland : *Aberglauben in Armenien und Kurdistan*، *Globus*، ۱۹۰۷ء، ج ۹۱، شمارہ ۲۲، ص ۳۴۱ تا ۳۴۴ (ان پیالوں کے بارے میں جن پر کلمات سحر منقش ہیں)؛ (۴) Driver : *The religion of the Kurds*، *Bull. School of Orient. Studies*، ۱۹۲۲ء، ۲/۲ : ۱۹۷ تا ۲۱۵؛ (۵) Nikitine : *Les Kurdes et le Christianisme*، *RHR*، ۱۹۲۲ء.

۵- کردی زبان

فارسی کی طرح کردی بھی مغربی ایرانی زبان ہے، لیکن اس کی اصل فارسی سے مختلف ہے ۔ مغربی ایرانی کے شمالی اور جنوبی شاخوں میں تقسیم ہو جانے کی تاریخ کا ذیل کے مصنفین نے پتا لگایا ہے : Andreas، Salemann، O. Mann (*Die Tajik Mundarten d. Provinz Fars*، برلن ۱۹۰۹ء، ص i تا ۲۶)؛ Meillet : *MSL*، ۱۹۱۱، ۱۹۱۲ء، ج ۱۷؛ Lentz : *Die nordiranischen Elemente in d. neupers. Literatursprache bei Firdosi*، *Z.fur Indologie und Iranistik*، ۱۹۲۶ء، ج ۴، لیکن P.Tedesco نے اپنی تصنیف *Dialektologie d. westiranischen Turfantexte*، *le Monde Oriental*، ۱۹۲۱ء، ج ۱۵، کُرّاسہ ۱ تا ۳، میں بتایا ہے کہ "مغربی" ایرانی کا (جو "مشرق" ایرانی : سغدی، ساکا، سے مختلف ہے) اپنی شمالی اور جنوبی شاخوں سے بہت حد

تک امتزاج ہو گیا ہے اور اس نتیجے کی تصدیق W. Lentz، کی مذکورۂ بالا تصنیف سے ہو جاتی ہے .

جدید زبانوں میں اس خلط ملط اور اجنبی عناصر کے پہلو بہ پہلو راہ پانے جانے کے باوجود کردی زبان کا بحیثیت مجموعی ایک اپنا مزاج ہے جو اسے فارسی سے واضح طور پر ممتاز کر دیتا ہے۔ یہ امر اور بھی زیادہ واضح ہوتا اگر ہماری کردی دستاویزات اس متأخر زمانے سے متعلق نہ ہوتیں جب فارسی ادبی زبان اپنی فوقیت ثابت کر چکی تھی ۔ اگر کردی کا فارسی سے موازلہ کیا جائے تو اس کے اہم خصائص حسب ذیل ہوں گے .

(الف) اس کا مخصوص تلفظ، سامی حروف ع اور ح کی افراط، ایرانی الفاظ میں بھی، مثلاً عسپ (گھوڑا = اسپ)، حَوْت (سات = هفت) مُفَخَّم "ل" (جو سلاؤی اور ترکی سے تھوڑا سا مختلف ہے)، ثقیل (ڑ) جو ر سے متمیز ہے، دو ہونٹوں سے ادا کیا جانے والا "و"، دو حروف صحیحہ کا استعمال لفظ کے آغاز میں جائز سمجھنا (مثلاً برا brā، شتیک Shtek)، اور جہری حروف "ن" اور "ر" میں حروف علت کی خصوصیت کا پیدا ہو جانا (تقریباً ب ع ن، ک ع ر ت) .

(ب) صوتی اعتبار سے متبادل ایرانی الفاظ میں جو بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے، وہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہو جائے گا :

فارسی	کردی
دِل	زِرد
آذر (آتش)	آهِر اور آگِر
ماهی	ماسی
نماز	نویز

(ج) صرفی اختلافات : حالت نصبی کا باقی • رہنا، آکا (ākā) میں توصیفی لاحقہ، مختلف ضمائر کی تصریف : اسم ضمیر، غائب، کا ی/یا ن کے ساتھ، اسم ضمیر حاضر کی جمع ، یعنی صیغۂ متکلم : این، حاضر و غائب اِن، ت (ـد) سے اضافت کا اظہار (خصوصاً صیغۂ جمع میں) (دیکھیے تفتازی صیغۂ جمع تا ta میں)، مثلاً یار تِ، تیرا دوست "یار دِت" تیرے دوست"، یا کے ساتھ ماضی مجہول کی قدیم صورت (Salemann : *Zum mittelpers. Passive*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۰ء، Meillet : *Grammaire du vieux Perse*، ص ۲۰۱)اور "رؔ" میں ماضی مجہول کی ایک شکل .

(د) نحوی اختلافات : ماضی مطلق کے صیغوں میں افعال متعدی کا بصیغہ مجہول باقی رہنا، خصوصاً یہ صورت ان افعال میں زیادہ گنجلک ہو جاتی ہے جو حروف صلہ سے مرکب ہوں (کولستالیاں لی بروین : "انھوں نے ہمیں کوهستان سے منقطع کر دیا ہے" اور لفظی ترجمہ یوں ہوگا : پہاڑ/ان کے ہاتھوں/ہم سے منقطع کر دیے گئے") .

(ہ) لغوی اختلافات : شمال مغربی علاقوں کی اکثر بولیوں کی طرح کردی زبان میں بھی نہ صرف کَر ۔ کَپ ۔ (اور واچ ۔) کے الفاظ علی الترتیب جنوب مغربی بولی کے کن ۔ افت ۔ (اور گو ۔) کے مقابلے میں آتے ہیں، بلکہ اس میں آمد کی جگہ هات، آورد کی جگہ آنی، شنید کی جگہ بیست، فرستاد کی جگہ نارد وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ کردی اور فارسی دونوں زبانوں نے ادبی عربی سے، بہت سے الفاظ لیے ہیں، لیکن کردی زبان میں عامی عربی، عثمانی ترکی، آرامی اور ارمنی زبانوں سے بھی الفاظ مستعار لیے گئے ہیں ۔ علاوہ بریں کردی اور ارمنی میں بھی انھیں ملکی مآخذ سے الفاظ مستعار لیے گئے ہوں گے جن کا تاحال پوری طرح تعین نہیں ہو سکا .

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو شمال مغربی اور

جنوب مغربی ایرانی بولیوں کے درمیان کوئی ناقابل عبور خلیج حائل نہیں، لیکن کردی زبان کی اچھی ایک واضح اور معینہ شکل ہے جو اسے جدید فارسی ہی سے نہیں بلکہ شمال مغرب کی تمام بولیوں (سمنانی، "مرکزی" بولیاں وغیرہ) سے ممتاز کرتی ہے.

علاوہ بریں کردی زبان بہت سے مختلف لہجوں اور بولیوں پر مشتمل ہے ۔ اکثر کردی بولیاں اصطلاح کرمانجی کے تحت آ جاتی ہیں ۔ از روے شرف نامہ کرد قوم چار گروہوں پر مشتمل ہے : کرمانج، لر، کلہر اور گوران ۔ ان قبائل میں سے لر، جہاں تک ان کی جسمانی ساخت اور زبان کا تعلق ہے جنوب مغربی گروہ سے مماثل ہیں (*Die Mundarten der Lur-Stämme* : O. Mann، برلن ۱۹۱۰ء) اور ایک جداگانہ وحدت کی تشکیل کرتے ہیں ۔ گوران اپنے قرابت داروں، یعنی اورامی [رک بہ سنہ]، زازا وغیرہ کی طرح شمال مغربی علاقے کی بولی بولتے ہیں جو کردی سے خاصی مختلف ہے (دیکھیے "تین" گورانی میں : پری؛ زازا میں : ہریہ، جو سمنانی : ہیرہ کے مماثل ہے ۔ حالانکہ کردی میں سی کہتے ہیں)، بقول Andreas (جیسے Christiansen نے قلمبند کیا ہے) زازا قدیم دیلمیوں کے رشتے دار تھے اور اس مفروضے کی تائید ان روایات سے ہو جاتی ہے جو آج بھی اورامی کے ہاں پائی جاتی ہیں (E. Soane : *In Disguise to .... Kurdistan*، ص ۳۷۷) .

شرف نامہ کی رو سے کلہر، سنہ، کرمان شاہ اور زہاب کے درمیانی علاقے میں آباد تھے ۔ لہذا لفظ کلہر شرف نامہ (ص ۱۳) کے کرد گروہ "غیر کرمانجی" کے مماثل معلوم ہوتا ہے جو سنہ اور کرمان شاہ کے اضلاع میں رہتے تھے ۔ O. Mann نے ان بولیوں کا مطالعہ کیا ہے، لیکن اس کی کلیات معلومات کا یہ حصہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ۔ اس کی کتاب *Kurdisch-Persische forschungen* (جس کی اشاعت کا بیڑا K. Hadank نے اٹھایا ہے) کے کتابچۂ کیفیت کی رو سے صوبۂ کرمان شاہ کی جنوبی بولیاں : کرمان شاہی، کلہری، لکی، پہروندی، ناتکلی اور کلیانی ایک جلد میں شامل ہوں گی ۔ ان میں سے مؤخرالذکر ضلع سنقر [رک بآں] میں بولی جاتی ہے، ایک اور جلد صوبۂ کردستان [رک بہ سنہ] اور صوبۂ کرند اور گروس (جسے بیجار بھی کہتے ہیں اور جو سنہ کے مشرق میں ہے) کی بولیوں کے لیے وقف ہوگی ۔ جو لوگ یہ بولیاں بولتے ہیں وہ اپنے آپ کو کردی یا اس سے متعلقہ قبیلے کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ لرستان (لکستان میں) کی سرحدوں پر جنوبی کردی بولیاں لکی کے نام سے مشہور ہیں (دیکھیے O. Mann : *Kurze Skizze aer Luridialecte*، *SBAW*، ۱۹۰۴ء، ج ۳۹؛ Cirikow : *Putewoi Journal*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۵ء، ص ۲۲۷) ۔ سلماس [رک بآں] اور صوبۂ فارس میں لک موجود ہیں (لیکن کاون آبدو کی کردی بولی جس کا ذکر O. Mann : *Die Tajik Mundarten*، ص ۱۳۵، میں ہے، لکی نہیں) ۔ مغربی ایران کی جنوبی کردی بولیاں کردی کی اہم خصوصیات سے محروم ہو چکی ہیں (مثلاً افعال متعدی کا صیغۂ ماضی مجہول) ۔ ان غیر کرمانجی بولیوں کا وجود تردد کے مسئلے کو سلجھانے کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ اہم ثابت ہو سکتا ہے .

ہمیں لفظ کرمانج کی اصل معلوم نہیں ۔ کیا یہ لفظ کرد کو میڈیا کے کسی اور قبیلے کے نام سے ملا کر بنایا گیا ہے ؟ جس علاقے کو ہم صحیح طور پر کرمان جی کہتے ہیں، وہاں بولیوں کے دو گروہ ایک دوسرے سے ممتاز ہیں : مشرق (یا زیادہ صحیح طور پر جنوب مشرقی) گروہ اور مغربی گروہ ۔

ان کی صحیح صحیح حدود ابھی تک معین نہیں ہو سکیں ۔ مشرق کرمانجی مُکری [رک بہ ساوج بُلاق] اور دجلے کے معاونیں زاب کوچک، عَضَیم [رک بآں] اور دِیالی [رک بآں]، کے علاقوں میں بولی جاتی ہے ۔ یہ بڑی خالص بولی ہے اور تصریف الفاظ کے تنوع سے مالا مال ہے ۔ مغربی شاخ، باقیماندہ کُرمانجی بولیوں اور ان کی مقامی خصوصیات پر مشتمل ہے (دیار بکر، ماردین، بُختان بَہدِینان، ھکاری، اُرمیہ، اِریوان، ارزروم اور ایشیاے کوچک اور خراسان کی کرد نو آبادیاں) ۔ معلوم ہوتا ہے کہ شمالی شام کے کرد ایسی متعدد بولیاں بولتے ھیں جن میں مستعار ترکی الفاظ کی کثرت ہے (دیکھیے Le Coq کا مجموعہ) .

اولیا چلبی (۴ : ۷۵) نے پندرہ کردی بولیاں (لسان) گنوائی ھیں ۔ Garzoni : *Grammatica*، میں عمادیہ کی بولی میں اور بِدلیس جولامِرگ، بُختان اور سلیمانیہ کی بولیوں میں امتیاز کرتا ہے ۔ نیز دیکھیے وہ نقشۂ تقسیم جو Soane : *Grammar of the Kurmanjii* میں ہے ۔

مآخذ : ۱۷۸۳ء سے لے کر اب تک کرد زبان کے بارے میں تمام تر تحقیقات، در (۱) Lerch : *Izledovaniya*، ۳ : i تا xxxi؛ اور (۲) *Grundriss d. iran. philol.*، ۱/۲ : ۲۵۳ و ۲۵۴ ۔ کردی زبان کی صرف یہ محقق تصانیف ھیں: (۳) Justi : *Kurdische Grammatik*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۰ء؛ اور (۴) Socin : *Die Sprache d. Kurden*، در *Grundr d. iran. Phil.*، ۱/۲ : ۲۴۹ تا ۲۸۶ ۔ ان دونوں کتابوں میں زیادہ تر مغربی کرمانجی سے بحث کی گئی ہے ۔ مشرقی کرمانجی کے بارے میں بنیادی کتاب : (۵) O. Mann : *Die Mundart der Mukri - Kurden*، برلن ۱۹۰۹ء، ۱ : xxxiii تا cvi؛ (۶) *Grammatische Skizze*؛ نیز دیکھیے (۷) Soane : *Notes on the Phonology of Southern Kurmanji*، *JRAS*، ۱۹۲۲ء، ۱۹۱ تا ۲۲۶؛ واحد کردی لغت جو آج موجود ہے وہ : (۸) A. Jaba و F. Justi : *Dictionnaire kurde-française*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۹ء ہے ۔ اس میں وہ تمام مواد موجود ہے جو اس سے قبل شائع ہوا تھا (ضمیمہ از H. Schindler، *ZDMG*، ج ۳۸/۱ میں شائع ہوا)؛ لیکن یہ عملی ضروریات کے لیے کافی نہیں ۔ E. B. Soane کی مرتب کردہ ضخیم کردی لغت کے قلمی نسخے مملوکۂ سکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے بارے میں دیکھیے (۹) E. D. Ross، در *The Times*، ۱۹ فروری ۱۹۲۶ء .

کردی بولیوں کے جو نمونے اب تک مہیا ہو سکے ھیں، ان کی ایک فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے :

۱- فارسی گروہ : (الف) سِنّہ ۔ کرمان شاہ : (۱) Lerch : *Forschungen über die Kurden*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۵۷-۱۸۵۸ء، مآخذ، سِنّہ کی بولی میں لکھا ہوا گلستان کا ایک جزو؛ (۲) H. Schindler : *Beitrage z. Kurdischen Wörtschatze*، *ZDMG*، ۱۸۸۴ء، ج ۳۸، زنگنہ اور کلہُری کے الفاظ و محاورات؛ (۳) وہی مصنف : *Weitere Beitrage*، *ZDMG*، ۱۸۸۸ء، ۴۲ : ۷۳ تا ۷۹، سِنّائی الفاظ کا تجزیہ؛ (۴) Soane : *Southern Kurdish Folk - Song in Kermānshāhi*، *JARS*، ۱۹۰۹ء، ص ۳۵؛ دیکھیے جائزہ از : (۵) O. Mann، در *Die Mundart d. Mukri - Kurden*، ۱ : *xxi* .

(ب) منتشر بولیاں : (۱) A. Querry : *La dialecte guerrouci*، *MSL*، ۱۸۹۵ء، ۹ : ۱ تا ۲۳، مازلدران کے علاقۂ خجاوند کی گروسی بولی؛ (۲) O. Mann : *Die Tajik Mundarten*، برلن ۱۹۰۹ء، ص ۱۳۵ تا ۱۵۵، فارس میں کاون آبدو کی کردی بولی؛ (۳) W. Iwanow : *Khurasani Kurdish*، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات میں چھپے گی : یہ بولی ارزروم کی کُرمانجی کے قریب تر ہے، نیز دیکھیے: (۴) Berezine : *Études*،

خراسانی کردی کے محاورات؛ (۵) H. Schindler : ZDMG، ج ۳۸/۱، خراسان میں آمرلو بولی اور متعدد کتب سیاحت؛ (۶) Burgsch : Reise d. preussischen Gesandschaft ۱۸۶۳ء، ۲ : ۹۶۳ تا ۹۸، تہران کے مضافات کے کرد.

۲- مشرق کرمانجی : (۱) Chodzko : Études philologiques sur la langue kurde، JA، ۱۸۵۷ء ص ۲۹۷ تا ۳۵۶، سلیمانیہ کی بولی، پیرس میں مرتب کی گئی؛ (۲) O. Mann : Die Mundart der Mukri - Kurden، برلن ۱۹۰۶ء، ج ۱، مکمل کتاب صرف و نحو، متن، برلن، ۱۹۰۹ء، ج ۲، ترجمے، مشرقی کردوں کے منظوم قصوں پر مقالہ؛ (۳) E. B. Soane : Notes on a Kurdish dialect (Sulaimania)، JRAS، ۱۹۱۲ء، ص ۸۹۱ تا ۹۳۰؛ (۴) وهی مصنف : Grammar of the Kurmanji Language، لندن ۱۹۱۳ء، ۱۶ : ۲۸۹؛ (۵) Die heiligen Bucher d. Jeziden و Denksch. Wien Akad.، ج ۵۵/۴، ۱۹۱۳ء؛ (۶) Soane : Elementary Kurmanji Grammar، بغداد ۱۹۱۹ء، ۱۹۴ صفحات؛ (۷) وهی مصنف : کتاب اول‌امینی قرأت کردی، بغداد ۱۹۲۰ء؛ (۸) L. O. Fossum : A Practical Kurdish Grammar، (مکری)، منی پولس ۱۹۱۹ء؛ نیز دیکھیے؛ (۹) Bérézine : Recherches sur les dialectes musulmans، قازان ۱۸۵۳ء؛ (۱۰) H. Schindler : ZDMG، ۱۸۸۴ء، ج ۳۸؛ (۱۱) de Morgan : Mission Scientifique V، ۱۹۰۴ء؛ (۱۲) Von le Coq : Kurdische Texte، ج ۲، بذیل بابا = بابان.

۳- شمالی اور مغربی کرمانجی - اریوان : (۱) S. A. Egiazarow : Kratkii etnograficeskii Ocerk Kurdow, Zap. Kawkaz. otd. Geogr. Obschestwa ۱۳/۱، تفلس ۱۸۹۱ء، مکمل ترجمہ WZKM، ۶ : ۱۷۸؛ (۲) Khacaturow : Kurdskie Teksti Sbornik materialow dlia opisaniya Kawkaza، تفلس ۱۸۹۴ء، ۲۰ : ۱ تا ۱۶، کوہ اراراٹ کے قریب برکلی کردوں کی زبان؛ (۳) Adjarian : Recueil de mots Kurdes en dialecte de Novo - Bayazet، MSL، ۱۹۱۱ء، ۱۶ : ۳۴۹ تا ۳۸۳؛ ارزروم - بایزید؛ (۴) Jaba : Recueil des notice et extraits Kurdes، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۰ء، (۵) Jaba - Justi : Dictionnaire Kurde français، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۹ء، جو بنیادی طور پر بایزید کے متن پر مبنی ہے، لیکن جس میں تمام فراہم شدہ مواد سے فائدہ اٹھایا گیا ہے؛ (۶) Jaba : - Dialogues Kurde - français، مسودۂ مملوکۂ راقم، ارمیہ ھکاری، شمدینان؛ (۷) F. Müller : Kurdisches und syriches Worterverzeichniss و Orient und Occident مطبوعۂ Benfey، ۳ : ۱۰۴؛ (۸) S. Rhea : Brief Grammar and vocabulary of the Kurdish Language of the Hakkari district، JAOS، ۱۸۷۲ء، ۱۰ : ۱۱۸ تا ۱۵۵؛ (۹) Makas : Kurdische Studien، هائیڈل برگ ۱۹۰۰ء، ص۱۶ تا ۱۸؛ (۱۰) Ein Gedicht aus Gawar، گور سے دیگر مواد کے بارے میں، دیکھیے؛ (۱۱) M. Hartmann، در Bull. Acad.، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۰ء؛ (۱۲) Nikitine : Kratkii russko-kurdskii voyennii perevodcik، ارمیہ ۱۹۱۶ء؛ (۱۳) Noel : The Character of the Kurds as illustrated by their proverbs (ھکاری)، Bull School Orient Studies، ۱/۴ (۱۹۲۱ء) : ۷۹ تا ۹۰؛ (۱۴) Agha Petros Ellow : Assyrian, Kurdish and Yezidi، بغداد ۱۹۲۰ء، ۸۷ صفحات؛ (۱۵) Nikitine و Soane : The Tale of Suto und Tato Bull. School of Oriental Studies، ۱۹۲۳ء، ۱/۳ : ۶۹ تا ۱۰۶؛ (۱۶) Nikitine : Kurdish Storis، کتاب مذکور، ۱۹۲۶ء، ۴/۱ : ۱۲۱ تا ۱۳۸، بہدینان - بوھتان؛ (۱۷) M. Garzoni : Grammatica e vocabolario della lingua kurda، روم ۱۷۸۷ء، مواد عمادیہ میں جمع کیا گیا؛ اس بولی کی ممتاز خصوصیات کے بارےمیں

دیکھیے - (۱۸) شرف نامہ، ۱ : ۱۰۷؛ (۱۹) A. Socin : *Kurdische Sammlungen*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۰ء، ج ۲، الف و ب، متن و ترجمہ بُوھتان بولی میں، جو زاخو میں مرتب ہوا؛ (۲۰) Jardine : *Bahdinan Kurmanji*، بغداد ۱۹۲۲ء، مواد زاخو میں جمع ہوا اور "قسمت موصل اور کردستان کے گرد و نواح کے اضلاع کے کردوں کی کرمانجی" کے طور پر پیش کیا گیا؛ (۲۱) Dufresne : *Un conte Kurde de la region de So ord*، *JA*، ۱۹۱۰ء، ص ۱۰۷ تا ۱۱۸، بُوھتان کی بولی میں، لیکن اسے ایک شخص مسمی "سعید ھکّاری افندی" نے لکھوایا؛ (۲۲) یوسف ضیاء الدّین پاشا الخالدی : الهدية الحمیدیة فی اللغة الکردیة، استانبول ۱۳۱۰ھ، مصنف موتکی (مودکی) میں قائم مقام کے عہدے پر فائز تھا، دیکھیے مکمل ترجمہ *JA*، سلسلۂ ۹، ۲ : ۵۰۵ اور M. Hartman : بُوھتان؛ (۲۳) P. Beidar : *Grammaire Kurde*، پیرس ۱۹۲۶ء، زاخو - الجزیرۃ کی بولی - طُور عَبدین - دیار بکر : (۲۴) P. Lerch : *Forschungen über die Kurden*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء، اس کا متن Roslawl کے مقام پر ان جنگی قیدیوں سے جمع کیا گیا جو دیار بکر کے نواح کے باشندے تھے؛ (۲۵) Prym و Socin : *Kurdische Sammlungen*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۷ء، ج ۱ (ا) و (ب)، متن و تراجم، طور عبدین کی بولی؛ (۲۶) Makas : *Kurdische Studien*، ھائیڈل برگ ۱۹۰۰ء، ص ۱ تا ۱۶ : *Eine Probe des Dialcktes v. Diyarbakir*؛ (۲۷) وھی مصنف : *Kurdische Texte*، سینٹ پیٹرز برگ - لینن گراڈ ۱۸۹۷ - ۱۹۲۶ء، مرتبہ بمقام بوڈا پسٹ، ماردین کی بولی؛ شمالی شام : (۲۸) Von Le Coq : *Kurdische Texte*، برلن ۱۹۰۳ء، قابل فروخت نہیں، ۱ : ۱ تا ۸۱، متون مرتبہ بمقام زلجیرلی، ص ۱ تا ۹۲، لوبہار اور مولدی لبی کے فوٹوٹائپ، ۲ : ۱ تا ۱۱۵، ج ۱ کے متون کی نقل اور زا زا، لولو (؟) اور بابا سکری کے محاورات - نیز دیکھیے (۲۹) Berezine : *Etudes sur les dialectes musulmans*، قازان ۱۸۵۳ء؛ (۳۰) Soane : *The Shadi branch of Kurmanji*، *JRAS*، ۱۹۰۹ء، ص ۸۹۵؛ (۳۱) Soane : *Grammar of the Kurmanji*، ۱۹۱۳ء۔

عوامی خیالات، ادب اور اخبارات

کردی کہانیوں کے جومجموعے Jaba، Lerch، Prym-Socin، von le Coq، O. Mann، Makas اور Nikitine نے مرتب کیے ہیں، ان سے کردوں کے انداز قصہ گوئی کا خاصا علم ہو جاتا ہے - ان کے موضوعات اکثر ان عوامی خیالات سے لیے جاتے ہیں جو مشرق قریب میں عام ہیں (اخلاق قصے، جن و پری کی کہانیاں، بیوقوفوں کی حکایتیں، دیکھیے مرزا محمّد جاوید القاضی : *Ein Kurdisches Märchen Globus*، ۹۶ : ص ۱۸۷)، کثیر التعداد اور زیادہ دلچسپ وہ کہانیاں ہیں جو عوامی نامور لوگوں کے عشق یا قبیلوں کی باھمی جنگوں وغیرہ کے بارے میں ہیں - اس قسم کی کہانیوں کے موضوع و مواد کے بارے میں Prym-Socin اور Makas نے مفصل ایضاحات قلمبند کیے ہیں - O. Mann نے عباس اول کے وقائع کی سرکاری تاریخ کی شہادت کی بنا پر ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء کے دمدم قلعے کے منظوم قصے کی شرح کی ہے - بہت سے مقبول عام موضوعات پر نظم اور نثر دواوں میں طبع آزمائی کی گئی ہے - بعض واقعات کے گرد تصنیفات کا حلقہ جنھیں مختلف مصنفین نے اپنی اپنی طرز میں لکھا ہے باقاعدہ رزمیات کی صورت اختیار کر گیا ہے، مثلًا مم و زین، یعنی امیر بُوھتان کے دربار کے دو عاشق و معشوق کا قصہ جس کی بابت احمد خانی تصنیف اور دیگر شاعروں کی مقبول عام تصانیف بھی ہمارے پاس موجود ہیں : (۱) Lerch : *Melanges Asiatiques*، ۳ : ۲۴۲ تا ۲۵۵؛ (۲) Prym-Socin، شمارہ ۱۳؛ (۳) Mann، شمارہ

۲ ؛ (م) Makas، شمارہ ۱ ۔ نیز دیکھیے (۵) *Kurdische Sagen Zeitsch. d'* : B. Chalatianz *Verlens of Volkerkund*، ۱۵ (۱۹۰۵ء) : ۳۲۲ تا ۳۳۰؛ ۱۶ (۱۹۰۶ء) : ۳۵ تا ۴۶ و ۳۰۲ تا ۳۱۴؛ ۱۷ (۱۹۰۷ء) : ۷۶ تا ۸۰ .

Jaba کے اطلاع دھندہ نے اسے لو کرد شاعروں کی ایک فہرست تیار کرکے دی تھی، لیکن اس کی بتائی ہوئی باتوں کو کسی قدر احتیاط سے قبول کرنا چاہیے۔ یہ شعرا حسب ذیل ہیں :

علی حریر (شمدینان میں)، جو ۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء تا ۴۷۰ھ/۱۰۷۸ء میں گزرا ہے ۔ وہ ایک کردی دیوانچہ کا مصنف ہے .

شیخ احمد ملائی جزری، الجزیرۃ کا باشندہ تھا جہاں اس کا مقبرہ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ ۵۴۰ھ/۱۱۴۵ء اور ۵۵۶ھ/۱۱۶۰ء کے مابین ایک امیر عماد الدین کے وقت میں اسے عروج نصیب ہوا۔ ملائی جزری کے دیوان میں جسے عکسی ٹائپ میں M. Hartmann نے *Das Kurdische Diwan des Schech Ahmed* (برلن ۱۹۰۴ء) کے نام سے شائع کیا، فارسی شاعر جامی کا نام مذکور ہے (ورق ۱۲۱) جو ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء میں فوت ہوا تھا ۔ اس لیے ملائی جزری پندرھویں صدی کے اواخر سے قبل نہیں ہو سکتا۔ ایک قصیدہ خان خالناں کی مدح میں ہے جو شاہ کردستان ہے (ورق ۱۷۱) ۔ تبریز پر حکومت کرتا ہے اور شاہ خراسان سے بڑا ہے (ورق ۱۷۷) ۔ بہ ظاہر یہ آق قویونلو [ترکماں] خالدان کا کوئی فرمانروا ہوگا .

فقی طیران (۷۰۷ھ/۱۳۰۲ء تا ۷۷۷ھ/۱۳۷۵ء) مکس میں پیدا ہوا اور وھیں مدفون ہوا ۔ در اصل محمد کے نام سے معروف تھا اور میم، حے، تخلص کرتا تھا ۔ اس نے حکایت شیخ سنالہ (صنعان)، حکایات برصیصہ، قول ھسپ رش (مقولات اسپ سیاہ پیغمبر؟) اور دیگر نظمیں لکھیں .

ملائی بتی (ملا احمد) ھکاری کے ایک گاؤں بتی میں پیدا ہوا اور وھیں دفن ہوا ۔ ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء تا ۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء) ایک دیوان اور ایک مولد کا مصنف ہے ۔ مؤخرالذکر کی عکسی طباعت H. Von Le Coq نے کرائی (*Kurd Texte*، ۱ : ۹۴ تا ۹۶) .

احمد خان ھکاری ۔ ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء اور ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۲ء کے مابین ہوا ۔ بایزید میں اس مسجد کے قریب دفن کیا گیا جو اس کے نام سے منسوب ہے ۔ اس نے نظم مم و زین لکھی، Jaba-Lerch نے *Melanges Asiatiques*، ۳ : ۲۴۲ تا ۲۵۵، میں اس کی تشریح کی اور اصل کتاب کو ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء میں قسطنطینیہ سے اخبار زین کے ناشرین نے شائع کیا ۔ اس کے مشکل الفاظ کی مقفی عربی کردی فرہنگ موسوم بہ نوبہار (لیا پھل) یوسف ضیاء الدین نے جو اس کی تاریخ تصنیف ۱۰۹۴ھ بتاتا ہے (الھدیۃ الحمیدیۃ، ص ۲۷۹ تا ۲۹۷) شائع کی، اور Le Coq ۱ : ۱ تا ۷۴، نے اس کی عکسی نقل شائع کی ۔ احمد خانی نے کردی، عربی اور ترکی میں متعدد نظمیں لکھیں .

اسمعیل بایزیدی، احمد خانی کا ایک پیرو (۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء تا ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء) میں ہوا ۔ وہ ایک کرمالجی، عربی، ایرانی فرہنگ گلزار اور متعدد غزلیات و منظومات کا مصنف ہے ۔ شریف خان جو جولامرگ میں پیدا ہوا اور وھیں مدفون ہوا (۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) امرائے ھکاری کے خاندان سے تھا ۔ اس نے کرمالجی اور فارسی زبانوں میں کثیر التعداد نظمیں لکھی ہیں ۔ مراد خان بایزیدی (۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء تا ۱۱۹۰ھ/۱۷۸۴ء) غزل گو تھا .

سینٹ پیٹرزبرگ کے ایشیاٹک میوزیم میں کرد شاعری کے جو مجموعے موجود ھیں ان کے بارے میں، دیکھیے Lerch : *Isledovaniya* ، ۳ : xxvi؛ ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء میں قاھرہ سے کر دی زادہ احمد رابز کی مولد النبی باللغۃ الکردیۃ، شائع ھوئی ۔ کرد اخبار (دیکھیے سطور ذیل) میں ھمیں حسب ذیل شعرا کی زندگی کے بارے میں معلومات اور ان کا نمونۂ کلام ملتا ہے : شاہ پرتو ھکّاری، جس کا دیوان ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں مکمل ھوا؛ نالی، جو مشرق کرمانجی کے علاقے میں بہت مقبول ہے، انیسویں صدی کے وسط کا شاعر ہے ۔ اس کی نظموں کا ایک انتخاب قسطنطینیہ سے منتخب نظموں کے ایک مجموعے میں شائع ھوا جس کا نام شعاعات (از امین فیضی) ہے؛ حاجی قادر کوئی ، اسے اپنی کرد قومیت کا شدید احساس تھا (انیسویں صدی)؛ عبداللہ بیگ مصباح الدیوان (ادب)، جنگ عالمگیر کے دوران میں بمقام ساوج بلاق فوت ھوا؛ شیخ رزائی (رضا) خاندان طلبانی (سیروان کے کنارے) سے تعلق رکھتا تھا، م۔ تقریبًا ۱۹۱۰ء؛ طاھر بے جاف ابن عثمان پاشا، اَلَبجہ کا باشندہ (م۔حدود ۱۹۲۰ء)؛ ھمارے ھم عصر شعرا مندرجۂ ذیل ھیں : علی کامل باشندۂ سلیمانیہ، عبدالقادر زھاوی باشندۂ بغداد، احمد بیگ فتّاح صاحبقران باشندۂ سلیمانیہ، مصطفٰی بے جاف (ایک طنز گو شاعر)، احمد بیگ جاف ابن عادلہ خانم کرکوکی (اثیر) ۔ دیگر شعرا جن کے نام اخبارات میں ملتے ھیں، یہ ھیں : شیخ نوری بابا علی، علی بیگ سالار سعید، ملا رحیم مُکری (وفائی)، کاکہ مینی (= امین) مکری، کاک مصطفٰی ایرانی (= مرشد کامل)، عبدالخالق، سالم وغیرہ ۔

Jaba کی مستند کتاب (*Recueil* ، ص ۱۲) میں کردی زبان میں درسی نصاب کی کتابوں کے کئی مصنفوں کا ذکر ہے (علی ترماخ نے ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۱ء کے بعد کردی میں ایک عربی صرف ونحو کی کتاب لکھی اور ملّا یونس حَلقِطِینی نے تصریف، ظروف اور ترکیب پر صرف و نحو کی تین کتابیں تصنیف کیں) ۔ اسی طبقے میں "مسلمانوں کی شرعی نماز" جو ۱۷۸۳ء کے قریب لکھی گئی (طبع C. Huart در *JA*، ۱۸۹۵ء، شمارہ ۱، ص ۸۶ تا ۱۰۹) اور احمد خانی وغیرہ کی مذکورۂ بالا تصنیفات بھی شامل ھیں ۔ لیکن عام دستور یہ ہے کہ کرد مصنفین عمومی موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت عربی، فارسی یا ترکی کو ترجیح دیتے ھیں ۔

عربی میں لکھنے والوں کے اندر مندرجۂ ذیل مشہور فقہا اور علماے دین شامل ھیں : عیسٰی ھکّاری (م ۔ ۵۸۵ھ/۱۱۸۹ء)، تقی الدّین شہر زوری (م۔ ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء بمقام دمشق)(ابن خلکّان : وفیات، ۲ : ۱۸۸، ۳۰۴)، سنجار کا عبداللہ الکردی (ابن بطوطہ ، ۲ : ۱۴۲) ۔ ایوبی شہزادہ ابوالفداء ، مؤرخ اور جغرافیہ نگار، کے بارے میں رک بہ مادّۂ ابوالفداء؛ ابن الأثیر (۹ : ۹۴) نے حسین بِشنوی کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے جو شاھان مروانیہ کا درباری شاعر تھا اور بتایا ہے (۱۱ : ۷ ، ۸) کہ کردوں میں ایسے اشخاص موجود ھیں جو مقامی روایات کے ماھر ھیں ۔ مصنف شرف نامہ (۱ : ۳۱۴، ۳۲۲) نے اھل بدلیس میں سے مولانا عبدالرّحیم، مولانا محمّد بَرقلعی اور شیخ عمّار یاسر (دیکھیے نفحات الانس، طبع Nassau-Lees، ص ۴۷۹) کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ عمادیہ میں علما و فضلا موجود ھیں۔ موجودہ زمانے کے کرد علماے دین کے بارے میں رک بہ مجلّۂ روژا کرد ، شمارہ ۲، ص ۲۳) .

کردوں نے فارسی زبان میں بہت سی تاریخی کتابیں لکھی ھیں (دیکھیے اوپر) ۔ کرد شاعرہ ماہ شرف خانم (م ۔ ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء [رک بہ

سِنّہ] کا دیوان اس کے مختصر حالات زندگی کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں تہران سے شائع ہوا تھا ۔

ترکی زبان میں لکھنے والے کردی الاصل مصنفین میں سے نامور شاعر فضولی [رک بآں] بغدادی (م - ۹۶۸ھ/۱۵۵۶ء) کو مانا جاتا تھا، لیکن کوپرولو زادہ محمد فؤاد اپنی فضولی، حیاتی و اثری، استانبول ۱۹۲۴ء، ص ۱۳ و ۱۴، میں رقمطراز ہے کہ فضولی قبیلۂ بیاط کا ترک تھا ۔ بیاطی یقیناً ترک ہیں، لیکن یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ خورشید افندی نے سیاحت نامۂ حدود، روسی ترجمہ، ص ۱۹۳ و ۱۹۴، کفری کے فرقۂ بیاط اور تزخرمتو کو کردوں میں شمار کیا ہے ۔ زمانۂ حال کے ترکی ادب میں متعدد کردی الاصل مصنفین نظر آتے ہیں (دیکھیے J. Deny، ضیاء گوک الپ عمرانی (عالم علم العمران) کے نسب کے بارے میں، RMM، ۱۹۲۵ء، ۶۱ : ۳) ۔

عیسائی مبلّغین کی مطبوعات کے کردی ادب کی ایک خاص صنف وجود میں آئی ہے ۔ کتاب مقدس کا متعدد بولیوں میں ترجمہ ہوا ہے : کرمان شاہی ترجمہ لنڈن میں ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا تھا ۔ مُکری میں مرقس کی انجیل ۱۹۰۹ء میں فلپو پواس سے شائع ہوئی ۔ M. Fossum نے مکری میں پروٹسٹنٹ مذہب سے متعلق ایک سوال و جواب نامہ شائع کیا ہے اور اپنی کتاب صرف و نحو میں "بڑھے چلو مسیحی سپاہیو" کا مقفی ترجمہ مقامی حالات کے مطابق بنا کر پیش کیا ۔ ان میں سے کئی مطبوعات ارمنی حروف میں چھپی ہیں (*Kurd. Gramm* : Justi، ص xxix) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ (دیار بکر کے) ان ارمنیوں کے لیے ہیں جن کی روز مرہ کی زبان کردی ہے ۔ اپریل ۱۹۱۴ء میں ارمیہ کے پروٹسٹنٹ مبلغین نے (مکری میں) مجلۂ کردستان کا پہلا شمارہ شائع کیا ۔

جہاں تک ہمیں علم ہے پہلا کرد جریدہ کردستان ہے جو عبدالرحمٰن بیگ بن بدر خان بیگ بُوھتانی نے یکے بعد دیگرے قاہرہ، لنڈن اور فوکسٹون سے شائع کیا ۔ *Preussische Staatsbiblisthek* میں اس کے شمارے ۱ تا ۳۱، بابت ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۲ء تا ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) موجود ہیں، دیکھیے WZKM، ۱۲ : ۱۱۲ و Makas : *Kurd. Stud.*، ص ۱۹ ۔ نوجوان ترکوں کے انقلاب کے بعد کرد طالب علموں (طلاب) نے جو کہ ھیوی (اتحاد) کے نام سے ایک جماعت قائم کر چکے تھے، ایک ماہنامہ روژا کرد (یوم کرد) جاری کیا جس کے پہلے دو شمارے صلاح الدین اور کریم خان زند کی تصاویر سے مزین ہو کر استانبول سے ۶ جون اور ۶ جولانی ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۳ء کو عبدالکریم سلیمانیوی کی ادارت میں شائع ہوے ۔ آگے چل کر اس رسالے کا نام ھتاوی کرد (کرد آفتاب) ہوگیا ۔ ارمیہ کے عیسائی مبلغین کے شائع کردہ مجلۂ کردستان کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔ جنگ ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء کے بعد کردوں کی سرگرمیاں از سرنو جاری ہوئیں جس کی نشانی یہ تھی کہ قسطنطینیہ، مصر اور کردستان (دیار بکر وغیرہ) میں ان کے کئی اخبارات نکلنے لگے ۔ ان میں سب سے پہلا ہفت روزہ ژین (="زندگی") تھا جس کی بنیاد ۱۹۱۹ء میں رکھی گئی ۔ یہ اگرچہ قسطنطینیہ سے ترکی زبان میں نکلتا تھا، لیکن یہ اس فکر کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف تھا کہ "کردستان کردوں کے لیے ہے" ۔ شمارہ ۳۲ جمادی الاولی ۱۳۳۸ھ/۲۳ جون ۱۹۲۰ء کو شائع ہوا ۔ کردی اخبارات کی کوئی مکمل فہرست موجود نہیں ہے ۔ ایسی حالت میں ہم حسب ذیل اخبارات کا ذکر کر سکتے ہیں : کردستان ، پندرہ روزہ، جسے احمد عزیزی (بدر خان کے قبیلے کا) قاہرہ سے شائع کرتا تھا، شمارہ ۲ پیر ۱۵ ذوالحجہ

۱۳۳۵ھ اور شمارہ ۱۱ ہر ۱۵ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ تاریخ درج ہے ۔ سلیمانیہ میں شائع ہونے والا پہلا اخبار پیشکوتن ("ترق") تھا ۔ جس کی جگہ بعد میں بانگ کردستان آ گیا ۔ انگریزوں کے انخلاء سے قبل اس کا مدیر حاجی مصطفٰی پاشا تھا ۔ (۲ اگست اور اکتوبر ۱۹۲۲ء کے درمیان ۱۳ شمارے)، روژ کردستان، "شاہ کردستان" (محمود اول=شیخ محمود) کی آرا کا ترجمان تھا جسے محمّد نوری سلیمانیہ سے نکالتا تھا ۔ پہلا شمارہ ۱۵ ستمبر ۱۹۲۲ء اور پندرھواں ۸ مارچ ۱۹۲۳ء کو شائع ہوا؛ بانگ حق، جسے شیخ محمود نے فرار ہونے کے بعد شائع کیا (شمارہ ۱ تا ۸، ج ۳، شمارہ ۳ تا ۱۲، ج ۴، ۱۹۲۳ء)، دیکھیے *A Kurdish Newspaper Journal Centr* : Edmonds *As. Soc.*، ۱۹۲۵ء، ۱ : ۸۳ تا ۹۰؛ ژیانـوی ("رستخیز")، سلیمانیہ کا سرکاری (حکوماتی) ہفت روزہ تھا (شمارہ ۱ تا ۱۸، ج ۸، ۱۹۲۴ء؛ دیاری کردستان (" تحفۂ کردستان") ایک ہفت روزہ انتقادی مجلہ تین زبانوں میں جو بغداد سے صاحبقران زادہ اور رشید شوقی شائع کرتے تھے، شمارہ ۱ تا ۱۱ مارچ ۱۹۲۵ء؛ زار کرمانجی، ایک ہفت روزہ انتقادی مجلہ جسے سید حسین مکری اور عبدالرّحیم گیو رواندز سے ، شائع کرتے تھے، اس کی بنیاد ۱۲ ذوالقعدہ ۱۳۴۴ھ کو رکھی گئی تھی ۔

(V. MINORSKY)

⊗ ایرانی کرد

رضا شاہ پہلوی کے عہد میں بھی کردوں کی شورشیں جاری رہیں ۔ ان آئے دن کی شورشوں سے تنگ آ کر ایران نے سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ۔ کرد قبائل کے سرکردہ سرداروں کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور انھیں تہران لا کر نظربند کر لیا گیا ۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ تا ۱۹۴۵ء) میں شمالی ایران پر روسیوں اور جنوبی ایران پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا، لیکن کردستان ان دونوں طاقتوں کے عمل دخل سے آزاد رہا ۔ اس اثنا میں روس نے ایران میں کمیونزم کی اشاعت کی کوششیں زور شور سے جاری رکھیں ۔ اس خلفشار سے فائدہ اٹھا کر کردوں نے ایک سیاسی جماعت Komala قائم کر لی اور ۲۲ جنوری ۱۹۴۶ء کو صوبۂ آذر بیجان میں مہا باد کے مقام پر کرد جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا ۔ جمہوریہ کا سربراہ قاضی محمّد اور سپہ سالار مـلّا مصطفٰی برزانی قرار پائے ۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی محمّد کمیونسٹ نہ تھا بلکہ وہ ایران میں کردوں کے لیے داخلی آزادی کا طلب‌گار تھا ۔ اس نے کردستان میں زراعت اور صنعت کو فروغ دیا اور جگہ جگہ سکول اور ہسپتال قائم کر دیے (*The Kurds* : Thomas Bais، ص ۴۸ تا ۴۹، بیروت ۱۹۶۶ء) .

یکم جنوری ۱۹۴۶ء کو انگریزوں کی فوجیں ایران سے چلی آئیں، لیکن روسیوں نے اپنی فوجیں نکالنے سے انکار کر دیا ۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ ایران میں ایسی حکومت قائم کر جائیں، جو سوویٹ روس کے زیر اثر ہو ۔ حکومت ایران نے سلامتی کونسل سے شکایت کی، لیکن روس نے ایران خالی کرنے کے لیے یہ شرط لگا دی کہ ایران کے شمالی علاقوں میں اسے تیل نکالنے کی مراعات عطا کی جائیں اور کرد جمہوریہ کو تسلیم کر لیا جائے ۔ بالآخر طویل گفت و شنید کے بعد ۹ مئی ۱۹۴۶ء کو روسی فوجوں نے ایرانی علاقے خالی کر دیے ۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں رضا شاہ پہلوی نے کرد جمہوریہ کے خلاف ایرانی افواج کو یلغار کا حکم دیا ۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۴۶ء کو قاضی محمّد صدر اور دیگر عہدیداران جمہوریہ نے ہتیار ڈال دیے اور ۳۱

مارچ ۱۹۴۷ء کو انھیں بغاوت کے الزام میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا، لیکن مُلّا مصطفٰی برزانی کسی طرح بچ کر روس پہنچ گیا ۔ روس کے ارباب اقتدار نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، اس کی ہر ممکن خاطر و تواضع کی اور اسے آزاد کردستان کے قیام کا سراب دکھاتے رہے، لیکن وہ کمیونسٹ نہ بن سکا ۔ وہ گیارہ برس تک روس میں مقیم رہا اور جمہوریۂ کردستان کی تأسیس کا خواب دیکھتا رہا، لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا (*The Kurds* : Hassan Arfa، لنڈن ۱۹۶۶ء، ص ۸۷ تا ۱۰۲) ۔ جمہوریۂ کردستان کے خاتمے کے بعد ایرانی کردوں کی کمر ہمت ٹوٹ گئی اور انھوں نے مجبور ہو کر اپنی قسمت ایران سے وابستہ کر لی ۔ ۱۹۵۰ اور ۱۹۵۴ء میں کرمان شاہ کے کردوں میں پھر بے چینی پیدا ہونے لگی اور انھوں نے ٹیکس کی ادائی سے انکار کر دیا، لیکن ایرانی افواج نے کردوں کی شورش کو سختی سے کچل دیا ۔ ان شورشوں کے بعد حکومت ایران نے کردوں کی معاشی حالت سدھارنے پر خصوصی توجہ دی ہے اور ان کی اصلاح و فلاح کے لیے بہت سے منصوبے عمل میں لائے گئے ہیں ۔

عراقی کرد

عراق میں شیخ محمود البرزانی (۱۸۸۰ تا ۱۹۵۶ء) حکمرانی کا خواب دیکھ رہا تھا ۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں اس نے عراقی کردستان کی آزادی کا اعلان کر دیا، لیکن اس کے اپنے ہمراہیوں کی نا اتفاقی کی وجہ سے اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ۔ ۱۹۳۰ء میں برطانوی انقلاب کا خاتمہ ہوا تو امیر فیصل کی حکومت کو کردوں اور آشوریوں کی بغاوت سے نمٹنا پڑا ۔ کردوں کو شکایت تھی کہ ان کے حقوق بلا وجہ غصب کیے جا رہے ہیں اور کردی زبان کو کرد علاقوں کے سرکاری دفاتر سے نکالا جا رہا ہے ۔ شیخ محمود جو ایران میں پناہ گزیں تھا، عراق چلا آیا اور بغاوت کی زمام کار خود سنبھال لی اور عراقی کردستان کی آزادی کا مطالبہ پیش کر دیا ۔ عراقی حکومت کی مدد رائل ایرفورس نے کی اور اس طرح یہ بغاوت بڑی خونریزی کے بعد دبا دی گئی ۔ جولائی ۱۹۳۱ء میں شیخ احمد برزانی نے بغاوت کر دی ۔ ۱۹۳۲ء میں اس نے دوبارہ شورش پیدا کی ؛ بالآخر اسے کرکوک اور پھر سلیمانیہ جلاوطن کر دیا گیا، جہاں وہ ۱۹۴۵ء تک مقیم رہا ۔ ۱۹۴۱ء میں رشید علی گیلانی کی ناکام بغاوت کے بعد انگریزوں نے عراق میں اپنا اقتدار دوبارہ مضبوط کر لیا ؛ انھوں نے کردوں کو اپنے ساتھ ملانے کی پوری کوشش کی اور بہت سے ترکوں کو فوج میں بھرتی کر لیا ۔

۱۹۴۳ء میں شیخ احمد البرزانی کے بھائی ملا مصطفٰی نے علم بغاوت بلند کر دیا، صلح کے لیے اس کی یہ شرائط تھیں : (۱) کرد علاقوں میں عربی کے علاوہ کردی زبان کو بطور سرکاری زبان تسلیم کیا جائے؛ (۲) کرد علاقوں میں نہ صرف مزید مدارس قائم کیے جائیں، بلکہ ایک یونیورسٹی کا قیام بھی عمل میں لایا جائے؛ (۳) کرد علاقوں میں کرد عہدیدار مقرر کیے جائیں ۔ نوری السعید نے تو یہ شرائط مان لیں، لیکن امیر عبد الالٰہ نے یہ شرائط نامنظور کر دیں ۔ ۱۹۴۵ء کے موسم بہار میں بغاوت پوری طرح پھوٹ پڑی؛ تمام کرد حکومت عراق کے خلاف اٹھ کھڑے ہوے اور عراقی افواج کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا ۔ اس دفعہ رائل ایئر فورس پھر حکومت عراق کی مدد کو آئی اور بڑے کشت و خون کے بعد کردوں کی یہ بغاوت فرو کر دی گئی ۔ مُلّا مصطفٰی برزانی ایران چلا آیا اور ایرانی کردوں میں تحریک آزادی چلائی ۔ عراقی کردوں نے بھی ہمت نہ ہاری اور کردستان کے قیام کے لیے خفیہ تحریک جاری رکھی ۔ اس مقصد کے

لیے انھوں نے Kusrdish Democratic Party قائم کی، جو بائیں بازو کے خیالات کی حامی تھی - آزادی اور رزگاری اس کے رسالے تھے - روسیوں نے ملا مصطفی برزانی کے همراهیوں کی مدد سے کاکیشیا (قفقاز) کے علاقے میں ایک ریڈیو سٹیشن قائم کر رکھا تھا، جو کردی زبان کی نشریات میں کردوں کو بغاوت کے لیے ابھارتا رھتا تھا - ملا مصطفی کے بعض معتمد برابر عراق آتے جاتے رھتے تھے اور واپس جا کر اسے تمام معاملات سے آگاہ کرتے تھے۔

۱۴ جولائی ۱۹۵۸ءکو عراقی فوج نے ھاشمی سلطنت کا تختہ الٹ کر جنرل عبدالکریم قاسم کو نئی حکومت کا سربراہ منتخب کر لیا - یہ نئی حکومت روس سے همدردی رکھتی تھی، اس لیے مُلّا مصطفی کو معافی دے دی گئی اور اسے عراق آنے کی اجازت مل گئی - عبدالکریم قاسم کی جمال عبدالناصر سے نبھ نہ سکی اور فریقین ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کرتے رھے - جولائی ۱۹۶۱ء میں مُلّا مصطفی اور PDF نے حکومت عراق کو عرضداشت پیش کی جس میں یہ مطالبات پیش کیے گئے: (۱) عراق میں کردوں کی آزاد مملکت قائم کی جائے جس کی سرکاری زبان کردی ھو؛ (۲) کرد علاقوں کی پولیس کردی ھو؛ (۳) خارجہ تعلقات اور دفاعی معاملات کو چھوڑ کر جمهوریۂ کردیہ کو داخلی آزادی حاصل ھو؛ (۴) موصل کرکوک کے تیل کے چشموں سے حاصل شدہ آمدنی کا معتدبہ حصہ کرد علاقوں کی تعمیر و ترقی پر خرچ کیا جائے؛ (۵) کردی فوج کرد جمهوریہ کی مرضی کے بغیر کردستان سے باھر نہ بھیجی جائے (Hassan Arfa : *The Kurds*، لنڈن ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۴) - عراق کونسل نے ان تجاویز پر غور کیا اور بالآخر انھیں نامنظور کر دیا، مُلّا مصطفی برزانی نے بر افروختہ ھو کر علم بغاوت بلند کر دیا، لیکن عراقی فضائیہ نے کرد علاقوں پر بم باری کرکے تباھی مچا دی، جس کی وجہ سے کردوں کو بھاری جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا - (دسمبر ۱۹۶۱ - ۱۹۶۲ء کے موسم بہار میں کردوں اور عراقی فوج میں دوبارہ جھڑپیں ھوئیں - اس دفعہ کردوں کا پلہ بھاری رھا اور تین ہزار عراقی سپاھی مارے گئے۔

۹ فروری ۱۹۶۳ءکو عبدالکریم قاسم کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور بعث پارٹی برسراقتدار آ گئی - جولائی ۱۹۶۳ء میں کردوں اور عراقی فوج میں دوبارہ جنگ شروع ھوگئی، جو بعث پارٹی کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ھوئی - بعث پارٹی کے بعد عبدالسلام عارف برسراقتدار آیا (فروری ۱۹۶۳ء) - اس دفعہ مصر نے کردوں کو صبر اور حوصلے کی تلقین کی، لیکن ساتھ ھی حکومت عراق کو یہ مشورہ دیا کہ کردوں کے جائز مطالبات مان لیے جائیں - کرد اپنے تمام مطالبات کی منظوری پر اڑے رھے، جس کی وجہ سے جنگ دوبارہ شروع ھوگئی - عراقی فوج نے بم باری کرکے کردوں کو سخت جانی نقصان پہنچایا - اس خانہ جنگی کی بازگشت جنرل اسمبلی میں سنی گئی اور روس نے الزام لگایا کہ استعماری طاقتیں عراق کی مدد کرکے کردوں کو نیست و نابود کر رھی ھیں (Hassan Arfa : *The Kurds*، لنڈن ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۶) - ۱۰ فروری ۱۹۶۴ءکو فریقین جنگ بندی پر متفق ھوگئے اور عراقی باشندوں نے اطمینان کا سانس لیا - حکومت عراق نے شمالی عراق، جو جنگ سے تباہ ھو چکا تھا، کی اقتصادی ترقی کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا، لیکن اشتراکیوں اور بعثیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے یہ منصوبہ بروے کار نہ آسکا - اس کے بعد کردوں کے نمائندے قاھرہ جا کر جمال عبدالناصر سے ملتے رھے کہ وہ عراقی صدر عبدالسلام عارف

کو ان کے مطالبات تسلیم کرنے پر آمادہ کر سکیں، لیکن جمال عبدالناصر نے صرف یہ جواب دیا کہ وہ حکومت عراق کو اس مسئلے کی اہمیت پر توجہ دلائے گا۔ عبدالسلام عارف کردوں کے بعض مطالبات سے متفق تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ قضیہ حل ہو جائے، لیکن عملی طور پر کچھ بھی نہ ہو سکا۔ ۱۹۶۶ء میں عبدالسلام عارف کے انتقال کے بعد اس کا بھائی عبدالرحمٰن محمد عارف برسراقتدار آیا۔ اس دوران میں کرد اندرونی آزادی کا مطالبہ کرتے رہے اور عراق فوجوں سے ان کی جھڑپیں بھی جاری رہیں۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں کرد خاموش رہے۔ ۱۹۶۸ء میں بعث پارٹی نے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا اور کردوں کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے مختلف تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ بالآخر مارچ ۱۹۷۰ء میں کردوں اور عراق حکومت میں مفاہمت ہوگئی اور کردوں کے بعض مطالبات منظور کر لیے گئے (عبدالوحید: الاکراد و بلادہم، لاہور ۱۹۷۰ء)، ص ۱۹۱) اور سلیمانیہ میں یونیورسٹی قائم کر دی گئی۔ ۱۹۷۴ء میں ایران اور عراق کے درمیان شط العرب کے مسئلے پر مفاہمت ہوگئی تو عراق کردوں کی رہی سہی مزاحمت بھی ختم ہوگئی اور ملّا مصطفٰی برزانی اور اس کے بہت سے ہمراہی ایران چلے آئے.

مآخذ: عبدالوحید: الاکراد و بلادہم، لاہور ۱۹۷۰ء؛ (۲) Majid Khadduri: *Independent Iraq, 1932-1958*؛ (۳) Urial Dann: *Iraq Under Qassem*، مطبوعۂ نیویارک؛ (۴) Hassan Arfa: *The Kurds*، لنڈن ۱۹۶۶ء؛ (۵) Thomas Osis: *The Kurds*، بیروت ۱۹۶۶ء؛ (۶) David Adamson: *The Kurdish War*، لنڈن ۱۹۶۴ء؛ (۷) *The Statesman's Year Book 1974-75*، مطبوعۂ لنڈن.

(نذیر حسین)

* **کُرْدِسْتان**: "کردوں کا ملک" اس نام کو تاریخی اور نسلی دو حیثیتوں سے دیکھا جا سکتا ہے.

(۱) تاریخی نقطۂ نظر سے کردستان کی اصطلاح بظاہر سلجوقوں نے اس صوبے کے نام کے طور پر وضع کی تھی، جس میں آذربیجان اور لُرستان کے درمیان کے علاقے (سِنّہ، دِیْنَوَر، ہَمَدان، کرمانشاہ وغیرہ) نیز زاگروس (Zagros) کے مغرب میں بعض ملحقہ علاقے (شِہْر زُور، خُفْتِیان = کوئی سَنْجَق ؟) شامل تھے۔ کردستان کے صوبے کا صدر مقام شروع میں بَہار تھا (ہَمَدان کے شمال مشرق میں واقع) اور بعد میں کَمْچمال (Camčamāl) کا سلطان آباد (بِیسْتُون کے قریب)۔ حَمْدُاللہ المُسْتَوفی نے نُزْہَۃُ القُلُوب میں اس کے سولہ اضلاع درج کیے ہیں (طبع Le Strange، ص ۱۰۸).

یہ مصنف مغربی کردستان کا ذکر "ولایت اَرْمَن و جزیرہ" (بشمول اَرْبِیل و عَمادیہ در مؤخّرالذکر) کے نام سے بھی کرتا ہے۔ منگول عہد میں بالعموم اس پہاڑی خطے کے بارے میں جس میں ہکّاری بوھتان اور ارمنی Anti-Taurus واقع ہیں، ہمیں چنداں معلومات حاصل نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ شروع میں کردستان کی اصطلاح دَرْسِیم کے علاقے کے لیے استعمال ہوتی ہو، کیونکہ شرف نامہ (۱: ۱۶۳) کے مطابق سرکاری کاغذات (پروانجات و فرامین) میں، نیز خود کردوں کے یہاں کردستان کی اصطلاح خاص طور پر چِمِشْ گَزَک کی جاگیر کے لیے مستعمل تھی، لیکن تیمور کے عہد میں آ کر ظفر نامہ، (۱: ۶۸۶) میں بِدْلِیس کے امیر کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ بلاد کردستان میں سب سے زیادہ اہم آدمی تھا۔ سلیم اوّل کی تاریخ میں (سلیم نامہ، قلمی نسخہ، Pers. Bibl.Nat: شمارہ ۲۸۵، ورق ۱۰۹) ۔ اس کے مصنف کلیم ادریس نے لکھا ہے کہ تبریز سے واپسی پر

سلطان سلیم نے اسے "کردوں کے علاقے (بلاد اکراد) یعنی اُرمیہ اور اُشنو سے لے کر آمد اور مَلاطیہ تک" سارے ملک کا دورہ کرنے کا حکم دیا ، تاکہ سر زمین کردستان کے امرا اور حکام کی تالیف قلوب کی جائے اور ان سے جو معاہدے ہوے تھے اور انھیں جو امان دی گئی تھی اس کی تصدیق و توثیق کر دی جائے اس طرح یہ نام زیادہ‌تر استعمال ہونے لگا اور ترکی اور ایران میں یکساں طور پر اس کا اطلاق نظام جاگیرداری کے تحت میں کردوں کی جاگیروں پر کیا جانے لگا، دیکھیے نقشہ، در ظفر نامہ؛ اولیا چلبی: رِحلَة (Travels)، ۴ : ۴۷ - ۵۷، کردستان دیاری - رفتہ رفتہ دیار بکر، وان، بغداد ، ارز روم وغیرہ کے پاشا کردستان کے معاملات کو انجام دینے لگے (دیکھیے سامی بے: قاموس اعلام ۵: ۳۸۴) - انیسویں صدی کے وسط کے قریب انتظام حکومت سے متعلق اصطلاح "ولایت کردستان" لوای دیار بکر، مُش اور دَرسیم کے لیے استعمال ہونے لگی، لیکن عام طور پر ترکی سرکاری نام صدر مقامات کے ناموں پر مبنی رہے اور نسلی یا قومی حدود سے متعلق اصطلاحات کو نظر انداز کیا جاتا رہا (ینی ترک، ۱۹۲۵ء، نمبر ۲ میں اصطلاح کردستان کے دائرۂ اطلاق پر مُکرمین خلیل بے کے مقالے سے راقم الحروف استفادہ نہیں کر سکا) .

جہاں تک شروع کے یورپین نقشوں کا تعلق ہے، یہ بظاہر جہان نما، اور قدیم صوبۂ Corduene کی روایات اور شاید کورچیخ (Korčaikh) کے متعلق ارمینی بیانات پر مبنی ہیں (دیکھیے ان کے نمونے Q' khanzadian : *Rapport sur l' Unité géographique de l' Arménie Atlas Historique*، پیرس ۱۹۲۰ء؛ اور جغرافیائی تجزیہ، در *Report of the Commission of Enquiry by the League of Nations*، C، ۴۰۰ ، m ، ۱۴۷ ، ۱۹۲۵ء، ۷ : ۲۳ تا ۲۸، اور نقشہ نمبر ۳) [رَکَ بہ کُرد ، "منشا و مولد"] .

۲- اصطلاح کردستان کا جغرافیائی اطلاق خواہ کچھ بھی رہا ہو، یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ اس کا کرد قوم کے واقعی انتشار سے کوئی بھی تعلق نہیں - لفظ کردستان کا رائج العام مفہوم محض وہ علاقے ہیں جہاں کرد آباد ہیں، دیکھیے ایرانی اصطلاح "کردستان خراسان" جس سے مراد خراسان میں واقع کرد آبادیاں ہیں - حقیقت یہ ہے کہ جس سر زمین میں کردوں کی مستقل آبادی ہے وہ جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف پھیلا ہوا ایک خطۂ ارض ہے جس کی لمبائی تقریباً چھے سو میل (ازلُرستان تا مَلاطیہ) ہے اور چوڑائی جو اوسطاً ایک سو بیس سے ایک سو پچاس میل تک ہے، سب سے زیادہ (۲۵۰ میل) خط موصل وأرارات پر ہے (دیکھیے جہان نما، ص ۴۴۵ تا ۴۴۹).

۱۹۱۴ء سے پہلے کرد، ترکی، روس اور ایران کے مابین منقسم تھے - ماسکو اور انگورہ کے درمیان طے شدہ ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کے معاہدے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ماوارے قفقاز کے کردوں کی اکثریت اب ترکی علاقے میں ہے - اس کے برعکس مسئلۂ موصل کے آخری تصفیے کی رو سے اس ولایت کے کرد ترکی سے جدا ہو گئے ہیں اور اب حدود عراق میں آباد ہیں ، چنانچہ صورت حال اب یہ ہے .

(الف) ایران میں جہاں کے کوائف سب سے اچھی طرح معلوم ہیں، کرد نسل کے لوگ کرمانشاہ [رَکَ بآں] اور سنّہ Senna [رَکَ بآں] کے صوبوں نیز آذر بیجان کے جُنوبی حصوں [رَکَ بہ سَاوج بُوق] اور بیجان کے ضلع میں آباد ہیں، علاوہ ازیں اضلاع اُرمیہ (خاص طور پر اُشنو، سرگور، دَشت، تُرگور اور بَرادوست کے اضلاع)، سَلماس [رَکَ بآں] (ضلع سومائی اور ضلع چاہ ریق)، خوئی (ضلع قوتور، اَلنْد) اور

ماکو (جہاں وہ آرارات کی ڈھلانوں پر رہتے ہیں) میں بھی کرد آباد ہیں ۔ خراسان (قوچان، بجنورد اور درگز کے خوانین کے علاقے)، کرمان، فارس، شمالی لرستان، پشت کوہ، ورامین (نزد تہران؛ دیکھیے Brugsch : *Reise*، ۲ : ۹۶م)، قزوین، منجیل (دیکھیے Rabino : *RRM* : ۲۷ : ۲۵۹) وغیرہ میں کردوں کی نو آبادیات پائی جاتی ہیں ۔ ایرانی کردوں کی مجموعی تعداد کا اندازہ پانچ لاکھ سے زائد نہیں ۔

(ب) ترکی میں صورت حال یہ ہے کہ موجودہ زمانے (۱۹۲۷ء) میں یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ مختلف لوگوں کی جغرافیائی تقسیم پر جنگ کے مابعد اثرات کیا ہوئے، مثلاً روسی فوج کے مقابلے کردوں کا فرار، ارمنی آبادی کا وطن سے اخراج، جولا مرگ کے نسطوریوں کا عراق کی سمت نقل وطن، درسیم، (۱۹۲۱ء) اور خرپوت و دیار بکر (۱۹۲۵ء) کے خلاف ترکوں کی تادیبی مہمات ۔ Sir Mark Sykes نے جو نقشہ درج کیا ہے (*The Caliph's Last Heritage*، ص ۵۳۳)، جنگ سے پہلے ترکی میں کردوں کی تقسیم کا تقریباً صحیح منظر پیش کرتا ہے ۔ کردوں کے بڑے مرکز عین "ترکی۔ ایرانی" سرحد کے ساتھ ساتھ واقع ہیں (بایزید، برگری، محمودیہ، آلبق، گور اور شمدینان کے اضلاع)، عیسائیوں کے ساتھ ملے جلے کرد جھیل وان کے ارد گرد اور اس کے جنوب کے علاقے میں دریائے دجلہ تک آباد ہیں ۔ دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے مابین ہم کردوں کو زیادہ تر اس خط کے شمال میں پاتے ہیں جو نیشابور (جزیرۂ ابن عمر کے نیچے) کو سمیساط (بالائے برجک) سے ملاتا ہے ۔ مغرب کی جانب کرد خاصی تعداد میں دریائے فرات کے پار پائے جاتے ہیں (Ritter، ۱۱ : ۴۴م) ۔ بقول Trotter (۱۸۷۸ء) یہ جنوب اور مغرب میں خط دورگی ۔ ارزروم ۔ قارص (اریوان) تک آباد تھے ۔ بدلیس کے جنوب اور مغرب کے علاقے میں، دیار بکر کو مشن سے جدا کرنے والے پہاڑوں میں اور اس دو شاخے میں جو دریائے فرات کے دونوں سر چشموں سے بنا ہے، کرد خاص طور پر بڑی تعداد میں موجود ہیں؛ تاہم اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ارزنجان اور دیار بکر کے درمیان بعض جگہ کرد اور بعض جگہ زازا آباد ہیں جو ایرانی نسل کے ہیں، لیکن ان کی جسمانی ساخت، زبان اور مذہب ان کو کردوں میں براہ راست جذب نہیں ہونے دیتے ۔ ارز روم کی بلند سطح مرتفع پر کہیں کرد اور کہیں ترک اور قفقاز سے آئے ہوئے مسلمان (چرکس، اوسیتہ (Ossetes) وغیرہ) بستے ہیں ۔ یہ لوگ خاص طور پر ارزروم کے جنوب اور جنوب مغرب میں پائے جاتے ہیں ۔ ان علاقوں میں جن کا الحاق زمانۂ حال میں ترکی سے ہوا ہے، کرد آرارات کی مغربی ڈھلانوں پر (سرملی اور کغزمان کے ضلعوں میں) آباد ہیں ۔ کرد نو آبادیاں مغرب کی سمت اقصاے کیلیکیا (Cilicia)، سیواس کے ضلع میں (قنگال، کوچ حصار، زرہ اور دورگی کی قضاؤں میں جہاں جنگ سے پہلے بیس ہزار کرد رہتے تھے)، انقرہ کے جنوب تک پائی جاتی ہیں (G. Perrot : *Les Kurdes de L'Haimaneh Reveu des Deux mondes*، ۱/۲ (۱۸۶۵ء) : ۶۰۷ تا ۶۳۱؛ Alboltin : *Nowi Wostok*، ماسکو ۱۹۲۵ء، ۷ : ۱۱۶ میں مندرجہ اعداد و شمار کے مطابق ترکی میں کردوں کی تعداد پندرہ لاکھ ہے ۔ ترکی ماخذ بظاہر (بادیہ نشین ؟) کردوں کے خیموں کا اندازہ ۹۶۰۰۰ کرتے ہیں، قبائل کی دیکھ بھال کے لیے جو محکمہ ہے (عشائر مدیریتی) اس کی مطبوعات ابھی تک مغربی یورپ میں دستیاب نہیں

ہو سکیں۔

(ج) العراق کے کرد (موصل کی سابق ولایت میں) موجودہ مردم شماری کے مطابق دس لاکھ کے لگ بھگ ہیں۔ وہ لوائے سلیمانیہ کے پورے علاقے میں آباد ہیں۔ اربیل کی لواء میں ان کی خاصی اکثریت ہے اور کرکوک میں نمایاں اکثریت۔ مجلس اقوام (League of Nations) کے تحقیقاتی کمیشن کے تیار کردہ نقشوں نمبر ۶ و ۸ میں نسلی کیفیت اور قبائل کی مہاجرت کا خاکہ ... کیا گیا ہے (سی ۴۰۰، ... ۱۹۲۵ء، ج ۷)۔

(د) روسی ماورائے قفقاز میں اریون اور قارص کے کردوں کی تعداد ۱۹۱۰ء میں سوا لاکھ تھی جس میں پچیس ہزار یزیدی بھی شامل تھے۔ کردوں (یعنی کردی زبان بولنے والوں) میں سے صرف ایک قلیل تعداد ارمینیا کی سوویٹ جمہوریہ میں شامل ہے۔ اس کے برعکس قدیم روسی مردم شماری میں Eliza Vetpol (=گنجہ) کی عملداری میں زنگزور، جوانشیر، جبرئیل اور آزیش کے کردوں کو جدا جدا شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ گنجہ کے یہ کرد (دیکھیے آران کردوں کی موجودگی کے بارے میں عرب مصنفین کی شہادت) اب آذربیجان کی سوویٹ جمہوریہ میں ایک الگ ضلع (Canton) میں مقیم ہیں جو ایزد Uyezd کہلاتا ہے، لیکن بظاہر ان کی زبان آذربیجان کی عام ترکی ہے (دیکھیے Cursin : Azerbaidjanskiye Kurdi، در Izw. Kavk. Istor, Arkheol Instituta، تفلس ۱۹۲۵ء، ج ۳)۔

(ھ) جہاں تک شمالی شام کا تعلق ہے، جو کرد ولایت حلب (خاص طور پر کلیس میں) بہت عرصے سے آباد تھے، ان کی تعداد جنگ سے پہلے روسی سفیر Zimmermann کے بیان کے مطابق ایک لاکھ پچیس ہزار تھی (نیز دیکھیے Cuinet : ۳ : ۱۲۴؛ Hartmann : Das Liwa Halab، برلن ۱۸۹۴ء، ص ۸۳، ۹۲، ۹۵ تا ۹۶، ۹۸ تا ۱۰۰، اور ۱۰۵)۔ RMM (۵۳ : ۳۱۷) کے مطابق فرانسیسی انتداب کے زمانے میں شام میں بیس ہزار کرد تھے (علویس کے شمال اور ہلان میں)۔ دمشق میں بھی کردوں کا ایک محلہ ہے۔ سنجار کے کردوں کی ... جہاں کی انتظامی حالت پورے طور پر واضح نہیں ہے، [رک بہ یزیدی]۔

(و) کرد مغرب [کذا، مشرق ؟] کی سمت بھی دور تک چلے گئے تھے، بلوچستان [رک بآں] میں ایک ممتاز کرد قبیلہ براہوئی مقامی باشندوں کے مابین آباد ہے اور اس قبیلے کے لوگ براہوئی زبان بولتے ہیں۔ زمانۂ حال کی تحقیقات (Tedesco) نے کردی اور بلوچی زبانوں کے مابین ایک گونہ مناسبت کا پتا چلایا ہے۔ افغانستان کے ضمن میں شرف نامہ (۱ : ۳۲۷) میں چگنی قبیلے کے بعض افراد کے غرچستان چلے جانے کا ذکر موجود ہے۔ Morgenstierne : Report on a Linguistic Mission to Afghanistan، اوسلو، ۱۹۲۶ء، ص ۵ کے نزدیک ہرات کے مغرب میں کر دی زبان بولنے والے کچھ لوگوں کی موجودگی (مغرب) کا امکان ہے۔

مآخذ : [رک بہ ارمینیا؛ ساوج بلاق؛ سنہ، شہرزور؛ شکاک، شمدینان اور سلیمانیہ]۔ Lerch کی تصنیف Izsledovania (سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۶ء، ۱ : ۵ تا ۱۹) میں کردستان سے متعلق ۱۸۵۶ء تک کے ماخذ کی ایک بہت عمدہ فہرست درج ہے (جرمن ترجمے میں یہ فہرست شامل نہیں ہے)۔

ان تمام ملکوں کا عام بیان جہاں ترک آباد ہیں، صرف Ritter کی قابل یادگار تصنیف Erdkunde میں موجود ہے، ۸ (۱۸۳۸ء) : ۳۹۲ تا ۴۰۰ (خراسانی کرد) : ۹

(۱۸۳۰ء): ۲۱۳ تا ۲۶۲، ۱۰۰۹ تا ۱۰۳۸ (ایرانی کردستان)، ۱۰ (۱۸۳۳ء): ۹۰ تا ۲۳۳، ۲۶۹، ۱۰۰۸ (دجلہ و فرات کے سرچشمے)، ۱۱ (۱۸۳۳ء): ۱۲۸ تا ۱۳۶ (مغربی کرد)، ۹، ۹۳۷، ۱۰۰۷، ۱۰۲۶، وغیرہ۔

ان دیگر تصانیف میں سے جو ۱۸۵۷ء کے بعد شائع ہوئی ہیں اور جو اوپر مذکور نہیں ہوئیں، ہم مندرجۂ ذیل کا ذکر کر سکتے ہیں: (۱) Sandreczki : *Reise nach Mosul*، Stuttgart، ۱۸۵۷ء؛ (۲) F. Jones : *Memoirs ......on the Journey to the Frontier of Turkey and Persia*، بمبئی ۱۸۵۷ء (۳) O. Blau : *Die Stämme des n. o. Kurdistans*، *ZDMG.*، ج ۱۲ (۱۸۵۸ء)؛ (۴) Bianchi : *Viaggi in Armenia*، میلان ۱۸۶۳ء؛ (۵) Strecker : *Das obere Zab-Ala Gebiet Peterm. Mitt.*، ۱۸۶۳ء، ص ۲۵۷ تا ۲۶۲؛ (۶) Blau : *Vom Urmia-See nach d. Wan-See Pet. Mitt.*، ۱۸۶۳ء؛ (۷) Auriema : *Reise routen in kurdistan Pet. Mitt.*، ۱۸۶۳ء؛ (۸) Schaefli : *Beitrage z. Ethnographie Kurdistans Pet. Mitt.*، ۱۸۶۳ء؛ (۹) Taylor : *Travels in Kurdistan*، *J.R.G.S.*، ۱۸۶۵ء، ۳۵ : ۲۱ تا ۵۵؛ (۱۰) Taylor : *Journal of a Tour*، *JRGS.*، ۱۸۶۸ء، ۳۸ : ۲۸۱ تا ۳۶۱؛ (۱۱) Marsh: *The Tenessean in Persia and Kurdistan (S.A. Rhea)*، فلاڈلفیا ۱۸۶۹ء؛ (۱۲) Millingen : *Wild Life among the Koords*، لنڈن ۱۸۷۰ء؛ (۱۳) Lyclama a Nijeholt : *Voyage en Russie, etc.*، پیرس ۱۸۷۲ تا ۱۸۷۵ء؛ (۱۴) Čirikow : *Putewoi dnewnik Zap. Kawk. Otd. Geogr. Obshc.*، ج ۹، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۵ء؛ (۱۵) Thielmann : *Streifzüge im Kaukasus*، لائپزگ ۱۸۷۵ء؛ (۱۶) Černik : در *Pet. Mitt.*، ۱۸۷۶ء، ضمیمہ عدد ۴۵؛ (۱۷) خورشید آفندی : سیاحت نامۂ حدود، قسطنطنیہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء)؛ روسی ترجمہ سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۷ء؛ (۱۸) Col. Carr : *The Kurdistan Mountain Ranges Journ. R. United Service Institution*، ۱۸۷۹ء، ج ۲۲، ص ۱۳۵ تا ۱۸۳؛ (۱۹) Mac-Coan : *Our New Protectorate*، لنڈن ۱۸۷۹ء؛ (۲۰) Tozer : *Turkish Armenia*، لنڈن ۱۸۸۱ء؛ (۲۱) Ellis : *On a Raft through the Desert*، لنڈن ۱۸۸۱ء؛ (۲۲) H. Schindler : *Reisen in n-w. Persien 'Zeit. Gesell. Erd. Berl*، ۱۸۸۳ء؛ (۲۳) Wünsch : *Reise in Armenien Mitt. Geogr. Gesell.* وی انا ۱۸۸۳ء، ۲۶ : ۳۰۹ تا ۳۱۲، ۳۸۷ تا ۳۹۶، ۵۱۳ تا ۵۲۰؛ (۲۴) Puchstein : *Reise in Kurdistan Sitzb. Berl. Akad.*، ۱۸۸۳ء؛ (۲۵) Clayton : *The Mountains of Kurdista* (*Alpine Journ.*) لنڈن ۱۸۸۴ء، ج ۱۲؛ (۲۶) Binder : *Au Kurdistan*، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۲۷) Schulze : *Eine Reise n. Kurdistan Das Ausland*, Stuttgart، ۱۸۸۸ء، ج ۶۱؛ (۲۸) M. S. Bell : *Reconnaissances in Mesopotamia*، شملہ ۱۸۸۹ء؛ (۲۹) Wünsch : *Die Quelle d. westl. Tigrisarmes Mitt. Geogr. Gesell Wien*، ۱۸۸۵ء، ج ۲۸؛ (۳۰) Wünsch : *Das Quelle ngebiet d. ostl. Tigrisarmes Pet. Mitt.*، ۱۸۸۹ء، ص ۱۱۵ تا ۱۱۹، ۱۳۹ تا ۱۳۱؛ (۳۱) Wunsch : *Die Landschaften Schirwan Chisan und Tatik Mitt. Geor. Gesell. wien*، ۱۸۹۰ء؛ (۳۲) Bishop : *Journey in Persia*، لنڈن ۱۸۹۱ء؛ (۳۳) Cuinet : *La Turquie d' Asie*، پیرس ۱۸۹۱ء، ج ۲؛ (۳۴) *Pissons Reise in Persisch-Kurdistan, Globus*، ۱۸۹۲ء، ج ۶۱، عدد ۸، ص ۱۲۲؛ (۳۵) Muller-Simonis و Hyvernat : *Du Caucase au Golfe Persique*، پیرس ۱۸۹۲ء؛ (۳۶) Curzon : *Persia*، لنڈن ۱۸۹۲ء، اشاریہ؛ (۳۷) D. Butyka : *Das ehemalige Wilayet Dersim Mitt. Geogr. Gesell. Wien*، ۱۸۹۲ء، ج ۳۵؛ (۳۸) Maunsell : *Kurdistan Geogr. Journ.*، ۱۸۹۳ء، ۳ : ۸۱ تا ۹۵؛ (۳۹) Maunsell : *Geography of*

(۴۰) : ۱۸۹۴ء Aldershot ،Eastern Turkey in Asia
Hand-book for Travellers in : Sir Charles Wilson
Mission : Morgan (۴۱) : ۱۸۹۵ء لنڈن ،Asia Minor
(اور ۲ ج ۱۸۹۵ء پیرس ،Scient. en Perse Etudes géogr
ایرانی کردستان کے وسطی حصے کا نقشہ): (۴۲) S. G. Wilson:
(۴۳) : ۱۸۹۹ء نیویارک ، Persian life and customs
،Eastern Turkey in Asia, Scot. Geog. Mag.: Maunsell
Mission : Morgan (۴۴) : ۲۴۱ تا ۲۲۵ : ۱۲ ،۱۸۹۶ء
۱۸۹۷ء و ۱ ج ۱۸۹۶ء ،Scient. Recherches archéol.
Notes from a Diary : Lord Warkworth (۴۵) : ۲ ج
: Oppenheim (۴۶) : ۱۸۹۸ء لنڈن ،in Asiat. Turkey
اشاریہ : ۱۹۰۰ تا ۱۸۹۹ء برلن ،Vom Mittelmeer, etc.
،Highlands of Asiat. Turkey : Earl Percy (۴۷)
۱۹۰۱ء لنڈن ،Armenia : Lynch (۴۸) : ۱۹۰۱ء لنڈن
Central Kurdistan : Maunsell (۴۹) : اشاریہ
: K. N. Smirnow (۵۰) : ۱۹۰۱ء ،Geogr. Journ.
Poyezdka, v severn. Kurdistan Izw. Kawk, Otd.
(۵۱) : ۴ عدد ،۱ ج ۱۹۰۴ء تفلس ،Geogr. Obshc
۱۹۰۴ء ،Kurdistan ،The Jewish Encycl. : Lipman
Kurdistan : Grenard (۵۲) : ۵۸۶ تا ۵۸۵ : ۷
(۵۳) : ۲۸۳ : ۹ ،۱۹۰۴ء ،et Arménie la Géogr.
(۵۴) : ۱۹۰۴ء لنڈن ،Dar-ul-Islam : Sir Mark Sykes
،Die Kurden in Nord-Mesopot., Asien : Wiedemann
Voyenno- : Mayewski (۵۵) : ۹ تا ۶ : ۴ ،۱۹۰۴ء
۱۹۰۴ء تفلس ،Statist. opis. Wan. i Bitlis Wilyaet
پیرس ، La Perse d' aujourd' hui : Aubin (۵۶)
Poyezda v Maku, : Minorsky (۵۷) : ۱۹۰۸ء ص ۲۳۳
۱۹۰۹ء سینٹ پیٹرز برگ ، Mater. po Wostoku
Journeys in : Dickson (۵۸) : ۱ تا ۵۳، ۱ تا ۴۲ : ۱۸
تا ۳۵۷ ص ۱۹۱۰ء اپریل ،Kurdistan Geogr. journ.
، Wanderungen in Persien : Grothe (۵۹) : ۳۷۹
A Journey through : Price (۶۰) : ۱۹۱۰ء برلن

،Turk. Arm. and Pers Kurd., J. Manchester G. Soc.
The : Wigram (۶۱) : ۴۶ تا ۳۵ : ۳۰ ،۱۹۱۴ء
Materiali (۶۲) : ۱۹۱۴ء لنڈن ،Cradle of Mankind
و Minorski) ۱۹۱۵ء ،سینٹ پیٹرز برگ ،po Wostoku
: Sir Mark Sykes (۶۳) : (وغیرہ کے سفر نامے Orlow
۲۹۸ ص ۱۹۱۵ء لنڈن ،The Caliph's Last Heritage
سینٹ پیٹرز برگ ،Kurdi : Minorsky (۶۴) : ۳۸۸ تا
Poyezkda po Sewer. : Iyas (۶۵) : ۱۹۱۵ء
(۶۶) : ۱۹۱۵ء سینٹ پیٹرز برگ ، Kurdistanu
Turets Köpers razgran. Izw. Russ. : V. Minorsky
: Hubbard (۶۷) : ۲ د ص ۱۹۱۶ء ،Geogr. Obshe.
(۶۸) : ۱۹۱۶ء لنڈن ،From the Gulf to Ararat
اخبار ٹائمز بابت ،The case of Kurdistan : A. Moore
: Kenneth Mason (۶۹) : ۱۹۱۹ء ،۱۸ ،۱۷ ،نومبر ۱۵
:۱۹۱۹ء دسمبر ،Central Kurdistan Geogr. Journ.
،The Road from Boghdad to Baku : Napier (۷۰)
: Miss Stevens (۷۱) : ۱۹۱۹ء اخبار مذکور، جنوری
(۷۲) : ۱۹۲۳ء لنڈن ، By Tigris and Euphrates
لاہوتی خان : ماسکو ،Kurdistan i Kurdi Nowu Wostok
Two years : Hay (۷۳) : ۷۱ تا ۵۸ : ۴ ،۱۹۲۳ء
The : Ryder (۷۴) : ۱۹۲۴ء لنڈن ،in Kurdistan
در ،demarcation of the Turoo-Persian Boundary
(۷۵) : ۲۴۲ تا ۲۲۷ ص ۱۹۲۵ء ستمبر ،Geogr. Jurn,
برلن ، Die Strasse d. Zehntausend : Klötzel
۱۹۲۶ء۔

(V. MINORSKY)

* **الکُرّاز** : (= دَوّرک، دُورک؛ سپینی و پرتگالی Alcarazas، Alcarrazas)، تنگ گلے کا مٹی کا برتن یا گھڑا جس میں پانی ٹھنڈا رکھا جاتا ھے۔

(C.F. SEYBOLD)

* **کَرّامیہ** : ایک فرقہ جو ابو عبداللہ محمّد بن کَرّام (یا کَرام یا کِرّام) کے نام سے منسوب ھے،

(دیکھیے میزان الاعتدال، ۳: ۲۷ ؛ اور ان کے دور تر اسلاف کے لیے ملاحظہ ہو ابن الاثیر: الکامل، ۷: ۱۴۹) ۔ السجستانی کے خاصے مفصل حالات السمعانی (الانساب، ۴۷۶ ب تا ۴۷۷ الف) میں ملتے ھیں ۔ اس کے بیان کے مطابق یہ بنو نزار سے تھا، موضع زرنج میں پیدا ھوا، سجستان میں پرورش پائی، اس کے بعد خراسان چلا گیا، جہاں مشہور زاھد احمد بن حرب (م ۲۳۴ھ) کے درس میں شریک ھوا ۔ بلخ میں اس نے ابراھیم بن یوسف الماکیانی (م ۲۵۷ھ)، مرو میں علی حجر (م ۲۴۴ھ) سے اور ھرات میں عبداللہ بن مالک بن سلیمان سے استفادہ کیا ۔ وہ احمد بن عبداللہ جویباری (م ۲۴۷ھ) اور محمد بن تمیم فریانانی کے واسطے سے بہت سی احادیث روایت کرتا تھا ۔ یہ دونوں روایت حدیث میں متہم تھے ۔ مکے میں پانچ سال بسر کرنے کے بعد ابن کرام سجستان واپس آیا اور یہاں اس نے اپنی ساری املاک فروخت کر دیں ۔ یہاں سے وہ نیشاپور چلا گیا جہاں کے عامل محمد بن طاھر بن عبداللہ نے اسے (تاج العروس کی رو سے دو موقعوں پر) قید کر دیا ۔ ۲۵۱ھ میں جب اسے رہائی نصیب ھوئی تو وہ نیشاپور چھوڑ کر بیت المقدس روانہ ھوگیا، جہاں اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کرکے ۲۵۵ھ میں وفات پائی ۔ وہاں اس کے پیرووں کی قیام گاہ کا، جو "خانقاہ" کہلاتی ھے، ذکر ایک سو سال بعد مطہر بن طاھر (البدء و التاریخ، طبع Huart، ۵: ۱۴۹) اور المقدسی نے کیا ھے ۔

(۲) عقائد: ابن کرام کے اقوال و افکار ایک کتاب میں مذکور تھے جس کا نام عذاب القبر تھا ۔ ان میں سے بعض اقوال الفرق بین الفرق، ص ۲۰۲ تا ۲۱۴، میں دیے گئے ھیں ۔ اس میں اس فرقے کا جس کے پیرووں سے مصنف کے مناظرے بھی ھوئے تھے، تفصیلی ذکر ملتا ھے ۔ اس کا سب سے بڑا دینی عقیدہ جس کے باعث اس کے فرقے کا شمار مشبہہ میں ھونے لگا، یہ تھا کہ ذات الٰہ ایک جوھر ھے ۔ اس کے بعض پیرووں نے جوھر کے بدلے جسم ھی کہہ دیا، گو ان کے نزدیک یہ جسم اعضاے انسانی پر مشتمل نہیں اور عرش سے ملا ھوا (مماسۃ، جس کے بدلے بعد میں زیادہ نرم لفظ ملاقات مستعمل ھو گیا) ھے جو "فضا (Space) میں واقع ھے ۔ بظاھر یہ عقیدہ قرآنی الفاظ "عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" سے مستنبط ھے ۔ درحقیقت ابن کرام کے بقیہ اعتقادی مسائل میں یہی سعی کار فرما نظر آتی ھے کہ قرآن مجید کی بعض آیات اور ارسطاطالیسی فلسفے کے بعض مسائل میں تطبیق دی جائے، خصوصاً وہ مسائل جن کی بنا مسئلۂ امتیاز جوھر و عرض اور امتیاز حرکت و قوۃ پر ھے ۔ اس طرح اس کے پیرو اس نظریے پر قائم رہ سکے تھے کہ خدا کلام کرنے سے قبل متکلم تھا اور عبادت کرنے والوں کے معرض و جود میں آنے سے قبل بھی اس کی عبادت کی جا سکتی تھی ۔ مسئلۂ قدم عالم کو قرآن کے مسئلۂ خلق کے مطابق ثابت کرنے کے لیے دقیق اور غامض دلائل کام میں لائے گئے ۔ ابن کرام یہ مانتا تھا کہ خدا بعض اعراض کا مورد ھے، مثلاً ارادہ، ادراک، کلام، مماسۃ وغیرہ ۔ ان اعراض پر اسے قدرت حاصل ھے، لیکن اسے عالم اور موجودات عالم پر قدرت نہیں ھے، کیونکہ وہ اس کے ارادے سے نہیں بلکہ لفظ کُنْ سے خلق ھوے ھیں ۔ اس طرح یہ معلوم ھوتا ھے کہ کُنْ فَيَكُوْن میں امر و مضارع کے صیغے اپنے اصلی معنوں میں استعمال کیے گئے ھیں ۔

ان کا ایک اور عقیدہ جس کا حوالہ اکثر کتب کلام میں ملتا ھے، یہ ھے کہ ایمان کا مطلب شہادتیں کو ایک بار زبان سے ادا کرنا ھے

اور اس میں نہ تصدیق قلبی کو دخل ہے اور نہ عمل کو ۔ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ جو مرجئہ کے بنیادی عقیدے سے ملتا جلتا ہے، ابن کرام سے قبل کسی نے پیش نہیں کیا تھا (ابن تیمیّہ : کتاب الایمان، قاہرہ ۱۳۲۵ھ، ص ۵۷، جہاں اس عقیدے کا ابطال کیا گیا ہے) ۔ اس کے بقیہ افکار و نظریات جو الفرق میں دیے گئے ہیں، مائل بہ اعتدال نظر آتے ہیں، چنانچہ عصمت انبیا کے لیے بعض حدود متعین کی گئیں ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے (کسی حد تک ابن طُفیل کے انداز میں) کہ جن لوگوں تک پیام نبوت نہیں پہنچا، انھیں بھی ارشادات نبوی پر ایمان لانا چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ہی زمانے میں دو امام بھی ہو سکتے ہیں اور ہر ایک کا حق ہے کہ اس کے متبعین اس کی اطاعت کریں، خواہ ان دونوں اماموں میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو ۔ فروع کے بارے میں اس کی بدعتیں کچھ اس قسم کی تھیں کہ ان سے قانون شریعت میں زیادہ لچک پیدا ہوگئی ۔

(۳) فرقۂ کرامیہ کی تاریخ : معلوم ہوتا ہے کہ کرّامی عقیدہ زیادہ تر خراسان میں پھیلا اور ۳۷۰ھ میں الفرق کے مصنف نے سامانی سپہ‌سالار محمّد بن ابراہیم بن سمجور کے سامنے اس فرقے کے ایک رکن سے مناظرہ کیا ۔ اس فرقے کو سبکتگین شاہ غزنہ کی حمایت حاصل تھی، کیونکہ وہ ابو بکر اسحٰق بن مَحْمَشاذ (م ۳۸۳ھ) کا، جو اس کے زمانے میں کرّامیوں کا امیر تھا۔ اس کے زہد و تقوٰی کی وجہ سے بہت احترام کرتا تھا۔ اسی ابو بکر کی بابت کہا گیا ہے کہ اس نے پانچ ہزار ذمیوں کو مشرف باسلام کیا تھا ۔ اسی کے بیٹے محمّد نے محمود بن سبکتگین کو باطنیوں پر سختی اور تشدد کرنے پر اکسایا ۔ اس واقعے کی صداے بازگشت صوفی ابو سعید کی سوانح حیات (ص ۳۵۷ تا ۴۰۴، طبع Jhukowski ۱۸۹۹ء، ۱ : ۸۴ تا ۹۱) میں سنائی دیتی ہے، جہاں بیان کیا گیا ہے کہ اسحٰق بن مَحْمَشاذ نے قاضی سعید (حنفی) سے مل کر صوفی موصوف کے خلاف متحدہ محاذ بنایا تھا ۔ اس وقت نیشاپور میں کرّامیوں کی تعداد بیس ہزار تھی ۔ بہرحال ۴۰۳ھ میں قاضی مذکور نے جو حج کر آیا تھا اور جس پر خلیفہ القادر کی نگاہ التفات تھی، غزنہ میں محمود کے سامنے کرّامیہ کے الحاد کی شکایت کی۔ محمّد بن اسحٰق کرّامیہ عقائد سے منکر ہو گیا اور جو لوگ اسے علی الاعلان مانتے تھے انھیں سزا دی گئی ۔ پھر بھی نیشاپور میں بہت سے لوگ اس پر قائم رہے ۔ ابن الأثیر کے ہاں ہمیں ایک عوامی جنگ کا ذکر ملتا ہے جو ۴۸۸ھ میں شہر نیشاپور میں ہوئی تھی ۔ اس میں ایک طرف کرّامی تھے اور دوسری طرف حنفیوں اور شافعیوں کی متحدہ طاقتیں ۔ ان جماعتوں کے رہنما محمود کے زمانے کے شیوخ کی اولاد میں سے تھے ۔ یاقوت نے (بذیل مادّۂ بِجِستان) ایک کرّامی مبلغ کا ذکر کیا ہے، جس نے چوتھی صدی ہجری کے وسط میں نیشاپور کے لوگوں میں بڑا رسوخ پیدا کر لیا تھا ۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (م ۵۶۱ھ؛ غنیۃ، قاہرہ ۱۲۸۸ھ، ۱ : ۸۱) نے لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں بھی کرّامیہ کی ایک بڑی تعداد خراسان میں موجود تھی ۔ فخرالدّین الرّازی (م ۶۰۶ھ؛ اساس التقدیس، قاہرہ ۱۳۲۸ھ، ص ۹۶ تا ۹۸) کا بظاہر یہ خیال ہے کہ وہ اس کے زمانے تک موجود تھے، تاہم قرین قیاس یہ ہے کہ جب چنیگیز خان کے فوجی سرداروں نے خراسان کے باشندوں کا قتل عام کیا تو اس فرقے کی بھی درحقیقت جڑ کٹ گئی ۔ جب زمانۂ مابعد کے مصنفین ان کے عقائد کا حوالہ دیتے ہیں (مثلاً ابن تیمیّہ اور مواقف کا مصنف) تو غالباً وہ

اپنی معلومات گزشتہ زمانے کی تصنیفات سے اخذ کرتے ہیں ۔

(۴) اس فرقے سے متعلق تصنیفات : الفرق میں لکھا ہے کہ یہ فرقہ تین شاخوں میں منقسم تھا، لیکن ان کے درمیان باہمی روا داری تھی ۔ یہ شاخیں حقاقیہ، طرائقیّہ اور اسحاقیّہ کے نام سے مشہور تھیں۔ الشّہرستانی نے ان کے بارہ ضمنی فرقوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے چھے کا اس نے نام لیا ہے، یعنی اسحاقیّہ (مذکورۂ بالا) عبْدیّۃ، نونیّۃ، زْربیبۃ، واحدیۃ اور ہیْصَمیّۃ۔ ان میں سے پہلا تو بلاشبہہ اسحٰق سے منسوب ہے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے اور آخری ایک شخص محمّد بن الہیْصم سے جسے المیزان میں اس فرقے کا متکلم کہا گیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان ضمنی فرقوں کے بانیوں نے جن تصنیفات میں اپنے نظریات پیش کیے تھے، وہ عوام میں زیادہ پھیل نہ سکیں ۔ بیان الادیان کا مصنف (م ۔ ۴۸۵؛ Chrestomathie Persane : Schefer، ۱ : ۱۵۲ متن)، اگرچہ غزنہ میں رہتا تھا، لیکن وہ محض مرکزی فرقے کے نام ہی سے واقف تھا اور عبدالقادر (محل مذکور) نے کرامی مصنفین کا نام پیش کرتے ہوے ہر جگہ غلط نام لکھا ہے ۔ بانی فرقہ کی تصنیف عذاب القبر کا پتا بھی صرف ان اقوال سے چلتا ہے جو الفرق میں درج ہیں ۔

مآخذ : تصنیفات مذکورۂ بالا کے علاوہ دیکھیے:

(۱) تاریخ یمینی، دہلی ۱۸۴۷ء، ص ۴۲۹ ببعد، قاہرہ ۱۲۸۶ھ، ۲ : ۳۱۵ ببعد؛ (۲) المقْریزی : الخطط، ۲ : ۳۵۷؛ (۳) Van Vloten، در Actes du IIe Congres int. d. Orientalistes، پیرس ۱۸۹۹ء، فصل ۳، ص ۱۱۴؛ (۴) Hortcn : Die philos. Systeme، ص ۳۴۰ ببعد؛ (۵) Barthold : Tu kestan، ص ۳۰۶ .

(D. S. Margoliouth)

* **کرسون :** (قدیم Cerasus) نقشوں میں Kerassounde؛ ایک قصبہ اور بندرگاہ جو ایشیاے کوچک میں بحیرۂ اسود کے کنارے واقع ہے ۔ کرسون طربزون کی سنجاق اور ولایت کی ایک قضا کا صدر مقام ہے اور شہر طربزون سے ۷۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ کل آبادی بارہ ہزار ہے (نصف مسلمان اور نصف یونانی کلیساے قدیم کے پیرو اور ارمنی ہیں) ۔ یہ قصبہ ایک پہاڑی راس کے سرے پر آباد ہے ۔ ماہر نباتات Tournefort کے بیان کے مطابق ابھی تک وہاں شاہ دانہ (Cherries) کے درختوں کا ایک جنگل ہے جس کی وجہ سے یہ قصبہ اس نام سے موسوم ہوا تھا کیونکہ یہیں سے Lucullus نے شاہ دانہ یورپ میں درآمد کیا تھا ۔ اس ذریعۂ آمدنی کی جگہ اب گری‌دار میووں (nuts) (ساڑھ لاکھ پونڈ سالانہ پیداوار) اور پھلیوں (Beans) (دس لاکھ اوقہ = اڑھائیس لاکھ پچیس‌ہزارپونڈ سالانہ) کی برآمد نے لے لی ہے ۔ قدیم زمانے کی فصیل، نیز ایک قلعے اور شہر کے ایک دروازے کے کھنڈر موجود ہیں ۔ کچھ فاصلے پر مدور تماشا گاہ (ایمفی تھیٹر) کے بقیہ آثار نظر آتے ہیں۔ قصبے کے شمال میں ایک بحری پشتے (Mole) کے کھنڈر ہیں، جنھیں بالکل معمولی خرچ سے صاف کروا کے یہ جگہ بندرگاہ بنائی جا سکتی ہے، جس کے اندرون ملک کے علاقوں کی پیداوار کو برآمد کرنے میں آسانی ہو جائے گی ۔ اس قصبے میں ۱۱ مسجدیں، ایک تکیہ ۹ یونانی گرجا اور ۲ ارمنی گرجا موجود ہیں ۔ اس میں سپاہیوں کے لیے بارکیں اور ایک اسلحہ خانہ بھی ہے ۔ Xenophon نے جس Kerasos کا ذکر کیا ہے وہ کرسون درے کی وادی میں واقع تھا ۔ موجودہ قصبہ اس شہر کے محل وقوع پر آباد ہے جسے Pontus کے بادشاہ Mithradates ہفتم کے دادا فارنے سس Pharnaces اول نے بنایا تھا اور اس کا نام اپنے نام پر فرنیشیا Pharnaceia رکھا تھا .

کرسون کی قضا میں ۱۳۸ گاؤں اور ۴ ناحیے ہیں؛ یہاں معتدل بحری موسم رہتا ہے ۔ اس کے پہاڑ جو اصلاً آتش فشاں ہیں، اس ضلع کے تقریباً نصف حصے پر پھیلے ہوے ہیں اور اب ان پر جنگل چھا گئے ہیں ۔ یہاں کے ساحلی باشندوں کا پیشہ ماہی گیری ہے اور اندرون ملک کے رہنے والے کان کنی کرتے ہیں (کانوں سے نقرہ دار سیسا (Argentiferous Lead) لوہا، تانبا، اور سرمہ نکلتا ہے)، اس قضا کی کل آبادی اسی ہزار (ساٹھ ہزار مسلمان، بیس ہزار یونانی کلیساے قدیم کے پیرو) نفوس پر مشتمل ہے ۔

مآخذ : (۱) علی جواد : جغرافیہ لغاتی، ص ۸۵۶؛ (۲) V. Cuinet : *Turquie d' Asie*، ۱ : ۷۳ ببعد؛ (۳) Ch. Texier : *Asie Mineure*، ص ۶۱۹، عمود ۱ ۔

(Cl. Huart)

کُرسی : ایک معروف عربی لفظ؛ (اس کی آرامی شکل : کُرسِیا بمعنی تخت (اور عبرانی : کِسّےہ؛ Nöldeke : *Mandäische Grammatik*، ص ۱۲۸ : S. Fraenkel : *Die Vocabulis Peregrinis*، ص ۲۲)، یہ لفظ قرآن مجید میں صرف دو دفعہ آیا ہے (۲ [البقرۃ] : ۲۵۵؛ ۳۸ [صٓ] : ۳۴) ۔ پہلی جگہ جس آیت میں یہ لفظ وارد ہوا ہے اس کا نام آیۃ الکرسی ہو گیا ہے ۔ اس میں اشارہ خداے تعالٰی کے تخت کی طرف ہے جس کی وسعت آسمان اور زمین پر حاوی ہے ۔ [کرسی سے مراد علم الٰہی لی گئی ہے ۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہی معنی منقول ہیں اور متعدد صحابہ نے ان کی پیروی کی ہے ۔ کرسی کے دوسرے معنی قدرت و حکومت کے بھی ہیں (الکشاف)] ۔ دوسری عبارت میں حضرت سلیمانؑ کا ذکر ہے ۔ اللہ تعالٰی کے تخت کے لیے دو لفظوں، عرش اور کرسی، کے استعمال کے بارے میں مفسرین میں اختلاف راے رہا ہے ۔ بعض کے خیال میں کرسی وہ چوکی ہے جو تخت کے آگے بچھی ہوتی ہے جس پر بادشاہ اپنے پاؤں رکھتا ہے ۔ دیکھیے الطبری : التفسیر، ۵ : ۳۹۸، ۳۹۹، مطبوعہ دارالمعارف، قاہرہ) بحالیکہ بعض نے اس کو محض عرش کا مرادف تصور کیا ہے (الحسن البصری، در کتاب مذکور) ۔ دوسری آیت میں جس طرح اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے ، یعنی "ایک تخت جو بیٹھنے کے کام آتا ہے" ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں، یہ عرش کا مرادف ہے ۔

ایک مربع شکل کی بلند چیز کا تصور (جو لفظ عرش کا بھی اصلی مفہوم ہے) ان سب مختلف معانی میں مضمر ہے جو اس لفظ نے اختیار کیے ہیں؛ چنانچہ کسی مستطیل کی چار اطراف کو جن کا مقصد کسی لفظ کے حروف یا کچھ کلمات کا احاطہ کرنا ہوتا ہے اس نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ فارسی میں ان چار اطراف کو خطوط کرسی کہا جاتا ہے اور خود اس مستطیل کو کرسی بندی (Huart : *Calligraphes*، ص ۳۵۲) ۔ ایرانی اس لفظ کو ایسے چوکھٹے کے لیے استعمال کرتے ہیں جس پر اون یا نمدے کا ایک قالین تان دیا جاتا ہے اور اس کے نیچے ایک انگیٹھی رکھ دی جاتی ہے ۔ جاڑے کے موسم میں ٹانگوں کو گرمائی پہنچانے کے لیے انھیں اندر کی طرف قالین کے نیچے پھیلا دیتے ہیں (ترکوں کا "تَنْدِر" Polak : *Persin*، ۱ : ۶۵؛ Fraser، ۲ : ۱۸۸) ۔ عرب اس نام کا اطلاق مندرجۂ ذیل اشیا پر کرتے ہیں : مکّے میں ایک قسم کی سیڑھی یا صندلی، یعنی چار (آج کل چھے) پہیوں کا ایک متحرک زینہ جس میں نو سیڑھیاں ہوتی تھیں اور جسے کعبے کی دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا اس طرح کہ اس کا اوپر کا سرا کعبے کی چوکھٹ کے برابر آ جاتا تھا (ابن جبیر : الرحلۃ، ص ۹۱؛ ابن بطّوطہ، ۱ : ۳۰۹؛

Dozy : Supplement، ۲ : ۴۵۵)؛ رحل، جس پر قرآن مجید رکھا جاتا ہے (المقرّی، ۱ : ۴۰۴)؛ اصطرلاب کا ایستادہ (اسٹینڈ)؛ منجنیق کی گاڑی؛ تین یا چار آدمیوں کے لیے ایک پشت دار نشست؛ ایک میز؛ جس پر کوئی کھانے کا برتن رکھ دیا جاتا ہے (Lane : Modern Egyptians، ۱ : ۱۹۵)؛ ایک ایستادہ، جس پر رات کے وقت عمامہ اتار کر رکھ دیا جاتا ہے (کرسیّ العمامہ، Dozy : Vetements، ص ۳۴۴، عدد ۱؛ Lane : Modern Egyptians، ۱ : ۵۰، ۲۲۱) : ایک ہولڈر، جس میں کسی نوک دار چیز کا نیچے کا سرا لگا دیا جاتا ہے (J.A.، ۱۸۵۰ء، ۱ : ۲۵۱)؛ طنبور بجانے کی مضراب (Description de l' Egypte، ۱۳ : ۲۵۱).

مراکش کے لوگ چوکور یا تکونی چاندی کی ڈبیوں (لاکٹ) کو، جنھیں وہ ہار میں آویزاں کرکے گلے میں پہنتے ہیں، ان کی شکل کی مناسبت کی بنا پر اس نام سے پکارتے ہیں (Dozy و Engelmann : Glossaire des mots espagnole، بذیل مادّہ؛ Beaussier، ص ۸۴د) ۔ چقماق سے چلنے والی بندوق کے گھوڑے کی ٹوپی اور رنجک دان کے سہارے کو بھی کرسی کہا جاتا ہے؛ نیز انگوٹھی کا وہ حصہ جس میں نگ جڑا جاتا ہے؛ جہاز رانی کی اصطلاح میں وہ نشست جہاں سے جہاز کی رہنمائی کی جاتی ہے (Breaussier، محل مذکور)؛ ایک خاص شکل کی نشست جس پر وضع حمل کے وقت عورت بیٹھ جاتی ہے (کرسی الوِلادۃ) (Lane، ۲ : ۲۷۵) ۔ مجازاً یہ لفظ کسی سلطنت کے پاے تخت، بادشاہی محل، کسی بطریق یا اسقف کی جاے قیام کے لیے استعمال ہوتا ہے (Dozy : Supplement، ۲ : ۴۵۶؛ Cuche : Dict. ar. franc، بذیل مادّہ) .

(Cl. Huart)

* کِرِشْں : رک بہ کریج .

* کَرْشُونی : ایک اصطلاح، جس کی اصلیت ابھی تک معلوم نہیں ہوئی ؛ اس کا اطلاق سریانی زبان کے ان حروف تہجی پر کیا جاتا ہے جن کو بعد از تصرف عربی زبان کے مطابق بنا لیا گیا ہے ۔ طَرسُوس کے اسقف اعظم یوسف دَرِیان نے حال میں اس نام کے بارے میں ایک مقالہ لکھا ہے (المشرق، ۷ (۱۹۰۴ء): ۷۸۵ تا ۷۹۰)، لیکن اس نے اس نام کا اشتقاق ایک غیر معروف سریانی لفظ کَرکونی Karkūnē سے بتایا ہے، جو کَرکا Karka کا مصغر ہے؛ اس کی رو سے ان حروف ہجا کی تعریف "چھوٹے" یا "گول" ٹھیرتی ہے، جو بالکل غیر اغلب ہے ۔ جس طرح یہودی اپنے نہ صرف اِخفا کی غرض سے بلکہ اپنی قومیت کی علامت کے طور پر بھی اپنے حروف ہجا کو ان ملکوں کی زبان نقل کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے جہاں وہ پناہ گزیں ہوتے تھے، اسی طرح اہل شام نے بھی جب روزمرہ کے استعمال کے لیے فاتحین کی زبان ، یعنی عربی اختیار کی تو اسے لکھنے کے لیے لازمًا اپنے حروف ہجا سے کام لیا ہوگا ۔ جو حروف سریانی میں مفقود تھے ان کی جگہ پہلے سے موجود حروف پر نقطے لگا کر پر کر دی گئی ، لیکن ایسا کرنے میں عربی حروف کی شکل کے مقابلے میں ان کی آواز پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی ۔ مثال کے طور پر خاء کو بالعموم سریانی کاف اور غین کو ، کاما کے ساتھ گامل سے ادا کیا جاتا ہے ۔ جیم کو یعقوبی (Jacobites) عمومًا اس حرف میں ایک نقطہ لگا کر ادا کرتے ہیں اور نَسطوری (Nestorians) اس کے نیچے ایک قلّابہ (hook) بنا کر ۔ زاء اور ضاد کو عربی طریقے کے مطابق طیت (Tēth) اور صادی (Ṣādai) کے اوپر نقطوں کے ساتھ لکھتے ہیں، لیکن یعقوبیوں کے ہاں انھیں اکثر طیث (Tē<u>th</u>) کے اندر ایک نقطہ لگا کر لکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ دونوں تلفظ میں

یکساں ہوگئے تھے ۔ آخر کلمے کی علامت تانیث کو بالعموم ہی He سے ظاہر کیا جاتا ہے، جس کے اوپر عربی دستور کے مطابق دو نقطے ہوتے ہیں ۔ اعراب کی ترتیب بعض دفعہ سریانی اور بعض دفعہ عربی طریقے سے ہوتی ہے ، لیکن واو معروف (ū) اور یای معروف (ī) کی آوازیں تقریباً ہمیشہ ضمے اور کسرے سے ظاہر کی جاتی ہیں ۔ مختلف وقتوں اور جگھوں میں اس بارے میں جو مختلف قواعد رائج تھے رہے ان کا اندازہ صرف اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب متعلقہ مخطوطات کی صحیح طور پر چھان بین کر لی جائے، لیکن اب تک اس قسم کا کوئی اقدام عمل میں نہیں آیا ۔

(C. BROCKELMANN)

* **کَرْشی** : اویغور زبان کا ایک لفظ، جو قلعہ اور محل کے معنوں میں آتا ہے؛ یہ غالباً مشرق ترکستان کی کسی مقامی زبان سے مستعار لیا گیا اور بعد ازاں مغول نے اسے اختیار کر لیا ۔ شہر نَخْشَب[رکّ باں] یا نَسَف کا موجودہ نام کَرْشی اس محل کی وجہ سے ہوگیا جو خان کَبَک (۱۳۱۸ تا ۱۳۲۶ء؛ رکّ بہ جِغتای خانیہ) کے لیے شہر سے دو فرسخ دور بنوایا گیا تھا اور جس کا نشان مدت ہوئی بالکل مٹ چکا ہے (دیکھیے شرف الدّین یزدی : ظفر نامہ، طبع محمّد الہ داد، کلکتہ ۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ء، ۱ : ۱۱۱؛ Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۴۷۰ ببعد ؛ سامی بک : [قاموس الا علام، ۵ : ۳۸۴۵] ۔

(W. BARTHOLD)

* **کَرَک** : رکّ بہ حِصْن الأ کْراد ۔

اَلْکَرَک : ایک قلعہ، جو بحیرۂ مردار کے مشرق میں قدیم موآب (Moab) میں واقع ہے ۔ لفظ الکرک آرامی لفظ کَرْخا (= شہر) سے نکلا ہے ، جیسے "تَرگوم" میں موآب کے مقامات کے ناموں، مثلاً قیر موآب (اشعیا، ۱۵ : ۱) اور قیر حارس (یا حارسۃ؛ اشعیا، ۱۶ : ۷، ۱۱؛ ارمیا، ۴۸ : ۳۱، ۳۶) میں لفظ قیر کی جگہ استعمال ہوا ہے ۔ بطلمیوس (۵ : ۱۶، ۴) کے ہاں، ماذبہ کے پچی کاری سے بنے ہوے نقشے میں اور استفانوس بوزنطینوس وغیرہ میں یہ لفظ Χαρακμωβα کی صورت میں ملتا ہے ۔ اس کا محل و قوع پہاڑ کی ایک الگ تھلگ تقریباً عمودی تیز کنارہ ڈھلواں شاخ پر ہے، جس کو بڑی پہاڑی سے فقط ایک ابھرواں اونچا ٹیلا (جسے مصنوعی طور پر کھود کر گہرا کیا گیا ہے) ملاتا ہے ۔ اس محل و قوع کی بدولت الکرک غیر معمولی طور پر ایک مستحکم قلعہ بن گیا ہے ۔ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ شرق اردن کی اسلامی فتوحات کے سلسلے میں، یا اس کے بعد کی صدیوں میں، اس کا ذکر نہیں آتا ۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں جب شاہ فُلکو Fulco کے سابق ساقی پیان Payan نے اس کی مورچہ بندی کی تو وہ اپنا تاریخی کردار انجام دینے لگا اور یہ کردار بہت نمایاں تھا ۔ اس زمانے کے عیسائی ، جو جغرافیے سے اچھی طرح واقف نہیں تھے، یہ سمجھے کہ قدیم پِترہ Petra یہیں واقع تھا؛ چنانچہ وہ اسے پِترہ صحرائی (Petra deserti) کہنے لگے ۔ چونکہ دمشق سے جانے والے حاجیوں کا راستہ اور شام اور مصر کے درمیان آنے جانے والے قافلوں کی شاہراہیں اس کے سامنے سے گزرتی تھیں، اس لیے اس قلعے کی وجہ سے مسلمانوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ نور الدّین اور صلاح الدّین نے ۵۶۵ھ/۱۱۷۰ء سے شروع کرکے کئی بار اس کا محاصرہ کیا، لیکن ہر بار ناکام رہے ۔ آخر کار قلعے کی فوجیں بھوک پیاس سے تنگ آ کر ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء میں صلاح الدّین کے بھائی ملک العادل کے سامنے ہتیار ڈالنے پر مجبور ہوگئیں اور صلاح الدّین کی وفات کے بعد یہ قلعہ

ملک العادل ھی کے حصے میں آیا ۔ اس کے بعد کئی سال تک اس پر مختلف ایوبی فرمانروا قابض رہے، حتّٰی کہ جب اس خاندان کے بیشتر بادشاھوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی تب بھی المغیث العمر بدستور الکرک میں حکمران تھا ۔ بالآخر بَیبَرس نے دھوکے سے قلعے پر قبضہ کر لیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا (۶۶۱ھ/ ۱۲۶۳ء) .

ایک حقیقۃً مستحکم حکومت قائم کرنے کے لیے جب مملوک سلطان ناصر ۷۰۸ھ/۱۳۰۹ء میں قاھرہ سے فرار ھوا تو اسے اسی قلعے کی مستحکم چار دیواری کے اندر پناہ ملی ۔ اس زمانے میں الکرک ان "مملکات" میں سے ایک کا صدر مقام تھا جس میں شام اور فلسطین منقسم تھے ۔ الکرک کے زیر حکومت علاقہ زیادہ تر اس کے جنوب میں واقع تھا ۔ یہ قلعہ، جس کی بیشتر آبادی اس وقت تک عیسائی تھی، اس زمانے میں کس قدر مستحکم تھا اس کا اندازہ الدمشقی، یاقوت العمری اور خلیل الظاھری کے بیانات سے ہو سکتا ہے ۔ ترکوں کے عہد میں اس کی اھمیت جاتی رھی تاآنکہ عثمانی حکومت نے الکرک کے اندر ایک مضبوط حفاظتی دستہ متعین کرکے اس کو ایک علٰحدہ انتظامی ضلع کا صدر مقام بنا دیا ۔ اس کی فصیل کا زیادہ حصہ از منۂ وسطٰی کا بنا ھوا ہے اور اس کے زیریں حصے کا تعلق اس سے بھی قدیم زمانے سے ہے .

مآخذ : (۱) P. Thomsen : *Loca sancta*، ص ۱۱۳؛ (۲) الدمشقی، طبع Mehren، ص ۲۱۳؛ (۳) یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۲۶۲؛ (۴) ابو الفداء، طبع Reinaud و de Slane، ص ۲۴۷؛ (۵) R. Hartmann : *Die geogr. Nachrichten* در خلیل الظاھری : زبدۃ الکشف الممالک، Kirchhain ۱۹۰۷ء، ص ۴۴ ببعد؛ (۶) *Zeitschr. d. Deutsch. Morgenl. Ges.*، ۷۰ : ۱۸؛ (۷) ابن الأثیر، طبع Tornberg، ۱۱ : ۲۳۲ و بمواضع کثیرہ، نیز ۱۲ : ۱۲، ۶۲ ببعد، ۲۱۴، ۲۳۰، ۳۱۶؛ (۸) Wilken : *Gesch. der Kreuzzüge*، ۲ : ۶۱۶ و ۳ : ۲، ۱۵۰، ۲۰۷، ۲۳۵، ۲۹۸؛ (۹) Tristram : *Land of Moab*، ص ۷۰ ببعد، ۱۰۵؛ (۱۰) Duc de Luynes : *Voyage d' exploration à la Mer morte*، ۱ : ۹۹ ببعد و ۲ : ۱۰۶ ببعد؛ (۱۱) A. Musil : *Arabia Petraea*، ۱ : ۴۵ تا ۶۲ (مع تصاویر و اقتباسات)؛ (۱۲) R. Hartmann : *Ztschr. d. Deutsch. Palästina-Vereins*، ۳۶ : ۱۹۴؛ (۱۳) *Mitt. u. Nachr. des Deutsch. Palästina-Vereins*، ۱۸۹۵ء، ص ۶۸ ببعد و ۱۸۹۶ء، ص ۴۵ .

(FR. BUHL)

کَرکَرَہلی : قازقوں کا ایک گاؤں، جو علاقۂ سمی پلاٹنسک Semiplatinsk میں ایک ضلع کا صدر مقام اور ۴۹ درجے ۲ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۶۷ درجے ۷ دقیقے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے ۔ [۱۹۲۵ء میں] اس کی کل آبادی ۳۰۰۰ تھی، جس میں دو تہائی مسلمان تھے .

(W. BARTHOLD)

کَرکُور : (یہ لفظ قاموس اور تاج میں نہیں ملا اور نہ المنجد وغیرہ لغات مختصرہ میں، جو یہاں موجود ھیں)، پتھروں کا، بالخصوص مقدس پتھروں کا ڈھیر ۔ پتھروں کے ڈھیر کی تقدیس کا مسلک نہایت قدیم زمانے سے چلا آتا ہے اور تمام دنیا میں پھیلا ھوا ہے ۔ اس کی بنیاد صحیح طور پر پتھروں کی عبادت پر نہیں بلکہ ایک رسم پر ہے جسے کسی بلا کے ٹالنے یا منتقل کرنے کے لیے ادا کیا جاتا تھا ۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص ایک پتھر ہاتھ میں اٹھا کر اس اپنی بلا کو، خواہ وہ کسی قسم کی ہو اس پتھر کی طرف منتقل کر دیتا (چاھے سستی اور تھکن ہو، کوئی

جسمانی یا قلبی تکلیف ہو، گناہ ہو، کوئی خطرناک دیو یا بھوت ہو جو بعض مقدس مقامات کے قرب و جوار میں انسان کو چمٹ جاتا ہے یا یہ سب کی سب بلائیں اکھٹی ہوں)؛ اس پتھر میں منتقل کر دیتا اور پھر اس پتھر کو اپنی بلا سمیت دور پھینک کر یا کسی ایسی جگہ میں ڈال کر جو اس پتھر میں سے اس بلا کو چوس لے، اس سے نجات حاصل کر لیتا تھا ۔ بلا سے چھڑانے والے ان پتھروں کے جمع ہو جانے سے پتھروں کے وہ مقدس ڈھیر بن جاتے تھے جو سڑکوں کے کنارے کنارے، دشوار گزار دروں اور مقدس جگھوں کے دروازوں پر پڑے دکھائی دیتے تھے ۔ ان ڈھیروں کے اوپر ویسا پتھر لا کر ڈالنا یا رکھنا یا پتھروں کا چھوٹا سا مخروطی مینار بنانا زائرین کے ضروری مناسک میں شمار ہونے لگا اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے قدیم رسم اپنی اصل صورت کھو بیٹھی اور اب اس رسم ہی کو اصل عبادت رسم سمجھا ہے (دیکھیے R. Dussaud : *La Matérialisation de la prièr en Orient* در *Bull. et Mém de la Soc. d' Anthr. de Paris*، ۱۹۰۶ء، ص ۲۱۳ تا ۲۲۰) ۔ کُرکُور اکثر ایسی جگھوں پر بنے ملتے ہیں جہاں کوئی قتل کیا ہوا شخص مدفون ہو ۔ کہتے ہیں کہ اس کی تہ میں یہ خواہش مضمر ہے کہ پتھر ڈال کر اس کی قبر کو اور زیادہ دبا دیا جائے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی روح کو قبر سے باہر آ کر بدلہ لینے کی سوجھ جائے ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان پتھروں کے جمع کرنے سے مردے کا احترام مدنظر ہے، لیکن یہ وجہ دل کو زیادہ نہیں لگتی ۔ ان پتھروں کے پھینکنے کی مناسب تر توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ دفع بلا کی رسم کا ایک حصہ ہے [کہ پتھر ایسی جگہ پھینکے جائیں جو خطرناک ہو، مثلاً قبر، جہاں سے بلا کو موت بآسانی لے لے، یا جہاں ساحرانہ قوتوں کا قرب ہو] ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرکور کی تہ میں رسوم تطہیر پوشیدہ ہیں ۔

عرب کے دورِ جاہلیت میں پتھر اٹھا کر ڈالنے اور مقدس پتھروں کے ڈھیروں کی رسم پائی جاتی تھی ۔ [لیکن منٰی کی رمی جمار (کنکریاں مارنا) کا اس رسم سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ۔ مناسک حج میں رمی جمار نہ تو کسی مدفون شخص کی قبر پر کیا جاتا ہے اور نہ وہاں ڈھیر جمع رہتے ہیں] [دیگر توجیہات کے لیے رک بہ حج] ۔ G. Demombynes (*LePèlerinage à la Mekka*، باب ۱) نے بتایا ہے کہ جس طرح پتھروں کے نشانات مواقیت پر حرم مکہ کی حدود بتاتے ہیں اسی طرح کے نشانات وسط ایشیا سے لے کر شمالی افریقہ تک سڑکوں کے ساتھ ساتھ ان جگھوں پر ملتے ہیں جہاں سے مقدس مقامات قریب آنے لگتے ہیں ۔ عیسائی ملکوں میں بھی اس امر کی مثالیں پائی جاتی ہیں ۔

مسلمانوں نے پتھر کے ڈھیروں کی عبادت اپنے تمام مفتوحہ ملکوں میں پائی ۔ بعض علاقوں میں کرکور خاص طور پر بکثرت پائے جاتے ہیں، مثلاً شام میں، لیکن پوجا کا یہ طریقہ کہیں بھی اس قدر پرجوش نہیں، جتنا کہ شمالی افریقہ میں بالخصوص مراکش کے جنوب میں، جہاں رہ کر ای ڈاوٹے E. Doutté نے خاص طور پر اس کا مطالعہ کیا ہے ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں ایسا کوئی درہ، گھاٹی یا چوراہا نہیں، جہاں پتھروں کا کوئی چھوٹا سا مینار نہ ہو، یا کوئی بڑا کرکور نہ ہو جس میں ہر کوئی وہاں سے گزرنے والا اپنی کنکری کا اضافہ نہ کرتا ہو اور کوئی دیہاتی خانقاہ ایسی نہیں جہاں پتھروں کا مقدس ڈھیر نہ ہو [اگر اس کی تہ میں شرک یا کفر کا کوئی شائبہ ہے تو حقیقی اسلام اس سے بالکلیہ براءت کا اظہار کرتا ہے] ۔ یوں پتھر

راستے کی علامت یا فاصلے کی تعیین یا جگہ کے تقرر کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں ۔

مآخذ : اس موضوع کے مآخذ بہت وسیع ہیں ۔ عام نظریے سے اہم مآخذ کا ذکر فریزر نے *Golden Bough*، بار سوم، حصۂ ۶ : *The Scape-goat*، ص ۸ تا ۳۰ میں کر دیا ہے جہاں چند مسلم ممالک کا حوالہ بھی دیا ہے ۔ مسلمانوں کے نظریے سے *Merrakech* : Doutté، پیرس ۱۹۰۵ء، ص۵۸تا۱۰۸، ۲۱۰) وهی مصنف : *Magie et religion dans l' Afrique du Nord*، الجزائر ۱۹۰۸ء، باب ۱ میں ذکر ہے ۔ مؤخرالذکر کتاب کے شائع ہونے کے بعد *The Moorish Conception of* : E. Westermark *Holiness* (*Baraka*)، Helsingfors، ۱۹۱۶ء، ص ۲۶ ببعد (مراکش پر) ملاحظہ ہو ۔

(HENRI BASSET)

کرکُوک : عراق کا ایک قصبہ جو ۴۴ درجے ۲۵ دقیقے طول بلد مشرق اور ۳۵ درجے ۲۵ دقیقے عرض بلد شمالی پر واقع ہے ۔ یہ اس ضلع کا سب سے بڑا قصبہ ہے جو شمال مغرب میں الزاب الصغیر، جنوب مغرب میں جبل حمرین، جنوب مشرق میں دیالا اور شمال مشرق میں زاگروس Zogros کے سلسلے سے گھرا ہوا ہے ۔ یہ علاقہ جو قدیم سلطنت بابل، بلکہ اس کے بعد اشوری سلطنت کے زمانے میں بھی شمال مشرق کے کوهستانیوں کے حملوں کا اکثر نشانہ بنا رہتا تھا، ساسانیوں کے عہد میں یہ گرمکان کے نام سے مشہور تھا (موسی سکنہ خرنہ) اور سریانی مآخذ میں اس کا نام بیتھ گرمہ ملتا ہے ۔ اس شناخت کا ثبوت G. Hoffman نے پیش کیا تھا (*Auszüge aus syrischen Akten Persischer Mürtyrer, Abh. für die Kunde des Morgenlandes*، ج ۷، شمارہ ۳، ص ۲۶۷ ببعد) ۔ اس قصبے کے شہدا کی تاریخ (کتاب مذکور، ص ۴۳ ببعد) میں بیان کیا گیا ہے کہ اشوری بادشاہ سردنا نے اسے میڈیا والوں کے خلاف بطور ایک فصیل کے تعمیر کرایا تھا ۔ آگے چل کر سلیوکس نے قلعے میں ایک برج بنوایا جس کے بعد سے قصبے کا نام سلیوکس (سلوخ) پڑ گیا، لیکن قلعہ سربوی یا سربوگ کے نام سے مشہور ہو گیا (دیکھیے *Eransahr* : Marquart، ص ۲۱) ۔ عہد ساسانیان میں یہ قصبہ نسطوریوں کا ایک مشہور و معروف مرکز بن گیا ۔ بیتھ گرمہ کا صدر اسقف یہیں رہتا تھا اور یہیں یزد گرد ثانی کے دور حکومت (۴۳۸ تا ۴۵۷ء) میں عیسائیوں پر وہ جبر و تشدد ہوا جس کا حال مذکورۂ بالا تاریخ شہدا میں بیان کیا گیا ہے ۔

عیسائی تو اس قصبے کو بدستور پرانے سریانی نام یا عربی میں الکرخ سے یاد کرتے رہے (ایلیا دمشقی، در *Bib. Or* : Assemani، ۳/۲ : ۴۲۶؛ دیکھیے Hoffman : کتاب مذکور، ص ۲۷۲)، لیکن اس امر کا صاف صاف پتا نہیں چلا کہ عربوں نے اسے کیا نام دیا تھا ۔ ہمیں خُرداذبہ کے یہاں (ص ۹۴؛ البلاذری، ص ۲۶۵؛ یاقوت، ۴ : ۶۸۳) باجرمی کا نام ملتا ہے جس کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ یہ صوبہ الموصل کا ایک کُورہ ہے، لیکن جتنی بستیوں کے نام گنوائے گئے ہیں، ان میں سے کسی کی بھی کرکوک کے ساتھ مطابقت نہیں ہو سکتی ۔ ابنِ خرداذبہ (محل مذکور) باجرمی کے ایک قصبے خُنیاً سابور کا نام لیتا ہے (ڈخویہ کے قیاس کا اطلاق طبری، ۱ : ۸۴۰، پر بھی ہو سکتا ہے) ۔ Hoffmann (محل مذکور) اس کا تعلق قصبۂ کرخینا سے بتلاتا ہے جس کا ذکر یاقوت (۴ : ۲۵۷) نے کیا ہے ۔ اس کے نام کی شناخت اس وجہ سے کچھ اور مشکل ہو جاتی ہے کہ عرب جغرافیہ نویسوں نے همیشہ بغداد سے الموصل جانے والی سڑک کا دریاے دجلہ کے ساتھ ساتھ جانا بیان کیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کفری تئوق، کرکوک اور اربل سے ہو کر جانے والی قدیم شاهراہ پر جو موجودہ

زمانے میں بھی استعمال ہوتی ہے، عہد اسلامی کی ابتدائی صدیوں میں زیادہ سفر نہیں کیا جاتا تھا .

بارھویں صدی عیسوی میں علاقۂ کرکوک پر خانوادۂ بکتگین حکومت کرتا تھا جس کا صدر مقام اربل [رک بآں] تھا - ۱۲۳۲ء میں مظفر الدّین توق بوری Kökbüri کی وفات کے بعد یہ علاقہ اس خاندان کے ہاتھ سے نکل کر خلفائے بنی عباس کے پاس آ گیا تھا، مگر چند ہی دن بعد منگولوں نے اسے فتح کر لیا - کرکوک کا نام پہلی بار شرف الدّین علی یزدی کے ظفر نامہ (ترجمہ Pétis de la Croix، ۱۷۲۳ء، ۲ : ۲۵۹) میں ملتا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ فتح عراق کے بعد تیمور دیار بکر کی طرف روانہ ہوا - اس کا راستہ تئوق (عربوں کے ہاں دقوقۃ)، کرکوک Carcouc اور التون قوپرو Altoun Cüprü سے ہو کر جاتا تھا، جہاں سے وہ ۲۰ دسمبر ۱۴۰۳ء کو رخصت ہوا - اس کے بعد آق قویونلو کی حکومت کا دور آتا ہے - سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں شاہ اسمٰعیل اول نے عراق فتح کر لیا - جب ترکی - ایرانی معاھدے کی رو سے، جو اماسیہ کے مقام پر بتاریخ ۲۹ مئی ۱۵۵۵ء طے پایا تھا، عراق پر بالآخر عثمانی سلطان سلیم اول اور سلیمان اول کا قبضہ ہو گیا تو کرکوک پہلے کی طرح ایک بار پھر مشرق سے آنے والے حملہ آوروں کا بقابلہ کرنے کے لیے ایک اہم پشت پناہ بن گیا - معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے سے دریاے دجلہ کے کناروں کا علاقہ غیر آباد اور اجاڑ ہو جانے کے باعث بغداد کو الموصل سے ملانے والی قدیم تجارتی اور عسکری شاہراہ آباد ہونے لگی تھی (تاہم اولیا چلبی نے دریاے دجلہ والا راستہ ہی اختیار کیا تھا (سیاحت نامہ، ۵ : ۶) - ۱۶۲۳ء میں سقوط بغداد کے بعد کرکوک ایک بار پھر ایرانیوں کے ہاتھ لگا، لیکن ۱۶۳۰ء میں خسرو پاشا [رک بآں] نے اسے دوبارہ فتح کر لیا - ۱۶۳۸ء میں سلطان مراد چہارم بغداد کی دوبارہ تسخیر کے لیے جاتے ہوے کرکوک سے گزرا تھا، مگر اس علاقے کے اصل حکمران صوبۂ اردلان کے کرد سردار ہی تھے (حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۴۳۵) - رفتہ رفتہ ایالت شہر زور [رک بآں] یا (شہرِ زول) کے پاشوں کی ہمت اور کوشش سے آل عثمان کی حکومت مضبوط ہو گئی - یہ ایالت بتیس سنجاقوں پر مشتمل تھی جن میں سے ایک سنجاقوں کرکوک تھی - شہر زور کا قصبہ تباہ ہو گیا تو وھاں کے پاشا کا صدر مقام بھی کرکوک قرار پایا (جہان نما، محل مذکور) - ۱۷۳۲ء میں نادر قلی نے (جو آگے چل کر نادر شاہ کے نام سے مشہور ہوا) اس شہر کا محاصرہ کیا، مگر ناکام رہا - اگلے سال کرکوک کے قریب بڑی خونریز لڑائی ہوئی جس میں ترکوں کو شکست فاش ہوئی - ترک فوجیں وزیراعظم توپل عثمان پاشا کی کمان میں تھیں اور وہ خود جنگ میں کام آیا - ۱۷۴۳ء میں کرکوک پر پھر ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا، لیکن ۱۷۴۶ء کے صلح نامے کی رو سے ترکی کو واپس مل گیا - ۱۹۱۸ء تک شہر ترکوں کی سلطنت میں رہا - ترکی کے جدید نظام حکومت کے ماتحت یہ صوبۂ الموصل میں سنجاق شہر زور کا صدر مقام بن گیا (اگرچہ وہ جگہ جہاں پرانا شہر زور آباد تھا اب سنجاق سلیمانیہ میں شامل ہو چکی تھی)- کرکوک پر انگریزی فوجوں کا قبضہ ہوا ہی تھا کہ ۱۹۱۸ء کی عارضی صلح کا اعلان ہو گیا - انگریز اس پر بدستور قابض رہے، تاآنکہ ۱۹۲۰ءمیں اسے عراق میں شامل کر دیا گیا - ۱۹۲۶ء میں جب برطانیہ اور ترکی کے درمیان موصل کے قدیم صوبے کی قسمت کا فیصلہ ہوا تو اس وقت کہیں سلطنت عراق سے اس کا قطعی الحاق ہوا .

موجودہ شہر ۱۲۰ فٹ بلند قلعے کے

چاروں طرف آباد ہے ۔ یہ قلعہ بجائے خود ایک چھوٹا سا قصبہ ہے ۔ جنوب اور مشرق کی جانب میدان میں ایک بڑا محلہ آباد ہے ۔ ان دو نوں محلوں کو مغرب کے ایک اور محلے سے "خاصہ چے" نامی ندی جدا کرتی ہے ۔ یہ ندی شمال مشرق سے آتی ہے اور جنوب مغرب کی جانب بہتی ہوئی سامرے کے نیچے دریاے دجلہ سے مل جاتی ہے ۔ یہاں یہ ندی صو کے نام سے مشہور ہے ۔ آج کل کرکوک کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے، جس میں ترکوں کا عنصر غالب ہے ۔ ایشیاے کوچک کے ترکوں سے انھیں متمیز کیا جائے تو انھیں ترکمان کہیں گے ۔ غالبًا یہ ترکی آبادی سلاطین عثمانیہ کی فتح سے بہت قبل، یہاں آباد ہو چکی تھی، لیکن یہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتایا جا سکتا کہ آیا ان کا سلسلۂ نسب اس ترک فوجی دستے سے ملتا ہے، جسے نویں صدی میں خلفا نے یہاں متعین کیا تھا، یا ان کا تعلق اس نقل مکانی سے ہے جو عہد سلاجقہ یا بنو بکتگین کے زمانے میں ہوئی تھی۔ بہرحال یہ شہر ہمیشہ سے سلطنت عثمانیہ کا ایک مضبوط گڑھ اور اس کے تمدن کا مرکز بنا رہا (دیکھیے *Türk Yurdu*، ۱۹۱۵ء) ترکی میں اس شہر کے نام کا تلفظ کرکوک کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کی صحیح سرکاری صورت کرکوک ہے (سامی : قاموس الاعلام، ۵ : ۳۸۴۶) ۔ عیسائی پانچ سو کنبوں پر مشتمل ہیں (*Rapport de la Commission de Mosul*، در *Bibliography*، ص ۵۲) ۔ یہ بھی ترکی بولتے اور اسے سریانی رسم الخط میں لکھتے ہیں ۔ عیسائی سب کے سب قلعے میں رہتے ہیں؛ مذھبا "کلدانی" کیتھولک (کرکوک ایک اسقف اعظم یا مطر ان کا صدر مقام ہے) اور قدیم نسطوریوں کی نسل سے ہیں اگرچہ ان کی اپنی روایت یہ ہے کہ وہ عہد سلاجقہ میں نقل مکانی کرکے یہاں آئے تھے ۔ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے ایک بڑا کلیسا بھی بنایا ۔

عربی زیادہ تر یہاں کے یہودی باشندے بولتے ہیں، جن کی اچھی خاصی تعداد ہے [اسرائیل کے قیام کے بعد بیشتر یہودی وہاں جا کر آباد ہو گئے ہیں] یہاں کی آبادی میں کردوں کا ایک مضبوط عنصر بھی شامل ہے ۔ ایک زمانے میں قلعہ ایک فصیل سے گھرا ہوا تھا ۔ اس کے اندر ایک مسجد الجامع، ایک قدیم گرجا اور پہاڑ کی ڈھلان پر مار دانیال نامی مسجد ہے ۔ حال ہی میں آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام پہاڑی میں شروع ہوا ہے اور توقع ہے کہ اس سے ہمیں سلطنت بابل کے زمانے میں اس شہر کی تاریخ کے متعلق معلومات دستیاب ہو جائیں گی ۔ ایک اور مسیحی یادگار مار تہمزگرد شہید کا مقبرہ ہے، جس کا ذکر مذکورۂ بالا کتاب الشہدا میں ملتا ہے ۔ یہ مقبرہ شہر کے مشرق میں واقع ہے ۔

کرکوک کی کچھ تجارتی اہمیت بھی ہے ۔ یہ اناج اور مویشیوں کی، جو گرد و نواح کے علاقے میں پالے جاتے ہیں، منڈی ہے ۔ اس کی اہم ترین سڑکیں بغداد (براہ تئوق و کِفری) اور موصل (براہ التون قوپرو واربل) کو جاتی ہیں ۔ ایک ریلوے لائن بھی اس راستے کے ساتھ ساتھ بنائی جا رہی ہے ۔ کرکوک اور سلیمانیہ کے درمیان ہموند کردوں کا علاقہ ہے، جو ترکوں کے عہد میں خطرناک ڈاکو تھے ۔ کرکوک کے گرد و نواح کا علاقہ تھوڑا بہت پہاڑی ہی ہے، لیکن مغرب میں تھوڑے سے فاصلے پر عراق کے صحرائی اقطاع شروع ہو جاتے ہیں جہاں زیادہ تر عرب آباد ہیں ۔ شہر سے بالکل ملحقہ زمینوں میں پھل کثرت سے ہوتا ہے ۔ یہاں ہمیں عراق کے انتہاے شمال کی کھجور بھی ملتی ہے ۔

کرکوک کے پورے ضلع میں، گندھک، نفط [نفت ، مٹی کا تیل] اور نفطی پیداواریں پائی جاتی ہیں جو قدیم زمانے ہی سے نکالی اور استعمال میں لائی جاتی رہی ہیں ۔ نفط کے چشمے خاص طور پر

مشہور ہیں [اب کرکوک میں لفظ صاف کرنے کے کارخانے قائم ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے کرکوک کی اہمیت بڑھ گئی ہے].

مآخذ: (۱) V. Cuinet : *La Turqui d' Asie*، ۲ (پیرس ۱۸۹۲ء): ۸۴۶، ۸۵۳ ببعد؛ (۲) C. Ritter : *Erdkunde*، ۹ (برلن ۱۸۴۰ء): ۵۵۲ ببعد؛ Ritter) نے مختلف سیاحوں، Niebuhr، Shiel، Ker Porter اور Ainsworth کے مشاہدات پر اعتبار کیا ہے)؛ (۳) H. Petermann : *Reisen im Orient*، لائپزگ ۱۸۶۱ء؛ (۴) Sarre.-Herzfeld : *Archäologische Reise im Euphrat-und Tigrisgebiest*، ۲ (برلن ۱۹۲۰ء): ۳۲۹ ببعد؛ (۵) E. B. Soane : *To Mesopotania and Kurdistan in disguise*، بار دوم، لندن ۱۹۲۶ء، ص ۱۱۹ تا ۱۳۹؛ (۶) H. C. Lukas : *Mosul and its Minorities*، لندن ۱۹۲۵ء؛ (۷) League of Nations : *Question de la Frontière entre la Turquie et l' Irak*، ۱۹۲۵ء، ۷ : ۳۸؛ (۸) J. Labourt : *Le Christianisme dans l' Empire Perse*، پیرس ۱۹۰۴ء.

(J. H, KRAMERS)

* **کَرَم** : (بنو الکَرَم)، ایک خاندان جس کی دو شاخوں بنو مسعود اور بنو عبّاس ابی الزریع نے پہلے ۴۷۶ھ/۱۰۸۳ء سے ۵۳۳/۱۱۳۸ء تک صنعاء کے صُلَیحیّة کے نائبین کی حیثیت سے مشترکہ طور پر عدن میں اسمٰعیلی حکومت قائم کی، جن میں سے صرف ایک شاخ نے ۵۳۳ھ/۱۱۳۸ء سے ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء تک حکومت کی۔ مؤخرالذّکر شاخ بنو زریع جسے بنو ذِئب بھی کہتے ہیں، اس آزاد سلطنت کی مالک تھی، جو صرف خلافت فاطمیہ کو تسلیم کرتی تھی.

بنو الکَرَم کا تعلق بنو ہَمْدان کے قبیلۂ یام کی ایک شاخ جشم سے تھا اور صلیحیه [رک بہ صلیحی] سے ان کی قریبی رشتےداری تھی۔ اسی بنا پر وہ اس خاندان کے بانی، یعنی اسمٰعیلی، فاطمی داعی، علی بن محمّد اور اس کے بیٹے اور جانشین المُکَرَّم کے بہت بڑے حامی تھے۔ بنو مَعْن نے جنھیں داعی نے باجگزاروں کی حیثیت سے عدن میں رہنے کی اجازت دے دی تھی، ۴۳۹ھ/۱۰۴۷ء میں بغاوت کی، تو المکرّم اور اس کی بیوی سلطانہ سیّدہ حُرّہ نے جسے عَدَن جہیز میں ملا تھا، ۴۷۶ھ/۱۰۸۳ء میں بنو مَعْن کے بجاے دو بھائیوں مسعود اور عباس کو جو الکَرَم کے بیٹے تھے، یہاں کا عامل مقرر کر دیا۔ اول الذّکر کو قلعة الخضراء ملا اور ساحلی علاقوں کی آمدنی، اور مؤخرالذّکر کو اندرون ملک کا مالیانہ وصول کرنے کا حق ملا اور التَعْکر کا قلعه جو اندرون ملک کے لیے دروازے کا کام دیتا تھا (اسے اسی نام کے اس قلعے سے ملتبس نہیں کرنا چاہیے جو جُبْلَة کے اوپر جَنَد سے یَریم کو جانے والی شاہراہ کے قریب ہی واقع تھا). ان کا مجموعی سالانہ خراج ایک لاکھ دینار تھا۔ مسعود اور الزُریع، عباس کا بیٹا اور جانشین، سیّدہ کے نائب السلطنت (major-domo) المفضل ابی البرکات کے زیر قیادت فوجی خدمت کرتے ہوے زبید کی دیواروں کے سامنے لڑتے ہوے مارے گئے۔ ان کے علاقے کی دو حصوں میں تقسیم وقتی طور پر برقرار رہی۔ مسعود کے بعد یکےبعد دیگرے اس کا بیٹا ابن ابوالغرات اور مؤخرالذّکر کے دو بیٹے محمّد اور علی حکمران ہوے؛ ادھر الزُرَیع کے جانشین اس کا بیٹا ابو مَسعود اور پھر اس کا بیٹا سَبا ہوے، لیکن جس طریقے سے اس علاقے کو تقسیم کیا گیا تھا، اس سے مؤخر الذّکر شاخ شروع ہی سے فائدے میں رہی کیونکہ اسے اندرون ملک میں حدود حکومت کی توسیع اور ان قلعوں کے دفاع کی زیادہ سہولتیں حاصل تھیں جنھیں ان دونوں خاندانوں نے فتح

کر لیا تھا ۔ در حقیقت یہ مسئلہ ضلع مَعَافِر کے شمال میں واقع پہاڑوں کا تھا ۔ یہ بات خاصی اہم ثابت ہوئی کہ الزُّرَیع نے ۴۸۰ھ/۱۰۸۷ء میں جبل السِّلْو کے ایک قلعے دُمْلُوَة پر قبضہ کر لیا تھا جو جند سے آنے والی سڑک کے مشرقی سرے پر اس موڑ کے اوپر واقع تھا جہاں یہ پہاڑ کے گرد چکر کاٹتی ہوئی گزرتی ہے ۔ اگر اس سے قبل نہیں تو کم از کم سَبَا کے عہد میں، جو ایک باھمت حکمراں تھا، نہ صرف ان کے علاقوں میں معتدبہ اضافہ ہوگیا، بلکہ ذُبْحان پر بھی قبضہ کر لیا گیا، جو عدن سے مغرب شمال مغرب کی سمت میں تقریبًا ایک سو میل کے فاصلے پر موخا اور زبید کو جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ سَبا کے والد اور ابوالغرات کی کوشش سے پہلے خراج کی رقم نصف اور بعدازاں چوتھائی ہوگئی تھی کیونکہ انھوں نے سیّدہ کو اس سے زیادہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور وہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکی تھی ۔ جب اس سیدہ کی مشکلات میں اضافہ ہوا تو سَبا نے یہ خراج ادا کرنا بالکل بند کر دیا ۔ جب حالات میں تبدیلی ہوئی تو خلافت قاہرہ کی توجہ بھی اس طرف مبذول ہوئی ۔ گیارھویں فاطمی خلیفہ الحافظ عبدالمجید نے ۵۲۵ھ/۱۱۳۱ء میں مسند خلافت پر بیٹھتے ھی سَبا کو داعی کی حیثیت دے کر اسمٰعیلی سلسلے میں شامل کر لیا ۔ دُمْلُوَة بدستور دارالحکومت رہا ۔ وادی لَہْج میں دو سال کی جنگ کے بعد دونوں بھائیوں کے خاندانوں میں فیصلہ ہو گیا ۔ پہلے علی بن ابی الغرات نے روپیہ دے کر بہت سے جنگجوؤں کی اعانت حاصل کر لی ۔ جب وہ اپنا وار کر چکا تو سَبا نے اپنی کثیر دولت اور تین لاکھ دینار کی مستعار رقم داؤ پر لگا کر بازی جیت لی ۔ کہا جاتا ھے کہ اس نے اسی روز آخری فتح حاصل کی جس روز عدن میں اس کے حلیف بلال ابن جریر نے الخضراء پر دھاوا بول کر اسے فتح کر لیا تھا ۔

اس کے بعد بنو الزُّرَیع نے بلا شرکت غیرے حکومت کی، لیکن سَبا ۵۳۳ھ/۱۱۳۸ء میں عدن میں داخل ہونے کے چھ ماہ بعد فوت ہوگیا ۔ وہ قلعہ التَّعْکر کے سامنے میں مدفون ھے ۔ اگلے ھی سال اس کا بیٹا اور جانشین علی الْاَعَزّ بعارضۂ دق وفات پاگیا ۔ اس نے اپنے کمسن بیٹوں کو، جو دُمْلُوَة میں تھے، اپنا جانشین اور ان کے اتالیق انیس اور وزیر یحیی بن علی کو ان کا ولی نامزد کیا تھا ۔ بایں ھمہ بلال نے، جو معزول و معتوب ہونے کے بعد اس وقت عدن ھی میں تھا، اپنے مرحوم آقا سبا کے ایک اور بیٹے محمّد نامی کے سر پر تاج رکھ دیا، جس نے اپنے باپ کی وفات کے بعد الأعزّ کے خوف سے بھاگ کر مذکورۂ بالا نائب اَلْمُفَضّل کے بیٹے منصور کے پاس پناہ لے رکھی تھی ۔ محمّد بن سَبا نے ۵۳۴ھ/۱۱۳۹ء سے ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء یا ۵۵۰ھ/۱۱۵۵ء تک حکومت کی اور یہ بنی الزُّرَیع کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا ۔ اس نے ۵۴۵ھ/ ۱۱۵۰-۱۱۵۱ء میں بنو مسعود کے آخری حکمران علی بن الغرات کو، جو شکست کھانے کے بعد ابھی تک اپنے خاندان کے چند ایک افراد اور کچھ وفادار ساتھیوں کے ساتھ چند پہاڑی قلعوں (مثلًا لَحج کے شمال میں جَبَل مُنِیف) پر قابض تھا، موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ ۵۴۷ھ/۱۱۵۲-۱۱۵۳ء میں اس نے اپنے پناہ دہندہ اور سیّدہ کے وارث منصور سے ۲۸ شہر اور قلعے خرید لیے، جن میں التَّعْکر، جَبْلَہ اور اِبّ شمال مشرق میں اور اَشْرَق جنوب مشرق میں شامل تھے ۔ اسے برسر حکومت آتے ھی داعی کا رتبہ مل گیا تھا، کیونکہ جس قاضی کو یہ منصب الاَعزّ کو دینے کے لیے قاہرہ سے بھیجا گیا تھا جب وہ یہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ محمّد پہلے ھی برسر اقتدار

آ چکا ہے - بنو الزُّریع کی تاریخ کے بارے میں ہماری زیادہ تر معلومات اسی حکمران کی مرہون منت ہیں، کیونکہ وہ مذکورۂ بالا انیس اور بلال جیسے چند لوگوں کے علاوہ، جن سے پوری طرح حالات معلوم نہیں کیے جا سکتے تھے، عمارَة کی تاریخ الیمن میں اس خاندان سے متعلق حصے کا سب سے مستند مأخذ تھا - عُمارَة نے بذات خود اس سے ملاقات کی تھی اور دوسری تمام تواریخ، مثلاً الجَنَادی، اَلخَزرجی اور ابن خَلدُون کی تصالیف اسی کے بیان پر مبنی ہیں - وہ محمّد کی بے حد تعریف و توصیف کرتا ہے، خصوصًا اس لیے کہ وہ ادب و ہنر کا بڑا قدر دان تھا؛ لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک پُرجوش اسمٰعیلی ہونے کی وجہ سے اس کا میلان طبع اپنے ہم‌مذہب فرمانرواؤں کی جانب ہوگا - باقی رہی یہ بات کہ محمّد مذہبی مفہوم میں ایک داعی کی حیثیت سے اپنے فرائض صحیح معنوں میں ادا کرتا تھا یا نہیں، اس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں اور نہ ہم یہی بتا سکتے ہیں کہ مہدی خاندان کے بانی علی بن المہدی نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے، محمّد سے ایک ملاقات کے دوران میں زبید کے خلاف مدد کی جو درخواست عُمارہ کی موجودگی میں کی تھی وہ محض سیاسی اور فوجی وجوہ کی بنا پر ردکر دی گئی تھی یا اس میں مذہبی وجوہ کو بھی دخل تھا - اس کے بیٹے اور جانشین عِمران کو مذہبی امور سے زیادہ دلچسپی تھی، چنانچہ اس کے عہد میں حقیقی اقتدار بلال کے وزیر خاندان کے ہاتھوں میں آ گیا - محمّد کے عہد میں خود بلال کا بھی حکومت میں حصہ رہا تھا اور محمد کو تخت دلوانے کی بنا پر وہ اس کا مستحق بھی تھا، لیکن وہ حکومت میں اس تبدیلی سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے یا اس کے فورًا ہی بعد وفات پا گیا اور اس نے ورثے میں ایک بہت بڑی جاگیر چھوڑی - اس کا جانشین پہلے اس کا بیٹا مدافِع ہوا، جو جلد ہی فوت ہوگیا - اس کے بعد بلال کا دوسرا بیٹا یاسر اِس عہدے پر فائز ہوا، جو بالکل خود مختارالہ حکومت کرتا رہا - جب ۵۶۰ھ/۱۱۶۴ء میں عِمران کا انتقال ہوگیا اور اسے اس کی خواہش کے مطابق مکّے میں دفن کر دیا گیا تو یاسر نے اپنے تینوں بیٹوں کو، جو ابھی خرد سال تھے، ابو الدُّر جوہر المُعظّمی کی نگرانی میں دُملُوہ میں قید کر دیا، تاہم بنو زُریع اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں تخت و تاج سے قطعی طور پر محروم ہو جانے کے انجام سے بچ گئے - ان پر آخری وار باہر سے ہوا - ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ - ۱۱۷۴ء میں صلاح الدّین کے بھائی تُوران شاہ نے عدن اور یمن کے باقی علاقے کو فتح کر لیا - اگلے سال جوہر نے ایک معاہدے کی رو سے دُملُوہ کا قلعہ بھی اس کے حوالے کر دیا اور ایک سال بعد تُوران شاہ نے یاسر کو، جس کی پناہ گاہ کے بارے میں مخبری ہو گئی تھی، قتل کروا دیا .

مآخذ (۱) وہ مصنفین جن کا ذکر H. C. Kay: *Yamen, its early Mediaeval History*، لنڈن ۱۸۹۲ء، کے متن میں آیا ہے ؛ (۲) B. L. Playfair: *A History of Arabia Felix Or Yemen*، بمبئی ۱۸۵۹ء، ص ۸۵ تا ۸۸ ؛ (۳) J. W. Redhouse: *The Pearlstrings ... by ... 'al-Khazrejiyy*، ج ۱، سلسلۂ یادگار گب، ۳/۱ (۱۹۰۶ء) : ۱۵، ۱۸ ببعد ؛ (۴) S. Lane Poole: *The Mohammadan Dynasties*، Westminister ۱۸۹۴ء، ص ۹۷ .

(R. STROTHMANN)

کِرماستی : آناطولی کی اسی نام کی ایک قضا * کا صدر مقام جو میخالیچ سے پندرہ میل جنوب مشرق میں (دیکھیے J. H. Mordtmann، در *ZDMG*، ۶۵ (۱۹۱۱ء) : ۱۰۱) اور برسہ سے چالیس میل جنوب

مشرق میں واقع ہے - [۱۹۲۷ء میں] اس کی کل آبادی پانچ ہزار تھی، جس میں تین ہزار مسلمان تھے - شہر چودہ محلوں پر مشتمل ہے، جن میں آٹھ سو مکانات تھے - یہ دریاے اطرا نوس (Rhyndacus) کے دونوں کناروں پر آباد ہے - اس نام کی اصل، جسے اکثر اوقات غلطی سے کَرماسلی لکھتے ہیں اور جس کا تعلق ایک یونانی نام *Κρεμαστή, یا *Κερμαστή سے معلوم ہوتا ہے، یقینی طور پر معلوم نہیں - اسی طرح یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں کونسا قدیم شہر آباد تھا - غالباً اس کا تعلق Troas میں واقع شہر Kremastis (دیکھیے Pauly-Wissowa، ۲ : ۴۳۷) سے قائم کیا جا سکتا ہے، جس کا ذکر Xen. : Hist.، ۴ : ۸، میں آیا ہے - کہا جاتا ہے کہ بوزنطی عہد میں یہاں اورتہ Aorata آباد تھا، جہاں ۱۱۱۳ء میں Kamytzes کے زیر قیادت کومنیوس Alexius Comnenus کی فوجوں نے سلجوقوں سے شکست کھائی تھی (دیکھیے Anna Comn.، ۲ : ۲۷۹ بعد) - بہر صورت کرماستی کے نزدیک ہی ایک بوزنطی قلعے کے کھنڈر موجود ہیں جو اس قلعے سے ملتا جلتا ہے جو یہاں سے چھ میل آگے دریاے اطرانوس (اِدّرہ نوس چای) کے کنارے کِستِرلک کے مقام پر واقع ہے اور جس کا مقصد اولوباد (Lapadium) اور بروسہ میں اسی نوع کے استحکامات کی طرح کا تھا کہ ترکوں کی پیش قدمی کو روکا جا سکے - شہر میں چھ جامع مسجدیں ہیں، جن میں سے ایک کافی بڑی اور بہت پرانی ہے اور اس کے ساتھ ایک مقبرہ (تربہ) بھی ہے - اس کے علاوہ چودہ دوسری مساجد اور متعدد آثار قدیمہ (پتھر کے تابوت، دیواروں پر کتبات اور آرائش و زیبائش) ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تاحال مطالعہ نہیں کیا گیا - ترکوں کے عہد میں کِرماستی کی تاریخ تاریکی میں ہے کیونکہ اس سے متعلق کوئی بیان محفوظ نہیں - اولیا چلبی (۵ : ۲۹۰) اور یورپی سیاحوں (دیکھیے W. Hamilton : *Reseascher in Asia Minor*، لنڈن ۱۸۴۲ء، ۱ : ۷۷ و ۲ : ۹۳) نے اس ضمن میں کوئی بھی مفید مطلب بات نہیں لکھی - اسلامی کتبات کے مطالعے اور ترتیب کا کام ابھی باقی ہے - کِرماستی کو یونانی قبضے کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچا - ۱۹۲۵ء میں صدر جمہوریۂ ترکیہ کے اعزاز میں اس کا نام بدل کر مصطفیٰ کمال پاشا رکھ دیا گیا - کِرماستی مشہور مؤرخ عاشق پاشا زادہ (دیکھیے طاش کوپرو زادہ مجدی : شقائق النعمانیہ، ص ۳۵۲، س ۱۳) کے داماد سید ولایت (م ۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء، در استانبول) کا مولد ہے، جو مناقب تاج‌العارفین (یعنی شیخ ابو الوفا) کے ذریعے معروف ہوا (دیکھیے Pertsch : *Türk. Hss. Gotha*، ص ۱۳۷، شمارہ ۱۶۶؛ Tornberg : *Catal. Uppsal*، ص ۲۱۱، شمارہ ۳۷۰).

کرماستی سے دو گھنٹے کی مسافت پر گرم پانی کے دو معدنی چشمے ہیں، جو دُمبلدک اور اَقرجہ کے نام سے مشہور ہیں.

مآخذ : متن میں مندرجہ حوالوں کے علاوہ دیکھیے : (۱) Cuinet : *Türquie d' Asie*، ۴ : ۱۵۵ ببعد؛ (۲) حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۶۵۶ س ۷؛ ص ۶۶ س ۱؛ (۳) اولیا : سیاحت نامہ، ۵ : ۲۹۰؛ (۴) W. M. Ramsay : *Historical Geography of Asia Minor*، ص ۱۵۵، ۴۳۷.

(FRANZ BABINGER)

* **کَرمان** : ایران کے ایک صوبے اور اس کے موجودہ صدر مقام کا نام - شہر کا نام بعد کے زمانے میں صوبے کے نام پر رکھا گیا تھا - اس کا تلفظ بالعموم کِرمان کیا جاتا ہے، لیکن اگر عربی کے علما کی روایت کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا زیادہ صحیح تلفظ کَرمان ہوگا (یاقوت، ۴ :

۲۶۳) - بہرحال یہ نام لفظ کرمنیہ (Carmania) سے ماخوذ ہے، جو Strabo (۱۵ : ۲، ۱۴) کے یہاں ملتا ہے؛ خود کرمنیہ بھی ایک قدیم دارالحکومت کے نام کرمنہ سے مشتق بتایا جاتا ہے (Ptolemy : *Geography*، ۶ : ۸؛ Ammianus Marcellinus، ۲۳: ۶، ۴۸)- بقول Marquart (*Erānšahr*، ص ۳۰) کرمنیہ کے نام نے یوتیہ کی جگہ لے لی تھی، جو ھخامنشی کتبات (*Beh.*، ۳ : ۲۲) میں ملتا اور *Outiol* کے مطابق ہے جس کا شمار ہیروڈوٹس Herodotus ۳ : ۹۳ نے (سلطنت ایران کی) چودھویں ولایت میں کیا ہے - پہلوی میں اس کے ھجے ک ر م ء ن ملتے ہیں - عربی قصص و روایات کی تاریخ (ابن الکلبی) میں بتایا جاتا ہے کہ کرمان دراصل کرمان بن فَلّوج کے نام سے نکلا ہے، جو یافث (Japhet) کی نسل سے تھا اور کہتے ہیں کہ اس علاقے میں آباد ہو گیا تھا - زمانۂ مابعد کی مقبول عام اشتقاقیات میں اس کا تعلق اسم کِرم سے بتایا گیا، جس کے معنی ہیں کیڑا یا اژدھا اور اس کا اشتقاق قصۂ ھفتان بخت اور کرمان کے اس اژدھے سے کیا گیا ہے جس کا ذکر اردشیر کے افسانے میں ملتا ہے (دیکھیے Browne : *Lit. Hist. of Persia*، ۱ : ۱۴۵) .

(۱) صوبہ : اگر جغرافیائی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مجموعی اعتبار سے کرمان کی حدود بڑی معین ہیں - یہ صوبہ ایران کے وسطی صحرائے اعظم (دشت لوط، یا ازمنۂ وسطی میں مفازۂ خراسان) کے جنوب مغرب میں واقع ہے - اس کے مشرق میں لق و دق میدان اور وہ پہاڑ ہیں جو اسے مکران سے جدا کرتے ہیں - یزد کی جانب سے شمال مغرب کی طرف اور فارس سے مغرب کی طرف بھی یہ صحرا اور غیر مزروعہ اراضی سے گھرا ہوا ہے - جو خاص بات کرمان کو فارس سے ممیز کرتی ہے وہ، جیسا کہ اصطخری (ص ۱۶۳) نے بھی بیان کیا ہے، یہ ہے کہ فارس کا مزروعہ علاقہ غیر منقطع چلا جاتا ہے، لیکن کرمان کا حال یہ ہے کہ اس میں کچھ تعداد سرسبز اور مزروعہ قطعات کی موجود ہے جنھیں صحراؤں نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے اور ان میں دیہات بکھرے پڑے ہیں - اس کے جغرافیائی محل وقوع سے فائدہ اٹھا کر اس کی پانچ اضلاع میں بالکل قدرتی تقسیم کر دی گئی ہے، یعنی شمال میں کرمان (قدیم زمانے میں بردسیر)، مغرب میں سیرجان، وسط میں جیرفت اور مشرق میں بم اور نرمسیر (المقدسی، ص ۴۶۰) - جنوب میں کرمان سمندر سے گھرا ہوا ہے، لیکن صوبے میں اس علاقے کو کچھ زیادہ اھمیت حاصل نہیں ہے یہاں کی واحد اھم بندرگاہ ھرمز [رک بآں] ہے اور اسے بھی کبھی کرمان میں اور کبھی فارس کے علاقے میں شمار کیا جاتا ہے - اس بندرگاہ پر اکثر عقبی علاقے کے مختلف لوگ قبضہ جماتے رہے ہیں - کرمان کے فرمانرواؤں نے تاریخ میں صرف ایک بار بالمقابل کے ساحل عمان پر اپنے اقتدار کا جھنڈا گاڑا ہے - صوبے بھر میں شمال مغرب سے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں - شمال میں بلند ترین سلسلۂ کوہ ملتا ہے، جو کوہ رود کا ایک حصہ ہے اور اس میں کوہ ھزار جیسی چوٹیاں بھی ہیں - یہ چوٹی بم کے شمال مغرب میں ہے اور اس کی بلندی قریب قریب پندرہ ھزار فٹ ہے - یہ سلسلہ ضلع کرمان کو سیرجان سے علیحدہ کرتا ہے - اس سلسلے کے جو پہاڑ جنوب مشرق کی طرف بڑھتے چلے گئے ہیں، وہ جبل بارز یا بارِز کے نام سے مشہور ہیں - ان سے آگے جنوب مغرب میں کچھ اور سلسلہ ھائے کوہ بھی ان کے متوازی پھیلے ہوئے ہیں - ازمنۂ وسطی میں بلوص [رک بہ بلوچستان] اور قفس جیسے وحشی قبائل ان پہاڑوں میں رہتے تھے - قفس ان پہاڑوں میں آباد تھے جو مکران کی جانب ساحل کے ساتھ ساتھ

جیرفت کے جنوب میں واقع ہیں ۔ کرمان میں کوئی بڑا دریا نہیں ملتا ۔ مزروعہ علاقوں کے لیے پانی پہاڑوں سے آتا ہے ۔ ان ندیوں میں سے اہم ترین خلیل رود (قبل ازیں دیورود) ہے اور جیرفت کے پار گزرتی ہے، لیکن سمندر تک نہیں پہنچ پاتی ۔ لہذا کرمان میں وہ تمام جغرافیائی خصوصیات موجود ہیں جن کے لیے سارا ایران ممتاز ہے ۔

عرب جغرافیہ نویس، جن میں سب سے پہلا نام الیعقوبی کا آتا ہے، کرمان کو ایک آزاد جغرافیائی اقلیم قرار دیتے ہیں ۔ انھوں نے اس کے تین چوتھائی علاقے کی درجہ بندی گرم خطوں (جروم) میں کی ہے ۔ سرد علاقے (صرود) زیادہ تر سیرجان کے آس پاس پائے جاتے ہیں (الاصطخری، ص ۱۶۵) .

اب آمد و رفت کے اعتبار سے دیکھیے تو کرمان فارس سے سیستان، خراسان اور ہندوستان جانے والی شاہراہوں پر واقع ہے ۔ تجارتی اور حجاج کے قافلوں کا وہ راستہ بھی یہیں سے گزرتا ہے جو سمندر (ھرمز اور آگے چل کر بندر عباس) سے ایران کے شمال مشرق اور پھر اس سے بھی آگے چلا گیا ہے ۔ یہ محل وقوع کچھ اس قسم کا ہے کہ اس صوبے کی تاریخ میں اس پر چاروں طرف سے حملہ آور فوج کشی کرتے رہے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی حکومت بار بار ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے قبضے میں جاتی رہی اور اسی باعث اس کی خوشحالی اور ترقی پر بری طرح متأثر ہوتی رہی ۔

زمانۂ قدیم کی بہ نسبت آج کل کرمان کے صحرائی علاقے زیادہ وسیع ہو گئے ہیں ۔ عہد اسلامی کی ابتدائی صدیوں میں ابھی یہاں جنگلات پائے جاتے تھے، اور جیرفت کے گرد و نواح میں شیر گھومتے پھرتے تھے (حمد اللہ المستوفی : نزھۃ القلوب، ص ۱۴۰)۔ اب یہاں مشکل ہی سے کوئی درخت نظر آتا ہے، البتہ دیہات اور قصبوں کے آس پاس کھجور کے پیڑ بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں ۔ آب پاشی زیر زمین قنات سے کی جاتی ہے، جو بڑا محنت طلب کام ہے ۔ یہاں کی بڑی زرعی پیداوار اناج، جَو اور افیون ہے ۔ سطح سمندر سے زیادہ بلند علاقوں میں فصلِ خریف کی پیداوار باجرا، کپاس اور چقندر ہے ۔ جروم یا گرمسیر میں چاول اور مکئی کی موسم گرما میں کاشت ہوتی ہے اور بَم اور خَبیص کے مضافات میں حنا پیدا ہوتی ہے ۔ یہاں ہر قسم کے پھل بافراط ہوتے ہیں اور یہاں کی کھجوریں مشہور ہیں ۔ مویشیوں سے حاصل ہونے والی چیزوں میں سب سے زیادہ اہم اون اور بکری کی کھالیں (کُرک) ہیں، جو یہاں کی مشہور شالیں تیار کرنے میں استعمال ہوتی ہیں ۔ کرمان کی معدنی دولت سے ازمنۂ وسطی میں بھی فائدہ اٹھایا جاتا تھا ۔ مارکوپولو نے فیروزوں کا ذکر کیا ہے، لیکن اب ان کی کانیں ختم ہو چکی ہیں ۔ پہاڑوں میں لوہا بھی پایا جاتا ہے، جو پچھلے زمانے میں اسلحہ سازوں کے کام آتا تھا ۔ جیرفت کے مغرب میں چاندی نکلتی تھی ۔ کُبنان کے قریب جو معدنیات برآمد ہوتی تھیں ان سے توتیا تیار کیا جاتا تھا ۔ (المقدسی (ص ۴۵۹، ۴۷۰) نے التوتیا المرازبی کا ذکر کیا ہے، دیکھیے de Goeje، در BGA، ۴ : ۲۴۶) ۔ القزوینی(۲:۱۷۳) نے بظاہر معدنی کوئلے (anthracite) کی موجودگی کے متعلق بھی اشارہ کیا ہے .

تاریخ : عہد ساسانیاں میں صوبۂ کرمان پر ایک والی حکومت کرتا تھا، جس کا خطاب شاہ ہوتا تھا (ابن خرداذبہ، ص ۱۷) ۔ یہی وجہ ہے کہ بہرام پنجم تخت نشین ہونے سے قبل کرمان شاہ [رک بآں] کے نام سے مشہور تھا ۔ شاھنامہ کی نیم افسانوی روایت میں بھی شاہ کیخسرو کے عہد کے ایک شاہ کرمان کا ذکر ملتا ہے (طبع Vullers، ۳ : ۱۲۷۹) ۔ اس کے برعکس البلاذری کرمان کے ایک

مرزبان کا ذکر کرتا ہے (ص ۳۹۱) - اسلامی فتوحات سے پہلے ہی عرب کرمان میں نقل مکانی کر آئے تھے اور بقول الطبری (Nöldeke : *Gesch. der Perser u. Araber*، ص ۵۷) شاپور اوّل نے عربوں پر فوج کشی کے بعد قبیلۂ بَکْر بن وَائِل کے لوگوں کو جبرًا یہاں سے نکال دیا تھا - نولدکے Nöldeke اس واقعے کو تاریخی اعتبار سے ایک حد تک درست تسلیم کرتا ہے، لیکن اس کی راے میں زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ عرب زمانۂ قبل از اسلام میں نقل مکانی کرکے کرمان میں چلے آئے تھے - عہد ساسانیان کے خاتمے کے وقت اس صوبے کا صدر مقام شِیْرجَان (سِیْرجان) تھا .

۶۴۰ سے ۷۵۰ء تک : جیسا کہ البلاذری (طبع de Goeje، ص ۳۱۵، ۳۹۱ بعد) نے لکھا ہے، عربوں کی کرمان کی فتح کا آغاز الرُّبیع بن زیاد نے کیا تھا - انھیں ابو موسیٰ الاشعری رضؓ نے بھیجا تھا، جو حضرت عمر رضؓ کے عہد میں ۶۳۸ء سے بصرے کے والی مقرر ہوے تھے - الرُّبیع نے شِیْرجَان فتح کیا اور بَم اور اَنْدغَار سے عہد و پیمان کر لیا - اسی زمانے میں عربوں کا ایک اور حملہ ہوا - یہ عثمان بن العاص الثَّقَفی، والی بحرین، نے کیا تھا - جزیرۂ اَبَرْکَوَان میں (اگرچہ وہ ولایت فارس میں شامل تھا) کرمان کا مرزبان ان کے ہاتھ سے مارا گیا، لیکن کرمان کی یہ تسخیر پوری طرح قابل اطمینان ثابت نہ ہوئی - ۲۹ھ/ ۶۴۹ - ۶۵۰ء میں یَزْدگرد اصفہان سے بھاگ کر کرمان پہنچا، جہاں کے باشندوں کی اکثریت ابھی تک اس کی وفادار تھی - اس پر عبداللہ بن عامر بن کُرَیْز نے اس کا تعاقب کرنے کے لیے مُجَاشع بن مسعود السلمی کو ایک اور سپہ سالار کے ساتھ روانہ کیا - یہ عرب فوج شِیْرجَان پہنچنے سے پہلے ہی بِیْمَنْد کے مقام پر برف باری سے تباہ ہوگئی اور یزدگرد خراسان تک بھاگ جانے میں کامیاب ہوگیا، لیکن وہاں موت نے اس کا خاتمہ کر دیا (شاهنامه، طبع Vullers ۳ : ۱۹۷۵ء، میں میں شاہ دارا کے انجام کا قصہ غالبًا یزد گرد کے فرار سے متأثر ہوکر ہی لکھا گیا ہے کہ دارا فرار ہوا اور کرمان میں مارا گیا) - مُجَاشع نے، جسے ابن عامر نے کرمان کا عامل مقرر کر دیا تھا، بالآخر کوہ قُفْس تک کے تمام بڑے بڑے شہر دوبارہ فتح کر لیے - هرمز سے ایرانیوں نے ایک جوابی حملہ کیا، مگر شکست کھائی - اس زمانے کی فتوحات کے بارے میں جو تاریخی مواد دستیاب ہوتا ہے وہ قطعی طور پر غیر یقینی ہے - مثال کے طور پر کچھ مزید معلومات الیعقوبی (کتاب البُلْدان، ص ۲۸۶) کے ہاں ملتی ہیں - فتح کے بعد بہت سے باشندے سیستان یا خراسان بھاگ گئے، یا پہاڑوں میں چھپ گئے، جہاں وہ مدت تک اپنے زردشتی عقائد پر قائم رہے - خود کوهستانیوں نے مزید تین سو سال تک اپنی خود مختاری برقرار رکھی - چونکہ یہ صوبہ مرکز سے کافی فاصلے پر واقع تھا، اس لیے یہ بہت جلد خوارج کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا - کچھ باشندے ان اَزْرَقی خوارج کے ساتھ بحیثیت موالی شریک ہوگئے جنھوں نے ۶۹۳ء کے قریب قَطَرِیّ ابن الفُجَاءَة [رکّ بآں] کی قیادت میں فارس اور کرمان فتح کر لیا تھا - جِیْرُفْت ان کا مرکز تھا - یہاں ان کا اقتدار تقریبًا ۶۹۹ء تک رہا جبکہ عرب خوارج اور مَوَالی کے درمیان علٰحدگی ہو جانے کے باعث ان کی طاقت کمزور ہوگئی تھی اور سپہ سالار مہلَّب نے انھیں شکست دے دی - اگلی صدی میں کرمان بغاوتوں کا گھر اور باغیوں کے لیے بہت اچھی جاے پناہ بنا رہا، چنانچہ الحجاج کے حریف عبدالرحمٰن بن الاَشْعَث نے شکست کھانے (۷۰۱ء) کے بعد کچھ مدت کے لیے یہاں پناہ لی تھی - بیس برس کے بعد کرمان کا شمار ان صوبوں

میں ہوتا تھا جس پر غاصب یزیدبن مہلّب [رکّ باں] نے قبضہ جما لیا تھا ۔ اس کی حکومت کا خاتمہ ۱۰۲ھ/ ۷۲۰ء میں ہو گیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بنوامیّہ نے، جن کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ ان کے متعدد سکّے کرمان میں ضرب کیے گئے تھے، صوبۂ کرمان میں اپنا اقتدار بخوبی قائم کر لیا تھا ۔ اس وقت یہ صوبہ جنگوں کے باعث نڈھال ہو چکا تھا ۔ بنی امیہ کے اقتدار کی دلیل یہ ہے کہ ان کی آخری فوج بنو عباس کے حامیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے، جن کی کمان قحطبہ کے ہاتھ میں تھی، یہیں سے روانہ ہوئی تھی ۔ اس زمانے کے بڑے بڑے مآخذ البَلاذری، الطَبری، الیعقوبی اور المسعودی ہیں ۔

۷۵۰ سے ۱۰۴۱ء تک : بنو عباس کے پہلے خلفا کے عہد میں کرمان میں کچھ خاص اہم واقعات پیش نہیں آئے ۔ اس زمانے میں زُطّ کی تاخت کے باعث، جو ہندوستان سے آئے تھے، ان صوبوں کو بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا، حتّٰی کہ المستعصِم کے عہد میں انہیں باہر نکال دیا گیا۔ ۱۶۵ اور ۱۶۷ھ میں عباسی سکّے کرمان میں ضرب کیے گئے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد اس صوبے نے ایران کی مختلف تحریکوں میں، جنھوں نے کئی فرمانروا خانوادوں کو جنم دیا، حصہ لینا شروع کر دیا، تاہم اس کا حصہ زیادہ تر انفعالی قسم کا تھا ۔ ان میں سے پہلا خاندان صَفّاریہ تھا ۔ یعقوب بن لَیث نے ۲۵۳ھ / ۸۶۲ء میں والی خراسان محمّد بن طاہر سے کرمان کی ولایت حاصل کر لی تھی ۔ یعقوب کو جِیرُفت کے آس پاس کے کوہستانیوں کی مخالفت کو فرو کرنا پڑا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اور اس کے بھائی عَمرو نے اس صوبے میں خوشگوار اثر چھوڑا (*History of Persia* : Sykes، ۲ : ۱۶، بروے وقائع افضل الدین)، لیکن ان کی حکومت کا دور اتنا مختصر تھا کہ یہاں ان کے آثار دیرپا نہیں رہے ۔ ۸۷۹ء میں عَمرو اپنے بھائی کی جگہ مسند نشین ہوا اور ۹۰۲ء میں اس کی وفات کے بعد کرمان میں عباسیوں کی حکومت کا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ طوائف الملوکی کا، دور پھر شروع ہوگیا ۔ ۳۱۵ھ/۹۲۸ء میں ابو علی بن اِلْیاس [رکّ باں] کی صورت میں کرمان کو ایک نیا حکمران ملا ۔ یہ شخص پہلے ڈاکو تھا ۔ وہ خراسان کا رہنے والا تھا اور سامانی بادشاہوں کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتا تھا (المقدسی، ص ۴۷۲) ۔ اسے بہت جلد آل بُویہ کے حکمران احمد معزالدولہ کا سامنا کرنا پڑا، جس نے ۹۳۵ء میں کرمان پر حملہ کرکے شیرجان پر قبضہ کر لیا ۔ ابن الیاس نے اپنے صدر مقام کے لیے بَرْدَسِیر (موجودہ شہر کرمان) کو منتخب کیا تھا اور اس نے خود ہی اپنے آپ کو آل بویہ کے ماتحت اس علاقے کا حاکم مقرر کرا لیا ۔ دس بیس سال بعد جب ابن الیاس اور اس کے بیٹے یاسع کے درمیان جھگڑا ہوا تو ان دونوں پر تباہی آئی اور ۳۵۷ھ(۹۶۸ء) میں صوبے پر آل بویہ کا قبضہ ہوگیا۔ کچھ ہی عرصے بعد عَضُد الدولہ کے اخلاف نے صوبہ حاصل کرنے کے لیے آپس میں لڑنا شروع کر دیا ۔ اب انتہائی انتشار کے دور کا آغاز ہوا، جس کے دوران میں کچھ عرصے کے لیے شاہان غزنویہ تک بھی کرمان کے مالک بنے (مسعود اول نے ۱۰۳۲ء میں اسے فتح کیا؛ [نیز رکّ بہ ابو کالیجار]) ۔ سب سے پہلے آل بویہ ہی نے قُفص اور بَلُوص کے کوہستانی قبائل سے مستعدی سے جنگ کی ۔ اس دور کے مآخذ الطَبری، الیَعقوبی، ابن الأثیر، ابن مِسْکَوَیْہ اور حَمْداللہ المُسْتَوْفی (تاریخ گُزِیدہ) ہیں ۔

۱۰۴۱ سے ۱۲۲۲ء تک : ۱۰۴۱ء میں جب سلاجقہ کی ایک شاخ نے یہاں ایک فرمانروا خاندان کی بنیاد رکھی تو اس صوبے نے اطمینان

کا سانس لیا ۔ یہ خاندان ۱۱۸۷ء تک حکومت کرتا رہا ۔اس کے افراد کی تاریخ کے لیے رک بہ سلجوق ۔ اس کا بانی چغری بیگ کا بیٹا قاورد قرا ارسلان بیگ تھا ۔ اس نے ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ - ۱۰۴۹ء میں دارالحکومت بردسیر پر قبضہ کر لیا اور قفس اور شبانکارہ [رک بآں] کے کوھستانیوں کو مطیع کیا ۔ مؤخرالذکر جنوب مغرب کا ایک کرد قبیلہ تھا، جس نے کچھ عرصے سے کرمان کے گرمسیر میں دھشت پھیلا رکھی تھی ۔ قاورد نے بالآخر عمان کا علاقہ فتح کر لیا، جو خلیج فارس کے دوسرے کنارے پر واقع تھا ۔ اس نے سلاجقہ کے جلیل القدر بادشاھوں الپ ارسلان اور ملک شاہ کے حملوں کو روکنے کی دو بار کوشش کی ۔ دوسری کوشش میں اسے اپنی جان سے بھی ھاتھ دھونے پڑے (۴۶۶ھ/ ۱۰۷۴ء) اور اس کے خاندان کی حکومت کا قریب قریب خاتمہ ھو گیا ۔ کرمان کو سب سے زیادہ خوشحالی ارسلان شاہ کے طویل دور حکومت (۱۱۰۱ء تا ۱۱۴۲ء) میں نصیب ھوئی، جو فارس کا بھی حکمران تھا ۔ یہ صورت حال اس کے بیٹے محمد شاہ کے عہد (۱۱۴۲ تا ۱۱۵۶ء) میں بھی جاری رھی ۔ کرمان کے آخری سلجوق بادشاھوں کے عہد میں ایک بار پھر طوائف الملوکی پھیل گئی، تا آنکہ غز [رک بآں] ، جو خراسان سے آئے تھے، اسے پوری طرح ویران کرنے لگے ۔ غز کا ایک سردار ملک دینار ۵۸۱ھ / ۱۱۸۵ء میں کرمان کا فرمانروا بن بیٹھا ۔ اس کا صدر مقام زرند تھا ۔ جلد ھی قبیلۂ شبان کارہ کا بھی ستارہ چمکا ۔ ان کے سرداروں قطب الدین اور نظام الدین نے ۵۹۷ھ / ۱۲۰۰ء میں بردسیر فتح کر لیا، جس پر وھاں کے باشندوں نے بڑی خوشیاں منائیں ، لیکن چونکہ ملک دینار کے بیٹے عجم شاہ کی زیر قیادت غز بدستور مدافعت کر رہے تھے اس لیے چند سال تک ابتری پھیلی

رھی ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۶۰۰ھ / ۱۲۰۳ء میں فارس کے اتابک سعد بن زنگی نے کرمان پر قبضہ کر لیا ۔ ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء میں خوارزم شاہ کے نام پر اس صوبے کو فتح کیا گیا ۔ ۱۲۲۰ء میں شجاع الدین زوزنی کرمان کا نیم خود مختار والی تھا، جس نے خوارزم شاہ محمد کی شکست کے بعد اس کے بیٹے غیاث الدین کو ، جو چنگیزی مغول کے آگے آگے بھاگا جا رہا تھا، اپنے علاقے میں داخل ھونے کی اجازت نہیں دی ۔ اس عہد کے مآخذ ابن الاثیر، ابن ابراھیم، افضل الدین (دیکھیے مآخذ)، ابن البلخی (فارس نامہ)، جوینی (جہان گشا)، حمد اللہ المستوفی (تاریخ گزیدہ)، راوندی (راحۃ الصدور) ھیں ۔

۱۲۲۲ء سے ۱۵۰۲ء تک : اس کے فوراً بعد ۶۱۹ھ / ۱۲۲۲ء میں مشہور براق حاجب [رک بآں] نے، جو قرہ ختای نسل سے تھا اور اس زمانے میں مذکورۂ بالا غیاث الدین کا وزیر تھا، شجاع الدین کو بزور نکال باھر کیا اور اس کے بعد سیاسی کھیل میں اس نے پہلے غیاث الدین، پھر جلال الدین خوارزم شاہ اور سب سے آخر میں مغول کے خلاف کچھ ایسی چالاکی سے چالیں چلیں کہ اس نے اپنا اقتدار بھی قائم رکھا اور کرمان بھی مغول فوجوں کے وحشیانہ ظلم و ستم سے آخر تک محفوظ رھا ۔ اس طرح براق حاجب نے، جسے دربار خلافت سے قتلغ خان کا اعزازی خطاب ملا تھا، ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی جو قتلغ خانیہ کے نام سے مشہور ھوا ۔ یہ خاندان ۱۳۰۳ء تک مغول کے زیر سیادت رھا ۔ اس خاندان کی ایک قابل ذکر شخصیت ترخان خاتون ھے جو براق حاجب کی بیٹی تھی ۔ اس نے ۱۲۵۸ سے ۱۲۸۲ء تک حکومت کی اور اس نے آب پاشی کے لیے قناتیں کھود کر ملک کی خوشحالی میں اضافہ کیا ۔ اسی کے عہد میں مارکوپولو "سلطنت" کرمان میں آیا تھا ۔ اس کے بیان سے یہ

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہرمز کا فرمانروا سلطان کرمان کا باجگزار تھا ۔ اس خاندان کا خاتمہ آخری قُتلغ خان کی ایک نافرمانی کے باعث عمل میں آیا (۱۳۰۳ء) ۔ صوبے میں متعدد مغول والی ہوئے تا آنکہ ۱۳۴۰ء میں آخری قتلغ خان کے داماد مبارز الدّین محمّد نے کرمان پر قبضہ کر لیا ۔ اس نے ۱۳۵۳ء میں شیراز فتح کیا اور خاندان مُظفّریہ کی بنیاد رکھی ۔ ۱۳۶۳ء میں اس کا بھائی عماد الدین کرمان میں اس کا جانشین ہوا ۔ اس کی بعض عمارتیں ابھی تک موجود ہیں (کرمان میں پامنار مسجد) ۔ ابھی کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ صوبے بھر میں اس خاندان کے درمیان لڑائی جھگڑے ہونے لگے جن کا ۱۳۹۳ء میں تیمور نے ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا ۔ آل تیمور کے بعد جنھیں مختلف اوقات میں یہاں کے باغی والیوں کو کچلنا پڑتا تھا (۱۴۰۸ء میں شیخ اُوَیس) کرمان کی فرمانروائی قَرہ قویونلو کے ہاتھ آئی (تقریباً ۱۴۳۵ء) جنھیں بہت جلد آق قویونلو کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی۔ دراصل اس زمانے سے کرمان کو فارس کے ساتھ متحد کر دیا گیا اور اُزون حسن کا ایک رشتہ دار یہاں کا والی مقرر ہوا ۔

مآخذ (۱) جوینی : تاریخ جہانگشای ؛ (۲) ناصر الدین : سمۃ العلی ؛ (۳) حمد اللہ المستوفی : تاریخ گزیدہ ؛ (۴) علی یزدی : شرف نامہ ؛ (۵) عبد الرزاق سمرقندی : مطلع سعدین ؛ (۶) میر خواند : روضۃ الصفا ؛ (۷) خواند میر : حبیب السیر ۔

۱۵۰۲ سے ۱۷۹۴ء تک : آق قویونلو خاندان کے آخری حکمران ابوالفتح بیگ بایندری کا عہد تھا جب شاہ اسمٰعیل نے صوبۂ کرمان فتح کیا (حدود ۱۵۰۲ء) اور اس وقت سے یہ صفوی خاندان [رک بہ صَفَویّہ] کے قبضے میں آ گیا ۔ ۱۵۰۹ء میں اسے ازبکوں کے حملے کا سامنا کرنا پڑا لیکن، عہد صفویہ کے خاتمے تک کرمان میں امن و امان کا دورہ رہا ۔ سارے ایران کی طرح یہاں کے باشندوں کی اکثریت بھی سرکاری مذہب اختیار کرکے اِثناعشریہ شیعہ ہو گئی ۔ کرمان کا ایک مشہور ترین صفوی والی گنج علی خان (۱۵۹۶ تا ۱۶۲۱ء) تھا جس نے کئی کاروان سرائیں اور بازار تعمیر کیے ۔ ۱۷۲۰ء میں محمود خان کے زیر قیادت افغانوں نے جب اصفہان کی جانب اپنی پیش قدمی کا آغاز کیا تو وہ کرمان سے گزرے جس نے صفویوں کا انتزاع کر دیا ۔ اس کے بعد نادر شاہ کی حکومت (۱۷۳۵ تا ۱۷۴۷ء) آئی ۔ پھر طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ افغان خانہ بدوش اور بلوچ ملک کو تاراج کرتے رہے ۔ ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۸ء میں کریم خان زَند نے کرمان پر زبردستی قبضہ کر لیا ۔ اس نے جس خاندان کی بنیاد رکھی اس کا تختہ الٹنے سے صوبے اور خصوصاً دارالحکومت پر ایسی ہولناک تباہی نازل ہوئی کہ اس کی مثال کرمان کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ کریم خان کا بیٹا لُطف علی خان [رک باں] آغا محمّد خان قاجار کے سامنے سے بھاگا اور ۱۷۹۴ء میں کرمان میں پناہ گزیں ہوا جہاں کے کچھ باشندے اس کے وفادار تھے، مگر اسی سال دارالحکومت کو ہتیار ڈالنے پڑے اور اگرچہ لطف علی خان بَم کی جانب فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، لیکن بعد ازاں اس کے ساتھ بے وفائی کی گئی اور اسے آغا محمّد کے حوالے کر دیا گیا ۔ قاجار نے بڑا ہولناک انتقام لیا ۔ مستند مآخذ کی رو سے اس نے ۲۰ ہزار عورتیں اور بچے غلام بنا کر فروخت کیے اور وہاں کے ۳۵ ہزار مردوں کو اندھا کر دیا ۔ اس فعل نے صوبے کی ساری طاقت اور خوشحالی کا خاتمہ کر دیا اور ایک سو سال تک اس کی حالت نہ سدھر سکی ۔

مآخذ: خواند میر اور صفویہ و مابعد کے خاندانوں کی فارسی تواریخ (دیکھیے *Grundriss der Iran. Phil.*، ۲: ۵۸۶ ببعد، ۵۹۲، ۵۹۳) .

۱۷۹۴ء سے شاہان قاجار [رک باں] کرمان پر والیوں کے ذریعے حکومت کرتے تھے۔ جو عموماً ان کے خاندان ہی کے افراد ہوتے تھے - ۱۸۳۹ سے ۱۸۴۱ء کے دوران میں ایک شخص آغا خان نامی نے صوبے کو قاجاریوں کے پنجے سے آزاد کرانے کی متعدد ناکام کوششیں کیں۔ اس زمانے سے اس صوبے کی تاریخ میں کوئی قابل ذکر واقعہ رونما نہیں ہوا - سیاسیات عالم میں جس طرح ایران کو ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہوتی گئی اگرچہ وہ خود بے اختیار تھا، اس نسبت سے کرمان آہستہ آہستہ برطانیہ کے حلقۂ اثر میں آتا گیا۔ اس صورت کا اظہار ۱۹۰۷ء کے انگریزی روسی معاہدے سے ہو گیا .

بڑے بڑے شہر اور اضلاع: کرمان کا صوبہ آج کل انیس اضلاع میں منقسم ہے ۔ مقدسی نے جن پانچ بڑے شہروں کا ذکر کیا ہے (دیکھیے لیچر) ان میں سے تین، یعنی سیر جان، جیرفت اور نرماسیر کا اب وجود نہیں رہا۔ اب صرف ان ناموں کے اضلاع موجود ہیں۔ جغرافیے کی قدیم کتابوں میں ایسے کئی شہروں اور دیہات کے نام ملتے ہیں جو معدوم ہو چکے ہیں یا ابھی ان کا تعین نہیں کیا جا سکا .

شمالی حصے میں دارالحکومت کرمان [رک باں] واقع ہے ۔ کرمان سے یزد جانے والی سڑک پر زرند اور بافک ابھی تک باقی ہیں۔ اس سڑک کے شمال مشرق میں صحرا کے کنارے کوہ بنان (جسے مارکوپولو نے Cobinan لکھا ہے) اور راور بھی موجود ہیں ۔ خبیص ایک تاریخی مقام ہے اور کرمان کے مشرق جانب کافی نشیبی علاقے میں واقع ہے ۔ یہاں کی کھجور بہت مشہور ہے ۔ دارالحکومت سے جنوب مشرق میں ماہان (موجود ماھون) صوفی سیّد نعمت اللہ (م - ۱۴۳۱ء) کی خانقاہ کی وجہ سے مشہور ہے جو شاہ عباس کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی ۔ المقدسی کے زمانے سے ماہان میں عرب آباد ہیں .

مغرب میں مرکزی شہر دارالحکومت سیر جان (اکثر شیرجان) ہے ۔ یہ صوبۂ فارس سے بہت نزدیک واقع ہے ۔ المقدسی کے زمانے میں یہ شہر شیراز سے بڑا تھا، لیکن ۱۳۹۶ء میں تیمور کی فوجوں کا ایک عرصے تک مقابلہ کرنے کے بعد تباہ ہوگیا ۔ اب اس کا محل وقوع چونے کے پتھر کی ایک چٹان سے معلوم ہوتا ہے جو ہموار میدان میں ۳۰۰ فٹ بلند کھڑی ہے اور قلعۂ سنگ کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ چٹان پرانے زمانے کے قلعے کی نشانی ہے اور اس کا حال Sykes نے بیان کیا ہے (*10,000 Miles, etc*، ص ۴۳۱ ببعد) ۔ اسے یہاں کچھ کتبات بھی ملے تھے - اس کے قریب ہی موضع سعد آباد واقع ہے ۔ یہ میدان کرمان سے زیادہ زرخیز ہے اور اس میں کئی گاؤں ہیں .

بم [رک باں] جو صوبے کے مشرقی حصے میں ہے ابھی تک قائم ہے۔ سیرجان سے بم جانے والی سڑک راین اور درزین سے گزرتی ہے ۔ درزین سے ایک سڑک جیرفت کو جاتی تھی (اور اب بھی جاتی ہے)۔ نرماسیر (نیز نرماشیر) بم سے کچھ تھوڑے ہی سے فاصلے پر جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ قبل ازیں یہ ہندوستان سے تجارت کی ایک اہم منڈی تھی۔ فی زماننا اس نام کا صرف ایک ضلع موجود ہے۔ موضع فہلج جو اسی ضلع میں واقع ہے، عہد الافغنہ میں ایک قلعہ تھا .

کرمان کے جنوبی حصے کا پرانا صدر مقام جیرفت اس جگہ واقع تھا جسے آج کل ہم شہر دقیانوس کہتے ہیں ۔ مارکوپولو کے زمانے ہی میں اس شہر کی جگہ اسی کے ایک سابقہ محلے کمادن

نے لے لی تھی جیسے یہ وینسی سیاح Camadi لکھتا ہے ۔ یہ ایک اہم منڈی تھی ۔ الادریسی (ترجمۂ Reinaud، ص ۴۳۲) کی ایک عبارت پر اپنے قیاس کی بنیاد رکھتے ہوے Sykes (کتاب مذکور، ص ۴۴۵) لکھتا ہے کہ قدیم ترین دارالحکومت کَرْمَنَہ کی تلاش جِیْرُفْت اور نَہاج کے درمیان کرنی چاہیے ۔ وَلاشگرد یا گلاشگرد جِیْرُفْت سے ھرمز جانے والی سڑک پر واقع ہیں ۔ اس نام کا ایک گاؤں ابھی تک موجود ہے ۔

آبادی : بیان کیا جاتا ہے کہ عام طور پر کرمان کے باشندے گرمی کی وجہ سے سیاھی مائل گندمی رنگ اور چھریرے جسم کے ہوتے ہیں (الاصطخری) ۔ گَرْم سَیْر میں واقعی بہت سخت گرمی پڑتی ہے جو مضر صحت ہوتی ہے ۔ کرمان کے قدیم ترین باشندوں کی نمائندگی ازمنۂ وسطی میں غالباً قُفْس نامی پہاڑی لوگ کرتے تھے جو جنوب کے کوھستانی ضلع میں آباد تھے یا پھر بارز (παρικάνιοι در ھیروڈوٹس، ۳ : ۹۲) کرتے تھے ۔ وہ ان پہاڑوں میں رہتے تھے جو شہر کرمان کے جنوب مغرب میں واقع اور آج بھی بارز کوہ کے نام سے مشہور ہیں ۔ المقدسی (ص ۴۷۱) لکھتا ہے کہ قُفْس اور بَلُوص کی زبان ناقابل فہم ہے ۔ غالباً یہ لوگ یا توگردش زمانہ سے نیست و نابود ھوگئے اور یا آل بویہ اور سلاجقہ کے عہد میں ایرانی عنصر میں خلط ملط ھوگئے ۔ بلوص کے بارے میں جو شمال مغرب سے نقل سکونت کرکے (البلاذری اور الطبری ان کا ذکر نہیں کرتے) بارھویں صدی سے مکران میں آباد ھوگئے تھے [رک بہ بلوچستان] ۔ جہاں تک یہاں کی مستقل سکونت رکھنے والی آبادی کا تعلق ہے وہ ایرانی النسل ھی معلوم ھوتی ہے ۔ Strabo پہلے ھی کہ چکا ہے کہ ان کی رسوم اور زبان میڈیا اور ایران کے باشندوں جیسی ہیں (۱۵ : ۲ : ۱۴) ۔ ساسانیوں کے عہد سے ان کا ایک حصہ نسطوری عیسائیوں پر مشتمل تھا ۔ کرمان کا اسقف فارس کے اسقف اعظم کے ماتحت ھوتا تھا ۔ لوگوں میں اسلام آہستہ آہستہ پھیلایا گیا ۔ بقول الطبری کوھستانیوں نے بنو عباس کے عہد میں اسلام قبول کیا تھا ۔ آگے چل کر ان لوگوں نے شیعہ تحریک کی بڑی حمایت دکھائی (المقدسی) ۔ یاقوت (: [معجم البلدان، بذیل مادۂ قُفْس) اس بات پر زور دیتا ہے کہ جب وہ کسی مذھب کے بھی پیرو نہیں تھے اس وقت بھی حضرت علی رضؓ بن ابی طالب کا انتہائی احترام کرتے تھے ۔ یہاں کی نو مسلم آبادی فرقہ پرستوں، مثلاً خارجیوں اور بعد ازاں اسمٰعیلیوں کے اثرات کی زد میں بہت زیادہ آتی تھی ۔ مذھبی اعتقادات کے نقطۂ نظر سے بقول المقدسی سَیْرجان کے باشندے اھل الحدیث اور جِیْرُفْت کے اھل الرائے تھے ۔ بالآخر جب صفوی نمودار ھوے تو شیعیت کی سرکاری صورت اثنا عشریہ مذھب رائج ھوئی اور آج بھی لوگوں کی بڑی اکثریت اسی مذھب کی پابند ہے ۔ انیسویں صدی میں شَیْخی فرقے [رک بہ شَیْخیّہ] کے کئی پیرو صوبۂ کرمان میں پیدا ھوگئے، چنانچہ اس کا شمار ان کے اہم ترین مراکز میں ھونے لگا ۔ Sykes کے اندازے کے مطابق ان کی تعداد ۷ ہزار تھی ۔ بابیوں کی تعداد ان سے کچھ کم تھی ۔ آخری بات یہ ہے کہ کرمان ان اضلاع میں سے ہے جہاں مذھب زردشت کے پیرو ایک فرقے کی حیثیت سے برقرار رہے اور اپنے مرشدین مذھب کی قدیم تنظیم کے ماتحت روحانی رھنمائی حاصل کرتے رہے ۔ Tavernier (ص ۳۹۰) لکھتا ہے کہ اس کے وقت (حدود ۱۶۰۹ء) میں ان کی کثیر تعداد کے ھندوستان میں ھجرت کر جانے کے بعد بھی صرف شہر کرمان ھی میں، ان کی آبادی ۱۰ ہزار سے زیادہ تھی ۔ آبادی سے چار فرسخ کے فاصلے پر ان کا دَیر تھا ۔ یہ لوگ

زیادہ تر اُون کے تاجر تھے۔ اٹھارھویں صدی تک کرمان میں دَستُور کا ایک مدرسہ بھی لازمًا ھوگا۔ اسے کافی اثر و رسوخ حاصل تھا۔ بقول Khanikoff ۱۸۹۴ء میں آغا محمّد شاہ کے ھاتھوں کرمان کی تباھی عمل میں آنے سے قبل وھاں ۱۲ ھزار پارسی گھرانے آباد تھے۔ ۱۹۰۰ء کے قریب Sykes نے ان کی آبادی ۱۷۰۰ نفوس پر مشتمل بتائی ھے [نیز رک بہ پارسی]۔

یزد کے پارسیوں کی طرح کرمان کے پارسی بھی اپنی قدیم متروک الاستعمال بولی گَبْری بولتے ھیں۔ Houtum Schindler اور براؤن جیسے لوگوں نے (دیکھیے *Grundriss der Ir. Phil.*، ۱ : ۳۸۱ ببعد) اور حال ھی میں O. Mann (*Die Mundarten von Khunsar, etc*، طبع K. Hadank برلن لائپزگ ۱۹۲۶ء) نے مطالعہ کیا ھے۔ معلوم ھوتا ھے کہ کرمان میں جو دوسری بولیاں استعمال ھوتی ھیں ان کا کبھی خصوصی مطالعہ نہیں کیا گیا۔ ان کا تعلق جنوبی السنہ کی برادری سے ھے جن کی نمائندگی مثال کے طور پر فارس اور کاشان کی بولیاں کرتی ھیں (دیکھیے Geiger در *Grundriss*، ۱ : ۲، ص ۳۲۲)۔ المقدسی کی رائے ھے کہ کرمان کی زبان خراسان سے ملتی جلتی ھے۔

خانہ بدوش لوگ جو کہ کرمان کی آبادی میں جو خاصی بڑی اقلیت پر مشتمل ھیں غالبًا عرب ترک اور کرد حملہ آوروں کی نسل سے ھیں۔

۱۹۰۰ء کے قریب صوبے کی آبادی کا اندازہ ۶۵۰,۰۰۰ لگایا گیا تھا۔

(۲) شہر کرمان صوبے کے شمال مشرقی حصے میں (۳۰ درجے ۱۷ دقیقے عرض بلد شمالی ۵۶ درجے ۵۹ دقیقے طول بلد مشرقی) واقع ھے اسے ھر اعتبار سے اس شہر اور ضلع سے مطابقت دی جا سکتی ھے جسے عرب جغرافیہ نویس بردَسِیر (یاقوت نے بَرْدَسِیر لکھا ھے) یا گَوَاشِیر (نیز دیکھیے المقدسی ص ۴۶۰) کے نام سے یاد کرتے تھے۔ یہ دونوں صورتیں ممکن ھے 'بِرْ اَرْدَشِیْر' سے ماخوذ ھوں جو بقول حَمْزَہ اِصْفَہانی (طبع Gottwald، ص ۴۶) خاندان ساسانیان کے بانی اَرْدَشِیْر کے ایک تعمیر کردہ شہر کا نام تھا۔ شہر کے مشرق میں وہ پرانا قلعہ، یعنی قلعۂ اَرْدَشِیْر ھے جو ازمنۂ وسطٰی میں شہر کے دروازے سے قریب باھر ھی واقع ھوگا۔ یہ قلعہ بھی اردشیر سے منسوب کیا جاتا ھے۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ شہر بَمْ اور جِیْرُفْت جتنا قدیم نہیں ھے (Sykes بہ تتبع افضل الدّین)۔ کرمان کے جنوب مغرب میں ایک ضلع ابھی تک بَرْدَسِیْر کے نام سے مشہور ھے۔ نویں صدی میں جب ابن الیاس نے اس پر قبضہ کیا تھا اس وقت یہ کچھ ایسا بڑا شہر نہیں تھا، لیکن بارھویں صدی میں یاقوت اسے کرمان کا سب سے بڑا شہر بتاتا ھے۔ اس کا نام کرمان اسی نام کے صوبے کا دارالحکومت ھونے کی وجہ سے پڑا۔ سرکاری طور پر اس کا اعزازی نام دَارُالْاَمان ھے۔

یہ شہر جُوپَر کے سلسلۂ کوہ سے ۱۲ میل کے فاصلے اور تقریبًا ۶۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ایسی جگہ واقع ھے جہاں تین وادیاں آپس میں ملتی ھیں۔ اس کے چاروں جانب سٹیپ کے لق و دق میدان پھیلے ھوے ھیں اور بہت کم مزروعہ زمین نظر آتی ھے۔ قلعۂ اردشیر جس کا ابھی ذکر ھوا ھے اور شہر کے درمیان ذرا کم بلندی پر ایک منہدم قلعہ، قَلْعَۂ دُخْتَر ھے جو پیشتر ازیں شہر کے اندر واقع ھوگا۔ شہر کے مشرق اور جنوب کی طرف پھیلے ھوے میدانوں میں ھر طرف عمارتوں کے کھنڈر بہت بڑی تعداد میں ملتے ھیں۔ یہاں نہایت خوبصورت گلی ظروف (Fayence) کے ٹکڑے اور دیگر آثار قدیمہ نظر آتے ھیں۔ خود شہر کے

چاروں طرف پکی مٹی کی ایک دیوار ہے جس میں چار دروازے ہیں۔ فصیل سے باہر شمال مشرق کی طرف زردشتیوں کی آبادی محلۂ گبر ہے۔ قلعہ مغربی جانب واقع ہے۔ حمد اللہ المستوفی (نزہۃ القلوب، ص ۱۴۰) نے ایک مسجد کا ذکر کیا ہے جو حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی، لیکن آج جو قدیم ترین مسجد ہمیں ملتی ہے وہ مسجد ملک ہے جسے توران شاہ سلجوق (۱۰۸۴ تا ۱۰۹۶ء) نے بنوایا تھا۔ یہ مسجد سولھویں صدی عیسوی میں کھنڈر بن گئی تھی، لیکن اب اس کی مرمت ہوگئی ہے۔ دوسری دو اہم مسجدیں مسجد جامع اور مسجد پامنار ہیں۔ مسجد جامع کو ایک کتبے کی رو سے ۱۳۴۹ء میں مبارز الدین مظفر نے اور مسجد پامنار کو اس کے بھائی عماد الدین نے تعمیر کرایا تھا۔ ایک یادگار جو ۱۸۹۶ء میں زلزلے سے تباہ ہوگئی گنبد سبز تھی۔ یہ ایک استوانہ نما عمارت تھی اور اس پر سبزی مائل نیلے رنگ کی کاشی کاری کی ہوئی تھی۔ Sykes کو جو معلومات بہم پہنچائی گئی تھیں ان کی رو سے یہ خاندان قتلغ خانیہ کے ایک رکن کا مقبرہ تھا جو ۶۴۰ھ/۱۲۴۲ء میں تعمیر ہوا تھا۔ ۱۷۹۴ء کی تباہی کے بعد فتح علی شاہ کے عہد میں یہ شہر دوبارہ تعمیر کیا گیا، لیکن اس کی خوشحالی کا دور کہیں ۱۸۶۰ء میں شروع ہوا جب یہاں کا والی وکیل الملک تھا۔ موجودہ شہر کا نقشہ Sykes نے ص ۱۸۸ کے مقابل دیا ہے (10,000 Miles, etc)۔ انیسویں صدی کے اواخر میں آبادی میں اضافہ ہوا۔ Schindler نے ۱۸۷۸ء میں یہاں کی آبادی ۴۱,۱۷۰ اور Sykes نے ۱۹۰۰ء میں ۴۹,۱۲۰ بتائی ہے۔ سب سے زیادہ تعداد شیعیوں کی ہے، پھر شیخی (۶,۰۰۰)، پھر بابی (۳,۰۰۰) اور پھر زردشتی (۱,۶۰۰) آتے ہیں۔ یہودیوں کی تعداد بہت ہی کم، یعنی صرف ۷۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ [صوبۂ کرمان کی موجودہ آبادی ۲۴۳,۶۶۹ ہے، دیکھیے: *The Statesman's Year-book 1975/1976*، بمدد اشاریہ]۔ کرمان کو صنعتی اعتبار سے بڑی بھاری شہرت شالوں کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے، لیکن اب اونی اور ریشمی قالینوں کی صنعت اس سے بازی لے گئی ہے۔ کاریگر تقریباً سب کے سب مرد ہیں۔ Sykes کے اندازے کے مطابق چالیس ہزار پونڈ مالیت کے مال کی سالانہ برآمد ہوتی ہے۔ نمدا تیار کرنا یہاں کی ایک اور اہم صنعت ہے [کرمان دور جدید میں بھی داخل ہو چکا ہے۔ وائرلیس سٹیشن ہے۔ بنک ملی ایران کی شاخ ہے۔ اپیل کے لیے عدالت موجود ہے]۔

مآخذ: عرب جغرافیہ نویسوں کے بیانات (جن کا حوالہ متن میں ہے) سے حسب ذیل نے فائدہ اٹھایا ہے:

(۱) P. Schwarz: *Iran im Mittelalter*، ۳ (لائپزگ ۱۹۱۲ء): ۲۱۱ ببعد؛ (۲) Barbier de Meynard: *Dictionnaire de la Perse*، پیرس ۱۸۶۱ء؛ (۳) J. Marquart: *Ērānshahr*، *Abh. G. W. Gött.*، N.F.، برلن ۱۹۰۱ء، شمارہ ۲، ۳: ۳۰ ببعد، ۱۷۹ ببعد؛ (۴) Tomaschek: *Zur historischen Topographie Persiens*، *S.B. Ak. Wien*، ۱۸۹۰ء، ج ۱۲۱، Abh.، ج ۸؛ (۵) Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۲۹۱ ببعد [اردو ترجمہ بھی موجود ہے]؛ بڑے بڑے مغربی سیاح یہ ہیں: (۶) Marco Polo؛ (۷) H. Pottinger: *Travels in Beloochistan*، ۱۸۱۰ء؛ (۸) N. de Khanikoff: *Mémoire sur l'ethnographie de la perse*، پیرس ۱۸۶۶ء؛ (۹) Lovett، Smith و Goldsmid: *Eastern Persia*، لنڈن ۱۸۷۶ء؛ (۱۰) A. H. Schindler: *Reisen im Südlichen Persien 1897*، *Z. G. Erd. Berl.*، ۱۶: ۳۲۳ ببعد؛ (۱۱) وہی مصنف: *Itineraries of Marco Polo*، *JRAS.*، N. S.، ج ۱۲؛ (۱۲) G. N. Curzon: *Persia*، لنڈن ۱۸۹۲ء، ۲: ۲۴۳

بعد ؛ (۱۳) E. G. Browne : *A year amongst the Persians* ، بار دوم ، کیمبرج ۱۹۲۶ء؛ (۱۴) Major P. Molesworth Sykes : *Ten Thousand Miles in Persia* ، لنڈن ۱۹۰۲ء ؛ مصنف جو کہ ۱۸۹۴ سے ۱۸۹۹ء تک کرمان میں انگریزی قونصل رہا - موجودہ صوبے کے بارے میں مستند ماخذ ہے دیگر جغرافیائی حالات : (۱۵) حاجی خلیفہ : جہان نما، قسطنطنیہ ۱۱۴۵ھ، ص ۲۵۶؛ (۱۶) C. Ritter : *Erdkunde*، ج ۸ ؛ (۱۷) K. Prellberg : *Persien eine historische Landschaft*، لائپزگ ۱۸۹۱ء - تاریخی ماخذ کا متن میں پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔ مقامی وقائع کی نوعیت کے تین ماخذ : (۱۸) محمّد بن ابراہیم : تاریخ آل سلجوق ، در *Recueil de Textes relatifs à l' histoire des Seldjoucides*، لائیڈن ۱۸۸۶ء؛ (۱۹) افضل الدّین احمد بن حامد کرمانی : عقد الاولی للموقف الاعلی، طبع لیتھو ، تہران ۱۲۹۳ھ (دیکھیے *Cat. of the Printed Pers. Books in the Brit. Mus.* ، لنڈن ۱۹۲۲ء، ص ۹۰) ؛ (۲۰) ناصر الدّین : سمت العلی للحضرت العلیا، محررہ ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء (دیکھیے *Cat. of the Pers. Mss. in the Brit. Mus.*، ۲ : ۸۴۹)؛ (۲۱) E. A. Strandman : *Chuandamir's afhandling om Qarachitaiska dynastin med inledning och anmärkingar*، Helsingfors ۱۸۶۹ء؛ (۲۲) Sykes کی مذکورہ تصنیف کے ص ۴۸ تا ۷۱ پر صوبۂ کرمان کی تاریخ کا خلاصہ درج ہے؛ (۲۳) موجودہ زمانے کے لیے دیکھیے E. G. Browne : *The Persian Revolution*، کیمبرج ۱۹۱۰ء؛ (۲۴) Sir Percy Molesworth Sykes : *History of Persia*، بار دوم، لنڈن ۱۹۲۱ء ؛ (۲۴) A. H. Schindler : *Die Parsen in Persien* ، *ZDMG*، ۱۸۸۲ء، ص ۵۴ تا ۸۸ ؛ (۲۵) Dosabhai Framji Karaka : *History of the Parsis*، بار دوم ۱۸۸۴ء؛ (۲۶) Spiegel : *Eranische Altertumskunde*، ج ۱، لائپزگ ۱۸۷۱ء؛ (۲۷) *Grundriss der Iranischen Philologie* ؛ (۲۸) E. G. Browne : *A Literary History of Persia* ، لنڈن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۶ء؛ (۲۹) وہی مصنف : *Persian Literature under Tartar Dominion*، کیمبرج ۱۹۲۰ء؛ (۳۰) وہی مصنف : *Persian Literature in Modern Times* ، کیمبرج ۱۹۲۴ء؛ (۳۱) de Gobineau : *Les religions et les philosophies de l'Asie Centrale*، پیرس ۱۹۰۰ء؛ (۳۲) Stanley Lane-Poole : *Catalogue of Oriental Coins in the Brit. Mus.* ، لنڈن ۱۸۷۵ تا ۱۸۹۰ء، ج ۱ ، ۶، ۷، ۹، بالخصوص ، ۱۰ : ۱۸۳ تا ۱۸۴؛ [(۳۳) *The Statesman's Year-book 1975/1976*، بمدد اشاریہ؛ (۳۴) منورسکی : حدود العالم، انگریزی ترجمہ، لنڈن ۱۹۳۷ء، بمدد اشاریہ] .

(J. H. Kramers)

* **کِرْمان شاہ** : ایک شہر جو ان پہاڑی سلسلوں کے درمیان ایک میدان میں واقع ہے جو سطح مرتفع ایران کی جنوب مغربی سرحد پر پھیلے ہوے ہیں، آج کل یہ اس ایرانی صوبے کا صدر مقام ہے جس کے شمال میں کُردستان ہے اور جنوب میں لُرِستان - شہر کا جغرافیائی محل وقوع تقریباً ۳۴ درجے ۲۰ دقیقے عرضِ بلد شمالی اور ۴۷ درجے طول بلد مشرقی ہے - قَرہ صو کی ندی اس میدان سے گزرتی ہے اور شہر کے شمال مشرق میں جنوب مغرب کی طرف بہتی ہوئی جنوب میں اور آگے جا کر دریاے گاما سیاب (پیشتر ازیں گاوْماسارُود) سے جا ملتی ہے - مؤخرالذّکر دریاے کَرخا [رکّ بآں] کا معاون اور صوبۂ مذکور کا اہم ترین دریا ہے .

غالباً یہی وہ علاقہ ہے جہاں میڈیا والوں کی قدیم ترین بادشاہت قائم ہوئی (A. Billerbeck : *Das Sandjak Suleimania und dessen Persische Nachbarlandschaften*، لائپزگ ۱۸۹۸ء، ص ۱۶۲) اور یہیں پارتھیا کے صوبے Καμβαδηνή اور Μηδία ἡ κάτω

واقع تھے ۔ (Isidore of Charax ص ۵) ۔ یہی صوبہ ساسانیوں کے زمانے میں اور عربوں کی فتح کے بعد ابتدائی صدیوں میں ماہ (موسیٰ سکنہ خُبرینہ کے ہاں ہے) کے نام سے مشہور رہا ۔ De Morgan یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ قدیم شہر کَمبَدینہ (Cambadene) کے کھنڈر کرمان شاہ کے شمال میں واقع تھے ۔ خود یہ شہر کچھ ایسا پرانا نہیں ہے اس کی بنیاد ساسانی دور میں رکھی گئی تھی اور سولھویں صدی سے اس کا شمار اہم شہروں میں ہونے لگا تھا ۔ قدیم عرب جغرافیہ نویس اسے قِرمَاسِین کے نام سے جانتے تھے (اس کی دوسری صورتیں قِرمَاسِن قِرمَاسِین، قِرماسِین، قِرمِشِین)، مقدسی (ص ۲۸) کہتا ہے کہ یہ کرمانشاھاں ہی کا دوسرا نام ہے ۔ دوسری طرف یاقوت (۴: ۶۹) کا خیال ہے کہ قِرمِیسِین کرمانشاھاں کا معرب ہے (دمشقی نے یہی بات کچھ تامل سے لکھی ہے، لیکن ابن الفقیہ پہلے ہی پہلی صورت کی تشریح دوسری صورت کی مدد سے کر چکا تھا) ۔ تاہم قزوینی (Geography، ص ۲۹۰) کہتا ہے کہ قِرمِیسِین کرمانشاھاں کے قریب واقع ہے ۔ قرمیسین کی وجہ تسمیہ کے بارے میں Ritter (۹: ۳۷۴) دریاے کُرسَنہ کی جانب توجہ دلاتا ہے جس کا ذکر Tacitus (*Annales*، ۱۲: ۱۳) نے کیا ہے ۔ کرمانشاھاں کا نام سب سے پہلے بظاہر دسویں صدی میں غالبًا آل بُوَیہ کے عہد میں ہمارے سامنے آتا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کن حالات میں حمد اللہ المستوفی (نزھۃ القلوب، ص ۱۰۸) نے ایک بہت مشہور و معروف روایت لکھی ہے جس میں بہرام چہارم (۳۸۸ تا ۳۹۹ء) کو اس شہر کا بانی بتایا گیا ہے ۔ اس بادشاہ نے صوبۂ کرمان [رک بآں] کے والی کی حیثیت سے کرمان شاہ کا خطاب پایا تھا اور بلا شبہہ مؤرخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس نے ایک شہر بسایا تھا، لیکن زیادہ اغلب ہے کہ یہ کرمان شاہ یزد اور کرمان کے کے درمیان کا چھوٹا قصبہ تھا (دیکھیے الطبری، در Nöldeke : *Gesch. d. Pers. u. Arab.*، ص ۱۷)۔ ایک اور روایت میں جو تقریبًا ہر جغرافیہ نویس کے ہاں کم و بیش وضاحت کے ساتھ ملتی ہے اس کی بنیاد شاہ کَوَاذ بن فیروز (۴۸۸ تا ۵۳۱ء؛ بالخصوص دیکھیے المقدسی، ص ۲۵۷ ببعد) سے منسوب کی جاتی ہے ۔ شہر کے گرد و نواح میں ساسانی بادشاہوں کے عہد کے کئی آثار موجود تھے اور آج بھی پائے جاتے ہیں ۔ یہ بادشاہ وہاں اکثر سکونت رکھتے تھے اور زمانۂ مابعد کے فرمانروا بھی اس سلسلے میں ان کے نقش قدم پر چلتے رہے، مثلاً ہارون الرّشید اور عضدالدولہ بُوَیہی جس نے وہاں ایک قصر تعمیر کرایا تھا (المقدسی، ص ۳۹۳)۔ شہر کا نیا نام شاید اسی واقعے سے منسوب کر سکتے ہیں کیونکہ عضدالدولہ ہی کے عہد میں آل بُوَیہ صوبۂ کرمان [رک بآں] کے مالک بنے تھے ۔

حُلوان کی فتح کے بعد قرمیسین پر عربوں کا پرامن طریق سے قبضہ ہو گیا تھا (۶۴۰ء میں؛ البلاذری، ص ۳۰۱) ۔ اسی زمانے میں ضلع ماہ جو صوبۂ جبال میں شامل تھا کوفے اور بصرے کے باشندوں کو بطور جاگیر عطا کیا گیا ۔ بالائی حصہ ماہ الکوفہ کے نام سے مشہور ہوا، جس کا صدر مقام دِینَور تھا اور زیریں حصہ ماہ البصرہ کے نام سے جس کا صدر مقام قرمیسین تھا (البلاذری، ص ۳۰۶؛ قدامۃ، ص ۲۲۶) ۔ بہرحال دِینَوَر [رک بآں] قرمیسین سے کہیں زیادہ اہم شہر تھا (دیکھیے Schwartz، ص ۴۷۹) اور اس زمانے کے جغرافیہ نویس اس کا ذکر بغداد —— خانقین —— حلوان —— قرمیسین —— بیستون —— ہمذان والی شاہراہ کی ایک منزل کی حیثیت سے کرتے ہیں ۔ ایک اور اہم سڑک قرمیسین سے نہاوند کو جاتی تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ اس

زمانے میں یہ شہر ایک بہت زرخیز میدان میں عمدہ جگہ پر واقع تھا ۔ اس پر یکے بعد دیگرے بنو عبّاس، آل بُوَیہ (اس زمانے میں یہ لازماً کرد خاندان حَسْنُوْیہ [رک باں] کی عملداری میں شامل تھا ، اگرچہ شرف الدّین نے شرف نامہ میں اس کا تذکرہ نہیں کیا) اور سلاجقہ حکومت کرتے رہے ۔ دور مغول میں اس کی حیثیت گھٹتے گھٹتے ایک معمولی گاؤں کی ہو کر رہ گئی تھی (حمد اللہ قزوینی) ۔

کرمان شاہ کی اہمیت صفویوں کے عہد حکومت میں اس وقت ہوئی جب اسے عثمانیوں کے خلاف سرحدی مورچہ بنایا گیا ۔ عثمانی ترکوں نے خصوصاً مراد چہارم کے بعد عراق میں قدم جما لیے اور ان کا اس قدر قریب آ جانے سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا ۔ ترکوں نے ایران سے جنگ کے دوران میں کئی بار قبضہ کیا، مثال کے طور پر ۱۶۳۰ء میں خُسْرَو پاشا [رک باں] کی مہم پیش کی جا سکتی ہے ۔ اس وقت یہ ایک قلعہ بند شہر تھا جس کے گرد خشتی فصیل بنی ہوئی تھی ۔ اولیا چلبی (۴ : ۳۵۳) کے اس بیان، جس میں اس شہر کا بسانا شاہ اسمٰعیل سے منسوب کیا ہے، کا مطلب غالباً یہ ہے کہ شاہ اسمٰعیل ہی نے پہلی بار اس کی قلعہ بندی کی تھی ۔ صفویوں کے زوال (۱۷۲۲ء) کے بعد بغداد کا پاشا اس پر قابض ہو گیا ، لیکن اشرف خان نے اسے نکال باہر کیا ۔ ۱۷۳۱ء میں پھر ترکوں کا قبضہ ہو گیا اور اس بار انہیں اس شخص کے ہاتھوں نکلنا پڑا جو آگے چل کر نادر شاہ مشہور ہوا ۔ ۱۷۳۲ء اور ۱۷۳۶ء کے صلح کے عہد ناموں کی رو سے کرمان شاہ ایران کے پاس رہنے دیا گیا (دیکھیے *G.O.R.* : Von. Hammer، ۷ : ۴۰۴ ببعد) ۔ ۱۷۵۴ء میں نادر شاہ کی طرف سے میرزا محمّد تقی خان یہاں کا والی مقرر ہوا ۔ آگے چل کر اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تاآنکہ ۱۷۶۶ء میں کریم خان زَند نے دو سال کے محاصرے کے بعد یہ شہر فتح کر لیا ۔ عہد قاجار میں کرمان شاہ کی اہمیت میں اضافہ ہوا ۔ ۱۷۹۰ء میں یہاں کی آبادی ۶۰۰۰ پر مشتمل تھی (Beauchamps، جس کا حوالہ Ritter نے دیا ہے)، لیکن ۱۸۱۰ء ہی میں یہ ۱۲۰۰۰ گھرانوں تک بڑھ چکی تھی (Kinneir، در Ritter) ۔ فتح علی شاہ کے بیٹے محمّد علی میرزا کی گورنری کے زمانے میں جو کرمان شاہ میں تقریباً خود مختار والی کی حیثیت سے رہتا تھا، یہ شہر ترکوں کے مقابلے کے لیے زبردست گڑھ بن گیا ۔ ترکوں اور ایرانیوں میں جو صلح ۱۸۲۳ء میں ہوئی تھی اس کے بعد علی میرزا نے اتنی قوت حاصل کر لی تھی کہ اس نے زہاب کا وسیع ضلع اپنے صوبے میں شامل کر لیا حالانکہ یہ ترکی کو واپس ملنا چاہیے تھا ۔ عہد قاجار کے کرمان شاہ کے والیوں کی ۱۹۰۵ء کی مکمل فہرست Rabino (دیکھیے مآخذ) نے دی ہے ۔ بالکل قریب زمانے، یعنی اپریل ۱۹۱۵ء تک ترک اس شہر پر قابض رہے اور وسطی (= جرمنی و آسٹریا کی) سلطنتوں کے حق میں تبلیغ کرتے رہے تاآنکہ مارچ ۱۹۱۷ء میں یہاں سے پسپائی پر مجبور کر دیے گئے ۔

آج کل کرمان شاہ دراصل صوبے کا نام ہے شہر کو "کرمانشاہان" کہتے ہیں جو زیادہ صحیح ہے ۔ ۱۹۰۵ء کے قریب اس کی آبادی تقریباً ساٹھ ہزار تھی (Rabino) اور اس کی خوشحالی زیادہ تر اس کے محل وقوع کی مرہون منت ہے کہ وہ بغداد سے ہمذان جانے والی خاصی قدیم اور عظیم تجارتی شاہراہ (الجادّہ، در المقدسی) پر واقع ہے (کرمانشاہان ان دونوں شہروں سے سو سو میل کے فاصلے پر ہے) اس راستے پر آگے تک بہ کثرت آمد و رفت رہتی ہے ۔ عراق کے مقدس مقامات کو جانے والے شیعہ زائرین بھی اسی شاہراہ کو استعمال

کرتے ہیں ۔ کرمانشاہاں میں کوئی قدیم عمارت نہیں ۔ برج و بارہ منہدم کر دیے گئے ہیں ۔ سب سے قابل ذکر عمارت اسلحہ خانہ ہے ۔ والی بھی یہیں سکونت رکھتا ہے ۔ یہ عمارت اس وسیع توپ میدان کے کنارے پر بنی ہوئی ہے ۔ اس شہر میں بہت سی کاروان سرائیں ہیں ۔ جب سے قالین بافی کا کام ختم ہوا کوئی خاص مقامی صنعت نہیں رہی۔ باشندوں کی اکثریت کردوں پر مشتمل ہے ۔ ان کے بعد ایرانیوں، ترکوں، یہودیوں اور مسیحیوں کا نام آتا ہے ۔ گرد و نواح کی زمین بہت زرخیز ہے ۔ اولیا (محل مذکور) اور حاجی خلیفہ (جہان نما، ص ۳۰۲) نے زعفران کی کاشت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے ۔

صوبہ ۳۳ درجے ۳۰ دقیقے اور ۳۵ درجے عرض بلد شمالی اور ۴۴ درجے ۳۰ دقیقے اور ۴۸ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرق کے درمیان پھیلا ہوا ہے ۔ صدر مقام اس کے تقریباً مرکز میں واقع ہے ۔ مغربی حصے میں کرند اور قصر شیریں [رک باں] اور مشرق میں اسد آباد کنگاور (قبل ازیں قصرُاللُّصُوص)، بیستون [رک باں] نہاوند [رک باں] اور دِینَور [رک باں] کے کھنڈر ہیں ۔ اس صوبے میں ہخامنشی اور ساسانی دور کے متعدد آثار قدیمہ ملتے ہیں، جن کا قدیم جغرافیہ نویسوں نے تھوڑی بہت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے ۔ مثال کے طور پر طاق بستاں کے مشہور مجسمے جو کرمانشاہاں سے تین میل مشرق میں واقع ہیں جنھیں شاہ خسرو کے گھوڑے کی وجہ سے جغرافیہ نگار شَبدیز یا شبِ دَاز کے نام سے یاد کرتے ہیں، نیز وہ ٹیلا (دکّہ) جہاں روایت کے مطابق ۱۰۰ ستونوں والے دیوان عام میں خسرو پرویز نے ساری دنیا کے بادشاہوں سے اطاعت کا اقرار لیا تھا [نیز رک بہ بیستون] ۔

اس کا شمار ایران کے خوشحال ترین صوبوں میں ہوتا ہے ۔ یہاں سے چاول اور گندم دساور جاتے ہیں اور خود اپنی ضرورت کے لیے مکئی، چارا، ارنڈ کا تیل اور کپاس پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس کی آبادی [پانچ لاکھ] کے قریب ہے اور یہ ۱۰ اضلاع (بلوک) میں منقسم ہے ۔ ان میں سے متعدد اضلاع ان قبائل کے نام سے موسوم ہیں جو وہاں آباد ہیں۔ Rabino نے اس صوبے کے چوالیس قبائل کے نام دیے ہیں (نیز دیکھیے Curzon، ۱ : ۵۵۷) جن میں سے بیشتر کرد ہیں ۔ کردوں کا سب سے بڑا قبیلہ کَلْہور ہے (یہ شرف الدّین کے شرف نامہ میں مذکور ہے) جو جنوب مغرب میں آباد ہے اور ایک ضلع اسی کے نام سے موسوم ہے ۔ قصرشیریں کے مغرب میں ایک بہت بڑا کرد قبیلہ سنْجابی ہے ۔ O. Mann نے جنوبی کردی بولی کا نام لَکّی (Lakki) لکھا ہے (*Die Mundarten der Lurstämme im Südlichen Persien*، برلن ۱۹۱۰ء، ص ۲۲)، حالانکہ لَکّ صحیح معنوں میں لُرستان میں رہتے ہیں ۔ صوبے کے جنوب میں لُر قبائل آباد ہیں ۔ نیم خانہ بدوش آبادی کی اکثریت علی اللّٰہی [رک باں] ہے ۔ مذکورۂ بالا قبائل کے علاوہ عربوں اور ترکوں کے کئی چھوٹے چھوٹے قبائل ہیں جو بڑے بڑے کرد قبائل کے حلیف ہوگئے ہیں ۔

مآخذ : (۱) قدیم جغرافیہ نگاروں کے حوالے .*B.G.A* اور دیگر مستند طباعتوں سے دیے گئے ہیں؛ (۲) J. Marquart : *Eranšahr*، *Abh. G. W. Gott. N. F.*، ج ۳، شمارہ ۲، ص ۱۸؛ (۳) P. Schwartz : *Iran in Mittelalter*، لائپزگ ۱۹۲۱ء، ۴ : ۴۲۵؛ (۴) C. Ritter : *Erdkunde*، برلن ۱۸۴۰ء، ۹ : ۳۶۹ ببعد؛ (۵) K. Prellberg : *Persien, eine historische Landschaft*، لائپزگ ۱۸۹۱ء، ص ۶۶؛ (۶) Le Strange : *The Lands of the Eastern Califate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۸۶، ببعد؛ (۷) قدیم یورپی سیاحوں (Ker Porter, Kinneir, Rawlinson, Beanchamps) کے بیانات سے Ritter نے

استفادہ کیا ہے ؛ نیز دیکھیے : (۸) S. de Sacy : *Mémoire sur les monuments et les inscriptions de Kirmanschah* در *Memoire sur diverses antiquites de la Perse* ، پیرس ۱۷۹۳ء؛ (۹) G. Curzon : *Persia* ، لنڈن ۱۸۹۲ء، ۱ : ۵۵۷ ببعد؛ (۱۰) A. V. Williams Jackson : *Persia, Past and Present* ، نیویارک ۱۹۰۶ء، ص ۲۳۰ ببعد؛ (۱۱) H. L. Rabino : *Kermanschah* ، در *R.M.M.* ، ۱۹۲۰ء؛ ۳۸ : ۱ تا ۴۰؛ (۱۲) M. Sykes : *Historia of Persia* ، بار دوم، لنڈن ۱۹۲۱ء؛ (۱۳) R. Stuart Pool : *B. M. Cat. Coins of Shahs of Persia* ، لنڈن ۱۸۸۹ء، بذیل مادہ .

(J. H. KRAMERS)

* کرمانی : کمال الدّین ابو العطا محمود بن علی ، رک بہ خواجو کرمانی .

* کِرمِسِین : رک بہ کرمان شاہ .

* کُرَمَۃ : بقول راڈلوف (*Versuch eines Wörterbuches der Türk-Dialecte* ، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۹ء، ۲ : ۹۲۴) ایک ترک قبیلہ جو ترکستان میں آباد ہے ۔ راڈلوف ہی کے نزدیک قیرغزی (یعنی قازق) لفظ قرمہ (قرۃ : کپڑوں کے ٹکڑوں کو سی کر جوڑ لینا) کے معنی ہیں "کمبل جو کپڑے کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنایا جائے"۔ ایک دوسرے مقام پر (*Aus Sibirien* ، بار دوم، لائپزگ ۱۸۹۳ء، ۱ : ۲۲۵) ہی لکھتا ہے کہ کرمہ ازبک اور قیرغز کے مخلوط لوگ ہیں اور ان کا یہ نام جیسا کہ قیرغز دعوی کرتے ہیں، اس لیے ہوا کہ ان کی تشکیل میں متعدد قبائل کے پیوند لگے ہیں (قرۃ ایک دوسرے کو پیوند لگانا) ۔ راڈلوف کا بیان ہے کرمۃ ایک مقیم قبیلہ ہے جو تاشکنت اور خجند کے درمیان یا زیادہ صحیح معنوں میں دریاے انگرن (آهنگران کی بگڑی ہوئی شکل) کے کنارے تاشکنت کے جنوب میں آباد ہے ۔ روسی مآخذ میں اس کا ذکر سب سے پہلے ۱۸۷۵ء میں ملتا ہے کہ کرمۃ اول اول اٹھارھویں صدی عیسوی میں نمودار ہوے ۔ یہی نظریہ Aristow (*Zametki ob etniceskom sostavi tyurkskikh plemen* ، سینٹ پیٹرزبرگ وغیرہ ۱۸۹۷ء، ص ۱۱۲) اور حال ہی میں I. Zarubin : *Spisok narodnostei Turkestanskogo Kraya* ، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۲۵ء، ص ۱۲) نے پیش کیا ہے، لیکن ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵-۱۶۳۶ء ہی میں ہمیں انگرن کے کنارے قازقوں اور ازبکوں کی جنگوں کے حال میں سرداران قورمہ کا ذکر ملتا ہے (محمود بن ولی : بحر الاسرار، کتاب خانۂ انڈیا آفس، عدد ۵۷۵، ورق ۹ ۱ ۱ ل) ۔ انیسویں صدی عیسوی میں خوانین خوقند کے عہد حکومت میں لفظ کرمۃ ایک نسلی ہی نہیں جغرافیائی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا رہا اور یہ ایک انتظامی قسمت کا نام بھی تھا ۔ خوقند سے جو سڑک درہ کندردوں سے گزرتی ہوئی تاشکنت کو گئی ہے شاہراہ قورمہ ہی کے نام سے مشہور تھی (مثلا تاریخ شاہ رخی، طبع Pantusow، قازان ۱۸۸۵ء، ص ۲۳۸) ۔ کرمۃ کا حکمران ایک بیگ تھا اور اس کا قیام قلعۂ کووچی (تحریری زبان میں کیراوچی؛ روسی نقشوں میں کاپوچی بھی) میں رہتا ۔ لفظ کرمہ روسی حکومت کے ماتحت بھی کچھ عرصے تک مستعمل رہا ۔ سیر دریا (سیحون) کے علاقے (ابلاست oblast) کی تقسیم جب اضلاع (uiezd) میں ہوئی تو جس حصے کو بعد (یعنی ۱۸۸۶ء کے بعد) "ضلع تاشکنت" کہا گیا، اسے پہلے ضلع کرمۃ (Kuraminskiy uiezd) ہی کہا جاتا تھا ۔ توی تبہ (Toi-Tübe) ایک چھوٹا سا قصبہ، جس کی بنیاد مدلی خان کے عہد حکومت (۱۸۲۲ تا ۱۸۴۲ء) میں رکھی گئی (یہاں ازمنۂ وسطی کے ایک قلعے کے کھنڈر بھی موجود

هیں، جن کا ۱۸۸۵ء میں پروفیسر Veselovskiy نے مشاهده کیا، اس ضلع کی حکومت کا صدر مقام تها، لیکن حاکم ضلع (U'ezdniy nacal'nik) اصل میں چرچک کے کنارے کوئی لوک میں رهتا ۔ خوقند کے عہد حکومت کی طرح روسی دور میں بهی ضلع کرمة کو بسبب اس کے کہ چاول کی پیداوار کا مرکز تها، سیاسی اعتبار سے اچهی خاصی اهمیت حاصل تهی۔ روسی ماهرین نسلیات نے کرمة کو ایک جدا گانه قبیله قرار دیا هے جو ان کے نزدیک خانه بدوشوں (قیرغز، یعنی قازقوں) کی نسل سے تهے جنهوں نے بعد میں زراعت کا پیشه اختیار کر لیا [سرت رک بآں]؛ لیکن سرتوں کا طرز زندگی اختیار کرنے کے باوجود کرمة ان خصائص سے سرتا سر محروم نہیں جو انهوں نے اپنے خانه بدوش اجداد سے ورثے میں پائے تهے .

اس بات کا ان کے یہاں آج بهی مشاهده کیا جا سکتا هے کہ سرتوں کے برعکس کرمه قازقوں کی طرح یرتوں (Yurts) میں رهتے هیں ۔ قازقوں کی طرح ان کی بیویاں بهی نقاب استعمال نہیں کرتیں، لیکن روسی حکومت کے آغاز میں ان کی جو حالت تهی بمقابله اس کے کرمه کئی ایک باتوں میں اپنے اجداد سے آگے بڑھ چکے هیں ۔ اس زمانے میں راڈلوف اور دوسرے محققین دیکھ چکے تهے کہ ان کے یہاں کنبوں کی تقسیم موجود هے ۔ بقول راڈلوف ان کنبوں کی تعداد پانچ تهی : جلائر (Djulair)، تلاؤ (Teläu) (حتّٰی کہ اس نام کا ایک گاؤں آج بهی موجود هے اور جس میں کرمة آباد هیں) تمه، جگیلی اور ترکلی مگر اب یه تقسیم بالکل ناپید هو چکی اور اگر کہیں موجود بهی هے تو وهاں بهی ایک هی کنبے کے افراد کے درمیان شادیاں ناجائز نہیں رهیں، جس کا قازقوں کے هاں دستور هے ۔ پهر اس امر کا ثبوت کہ کرمة مخلوط النسل قوم هے، آج بهی ملتا هے ۔ علاوه مختلف نسلوں کے اختلاط کے ان میں بقول Zarubin (کتاب مذکور) مختلف معاشرتی طریقوں کا اختلاط بهی موجود هے۔ کرمه خود بهی اپنے آپ کو کرمه نہیں کہتے ۔ اگر کہتے هیں تو ایک اور نسلی گروه کے نام کا اضافه کر لیتے هیں (مثلاً قیرغز کرمة، سرت کرمة) ۔ ضلع تاشکنت (سابق کرمة) میں ان کی تعداد ۱۹۱۷ء میں ۵۲۳۳۵ اور ۱۹۲۰ء میں ۹۶۹۷۴ تهی لیکن پچهلے چند سالوں سے سارے ترکستان کی آبادی قحط عظیم کے باعث گهٹتی جا رهی هے)۔ ضلع خجند میں بهی ۹۳۳۰ کرمة آباد هیں حتّٰی کہ "مخلوط قوم" کے معنوں میں لفظ کرمه اس علاقے میں بهی سنا جاتا هے جہاں ترکمانی زبانیں بولی جاتی هیں، لیکن ان کرموں کا انگرن کے کرموں سے کوئی تعلق نہیں .

مآخذ : مذکورۂ بالا تصانیف کے علاوه (۱) Kosienko : *Turkestanskiy Krai*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۰ء؛ (۲) Masalskiy : *Turkestanskiy Krai*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۳ء، ص ۳۰۶ و ۶۰۷؛ (۳) Fr. Schwarz : *Turkestan*، Freiburg، ج ۱، Br. ۱۹۰۰ء، بمدد اشاریه، بالخصوص، ص ۱۰ ببعد؛ (۴) N. Mallickiy در *Protokoli Turk. Kruzka Lyub. Arkh*، ۱۸۹۸ء، ۳ : ۱۷۶ ببعد .

(سید نذیر نیازی)

* **کِرمِیان** : رک به گِرمِیان .

* **کَرْناٹک** : (کَرْناٹَک)، هندوستانی جغرافیے میں کئی مفهوم رکهنے والی اصطلاح، ملک کے طور پر وه علاقه جہاں کینری زبان بولی جاتی هے۔ معلوم هوتا هے کہ یه لفظ اصل میں وجیانگر کی هندو سلطنت کے لیے بولا جاتا تها ۔ ۱۵۶۵ء میں جب مسلمانوں نے اسے فتح کر لیا تو انهوں نے جنوبی هند کے بعض اضلاع کا نام بهی کرناٹک

رکھ دیا، یہاں تک کہ انگریزوں نے اس نام کو اس نواب کے لیے بھی استعمال کیا ہے جو ارکاٹ پر حکومت کرتا تھا جہاں کی زبان تامل ہے کینری نہیں ہے ۔

[بھارتی صوبوں کی تنظیم جدید کے بعد صوبۂ کرناٹک سابق ریاست میسور اور حیدرآباد دکن اور صوبۂ مدراس کے بعض اضلاع پر مشتمل ہے ۔ اس کی آبادی تین کروڑ افراد پر مشتمل ہے ۔ مسلمان آبادی کا آٹھ فیصد ہیں ۔ صوبے کا دارالحکومت بنگلور ہے؛ جہاں جہاز سازی اور بجلی کا سامان بنانے کے کارخانے ہیں] .

(J. S. COTTON [و ادارہ])

⊗ **کَرْنال** : ہندوستان کے علاقۂ پنجاب کا ایک شہر اور ضلع، شہر کا رقبہ ۲۶ مربع میل ہے اور ضلع کا ۳۱۵۳ مربع میل ۔ دریاے جمنا ضلع کی مشرقی حد بناتا ہے ۔ جنوب میں ضلع دہلی ہے اور شمال میں ضلع انبالہ ۔ مغرب میں پٹیالہ اور سکھوں کی سابقہ ریاستیں جیند اور نابھہ ہیں ۔ سرسوتی دریا جو ہندووں کے نزدیک مقدس ہے کرنال شہر سے بیس میل شمال میں بہتا ہے ۔ کورو کشیتر کا میدان جہاں کورووں اور پانڈووں کے درمیان جنگ مہابھارت لڑی گئی تھی، ضلع کے شمال میں ہے ۔ اس جنگ سے متعلق یہاں کئی قدیم آثار موجود ہیں ۔ ۱۹۵۱ء میں آبادی ۱۰۹۳۷۹ تھی ۔ باشندے مغربی ہندی کی مقامی بولی استعمال کرتے ہیں ۔ رانگھڑ اور چوہان راجپوتوں کے علاوہ جاٹ بھی بستے ہیں ۔ تاریخی اور نسلی اعتبار سے یہ پنجاب کی نسبت ہندوستان کا حصہ ہے ۔ لوگوں کا پیشہ عام طور پر زراعت ہے ۔ چنا، باجرا، چاول، کپاس اور گیہوں کی کاشت ہوتی ہے ۔ پانی پت، کیتھل اور شاہ آباد ضلع کے دیگر مشہور شہر اور قصبے ہیں ۔

کرنال شہر راجا کرن نے آباد کیا تھا جو جنگ مہابھارت میں کورووں کا جرنیل تھا ۔ اسی سے اس کا نام مأخوذ ہے (کرنالیہ = کرن کی سکونت کی جگہ) ۔ پرانے زمانے میں یہ اتنا مشہور نہیں تھا ۔ ۶۳۵ء میں ہیون سانگ نے قنوج کے مقام پر بدھ راجا ھرش سے ملاقات کی، لیکن وہ کرنال کا ذکر نہیں کرتا ۔ محمود غزنوی اور محمّد غوری کی فتوحات میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا ۔ ۱۰۱۱ء میں محمود غزنوی نے تھانیسر پر حملہ کیا جو کرنال سے صرف بیس میل کے فاصلے پر ہے ۔ ۱۰۱۷ء میں وہ متھرا بھی گیا ۔ ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں محمّد غوری نے پرتھوی راج کو تراوڑی کے مقام پر شکست دی جو کرنال سے آگے جنوب میں واقع ہے ۔ کرنال نے تغلق خاندان (۱۳۲۰ تا ۱۴۱۳ء) کے عہد حکومت میں تاریخی لحاظ سے شہرت اختیار کی ۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء میں پانی پت کے مشہور بزرگ بو علی قلندر فوت ہوے ۔ علاء الدّین غوری کے بیٹوں خضر خان اور شادی خان نے پانی پت میں ان کا مقبرہ بنوایا، لیکن غیاث الدّین تغلق نے کرنال میں بھی ان کا مقبرہ تعمیر کرایا ۔ لوگ کہتے تھے قلندرؒ صاحب یہاں دفن ہیں ۔ ۱۳۵۵ء میں فیروز شاہ تغلق نے جمنا کے مغربی کنارے سے نہر نکالی جو کرنال سے ۴ میل نیچے گزرتی تھی ۔ اس سے علاقے کی پیداوار اور خوشحالی میں اضافہ ہوا ۔ ۱۳۹۸ء میں جب امیر تیمور آیا تو وہ کرنال سے تو نہیں گزرا، لیکن پانی پت گیا جو دس کوس کے فاصلے پر ہے اور وہاں جا کر گندم کے ایک بھاری ذخیرے پر قبضہ کر لیا ۔ ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کو جب پانی پت کے میدان میں بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دی تو وہ کرنال ہی سے ادھر گیا تھا ۔ ۱۵۵۵ء میں جلال الدین اکبر نے ہیمو بقال کے خلاف اپنی افواج کرنال سے دس میل شمال میں جمع کیں اور جب

اکبر ۹۸۰ھ/۱۵۷۳ء میں گجرات میں مصروف تھا کہ ابراہیم حسین مرزا نے فائدہ اٹھا کر کرنال، پانی پت اور سونی پت میں لوٹ مار کی ۔ آئین اکبری میں کرنال کا ذکر ایک پرگنے کی حیثیت سے کیا گیا ہے، جہاں ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۵ء میں جہانگیر اپنے باغی بیٹے خسرو کا تعاقب کرتے ہوے کرنال میں ٹھیرا تھا۔ کرنال میں فیروز شاہ تغلق کی بنائی ہوئی نہر کی مرمت اکبر کے زمانے میں شہاب الدّین احمد خان، صوبیدار دہلی، نے کرائی تھی، لیکن شاہ جہان کے عہد میں علی مردان خان لال قلعے میں پانی پہنچانے کے لیے اسے دہلی تک لے گیا ۔ مغلیہ دور میں کرنال میں ایک سرائے بھی تعمیر ہوئی تھی، جس کا اب کوئی نشان باقی نہیں ۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد بندہ بیراگی دریاے جمنا کے مغربی علاقے پر قابض ہوا تو اس نے کرنال کے فوجدار کو ہلاک کر کے وہاں قتل عام کیا اور شہر کو لوٹا ۔ اس شہر کی تاریخ کا سب سے مشہور واقعہ ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے مقابلے میں محمّد شاہ کی شکست ہے ۔ تین ماہ تک کرنال کے جنگوں میں محمّد شاہ پڑاؤ ڈالے رہا ۔ لڑائی شہر کی دیواروں کے عین باہر ہوئی ۔ احمد شاہ ابدالی یہاں تو نہیں آیا، لیکن ۱۷۶۱ء میں ضلع کرنال کے مشہور شہر پانی پت میں اس نے مرہٹوں کو زبردست شکست دی تھی ۔ مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کی وجہ سے سلطنت دہلی میں جو انتشار رونما ہوا، اس سے سکھوں نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ دہلی سے قریب ہونے کی بنا پر کرنال کی تاریخ شروع ہی سے دہلی کے حالات سے متاثر ہوتی رہی ہے ۔ ۱۷۶۳ء میں جیند کا راجا گنج پت سنگھ اس علاقے کو اپنے تسلط میں لایا، لیکن ۱۷۷۵ء میں نجف خان نے اسے دوبارہ فتح کر لیا ۔ اس کے بعد اقتدار کے لیے مرہٹوں اور سکھوں کی آپس میں لڑائیاں جاری رہیں ۔ انجام کار ۱۸۰۵ء میں جب انگریزوں کا قبضہ ہوا تو پھر کہیں امن و امان قائم ہوا؛ لیکن اس سیاسی افراتفری میں کرنال پرگنے کے ۲۲۱ دیہات میں سے ۱۷۸ ویران ہوچکے تھے ۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی لڑی گئی تو کرنال کے نواب احمد علی خان نے انگریزوں کی مدد کی ۔

حکومت انگلشیہ نے کرنال کو ضلع کا صدر مقام بنایا ۔ فوجی چھاؤنی قائم ہوئی، جو بعد میں شہر کی مضر صحت آب و ہوا کی وجہ سے انبالے منتقل کر دی گئی ۔ سابقہ نہر نادر شاہ کے حملے کے وقت درست حالت میں تھی اور ہر طرف پانی بھرپور مقدار میں مہیا کرتی تھی، لیکن طوائف الملوکی کے ایام میں ٹوٹ پھوٹ گئی اور ادھر ادھر دلدلیں بن گئیں، جن سے وبائیں پھوٹتی تھیں ۔ انگریزوں نے نئی نہر جمن غربی بنوائی اور دلدلوں کو پر کرایا ۔ شہر میں میونسپلٹی، سکول، ہسپتال، ڈاک خانہ وغیرہ تعمیر کرائے اور سڑکیں پختہ کرائیں ۔ دہلی کالکا ریلوے لائن کی تعمیر سے شہر کی تجارت بڑھ گئی اور کرنال ایک اہم تجارتی مرکز بن گیا ۔ پرانے شہر کے اردگرد فصیل ہے، جس کے ساتھ ساتھ پختہ سڑک ہے؛ دس دروازے ہیں ۔ جہاں پہلے چھاؤنی تھی وہاں مضافاتی بستی آباد ہوئی، جو صدر بازار کہلاتی ہے ۔ شمال کی طرف ایک میل کے فاصلے پر سول لائن اور سرکاری دفاتر ہیں ۔ ۱۹۴۷ء کے بعد شہر کی آبادی بڑھ گئی ہے، مضافاتی آبادیوں میں اضافہ ہوا ہے اور کاروبار اور صنعت و حرفت نے فروغ پایا ہے ۔ قلندرؒ صاحب کا مقبرہ شہر کی تاریخی عمارات میں شمار ہوتا ہے ۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اس میں مسجد اور تالاب کی تعمیر کرائی تھی ۔ ہندو لوگ راجا کرن کی وجہ سے کرنال کے تالاب کو مقدس خیال کرتے ہیں ۔ کرنال کا قلعہ بھی مشہور ہے ۔ امیر دوست محمّد خان، والی کابل نے کلکتے

جاتے ہوئے یہاں چھے ماہ قیام کیا تھا ۔ چھاؤنی والی جگہ پر انگریزوں کا بنایا ہوا گرجا گھر شکستہ حالت میں اب بھی موجود ہے ۔

مآخذ : (۱) ابوالفضل : آئین اکبری ، کلکتہ ۱۸۶۹ء، ۲ : ۳۸ ؛ (۲) جہانگیر : تـوزک جہانگیری ، مطبوعۂ لکھنؤ، ۱ : ۲۸ ، ۲۹؛ (۳) شمس سراج عفیف : تاریخ فیروز شاہی ، کلکتہ ۱۸۹۰ء، ص ۳۲۹ تا ۳۳۳؛ (۴) *Karnal District Gazetteer*، لاہور ۱۸۹۲ء؛ (۵) ارد، لائیڈن، بار اوّل، بذیل مادۂ کرنال؛ (۶) کننگھم : *Ancient Geography of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء .

(عبدالغنی)

* **کرنک :** رک بہ الاقصر .

⊗ **کرنکو :** فرِٹز کرنکو Fritz Krenkow؛ جرمن نسل کا ایک معروف مستشرق، جس نے اپنی عمر کا اکثر حصہ انگلستان میں گزارا ۔ وہ زیادہ تر عربی شعر اور لغت کے ساتھ شغف رکھتا تھا اور ان مضامین پر بہت سی کتابیں ایڈٹ کرنے میں حیدر آباد دکن کے دائرۃ المعارف العثمانیہ کے ساتھ شریک رہا .

کرنکو ۱۸۷۲ء میں شمالی جرمنی کے شہر شونبرگ Schoenberg میں پیدا ہوا ۔ اس کی عمر ابھی چھے برس کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ بعد ازاں اس کی والدہ نے اس کی تربیت کی ۔ تعلیم کے دوران میں اس نے یونانی اور لاطینی کے علاوہ فرانسیسی اور انگریزی زبانیں بھی سیکھیں .

اپنی علمی زندگی کے دوران میں کرنکو نے جرمنی اور انگلستان کے علمی رسالوں میں متعدد مقالات لکھے ۔ ۱۹۰۸ء میں اس نے جرمن اوریئنٹل سوسائٹی کے مجلے میں کعب بن زہیر کے قصیدۂ "بانت سعاد" کو ایک مفصل مقدمے کے ساتھ شائع کیا ۔ اسی طرح اس نے حماسہ ابن شجری اور ابو دھبل جمحی کے اشعار کے علاوہ ابوبکر زبیدی کی کتاب النحویین کو مقدمے اور شرح کے ساتھ شائع کیا ۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ کی مدد سے اس نے ۱۳۴۲ھ میں ابن درید کی کتاب المجتنٰی شائع کی ۔ ابن درید کی الجمہرہ، جو حیدر آباد دکن میں تین جلدوں میں چھپی تھی، اس نے اس کی تہذیب بھی کی ۔ شیرازی نے ابن الہیثم کی جو شرح لکھی تھی، اس کی بھی اس نے تہذیب کی ۔ کرنکو نے دیوان طفیل بن کعب الغنوی اور دیوان طرمّاح بن حکیم بھی شائع کیا اور ان کے مقدمے اور ترجمے کے علاوہ ان کی شرح بھی لکھی ۔ ابن العمیثل الاعرابی کی کتاب المأثور کو ایک نہایت قدیم نسخے کی بنا پر جس کا سنۂ کتابت ۲۸۰ھ ہے، ۱۹۲۵ء میں بیروت سے ایک جرمن مقدمے اور فہارس کے ساتھ شائع کیا .

اس نے دیوان مزاحم العقیلی انگریزی ترجمے کے ساتھ لائیڈن سے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا ۔ اس کے علاوہ دیوان نعمان بن بشیر انصاری بھی اس کے علمی آثار میں سے ہے .

کرنکو نے ابن عساکر کی تاریخ دمشق پر ایک مفصل مقالہ لکھا اور اس مقالے میں اس تاریخ کے جو نسخے لنڈن وغیرہ مقامات میں موجود تھے، ان کی طرف رجوع کیا ۔ یہ مقالہ دمشق کے المجمع العلمی کے مجلہ میں شائع ہوا ۔ وہ اس المجمع العلمی کا رکن بھی تھا ۔ اس نے پروفیسر بیون Bevan کے ساتھ مل کر ابو علی القالی کی کتاب الامالی کے اشعار کی فہرست بھی مرتب کی، جو ۱۹۱۳ء میں لنڈن میں طبع ہوئی .

کرنکو طویل عرصے تک حیدرآباد دکن کے دائرۃ المعارف العثمانیہ کے لیے یورپ میں عربی کی نادر کتابیں تلاش کرتا رہا اور بعض کتابوں کی اشاعت اور بعض کی تہذیب کے لیے اس ادارے

کے ساتھ تعاون کرتا رہا ۔ ایک سال تک وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں صدر شعبۂ عربی کے عہدے پر فائز رہا ۔ ۱۹۵۳ء میں اس نے کیمبرج میں وفات پائی ۔

مآخذ : (۱) ابوالقاسم سحاب: فرہنگ خاور شناسان، مطبوعۂ ایران، ص ۱۹۸ تا ۲۰۲؛ (۲) نجیب العقیقی : المستشرقون، بارسوم، قاہرہ ۱۹۶۵ء، ۲: ۵۳۰ تا ۵۳۲؛ (۳) Otto Spies : *Obituary notice*، در *Der Islam*، ۱۹۵۳ء۔

(شیخ عنایت اللہ)

* **کروجا** : رک بہ کرویو، در آآ لائیڈن، بار دوم ۔

* **کُروسیڈز** : (Crusades)، رک بہ صلیبی جنگیں ۔

* **کرویا** : (قرویہ : Kruje، Kroya)، البانیہ کا ایک قصبہ اور قلعہ جو کسی زمانے میں سکندر بیگ [رک باں] کا صدر مقام تھا ۔ کرویا (ترکی : آق حصار) کو بعض اوقات آقچہ حصار اور آق سرای بھی کہا جاتا ہے ، اس شہر کی تاریخ بڑی پر آشوب ہے ۔ خیال ہے کہ یہ شہر اس جگہ آباد ہوا جہاں کبھی یوری بوی Euriboea کا قدیم شہر واقع تھا ۔ قرون وسطی میں اس کی تاریخ کیا رہی، یہ ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے ۔ اسے نیپلز کے امیر کارلو تھوپیا Carlo Thopia نے بسایا تھا، جس کے آبا و اجداد پندرھویں صدی کے تقریباً وسط میں ترانیہ Tirana اور درزو Durazzo کے درمیان واقع علاقے کے مالک تھے ۔ یہاں کے قدیم دفاعی استحکامات کے بچے کھچے حصوں سے ان کے اطالوی الاصل ہونے کا پتا چلتا ہے ۔ کرویا کو صرف اس وقت شہرت ہوئی جب البانوی محب وطن جارج کسٹریوٹا G. Kastriota نے، جسے سکندر بیگ (م ۱۷ جنوری ۱۴۶۸ء) بھی کہا جاتا ہے، ترکوں کی قید سے فرار ہو کر پھر عیسائی مذہب قبول کر لیا اور دوبارہ کرویا کو اپنا صدر مقام بنایا ۔ یہیں سے سکندر بیگ نے ۱۴۴۳ء میں البانیہ کی جنگ آزادی کا اعلان کیا اور اسے کئی سال تک بڑی دانائی اور کامیابی سے جاری رکھا ۔ ۱۴۵۰ء میں سلطان مراد دوم نے کرویا کا محاصرہ کیا تو سکندر بیگ نے سلطان کو محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور کر دیا ۔ وہ محمّد ثانی کے مقابلے پر بھی ڈٹا رہا، لیکن اس کی موت کے بعد ترکوں نے کرویا کے گرد و نواح کا علاقہ بے دردی سے تاخت و تاراج کرتے ہوے ۱۴-۱۵ جولائی ۱۴۷۸ء کو پھر اس پر دھاوا بول دیا ۔ آگے چل کر یہ شہر پورے طور پر اسلامی رنگ میں رنگا گیا اور آج کل ایک ضلع کا صدر مقام ہے ۔ یہاں زیادہ تر مردیہ (Mirdites) فرقے کے لوگ آباد ہیں ۔ آبادی مشکل ہی سے ۱۰ ہزار سے اوپر ہوگی ۔ کرویا بکتاشیوں کے مرکز کی حیثیت سے بھی قابل ذکر ہے، جن کی ایک خانقاہ یہاں موجود ہے ۔ یہاں صاری صلتیق دده ولی کی ایک قبر بھی ہے ۔ دراصل کرویا کے ارد گرد بکتاشی ولیوں کی متعدد قبریں موجود ہیں، گو ان کی اصل کے بارے میں ابھی تک کوئی تحقیق نہیں ہو سکی ۔ حاجی حمزه بابا اور بابا علی کے مقبروں کی لوگ بڑی تعظیم کرتے ہیں (مؤخرالذّکر مقبرے کے ساتھ ایک تکیہ بھی ہے) ۔ مقبروں کی تعداد ۳۶۶ بتائی جاتی ہے، لیکن یہ بلا شبہہ محض ایک اندازہ ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ بکتاشی طریقے کو سب سے پہلے اٹھارھویں صدی کے آخر میں ایک شخص شیخ میمی نے رواج دیا تھا، مگر اسے یانینا Janina کے علی پاشا نے کچل ڈالا؛ تاہم یہ بیان بھی قابل اعتبار نہیں (Ippen : *Skutari*، ص ۷۱ بعد) ۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ اہل کرویا کی بہت بڑی اکثریت

بکتاشی طریقے کی پیرو ہے ۔

مآخذ : (۱) ہم عصر وقائع نگار Benedetto نے عثمالیوں کے ھاتھوں کرویا کی فتح کے بارے میں طرح طرح کی تفصیل بیان کی ہے (اقتباس، در *Della decima e della altre gravezze, della moneta, e della mercatura de' Fiorentini fino al secolo*، ج ۲ : لزبن و لکہ Lucca ۱۷۶۵ء، ص ۲۰۷ ببعد)، لہٰذا ان پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے؛ (۲) Ippen : *Skutari*، ص ۱۷ ببعد : (۳) *Wissenschaftliche Mitteilungen aus Bosnien*، ۷ : ۶۰؛ (۴) A Degrand : *Souvenirs de la Haute-Albanie*، پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۲۱۵ ببعد (مع تصاویر)؛ (۵) F. W. Hasluck : *Geographical distribution of the Bektashi*، در *Annual of the British School at Athens*، ۱۹۱۵ء، ۲۱ : ۱۲۱ ببعد ۔

(FRANZ BABINGER)

* **کُرَبیۃ** : کیسانیہ [رک بآں] کے ایک فرقے کا نام، جس کا یہ املا غالباً الاشعری کی تصنیف مقالات الاسلامیین (باعتبار مخطوطۂ [آیا صوفیا]، اعراب کے بغیر) میں اختیار کیا گیا اور جو حضرت شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ کے ھاں بھی موجود ہے ۔ صاحبِ مفاتیح العلوم کے علاوہ عبدالقاھر البغدادی، ابو المعالی اور المقریزی نے اسے کربیۃ لکھا ہے ۔ اوّل، الذکر املا کی تائید اس کی ایک اور شکل الکَرَنْبِیہ سے بھی ھوتی ہے، جو مطہر بن طاھر المقدسی نے اختیار کی اور جس کی وجہ ممکن ہے متن کی خرابی ھو ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ فرقہ ایک شخص ابو کُرَیب (الاشعری میں بلا اعراب؛ عبدالقادر الجیلانی، مطبوعہ متن، نیز مخطوطۂ لائیڈن، شمارہ Or. ۳۲۵، ورق ۹۶ الف : ابن کُرَیب؛ الخوارزمی، البغدادی، ابوالمعالی اور المقریزی : ابو کُرَیب؛ مطہر بن طاھر المقدسی : ابن کرنب) الضَریر سے منسوب ہے ۔ غالبًا یہی وہ شخص تھا جس نے اس نظریے کی جو کربیۃ کا امتیازی عقیدہ ہے اشاعت کی کہ ابن الحنفیہ [رک بآں] مسیح کی طرح پھر ظہور کریں گے؛ لہٰذا اس کا زمانۂ حیات ابن الحنفیۃ کے انتقال (غالباً ۸۱ھ/ ۷۰۰ء) سے مؤخر ھی قرار دیا جا سکتا ہے ۔

الاشعری کے بیان کی رو سے کُربیۃ کا عقیدہ تھا کہ ان کے امام محمّد بن الحنفیۃ ابھی زندہ ھیں؛ وہ مدینۂ منورہ کے مغرب میں رضوٰی کے پہاڑوں میں رھتے ھیں، جہاں دائیں جانب ایک شیر اور بائیں جانب ایک چیتا ان کی حفاظت کرتا ہے اور صبح و شام ان کے لیے کھانا آ جاتا ہے؛ چنانچہ اپنے خروج کے وقت تک وہ وھیں رھیں گے ۔ کربیہ کے نزدیک امام کو اس طرح چھپا رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے ان کے لیے ایک خاص کام تجویز کر رکھا ہے ۔ البغدادی نے بھی ان کے قیام رضوٰی کا حال انھیں الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ بقول اس کے امام کے قریب ھی ایک چشمہ پانی کا اور ایک شہد کا موجود ہے اور یہی چشمے ھیں جن سے وہ ھر روز اپنی خوراک حاصل کرتے ھیں ۔ الشہرستانی اور المنصور باللہ عبداللہ بن حمزۃ (العقد الثمین، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد Or. ۳۹۷۶، ورق ۸ ب) نے بھی اگرچہ اس بات کا ذکر کیا ہے، لیکن اس سلسلے میں خاص طور سے کربیۃ کا حوالہ نہیں دیا ۔ مؤخرالذّکر نے اس خیال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رضوٰی میں امام فرشتوں کے ساتھ گفتگو کرتے ھیں (جیسا کہ ابن حزم نے بھی لکھا ہے) اور یہ کہ "بزمانۂ غیبت" ان کی حیثیت اللہ کی آنکھ کی ہے، جو اس کی مخلوقات کو دیکھ رھی ہے ۔

ان میں سے کئی ایک باتوں کا سلسلہ ظہور مسیح کے قدیم عقیدے سے جا ملتا ہے اور تقریبًا سب کی سب کُثَیّر [رک بآں] اور السیّد الحِمْیَری (دیکھیے الاغانی، بار دوم، ۷ : ۴ س ۱۱ ببعد و ۸ : ۳۰

س ۲ ۵ بعد) کے اشعار میں ملتے ہیں؛ چنانچہ ملاحدہ کے مختلف فرقوں پر جس کسی نے قلم اٹھایا اس نے اپنی معلومات انھیں سے حاصل کیں.

الاشعری نے، جس کے نزدیک کثیّر نظریات کریبیة کا پرجوش علمبردار ہے، اس کے وہی اشعار پیش کیے ہیں جو البغدادی (ص ۲۸ بعد) اور الشہرستانی نے دیے ہیں (نیز دیکھیے الآغانی، بار دوم، ۸ : ۳۱ س ۸ بعد).

مآخذ : (۱) ابوالحسن الاشعری: مقالات الاسلامیین، مخطوطۂ آیا صوفیا، عدد ۲۳۶۶، در باب رافضة، ص ۹ بعد [مطبوعه استانبول و قاهره]؛ (۲) المقدسی : کتاب البدء و التاریخ، ج ۵، در *PELOV*، ج ۳، پیرس ۱۹۱۶ء، سلسلۂ ۲۲، متن: ص ۱۲۳ س ۳ بعد، ۱۲۸ س ۳ بعد و ترجمه: ص ۱۳۰ س ۲، ۱۳۴؛ (۳) محمّد بن احمد الخوارزمی : مفاتیح العلوم، طبع van Vloten، لائیڈن ۱۸۹۵ء، ص ۳۰؛ (۴) عبد القاهر البغدادی : الفرق بین الفرق، طبع محمّد بدر، قاهره ۱۳۲۸ھ، ص ۲۷، س ۱۵ بعد؛ (۵) عبدالرزاق بن رزق الله الرسعنی : مختصر کتاب الفرق بین الفرق، طبع F. Hitti، قاهره ۱۹۲۴ء، ص ۳۶؛ (۶) ابن حزم : الفصل فی الملل والاهواء و النحل، قاهره ۱۳۱۷ - ۱۳۲۱ھ، ۴ : ۱۷۹ س ۲۱ تا ۲۳؛ (۷) ابو المعالی محمّد بن عبیدالله : بیان الادیان، در Schefer : *Christomathie Persane*، ج ۱ (*PELOV*، ج ۲، سلسلۂ ۷، پیرس ۱۸۸۳ء) : ص ۱۵۲ س ۱۵، ۱۵۸ س ۱؛ نیز دیکھیے ڈینش ترجمه : *Fremstilling af Abū'l-Maʿālī* از Arthur Christensen، در *Studier fra Sprog-og Oldtidsforskning*، *Religionerne*، شماره ۱۰۱، کوپن ہیگن ۱۹۱۶ء، ص ۳۱، ۴۰)؛ (۸) الشہرستانی : الملل والنحل، طبع Cureton، ص ۱۱۱ س ۱۱ بعد؛ (۹) عبدالقادر الجیلانی : الغنیة لطالبی طریق الحق، قاهره ۱۳۲۲ھ، ۱ : ۱۰۰ ذیل؛ (۱۰) المقریزی : الخطط، بولاق ۱۲۷۰ھ، ۲ : ۳۵۲ س ۱ بعد؛ (۱۱) Wellhausen : *Die religiös-Politischen Oppositionsparteien im alten Islam* (*Abh. G.W. Gott*، Phil.-hist. Kl., N.F.، ج ۵، شماره ۲، برلن ۱۹۰۱ء)، ص ۹۳ بعد؛ (۱۲) I. Friedlaender : *The Heterodoxies of the Shiites according to Ibn Ḥazm*، لیوهیون ۱۹۰۹ء، (از *JAOS*، ج ۲۸، ۲۹)، ۲ : ۳۵ بعد؛ (۱۳) Fr. Buhl : *Alidernes Stilling til de Shi'istike Bevaegelser under Umajjaderne* (*Oversigt over det Kgl. Danske Videns kabernes Selskabs forhandlinger* ۱۹۱۰ء، شماره ۵)، ص ۵۰ بعد؛ (۱۴) I. Goldziher : *Vorlesungen über den Islam*، بار دوم، هائیڈل برگ ۱۹۲۵ء، ص ۲۱۷؛ (۱۵) C. van Arendonk : *De Opkomst Van het Zaidietische Imamaat in Yemen*، لائیڈن ۱۹۱۹ء، ص ۲۱، حاشیه ۳.

(C. VAN ARENDONK)

* **کریٹ** : رک به اقریطش.

* **کریم** : یه اگر کسی انسان کی صفت ہو تو اس کے معنی ہیں فیاض، مہربان، کشاده دل، معزز، شریف، عالی نسب؛ اشیا ہوں تو بافراط، بکثرت، معزز، باشرف، شاندار، اعلٰی اور نفیس - کریم اللہ تعالٰی کی ۹۹ صفات یا اسماے حسنٰی میں سے ایک ہے (۷ [الاعراف] : ۱۸۰)، لیکن قرآن مجید کے چھبیس مواضع میں، جہاں یه لفظ استعمال ہوا، اللہ تعالٰی پر اس کا اطلاق صرف دو جگه ہوا ہے - مزید برآں یه نبی کریم صلّی اللہ علیه وآله وسلّم اور فرشتوں کے لیے اور زیاده تر کسی شے کی صفت کے بیان میں استعمال ہوا ہے، مثلاً اس اجر اور رزق کے لیے جو مومنوں کے لیے موجود ہے، نیز قرآن مجید کے لیے اور اس خط کے لیے جو ملکۂ سبا [رک بآن] بلقیس کو بھیجا گیا - علٰی هٰذا یه اہل ایمان کے جنت میں داخلے، پودوں، غلے کے کھیتوں، سکونت گاہوں اور والدین سے

انداز خطاب وغیرہ کے لیے بھی آیا ہے ۔ حدیث میں یہ اصطلاح اکثر حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے استعمال ہوئی، جہاں انھیں کریم ابن الکریم کہا گیا ہے (البخاری، کتاب المناقب، باب ۱۳ و کتاب التفسیر، ۱۲ [یوسف] : ۳۱) ۔ الکریمتان سے مراد آنکھیں ہیں (احمد بن حنبل : مسند، ۳ : ۲۸۳) .

مآخذ : لغات، بذیل مادّہ .

(T. W. Haig)

* **کریم خان زند** : (محمّد)، قبیلۂ لور کے ایک غیر معروف گھرانے کا فرد، جو اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں در حقیقت ایران کا بادشاہ تھا گو اس نے شاہ کا لقب اختیار نہیں کیا، اپنے آپ کو ہمیشہ وکیل (کار پرداز) ھی کہا اور اسی نام سے عام طور پر اس کی شہرت بھی ہوئی ۔ شروع میں وہ بختیاری سپہ سالار علی مردان خان کے نائبوں میں شامل تھا، جس نے نادر شاہ افشار کو قتل کیا تھا ۔ اس کے بعد طوائف الملوکی پھیل گئی تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوے اس نے اصفہان پر قبضہ کر لیا اور خاندان صفویہ کے آخری کمسن بادشاہ شاہ اسمٰعیل سوم کو، جس کی عمر صرف آٹھ سال تھی، تخت پر بٹھا دیا (۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء) ۔ علی مردان کے قتل اور والی آذربیجان، نیز محمّد حسین خان حاکم مازندران کی شکست کے بعد کریم خان زند کو سارے مغربی ایران پر قابض ہونے کا موقع مل گیا ۔ پھر جب شیراز میں فتح علی خان قاجار کے بیٹے محمّد حسن نے، جو انھیں دنوں اصفہان فتح کر چکا تھا، اس پر حملہ کیا تو اس نے دشمن کی فوجیں تتر بتر کر دیں ۔ اس سے ایک سال بعد یہ قاجاری شہزادہ کریم خان کے نائبوں کے خلاف جنگ کرتا ہوا مارا گیا ۔ بایں ہمہ خراسان کریم خان کے قبضے میں نہیں آیا، جہاں نادر شاہ کا ایک نام لیوا شاہ رخ نابینا بدستور متصرف رہا ۔ کریم خان کے سپہ سالار اس کے دونوں بھائی صادق اور ذکی تھے ۔ ان میں سے ذکی تو بسبب اپنے مظالم کے آگے چل کر بدنام ہو گیا اور صادق نے عثمانیوں کے خلاف لشکرکشی کی ۔ اس نے بصرے کا تیرہ ماہ تک محاصرہ جاری رکھا، تاآنکہ اہل بصرہ کو ایرانیوں کی اطاعت قبول کرنا پڑی ۔ یہ شہر وکیل کی وفات تک انھیں کے قبضے میں رہا ۔ کریم خان نے بڑی تن دہی سے ملک میں امن و امان بحال کیا اور تجارت اور زراعت کو ترقی دی ۔ وہ خود تو ذرا بھی تعلیم یافتہ نہیں تھا، لیکن اس نے اپنے دربار میں علما و فضلا کو جمع کیا اور ان کی سرپرستی کی ۔ اس کا قیام عام طور سے شیراز میں رہتا تھا، جسے اس نے متعدد عمارتوں (مسجدوں، کاروانسراؤں اور حماموں) سے رونق بخشی، جو آج بھی موجود ہیں ۔ مشہور شاعر سعدی کے مقبرے کی اسی کے حکم سے مرمت کرائی گئی اور حافظ کے مقبرے کو تبریز کے خوبصورت سنگ مرمر سے مزیّن کیا گیا اور اس پر اس کی دو غزلیں بھی کندہ کی گئیں ۔ ھفت تن (= سات شخص) ان پارسا درویشوں کی یاد میں وقف ہوا جن کا وہاں قیام رہتا تھا ۔ یہ ایک تفریح گاہ ہے، جس کا اندرونی حصہ انجیلی مناظر یا سعدی اور حافظ کی فرضی تصاویر سے آراستہ کیا گیا ہے ۔ اس سے تھوڑے ھی فاصلے پر وکیل کا باغ ہے، جو زیادہ تر جہاں نما کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کا یہ نام فتح علی شاہ نے رکھا تھا ۔ باغ دلکشا بھی اسی کی یادگار ہے، لیکن اب اس میں ترکاریاں بوئی جاتی ہیں .

کریم خان ژند نے ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی ۔ Olivier کی تصحیح کے مطابق اس کی تاریخ وفات ۲۳ صفر ۱۱۹۳ھ/۱۲ مارچ ۱۷۷۹ء ہے ۔ اس کے بعد ایران میں طوائف الملوکی پھیل

گئی، جس سے خاندان قاجار کے برسراقتدار آنے کے بعد ھی نجات مل سکی .

مآخذ : (۱) ابن عبد الکریم علی رضا شیرازی : تاریخ زندیه، طبع E. Beer، لائیڈن ۱۸۸۸ء، ص ۳ تا ۶؛ (۲) Malcolm : *Hist. de la Perse*، فرانسیسی ترجمه، ۳ : ۱۶۶ تا ۲۲۰؛ (۳) Charmey : شرف نامه، ۱ : ۵۳؛ (۴) L. Dubeux : *La Perse*، ص ۳۶۶،۳۴؛ (۵) P. Horn، در *Grundr. der iranischen Philologie*، ۲ : ۵۹۲ ببعد؛ (۶) Mme Dieulafoy : *La Perse*، ص ۴۱۲، ۴۱۵ تا ۴۵۸؛ (۷) Oilvier : *Voyage dans l' Empire Ottoman*، ۳ : ۲۸۴ تا ۳۰۱؛ (۸) Cl. Huart : *Hist. de Bagdad*، ص ۱۵۶ تا ۱۵۷؛ (۹) Niebuhr : *Voyage en Arabie*، ۲ : ۲۹۲ ببعد؛ (۱۰) W. Francklin: *Observations made on a tour from Bengal to Persia in 1786-87*، کلکته ۱۷۸۸ء؛ (۱۱) Robert Binring : *Journal of two years' travel*، ۲ : ۱ ببعد، ۱۹۲ ببعد؛ (۱۲) R. S. Poole : *Coins of the Shahs of Persia*، لنڈن ۱۸۸۷ء، ص ۱۰۵ تا ۱۰۶ .

(CL. HUART)

⊗ **کریمر** : رک به فان کریمر .

⊗ **کَریمیا** : رک به قریم .

* **کِسائی** : حکیم مجد الدّین ابو اسحٰق (یا ابوالحسن) کسائی، چوتھی صدی هجری کے نصف آخر کا ایرانی شاعر، جس کا شمار فارسی شاعری کے دور اول میں هوتا هے - کسائی بروز چهارشنبه بتاریخ ۲۶ شوّال ۳۴۱ھ/۱۶ مارچ ۹۵۳ء مرو میں پیدا هوا اور بیشتر مآخذ کی رو سے ۳۹۲ھ (۱۰۰۲ء) میں فوت هوگیا، البته ایک مآخذ (واله، جس کا حواله Ethé نے دیا هے) سے پتا چلتا هےکه اس نے طویل عمر پائی - رها اس کا کلام، سو اس کا کچھ حصه مختلف تذکروں میں محفوظ ره گیا هے، جس کی Ethé نے اشاعت بھی کر دی هے (*Die Lieder des Kisai S. B. Bayr. Ak.*، ۱۸۷۴ء، ص ۱۳۳ تا ۱۴۹) - کسائی کے کلام میں اس دور کے جمله فارسی شعرا کے اصناف سخن کا نمونه ملتا هے اور اس مجموعے میں سب سے زیاده مشهور وه قصیده هے جس میں شاعر نے اپنی تاریخ پیدائش وهی بتائی هے جس کا ذکر اوپر آ چکا هے اور بتایا هے که یه قصیده اس نے پچاس برس کے سن میں لکھا تھا - اس قصیدے میں یاس و قنوط اور زاهدانه رجحانات کا غلبه هے - تذکرے کی رو سے وه ایک ایسا شاعر هے جس نے اهل بیت رسول اللہ صلّی اللہ علیه وآله وسلّم کی منقبت میں کئی قیصدے لکھے (اس قسم کا ایک قطعه Ethé کے مقالے میں بھی موجود هے) - یه بھی کہا جاتا هےکه اس نے سامان فرمانرواؤں اور سلطان محمود غزنوی کی مدح میں قصیدے لکھے - سامانی دور میں وه لازماً ایک مشهور و معروف شاعر هوگا، لیکن زمانۂ مابعد کے تذکروں (مثلاً تذکرۂ دولت شاہ) میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا .

ناصر خسرو کے دیوان میں ایسے کئی اشعار ملتے هیں جس میں اس نے کسائی کا ذکر بڑے حقارت آمیز طریق سے کیا هے۔ Ethé (*Grundr. d. iran. Phil.*، ۲ : ۲۸۱ تا ۲۸۲) نے اس سے یه نتیجه اخذ کیا هےکه کسائی ناصر کےزمانے (تخمیناً ۱۰۴۰ء) میں زنده هوگا جس کا مطلب پھر یه هےکه اس نے بڑی عمر پائی - علاوه ازیں Ethé کے نزدیک ان دونوں شاعروں کے باهمی اختلاف کا سبب ان کے مذهبی عقائد هیں کیونکه کسائی اثنا عشری شیعه تھا اور ناصر خسرو کا تعلق سبعیة سے هے۔ اس کے برعکس براؤن (*A Literary History of Persia*، ۲ : ۱۶۰ تا ۱۶۴) کے خیال میں ناصر کی بدگوئی کا مقصد محض یه تھا که بحیثیت شاعرکسائی پر اپنی فوقیت ثابت کرے - براؤن کی راے میں Ethé کے اخذکرده

نتائج ناقابل قبول ھیں، حتّٰی کہ کسائی کی عمر کے بارے میں بھی وہ اس کا نظریہ تسلیم نہیں کرتا کیونکہ اس کے نزدیک ناصر خسرو کی اپنی پیشرو نسل کے معروف ترین شعرا پر اپنی اولیت جتانے کی کوشش مطلقًا تعجب انگیز نہیں .

مآخذ : (۱) عوفی : لباب الالباب، طبع براؤن، ۲ : ۳۳ تا ۳۹؛ (۲) چہار مقالہ، سلسلۂ یادگار گب، ۱۱ : ۲۸، ۱۳۱ .

(J. H. KRAMERS)

* **الکسائی**: (صاحب کتاب قصص الانبیاء)۔ حاجی خلیفہ (۴ : ۹۳۷۴) ایسے اور مشہور نحوی و قاری علی بن حمزۃ کو ایک ھی شخص قرار دیتا ھے؛ چنانچہ اس کی یہ رائے سب سے پہلے Herbelot (*Bib. Orientale*، ورق ۹۶۱ ب) نے تسلیم کی گو Pertsch اور Ahlwardt کی پیروی کرتے ھوے Lidzbarski (*De Propheticis quae discuntur legendis Arabicis*، لائپزگ ۱۸۹۳ء، ص ۲۵) نے بجا طور پر اس کی مخالفت کی ھے، لیکن I. Eisenberg کے مقالے *Die Prophetenlegenden des Muhammad been Abdallah al-kisai*، برن ۱۸۹۸ء، ص ۷، میں Wellhausen اس مفروضے کی بنا پر اسے پھر قبول کرتا نظر آتا ھے کہ یہ کتاب اگرچہ اس مشہور و معروف عالم کی اپنی تصنیف تو نہیں، لیکن اس سے منسوب ضرور ھے ۔ بایں ھمہ بیشتر مخطوطات کی شہادت اس رائے کے خلاف ھے، جن میں بعض اوقات مصنف کا نام (ابو عبداللّٰہ) محمد بن عبداللّٰہ بھی لکھا جاتا ھے، کبھی محمّد بن احمد اور کبھی حسن بن محمّد (کذا)۔ پھر اس امر میں بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ کتاب مذکور کا مصنف وھی شخص ھے جس نے کتاب عجائب الملکوت (حاجی خلیفہ، ۴ : ۸۰۷۵) یا محض کتاب الملکوت (کتاب مذکور، ۵ : ۱۰۵۲۷) تصنیف کی اور جس کا نام حاجی خلیفہ کے نزدیک ابو جعفر محمّد بن عبداللّٰہ الکسائی ھے، علی ھذا کتاب بدء الدنیا کا مصنف، جس کا نام حاجی خلیفہ (۳ : ۹۹۱۱) نے کنیت کے بغیر لکھا ھے ۔ یہ آخرالذّکر تصنیف ناپید ھے، لیکن شاید اصل تصنیف کے حصۂ اوّل کا نسخہ تھا، جسے ایک جداگانہ کتاب کی شکل میں مرتب کیا گیا اس لیے کہ بعض مخطوطات میں، کتاب مذکور کا نام کتاب بدء (خلق) الدنیا و قصص الانبیاء بھی آیا ھے ۔ اس مصنف نے جس زمانے میں فروغ پایا اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا؛ لہٰذا اس بارے میں کہ اس کا مصنف یہی الکسائی تھا یا مشہور نحوی، جیسا کہ حاجی خلیفہ (۴ : ۹۳۷۷) کا بیان ھے، Eisenberg (مقالہ ص ۹) کی رائے کے برعکس کوئی نتیجہ مرتب نہیں ھوتا ۔ سہل بن عبداللّٰہ التستری (رک بآں) ایک مختصر قصص الانبیاء کا مصنف ھے، اس لیے کہ حاجی خلیفہ نے کہیں نہیں لکھا کہ کتاب مذکور کی بنیاد الکسائی کی مشہور تصنیف قصص الانبیاء پر رکھی گئی ۔ الثعلبی [رک بآں] نے بھی الکسائی کا ذکر نہیں کیا، لہٰذا مآخذ اور دونوں مصنفوں کے باھمی تعلق کے بارے میں ابھی تحقیق کی ضرورت باقی ھے اور یہی وجہ ھے کہ الکسائی کے زمانے کے متعلق بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنا ناممکن ھے البتہ اس کے تمام ادبی کارناموں کی جو نوعیت ھے اسے مدنظر رکھیے تو Ahlwardt کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ الکسائی کا زمانہ پانچویں صدی ھجری ھے ۔ الثعلبی کی تصنیف قرآن مجید کی تفاسیر پر مبنی ھے اور پڑھے لکھے حلقے کے لیے لکھی گئی ھے ۔ اس کے برعکس الکسائی قصہ گو طبقے کا مثالی نمائندہ ھے اور قارئین کی آگہی اور دلچسپی کے لیے قصے بیان کرتا ھے ۔ بظاھر اسے احتیاط اور صحت پسندی کا دعوٰی ھے، لیکن حوالے ھمیشہ قدیم ترین اسناد، مثلاً کعب الاحبار اور وھب بن

منبہ ھی کے دیتا ہے، لہٰذا اس کے اقتباسات علمی تنقید کے قطعاً متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے ابھی موجود ہیں (*GAL.*، ۱ : ۳۵۰ میں مندرجہ نسخوں پر حسب ذیل کا اضافہ کر لیجیے : (۱) Gotha، Pertsch : *Verz.*، عدد ۱۸۳۹؛ (۲) موزۂ بریطانیہ Ellis and Edwards : *A descriptive List*، ص ۳۴ Or. ۵۸۲۰؛ (۳) E. G. Browne : *A Supplementary Handlist*، عدد ۱۰۱۲؛ (۴) Littmann, Princeton، عدد ۲۸؛ (۵) فہرست دارالکتب المصریة، قاہرہ، ۵ : ۱۳۱؛ (۶) فہرست دارالکتب الظاہریہ، دمشق، الزیات، عدد ۴۷۔ یہ کتاب چونکہ مقبول عام تھی، لہٰذا کاتبوں نے اسے نقل کرنے میں ہمیشہ احتیاط سے کام نہیں لیا بلکہ اکثر من مانے اختصار کر دیے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ ترکی میں بھی ہو چکا ہے دیکھیے H. L. Fleischer : *Catalogus codd. mss. Or. bibl. Dresdensis*، عدد ۱۲۸۔

مآخذ : (۱) Hottinger : *Promptuarium*، ہائیڈل برگ ۱۶۵۸ء، ص ۲۰۹؛ (۲) Lidzbarski : *Diss.* (sl.)، ص ۲ تا ۲۵؛ (۳) *Vita Prophetarum auctore Muhammed Ben Abdallah al-kisa'i e codicibus, qui in Monaco, Bonna, Lugd. Batav., Lipsia et Gothana asservantur edidit* Isaac Eisenberg، ج ۱، لائیڈن ۱۹۲۲ء و ج ۲ لائیڈن ۱۹۲۳ء۔

(BROCKELMANN)

* **الکسائی** : علی بن حمزہ بن عبداللہ بن بہمن بن فیروز، مولٰی بنو اسد، نحوی اور قاری۔ کوفے میں پیدا ہوا اور رنبویة میں، جو رے سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے، ۱۸۹ھ/۸۰۵ء میں فوت ہو گیا۔

اپنے آبائی شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد الکسائی بصرے چلا گیا تاکہ الخلیل بن احمد [رکّ بآں] کی خدمت میں رہ کر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے، لیکن اس نے اسے مشورہ دیا کہ نجد، حجاز اور تہامة کے قبائل کا رخ کرے، ان کے ساتھ رہے اور زبان سیکھے۔ الکسائی واپس آیا تو الخلیل کا انتقال ہو چکا تھا اور نحوی یونس بن حبیب البصری اب اس کا جانشین تھا۔ اس نے صرف و نحو کے بارے میں الکسائی سے متعدد مباحثے کیے اور بالآخر اپنی جگہ اس کے لیے خالی کر دی۔ الکسائی نے مستقل طور پر بغداد میں اقامت اختیار کی جہاں زیادہ تر وہ قرآن مجید کی قراءات ھی پر درس دیتا۔ شروع شروع میں تو اس نے اپنے استاد حمزة الزیات ھی کے طریقۂ تعلیم کی پیروی کی، لیکن بعد ازاں اپنا الگ طریق اختیار کر لیا۔ وہ "بدر سابع" ہے لہٰذا اس کا شمار سات مستند قاریوں [قرائے سبع] میں ہوتا ہے۔

ہارون الرّشید نے الامین اور المأمون اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم اس کے ذمے کی۔ اگرچہ امام الشافعیؒ صرف و نحو میں اس کی معلومات کی بے انتہا تعریف کرتے ہیں، لیکن کہا جاتا ہے کہ صرف و نحو ھی میں بالخصوص کمزور تھا؛ چنانچہ اس کے حامی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ الکسائی نے اس فن پر آخر عمر ھی میں توجہ مبذول کی۔ بہرحال اس کے متعدد حریف تھے جن کے متعلق اس کے رویے کو نہ تو دیانتدارانہ کہا جا سکتا ہے نہ منصفانہ۔ ان میں سیبویہ اور الیزیدی قابل ذکر ہیں۔

الکسائی کے اساتذہ میں ابو جعفر، الرؤاسی، معاذ بن مسلم الھراء، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن ارقم اور ابوبکر بن عیاش شامل ہیں۔

شاگرد تھے : ابو عمر الدوری، ابو الحارث اللیث بن خالد، یحیی بن زیاد الفراء اور ابو عبیدالقاسم بن سلیمان۔

معلوم ہوتا ہے کہ الکسائی کی متعدد تصنیفات

میں سے ایک رسالہ ما تلحن فیہ العوام ہی محفوظ رہ سکا ہے ۔ یہ رسالہ عامیانہ زبان کی غلطیوں کے بارے میں لکھا گیا ہے جسے اس موضوع پر غالباً قدیم ترین تصنیف کا درجہ حاصل ہے اور جسے مخطوطۂ برلن عدد ۷۰۱۳ سے نقل کرتے ہیں، Brockelmann نے *Zeitschr. F. Assyriol*، ۱۲ (۱۸۹۸ء) : ۲۹ تا ۳۶ میں شائع کیا (دیکھیے سطور ذیل Nöldeke، کتاب مذکور، ص ۱۱۱ تا ۱۱۵) ۔ [یہ رسالہ عبدالعزیز المیمنی کی تصحیح سے دوبارہ شائع ہوا ہے] .

مآخذ : (۱) الفہرست، ص۲۹، ۶۵؛ (۲) الاغانی، ۵ : ۳۶، ۵۳؛ ۱۱ : ۱۰۶؛ ۱۲ : ۲۳؛ ۱۸ : ۷۳؛ ۲۱ : ۱۰۶؛ (۳) ابن الانباری : الانصاف، طبع G.Weil، لائیڈن ۱۹۱۳ء، ص ۲۹۳ تا ۲۹۴ و بمدد اشاریہ؛ (۴) ابن قتیبہ : المعارف، قاہرہ ۱۳۰۰ھ، ص ۱۸۴؛ (۵) ابن حجر : تہذیب التہذیب، حیدرآباد ۱۳۲۶ھ، ۷ : ۳۱۳؛ (۶) الانباری : نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ء، ص ۸۱؛ (۷) یاقوت : معجم البلدان، بذیل مادۂ رنبویہ؛ (۸) وہی مصنف : ارشاد الاریب، لائیڈن ۱۹۱۱ء، ۵ : ۱۸۳؛ (۹) ابن خلّکان : وفیات، قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۱ : ۳۳۰؛ (۱۰) البکری: تاریخ الخمیس، قاہرہ ۱۲۸۳ھ، ۲ : ۳۳۲؛ (۱۱) ابوالفداء : تاریخ، قسطنطینیہ ۱۲۸۶ھ، ۲ : ۱۸؛ (۱۲) السمعانی : الانساب، لائیڈن ۱۹۱۲ء، ورق ۴۸۲ الف؛ (۱۳) السیوطی : المزہر، بولاق ۱۲۸۲ھ، ۲ : ۲۳۲؛ (۱۴) وہی مصنف : بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۳۳۶؛ (۱۵) وہی مصنف : الاشباہ و النظائر، حیدرآباد ۱۳۱۷ھ، ۴ : ۱۵، ۱۸، ۳۴؛ (۱۶) Flügel : *Die Gramm. Schulen d. Araber*، لائپزگ ۱۸۶۲ء، ص ۱۲۱؛ (۱۷) Nöldeke : *Gesch. d. Qorân*، گوٹنگن ۱۸۶۰ء، ص ۲۹۱، ۲۹۷؛ (۱۸) Brockelmann : *GAL.*، ص ۱۱۵ [تعریب : تاریخ الادب العربی، ۲ : ۱۹۷ تا ۱۹۹]؛ (۱۹) Huart : *Litt. arabe*، ص ۱۵۰ .

(محمّد بن شنب)

کسب : یہ مادہ قرآن مجید میں تلاش کرنے، حاصل کرنے، کمانے، کام کرنے [(الراغب : مفردات القرآن، بذیل مادہ)] (اچھا یا برا) کے معنوں میں بارہا استعمال ہوا، نیز دیکھیے C. Torrey : *The Commercial Theological Terms in the Koran* (لائیڈن ۱۸۹۲ء)، ص ۲۷ بعد اور اس میں Nöldeke کا شذرہ ۔ باب اول (فعل) اور باب ہشتم (افتعال) کے مشتقات مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، لیکن البیضاوی نے (تفسیر البیضاوی طبع Fleischer، ۱ : ۱۴۳ س ۲۱) میں اس آیت (۲ [البقرۃ] : ۲۸۶) کی تفسیر میں الزمخشری کی پیروی کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ باب افتعال میں جا کر معنوں میں زیادہ ذاتی اور راجع الی الفاعل ہونے کا اعتماد پیدا ہو جاتا ہے، لہٰذا کسب اور اکتساب کے معنی تقریباً ایک ہیں البتہ اصطلاحاً اس کا استعمال دوگونہ ہے : (۱) ایک جو اشاعرہ کے "اکتساب" کا مترادف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کا فعل در اصل اللہ کا تخلیق کردہ، ابتدا کردہ اور پیدا کردہ ہوتا ہے، لیکن انسان اس کا اکتساب کرتے ہوئے اسے مکسوب بنا لیتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے اختیار اور ارادے سے اس سے ربط تو قائم کر لیتا ہے، مگر نہ تو اس کے نتیجے پر اثر انداز ہوتا ہے نہ اس کا آغاز وجود اس کا مرہون منت ۔ وہ صرف اس کا مورد (ریاضی کی اصطلاح میں محل) ہے کہ جو عمل سرزد ہوتا ہے، مخلوق کی ذات میں ہوتا ہے (الجرجانی : شرح المواقف از الایجی، بولاق ۱۲۶۶ھ، ص ۵۱۵) ۔ الغزالیؒ نے غالباً اس لیے کہ انسان اپنے عمل کی ذمّے داری قبول کرے اکتساب کو ترجیح دی دیکھیے ان کا ارشاد احیاء علوم الدین (طبع مع شرح المرتضی الزّبیدی، ۲ : ۱۶۵ بعد) اور اس کی

مفصل شرحیں ۔ الرازی (تفسیر، ۲ : ۳۸۸، قاہرہ ۱۳۰۸ھ) نے بھی ۲ [البقرۃ] : ۲۸٦ کی شرح کرتے ہوے ان دو اصطلاحات کے بارے میں مختلف نظریے بیان کیے ہیں ۔ السنوسی نے بھی مقدمہ (طبع Luciani، ص ٦۸ ببعد، نیز حاشیہ ص ۲۳۷) میں اکتساب کی اصطلاح دو بار استعمال کی ہے اور وہ بھی کسب ہی کے معنوں میں ۔ السنوسی کے بیان کو الجرجانی کے بیان پر اضافہ تصور کیجیے ۔ یہ مسلمانوں کے کلام کا ادق ترین مسئلہ ہے (ادق من کسب الاشعری)، لیکن قیاس یہ ہے کہ الاشعری چاہتا تھا اس امر کی تشریح کرے کہ انسان کو آزادی اختیار کا شعور حاصل ہے اس کا کہنا یہ تھا کہ اس شعور کو اللہ تعالٰی نفس انسانی میں الگ طور پر تخلیق کرتا ہے ۔ اس کے نزدیک انسان ایک خود حرکت کل ہے اور شعور اس کا ایک پرزہ ۔ متکلمین مابعد نے بالخصوص ماتریدی نظام فکر کے زیر اثر جس پر اخلاقیات کا غلبہ ہے، اس نظریے کو اس کے برعکس دوسرے طریقے سے پیش کیا، مثلاً دیکھیے التفتازانی : شرح العقائد النسفی (نسفی ماتریدی تھا)، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ص ۹۸ ببعد؛ (۲) کسبی اور اکتسابی اطلاق اس علم پر ہوتا ہے جو مخلوق اشیا کو حاصل اور علل ثانویہ (اسباب) کے اختیاری استعمال سے حاصل کیا جاتا ہے : (الف) مثلاً استدلال اور استخراج میں مقدمات کو جانچنا یا (ب) جیسے سننا، جیسے ادراک حسی کے دوران میں آنکھ کا پھیرنا ۔ ان کا دائرہ بہ نسبت استدلال زیادہ وسیع ہے ۔ استدلال کا تعلق تو صرف حجت اور دلیل سے ہے ۔ بعض اوقات ایسا ہی ہوتا ہے کہ ضروری کو اکتسابی اور استدلالی کے مقابلے میں پیش کیا جائے ۔ دوسروں کے نزدیک اس کی ترتیب یوں ہے : (الف) ضروری اور (ب) اکتسابی؛ (ب) کے حصول میں اسباب کی تین قسمیں ہیں : صحت مند حواس قابل اعتماد بیان اور "نظر"، یعنی فکر معقول ۔ نظر کی بھی دو قسمیں ہیں : یعنی فوری وجدان (بدیہی) اور استدلال، یعنی (استخراج) (التفتازانی : شرح العقائد النسفی، ص ۳۹ ببعد؛ نیز الجرجانی : شرح المواقف، ص ۱٦، ۲۱) .

مآخذ : متن میں مذکور ہیں ۔ دونوں قسم کے استعمال کے بارے میں کشاف اصطلاحات الفنون، ص ۱۲۳۳، ببعد کا اضافہ کر لیجیے .

(D. B. MACDONALD)

* **کَسْر** : ریاضی کی ایک اصطلاح جسے عرب ریاضی دان کوئی سے دو عددوں، فاصلوں یا سطحوں وغیرہ کی نسبت کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ ہندسہ میں البتہ الکسر کی اصطلاح شاذ ہی استعمال ہوتی ہے ۔ عام طور پر یوں کہا جاتا ہے نسبت الف الی ب کنسبۃ ج الی د $\left(\frac{ا}{ب} = \frac{ج}{د}\right)$ ۔ عرب ہیئت دان جیب زاویے کو دائرے کے نصف قطروں سے تعبیر کرتے ہیں جو ۱۲ یا ٦۰ حصوں پر مشتمل ہوگا ۔ البیرونی کے نزدیک نصف قطر کی قیمت ہے ایک، لہٰذا اس کی تصنیف میں جیب زاویے کی قیمتیں کسروں ہی کی شکل میں جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں دی گئی ہیں ۔ القانون المسعودی کی عبارت ہے : ویقوم مقام الکسر اللّتِی مخارجہا من الاثنین الی العشرۃ ولذلک سمواتلک الاوتار امہات کما سموا ھذہ الکسور رؤسًا (اور پھر کسروں کے ایک باقاعدہ سلسلے کے بعد دوسرا سلسلہ جو (اعداد) ۲ سے شروع ہو کر ۱۰ تک چلتا ہے، لہٰذا انھوں (ریاضی دانوں) نے ان کا نام وتر "اُمّہات" (مائیں) رکھا ہے بعینہ جیسے کسروں کا سر. (دیکھیے القانون المسعوی، مخطوطۂ عربی برلن، عدد ۵۷۲۲، ص ٦۳ب ۔ جبر و مقابلہ میں البتہ کسروں سے نسبۃً زیادہ سابقہ پڑتا ہے؛ چنانچہ جن کسروں کو عرف عام

میں "قابل تعبیر" کہا جاتا ہے یہ وهی کسریں هیں جن کے نسب نما ۳ تا ۱۰ هیں، مثلاً ثلث ($\frac{1}{3}$)، ربع ($\frac{1}{4}$)، خمس($\frac{1}{5}$)، سدس($\frac{1}{6}$)وغیرہ۔ دوسری صورتوں میں، مثلاً ($\frac{5}{11}$) کے بجائے هم یوں لکھیں گے گیارہ میں سے پانچ حصے۔ پھر اگر نسب نما اجزا میں تقسیم کیے جا سکیں تو کلیۂ ذیل استعمال کیا جائے گا $\frac{1}{48}$ = آٹھویں حصے کا چھٹا حصہ، کسر $\frac{1}{2}$ کو نصف (آدھے) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مآخذ : J. Ruska : *Zur ältesten arabischen Algebra*، هائیڈل برگ ۱۹۱۷ء، ص ۲۰ و ۲۳۔

(C. Schoy)

* **کَسْر** : رک بہ کَسْرَۃ۔

* **کَسْرَۃ** : لغوی معنی توڑنا؛ زیر کی علامت؛ اس کی آواز کسر کہلاتی ہے۔

* **کِسریٰ** : ساسانی خاندان کے دو ایرانی بادشاهوں کا عربی نام۔ خُسْرو [رک بآں] ایرانی بادشاهوں کا عام نام پڑ گیا۔ آگے چل کر اس سے اَکَاسِرَۃ (دوسری شکلیں: کُسور، اکاسِر، کساٸرہ) جمع مکسر بنی۔ شہر المدائن (Seleucia-ctesiphon) کی واحد یادگار جو حال هی میں زلزلے سے تباہ هوئی، طاق کسریٰ اور ایوان کسریٰ کہلاتی تھی (۱) Pietro della Valle، فرانسیسی ترجمہ، پیرس ۱٦٦۱ء، حصہ ۲، ص ۳٦ تا ٦۸؛ (۲) Buckingham : *Travels in Mesopotamia*، ۱ : ۹۱۵؛ (۳) Edw. Yves : *Voyage from England to India*، لنڈن ۱۷۷۳ء، ص ۲۹۰؛ (۴) Beauchamp، در *Journal des Savants*، ۱۷۹۰ء، ص ۷۹۷؛ (۵) Olivier : *Voyage dans l' empire Othoman*، ۲ : ۴۳۳ ببعد؛ (٦) J. cl. Rich : *Narrative*، ۲ : باب ۹، ص ۱۵۹؛ (۷) J. Keppel : *Personal narrative*، ۱ : ۱۲۲ ببعد؛ (۸) J. Baillie Fraser : *Travels in Koordistan*، ۲ : ۱ تا ۹۔

(Cl. Huart)

* **کَسْف** : رک بہ خسوف۔

* **کَسْف** : رک بہ کَشْف۔

* **کَسْکَر** : عراق کے ایک شہر کا نام۔ جب خلیفہ عبدالملک کے عامل عراق الحجاج [رک بآں] نے یہاں کی بغاوت فرو کر دی تو اس نے ۸۳ھ/۷۰۲ء تا ۸٦ھ/۷۰۵ء میں ایک نیا شہر بسانا شروع کیا جو الواسط (مرکز) کے نام سے مشہور هوا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ شہر اس صوبے کے پرانے عرب دارالخلافوں، یعنی شمال میں کوفے اور جنوب میں بصرے سے یکساں فاصلے پر واقع تھا۔ الحجاج نے اس شہر کی تعمیر کے لیے دریاے دجلہ کے کنارے شہر کسکر کے مضافات کا انتخاب کیا، جس نے ساسانیوں کے عہد کی تاریخ میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ نیا اسلامی شہر دجلے کے مشرقی کنارے پر بسایا گیا۔ اس کے برعکس کسکر اس کے بالمقابل دجلے کے دوسرے کنارے پر واقع تھا۔ شہر کے دونوں نصف حصوں کو ایک کشتیوں کے پل کے ذریعے ملایا گیا۔ آج کل نہ تو الواسط باقی ہے نہ کسکر بلکہ ابھی کچھ مدت پہلے تو ان کے صحیح محل وقوع کے متعلق بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ عہد اسلام میں دریاے دجلہ موجود مقام سے کہیں زیادہ مغرب میں بہتا تھا۔ اس زمانے میں اس کی گزر گاہ بہت حد تک غالباً وهی تھی جو آج کل شط الحی کی ہے۔ کسکر واسط یقیناً موجودہ کوت الحی کے قرب و جوار میں کہیں واقع هوگا۔

ساسانیوں نے عراق کی جو تقسیم کی تھی اس کے مطابق ۲۷ انتظامی اضلاع میں کسکر کا بھی شمار هوتا تھا دیکھیے Streck، کتاب مذکور [دیکھیے مآخذ] ص ۱۵، ۱۸۔ یہ غالباً جیسا کہ آگے چل کر مسلمانوں کی حکومت میں بھی... تخمیناً اس علاقے پر مشتمل تھا جو دریاے دجلہ کے مشرق میں واقع ہے اور شمال میں موجودہ کوت العمارہ

سے لے کر دجلے کے دہانے کے علاقے تک پھیلا ہوا ہے - بعض اوقات اسے اور ضلع میسان [رک باں] کو ایک ھی بتایا گیا ہے - اس بارے میں دیکھیے Schaeder، در *Islam*، ۱۴ (۱۹۲۴ء) : ۱۷ ببعد؛ دیکھیے نقشہ در Sachau : *Die Chronik von Arbela*، ص۶۱ - دیلم کے دار الخلافہ کو جو عام طور دولاب کے کے نام سے مشہور ہے بعض اوقات کسکر بھی کہتے ہیں، دیکھیے G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۴۷ ؛ de Morgan : *Miss scientif. en perse*، ۱ (پیرس ۱۸۹۴ء) : ۲۷۶ .

مآخذ : (۱) *BSA*، بمواضع کثیرہ؛ (۲) البلاذری، (طبع ڈخویہ)، ص۲۸۵؛ (۳) یاقوت : معجم (طبع Wüstenfeld)، ۴ : ۴۷۲؛ (۴) القزوینی : آثار البلاد (طبع Wüstenfeld)، ۲ : ۲۹۹؛ (۵) حمد اللہ المستوفی : نزھۃ القلوب (سلسلۂ یادگار گب، ۲۳/۱ : ۱۶۲، ۶)؛ (۶) G. Le. Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate* (کیمبرج ۱۹۰۵ء)، ص ۳۹، ۴۳، ۸۰؛ (۷) وھی مصنف، در *JRAS*، ۱۸۹۵ء، ص ۴۴ ببعد؛ (۸) Streck : *Babylonien nach den arab. Geographen*، ۲ (لائیڈن ۱۹۰۲ء) : ۳۱۸ ببعد، ۳۲۱ ببعد؛ (۹) Ritter : *Erdkunde*، ۱۰ : ۱۹۱ .

(M Streck و [تلخیص از ادارہ])

* **کُسْکُس** : (Couscous)، ایک قسم کا کھانا جو میدے (Semolina) سے تیار کیا جاتا ہے - تمام شمال مغربی افریقہ (طرابلس، صحراء، تونس، الجزائر اور مراکش) میں یہ لوگوں کی خوراک کا بڑا جزو ہے - اسے بعض اوقات "طَعام"، یعنی "اصلی کھانا" "یا بہترین کھانا" بھی کہا جاتا ہے اور مشرق الجزائر کے بدوی باشندے اسے نَعْمہ بھی کہتے ہیں جس کا مفہوم بھی وھی ہے - مغربی الجزائر کے بادیہ نشین اسے "مَعاش" اور جنوب اور صحرا کے بادیہ نشین "عَیْش" اسی مفہوم میں کہتے ہیں، یہاں تک کہ تونس میں طعام کی اصطلاح خاص طور پر ان دعوتوں کے لیے استعمال ہونے لگی ہے جن میں یہ کھانا خصوصیت سے کھایا جاتا ہے، یعنی وہ دعوتیں جو اور جگہ زردہ (مشرق الجزائر)، وعدہ (مغربی الجزائر) اور مُسِیْم musem (مراکش) کہلاتی ہیں - افریقہ کی یہودی عربی میں کسکس کو فتیل (Ftil) کہا جاتا ہے .

کسکس کسی وقت میں بھی تیار کیا جا سکتا ہے، تاھم بعض لوگ اسے دوشنبے اور جمعے کی راتوں میں تیار کرتے ہیں جو سنت نبویؐ کے مطابق خاص طور پر مبارک راتیں ہیں - تیاری کا عمل، جسے ایک طرح کا مذھبی رنگ دے دیا گیا ہے اور جس میں بعض رسوم کا ادا کرنا ضروری ہے، کسی دعا یا مذھبی کلمے سے شروع ہوتا ہے - جو عورت اسے تیار کر رھی ہو اسے نہ تو کوئی چیز ایسی سننی چاھیے اور نہ دیکھنی جو فال بد تصور کی جا سکے - چنانچہ جو لوگ اس کے گرد و پیش ہوتے ہیں وہ یا تو اولیاے کرام کا ذکر کرتے ہیں، یا زرعی خوشحالی اور زمین کی زرخیزی کا اور یا اس عورت کے گھرانے کی دولت و ثروت کا چرچا کرتے ہیں - اس کے علاوہ اور سب باتوں کے ذکر سے وہ احتراز کرتے ہیں .

کسکس بناتے وقت عورت زمین پر بیٹھ جاتی ہے اور اپنے سامنے ایک لکڑی کا برتن رکھ لیتی ہے جسے مقامی اصطلاح کے مطابق جَفْنہ یا قَسْعہ کہا جاتا ہے - اس کے قریب ھی میدے کا تھیلا اور ایک برتن میں خفیف سا نمکین پانی رکھا ہوتا ہے - بعض لوگ اس نمکین پانی میں دو تین قطرے ابرنیساں کے پانی کے (یعنی اس مینہ کے جو مئی کے شروع میں برستا ہے اور جس کا پانی ایک بوتل میں بھر کے رکھ لیا جاتا ہے) ملا دیتے ہیں، جس کی

کچھ خاص تاثیر سمجھی جاتی ہے ۔ وہ عورت ایک مٹھی بھر میّدہ لیتی ہے، اسے جفنہ میں ڈال دیتی ہے اپنے چلو سے نمکین پانی اس پر چھڑکتی ہے اور اسے اپنی انگلیوں سے دبا دبا کر برتن میں ادھر ادھر پھراتی ہے ۔ یہاں تک کہ سیسے کے چھرّوں کی طرح سے اس کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بن جاتی ہیں ۔ ایک ایک مٹھی آٹا لے کر وہ یہی عمل کرتی رہتی ہے اور چھوٹی گولیوں کو بڑی گولیوں سے جدا کرنے کے لیے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جفنہ کو ہلاتی رہتی ہے اور اس میں گھما گھما کر بڑی گولیوں کی چھوٹی گولیاں بناتی ہے ۔

اس اثنا میں وہ ایک انگیٹھی پر قدرہ (ایک قسم کی مٹی کی ہنڈیا) کے اندر پانی میں گوشت ابالنے کو رکھ دیتی ہے، یعنی اگر کسکس کو گوشت کے ساتھ پکانا منظور ہو، اور یا ترکاریاں (چھوٹی مٹر، شلجم، جنگلی چقندر)، اگر اسے ترکاریوں کے ساتھ پکانا مقصود ہو، اور یا صرف پانی، اگر اسے شکر کے کے ساتھ پکانا چاہیں ۔ آخر کار جب کسکس کے لیے میدے کی حسب ضرورت مقدار تیار ہو جاتی ہے تو عورت اسے کچھ دیر کے لیے ایک چمڑے کی تھیلی یا بوتل میں بند کرکے رکھ دیتی ہے ۔ اس کے اندر چھوٹی گولیاں خشک ہوتے ہی ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور ایک طرح کے موٹے دانے دار آٹے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اب پکانے والی اس آٹے کو ایک خاص چھلنی میں الٹ دیتی ہے اور موگری ہاتھ میں لے کر اس سے آٹے کو کچل کچل کر چھلنی میں سے گزارتی ہے ۔ یہ گول دانے جو چھلنی کے سوراخوں میں سے گزرتے ہیں کسکس کے اصلی دانے ہوتے ہیں ۔ جو دانے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ سوراخوں میں سے نہیں گزر سکتے انھیں بَرقُوش یا میدے کے نان جو مُقطّفہ کہلاتے ہیں، بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے ۔

اسی دوران میں پانی سے آدھی بھری ہوئی قدرہ انگیٹھی پر کھولتی رہتی ہے ۔ اب پکانے والی ایک برتن جسے کسکس کہتے ہیں لیتی ہے جو ایک بغیر گردن کی قیف نما مٹی کی پتیلی ہوتی ہے جس کے پیندے میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے ہیں ۔ پتیلی کو قدرہ کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے کناروں پر کپڑا لپیٹ دیا جاتا ہے تاکہ دونوں برتنوں کے بیچ میں سے بھاپ باہر نہ نکل سکے ۔ اس پتیلی کے اندر کسکس کے دانے بھرے ہوتے ہیں ۔ بھاپ کو باہر نکلنے کے لیے پتیلی کے پیندے کے سوراخوں اور کسکس کے دانوں کے بیچ میں سے گزرنا پڑتا ہے جنھیں وہ پکا دیتی ہے ۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پکانے والی کسکس میں اپنی انگلی ڈال کر یہ دیکھ لیتی ہے کہ آیا وہ ٹھیک طرح پک گیا ہے یا نہیں ۔ جب وہ اچھی طرح پک جاتا ہے تو وہ اس کے دانوں کو جفنہ میں ڈال دیتی ہے اور دوبارہ اپنے ہاتھ سے ان کی گولیاں بناتی ہے تاکہ وہ مل کر آٹا یا منجمد ٹکڑے نہ بن جائیں اور پھر دوبارہ انھیں کسکس، یعنی پتیلی میں بھاپ دیتی ہے ۔ اس مرتبہ جونہیں کسکس سے بھاپ اٹھنی شروع ہوتی ہے وہ اسے آخری دفعہ جفنہ میں ڈال دیتی ہے ۔

اب اگر پکانے والی مَسْفُوف یا میٹھا کسکس بنانا چاہتی ہے تو اس پر مصری چھڑک دیتی ہے اور کہیں کہیں اس کے بیچ میں مکھن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ دیتی ہے جو گرمی کے اثر سے پگھل کر میدے کی چھوٹی گولیوں میں سرایت کر جاتا ہے ۔ اب قدرہ کا پانی پھینک دیا جاتا ہے ۔ اگر کسکس کو گوشت یا ترکاریوں کے ساتھ پکانا ہوتا ہے تو عورت قدرہ میں پانی کی مقدار بڑھا دیتی ہے تاکہ شوربے یا سقیہ کی مقدار بڑھ جائے، نیز اس میں تھوڑا سا نمک بھی ڈال دیتی ہے ۔ کھانا پیش

کرنے سے پہلے یہ شوربا اس پر ٹپکا دیا جاتا ہے ۔

کسی ضیافت میں خواہ کتنے ہی الوان کا کھانا ہو، کسکس ہمیشہ سب سے آخر میں دسترخوان پر رکھا جاتا ہے ۔ بنانے کی ترکیب کے مطابق اسے مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے اور ان ناموں میں مختلف لسانی علاقوں کے اعتبار سے بھی تفریق پائی جاتی ہے ۔ جو نام بیان ہو چکے ہیں ان میں مندرجۂ ذیل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے : (۱) مَسْفُوف، بہت باریک دانوں کا شکر کے ساتھ؛ (۲) مَعْوار، بہت باریک دانوں کا گوشت کے ساتھ؛ (۳) بَرْبُوخ (تونس، قُسَنْطِینَة Constantine) باریک دانوں کا جسے ٹھنڈا کرکے مکھن یا کسی بھی قسم کی چربی کے ساتھ اوپر سے چھاچھ چھڑک کر کھاتے ہیں ۔ یہ مغرب میں سِیکُوک کہلاتا ہے؛ (۴) مَحَمَّصَة، بہت بڑے بڑے دانوں کا کسکس؛ (۵) بَرْقُوکس یا برقوقش یا مَرْدُود، بھاپ کے پھولے ہوئے بڑے دانوں کا اور شوربے یا دودھ میں پکا ہوا، جو جنوبی الجزائر میں عَیْش کہلاتا ہے؛ (۶) بَرْبُوشَة، جو بجائے گیہوں کے جو کے میدے سے بنتا ہے ۔ اسے مغرب میں بربول کہا جاتا ہے ۔

مآخذ : (۱) Delphin : *Textes Pour l' étude de l' arabe parlé*، پیرس ۱۸۹۱ء، ص ۲۰۷ ببعد؛ (۲) Desparmet : *Enseignement de l' arabe dialectal*، دوسرا دور : الجزائر ۱۹۱۳ء، ص ۱۷۹ ببعد؛ (۳) Destaing : *Dialecte berbère des B. Snous*، ۱ : ۳۱۲؛ (۴) Doutté : *Marrakech*، پیرس ۱۹۰۶ء، ص ۲۳۲ اور وہ مآخذ جن کا حوالہ حاشیے میں دیا گیا ہے ۔

(A. Cour)

* **کَسَّلہ** : (عربی هجاء کَسَلة، کَسَلا) اینگلو مصری سوڈان کا ایک شہر اور صوبہ (مُدیریة) ۔ اریٹیریا کی سرحد سے تقریبًا پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ اس کا نام جبل کسلة کے نام پر رکھا گیا ہے، جو سنگ خارا کی ایک خوش منظر پہاڑی ہے ۔ اس کی سات چوٹیاں ہیں اور بلندی ۲۷۹۱ فٹ ہے، یہ اردگرد پھیلے ہوئے میدانوں کے مابین رہنمائی کا نمایاں نشان ہے ۔ کتب قدیم میں اس کا نام کَسَّلَہ اللُس لکھا ہے (بِجہ : To-Lus) ۔ ابتداء موجودہ شہر کی جگہ حلنقہ (بِجہ نسل کے ایک قبیلے) کی بستی تھی ۔ ۱۸۴۰ء میں احمد پاشا ابو اذان (حکمدار سوڈان ۱۸۳۹ تا ۱۸۴۴ء) نے ضلع تاکّہ کا صدر مقام اور فوجوں کی چھاؤنی بنانے کے لیے یہ مقام منتخب کیا ۔ یہ ضلع اسی زمانے میں ترکی مصری فوجوں نے فتح کیا تھا ۔ سواکن اور مساوا (مسوع) کی بندرگاہوں کو جانے والے راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے کسلہ کو ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے خاص اہمیت حاصل ہوگئی ۔ ۱۸۸۳ء میں اس کی آبادی ۲۰ ہزار تھی، جس میں غیر ملکی تاجروں کی بھی کچھ تعداد شامل تھی ۔ ۱۸۸۵ء میں باقی مصری سوڈان کی مانند کسلہ پر بھی درویشوں، یعنی محمّد احمد [رَکَ بآں] مہدی سوڈانی کے پرجوش پیرووں کا قبضہ ہوگیا ۔ ۱۸۹۱ء میں بریطانیہ اور اطالیہ کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے کسلة کو عارضی طور پر اطالوی افواج کی تحویل میں دے دیا گیا ۔ اگرچہ اس عرصے میں درویشوں کی وجہ سے انھیں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی اور ان کے خلاف متعدد کامیاب جھڑپیں بھی ہوئیں، مگر یہ فوجیں ۱۸۹۴ سے ۱۸۹۷ء تک یہیں قابض رہیں ۔ ان کا قبضہ اس وقت ختم ہوا جب اینگلو مصری افواج نے دوبارہ سوڈان فتح کر لیا اور بریطانیہ اور مصر کی مشترک نگرانی میں حکومت سوڈان قائم ہوئی تو نئے نظام کے تحت اس شہر کو دوبارہ انتظامی و تجارتی مرکز ہونے کی حیثیت سے سابقہ اہمیت حاصل ہو گئی ۔ پچھلے چند سالوں میں اس کی رفتار ترقی اس

وجہ سے اور بھی تیز ہوگئی کہ کش کے ڈیلٹا میں کپاس کی کاشت کو ترقی دی گئی اور ایک ریلوے لائن تیار ہوگئی (۱۹۲۴ تا ۱۹۲۷ء) جس کی وجہ سے یہ شہر وادی نیل اور بحیرۂ قلزم کے ساتھ مل گیا۔ آبادی مخلوط ہے اور اٹھائیس ہزار کے قریب۔ اس میں مغربی افریقیوں (ھَوسَہ اور فلّاتہ) کی خاصی تعداد بھی شامل ہے۔ ان میں سے بیشتر لوگ حاجی ہیں۔

سوڈان کی مذہبی زندگی میں کسلۃ کی اہمیت یہ ہے کہ یہ مِرغنیّہ (یا خَتمیّہ) طریقے کا ایک مرکز ہے۔ یہ سلسلہ انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں اس کے بانی سید عثمان المرغنی نے سوڈان میں قائم کیا۔ یہ بزرگ حجاز کے شہر طائف کے رہنے والے تھے۔ کسلۃ کی ایک نواحی بستی الخاتمیہ میں ان کے بیٹے اور جانشین سید محمّد الحسن (م ۔ ۱۸۶۹ء) کی مسجد اور مقبرہ ہے، جنھیں سوڈان کی تاریخ اولیا میں اہم مقام حاصل تھا۔

کسلہ سے قدیم زمانے ھی سے مشرقی سوڈان کو غلہ بہم پہنچتا رہا ہے۔ یہاں پہلی بار کپاس کی کاشت مصری حکومت کے قیام کے بعد ہوئی جسے پچھلے چند سالوں میں بڑے وسیع پیمانے پر ترقی دی گئی ہے۔ اس سبب سے اس صوبے کو خاصی معاشی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ زمین کے اصل مالک بجہ بولنے والے حَلَنقہ، ھَدَنْدُو اور بنی عامر ھیں۔ بنی عامر وہ قبیلہ ہے جس کے افراد زیادہ تر اریٹیریا میں رہتے اور تگری بولتے ہیں۔ کاشتکار جو کہ حکومت کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ نظام کے ماتحت کام کرتے ہیں ان میں مقامی قبائیلیوں کی غالب اکثریت ہے۔ باقی لوگ جن میں زیادہ تر جَعلیّین ہیں ساحلی اضلاع سے آ کر آباد ہوے یا مغربی افریقہ کے باشندے ہیں۔

صوبۂ کسلہ کا شمالی حصہ (سابق صوبۂ بحیرۂ قلزم) مصری سرحد سے لے کر اریٹیریا کی سرحد تک پھیلے ہوے ساحلی علاقے پر مشتمل ہے جس میں سوڈان اور سواکن کی بندرگاہیں بھی شامل ہیں اور اس کا اندرونی کوہستانی (اتبئی Atbai) حصّہ بھی۔ ھدِندُوا (Hadendoa)، اَمرار اور بِشارین یہاں کے باشندے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ قرون وسطٰی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور ان میں سے اکثر عربی النسل ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں، لیکن وہ بدستور اپنی قدیم حامی زبان (To-Bedauye تویبضاوی) بولتے ہیں، اور رسم و رواج میں ان لوگوں سے چنداں مختلف نہیں، جو عرب مصنفوں کے ہاں بِجہ قبیلے کے نام سے مذکور ہیں۔

صوبے کا مغربی حصہ جو بُطانہ کے نام سے مشہور ہے باریک زردی مائل چکنی مٹی (Loess) کا بنا ہوا ایک وسیع میدان ہے جو دریاے نیل اور دریاے اتبرہ کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک مثالی بدوی علاقہ ہے جہاں موسم برشگال میں اونٹوں اور بھیڑوں کے لیے بہترین چراگاہیں ہیں، لیکن مستقل آبادیاں صرف چند ایک ھی ہیں اور وہ بھی غیر اہم۔ قبائل بطانہ (شکریۃ، کواھلۃ، بطاحین، لحاوین) عربی بولتے ہیں اور سوڈان کے باقی عربوں کے ہم نسل ہیں۔ ان کی تشکیل میں بلاشبہہ بِجہ عناصر کی آمیزش بھی ہے۔ دوسری طرف رشائدہ کہیں انیسویں صدی میں عرب سے ترک وطن کرکے یہاں آئے۔ یہ لوگ ابھی تک اپنے سابقہ وطن کے لباس اور زبان کے پابند ہیں۔ انیسویں صدی میں حکومت کے ابتر نظم و نسق اور مہدویوں کی بغاوت سے جو تباہی پھیلی، اس کی وجہ سے اب یہاں کی آبادی پہلے کی نسبت بہت کم رہ گئی ہے، لیکن اگر آبادی میں اضافہ ہو جائے تو معاشی ترقی کے خاصے مواقع موجود ہیں۔ یہاں کے باشندوں میں مغربی سوڈان سے آئے ہوے لوگوں کو بڑی

اھمیت حاصل ھے - مشرق سوڈان کا وہ حصہ جو اب کسلہ کے نام سے مشہور ھے اس کے تعلقات بیرونی دنیا کے ساتھ کہیں انیسویں صدی میں جا کر شروع ھوے - اگرچہ تاکہ اور بطانہ ھمیشہ سے حبشہ اور نوبیا کی برسراقتدار طاقتوں (میروئی، مسیحی نوبیا اور سِنّار کی سلطنت فُنج) کے حلقۂ اثر میں رھے ھوں گے، لیکن وادی نیل کے ساتھ تعلقات ڈھیلے ڈھالے اور وقتی سے رھے - سواکِنْ ۱۵۱۷ء سے سلطنت عثمانیہ میں شامل رھا اور یہاں ایک ترک پاشا حکومت کرتا تھا، لیکن اندرون ملک باب عالی کی سیادت تسلیم نہیں کی جاتی تھی - حبشہ کے ساتھ اس کے تعلقات کے آثار بہت کم ھیں، لیکن ایک روایت کی رو سے (جسے James Bruce نے نقل کیا ھے) سسنیوں (Susneyos) (۱۶۰۵ تا ۱۶۳۲ء) کے عہد میں اھل حبشہ نے ملک بجہ پر تاخت کی اور ایک خاتون سردار کو گرفتار کر لیا جس کا نام فاطمہ ملکۂ شبان بیان کیا جاتا ھے -

مآخذ: J. W. Crowfoot نے بطانہ کی ابتدائی تاریخ کے متعلق تحقیق کی ھے: (۱) *The Island of Meroe*، *Archaeological Survey of Egypt*، *Egypt Exploration Fund*، ۱۹۱۱ء، ج ۱۹؛ (۲) وھی مصنف: *Old Sites in the Butana*، در *Sudan Notes and Records*، ج ۳ (۱۹۲۰ء)، لوحہ ۲؛ اولین یورپی سیاح J. L. Burckhardt ھے: (۳) *Travels in Nubia*، لنڈن ۱۸۱۹ء؛ (۴) مصری فتوحات اور مصری دور کے حالات کے لیے دیکھیے F. Werne: *Feldzug von Sennar nach Taka, Basa und Beni Amer*، برلن ۱۸۵۱ء؛ (۵) Sir Samuel Baker: *The Nile tributaries of Abyssinia*، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۶) H. Dehérain: *Le Soudan Égyptien sous Mehemet Ali*، پیرس ۱۸۹۸ء؛ (۷) قبائلی تاریخ پر Sir H. A. MacMichael نے خامہ فرسائی کی ھے: *History of the Arabs in the Sudan*، کیمبرج ۱۹۲۲ء، بمواضع کثیرہ؛ (۸) S. Hillelson: *Historical poems and traditions of the shukriya*، در *Sudan Notes and Records*، ج ۳ (۱۹۲۰ء)، لوحہ ۱؛ (۹) G. C. و Brenda Seligman: *Note on the history and Present Condition of the Beni Amer*، کتاب مذکور، ج ۱۳ (۱۹۳۰ء)، لوحہ ۱؛ (۱۰) G. E. R. Sandars: *The Bisharin*، کتاب مذکور، ج ۱۶ (۱۹۳۳ء)، لوحہ ۲؛ (۱۱) توکر اور کسلہ کے عام حالات کے متعلق دیکھیے G. J. Fleming، در *Sud. Notes and Rec.*، ج ۳ (۱۹۲۰ء)؛ لوحہ ۱، ج ۵ (۱۹۲۲ء)، لوحہ ۲؛ (۱۲) موجودہ ترقیات کے لیے دیکھیے *Reports on the administration, finances and condition of the Sudan*، لنڈن، His Majesty's Stationery Office، ۱۹۲۵ء و سالانہ -

(S. Hillelson)

* **کِسْوَة**: رک بہ کَعْبَة و مَحْمَل -

کُسُوف: (و خسوف) سورج گرھن یا چاند گرھن - جہاں تک لغت کا تعلق ھے کہا جا سکتا کہ لفظ "الکسوف" چاند گرھن (کسوف القمر) اور سورج گرھن (کسوف الشمس) دونوں کے لیے یکساں طور پر مستعمل ھے؛ چنانچہ الفرغانی، قسطا بن لوقا، البتّانی، البیرونی اس لفظ کو اپنے ھی استعمال کرتے ھیں، مگر بسااوقات ان میں امتیاز پیدا کرتے ھوے الخسوف کو چاند گرھن اور الکسوف کو سورج کے لیے مختص کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ القزوینی نے کیا ھے (لغوی اعتبار سے یہ امر قابل ذکر ھے کہ صاحب مفاتیح العلوم، طبع Van Vloten کے نزدیک اس کلمے کا باب انفعال میں استعمال، یعنی "انکسف الشمس" عامی اور غیرفصیح ھے، گو اسے اکثر استعمال بھی کیا جاتا ھے جیسے القزوینی وغیرہ ھم نے) -

سورج اور چاند کا گہن زمانۂ قدیم ھی سے

بہت کچھ جاذب توجہ رہا ہے ابرخس (ہپارکوس Hipparchus) کے بعد بطلمیوس نے اور بطلمیوس کی پیروی میں عربوں اور سریانیوں وغیرہم نے گہن کے نظریے کی تحقیق کی ۔ ہم پہلے چاند گرہن کا ذکر کریں گے ۔ سب سے پہلے کہنے کی بات یہ ہے کہ چاند کا ظاہری راستہ (ہم یہاں مرکز ارض کے نظریے کی پابندی کریں گے) طریق الشمس کو دو متقابل نقطوں پر قطع کرتا ہے، جو وقت گزرنے کے ساتھ طریق الشمس ہی پر حرکت کرتے ہیں ۔ ان نقطوں کو الجوزھر کہا جاتا ہے (فارسی جوزچہر، اخروٹ نما، یا اس سے کم صحیح گوی چہر، گیند نما) ۔ وہ التنّین یا "اژدھا" بھی کہلاتے ہیں (مذکورۂ ذیل)، پھر جو بھی سیارہ ہے اس کے ایسے ہی جوزھر ہوتے ہیں ۔ اس لفظ کے ساتھ کسی دوسرے لفظ کا اضافہ نہ کیا جائے تو اس کا تعلق ہمیشہ چاند سے ہوگا ۔ ان کے محل تقویمات فلکی میں درج ہیں ۔ فلک الجوھر وہ عظیم کرہ ہے جس کے اندر بقول ابن الہیثم چاند داخل اور جو اپنی حرکت کے دوران میں چاند کو بھی ساتھ لے چلتا ہے، فلک الجوزھر کہلاتا ہے ۔

چاند گرہن، جیسا کہ قدیم زمانے ہی میں معلوم کر لیا گیا تھا، اس وقت واقع ہوتا ہے جب سورج اور چاند کے درمیان کوئی سیاہ جسم حائل ہو جاتا ہے ۔ ایک زمانے میں خیال تھا کہ یہ جسم ایک اژدہا ہے جو کرۂ سماوی کے دو متقابل نقطوں پر ختم ہوتا ہے اور جس کی حرکت بھی وہی ہے جو چاند کے عقدوں کی ۔ گہن اس وقت ہوتا ہے جب اژدہے کا سر یا دم ہمارے اور چاند کے درمیان حائل ہو جاتا ہے ۔ اس صورت میں چاند نظر نہیں آتا ۔ یہی خیال ہے جس کی بنا پر ہلال اور زوال پذیر عقدوں، یعنی ان نقطوں کا نام جہاں چاند طریق الشمس سے گزرتا ہے، "سر" (الرأس) اور "دم" (الذنب) رکھا گیا ۔ یہ نام، یعنی اژدھا اگرچہ متروک ہو گیا اس کے باوجود الرأس اور الذنب مدتوں رائج ہے ۔ عقدے کے طول کے لیے علامت Ω دراصل اژدھا ہی کی ایک مسخ شدہ شکل ہے ۔ منجموں نے اس اژدہے سے جو اثرات منسوب کیے ہیں وہ زائچے پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں، لیکن سیو روس سیبوخت Severus Sebokt (تقریباً ٦٥٠ ؛ I. Nau : J. A. 'Notes d' Astronomie Syrienne (سلسلۂ ۱۰)، ۱۶ : ۱۵، ۱۹۱۰ء) نے بہت عرصہ پہلے اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ایسا کوئی اژدہا موجود نہیں، لہٰذا اس سلسلے میں جو حسابات کیے جاتے ہیں ان کا تعلق حرکت سے ہے ۔ بایں ہمہ البیرونی کی التفہیم وغیرہ میں ہمیں اس قسم کے بیان ملتے ہیں کہ سر اور دم کی خاصیت مختلف ہے ۔ سر گرم اور مبارک ہوتا ہے اور (مال و متاع) میں اضافے پر دلالت کرتا ہے ۔ دم سرد ہوتی ہے، مصیبت لاتی ہے اور دولت وغیرہ کی کمی کی علامت ہے ۔ چاند اور سورج گرہن تو اصل میں یوں واقع ہوتے ہیں کہ سورج اور چاند یا چاند زمین اور سورج کے درمیان آ جائے ۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جوزھر کے بجائے اکثر لفظ عقد اور عقدۃ استعمال کیا جاتا ہے اور ان میں کبھی رأس اور ذنب کے الفاظ بھی جوڑے جاتے ہیں ۔

سورج چونکہ زمین سے کہیں زیادہ بڑا ہے، اس لیے بشکل اول زمین کا اس پر سایہ ایک طرف مخروطی شکل کے مستدق سائے (ظلّ محض ہے) اور دوسری طرف ایک متسع سائے (ظلّ مشوب) پر مشتمل ہوگا ۔ مکمل تاریکی صرف ظل محض کی صورت میں ہوتی ہے ۔ پھر چونکہ اس سائے کا قطر مدار قمر میں اس مقام پر جس سے اس کا گزر ہو رہا ہے چاند کے قطر سے بڑا ہوگا، اس لیے بعض حالات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ چاند اس سائے میں کچھ دیر ٹھیرا

رہے اور اس صورت میں چاند پورے طور پر گہنایا رہے گا؛ چنانچہ ابن الہیثم ان حالات کی مکمل تحقیقات کر چکا ہے (E. Wiedemann : *Beitr., Xiii, uber eine Schrift von Ibn al. Haitham, Uber die Beschaffenheitder Schatten*، در *S.B.P.M*، *Erlg.*، ۱۹۰۷ء، ۳۹ : ۲۲۶).

اگر زمین، سورج اور چاند بہت چھوٹے چھوٹے اجرام، یعنی ان کی حیثیت محض نقطوں کی ہوتی، تو گرہن صرف اس وقت لگتا جب سورج اور چاند قطعی طور پر عقدوں میں آ جاتے، لیکن یہ چونکہ بڑے بڑے جسم ہیں، اس لیے گرہن اس وقت بھی لگتا ہے جب ان کا گزران عقدوں سے ہو چکا ہو، یعنی ان کے فلکی عرض و طول میں تبدیلی واقع ہو چکی ہو ۔ عرض اگر سائے اور چاند کے قطروں کے فرق سے کم ہے تو پورا گہن ہوگا ۔ آخرالذّکر سے زیادہ، لیکن قطروں کے مجموعے سے کم ہو تو جزوی لگے گا ۔ اگر مؤخرالذّکر کے برابر تو سایہ صرف مس ہی کرتا ہے، گہن نہیں لگتا ۔

صرف سائے کو لیا جائے تو جسے مخروط یا صنوبری کہتے ہیں اور جس کی عمودی تراش کا نام دائرۃ الظّل ہے تو ذیل کی صورتیں پیدا ہوں گی : سائے میں داخلے کو بدء الکسوف، کہتے ہیں ۔ یہ گویا کسوف کی ابتدا ہے ۔ کسف کی ابتدا سے اس کی تکمیل کی منزل کو سقوط (جس کے معنی ہیں گرنا اور جس کا نام بطلمیوس نے ἐμπτωσις رکھا) کہا جاتا ہے ۔ سائے میں طے شدہ راستے کا درمیانی حصہ طے ہو جائے تو اسے وسط کہتے ہیں ۔ سائے سے پورے طور پر باہر نکل آئے تو اسے تمام الانجلاء ۔ المکث (رکنا، ٹھیرنا) سے مراد ہے چاند کے گہن میں رہنے کی حالت ۔ جزوی کسف میں البتہ ایسا کوئی وقفہ نہیں ہوتا ۔ کسف کلّ القمر بلا مکث یا پورا گہن بلاوقفہ اس وقت ہوتا ہے جب مدار قمر کی یہ صورت ہو کہ تاریک شدہ چاند سائے کے مخروط کو صرف ایک نقطے پر مس کرے ۔ اندریں صورت پورا گرہن صرف اسی نقطے پر ہوگا ۔ پورے گرہن کی صورت میں اس مقام کو جس سے اس کی ابتدا ہوئی اوّل المکث اور وہ جہاں چاند سائے سے باہر نکلنے لگتا ہے آخر المکث کہلاتا ہے ۔

جب چاند نیم سائے سے گزرتا ہو تو چاند کی روشنی میں کمی تو واقع ہوگی، لیکن ایسا نہیں کہ بالکل زائل ہو جائے ۔ ابن الہیثم نے سایوں پر اپنی معرکۃ الآرا تصنیف (مذکورۂ بالا) میں اس سوال پر نظری حیثیت سے بحث ہی نہیں کی بلکہ مشاہدے سے اس کی جانچ پڑتال بھی کی ہے؛ تاہم ایسی صورتیں بڑی شاذ ہیں کہ گہنایا ہوا پورا چاند کلیۃً سیاہ نظر نہ آئے اور اس کے بجائے مختلف رنگ دکھائی دیں، بالخصوص گہرا سرخ رنگ جس کا کئی ایک قدیم ہیئت دان مشاہدہ بھی کر چکے ہیں ۔ ابن الہیثم بھی اس کا بالتفصیل ذکر کرتا ہے؛ چنانچہ ابن الہیثم کے یہ بیانات جدید مشاہدوں کے عین مطابق ہیں، مثلاً Joh. Muller : *Lehrbuch der kosmischen Ppysik*، بار پنجم، ص ۱۹۶ ۔ البیرونی نے ان رنگوں کی مزید تحقیق کی (القانون المسعودی، مقالہ ۷، باب ۷، فصل ۳) [نسخۂ مطبوعۂ حیدرآباد دکن، مقالہ ۸، باب ۷، فصل ۲] ۔ اس نے قدیم نظریوں اور خاص کر اور رنگوں کی منجمانہ حیثیت کے بارے میں ہندووں کے خیالات کی بالخصوص تنقید کی ہے (دیکھیے Weidemann : *Uber die verschiedenen bei der Mondfinsternis auftretenden Farben nach Eders Biruni*، در *Jahrbuch für Photographie, etc.*، ۱۹۱۳ء) ۔ پورے طور پر گہنائے ہوئے چاند کی اس روشنی کی توجیہ یوںنہیں کی جاتی ہے کہ سورج

کی شعاعیں جو کہ زمین کے کرہ ہوا سے گزرتے ہوے منحرف ہو جاتی ہیں، لہٰذا یوں ان کے سائے میں داخلے سے چاند کی سطح منوّر ہو جاتی ہے۔ پھر کرۂ ہوا میں رطوبت کی مقدار جیسی کم یا زیادہ ہوتی ہے منحرف شعاعیں بھی اسی اعتبار سے کم و بیش رنگوں سے رنگین ہو جاتی ہیں۔ سورج گہن کے امکان کی بھی وہی شرائط ہیں جو چاند گرہن کی۔

سورج گرہن : چاند جس زاویے پر ہمیں نظر آتا ہے وہ چونکہ اس زاویے سے چھوٹا ہوتا ہے جس پر ہم سورج کو دیکھتے ہیں، گو یہ فرق خفیف ہی سا ہے، اس لیے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ چاند سورج کو پورے طور پر ڈھانپ لے۔ یہی وجہ ہے کہ سورج کے اس گہن پر بھی جو عرف عام میں پورا سورج گرہن کہلاتا ہے، روشنی کی ایک تنگ سی کور باقی رہ جاتی ہے، خواہ سورج چاند اور زمین کے مرکز ایک ہی سیدھ میں کیوں نہ ہوں اور اکلیل اور ذوات الادیات ایسی روشنی کی شکلیں (Perotuberanes) خروج کرتی رہتی ہیں۔ البیرونی : القانون المسعودی، مقالہ ۸، باب ۱۱ میں ان کا ذکر کرتا ہے ([دیکھیے نسخۂ مطبوعہ، ۲ : ۱۹۳۶]؛ E. Wiedemann : *Erscheinungen bei der Dammerung und Sonnen finsternis*، در *Arch. f. Gesch. d. Med.*، ج ۱۵، ۱۹۲۳ء، ص ۴۳)۔ چاند یا سورج کے ایک ہی گہن کے نظر آنے کے مقامی اوقات کو ان مقامات کے جغرافیائی طول بلد کے فرق سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ان اوقات کا یہ حساب مشکل ہے، اس لیے کہ ان اجرام کے اختلاف منظر Parallax ایک نہیں کئی ہیں۔ یہ جو حسابی اور اصلی قیمتوں میں بڑا نمایاں فرق رہ جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی ایک حد تک یہی ہے۔ نظری تفصیلات کا ذکر کہ کسوف کب شروع ہوتا ہے، کتنی دیر تک رہتا ہے اور پھر کتنی مدت کے بعد عود کرتا ہے وغیرہ وغیرہ باعث طوالت ہوگا۔ الفرغانی، قسطا بن لوقا، القزوینی الچغمینی، الخرقی کی تصنیفات بالخصوص ابوالفرج کی تصنیف، *Le Uvre de l' ascensien de l' esprit*، طبع ایف ناؤ (F. Nau)، پیرس، ۱۸۹۹ء اور البیرونی کی کتاب التفہیم وغیرہ میں بھی ان کا کسم و بیش مفصل اور عام تذکرہ مل سکتا ہے، البتہ ریاضیاتی امور اور ان خاص مشاہدات کا جو اس سلسلے میں ضروری ہیں۔ نظریہ ہیئت پر الخوارزمی یا البتّانی کی الزیج یا البیرونی کی القانون المسعودی یا نصیر الدّین الطوسی کی الزیج وغیرہ میں (مذکورۂ بالا فضلا کے بارے میں دیکھیے H. Suter : *Die Mathematiker und Astronomen der Araber* در *Abhandl. zur Gesch. der math. Wissensch.*، حصۂ ۱۰، ۱۹۰۰ء)۔

اس غرض کے لیے کہ کسف کی پیمائش کا ایک معیار مقرر ہو جائے، سورج یا چاند کے قطر کو جن بارہ مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا، انھیں اصبع (انگلی) یا اصبع الکسوف کہتے ہیں۔ ہم ان کی اس تعداد کو جو گہن میں آ جائے شمار کر سکتے ہیں۔ مغرب میں ان انگلیوں کو digits کہتے تھے۔ بعینہٖ سطح کو بھی خیالی طور پر بارہ مساوی حصوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے اور یوں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان میں کتنے حصے گہن میں آ چکے ہیں۔ آخرالذّکر اوّل الذّکر سے جو صرف طول کو تعبیر کرتے ہیں حساب لگایا جا سکتا ہے؛ چنانچہ البتّانی کے یہاں اس کی جدولیں بھی موجود ہیں۔ چاند گرہن کی مقدار کو ہپار کوس کے مبصار (diopter) سے ناپا جاتا تھا اور یوں کہ ایک سلاخ کے ساتھ دو اور سلاخیں علی القوائم جوڑ دی جائیں۔ ان میں ایک سلاخ تو جس کے اندر ایک چھوٹا سا گول سوراخ ہوتا ہے علی حالہٖ قائم رہتی ہے۔ دوسری

جس کا گول سوراخ اس سے بڑا ہوتا ہے، پہلی سلاخ کی طرف سرکائی جا سکتی ہے - پھر دوسرے سوراخ کو پہلے سوراخ سے ایک مناسب فاصلے پر اس طرح رکھا جاتا ہے کہ پہلے سوراخ سے دیکھا جائے تو پورا چاند اس میں سے نظر آئے - پھر دوسرے سوراخ کے سامنے ایک سیاہ تختی رکھ دی جاتی ہے اور اب سوراخ کی ایک طرف سے اس کے کنارے کو جہاں چاند کے تاریک کنارے کی حد ہے، چاند کے روشن کنارے تک سرکنے کی مقدار کو ناپ لیا جاتا ہے - ایسے ہی چاند کی پوری سطح پر تختی کے سرکنے کی مقدار ب کو - ان دونوں کی باہمی نسبت کو یوں ظاہر کیا جائے ا : ب ، لہٰذا گرہن کی مقدار گ ہے تو اصابع الکسوف کی گ = $\frac{ا}{ب}$ ۱۲ .

(E. WIEDEMANN)

* کُسَیْلَہ بن لمزم الاَوْرَبی [ابن کمرم البربری] : تلمسان سے مغرب کی سمت میں آباد بڑے قبیلۂ اَوْرَبَہ کی قیادت میں سَکْرْدِید الاَوْرَبی کا جانشین یارفیق کار۔ (البَکْری، کتاب المسالک، ص ٥٠ کی عبارت جس میں کسیلہ کو موسیٰ بن نصیر کے زمانے میں طُبنہ کا حکمران بتایا گیا ہے، یقیناً غلط فہمی پر مبنی ہے، اس کے سوا کہ کُسَیْلَہ دو مختلف آدمیوں کا نام ہو) - عرب فتح کے دوران میں اس نے عقبہ کے جانشین اَبُو المُہَاجِر کے خلاف مزاحمت کی قیادت کی - ۵۵ھ (٦٧٤ - ٦٧٥ع) میں "تلمسان کے چشموں" (موجودہ الاُربط) کی جنگ میں اس نے اَبُو المُہَاجِر سے شکست کھائی اور عیسائیت کو خیر باد کہہ کر مسلمان ہو گیا - فاتح کی خوشنودی حاصل کرنے میں اسے کامیابی ہوئی اور وہ اس کا معتمد خاص بن گیا لیکن عقبہ کو اس سے نفرت تھی اور پھر جب عُقْبَہ دوبارہ افریقیہ اور المغرب کا والی مقرر ہوا تو کسیلہ زیر عتاب آیا - اَبُو المُہَاجِر کی عاقلانہ تنبیہ و نصیحت کے باوجود عقبہ کُسَیْلَہ کی تذلیل کرتا رہا، اس لیے اپنی سوار فوج کی معرکہ آرا مہم کے بعد قیروان واپس جاتے ہوئے جب اس نے یہ غلطی کی کہ اپنی فوج کو تقسیم کر دیا تو کُسَیْلَہ نے، جو فتح کے ایک زندہ مال غنیمت کے طور پر اس کے ہمراہ تھا، موقع پا کر ان یونانیوں اور بربروں سے ساز باز کر لی جو اسلامی لشکر کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے، چنانچہ اسلامی فوج پر تہوذہ کے قریب اچانک حملہ کیا گیا (٦٣ھ/٦٨٢-٦٨٣ع) جس میں تقریباً سب آدمی جن میں عقبہ اور اَبُوالمُہَاجِر بھی شامل تھے، لڑتے ہوئے شہید ہو گئے - اب کُسَیْلَہ ایک فاتح کی حیثیت سے قیروان میں داخل ہوا جہاں سے اس نے افریقیہ پر پانچ سال تک حکومت کی اور عرب، یونانی اور بربر اس کے زیر فرمان رہے - جب خلیفہ عبد الملک کو دفعۃً ان مشکلات سے چھٹکارا حاصل ہو گیا جو مشرق میں خانہ جنگیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں تو اس نے بَرْقَہ میں زہیر بن قیس کے پاس ایک فوج بھیج دی جسے لے کر مؤخرالذکر قیروان کے مغرب میں ممش کے مقام پر کُسَیْلَہ سے نبرد آزما ہوا اور اسے شکست دے کر ہلاک کر دیا اور کھوئے ہوئے علاقے کو دوبارہ حاصل کر لیا (٦٩ھ/٦٨٨ع - ٦٨٩ع) .

مآخذ : ابن خَلْدُون : کتاب العبر، ٦ : ۱۰۸ تا ۱۰۹، ۱۳٦ تا ۱۳۸ ؛ (۲) وہی مصنف : تاریخ البربر، ۱ : ۲۱۱ تا ۲۱۳، ۲۸٦ تا ۲۸۹ ؛ (۳) وہی مصنف : اخبار دولۃ بنی اغلب بافریقیہ و صقلیۃ، طبع و ترجمۂ Desvergess، متن ص ۲، ۳ تا ۵؛ ترجمہ ص ۱٦ ، ۲۰ تا ۲۳؛ (۴) ابن عذاری : بیان، ۱ : ۱۵ تا ۱۷؛ (۵) البَکْری : کتاب المَسَالک، متن ص ۳۷؛ (٦) ابن تَغْری بردی : النُّجُوم الزَّاہِرَہ، ۱ : ۱۷٦ تا ۱۷۸؛ (۷) النُّوَیْری : *Histoire des Berberes*، ضمیمہ ج ۱، ضمیمہ ۲، ص ۳۳۳ تا ۳۳٦، ۳۳۷؛ (۸) ابن الأثیر :

الکامل، مطبوعۂ قاہرہ، ۴ : ۴۵ تا ۵۵؛ (۹) ابن النّاجی : معالم الایمان، تونس ۱۳۲۰ھ، ۱ : ۴۷ تا ۵۰، ۵۱تا۵۳؛ (۱۰) ابن ابی دینار القیروانی : کتاب المؤنس، ص ۲۹ تا ۳۰؛ (۱۱) احمد الدرعی : الرحلۃ، مطبوعۂ فاس، ص۴۴ تا ۴۷، مترجمۂ *Voyages dans le sud* : de Berbrugger *de l' Algererie*، پیرس ۱۸۴۶ء، ص ۲۲۶ تا ۲۳۱؛ (۱۲) محمود بن سعید مقدیش الصفاقسی : نزھۃ الانظار، تونس ۱۳۲۱ھ، ۱ : ۷۱، ۷۳، ۷۵؛ (۱۳) الورثیلانی : نزھۃ الانظار، الجزائر ۱۳۲۶ھ، ص ۹۷ تا ۱۰۰؛ (۱۴) *Oqba Ibn Nafi'* : W. Roth، گوٹنگن ۱۸۵۹ء، ص ۵۹ تا ۶۱؛ (۱۵) Fournel : *Les Berbéres*، ۱ : ۱۶۰تا۱۶۲، ۱۷۳ تا ۱۷۷، ۱۸۱، ۱۹۳ تا ۱۹۶؛ (۱۶) Mercier : *Histoire de l' Afrique Septentrionale*، ۱ : ۲۰۴ تا ۲۱۱.

(RENE BASSET)

* کَش [کِش] : موجودہ شہر سبز (وجہِ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے گرد و نواح کا علاقہ بہت زرخیز ہے) ۔ یہ شہر ملک بخارا میں واقع ہے اور کسی زمانے میں سمرقند سے بلخ جانے والی تجارتی شاہراہ یہاں سے گزرتی تھی۔ چینی مآخذ کی رو سے (چینی = کیاشہ Kia Sha یا کئی شوانگ Kie-Shuangna نیز کثیوشہ Kui Sha بطور شہر کی‌شیہ Ki-She کی بنیاد سترھویں صدی عیسوی کے ابتدائی ایام میں رکھی گئی تھی ۔ دیکھیے (۱) J. Marquart : *Chronologie der alttürkischen Inschriften*، لائپزگ ۱۸۹۸ء، ص ۵۷؛ (۲) ایران شہر وغیرہ، برلن ۱۹۰۱ء، ص ۳۰۴؛ (۳) E. Chavannes : *Documents Sur les Toukiue (Turcs) accidentaux*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۱۴۶؛ ابن مکولا (م۴۷۳ھ/۱۰۸۰ء) کے حوالے سے یاقوت کا یہ بیان (معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۲۷۴) کہ ماوراء النہر میں اس لفظ کا تلفظ ہر جگہ کِس کیا جاتا ہے، بہت مشکوک ہے ۔ زمانۂ مابعد میں "کِش دلکش" کی ترکیب اکثر دیکھنے میں آتی ہے جب سے اس کے تلفظ کِش کا ثبوت ملتا ہے ۔ عربوں کی فتح کا حال Marquart نے خاص طور پر بیان کیا ہے (ایران شہر، بمدد اشاریہ) سامانی عہد کے کش کے حالات عرب جغرافیہ‌نویسوں(*Bibl. Geogr. Arab.*، طبع de Goeje) (۱) الاصطخری، ص۳۲۴؛ (۲) ابن حوقل، ص۳۷۵ ببعد؛ (۳) المقدسی، ص ۲۸۲) نے التہائی تفصیل سے قلمبند کیے ہیں۔ ان دنوں یہ شہر طول و عرض میں ایک تہائی فرسخ (تقریباً ایک میل) تھا ۔ قدیم شہر (مدینہ؛ فارسی : شہرستان)، نیز قلعہ (قہندز) اس وقت بھی غیر آباد ہو چکے تھے صرف بیرون شہر (ربض) میں آبادی تھی۔ قدیم کش کے مضافات میں ایک نیا شہر ابھر رہا تھا ۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ موجودہ شہر کا محل و قوع اس کش سے مختلف ہے جو مسلمانوں کی فتح سے قبل موجود تھا ۔ محل و قوع کی دوسری تبدیلیوں کے بارے میں اور کسی قسم کی معلومات نہیں ملتیں ۔ مغول کی فتوحات کی تاریخ میں کش کا کہیں ذکر نہیں آتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کش نے مقابلہ کیے بغیر مغول کی اطاعت قبول کرلی ہوگی (۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء) شہر سبز کا نام پہلی بار سکوں پر بھی آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط میں دیکھنے میں آیا ۔ تیمور نے، جو کش کے علاقے کا رہنے والا تھا، اور اس کے معاصرین نے کش میں کئی عمارتیں بنوائیں؛ اس کے لیے دیکھیے W. Barthold، در *Zapiski Wost. otd. arkh. Obshc*، xxiii ببعد ۔ ان میں اق سرای کا محل خاص طور پر مشہور ہے جو خوارزم سے بلوائے ہوے معماروں نے اواخر ۷۸۲ھ/اوائل ۱۳۸۰ء میں تعمیر کیا تھا دیکھیے شرف الدّین یزدی : ظفر نامہ، کلکتہ ۱۸۸۷-۱۸۸۸ء، ۱ : ۳۰۱ ببعد

اور حواشی از نظام الدّین شامی و عبدالرزاق سمرقندی، در Ulugbeg i ego Wremya : W. Barthold، پیٹرو گراڈ ۱۹۱۸ء، ص ۲۳ - اب اس محل کے بہت کم آثار باقی رہ گئے ہیں۔ کتبات کے بارے میں دیکھیے *Protokoli Turk. Kružka* در N. Stinyakowskiy، *Lyub. Arkh.*، ۵ : ۱۱۳ ببعد .

آخری زمانے، یعنی دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی میں حافظ تالیش نے شہر سبز کا حال بیان کرتے ہوے لکھا ہے (عبداللّٰہ نامہ، مخطوطۂ ایشیاٹک میوزیم، ۵۷۴ ورق، ۸۷ب [نیز دیکھیے مخطوطہ کتاب خانۂ دانش گاہ پنجاب، لاھور] کہ یہ ایک اہم شہر ہے جس کا حاکم عموماً شاہی خاندان کا ایک شہزادہ ہوتا تھا حالانکہ نسف یا قرشی [رک بآں] کا نظم و نسق ایک فوجی افسر (داروغہ) کے حوالے کردیا جاتا تھا - آج کل حالت اس سے برعکس ہو چکی ہے اور بارھویں صدی ہجری/ اٹھارھویں صدی عیسوی کے سیاسی انقلابات کی وجہ سے قرشی کے مقابلے میں شہر سبز ایک غیر اہم سا قصبہ ہے - شہر سبز کا ضلع شمال جنوب اور مشرق میں پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، اس لیے اس علاقے کو ریلوے نظام کے ساتھ جلد مربوط ہو جانے کی امید بہت کم ہے اور قرشی پہلے ہی سے ریل کے ذریعے بخارا اور ترمذ سے ملایا جا چکا ہے - اس امر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ شہر سبز پھر پہلے کی طرح خوشحال ہو جائے گا .

مآخذ : (۱) G. le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۴۶۹ ببعد؛ (۲) W. Barthold : *Turkestan W Epokhu mongolskago nashestwiya*، ۲ : ۱۳۴ مع تصحیحات، ص ۵۲۴، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۰ء؛ (۳) وہی مصنف : *Kistorii orosheniya Turkestana*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۴ء، ص ۱۲۵ ببعد .

(W. Barthold)

⊗ **کَشْف** : لغوی معنی کھولنا، ظاہر کرنا، حجاب دور کرنا، انکشاف، کھلنا، ظاہر ہونا، حجاب دور ہو جانا؛ اصطلاح : (۱) علم عروض کی اور (۲) تصوف کی - پہلے علم عروض میں اس کا جو مفہوم ہے وہ بیان کیا جاتا ہے :

[کَشْف با شین منقوطہ یا کسف با سین مہملہ (ع) [الزمخشری : قسطاس؛ فیروز آبادی : قاموس؛ سکاکی : مفتاح، کا قول ہے کہ اصلاً "کسف" (باسین مہملہ : کاٹنا) ہے؛ "کشف" (باشین منقوطہ) [تصحیف ہے] - علم عروض کی اصطلاح میں ایک زحاف کا نام - مراد رکن کے ساتویں متحرک حرف یا وتد مفروق کے حرف متحرک دوم کا حذف، یعنی "مفعولات" کی 'تاء' ساقط کرکے بقیہ "مَفْعُولاْ" کو "مَفْعُوْلُنْ" سے بدل لینا - رکن مزاحف کو مکشوف [یا مکسوف] کہتے ہیں .

صاحب مفتاح کے نزدیک کشف [یا کسف] "وقف" [= سکونِ تاے مَفْعُوْلَات بضم تاء] اور "کف" [= حذف تاے ساکنِ مَفْعُوْلَاْت] کے اجتماع کا نام ہے، یعنی پہلے وقف کے عمل سے مَفْعُوْلَات کی تاء کو ساکن کیا، پھر کف کے عمل سے مَفْعُوْلَاْت کی تاے ساکن کو حذف کیا، "مَفْعُوْلَا" رہا، اسے مَفْعُوْلُنْ سے بدل لیا .

پہلی صورت میں کشف [یا کسف] زحافاتِ مفردہ میں شمار ہوگا، دوسری صورت میں زحافات مزدوجہ میں] .

مآخذ : عربی، فارسی اور اردو میں علم عروض کی تقریباً سب کتابیں، نیز الجرجانی : تعریفات، بذیل مادّہ .

[ھادی علی بیگ]

(۲) تصوف میں یہ وسیع ترین اصطلاح ہے جو صوفی کے سامنے سے حجابات بمراتب اٹھ جانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے - اس کا سوچ سمجھ کر تجزیہ کیا جائے تو اس میں تین درجے نکلتے

ہیں : (ا) مُحَاضَرة، جس میں عقل سے بذریعۂ برہان کام لیا جاتا ہے؛ (ب) مکاشفہ، جس میں علم سے بذریعۂ بیان و تشریح کام لیا جاتا ہے؛ (ج) مشاہدہ، جو براہ راست ذاتی تجربہ (معرفت) کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ (ا) کے ذریعے ارباب العقول علم الیقین تک پہنچتے ہیں ۔ یہ منزل حدود فکر و نظر ہی سے تعلق رکھتی ہے اور اسے در حقیقت کشف نہیں کہا جا سکتا؛ (ب) کے ذریعے اصحاب العلوم کی رسائی عین الیقین کے درجے تک ہوتی ہے اور (ج) کے ذریعے اصحاب المعرفۃ حق الیقین تک پہنچ جاتے ہیں ۔ حق الیقین مطلوب حقیقی کا بلا واسطہ دیدار ہے اور اسے بعض اوقات معاینہ بھی کہتے ہیں (القشیری : الرسالۃ، طبع (مع شرح) از زکریا الانصاری و العروسی، بولاق ۱۹۲۰ء، ۲ : ۹۷ ببعد ۔ الهجویری : کشف المحجوب، مترجمۂ نکلسن، ص ۳۷۳، بمدد اشاریہ .

مآخذ : متن میں مذکور ہیں ۔ ان میں التھانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، ۲ : ۱۲۵۴ کا اضافہ کر لیا جائے .

[D. B. MACDONALD]

⊗ تعلیقہ : تصوف میں کشف یا مکاشفہ کے معنی ہیں رفع حجاب ۔ یہ ایک روحانی کیفیت ہے جس کا ادراک حواس ظاہر سے نہیں کیا جا سکتا (التھانوی : کشاف، بذیل مادّہ) اسے مشاہدہ بھی کہا جاتا ہے .

کشف کی چند اقسام یا مراتب ہیں : (۱) کشف نظری : جب سالک اپنے جذبۂ ارادت سے طبیعت سفلی سے حقیقت علّیین میں قدم رکھتا ہے اور اپنے باطن کو ریاضت کے ذریعے صاف کر لیتا ہے تو اس کی چشم باطن کھل جاتی ہے اور اس رفع حجاب کے مطابق، اس پر حقائق کے دروازے وا ہو جاتے ہیں ۔ یہ کشف نظری ہے؛ (۲) جب اس سے آگے بڑھ جاتا ہے اور نور دل اسے حاصل ہو جاتا ہے تو اسے کشف نوری کہا جاتا ہے؛ (۳) اس سے ترقی کرکے، کشف سِرّی کی منزل آتی ہے، اسے کشف الٰہی بھی کہتے ہیں ۔ یہاں آفرینش کے اسرار اور حکمت وجود کا پتا چلتا ہے؛ (۴) اس کے بعد آگے بڑھ کر بہشت و دوزخ اور دیگر عوالم کی حقیقت کھل جاتی ہے اسے مکاشفۂ روحانی کہا جاتا ہے؛ (۵) اس کے بعد مکاشفۂ خفی ۔ اس منزل میں عالم صفات خداوندی میں سالک کو راستہ ملتا ہے ۔ اسے مکاشفۂ صفاتی کہا جاتا ہے اور (۶) اخری منزل مکاشفۂ ذاتی کی جو بہت مشکل ہے (التھانوی : کشاف، بحوالۂ مجمع السلوک) .

کشف اللغات کے مطابق "مکاشفہ آنرا گویند کہ آشکارا شود ناسوت و ملکوت و جبروت و لاہوت، یعنی از نفس و دل و روح و سرّ واقف حال شود" (دیکھیے ایضاً) .

مکاشفہ (کشف) کو مداناۃ، المحاضرہ اور المشاہدہ بھی کہتے ہیں ۔ سب کے معنی ایک ہی ہیں، لیکن کشف کی اصطلاح عام و مکمل ہے (ابو نصر سرّاج : کتاب اللمع، قاہرہ ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۰ء، ص ۴۱۲) ۔ کشف کی جدید ترین تعبیرات کے لیے دیکھیے محمّد اقبال : *Reconstruction of Religious Thought in Islam*، باب اوّل و ببعد ۔ [سیّد عبداللہ نے لکھا] .

[ادارہ]

* **کَشْکُول** : (فارسی)، دھات، لکڑی یا ناریل کا بیضوی پیالہ (calabash = کچکول، تونبی) جسے ایک زنجیر سے باندھ کر شانے پر لٹکا لیا جاتا ہے اور جس میں خیرات یا کھانے کے لیے جو کچھ ملتا ہے، ڈال لیا جاتا ہے ۔ اس لفظ کے اشتقاق کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ عام طور پر ایرانی اس کی یوں

توجیہ کریں گے : کش = کشیدن بمعنی کھینچنا سے (صیغۂ امر) اور کول بمعنی "شانہ"، یعنی وہ شے جسے انسان کندھے پر ڈال کر اٹھاتا ہے"، لیکن اس کی ایک اور صورت خچکول بھی ہے جس کی تصدیق شعرائے متقدمین (انوری، سیف اسفرنگی) سے بھی ہوتی ہے، لہٰذا اولین تشریح کو قبول کرنا مشکل ہے ۔ لغات میں اس کے اصل معنی "گداگر" اور ثانوی مفہوم "گداگر کا پیالہ" لکھے گئے ہیں ۔ ہم نہیں کہ سکتے کہ یہ معنی درست ہیں یا غلط ۔

ادب میں کشکول کے معنی بیاض کے ہیں، یعنی مختلف ادب پاروں کا مجموعہ جو مختلف مآخذ سے جمع کیے جائیں؛ چنانچہ اس لفظ کا اطلاق بالخصوص بہاء الدّین العاملی کی کتاب الکشکول پر ہوتا ہے ۔

مآخذ : (۱) فرہنگ رشیدی، بذیل مادّۂ خچکول؛ (۲) برہان قاطع، بذیل مادّۂ کشکول؛ (۳) Rev. R. du Mans : *Estat de la Perse 1660*، طبع Schefer، ص ۲۱۲؛ (۴) Ricaut : *Present State of the Ottoman Empire*، ۲ : ۷، تصویر، باب ۷ : ....؛ (۵) Lane : *Manners and Customs of Modern Egyptians*، بار اول، ۱ : ۳۳۷؛ (۶) A. von Kremer : *Topographie von Damascus*، ۲ : ۴؛ (۷) E. G. Browne : *A Year amongst the Persians*، ص ۵۲ .

(CL. HUART)

* **کِشم** : (۱) خلیج فارس میں بندر عباس کے بالمقابل ایک لمبوترا سا جزیرہ، جو بسبب اپنی شکل و صورت کے طویلہ کے نام سے بھی مشہور ہے ۔ یہ ساحل لارستان سے پرے اس مقام پر واقع ہے جہاں سے آبنائے ہرمز شروع ہوتی ہے ۔ اس کا طول ۷۷ میل کے قریب ہے ۔ اسے ایک اور آبنائے، جسے آبنائے کلیرنس (Clarence) کہتے ہیں، براعظم سے جدا کرتی ہے ۔ اس آبنائے کا عرض مختلف مقامات پر ایک سے سات میل تک ہے ۔ یہ جزیرہ پتھریلی اور کھڑیا مٹی کی پہاڑیوں سے بنا ہے؛ چنانچہ مغرب میں کھڑیا مٹی کی چٹانوں سے ایک بلندی سی قائم ہو گئی ہے اور کوہ کشم کے نام سے مشہور ہے ۔ کشم میں نباتات کی کمی ہے، البتہ گندھک اور نمک کی کانیں موجود ہیں ۔ آبادی عربی النسل ہے اور [اس صدی کے اوائل میں] ۱۵ ہزار باشندوں پر مشتمل تھی ۔ ۱۸۸۴ء میں کشم ایک زلزلے سے تباہ ہو گیا تھا ۔ لوگوں کا پیشہ زیادہ تر مونگا اور موتی نکالنا ہے ۔ الادریسی (در ابو الفدا : تقویم البلدان، طبع رینو (Reinaud)، ص ۳۷۳) نے کشم کے قریب سمندر کے ایک بہت بڑے بھنور کا ذکر کیا ہے ۔ کشم دراصل اس جزیرے کے صدر مقام کا نام ہے ۔ یہ ... ۵ آبادی کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جو اس کے مشرقی کنارے پر واقع ہے ۔ یہاں ایک قدیم پرتگالی بندرگاہ بھی اب تک موجود ہے ۔ ازمنۂ وسطٰی میں یہ جزیرہ یکے بعد دیگرے حسب ذیل مختلف ناموں سے مشہور رہا : جزیرۂ بنو کاوان (الاصطخری، ص ۱۰۷)؛ برکاوان (ابن حوقل، ص ۱۸۳)؛ ابن کَوان، ابرکافان، ابرکاوان (البلاذری، ص ۳۸۶)؛ لافت (الاصطخری، ص ۳۲، س ۱۸؛ یاقوت، ۴ : ۳۴۱)، اس مقام کے نام پر، جو آج بھی شمالی جانب واقع ہے ۔ انگریزوں نے باسیدو کے مقام میں باسیڈور (Bassadore) نام کارخانہ قائم کیا تھا، لیکن اسے انھوں نے بہت جلد چھوڑ دیا ۔ دوسرے قابل ذکر مقامات کُرنَ اور سوکُسہ ہیں ۔

(۲) پچھلے زمانے میں اسی نام کا ایک شہر دریائے جیحون کے بالائی طاس میں واقع تھا، جو ایک قلیل مدت کے لیے طُخارستان کے والی یبغو قبضے میں رہا (الطبری : تاریخ، ۲ : ۱۵۹۰، س ۱۰)۔ ہیون سانگ نے اس کا ذکر کیت لیت سیت مو کے نام

سے کیا ہے، جو ایک فرضی سنسکرت نام کُرشَم کا مترادف ہے، یہ کشم ہوہ (Hwoh) کے مشرق میں چار روز کی مسافت پر واقع تھا۔ یول (Yule) کا خیال ہے کہ یہ نواح قندز کا وہی مقام ہے جسے وَرْوالِیز کہتے ہیں (*Erānšahr* : Marquart، ص ۲۰ و ۲۳۱)۔

مآخذ: (۱) ابن حوقل، در *BGA*، ۲ : ۳۸؛ (۲) حَمْدُاللہ اُلْمَستوفی: نزهة اُلْقُلوب، طبع براؤن، ص ۱۳۷، ۱۸۶؛ ۲۳۴ (۳) Pietro della valle : *Voyages*، فرانسیسی ترجمہ (۱۷۴۵ء)، ۵ : ۳۸۳ و ۶ : ۲۳۰ ببعد (کِسم)؛ (۴) L. Pelly : *Visit to Lingah*، در *JRGS*، ۱۸۶۵ء، ۳۴ : ۲۵۱ (مع نقشہ)؛ (۵) Dubeux : *Perse*، ص ۵۵؛ (۶) De Bruyn : *Voyages*، ص ۳۲۲؛.

(CL. HUART)

* **کَشْمِیر:** (۱) کشمیر کا نام (عربی تصانیف میں قشمیر بھی) زمانۂ قدیم کی اس وادی کے نام کے طور پر مستعمل رہا ہے جو شمال مغربی ہمالیہ میں ۳۳ درجے ۲۰ دقیقے اور ۳۴ درجے ۵۴ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۴ درجے اور ۷۵ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرق کے مابین واقع ہے۔ اس وادی کی لمبائی شمال مغرب سے جنوب مشرق کی جانب تقریباً ۸۴ میل ہے اور چوڑائی شمال مشرق سے جنوب مغرب کی سمت ۲۰ سے ۲۵ میل تک؛ رقبہ کم و بیش ۸۵۳۹ مربع میل ہے۔ اسے جموں، راجوڑی اور پونچھ کی بیرونی پہاڑیوں سے پیر پنجال کا بلند سلسلۂ کوہ جدا کرتا ہے، جس کی کئی چوٹیاں ۱۵۰۰۰ فٹ سے زائد بلند ہیں۔ شمال مغرب کی جانب جو پہاڑی سلسلے وادی سے قریب ترین ہیں وہ اس سے بھی زیادہ بلند ہیں؛ ان کی بڑی بڑی چوٹیاں گوش براری (۱۷۸۰۰ فٹ)، امر ناتھ (۱۷۳۲۱ فٹ) اور ہر مکھ (۱۶۹۰۳ فٹ) ہیں۔ ان سے پرے ایک وسیع پہاڑی علاقہ ہے، جسے چند دشوار گزار درے اس وادی کو لداخ، بالائی وادی سندھ، اور وسطی ایشیا سے ملاتے ہیں۔ لداخ سے مواصلات کا بڑا ذریعہ درّہ زاجی (۱۱۳۰۰ فٹ) ہے اور استور اور سکردو سے درّہ برزیل (۱۳۵۰۰ فٹ)۔ پنجاب (پاکستان) کے میدانوں سے ملانے والا سب سے براہ راست راستہ وہ ہے جو درّہ بھمبر سے ہوتا ہوا پیر پنجال (۱۱۴۰۰ فٹ) پر سے گزرتا ہے، لیکن سب سے آسان اور سال بھر کھلا رہنے والا راستہ بارہ مولا [وراہا مولا کا جدید نام] کا ہے جہاں سے دریاے جہلم یا بیہت وادی سے نکل کر میدان میں داخل ہوتا ہے۔ کشمیر تک پہنچنے کا آسان ترین راستہ وہ عمدہ سڑک تھی جو [تقسیم ملک سے پہلے] راولپنڈی سے مری ہوتی ہوئی دریاے جہلم کی وادی کے ساتھ ساتھ چلی جاتی تھی۔ دوسرا راستہ ایبٹ آباد کا ہے، جو اس سڑک سے مظفرآباد (یعنی کشن گنگا [=نیلم] اور جہلم کے مقام اتصال) پر مل جاتا ہے اور اس پر قدرتی سہولتیں زیادہ ملتی ہیں؛ شروع زمانے میں یہی راستہ سب سے زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ برصغیر کے شمال مغربی کونے میں واقع اس الگ تھلگ وادی کی جغرافیائی اور طبقات الارضی کیفیت Drew، Lydekker اور Oestreich نے مفصل بیان کر دی ہے اور تاریخی جغرافیے کی وضاحت Cunningham اور Steain نے کی ہے۔

یہ وادی سطح سمندر سے پانچ سے چھے ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کی سطح کم و بیش ہموار اور زمین بہت زرخیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے قدیم زمانے ہی سے خوشحالی حاصل رہی ہے۔ یہ وادی اپنی دور افتادگی اور دشوارگزار راستوں کے باعث شمالی ہند پر ہونے والے متعدد حملوں سے محفوظ رہی۔ کشمیر کے باشندے جسمانی طور پر اچھے ہوتے ہیں، [تاہم بعض

سیاحوں اور مصنفوں نے ان کی مذمت کی ہے؛ لیکن یہ سیاح اور مصنف اس امر کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ یہ لوگ مسلسل جبر و تشدد کا شکار رہے ہیں ۔ اس کے باوجود اس قوم نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اتنی صدیوں تک برابر جد و جہد کی ہے، جو اب بھی جاری ہے ۔ اس سے الٹا اس قوم کی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا پتا چلتا ہے ۔ کشمیر کے توانا اور مضبوط پٹھوں والے پہلوان اکھاڑوں میں ہمیشہ اپنے مدِّ مقابل کے لیے خطرے کا موجب رہے ہیں ۔ حسن جسمانی کے لحاظ سے بھی کشمیری مشہور ہیں ۔ تعلیم یافتہ کشمیری اپنی ذہانت، تہذیب و شائستگی اور دیگر صفات کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں ۔ ان میں ممتاز قانون دان، ماہرین سیاست، مدبّر اور اعلٰی درجے کے مفکّر اور شاعر پیدا ہوتے رہے ہیں اور پھر کشمیری دستکاروں کی شال بافی اور اخروٹ کی لکڑی کا کام اپنی خوبصورتی، نزاکت اور پائداری کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے] ۔

اگرچہ بہت زیادہ قدیم زمانے سے متعلق ہماری تاریخی معلومات کچھ زیادہ نہیں، تاہم گزشتہ دو ہزار سال کی تاریخ کشمیر کے بارے میں غیر معمولی طور پر اچھے ذرائع معلومات موجود ہیں ۔ ان میں سب سے بڑا ذریعہ کلہن Kalhana کی راج ترنگنی ہے ۔ یہ منظوم وقائع نامہ بارھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے اور Stein کی طبع و ترجمہ و حواشی کی بدولت ہمارا سب سے بڑا مأخذ ہے ۔ دیگر مأخذ میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں : چینی سیاح ہوانگ چوانگ (= ہیون سانگ)، جو ساتویں صدی عیسوی [۶۳۱ تا ۶۳۳ء] میں کشمیر آیا تھا؛ البیرونی [رک بآں] کی گیارھویں صدی عیسوی کی تصنیف تحقیق ماللہند؛ ابو الفضل کی آئین اکبری؛ شہنشاہ جہانگیر کی توزک؛ زمانۂ حال کے کئی ایک سیاحوں کے بیانات، مثلاً فرانسیسی طبیب برنیر Bernier کا سفر نامہ، جو شہنشاہ اورنگ زیب [رک بہ محی الدّین عالمگیر] کے ہمراہ وادی کشمیر میں آیا تھا، اہم معلومات پر مشتمل ہے ۔ ان کے علاوہ سکّوں کا ایک بہت مکمل سلسلہ موجود ہے، جن سے کشمیر کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، یعنی چھٹی صدی عیسوی سے لے کر موجودہ زمانے کی تاریخ کشمیر پر، جس میں سفید ہنوں Ephthalites، ہندو راجاؤں، مسلمان سلاطین، مغل شہنشاہوں، دُرّانی افغانوں اور سکھوں کے ادوار کے علاوہ برطانوی عہد میں جموں کے ہندو ڈوگرا حکمرانوں کا دور اقتدار بھی شامل ہے ۔

کشمیر کی تاریخ کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ وادی بڑے بڑے تاریخی فاتحوں سے محفوظ رہی ۔ اسکندر نے اسے چھوا تک نہیں، محمود غزنوی نے حملہ تو کیا، لیکن اسے پسپا کر دیا گیا ۔ چنگیز خاں [رک بآں] اور تیمور اس کے پاس سے گزر گئے اور بابر [رک بآں] نے بھی یہی کیا، لیکن جب اکبر نے تمام شمالی ہندوستان میں اپنی طاقت کو مستحکم کر لیا تو کشمیر آسانی سے اس کے قبضے میں آ گیا ۔ مغلوں کے بعد نادرشاہ نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، یعنی اس وقت بھی جب مغلیہ اقتدار اس کے حملوں کی وجہ سے درہم برہم ہو گیا تھا ۔ بہرحال یہ غیر منظم ملک احمد شاہ درانی کے حملوں کے سامنے فوراً سرنگوں ہو گیا، لیکن آگے چل کر درانیوں میں پھوٹ پڑ گئی اور سکھوں نے آسانی سے یہاں قبضہ جما لیا ۔

بطلمیوس سے قبل قدیم مأخذ میں کشمیر کے متعلق معلومات نہیں ملتیں کیونکہ سکندر اعظم کے یونانی مؤرخین نے اس کا ذکر تک نہیں کیا ۔ بطلمیوس (دوسری صدی عیسوی کے وسط میں) اسے ایک بہت زبردست ریاست بتاتا ہے، جو وادی کی

حدود سے بہت آگے تک پھیلی ہوئی تھی ۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں یہ کشان خاندان کی عظیم سلطنت کا ایک حصہ ہوگا جو پورے شمالی ہندوستان پر قائم تھی ۔ بطلیوس اسے کسپیریا Kaspeiria کہتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ یہ بِدَسپس Bidaspos ، سَنْدابَل Sandabal اور اَدْرِس Adris، یعنی وتستا (=ویہت، بیہت یا جہلم)، چندر بھاگ (=چناب) اور ایراوتی (=راوی) کے منبعوں کے نیچے واقع ہے اور یہ بیان صحیح ہے ۔

اگرچہ اس زمانے سے پہلے کی کوئی معاصر معلومات موجود نہیں، تاہم یہ باور کرنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ تقریباً ۲۵۰ ق ۔ م میں کشمیر اشوک کے مقبوضات میں شامل تھا ۔ جب چندر گپت نے سلیوکس کو شکست دی تو موریا خاندان کی حدود حکومت شمال کی جانب پھیل گئیں ۔ بدھ مت کی اشاعت اس علاقے میں دور دور تک ہو چکی تھی، چنانچہ جب اشوک نے یہ مذہب قبول کر لیا تو اسے کشمیر میں اپنے اثر و رسوخ کو وسعت دینے میں آسانی ہوگئی ۔ اس کے فرامین کا کوئی کتبہ کشمیر میں نہیں ملا، لیکن مانسہرہ کا کتبہ اس راستے کے قریب ہی واقع ہے جو پکھلی کے میدان میں سے ہوتا ہوا بارہ مولا کو جاتا ہے؛ یہ میدان ارسا (ہزارہ) میں شامل تھا ۔ اور ہیون سانگ کا بیان ہے کہ اشوک نے وادی میں چار ستوپے تعمیر کرائے تھے ۔

اس کی تصدیق راج ترنگنی (۱ : ۱۰۳) سے بھی ہوتی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ روایت کلہن پنڈت کے زمانے میں بھی موجود تھی ۔ اس میں اشوک کو ایک ایسا بادشاہ بتایا گیا ہے جس نے متعدد ستوپے تعمیر کیے تھے اور شہر سری نگری کی بنا ڈالی تھی۔ اس شہر کے حقیقی محلّ وقوع کی نشاندہی پاندریتھن (یعنی پرانا دھستھانہ = قدیم دارالسلطنت) کے مندر سے ہوتی ہے، جو سری نگر سے تین میل کے فاصلے پر ہے ۔ علاوہ بریں اسی تاریخ میں ایک حقیقی روایت مندرج ہے جو کنشکا، جشکا اور ہشکا نامی بادشاہوں تک پہنچتی ہے؛ یہ کشان بادشاہوں کَنِشک، واسِشک اور ہُوشک سے قریبی مطابقت رکھتے ہیں، جن کا ذکر سکّوں اور کتبوں میں آتا ہے ۔ ہمیں چینی اور دیگر بدھ ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ کنشک نے کشمیر میں بدھ مت کی دوسری بڑی مجلس مشاورت منعقد کی تھی اور اگر بدھ روایت صحیح ہے تو عین اغلب ہے کہ یہ اجتماع بدھ کی وفات کے ۴۰۰ سال بعد، یعنی پہلی صدی ق ۔ م کے نصف آخر میں عمل میں آیا ہوگا ۔ اگر وہ نظریہ صحیح بھی ثابت ہو جائے جس کی رو سے کنشک کا زمانہ اور ساکا عہد ایک ہی بتایا جاتا ہے تو بھی اس مجلس مشاورت کی تاریخ پہلی صدی سے بعد کی نہیں ہو سکتی ۔ عظیم کشان سلطنت کے زوال کے بعد یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر اس کشان خاندان کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے ماتحت رہا ہوگا، جنھیں چھٹی صدی عیسوی کے شروع میں سفید ھنوں نے ختم کر دیا ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے ابتدائی عہد میں کشمیر یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور نام برابر مستعمل رہا ۔ Stein نے ثابت کیا ہے کہ بطلیوس کا کَسْپِیریا (Kaspeiria) ایک پراکرت لفظ کَسْویرا (Kasvira) کے مطابق ہے، جو اس کے جدید کشمیری نام کَشِیر (Kashir) میں محفوظ ہے، جب کہ اس کی قدیم تر سنسکرت شکل کَشْمِیر (Kasmira) تقریباً بغیر کسی رد و بدل کے اس ملک کے نام کے طور پر برصغیر اور ایران میں باقی رہ گئی ہے ۔ کشمیر کے نام کا ایک فرضی کسیاپا پورہ (Kasyapa-pura) سے اشتقاق، جو وِلْسن اور لَیسن نے تجویز کیا ہے، اب عام طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا ۔ نیز ہیروڈوٹوس

کے Kaspatyros سے مراد یقینًا کشمیر نہیں ہے بلکہ دریاے سندھ کے کنارے کا کوئی مقام ہے۔ وہ اسے Paktyikē کے صوبے میں بتاتا ہے، جو ضرور وہی ہوگا جو بعد ازاں پکھلی کہلانے لگا، یعنی وہ پہاڑی علاقہ جو دریاے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع ہے اور جس کے نام پر مغل شہنشاہ اکبر کے عہد میں ایک سرکار موسوم تھی۔ Hekataios بھی گندھارا کے ایک شہر Kaspapyros نامی کا ذکر کرتا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں چینی زائرین نے کشمیر کا نام کِپُوئی Kipūi رکھ لیا تھا، لیکن ہیون سانگ ایک اور شکل کاسی مِیلو Ka-si-mi-lo بھی استعمال کرتا ہے۔

کشمیر پر سفید ھُنوں (Ephthalites) کا قبضہ بظاہر ہندوستان پر براہ راست حملے کا ایک حصہ نہ تھا، جو مغرب کی طرف سے ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بادشاہ مہرگل Mihiragula ۵۳۰ء میں ساکلہ (سیالکوٹ) میں رہتا تھا۔ چینی زائر سُونگ یون کے سامنے اسی زمانے میں اس نے کشمیر پر چڑھائی کی تھی۔ مہرگل کو اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی، یہ واضح نہیں، لیکن ۵۲۸ء میں وسطی ہندوستان میں اپنی شکست کے بعد وہ بظاہر کشمیر چلا گیا اور رفتہ رفتہ اس ملک پر قابض بھی ہو گیا۔ یہیں سے اس نے اپنے بھائی پر حملہ کیا، جس نے گندھارا میں اس کے تخت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسے شکست دینے والا یشو دھرمن کشمیر میں بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا اور وہاں اس نے سکے ضرب کیے؛ لیکن مہرگل بظاہر بدستور کشمیر پر قابض رہا کیونکہ کشمیری طرز کے سکّے اس کے جانشینوں کھنگل اور تورمان کے نام کے بھی ملتے ہیں۔ ہیون سانگ نے، جو آئندہ صدی کے آغاز میں کشمیر آیا تھا، لکھا ہے کہ مہرگل ایک ظالم بادشاہ تھا اور بدھوں پر بہت سختی کرتا تھا۔ اس وقت کے بادشاہ نے اس سیاح کا اچھی طرح استقبال تو کیا، لیکن اس نے اس کا نام نہیں بتایا؛ تاہم ممکن ہے کہ وہ دُرلبھ ہو، جس نے کارکوٹہ خاندان کی بنا رکھی تھی۔ اس نے وہاں ایک سو بدھ خانقاہیں دیکھیں، جو اس وقت تک موجود تھیں۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد قنوج [رکَ بان] کے بادشاہ ھرش نے کشمیر سے بدھ کے دانت کی متبرک یادگار حاصل کر لی، لیکن اس نے اس ملک پر حملہ نہیں کیا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے دوران میں چین سے گہرے تعلقات رہے؛ چنانچہ ۷۱۳ء میں چین سے ایک سفارت آئی۔ ۷۲۰ء کے بعد سے کشمیر کے بادشاہوں کو چینی حکمرانوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ چین سے آخری سفارت، جس کا ذکر آتا ہے، ۷۵۹ء میں آئی تھی۔ اس وقت کشمیر میں کارکوٹہ خاندان کی حکومت تھی۔ ۷۱۳ء کی یہ سفارت بظاہر راجا چندر پیڈ (بجردت) کی درخواست پر بھیجی گئی تھی، جس نے عربوں کے خلاف، جو اب پہلی بار منظر عام پر آئے تھے، مدد مانگی تھی۔ محمّد بن قاسم نے سندھ کی فتح کے بعد کوہ ھمالیہ کے دامن تک پیش قدمی کی، لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھا۔ کشمیر کے باقاعدہ سکّے، جو متأخر کُشان بادشاہوں کے سکّوں کی نقل تھے (اگرچہ ان کے نقوش بتدریج بگڑتے گئے)، کارکوٹہ خاندان سے شروع ہوتے ہیں، جو چودھویں صدی میں ہندو حکمرانوں پر مسلمان بادشاہوں کے غلبہ پانے کے زمانے تک جاری رہے۔ اس قوم کے قدیم تر بادشاہوں کے قبضے میں کشمیر کی حدود سے بہت آگے تک کے علاقے بھی تھے، جن میں پکھلی، پونچھ، راج پوری، ٹیکسلا اور کوھستان نمک شامل تھے۔

غالبًا اسی زمانے سے کشمیری اسلوب تعمیر کی توسیع بھی منسوب کی جا سکتی ہے، جو تقریبًا

غیر متغیر شکل میں کوھستان لمک کے قدیم مندروں میں نمایاں ہے جیسا کہ ہمیں ھیوں سالگ کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔ کشمیر میں ھندو مت اور بدھ مت ساتھ ساتھ پھیلتے رہے۔ بارھویں صدی عیسوی تک بھی، جب پنڈت کلہن نے اپنی کتاب لکھی، یہی صورت قائم رہی اور غالبًا ھندو مندروں کے لیے جو طرز تعمیر مروّج تھی، وہ بعینہٖ وھی تھی جو بدھ وھاروں (خانقاھوں) کی تھی۔ Foucher (*L' Art Greco - Bouddhique*، ص ۱۳۶ تا ۱۴۵) نے اس کی ابتدا پہلی اور دوسری صدی عیسوی کے گندھارا فن عمارت میں ثابت کی ہے۔ ایک دہری مخروطی شکل کی چھت اس کی نمایاں خصوصیت ہے، جو آج تک کشمیر کی مسلم مساجد میں برقرار چلی آتی ہے؛ چنانچہ سری نگر میں شاہ ھمدان کی مسجد میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔

پنڈت کلہن کی تاریخ میں اس عہد کا جو بیان ہے، اس میں گندھارا شاھیوں کا ذکر آنا شروع ہوتا ہے اور (جیسا کہ چین میں ھوا) بظاھر اسلام کی توسیع ھی گندھارا اور کشمیر کے مابین اتحاد کا باعث بنی۔ [مسلمانوں کو] سندھ میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے علاوہ کابل کی سمت میں بھی گندھارا کی حدود پر حملے ہو رہے تھے۔ الطبری کا کہنا ہے کہ ۴۳ھ ہی میں عاصم بن عمرو قندھار (گندھارا) اور ھندوستانی سرحد تک پہنچ گیا تھا اور المنصور کے عہد (۱۳۶ھ/۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ/۷۷۵ء) میں بقول البلاذری ھشام بن عمرو التغلبی، حاکم سندھ، نے کشمیر اور ملتان کو فتح کر لیا؛ پھر وہ قندھار آیا اور اسے بھی سر کیا۔ الیعقوبی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ کشمیر کے وہ علاقے جو اس طرح مفتوح ہوے، بلا شبہہ ملک کے دور افتادہ حصے تھے۔ یہ سندھ اور جہلم دریاؤں کے درمیان واقع تھے، نہ کہ خود وادی کشمیر۔ اس کی حیثیت ایک حملے سے زیادہ نہ تھی، جس کا کشمیر پر کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔ وہاں چند صدیوں تک ھندو راجا امن و چین سے حکومت کرتے رہے۔ ان ھندو حکمرانوں میں سب سے زیادہ قابل ذکر اَوَنتی وَرمن (۸۵۵ تا ۸۸۳ء) تھا جس نے اونتی پور کی بنیاد رکھی، جہاں ابھی تک اس کے مندروں کے شکستہ آثار پائے جاتے ہیں۔ اس نے دریاے جہلم کے سیلابی پانیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے بڑے پیمانے پر کئی اقدامات کیے۔ اس کے بیٹے کے زمانے میں "شاھیوں" سے اتحاد کا ذکر آتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعلق اور گہرا ہوتا گیا۔ گوپال ورمن (۹۰۲ تا ۹۰۴ء) نے تورمان یا کَملوکا کی (جسے البیرونی نے "کملوا" لکھا ہے) ایک باغی سے اپنا دارالسلطنت واپس لینے میں مدد کی اور کھیم گپت (۹۵۰ تا ۹۵۸ء) نے کملوکا کے جانشین بھیم کی نواسی دِدّا سے شادی کر لی۔ دِدّا کئی حکمرانوں کے عہد میں بڑے اثر و رسوخ کی مالک رہی اور آخر کار ملکہ بن گئی۔ وہ پونچھ کے "لوھر" حکمران خاندان سے تھی اور اسی کے زیر اثر یہ خاندان کشمیر کا حکمران بنا۔ ۴۰۴ھ/۱۰۱۳ء میں محمود غزنوی نے "شاھی" خاندان کو ختم کر دیا۔ اس کے آخری حکمران ترلوچن پال کو، جس کی مدد کشمیر کا ایک فوجی دستہ کر رہا تھا، شکست ہوئی اور وہ فرار ہو گیا، لیکن محمود کی خود کشمیر میں داخل ہونے کی کوشش "لوھر" کے پہاڑی قلعے تک پہنچ کر رک گئی، جسے البیرونی نے لاھور لکھا ہے اور کہا ہے کہ ایسا مستحکم مقام اس نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ شاھی سلطنت کی تباھی کے بعد بھی اس خاندان کے شہزادے کشمیر کے معاملات پر اثر انداز ہوتے رہے۔ لوھر خاندان غزنوی عہد کے دوران میں برابر حکمران رہا۔ بقول کلہن، نیم پاگل راجا ھرش دیو

(۱۰۸۹ تا ۱۱۰۱ء) مسلمانوں کے زیر اثر تھا۔ اس نے ترک سپاہیوں کو ملازم رکھا اور ہندو اور بدھ مورتیوں کو تباہ کر دیا۔ تُرُشکَ یا ترک سپاہیوں کو ملازم رکھنے کا سبب ایک حد تک کشمیریوں کی نااہلی بتائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں بد نظمی کے باعث ملک بار بار کی سازشوں اور بغاوتوں سے پریشان حال رہا اور ممکن ہے کہ غیر ملکی سپاہیوں کے استعمال کا ایک یہ بھی سبب ہو۔ پنڈت کلہن کی تاریخ ۱۱۴۹ء پر ختم ہو جاتی ہے اور جونراج نے اس کا جو تتمہ لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالات بد تر ہوتے گئے تھے، نیز یہ کہ بتدریج تبلیغ اسلام بھی جاری تھی۔ زولچو [آآ، لائیڈن میں اس کا نام ذوالقدر خان غلط بتایا گیا ہے۔ وہ مسلمان نہیں تھا، دیکھیے محب الحسن: کشمیر سلاطین کے عہد میں، ص ۴۸ تا ۴۹] کی سرکردگی میں شمال کی جانب سے ۷۰۶ھ/۱۳۰۵ء میں تاتاریوں کا حملہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں لوٹ مار کرنے کے بعد یہ فوج واپس جاتے ہوئے برفباری کی وجہ سے تباہ ہو گئی۔ اس واقعے سے شاید بعد میں آنے والے ایک مسلمان قسمت آزما شاہ میرسواتی (غالبًا ایک افغان) کے لیے راستہ سہل ہو گیا جس نے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا اور ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء میں سلطان شمس الدّین اوّل کے لقب سے ایک مسلمان خاندان "شاہ میری" کی بنا رکھی۔ بظاہر اس تبدیلی کو کشمیریوں کی اکثرت نے قبول کر لیا۔ ہندوؤں سے، جو زیادہ تر برھمن تھے، اور جنھوں نے اپنا مذہب برقرار رکھا تھا، رواداری کا سلوک کیا جاتا تھا، اور وہ بدستور سرکاری ملازمتوں پر متعین رہے۔ سکندر شاہ کے عہد (۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء تا ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء) میں [بادشاہوں کی مذہبی حکمت عملی میں] ایک تبدیلی رونما ہوئی اور کچھ مندروں کو بھی نقصان پہنچایا [غلام محی الدّین صوفی انگریزی میں اپنی محققانہ تاریخ *Kashir* میں لکھتا ہے کہ یہ تقریباً سب کچھ پرجوش نو مسلم کشمیریوں نے کیا]۔ سکندر شاہ تو خورد سال تھا اسے بت شکن کے نام سے یاد کرنا غلط ہے، البتہ اس کے میر لشکر اور وزیر اعلٰی ملک سیف الدّین (سابق بودی بٹ) پر، جو نو مسلم تھا، کچھ ذمّے داری عائد ہوتی ہے۔ زین العابدین نے (۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء تا ۸۷۴ھ/۱۴۷۰ء) روا داری کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ ہر لحاظ سے نہایت اچھا بادشاہ تھا، اس کے عہد حکومت میں عدل و انصاف کا دور دورہ تھا۔ اس عہد کو کشمیر کے ہر طبقے کے لوگ سنہرے دور کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں، اس نے سڑکیں، نہریں اور پل تعمیر کرائے اور ہر طریقے سے ملک کی خوش حالی کو فروغ دیا۔ اس کے جانشینوں کے عہد میں پھر بدنظمی پھیل گئی۔ شیعہ چکوں نے، جو بقول لارنس غالبًا دَرْدِسْتان سے آئے تھے، بڑا اثر و اقتدار حاصل کر لیا اور آخر کار جائز اور حق دار خاندان کے متأخر حکمرانوں کی جگہ لے لی۔ غازی خان چک اگرچہ بادشاہ تو نہیں کہلایا لیکن دراصل وہ مطلق العنان فرمانروا ہی تھا؛ تاہم حسین شاہ، محمّد علی اور یوسف نے، جیسا کہ ان کے سکّوں سے ظاہر ہوتا ہے، مغول شہنشاہوں کے مقابلے میں بجائے سلطان کے، جو ان سے پہلے کے حکمران استعمال کرتے تھے، بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔

جب بابر نے شمالی ہندوستان کو فتح کر لیا تو مغول شہنشاہوں کی توجہ کشمیر کی جانب مبذول ہو گئی، جس میں ایک ایسی قوم کے لیے بڑی کشش موجود تھی جو سرد آب و ہوا، رواں نہروں اور باغوں سے مالوس تھی۔ خود بابر نے کشمیر میں ایک مختصر سی مہم بھیجی، جیسے کوئی

کامیابی نہ ہوئی ۔ ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں، یعنی اس سال جب ھمایوں کو شیر شاہ کی بغاوت کی وجہ سے اقتدار سے محروم ہونا پڑا، اس کے چچا زاد بھائی حیدر میرزا دوغلات نے، جو کاشغر کے حکمران خاندان سے تھا [رک به دوغلات] اور بہت قابل شخص اور مؤرخ تھا [رک به حیدر میرزا]، ھمایوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ کشمیر پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے اور اس طرح اپنے دشمنوں سے ایک محفوظ جائے پناہ حاصل کر لے، لیکن ھمایوں اس منصوبے پر عمل نہ کر سکا ۔ تاھم حیدر میرزا نے اپنی مہم جاری رکھی اور چونکہ اسے خاصی مقامی امداد حاصل ہو گئی، وہ ھمایوں کے نام پر کشمیر میں مغلیہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ ۹۵۸ھ/ ۱۵۵۱ء تک اس کی حکومت برقرار رھی، لیکن اسی سال وہ ایک بغاوت کے دوران میں شہید ہوگیا ۔ اس بغاوت کی تنظیم غالبًا سوری بادشاھوں نے کی تھی، کیونکہ اسلام شاہ سوری کا ایک سکّہ، جو کشمیر میں ۹۵۷ھ میں مضروب ہوا تھا، ھمارے علم میں ہے ۔ بعد ازاں وادی میں چک حکومت کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ اکبر نے کشمیر پر حملہ کیا ۔ یوسف شاہ کے بیٹے یعقوب خان نے زبردست مزاحمت کی آخر ۹۹۵ھ/۱۵۸۶ء میں تمام مزاحمت ختم ہو گئی اور کشمیر مغل سلطنت کا ایک حصہ بن گیا، جس سے مغل شہنشاھوں کو ایک پسندیدہ سیرگاہ میسر آئی ۔

اکبر پہلی دفعہ بذات خود ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں براہ پیر پنجال کشمیر گیا اور دوسری دفعہ ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۲ء میں جب کہ اس کے ھمراہ نامور مؤرخ نظام الدّین مصنف طبقات اکبری بھی تھا ۔ وہ تیسری بار گیا تو اس نے اپنے وزیر مال ٹوڈر مل سے کشمیر کا بندوبست اراضی کرایا اور سری نگر کی پہاڑی کو قلعہ بند کیا، جس پر اب ھری پربت نامی قلعہ واقع ہے ۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں اکبر کے عہد میں کشمیر کی مفصل کیفیت لکھی ہے ۔ جہانگیر دورِ شہزادگی میں اپنے والد کے ساتھ کشمیر جایا کرتا تھا اور جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے اس ملک کی سیر و تفریح سے پورا پورا حظ اٹھایا ۔ اس نے کئی گرمائی محل تعمیر کرائے اور باغ لگوائے، جن میں سے نشاط باغ، جو ڈل کے کنارے واقع ہے، اچھی بل، جہاں دریائے جہلم کی ایک شاخ کے چشمے چٹانوں میں سے پھوٹتے ہیں اور ویری ناگ سب سے زیادہ مشہور ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی ملکہ نور جہاں کو خوش کرنے کے لیے اس کے وطن ایران سے چنار کے درخت منگوا کر لگوائے ۔ ان درختوں کے خوبصورت جھنڈ اور راستوں کے ساتھ ساتھ دو رویہ قطاریں اب تک کشمیر کے خوش نما مناظر میں شمار ہوتی ہیں ۔

اس کے جانشین شاہ جہاں نے متعدد باغ لگوائے ۔ اس کے عہد میں علی مردان خان نے پیر پنجال کے راستے پر سرائیں تعمیر کیں ۔ شاہجہان کے بیٹے دارا شکوہ [رک باں] نے ڈل کے اوپر پہاڑی کے پہلو میں پری محل بنوایا، جس کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں ۔ اورنگ زیب صرف ایک دفعہ کشمیر آیا ۔ وہاں کی تعمیر کردہ مسجدیں اب بھی موجود ہیں ۔ سلطنت کی شان و شوکت بدستور قائم رھی ۔ برنیئر نے، جو شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ یہاں آیا، کشمیر کا حال بڑے شگفتہ پیرائے میں بیان کیا ہے ۔

متأخر مغول شہنشاھوں کے عہد میں حکومت کا نظم و نسق خراب ہوگیا ۔ اگرچہ نادر شاہ نے کشمیر کا رخ تو نہیں کیا، مگر اس کے حملے نے افراتفری ضرور پیدا کر دی ۔ یہاں کے صوبیدار عملًا

خود مختار ہو گئے ۔ تقریباً ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ درّانی [رک بآں] نے اسے فتح کر لیا ۔ ۱۷۵۶ء میں اس نے بلند خان سدو زئی کو کشمیر کا صوبیدار مقرر کیا ۔ تاہم سکّے شہنشاہ عالمگیر ثانی کے نام پر ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء تک مضروب ہوتے رہے ۔ احمد شاہ کے پہلے کشمیری سکّے کی تاریخ ۱۱۷۶ھ ہے (۱۱۶۲ھ کا وہ سکّہ جس کا ذکر راجرز Rodgers نے کیا ہے، اسے وھائٹ ھیڈ White head نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مغل بادشاہ احمد شاہ کا ہے نہ کہ احمد شاہ درّانی کا) ۔

درّانیوں کے عہد میں، کشمیر کی حالت خراب رہی ۔ ان کے متعلق لوگوں نے کچھ اچھی رائے قائم نہیں کی ۔ مدعیانِ حکومت بالخصوص محمود شاہ اور شجاع الملک کے درمیان ہونے والی خانہ جنگیوں کا صحیح پرتو سکّوں میں دکھائی دیتا ہے ۔ ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء میں فتح خاں بارکزی نے پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ کی مدد سے کشمیر پر قبضہ کر لیا ۔ برائے نام بادشاہ تو محمود شاہ (اور بعد ازاں ایوب شاہ) رہا، لیکن حقیقی اقتدار بارک زئی سرداروں، بالخصوص محمّد اعظم شاہ کے ہاتھ میں تھا، جس نے غالباً محمّد (۱۲۲۷ تا ۱۲۳۲ھ) کے نام سے سکّے ضرب کرائے ۔ ۱۲۲۳ تا ۱۲۲۵ھ کے دوران میں جو بدنظمی پھیلی رہی، وہ اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس زمانے میں سکّے بجائے کسی برائے نام بادشاہ کے، ایک مقبول ولی اللہ نور الدّین کے نام سے جاری ہوتے رہے ۔ اس صورت حال کا خاتمہ یوں ہوا کہ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کیا اور اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا ۔ سکھوں کی حکومت سخت گیر اور تشدد آمیز تھی ۔ یہاں کے صوبیداروں میں سے ھری سنگھ اپنے جبر و استبداد کے لیے مشہور تھا، البتہ میاں سنگھ قدرے انصاف پسند حکمران گزرا ہے ۔ مُور کرافٹ Moorcroft سیاح اس زمانے میں کشمیر آیا اور اس نے سکھوں کے عہد میں لوگوں کی جو حالت بیان کی ہے، وہ کچھ اچھی نہیں ۔

رنجیت سنگھ کے زمانے میں جموں کے ایک ڈوگرا خاندان کے تین بھائیوں، دھیان سنگھ، گلاب سنگھ اور سچیت سنگھ نے نام پیدا کر لیا تھا ۔ یہ سکھ نہیں بلکہ سخت متعصب ہندو تھے ۔ ڈوگرے کشمیر کی ملحقہ پہاڑیوں کی ایک راجپوت قوم سے ہیں اور وادی کشمیر کے باشندے نہیں ۔ دھیان سنگھ کو سکھ ریاست کے ایک اعلٰی منصب پر فائز کر دیا گیا اور گلاب سنگھ کو جموں کا راج مل گیا، جو رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۰ء کے قریب ضبط کر لیا تھا ۔ گلاب سنگھ نے رنجیت سنگھ کے نام پر یکے بعد دیگرے کئی پہاڑی ریاستوں پر قبضہ کرکے کشمیر میں اپنی قوت اور اثر و رسوخ میں اضافہ کر لیا ۔ اس طریقے سے اس نے کشتوار اور لداخ کو سکھ مملکت میں شامل کر لیا ۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی وفات اور اس کے بعد رونما ہونے والے مناقشات کی وجہ سے دھیان سنگھ کچھ عرصے کے لیے بہت طاقتور ہو گیا اور اس کی مدد سے گلاب سنگھ کو پہاڑی علاقوں میں اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کا موقع مل گیا ۔ اجیت سنگھ سندھانوالیا کے ہاتھوں دھیان سنگھ اور مہاراجا شیر سنگھ کے قتل (۱۸۴۳ء) کے بعد گلاب سنگھ کچھ عرصے کے لیے اپنے پہاڑی مقبوضات میں چلا گیا؛ لیکن اس سے پہلے اسے ایک بغاوت کی سرکوبی کے لیے کشمیر بھیجا گیا، تھا جس میں حاکم کشمیر میاں سنگھ، مارا گیا تھا (۱۸۴۲ء) ۔ اس نے یہ کام کامیابی سے انجام دیا، لیکن ملک ایک دفعہ پھر طوائف الملوکی کا شکار

ہو چکا تھا اور باغی قبیلہ بمبا سکھ فوجوں کا مقابلہ کر رہا تھا ۔ ۱۸۴۵ء میں جب خالصہ فوج انگریزوں کے خلاف جنگ میں کود پڑی تو گلاب سنگھ نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ جنگ کے بعد نوجوان مہاراجا دلیپ سنگھ کے نمائندے کی حیثیت سے انگریزوں سے گفت و شنید میں شرکت کی ۔ [صلح نامۂ لاہور کی رو سے دوآبۂ بست جالندھر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا، سکھوں پر پندرہ لاکھ اشرفی تاوان لگایا گیا اور مہاراجا دلیپ سنگھ کی اتالیقی انگریز قائم مقام ہنری لارنس کو تفویض ہوئی ۔ خزانے میں تاوان کی رقم پانچ لاکھ اشرفی سے زیادہ نہ نکلی ۔ دس لاکھ اشرفیاں گلاب سنگھ نے دینے کا اقرار کیا اور معاوضے میں کشمیر کی ریاست حاصل کی] .

گلاب سنگھ کو اپنی نئی مملکت کا قبضہ امن و آشتی سے نہیں ملا ۔ حاکم کشمیر امام الدین نے بمبا قبیلے کی مدد سے گلاب سنگھ کی فوجوں کو شکست فاش دی ۔ اب اسے وادی کا قبضہ دلوانے کے لیے انگریزی فوج بھیجی گئی جو بالآخر کامیاب ہوئی ۔ گلاب سنگھ کی حکومت بحیثیت مجموعی مستحکم تھی [لیکن اس کے زمانے میں مسلمانوں کا سیاسی اور معاشی استحصال بری طرح کیا گیا ۔ ریاست کے تمام چھوٹے اور بڑے عہدے ڈوگرا خاندان یا کشمیری پنڈتوں کے پاس تھے ۔ مسلمان کاشتکاروں کے لیے مالیہ کی شرح ناقابل برداشت تھی ۔ مسلمانوں پر ظالمانہ ٹیکس لگائے جاتے تھے ۔ کرنل ٹورنیز لکھتا ہے کہ گلاب سنگھ اپنا خزانہ بھرنے میں بے حد لالچی تھا] ۔ ۱۸۵۷ء میں اس کی موت کے بعد اس کا تیسرا بیٹا رنبیر سنگھ اس کا جانشین ہوا ۔ [اس نے ٹیکسوں میں پہلے کی نسبت بہت اضافہ کر دیا جس کی وصولی بڑی سختی سے کی جاتی تھی] ۔ ۱۸۷۷ تا ۱۸۷۹ء کے قحط سے ملک میں بڑی تباہی آئی اور ۱۸۸۵ء کے زلزلے سے بڑا نقصان ہوا ۔ رنبیر سنگھ کا جانشین ۱۸۸۵ء میں اس کا سب سے بڑا بیٹا مہا راجا پرتاب سنگھ ہوا ۔ [اس کے زمانے میں بھی ڈوگرا راج کا مسلمانوں پر خصوصی عتاب بیگار یا جبری محنت کی صورت میں جاری رہا، جسے قانونی تحفظ حاصل تھا] ۔ قحط اور زلزلے کے بعد ۱۸۹۳ء میں تاریخ کشمیر کا ایک بدترین سیلاب آیا ۔ انگریزوں کے زیر اثر زمین کے لگان کے نظم و نسق کا طریقہ ۱۸۸۷ تا ۱۸۹۲ء کے بندوبست اراضی کے تحت کشمیر میں برطانوی ہند کے نمونے پر رائج ہوا ۔ ان قواعد میں بعد ازاں مزید اصلاح اور نشو و نما بھی ہوئی ، [لیکن اس سے مسلمانوں کی فلاکت زدگی میں کوئی فرق نہ آیا] ۔ ذرائع حمل و نقل بہتر ہو گئے ۔ وادی جہلم میں سے گزر کر بارہ مولا کے راستے سری نگر تک ایک عمدہ سڑک تعمیر ہوئی، جس پر انتظامی نقطۂ نظر سے کشمیر تین اضلاع ، یعنی جنوبی کشمیر، شمالی کشمیر اور مظفر آباد کے اضلاع میں منقسم تھا ۔ پہلے دو اضلاع وادی کشمیر اور ان چھوٹی چھوٹی دریائی وادیوں اور ان سے ملحقہ پہاڑی ڈھلانوں پر مشتمل تھے اور تیسرا بارہ مولا سے نیچے وادی جہلم اور وادی کشن گنگا پر مشتمل تھا ۔ [موجودہ وقت (ستمبر ۱۹۷۶ء) میں کشمیر کے دو حصے ہیں : آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر ۔ آزاد کشمیر شمالی اور مغربی حصے پر مشتمل ہے اور پاکستان کے زیر اقتدار ہے؛ مظفر آباد اس کا صدر مقام ہے ۔ مقبوضہ کشمیر بھارت کے قبضے میں ہے جس کے چار اضلاع ہیں اور صدر مقام سری نگر ۔ مزید تفصیلات کے لیے تعلیقہ دیکھیے] .

۱۹۱۱ء میں کشمیر کی آبادی ۱۲۹۵۲۰۱

تھی ۔ اس میں تقریباً ۹۴ فی صد مسلمان اور چھے فی صد ہندو تھے جن میں سکھوں کی ایک قلیل تعداد شامل تھی ۔ ہندو زیادہ تر برھمن تھے، جنھیں عام طور پر پنڈت کہتے ھیں، خواہ ان کا پیشہ کچھ ھی کیوں نہ ھو ۔ قدیم زراعت پیشہ باشندے سب کے سب مسلمان ھو گئے تھے ۔ غیر ملکی اقوام کی آمیزش بہت کم، بلکہ بالکل ھی نہیں ھوئی ۔ کشمیریوں میں قدیم ذاتیں ابھی تک باقی ھیں، لیکن آپس میں شادی بیاہ کی اجازت ھے اور خاندانی نام (کرام) جو ابتداءً القاب تھے، بڑی حد تک ذاتوں کے ناموں کی جگہ استعمال ھونے لگے ھیں ۔ [صوبۂ کشمیر میں کل آبادی ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق (جو متحدہ برصغیر کی آخری مردم شماری تھی) ۱۷۲۸۷۰۵ تھی، جن میں سے ۱۶۱۵۴۷۸ مسلمان تھے اور باقی تقریباً ۶۰۶ فی صد غیر مسلم تھے] ۔

کشمیریوں میں فنی صلاحیت اور کاریگری کا قدرتی مادّہ بافراط پایا جاتا ھے ۔ شال بافی کی قدیم صنعت، جس کے لیے کبھی کشمیر مشہور تھا، اب چھوٹے پیمانے پر باقی رہ گئی ھے اور سادہ پشمینے نے، جو تبتی بکریوں کی پشم سے بنا جاتا ھے، کسی حد تک اسی پشم سے بنی ھوئی شالوں کی جگہ لے لی ھے ۔ کئی اور صنعتیں بھی قائم ھوگئی ھیں، چنانچہ قالین، نمدے جن پر کشیدہ کاری ھوتی ھے اور میز پوش بڑی تعداد میں تیار ھوتے ھیں اور لکڑی کے تراشیدہ کام کی اشیا، لاکھ کے روغن، منقش لکڑی اور کُٹی (Papier-mache) کے کام کی چیزیں اور اسی طرح چاندی اور تانبے کے برتن یورپ میں اور سیاحوں کے نزدیک بہت مقبول ھیں ۔

کشمیریوں کی ایک خاصی بڑی تعداد دریاؤں اور جھیلوں پر کشتیوں میں رھتی ھے ۔ یہ مانجھی یا ملاح کہلاتے ھیں اور آبادی میں ایک جدا گانہ عنصر تشکیل کرتے ھیں ۔

کشمیر میں سیاحوں کے لیے ھمیشہ سے ایک کشش رھی ھے ۔ ذرائع رسل و رسائل میں اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ھوتا رھا ھے ۔ ھندوستان میں مقیم یورپی [اور مقامی] باشندوں کے علاوہ دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے یہ ایک بڑی گرمائی سیر گاہ رھا ھے، جو یہاں سفر کرتے وقت خیمے یا مکانوں کا کام دینے والی دریائی کشتیاں استعمال کرتے ھیں ۔ وادی گلمرگ ان کی محبوب جگہ ھے، جو سطح سمندر سے ۸۰۰۰ فٹ بلند ھے ۔ پہاڑی وادیوں میں بڑا اور چھوٹا شکار ایک زمانے میں بہت سے شکاریوں کے لیے باعث کشش تھا، لیکن اب اس کی افراط نہیں رھی اور یاد گاروں کے تلاش کرنے والے اب شاذ و نادر ھی کشمیر آتے ھیں ۔

کشمیر کی زبان، جو کشمیری یا کاشر کہلاتی ھے، ایک پراکرتی بولی ھے، جو پنجاب کی بولیوں سے بہت مختلف ھے اور دردستان کی شینا زبانوں سے اتنی ملتی جلتی ھے کہ گریرسن Grierson نے اسے پشاچی زبانوں کے گروہ میں جگہ دی ھے ۔

کشمیر کے بڑے بڑے سیاح جن کے بیانات کا مطالعہ سترھویں صدی عیسوی سے قبل کے مذکورۂ بالا مآخذ کے ساتھ کرنا مفید ھوگا، حسب ذیل ھیں : (۱) فرانسسکو زیویر Francisco Xavier، جو اکبر کے ھمراہ کشمیر آیا تھا؛ (۲) فرانکوئی برنیئر Francois Bernier، جو اورنگ زیب کے ساتھ ۱۶۶۴ء میں آیا تھا؛ (۳) جارج فورسٹر George Forster ۱۷۸۳ء میں بعہد تیمور شاہ درانی یہاں آیا؛ (۴) ولیم مورکرافٹ William Moorcroft اور جارج ٹریبک George Trebeck دونوں لداخ سے ھوتے ھوئے کشمیر میں بعہد رنجیت سنگھ (۱۸۱۹ تا ۱۸۲۵ء) آئے؛ (۵) وکٹر جیکوئی ماں Victor

Jacquemant (۱۸۳۱ء)؛ (۶) فان هیوگل Von Hügel (۱۸۳۵ء) اور (۷) وائن Vigne (۱۸۳۵ء)؛ قریب تر زمانے کے لیے سب سے اچھے بیانات ڈریو Drew اور لارنس Lawrence کے هیں اور قدیم تاریخ کے لیے سٹائن Stein کی تصانیف .

(۲) کشمیر کا نام بسا اوقات سری نگر کے لیے بھی استعمال ھوتا تھا، جو ملک کشمیر کا پہلے دارالحکومت تھا [اور اب صرف مقبوضہ کشمیر کا ھے] ۔ یہی نام ٹکسالی شہر کے لیے مسلمان سلاطین، مغل شہنشاھوں اور درانی شاھوں کے زمانے میں بھی استعمال ھوتا تھا اور ۱۸۳۵ء کے متأخر زمانے میں بھی Von Hügel شہر کشمیر کا ذکر کرتا ھے ۔ سری نگر کا قدیم نام، جو بقول پنڈت کلہن، اشوک نے رکھا تھا، ھندو حکمرانوں نے دوبارہ استعمال کرنا شروع کر دیا اور اب عام طور پر مستعمل ھے .

(۳) جموں اور کشمیر کے وسیع علاقے اکثر نقشوں کی کتابوں اور سرکاری اشاعتوں میں کشمیر کے نام کے تحت شامل کر دیے جاتے ھیں، لیکن ۱۸۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے بعد ایسا کرنا درست نہیں ۔ سطور بالا میں کشمیر کے دو حصوں آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کا ذکر ھو چکا ھے ۔ اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے تعلیقہ دیکھیے ۔ کشمیر اور جموں کی تنگ حدود سے باھر کے بہت بڑے علاقے میں، جس کا بیشتر حصہ پہاڑوں پر مشتمل ھے، آبادی صرف ۲۶۵۰۰۶۰ ھے ۔ یہ لداخ، سکردو، بلتستان [رک باں]، چلاس، گلگت [رک باں]، ھنزہ، ناگر [رک باں] اور یاسین کے علاقے ھیں ۔ ان کا ذکر اپنے اپنے ناموں کے تحت ملے گا ۔ برصغیر کی تقسیم کا ان پر بھی اثر پڑا ھے .

مآخذ : جغرافیہ اور عام کوائف (۱) F. Drew : *The Jummoo and Kashmir Territories*، لنڈن ۱۸۷۵ء؛ (۲) W. R. Lawrence : *The Valley of Kashmir*، لنڈن ۱۸۹۵ء؛ (۳) F. E. Younghusband : *Kashmir*، لنڈن ۱۹۰۹ء؛ (۴) M. A. Stein : *The Ancient Geography of Kashmir*، در *JASB*، کلکتہ ۱۸۹۹ء؛ (۵) *Census of India*، ج ۲۰ : *Kashmir*، لکھنؤ ۱۹۱۲ء؛ (۶) Lydekker : *Kashmir*، در *Geological Survey of India*، ج ۲۲؛ (۷) Oestreich : *Die Täler des Nordwestlichen Himalaya*، گوتھا ۱۹۰۷ء؛ (۸) A. Cunningham : *Ancient Geography of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء؛ (۹) C. E. Bates : *Gazetteer of Kashmir*، کلکتہ ۱۸۷۳ء؛ (۱۰) J. H. Knowles : *Folk Tales of Kashmir tr. into Engl.*، بار دوم، ۱۸۹۳ء؛ (۱۱) H. W. Bellew : *Kashmir und Kashgar*، لنڈن ۱۸۷۵ء؛ (۱۲) البیرونی : *India*، طبع Sachau، ص ۱۱، ۶۵، ۸۲، ۸۳، ۱۰۱ ببعد، ۱۰۳، ۱۶۳، ۱۹۶، ۲۰۶، ۲۸۷، ۲۸۹؛ ترجمہ، ۱ : ۲۱، ۱۳۵، ۱۷۳، ۱۷۴، ۲۰۶ تا ۲۰۸، ۲۱۱، ۳۱۷، ۳۹۱، ۳۹۳ و ۲ : ۸، ۹، ۱۷۸، ۱۸۱؛ (۱۳) *Relations de Voyages et Textes Géogr.* وغیرہ مترجمۂ G. Ferrand، پیرس ۱۹۱۳ء، ج ۱، ۲؛ (۱۴) Elliot-Dowson : *The Hist. of India etc.*، ج ۱ تا ۷؛ (۱۵) *Hist. of India*، طبع A. V. Williams Jackson، ج ۲، ۳، ۴، ۵ .

تاریخ : (۱) Walters : *Yuan Chwang*، طبع رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لنڈن ۱۹۰۴ء؛ (۲) البیرونی : *India*، ترجمہ از Sachau، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۳) پنڈت کلہن : راج ترنگنی، ترجمہ و حواشی از Stein، دو جلدیں، ویسٹ منسٹر ۱۹۰۰ء؛ (۴) المسعودی : مروج الذھب، ترجمہ از Sprenger، لنڈن ۱۸۴۱ء؛ (۵) ابو الفضل : آئین اکبری، ترجمہ از Jarret، ج ۲، کلکتہ ۱۸۹۱ء؛ (۶) *The India of Awrangzeb*، ترجمہ از خلاصۃ التواریخ، کلکتہ ۱۹۰۱ء؛ (۷) *Cathay and the Way Thither*، بار دوم، لنڈن ۱۹۱۵ء؛ (۸)

Ancient India as described by : Mc Crindle *Ptolemy*، بمبئی ۱۸۸۵ء؛ (۹) : Sir A. Cunningham *Coins of Mediaeval India*، لندن ۱۸۹۱ء؛ (۱۰) *Coinage of Kashmir, Hindu and* : Rodgers *Muhammadan*، در *JASB*، کلکتہ ۱۸۷۹ء؛ (۱۱) *Catalogue of Indian Coins, Muhammadan States (British Museum)* : Lane-Poole، لندن ۱۸۸۵ء؛ *Catalogue of Coins of Mughal* : Whitehead (۱۲) *Emperors, Lahore Museum*، آوکسفرڈ ۱۹۱۴ء؛ (۱۳) *Catalogue of Coins in Lahore Museum* : Rodgers، کلکتہ ۱۸۹۳ء؛ (۱۴) *Essay on the* : H. H. Wilson *Hindu History of Kashmir*، کلکتہ ۱۸۸۵ء.

سیاحت نامے : (۱) *Hajus de rebus Japonicis Indicis etc.*، اینتورپ ۱۶۰۵ء؛ (۲) : F. Bernier *Voyages*، ایمسٹرڈم ۱۷۲۳-۱۷۲۴ء، انگریزی ترجمہ از A. Constable، بار دوم، مع نظر ثانی از J. A. Smith، آوکسفرڈ ۱۹۱۶ء؛ (۳) *A Journey from* : G. Forster *Bengal to England through .... Kashmire*، ۲ جلدیں، لندن ۱۸۰۸ء؛ (۴) Moorcroft و Trebeck : *Travels ... in Ladakh and Kashmir*، ۲ جلدیں، لندن ۱۸۴۱ء؛ (۵) *Travels in Kashmir* : G. T. Vigne *Ladakh, etc.*، ۲ جلدیں، لندن ۱۸۴۲ء؛ (۶) V. Jacquemont : *Journey in India*، لندن ۱۸۳۵ء؛ (۷) C. v. Hugel : *Kaschmir und das Reich der Siek*، ۴ جلدیں، Stutgart ۱۸۴۰ تا ۱۸۴۸ء و انگریزی ترجمہ : *Travels in Kashmir and the Panjab*، لندن ۱۸۴۵ء؛ (۸) Torrens : *Travels*، مطبوعۂ لندن، ص ۳۰۱].

آثار قدیمہ : (۱) *Illustrations* : H. H. Cole *of ancient buildings in Kashmir*، لندن ۱۸۶۹ء؛ (۲) *L'Art. Gréco-Bouddhique du* : A. Foucher *Gandhāra*، پیرس ۱۹۰۵ء.

زبان : (۱) *Kāçmiri Grammar* : Grierson، لندن ۱۸۹۹ء؛ (۲) وہی مصنف : *The Piśaca Languages of N. W. India*، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن ۱۹۰۹ء؛ (۳) *Dictionary of Kashmiri* : Rev. J. H. Knowles *Proverbs*، بمبئی ۱۸۸۵ء؛ (۴) Sir Aurel Stein : *Hatim's Tales*، بہ معاونت پنڈت گووند کول، طبع سر جارج گریئرسن، لندن ۱۹۲۳ء؛

(M. Longworth-Dames)

⊗ تعلیقہ : جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، سکھوں نے تقریبًا تیس سال تک کشمیر پر حکومت کی اور یہ ظلم و تشدد اور جبر و استبداد کا تاریک ترین دور تھا (*History of the Freedom Movement*، ۲/۱ : ۹۷) - سکھوں نے مغلوں کے ہاتھوں جو شکستیں کھائی تھیں ان کا بدلہ انھوں نے بے بس اور مجبور مسلمان کشمیریوں سے لیا (*Two Nations and Kashmir*، ص ۲) - ان کی نظر میں مسلمانوں کی اہمیت جانور سے زیادہ نہ تھی، حتی کہ ایک مسلمان کو قتل کرنے کی سزا کسی سکھ کو صرف بیس روپے جرمانہ تھی (*The Princes of India*، ص ۱۲۱) - معاشی استحصال عام تھا، مذہبی آزادی سلب کر لی گئی تھی اور مسلمان نماز باجماعت بھی ادا نہیں کر سکتے تھے (*Kashmir in sunlight and shade*، ص ۷۵).

رنجیت سنگھ کے زمانے میں جموں کے تین ڈوگرا بھائیوں، گلاب سنگھ، دھیان سنگھ اور سوچیت سنگھ نے خالصہ دربار کی ملازمت اختیار کی اور بڑی وفاداری سے خدمات سرانجام دیں - جس پر ۱۸۱۸ء میں گلاب سنگھ کو جموں، دھیان سنگھ کو بھمبر اور پونچھ اور سوچیت سنگھ کو رام نگر کی سرداری عطا ہوئی - کشمیر پر حملہ کرنے کے سلسلے میں گلاب سنگھ کی خدمات سے خوش ہو کر مہاراجا رنجیت سنگھ نے اسے راجا کا خطاب دے کر جموں کا صوبیدار بنا دیا - ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی

موت پر انتشار پھیلا تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گلاب سنگھ نے جموں میں مطلق العنانیت اختیار کر لی اور انگریزوں سے ساز باز شروع کر دی ۔ سبراؤں کی لڑائی میں سکھوں کی شکست فاش بڑی حد تک گلاب سنگھ کی غداری کی مرہون منت تھی، جس کے نتیجے کے طور پر فروری ۱۸۴۶ء میں لاہور پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا ۔ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدۂ لاہور پر دستخط ہوئے، جس کی رو سے سکھوں پر ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوان جنگ عائد کیا گیا اور دوآبہ بست جالندھر کا انتہائی زرخیز علاقہ انگریزی حکومت کی حدود میں شامل کر لیا گیا ۔ تاوان جنگ میں پچاس لاکھ روپے نقد ادا کر دیے گئے اور بقیہ ایک کروڑ کے عوض انگریزوں نے بیاس اور سندھ کا درمیانی پہاڑی علاقہ، جس میں ہزارہ اور کشمیر بھی شامل تھے، حاصل کر لیے ۔ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزوں اور راجا گلاب سنگھ کے مابین معاہدۂ امرتسر طے پایا، جس کے مطابق وہ تمام کوہستانی علاقہ (مع ملحقات) جو دریاے سندھ کے مشرق اور دریاے راوی کے مغرب کی طرف واقع تھا، مہاراجا گلاب سنگھ اور اس کی اولاد نرینہ کے حق میں منتقل کر دیا گیا اور انتقال ریاست کے عوض گلاب سنگھ نے پچھتر لاکھ روپیہ نانک شاہی (موجودہ پچاس لاکھ روپے) ادا کرنے کا وعدہ کیا، نیز طے پایا کہ پچاس لاکھ روپے معاہدے کے شروع ہوتے وقت اور پچیس لاکھ روپے یکم اکتوبر ۱۸۴۶ء کو یا اس سے قبل ادا کر دیے جائیں گے ۔

معاہدۂ امرتسر کے بعد گلاب سنگھ نے کشمیر پر باقاعدہ قبضہ کرنا چاہا، لیکن حکومت لاہور کے آخری صوبیدار شیخ امام الدّین نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جو ڈوگرا فوج قبضہ لینے کے لیے بھیجی گئی تھی اسے شکست دے کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا ۔ جب انگریزوں نے دیکھا کہ گلاب سنگھ کی فوج سے کشمیر کی فتح ممکن نہیں تو کرنل لارنس کی قیادت میں کشمیر پر چڑھائی کر دی گئی ۔ شیخ امام الدّین نے مجبوراً اطاعت قبول کر لی اور کشمیر میں ڈوگرا حکومت قائم ہوگئی ۔

مہاراجا گلاب سنگھ بڑا متعصب ڈوگرا تھا ۔ ڈوگروں نے برہمنوں کے ساتھ مل کر قبضہ ملتے ہی مسلم اکثریت پر ظلم و تشدد کا آغاز کر دیا اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کی حیثیت کم مایہ قلیوں اور مزدوروں کی ہو کر رہ گئی ۔ سیاسی و معاشی استحصال نے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دی ۔ ظالمانہ ٹیکسوں سے ان کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لیا جاتا تھا ۔ معاشرے میں وہ تمام سہولتوں سے محروم کر دیے گئے ۔ اس پر طرہ یہ کہ انھیں شکایت کرنے کی بھی اجازت نہ تھی ۔ اگر کوئی مسلمان کسی سیاح کے سامنے بھی اپنی حالت زار بیان کرتا تو اسے جیل میں ڈال دیا جاتا (تفصیل کے لیے دیکھیے Karbel : *Danger in Kashmir*، ص ۱۵؛ Mahaffe : *Road to Kashmir*، ص ۱۶۸؛ Torrens : *Travels*، ص ۳۰۱؛ *History of the Freedom Movement*، ۱ : ۱۱۹؛ Younghusband : *Kashmir*، ص ۱۷۹؛ Walter Lawrence : *The India we Served*، ص ۱۲۸ و *The Valley of Kashmir*، ص ۲۲۹؛ سردار محمّد ابراہیم : *The Kashmir Saga*، ص ۱۳، وغیرہ) ۔ بعد میں اگر کوئی نیک دل انگریز ڈوگرا حکومت پر دباؤ ڈالنے کو کہتا تو حکومت کی طرف سے معاہدۂ امرتسر کی قانونی مجبوریوں کو سامنے لایا جاتا تھا، جس میں کشمیر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی ۔ پنجاب میں سکھوں کا زور توڑنے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اپنی فوجیں بھیج کر مہاراجا گلاب سنگھ نے انگریزوں کی خدمات انجام دی تھیں، جن کی بنا پر برطانوی حکومت ریاست میں ہونے والے

تمام مظالم کے سلسلے میں چشم پوشی سے کام لیتی رہی۔ کشمیری مسلمانوں نے اس جبر و استبداد کے خلاف جنگ عالمگیر اول کے بعد آواز اٹھانی شروع کر دی۔ ہندوستان سے کشمیری نوجوان مسلمان تعلیم حاصل کرکے لوٹے تو اپنے ساتھ آزادی کا جذبہ لے کر آئے۔ چودھری غلام عبّاس اور شیخ محمّد عبداللہ انھیں نوجوانوں میں سے تھے۔ انھوں نے کشمیری مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ ۱۹۳۱ء میں پولیس کے دو ملازمین کی طرف سے مداخلت فی الدّین کے علاوہ قرآن مجید کی بے حرمتی ہوئی تو مسلمان مشتعل ہو گئے اور ساری ریاست سراپا احتجاج بن گئی۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو پولیس نے سری نگر میں مسلمانوں کے ایک پر امن ہجوم پر گولی چلا دی، جو ایک نوجوان عبدالقدیر کے مقدمۂ بغاوت کی سماعت بند کمرے کے بجائے کھلے عام کرنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ بائیس مسلمان شہید اور سیکڑوں زخمی ہوئے۔ شہر میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ سارا دن نہتے مسلمانوں پر اندھا دھند فائرنگ ہوتی رہی۔ انھیں گھروں سے نکال کر اذیت ناک سزائیں دی گئیں، ان کا مال و اسباب لوٹ لیا گیا اور نوجوان عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ کشمیری مسلمانوں کے تمام ممتاز قائد گرفتار کر لیے گئے۔ ریاست میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اگرچہ مہاراجا نے طاقت کے بل پر اسے کچل دیا، لیکن اب کشمیری مسلمانوں میں اپنے حقوق کے لیے قربانیاں دینے کا داعیہ پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں مسلم کانفرنس قائم ہوئی۔ سیاسی اصلاحات کے ماتحت ۱۹۳۴ء میں انتخابات ہوئے تو مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کی ۲۱ نشستوں میں سے ۱۶ نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ دو سال بعد پھر انتخابات ہوئے تو مسلم کانفرنس کی نشستوں کی تعداد اکیس ہو گئی۔ اسمبلی کے پاس اختیارات نہ ہونے کے برابر تھے، تاہم معاشی، معاشرتی اور سیاسی اصلاحات کے لیے مسلم کانفرنس نے مسلسل جدوجہد جاری رکھی، تاآنکہ ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے زیر اثر شیخ محمّد عبداللہ نے سیکولر خطوط پر نیشنل کانفرنس قائم کر لی۔ چودھری غلام عبّاس اس اقدام کو درست نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ریاست میں اصل مسئلہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی بازیافت کا تھا اور ہندووں کو تو پہلے ہی سے تمام مراعات حاصل تھیں؛ چنانچہ انھوں نے مسلم کانفرنس کو از سر نو زندہ کیا۔ ادھر مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کر دیا۔ مسلم کانفرنس نے اپنا سیاسی مستقبل مسلم لیگ سے وابستہ کر لیا۔ نیشنل کانفرنس تو پہلے ہی عملی طور پر کانگرس کی ایک ذیلی جماعت بن چکی تھی۔ کشمیری مسلمان سیاسی شعور سے بہرہ ور ہوئے تو نیشنل کانفرنس کا اثر روز بروز کم ہوتا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں شیخ محمّد عبداللہ نے "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی اور بغاوت کے جرم میں انھیں قید کر دیا گیا۔ مسلم کانفرنس نے "ڈائرکٹ ایکشن" کا ارادہ کیا تو چودھری غلام عبّاس کو کئی اور رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ریاست میں پھر انتخابات ہوئے اور مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کی اکیس نشستوں میں سے پندرہ حاصل کر لیں اور باقی چھے نشستوں پر انتخاب ہی منعقد نہ ہو سکے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ کشمیر میں مسلم کانفرنس ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اسی زمانے میں برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے منصوبے کے مطابق حکومت برطانیہ نے ریاستوں کے بارے میں یہ طے کیا کہ ریاستوں کے حکمران بھارت یا پاکستان جس ملک کے ساتھ چاہیں الحاق کر سکتے ہیں، تاہم انھیں فیصلہ کرتے وقت عوام کی خواہشات اور ریاست کی جغرافیائی پوزیشن کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو مسلم کانفرنس

نے ایک قرار داد کے ذریعے جغرافیائی حالات، مجموعی آبادی کی اسّی فیصد مسلم اکثریت، پنجاب کے اہم دریاؤں کی ریاست میں سے گزرگاھوں، نیز پاکستان سے ثقافتی، نسلی، معاشی تعلقات اور سرحدوں کے اشتراک کی بنا پر ریاست جموں و کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا رسمی طور پر اعلان بھی کر دیا ۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب برصغیر پر آزادی کا سورج طلوع ھوا تو ریاست کے ھر حصے میں مسلمانوں نے قیام پاکستان کا جشن منایا، پاکستان کا پرچم لہرایا گیا اور اسے سلامی دی گئی؛ ریاست کے تمام بڑے شہروں میں پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کے حق میں جلسے اور جلوس منعقد ھوے ۔

اس وقت چودھری غلام عبّاس جیل میں تھے، لیکن ان کی مسلم کانفرنس نے اپنا موقف واضح کر دیا تھا ۔ نیشنل کانفرنس کا موقف غیر واضح رھا کیونکہ عوام میں یہ اپنی مقبولیت کھو چکی تھی اور شیخ محمّد عبداللہ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کے سلسلے میں جیل میں تھے ۔ برصغیر کی تقسیم اور اعلان آزادی کے فوراً بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو مہاراجا کشمیر نے بھارت اور پاکستان دونوں کو ریاست کے ساتھ معاھدۂ قائمہ (Stand-still Agreement) کرنے کی دعوت دی، جسے پاکستان نے منظور کرلیا، مگر بھارت نے جواب ھی نہ دیا ۔ اس معاھدے کے تحت کشمیر کے ذرائع رسل و رسائل پاکستان کے حوالے کر دیے گئے اور کشمیر کے ڈاک خانوں پر پاکستان کا پرچم لہرانے لگا ۔ اب پاکستان سے مکمل الحاق ھونا تھا، مگر مہاراجا کشمیر کی نیت صاف نہیں تھی ۔ اس نے پٹیالہ، کپورتھلہ اور فریدکوٹ کے مہاراجوں کے مشورے سے ریاست میں مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ بنایا، ریاستی فوج سے مسلمان افسروں کو نکال دیا، مسلمان رعایا سے، حتّٰی کہ پولیس کے مسلمان ملازمین سے بھی ھتیار واپس لے لیے اور راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ جیسی متعدد تنظیموں اور سکھوں کے مسلح جتھوں کو ریاست میں بلا لیا، جو ھندوستان میں ان دنوں مسلمانوں کے قتل عام میں مصروف تھے ۔ اس طرح ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ستمبر میں جموں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ھوگیا ۔ ڈوگرا سپاھیوں نے میرپور، پونچھ، مظفر آباد اور اس سے ملحقہ اضلاع میں پہلے ھی سے دھشت گردی کی فضا قائم کرکے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا تھا ۔ اپنے عزیزوں کی لاشیں بے گور و کفن چھوڑ کر لاکھوں مہاجرین نے پاکستان آنا شروع کر دیا ۔ کشمیر میں اپنے بھائیوں کے قتل و غارت کی وحشتناک خبریں سن کر صوبۂ سرحد کے غیور قبائلی پٹھان ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر پہنچ گئے ۔ ادھر کشمیر کے مسلمان مجاھدین آزادی بھی اٹھ کھڑے ھوے اور انھوں نے جانیں ھتھیلی پر رکھ کر ریاست کے بہت بڑے حصے کو مہاراجا کے چنگل سے آزاد کرا لیا ۔ مسلم کانفرنس کی زیر نگرانی ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد جموں و کشمیر حکومت قائم کر دی گئی اور سردار محمّد ابراھیم اس کے پہلے صدر مقرر ھوے ۔

مہاراجا کی فوج اور پولیس اور متعدد ھندو تنظیموں کے مظالم کی وجہ سے ریاست بھر کے مسلمانوں نے بغاوت کر دی تھی ۔ مہاراجا اپنی گھناؤنی سازش کو ناکام دیکھ کر اپنے خاندان سمیت بھاگ گیا اور بلا تأمل ۲۶ جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل بھارت سے ریاست کے بھارت سے الحاق کی درخواست کر دی اور نہ تو کشمیری مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس کی ۱۹ جولائی والی قرارداد اور نہ ۲۴ اکتوبر کو قائم ھونے والی آزاد جموں و کشمیر حکومت ھی کو در خور اعتنا سمجھا ۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھی

بھلا دیا کہ ریاستوں کے الحاق کے بارے میں اس نے ۲۵ جولائی کو کیا مشورہ دیا تھا [رک بہ پاکستان]۔ وہ اب ہر لحاظ سے بھارتی گورنر جنرل تھا اور مکمل طور پر آل انڈیا نیشنل کانگرس کے زیر اثر ہو چکا تھا، جو پاکستان کے وجود تک کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اور جس نے ریاست جوناگڑھ کے پاکستان سے الحاق کو اس لیے برداشت نہ کیا کہ وہاں کی آبادی کی غالب اکثریت ھندو تھی اور ریاست کشمیر کا اس لیے بھارت سے الحاق چاھتی تھی کہ یہاں کا حکمران هندو تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے فوراً مہاراجا کی درخواست منظور کر لی؛ چنانچہ اگلے روز، یعنی ۲۷ اکتوبر کو ۹ بجے صبح بھارتی فوج ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر میں اتر گئی اور مجاھدین آزادی کے خلاف لڑائی شروع کر دی۔ یہ ایک مسلمہ سازش تھی اور اسی کی بنا پر ریڈ کلف ایوارڈ میں نا انصافی کرکے گورداسپور کا مسلم اکثریت والا علاقہ بھارت کو دے دیا گیا تھا تاکہ بھارت کو کشمیر تک راستہ مل سکے۔ پنڈت جواھر لعل نہرو نے بیرونی ممالک کو یہ تأثر دینے کے لیے کہ اس الحاق کو عوامی تائید بھی حاصل ھے، شیخ محمّد عبداللہ کو استعمال کیا، جن کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ آزادیٔ کشمیر کے سلسلے میں شیخ عبداللہ نے جو مثبت کردار انجام دیا تھا اسے قطعاً فراموش کرکے وہ اس مہاراجا کے وزیراعظم بن گئے جسے وہ ریاست کا جائز حاکم نہیں سمجھتے تھے۔

ریاست کشمیر کا پاکستان کے ساتھ معاهدۂ قائمہ موجود تھا۔ حکومت پاکستان کے نزدیک بھارت سے اس کے الحاق کی کوئی قانونی اور اخلاقی حیثیت نہیں تھی۔ بھارتی حکومت نے اپنی فوج بھیج کر ریاست پر بزور قبضہ کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمّد علی جناح نے اس کے جواب میں اپنی افواج کشمیر میں داخل کرنے کا حکم دیا، لیکن چونکہ ابھی پاکستان اور بھارت کی افواج مشترکہ طور پر لارڈ آکن لیک کے زیر کمان تھیں، اس لیے پاکستانی افواج کے انگریز سربراہ جنرل گلینسی نے تعمیل سے انکار کر دیا۔ اگر قائداعظم کے حکم کی تعمیل ھو جاتی تو وادی کشمیر پر پاکستان اپنے قدم جما لیتا اور کشمیری عوام کی خواھش کے مطابق مسئلۂ کشمیر کب کا طے ھو چکا ھوتا۔ بھارت نے یہ تأثر دیا کہ یہ مسئلہ رائے شماری کے ذریعے طے کرایا جائے گا، مگر اس کی کوشش تھی کہ پہلے تمام کشمیر پر قبضہ کر لے؛ لیکن آزاد کشمیر کی جیالی فوج نے بھارت کے اس ارادے کو ناکام بنا دیا۔ اپنی فوج کو شکست خوردہ دیکھ کر بھارت نے یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو مسئلۂ کشمیر سلامتی کونسل میں پیش کر دیا اور پاکستان پر الزام لگایا کہ وہ قبائلی حملہ آوروں کی مدد کر رھا ھے۔ پاکستان نے ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو بھارت کے الزامات کا جواب اور ایک جوابی شکایت سلامتی کونسل کے سامنے پیش کی اور یہ تجویز سامنے رکھی کہ غیر ریاستی لوگوں کو واپس بلا کر ریاست کے مہاجرین کو وھاں دوبارہ آباد کیا جائے اور غیر جانبدار اور نمائندہ حکومت قائم کرکے اقوام متحدہ کی نگرانی میں الحاق کے مسئلے پر ریاست میں استصواب کرایا جائے۔ اس کے بعد بحث و تمحیص گفت و شنید اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ھوگیا اور انجام کار ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی، جس کی رو سے پانچ ارکان پر مشتمل "کمیشن اقوام متحدہ برائے پاک و ھند" متعین ھوا، جسے واضح ھدایات دے کر ریاست میں استصواب کے لیے سازگار حالات پیدا

کرنے کی ذمے داری سونپی گئی ۔ کمیشن جنیوا میں اپنے اجلاس کے بعد برصغیر آیا اور ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کو اپنی پہلی قرارداد منظور کی، جس میں جنگ بندی اور فوجوں کے انخلا کی تفصیلات تھیں اور استصواب ہی کو مسئلے کا حل قرار دیا گیا تھا؛ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی عمل میں آ گئی ۔ کمیشن نے اپنی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء والی قرارداد کے ضمیمے کے طور پر ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو ایک اور قرارداد منظور کی، جس میں ریاست جموں و کشمیر کے بھارت یا پاکستان سے الحاق کے مسئلے پر رائے شماری کے لیے ناظم رائے شماری کے تقرر کے متعلق تفصیلات درج تھیں ۔ یہ دونوں قراردادیں کشمیر پر عالمی معاہدے کی بنیاد ہیں اور بھارت، پاکستان اور اقوام متحدہ تینوں ان پر عملدارآمد کرانے کی ذمے دار ہیں اور بھارت ان دونوں قراردادوں کو باقاعدہ طور پر منظور کر چکا ہے ۔

ان قراردادوں نے مسئلۂ کشمیر کے منصفانہ حل کی راہ ہموار کر دی تھی، مگر بھارت جوع الارض کے مرض کا شکار تھا۔ اسی بنا پر اس کی حکمت عملی میں واضح طور پر تضاد موجود تھا؛ چنانچہ اس نے بڑی دیدہ دلیری سے جونا گڑھ، اور حیدر آباد کی ریاستوں پر قبضہ کر لیا تھا ۔ ریاست جموں و کشمیر کے متعلق بھی اس کے یہی ارادے تھے ۔ مذکورۂ بالا حالات کے علاوہ اس کی راہ میں وہ بنیادی اصول بھی حائل تھا جس کی بنا پر برصغیر کی تقسیم ہوئی تھی اور وہ یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے ملحقہ علاقے پاکستان میں اور ہندو اکثریت کے ملحقہ علاقے ہندوستان میں شامل ہوں گے ۔ اب ریاست جموں و کشمیر مسلم اکثریت والا علاقہ تھا اور جغرافیائی طور پر پاکستان سے ملحق تھا۔

اقوام متحدہ میں مسئلۂ کشمیر کو لے جانے سے بھارت کی اصل غرض یہ تھی کہ آزاد کشمیر کی کفن بردوش فوج اس کی نرغے میں آئی ہوئی بد دل فوج کا قلع قمع نہ کر دے اور جنگ بندی کرانے کے بعد فرصت مل جانے پر وہ حیل و حجت سے کام لے کر اس مسئلے کو لاینحل بنا دے اور جو علاقہ اس کے قبضے میں ہے کم از کم اسے ہمیشہ کے لیے ہتیا لے ۔ اقوام متحدہ نے ناظم رائے شماری بھی مقرر کیا، بعد میں اپنے نمائندے بھی بھیجے، لیکن کسی نہ کسی بہانے بھارت فوجوں کے انخلا کے مسئلے کو ٹالتا رہا ۔ پاکستان اور بھارت کے باہمی مذاکرات بھی ہوئے، لیکن کوئی نتیجہ خیز بات نہ ہوئی ۔ الٹا پاکستان کے احتجاج کے باوجود بھارت مقبوضہ کشمیر پر اپنی گرفت مضبوط کرتا چلا گیا ۔ اس دوران میں ۱۹۶۲ء میں چین کے ہاتھوں نیفا میں بھارت کی پٹائی ہوئی ۔ اس موقع پر پاکستان کشمیر پر قبضہ کرکے کشمیری عوام کی امنگوں کو پورا کر سکتا تھا، مگر صدر پاکستان نے مصیبت زدہ دشمن کی پیٹھ میں چھرا بھونکنے سے دریغ کیا ۔ چین کے مقابلے میں بھارت کی ہر طرح امداد کرنے کے لیے روس اور امریکہ دونوں میدان عمل میں آ گئے ۔ بین الاقوامی سیاست کو اس طرح اپنے حق میں دیکھ کر ۱۹۶۴ء میں سلامتی کونسل میں بھارتی مندوب نے صاف صاف کہ دیا کہ بھارتی حکومت ریاست کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے جو کچھ ممکن ہو سکا کرے گی اور اس امر سے اسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی ۔ یہ اسی بھارت کے رویے میں تبدیلی تھی جو شروع ہی سے ریاست جموں و کشمیر کے اپنے ساتھ الحاق کو عارضی کہتا چلا آتا تھا اور استصواب کو اس مسئلے کا حل تسلیم کرتا تھا ۔ اس سلسلے میں ۱۹۵۷ء سے بھارت کو روس کی کھلی کھلی تائید حاصل ہو چکی تھی، چنانچہ الٹی سیدھی

تعبیرات کو چھوڑ کر ۱۹۶۲ء میں سلامتی کونسل میں بھارت نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ بھارت سے کشمیر کا الحاق حتمی اور آخری ہے اور بھارت کشمیر کا ایک لازمی حصہ ہے ۔

بھارت کی اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں ہر جگہ لوگ سخت مایوس ہوئے ۔ سلامتی کونسل کی بے چارگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۹۵۷ اور ۱۹۶۲ء میں روس نے ویٹو استعمال کرکے مسئلۂ کشمیر کے تصفیے کے متعلق کوئی ٹھوس قرارداد پاس نہیں ہونے دی تھی ۔ بھارت نے تمام بین الاقوامی معاہدوں کو پس پشت ڈال کر ۱۹۶۴ء میں بھارتی آئین کو کشمیر پر عائد کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ ریاست کو بھارت کے دیگر عام صوبوں کی سطح پر لا سکے ۔ ان تمام واقعات کا یہ نتیجہ نکلا کہ جموں و کشمیر کے عوام نے بھارتی استعمار کے خلاف ہتیار اٹھا لیے ۔ طاقت کے نشے میں بھارت نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بین الاقوامی سرحد عبور کرکے لاہور پر حملہ کر دیا اور اس کا جواز یہ پیش کیا کہ پاکستان نے کشمیر میں تخریب کار بھیجے ہیں ۔ چونڈہ کے محاذ پر ٹینکوں کی تاریخ کی سب سے بڑی جنگ لڑی گئی ۔ پاکستان نے کشمیر میں چھمب اور جوڑیاں کا علاقہ بھارت سے آزاد کرا لیا ۔ اگر دیکھا جائے تو ایک اعتبار سے یہ خطرناک جنگ مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی بے حسی اور بے اثری کی وجہ سے لڑی گئی ۔ سلامتی کونسل نے آخر ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو مسئلۂ کشمیر کو حل کرنے کی طرف کوئی قدم اٹھانے کے بجائے جنگ بندی کرا دی ۔ جنوری ۱۹۶۶ء کے اوائل میں روس کے وزیراعظم مسٹر کوسیگن کی دعوت پر بھارتی وزیراعظم اور صدر پاکستان نے تاشقند میں ملاقات کی اور ۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو اعلان تاشقند جاری ہوا، جس کی بنا پر دونوں ممالک کی افواج ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی پوزیشنوں پر واپس چلی گئیں اور کشمیر کے اصل مسئلے کے متعلق صرف یہ کہا گیا کہ دونوں ملک باہمی جھگڑے طاقت کے بل بوتے پر نہیں، پر امن طریقوں سے حل کریں گے ۔ اس اعلان پر وزیر اعظم بھارت، صدر پاکستان اور روسی وزیر اعظم تینوں کے دستخط تھے ۔ ظاہر ہے کشمیر کا مسئلہ کھٹائی میں ڈال دیا گیا اور لاکھوں کشمیری ایک بار پھر بڑی بے تابی سے اس دن کا انتظار کرنے لگے جب اقوام متحدہ ان کی قومی امنگوں کا احترام کرتے ہوئے مسئلۂ کشمیر کا آبرومندانہ حل تلاش کرے گی اور وہ پنجۂ استبداد سے آزادی حاصل کریں گے ۔

۱۹۷۱ء میں بھارت نے ایک بار پھر کھلم کھلا جارحیت کا ارتکاب کیا ۔ اس جنگ میں عملی طور پر اسے روس کی پوری حمایت و اعانت حاصل تھی؛ چنانچہ مشرقی پاکستان علٰحدہ کر دیا گیا، پاکستان کے نوے ہزار فوجی بھارت کی قید میں چلے گئے اور پاکستان کے پانچ ہزار مربع میل علاقے پر بھارت کا قبضہ ہوگیا ۔ ۱۹۷۲ء میں شملہ کانفرنس ہوئی ۔ شملہ معاہدے میں تنازع کشمیر کا ذکر بھی آیا اور تسلیم کیا گیا کہ یہ دونوں ممالک کے مابین متنازع فیہ مسائل میں سے ایک ہے، جس کا حل باہمی مذاکرات کے ذریعے کرنا چاہیے ۔ اس طرح کشمیر کا مسئلہ دوبارہ زندہ ہو گیا ۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے اعلانات کے مطابق اس وقت پاکستان کا موقف یہ ہے کہ مسئلۂ کشمیر اصولی حیثیت رکھتا ہے اور پاکستان اصولوں پر سمجھوتا نہیں کر سکتا ۔ اب (ستمبر ۱۹۷۹ء) بھارت اور پاکستان کے درمیان تقریباً تمام مسائل گفت و شنید کے ذریعے طے کر لیے گئے ہیں ۔ دونوں ممالک میں سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم

ہو چکے ہیں اور توقع ہے کہ کشمیر کا مسئلہ بھی وہاں کے عوام کی خواہشوں اور امنگوں کے مطابق حل کر لیا جائےگا ۔

کشمیر میں اشاعت اسلام : مسلمانوں کی آمد سے قبل ریاست جموں و کشمیر اور اس کے ملحقات کے باشندوں کا تعلق ہندو یا بدھ مذہب سے تھا ۔ ان کا اسلام قبول کرنا اس لحاظ سے خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ محمّد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدّین محمّد غوری یا بابر جیسے نامور فاتحین اسلام میں سے کسی نے اس علاقے پر فاتحانہ یلغار نہیں کی ۔ سب سے پہلے ۱۵۳۱ء میں شہزادۂ کامران تیس ہزار کا لشکر لے کر پیر پنجال پر واقع قصبۂ نوشہرہ کے راستے کشمیر پر حملہ آور ہوا اور اس کے دو جرنیل محرم بیگ اور علی بیگ سرینگر کے قرب و جوار میں پہنچ گئے ۔ علاوہ بریں اسی سال کے لگ بھگ میرزا دو غلات [رک باں] بھی ابو سعید میرزا والی کاشغر کے ملازم کے طور پر لداخ کو فتح کرکے کشمیر آیا اور بعد میں ۱۵۴۰ء میں اسی نے کشمیر ہمایوں کے نام پر فتح کر لیا ۔ اسی فتح کو اپنا استحقاق قرار دے کر اور وقتی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوے ۱۵۸۶ء میں جلال الدین اکبر نے کشمیر کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا ۔ بایں همه تاریخ شاهد ہے کہ مغلوں کی ان فتوحات سے پہلے پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر ھی میں یہاں کے باشندوں کی اکثریت مشرف باسلام ھو چکی تھی ۔ یہاں کے ہندوؤں اور بدھوں کا بلا جبرو اکراہ اور بطیب خاطر جماعتی طور پر قبول اسلام ایک معجزے سے کم نہیں ۔ ہم دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ کیسے وقوع پذیر ہوا ۔

معلوم ہوتا ہے اهل کشمیر کا ابتدائی مذہب ناگ پوجا، یعنی سانپ کی پرستش تھا ۔ بعد میں انھوں نے بدھ مذهب اختیار کیا، چنانچہ ۱۰۰ء میں مہاراجہ کنشک نے کشمیر کے ایک مشہور وہار میں بدھوں کی تیسری تاریخی مجلس منعقد کرائی ۔ بعد میں یہاں شیومت کا اجرا ہوا، جو ایک طرح کی وحدت پرستی (Monism) تھی ۔ اسلام جب یہاں پہنچا تو اس کا سامنا زیادہ تر شیو مت ھی سے ہوا ۔ پہلا مسلمان حمیم شامی تھا جو ۷۱۲ء میں کشمیر میں داخل ہوا ۔ وہ راجا داهر کے بیٹے جے سیہ کے ساتھ کشمیر کے راجا کے پاس غالباً اس مقام پر پہنچا جو آج کل کار کہار کہلاتا ہے اور ضلع جہلم میں واقع ہے، لیکن ان دنوں کشمیر میں شامل تھا ۔ جے سیہ کو کشمیر کے راجا نے اس علاقے کی حکمرانی عطا کی ۔ اس کے مرنے پر حمیم شامی جانشین ہوا، جس نے یہاں متعدد مسجدیں تعمیر کرائیں ۔ ۷۳۳ء کے قریب کشمیر کے راجا للتا دتیہ کے عہد میں عرب سندھ کی طرف سے بڑھے تو اس نے فغفور چین کو امداد کے لیے لکھا ۔ امداد تو نہ پہنچی، مگر راجا کی مساعی سے عربوں کی پیش قدمی رک گئی ۔ خلیفہ منصور کے عہد (۷۵۴تا۷۷۵ء) میں هشام بن عمرو التغلبی سندھ کا والی مقرر ہوا ۔ اس نے بھی کشمیر پر حملہ کیا، لیکن کشمیر میں داخل نہ ہو سکا ۔ گلگت پر ۷۵۱ء سے عربوں کا قبضہ تھا، جسے عربوں نے دوسرے مقبوضات کے ساتھ فغفور چین کو شکست دے کر حاصل کیا تھا ۔ مسلمان فاتح کے طور پر تو کشمیر میں داخل نہ ہو سکے، لیکن مذکورۂ بالا حمیم شامی کے بعد مسلمان تاجر اور سپاهی کشمیر میں بکثرت آنے لگے ۔ للتادتیہ کے لڑکے اور جانشین وجرادتیہ نے ملک میں ایسے کام کیے جن سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا ۔ بعد میں هرش (۱۰۸۹ تا ۱۱۰۱ء) نے ترک سپاهی ملازم رکھے اور مسلمانوں کے لباس اور زیورات استعمال کیے ۔

اس سے پہلے محمود غزنوی نے دو بار کشمیر پر حملہ کیا تھا، لیکن سردی کی وجہ سے ناکام رہا۔ بھکشا چر کے عہد (۱۱۲۰ تا ۱۱۳۱ء) میں مسلمان سپاہی دوبارہ ملازم رکھے گئے؛ چنانچہ مشہور سیاح مارکو پولو لکھتا ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں کشمیر میں مسلمانوں کی ایک باقاعدہ آبادی تھی اور وادی کے لوگ گوشت کھانا چاھتے تو وھاں کے مسلمان ان کے لیے جانور ذبح کر دیتے تھے۔ تبلیغ اسلام تو ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن وادی کے لوگ مسلمانوں کے صاف ستھرے لباس، خوراک اور رہن سہن کے پاکیزہ طریقے سے متأثر ہو چکے تھے۔

کشمیر میں سب سے پہلے جس شخص نے اسلام قبول کیا وہ لداخ کا ایک باھمت اور قابل سردار رنچن تھا، جس نے زولجو ترکستانی کی پیدا کی ہوئی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ۱۳۲۰ء میں یہاں کی حکومت پر قبضہ کر لیا اور ۲۵ نومبر ۱۳۲۳ء تک بڑی دانشمندی، عدل و انصاف اور روا داری کے ساتھ فرمانروائی کرتا رہا۔ سری نگر میں وہ علی کدل اور نوکدل کے درمیان مدفون ہے۔ اپنی روحانی تشنگی کو بجھانے کے لیے وہ اکثر پڑھے لکھے ہندوؤں اور بدھ پروھتوں کو بلا کر ان سے مذھب کے متعلق سوالات کیا کرتا تھا، لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے روحانی اضطراب کو رفع نہ کر سکا۔ اسی اثنا میں اس کی ملاقات سلسلۂ سہروردیہ کے ایک بزرگ شاہ نعمت اللہ فارسی کے ایک مرید سیّد شرف الدّین المعروف بہ بلبل شاہ سے ہوئی، جو منگولوں کے خوف سے ایک ہزار پناہ گزینوں کے ساتھ ترکستان سے کشمیر آ گئے تھے۔ رنچن نے بلبل شاہ سے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کیں اور اسلامی تعلیمات کی سادگی اور مسلمانوں کے طریق عبادت سے بڑا متأثر ہوا اور یہ دیکھ کر کہ اسلام میں نہ تو رسم پرستی ہے، نہ ذات پات کی بندش ہے اور نہ کسی مخصوص مذھبی طبقے کا اقتدار اور غلبہ ھی ہے، وہ مشرف باسلام ھو گیا اور صدر الدّین نام اختیار کیا۔ اس کے سالے راون چندر نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ پھر ان کی تقلید میں اور لوگوں نے بھی آغوش اسلام میں پناہ لینی شروع کر دی۔ کشمیر میں ابھی تک ھندو اپنا معاشرتی نظام پوری طرح قائم نہیں کر پائے تھے، اس لیے معاشرتی سطح پر نو مسلموں کو کوئی خاص دقت پیش نہ آئی۔ رنچن سے پہلے سہدیو کے عہد (۱۳۰۰ تا ۱۳۲۰ء) میں کشمیر شرابیوں، جواریوں اور بدکاروں کا ملک بن چکا تھا۔ رنچن کے قبول اسلام کے بعد کشمیر میں ایک نیا دور شروع ہوا اور وھاں اخلاقی اعتبار سے ایک عظیم الشان انقلاب آ گیا۔ رنچن بلبل شاہ کی پاکیزہ اور مقدس سیرت سے اس قدر متأثر ہوا کہ اپنے محل کے پاس جہلم کے کنارے ان کے لیے ایک خانقاہ بنوائی اور اس میں ایک مسجد تعمیر کرائی، جس میں وہ نماز پنج گانہ ادا کرتا تھا۔ یہ وادی کشمیر کی پہلی مسجد تھی۔

یہ تو کشمیر کا ذکر تھا، لیکن دریائے سندھ کے کنارے درد قبائل رنچن کے قبول اسلام سے دو صدی پہلے، یعنی بارھویں صدی عیسوی ھی میں بدھ مت چھوڑ کر تیزی سے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تھے۔ رنچن کے مسلمان ہونے سے کشمیر کی سیاسی اور ثقافتی زندگی میں کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ ملک آزاد تھا، حکومت پر برھمنوں کا تسلط تھا اور سنسکرت سرکاری زبان تھی۔ مسلمانوں نے بھی سنسکرت سیکھی، یہاں تک کہ اب بھی اس زمانے کی بعض قبروں پر سنسکرت کے کتبے ملتے ھیں اور اسمائے معرفہ پر بھی سنسکرت کا اثر نظر آتا ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ اپنے

واضح قوانین کی وجہ سے اسلام نے بہت جلد سابقہ ہندو معاشرے کو متاثر کرکے ایک نئے اسلامی معاشرے کی تشکیل شروع کر دی۔ ہنود کا اعلٰی طبقہ اسلامی تعلیمات کی پاکیزگی اور سادگی سے متاثر ہوا تو ادنٰی طبقہ مساوات اسلامی اور معاشرے میں باعزت مقام ملنے سے خوش ہوا۔ الغرض فکری اور عملی لحاظ سے اسلام کا نظریۂ توحید ہر ایک کے لیے باعث کشش تھا۔

شرف الدّین بلبل شاہؒ کے بعد کئی اور بزرگ کشمیر میں تبلیغ اسلام کے لیے تشریف لائے، جن میں سیّد جلال الدّین بخاریؒ (۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء) اور سیّد تاج الدّینؒ اور ان کے ہمراہی سیّد حسین سمنانیؒ اور سیّد یوسفؒ قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں کی بدولت بہت سے کشمیری اسلام سے متعارف ہوئے؛ مگر جس بزرگ نے صحیح معنوں میں عقیدۂ توحید ان کے دلوں میں راسخ کیا وہ علی ثانی امیر کبیر سیّد علی ہمدانیؒ المعروف بہ شاہ ہمدان تھے، جو سہروردیہ سلسلے کی کبرویہ شاخ کے نامور بزرگ تھے۔ دولت شاہ انہیں تیموری دور کا سلطان العرفا والسادات لکھتا ہے۔

سیّد علی ہمدانیؒ کا تعلق ہمدان کے حسنی سادات کے ایک معروف گھرانے سے تھا۔ علوم معقول و منقول کی تحصیل کے بعد وہ تہذیب نفس اور عرفان حقیقت کے ادراک کے لیے چھے سال تک خلوت گزیں ہو کر ذکر و مراقبہ اور ریاضت و عبادت میں مصروف رہے۔ پھر اکیس سال تک انھوں نے بلاد اسلامیہ کے علاوہ دیگر ممالک کی سیر و سیاحت کی اور سیکڑوں اولیاے کرام سے افاضہ و استفاضہ کیا۔ یہ زمانہ امیر تیمور کی ابتدائی یلغاروں کا تھا۔ ماوراء النہر میں اس سے اختلاف ہوا تو وہ سات سو سادات اور مریدوں سمیت ربیع الاوّل ۷۷۴ھ/۱۳۷۲ء میں کشمیر تشریف لے آئے۔ چھے ماہ کشمیر میں گزارنے کے بعد وہ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے چلے گئے، جہاں سے ۷۸۱ھ/۱۳۷۹ء میں لوٹے۔ تقریباً اڑھائی سال یہاں قیام کیا اور پھر لداخ کے راستے ترکستان تشریف لے گئے۔ شاہ ہمدانؒ کا کشمیر میں تیسری بار ورود ۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء میں ہوا، لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے انھیں جلد ہی کشمیر کو خیرباد کہنا پڑا۔ پکھلی کے حاکم سلطان محمّد کی درخواست پر وہاں دس روز مقیم رہنے کے بعد وہ کافرستان میں کنار پہنچے تو مرض کا پھر حملہ ہوا اور وہاں ۵ ذی الحجہ ۷۸۶ھ/۱۸ جنوری ۱۳۸۵ء کو ان کا وصال ہو گیا۔ ختلان میں کولاب کے مقام پر ان کا مقبرہ آج مرجع خلائق ہے۔ سری نگر کے عین قلب میں ان کی خانقاہِ معلّٰی ان کے فرزند میر محمّد نے تعمیر کرائی، جو شاہ ہمدان کی مسجد اور زیارت کہلاتی ہے۔ ان کے ہمراہیوں نے بھی متعدد خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ یہ کشمیر میں تبلیغ اسلام کے بہت بڑے مرکز تھے۔ شاہ ہمدان کی تشریف آوری کے وقت عوام اور والیِ کشمیر ابھی تک ہندو عقیدوں کو اپنائے ہوئے تھے، بت خانوں میں آمد و رفت اور برہمنوں کی تکریم بدستور جاری تھی اور حاکم غیر اسلامی لباس پہنتے اور غیرشرعی امور پر کار بند تھے۔ ان کی فہمائش پر حاکم نے ہندوانہ لباس ترک کرکے شاہان ترک کی مانند لمبا چغہ پہننا شروع کیا، احکام شریعت کا رواج ہوا اور ہر طرف اسلامی روح کا ذوق و شوق پیدا ہو گیا۔ شاہ ہمدان نے آتے ہی دو ہندو سنیاسیوں کو مسلمان کیا۔ اس کے بعد لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ شاہ ہمدان ایک اچھے انشا پرداز اور شاعر بھی تھے۔ تحائف الابرار میں ان کے ۱۷۰ رسائل کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں سے ستر سے زیادہ تصنیفات کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ذخیرۃ الملوک کا لاطینی، فرانسیسی،

ترکی اور اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔ ان تمام رسائل کا مقصد انسانی اخلاقیات کی تبلیغ اور امراض نفسانی کی تشخیص اور ان کا علاج ہے ۔ شاہ ہمدانؒ کے اشعار میں جذبۂ عشق جاری و ساری ہے اور روحانی واردات اصطلاحات میں بیان کی گئی ہیں اور وہ ابن العربیؒ سے متاثر نظر آتے ہیں ۔ شاہ ہمدان کی وجہ سے دستی صنعتوں کو بھی فروغ حاصل ہوا اور علامہ اقبال کے قول کے مطابق دل پذیر اور عجیب و غریب صناعی سے کشمیر کو ایران صغیر بنا دیا ۔ شاہ ہمدانؒ نے فی الواقع کشمیر میں ذہنی، فکری اور نظری انقلاب پیدا کیا اور اسے علم، صنعت، تہذیب اور دین کا عطیہ دیا ۔ وہ حقیقی معنوں میں کشمیر کے ولی، صوفی اور رہنما ہیں ۔

شاہ ہمدانؒ اور ان کے پاکیزہ سیرت ہمراہیوں کی وجہ سے چودھویں صدی عیسوی (بالخصوص اس کے ربع آخر) میں ایک عجیب مذہبی فضا پیدا ہوئی ۔ ان ایام میں مشہور صوفی خاتون للّہ عارفہ کی بڑی شہرت ہوئی ۔ اسی زمانے میں شیخ نور الدّینؒ ریشی جیسے تارک الدنیا بزرگ بھی پیدا ہوئے، جو کشمیر میں نندرشی کے نام سے مشہور ہیں اور کشمیر کے محافظ ولی (Patron-Saint) سمجھے جاتے ہیں ۔ روایت ہے کہ انھوں نے للّہ عارفہ کا ذودھ پیا تھا ۔ ریشی نامہ اور نور نامہ میں ان کا ذکر اور ان کے ملفوظات موجود ہیں ۔ انھوں نے ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء میں بعہد سلطان زین العابدین اعظم وفات پائی (تاریخ وفات "شمس العارفین" سے برآمد ہوتی ہے) اور سری نگر سے بیس میل جنوب مغرب میں چراڑ کے مقام پر مدفون ہوئے ۔ کشمیر میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ افغان صوبیدار عطا محمّد خان نے ان کے نام کے سکّے ضرب کرائے ۔ دنیا بھر کے اولیاے کرام میں غالبًا شیخ نور الدّین ریشی واحد بزرگ ہیں جن کے نام کے سکّے رائج ہوئے ۔

ان کے بعد ان کے اتباع میں ریشی بزرگوں کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہو گیا، جو انھیں ان کی طرح تارک الدنیا تھے اور عوام و خواص ان سے نور ایمان حاصل کرتے تھے ۔ ان بزرگوں کی تقدیس اور نفس کشی کا ذکر ابو الفضل اکبر نامہ میں کرتا ہے اور جہانگیر اپنی توزک میں کہتا ہے کہ اس کے زمانے میں اس قسم کے دو ہزار بزرگ کشمیر میں موجود تھے ۔ لوگ گروہ در گروہ اسلام قبول کرتے تھے اور نئے مذہب نے ان کے دلوں میں جو ولولہ اور جوش پیدا کیا تھا اس کی وجہ سے اپنے مندروں کو گراتے تھے، اس لیے کہ وہ بت پرستی کے مراکز تھے، اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کرکے ان میں خداے واحد و لا شریک کی عبادت کرتے تھے ۔

شاہ ہمدانؒ کے بعد ان کے فرزند میر محمّد ہمدانی تین سو سادات اور علماے کبار کے ساتھ کشمیر تشریف لائے ۔ ان کی وجہ سے بھی اس اسلامی تصوف کو فروغ حاصل ہوا جس کا دارومدار سر تا سر کتاب و سنت پر تھا ۔ اسی بنا پر کشمیری مسلمان فقہ و تصوف کے لحاظ سے کافی حد تک افراط و تفریط سے بچ گئے ۔ سلطان سکندر (۱۳۸۹ تا ۱۴۱۳ء) ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتا تھا اور انھیں اپنا استاد اور مرشد سمجھتا تھا ۔ ان کے زیر اثر سلطان نے ملک میں شرعی احکام کو سختی سے نافذ کیا، شراب اور دوسری خمریات کے استعمال کے علاوہ قمار بازی اور رقص و سرود کو ممنوع کر دیا (صرف طبل اور فوجی باجا بجانے کی اجازت تھی) اور شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کیا تاکہ اسلامی قوانین کا نفاذ مناسب طور پر ہوتا رہے؛ شیخ الاسلام کے ذمّے ان اوقاف کے انتظام و انصرام کا کام بھی تھا جو سلطان نے مسافروں، علما، سادات اور غیر مستطیع اشخاص کے فائدے کے لیے قائم

کیے تھے - سلطان نے مساجد اور خانقاهیں تعمیر کرائیں، بچوں کی تعلیم کے لیے مدرسے کھولے اور ستی کی رسم بند کرائی - میر محمّد همدانیؒ کے هاتھ پر دیگر هندووں کے علاوہ سلطان سکندر کا وزیراعلٰی اور سپہ سالار سوہ بھٹ بھی مسلمان هوا، جس کا نام سیف الدّین رکھا گیا - سیف الدّین نے نو مسلم هونے کے جوش میں مندر گرائے، جس کی بنا پر لوگ سکندر کو بت شکن کہتے هیں - میر محمّد همدانی نے سوہ بھٹ کے اس جوش کو دیکھ کر لااکراہ فی الدّین کی تلقین کی اور دین کے سلسلے میں جبر و تشدد سے منع کیا - میر صاحب مصنف بھی تھے - انھوں نے رسالۂ سکندری کے علاوہ منطق پر بھی عربی میں ایک کتاب لکھی - انھوں نے بیس سال کشمیر میں گزارے اور بمقام ختلان ۸۵۴ھ/ ۱۴۵۰ء میں وفات پائی ۔

سلطان سکندر کے بعد اس کے دوسرے بیٹے سلطان زین العابدین اعظم کے پچاس سالہ دور حکومت (۱۴۲۱ تا ۱۴۷۱ء) میں اسلام کے ساتھ اسلامی معاشرے کو مستحکم هونے کا موقع ملا - وہ ایک انصاف پسند حکمران تھا - غیرمسلموں کے ساتھ اس کا برتاؤ منصفانہ اور روادارانہ تھا - اس کے والد کے زمانے میں جن برهمنوں کو جبریہ مسلمان بنایا گیا تھا انھیں اجازت دے دی گئی کہ اگر وہ چاهیں تو اپنا آبائی مذهب دوبارہ اختیار کر سکتے هیں - اس نے برباد شدہ مندروں کی از سر نو مرمت کرائی اور غیر مسلموں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے انھیں اعلٰی عہدے دیے - وہ گوشت بھی نہیں کھاتا تھا، تاهم اسے اسلام سے فطری لگاؤ تھا اور وہ مذهبی فرائض کا سختی سے پابند تھا - لوگ اسے ولی سمجھتے تھے - زینہ لنکا میں اس نے چلہ کشی کی - اس کی نگاہ کبھی نا محرم عورت پر نہ پڑی - امور حکومت میں وہ شیخ الاسلام کے مشورے سے کام کرتا تھا - اس نے علما اور مشائخ کو غیر ممالک سے کشمیر میں آنے کی دعوت دی، متعدد مسجدیں اور خانقاهیں تعمیر کرائیں اور ایک دارالعلوم قائم کیا، جس کے صدرمدرس مولانا کبیر تھے - اس میں نامور اساتذہ تعلیم دیا کرتے تھے اور طلبہ کے لیے دارالاقامہ تھا - اس نے خود بھی تفسیر و حدیث مولانا کبیر سے پڑھی تھی - کشمیر کا وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے ایک ضابطۂ قانون بنایا - قانون کے معاملے میں وہ اپنے بیٹے یا بھائی سے بھی رعایت نہ برتتا تھا - اس کی انصاف پرستی اور رواداری کا یہ نتیجہ نکلا کہ برهمنوں نے بھی فارسی پڑھی - سنسکرت کی کئی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں هوا - ادھر فارسی کی کتابوں کا بھی سنسکرت میں ترجمہ هوا - سلطان خود شاعر اور مصنف تھا - اس نے فارسی زبان میں دو کتابیں لکھیں - علاوہ بریں رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بھی اس نے بہت سے کام کیے - سلطنت بھی وسیع تھی - ان تمام امور کی بنا پر اسے اهل کشمیر آج تک بڈ شاہ [رکّ باں] کے لقب سے یاد کرتے هیں، جس کا مطلب ہے بادشاہ اعظم ۔

۱۴۸۷ء میں شیخ شمس الدّین عراقی کشمیر میں آئے - ان کی وجہ سے چک حکمرانوں نے شیعیت قبول کی - اسی زمانے کے ایک اور صوفی بزرگ شیخ حمزہ مخدوم (م ۱۵۷۶ء) حدیث، تفسیر اور فقہ کے ممتاز عالم تھے - ان کا مزار کوہ ماران کی ڈھلان پر ہے - موسم بہار میں بادام کے درختوں پر پھول آتے هیں تو ان کا عرس منعقد هوتا ہے - هندوستان میں مغلیہ سلطنت قائم هوئی تو شاهنشاہ جلال الدّین اکبر نے ۱۵۸۶ء میں ریاست کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا، لیکن جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر کیا جا چکا ہے اس الحاق سے پہلے پندرهویں صدی عیسوی هی میں خاندان شاہ میر کے زمانے میں مسلمانوں کی یہاں اکثریت هو چکی تھی - مشہور صوفی شیخ یعقوب صرفی (م ۱۵۹۵ء) اکبری دور هی میں

گزرے ہیں، جو فارسی زبان کے نامور شاعر بھی تھے جو شریعت کو طریقت سے الگ رکھنے کے قائل نہیں تھے ۔ انھیں کی شکایت پر اکبر فتح کشمیر کے لیے آمادہ ہوا تھا۔ اسی عہد میں یہاں بابا بھائی والؒ بھی تھے جن کی خدمت میں حضرت باقی باللہؒ (م ۱۶۰۳ء) حاضر ہوے تھے ۔ مغول کے زمانے میں نقشبندی بزرگوں نے کشمیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور ترویج میں بڑا حصہ لیا۔ خواجہ کمال الدّین نقشبندیؒ شریعت و طریقت کی پابندی پر زور دیتے تھے ۔ انھوں نے ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء میں شہادت پائی ۔ نقشبندی سلسلے کے جامع کمالات بزرگوں میں خواجہ نورالدّین محمّد آفتاب کشمیریؒ (م ۱۶۷۵ء)، شیخ شرف الدّین محمّد کشمیریؒ (م ۱۷۵۷ء) اور شاہ محمّد صادق قلندرؒ (م ۱۷۵۷ء) کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ اس دور میں بھی باہر سے علمائے اسلام کا کشمیر میں ورود ہوتا رہا ۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے شاہ فرید الدّین قادریؒ ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء میں وادی کشتواڑ میں تبلیغ کے لیے آئے ۔ ان کی سعی سے وہاں کے راجہ کرت سنگھ نے اسلام قبول کیا اور اورنگ زیب عالمگیر نے اس کا نام سعادت یار خان رکھا۔ شاہ فرید الدّین کے بعد ان کے فاضل فرزند اخیار الدّینؒ (م ۱۷۲۵ء) نے اپنے والد کے کام کو جاری رکھا۔ مغول دور میں ایک اور بزرگ ملّا شاہ قادریؒ (م ۱۶۶۱ء) نے بھی کشمیر میں قابل قدر کام کیا ہے ۔ وہ حضرت میاں میر قادری لاہوریؒ (م ۱۶۳۵ء) کے خلیفہ تھے ۔ خرقۂ خلافت پہننے کے بعد کشمیر میں توطن اختیار کیا ۔ وہ اکثر وقت تبلیغ اسلام میں صرف کیا کرتے تھے، جس سے متأثر ہو کر بہت سے ہندو حلقۂ اسلام میں داخل ہوے ۔ وہ صاحب تصنیف بزرگ تھے اور شاعر بھی تھے ۔ متأخر مغول شہنشاہوں کے زمانے میں بھی اولیاے کرام نے تبلیغ اسلام کا سلسلہ جاری رکھا ؛ چنانچہ مقبوضہ کشمیر کے موجودہ وزیر اعلٰی شیخ محمّد عبداللہ کے جدّ اعلٰی نے میر عبد الرّشید بیہقی (م ۱۷۶۶ء) کی تبلیغ سے اسلام قبول کیا اور اس کا نام شیخ عبداللہ رکھا گیا ۔ ڈوگرا راج کے دوران میں بھی ایک قابل ذکر شخص وریام سنگھ تحصیلدار، شاہ عبدالرحیم صفاپوری کی تبلیغ سے دولت اسلام سے بہرہ ور ہوا ۔ سہروردی، ریشی، نقشبندی اور قادری بزرگوں کے علاوہ سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں کے اثرات بھی وادی کشمیر میں نظر آتے ہیں ۔ جلالپور (ضلع جہلم) کے سیّد غلام حیدر شاہؒ چشتی [رکّ بآں] (م ۱۹۰۸ء)، سے جو اسوۂ نبویؐ کے مقلد اور اخلاق احمدیؐ کا نمونہ تھے، وادی کشمیر کے لوگ بھاری تعداد میں ان سے مستفیض ہوے ۔ ان کے پوتے ابو البرکات محمّد سیّد فضل شاہؒ (م ۱۹۶۶ء) نے جو اعلٰی درجے کے خطیب اور مصنف بھی تھے، یہ فیض جاری رکھا، انھوں نے کئی برس تک وادی کشمیر کا دورہ کیا اور ذکر حبیب کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں حقیقت تصوف اور اپنے جد بزرگوار کی سیرت عالمانہ انداز میں بیان کی ۔ مرور ایام سے کشمیری مسلمان مزارات و مقابر سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ ان اولیاے کرام کے مرقد تھے جو اسلام کا پاکیزہ نمونہ بن کر کشمیر میں آئے اور پرامن طریقے سے اہل کشمیر کو روح اسلام سے بہرہ ور کیا ۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے موقع پر جہاد کشمیر شروع ہوا تو ان کی جماعت حزب اللہ کے رضا کار کرناہ، اوڑی اور ٹیٹوال کے محاذ پر لڑتے رہے ۔

کشمیر کے نامور علما میں سے یعقوب صرفیؒ کا ذکر اولیاے کرام کے ضمن میں بھی آ چکا ہے ۔

وہ صحیح بخاری کے شارح تھے اور انھوں نے حاشیہ توضیح تلویح کے علاوہ فیضی کی تفسیر سواطع الالہام کی عربی میں تقریظ بھی لکھی ۔ فارسی میں مغازی النبی بھی ان کی تصنیف ہے ۔ اخوند ملّا کمال عربی اور دینی علوم میں اتنی فضیلت رکھتے تھے کہ حضرت مجدد الف ثانی اور ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی، سیالکوٹ میں ان سے مستفید ہوے ۔ فتاوی عالمگیری تیاز کرنے والے علما میں مولوی خیر الدّین ابو الخیر کشمیری بھی شامل تھے۔ آگے چل کر فرخ سیر نے فتاوی عالمگیری کے ترجمے کے لیے ایک کشمیری ملّا عبیداللہ کو مقرر کیا ۔ ملّا محمّد سعید گندسو دوم نے مفاتیح البرکات کے نام سے قرآن مجید کا ترجمہ کیا ۔ انھیں صحیح بخاری زبانی یاد تھی اور بخاری کے نام سے مشہور تھے ۔ شیخ حمزہ مخدومی بڑے فاضل بزرگ تھے ۔ تیراہ کے شاہ محمّد تنولی نے ان سے اکتساب فیض کیا۔ خواجہ محمّد ٹوپی گر کے علم و فضل کی اتنی شہرت تھی کہ بیرون کشمیر سے طالب علم بھی ان کے پاس آتے اور صرفی نحوی بن کر واپس جاتے ۔ حاجی محمّد کشمیری فقہ اور حدیث کے نامی عالم تھے، انھوں نے شمائل ترمذی، عقائد العضدیہ اور حصن حصین کی شرحیں اور فارسی میں تفسیر القرآن لکھی ۔ مولوی چراغ علی، جن کی عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں تصانیف موجود ہیں، سری نگر سے پنجاب چلے آئے تھے ۔ مولوی جلال الدّین نے عربی میں فقہ کی مشہور کتاب در مختار کی شرح لکھی ۔ آغا سیّد مہدی شیعہ عالم اور عربی و فارسی کی کئی کتابوں کے مصنف تھے ۔ مفتی صدر الدّین دہلوی کشمیری الاصل تھے ۔ اسی طرح علامہ تفضل حسین کا شمار برصغیر کے مشہور علما میں ہوتا ہے ۔ وہ عربی، فارسی، انگریزی میں مہارت رکھتے تھے ۔ شیخ الحدیث مولانا محمّد انور شاہ کشمیری کئی برس تک دارالعلوم دیو بند کے مدرس اعلٰی رہے ۔ انھوں نے صحیح بخاری کی شرح چار جلدوں میں تالیف کی اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی تعریف میں کئی قصائد عربی زبان میں لکھے ۔ میر واعظ مولوی رسول شاہ کو علوم دینی میں بڑی دسترس تھی ان کے تلامذہ میں مفتی محمّد شاہ سعادت کشمیری تھے، جو بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں ۔ برصغیر کے سب سے نامور شاعر حکیم مشرق علامہ اقبال [رک بآں] بھی کشمیری الاصل تھے ۔

کشمیر میں علم طب پر بھی ایک جامع کتاب کفایۂ منصوری کے نام سے لکھی گئی جو ہندوستان میں کئی بار چھپ چکی ہے۔ اس کے مصنف منصور بن محمّد بن احمد بن یوسف بن الیاس سلطان زین العابدین کے شاہی طبیب تھے ۔

فارسی شعر و ادب اور مصوری کے سلسلے میں یہاں کچھ زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں ۔ شبلی اور دوسرے مصنفین، ہند کی فارسی شاعری کے ضمن میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں ۔ ان میں غنی کاشمیری کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی ۔ دیگر شعرا کے لیے دیکھیے غلام محی الدّین صوفی *Kashir*، ۲ : ۳۴۶ ببعد .. اسی طرح کشمیری زبان کی شاعری کے لیے دیکھیے وہی کتاب، ۲ : ۱۷ ببعد .

اس کے علاوہ کشمیر کے قدرتی مناظر اور اہل کشمیر کی پیشہ ورانہ زندگی کے متعلق بھی دیکھیے : غلام محی الدّین صوفی : Kashir، ج ۲ .

مآخذ : (۱) محمّد الدّین فوق : مکمل تاریخ کشمیر، ج ۱، لاہور ۱۹۳۱ء و ج ۳، لاہور ۱۹۱۲ء: (۲) غلام محی الدّین صوفی : *Kashir*، ج ۱، لاہور ۱۹۴۸ء و ج ۲، لاہور ۱۹۴۹ء؛ (۳) محب الحسن : کشمیر سلاطین کے عہد

میں، مترجمۂ علی حماد عباسی، اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء؛ (۴) *The Statesman's Year - Book 1975 - 1976*، لنڈن، ۱۹۷۵ء، بمدد اشاریہ؛ (۵) ممتاز احمد: مسئلۂ کشمیر، لاھور ۱۹۷۰ء؛ (۶) تھامس آرنلڈ: *Preaching of Islam*، بار دوم، ص ۲۹۱؛ (۷) صفدر محمود: *Pakistan Affairs*، لاھور ۱۹۷۰ء؛ (۸) *Twenty Years of Pakistan*، کراچی ۱۹۶۷ء؛ (۹) کے - کے - عزیز: *Discovery of Pakistan*، لاھور ۱۹۵۷ء؛ (۱۰) اکبر خان: *Raiders in Kashmir*، کراچی ۱۹۷۰ء؛ (۱۱) مشتاق احمد گورمانی: مسئلۂ کشمیر کا جائزہ، مطبوعۂ لاھور؛ (۱۲) کشمیر الحاق کے بعد، مطبوعۂ لاھور؛ (۱۳) مشتاق احمد: جہاد کشمیر، لاھور ۱۹۴۸ء؛ (۱۴) محمد عبداللہ قریشی: آئینۂ کشمیر، مطبوعۂ لاھور؛ (۱۵) مقبول بیگ بدخشانی: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند، ج ۴، فارسی ادب، لاھور ۱۹۷۱ء؛ (۱۶) غلام سرور: خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، مطبوعۂ کانپور؛ (۱۷) محمد الدین: ذکر حبیب، پنڈی بہاءالدین، ۱۹۲۳ء؛ (۱۸) عبدالغنی: امیر حزب اللہ، جلال پور ۱۹۶۵ء؛ (۱۹) ظہور الدین احمد: پاکستان میں فارسی ادب، ج ۱، مطبوعۂ لاھور؛ (۲۰) محمد صادق قصوری: اکابر تحریک پاکستان، گجرات، ۱۹۷۶ء، ص ۲۶۴؛ (تعلیقہ عبدالغنی، مدیر ادارہ، نے لکھا)۔

[ادارہ]

⊗ **کشمیری زبان و ادب**: درد خاندان کی زبانوں سے اساسی تعلق رکھنے کے باوجود کشمیری زبان اپنی موجودہ ھیئت کے اعتبار سے اسلامی اثرات کی بدولت وجود میں آئی - یہ جموں کے بعض علاقوں، وادی کشمیر اور آزاد کشمیر میں بولی جاتی ھے - ادبی اور صوتی لحاظ سے اسے چھے درجوں میں تقسیم کیا گیا ھے: (۱) کاشر: وہ کشمیری جو خاص وادی کشمیر میں بولی جاتی ھے اور اسے معیاری کشمیری تصور کرنا چاھیے؛ (۲) کشتواڑی: وہ کشمیری جو صوبۂ جموں میں بولی جاتی ھے اور صوبۂ جموں کے علاقۂ کشتواڑ سے منسوب ھے؛ (۳) کندور کشمیری: وہ کشمیری جو شہروں کے پڑھے لکھے لوگ بولتے ھیں؛ (۴) گامی کشمیری: وہ کشمیری جو دیہات میں بسنے والے کسان ملاح اور مزدور بولتے ھیں، اور جسے ٹھیٹ یا کھردری کشمیری کہنا زیادہ موزوں ھے؛ (۵) ھندو کشمیری: وہ کشمیری جس میں سنسکرت یا ھندی کے الفاظ و تراکیب ھوں؛ (۶) مسلمانی کشمیری: وہ کشمیری جس کا رواج مسلمان گھرانوں میں ھے اور اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ و تراکیب، نیز اصطلاحیں اور محاورے بکثرت ملتے ھیں -

ایک زمانہ تھا جب نسانیات کے ماھر کشمیری کو سنسکرت کی بیٹی تصور کرتے تھے، لیکن جدید تحقیقات نے اس تصور کو باطل قرار دیا ھے - دراصل کشمیری سنسکرت کی بہ نسبت قدیم زبان ھے اور آریاؤں کی آمد سے پہلے بھی وادی کشمیر میں بولی جاتی تھی - آریاؤں کی آمد سے پہلے کشمیر میں ناگا لوگ آباد تھے، جنھیں نائیر Nayar بھی کہا گیا ھے - گویا کشمیری ناگاؤں اور نائیروں کی زبان ھے نہ کہ ان کے بعد آنے والے آریاؤں کی - اس امر کا ثبوت خود کشمیر کا لفظ مہیا کرتا ھے - کشمیر کا قدیم نام ستی سر (= بلند تالاب) ھے - اس قدیم نام کی جگہ کشمیر کا نام تجویز ھوا - "کا" پانی کو کہا جاتا ھے اور "سمیرا" ھوا کا نام ھے - یہ دونوں پراکرت لفظ جب مل گئے تو کاسمیرا یا کشمیرا یا کشمیر کی ترکیب وجود میں آئی، یعنی وہ زمین جہاں سے ھوا کے ذریعے پانی نکالا گیا ھو - لفظ کشمیر کی دوسری تعبیر یہ ھے کہ پراکرت میں "کَس" نہر یا ندی کو کہا جاتا ھے

(پنجابی میں بھی ندی اور نالے کے لیے "کسی" کا لفظ مروج ہے) اور میر کا مطلب ہے پہاڑ (جیسے شرح میر یا پلمیر) ۔ اس تعبیر کے مطابق کسمیر یا کشمیر وہ ندی یا نہر ہے جو پہاڑ میں سے نکالی گئی ہے ۔ کشمیر واقعی جغرافیائی اعتبار سے ایک بہت بڑی ندی یا جھیل ہے جس کے اردگرد پہاڑی دیواریں کھڑی ہیں (وادی کشمیر ۸۴ میل لمبی اور ۲۰ سے ۲۵ میل تک چوڑی ہے) ۔ اہل کشمیر ، وادی کشمیر کو کشمیر کے بجائے کشیر کہتے ہیں ۔ یہ لسانی ترمیم بھی لفظ کشمیر کی پراکرت اصل کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ سر ایرل سٹائین کے مطابق لفظ "کشیر" لفظ کشمیر کا محض صوتی تغیر ہے ۔ کشمیر کے لوگ کشمیر کا لفظ ادا کرتے وقت "م" کو حذف کر دیتے ہیں ۔ ماہرین جغرافیہ کے نزدیک لفظ کشمیر کو مروج ہوئے ۲۳۰۰ سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو چلا ہے ۔

پروفیسر سدھیشور ورما نے کشمیری زبان کے بارے میں لکھا ہے : "کشمیری زبان کی خصوصیت اس کا نہایت ہی پیچیدہ اور لطیف نظام حروف علّت ہے ۔ اس میں ایسے باریک حروف علّت، موجود ہیں جنہیں صرف بولنے والا ہی محسوس کر سکتا ہے ۔ سننے والے کو وہ سنائی نہیں دیتے ۔ اگر سنائی دیتے بھی ہیں تو کوشش اور توجہ کے بعد ۔ اس کے علاوہ یہ صوتی شکلیں ایسی پراسرار ہیں جنہیں صوتی علامات میں قلمبند کرنا اور ان کی حقیقت کو سمجھنا ایک ماہر صوتیات کے لیے بھی نہایت مشکل ہے" ۔

کشمیری زبان و ادب خصوصاً شاعری کو تاریخی طور پر پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

پہلا دور : گیت سنگیت، یعنی قدیم ترین دور، مذہبی و اخلاقی لوک گیتوں پر مشتمل؛

دوسرا دور : شتی کنتھ سے شیخ نور الدّین نورانی تک؛

تیسرا دور : حبہ خاتون سے ارنیمال تک؛

چوتھا دور : محمود گامی سے عزیز اللہ حقانی تک؛

پانچواں دور : غلام احمد مہجور سے طاؤس بانہالی تک ۔

ہر زبان کی طرح کشمیری ادب کی ابتدا لوک گیتوں سے ہوئی ۔ یہ لوک گیت حمد اور بھجن سے بے حد مماثلت رکھتے ہیں ۔ ان لوک گیتوں میں پرماتما، اوتاروں اور مختلف دیوی دیوتاؤں کی برتری اور عظمت کو تسلیم کرنے کے علاوہ قلب و روح کی طہارت پر زور دیا گیا ہے ۔ گویا یہ آج کے مفہوم میں لوک گیت کم اور بھجن زیادہ ہیں ۔ ان اخلاقی اور روحانی لوک گیتوں میں دھرتی ، سورج ، چاند ، دریاؤں ، جھیلوں ، چشموں ، پہاڑوں، بادلوں اور دوسرے مظاہر فطرت کی بھی توصیف کی گئی ہے اور خدا کی وحدانیت، فکر کی آزادی اور روح کی نجات پر زور دیا گیا ہے ۔ ان پر ناگا مت ، شومت اور بدھ مت کی مخصوص تعلیمات کا اثر نمایاں ہے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوک گیتوں کے دور کے بعد سب سے پہلا شاعر شتی کنتھ بھی روحانی اور اخلاقی موضوعات کو اپناتا ہے اور اپنے ان موضوعات اور تصورات کو سنسکرت آمیز کشمیری میں پیش کرتا ہے ۔

کشمیری ادب کے دوسرے دور کا دوسرا اہم شاعر مرد نہیں ایک خاتون ہے، جو للّہ عارفہ کے نام سے مشہور ہے ۔ للّہ عارفہ کو لل دید Lal Ded بھی کہا جاتا ہے ۔ ان کا اصلی (ہندوانہ) نام پرماوتی ہے ۔ (بعض کا خیال ہے کہ للّہ عارفہ جوگن

اور شومت کی پیروکار تھی ۔ اس نے یوگا کی تعلیم اپنے استاد سدھ سے حاصل کی ۔ پھر اسے عام کرنے کے لیے گلی کوچوں میں گھومتی پھری اور شعر کو اس نے ذریعۂ اظہار بنایا ۔ اس کے اشعار اشلوک کے نام سے مشہور ہوے، جنھیں مجموعی طور پر لل وکھی، یعنی للّہ عارفہ کی کہاوتیں یا باتیں، کہا جاتا ہے ۔ بہرکیف وہ مسلمانوں اور ہندووں دونوں کے نزدیک واجب الاحترام رہی ہے) ۔ وہ چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں کشمیر کے تیسرے مسلمان بادشاہ سلطان علاء الدّین کے عہد (۱۳۴۳ تا ۱۳۵۴ء) میں پیدا ہوئی ۔ یہ وہ دور تھا جب اسلام کے احسانات اور اثرات سے ہندو اور کشمیر کے دوسرے مذہبی فرقوں کے لوگ فیض یاب ہو رہے تھے ۔ للّہ عارفہ نے بھی مسلم مبلغوں، خصوصاً سیّد علی ہمدانی[۳]، سے کسب فیض کیا ۔ وہ مؤخرالذّکر بزرگ سے روحانی طور پر بہت متاثر تھی، جس کی جھلک اس کی شاعری میں بھی ملتی ہے ۔

کشمیری ادب کے تیسرے دور میں دو اور خواتین، حبہ خاتون اور ارنی مال، کشمیری شاعری پر چھائی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ ان کے گیتوں کو کشمیری زبان کے ادب عالیہ میں بلند مقام حاصل ہے ۔ "ارنی مال اور حبہ خاتون کے ذاتی دکھوں، پنہاں فلسفے اور نظریۂ زندگی میں اس قدر مماثلت ہے کہ اگر ہم ایک شاعرہ کے بارے میں سوچیں تو دوسری فوراً ذہن میں آ جاتی ہے ۔ ان کے پیار اور محبت کے زمزموں کی اہمیت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ ان کا کلام وادی کشمیر کی عام عورتوں کی افسردگیوں، تکلیفوں، آرزووں، حسرتوں، چیخوں اور کراھوں کی عکاسی کرتا ہے ۔ انھوں نے اپنی زندگیوں میں جو دکھ سہے وہ اگرچہ ذاتی نوعیت کے تھے، لیکن ان کی قومی اہمیت اس لیے ہے کہ حبہ خاتون اور ارنی مال کی طرح تمام کشمیری عورتوں سے وہ تمام کچھ چھین لیا گیا تھا جس سے زندگی قابل قدر ہوتی ہے ۔ استعارے کی زبان میں یہی بات یوں ادا کی جائے گی کہ ان سے بے وفائی اور بد عہدی ہوئی تھی ۔ وہ مجبور، مقہور اور بے بس تھیں ۔ انھوں نے اپنا دامن بہتر دنوں کی امید سے باندھ لیا تھا" (پریم ناتھ بزاز : *Daughters of the Vitasta*، ص ۱۷۸) ۔

کشمیری شاعری چوتھے دور میں فارسی شاعری سے بے حد متاثر نظر آتی ہے ۔ اس دور کا سب سے بڑا شاعر محمود گامی ہے، جس نے ۱۸۵۵ء میں وفات پائی (بعض نسخوں میں تاریخ وفات ۱۸۸۵ء درج ہے) ۔ اس دور کے دوسرے مشہور شاعر مقبول شاہ کرالہ واری اور رسول میر ہیں ۔

کشمیری شاعری کا جدید دور ۱۹۰۰ء سے شروع ہوتا ہے ۔ اس دور کا ممتاز ترین شاعر پیرزادہ غلام احمد مہجور (ولادت ۱۸۸۸ء) کشمیری کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتا تھا ۔ مہجور دراصل مسلمان عوام کا شاعر ہے ۔ وہ حب وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے لیے تیار رہا ۔ انسانوں سے پیار، آزادی فکر و عمل اور مناظر فطرت اس کی شاعری کے موضوعات ہیں ۔ اس کی شاعری کی بنیاد موسیقی ہے اور وہ جو بات بھی کہتا ہے اس میں شرینی اور دلکشی پائی جاتی ہے ۔ اس کے کلام کے دو مجموعے کلام مہجور اور پیام مہجور چھپ چکے ہیں ۔ ۱۹۴۷ء میں مہجور نے ڈوگروں کی سنگینوں کے تلے کھڑے ہو کر "میرا دل پاکستان کے ساتھ ہے" کا نعرہ لگایا ۔ ڈوگرہ حکومت نے اسے گرفتار کرکے جیل میں ٹھونس دیا اور وہ جیل ہی میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا اللہ کو پیارا ہو گیا ۔

مہجور کا ہم عصر عبدالاحد آزاد بھی روندی اور ٹھکرائی ہوئی انسانیت کا شاعر اور مزاج کے اعتبار سے انقلابی ہے؛ لیکن مہجور کی طرح وہ بھی سیاسی نہیں، عمرانی انقلاب لانا چاہتا ہے ۔ بعض نقادوں نے اس کی انقلابی شاعری کے پیش نظر آزاد کو مہجور سے بڑا شاعر گردانا ہے، مگر یہ درست نہیں ۔ مہجور حقیقت کا ادراک رکھتا ہے ۔ اس میں جوش و ہوش پہلو بہ پہلو ملتے ہیں ، مگر آزاد کا جوش جنون کی اس حد کو چھونے لگتا ہے جہاں حقیقت تصور میں بدل کر ناقابل عمل ہو جاتی ہے ۔

قیام پاکستان، یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد آزاد کشمیر اور پاکستان میں کشمیری زبان کے متعدد اچھے شاعر ابھرے ہیں ۔ ان میں احمد شمیم اور طاؤس بانہالی کے نام سر فہرست ہیں ۔ ان دونوں کے ہاں جدید احساس کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی بھی ملتی ہے اور شعری موضوعات کو فکر کی آنچ سے گہرائی اور گیرائی دیتے ہیں ۔

مآخذ کے لیے رک بہ قصّہ، کشمیری ۔

(سلیم خان گمی)

⊛ تعلیقہ : کشمیری زبان اپنی موجودہ صورت کے لیے اسلام کی مرہون منت ہے ۔ اسلام کشمیر میں چودھویں صدی عیسوی میں پھیلا ۔ اس وقت کی درباری زبان سنسکرت تھی ۔ سلطان شہاب الدّین کے دور (۱۳۵۴ تا ۱۳۷۳ء) سے فارسی زبان نے اس کی جگہ لینی شروع کر دی (دیکھیے محب الحسن : کشمیر سلاطین کے عہد میں، اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء، ص ۳۹۸، ۴۰۲) ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کشمیری سلاطین سنسکرت کی سرپرستی سے دست کش نہیں ہوے، لیکن فارسی کے نظم و نسق اور ثقافت کی زبان بن جانے سے اس کا رواج کم ہوتا چلا گیا ۔ دربار سے باہر چودھویں صدی عیسوی میں بھی عوام کشمیری زبان ہی بولتے تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ للّٰہ عارفہ، جو ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوئی، کشمیری زبان میں شعر کہتی تھی ۔ شیخ نور الدّین ؒ ریشی (۱۳۷۷ تا ۱۴۳۸ء میں) کے ملفوظات، نور نامہ میں ملتے ہیں، جو کشمیری زبان میں ہیں ۔ للّٰہ عارفہ اور شیخ نورالدّین نے پرانی کشمیری زبان استعمال کی، جو چودھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی ۔ لسانیات کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ کشمیری زبان کی اساس دردی زبان کی ایک شاخ ہے ۔ اس میں سنسکرت کے الفاظ ان برہمنوں کی وجہ سے شامل ہوے جو دربار پر چھائے ہوے ہیں ۔

پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں شاہ ہمدان ؒ کی آمد کے بعد کم و بیش ڈیڑھ صدی کے اندر اندر کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی تھی ۔ اس دوران میں اس اکثریت کی جو زبان بنی وہ موجودہ کشمیری زبان ہے، جسے ہندو مصنفین مسلمانی کشمیری کا نام دیتے ہیں ۔ ہندو جو کشمیری بولتے ہیں اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں اور اسے ہندو کشمیری کہا جاتا ہے؛ لیکن ایک تو خود بہت سے ہندو مسلمانی کشمیری استعمال کرتے ہیں، دوسرے ہند و کشمیری بولنے والے اتنے تھوڑے ہیں کہ ہمارے نقطۂ نگاہ سے اسے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی؛ لٰہذا غالب اکثریت کی زبان، یعنی مسلمانی کشمیری، ہی وہ زبان ہے جس پر زیادہ تر توجہ مرکوز کرنی چاہیے ۔

کشمیر میں اشاعت اسلام شروع ہوئی تو مسجدیں تعمیر ہوئیں ۔ خانقاہوں اور مکتبوں کا قیام عمل میں آیا ۔ چونکہ کشمیر کے لوگوں نے قبول اسلام جماعتی طور پر کیا اس لیے تمام تہذیبی

اور ثقافتی تبدیلیاں اتنی تیزی سے ہوئیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ۔ علما اور صوفیہ نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تبلیغ و ارشاد کا فریضہ بڑی سرگرمی سے انجام دیا ۔ اسلام کا سارا مذہبی اور ثقافتی سرمایہ عربی اور فارسی زبانوں میں موجود تھا، اس لیے ان کا رواج روز بروز بڑھتا چلا گیا ۔ اکثر صوفیہ اور مبلغین ترکستان سے آتے تھے، جن کی مادری زبان ترکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عربی اور فارسی کے ساتھ ترکی کے الفاظ بھی کشمیری زبان میں بڑی تعداد میں شامل ہوگئے ۔ کشمیری میں اشاعت اسلام شروع ہوئی تو سعدی، رومی، نظامی، امیر خسرو اور حافظ کا ظہور ہو چکا تھا اور ان شعرا کا کلام وہاں بکثرت پڑھا جا رہا تھا ۔ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ فارسی کے شعرا کا اتباع کرتے ہوئے یوسف زلیخا، لیلی مجنون، شیرین و خسرو اور وامق و عذرا وغیرہ داستانیں کشمیری زبان میں لکھی گئیں ۔ نہ صرف یہ کہ کشمیری زبان کو مسلمانوں کی وجہ سے جدید ذخیرۂ الفاظ ملا اور اس کی شاعری یک لخت اعلٰی درجہ پر پہنچ گئی بلکہ مسلمانوں نے اسے فارسی رسم الخط میں بھی لکھنا شروع کر دیا ۔ کشمیری کے لیے شاردا رسم الخط بھی استعمال ہوتا رہا، جو اس زبان کا قدیم مقامی رسم الخط ہے اور ناگری سے ملتا جلتا ہے ۔ اس کے حروف تہجی زیادہ تر پنجاب کی پہاڑیوں میں استعمال ہونے والی ٹکری یا ڈوگری سے ملتے جلتے ہیں ۔ ہندو اکثر ناگری رسم الخط میں لکھتے تھے، لیکن کشمیر کے لاکھوں مسلمانوں کا رسم الخط فارسی ہی رہا ۔ اس سلسلے میں ایک دقت ضرور پیش آئی اور وہ حروف علت کی تھی، جن کی تعداد کشمیری زبان میں زیادہ ہے ۔ ان کے لیے علامات مقرر کرنا ضروری تھا؛ چنانچہ کشمیری مصنفین نے تقسیم ملک کے بعد نستعلیق رسم الخط میں مزید ترمیمیں کیں اور کشمیری حروف علّت کے تمام صوتی تقاضوں کو پورا کیا (دیکھیے تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ۱۴ (کشمیری ادب) : ۱۵۰)۔ معیاری کشمیری میں لسانی اختلاف کی اصل وجہ جموں و کشمیر اور ملحقہ علاقوں میں مسلمانوں اور ہندووں کی پہلو بہ پہلو موجودگی ہے ۔ دیہاتیوں اور شہریوں کی زبان میں بھی فرق ہے ۔ تعلیم کی عام اشاعت سے بھی اثر پڑا ہے ۔ علاوہ بریں مقامی اثرات کے باعث بالخصوص تلفظ کا فرق بھی نظر آتا ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں ورود اسلام سے پہلے کشمیری زبان کا کوئی ادب نہیں تھا ۔ رنگ رنگ کے لوک گیت، قسم قسم کی لوک کہانیاں، بجھارتیں اور ضرب الامثال ضرور معاشرے میں موجود ہوں گی، لیکن مرتب صورت میں نہیں تھیں ۔ کشمیری زبان کا ادب مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوا ۔ اس زبان میں شاعری کی ابتدا کشمیر کے حسین ماحول میں جاری و ساری وارفتگی کے باعث ہوئی ۔ نظر پرور اور دل نواز ماحول میں جذبات بھرے گیت بے ساختہ زبان پر آ جاتے تھے ۔ کشمیری زبان کی بعض نظمیں اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتی ہیں ۔ اس ضمن میں مقبول شاہ کی گل ریز، محمود گامی کی شیریں خسرو، ولی اللہ متو کی ہیہ مال (= چنبیلی کا ہار) کا ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ کشمیری ادب اور شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔

پہلا دور شتی کنتھ، للّٰہ عارفہ اور شیخ نورالدّینؒ ریشی کا ہے ۔ کشمیری زبان کا پہلا شاعر شتی کنتھ ہے، جو تیرھویں صدی عیسوی میں گزرا ۔ مہانیہ پرکاش اس کے کلام کا مجموعہ ہے ۔ زبان میں سنسکرت کے الفاظ کی بہتات ہے اور ہندو دھرم کے خیالات بیان کیے گئے ہیں ۔ للّٰہ عارفہ کا کلام

صوفیانہ اور فلسفیانہ ہے اور سنسکرت آمیز زبان کے باوجود اس میں مسلمان صوفیہ کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے ۔ شیخ نورالدّین ریشیؒ کے اشعار بھی، جو اشلوک کہلاتے ہیں، متصوفانہ ہیں، البتہ ان کا لہجہ زیادہ نصیحت آموز ہے ۔ ان تینوں کے کلام میں کشمیری کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر اب متروک ہو چکے ہیں ۔ اس دور میں سوم پنڈت نے زین چرتر اور یودھ بٹ نے زینہ و لاسی لکھی ۔ یہ دونوں کشمیری ادب کے دور ثانی میں بھی زندہ تھے ۔

دوسرے دور کے ممتاز شعرا میں حبہ خاتون، حبیب اللہ نوشہری، روپا بھوانی، صاحب کول، پرکاش بٹ، مُلّا فقیر اور میر عبداللہ بیٹھی قابل ذکر ہیں ۔ غیر مسلموں کا طرز نگارش ٹھیٹھ کشمیری تھا، لیکن مسلمان شعرا نے فارسی عروض کا اثر قبول کیا ۔ حبہ خاتون، جو کشمیر کے بادشاہ یوسف شاہ چک کی بیوی تھی، موجودہ کشمیری غزل کی بانی ہے ۔

کشمیری ادب کا تیسرا دور محمود گامی سے شروع ہوتا ہے اور عزیز اللہ حقانی تک پہنچتا ہے ۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان کشمیر پر اپنی حکومت کے تقریباً پانچ سو سال ختم کر چکے تھے، کشمیری زبان پر فارسی کا گہرا رنگ چڑھ چکا تھا اور اس میں شستگی، نکھار، روانی اور گھلاوٹ پیدا ہو چکی تھی ۔ اسی دور میں کشمیری باقاعدہ علمی اور ادبی زبان بن گئی، ثقیل اور متروک الفاظ استعمال کرنے کا رواج ختم ہوا اور روزمرہ کی زبان کا استعمال شروع ہوا ۔ اس زمانے میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں اور غزل کو بڑا فروغ حاصل ہوا ۔ سکھوں اور ڈوگروں کا عہد بھی اسی دور میں شامل ہے ۔ ان کی وجہ سے کشمیری شاعری میں قنوطیت پیدا ہوئی ۔

کشمیری ادب کے چوتھے دور (عصر جدید) کا بڑا شاعر پیرزادہ غلام احمد مہجور ہے ۔ اس دور میں کشمیریوں نے ڈوگرا مظالم کے خلاف آواز بلند کی اور جد و جہد آزادی کا آغاز کیا ۔ اسی لیے اس دور کی نظم و نثر میں قومی آزادی اور حریت پرستی کا ذکر ہے ۔ یہ ادب برائے زندگی کا دور ہے ۔ مہجور نے کشمیری زبان میں رزمیہ شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا ۔ عبدالاحد آزاد بھی، جو کشمیر کا شاعر انقلاب اور شاعر انسانیت ہے، اسی دور میں پیدا ہوا ۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت کشمیر میں جنگ آزادی چھڑی ۔ کشمیر کے دو ٹکڑے ہو گئے ۔ اس کے باوجود مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر دونوں میں کشمیری ادب کی ترقی بدستور جاری رہی ۔ دینا ناتھ نادم، عبدالرحمٰن راہی، غلام نبی خیال، غلام رسول نازکی وغیرہ مقبوضہ کشمیر کے شاعر اور ادیب ہیں ۔ آزاد کشمیر میں بھی کشمیری ادب کی کیفیت بڑی امید افزا ہے ۔ ہے ۔ غلام احمد ناز، احمد شمیم، علی محمّد کنول، شمس العین بخاری، غلام محمّد مورروجی، غلام محمّد مسرور، احمد اللہ دلنواز اور تحسین جعفری، وغیرہ وہاں کے ممتاز شاعر ہیں ۔ احمد اللہ دلنواز کے کلام کے کئی مجموعے، رسالہ دل، عشقہ باغ، کلام الفت، کلام عمر خوجہ، ظہور گلشن، سرور عشق شائع ہو چکے ہیں ۔ غلام احمد کشفی نے کاشر زبان کے نام سے کشمیری زبان پر ایک کتاب لکھی ہے ۔ کشمیری بول چال پر کتابچہ محمّد اسد اللہ قریشی اور خواجہ غلام نبی گلکار نے شائع کیا ہے ۔ کئی ایک ادبی انجمنیں اور ادارے کشمیری زبان و ادب اور ثقافت کو فروغ دے رہے ہیں ۔ آزاد کشمیر ریڈیو سے نظمیں، فیچر اور خبریں کشمیری زبان میں نشر کی جاتی ہیں ۔ کشمیری صحافت اردو زبان کے عام

رواج کے باعث زیادہ ترقی نہیں کر سکی، تاہم متعدد کشمیری ہفت روزے اور ماہنامے نکالے گئے - علاوہ بریں اردو جرائد میں کشمیری نظمیں اور مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں.

مآخذ : (۱) سید عبدالعزیز، در تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، لاہور ۱۹۷۱ء، ۱۴ : ۱۳۵ تا ۲۰۹؛ (۲) محبوب الحسن : کشمیر سلاطین کے عہد میں، اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء، ص ۳۰۴ تا ۳۰۶؛ (۳) غلام محی الدّین صوفی : *Kashir*؛ لاہور ۱۹۴۹ء، ص ۳۹۵ تا ۴۴۶ - [تعلیقہ عبدالغنی، مدیر ادارہ، نے لکھا] .

[ادارہ]

* **کَشیش طاغی** : (ترکی؛ لغوی معنی "راہبوں کا پہاڑ") یہ وہ نام ہے جو عثمانیوں نے مسیہ Mysia میں واقع کوہ اولمپس Olympus کو دیا اور جس کے دامن میں شمال کے رخ شہر برسہ [رک بآں] آباد ہے - اس کی ڈھلانیں جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ہیں، لیکن اب یہ جنگل بہت کم ہوگئے ہیں - چوٹیوں پر برف جمی رہتی ہے، جو صرف موسم گرما میں پگھلتی ہے (بلندی ۶۲۰۰ فٹ) - پہاڑوں کے اس گٹھے ہوئے سلسلے کی ساخت سنگ خارا، سنگ مرمر اور فلسپار (Felsper، ایک قسم کی سفید یا سرخ رنگ دھات)، سے ہوئی ہے - جب عثمانیوں نے اسے فتح کیا تو کوہ اولمپس خانقاہوں اور راہبوں کے حجروں سے بھرا پڑا تھا - یہی وجہ ہے کہ ترکی میں اس کا نام کشیش طاغی پڑ گیا - پھر عیسائی راہبوں کی جگہ مسلمان درویشوں نے لے لی؛ چنانچہ شاعر الامعی کے ہاں گیکلی بابا اور طوغلو بابا کی دو خانقاہوں کا حال بھی ملتا ہے - پہاڑ کے دامن میں شہر برسہ کے ایک محلے میں شیخ شمس الدّین محمّد بن علی البخاری کا مزار ہے، جو عام طور پر سلطان امیر ولی کے نام سے مشہور ہیں؛ مقبرے کے ساتھ ایک مسجد بھی بنی ہے .

مآخذ : (۱) حاجی خلیفہ : جہان نما، قسطنطینیہ ۱۱۴۵ھ، ص ۶۶۰ و مترجمۂ Norberg، ۲ : ۳۸۰ و ۳۸۱؛ (۲) اولیا چلبی : سیاحت نامہ، در سعادت ۱۳۱۴ھ، ۲ : ۲۹ تا ۳۰، ۳۶، ۴۷ تا ۴۸ و انگریزی ترجمہ از v. Hammer، لنڈن ۱۸۵۰ء، ص ۱۵ تا ۱۶، ۲۴، ۲۵؛ (۳) سامی بے : قاموس الاعلام، ۵ : ۳۸۶۶؛ (۴) علی جواد : ممالک عثمانیہ تاریخ و جغرافیہ لغاتی، ص ۶۶۹؛ (۵) v. Hammer : *Hist. de l' empire ottoman*، ۱ : ۱۵۷ ببعد .

(CL. HUART)

* **کَعب (بنو)** : ایک عرب قبیلہ، جو آج کل جنوب مغربی ایران کے صوبۂ خوزستان کے بعض حصوں میں آباد ہے - بنو کعب متعدد گروہوں پر مشتمل ہیں، اس لیے مشرق عرب اور جنوبی عراق کے باشندے انہیں کُعوب (اٹھارھویں صدی کے یورپی مآخذ میں Chaub) کہتے ہیں - عرب مصنفین اور ماہرین انساب ان کا تفصیل سے ذکر نہیں کرتے بلکہ بالعموم انہیں کعب بن ربیعہ کے ذیل میں شمار کرتے ہیں - کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق قیس عیلان سے ہے، جو وسطی اور مشرق عرب کا ایک بڑا قبیلہ تھا - معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہاں سے ترک وطن کرکے جنوبی عراق اور جنوب مغربی ایران میں سترھویں صدی عیسوی سے قبل نہیں پہنچے تھے - ڈنمارک کے سیاح Niebuhr کے زمانے (۱۷۶۵ء) تک وہ بظاہر اس علاقے کے باشندوں میں خاصے بدنام ہو چکے تھے - جن لوگوں نے ان کے ہاتھوں تکلیف اٹھائی ان میں ترک، ایرانی اور برطانوی سب شامل ہیں - اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں ان کے سردار شیخ سلمان کو زیر کرنے میں ہر حکومت ناکام رہی - ان کے قلعہ بند شہروں میں قُبّان، دَوْرَق اور فَلّاحِیّہ کا ذکر آتا ہے - سلمان کے بعد بنو کعب کا دوسرا ممتاز فرمانروا اس کا

پرپوتا ثامر (۱۸۳۷ تا ۱۸۴۰ء) تھا۔

ایران میں آباد دیگر عرب قبائل کی طرح بنو کعب بھی غیر عرب آبادی میں گھل مل گئے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی عربی شخصیت کھوتے جا رہے ہیں۔ اس قبیلے کے بڑے گروہ یہ ہیں: دُریس، مُقدّم، خَنافِرہ اور حَزْبَہ.

بنوکعب کو نہ تو مکمل طور پر حضری کہا جا سکتا ہے نہ ان کے کسی بڑے حصے کو صحیح معنوں میں بدوی کہہ سکتے ہیں، بلکہ آج کل اس قبیلے کے بیشتر افراد نیم خانہ بدوش ہیں۔ ان کے اقتدار کے زمانۂ عروج میں (۱۷۷۵ء کے ذرا بعد) ان کے شیخ کی حکومت بظاہر بصرے کے قرب و جوار سے لے کر بِہبہان کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن جوں جوں محمّرہ کے بنو مُحَیْسِن کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا ان کا زورکم ہوتا گیا اور بنو کعب کے شیوخ اپنا سیاسی اقتدار کھو کر محمّرہ کے شیخ کے معمولی باجگزار ہو کر رہ گئے۔ خود محمّرہ کے شیوخ بیسویں صدی کے شروع میں ایرانی بادشاہوں کے باجگزار بن گئے۔

مآخذ: (۱) ابن درید: کتاب الاشتقاق، قاہرہ ۱۹۵۸ء، ص ۲۹۵؛ (۲) ابن رسول: طرفۃ الاصحاب فی معرفۃ الانساب، دمشق ۱۹۴۹ء، ص ۱۵، ۲۸؛ (۳) یاقوت، ۱: ۳۷۷ و ۳: ۹۰۸؛ (۴) النویری: نہایۃ الارب، قاہرہ ۱۹۴۵ء، ۲: ۳۳۸؛ (۵) کحّالۃ: معجم قبائل العرب، دمشق ۱۹۴۹ء، ۳: ۹۸۳ تا ۹۸۷؛ (۶) G. Niebulr: *Voyage en Arabie*، ایمسٹرڈم ۱۷۸۰ء، ۲: ۱۶۰ ببعد؛ (۷) ایسٹ انڈیا کمپنی: *Factory Records: Persia and the Persian Gulf*، (انڈیا آفس لائبریری، لنڈن میں)، ج ۱۶ و ۱۷؛ (۸) Baron C. A. de Bode: *Travels in Luristan and Arabistan*، لنڈن ۱۸۴۵ء، ص ۱۱۱ تا ۱۱۹؛ (۹) A. H. Layard: *A Description of the Province of Khusistan*، در *JRGS*، ۱۶ (۱۸۴۶ء): ۳۶ تا ۴۵؛ (۱۰) W. K. Loftus: *Travels and Researches in Chaldea and Susania*، لنڈن ۱۸۵۷ء، ص ۲۷۹ تا ۲۸۶؛ (۱۱) W. F. Ainsworth: *A Personal Narrative of the Euphrates Expedition*، لنڈن ۱۸۸۸ء، ص ۲۰۵ تا ۲۱۸؛ (۱۲) G. W. Curzon: *Persia and the Persian Question*، لنڈن ۱۸۹۲ء، ۲: ۳۳۱ تا ۳۳۸؛ (۱۳) J. G. Lorimer: *Gazetteer of the Persian Gulf, Omān and Central Arabia*، کلکتہ ۱۹۰۸ء، ۲: ۹۳۷ تا ۹۶۳.

(A. M. ABU-HAKIMA)

* **کَعْب بن الاَشْرَف**: مدینۂ منورہ میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ایک دشمن، جو ایک بیان کے مطابق نضیری، مگر دوسرے بیان کے مطابق نبہانی طائی تھا؛ بہر کیف اس کی ماں بنو نضیر ہی سے تھی۔ وہ یہودیت کا پُرجوش حامی تھا (دیکھیے لفظ سیّد الاحبار، در ابن ہشام، ص ۶۵۹ س ۱۲)۔ [اس کا شمار رؤسائے یہود اور قادرالکلام شعرا میں ہوتا تھا؛ چنانچہ اس کا عرب میں بڑا اثر تھا (کتاب الاغانی، میں اسے "فحل فصیح" کہا گیا ہے)۔ اسلام سے اسے سخت عداوت تھی۔ غزوۂ بدر میں قریش کی عبرتناک شکست کے بعد وہ تعزیت کے لیے مکّے گیا اور مقتولان بدر کے پُر درد مرثیے پڑھ کر لوگوں کو رُلاتا اور انتقام پر ابھارتا رہا؛ چنانچہ ابوسفیان نے حرم کا پردہ تھام کر انتقام لینے کا عہد کیا (الدیار بکری: تاریخ الخمیس، ص ۵۱۷)۔ مدینے میں واپس آنے کے بعد اس نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ہجو میں اشعار کہنا اور لوگوں کو آپؐ کے خلاف برانگیختہ کرنا شروع کردیا (ابو داؤد، ج ۲، کتاب الخراج و الامارۃ)۔ مزید برآں اس نے قصد کیا کہ چپکے سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو قتل کرا دے (ابن حجر: فتح الباری، ۷: ۲۵۹)۔ جب اس کی فتنہ انگیزی

حد سے زیادہ بڑھ گئی اور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اس پر ملال کا اظہار فرمایا تو حضرت محمّد بن مسلمہؓ نے آپؐ کی اجازت اور رؤسائے اوس کے مشورے سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا (الزرقانی، ۲ : ۱۲؛ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل کعب) ۔ الواقدی نے اس کے قتل کی تاریخ ۱۴ ربیع الاول ۳ھ/ستمبر ۶۲۴ء دی ہے، لیکن بعض کے نزدیک یہ واقعہ غزوۂ بنو نضیر (ربیع الاول ۴ھ/ اگست ۶۲۵ء) سے ذرا قبل پیش آیا تھا کیونکہ اس وقت بنو نضیر کعب کا سوگ منا رہے تھے (ابن ہشام، ص ۶۵۸ ببعد) ۔ کعب بن الاشرف کے اُطم (= قلعہ) کے کھنڈر آج بھی باقی ہیں (محمّد حمید اللہ : *The Battlefields of the Prophet Mnhammad*، ووکنگ، لنڈن ۱۹۵۳ء)] ۔

مآخذ : مقالے میں دیے گئے حوالوں کے علاوہ دیکھیے : (۱) ابن ہشام، طبع وُسٹنفلٹ، ص ۵۴۸ تا ۵۵۱؛ ۶۵۷ تا ۶۶۹؛ (۲) الواقدی، مترجمۂ Wellhaussen، ص ۹۵ تا ۹۹ [و طبع Marsden Jones، ص ۱۲۱ ببعد، ۱۸۴ تا ۱۹۲]؛ (۳) الطبری، طبع ڈخویہ، ۱ : ۱۳۶۸ تا ۱۳۷۲؛ (۴) الحلبی : انسان العیون، قاہرہ ۱۳۰۸ھ، ۳ : ۱۷۶ تا ۱۷۹؛ (۵) المسعودی : التنبیہ، طبع ڈخویہ، ص ۲۴۳؛ (۶) الاغانی، ۱۹ : ۱۰۶ ببعد؛ (۷) کائتانی : *Annali dell' Islam*، ۱ : ۵۳۴ تا ۵۳۷؛ (۸) مارگولیتھ، بار سوم، ص ۲۸۶ ببعد؛ (۹) ونسنک : *Mohammed en de Joden te Medina*، لائیڈن ۱۹۰۸ء، ص ۱۵۲ تا ۱۵۵؛ (۱۰) R. Leszynsky : *Die Juden in Arabien zur Zeit Muhammeds*، برلن ۱۹۱۰ء، ۶۶ تا ۶۹؛ [(۱۱) Fr. Buhl : *Das Leben Muhammeds*، لائپزگ ۱۹۳۰ء، ص ۲۵۰ ببعد؛ (۱۲) M. J. Kister : *The Market of the Prophet*، در *JESHO*، ۸ (۱۹۶۵ء) : ۲۷۲ تا ۲۷۶؛ (۱۲) شبلی نعمانی : سیرۃ النبی، مطبوعۂ اعظم گڑھ، بار ششم، ۱ : ۴۰۵ ببعد؛ (۱۳) البخاری، مطبوعۂ قاہرہ، ۳ : ۱۲] ۔

(Fr. Buhl [و ادارہ])

کَعْب بن جُعَیْل التَّغلبی : پہلی صدی * عیسوی/ساتویں صدی ہجری کا ایک عرب شاعر، جو زیادہ مشہور نہیں ۔ ابن سلاّم (طبقات، ص ۸۵ تا ۸۹) نے اسے اسلامی شعرا کے تیسرے طبقے میں جگہ دی ہے ۔ اس کا نسب نامہ مختلف مصنفین کے ہاں مختلف ہے (ابن الکلبی، طبع Caskel، جدول ۱۶۵، میں بلاشبہہ سب سے زیادہ صحیح نسب نامہ ملتا ہے) ۔ اس کی زندگی کے بارے میں ہمارے پاس بہت کم معلومات ہیں ۔ وہ غالباً ہجرت کے اوّلیں سالوں میں پیدا ہوا اور اس نے جنگ صفین (۳۷ھ/ ۶۵۷ء) میں حضرت معاویہؓ کے ایک مقرب خاص کی حیثیت سے حصہ لیا کیونکہ وہ بھی بنو تغلب [رک بآں] کے بیشتر افراد کی طرح ان کا ایک پرجوش حامی تھا ۔ حضرت علیؓ سے مخالفت کی بنا پر اس نے کئی نظمیں لکھیں ۔ امیر معاویہؓ نے اس کا شعر اپنے حریف کے نام ایک خط کے ساتھ لکھ کر بھیجا، جس کا النجاشی نے جواب دیا (الدینوری : الاخبار الطوال، ص ۱۷۰؛ المبرد : الکامل، ۱ : ۲۸۱ تا ۲۸۲) ۔ بعدازاں اس نے عبیداللہ بن الخطاب کے کئی مرثیے لکھے، جو اس جنگ میں مارے گئے تھے (ابن سلام، ص ۸۸ تا ۸۹؛ الطبری، ۱ : ۳۳۱۵؛ نسب قریش، ص ۳۵۵ تا ۳۵۶؛ یاقوت، بذیل مادۂ صفین؛ نصر بن مزاحم : وقعۃ صفین، ص ۳۶۶، ۴۰۱؛ شرح نہج البلاغۃ، ۱ : ۴۹۸ تا ۴۹۹؛ ابن کثیر : البدایۃ، ۷ : ۲۶۵) اور اسی طرح ایک قصیدہ امیر معاویہؓ اور ایک عمروؓ بن العاص کی مدح میں لکھا (ابن سلاّم، ص ۸۶ تا ۸۷؛ المرزبانی : المعجم، ص ۳۴۴؛ ابن قتیبہ : الشعر والشعراء، ص

۶۳۲؛ یاقوت، بذیل مادۂ اذرح)۔ اس کے باقی ماندہ مقطوعات (تقریباً ۸۰ اشعار) کے علاوہ چند قصائد عبدالرحمٰن بن خالد بن الولید کی مدح میں موجود ہیں (نسب قریش، ص ۳۲۵ تا ۳۲۶)، المغیرۃ بن شعبہ کی ایک ہجو ہے (م ۵۰ھ/۶۷۰ء، الحماسۃ البصریۃ، ۲ : ۱۸۲) اور بعض ایسے اشعار ہیں جو ۵۰ھ/۶۷۰ء اور ۵۹ھ/۶۷۹ء کے درمیان مدینے میں لکھے گئے، جہاں وہ والی شہر سعید بن العاص کے مصاحبین میں سے تھا (ابن سلام، ص ۲۵۵، ۲۷۱؛ الطبری، ۱ : ۲۸۳۸ و ۲ : ۱۰۷) اور الفرزدق کے کلام سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔

روایت یہ ہے کہ اپنے نوعمر ہم قبیلہ شاعر الاخطل [رک بآں] کو یہ نام اسی نے دیا تھا۔ (ابن سلاّم، ص ۲۵۰، ۳۹۶؛ الاغانی، مطبوعۂ بیروت، ۸ : ۲۸۰ تا ۲۸۱)۔ ایک خبر کی رو سے، جو اکثر بیان کی جاتی ہے (الجاحظ : البیان، ۱ : ۶۳، ۲۷۱؛ ابن قتیبہ : الشعر و الشعراء، ص ۳۵۶، ۶۳۱ تا ۶۳۲؛ المبرد : الکامل، ۱ : ۱۵۳؛ ۱۵ : ۸۳؛ الاغانی، مطبوعۂ بیروت)، یزید بن معاویہ نے ۶۰ھ/۶۸۰ء سے پہلے اس سے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ عبدالرحمٰن بن حسان بن ثابت کی ہجو میں کچھ اشعار کہے، لیکن کعب نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ یہ کام الاخطل کے سپرد کر دے کیونکہ وہ خود انصار کی ہجو کہنا نہیں چاہتا تھا۔ کعب نے یزید کو جو جواب بھیجا تھا اس کے سلسلے میں مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں (اور جو غیر یقینی ہیں)۔ ان کی بنا پر لوئیس شیخو (الشعراء النصرانیین بعد الاسلام، ص ۲۰۴) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کعب اس وقت تک عیسائی تھا؛ لیکن تمام شہادتیں اس قیاس کی تصدیق کرتی ہیں کہ وہ مسلمان ہو چکا تھا۔

اس کے بعد وہ ایک غیر معینہ زمانے میں (الاغانی، مطبوعۂ بیروت، ۵ : ۱۳) بصرے کے مربد (میدان) پر بعض شعرا بالخصوص النابغۃ الجعدی کے ساتھ نظر آتا ہے (ان دونوں کے مابین تعلقات کے بارے میں دیکھیے M. Nallino، در *RSO*، ۱۴ (۱۹۳۴ء) : ۴۰۴ تا ۴۰۵؛ *Le Poesie di an Nabigah*، بار دوم، روما ۱۹۵۳ء، ص ۱۲۰)۔ اگر البلاذری (الانساب، ۱۱ : ۲۱۲) کا بیان صحیح ہے تو عبدالملک بن مروان ۶۵ھ/۶۸۵ تا ۸۶ھ/۷۰۵ء) کے عہد میں کعب زندہ تھا، جس کی مدح میں، اس کے بیان کے مطابق، کعب نے ایک قصیدہ لکھا تھا؛ تاہم جو ابیات اس نے نقل کیے ہیں وہ القطامی کے ایک طویل قصیدے میں پائی جاتی ہیں (طبع J. Barthe، لائیڈن ۱۹۰۲ء، ص ۸۸ ابیات ۸۹ و ۹۰)۔

ابن سلام کعب بن جعیل کو ایک مفلق (= ذہین و جدت پسند) شاعر کہتا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دیوان جمع نہیں کیا گیا، اگرچہ اس کے اشعار کو اچھی خاصی شہرت حاصل رہی ہے؛ چنانچہ ابن سریج [رک بآں] نے اس کی بعض ابیات کی دُھنیں بھی بنائی تھیں (الاغانی، بیروت، ۳ : ۲۷۵)۔ اشعار جمع کرنے والوں نے اس سے زمانۂ جاہلیت کے شاعر عُمَیرہ یا عَمِیرَہ بن جُعَیل یا جُعَل کے بعض اشعار منسوب کرنے میں (شیخو : کتاب الشعراء النصرانیہ قبل اسلام، ص ۱۹۵، ۱۹۶) یا اس شاعر کو اس کا بھائی قرار دینے میں (ابن قتیبہ : الشعر والشعراء، ص ۶۳۱ تا ۶۳۲؛ البغدادی : خزانۃ، مطبوعۂ بولاق، ۱ : ۴۵۸؛ مطبوعۂ قاہرہ، ۳ : ۴۴) کئی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ ان کی بنا پر ابن سلام (ص ۴۸۶ تا ۴۸۷) اور دیگر مصنفین نے جو عبارت نقل کی ہے اس سے ان غلط فہمیوں کی شہادت

ملتی ہے ۔

مآخذ : کسی قدر مفصل بیان کے لیے دیکھیے (۱) شیخو : الشعراء النصرانیہ بعد الاسلام، ص ۲۰۳ تا ۲۱۲؛ ان مآخذ کے علاوہ جن کا حوالہ متن مقالہ میں دیا گیا ہے دیکھیے (۲) البحتری : حماسۃ، ص ۳۴۵؛ (۳) الدینوری : الاخبار الطوال، ص ۱۹۲؛ (۴) الآمدی : المؤتلف، ص ۸۴؛ (۵) الاغانی، مطبوعۂ بیروت، ۹ : ۲۷؛ (۶) ابن درید : الاشتقاق، ص ۲۰۳؛ (۷) الشریشی : شرح المقامات، ۲ : ۸۶؛ (۸) نقائض، ص ۶۱۹؛ (۹) یاقوت، بذیل مادۂ الحیرۃ؛ (۱۰) Nöldoke : *Delectus*، ص ۷۹ تا ۸۰؛ (۱۱) C. A. Nallina : *Letteratura*، بمدد اشاریہ؛ (۱۲) R. Blachere، در *HLA*، ۳ : ۶۵ تا ۶۶، نیز وہ مآخذ جن کا اس نے حوالہ دیا ہے ۔

(C. H. PELLAT)

⊗ * **کعب بن زُہَیر :** عرب کے مشہور صاحبِ معلقہ شاعر زُہیر بن ابی سُلْمٰی کا بیٹا کَبْشہ بنت عمّار کے بطن سے تھا ۔ شاعری کا ملکہ اور استعداد ان کا خاندانی استحقاق معلوم ہوتا ہے کیونکہ کعب اور اس کا باپ تو ایک طرف رہے بشمولیت شاعرہ شہیر تُماضِر (الخنساء، رکّ باں) اس خاندان کے گیارہ افراد کا کلام ہمارے پاس موجود ہے ۔ ہمیں اس شاعر کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ۔ اس کے دو اور بھائی بجیر اور سالم تھے، جن سے وہ عمر میں بڑا تھا ۔ اس نے اپنے قبیلے کی جنگوں میں قبیلۂ طی، قریش اور خزرج کے خلاف حصّہ لیا، جیسا کہ اس کے دیوان کے بہت سے قصائد سے ظاہر ہوتا ہے ۔ عہدِ رسالت میں ۷ھ سے کچھ پہلے (۶ھ کے آخر میں) اس کا بھائی بجیر حلقہ بگوش اسلام ہو گیا، مگر کعب کفر پر قائم رہا اور آنحضرت صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وآلہٖ وَسَلَّم اور مسلمان عورتوں کے خلاف یاوہ گوئی کرتا رہا (خزانۃ الادب، ۴ : ۱۲)۔ آنحضرت صَلّی اللّٰہ عَلَیْہِ وآلہٖ وَسَلَّم نے اس کے خون کو رائگاں و باطل قرار دیا (فَاَهْدَرَ دَمَہٗ : الاغانی، ۱۵ : ۱۴۹) ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کعب کے لیے زمین تنگ ہو گئی ۔ بالآخر اس نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر لیا اور ۹ھ میں اچانک مسجد رَسُولُ اللّٰہ میں آ نکلا، جہاں رسول خدا صلّی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلّم تشریف فرما تھے ۔ اس نے آپ کو اپنا مشہور قصیدہ "بانَتْ سُعَاد" سنایا ۔ نبی کریم صلّی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلّم یہ قصیدہ سن کر خوش ہوئے اور اپنی دھاریوں والی چادر (البُرْدہ) اس کو عطا فرمائی ۔ اسی وجہ سے اس قصیدے کا نام قصیدۂ بُردہ مشہور ہوا ۔ کعب کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خاصی طویل عمر پائی ۔ قصیدۂ بانَتْ سُعَاد میں دینی شاعری کا کوئی خاص انداز و اسلوب نہیں ہے ۔ اس کے جذبات جاہلی شاعری کے جذبات ہیں اور اس کی ابتدا اس قدر رسمی ہے کہ حمّاد الرَّاوِیَہ [رکّ باں] کا دعوٰی تھا کہ وہ اس طرح شروع ہونے والے سات سو قصیدوں سے واقف ہے ۔ [بہرحال یہ قصیدہ اس عہد کی قصیدہ نگاری کی مستند ترین مثال ہے ۔ موضوعات کے تنوع، عام مضامین کی تکرار، اسلوبِ بیان اور ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے اس کا شمار روایتی شاعری کے اچھے نمونوں میں ہو سکتا ہے ۔ اس میں پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں مدح نگاری کے ضروری عناصر متعین کیے گئے ہیں] ۔

یہ قصیدہ اکثر تشطیر اور تخمیس کے لیے استعمال کیا گیا ہے ۔ اس کے شارحین کی تعداد بے شمار ہے ۔ مشہور ترین شارحین میں ثعلب، ابن دُرید، التبریزی (طبع Krenkow، در *ZDMG*، عدد ۶۵، ص ۲۴۱ تا ۲۷۹)، ابن ہشام (طبع Guidi، ۱۸۷۱ء)، ابن حِجّہ، السّیوطی اور الباجوری

ہیں [براکلمان، ۱ : ۳۸ تا ۳۹ و تکملہ، ۱ : ۶۸ تا ۶۹] ۔ اس قصیدے کو پہلی مرتبہ Lette نے شائع کیا (لائیڈن ۱۷۴۸ء) ۔ بعد کی اشاعتوں میں ہم فریتاغ کی طباعت مع ترجمۂ لاطینی (۱۸۲۳ء) اور Nöldeke (*Delectus*، ۱۱۰ تا ۱۱۳، برلن ۱۸۴۰ء) کا ذکر کر سکتے ہیں ۔ راقم نے ایک ایڈیشن مع فرانسیسی ترجمہ اور دو غیر مطبوعہ شرحیں شائع کی ہیں (الجزائر ۱۹۱۰ء) ۔ [اس کا دیوان، مع شرح، السکری عبدالعزیز المیمنی کی تصحیح سے دارالکتب المصریہ قاہرہ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے] ۔

مآخذ : (۱) R. Basset. : *La Bânat Socâd*، ص ۱۴ تا ۸۲، نیز اس کتاب میں مذکور مصنفین : ص ۹ تا ۱۳؛ (۲) ابن سلّام الجمحی : طبقات الشعراء، طبع Hell، لائیڈن ۱۹۱۶ء، ص ۲۰ تا ۲۶ ۔

(R. Basset [و ادارہ])

* **کعبؓ بن مالک :** ابو عبداللہ [نیز ابو عبدالرحمٰن، دیکھیے تہذیب التہذیب، ۸ : ۴۴۰]، مدینۂ منورہ میں بنو خزرج کے قبیلۂ سلمہ سے تھے ۔ وہ عہد جاہلیت میں مدینہ منورہ کی خونریز قبائلی جنگوں میں حصہ لینے کے بعد ہجرت سے پہلے اسلام لے آئے تھے؛ چنانچہ عقبۂ ثانیہ [رک باں] کی مہتم بالشان بیعت میں وہ بھی شریک تھے ۔ کعبؓ شاعر تھے اور حسانؓ بن ثابت [رک باں] اور عبدالرحمٰنؓ بن رواحہ کی طرح حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمائش پر مسلمانوں کے جنگی کارناموں کا ذکر کرتے اور دشمنوں کے معاندانہ اشعار کے جواب میں شعر کہتے تھے ۔ وہ غزوۂ بدر [رک باں] میں شریک نہیں ہو سکے، لیکن دوسرے متعدد غزوات میں حصہ لیا؛ چنانچہ غزوۂ احد میں باوجودیکہ انھیں زخم لگ چکے تھے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، جن کے بارے میں خیال تھا کہ زخمی ہو کر شہید ہو گئے، تلاش کر لیا ۔ بایں ہمہ وہ ان معدودے چند صحابہ میں سے تھے جو باوجود اپنے جذبۂ ایثار و جاں نثاری کے تبوک کے پرخطر غزوے میں شریک نہ ہو سکے ۔ اس پر انھیں سخت ندامت ہوئی ۔ سخت آزمائش کے بعد انھیں معاف کر دیا گیا (دیکھیے ۹ [التوبۃ] : ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۱۸ ببعد) ۔ یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ کعب ہی غسانیوں [رک بہ غسّان، بنو] سے اپنے قبیلے کے تعلقات پر بار بار زور دیتے اور کعب ہی سے ایک غسّانی سردار نے مدینۂ منورہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قطع تعلق کرنے کے لیے کہا تھا ۔

ان کی وفات ۵۳ھ/۶۷۳ء میں ہوئی جب وہ اپنی بصارت کھو چکے تھے، مگر ایک دوسرے قول کے مطابق ۵۰ھ میں ہوئی [اور ہیثم بن عدی اور ابن حجر کے نزدیک اس زمانے میں جب حضرت علیؓ شہید ہوے (تہذیب التہذیب، ۸ : ۴۴۱)] ۔ کعبؓ بن مالک کے کلام میں جذبۂ حبّ الوطنی کے ساتھ اسلام کے لیے بھی حقیقی جوش پایا جاتا ہے ۔

مآخذ : (۱) ابن ہشام، ص ۲۹۹ تا ۳۰۱، ۳۱۰، ۵۷۵، ۸۹۶، ۹۰۷ تا ۹۱۳ (اشعار : ص ۵۲۰ تا ۸۷۱، بمواضع کثیرہ؛ (۲) المبرّد : الکامل، ص ۶۶؛ (۳) ابن قتیبہ : کتاب الشعر، طبع ڈخویہ، ص ۱۸۰؛ (۴) الطبری، طبع ڈخویہ، ۱ : ۱۲۱۷ تا ۱۲۲۵، ۱۳۰۶، ۱۶۹۵، ۱۷۰۵، ۲۹۳۷، ۳۰۴۹، ۳۰۶۲، ۳۰۷۰؛ (۵) الواقدی، مترجمۂ Wellhausen، ص ۱۱۳، ۱۲۳، ۱۳۶، ۱۶۹، ۳۲۶، ۳۹۳، ۴۱۱ تا ۴۱۴؛ (۶) الاغانی، ۱۵ : ۲۶ تا ۳۲؛ (۷) النووی : تہذیب التہذیب، طبع Wüstenfeld، ص ۲۳ ببعد؛ (۸) *Bibl. Geogr. Arab.*، ۷ : ۳۲۲؛ [(۹) البخاری، مطبوعۂ قاہرہ، ۳ : ۵۹ ببعد] ۔

(Fr. Buhl)

* کَعْب اَلْاَحْبَار : ابو اسحٰق کعب بن ماتع بن هَیْسُوع، عربوں کے یہاں اسرائیلیات میں قدیم ترین مستند راوی - وہ یہود یمن میں سے تھے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رض یا حضرت عمر رض کے عہد خلافت میں اسلام قبول کیا اور بسبب اپنی فراواں دینی معلومات (بالخصوص بائبل میں) کعب الاحبار یا کعب الحبر (= ربّی کعب) کہلائے - Lidzbarski *(De Propheticis, quae dicuntur, legendis arabicis*، لائپزگ ۱۸۹۳ء، ص ۳۳ ببعد) کا خیال ہے کہ کعب کا عبرانی نام عَقِیبا یا یَعقُوب تھا، جو عربی میں بدل کر کعب ہوگیا - حَبر یا حِبر (جمع : احبار) عبرانی لفظ حابِیر سے مشتق ہے، جو بابل کے یہودی ارباب علم و فضل کا لقب تھا، مگر باعتبار مرتبہ "ربی" سے کم تھا - الخوارزمی نے بھی یہی کہا ہے کہ حبر یہود کا ایک لقب ہے، جو عربی لفظ "عالم" کا مترادف ہے (مفاتیح العلوم، طبع van Vloten، ص ۳۵) - کعب کی زندگی اور تصنیفات کے بارے میں ہماری معلومات بڑی محدود ہیں۔ بقول الطبری، کعب کے تعلقات حضرت عمر رض سے نہایت گہرے تھے، چنانچہ جب وہ بیت المقدس تشریف لے گئے (۱۵ھ/۶۳۶ء، الطبری، ۱ : ۲۴۰۸) تو کعب ان کے ہمراہیوں میں تھے اور ۱۷ھ (۶۳۸ء) میں وہ مسلمان ہوے (کتاب مذکور، ص ۲۵۱۴) - کہا جاتا ہے کہ ۲۳ھ/۶۴۴ء میں حضرت عمر رض کی وفات کے تین دن پہلے کعب نے ان سے ان کی شہادت کی پیش گوئی کر دی تھی (کتاب مذکور، ص ۲۷۲۲؛ نیز دیکھیے ابن الأثیر، ۳ : ۳۲) - النووی (تہذیب، طبع Wüstenfeld، ص ۵۲۳) کا بیان ہے کہ کعب اگرچہ عہد رسالت میں موجود تھے، لیکن کبھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں حاضر نہ ہوے - ابو الدرداء رض الانصاری [رک بآں] فرماتے ہیں کہ کعب الاحبار بہت بڑے عالم تھے حتّٰی کہ ان کی وسعت علم اور ثقاہت کے بارے میں کسی کو بھی اختلاف نہیں (النووی : کتاب مذکور) - حضرت عمر رض کے عہد خلافت میں وہ یمن سے مدینہ آئے اور پھر شام میں حمص چلے گئے - حضرت معاویہ رض نے، جو اس وقت شام کے والی تھے، کعب کو اپنے دربار میں بحیثیت استاد اور مشیر سلطنت کے جگہ دی۔ جب حضرت عثمان رض اور ان کے مخالفین کے مابین خصومت پیدا ہوئی تو کعب نے حضرت عثمان رض کی بڑے زور سے طرفداری کی (ابن الأثیر، ۳:۵۶) - حضرت عثمان رض کے عہد خلافت میں انھوں نے بمقام حمص وفات پائی (۳۲ھ/۶۵۲ء یا ۳۴ھ/۴۵۴ء، دیکھیے الطبری، ۳ : ۲۴۷۴ ببعد) اور انھیں حمص ھی میں دفن کیا گیا - بقول بعض (ابن بطوطه، طبع Defremery و Sanguinetti، ۱ : ۲۲۲؛ یاقوت : معجم، ۲ : ۵۹۵) وہ دمشق میں فوت ہوے اور وہیں دفن ہوے - عبداللہ بن عبّاس رض [رک بآں]، جو قرآن مجید کے قدیم ترین مفسرین میں سے ہیں، اور ابو ہریرہ رض [رک بآں] ان کے مشہور ترین شاگرد ہیں .

کعب نے جو بھی تعلیم دی، زبانی دی۔ بہرحال اس امر کا بیان کہیں بھی نہیں کہ انھوں نے کوئی کتاب بھی لکھی ہے۔ کعب سے بکثرت اقوال منسوب ہیں - ان میں سے بعض اقوال الطبری کے ہاں منقول ہیں اور ان کا ثبوت ربّانی یا کلیسائی بطریقی روایات میں ملتا ہے (مثلاً دیکھیے Lidzbarski : کتاب مذکور، ص ۳۸ ببعد) - ابن قتیبہ اور النووی جیسے معتبر مؤرخین نے ان کے اقوال کا بالکل ذکر نہیں کیا اور کیا بھی ہے تو الطبری کی طرح شاذ و نادر - اس کے برعکس الثعالبی اور الکسائی جیسے قصّہ نویسوں نے باربار اس سے استناد کیا ہے - *Leyendas de José* (ہسپانوی رسم الخط میں طبع F. Guillen Rablies : *Leyendas de José hijo de Jacob y de Alejandro*

Magno، سرقسطہ ۱۸۸۸ء) میں بہرحال اس کی حیثیت ایک ایسے راوی کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا تمام مواد شاید کعب ہی سے روایت ہے۔ ناشر نے کعب الاحبار (ہسپانوی رسم الخط میں Cab Alajbar، ص ۴، تعلیقہ ۲) کا ترجمہ Caab el historiador یعنی کعبِ مؤرخ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی فان ہامر von Hammer کی طرح (دیکھیے Lidzbarski : کتاب مذکور، ص ۲۶، تعلیقہ ۴) احبار کو اخبار پڑھا اور اسی لیے وہ اسے el narrador یا el cronista، یعنی وقائع نگار، لکھتا ہے۔ یہ عربی ہسپانوی روایت، بالخصوص اس کا پہلا باب، زیادہ تر الثعالبی کے قصۂ یوسف کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے۔ پھر جہاں اس نے دیگر محدّثین کا ذکر کیا ہے یا کسی کا بھی ذکر نہیں کیا، وہاں وہ کعب ہی کا حوالہ دیتا ہے۔ الثعالبی کے قصے میں کعب کا بطور سند صرف پانچ مرتبہ ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی مرتبہ یہ ذکر حضرت یوسف کی پیدائش اور حسن و جمال کے تمہیدی بیان میں آیا ہے (قصص الانبیاء، ص ۶۱ سطر ۴)۔ *Leyenda* میں یہ عبارت موجود نہیں ہے کیونکہ اس کا پہلا صفحہ ضائع ہو چکا ہے۔ *Leyanda* اور الثعالبی کے بیانات میں مماثلت ابتدائی صفحات ہی میں نظر آ جاتی ہے (*Leyenda*، ص ۳ س ۴ = الثعالبی، ص ۶۲ س ۲۳)، جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالٰی نے یعقوب علیہ السلام کے صحن خانہ میں ایک درخت اگایا، چنانچہ جیسے ہی ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو اس کی ایک شاخ نکل آتی؛ پھر جیسے جیسے لڑکا بڑھتا جاتا ایسے ہی شاخ بھی بڑھتی جاتی، حتّٰی کہ لڑکا بالغ ہو جاتا اور یعقوب[ع] اس ٹہنی کو کاٹ کر اس لڑکے کے حوالے کر دیتے۔ الثّعالبی نے خود یہاں ایک عام حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ روایت ان لوگوں کی ہے "جو انبیا کے حالات اور قدیم تاریخ سے واقف ہیں"؛ *Leyenda* میں چوتھے ہی صفحے پر اور اس کے بعد تقریبًا ہر صفحے پر کعب کا حوالہ بطور راوی موجود ہے۔ الثعالبی کے قصے کے ساتھ مزید موازنے سے واضح ہوتا ہے اس کا اس کثرت سے کعب کا حوالہ دینا بالکل من گھڑت سی بات ہے۔ الکسائی (قصص الانبیاء، ص ۳۵۱ تا ۳۸۲) نے اس قصے میں کعب کو صرف ایک مرتبہ، یعنی ابتدا میں، بطور سند پیش کیا ہے جہاں یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالٰی نے ابراہیم علیہ السّلام کو پانچ قیمتی تحفے عطا کیے، جو آگے چل کر سب کے سب حضرت یوسف[ع] کے قبضے میں آ گئے اور اسی باعث ان کے بھائیوں نے ان سے حسد کیا۔ اس کے بعد حضرت یوسف[ع] اور حضرت یعقوب[ع] کے خواب کا قصّہ آتا ہے (دیکھیے Weil : *Biblische Legenden der Musulmanner*، ص ۱۰۰)۔ فردوسی کی کی یوسف و زلیخا کی صرف ایک عبارت (طبع Ethe، در *Anecdota Oxoniensa*، سلسلۂ آریائی، ۱/۶ (۱۹۰۸ء) : ۲۵۸ تا ۲۵۹۹) کعب کا بطور راوی صرف ایک حوالہ ملتا ہے، جہاں فردوسی نے کہا ہے کہ سب سے پہلے کعب نے یہ بات کہی اور کعب ہی سے یہ مسیحی روایت مجھے پہنچی۔ اس کے بعد شاہ مصر (جسے یہاں وہ ذطروس یا خطروش کہتا ہے، کنیت ابوالحسن) اور اس کے وزیر ریان بن الولید (جس کا نام انجیل میں فوطیفار Potiphar آیا ہے) اور اس کی بیوی زلیخا اور مجمع عام میں حضرت یوسف[ع] کی نیلامی کا ذکر آتا ہے۔ الطبری (۱ : ۳۷۱ تا ۴۱۳) حضرت یوسف[ع] کا قصہ بیان کرتے ہوئے کعب کا مطلقًا ذکر نہیں کرتا۔ اس کے برعکس الثعالبی، الکسائی اور فردوسی اسی قصے میں مختلف مگر ایک سی عبارات میں بطور سند کے کعب کا ذکر کرتے ہیں، جس سے اس مفروضے کو تقویت

پہنچتی ہے کہ یہ نام بعد کی ایجاد ہے نہ صرف سوری (Moresco) افسانے بلکہ الثعالبی، الکسائی اور فردوسی میں بھی .

مآخذ : (۱) ابن سعد، طبع Sachau، ج ۲/۷ : ۱۵۶؛ (۲) الطبری : تاریخ، بمدد اشاریہ؛ (۳) ابن قتیبہ : کتاب المعارف، طبع وسٹنفلٹ، ص ۲۱۹؛ (۴) ابن الأثیر : ٹورنبرگ، ۳ : ۱۲۱؛ (۵) ابن حجر : الاصابہ، ۳ : ۶۳۵ تا ۶۳۹؛ (۶) وهی مصنف : تہذیب التہذیب، حیدرآباد ۱۳۲۹ھ، ۸ : ۴۳۸ تا ۴۴۰؛ (۷) النووی، بذیل مادہ؛ (۸) الاغانی، ۲ : ۵۰؛ (۹) Weil : *Biblische Legenden der Musulmänner*، ص ۱۰؛ (۱۰) شپرنگر : *Das Leben und die Lehre des Mohammed*، ۳ : ۱۰۹ حاشیہ ۲؛ (۱۱) M. Grünbaum : *Zu Schlechta-Wssehrds Ausgabe des Jussuf und Suleicha*، در *ZDMG*، ۴۳ : ۴۵۸، ۴۷۷؛ (۱۲) Lidzbarski، بذیل مادہ، ص ۳۱ تا ۴۰؛ (۱۳) H. Hirschfeld، بذیل مادۂ *Ka'b al-Ahbar*، در *Jewish Encyclopedia*، ۷ : ۴۰۰؛ (۱۴) M. Schmidt : *Uber das altspanische Poema de Jose*، در *Roman. Forschungen*، ۹ (۱۹۰۱ء) : ۳۲۱؛ (۱۵) G. Salzberger : *Die Salomosage in der semit. Literatur*، Heidelberg Diss : (برلن ۱۹۰۷ء)، ص ۹۱؛ (۱۶) B. Chapira : *Legendes bibliques attribuees a Ka'b al-Ahbar*، در *Rev. des Etudes Juives*، ۶۹ : ۸۶ ببعد؛ ۷۰ : ۳۷ ببعد .

(M. SCHMITZ)

⊗ * **کعبہ** : دنیا میں خدا کا پہلا گھر (بیت اللہ) اور مسلمانوں کا قبلہ جو مکۂ مکرمہ میں مسجد الحرام کے تقریباً عین وسط میں واقع ہے .

(۱) کعبہ، اسماے کعبہ اور جوار کعبہ :

[علما نے کعبے کے چند اسما لکھے ہیں :

(۱) کعبہ : یہ نام کعبے کی تعکیب، یعنی مربع ہونے، کی وجہ سے پڑ گیا ہے ۔ لغت کے اعتبار سے ہر بلند اور مربع عمارت کو کعبہ کہتے ہیں (دیکھیے الفاسی : شفاء الغرام، ۱ : ۱۲۶، بحوالۂ قاضی عیاض : المشارق؛ النووی : تہذیب الاسماء و اللغات)؛ (۲) البیت الحرام؛ (۳) بکّہ : بکّہ کے معنی توڑ دینے کے ہیں ۔ کعبے کو بکہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ سرکش لوگوں کی گردنوں کو توڑ دیتا ہے ۔ یہ نام مکۂ مکرمہ کا بھی ہے؛ (۴) البیت العتیق : چونکہ یہ گھر سرکش لوگوں کے تصرف سے آزاد رہا ہے، اس لیے اس کو یہ نام دیا گیا ۔ ابن الأثیر (النہایہ) اور الازرق (اخبار مکّۃ) نے کعبے کے کچھ اور نام بھی ذکر کیے ہیں (دیکھیے الفاسی : شفاء الغرام، ۱ : ۱۲۷)] .

کعبے کا نام، جو دراصل اسم علم نہیں، خانۂ کعبہ کی مکعب نما شکل سے تعلق رکھتا ہے، لیکن یہ عمارت صرف سرسری نظر میں مکعب نما ہے ورنہ حقیقت میں اس کا نقشہ ایک بے قاعدہ مستطیل کا ہے ۔ وہ دیوار جس کا رخ شمال مشرق کی طرف ہے اور جس میں دروازہ ہے (یعنی کعبے کے سامنے کا رخ) اور مقابل کی دیوار (کعبے کی پشت) چالیس چالیس فٹ لمبی ہیں، دوسری دو پینتیس پینتیس فٹ؛ بلندی پچاس فٹ ہے .

کعبے کی عمارت میں سیاہی مائل بھورے پتھر کے ردّے استعمال کیے گیے ہیں، جو مکے کے اردگرد کے پہاڑوں میں ملتا ہے ۔ عمارت کی کرسی (شادرواں) سنگ مرمر کی ہے ۔ یہ دس انچ اونچی ہے اور کوئی فٹ بھر دیواروں سے باہر نکلی ہوئی ہے ۔ کعبے کے مرکز سے اگر چار لکیریں چاروں کونوں (ارکان) سے گزرتی ہوئی کھینچی جائیں تو وہ کم و بیش قطب نما کی چار جہتوں کا پتا دیں گی ۔ اگر چاروں دیواروں کے مرکزوں سے عمودی خط کھینچے جائیں تو ان کی سمت شمال مشرق، شمال مغرب، جنوب مغرب اور جنوب مشرق ہوگی ۔

شمالی کونہ الرّکن العراقی کہلاتا ہے، مغربی الرّکن الشامی، جنوبی الرّکن الیمانی اور مشرقی (حجر اسود کی رعایت سے) الرّکن الاسود .

کعبے کی چاروں دیواریں ایک سیاہ پردے یا غلاف (کِسوۃ) سے ڈھکی رہتی ہیں، جو زمین تک لٹکتا ہے اور جس کا زیریں کنارہ تانبے کے ان حلقوں سے بندھا رہتا ہے جو شادرواں میں جڑے ہوے ہیں۔ [کعبے کو غلاف پہنانے کا رواج قدیم ترین زمانے سے چلا آ رہا ہے اور اسلام نے اس کو باقی رکھا ۔ اس سلسلے میں پہلا نام تُبّع اسعد الحمیری کا لیا جاتا ہے (شفاء الغرام، ۱ : ۱۱۹)۔ قبل از اسلام خالد بن جعفر بن کلاب نے کعبے کو ریشمی غلاف پہنایا ۔ جب قریش مکہ نے از سر نو کعبے کی تعمیر کی تو اسے خوبصورت غلاف پہنایا ۔ الازرقی کے مطابق رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے کعبے کو یمنی کپڑے کا غلاف پہنایا ۔ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ، حضرت عمر رضؓ اور حضرت عثمان رضؓ اپنے اپنے عہد خلافت میں عمدہ مصری کپڑے کا غلاف چڑھاتے رہے ۔ حضرت عثمان رضؓ اوپر نیچے دو غلاف چڑھایا کرتے تھے ۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ اور حضرت معاویہ رضؓ بھی ریشمی غلاف چڑھایا کرتے تھے ۔ ہر سال محرم کی دسویں تاریخ کو کعبے پر غلاف چڑھایا جاتا تھا ۔ آگے چل کر خلفاے بنو امیہ میں سے یزید بن معاویہ رضؓ اور عبدالملک بن مروان اور عباسی خلفا میں سے خلیفہ مأمون الرّشید اور المتوکل نے بھی اس رسم کو قائم رکھا ۔ خلیفہ مأمون نے تین غلاف چڑھانے شروع کیے : (۱) سرخ ریشمی غلاف، ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ (یوم التّرْویۃ) کو؛ (۲) قباطی (مصری) غلاف، یکم رجب کو؛ (۳) سفید ریشمی غلاف، ۲۷ رمضان المبارک کو ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے السہیلی : الروض الانف، مطبوعۂ قاہرہ، ۱ : ۱۲۹ تا ۱۳۰؛ سیرۃ ابن ہشام، مطبوعۂ قاہرہ، ۱ : ۱۹۹؛ الفاسی : شفاء الغرام، ۱ : ۱۱۹ تا ۱۲۶] .

پردے میں صرف دو شگاف ہیں : ایک میزاب (پر نالے) کے لیے اور دوسرا دروازے کے لیے۔ کِسوۃ مدت تک ہر سال مصر میں تیار ہوتا رہا، پھر ہند اور پاکستان میں بھی تیار ہوتا اور حاجیوں کے ایک خاص قافلے کے ہمراہ مکّے پہنچتا رہا ۔ اب یہ غلاف کعبہ مقامی دارالکسْوۃ میں تیار ہوتا ہے ۔ پرانا غلاف ۲۵ (یا البتنونی کے مطابق ۲۸) ذوالقعدہ کو اتار دیا جاتا تھا اور عارضی طور پر ایک سفید غلاف، جو زمین سے تقریباً چھے فٹ اونچا رہتا تھا، چڑھا دیا جاتا تھا ۔ اس موقع پر کہا جاتا تھا کہ کعبے نے احرام باندھ لیا ۔ [ابن جُبیر نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ ۲۷ ذوالقعدہ کو کعبے کے غلاف کو آٹھ نو فٹ اوپر کی جانب چاروں طرف سے سمیٹ دیا جاتا ہے ۔ اسے کعبے کا احرام کہا جاتا ہے ۔ بقول ابن جُبیر ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے۔ الفاسی (شفاء الغرام، ۱ : ۱۲۴) کے مطابق ان کے زمانے میں ۲۵ ذوالقعدہ کو ہر سال کعبے کے غلاف کو اوپر کی جانب چاروں طرف سے سمیٹ دیا جاتا تھا ۔ اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے ۔ یہ عمل پہلے عصر کی نماز کے بعد انجام دیا جاتا تھا پھر دن کے آغاز میں اس کا رواج ہو گیا] ۔ حج کے اختتام پر نیا غلاف چڑھا دیا جاتا ہے ۔ دروازے کے لیے ایک علٰحدہ پردہ ہوتا ہے، جسے البرقع کہتے ہیں .

کسوۃ سیاہ کمخواب کا ہوتا ہے، جس میں کلمۂ شہادت بُنا ہوتا ہے ۔ اس کی دو تہائی بلندی پر ایک زردوزی کے کام کی پٹی (حِزام) ہوتی ہے، جس پر قرآن مجید کی آیات خوشخط لکھی ہوتی ہیں ۔ غلاف کعبہ ہر سال بدلا جاتا ہے اور اس کی ذرا سی کترن بھی تبرّک سمجھی جاتی

ھے؛ چنانچہ بنو شیبہ، جو کعبے کے دربان چلے آتے ھیں، اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تبرک کے طور پر تقسیم اور بعض اوقات فروخت کر دیا کرتے تھے [مگر اب سعودی عرب کی حکومت کعبے کی متولّی ھے اور موجودہ حکومت نے غلاف کے اجزا کو فروخت کرنے کی ممانعت کر دی ھے] .

شمال مشرق دیوار میں زمین سے کوئی سات فٹ اونچا کعبے کا دروازہ ھے، جس کے کچھ حصوں پر چاندی کے پترے چڑھے ھوے ھیں۔ Burckhardt اور علی بے کے زمانے میں ھر رات دہلیز پر شمعوں کی قطار جلا کرتی تھی۔ [مگر موجودہ دور میں برقی روشنی کی وجہ سے اس کا رواج باقی نہیں رھا] ۔ جب دروازہ کھلتا ھے تو ایک پہیے دار زینہ (دَرَج یا مَدْرَج) دھکیل کر اس کے برابر لگا دیا جاتا ھے۔ یہ زینہ جب استعمال میں نہیں ھوتا تو چاہ زمزم اور باب بنو شیبہ کے درمیان کھڑا رھتا ھے (Snouck Hurgronje : *Bilderatlas zu Mecca*، عدد ۲؛ زینے کی تصویر کے لیے دیکھیے علی بے : *Travels*، ۲ : ۸۰) .

کعبے کی چھت تین چوبی ستونوں پر قائم ھے، جس پر پہنچنے کے لیے ایک سیڑھی بھی ھے۔ یہاں بہت سی سنہری اور روپہلی قندیلیں لٹک رھی ھیں؛ اس کے سوا اور کوئی ساز و سامان نہیں۔ اندرونی دیواروں پر عمارت کی تجدید و مرمت کے متعلق کئی کتبے ھیں۔ فرش سنگ مرمر کی سلوں کا ھے .

بیرونِ کعبہ مشرقی کونے میں، فرش سے تقریباً پانچ فٹ بلندی پر، دروازے کے قریب ھی الحجر الاسود (سیاہ پتھر) دیوار میں نصب ھے۔ اب اس کے تین بڑے اور کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ھیں جو ایک دوسرے سے پیوست ھیں۔ ان کے گرد ایک پتھر کا ھالہ ھے اور اس ھالے پر ایک چاندی کا حلقہ چڑھا ھوا ھے۔ حجر اسود کی سطح زائرین کے چھونے اور چومنے سے گھس گھس کر صاف شفاف ھو گئی ھے۔ علی بے (۲ : ۷۶) نے اس کا ایک خاکہ دیا ھے، جس سے ظاھر ھے کہ سطح میں اونچ نیچ سی پیدا ھو گئی ھے۔ البتنونی (ص ۱۰۵) کے اندازے کے مطابق اس کا قطر بارہ انچ ھے۔ حجرِ اسود کی رنگت سرخی مائل سیاہ ھے جس میں سرخ اور زرد ریزے جھلکتے ھیں .

دیوار کا وہ حصہ جو حجر اسود اور دروازے کے درمیان ھے، اَلْمُلْتَزَم (= جہاں چمٹا جائے) کہلاتا ھے کیونکہ طواف کرنے والے دعا اور اِلْحاح و زاری کرتے وقت اس دیوار (الملتزم) سے لپٹ جاتے ھیں .

کعبے کے باھر کی طرف ایک سنہری پرنالہ (مِیْزاب) شمال مغربی دیوار کے بالائی کنارے سے نیچے نکلا ھوا ھے، جس کا لٹکا ھوا سرا میزاب کی داڑھی کہلاتا ھے۔ یہ پرنالہ "میزاب الرحمة" کے نام سے موسوم ھے (دیکھیے Ben Cherif : *Aux Villes saintes de l'Islam*، ص ۵۷)۔ بارش کا پانی پرنالے کے ذریعے نیچے پتھر کے فرش پر گرتا ھے، جو اس جگہ پچی کاری سے مزین ھے۔ کعبے کے چاروں طرف سنگ مرمر کا فرش ھے .

شمال مغربی دیوار کے سامنے، مگر اس سے جدا، سفید سنگ مرمر کی ایک نیم مدوّر دیوار (حَطِیْم) ھے۔ یہ تین فٹ اونچی اور تقریباً پانچ فٹ موٹی ھے۔ اس کے سرے کعبے کے شمالی اور مشرقی کونوں سے تقریباً چھے فٹ کے فاصلے پر ھیں۔ حطیم اور کعبے کے درمیان جو نصف دائرے کی شکل کا قطعہ ھے اسے خاص تقدس حاصل ھے۔ دراصل یہ کعبے کا حصہ ھے، اسی لیے طواف کے وقت اس کے اندر داخل نہیں ھوتے بلکہ اس کے گرد ھو کر، جس قدر قریب ممکن ھو، گزرتے ھیں۔ یہ قطعہ الحِجر یا [حِجْر اسمٰعیل[۴]]

کے نام سے موسوم ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت اسمعیل[ؑ] اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ[ؑ] یہیں مدفون ہیں ۔ وہ فرش جس پر طواف کیا جاتا ہے، مَطاف کہلاتا ہے ۔

[مَطاف اور اس کے گرد و نواح کی صورت ہمیشہ یکساں نہیں رہی، البتہ مَطاف میں داخل ہونے والا دروازہ (باب السلام) بدستور قائم ہے ۔ ۱۹۵۶ء کی توسیع و تزئین کے دوران میں مَطاف میں نیا فرش لگایا گیا تھا] ۔ کچھ عرصہ پہلے مَطاف کے ساتھ ساتھ اکتیس یا بتیس نازک پتلے ستون نصب تھے اور ہر دو ستونوں کے درمیان سات قندیلیں آویزاں تھیں جو شام کے وقت روشن کی جاتی تھیں ۔ [اب روشنی کے لیے بجلی کی جدید خوبصورت ٹیوبیں نصب کی گئی ہیں] ۔ باب بنی شیبہ ایک محراب ہے، جو کعبے کی شمال مشرقی دیوار کے مقابل واقع ہے اور جہاں سے مَطاف میں داخل ہوتے ہیں ۔ اس محراب اور کعبے کے درمیان ایک چھوٹی سی قبہ دار عمارت ہے، جو مقام ابراہیم[ؑ] کہلاتی ہے ۔ اس میں ایک پتھر رکھا ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم[ؑ] تعمیر کعبہ کے وقت اس پر کھڑے ہوے تھے ۔ مشرقی سیاحوں اور مؤرخوں کے بیان کے مطابق یہ ایک نرم پتھر ہے، جس پر حضرت ابراہیم[ؑ] کے نقش قدم اب تک دکھائی دیتے ہیں ۔ المہدی بن المنصور عباسی (م ۱۶۹ھ) کے عہد خلافت میں اس پتھر پر حفاظت کے لیے ایک سنہری حلقہ چڑھا دیا گیا تھا ۔ مقام ابراہیم کے علاوہ اسی شمال مشرقی دیوار کعبہ کے سامنے، مگر مقام ابراہیم[ؑ] سے ذرا شمال کی طرف، سفید سنگ مرمر کا منبر ہے ۔ باب بنی شیبہ کے نزدیک مدخل کے بائیں ہاتھ اور حجر اسود کے عین سامنے وہ "قبہ" ہے جس کے اندر چاہ زمزم واقع ہے ۔ فرش زمین پر کمرے کے اندر یہ ایک کنواں ہے، جو تمام کا تمام پختہ ہے ۔ اس پر برقی رو سے چلنے والے ٹیوب ویل (Tube well) لگے ہوے ہیں ۔ سپاٹ چھت کے ایک حصے پر چھوٹا سا مسقّف مصلّی ہے، جس کے اوپر ایک گنبدی سی بنی ہے ۔ [۱۹۵۶ء کی تعمیر و توسیع کے سلسلے میں صفا و مروہ کا سارا راستہ بڑی خوبصورتی سے پختہ اور مسقّف کر دیا گیا ہے] ۔

(۲) تاریخ کعبہ

[کعبے کی تعمیر کے سلسلے میں مختلف روایات مذکور ہیں ۔ بقول الازرقی (اخبار مکہ) کعبے کو سب سے پہلے فرشتوں نے تعمیر کیا ۔ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا بھی نہیں کیا گیا تھا ۔ اس کے اثبات میں وہ حضرت زین العابدین[رض] سے منقول ایک روایت پیش کرتے ہیں ۔ مزید براں حضرت ابن عباس[رض] سے بھی اس سلسلے میں ایک روایت منقول ہے ۔ النووی نے بھی اپنی کتاب تہذیب الاسماء و اللغات میں فرشتوں کی تعمیر کعبہ کا ذکر کیا اور اسے کعبے کی اولین تعمیر قرار دیا ہے ۔ اس کے بعد حضرت آدم[ؑ] نے کعبے کو تعمیر کیا ۔ اس کے اثبات میں البیہقی نے دلائل النبوۃ میں ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالٰی نے جبریل[ؑ] کو حضرت آدم و حوّا کی طرف بھیجا اور ان کو کعبے کی تعمیر کا حکم دیا؛ چنانچہ انھوں نے تعمیل ارشاد کی ۔ جب تعمیر مکمل ہوگئی تو ان کو طواف کا حکم دیا گیا ۔ پھر مرور زمانہ کے بعد حضرت نوح[ؑ] نے کعبے کا حج کیا ۔ الازرقی نے بھی آدم علیہ السلام کی تعمیر کعبہ کا ذکر کیا اور اس کی تائید میں دو روایات نقل کی ہیں ۔ مشہور محدّث عبدالرزاق اپنی کتاب المصنف میں لکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے کعبے کی تعمیر میں پانچ پہاڑوں یعنی لبنان، طور زیتا، طور سیناء، الجودی اور حراء کے پتھر استعمال کیے ۔ بقول المحب الطبری کعبے

کی بنیادوں میں حراء کے پتھر استعمال کیے گئے تھے۔ حضرت آدم ؑ کی تعمیر کے بعد ان کے بیٹے شیث ؑ نے بھی کعبے کی تعمیر ثانی میں حصہ لیا تھا ۔ اس کے بعد حضرت ابراهیم علیه السلام کی تعمیر کا ذکر تو خود قرآن مجید نے کیا ہے ۔ ابن الحاج المالکی کہتے ہیں کہ حضرت ابراهیم ؑ نے کعبے کی جو بنیاد رکھی وہ پچھلی جانب سے گول تھی ۔ اس کے دو کونے (رکن) تھے اور دونوں رکن یمانی کہلاتے تھے ۔ قریش نے تعمیر کعبه کے وقت اس کے چار ارکان تعمیر کیے (دیکھیے شفاء الغرام، ۱ : ۹۲، ۹۳) .

الفاکہی حضرت علی رض سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابراهیم ؑ کا تیار کردہ کعبه جب گر گیا تو قبیلۂ جرهم نے اس کو تعمیر کیا ۔ جب مرور زمانه سے کعبے کی عمارت پھر منہدم ہوگئی تو عمالقه نے اس کو تعمیر کیا ۔ بعد ازاں قریش نے کعبه تعمیر کیا ۔ المسعودی کا بیان ہے کہ قبیلۂ جرهم میں سے جس شخص نے کعبے کو تعمیر کیا اس کا نام الحارث بن مضاض الاصغر تھا ۔ الزّبیر بن بکّار قاضی مکّه نے کتاب نسب قریش و اخبارها میں قصّی بن کلاب کی تعمیر کعبه کا ذکر بھی کیا ہے ۔ الماوردی (الاحکام السلطانیه) نے لکھا ہے کہ حضرت ابراهیم ؑ کی تعمیر کے بعد قریش میں قصّی بن کلاب پہلا شخص تھا جس نے کعبے کو از سر نو تعمیر کیا (شفاء الغرام، ص ۹۲ تا ۹۵؛ السہیلی : الروض الانف، ص ۱۲۷ تا ۱۳۰) .

جب ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں یمن کا حاکم اَبْرهه کعبے کو ڈھانے کے لیے مکے پر حمله آور ہوا تو اللہ تعالٰی نے اپنے گھر کی حفاظت خود فرمائی اور اس کی فوج کو نیست و نابود کر دیا [رک به ابرهه، نیز اَصحاب الفیل] .

یه واقعه مُزْدَلِفه اور مِنٰی کے درمیان وادی محصّب کے قریب مُحَسِّر کے مقام پر پیش آیا تھا ۔ مسلم اور ابو داؤد کی روایات میں مذکور ہے که حجّة الوداع کے سفر میں رسولُ اللہ صَلَّی اللہ عَلَیْه وآله وَسَلَّم جب مزدلفه سے منٰی کی طرف چلے تو مُحَسِّر کی وادی میں آپ ؐ نے رفتار تیز کر دی ۔ امام النَوَوی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں که اصحاب الفیل کا واقعه اسی جگه پیش آیا تھا ۔ اس لیے سنت یہی ہے کہ آدمی یہاں سے جلدی گزر جائے .

جس سال یه واقعه پیش آیا، اهل عرب اسے عام الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہتے ہیں ۔ اسی سال رسولُ اللہ صَلَّی اللہ عَلَیْه وآله وسَلَّم کی ولادت مبارکه ہوئی ۔ محدثین اور مؤرخین کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ہے که اصحاب الفیل کا واقعه محرم میں پیش آیا تھا اور حضور ؐ کی ولادت ربیع الاول میں ہوئی تھی ۔ اکثر مؤرخین کہتے ہیں که آپ ؐ کی ولادت واقعۂ فیل کے ۵۰ دن بعد ہوئی ۔ اسی واقعے کے سلسلے میں سورة الفیل نازل ہوئی (دیکھیے ابن هشام : سیرة، ۱ : ۴۳ تا ۵۷؛ السہیلی : الروض الانف، ص ۳۵ تا ۴۸؛ الفاسی : شفاء الغرام، ۱ : ۱۸۹ تا ۱۹۰؛ نیز اردو تفاسیر مثلاً مواهب الرحمن، تفهیم القرآن وغیره بذیل تفسیر سورة الفیل] .

مستند تاریخ حضرت محمّد صلّی اللہ علیه وآله وسلّم کے زمانے هی سے شروع ہوتی ہے ۔ کہا جاتا ہے که جب آپ ؐ سن بلوغ کو پہنچے تو ایک عورت کے ہاتھ سے جو بخورات جلا رہی تھی کعبے کو آگ لگ گئی اور عمارت تباہ ہو گئی ۔ اتفاق سے انہیں دنوں ایک بوزنطینی جہاز جدے [رک بآن] کے قریب خشکی پر چڑھ گیا تھا اور اهل مکه اس کی لکڑی اٹھا لائے اور نئی عمارت کے لیے اس کو استعمال کیا ۔ اس ضمن میں ایک شخص باقوم کا نام (یه نام مختلف صورتوں میں مذکور ہوا ہے)

ہمیشہ آتا ہے جیسے بعض روایات میں جہاز کا کپتان اور بعض میں بڑھئی بتایا گیا ہے جس سے نئی عمارت بنانے کے سلسلے میں مشورہ لیا گیا تھا ۔ کہتے ھیں کہ وہ ایک قبطی عیسائی تھا [(دیکھیے السہیلی : الروض الانف، ۱ : ۱۳۰) ۔ السہیلی بھی اس شخص کا نام باقوم بتاتا ہے] .

کعبے کی قدیم عمارت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ قد آدم اونچی اور غیر مسقّف تھی ۔ دھلیز زمین کے برابر تھی جس کی وجہ سے سیلابوں کا پانی آسانی سے اندر داخل ہوسکتا تھا اور سیلاب اکثر آتے رہتے تھے ۔ اس دفعہ تعمیر اس طرح ہوئی کہ باری باری سے ایک تہ پتھر کی اور ایک لکڑی کی بنائی گئی اور بلندی پہلے سے دگنی کر دی گئی اور عمارت پر چھت بھی ڈال دی گئی ۔ دروازہ زمین سے اتنا اونچا کر دیا گیا کہ داخل ہونے کے لیے سیڑھی درکار تھی ۔ ناپسندیدہ زائروں کو دھکے دے کر اونچی دھلیز سے نیچے لڑھکا دیا جاتا تھا ۔ جب حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب کرنے کا موقع آیا تو اهل مکہ اس بات پر آپس میں جھگڑنے لگے کہ یہ اعزاز کس کے حصے میں آئے ۔ آخر قریش کے معتبر ترین شخص ابو امیّہ بن المغیرہ نے کہا کہ جو شخص سب سے پہلے نمودار ہو وہی یہ خدمت بجا لائے ۔ عین اسی وقت حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا وہاں سے گزر ہوا ۔ سب پکار اٹھے کہ امین آ گئے، محمد آگئے، یہ ہمیں پسند ہیں ۔ روایت ہے کہ آپؐ نے کمال دانشمندی سے کہا مجھے ایک چادر دیجیے ۔ چادر مہیا کر دی گئی آپؐ نے قبائل کے سرداروں سے کہا کہ وہ اس کپڑے کے کونے پکڑ کر لے چلیں ۔ پھر آپؐ نے خود پتھر کو اٹھایا اور مقررہ مقام پر رکھ دیا [(ابن ہشام : سیرۃ، مطبوعۂ قاہرہ، ۱ : ۱۹۷؛ الروض الانف، ۱ : ۱۳۲؛ شفاء الغرام، ۱ : ۹۵ و ۹۶)] .

۸ھ میں فتح مکّہ کے وقت (دیکھیے ذیل میں عنوان ۳) حضرت رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے کعبے کی عمارت کو جوں کا توں رہنے دیا، مگر [ایک حدیث میں آپؐ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ اے عائشہؓ ! اگر تیری قوم تازہ تازہ ایمان نہ لائی ہوتی تو میں کعبے کی عمارت میں تبدیلی کرکے دو دروازے بنا دیتا، ایک دروازہ داخل ہونے کے لیے اور ایک نکلنے کے لیے (البخاری : الصحیح، کتاب العلم، باب ۴۸)] .

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کا ارادہ تو تھا، لیکن آپؐ نے اس خیال سے اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنایا کہ مبادا لوگ کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائیں اور غلط قسم کی قیاس آرائیاں کرنے لگیں] ۔ آپؐ کے ارادے کی تکمیل ۶۴ھ / ۶۸۳ء میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ [رک بآں] کے ہاتھوں معرض عمل میں آئی ۔ ان کے مدعی خلافت ہونے کے باعث الحُصَیْن بن نُمَیْر [رک بآں] نے مکے کا محاصرہ کر لیا اور گرد و نواح کی پہاڑیوں پر منجنیقیں گاڑ کر شہر اور حرم پر پتھروں کی بارش شروع کر دی اور بیت اللہ کی عمارت کو بڑا نقصان پہنچایا ۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے ساتھیوں نے کعبے کے نزدیک اپنے خیمے نصب کر لیے ۔ (اس وقت سے وہ العائذ بالبیت، یعنی ایسا شخص جو بیت الحرم میں پناہ گزین ہو، کہلانے لگے) ۔ اسی اثنا میں آتشزدگی سے حجر اَسْوَد تین ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا ۔ ابن زبیر نے ان ٹکڑوں کو چاندی کی پٹی کے ساتھ باندھ دیا (شفاء الغرام، ص ۹۸) .

جب اموی لشکر چلا گیا تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے عمائد مکہ سے کعبے کی شکستہ عمارت کے انہدام اور از سر نو تعمیر کے متعلق مشورہ کیا ۔ جب

انھوں نے اس بات کا فیصلہ کر لیا اور ملبے کو صاف کرنے اور اٹھانے کا وقت آیا تو کسی کو یہ کام شروع کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی ۔ بیشتر شہری حضرت ابن عباس رض کی سر کردگی میں شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے، کیونکہ انھیں خوف تھا کہ کعبے کے انہدام سے آسمانی عذاب نازل ہوگا، لیکن حضرت عبداللہ رض ہاتھ میں کدال لے کر خود یہ ہیبت زا کام کرنے لگے ۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ انھیں کوئی ضرر نہیں پہنچا تو ہمت بندھی اور وہ بھی شریک کار ہو گئے ۔

تعمیر کے دوران میں ایک پردے دار باڑ اصل جگہ پر کھڑی کر دی گئی تاکہ کم از کم قبلے اور مطاف کا نشان قائم رہے ۔ کہا جاتا ہے کہ معمار اس پردے کے پیچھے کام کرتے رہے ۔ حضرت عبداللہ رض خود دارالندوہ میں حجر اسود کی حفاظت کرتے رہے جو کمخواب کے ایک ٹکڑے میں لپٹا ہوا تھا ۔ جب حجر اسود کو، یعنی اس کے تین ٹکڑوں کو، پھر اس کے مقام پر رکھا گیا تو اس کے گرد چاندی کا ایک حلقہ کس دیا گیا ۔

اس دفعہ کعبے کی تعمیر میں تمام تر مکے کا پتھر اور یمن کا چونا استعمال کیا گیا ۔ عمارت ستائیس گز اونچی کر دی گئی ۔ حدیث نبوی ص کی تعمیل کرتے ہوے حِجْر (حطیم) کو عمارت میں شامل کر دیا گیا اور فرش کے برابر دو دروازے رکھے گئے، مشرقی دروازہ داخلے کے لیے اور مغربی دروازہ نکلنے کے لیے ۔ طواف کے وقت چاروں کونوں کو بوسہ دیا جاتا تھا ۔

یہ تبدیلیاں فقط تھوڑے عرصے تک قائم رہیں ۔ ۷۴ھ/۶۹۳ء میں حجاج بن یوسف [رک باں] نے مکے کی تسخیر کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رض کو قتل کر دیا ۔ اس نے خلیفہ عبدالملک کے اتفاق راے سے حجر کو پھر کعبے سے جدا کر دیا اور مغربی دروازہ بند کر دیا ۔ بعد ازاں جب خلیفہ عبدالملک بن مروان کو حضرت عائشہ صدیقہ رض سے حدیث کا علم ہوا تو اس نے اس پر اظہار ندامت کیا اور کہا کہ بہتر ہوتا کہ میں کعبے کو ابن زبیر رض کی بنا کردہ حالت پر چھوڑ دیتا (شفاء الغرام، ص ۹۹) ۔ اس طرح کعبے نے عملاً پھر وہی صورت اختیار کر لی جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے عہد مبارک میں تھی اور یہی شکل آج تک چلی آتی ہے ۔ عوام کا جذبۂ احترام کسی قسم کی معتدبہ تبدیلیوں کا ہمیشہ مخالف رہا ہے ۔ کبھی کبھار مرمت کی ضرورت پیش آتی رہی ہے ۔ زمانۂ جاہلیت سے لے کر عصر حاضر تک یہ عمارت برابر سیلابوں کی زد میں رہی ہے ۔ ۱۶۱۱ء میں جب اس کے گر جانے کا خطرہ پیدا ہوا تو اس خطرے کی روک تھام کے لیے اس کے گرد تانبے کا حلقہ ڈال دیا گیا، مگر ایک نئے سیلاب نے ان حفاظتی تدابیر کو بھی بیکار کر دیا ۔ اس لیے ۱۹۳۰ء میں پوری طرح مرمت کرکے عمارت کو درست کر دیا گیا، لیکن اس دفعہ حتی الوسع پرانے پتھر کام میں لائے گئے ۔

۳۱۷ھ/۹۲۹ء میں قرامطہ کے حملے کے باوجود کعبہ محفوظ رہا، البتہ حملہ آور حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے جو کوئی بیس برس غائب رہنے کے بعد پھر واپس مکے پہنچ گیا ۔

کعبے پر غلاف چڑھانے کی رسم بہت قدیم زمانے سے چلی آتی ہے اس ضمن میں مختلف روایات قبل ازیں ذکر کی جا چکی ہیں ۔ [ایک روایت کے مطابق سکندر اعظم نے بھی وہاں سے گزرتے ہوے ایک غلاف چڑھایا تھا] ۔ ہر سال نیا غلاف چڑھانے کا دستور فقط زمانۂ حال ھی میں باقاعدہ طور پر رائج ہوا ۔ قدیم ترین اسلامی عہد میں غلاف چڑھانے کا دن عاشوراء مذکور ہے، مگر رجب اور دوسرے مہینوں میں بھی غلاف بدلے گئے ہیں ۔ کسوۃ یا

غلاف بعض دفعه یمنی اور بعض دفعه مصری یا کسی اور کپڑے کا ہوتا تھا ۔ [غلاف کعبه کے سلسلے میں مختلف کپڑوں اور مختلف رنگوں کا ذکر بھی آیا ہے (دیکھیے شفاء الغرام، ۱۱۹ تا ۱۲۶)] ۔

کعبے کے گرد کے مقاموں کا تذکرہ عباسی عہد میں بھی پایا جاتا ہے اور بعض دفعه مقام کے بجائے ظُلّه (سائبان) کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ موجودہ عمارتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۳ء سے چلی آتی ہیں۔ چاہ زمزم پر گنبد کا ذکر بھی اسی پرانے زمانے میں آیا ہے ۔ ۹۳۳ھ میں بیت زمزم کے سامنے آب زر سے سلطان سلیمان آل عثمان کا نام کندہ ہوا۔ ۹۴۸ھ میں بیت زمزم کو از سر نو تعمیر کیا گیا ۔ ۱۰۲۰ھ میں سلطان احمد خان کے حکم سے زمزم کے کنویں میں لوہے کی جالی لگائی گئی ۔ ۱۰۷۲ھ میں زمزم کے گنبد کو از سر نو تعمیر کیا گیا (شفاء الغرام، ص ۲۵۱) ۔ سلطان عبدالعزیز آل سعود نے زمزم کے پاس پانی کی دو سبیلیں لگا دیں اور پانی پینے والوں کے لیے سائبان تعمیر کر دیا ۔

۳- کعبه اور اسلام

مکّے میں نبوت کے بارھویں سال نماز فرض ہوئی اور آپؐ حکم خدا وندی کے مطابق کعبے کی جانب متوجه ہو کر نماز ادا کرتے رہے ۔ [نماز فرض ہونے سے قبل بھی آپؐ کا قبله رخ ہو کر نماز پڑھنا ثابت ہے] ۔ ہجرت کے بعد مدنی زندگی کے آغاز میں آپؐ کو بیت المقدس کو قبله بنا کر نماز پڑھنے کی ہدایت ہوئی، چنانچه تقریبًا ڈیرھ سال تک آپؐ نے اس حکم کی تعمیل فرمائی، مگر دل سے آپؐ اس بات کے خواہاں تھے کہ مسلمانوں کا کعبه بیت اللہ ہی رہے ۔ قرآن مجید نے آپؐ کی اس دلی تمنا کا ذکر کیا ہے ۔ آخر آپؐ کی یه آرزو پوری ہوئی اور یه آیت کریمه نازل ہوئی : قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (۲ [البقرة] : ۱۴۴)، یعنی ہم دیکھ رہے ہیں آپ کے منه کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا، سو ہم پھیر دیں گے آپ کو اسی قبلے کی طرف جو آپ کو پسند ہے ۔ پس اب اپنا منه مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور تم لوگ جہاں بھی ہوا کرو (نماز پڑھتے وقت) اسی مسجد کی طرف منه کر لیا کرو اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ (نیا قبله) ان کے ربّ کی طرف سے برحق ہے اور اللہ بے خبر نہیں ہے اس سے جو وہ کر رہے ہیں ۔

کعبے کے ابتدائی آثار مٹ جانے کے بعد حضرت ابراهیمؑ نے از سر نو اس کو تعمیر کیا۔ حضرت ابراهیمؑ جدّالانبیاء تھے ۔ یہودی اور عیسائی بھی آپؑ کی عزت و تکریم کرتے اور آپؑ کی نبوت کو تسلیم کرتے تھے ۔ حضرت محمّد صلّی اللہ علیه وآله وسلّم کو بھی آپ کی پیروی کا حکم دیا گیا تھا۔ حضرت ابراهیمؑ دین اسلام ہی کے داعی تھے ۔ یہود نے اپنے مذہب کو بڑی حد تک تبدیل کر لیا تھا ۔ حضرت ابراهیمؑ و اسمٰعیلؑ کی تعمیر کعبه کا ذکر سورة البقرة میں کیا گیا ہے (۲ [البقرة]: ۱۲۷) اور مقام ابراهیمؑ کو نماز (صلٰوة) کے لیے موزوں جگه قرار دیا گیا (۲ [البقرة] : ۱۲۵) ۔ حضرت ابراهیمؑ کو خدا نے حکم دیا کہ لوگوں کو حج کی دعوت دیں (۲۲ [الحج]: ۲۷) اور کعبه پہلی مقدس عبادت گاہ تھی جو روے زمین پر قائم کی گئی (۳ [اٰل عمرٰن] : ۹۶) ۔ اب کعبه بیت الحرام (۵ [المائدة] : ۹۷) یا

بیت العتیق (۲۲ [الحج] : ۲۹ و ۳۳) کے نام سے موسوم ہوا ۔

۶ھ میں حضرت رسول کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے چودہ سو صحابہ کی رفاقت میں عمرے کا ارادہ کیا، مگر اہل مکہ نے آپؐ کو حُدَیْبِیَہ کے مقام پر روک دیا ۔ اگلے سال ۷ھ میں عمرۃ القضاء ادا کیا ۔ ۸ھ میں اللہ کے حکم سے آپؐ نے جنگ و جدال کے بغیر مکہ فتح کیا ۔ اس سے اسلام میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ۔ کفر و شرک کے تمام انبار جو کعبے کے گرد جمع ہو گئے تھے اب صاف کر دیے گئے ۔ تاریخی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبے کے چاروں طرف ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے جب اپنی چھڑی سے انھیں چھوا اور آیت کریمہ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷ [بنی اسراءیل] : ۸۱) تلاوت فرمائی تو وہ زمین پر گر گئے (کتب صحاح ستّہ) ۔ ہبل کا مجسّمہ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ عمرو بن لُحَیّ نے کعبے کے اندر نصب کیا تھا نیز بعض انبیاے کرام کے مجسمے اور تصویریں سب کو ضائع کر کے اٹھوا باہر کیا ۔ (ابن ہشام : سیرۃ، ۴ : ۸۲؛ ابن الکلبی : کتاب الاصنام) .

فتح مکّہ کے وقت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ان دینی اور دنیوی منصبوں کا انتظام کیا جو مکے میں قدیم زمانے سے چلے آتے تھے ۔ مؤرخوں کا قول ہے کہ پرانے زمانۂ جاہلیت میں قُصَیّ نے قبیلۂ خُزاعہ سے سخت جنگ و جدال کے بعد کعبے پر قبضہ کر لیا اور سب اہم دینی اور دنیوی منصب خود سنبھال لیے، یعنی دارالندوہ کا اہتمام اور پرچم کا باندھنا (عَقد اللِّوا)، زائرین کے لیے خوراک کی بہم رسانی (رِفادہ) اور پانی کی بہم رسانی (سِقایہ)، کعبے کی نگرانی (سِدانہ و حَجابہ) ۔ قصیّ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے پوتے جن کا شجرہ درج ذیل ہے ان عہدوں کے فرائض بجا لاتے رہے (دیکھیے ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۱۲۳ تا ۱۲۴) :

عبدمناف | عبدالدّار
ہاشم | عثمان
عبدالمطّلب | عبدالعزّی
عباس، ابو طالب | ابو طلحہ، عبداللہ

عبد مناف اور ان کی اولاد کو رفادہ اور سقایہ وغیرہ ملے اور عبدالدّار اور ان کی اولاد کو سِدانہ اور حجابہ وغیرہ کے منصب تفویض ہوے ۔

جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مکّہ فتح کیا تو آپؐ کے چچا عباسؓ [رکّ بآں] یا ایک اور روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے ان عہدوں کے لیے درخواست کی، لیکن آپؐ نے فرمایا کہ یہ سب چیزیں سوا سقایہ اور کعبے کی نگرانی کے آپؐ کے پاؤں تلے روند ڈالی جائیں گی ۔ سقایہ حضرت عباسؓ کی تحویل میں تھا ۔ کعبے کی نگرانی عثمان بن طلحہ کے سپرد ہوئی جنھوں نے اپنے چچازاد بھائی شیبہ بن ابی طلحہ کو اجازت دے دی کہ وہ ان کے نائب کے طور پر کام کریں ۔ بنو شیبہ آج تک کعبے کے دربان چلے آتے ہیں ۔ رفادہ جو ابو طالب کے قبضے میں تھا، ۹ھ میں حضرت ابو بکرؓ کے نام منتقل ہو گیا ۔ ان کی وفات کے بعد خلفا زائرین کے طعام کا انتظام کرنے لگے ۔

مکّے پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا عملی تسلط پہلی دفعہ ۹ھ کے حج کے موقع پر علانیہ طور پر ثبت ہوا ۔ آپؐ خود اس حج میں شریک نہ تھے ۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپؐ کی نیابت اور نمائندگی کرتے ہوے امیر الحج کے فرائض انجام دیے اور حاجیوں کے مجمع میں نئے انتظامات کا اعلان کیا جو وحی الٰہی کے پیش نظر عمل میں لائے گئے تھے ۔ حضرت علیؓ نے سورۂ

توبہ [رک بہ براءۃ (سورہ)] کی آیات پڑھ کر اعلان کیا کہ اس سال کے بعد مشرکین کو بیت اللہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ۔

اس کے مطابق آئندہ سے مشرکوں کو بیت اللہ کی تقریبات میں شرکت کی ممانعت کر دی گئی ہے کیونکہ وہ ناپاک (نجس) ہیں ۔ علاوہ ازیں اہل اسلام کے خلاف نبرد آزما ہونے والے کفار کو قانون کی حمایت سے محروم قرار دے دیا گیا ہے ۔ ان کو چار مہینے کی مہلت دی گئی جس کے دوران میں وہ جہاں چاہیں آزادی سے چل پھر سکتے ہیں، لیکن اس کے بعد انھیں بیت اللہ میں داخلے کی ممانعت کر دی گئی ۔ صرف ایسے لوگوں کو مستثنی کر دیا گیا ہے جن سے معاہدہ ہو چکا ہو اور جنھوں نے معاہدے کی شرائط کی تعمیل بعد میں احتیاط اور پابندی کے ساتھ کی ہو اور مسلمانوں کے خلاف کسی کو مدد نہ دی ہو [نیز رک بہ براءۃ (سورۃ)] ۔

۱۰ھ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے خود حج کی قیادت فرمائی ۔ اس موقع پر ایک بھی مشرک موجود نہ تھا ۔ کعبہ اب بلا شرکت غیرے صرف مسلمانوں کا مقدس حرم بن گیا ۔ ہر نماز کے وقت تمام دنیا کے مسلمان کعبے کی طرف منہ کرتے ہیں اور حج کی تقریبات میں کعبہ ہی جملہ مناسک حج کا مبدأ اور منتہا ہے ۔

کعبے کے متعلق دو خاص چیزوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا، یعنی عمارت کا کھولنا اور دھونا ۔ کھولنے کی رسم معیّن تاریخوں میں ادا کی جاتی ہے ۔ اس موقع پر وہ زینہ جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے دھکیل کر عمارت کے برابر لگا دیا جاتا ہے ۔ کھولنے کی تاریخیں حکام مکہ کی مرضی کے مطابق بدلتی رہتی ہیں ۔

حج کے موقع پر کعبے کو غسل دیا جاتا ہے غسل کے اوقات کی تعیین حکومت وقت کرتی ہے ۔ آج کل چھے سات ذوالحجۃ غسل کے لیے مقرر ہے اس رسم میں سعودی عرب کے حکام، اسلامی ممالک کے وفود اور چند ممتاز زائرین شریک ہوتے ہیں ۔ سب سے پہلے سلطان وقت داخل ہوتا ہے ۔ وہ دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد خود فرش کو آب زمزم سے دھوتا ہے ۔ پانی دہلیز میں کی ایک موری کے راستے باہر بہ جاتا ہے ۔ دیواریں ایک قسم کی جاروب سے دھوئی جاتی ہیں جو کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی ہے ۔ اس کے بعد مکۂ مکرمہ کا گورنر ہر ایک چیز پر گلاب چھڑکتا ہے اور آخر میں عمارت کے اندر قسم قسم کے بخورات سے دھونی دی جاتی ہے [رک بہ القبلہ] ۔

جیسا کہ اس مثال سے ظاہر ہے، اس مقدس عمارت کی تعظیم و تکریم کا دائرہ ان تمام چیزوں تک پھیلا ہوا ہے جو اس سے متعلق ہیں، حجر الاسود، میزاب (پرنالہ)، ملتزم اور سب سے بڑھ کر زمزم کا پانی ۔ تاہم جیسا کہ روایات صحیحہ میں مذکور ہے حضرت عمرؓ نے حجر الاسود کے بارے میں اپنے احساسات کا یوں اظہار کیا : "میں جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان اور اگر رسول اللہؐ نے تجھے بوسہ نہ دیا ہوتا تو میں تجھے کبھی نہ چومتا" (صحیح بخاری) ۔ یہ کہنے کے بعد حضرت عمرؓ نے پتھر کو چوم لیا ۔ میزاب کے نیچے نماز خاص طور پر موجب اجر و ثواب سمجھی جاتی ہے ۔ جو شخص میزاب کے نیچے نماز پڑھتا ہے وہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسا اس دن تھا جب اس کی ماں نے اسے جنا (الأزرق، ص۲۲۴) ۔ آب زمزم جس کو زائر بار بار پی چکا ہے، ہر اس نیک کام کے لیے کار آمد ہے جس کے لیے یہ پیا جائے (قطب الدین : ماء زمزم لما شرب لہ، ص ۳۴؛ اخرجہ الحاکم فی المستدرک و قال ھذا حدیث صحیح الاسناد؛ شفاء الغرام، ۱ : ۲۵۳) ۔

کعبے کے نظارے سے زائرین کے جذبۂ عقیدت میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے بارے میں متعلقہ کتب میں وافر شہادت موجود ہے ۔ مثال کے طور پر البتنونی (ص ۲٦) نے کعبے کے سامنے نماز کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ ہم یہاں نقل کر سکتے ہیں : ”سارا مجمع اس ذات ذوالجلال کے حضور میں جو دلوں پر ہیبت طاری کرنے والا قادر قیوم ہے اور جس کے آگے بڑی سے بڑی ہستی حقیر و بے مایہ ہو کر لاشے محض بن جاتی ہے، انتہائی خضوع و خشوع کے ساتھ کھڑا تھا اور اگر ہم نے نماز کے دوران میں جسم کو جھکتے اور سیدھا ہوتے، ہاتھوں کو دعا میں اٹھتے اور عجز و انکسار کے اعتراف میں ہونٹوں کو ہلتے نہ دیکھا ہوتا اور اگر ہم نے اس بے پایاں عظمت کے سامنے دلوں کی دھڑکنیں نہ سنی ہوتیں تو ہم یہ سمجھتے کہ ہم کسی دوسرے عالم میں پہنچ گئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس ساعت میں ہم کسی اور ہی عالم میں تھے ۔ ہم خدا کے گھر میں تھے اور اس کے قرب حضوری میں کھڑے تھے اور ہمارے پاس فقط جھکا ہوا سر تھا اور گڑگڑاتی ہوئی زبان تھی اور دعا کے لیے بلند ہوتی ہوئی آوازیں تھیں اور آنسو بہاتی ہوئی آنکھیں تھیں اور خشیت الٰہی سے معمور دل تھے اور شفاعت کے پاکیزہ خیالات تھے (نیز دیکھیے Macdonald : *The Religious attitude and Life in Islam*، شکاگو ۱۹۰۹ء، ص ۲۱٦ ببعد، Ben cherif : *Aux villes saintes de l'Islam*، ص ۳ ببعد، ٦۸ ۔ [یہ کیفیت تقریباً ہر حاجی پر طاری ہوتی ہے]۔

اسلام میں کعبے کو جو مقام اور مرتبہ حاصل ہے اس میں مسلمانوں کے تمام فرقے متحد ہیں ۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مکۂ مکرمہ اسلامی شان و شوکت اور سطوت کا مظہر ہے اور کعبہ اس کے جاہ و جلال اور فضل و کرم کا مرکز ہے ۔ چار دانگ عالم میں یہی وہ جگہ ہے جہاں دس بارہ لاکھ آدمی حج کے لیے جمع ہوتے ہیں جو سب کے سب خدا کو یک دل و یک زبان ہو کر پکارتے ہیں. اور اگرچہ یہ زائرین نسل اور زبان میں مختلف ہوتے ہیں تاہم وہ سب ایک قبلے کی طرف منہ کرتے ہیں اور نماز میں پہلو بہ پہلو کھڑے ہوتے اور تمام ارکان نماز ایک ساتھ ادا کرتے ہیں ۔ وہ خداے واحد کے سوا کسی اور سے اپنی امیدیں وابستہ نہیں کرتے ۔

اہل تصوف بھی کعبے کے بارے میں ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں ۔ الغزالی جیسے صوفیوں کے نزدیک جو گویا متشرع صوفی ہیں کعبہ واقعی وہ مقدس عمارت ہے جس کے گرد طواف کرنا لازم ہے، لیکن طواف اور جس چیز کے گرد طواف کیا جاتا ہے انسان کے لیے تبھی قدر و قیمت رکھ سکتے ہیں جب وہ اسے بلند تر روحانی درجے کو پہنچنے میں ترغیب کا کام دیں ۔

چاہ زمزم کے مبدأ سے تعلق رکھنے والے واقعات کے لیے رک بہ اسمٰعیل[۴]، لیکن یہاں اس سلسلے میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ جب عبدالمطلب حجرے میں سو رہے تھے انھوں نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص پراسرار الفاظ میں ان کو حکم دے رہا ہے کہ وہ زمزم کو اس جگہ سے جہاں گوبر اور خون اور ”پہاڑی کوے کا گھونسلا“ اور ”چیونٹیوں کا بل“ ہے کھود کر نکال لیں ۔ جب قریش نے ان کا کنواں کھودنے کا حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو طرفین بنو سعد ھُذَیم کی کاھنہ سے مشورہ کرنے روانہ ہوے ۔ راستے میں ان کا پانی ختم ہو گیا، لیکن عبدالمطلب کی سواری کے نقش سم سے ایک چشمہ جاری ہو گیا جو اس بات کی آسمانی علامت تھی کہ وہ حق

بجانب تھے ۔ پس سب وہیں سے مکے کی طرف واپس لوٹے۔ واپس پہنچ کر جب عبدالمطلب نے کھدائی شروع کی تو انھیں تلواروں اور زرہ بکتر کے علاوہ دو طلائی غزال بھی ملے جو جرہم نے چاہ زمزم میں دفن کر رکھے تھے ۔ یہ سب چیزیں کعبے میں رکھ دی گئیں (ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۱۴۲ تا ۱۴۷؛ السروض الانف، ۱ : ۹۷ تا ۱۰۰) .

[قرآن کریم میں اللہ تعالٰی نے مکّے کو اُمّ القرٰی کہا ہے ارشاد باری تعالٰی ہے : "وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا" (۶ [الانعام] : ۹۳)، یعنی یہ قرآن مجید کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے ۔ برکت والی تصدیق کرنے والی ان (کتابوں) کی جو اس سے پہلے ہیں اور تاکہ تو ڈرائے مکّے والوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو] .

امّ القرٰی کے معنی ہیں بستیوں کی اصل اور جڑ ۔ مکۂ معظّمہ تمام عرب کا دینی و دنیوی مرجع تھا اور جغرافیائی حیثیت سے بھی قدیم دنیا کے وسط میں مرکز کی طرح واقع ہے، اس لیے مکّے کو امّ القرٰی فرمایا ۔ اور آس پاس سے یا تو عرب مراد ہے کیونکہ دنیا میں قرآن مجید کے اولین مخاطب وہی تھے ۔ ان کے ذریعے سے باقی دنیا کو خطاب ہوا، یا سارا جہان مراد ہے جیسے فرمایا : لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (۲۵ [الفرقان] : ۱) .

ایک روایت کے مطابق عرب میں بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب بنو خزاعہ نے بنو جرہم کو مکۂ مکرمہ سے نکال دیا تو اہل مکّہ نے عَمرو بن لُحَیّ خزاعی کو اپنا رئیس مقرر کر لیا ۔ یہ شخص جو کام کرتا مکّے والے اس پر عمل کرنے لگتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عمرو بڑا دولت مند تھا ۔ یہ حُجّاج کو کھانا کھلاتا اور کپڑے پہناتا ۔ بعض اوقات یہ حجاج کے لیے دس دس ہزار جانور ذبح کرتا اور دس دس ہزار آدمیوں کو کپڑے پہناتا ۔ انھیں دنوں قبیلۂ ثقیف کا ایک شخص ایک بڑے پتھر پر حاجیوں کو ستو گھول کر پلایا کرتا تھا ۔ اس پتھر کو صخرۃ اللاّت (لات کا پتھر) کہتے تھے ۔ جب یہ شخص مر گیا تو عمرو نے مشہور کر دیا کہ یہ شخص مرا نہیں بلکہ پتھر میں داخل ہو گیا ہے ۔ اس نے عربوں کو اس کی پرستش کرنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہا کہ اس پتھر پر ایک مکان تعمیر کرکے اس کو "لات" (ستو گھولنے والا) کے نام سے موسوم کر دیں۔ کہا جاتا ہے کہ تین صدیوں تک عمرو کی اولاد اس کی پرستش کرتی رہی اور اس نے ایک بت کی حیثیت اختیار کر لی (السہیلی : الروض الانف، ۱ : ۶۲؛ ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۷۷) .

ایک دوسری روایت کے مطابق بنو اسمٰعیل میں بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب ان کی تعداد زیادہ ہوگئی تو وہ مکہ چھوڑ کر دوسرے بلاد و دیار کو جانے لگے۔ جب بنو اسمٰعیل کا کوئی شخص مکے سے جاتا تو خانۂ کعبہ کے احترام کے پیش نظر اپنے ساتھ حرم کا ایک پتھر بھی لے جاتا ۔ وہ جہاں کہیں جاتا کعبے کی طرح اس کا طواف کرنے لگتا ۔ مرور زمانہ سے ان کی یہ عادت ہو گئی کہ جو پتھر بھی انھیں پسند آتا اس کی پوجا کرنے لگتے ۔ اس طرح دین ابراہیمی چھوڑ کر وہ بتوں کے پرستار بن گئے اور سابقہ اقوام کی طرح گمراہی اختیار کر لی ۔ تاہم ان میں سے کچھ لوگ اپنے پرانے ابراہیمی دین پر بھی قائم رہے ۔ وہ خانۂ کعبہ کی تعظیم کرتے ۔ اس کا طواف کرتے اور حج و عمرہ کی عبادات بجا لاتے ، عرفات و مزدلفہ میں قیام کرتے، قربانیاں ذبح کرتے اور دیگر مناسک حج ادا کرتے، مگر ان میں یہ خرابی پیدا ہو گئی کہ حج کا تلبیہ کہتے وقت مشرکانہ کلمات پکارنے لگتے، مثلاً کنانہ

اور قریش تلبیه پکارتے وقت یه الفاظ کہتے : لَبَّیْک اللّٰهُمَّ لَبَّیْک، لَبَّیْک لَا شریکَ لَکَ، اِلَّا شریکًا هولک، تَمْلِکُهٗ وَمَا مَلَکَ .

اس طرح تلبیه کے کلمات توحید میں اپنے بتوں کو شریک کر لیتے ۔ اسی کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا : وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِکُوْنَ (۱۲ [یوسف] : ۱۰۶)، یعنی ان کے اکثر لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں (ابن ہشام : سیرت، ۱ : ۷۷؛ الروض الانف، ۱ : ۶۲).

ابن اسحٰق سندًا بیان کرتے ہیں که نبی اکرم صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ آلِهٖ وَسَلَّم نے فرمایا میں نے عمرو بن لحیّ کو جہنم میں انتڑیاں گھسیٹتے ہوے دیکھا، پھر میں نے اس سے ان لوگوں کے بارے میں سوال کیا جو میرے اور اس کے درمیان تھے ۔ اس نے کہا وہ ہلاک ہو گئے (الروض الانف، ۱ : ۶۱) .

الحجرالاسود : الازرق (تاریخ مکه میں) حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت کرتے ہیں که جب حضرت آدمؑ آسمان سے اتارے گئے تو اللہ تعالٰی نے ان کے ساتھ حجر اسود اور مقام ابراهیم کو بھی اتارا تاکه آدمؑ ان کے ساتھ مانوس رہیں ۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں که طوفان نوح کے زمانے میں اللہ تعالٰی نے حجر اسود کو جبل ابو قُبیس [رکّ بآں] پر محفوظ رکھا ۔ جب حضرت ابراهیمؑ نے کعبه تعمیر کیا تو جبریلؑ نے حجر اسود کو لا کر س کی جگه پر نصب کر دیا (شفاء الغرام، ۱ : ۱۹۱) .

الازرق ان لوگوں سے نقل کرتے ہیں جو حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ کی تعمیر کعبه میں بذات خود شریک تھے که کعبے کو آگ لگنے سے حجر اسود کے تین ٹکڑے ہو گئے تھے ۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا اڑ کر کسی طرح بنو شیبه کے کسی آدمی کے ہاتھ لگ گیا اور مدتوں اس خاندان میں محفوظ رہا ۔ پھر عبداللہ بن زبیر رضؓ نے حجر اسود کے ٹکڑوں کو چاندی کے تار سے باندھ دیا ۔ جب مرور زمانه سے یه تار ڈھیلا ہو گیا اور حجر اسود کے ٹکڑے ہلنے لگے تو خلیفه هارون الرّشید عبّاسی نے اپنے عہد خلافت میں حجر اسود میں آر پار سوراخ کرکے اس میں چاندی بھروا دی (شفاء الغرام، ۱ : ۱۹۲ تا ۱۹۳) .

مؤرّخین کا بیان ہے که ابو طاهر قرمطی جب مکے آیا (۸ ذوالحجه ۳۱۹ھ) تو اس نے جعفر بن فلاح معمار کو حجر اسود کے کعبے سے اکھاڑنے کا حکم دیا ۔ چنانچه اس نے پیر کے دن ۱۴ ذوالحجه کو حجر اسود کو اکھاڑا اور اپنے ساتھ بلاد هجر [(الحسا)] لے گیا ۔ خاصے عرصے تک خانۂ خدا حجر اسود سے خالی رہا اور لوگ تبرکًا اس کی جگه پر ہاتھ رکھنے پر اکتفا کیا کرتے تھے ۔ حتّٰی که منگل ۳۳۹ھ کو یوم النحر کے دن حجر اسود کو واپس اس کی جگه پر نصب کیا گیا ۔ کہتے ہیں که سنبر بن حسن قرمطی نے حجر اسود کو دوبارہ اس کی جگه پر نصب کیا تھا ۔ جب لوگوں نے حجر اسود کو دیکھا تو سجدۂ شکر بجا لائے اور اسے بوسه دیا ۔ یوم النحر کو لوگوں کے زیارت کعبه کے لیے آنے سے قبل حجر اسرد کو اس کی جگه پر نصب کر دیا گیا تھا (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے شفاء الغرام، ۱ : ۱۹۳) .

اس کے ایک سال بعد ۳۴۰ھ میں کعبے کے دربانوں نے ڈر کے مارے سنبر قرمطی کے نصب کردہ حجر اسود کو اکھاڑ کر کعبے میں رکھ دیا ۔ وہ چاہتے تھے که حجر اسود کے گرد چاندی کا ایک مضبوط حلقه بنا دیا جائے تاکه کوئی شخص اسے اکھاڑ نه سکے ۔ ابن زبیر رضؓ نے تعمیر کعبه کے وقت اسی طرح کیا

تھا ۔ چنانچہ دو ماہر کاریگروں کو اس کام پر مامور کیا گیا جنھوں نے چاندی کا یہ حلقہ تیار کر دیا ۔ تاریخ سے یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ قرامطہ کے حجر اسود کو واپس کر دینے کے بعد بھی کسی نے آج تک حجر اسود کو اس کی جگہ سے اکھاڑا ہے ۔ الفاسی کہتے ہیں ایک مصری فقیہ نے بتایا کہ ۷۸۱ھ میں امیر سودون پاشا نے حجر اسود کو اکھڑوا کر اس کو نئی زیب و زینت سے مزّین کیا تھا، مگر مکّۂ مکرمہ کے بعض لوگ مصری فقیہ کی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے ۔ مصری فقیہ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ میں نے حجر اسود کو اکھڑا ہوا بچشم خود ملاحظہ کیا تھا ۔ الفاسی کہتے ہیں مجھ سے پہلے مکے کے بہت سے فقہا یہ بات مصری فقیہ سے سن کر مجھے بتا چکے تھے ۔ چنانچہ وہ مصری فقیہ جن کا نام نور الدین المنوفی ہے جب ۸۱۴ھ میں مصری کاروان کے قافلہ سالار بن کر مکے آئے تو میں نے خود ان سے پوچھا اور انھوں نے اس کی تائید کی (شفاء الغرام، ۱ : ۱۹۳) ۔

حجر اسود میں اللہ تعالٰی کی چند آیات بیّنات پائی جاتی ہیں :

۱۔ زمین پر آنے کے بعد حجر اسود عظیم حوادث مثلًا طوفان نوح وغیرہ سے دو چار ہونے کے باوجود بھی جوں کا توں محفوظ رہا ۔

۲۔ محدث ابن جماعہ کے مطابق حجر اسود کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ حجر اسود کو کئی مرتبہ اپنی جگہ سے اکھاڑا گیا، مگر وہ اپنی جگہ پر واپس آ گیا مثلا قبیلۂ جرهم، بنو اياد اور قرامطہ نے حجر اسود کو اکھاڑا، مگر اسے پھر واپس لایا گیا ۔

۳۔ جب قرامطہ حجر اسود کو اکھاڑ کر لے گئے تو اس کو باری باری چالیس اونٹوں پر لادا گیا اور وہ ہلاک ہو گئے ۔ جب قرامطہ نے اسے واپس کیا تو ایک نحیف اونٹ پر لادا گیا اور وہ پہلے سے موٹا ہو گیا ۔ اس کا محدث الذھبی نے بھی ذکر کیا ہے ۔

۴۔ اسی طرح جب حجر اسود کو بلاد هجر کی جانب لایا گیا تو یکے بعد دیگرے اس کو لادنے سے پانچ سو اونٹ ہلاک ہو گئے ۔

۵۔ حجر اسود پانی پر تیرتا ہے اور ڈوبتا نہیں ۔

ابن ابی الدم نے الفرق الاسلامیہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے جیسا کہ مؤرخ ابن شاکر الکتبی نے اس سے نقل کیا ہے ۔ بعض محدّثین سے مرفوعًا بھی نقل کیا گیا ہے (شفاء الغرام، ۱ : ۱۹۵) ۔

کعبہ مسلمانوں کا قبلہ ہے اور مرکز حج، اس کی بدولت تمام گرد و پیش کا رقبہ حرم [رکّ بآں] اور متبرک زمین بن گیا ہے ۔ شہر کے گرد مقدس منطقہ واقع ہے جس کی حدبندی پتھروں کے نشانات سے کی گئی ہے حرم میں داخل ہو کر ہر شخص پر کچھ پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں، اللہ تعالٰی نے اس علاقے کو عزت و حرمت عطا کی ہے ۔ یہ سارا علاقہ امن و امان اور صلح و سلامتی کی علامت قرار دیا گیا ہے ۔ حدود حرم میں جنگ نہیں ہو سکتی ۔ کسی درخت کو کاٹنے تک کی اجازت نہیں ۔ حرم میں داخل ہونے والا ہر گزند سے محفوظ ہو جاتا ہے (نیز رکّ بہ حرم) ۔

جیسے اوپر بیان ہوا تبّع وہ پہلا شخص سمجھا جاتا ہے جس نے کعبے کو لباس پہنایا ۔ تاریخی اعتبار سے یہ روایت صحیح ہے یا نہیں، اس کا جواب ہمارے احاطۂ علم سے باہر ہے ۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ عمارت پر رنگین کپڑے چڑھانے کا ذکر آتا ہے، اور یہ ایسی رسم ہے جس پر اسی قسم کی رسموں کے سلسلے میں غور کرنا (جو اور جگہ ادا کی جاتی تھیں) ضروری ہے ۔

مآخذ : (۱) Wüstenfeld : *Die Chroniken der Stadt Mekka*، لائپزگ ۱۸۵۷-۱۸۶۱ء، ۴ جلدیں؛ (۲) J. L. Burckhardt : *Travels in Arabia*، لنڈن ۱۸۲۹، ۲ جلدیں؛ (۳) علی بے : *Travels*، لنڈن ۱۸۱۶، دو جلدیں؛ (۴) R. Burton : *Personal Narrative of a Pilgrimage to el-Medinah and Meccah*، لنڈن ۱۸۵۷ء، ۲ جلدیں؛ (۵) A. Müller : *Der Islam im Morgen- und-Abend land*، برلن ۱۸۸۵ء، ۲ جلدیں؛ (۶) C. Snouck Hurgronje : *Mekka*، ہیگ ۱۸۸۸-۱۸۸۹ء، ۲ جلدیں، مع *Bilderatlas*؛ (۷) وہی مصنف : *Bilder aus Mekka*، لائیڈن ۱۸۸۹ء؛ (۸) Caïd Ben Chérif : *Aux villes saintes de l' Islam*، پیرس ۱۹۱۹ء؛ (۹) البتنونی : الرحلة الحجازیه، قاہرہ ۱۳۲۹ھ؛ (۱۰) الازرق [: تاریخ مکة]، ص ۸۶ ببعد؛ (۱۱) الفاکہی، ص ۱۸ ببعد؛ (۱۲) الطبری، مطبوعۂ لائیڈن، ۱ : ۱۰۹ ببعد، ۱۱۳۰ ببعد؛ (۱۳) المسعودی : مروج الذہب، طبع پیرس، ۱ : ۱۳۳ و ۴ : ۱۲۵ ببعد و ۵ : ۱۶۵ تا ۱۶۷، ۱۹۳ ؛ (۱۴) *Bibl. Geogr. Arab.*، ۱ (الاصطخری) : ۱۵ ببعد و ۲ (ابن حوقل) : ۲۳ ببعد و ۳ (المقدسی) : ۷۱ ببعد و ۵ (ابن الفقیه): ۱۶ تا ۲۲ و ۷ (ابن رسته): ۲۴ تا ۴۵؛ (۱۵) یاقوت : معجم (طبع Wüstenfeld) ۴ : ۴۷۸ ببعد؛ (۱۶) ابن جبیر : رحلة (سلسلۂ مطبوعات بیادگار گب)، ص ۸۱ ببعد؛ (۱۷) البخاری : الصحیح، کتاب العلم، باب ۴۸؛ (۱۸) Gaudefroy و Demombynes : *Notes sur la Mekke et Médine*، در *Rev. de l' Hist. des Religions*، ۷۲ : ۳۱۶ ببعد ؛ (۱۹) C. Snouck Hurgronje : *Het Mekkannsche Feest*، لائیڈن ۱۸۸۰ء؛ (۲۰) حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت پر کتابیں جو مشرق اور مغرب میں شائع ہوئیں اور قرآن مجید کی مختلف تفاسیر؛ (۲۱) الطبری، ۱ : ۱۳۰ ببعد، ۲۷۴ ببعد؛ (۲۲) الثعلبی : قصص الانبیاء، قاہرہ ۱۲۹۰، ص ۶۹ ببعد؛ (۲۳) الدّیار بکری : تاریخ الخمیس، قاہرہ ۱۲۸۳، ۲ جلدیں ؛ (۲۴) ابن ہشام [: سیرة]، طبع Wüstenfeld، Göttingen ۱۸۵۸-۱۸۶۰ء، ۲ جلدیں؛ (۲۵) Caussin de Perceval : *Essai sur l' Hist. de Arabes*، پیرس ۱۸۴۷-۱۸۴۸ء؛ (۲۶) A. J. Wensinck : *The Navel of the Earth*، در *Verh. Kon. Akad. v. Wetensch Dl xvii*، ج ۱۲/۱؛ (۲۷) J. L. Palache : *Het Heiligdom in de Voorstelling der Semitische Volken*، لائیڈن ۱۹۲۰ء؛ (۲۸) L. Caetani : *Annali del l'Islam*، مقدمہ، فصل ۶۲ ببعد؛ (۲۹) J. Wellhausen : *Reste arab. Heidentums*، بار دوم، برلن ۱۸۹۷، ص ۷۳ ببعد؛ (۳۰) H. Grimme : *Mohammad*، میونخ ۱۹۰۴ء، ص ۵۴ ببعد .

(A. J. WENSINCK [و غلام احمد حریری])

کَفّ : (ع) علم عروض کی ایک اصطلاح، ⊗ یعنی رکن سباعی سے آخری، ساتویں حرف، ساکن سبب خفیف کو حذف کرنا ۔ یہ عمل صرف مندرجۂ ذیل چار ارکان ہی میں واقع ہو سکتا ہے : (۱) مَفَاعِیلُنْ؛ (۲) فَاعِلَاتُنْ، متصل یا مجموع؛ (۳) فَاعِ لَاتُنْ منفصل (یا مفروق یا منقطع) اور (۴) مُسْ تَفْعِ لُنْ منفصل (یا مفروق یا منقطع)، چنانچہ مَفَاعِیلُنْ سے، ن، حذف ہو کر مَفَاعِیلُ بضمّ لام، فَاعِلَاتُنْ متصل (یا مجموع) سے ن حذف ہو کر فاعلاتُ بضمّ تاء، فَاعِ لَاتُنْ منفصل (یا مفروق یا منقطع) سے فَاعِ لَاتُ بضمّ تاء اور مُسْ تَفْعِ لُنْ منفصل (یا مفروق یا منقطع) سے مُسْ تَفْعِ لُ بضمّ لام باقی رہتا ہے .

کَفّ مندرجۂ ذیل دس بحور میں واقع ہوتا ہے :

(۱) ہَزَج ؛ (۲) طویل ؛ (۳) مُضارِع ؛ (۴) رَمَل؛ (۵) مدید؛ (۶) خفیف؛ (۷) مُجتث ؛ (۸) جدید؛ (۹) قریب اور (۱۰) مُشاکل .

مآخذ : دیکھیے مقالۂ عروض.

(ہادی علی بیگ)

* **کفارۃ :** (ع)؛ تاوان، تلافی؛ لغوی معنی وہ چیز جو گناہ کو "ڈھانپ لے" اس کا ازالہ کر دے۔ [قرآن و حدیث میں کفّارہ ادا کرنے کے مندرجۂ ذیل تین طریقے بیان ہوے ہیں۔ (۱) اگر استطاعت ہو تو] غلام کو آزاد کر دیا جائے؛ (۲) جو لوگ اس کی استطاعت نہ رکھتے ہوں وہ تین دن (اور بعض صورتوں میں دو مہینے) روزہ رکھیں؛ (۳) جو لوگ [بیماری یا کمزوری کی وجہ سے] روزہ رکھنے کے قابل نہیں، وہ اهل حاجت کی ایک مقررہ تعداد (۱۰ سے ۶۰ تک) کو کھانا یا کپڑا دیں.

قرآن مجید کے مطابق مندرجۂ ذیل صورتوں میں کفّارہ ادا کرنا ضروری ہے :

(۱) بصورت قتل خطا : اس کے لیے تین طرح کے کفارے لازم کیے گئے ہیں؛ (۱) اگر مقتول مسلمان ہو تو (الف) ایک مسلم غلام کو آزاد کرنا اور خون بہا (دیت [رک بآں]) کا ادا کرنا؛ (ب) اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا؛ (۲) اگر مقتول غیر مسلم لیکن معاہد قبیلے سے تعلق رکھتا ہو تو بھی مندرجۂ بالا طریقے سے کفارہ ادا کرنا ضروری ہوگا؛ (۳) اگر مقتول کسی حربی (حالت حرب کے) قبیلے سے تعلق رکھتا ہو لیکن بذات خود مسلمان ہو تو : (الف) مسلم غلام کا آزاد کرنا؛ (ب) بصورت عدم استطاعت دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا (دیکھیے ۴ [النساء] : ۹۲).

بصورت حنث یعنی قسم توڑ دینے کی صورت میں مندرجۂ ذیل طریقے سے کفارہ ادا کرنا ضروری ہے : (الف) دس مساکین کو کھانا کھلانا، یا انھیں کپڑا پہنانا؛ (ب) یا ایک غلام آزاد کرنا؛ (ج) اگر ان دونوں کی استطاعت نہ ہو تو تین روزے رکھنا (دیکھیے ۵ [المائدۃ] ۸۹).

بصورت ظہار : ظہار کی صورت میں مندرجۂ ذیل کفّارہ لازم ہوتا ہے : (الف) غلام کا آزاد کرنا؛ (ب) عدم استطاعت کی صورت میں دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا؛ (ج) اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا۔ اس میں یہ بھی ایک شرط ہے کہ کفّارے کی ادائی بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہو (۵۸ [المجادلۃ] : ۱-۴).

احادیث میں روزہ توڑنے کے کفارے کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس کے لیے مندرجۂ ذیل تین صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ضروری ہے : (الف) غلام آزاد کرنا؛ (ب) ۶۰ روزے رکھنا؛ (ج) اگر اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا، (دیکھیے البخاری : الصحیح، کتاب الصیام؛ نیز الجزیری: الفقہ علی المذاهب الاربعہ)].

مآخذ : (۱) ابن قاسم الغزّی : فتح القریب، طبع L. W. C. van den Berg، ص ۲۶۲، ۲۶۶، ۵۰۰، ۵۶۸، ۶۶۲؛ (۲) Th. W. Juynboll : Handb. des islamischen Gesetzes، ص ۱۲۲، ۲۲۵، ۲۶۷، ۲۹۸.

([و ادارہ] Th. W. Juynboll)

* **کِفالۃ :** کفالہ کسی شخص (اصطلاحاً کفیل) کا قرض خواہ (مکفول لہٗ) کے لیے قرضدار (مکفول بہٖ) کا ضامن ہونا کہ قرضدار ایک متعین مقام پر قرضہ یا اس کا جرمانہ ادا کرنے یا کسی جوابی کارروائی کی صورت پر قصاص کے لیے حاضر ہو جائے گا.

مکفول اس معین وقت پر حاضر نہ ہو تو کفیل کو مکفول بہ کی آمد تک قید رکھا جا سکتا ہے۔ تاآنکہ وہ آ جائے یا ثابت ہو جائے کہ وہ آنے سے معذور ہے (مثلاً بصورت انتقال).

یہ مسئلہ کہ کفیل مکفول کی جگہ ادائی

کرے - اسے اس کی سزا بھگتنا ائمہ کے نزدیک مختلف فیہا ہے - شافعیہ کے نزدیک اس کا ایسا کرنا ضروری نہیں، خواہ اس نے واضح طور پر اس کی ذمے داری لے لی ہو .

مآخذ : (۱) الباجوری : حاشیہ علی شرح ابن قاسم الغزّی، بولاق ۱۳۰۷ھ، ۱ : ۳۹۵ ببعد؛ (۲) زخاؤ : *Muhammedan Recht nach Schafiitischer Lehre*، ص ۵۰۳ ببعد؛ (۳) الدمشقی : رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ، بولاق ۱۳۰۰ھ، ص ۸۱؛ (۴) A Querry : *Droit Musulman*، ۱ : ۳۸۳ تا ۳۸۶ .

(TH. W. JUYNBOLL)

* **کُفْر** : رک بہ کافر .

* **کُفْرَۃ** : صحرائے مشرق میں برہ (Cyrenaica) اور ودائی کے مابین مساوی فاصلے پر نخلستانوں کا ایک مجموعہ ہے، اس کے بارے میں ہماری معلومات ایک مدت تک صرف Rohlfs کے بیان تک محدود رہیں جس نے ۱۸۷۹ء میں وہاں تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی، اس کے بعد دو اور یورپی سیاح، Marshal des Legis Lapierre (۱۹۱۸ء) اور مسز روزیٹا فوربس Mrs. Rosita Forbes (۱۹۲۰-۱۹۲۱ء) بھی وہاں کی سیر کر چکے ہیں - نخلستانوں کا یہ مجموعہ جو کفرۃ کے نام سے مشہور ہے، جنوب مشرق سے شمال مشرق کی جانب ۱۲۰ میل تک ۲۴ اور ۲۶ درجے عرض بلد شمالی اور ۲۱ اور ۲۴ درجے طول بلد مشرق کے درمیان پھیلا ہوا ہے - جنوب میں سب سے آخری نخلستان طرابلس سے ۸۵ میل جنوب مشرق میں اور بن غازی سے ۶۰۰ میل جنوب میں واقع ہے ، یہ تعداد میں پانچ ہیں اور سرر serir یا کنکریلے ٹیلوں کے خطے انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں ، یعنی تیسّربو شمال مشرق میں، بوسیمہ وسط میں، اربہنہ (جسے مسز فوربس نے Ribiana لکھا ہے) جنوب مشرق میں، بوسیمہ کے شمال مشرق میں سیرھن اور جنوب مشرق میں وہ نخلستان ہے جسے خاص کفرۃ کہا جاتا ہے اور جس کا نام رولفس Rohlfs نے کبابو Kebabo لکھا ہے - Rohlfs کے بیان کے مطابق اس مجموعے کا کل رقبہ تقریباً ۷۰۰۰ مربع میل ہے جس میں کفرۃ کا ۴۳۰۰ اور تیسّربو کا ۲۵۰۰ مربع میل ہے - [تفصیل کے لیے دیکھیے 3آ لائیڈن، بار دوم، بذیل مادّہ] .

مآخذ : (۱) G. Rohlfs : *Kufra*، لائپزگ ۱۸۸۱ء؛ (۲) الحشائشی (شیخ محمّد بن عثمان) : *Voyage au pays des Senoussia*، مترجمۂ V. Serres et Lasram، پیرس ۱۹۰۳ء، بار دوم ۱۹۱۲ء؛ (۳) Silva White : *From Sphinx to Oracle*، لنڈن ۱۸۹۹ء، ص ۱۲۴ تا ۱۲۹؛ (۴) Lapierre : ....، *Rapport* در *Afrique française (Renseignements coloniaux)*، اپریل ۱۹۲۰ء، ص ۹۹ تا ۱۱۹؛ (۵) Rosita Forbes : *Across the Lybian Desert to Kufara*، در *Geogr. Journal*، ۱۹۲۱ء، ص ۸۱ تا ۱۰۱؛ (۶) وہی مصنف : *The Secret of Sahara : Kufara*، لنڈن ۱۹۲۱ء .

[(G. YVER) [تلخیص از ادارہ]]

* **کَفَۃ** : (یا کَفّہ)؛ [ترکوں کے ہاں کیفہ]؛ جسے الکفۃ بھی لکھا جاتا ہے، جزیرہ نمائے کریمیا کے جنوبی ساحل پر ازمنۂ وسطٰی کا ایک شہر ہے جس کا نام قدیم زمانے میں تھیوڈوشیا Theodosia تھا اور آج کل پھر اسی نام سے مشہور ہو گیا ہے (ابتدا میں یہ ایک نوآبادی تھا) - اس کا نام Καφᾶ یا Καφά یا Κάφα سب سے پہلے Konstantinos Porphyrogenetos کے ہاں ملتا ہے (*De administr. imperio*، باب ۵۳) - کہتے ہیں کہ چوتھی صدی عیسوی میں یہاں باسفورس کا بادشاہ Sauromates پنجم، Chersonesus کے Pharnaces کے ساتھ مبارزت میں مارا گیا

تھا ۔ یہ نظریہ بھی پیش کیا گیا ہے (F. Köppen : Krimskiy Sbornik، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۳۷ء، ص ۲۰۱) کہ یہ نام Βοαχα سے مطابقت رکھتا ہے جس کا ذکر Strabo : باب ۲، ۳ میں آیا ہے ۔ ان مستثنیات سے قطع نظر تیرھویں صدی عیسوی تک کفۃ کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا ۔ کریمیا کے جنوبی ساحل پر تجارتی، نیز جنگی جہازوں کے لیے بندر گاہ کی حیثیت سے ہمیں ہمیشہ سغداق کا نام ملتا ہے (حتّٰی کہ ان حوالوں میں بھی جو Recueil de Textes rel. à l'Hist. des Seldjoucides، طبع Houtsma جلد ۳ و ۴، بمدد اشاریہ، میں موجود ہیں) جسے اب سداق کہتے ہیں ۔

کفۃ کو پہلی بار کہیں تیرھویں صدی کے نصف آخر میں اہمیت حاصل ہوئی جب جینوآ کی جمہوریت نے تاتاریوں کے ایک سردار سے یہ جگہ خرید لی اور یہاں اہل جینوآ آباد ہو گئے ۔ عموماً یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ سردار اوران تیمور تھا جس کا ذکر ابو الغازی (طبع Desmaisons ص ۱۷۳) نے کیا ہے اور جو توقای [= توغہ؛ توقا] تیمور کا بیٹا اور جوچی کا پوتا تھا اور جسے مونگکا [= منکو] تیمور (۱۲۶۶ تا ۱۲۸۰ء) نے کفۃ اور کریمیا عطا کیا تھا ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے آرز لائیڈن، بار اوّل، بذیل مادّہ .

مآخذ : (۱) دیکھیے مادّۂ باغچہ سرای اور وہاں Pallas, Broniewski وغیرہ کی مندرجہ تصنیفات کے علاوہ Zapiski Odesskago Obshčestwa Istorii i Drewnestei بھی کفہ کی تاریخ کے مطالعے کے لیے ناگزیر ہے؛ (۲) Zapiski (جلد ۲ تا ۴) میں جینوآ کی ان سرکاری دستاویزات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو اٹلی میں شائع ہوئیں (Atti della Societa Ligure di storia patria)؛ (۳) O. Retowski : سکوں پر Genuezko-tatarskiya moneti goroda Kaffi (Simferopol ۱۸۹۷ اور ۱۸۹۸ء)؛ نیز دیکھیے (۴) F. Brun : Černomorye، ج ۱ (Odessa ۱۸۷۹ء)، باب ۱۱، (O poseleniyakh Italyanskikh w Gazarii)؛ (۵) J. Kulakowskiy : Proshloye Tawridi، بار دوم (Kiew ۱۹۱۴ء)؛ ایک جامع اور مسلسل جائزے کے سلسلے میں ایک کوشش (۶) W. K. Minogradow : Feodesiya (Istoričeskiy Očerk)، بار دوم (Jekaterinodar ۱۹۰۲ء)؛ نیز دیکھیے (۷) M. G. Canale : Dellā Crimea (جینوآ ۱۸۵۵ء) اور (۸) Heyd : Hist. du Commerce du Levant (لائپزگ ۱۸۸۵-۱۸۸۶ء)، بمدد اشاریہ بذیل مادّۂ Caffa .

(W. Barthold [و تلخیص از ادارہ])

⊗ * **کَفِیْل** : رَکّ بہ کَفَالَۃ .

کِلاب بن رَبِیْعہ : [بنو کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صَعْصَعَہ بن معاویۃ بن بَکْر بن ہَوازن بن منصور بن عِکْرِمۃ بن خَصَفۃ بن قَیس عَیْلان بن مُضَر]، عربوں کا ایک نامور قبیلہ جو ضرِیّۃ اور رَبَذہ کی چراگاہوں میں رہتا تھا [جو مدینۂ منورہ کے اطراف میں تھیں ۔ فَدَک اور العوالی بھی ان کے علاقوں میں شامل تھے ۔ ضَرِیّۃ کی چراگاہ نہایت سرسبز تھی جس کی وجہ سے اونٹ اور گھوڑے خوب موٹے ہوتے تھے] ۔ بعد میں وہ شام کی طرف منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے حلب اور دیگر شہروں پر قبضہ کر لیا اور جہاں ان کے حکمران آل مرداس (رَکّ باں) کے نام سے مشہور تھے ۔ [بنو کلاب نے الجزیرہ میں بھی بڑی شہرت اور قوت حاصل کر لی تھی] ۔ کلاب جیسا بڑا قبیلہ کئی چھوٹے قبیلوں میں منقسم ہوگیا ۔ ہمیں ان کی دس بڑی شاخوں کا علم ہے : (۱) جعفر بن کلاب چار شاخوں کے ساتھ : مالک، الأَحْوَص، خالد اور عُتْبَہ؛ (۲) ابوبکر بن کلاب تین شاخوں عبد، کعب اور عبداللہ کے ساتھ؛ (۳) معاویہ الضِّباب :

تیرہ شاخوں کے ساتھ، جن میں سے پانچ کے نام گوہ یعنی سوسمار کے نام پر ھیں : ضَبّ، مُضِبّ، ضِباب، حُسَیل، حِسل، عَمرو، اَنس، الأعْوَر، زُفَر، اُنَیس، مالک، ربیعہ اور زُھیر۔ شِمر بن شُرَحبِیل جس نے امام حسین رض کو کربلا میں شہید کیا وہ قبیلۂ اعور کا ایک فرد تھا؛ (۴) عامر بن کلاب چار شاخوں کے ساتھ: الاصم و کعب (سارے قبیلے کی اھم ترین شاخوں میں سے)، طریف اور عقیل؛ (۵) ربیعہ بن کلاب: تین شاخوں کے ساتھ: بُجیر و عُبَید اور نُفَیل؛ (۶) الاضبط بن کلاب [= ابو وَبْر]، جن کی تمام شاخیں وَبْر سے چلی ھیں اور جن میں سے سات کا نسّابوں نے ذکر کیا ھے؛ (۷) عمرو بن کلاب دو شاخوں کے ساتھ: نُفَیل اور ابو عوف؛ (۸) عبداللہ بن کلاب جن کی تین شاخیں تھیں: عامر و عمرو اور الصموت؛ (۹) رُؤاس بن کلاب جن کی تین شاخیں تھیں: بجاد، بُجَید اور عُبید؛ (۱۰) کعب بن کلاب جن کی چار شاخیں تھیں: عامر، وھب، ربیعہ اور اوس۔ اسلام سے پہلے سب سے بڑا قبیلہ بنو جَعْفر کا قبیلہ تھا جو اس قدر طاقتور تھے کہ انھوں نے قبیلۂ غنی کو کافی مدت تک اپنی پناہ میں رکھا اور بنو عَبْس کی بنو ذُبْیان کے خلاف جنگوں میں بڑی مدت تک مدد کرتے رھے۔ بنو کلاب کا سب سے نمایاں کام ان کا بنو ذبیان اور اسد کے متحدہ قبائل کو جَبَلہ کی جنگ میں مکمل شکست دینا ھے، جہاں، انھوں نے دیگر قبائل عامر سے مل کر ایک نمایاں فتح حاصل کی اور جو جاھلیت کی ان تین بڑی جنگوں میں شمار کی جاتی ھے جن کے متعلق عرب مصنفین کی تحریری دستاویزیں موجود ھیں۔ پہلی صدی ھجری کے بعد بھی ھم انھیں اپنی نو آبادیات ھی میں پاتے ھیں، لیکن وہ ان گورنروں کے جو مدینے یا دمشق سے بھیجے جاتے تھے نہایت اطاعت گزار تھے۔ ۲۳۱ھ میں بُغاالکبیر نے مجبور ھو کر ان کے ۱۵۰۰ آدمی قید کر لیے تھے کیونکہ اس وقت وہ پھر اپنی قدیم بدوی زندگی کی طرف لوٹ چکے تھے اور اپنے پڑوس کے قبائل پر لوٹ مار کے لیے حملے کرتے تھے۔

اس قبیلے میں سے جو سر برآوردہ لوگ نکلے، ان میں سے غالباً شاعر لَبِید [رک بآں] سب سے زیادہ مشہور ھے۔

مآخذ: (۱) النویری: نہایۃالعرب، مطبوعۂ قاھرہ، ۲: ۳۳۸ تا ۳۴۰؛ (۲) القلقشندی: صبح الاعشی، مطبوعۂ قاھرہ، ۱: ۳۴۰؛ (۳) وھی مصنف: نہایۃ العرب، بغداد ۱۳۳۲ھ، بمدد اشاریہ؛ (۴) نقائض، طبع بیون، بمواضع کثیرہ بالخصوص صفحات ۶۵۵ ببعد اور ۶۶۲ ببعد؛ (۵) Wüstenfeld: *Geneal-Tabellen* اور *Register*، ص ۲۶۷؛ (۶) الطبری، طبع دخویہ، بمواضع کثیرہ؛ (۷) ابن الأثیر: الکامل، بمواضع کثیرہ؛ [(۸) ابن حزم: جمھرۃ انساب العرب، ص ۲۸۲ ببعد؛ (۹) ابن خلدون: العبر؛ (۱۰) البکری: معجم ما استعجم، ۱: ۹۹؛ ۳: ۶۲۳؛ (۱۱) عمررضا کحالہ: معجم قبائل العرب، بذیل مادّہ].

(F. KRENKOW [و ادارہ])

الکلاباذی: ابوبکر محمّد بن [ابی اسحٰق ابراھیم بن یعقوب] الکَلاباذی البخاری تصوف کے ابتدائی دور کے لیے ان کی تحریریں سند ھیں۔ بخارا میں وفات پائی۔ سال وفات غالباً ۳۸۵ھ/۹۹۵ء ھے۔ ان کے حالات زندگی کی تفصیل معلوم نہیں ھو سکی۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے البتہ ان کا نام فقہائے حنفیہ کی فہرست میں لکھا ھے۔ بیان کیا جاتا ھے انھوں نے علم فقہ کی تحصیل محمّد بن فضل سے کی۔ کَلاباذ بخارا کا ایک محلہ ھے، جس کی نسبت سے وہ کَلاباذی کہلائے۔ ان کی دو کتابیں محفوظ ھیں: [پانچ چھے کتابوں میں سے صرف دو ھم تک پہنچی ھیں] ایک کتاب التعرف لمذھب

اهل التصوف ہے یہ مختصر سی کتاب پچھتر ابواب پر مشتمل ہے ۔ اس میں صوفیہ کے روحانی احوال اور اصول بیان کیے گئے ہیں ۔ آگے چل کر اس کی جو شرحیں لکھی گئیں اور دستیاب بھی ہوتی ہیں، ان میں ایک علاء الدّین القونوی (م ۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء) کی ہے اور دوسری المستملی کی جو ۷۱۰ھ/ ۱۳۱۰ء سے پہلے لکھی گئی اور جو ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے بچھاپ سنگ شائع ہوئی ۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے ۔ ایک اور شرح بھی ہے جسے غلطی سے شہاب الدّین السہروردی المقتول سے منسوب کر دیا گیا ہے ۔ جس کا متن ۱۹۳۴ء میں قاہرہ میں چھپا اور جس کا اے جے آربری A.J. Arberry نے کیمبرج میں ترجمہ کیا ۔

کلاباذی کی دوسری کتاب بحرالفوائد [فی معانی الاخبار] ہے، یہ تصوف کے رنگ میں، دو سو بائیس منتخب احادیث کی شرح پر مشتمل ہے ۔ ان میں بہت سی آیات اور ایسے اقوال منقول ہیں جو پہلی تصنیف میں بھی آ چکے ہیں (دیکھیے براکلمان: GAL، بار دوم، ۱ : ۲۱۷؛ [تکملہ ۱، ۱ : ۳۶۰]).

کلاباذی کے قدیم ترین استاد فارس [بن عیسی (م ۔ د ۳۴۳ھ)] تھے جن سے انھوں نے اپنی معلومات حاصل کیں لہذا ہمارے لیے ان کے دو اقتباسات جو انھوں نے الحلاج [رک بآں] سے لیے ہیں، غیرمعمولی دلچسپی کا باعث ہو جاتے ہیں ۔ کلاباذی نے ان کی طرف باحتیاط اشارہ کیا ہے، یعنی الحلاج کو محض ایک بڑا صوفی کہا ہے ۔ تصوف پر قلم اٹھانے سے کلاباذی کا مقصد یہ تھا کہ علما اور صوفیہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے، اسے پاٹ دیا جائے کیونکہ یہ خلیج حلاج کے قتل کے باعث سے زیادہ وسیع ہوگئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کلاباذی نے جن ابواب میں صوفیہ کے عقائد سے بحث کی ہے، وہاں صرف فقہ الاکبر (دوم) کا حوالہ دیا ہے ۔ [کلاباذی کا ایک مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کے صحیح اور مستند عقائد فقہ کی روشنی میں بیان کر دیے جائیں].

تصوف کی ابتدائی تاریخ کے ایک بلاواسطہ مآخذ کی حیثیت سے کلاباذی کا شمار بھی السراج، ابو طالب المکّی، السُّلمی اور القشیری کے ساتھ کیا جا سکتا ہے [کتاب التعرف کا انگریزی ترجمہ آربری نے مفید دیباچے کے ساتھ ۱۹۳۵ء میں شائع کیا اور اردو ترجمہ ڈاکٹر پیر محمّد حسن نے ایک محققانہ مقدمے کے ساتھ ۱۳۹۱ھ میں لاہور میں شائع کیا].

مآخذ : (۱) محمد عبدالحی لکھنوی : الفوائد البھیة فی تراجم الحنفیة، مصر ۱۳۲۴ھ، ص ۱۶۱؛ (۲) براکلمان : GAL، ۱ : ۲۱۷، بار دوم، تکملہ، ۱ : ۳۶۰؛ (۳) حاجی خلیفہ : کشف الظنون، ۲ : ۱۶، ۳۱۶ .

(A. J. Arberry)

کِلات نَادری : (زیادہ صحیح کَلات)، * ایران (خراسان) کا ایک قصبہ جو روس اور ایران کی سرحد پر مشہد کے شمال اور سرخس کے شمال مشرق میں واقع ہے ۔ یہ ایک قدرتی قلعہ ہے اور قرہ داغ کے سلسلۂ کوہ کی ایک آگے کو بڑھی ہوئی چٹان پر بنا ہوا ہے ۔ جب ارغون نے تکودار احمد کے مغول کا ایلخان منتخب ہو جانے پر علم بغاوت بلند کیا تھا اور شکست کھائی تو اسی قلعے میں پناہ لی تھی (۶۸۰ھ/۱۲۸۱ء) ۔ مغربی جانب داخلے کا دروازہ آج بھی دربند ارغون کے نام سے مشہور ہے ۔ (غالبًا ایک مقبول عام اشتقاق کی بنا پر اس کا تلفظ ارغوان بھی کیا جاتا ہے) ۔ امیر تیمور نے بھی اس کا محاصرہ کیا تھا ۔ اس نے اس پر چودہ حملے کیے، لیکن ناکام رہا ۔ یہ کشورکشا واپس چلا گیا، مگر قلعے کی ناکہ بندی کے لیے فوجیں چھوڑ گیا تھا ۔ آخر وبا کے ہاتھوں تنگ آ کر قلعہ والوں کو سپر انداز ہونا پڑا ۔ نادر شاہ جس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک مہم جو کی حیثیت سے

کیا تھا، اس نے سب سے پہلے اسی مقام کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا۔ بعد میں اس نے یہاں ایک محل اور دلی کا مال غنیمت رکھنے کے لیے ایک خزانہ گاہ تعمیر کرائی۔

مآخذ: (۱) میرزا مہدی خان: تاریخ جہان گشای نادری، بمبئی ۱۲۶۵ھ، ص ۱۸؛ (۲) تاریخ وصاف، حوالہ در d' Ohsson: *Hist. des Mongols*، ۳: ۵۹۴؛ (۳) P. M. Sykes: *Journal of the Royal Geogr. Society*، دسمبر ۱۹۰۶ء؛ (۴) وہی مصنف: *History of Persia*، بار اوّل، ۲: ۱۸۵، ۲۰۱، ۳۴۱، ۳۵۹۔

(Cl. Huart)

* **کلام:** [کلام کے ایک سے زیادہ معنی ہیں: (۱) لغوی؛ (۲) علم نحو میں؛ اور (۳) علم کلام میں۔ لغوی معنی ہیں گفتار یا بات چیت (لسان)۔] نحویوں نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ اس سے مراد وہ لفظ ہے جو باواز بلند ادا ہو، جو مرکب ہو، مفرد نہ ہو اور وضعی معنی ادا کرتا ہو نہ کہ حقیقی۔ آجُرومیہ میں بھی ایسا ہی مرقوم ہے۔ المفصل کے مطابق یہ تام (= مکمل) جملہ ہونا چاہیے خواہ سادہ ہی سہی۔ ابن عقیل (شرح الالفیۃ) نے تو نہایت تفصیل سے کلام، کَلِم (تین یا زیادہ الفاظ کا مرکب جس سے ضروری نہیں پورا پورا مفہوم ادا ہوتا ہو)، کلمہ (واحد) اور قول (جو ان سب پر حاوی ہے) کے درمیان فرق کیا ہے۔ تہانوی (کشاف اصطلاحات الفنون، ص ۱۲۶۸ تا ۱۲۷۰) نے کلام اور اس کے اجزا پر صوتی، نحوی، لغوی اور علم بلاغت کے اعتبار سے مناسب شرح و بسط سے متکلمانہ بحث کی ہے (نیز دیکھیے De Sacy، در *Anthol. Gramm.*، ص ۴۷، ۹۳ اور حواشی)۔ لغوی اعتبار سے کلام ایسا اسم جنس ہے، جس کا اطلاق ہر بول چال پر ہوتا ہے، خواہ مختصر ہو یا مفصل (جوہری، در(صحاح) و لسان)، ہر قسم کی بات چیت پر ہوتا ہے: "لِکُلِّ مَا یُتَکَلَّمُ بِہٖ" (ابن عقیل) یا یہ مسلسل اصوات کا وہ اظہار ہے جس کے معنی سمجھ میں آ جائیں (الفیومی: المصباح)؛ چنانچہ عربی زبان میں اس مادے کا استعمال اسی طرح ہوتا ہے، قرآن مجید میں یہ جو اللہ تعالٰی نے حضرت موسٰیؑ سے خطاب کرتے ہوے بِکَلَامِی کا لفظ استعمال کیا ہے: قَالَ یٰمُوْسٰٓی اِنِّی اصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِکَلَامِیْ (۷ [الاعراف]: ۱۴۴)، یعنی فرمایا اے موسٰیؑ! میں نے تجھے لوگوں پر اپنی پیامبری اور اپنے کلام کے ذریعے ممتاز کیا۔ اس کا مطلب بیضاوی (طبع Fleischer، ۱: ۳۴۳) نے بِتَکْلِیْمِیْ اِیَّاکَ بیان کیا ہے اور سَیَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰی مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْکُمْ ۚ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلٰمَ اللّٰهِ ط (۴۸ [الفتح]: ۱۵)، یعنی "جب تم لوگ غنیمتیں لینے چلو گے تو جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ کہیں گے ہمیں بھی اجازت دیجیے کہ آپ کے ساتھ چلیں، یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے قول کو بدل دیں" کی تفسیر بیان کرتے ہوے لکھتا ہے کہ یہاں کلام ایک اسم ہے جو تکلیم کے لیے استعمال ہوا (۲: ۲۶۸، س ۱۰)۔ باقی وہ مقامات جہاں قرآن مجید میں کلام اللہ آیا ہے: اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَ قَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ (۲ [البقرۃ]: ۷۵)، یعنی اے مسلمانو! توقع رکھتے ہو کہ وہ تمھاری بات مانیں اور ان میں ایک فرقہ تھا کہ وہ اللہ کا کلام سنتا تھا، پھر اس کو جان بوجھ کر بدل ڈالتے تھے اور وہ جانتے تھے۔ وہاں اس کا مفہوم یا تو

یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے سچ مچ حضرت موسٰیؑ سے بات کی اور یا اس سے مطلب ہے اس کا قانون (شریعت) الٰہیہ ؛ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۹ [التوبۃ] : ۶)، یعنی "اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو ان کی جگہ پر پہنچا دے یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔" اس آیت میں یہ امر بالکل واضح ہے کہ یہاں کلام اللہ کے معنی دین اسلام کے ہیں ۔ قرآن مجید میں تکلیم بروزن تفعیل کا استعمال عام ہے جس کے معنی ہیں کسی سے کلام کرنا اور جس سے کلام کیا جائے، اس کی علامت معمولی کے ساتھ ۔ الاشعری (الابانۃ، مطبوعۂ حیدر آباد، ص ۲۷) کہتے ہیں : تکلیم کے معنی ہیں کسی سے بالمشافہہ بات کرنا (المشافہۃ بالکلام)، باب تفعل کا استعمال چار مرتبہ آیا ہے : يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۱۱ [ھود] : ۱۰۵)، یعنی "جس دن وہ آئے گا کوئی جاندار اس کے حکم کے بغیر بات نہ کر سکے گا"؛ اور وَ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴ [النور] : ۱۶)، یعنی "اور جب تم نے ایسے سنا تھا تو کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں شایاں نہیں کہ ایسی بات زبان پر لائیں۔ (پروردگارا) تو پاک ہے یہ تو (بہت) بڑا بہتان ہے"، اور اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ (۳۰ [الروم] : ۳۵)، یعنی کیا ہم نے ان پر اتاری ہے کوئی سند کہ وہ انہیں شریک کرنے کو کہہ رہی ہے؛ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ۝ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ (۷۸ [النبا] : ۳۸)، یعنی "جس دن روح (الامین) اور (اور) فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے تو کوئی بول نہیں سکے گا، مگر جس کو خدائے رحمٰن اجازت بخشے اور اس نے بات بھی درست کہی ہو۔" یہاں یہ فعل لازم ہے اور اس کا مطلب ہے بولنا، بات کرنا، بحث کرنا، چنانچہ جو موضوع زیر بحث ہوگا اس سے پہلے جس کا استعمال ضروری ہے ۔ ۲۴ [النور] : ۱۶ میں جو لفظ کلام آیا ہے اس کا لب و لہجہ قدرے طنز آمیز ہے اس کے معنی کے لیے (دیکھیے Dozy : *Suppl.*، ۲ : ۴۸۶ الف) ۔ کلام کا ایک مطلب کسی عقلی موقف کی تصریح یا کوئی دلیل جس سے اس تصریح کی تائید ہو اور متکلم وہ شخص جو ایسا کلام استعمال کرے (فہرست، بمواضع کثیرہ) ۔ المسعودی (مروج، مطبوعۂ پیرس، ۸ : ۱۶۱) نے تکلّم کا لفظ عام داستان گوؤں کی تیزی گفتار اور سر راہ نقالی کے معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ [دینی اصطلاح کلام کے لیے رکّ بہ مقالۂ علم (کلام)] .

مآخذ : متن میں آ گئے ہیں .

(D. B. MACDONALD)

* **کَلانْتَر** : (کلاں بمعنی بڑا اسم تفضیل)، آج کل ایران میں اس سے مراد ہے کسی شہر کا اہم ترین شخص، یا جیسے رئیس بلدہ (Mayor)، عمدۂ بلد (Burgomaster) داروغہ یا چاؤش (bailiff)۔ یہ عہدہ بر بنائے انتخاب پر کیا جاتا ہے اور جو کوئی منتخب ہو اس کے لیے بالائی حکومت کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے ۔ اس عہدیدار کی اہم ترین ذمّے داری محصولات کا عائد کرنا ہے .

مآخذ : (۱) رضا قلی خان : فرہنگ انجمن آرائے ناصری، بذیل مادۂ کلاں؛ (۲) Raphaël du Mans: *Estat de La Perse en 1660*، طبع Schefer، ص ۳۹؛ (۳)

E. Flandin : *Voyage en Perse*، ۲ : ۴۲۱؛ (۴) E. G. Browne : *A year amongst the Persians*، ص ۳۵۵ ۔

(CL. HUART)

* **کَلْب** : (بمعنی کُتّا)، یہ عام طور پر ان جانوروں میں شامل ہے جو، اسلام میں نجس قرار دیے گئے ہیں ۔ اس کی اوّل وجہ تو یہ ہے کہ اس کا گوشت کھانا حرام ہے (النووی : منہاج الطالبین، طبع v.d. Berg، ۳ : ۳۱۲)؛ اور دوسرے اس لیے کہ حدیث میں کتے سے متعلق خاص ارشادات ہیں، مثلاً یہ کہ جس خوراک کو کتا چاٹ جائے وہ نجس ہو جاتی ہے اور وضو کے پانی میں منہ ڈال دے تو اس سے وضو نہیں ہو سکتا (البخاری، کتاب الوضوء، باب ۳۳) [بخاری حوالۂ مذکور کے عنوان میں جو کچھ ہے وہ زہری کی فقط اپنی رائے ہے ۔ جس کے بعد بخاری نے سفیان کا قول نقل کیا ہے کہ میرے دل میں اس کی بابت شبہہ ہے، بہتر ہے کہ وضو کے ساتھ اس صورت میں تیمم بھی کر لے] جن برتنوں کو کتا چاٹ جائے انہیں کئی بار ریت سے مل کر دھونا چاہیے ۔ ایک لحاظ سے وہ اس تمام کمرے کو پلید کر دیتا ہے جس میں وہ ہو کیونکہ حدیث کی رو سے جس گھر میں کتا ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے اور حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو وہ جگہ جہاں کتا چھپا پڑا تھا پانی سے صاف کرانی پڑی ۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام اس گھر میں داخل ہوے (مسلم : کتاب اللباس، حدیث ۱۳ ببعد) ۔ کتے نماز کے باطل ہونے کا موجب ہیں، یعنی اگر کتا نماز پڑھتے میں مصلّی کے قریب آ جائے تو نماز باطل ہو جاتی ہے ۔ [احادیث سے قریب آ جانا مفہوم نہیں ہوتا بلکہ سامنے سے گزرنا مراد ہے اور یہ بعض اصحاب ظواہر کا مسلک ہے، جمہور کے نزدیک کسی چیز کا سامنے سے گزرنا مفسد صلٰوۃ نہیں ہے (ابن ماجہ، حوالۂ مذکور، حاشیہ صفحہ کے شروع میں؛ ہدایہ اوّلین، مطبوعۂ لکھنؤ، ص ۱۲۳، حاشیہ ۱)] اس فساد کا باعث کتے کی نجاست کو ٹھیرانا اس وجہ سے اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ یہی حکم عورت حائض کے متعلق بھی ہے (ابن ماجہ، قاہرہ ۱۳۱۳ھ، ۱ : ۱۵۷) ۔ [صرف ایک حدیث میں مرأۃ کے ساتھ لفظ حائض آیا ہے، باقی احادیث میں فقط مرأۃ ہے ۔ اس لیے یہاں حائض سے مراد بالغہ ہے، چنانچہ دیگر احادیث میں بھی اس لفظ سے یہی مراد ہوگی ۔ نابالغہ لڑکیوں کے متعلق یہ حکم کسی کے ہاں بھی نہیں ہے ۔ بالغہ عورت کے بارے میں اختلاف پہلے بیان ہوا، یعنی فقط بعض اصحاب ظواہر مرور مرأۃ کو قاطع صلٰوۃ مانتے ہیں اور کوئی نہیں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا (حوالۂ بالا)] ۔ شارحین حدیث اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ کتا نمازی کو ڈرا دیتا ہے اور اس کی توجہ نماز سے ہٹا دیتا ہے (السندی : شرح ابن ماجہ، حوالۂ مذکور) ۔ چونکہ جمہور کسی چیز کے مصلّی کے سامنے سے گزرنے کو قاطع صلٰوۃ نہیں مانتے، اس لیے وہ احادیث کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ قطع سے مراد نقص ہے، یعنی ان اشیا کے مرور سے خیال دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔ اس لیے ان اشیا کا مرور باعث نقصان صلٰوۃ ہے اور قاطع صلٰوۃ نہ ہونے کی دلیل ان کے نزدیک یہ حدیث ہے : "لا یقطع الصلٰوۃ مرور شیء، رواہ مسلم" (ہدایہ اوّلین ۔ مطبوعۂ لکھنؤ، ص ۱۲۳، س ۱ و ۲ از ابتداے صفحہ) ۔ یہ بات کالے کتے کی بابت خصوصیت کے ساتھ درست ہے کیونکہ وہ "شیطان" ہے (ابن ماجہ، قاہرہ ۱۳۱۳ھ، ص ۱۵۷، س ۷ ببعد) ۔ اس حدیث کو بعض نے لفظی معنوں میں لیا ہے، یعنی یہ کہ شیطان کبھی کبھی کالے کتے کی صورت

میں دکھائی دیتا ہے (دیکھیے Faust) یا اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ عام طور پر کالے کتے خصوصیت کے ساتھ شریر سمجھے جاتے ہیں [(دیکھیے ابن ماجہ: حوالۂ مذکور، ص ۷۰۵ (حاشیہ) الکلب الاسود شیطان)۔ شیطان کا مرور قاطع صلوٰۃ نہیں ہے، اس لیے اختلاف صورۃ کلبیہ ھی پر مرتکز ہے] ۔ کتے بالعموم خطرناک سمجھے جاتے ہیں، اس لیے انھیں نیست و نابود کر دینا چاہیے (النسائی، مطبوعۂ قاہرہ، کتاب الصید والذبائح، باب ۹-۱۰، وسط صفحہ، باب الأمر بقتل الکلاب ببعد)، لیکن چونکہ "خدا کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کرتا جس میں اس کی حکمت کی کوئی نشانی نہ ہو"، (السندی: شرح النسائی، حاشیہ (لولا ان الکلاب اُمّۃٌ من الامم)، کتاب مذکور، حوالۂ بالا کی اس عبارت پر شرح) اس لیے یہ حکم صرف کالے کتے پر جاری ہوتا ہے ۔ کتے کی ساری نوع کو فنا کرنے سے روک دیا گیا ہے ۔

کتوں کو صرف شکار، بکریاں چرانے اور حفاظت کے لیے رکھنے کی اجازت ہے (النسائی: کتاب مذکور، ص ۱۹۵، س ۱۰ ببعد) جو شخص ان کے سوا کسی اور غرض سے کتا اپنے گھر میں رکھے گا، اسے اس کے نیک اعمال کے ثواب میں سے روزانہ دو قیراط کی کمی ہوتی رہے گی (دیکھیے *Babylon Talmud Shabbāth*، ورق ۶۳ الف: جس کسی کے پاس خطرناک کتا ہوگا سعادت مندی اس کے گھر کے نزدیک نہ آئے گی) ۔ بلکہ حدیث کی رو سے کتے کا بیوپار سخت ممنوع ہے (البخاری، کتاب البیوع، باب ۲۵) ۔

اس کے خطرناک اور ناپاک ہونے کے باوجود عرب کتے کی اچھی خصلتوں اور خدمات کی قدر پہنچانتے تھے ۔ [اسلام میں اسی لیے اس سے مفید کام لینے کی اجازت ہے، مثلاً شکار، حفاظت وغیرہ] ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے (خود ایک عورت کو اس مہربانی کے صلے میں جو اس نے ایک پیاسے کتے سے کی تھی ثواب کا مژدہ دیا ہے (البخاری، کتاب الوضوء، باب ۳۳) ۔ [اس حدیث میں عورت کا ذکر نہیں رجل کے لفظ سے آپ نے فرمایا کہ اس کو ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے بخش دیا گیا اور جنّت میں داخل کیا گیا ۔] القزوینی (عجائب المخلوقات، ص ۴۰۳) کتے کی بابت لکھتا ہے کہ یہ "بہت سمجھدار، کارآمد، بھوک اور پاسبانی میں صابر جانور ہے، جس کی دانشمندی اور وفاداری بہت سے واقعات سے ثابت ہے" ۔ القزوینی (عجائب المخلوقات) باؤلے کتے سے کاٹے جانے کی علامات تفصیلاً بیان کرتا ہے، اس پر دیکھیے *Babylon. Talmud Yōmā*، ورق ۸۳ ب: "باؤلے کتے کی پانچ علامتیں ہیں، اس کا منہ کھلا ہوتا ہے، اس کی رال بہ رہی ہوتی ہے، اس کے کانوں سے بدبو آتی ہے، اس کی دم ڈھیلی ہو کر سیدھی لٹک جاتی ہے اور وہ گلی کوچوں میں آوارہ پھرتا رہتا ہے" ۔

اصحاب الکہف کا کتا البتہ مستثنٰی ہے ۔ البیضاوی کے بیان کے مطابق (طبع فلائشر Fleischer، ص ۵۵۷) یہ ایسا کتا تھا جس کو قوت گویائی عطا کی گئی تھی ۔ الطبری (تفسیر، ۱۵: ۱۴۱، بار اول، ص ۱۳۱)، کی رائے ہے کہ یہ کتے کی شکل میں ایک انسان تھا، لیکن شاید یہ ایک عام کتا تھا ۔ [اصحاب الکہف کے کتّے کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عبدالماجد دریا بادی: تفسیر ماجدی؛ شبیر احمد عثمانی: تفسیر؛ محمّد شفیع: معارف القرآن، ج ۵، بذیل وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ (۱۸ [الکہف]: ۱۸)] ۔

مآخذ: حدیث کے دوسرے مجموعوں میں وہ عبارتیں دیکھیے جو محولۂ بالا احادیث کے انداز پر ہیں ۔ (۱) القزوینی: عجائب المخلوقات، طبع وستنفلٹ، ص

۴۰۳ بعد؛ (۲) الدمیری: کتاب حیوۃ الحیوان الکبری، قاہرہ ۱۲۷۵ھ، ۲: ۳۲۰ تا ۳۶۰؛ مشرق کے سیاح مثلاً (۳) Ch. M. Doughty : *Travels in Arabia Deserta*، کیمبرج ۱۸۸۸ء بمدد اشاریہ؛ (۴) A. Musil : *Arabia Petraea*، ۳، (وی انا ۱۹۰۸ء)، بمدد اشاریہ؛ (۵) Julius Euting : *Tagbuch einer Reise in Innerarabien*، ۲: ۵۳؛ کتوں کے ناموں پر؛ مشرق کے شہروں کے کتوں پر دیکھیے (۶) Von Oppenheim : *Vom Mittelmeer Zum Persichen Golf*، برلن ۱۸۹۹ - ۱۹۰۰ء، ۱: ۶۹ تا ۷۱ .

(B. JOEL)

* **الکلب**: علم ہیئت کا شعریٰ الیمانیہ (کلب الجبّار) ہے۔ اس سے صورت الکلب الاکبر (= بڑے کتے کا مجمع الکواکب) اور صورت الکلب الاصغر (= چھوٹے کتے کا مجمع الکواکب) یا صورت الکلب المتقدم (= اگلے کتے کا مجمع الکواکب) مراد ہے۔ اوّل الذّکر کلب اکبر (Canis major) اور مؤخر الذّکر کلب اصغر (Canis minor) کہلاتا ہے۔ یہ جنوبی افلاک کے مجمع الکواکب ہیں جن کے نام اور اشکال عربوں نے بطلمیوس کی المجسطی سے اخذ کی ہیں۔ مؤخر الذّکر کے تتبع ہیں عربوں نے بھی ۱۸ ستارے کلب اکبر کی خاص شکل میں شامل کیے ہیں جن میں سے سیریوس Sirius (الشعریٰ العبور) قدر اول (دراصل ۱ء ۶) کا ہے۔ ۱۱ ستارے مجمع الکواکب کے باہر واقع ہیں اور کلب اصغر میں دو ستارے ہیں جن میں سے پروکیون Prokyon (اے) کلب اصغر یا الشعریٰ الغمیصاء) بھی قدر اول (دراصل ۵ء ۰) کا ہے۔ جہاں تک کوکبی محدّدوں (عرض بلد و طول بلد) کا تعلق ہے عبدالرحمٰن الصوفی (م ۳۷۶ھ/ ۹۸۶ء) اور البیرونی (م ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء) کی فہرست ہائے نجوم تمام تر بطلمیوس کی المجسطی پر مبنی ہیں، لیکن وہ فہرست جو الغ بیگ نے ۱۴۳۷ء کے دوران میں تیار کی تھی، ستاروں کے مقامات کی بہت سی نئی حدود پر مشتمل ہے .

شِعریٰ (یمانی) کے نام کی روایت غالباً مصر قدیم تک پہنچتی ہے جہاں آج کل کا سیریوس، یعنی مشتعل، درخشاں (= Dog Star کے اضافے کے ساتھ) سوپ ڈٹ (Sopdet) کہلاتا تھا جو بلاشبہہ بعد میں یونانی سوتھس (Sothis) بن گیا۔ اصل میں ستارے نام کا کتے سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن یونانی سفال کاری (Terracotta) میں جس کے آثار مصر میں اکثر پائے جاتے ہیں دیوی ایزیس (Isis) جس کے نزدیک یہ ستارہ مقدس تھا، اکثر ایک کتے کی ہمراہی میں دکھائی گئی ہے اور بقول L. Borchardt ایک خاص قسم کے کتے کی معیت میں جسے عرف عام میں ارمنت Ermant or Arment کتا کہتے ہیں دکھایا گیا ہے۔ سریوس Sirus کا چربہ بھی سفال کاری میں اسی طور پر اتارا گیا ہے۔ بعض اوقات اس کے سر پر بھی ستارہ ہوتا ہے۔ L. Borchardt کے نزدیک یہ غیر اغلب نہیں کہ جو ستارہ رامیسی Ramesid مقبروں سے برآمد شدہ ستاروں کی جدولوں میں دکھایا گیا ہے اور جو سوپ Sopdet سے پہلے یا پیچھے آتا ہے، وہ آج کل کا پروکیون Prokyon ہی ہو.

بابل میں سیریوس "تیر ستارہ" (Arrow Star) کہلاتا تھا۔ اس کا نام کتا ستارہ کبھی نہ تھا؛ اس ستارے کا قدیم بابلی نام (بقول ایکس کیوگلر (F. X. Kugler) ککب مشری Kakkabmishre تھا اور بعد کی بابلی زبان میں اسے کک کشتی kak-kashti (کمان کا ہتیار، تیر) کہتے تھے .

مآخذ: (۱) Schjellerup : *Description des étoiles fixes*، (سینٹ پٹرز برگ ۱۸۷۴ء)، ترجمۂ کتاب الکواکب الثابتہ، از عبدالرحمٰن الصوفی؛ (۲) البیرونی:

الانسان المسعودی، مخطوطۂ کتاب خانۂ برلن، ص ۲۰۹ ب ببعد؛ (۳) الخوارزمی: مفاتیح العلوم، طبع Vloten، ۷، ص ۲۱۳؛ (۴) المسعودی: مروج الذھب، پیرس ۱۸۶۱-۱۸۷۷ء، ۳: ۳۱۶ ببعد؛ (۵) القزوینی: عجائب المخلوقات، طبع وستنفلٹ، ص ۳۹ ببعد؛ (۶) L. Ideler: *Untersuch über den Ursprung u. die Bedeutung der Sternnamen*، برلن ۱۸۰۹ء، ص ۲۳۸ ببعد؛ (۷) C. A. Nallino: *Opus astronomicum*، ۲: ۱۲۱؛ (۸) B. Knobel: *Ulug Beg's catalogue of stars*، طبع واشنگٹن ۱۹۱۷ء؛ (۹) F. X Kugler: *Sternkunde und Sterndienst in Babel*، ج ۲ (Münster ۱۹۲۴ء): ۵۲۲ ببعد.

(C. SCHOY)

* **کَلْب بن وَبَرَة**: بنو کلب کا جدّ امجد جس کے نام سے یہ قبیلہ منسوب ہے۔ بنو کلب شام کے بدوی عربوں کا ایک گروہ ہے جو قضاعة [رکّ بآں] کے طاقت ور گروہ سے وابستہ ہے۔ ہجرت کے بعد کلب کے قبائل میں سب سے زیادہ شہرت خصوصًا تاریخ ادب میں بنو عذرة (رکّ بآں) نے پائی۔ بنو کلب کے زمانۂ قبل اسلام کے جو حالات و واقعات معلوم ہیں، وہ بہت دھندلے اور نیم افسانوی ہیں۔ زُہیر بن جناب [رکّ بآں] جو قریب قریب ایک فرضی شخصیت بن چکا ہے اور جس کا مُعَمَّرون، یعنی صد سالہ لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس قبیلے کے بڑے بڑے سرداروں میں سے تھا۔ معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے قبائل سے بالکل الگ تھلگ رہ کر نشو و نما پائی تھی اور ان کا دوسرے قبائل سے کوئی رشتہ یا تعلق نہیں تھا۔ ان کی زبان میں بعض عجیب و غریب امتیازی خصوصیات ملتی ہیں اور ہمیں زمانۂ قبل از اسلام کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا جس نے یہ زبان استعمال کی ہو۔ زمانۂ ہجرت میں یہ شامی عربوں کا وقیع قبیلہ تھا.

شام کی فتح کے بعد بنو کلب منظر عام پر آئے۔ اس بات میں ان کا کچھ کم دخل نہ تھا کہ امیر معاویہؓ اول نے اس قبیلے سے معاہدۂ اتحاد کر لیا اور میسون [رکّ بآں] مادر یزید اول کے ساتھ شادی کر کے معاہدے پر مہر توثیق ثبت کردی۔ اس سیاسی اتحاد سے بنو کلب کے افراد کو دربار اور فوج میں اونچے عہدے مل گئے۔ فوج کو اس قبیلے سے تربیت یافتہ سپاہی اور بڑے دلیر سپہ سالار ملے۔ پہلی صدی ہجری کے وسط کے قریب ان کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی۔ ان میں سے ۲۰۰۰ افراد کو ۲۰۰۰ درہم کا وظیفہ دیا جاتا تھا۔ اسے "شرف العطا" کہتے تھے اور یہ ایک ایسا امتیاز تھا جو فقط اشراف کے لیے مخصوص تھا۔ ان نیم حضری اور نیم بدوی لوگوں نے جو گلہ بانی میں بڑے مشّاق تھے، اپنے مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ صحرائے سَمَاوَة کے لق و دق میدانوں میں جو شام کو عراق سے جدا کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اس کو سَمَاوَة کلب یا صحرائے کلب کہتے ہیں، پھیلا رکھے تھے۔ حوران کے جنوب اور مشرق کے چشمے اور نخلستان ان کے قبضے میں تھے، بالخصوص دومة الجندل، تبوک اور چند دیگر مقامات جن میں وادی القرٰی کے آس پاس جگہ جگہ کھجوروں کے باغات تھے، جو بنو عذرة کی املاک تھے۔ شام میں وہ سَلَمِیَہ اور پالمیرا کے گرد و نواح میں متعدد گروھوں میں آباد تھے۔ یہ دونوں شہر بھی انھیں کے تھے۔ ضلع اسمة Emesa کا کچھ علاقہ اور دریائے عاصی کی وادی زیریں کا ایک حصہ ان کے مقبوضہ علاقے میں شامل ہو کر باہم متحد ہو گئے تھے اور غُوطَہ دمشق [رکّ بآں] میں بھی کچھ دیہات پر بنو کلب قابض تھے۔ چونکہ پالمیرا اور دومة الجندل جیسے تجارتی مرکزوں پر ان کا

قبضہ تھا، اس لیے یہ امر قرین قیاس ہے کہ ان شاہراہوں سے جہاں پہلی صدی ہجری تک بھی بہت آمد و رفت رہتی تھی، گزرنے والے قافلوں سے یہ ہوشیار، محنتی، شامی قبیلہ کافی فائدہ اٹھاتا ہوگا.

معلوم ہوتا ہے کہ متحدہ قبائل کی قیادت قدیمہ انھیں بنو غسان سے ورثے میں ملی تھی۔ بنو غسان اور دوسرے شامی عرب قبائل کی طرح ہجرت کے وقت اس قبیلے کے اکثر لوگ بھی عیسائی تھے اور فرقۂ یعقوبیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک فریق نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے پاس ایک وفد بھی بھیجا تھا۔ متعدد کلبیوں نے آنحضرتؐ کا متبع ہو کر عروج حاصل کیا اور بڑی اہم خدمات سر انجام دیں۔ ان میں سے آنحضرتؐ کے متبنٰی زید بن حارثہ اور آپؐ کے سفیر دحیَة بن خَلیفہ قابل ذکر ہیں۔ اس قبیلے میں اسلام خاص طور پر اس وقت پھیلا جب بنو امیہ کے ساتھ ان کے ازدواجی تعلقات قائم ہونے لگے۔ سب سے پہلا تعلق حضرت عثمانؓ [رکّ بآں] اور [حضرت] نائلہ کی شادی سے پیدا ہوا اور اس سے انھیں عرب کے دوسرے قبائل پر غلبہ حاصل ہونے کا یقین ہو گیا۔ یزید اول نے کچھ ایام شباب اپنی ماں کے ساتھ صحرائے کلب میں بسر کیے اور ایک کلبیہ سے شادی کی۔ اس قبیلے اور طاقتور قبیلۂ بَحْدَل [رکّ بآں] کے عروج کی وجہ سے بنو قیس ان کے خلاف بھڑک اٹھے۔ انھوں نے معاویۂ ثانی کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر کے ابن الزبیرؓ [رکّ بہ عبداللہؓ بن الزبیرؓ] کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ مرج راہط کی فتح کے بعد جو زیادہ تر کلبیوں کی جوانمردی کی مرہون منت تھی، ان دونوں قبائل کے درمیان پوری طرح ٹھن گئی۔ جوش انتقام میں انھوں نے بنو کلب پر ہر جگہ حملے شروع کر دیے اور انھیں عراق اور اس سے ملے ہوئے اضلاع سَماوة سے نکال دینے میں کامیاب ہو گئے۔ مزید برآں آل مروان کے برسراقتدار آنے سے دربار دمشق میں جہاں مرج راہط کی شاندار فتح کے بعد ان کے کئی دشمن پیدا ہو گئے تھے، ان کی قدر وقتی طور پر گھٹ گئی تھی، لیکن انھیں دوبارہ اثر و رسوخ حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ان کا شمار بدستور سلطنت بنی امیہ کے ثابت قدم اور سرگرم ترین حامیوں میں ہوتا رہا۔ ان کے فوجی دستوں نے بارہا عراق کو مشرق کے باغیوں سے دوبارہ چھیننے میں بڑی کامیابی سے اعانت کی۔ اسی وجہ سے ان کو قضاعة کا سب سے زیادہ بہادر قبیلہ مانا جاتا تھا۔ قصہ مختصر لقب کلبی، بنی امیہ کے معاون کا مرادف ہو کر رہ گیا تھا۔ بنی امیّہ کا طریق عمل تقریباً ہمیشہ یہی رہا کہ بنو کلب کے معاهدۂ اتحاد پر بھروسا کیا جائے اور پھر ان کے ذریعے دیگر شامی قبائل کی اعانت حاصل کی جائے۔ ایک روایت ہے کہ السفیانی [رکّ بآں] کے آخری حمایتی کلب ہوں گے۔ اس صورت حالات کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عہد عباسی میں بنو کلب کو بڑی سخت پاداش بھگتنی پڑی اور ان پر بہت جلد زوال آ گیا کیونکہ ان کی تعداد ایک مدت تک قیس کے ساتھ لڑنے میں اور اسلامی فتوحات کی جنگوں کے اندر عملی حصہ لینے میں پہلے ہی بہت کچھ گھٹ چکی تھی۔ ان کی عصبیت ختم اور اتفاق پارہ پارہ ہو گیا اور لقب کلبی جو بغداد کی حکومت کی نگاہ میں شک و شبہہ کا مورد بن چکا تھا، رفتہ رفتہ بالکل غائب ہو گیا۔ ابن سعد جس کا قول القلقشندی نے (اپنی تصنیف نِہایةُ الاَرَب) میں نقل کیا ہے کہتا ہے کہ اس کے زمانے میں بنو کلب کی ایک بڑی تعداد "آبنائے قسطنطینیہ" کے ساحلی علاقوں

میں آباد تھی اور ان میں نصف مسلم تھے اور نصف عیسائی ۔

مآخذ : (۱) ابن دُرید : کتاب الاشتقاق، ص ۳۱۳ ببعد؛ (۲) Wüstenfeld : *Register zu den genealog. Tabellen*، ص ۲۶۳ تا ۲۶۷؛ (۳) دوسرے حوالوں کے لیے بڑی تصنیف *Etudes sur le regne du calife omaiyade Moawia Ier*، ص ۵۰، ۵۱، ۶۵، ۲۸۶ تا ۲۹۳، ۳۰۹ تا ۳۱۲، ۳۲۳ تا ۳۲۶، ۳۱۸

(H. LAMMENS)

* **کُلبرگہ :** رک بہ احسن آباد، گلبرگہ ۔

* **اَلْکَلْبی :** کوفی علما کا ایک خانوادہ ۔ الکلبی الکبیر ابو النضر محمد (ابن مالک بروایت ابن الکوفی، در الفہرست) بن السائب بن بِشر کے دادا نے اپنے بیٹوں، السائب، عُبید اور عبدالرحمٰن نے حضرت علی رضکی حمایت میں جنگ جمل میں حصہ لیا تھا ۔ اس کے باپ نے حضرت مصعب رض بن الزبیر رض کے ساتھ شہادت پائی اور خود ابو النضر محمد الکلبی نے دیر الجماجم [رک باں] کی لڑائی میں عبدالرحمٰن بن محمد الاشعث [رک باں] کی ہمراہی میں شرکت کی تھی ۔ بعد ازاں ابو النضر محمد الکلبی نے خود اپنے کو لغت اور اخبار العرب کے درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا ۔ اس نے الفرزدق کے نقائض کو الفرزدق [رک باں] سے پڑھا تھا ۔ وہ کوفے میں تفسیر اور اخبار العرب پر لیکچر دیا کرتا تھا ۔ سلیمان بن علی کی دعوت پر اس نے کچھ عرصہ اس کے گھر میں قرآن مجید کی تفسیر کا بھی درس دیا تھا ۔ اس کی تفسیر سے الثعلبی (م ۴۲۷ھ/ ۱۰۳۶ء) نے بھی استفادہ کیا تھا (دیکھیے *Cat. Codd. Mss. or.*، موزۂ بریطانیہ، ج ۲، عدد ۸۲۱) ۔ اس نے ۱۴۶ھ/۷۶۳ء میں وفات پائی ۔

ابو المنذر ہشام نے اخبار العرب کی تعلیم اپنے والد سے پائی اور پھر خود اس نے ایام العرب اور اخبار العرب کی تدریس جاری رکھی ۔ ارباب جرح و تعدیل نے دونوں علما کو ضعیف الروایت لکھا ہے (دیکھیے الاغانی، ۹ : ۱۹؛ ۱۱ : ۳۸؛ ۱۸ : ۱۶۱؛ Goldziher : *Muh. Studien*، ۱ : ۱۸۶)؛ جب کہ بعض نے انھیں ثقہ بتلایا ہے (یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۲ : ۱۵۸) ۔ موجودہ علمی تحقیقات نے ان کی روایات کی تصدیق کر دی ہے، کیونکہ ان کے استدلال علمی کی بنیاد کتبات کے مطالعے پر ہے (دیکھیے Nöldeke : *Gesch. der Araber U. Perser*، ص ۲۷) ۔ محمد بن المنذر نے کچھ عرصے کے لیے بغداد میں ملازمت بھی کی تھی ۔ اس نے اپنے وطن کوفے میں ۲۰۴ھ/۸۱۹ء میں وفات پائی ۔ بعض اس کا سال وفات ۲۰۶ھ بتاتے ہیں ۔

محمد بن المنذر کی ایک سو چالیس کتابوں (الفہرست، ص ۹۵ تا ۹۸) میں سے یہ کتابیں اب دستیاب ہوتی ہیں : (۱) کتاب النسب الکبیر یا الجمہرۃ فی النسب (حاجی خلیفہ میں جمہرۃ الانساب)، جو کہ عربوں کے انساب پر ہے اور ایسکوریال Escorial میں اس کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے (دیکھیے Casiri : *Bibl. arabico-hispana*، عدد ۱۶۹۳)؛ اس کی دوسری جلد موزۂ بریطانیہ میں ہے (دیکھیے Brit. Mus. : *Cat. Codd. Mss*، ۲، عدد ۹۱۵) جو جدید مگر ناقص ہے ۔ شاید یہ کسی اقتباس کی نقل ہے ۔ اس کتاب کا کچھ حصہ پیرس میں ایک مخطوطے کی شکل میں محفوظ ہے (فہرست کتاب خانہ ملی، مرتبۂ دیسلان، عدد ۲۰۴۷) ۔ ابو سعید علی بن موسی السُّکری (م ۳۶۵ھ/۱۰۷۵ء) نے اس کتاب کی تلخیص بھی کی تھی جو کہ محمد بن حبیب کی روایت پر مبنی ہے ۔ السکری نے ابن العربی اور دوسرے قدیم

مصادر سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ اس کی پہلی جلد موزۂ بریطانیہ میں موجود ہے (دیکھیے *Cat.*، عدد ۱۲۰۲، ص ۸۳ ب) ۔ یاقوت کا اقتباس کردہ نسخہ قاہرہ میں ہے، فہرست، (دارالکتب المصریہ، ۵ : ۱۵۶؛ Vollers : *Zeitschr. d. deutsch. Morg. Gesellsch*، ۴۳ : ۱۱۶)؛ (۲) کتاب نسب فحول الخیل فی الجاہلیۃ و الاسلام (دیکھیے Hammer : *Denks. der Wiener Akad. Phil. Hist. Kl*، ۶ : ۲۱۴، عدد ۵۰)، در گوتھا (دیکھیے Pertsch : *Die arab. Hdss.*، عدد ۲۰۸۷)، نیز در ایسکوریال (دیکھیے Casiri، عدد ۱۷۰۰، ۲)؛ (۳) کتاب الاصنام (یا کتاب تنقیص الاصنام)، طبع زکی پاشا [Ibn al Kalbi : *Le Livre des Idoles*، (کتاب الاصنام)، قاہرہ ۱۹۱۴ء] ۔ عبدالقادر البغدادی نے کتاب کے مطالب کا خلاصہ بیان کیا ہے (خزانۃ الادب، ۳ : ۲۴۲ تا ۲۴۶)، جس سے کتاب کی وسعت اور اس کی ترتیب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ یاقوت نے معجم البلدان میں اس کتاب کے بہت سے اقتباسات دیے ہیں، جن کا ترجمہ مع حواشی Wellhausen نے شائع کیا ہے : *Reste arab. Heidentums*، بار دوم، ص ۱۰ تا ۶۴ (دیکھیے ص ۳۴۳) ۔ الانباری نے کتاب الکلاب (فہرست، ص ۹۷، س ۱۸) سے ایک اقتباس مفضلیات کی شرح میں بھی دیا ہے، دیکھیے C. J. Lyall : *Ibn al-Kalbi's Account of the first day of al Kulāb*، در Orient. *Stud. Th. Nöldeke* Gewidmet (Giessen ۱۹۰۶ء)، ۱ : ۱۲۷ تا ۱۵۴ ۔

مآخذ : ابن سعد : طبقات، ۶ : ۲۴۹ تا ۲۵۰؛ (۲) ابن حجر : تہذیب التہذیب، (حیدر آباد دکن، ۱۳۲۵—۱۳۲۷ھ)، ج ۹، عدد ۲۶۶؛ (۳) ابن الانباری : نزہۃ الالبّاء فی طبقات الادباء، ص ۱۱۶ تا ۱۱۸، قاہرہ ۱۲۹۴ھ؛ (۴) Wüstenfeld : *Geschichtsschreiber.*، عدد ۲۶، ۴۲؛ (۵) Nöldeke-Schwally : *Gesch d. Qorāns*، ۲ : ۱۶۸، ۱۷۰، ۱۷۱؛ (۶) Brockelmann : *Gesch. d. ar Lit.*، ۱ : ۱۳۸ تا ۱۴۰ ۔

(Brockelmann)

* **کُلْثُوم بن عیاض القُشَیْرِی** : بنو قیس [ابن الاَعْوَر بن قشیر بن کعب ربیعۃ کا نامور فرزند اور اموی عہد کا بہادر سپہ سالار جس نے افریقیۃ میں لشکر کشی کی] ۔ اسے خلیفہ ہشام [ابن عبدالملک] نے اس شکست فاش کے انتقام کے لیے منتخب کیا تھا جو ۱۲۳ھ [/۷۴۱ء] کی ابتدا میں عربوں کو غزوات الاشراف میں صوفی بربروں کے ہاتھوں ہوئی تھی ۔ کلثوم ۳۰ ہزار فوج کے ساتھ جس میں الافریقیۃ اور مغرب کے دستے بھی شامل ہوگئے تھے روانہ ہوا اور حبیب بن ابی عُبَیْدۃ سے جو تلمسان کے قریب خوارج کی پیشقدمی روکنے کی کوشش کو رہا تھا جا ملا، لیکن شامیوں کے نامناسب رویے اور بالخصوص کلثوم کے بھتیجے اور نامزد جانشین بَلْج [ابن بِشْر بن عیاض] کے غرور اور نخوت سے وہ لوگ ناراض ہوگئے جن کی اعانت کے لیے وہ یہاں آئے تھے ۔ بربری قائد خالد بن حمید عربوں سے کٹ کر وادی سبو جو مغرب کے وسط (طنجہ) میں واقع ہے چلا گیا ۔ اسی دوران [فاس کے شمال میں] نَبْدورہ (مقامی تلفظ بَقْدورہ) کے مقام پر ایک معرکہ ہوا جس میں حبیب کے دانشمندانہ مشورے کو رد کر دیا گیا ۔ بالآخر وہ عرب رسالہ جسے بَلْج نے چھپا رکھا تھا بمشکل بربری صفوں کو چیر کر نکلنے میں کامیاب ہو سکا، لیکن بربروں نے ان کے عقب میں اپنی صفیں دوبارہ مرتب کر لیں اور خلیفہ کی فوج کو گھیرے میں لے لیا ۔ حبیب اور چند دوسرے سپہ سالار مارے گئے ۔ کلثوم آیات قرآنی پڑھ پڑھ کر دوسروں کو جرأت

دلاتا رہا اور انتہائی دلیری سے لڑا، مگر بالآخر وہ بھی کام آیا ۔ ایک تہائی فوج ہلاک ہو گئی اور ایک تہائی گرفتار (ذوالحجہ ۱۲۳ھ/اکتوبر نومبر ۷۴۱ء) ۔ بَلْج کے رسالے کے لیے بچاؤ کی واحد صورت یہ تھی کہ سبتہ میں پناہ لے جہاں سے بڑی مصیبتیں اٹھاتا ہوا وہ سمندر پار کرکے ہسپانیہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ۔ [رَکّ بہ بَلْج بن بِشْر] .

مآخذ : (۱) ابن خلدون : کتاب العبر، ۶ : ۱۱۱، ۱۱۹؛ (۲) [ابن حزم : جمہرۃ انساب العرب، ص ۲۹۰]؛ (۳) *Histoire de l' afrique et de la Sicile*، طبع و ترجمہ Desverges، ص ۱۱ تا ۱۳ متن، ۳۶ تا ۳۸ ترجمہ؛ (۴) ابن عذاری: البیان المغرب، ۱: ۳۴ تا ۴۳؛ (۵) ابن القوطیۃ : تاریخ افتتاح الاندلس، میڈرڈ ۱۸۶۸ء، ص ۱۵ تا ۱۵ [کذا ؟]؛ (۶) البلاذری : فتوح البلدان، ص ۲۲۹ ۲۳۲؛ (۷) اخبار مجموعۃ، ص ۳۲ تا ۳۵؛ (۸) ابن الأثیر : کامل، طبع قاہرہ، ۵ : ۱۱۷؛ (۹) ابن تغری بردی: النجوم الزاہرۃ، ۱ : ۳۲۱؛ (۱۰) المقری : نفح الطیب، ۲ : ۱۲؛ (۱۱) ابن ابی دینار القیروانی : کتاب المؤنس، ص ۳۸؛ (۱۲) Dozy. : *Hist. des Musulmans d' Espagne*، ۱ : ۲۳۵ تا ۲۳۸؛ (۱۳) Fournel : *Les Berbers*، ۱ : ۲۹۱ تا ۲۹۶؛ (۱۴) Mercier : *Histoire de l' Afrique septentrionale*، ۱ : ۲۳۱ و ۲۳۲ .

(RENÉ BASSET)

کِلِک : (فارسی) وہ بیڑا جو لمبے لٹھوں یا شہتیروں کو باہم رسوں سے باندھ کر بنایا جائے اور پانی میں چھوڑ کر اس کے نیچے بھیڑوں کی کھالوں کی مشکیں ہوا سے پھلا کر مضبوطی سے باندھ دی جائیں ۔ اس قسم کے بیڑے زیادہ تر دریائے دجلہ کے ان مقامات میں استعمال ہوتے ہیں جہاں جہازرانی ممکن نہیں ۔ ان کا بیان اس قدیم زمانے میں موجود ہے کہ Herodotus (۱ : ۱۹۴)، اور Xenophon (*Anabasis*، ۱ : ۵، ۱۰؛ ۲ : ۵، ۹) *

ببعد) میں ملتا ہے یہ آج کل بھی زیر استعمال ہیں اور عراق کے تقریباً تمام سیاحوں نے ان کا ذکر کیا ہے .

مآخذ : (۱) Thévenot : *Suite du voyage de levant*، پیرس ۱۶۷۴ء، ۲ : ۱۰۳ ببعد؛ (۲) Buckingham : *Travels in Mesopotamia*، لنڈن ۱۸۲۷ء، ۲ : ۸۷؛ (۳) Ker Porter : *Travels*، لنڈن ۱۸۲۱ - ۱۸۲۲ء، ۲ : ۲۵۹؛ (۴) V. Moltke : *Gesammelte Schriften*، ۸ : برلن ۱۸۹۳ء بمدد اشاریہ؛ (۵) H. Ritter در *Isl.*، ۹ : ۱۴ ببعد .

(ادارۂ [آ]، لائیڈن، بار اوّل)

کَلْکَتّہ (Calcutta) : صوبۂ مغربی بنگال کا* ⊗ صدر مقام اور بھارت کا سب سے بڑا شہر، جو خلیج بنگال سے تقریباً ۸۰ میل کے فاصلے پر دریائے گنگا کی ایک شاخ ہگلی (جس میں بڑے بڑے جہاز بھی چل سکتے ہیں) کے بائیں، یعنی مشرقی کنارے پر واقع ہے ۔ ریل اور سمندر کے ذریعے آمد و رفت کا مرکز اور یورپ اور مشرق بعید کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے دنیا کی مصروف ترین بندرگاہوں میں سے ہے ۔ ہندوستان کی سمندر پار کے ممالک سے تجارت کے تقریباً ۵/۷ حصے میں کلکتہ اور بمبئی شریک ہیں، جس میں بڑا حصہ کلکتے کا ہے ۔ ملک بھر کے کارخانوں کی تقریباً ایک تہائی منظم صنعت اس کے گرد و نواح میں قائم ہے ۔ یہاں بہت بڑا بین‌الاقوامی ہوائی اڈا ہے ۔ [خاص کلکتے کا رقبہ ۴۰ مربع میل (تقریبا ۱۰۰ مربع کیلومیٹر) ہے، آبادی ۱۹۷۱ء میں ۷۰۰۵۳۶۲ تھی ۔ کلکتے کے بڑے نواحی شہر ہوڑہ، بڑا نگر، جنوبی ڈم ڈم، بہالہ اور گارڈن ریچ ہیں ۔ اس تمام علاقے کا رقبہ ۵۰۰ مربع میل تقریباً ۱۳۰۰ مربع کیلومیٹر ہے جو دراصل کلکتے ہی سے ملحق ہے ۔ کلکتے کا ان شہروں سے دریائے ہگلی کے دو پلوں،

ھوڑہ پل اور بالی پل کے ذریعے رابطہ قائم ہے ایک تیسرا پل بھی زیر تجویز تھا (۱۹۷۳ء)] .

موجودہ دور کے اس گنجان دارالملک کا آغاز سترھویں صدی کے اواخر میں کچّے گھروں والے تین گاؤں کے مجموعے سے ہوا ۔ کلکتے کا ذکر سب سے پہلے ویر داس کی بنگالی نظم "منسا ۔ وجَیہ" (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا متن، ۱۴۴) میں پایا جاتا ہے، جو ۱۴۹۵ء میں لکھی گئی تھی، لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ حصّہ جس میں کلکتے کا حوالہ ہے، بعد میں بڑھایا گیا ہو ۔ قطعیت کے ساتھ کلکتے کے متعلق پہلا بیان آئین اکبری (لکھنؤ کا متن، ii، ۶۲) میں ہے جو ۱۵۹۶ء کے لگ بھگ مرتب ہوئی ۔ اس میں کلکتے کا ذکر شہنشاہ اکبر کے زیر نگیں گاؤں کی سرکار کے ایک مالیہ گزار گاؤں کی حیثیت سے کیا گیا ہے ۔ شہر کی بنیاد تقریبًا ایک صدی بعد ۱۶۹۰ء میں رکھی گئی ۔ انگریزی تاجروں کو جو تقریباً پچاس سال سے بنگال میں آئے ہوئے تھے کسی مورچہ بند جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ ۱۶۸۶ء کے بعد Job Charnock کی زیر ہدایت آباد ہونے کی دو ناکام کوششیں کرنے کے بعد بالآخر ۲۴ اگست ۱۶۹۰ء کو موجودہ کلکتے کے شمالی حصے "سوتانت" میں آباد ہو گئے ۔ ۱۶۹۶ء میں انگریزوں کو قلعہ بنانے کی اجازت مل گئی ۔ دو سال بعد انھوں نے شہنشاہ اورنگ زیب کے پوتے شہزادہ (بہ تصحیح) عظیم الشان سے سوتانت (شمال) کلکاتا (وسط) اور گووند پور (جنوب) کے تین گاؤں کرایہ پر لینے کی اجازت حاصل کر لی ۔ جدید کلکتہ انھیں تین مواضع کے گرد پھیلا ۔ ۱۷۰۷ء میں اسے ایک علٰحدہ پریذیڈنسی Presidency (= احاطہ) کا مرکز بنا دیا گیا ۔ ۱۷۱۷ء میں انگریزوں کو مغل بادشاہ فرخ سیر سے اس آبادی کے نواح میں ۳۸ گاؤں خریدنے کی اجازت مل گئی ۔ ان میں سے بعض کے نام اب بھی شہر کے محلوں کے ناموں میں موجود ہیں [انگریزوں کو تین ہزار روپے سالانہ کی ادائی پر تجارت کرنے کی آزادی بھی مل گئی کمپنی کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے] جون ۱۷۵۶ء میں نواب بنگال سراج الدّولہ نے اس پر قبضہ کر لیا اور اپنے عارضی قبضے کے دوران میں اس کا نام علی نگر رکھا ۔ جدید کلکتے کا آغاز ۱۷۵۷ء سے ہوتا ہے جب کہ پلاسی کی جنگ (ماہ جون) کے بعد انگریز عملی طور پر بنگال کے مالک ہو گئے ۔ پرانے قلعے کو ترک کر دیا گیا اور [لارڈ] کلائیو نے گووند پور کے مقام پر موجودہ فورٹ ولیم کی تعمیر شروع کی ۔ ۱۷۷۲ء میں صوبے کا خزانہ مرشد آباد سے کلکتے منتقل کیا گیا اور ۱۷۷۳ء میں کلکتہ برطانوی ہندوستان کا سرکاری صدر مقام بن گیا ۔ اس وقت سے ۱۹۱۱ء تک یہ ہندوستان، نیز بنگال کا اور ۱۹۴۷ء تک صوبۂ بنگال کا دارالحکومت رہا .

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے بنگال کو دو حصوں (مغربی اور مشرقی بنگال) میں تقسیم کر دیا اور ڈھاکے کو مشرقی بنگال اور آسام کا دارالسلطنت مقرر کر دیا ۔ ۱۹۱۲ء میں حکومت انگلشیہ کا دارالسلطنت دہلی میں منتقل ہو گیا .

انیسویں صدی میں انگریزوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اقتصادیات نے جغرافیائی تبدیلیوں کی وجہ سے جو صورت اختیار کی اس سے کلکتے اور نواحی شہروں کو بہت فائدے پہنچے ۔ بڑی بڑی آبادی والے علاقوں تک بحری راستے بنائے گئے ۔ زراعت کو ترقی دی گئی ۔ خام پیداوار [illegible]ن، چائے اور نیل کی برآمد ہونے [illegible] مشرقی [حالیہ بنگلہ دیش] کی پٹ سن تو [illegible]

دروازوں پر تھی، اس لیے یہ شہر پٹ سن کی برآمد کا اہم مرکز بن گیا - اب کلکتہ بہت بڑا صنعتی اور تجارتی مرکز ہے - یہاں پٹ سن روئی اور دوسرے اہم خام مال کے بڑے بڑے کارخانے ہیں - ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور پاکستان عالم وجود میں آیا تو تقریباً ۸۰ فی صد پٹ سن کا رقبہ مشرقی پاکستان میں آ گیا - انجینئرنگ اور دھات سازی کی صنعتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں - ہر قسم اور ہر سائز کے کارخانے کلکتے اور مضافات میں پائے جاتے ہیں - مشینوں کے پرزے بنانے والے کارخانے بھی قائم ہیں - شہر کی مالیات کا انحصار تجارت پر ہے - بھارت کی ۲۵ فی صد درآمد اور ۴۰ فی صد برآمد کلکتے ہی کی بندرگاہ سے ہوتی ہے - اس لحاظ سے کلکتہ غیر ملکی زر مبادلے کا بڑا ذریعہ ہے .

کلکتے میں تین بڑی یونیورسٹیاں ہیں - (۱) کلکتہ یونیورسٹی؛ (۲) جداد پور یونیورسٹی اور (۳) رابندر بھارتی یونیورسٹی - کلکتہ یونیورسٹی کے تحت ۵۰ کالج ہیں - یہ بھارت کا اہم ثقافتی مرکز بھی ہے - تین متذکرہ یونیورسٹیوں کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، بنگیہ سہتہ پریشاد، راما کرشنا مشن انسٹی ٹیوٹ آف کلچر، اکیڈیمی آف فائن آرٹس، برلا اکیڈیمی آف آرٹ اینڈ کلچر، مہا بودھی سوسائٹی، خانۂ فرہنگ ایران اور کلکتہ ہسٹاریکل سوسائٹی بھی وہ تنظیمیں ہیں جو تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں .

کلکتہ ویسے تو برطانوی دور حکومت کی پیداوار ہے، لیکن مسلمانوں کی معاشرت کا بھی ایک اہم مرکز ہے - یکم مارچ ۱۹۵۱ء کو کلکتے کے شہر میں مسلمانوں کی آبادی ۳۰۵۹۳۲ تھی - کلکتے کے عین قریبی مضافات ہوڑہ اور گارڈن ریچ کو ملا کر یہاں کے مسلمانوں کی آبادی مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے صدر مقام اور مسلمانوں کی سرگرمیوں کے تاریخی مرکز ڈھاکے کی آبادی کے قریب قریب برابر تھی - ۱۹۵۱ء کی مردم شماری سے پہلے تقریباً ۳۱۰۰۰ مسلمان غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر کلکتے کو چھوڑ کر چلے گئے تھے- یہ شہر یعنی کلکتہ مسلم ثقافت کا ایک اہم مرکز ہے - "کلکتہ مدرسہ" کی بنیاد وارن ہیسٹنگز نے علوم اسلامیہ کے فروغ کے لیے ۱۷۸۱ء میں رکھی - اس کے پرنسپلوں میں H. Blochmann اور Sir E. Devisor Ross ایسے معروف علماے اسلامیات بھی ہوے - ایشیاٹک سوسائٹی میں جو ۱۷۸۴ء میں قائم ہوئی، ۶۰۰۰ سے زائد عربی اور فارسی کے خطی نسخے موجود ہیں اور اسے مسلم تاریخ اور ثقافت سے متعلق بڑی تعداد میں گرانمایہ کتابیں شائع کرنے کا فخر حاصل ہوا .

نیشنل لائبریری کے بُوہار مجموعے میں عربی اور فارسی مخطوطات کی معقول تعداد موجود ہے - ہندوستان کے ممتاز مؤرخ سر جادو ناتھ سرکار کے قیمتی مجموعے کا بھی اس میں اضافہ ہو گیا ہے - انڈین میوزیم اور وکٹوریہ میموریل میں ہندی مسلم تصویروں کے چند نایاب اور حسین نمونے نظر آتے ہیں - کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامیات سے متعلق دو پوسٹ گریجویٹ شعبے قائم ہیں - (۱) عربی اور فارسی اور (۲) اسلامی تاریخ اور ثقافت - کلکتے ہی میں ٹیپو سلطان کے بیٹے اور اودھ کے آخر حکمران واجد علی شاہ (م ۱۸۸۷ء) رہتے تھے - مسلمانوں کی یادگار عمارتوں میں صرف ایک فن تعمیر کے اعتبار سے اہم ہے اور وہ ایک مسجد ہے جو دھرم تلہ سٹریٹ میں واقع ہے - اسے ٹیپو سلطان کے لڑکے شہزادہ غلام محمد نے ۱۸۴۲ء میں تعمیر کرایا تھا - سب سے پرانی

عمارتیں نیم تلہ کی مسجد (جو ۱۷۸۶ء کے کچھ عرصے بعد تعمیر ہوئی)؛ چت پور میں واقع بھرنسر شاہ کی مسجد اور مقبرہ (۱۸۰۴ء) اور لیتا جی سبھاش (کلائیو) سٹریٹ میں واقع جمعہ شاہ کا مقبرہ (۱۸۰۸ء) ہیں .

مآخذ : (۱) غلام حسین سلیم : ریاض السلاطین، کلکتہ ۱۸۹۰ - ۱۸۹۸ء؛ (۲) C. R. Wilson : *Early Annals of the English in Bengal*، جلد ۳ ، کلکتہ ۱۸۹۶ - ۱۹۱۷ء؛ (۳) وهی مصنف : *Old Fort William in Bengal*، ۲ جلدیں، لنڈن ۱۹۰۶ء؛ (۴) *List of Ancient Monnments*، کلکتہ، بنگال سیکرٹریٹ پریس ۱۸۹۶ء؛ (۵) A. K. Ray : *A Short History of Calcutta*، کلکتہ ۱۹۰۲ء : (۶) H.E.A. Cotton : *Calcutta old and new*، کلکتہ ۱۹۰۷ء ؛ [(۷) مکرجی : *The port of Calcutta : A short History*، ۱۹۶۸ء؛ (۸) P. Sinha : *Bengal, Past and Present*، *The City as a physical Entity*، ۱۹۷۰ء؛ (۹) انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا ، ۱۹۷۳ء] .

(SUKUMAR RAY [و ادارہ])

* **کِلّز :** شمالی شام کا ایک قصبہ، جو حلب اور عین تاب کے درمیان واقع ہے ۔ بظاہر آشوری بھی اس سے واقف تھے، کیونکہ خطِ میخی کے ایک کتبے (Harper ۱۰۳۷ ، موزۂ بریطانیہ، K ۷۳۰ ، ۱۳، .Obv ۳) میں ایک قصبہ ک ۔ ل ۔ ز کا ذکر ملتا ہے ۔ رومیوں کے زمانے میں یہ قصبہ *Ciliza sive Urmagiganti* کے نام سے مشہور تھا (*Itin. Ant.*، طبع Pinder-Parthey ، ص ۸۳) ۔ ازمنۂ قدیم میں یقیناً یہ بالکل معمولی سا مقام ہوگا ۔ یاقوت کلّز (وہ اسے یونہیں لکھتا ہے) کے بارے میں بتاتا ہے کہ یہ عزاز کے ناحیہ کا ایک گاؤں ہے ۔ باقی عرب جغرافیہ نویسوں نے اس کا بالکل تذکرہ نہیں کیا ۔ جدید شہر کی آبادی ۲۰ ہزار کے قریب ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد ۱۵ ہزار ہے (Cuinet ۱۸۹۱ء)، عرب اب تک اسے کلّز ہی کہتے ہیں اور ترک کلیس ۔ M. Hartmann کے خیال میں قدیم کلز، موجودہ ترزمہ خاں (موجود کلز کے مغرب، جنوب مغرب میں، ایک گھنٹے کی مسافت پر) کے محل و قوع پر واقع تھا، جہاں اب بھی بڑے بڑے پتھر ملتے ہیں ۔ دوسری طرف روایت یہ چلی آتی ہے کہ (کلز سے ۲۰ منٹ کی مسافت پر مشرق میں) الزی باغچسی نامی چھوٹا سا باغ اس قصبے کا یا اس کے کچھ حصے کا محل و قوع تھا کیونکہ فرض کیا جاتا ہے کہ کلز کا نام ''الزی'' کی صورت میں باقی رہ گیا ہے ۔ یہاں، یعنی الزی میں کسی قدیم قصبے کا مقام ہونے کے آثار بھی پائے جاتے ہیں .

مآخذ : (۱) یاقوت : معجم ، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۱۵۸، ۲۲۹ : (۲) صفی الدّین : مراصد الاطّلاع، طبع Juynboll، ۲ : ۴۰۸؛ ۵۰۸: (۳) یحیٰی بن سعید الانطاکی، طبع Rosen، ص ۱۷، س ۴؛ (۴) *Zapiski Imp. Akad. Nauk*، ۱۸۸۳ء، ۴۴ : ص ۱۶۶ و ۱۷۱ ببعد : (۵) Le Strange : *Palestine under the Moslems*، ۱۸۹۰ء، ص ۴۸۶؛ (۶) M. Hartmann : *Zeitschr. Gesellsch. f. Erdk. Berlin*، ۱۸۹۴ء، ۲۹ : ۴۸۵؛ (۷) *M.V.A.G.*، ۱۸۹۶ء، ص ۱۰۶ (بار دوم، ص ۲۲)؛ (۸) Barthélemy : *Recueil de travaux rel. à la philol. èt a l'archéol. égypt. et assyr.*، ۱۸۹۷ء، ص ۴۳ (اس میں غلطی سے کلّز اور قدیم کیّر ھوس Kyrrhos کو ایک ہی شہر بتایا گیا ہے)؛ (۹) Cuinet : *La Turquie d' Asie*، ۲ : ۱۸۵ ببعد: (۱۰) R. Hartmann : *Geogr. Nachrichten über Palästina u. Syrien in Ḫalil az-Zāhirīs Zubdat-u-Kašf al-Mamālik*، (در خلیل الظاهری : زبدۃ کشف الممالک)، (مقالہ Tubingen) Diss. Tubingen، ۱۹۰۷ء، ص ۶۳،

حاشیہ ۱؛ (۱۱) Meissner، در *Z. A.*، ج ۲۷، ۱۹۱۲ء، ص ۲٦٦؛ (۱۲) Cumont : *Études Syriennes*، پیرس ۱۹۱۷ء، ص ۲۵۷ ببعد.

(HONIGMANN)

⊗ **کَلِمَة** : کَلْم (ک ل م) سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی اس تاثیر کے ہیں جس کے اثر کا ادراک دو حاسوں (سامعہ یا باصرہ) میں کسی ایک کے ذریعے سے کیا جا سکتا ہو، چنانچہ اس سے کلام [رک باں] بھی مشتق ہے اور اسی سے کلم بمعنی جراحت (زخم) بھی آیا ہے۔ اول الذکر کا ادراک، حاسۂ سمع اور مؤخر الذکر کا، حاسۂ بصر سے ہوتا ہے۔ اس ایک مادّۂ لغوی میں ہر دو معانی کے جمع ہو جانے سے عرب شعرا نے استفادہ کیا ہے، مثلاً یہ ایک مصرع ملاحظہ ہو : ع : وَالْکَلِمُ الأَصِیْلُ کَأَرْغَبِ الْکَلِمِ [یعنی دل میں لگ جانے والی باتوں کی تاثیر وسیع تر زخموں کی طرح ہوتی ہے]۔ یہاں پہلا کلم الفاظ یا کلام کے معنی میں اور دوسرا، جراحات کے معنی میں استعمال ہوا ہے (راغب الاصفہانی : مفردات، بذیل مادّہ)۔ کلم اور اس کے مشتقات، احادیث و آثار میں بمعنی جراحت بھی استعمال ہوے ہیں، ابن الأثیر نے اس ضمن میں یہ حدیث نقل کی ہے : إِنَّا نَقُومُ عَلَی الْمَرْضٰی وَ نُدَاوِی الْکَلْمٰی؛ آخری لفظ (الْکَلْمٰی) کی توضیح یوں کی ہے : ھو جمع کَلِیْم و ھُوَ الجَرِیح، فَعِیل بمعنی مَفْعُول . . . . . (ابن الأثیر : النہایۃ فی غریب الحدیث و الأثر، بذیل مادّۂ کلم)، [یعنی ہم بیماروں کی دیکھ بھال کرتے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے ہیں]۔

لغت اور نحو کی اصطلاح میں کلمہ کا اطلاق بالعموم مفرد لفظ پر ہوتا ہے۔ بمقابلۂ کلام، اس کا اطلاق جملۂ مرکّبۂ مفیدہ پر ہوتا ہے (راغب : کتابِ مذکور)۔ علماے لغت کے ہاں، کلمہ کا اطلاق حروف تہجّی میں سے کسی ایک حرف پر بھی ہوتا ہے، نیز با معنی لفظ واحد (حروف تہجّی سے مرکب) پر بھی۔ اسی طرح پورے قصیدے اور خطبے کو بھی کلمہ کہہ دیتے ہیں۔ لسان میں ہے : والکَلِمَۃ تقع علی الحرف الواحد من حروف الهجاء و تقع علی لفظۃ مؤلفۃ من جماعۃ حروف ذات معنی و تقع علی قصیدۃ بکمالها و خطبۃ بأسرها یقال "قال الشاعر فی کلمتہ" ای فی قصیدتہ قال الجوهری الکلمۃ القصیدۃ بطولها (لسان العرب، بذیل مادّہ)۔ تاہم علمِ النّحو کی اصطلاح میں کلمہ اس لفظ کو کہتے ہیں جو معنی مفرد کے لیے وضع کیا گیا ہو، اور اس کا اطلاق، اسم، فعل اور حرف پر ہوتا ہے : الکَلِمَۃُ لفظٌ وُضِعَ لمعنی مفرد وهی اسم و فعل و حرف (ابن الحاجب : الکافیۃ، ص ۱).

عُرف شرعی میں کلمۂ طیّبہ سے کلمۂ توحید (و رسالت) مراد لیا جاتا ہے : وَ فی الشّرع الکَلِمَۃُ الطّیِّبۃُ اعنی لا إِلٰه الّا اللّٰہ محمدٌ رسولُ اللّٰہ (عبدالنّبی احمد نگری : دستور العلماء، ۳ : ۱۲۹؛ نیز دیکھیے تھانوی : کشّاف اصطلاحات الفنون، ۵ : ۱۲٦۷، بذیل مادّۂ کلمہ)، جہاں بتایا گیا ہے کہ خطبے اور قصیدے کے علاوہ کلمۂ شہادت پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے) اس کی تائید الفرّاء کی تالیف معانی القرآن سے بھی ہوتی ہے جو دوسری صدی ہجری کے اواخر میں لکھی گئی۔ موصوف وَ جَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا السُّفْلٰی ط وَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ هِیَ الْعُلْیَا ط (۹ [التوبۃ] : ۴۰) کی تفسیر میں لکھتے ہیں : و کلمۃُ الّذین کفروا الشرکُ باللّٰہ و کلمۃُ اللّٰہ قولُ لَا إِلٰهَ اللّٰہ (الفرّاء : معانی القرآن، ۱ : ۴۳۸).

قرآن مجید کی آیات میں لفظ کلمۃ (نیز کلمات اور کَلِم) جن معانی اور مفاہیم کے لیے استعمال ہوا ہے اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے حوالۂ مذکور،

۱ : ۲۲۰ و ۳۸۴؛ ۳ : ۸ و ۳۱، ۶۶، ۶۸ (نیز فہرست مندرجات کی مدد سے جو ہر جلد کے آخر میں ملحق ہے)، الدامغانی، اصلاح الوجوہ و النظائر فی القرآن الکریم، بذیل مادّہ؛ راغب الاصفہانی : مفردات القرآن، بذیل مادّہ (ان مصادر میں وہ متعدد آیات قرآنی نقل کی گئی ہیں جن میں لفظ کلمہ یا اس کے مشتقات استعمال ہوے ہیں اور ان کے معانی کی طرف اشارے کر دیے گئے ہیں۔ ان مصادر کی رو سے لفظ کلمہ، مختلف آیات میں کلام (جملۂ مفیدہ یا طویل گفتگو)، قضیہ، حجّت، حکم شرعی، وعدۂ خداوندی (متعلق بہ انعام یا عقوبت)، آیت (معجزہ)، مشیت خداوندی، قرآن، دین (الاسلام)، قول لا الٰہ الّا اللّٰہ، عجائبات قدرت (عجائب الصنع) اور حضرت عیسٰی علیہ السلام پر بولا گیا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت عیسٰیؑ کو کلمۃ اللّٰہ کہا گیا ہے (۳ [اٰل عمرٰن] : ۳۹، ۴۵؛ ۴ [النسآء] : ۱۷۱)۔ امام راغب نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ براہ راست کلمۂ کُن سے پیدا کیے گئے : وتسمیۃُ عیسٰی بکلمۃ . . . لکونہ موجدًا بکن المذکور فی قولہ انّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ط خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُO (راغب : مفردات، مادۂ کلمۃ)۔ راغب نے اس کی دیگر وجوہ بھی بیان کی ہیں اور لسان میں بھی حضرت عیسٰی کے "کلمۃ اللّٰہ" کہلانے کی توجیہات درج ہوئی ہیں (لسان العرب، بذیل مادّہ)۔

احادیث نبویہ سے بھی کلمہ (یا کلمات) کے مختلف مفاہیم معلوم ہوتے ہیں؛ چنانچہ حدیث "اَعوذُ بکلماتِ اللّٰہ التّامّات" میں ابن الاثیر نے کلمات اللّٰہ التامات کا مفہوم، قرآن نقل کیا ہے اور حدیث نساء، یعنی "اِسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بکلمۃِ اللّٰہ" کی شرح میں دو قول نقل کیے ہیں : (۱) اس حدیث میں کلمۃ اللّٰہ سے وہ حکم خداوندی مراد ہے جو آیت فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ ط (۲ [البقرۃ] : ۲۲۹) میں مذکور ہوا؛ (۲) قانون اباحت ازدواج، (ابن الأثیر : النہایۃ، بذیل مادّہ)۔ بخاری کی حدیث میں وِرد کے طور پر پڑھے جانے والے دو جملوں کے لیے کَلِمَتَان کا لفظ آیا ہے (البخاری : الصحیح، دیکھیے آخری حدیث : کَلِمَتَان حَبِیْبَتَان . . . . الحدیث)۔

علم المنطق کی اصطلاح میں کلمۃ وہ مفرد لفظ ہے جو اپنے صیغے اور وزن (کی شکل مخصوص) سے معنی اور زمانے پر دلالت کرتا ہو : و عند المنطقیین هی اللّفظ المفرد الدّالُّ علٰی معنی و زمان من الازمنۃ الثلاثہ بصیغتہ و وزنہ (تھانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، بذیل مادّہ کلمہ)، گویا علماے نحو کے نزدیک جسے "فعل" کہا جاتا ہے اہل منطق نے اسے کلمۃ کہا ہے اور پھر کلمے کی دو قسمیں بیان کی ہیں، حقیقیّہ اور وجودیّہ (تفصیل کے لیے تھانوی کی کشاف اصطلاحات الفنون کے علاوہ دیکھیے، عبدالنبی احمد نگری : دستور العلماء، ۳ : ۱۲۹، ۱۳۵)۔

اہلِ تصوف کی اصطلاح میں لفظ کلمہ (کلمات) ایک الگ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے؛ ان کے ہاں ان " اعیان ثابتہ " کو کلمات کہا جاتا ہے جو تحت الایجاد علم الٰہی میں داخل ہوں۔ تھانوی نے اسے یوں بیان کیا ہے : و عند اهل التّصوف عَینٌ من الاعیان الثّابتۃ فی العلم الالٰہی الداخلۃ تحت الایجاد (تھانوی بذیل مادّۂ کلمہ)۔ عبدالکریم الجیلی نے اپنی کتاب الانسان الکامل میں کہا ہے : کلمات وہ حقائق مخلوقات عینیّہ ہیں جن کا تعین عالم شہود میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ تھانوی نے الجیلی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں : فی الانسان الکامل فی باب ام الکتاب " الکلمات عبارۃ

عن حقائق المخلوقات العینیة اعنی المتعیّنة فی العالم الشهادی" انتہی - (تہانوی بذیل مادّۂ کلمة) - تہانوی هی نے، صدر الدّین قونوی کی جو عبارت بحث کلمه سے متعلق نقل کی هے، وہ نسبةً زیادہ مفصّل اور فکر انگیز هے - القونوی کے خیالات کا لُبّ لباب یہ هے کہ احاطۂ علم الٰہی میں هر شے کی معلومیت کی ایک صورة هے، جسے مرتبۂ حرفیت پر متصور کیا جاتا هے اور جب معلومیت شی کو مرتبہ کتابت میں داخل کر دیا جاتا هے، یعنی حق تعالٰی نور وجودی ذاتی کا پرتو اس پر ڈال دیتا هے (یہ عمل ایک عقلی و معنوی حرکت پر مبنی هے جو شان الٰہی کا مقتضا هے) تب یہ صورة معلومیت شی جس کی تکوین ارادۂ الٰہی میں شامل هو جاتی هے، کلمة کہلاتی هے - القونوی نے حضرت عیسٰیؑ کو کلمہ قرار دینے اور جملہ موجودات کو لفظ کلمات کے ساتھ پکارنے کی توجیہ اپنے مذکورۂ بالا تصور کے ماتحت کی هے - اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ (۳۵[فاطر] : ۱۰) کی تاویل، القونوی نے ارواح طاهرہ سے کی هے، (کلمة بحیثیت اصطلاح صوفیہ کی مزید توضیح کے لیے دیکھیے تہانوی : کشّاف اصطلاحات الفنون، بذیل کلمة و کلام) - نصارٰی کی اصطلاح میں "کلمة" صفت علم کا نام هے جو اقانیم ثلثه (یعنی صفات باری : علم، وجود، حیٰوة - وجود "اب" (باپ) هے، حیٰوة "روح القدس" هے اور علم "کلمة" هے) میں سے ایک هے (کتاب مذکور، بذیل مادّۂ اقنوم (ق ن م) اور بذیل مادۂ کلمة) .

مآخذ : (۱) قرآن مجید ؛ (۲) محمّد بن اسمٰعیل البخاری : الجامع الصحیح، قاهره ۱۳۱۵ھ؛ (۳) الفرّاء : معانی القرآن، قاهره ۱۹۵۵ء، ج ۱ : ۳؛ (۴) ابن الأثیر : النهایة فی غریب الحدیث و الاثر، قاهره ۱۳۲۲ھ، ج ۴؛ (۵) راغب الاصفہانی : مفردات القرآن؛ (۶) ابن منظور : لسان العرب، قاهره ۱۳۰۳ھ؛ (۷) ابن حاجب : الکافیة (فی النحو)، دہلی، ۱۹۲۹ء؛ (۸) الدامغانی : اصلاح الوجوه و النظائر فی القرآن الکریم، بیروت ۱۹۷۰ء؛ (۹) تہانوی : کشّاف اصطلاحات الفنون، کلکته ۱۸۶۲ء؛ (۱۰) عبدالنبی احمد نگری : دستور العلماء، حیدرآباد دکن .

(عبدالنبی کوکب)

* **کِلْوَه** : یہ نام ساحل مشرقی افریقہ کے متعدد مقامات اور جزائر کے ساتھ مربوط هے، لیکن آج کل اس سے بالعموم علاقۂ ٹانگا نیکا کا ایک ضلع مراد هوتا هے اور بالخصوص دو بندرگاهوں کا نام هے : (الف) کِلوہ کونجہ، جو دارالسّلام (۲۰ درجے ۵۴ دقیقے) سے ۱۳۳ میل جنوب کی جانب کِلوہ کے شمال میں براعظم پر واقع هے - یہ ایک بندرگاہ هے جس میں خوش منظر باغات اور یورپین لوگوں کے بہت سے مکانات هیں - یہ جھیل نیاسا کی طرف جانے والی کاروانی شاہ راہ کا مقام آغاز هے - اس کی آبادی تقریباً پانچ هزار هے اور ان میں اکثر سواحلی هیں .

اور (ب) کلوہ کسونی جو دارالسّلام سے ۱۵۰ میل جنوب مغرب کی طرف (۸ درجے ۵۸ دقیقے) اور زلجبار [زنگ بار] سے تقریباً ۲۰۰ میل جانب جنوب واقع هے - تاریخی لحاظ سے کِلْوَہ کسونی زیادہ اهم هے - یہ ایک چھوٹے سے جزیرے پر واقع هے اور اس کے قرب میں دیواروں، محلات کی عمارتوں، قلعوں اور مساجد کے کثیر التعداد آثار موجود هیں جو عربی دور کی اور اس کے بعد پرتگیزی قبضے کی یاد تازہ کرتے هیں - ابن بطّوطه جو اس قصبے میں گیا تھا، اسے "کُلوا" لکھتا هے - اس کا محل و قوع اس قدیمی شہر کے نزدیک تھا جسے مستند جغرافیه دان (دیکھیے *R.E.* : Pauly-wissowa، بذیل مادّہ Pxioi) راپٹه Rhapta کا نام دیتے هیں .

بیان کیا جاتا هے کہ جزیرہ کِلْوَہ کے اوّلین

مسلم آباد کار حضرت زیدؓ کے متبعین تھے جو "اُمّۃ زیدیہ، مشہور ہیں (Emozaidij، در De Barros)۔ یہ تقریباً ۱۲۲ھ/۷۳۹ء میں تھے۔ ان کے اخلاف کو ۳۶۵ھ/۹۷۵ء میں ایک شیرازی خاندان کے بانیوں نے یہاں سے بے دخل کیا۔ یہ خاندان پرتگیزوں کی ۱۵۰۰ء میں آمد تک یہاں حکمران رہا (اس کے حکمرانوں کی تعداد ۴۹ ہے)۔ ان کا حلقہ اقتدار و حکومت اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں شمال میں زنجبار تک اور جنوب کی جانب سوخالہ کی کانوں تک جس میں جزائر پمبہ و مافیہ (جسے Mofia de Barros کہتا ہے) شامل ہیں، پھیلا ہوا تھا۔ اس طرح کلوہ ایک معنے میں "سلطنت زنج [زک بآن] کے دارالحکومت کی حیثیت رکھتا تھا۔ براعظم سے اس جزیرے کو ایک پایاب رودبار جدا کرتی ہے۔ کلوہ کی قدیم رونق و عظمت کا انداز اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جب پرتگیز یہاں آئے ہیں تو یہاں پر تین سو مساجد موجود تھیں۔ ۱۵۰۵ء میں جب ابراھیم سلطان کلوہ (Mir Hahraemo De Barros) نے خراج دینے سے انکار کیا تو (Don Framisco d Almeyda) نے کلوہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جو کشمکش عربوں اور یورپی حملہ آوروں میں ہوئی اس کی وجہ سے یہ قصبہ تباہ ہو گیا۔ اور ۱۵۱۲ء میں عارضی طور پر بالکل خالی کر دیا گیا۔ سترھویں صدی میں یہ سلاطین مسقط کے قبضے میں آیا اور ۱۸۵۶ء میں اس پر سلطان زنجبار نے قبضہ جما لیا، ۱۸۹۰ء میں یہ جرمنوں کے ہاتھ لگ گیا، لیکن جنگ عظیم کے بعد سے اسے علاقۂ ٹانگا نیکا میں شامل کر دیا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) J. de Barros : *Asia*، حصۂ اوّل، ۸ : ۴ ببعد؛ (۲) شیخ محی الدّین زنجباری کی مرتّبہ عربی تاریخ کلوہ، (*Arabic History of Kilwa*) (مخطوطات موزہ بریطانیہ، عدد *Or* ۲۶۶۶) اور مرتبہ، در *JRAS* ۱۸۹۵ء، ص ۳۸۵ تا ۴۳۰ مع ایک خلاصہ اور حواشی از قلم S. Arthur-Strong؛ ان دو مآخذ کے موازنے کے لیے اور مسکوکات کے متعلق مواد: (۳) کے لیے دیکھیے J. Walker : *The Coinage of Kilwa Numismahi Chronicle*، ۱۹۳۶ء، ص ۴۳ تا ۸۱؛ (۴) Sir Richard Burton : *Zanzibar*، ۲ : ۳۹۴ ببعد؛ (۵) Guillain : *Documents sur L'histoire la geographie et If commerce de l' Afrique Orientale*، پیرس ۱۸۵۶ء، ۱ : ۱۷۷ ببعد؛ (۶) O. Kerston : *Tabellarische Ubersicht der Geschichte Ostafrikas*، لائپزگ ۱۸۷۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۷) J .Strandes : *Die Portugiesenzeit von Deutsch-und Englisch-Ostafrika*، برلن ۱۸۹۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۸) C. P. Rigby : *Report on the Zanzibar Dominions*، بمبئی ۱۸۶۱ء؛ (۹) A. M. H. J. Stokvis : *Manuel d' Histoire*، لائیڈن ۱۸۸۸ء، ۱ : ۵۵۸؛ (۱۰) Zambaur : *Manuel de Généalogie*، ھانوور ۱۹۲۷ء، ص ۳۰۹؛ (۱۱) Rieu : *Cat. Arabic MSS. Suppl.*، ص ۳۹۱ تا ۳۹۲؛ (۱۲) *Geographical Journal*، ۱۹۱۷ء، ص ۱۱۸؛ (۱۳) ابن بطوطہ (ترجمہ Defrémery و Sanguinetti) ۲ : ۱۹۱ ببعد؛ (۱۴) یاقوت : معجم، بذیل مادہ؛ (۱۵) G. Ferrand، در *J. A.* ۱۹۲۰ء، ص ۲۲ و ۶۹ ببعد، ۲۳۳؛ (۱۶) وہی مصنف : *Textes relatifs à l' extrême orient*، ص ۳۳۶ تا ۳۳۸ و ۵۳۶؛ (۱۷) W.F.W. Owen : *Narrative of Voyages.*، لنڈن ۱۸۳۳ء، ۲ : ۲ ببعد؛ (۱۸) Carlo Conte Rossini، در *Atti del Terzo Congresso Geogr. Italiano*، فلارنس ۱۸۹۹ء، ۲ : ۹۱ تا ۵۰۰؛ (۱۹) C. H. Becker : *Materialien Zur Kenntnis des Islam in Deutsch Ostafrika* در *Der Islam*، ۲ : ۹؛ (۲۰) Hobson Jobson : *Sub Quilra*؛ (۲۱) Admiralty : *Handbook of*

German East Africa، ص۱۸۵؛ (۲۲) F.B. Pearce : *Zanzibar*، ۱۹۲۰ء، ص ۱۴ تا ۳۴ و ۹۳ تا ۹۶ .

(J. Walker [تلخیص از ادارہ [ژ]، اردو])

* **کَلَہ** : (نیز کَلاہ، کَلّا، کِلا اور کِلّہ) ازمنۂ وسطی کے عرب جغرافیہ نویسوں کے نزدیک یہ ایک جزیرے یا جزیرہ نما کا نام تھا جو عرب، ہندوستان اور چین کے درمیان تجارت اور جہازرانی کے لیے ایک بہت اہم رابطے کا کام دیتا تھا ۔ یہ اپنی ٹین کی کانوں کی وجہ سے خاص طور پر مشہور تھا ۔ اس کے ساتھ ھی اسے کافور، بانس، ایلوا، ھاتھی دانت وغیرہ کی تجارت کا مرکز بھی بتایا گیا ھے ۔ اس کا دارالحکومت بھی اسی کی طرح کلہ کے نام سے مشہور تھا، دیکھیے بطور مثال الدمشقی، ص ۱۵۲، س ۱۱، ۱۷۰، س ۱؛ النویری (در A.V. d. Lith)، کتاب مذکور (ذیل میں مآخذ دیکھیے)، ص ۲۸۱ ۔ سمندر کا جو حصہ اس علاقے کے ساحل سے ٹکراتا ھے جس میں جہازرانی بہت مشکل بتائی گئی ھے، اسے بھی اسی کے نام پر ''بحیرۂ کلہ'' کہتے ھیں (دیکھیے المسعودی، ۱ : ۱۰۳، س ۱۰، ۳۴۰، س ۱؛ الدمشقی ص ۱۵۲، س ۱۱، ۱۶۹، س ۲۰) ۔ ہندوستان اور عرب کی تجارت کی تاریخ کے لیے اس علاقے کے صحیح محل وقوع کو سمجھنا بہت ضروری ھے ۔ تاجر سلیمان (اس کا روزنامچہ ۲۳۷ھ/۸۵۱ء میں مرتب ھوا تھا) اور یاقوت کے بیانات کی رو سے اس کا محل وقوع ہند اقصی ھی میں ھونا ممکن ھے ۔ ہند اقصی کے جزیرے اور جزیرہ نما صدیوں تک ٹین پیدا کرنے والے علاقوں کی حیثیت سے خاص طور پر مشہور رھے ھیں، (دیکھیے دریں مادہ Ritter : *Erdkunde*، ۵ : ۲۳، ۲۴، ۲۸، ۳۰، ۷تا ۸۰، ۳۳۸ و ۳۳۹) ۔ چونکہ کلہ کے بارے میں صاف طور پر بیان کیا گیا ھے (مثلاً ابو زید السیرافی، ذیل میں مآخذ دیکھیے) یہ کم از کم کچھ عرصے کے لیے زابج (= جاوا، [رک بہ] A. van der Lith، کتاب مذکور، ص ۲۳۱ ببعد اور مادۂ جاوا، ۲ : ۴۷۵ ببعد) کے بادشاہ کے زیر حکومت تھا، اس لیے اس کا محل وقوع معلوم کرنے کے واسطے سب سے پہلے لازمی ھے کہ ہند اقصی کے جنوب مغربی حصے میں آبنائے ملاکا (Malacca) کے علاقے پر نظر ڈالیں ۔ سماٹرا کا ذکر تو خارج از بحث ھے، اس لیے کہ یہاں ٹین نکلتا بھی ھے تو مقدار میں بہت کم اور گھٹیا قسم کا ۔ جزیرۂ بنگکا (Bangka) بھی جو سماٹرا کے جنوب مشرقی ساحل پر ھے اور کثیر مقدار میں ٹین نکلنے کی وجہ سے آج کل مشہور ھے قابل اعتنا نہیں ھے، کیونکہ اس کی کانیں ۱۷۱۰ء ھی میں دریافت ھوئی ھیں اور اس سے قبل ان کو ٹین نکالنے کی غرض سے کبھی کھودا نہیں گیا (دیکھیے A.v.d. Lith، ص ۲۶۳) ۔ اب ھمارے پاس صرف جزیرہ نمائے ملاکا رہ جاتا ھے اور ھمیں Walckenaer (در *Nouvelles Annales des Voyages*) پیرس ۱۸۵۲، ص ۱۰) کی رائے ماننی پڑتی ھے کہ موجودہ شہر قدہ Quedah (Queda کدہ Kedah، کدّہ Keddah) جو اس جزیرہ نما کے مغربی ساحل پر چھے درجے شمالی عرض بلد پر واقع ھے، وھی مقام ھے جسے عربوں نے کَلَہ لکھا ھے ۔ صوبہ قدہ (Quedah) (دیکھیے دریں بارہ Ritter : *Erdkunde*، ۵ : ۲۰ ببعد)، جس کو دریائے کلنگ (Kalang) سیراب کرتا ھے اور علامات سے معلوم ھوتا ھے کہ ''جزیرہ نمائے'' کلہ کی جائے وقوع کم و بیش یہی ھے اور آج کل بھی ٹین کی تجارت کی گہما گہمی کے باعث ملاکا بھر میں ممتاز ھے ۔ مرکزی شہر کا اصل نام کدہ (موجودہ تلفظ کدہ Kedáh) ھے ۔ Quedah کی یہی توجیہ کی جا سکتی ھے کہ پرتگالی میں بگڑ کر اس کی یہ

صورت هو گئی ہے۔ سیدی علی (۱ : ۲۸۷) کی ترکی کتاب محیط میں جو تقریباً ۱۵۵۴ء میں لکھی گئی، لفظ کیدا ملتا ہے؛ دیکھیے Bittner و Die Topogr. Kapitel des indischen : Tomaschek Seespiegels Mohīt، (وی انا ۱۸۹۷ء)، ص ۸۶، نیز یہاں وہ نقشے بھی دیکھیے جو Tomaschek نے محیط کے بیانات اور پرتگالی مآخذ کی رو سے دوبارہ تیار کیے ہیں (لوحہ ۲۳ و ۲۴)۔ آج کل قدہ (کدہ) ایک گمنام سی جگہ ہے، لیکن گزشتہ زمانے میں یہ ایک بارونق خوب معمور بندرگاہ تھی جسے دیکھنے کے لیے لوگ بہ کثرت آتے رہتے تھے، دریں بارہ دیکھیے Ritter : کتاب مذکور، ص ۲۵ اور A.v.d. Lith، ص ۲۶۱ .

کلہ سے متعلق Walckenaer کی پیش کردہ تشخیص و تطبیق سے A.v.d. Lith، ص ۲۵۹، ۳۰۸؛ de Goeje (در De Gids، ایمسٹرڈم ۱۸۸۹ء، ۳ : ۲۹۷)، Tomaschek، کتاب مذکور، اور G. Le Strange نے حمد اللہ المستوفی کی نزہۃ القلوب (ترجمہ، ص ۳۹۱) میں اتفاق کیا ہے۔ Quatremère (کتاب مذکور، ص ۳۴۷) اور Yule - Burnell، (کتاب مذکور، ص ۳۵۱) اسے قرین حقیقت سمجھتے ہیں، لیکن دونوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کلہ وہی مقام ہو جسے بطلمیوس (Ptolemy) نے Κῶλι لکھا ہے، لیکن نشاندہی کے لحاظ سے اس شہر کی جو جائے وقوع ہونا چاہیے (دیکھیے مادہ Koli، در Pauly - Wissowa : Realenzykl. d. klass. Altertumswiss، ۱۱ : ۱۰۷۵) اس سے اس نظریے کی تردید ہوتی ہے .

یہ مساوات، یعنی کدہ = کلہ بالکل یقینی ہو جاتی ہے جب ہم اس حقیقت کو زیر نظر رکھیں جس پر Kern نے A.v.d. Lith، ص ۳۰۸ میں زور دیا ہے کہ ملائی زبان کا د بہت کچھ ل کی طرح بولا جاتا ہے، اس لیے ملایا والے جب کدہ بولیں گے تو عرب کے کانوں کو وہ کلہ سنائی دے گا، لیکن دوسری طرف یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حال ھی میں G. Ferrand (دیکھیے مآخذ) نے ایسے صوتی تغیّر کے وقوع سے اختلاف کیا ہے جس کی رو سے کدہ کا لفظ کلہ ہو جائے گو بظاہر اس کے مان لینے کو کیسا ھی جی چاہتا ہو۔ اس کی تحقیق کی رو سے کلہ کی اصلیت کبھی کدہ نہیں ہو سکتی بلکہ یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ کلہ اصل میں کیرہ (Kerah)، کرہ Kra (نقشوں میں) ہو جو ملاکا کے جنوب مشرقی حصے میں (۱۰ عرض بلد شمالی کے قریب) واقع ہے [تفصیل کے لیے دیکھیے لۤا، لائیڈن بار اول] .

مآخذ : (۱) سلیمان تاجر کا سفر نامہ، در Reinaud : Relation des Voyages faits par les Arabes et les persans dans l' Inde . . . dans le IXᵉ siécle، (پیرس ۱۸۴۵ء)؛ ۲: متن، ص ۱۸، س ۱۲ ببعد، ۲۲؛ س ۱؛ دیکھیے Voyage du marchand arabe Sulayman en Inde et Chine، مترجمہ G. Ferrand (پیرس ۱۹۲۲ء)، ص ۱۲، ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۹۵ ببعد؛ (۲) ابو زید السیرافی، در Reinaud : کتاب مذکور، ۲ : متن، ص ۹۰ ببعد؛ (۳) سند باد جہاز ران کے سفر، طبع Langlés، در Savary : Gramm. de la Langue Arabe، پیرس ۱۸۱۳، ص ۴۹۹، (علٰحدہ ایڈیشن، پیرس ۱۸۱۴ء، ص ۶۳)؛ (۵) مِسْعَر بن مہلہل (دیکھیے K. v. Schlözer : Abu Dolef Misaris b. Mohalhal de itinere Asiatico Comment، برلن ۱۸۴۵ء، ص ۱۸ ببعد)؛ (۶) بزرگ بن شہریار : کتاب عجائب الہند (Livre des Mervilles de l' Inde)، طبع A. v. d. Lith و L,M. Devic، لائیڈن ۱۸۸۳-۱۸۸۶ء، ص ۲۲۲ (Register)؛ (۷) المسعودی : مروج الذہب (مطبوعۂ پیرس)، ۱ :

۳۰۸، س ۹: ۳۳۰، س ۱۰: ۳۴۰، س ۱؛ (۸) الادریسی : نزهة المشتاق (Geographie، ترجمه از Jaubert پیرس ۱۸۳۶ء، ۱ : ۷۷، ۷۹ ببعد ؛ (۹) یاقوت : معجم (طبع Wüstenfeld)، ۲ : ۳۵۴، س ۱۰؛ ۳ : ۳۵۲، س ۲۳؛ ۴ : ۱۰۳، س ۱۹، ۱۶۲، س ۶، ۲۹۷، س ۲۳؛ (۱۰) الدمشقی : نخبة الدهر (طبع Mehren)، ص ۱۵۲، س ۱۱، ۱۵۵، س ۱۸ ببعد، ۱۷۰، س ۱ : (۱۱) القزوینی : آثار البلاد (طبع Wüstenfeld)، ۲ : ۳۸، س ۲۵ = Gildemeister : *Script. Arab. de Rebus Indicis loci etc.*، (بون ۱۸۳۸ء)، ص ۵۷ ببعد، عربی متن؛ (۱۲) ابو الفداء : تقویم البلدان (طبع Reinaud و De Slane)، ص ۳۷۵؛ (۱۳) الباکوی : تلخیص الآثار، مترجمه de Guignes : *Notices et Extraits des Manuscr*، ۲ : ۴۰۵؛ (۱۴) ابن الوردی : خریدة العجائب (قاهره ۱۳۲۴ھ)، ص ۸۶، س ۱۹ ؛ (۱۵) ابن ایاس : نشق الازهار، در Arnold : *Chrestom. Arab.*، هل ۱۸۵۳ء)، ص ۲۷، س ۱۰؛ (۱۶) Vullers : *Lex. Pers. Lat.*، ۲ : ۸۷۳ (کَله)، ۸۷۴ (کَله)؛ (۱۷) حمد الله المستوفی : نزهة القلوب (طبع G. le Strange، سلسلهٔ یادگار گب، عدد ۲۳/۲)، ص ۲۰۳، س ۶، ۲۳۱، س ۲۱؛ (۱۸) *Relations de voyages et Textes Geographiques arabes, persans et turcs relatifs â l'Exterme-Orient du* viii*e au* xviii*e siecles* مترجمهٔ G. Ferrand (پیرس ۱۹۱۴-۱۹۱۳ء)، بمدد اشاریه، بذیل کَله؛ (۱۹) گرشاسپ نامه میں جو ۱۰۶۶ء میں ختم ھوا اور اسدی سے منسوب کیا جاتا ھے، کَله کا ذکر ایک بحری مہم کے بیان کے سلسلے میں آیا ھے؛ دیکھیے عبارت، در Ouseley : *Travels in varlous countries of the East*، لنڈن ۱۸۱۹ء ص ۵۲، حاشیه؛ (۲۰) الجَوالیقی : المعرب، طبع Sachau، ص ۱۲۵، س ۶ اور دریں باره Sachau کا حاشیه، ص ۵۶ ببعد؛ (۲۱) Reinaud : *Relation des Voyages*، وغیره (دیکھیے سطور بالا)، ۱ : ۶۱ ببعد و در *Geogr. d' Aboulfeda* (تقویم البلدان از ابو الفداء کا ترجمه)، ۱: ص CDXIV و CDXVIII ببعد؛ (۲۲) Quatremere، در *Journal des savants* (پیرس ۱۸۴۶ء)، ص ۷۲۹ تا ۷۳۱؛ (۲۳) Dulaurier، در *Journ. Asiat.*، سلسلهٔ هشتم، ۸: ۲۰۹؛ (۲۴) Yule و Burnell : *Hobson-Johson, A Glossary of Colloquial Anglo-Indian Words.*، بار دوم، لنڈن ۱۹۰۳ء، ص ۱۴۵ ببعد؛ (۲۵) کله کے مسئلے پر ایک جامع تبصره A. v. d. Lith. نے (کتاب) عجائب الهند کے اپنے ایڈیشن کے ص ۲۵۶ تا ۲۶۴ (ص ۲۴۸ : ابن سعید اور النُّویری کے اقتباسات) پر اپنے حواشی میں کیا ھے، ص ۲۷۹ (اقتباس از مُختصر العجائب)، ص ۳۰۸ ؛ (۲۶) G. Ferrand، در *Journ. Asiat.*، سلسلهٔ یازد هم، ۱۲ (۱۹۱۸ء) : ۸۹، ۱۰۹؛ ۱۳ (۱۹۱۹ء) : ۳۱۲، ۴۳۸، حاشیه ۲، ۴۳۹ ببعد اور ۱۴ (۱۹۱۹ء) ۲۱۴ تا ۲۳۳، نیز جلد ۲۲۳ء، ص ۳۱.

(M. Streck [و تلخیص از اداره])

الکلی : رَکَ به القِلی .

کُلَیب بن رَبیعه : عہد جاهلیت میں شیوخ بنو تغلب میں سے ایک، جو اپنے برادر نسبتی جساس بن مرة الشیبانی کے هاتھوں قتل هوگیا اور جس سے قدیم نسل قبائل تغلب و بکر۔[رَکَ بآں] کے درمیان وہ طویل اور خونریز جنگ شروع هوگئی جو حرب بسوس [رَکَ بآں] کے نام سے مشہور ھے ۔ کلیب کا نسب نامه یه ھے، کلیب بن ربیعه بن الحارث بن مرة بن زهیر بن جشم (Wüstenfeld : *Geneal Tabellen*، باب ۲۲) ۔ کہا جاتا ھے که کلیب کا اصل نام وائل تھا جو کلیب (چھوٹا کتا) اس لیے هوگیا که وه همیشه ایک چھوٹا سا کتا اپنے ساتھ رکھتا تھا اور ایسے هر ایسی جگه پر مار مار کر بھونکنے پر مجبور کرتا تھا جسے وہ اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر مخصوص رکھنا چاھتا تھا ؛ چنانچه جس کسی کے کان میں بھونکنے کی

آواز جاتی وہ اسے استعمال کرنے سے پرہیز کرتا۔ یہ کہانی جس کا مطلب اگرچہ ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا بدیہی طور پر بعد کی اختراع ہے۔ کلیب ایک ایسا نام ہے جو عربوں کے یہاں اکثر ملتا ہے اور اس لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ عرف کے طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا۔

کلیب کے اندر وہ سب باتیں موجود تھیں جو کسی مستبد حکمران میں ہو سکتی ہیں اور جن سے بادیہ نشین عربوں کی آزاد اور نکتہ چیں طبیعت ہمیشہ متنفر رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے جب یمن کے باہم حلیف قبائل پر خزازہ کے مقام پر زبردست فتح حاصل ہوئی تو اس نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا (اس لقب کے استعمال کے لیے دیکھیے Lammens : *Le Berceau de l' Islam*، روم ۱۹۱۴ء، ص ۲۱۰)۔ وہ صرف بنو تَغْلب ہی نہیں بلکہ بنو بَکْر کے اہم ترین قبیلے بنو شَیْبان پر بھی حکومت کرتا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے کچھ عرصے کے بعد اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا اور رعایا کے شکار کھیلنے اور چراگاہوں میں مویشی چرانے کے حقوق غصب کر لیے۔ بدووں کو "مستبد حکمرانوں" سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ وہ "چراگاہ" (حِمٰی) سے متعلق ان کے حقوق غصب کر لیتے ہیں۔ دراصل کلیب قتل ہوا تو اس لیے کہ ایک تمیمی خاتون البَسُوس کی اونٹنی سُراب، یا اگر اس کی نہیں تھی، تو اس کے موالی بنو جرم کی اونٹنی کلیب کی ذاتی زمین میں جا نکلی۔ کلیب نے اسے مار ڈالا (یا اسے نہیں تو اس کے بچے کو مار ڈالا اور اسے بھی زخمی کر دیا)۔ جَسّاس کے ہاتھوں، جس کی ماں البسوس کی بہن تھی، اس کے قتل کا باعث یہ متشددانہ فعل ہوا۔

اس قصے کی تفصیلات تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ قدیم مآخذ میں بھی ملتی ہیں، جن میں سے بیشتر ابو عُبَیْدہ کی تصنیف میں موجود ہیں جو ایام العرب (۱ : ۲۳) کے بارے میں جیسا کہ سب کو معلوم ہے، تقریباً جملہ معلومات کا سرچشمہ ہے۔ کچھ باتیں ابن الکلبی سے لی گئی ہیں بالخصوص وہ جن کا تعلق کتاب الاغانی سے ہے۔ علاوہ ازیں المُفَضَّل الضَّبّی کا بیان بھی محفوظ ہے کہ ہم ابھی تک تحقیق کے ساتھ نہیں کہ سکتے کہ کلیب کی زندگی (بلکہ عام طور پر بنو تغلب اور بنو بکر کے خلاف معرکہ آرائی) کے بارے میں ہمیں جو روایات بکثرت ملتی ہیں اور جن میں بعض افسانہ ہیں، کہاں تک ٹھیک ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل جب ہی ممکن ہے جب اس سوال کا جواب مل جائے کہ زمانۂ قبل از اسلام کی روایات کی تاریخی قدر و قیمت کیا ہے۔ اگر ہم صرف اس واقعے پر نظر رکھیں، جو کلیب کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی بات غیر اغلب نہیں۔ یہ حکایت اس کوشش کی یاد دلاتی ہے جو بنو تغلب اور بنو بکر کی ایک ایسی تنظیم قائم کرنے کے لیے کی گئی جو بدوی قبائل کی تنظیم سے برتر ہو، یعنی کچھ ویسی ہی کوشش جس کی بدولت بنو کِنْدہ کے سر پر تاج شاہی رکھا گیا اور جس کا خیال حِیرہ میں بنو لَخْم کی بادشاہت کو دیکھ کر جو بنو تغلب اور بنو بکر کے گھروں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھی، پیدا ہوا۔ کلیب کے استبداد اور اس کی موت اور مظالم کی روایت کا تعلق بھی کسی بڑے قدیم زمانے سے ہے۔ اس کی تصدیق عباس بن مِرْداس اور النّابِغَۃ الجَعْدی (دونوں آغاز اسلام میں ایک دوسرے کے معاصر تھے) کے ان اشعار سے ہوتی ہے جن کا حوالہ ہمارے مآخذ میں موجود ہے؛ چنانچہ النابغۃ کے اشعار میں اونٹنی کی ہلاکت کا قصہ بالخصوص تفصیل سے بیان کیا

گیا ھے - کلیب کے اقتدار کا ذکر تو تغلبی شاعر عمرو بن کلثوم (۵ : ٦۵) کے "معلّقہ" میں بھی آیا ھے .

کلیب کا جو انجام ھوا، اس کی خود اس کے زمانے کی دستاویزی شہادت ان مرثیوں میں ملے گی جو اس کی موت پر لکھے گئے اور جن میں اس کی طرف متعدد اشارات موجود ھیں - یہ مرثیے اس کے بھائی مُہَلْہِل سے منسوب ھیں (جس کا شمار عرب کے قدیم ترین شعرا میں ھوتا ھے، دیکھیے ابن قتیبہ : کتاب الشعر و الشعراء، طبع De Goeje، ص ۱٦۴ تا ۱٦٦ ؛ محمّد بن سلام: طبقات الشعراء، طبع Hell، ص ۱۳ س ۱۱ تا ۱٦ وغیرہ، لیکن جن کی صحت بہت زیادہ مشکوک ھے) .

کلیب کے قتل کی کہانی بنو ھلال کی رومانی نظموں کے مجموعے میں، جیسا ان کا جی چاھا، مرتب کر دی گئی ھے (دیکھیے Mittwoch : *Proelia Arabum Paranorum*، برلن ۱۸۹۹ء، ص ۱۱) .

مآخذ : مادّۂ البسوس کے مآخذ کے علاوہ دیکھیے (۱) ابن الاثیر : الکامل، طبع Torenberg، ۱ : ۳۸۴ تا ۳۹۷ ؛ (۲) ابن عبدربہ : العقد، ۱۲۹۳ھ، ۳ : ۹۳ تا ۹۵ ؛ (۳) نقائض، طبع Bevan، ص ۹۰۵ تا ۹۰۷؛ (۴) المفضّل بن سَلَمہ : فاخر، طبع Storey، ص ٦۷ تا ٦۸؛ (۵) المفضّل الضّبّی : اَمْثال، استانبول ۱۳۰۰ھ، ص ۵۵ تا ۵٦ ؛ (٦) المیدانی : مجمع الامثال، طبع ۱۳۱۰ھ، ۱ : ۲۵۴، ۲۵۵؛ (۷) خزانۃ الادب، ۱ : ۳۰۱ تا ۳۰۴؛ (۸) یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۱ : ۱۵۰، ۱۵۱ .

(G. LEVI DELLA VIDA)

* **کِلیدُ البحر** : درِ دانیال کے سب سے تنگ حصے میں ایک قلعہ اور چھوٹا سا قصبہ ھے - [رک بہ مادّۂ قلعۂ سلطانیہ جس میں اس قلعے کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا گیا ھے جو ایشیائی جانب کلید البحر کے بالمقابل واقع ھے]- یہاں صرف ضروری معلومات مجملاً پیش کی جاتی ھیں -

قلعۂ کلید البحر کو گیلی پولی کے سنجق بے، یعقوب بے نے محمّد ثانی کے حکم سے ۱۴٦۳ء میں ایشیائی دفاعی استحکامات کے سلسلے میں تعمیر اور مسلح کیا تھا (*Kritobulos*، طبع C Müller کتاب ۴، باب ۱۴: کتاب ۱۵، باب ۳۳؛ نیز دیکھیے : *Chalkokondyles*، طبع I. Bekker، ص ۵۲۰، و J.v. Hammer : *G O R.*، ۲ : ۷۳) سلیمان اعظم نے ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء میں اس کی فصیل کی از سر نو مرمت کرائی جو اس عرصے میں ٹوٹ پھوٹ گئی تھی- ان استحکامات کی ۱۰٦۹ء-۱۰۷۰ء میں قلعۂ سلطانیہ کے ساتھ از سر نو بالکل جدید طریق پر تعمیر و توسیع کی گئی - کلید البحر کی مزید تاریخ عملی طور پر وھی ھے جو قلعۂ سلطانیہ [رک باں] کے ایشیائی قلعے کی ھے جو یہاں سے ۱۵۰۰ گز کے فاصلے پر واقع ھے - اس پرانے مدور مینار والے قدیم قلعۂ کلید البحر کا محل وقوع نہایت حسین منظر پیش کرتا ھے - زمانۂ مابعد میں اسی نام کے ایک جدید طرز کے قلعے کا اضافہ کرکے اسے مزید مستحکم کیا گیا ھے اس سے ملحق ایک توپخانہ اور بنی مجیدیہ کے چھوٹے اور "نماز گجاہ" کے بڑے پشتے تھے - قلعہ پرانے مینار کے پیچھے ایک پہاڑی کی ڈھلان پر، اسی نام کا چھوٹا سا گاؤں آباد ھے جسے جنگ عظیم میں در دانیال کے معرکے میں بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا .

مآخذ : (حوالوں کے لیے دیکھیے مادّۂ قلعۂ سلطانیہ کے علاوہ) : اولیا: سیاحت نامہ، ۵ : ۳۰۲ تا ۳۰۴ (مادّۂ ھاے تاریخ)؛ (۲) Jacob Spon : *Voyage du Levant*، Lyon ۱٦۷۸ء، ۱ : ۲۰۹؛ (۳) G. Wheeler : *Journey*، لنڈن

۱۶۸۲ء، ص ۴۷؛ (۴) G. A. Olivier : *Voyage dans l'Empire Ottoman*، پیرس ۱۸۰۱ء، ۱ : ۲۳۴ ؛ (۵) Félix de Beaujour : *Voyage militaire*، ۱۸۲۹، ۲ : ۸۹؛ (۶) d' Anville : در *Mémoires de l' Académie des Inscriptions*، ۲۸، (۱۷۶۱ء)، ۳۲۲ ؛ (۷) Jean Reinhard : *J. M. Angiolello*، (۱۴۵۲-۱۵۲۵)، حصہ ۱؛ (۸) Besançon : *Jeorine Maurand*، ۱۹۱۳ء، ص ۵۸؛ (۹) تصویر، در Jérome Maurand : *Itineraire* (1544)، طبع Ch. Schefer، پیرس ۱۹۰۱ء، لوح ۴، تصویر ۲ ("Sestos") اور ص ۱۷۹ ببعد؛ (۱۰) ایک تشریح در : *Historia, osia vero, e distinto Ragguaglio dello Stato presente dellà citta di Costantinopoli*؛ (۱۱) ۴ : *La descrittione . . . delli Dardanelli*، وینس (۱۶۸۶ء)، ۴°، ۳۶ صفحات ؛ (۱۲) J. Löwenklau (Leunclavius) : *Annales Sultanorum Othmanidarum*، طبع altera، فرینکفرٹ ۱۵۹۶ء، ص ۱۲۲ ببعد ۔

(FRANZ BABINGER)

* **کلیلہ و دمنہ** : ایک کتاب کا عنوان ہے جو شاہزادوں کے لیے بطور آئینۂ ہدایت کے مرتب کی گئی تھی۔ یہ عنوان سنسکرت کے دو لفظوں کرتکا Karataka اور دمنکا Damanaka کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ کرتکا اور دمنکا دو گیدڑوں کے نام تھے جو قصے کے اہم کردار ہیں (قدیم سریانی ترجمے میں یہ Kalilag اور دمنگ Damnag ہی کی شکلوں میں آئے ہیں)۔ اس کا سنسکرت سے پہلوی میں اور پھر پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا گیا اور یوں اسے اسلامی ادب میں اور مسیحی ادب میں بھی ہمہ گیر شہرت حاصل ہوگئی ۔

۱ ۔ اصل تصنیف : اصل ہندوستانی کتاب بقول ہرٹل Hertal ایک نامعلوم وشنو برہمن نے کشمیر میں ۳۰۰ء کے قریب تصنیف کی جس کے حق میں اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کتاب میں denarius کو dīnāra لکھا گیا ہے مگر یہ کوئی دل لگتی بات نہیں، کیونکہ حرف "n" کا تلفظ بطور "i" اس زمانے سے بہت زیادہ قدیمی ہے جو Hertel سمجھتا ہے (نیز دیکھیے A. Berriedale Keith، در *Journ. Roy. As. Soc.*، ۱۹۱۵ء، ص ۵۰۵) ۔

کلیلہ و دمنہ ایک مقدمے اور پانچ فصلوں پر مشتمل ہے ۔ ہر فصل کا عنوان تنترا، یعنی "عقل سلیم کا معاملہ" ہے ۔ اس تصنیف کا مقصد یہ تھا کہ جانوروں کے فصیح و بلیغ سنسکرت میں لکھے ہوئے قصے کہانیوں کے پیرائے میں بادشاہزادوں کو اصول مدنیت سمجھائے جائیں ۔ اصل کتاب کو سامنے رکھ کر جو کتابیں مرتب کی گئیں، ان میں قدیم ترین تنترا کھیا یکا *Tantrākhyāyika* ہے، جسے J. Hertal نے پھر سے دریافت کیا (دیکھیے *Tantrākhyāyika, die älteste Fassung des Pañcatantra* سنسکرت سے ترجمہ مع مقدمہ و تشریحات از J. Hertel، ۲ حصے، لائپزگ و برلن ۱۹۰۹ء) ۔ اصل کتاب کا ایک دوسرا نسخہ پنچ تنترا کے نام سے مشہور ہے (دیکھیے J. Hertal : *Pañcatantra, etc.* در Harvard Oriental Series، جلد ۱۱ تا ۱۴) ۔ اسے ہندوستان میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے ان گنت ترجمے متداول ہیں ۔ J. G. L. Kosegarten نے اس کے مخطوطے کا ایک غیر تنقیدی نسخہ بون Bonn سے ۱۸۴۸ء میں شائع کیا، اسی پر Th. Benfey نے اپنے ترجمے کی بنیاد رکھی : *Pantschatantra fünf Bücher Indischer Fabeln, Märchen und Erzählungen*، سنسکرت سے ترجمہ مع مقدمہ و حواشی (۲ حصے) لائپزگ ۱۸۵۹ء ۔ اس تصنیف کے مقدمے میں پہلی بار پوری جامعیت کے ساتھ اس امر کی تحقیق کی گئی ہے کہ ہندوستان کے ادبی موضوعات کس طرح یورپ میں منتقل ہوئے ۔

۲ - پہلوی ترجمہ ساسانی بادشاہ خسرو نوشیروان (۵۳۱ تا ۵۷۹ء) کے حکم سے پنچ تنترا کے کسی قدر قدیم منقح نسخے کا ترجمہ اس کے طبیب برزویہ نے کیا، جسے بادشاہ نے اسی غرض سے ہندوستان بھیجا اور جس نے بعض دوسرے ہندوستانی مآخذ سے قصے کہانیاں حاصل کرتے ہوے اس تصنیف میں ایک ضمیمے کا اضافہ بھی کیا - ان میں پہلی تین کہانیاں (de Sacy میں باب ۱۱ تا ۱۳) مہا بھارت کی بارھویں کتاب سے مأخوذ ہیں، باقی پانچ (de Sacy میں باب ۴، ۵، ۱۰، ۷، ۱۸) اور چوھوں کے بادشاہ کی کہانی (دیکھیے سطور ذیل جو de Sacy کے نسخے میں موجود نہیں) ابھی تک ہندوستانی ادب میں نہیں مل سکیں، تاہم اس میں شبہے کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ کہانیاں اصلاً ہندوستانی ہیں - برزویہ نے ترجمے کے شروع میں اپنی خود نوشت سرگزشت بطور دیباچہ قلمبند کی تھی - معلوم ہوتا ہے مصنف کی عزت افزائی کے لیے وزیر بزرجمہر نے اپنے ہاتھ سے اس پر دستخط ثبت کیے (دیکھیے *Burzöes Einleitung zur dem Buche Kalila wa-Dimna*، ترجمہ و حواشی از Th. Noldeke: *Schriften der wissensch Gesellsch. in Strassburg*، حصہ ۱۲، سٹراسبورگ Strassburg ۱۹۱۲ء).

۳ - قدیم سریانی ترجمہ : برزویہ کا پہلوی ترجمہ تو ضائع ہو چکا ہے، لیکن ۵۷۰ء کے قریب Periodeut Būd اس کا سریانی میں ترجمہ کر چکا تھا - اس ترجمے کا صرف ایک نسخہ باقی بچا ہے جو پہلے تو مار دین کی خانقاہ میں محفوظ تھا پھر موصل کے بطریق کے کتاب خانے میں پہنچا - یہاں سے یہ پیرس میں Mgr. Graffin کے قبضے میں آیا - اس کی ایک ناقص نقل سے جسے سوسن Socin اپنے ساتھ لایا تھا، بکل Bickle نے پہلا ایڈیشن تیار کیا (*Kalilag und Damnag, alte syrische Übersetzung des indischen fürstenspiegels*، متن و جرمن ترجمہ از C. Bickell، مع مقدمہ از Th. Benfey، لائپزگ ۱۸۷٦ء - آگے چل کر *Schulthess* ان تین نئی نقول کو سامنے رکھ کر جنھیں زخاؤ (Sachau) نے موصل میں تیار کرایا تھا، ایک زیادہ مستند متن شائع کرنے میں کامیاب ہو گیا (*Kalila und Dimna* سریانی اور جرمن، برلن ۱۹۱۱ء).

۴ - عربی ترجمہ : تقریباً تین صدی بعد عبداللہ بن المقفع (رک بہ مادۂ ابن المقفع، ۲ : ۴۰۴) نے برزویہ کے پہلوی ترجمے کو عربی میں منتقل کیا - اس نے کتاب پر اپنی طرف سے مقدمہ تحریر کیا اور برزویہ کے دیباچے میں غالباً اس حصے کو داخل کیا جو مذاہب کے ظنی اور غیر یقینی ہونے کے بارے میں ہے اور اس سے برافروختہ ہو کر (جس کی اس کتاب میں تعلیم دی گئی ہے)، پنچ تنترا کے حصۂ اول کے بعد دمنہ کے عدالتی مقدمے (de Sacy میں باب ٦) پر ایک باب خود لکھا، جس میں غدار کو سزا مل جانے کی وجہ سے انصاف کا تقاضا پورا ہوتا ہے - ظاہر یہی ہے کہ اسی نے "راہب اور مہمان" کے باب کا بھی اضافہ کیا (de Sacy میں شمارہ ۱٦) - ابن المقفع کا ترجمہ در حقیقت فن الشا کے حسن اسلوب کا نمونہ تھا، جو ماہرین علم ادب کے سامنے پیش کیا گیا تھا، لیکن موضوع کی نوعیت کی وجہ سے عوام میں بھی اس کو بہت جلد بڑی مقبولیت حاصل ہو گئی اور اسی وجہ سے نقل و روایت کی کثرت کی بنا پر اس کی اصل صورت میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوتا گیا، حتّٰی کہ ابن قتیبہ کی عیون الاخبار میں بھی جو اس کے متعدد اقتباسات موجود ہیں، وہ ابن المقفع کی اصل کتاب سے لفظ بلفظ نہیں ملتے - اس تصنیف کے

بے شمار قلمی نسخے جو ملتے ہیں، سب کے سب بعد کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں Sylvestre de Sacy کا نسخہ *'Calila et Dimna' ou Fables de Bidpai* پیرس ۱۸۱۶ء، ایک کم مرتبہ قلمی نسخے پر مبنی ہے اور دوسرے نسخوں کی مدد سے اس میں من مانی ترمیمیں کی گئی ہیں (دیکھیے Nöldeke، در *Göttinger Gelehrte Anz.*، ۱۸۸۴ء، ص ۶۷۶) de Sacy کے متن میں ابن المقفع کے مقدمے سے پہلے ایک اور نیا مقدمہ درج ہے، جو ایک غیر معروف شخص بہنود بن سحوان یا علی بن شاہ الفارسی کا لکھا ہوا ہے، جس میں یہ شخص اس کتاب کی وہ سرگزشت بیان کرتا ہے، جو اس کو ہندوستان میں پیش آئی، اس کے علاوہ ایک روداد دی گئی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ برزجمہر نے لکھی ہے، یہ روداد برزویہ کے مشن کے بارے میں ہے، جو خاص طور پر یہی کتاب لانے کے لیے ہندوستان گیا تھا، بعض مخطوطات میں ایک اور کہانی ملتی ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ برزویہ کو ایک کراماتی پودا لانے کے لیے بھیجا گیا تھا، بعض مخطوطات (دیکھیے J. Derenbourg : *Directorium vitae humanae*، ص ۳۲۳) میں خاتمے پر دو اور کہانیوں کا بھی اضافہ نظر آتا ہے، یعنی بگلے، بطخ اور فاختہ، اور لومڑی اور بگلے کی کہانیاں جو دوسرے ماخذ سے لی گئی ہیں، جن کا ابھی تک پتا نہیں چلا، ان میں سے آخری کہانی اس نسخے میں بھی شامل ہے جو de Sacy کے نسخے کی رو سے مشرق میں پہلی مرتبہ ۱۲۴۹ء میں بولاق میں طبع ہوئی (بقول Chauvin، کتاب مذکور، ص ۱۳ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں ہے، اس کا ایک نسخہ راقم مقالہ کے پاس بھی ہے) اس سے یہ کہانی قاہرہ، موصل اور بیروت میں شائع شدہ نسخوں میں بھی شامل ہو گئی ہے جن کی ایک فہرست Chauvin، ص ۱۳ بعد پر موجود ہے، مگر جو بقول Cheikho (دیکھیے نیچے) ص ۶ ابھی نامکمل ہے ۔ I. Guidi نے *Studii sul testo arabo del Libro di Calila e Dimna*، روم ۱۸۷۳ء میں اطالوی مخطوطات کی رو سے de Sacy کے متن کی تنقیدات میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے چوہوں کے بادشاہ اور اس کے وزیروں کی کہانی de Sacy کے نسخے میں نہیں، لیکن اس کے بارے میں سریانی متن سے پتا چلتا ہے کہ وہ پہلوی ترجمے میں موجود تھی ۔ Nöldeke نے اس کہانی کا متن اور ترجمہ *Abhandl. der Königl Gesellsch der Wissensch zu Göttingen*، ۱۸۷۹ء، ۲۵ شمارہ ۴ میں شائع کر دیا ہے "راہب اور شکستہ پیالے" کی کہانی سے متعلق مکمل مواد پیرس کے ۱۶ مخطوطات سے حاصل کر کے Zotenberg نے *Journ. Asiat.*، سلسلۂ ہشتم، ۷ (۱۸۸۶ء)، ص ۱۱۷ تا ۱۲۳ میں شائع کر دیا تھا ۔

مشرق کے متعدد مطبوعہ نسخوں میں زیادہ تر de Sacy کے متن ہی کو نقل کیا گیا ہے، لیکن A.N. Tabbara (*Kalila et Dimna trad. arabe copiée d' après un ancien manuscrit trouvé à Damas, avec notes*، بیروت ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) نے تنقید متن کے لیے ایک نیا ماخذ دریافت کیا ہے، لیکن یہ قلمی نسخہ (مکتوبۂ ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء) اس قدر قریب زمانے کا ہے کہ اس سے نیا مواد نہیں مل سکتا ۔ اس سے قطع نظر اس نسخے سے تمام عریاں مواد خارج کر دیا گیا ہے ۔ دوسری طرف Cheikho کو لبنان میں 'دیر الشیر' کی خانقاہ سے ایک بیش قیمت نسخہ ملا، جو ۷۳۹ھ/۱۳۳۹ء کا لکھا ہوا تھا اور اس نے اسے نہایت سلیقے کے ساتھ طبع کراکے، سہل الحصول کر دیا : *La version. arabe de kalilah et Dimnah d'après le plus*

ancien manuscrit arabe daté، بیروت ۱۹۰۵ء۔ خلیل
الیازجی کا نیا ایڈیشن (کتاب مذکور، ۱۹۰۸ء) میری
نظر سے گزرا ہے۔ سلیم ابراہیم صادر اور شاہین عطیه
(کتاب مذکور ۱۹۱۰ء) کے نسخے مدرسوں میں
پڑھانے کے لیے ہیں۔ de Sacy کے متن سے
جو جدید یورپی ترجمے تیار ہوے ہیں، ان کا ذکر
Hertel نے کتاب مذکور، ص ۳۹۳ میں کر دیا
ہے، ان میں اب M. Moreno : *La versione arabe*
de Kalilah e Dimmah کا اطالوی ترجمہ جو
San Remo سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا، اضافہ کر لینا
چاہیے (دیکھیے *Riv. d. Studi Orient*، ۶ : ۲۰۱)۔

۵۔ کلیله و دمنه عربی نظم میں، ابن المقفع کے
ترجمے کو تین بار عربی میں منظوم کیا گیا، پہلی بار
اس کے ہم عصر ابان اللاحقی [رک بآں] نے جو عمر
میں اس سے چھوٹا تھا، اسے نظم کیا (دیکھیے نیز
A. E. Krymski : *Abān al-Lāḥiḳī, le Zindīq*
(environ 750-815), versificateur arabe des recueils
des apologues indo-persans. Essai sur sa vie et
ses écrits, tiré de l' unique manuscrit de Souli...,
Bibl. Khéd. No. 594, et d' autres sources primitives.
Appendices : a. Barslaam et Joasaph, essai
littéraire-historique; b. Texte arabe intact d'al-
Awrāq par Souli, éd. en collaboration avec، مرزا
عبداللہ غفاروف Ghaffarow (روسی میں اور روسی عنوان
کے ساتھ ہے) Moskva ماسکو ۱۹۱۳ء؛ مخطوطے
کے بارے میں دیکھیے هورو وٹز Horovitz، در
Mitt. des Seminars Für Orient Sprachen، مطبوعۂ
برلن، ۱۰ : ۳۵۔ یہ نسخہ ضائع ہو چکا ہے، اس سے
استفادہ کر کے ابن المقفع کے متن کی بنیاد پر ۱۱۰۰ء
کے قریب ابن الہبّاریة [رک بآں] نے صرف دس دن میں
یہ مواد نتائج الفطنة فی نظم کلیله و دمنه (طبع سنگی
بمبئی ۱۳۱۷ھ) کے عنوان سے نہایت لطیف اور
رواں نظم میں منتقل کر دیا تھا (دیکھیے Houtsma، در
Orient Stud. Th. Nöldeke...gewidmet، ۹۱ تا ۹۶)
اس کتاب کے تیسرے منظوم ترجمے کا عنوان
دُرر الحکم فی امثال الہنود و العجم ہے، اسے عبدالمؤمن
بن الحسن بن الحسین الصغانی نے ۸۰ روز کی محنت
کے بعد ۲۰ جمادی الاولی ۶۴۰ھ/ ۱۱ نومبر
۱۲۴۲ء کو مکمل کیا، اس کا صرف ایک قلمی
نسخہ وی انا میں ہے (دیکھیے Flügel : *Die arab.,*
Pers. und türk. Hdss. der...Hofbibliothek zu Wien
۱ : ۳۶۹م، شمارہ ۴۸۰م)۔

۶۔ زمانۂ مابعد کے سریانی ترجمے:
دسویں یا گیارھویں صدی میں ایک سریانی پادری
نے اس کا ایک بار پھر المقفع کے متن سے اپنے کلیسا
کی زبان میں ترجمہ کیا جو اس کے زمانے سے
پہلے ہی مردہ ہو چکی تھی۔ اس نے کوشش کی
کہ اس کتاب میں مسیحیت کی رنگ آمیزی کی
جائے، چنانچہ اس نے هندی تصنیف کے اشعار کو
جو پہلوی ترجمے میں پہلے ہی کافی مسخ ہو چکے
تھے، طول دے کر لمبے اور تھکا دینے والے اخلاق
مباحث و مواعظ میں بدل دیا۔ اس نے ترجمے میں
بھی بہت سی غلطیاں کیں، لیکن چونکہ اس کے
پیش نظر ایک ایسا متن تھا جو ہمارے بیشتر قلمی
نسخوں کی نسبت اصل کتاب سے قریب تر تھا،
اس لیے تمام نقائص کے باوجود اس کا ترجمہ تنقید
متن کے لیے اهمیت رکھتا ہے۔ یہ W. Wright :
The Book of Kalilah and کی تصحیح سے چھپا ہے
Dimnah. Transl. from Arabic into Syriac، مطبوعۂ
لنڈن ۱۸۸۴ء۔ اصل کتاب کی صاف گوئی کے
مقابلے میں اس سریانی نسخے کا انگریز مترجم
Keith - Falconer (کیمبرج ۱۸۸۵ء) جنسی
معاملات کے بیان میں پادری صاحب سے بھی
کہیں زیادہ محتاط ثابت ہوا ہے۔ متن اور

ترجمے کے بارے میں دیکھیے Nöldeke، در *Göttinger Gelehrte Anz.*، ۱۸۸۴ء، ص ۷۵۳ ببعد.

۷- فارسی منثور و منظوم ترجمے: شاهنامه میں فردوسی کے بیان کے مطابق (دیکھیے de Sacy، در *Not. et. Extr. X* (۱۸۱۸)، ۱، ۱۴۰ ببعد) سامانی بادشاہ نصر بن احمد (۴۱۴ تا ۹۴۳ء) کے عہد میں اس کے وزیر بلعمی [رک بآں] کے حکم سے ابن المقفع کی کتاب کا فارسی میں ترجمه کیا گیا، لیکن معلوم ھوتا ھے که یه ترجمه کبھی پایهٔ تکمیل کو نه پہنچ سکا- اسی بادشاہ کے حکم سے شاعر رودکی (م ۳۰۴ھ/۹۱۶ء) نے اسے فارسی نظم کا جامه پہنایا، لیکن اس کے صرف وہ ۱۶ اشعار محفوظ رہ سکے ھیں، جو اسدی کی لُغت الفرس، طبع Horn، ص ۱۸ ببعد میں درج ھیں.

ابن المقفع کی تصنیف کا فارسی نظم میں ترجمه غالباً ۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء کے بعد دیکھیے Rieu: *Cat. of the Pers. Mss. in the Brit Mus., London*، ۷۴۵ ببعد) نظام الدّین ابوالمعالی نصراللہ بن محمّد بن عبدالحمید نے کیا اور اپنی کتاب بہرام شاہ غزنوی (رک بآں، ۱: ۵۸۶) کے نام سے معنون کی- نصراللہ ایک جدید مقدمے میں لکھتا ھے کہ اس نے مکمل صورت میں اسے دوبارہ پیش کرنے کا ارادہ کیا ھے، جس میں وہ تمام امثالِ حکمیه شامل ھیں، جو اس کے نزدیک بڑی قدر و قیمت کی حامل ھیں اور اسے نثر مصنوع کے تمام بدائع و محاسن کے ساتھ آراستہ بھی کرنا چاھا ھے- اس نے صرف برزویه کا مقدمه ساده نثر میں لکھا ھے کیونکه اس مقدمے کانفس مضمون کچھ اس قسم کا ھے که مرصع نگاری اس کے لیے موزوں معلوم نہیں ھوتی- یه کتاب ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۴ء (اس سے Chauvin کے شکوک رفع ھوجاتے ھیں، ص ۴۶-۴۷) ۱۳۰۴ اور ۱۳۰۵ھ میں تہران میں چھپی (چاپ سنگی) دیکھیے de Sacy، در *Not. et Extr* ۱۰: ۱، ۹۶ ببعد E.G. Browne: *A Literary History of Persia*، ۲ (لنڈن ۱۹۰۶ء): ۳۴۹.

اس کتاب کا ایک منظوم ترجمه قونیه میں مولانا جلال الدّین رومی کے ایک معاصر احمد بن محمود الطوسی قانعی نے جو مغول کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر وھاں آ گیا تھا، سلطان عزالدّین کیکاؤس (۶۴۳ھ/۱۲۴۴ء تا ۶۶۲ھ/۱۲۶۳ء) کے لیے کیا- یه غالباً نصراللہ کے ترجمے پر مبنی تھا. تاھم اس نے اس امر کا ذکر کہیں نہیں کیا دیکھیے Rieu: *Cat of the Pers. Mss. in the Birt Mus.*، ص ۵۸۲ ببعد؛ E. G Browne: *A History of Persian Literature under Tartar Dominion* (کیمبرج ۱۹۲۰ء)، ص ۱۱۱.

جب سلطان ھرات، حسین بایقرا [رک به حسین میرزا] کے درباری واعظ حسین واعظ کاشفی [م ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء (رک به کاشفی)] نے نصراللہ کے ترجمہ پر نظر ثانی کرکے اسے پیش کیا تو طوسی کے ترجمے کی اھمیت بالکل جاتی رھی- حسین واعظ کاشفی نے سلطان حسین کے وزیر میر احمد سہیلی کے اعزاز میں اپنی کتاب کا نام انوار سہیلی رکھا- اس کا دعوٰی تو یه ھے که اس نے نصراللہ کی پر تصنع اور مرصع عبارت کو اپنی نئی طرز تحریر میں آسان اور سلیس کر دیا ھے تاکه لوگ اسے آسانی سے سمجھ سکیں لیکن حقیقت یه ھے که کاشفی نے اسے پہلے سے بھی زیادہ پر تکلف بنا دیا ھے اور اپنے اطناب اور رنگین کلام کی وجه سے ایک ایسا مجموعه تیار کیا ھے، جو بے معنی مبالغه آرائیوں، پچیدہ الفاظ، فضول القاب، دوراز کار تشبیہوں اور بے مزہ عبارت آرائیوں سے پُر ھے اور ان مرصع نگاروں کے اسلوب کا بہترین نمونه ھے جنھوں نے سلاطین تیموریه کی سرپرستی میں بڑا

عروج حاصل کیا تھا ۔ (*Lit.* : E. G. Browne
History of Persia، ۲ : ۳۵۲، کتاب مذکور، ص
۵۰۳ ببعد)، لیکن چونکہ یہ اسلوب موجودہ دور
کے آغاز تک ایران اور خصوصاً ہندوستان میں بہت
مقبول رہا، اس لیے اس کتاب کو بے نظیر کامیابی
حاصل ہوئی اور اصل کتاب فارسی ہی میں انگلستان
میں طبع ہوئی (پہلا مکمل نسخہ، لنڈن ۱۸۳۶ء)
اور ایسے ہندوستان جانے والے انگریز افسروں کے
امتحان کے لیے بطور درسی کتاب مقرر کیا گیا ۔
اور پھر یہ کئی بار چاپ سنگی میں ہندوستان اور
ایران میں طبع ہوئی اور اس کا ہندوستان کی متعدد
زبانوں نیز پشتو، گرجستانی، اور یورپ کی تمام
بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوا (دیکھیے Chauvin
ص ۶ تا ۳۴) حسین کاشفی نے ترجمۂ المقفع کے
چار مقدمات کے بجائے اپنے ترجمے کا ایک نیا مقدمہ
لکھا ہے، جس کا مأخذ ابھی تک شناخت میں نہیں آیا ۔
de Sacy کا قیاس ہے کہ (*Not. et Extr.*، ۱۰، ۱ : ۵۹)
اس کے اندر وہی قدیم تر جاویدان خرد موجود
ہے جس سے الطرطوشی نے اپنے زمانے میں اپنی
تصنیف سراج الملوک (بولاق ۱۲۸۹ء) ص ۹۷،
س ۲۲ تا ۲۴، ص ۱۸۵، س ۲۵ ببعد کے لیے
استفادہ کیا تھا ۔ ہمایوں فال شہنشاہ چین کو اس
کا وزیر ترغیب دیتا ہے کہ تخت و تاج چھوڑ
دینے کا خیال ترک کر دے ۔ اس سلسلے میں ایسے
دابشلیم شاہ ہند کا قصہ سناتا ہے کہ ایسے خواب
میں ہدایت ہوئی کہ ایک غار میں جائے، جہاں ایسے
ایک پیر مرد ایک خزانہ دے گا ۔ اس خزانے میں
سے دابشلیم صرف ہوشنگ شاہ فارس کا وصیت نامہ
اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے، جس میں بادشاہوں
کے لیے ۱۴ نصیحتیں درج ہیں، انہیں لے کر وہ لنکا
جاتا ہے، جہاں ایک برہمن بید پائے یا پیلپائے ان
میں سے ہر نصیحت کی تشریح کہانیوں کے ذریعے
کرتا ہے ۔ یہی کہانیاں زیربحث ہیں، جن پر اس
کتاب کے مختلف ابواب مشتمل ہیں ۔

انوار سہیلی کے حد سے زیادہ پُر تکلف اسلوب
بیان سے بیزار ہو کر شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ تا
۱۶۰۵ء) نے اپنے وزیر ابو الفضل کو اس کتاب
کا ایک نیا منقح نسخہ مرتب کرنے پر مأمور کیا ۔
اس نسخے کا نام عیار دانش ہے اور یہ ۹۹۶ھ/
۱۵۸۷-۱۵۸۸ء میں مکمل ہوا ۔ اس میں ترتیب
تو انوار سہیلی ہی کی ملحوظ رکھی گئی ہے، لیکن
ابن المقفع کا مقدمہ اور برزویہ کا دیباچہ دوبارہ
شامل کر دیا گیا ہے ۔ یہ کتاب ابھی تک غیر
مطبوعہ ہے، البتہ حفیظ الدّین نے خرد افروز کے
نام سے اس کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا ۔
اس کے پاکیزہ طرز تحریر سے متأثر ہو کر
Eastwick اور (کلکتہ ۱۸۱۵ء) Th. Roebuck
(Hertford، ۱۸۵۷ء اور لنڈن ۱۸۶۷ء) نے شائع
کیا ۔

۸ - ترکی ترجمے: نصراللہ نے ابن المقفع کی
تصنیف کا جو ترجمہ کیا تھا، اس کا مشرقی ترکی
میں دوبار ترجمہ ہوا دیکھیے مخطوطات ڈریسڈن،
در Fleischer : *Cat. Codd. Mss. orient Bibl.*
Regiae Dresdensis، (لائپزگ ۱۸۳۱ء)، ص ۱۹،
شمارہ ۱۳۶ اور Munich، در Aumer : *Die Pers.*
und türk. Hdss der K. Hof-und Staatsbibliothek،
ص ۵۴ ۔

نصراللہ کے ترجمے کا ایک ترجمہ قدیم عثمانی
ترکی میں (مشرقی ترکی میں نہیں جیسا کہ Ethé نے کسی
قدر غلط فہمی پیدا کرنے والے ایک جملے پر اعتبار
کرکے Hertel، نے خیال ظاہر کیا ہے، ص ۳۰۷)
مسعود نے والیِ آیدین کے شاہزادے عُمور بیک
(م ۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء) کے لیے کیا (ایک مخطوطہ، در
Bodleian Marsh.، ۱۸۰) ۔ اس نثری تصنیف کو

ایک نامعلوم مصنف نے نظم کا جامہ پہنا کر اسے سلطان مراد اول (۷۶۱ھ / ۱۳۵۹ء تا ۷۹۲ھ / ۱۳۸۹ء) کے نام معنون کیا۔ اس کا تقریباً نصف حصہ ایک مخطوطے Gotha (دیکھیے Pertsch : *Verz. der türk Handschr. d. Herz Bibl.*، ص ۱۶۸، شمارہ ۱۸۹) میں محفوظ ہے۔ اس کا جدید عثمانی نثر میں ترجمہ جو لازمی طور پر ۹۵۵ھ/۱۵۴۸ء سے قبل ہوا ہوگا، اس کا قلمی نسخہ کتابخانہ Bodleian، ۶۱ میں موجود ہے (دیکھیے H. Ethé : *On some hitherto unknown Turkish Versions of Kalilah and Dimnah*، در *Actes due be Congr. internat. des Orientalistes*، حصہ ۲، ۱ : ۲۴۱ ببعد۔

علی بن صالح المعروف بہ علی واسع یا علی چلپی نے انوار سہیلی کا ترجمہ مسجع عثمانی نثر میں ہمایون نامہ کے عنوان سے کیا اور سلطان سلیمان اول (۱۵۱۲ تا ۱۵۲۰ء) کے نام معنون کیا۔ یہ کتاب کئی مرتبہ بولاق اور استانبول میں چھپ چکی ہے (دیکھیے Chauvin، ص ۵۰)۔ ہمایون نامہ کے جو تراجم مختلف یورپی زبانوں میں ہوئے، ان میں سب سے زیادہ مشہور Galland کا فرانسیسی ترجمہ ہے، جسے Gueulette نے اس کی وفات کے بعد شائع کیا (پیرس ۱۷۲۴ء) اسی کا Gonggrijp نے ملائی زبان میں ترجمہ کیا (بٹیویا ۱۸۶۶ء) اور Kramaprawira نے ترجمے سے متاثر ہو کر اس کا ترجمہ جاوی زبان میں کیا اور جسے ایک نامعلوم الاسم شاعر نے جاوی ھی میں منظوم بھی کر دیا۔ ہمایون نامہ پر تکلف عبارت آرائی میں، اصل فارسی کتاب سے بازی لے گیا اور اس کی پیچیدگیاں صاف کرنے کے لیے مفتی یحیی افندی اوز عثمان زادہ کو جس نے ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں جب وہ قاہرہ کا قاضی تھا، وفات پائی، اس کا ملخص تیار کرنے پر آمادہ کیا (دیکھیے Ethé، کتاب مذکور، ص ۲۴۲)۔ محمد موسی بے بچجہ کی ترغیب سے فضل اللہ بن عیسی تاشقندی نے ہمایون نامہ کی مدد سے انوار سہیلی کا ترجمہ جدید مشرق ترکی نثر میں کیا (زیادہ صحیح، جیسا کہ خاتمۂ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے، تاشقند اور فرغانہ کی زبان میں اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، ترکستان اور فرغانہ کی زبان میں) اور خاتمۂ کتاب کی رو سے محمد موسی بے نے ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء میں میرزا ہاشم خجندی خوش نویس سے لکھوا کر لتھو میں طبع کرایا، لیکن عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔

عبدالعلام فیض خاں اوغلو نے ابن المقفع کی کتاب کا ترجمہ عربی سے قازان ترکی میں کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۸۹ء میں قازان میں طبع ہوا (یونیورسٹی پریس *Orient Bibliographie*، ۳ : ۱۴۲۱) اسی سال Wjatschakow (کتاب مذکور، ۳ : ۱۶۷، عدد ۳۹۳۵) میں اور ۱۸۹۲ء میں Circova (کتاب مذکور، ۳ : ۱۶۷، عدد ۳۹۶۶) میں چھپا۔ پروفیسر Hommel کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقدسہ انوار سہیلی سے لیا گیا ہے۔

۹ - مغولی ترجمہ : ملک افتخار الدین محمد بن ابی نصر نے جو محمد بکری کی اولاد میں سے تھا، قزوین میں اس کا مغولی زبان میں ترجمہ کیا، لیکن یہ ناپید ہے (دیکھیے حمد اللہ المستوفی : تاریخ گزیدہ طبع، Browne، Gibb Mem.، ۱۴ : ۸۴۴، ۸۴۵؛ ترجمہ، ص ۲۳۳؛ Browne : *A History of Persian Literature under Tatar Dominion*، ص ۹۳ اور *Hammer-Purgstall* نے *Journ. Asiat*، سلسلۂ سوم، ۱ : ۸۰۵ میں جو بیان دیا ہے، وہ صحیح ہے۔ یہ بیان حاجی خلیفہ (۵ : ۲۳۹) میں خلط ملط ہوگیا ہے۔ اس نے اس کا ترکی میں ایک ترجمہ ملک افتخار الدین

کے جد امجد بکرمی سے منسوب کیا ہے (دیکھیے De Sacy : .Not et Extr، ۱۰ : ۱۲۵ ؛ Ethé، کتاب مذکور، ص ۲۴۳، جس نے von Hammer کے بیان کو جو صحیح ہے، نظر انداز کر دیا) جس طرح Flugel نے "in lingnam Tatarorum" کا ترجمہ غلط کیا ہے، اسی طرح Hertel (ص ۱۴۴) نے غلطی سے اس نامبردہ تاتاری ترجمے کو قازان ترکی (جسے تاتاری کہا گیا ہے) ترجمہ سمجھ لیا ہے، جس کا حوالہ Chauvin، ص ۸۷، حاشیے میں دیا گیا ہے۔

۱۰ - حبشی ترجمہ : ایک حبشی ترجمہ جو یقیناً ابن المقفع کے ایک ایسے عربی متن پر مبنی تھا، جو مصر میں رائج تھا، ضائع ہو چکا ہے اور جس کا ۱۵۸۲ء کی ایک تصنیف میں ذکر ملتا ہے (دیکھیے Wright : *Cat. of the Ethiop. Mss. in the Brit. Mus.*، ص ۸۲ ب) (دیکھیے Nöldeke : *Gött. Gelehrte Anz.*، ۱۸۸۴ء : ص ٦٢٦، حاشیہ ۵).

۱۱ - عبرانی اور قدیم یورپی تراجم : بارھویں صدی کے آغاز میں ربّی جوئیل نے ابن المقفع کی تصنیف کا عبرانی میں ترجمہ کیا، ترجمہ ایک بیش قیمت قلمی نسخے سے کیا گیا تھا، لیکن اس میں برزویہ کی سہم کی غلط کہانی اور آخر کتاب میں دو بے اصل کہانیاں بگلے، بطخ اور لومڑی کی، اور فاختہ اور بگلے کی شامل تھیں - اس کے واحد قلمی نسخے سے جس کے شروع کے حصے میں بے حد غلطیاں ہیں، J. Derenbourg نے یہ ترجمہ تیرھویں صدی کے ایک شخص Jacob b. Eleazar کے ترجمے کے ساتھ شائع کیا (*Deux versions hébraïques du Livre de Kalilâh et Dimnâh*، در *Bibl. de l'École des Hautes Études*، *Fasc.* ۴۹، پیرس ۱۸۸۱ء) جیکب کا ترجمہ اسی قسم کے متن پر مبنی ہے، جس طرح کا جوئیل کے پیش نظر تھا، پھر بھی یہ ایک صاف آزاد مقفّی نثر میں لکھا ہوا ہے اور بائیبل کے محاوروں سے پر ہے - اس کے بعد ربّی جوئیل کے ترجمے کا ایک یہودی John Capua نے جو عیسائی ہو گیا تھا، ۱۲٦۳ اور ۱۲۷۸ء کے مابین کارڈینل ارسینس Ursinns کے لیے *Directorium vita Humanae* کے عنوان سے لاطینی میں ترجمہ کیا (دیکھیے Johnnes de Capua : *Directorium vitae humanae*، مرتبہ و مشرحہ از J. Derenbourg از *Bibl. de l' École des Hautes Études*، Fasc، ۷۲، پیرس ۱۸۸۷ء توقع کی جاتی ہے کہ Hilka ایک نیا ایڈیشن شائع کرے گا، جو ایسے قلمی نسخوں پر مبنی ہوگا، جنھیں اس نے حال ہی میں دریافت کیا ہے) ایک قدیم ہسپانوی ترجمے کو جس میں اسی اصل متن کا جسے ربّی جوئیل نے استعمال کیا ہے، John of Caua سے کہیں زیادہ التزام کے ساتھ لفظ بلفظ تتبع کیا گیا ہے (دیکھیے Clifford G. Allen : *L'ancienne version espagnole de Kalila et Dimna, texte des Mss. de l'Escorial, précédé d'un avant propos et suivi d' un glossaire*، *Thesis*، Paris-Macon، ۱۹۰٦ء)- تمام تراجم جو مغربی یورپ کی زبانوں میں ہوئے، ان میں سے بالکل حال کے تراجم نکال کر سب کے سب John of Capua کے لاطینی ترجمے پر مبنی ہیں (دیکھیے Chauvin، ص ۵۹ تا ۷۲؛ Hertel، ص ۳٦٦ تا ۴۰۰).

۱۲ - یونانی ترجمہ : گیارھویں صدی کے آخری ایام میں Seth کے بیٹے Symeon نے ابن المقفع کے ترجمے کے ایک ایسے قلمی نسخے کو جو بعد کے اضافوں سے پاک تھا، لیکن پھر بھی اس مین چوھوں کے بادشاہ اور اس کے وزیروں کی کہانی شامل تھی، خاصے آزاد اسلوب میں یونانی زبان کا جامہ پہنایا - اس نے اس کتاب کا نام Στεφανίτης

καὶ Ἰχνηλάτης رکھا کیونکہ اس نے لفظ کلیلہ کا تعلق عربی لفظ اکلیل سے اور دمنہ کا تعلق عربی لفظ دمنہ، بمعنی آثار کہنہ سے سمجھا تھا ۔ دیکھیے Στεφανίτης καὶ Ἰχνηλάτης *Quattro recensioni della versione greca del Kitāb Kalila wa-Dimna, Pubbl. da Vittorio Puntoni Pubblicazioni della Soc. Asiat. Ital.*، ۲، (۱۸۸۹ء) یہ ترجمہ پھر لاطینی، جرمن، نیز متعدد سلاوی زبانوں میں منتقل ہوا ۔

۱۳ - ہتوپدیش کا فارسی ترجمہ : ہتوپدیش کا جو سنسکرت میں پنچ تنترا کی، زمانۂ ما بعد کی نقل تھی، غالباً [ہمایوں یا] اکبر کے عہد میں ایک شخص تاج الدین نے مفرح القلوب کے نام سے فارسی میں آزاد ترجمہ کیا (دیکھیے de Sacy : *L' électuaire des coeurs, ou traduction persane du liver indien intitulé Hitoupadésa par Taj-eddin, ms. persan de la Bible du Roi*، شمارہ ۳۸۶ در *Not. et Extr.*، ۱۰ : ۲۲۶ تا ۲۶۴) ۔ بعد ازاں ایک بلند مرتبہ ہندوستانی مصنف میر بہادر علی حسینی نے ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں اس کا اپنی مادری زبان میں ترجمہ کیا (دیکھیے Garcin de Tassy : *Hist. de la litér hindouie ou hindoustanie*، بار دوم، ۱ : ۶۰۹ ببعد) ایک سال بعد گلکرسٹ نے اسے طبع کیا، بنام *Ukhlaqi Hindee or Indian Ethics transl. from the Version of the celebrated Hitoopades or Salutary Counsel*، از میر بہادر علی ۔ ۔ ۔ زیر نگرانی جان گلکرسٹ، کلکتہ ۱۸۰۳ء، دیکھیے J. Hertel : *Die Akhlāq-ē Hindi und ihre Quellen*، در *Zeitschr. d. Deutsch. Morg. Gesellsch*، ۷۲ : ۶۵ تا ۸۶؛ ۷۴ : ۹۵ تا ۱۱۷؛ ۷۵ : ۱۲۹ تا ۲۰۰ ۔

۱۴ - قدیم ملائی ترجمہ : ابن المقفع کے ترجمے اور پنچ تنتر کے ایک تامل نسخے پر ملائی ترجمہ حکایت کلیلہ دن دمنہ مبنی ہے، جسے سب سے پہلے Werndly نے اپنی تصنیف *Maleische Spraakkunst* (ایمسٹرڈم ۱۷۳۶ء) کے ذریعے متعارف کیا اور ۱۸۷۶ء میں Gonggrijp نے لائیڈن سے شائع کیا (بار دوم ۱۸۹۲ء، دیکھیے J.J. Brandes، در Feestbundel، لائیڈن ۱۸۹۱ء، ص ۷۷، ببعد) اس کے بعد اسی کا جاوی (بٹیویا ۱۸۷۸ء) اور مدوری (وہی مقام ۱۸۷۹ء) میں ترجمہ ہوا ۔

۱۵ - کلیلہ و دمنہ کے مماثلات : ان قصوں سے قطع نظر جو الف لیلہ و لیلۃ میں شامل کیے گئے، ابن المقفع کی کتاب کا اسلامی ادب میں تین بار اتباع کیا گیا ۔ ابن الہبّاریۃ (دیکھیے اوپر) نے اپنی منظوم تصنیف کتاب الصادح والباغم (دیکھیے اوپر، ص ۳۷۸ ببعد، نیز مطبوعۂ قاہرہ ۱۲۹۲ھ) اس کے نمونے پر تیار کی، لیکن اس میں محض حیوانوں کی حکایات کی نقل کی گئی ہے، لیکن محمّد بن عبداللہ بن ظفر الصقلّی (م ۵۶۵ھ/۱۱۶۹ء یا ۵۶۸ھ/ ۱۱۷۲ء) اپنی کتاب سلوان المطاع کو جسے اس نے پہلی بار ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء میں مرتب کیا اور جس کے نئے ایڈیشن کو ۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء میں صقلیہ کے قائد ابو عبداللہ محمّد القرشی کے نام معنون کیا، وہ بھی کلیلہ و دمنہ کی طرح اسے بادشاہوں کے لیے آئینۂ حالات بنانا چاہتا تھا ۔ اس لیے جانوروں کے قصے کہانیوں کے علاوہ اس میں تاریخی حکایات بھی درج کی گئی ہیں ۔ یہ ۱۲۷۸ھ میں قاہرہ سے لتھو میں طبع ہوئی ۔ تونس میں ۱۲۷۹ھ میں چھپی اور بیروت سے ۱۳۰۰ھ میں شائع ہوئی ۔ اس کا ترکی ترجمہ قرہ خلیل زادہ (م ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء) نے کیا جو ۱۲۸۵ھ میں استانبول میں چھپا ۔ M. Amari نے اسے اطالوی زبان میں منتقل کیا ۔ *Solwan el-mota ossiano Conforti*

politici di Ibn Zafar arabo Siciliano del xii Secolo، فلورنس ۱۸۵۱ء، ۱۸۸۲ء (انگریزی ترجمہ، لنڈن ۱۸۵۲ء).

ایک اور آئینہ ھدایت جس میں قارئین کی اخلاق اصلاح کے لیے جانوروں کے قصوں کے ساتھ ساتھ تاریخی حکایات کی آمیزش بھی کی گئی ہے، چوتھی صدی ھجری کے اواخر میں اسپہبذ مرزبان والیِ طبرستان نے اپنے ملک کی فارسی زبان میں لکھی ۔ خود یہ تصنیف تو ضائع ہو چکی ہے، لیکن چھٹی صدی ہجری بارھویں صدی عیسوی اور ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں دوبارہ اس کا مستند فارسی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے، پہلا ترجمہ ایشیاے کوچک کے سلجوق فرمانروا سلیمان شاہ (۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء تا ۶۰۰ھ/۱۲۰۴ء) کے دربار میں اس کے وزیر محمّد بن غازی الملطی کے ھاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا ۔ اس کا نام روضۃ العقول ہے اور اس کے دو قلمی نسخے لائیڈن اور پیرس میں موجود ھیں ۔ سعد الدّین وراوینی کے مرزبان نامہ نے، جو ۶۰۷ھ اور ۶۲۲ھ کے مابین (۱۲۱۰ - ۱۲۲۵ء) لکھا گیا، اس سے زیادہ مقبولیت پائی ۔ اسے میرزا محمّد نے براے طبع مرتب کیا (Gibb. Mem. Ser، جلد ۸) .

وراوینی کی کتاب کا ایک نامعلوم مصنف نے عثمانی ترکی میں ترجمہ کیا (۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء) (اس کا ایک قلمی نسخہ برلن میں ہے، (دیکھیے Pertsch : *Verz. der Türk-Hdss.*، عدد ۴۴۴) اس ترکی نسخے کا ایک بار پھر عربی میں ترجمہ ہوا، لیکن مترجم کا نام معلوم نہیں (مخطوطۂ برلن دیکھیے Ahlwardt : *Verz*، عدد ۸۳۷۲) ۔ ایک دوسرا عربی ترجمہ جو مخطوطۂ Gotha (دیکھیے Pertsch : *Die Arab Hdss. der Herz Bibl*، عدد ۲۶۹۲) کی رو سے اسی ترکی ترجمے پر مبنی ہے، ابن عرب شاہ [رک بآں] نے کیا ۔ ایک اور قلمی نسخہ پیرس میں موجود ہے (*Catal.* : de Slane، شمارہ ۳۵۲۳) اور یہ ۱۲۷۸ء میں قاھرہ سے لتھو میں طبع ھوا ۔ اسی مصنف نے دوبارہ اپنی یہی کتاب فاکہۃ الخلفاء و مفاخرۃ الظرفاء کے نام سے مرصع نثر میں لکھی اور اس میں متعدد نئی حکایات کا اضافہ کیا .

اسی منقح و مہذب کتاب کو جس کا عثمانی ترکی میں ترجمہ ھو چکا تھا اور جسے دسویں (آخری) باب "در بیان زیادت عمر و دولت و زندگانی کردن با دوست و دشمن" کی بنا پر وراوینی کی تصنیف سے ممیز کیا جاتا ہے، ایک نامعلوم الاسم مصنف نے کسی سلیمان بک بن محمّد بک کے لیے قازانی ترکی کا جامہ پہنایا اور یہ کتاب دستور شاھی فی حکایات پادشاھی کے نام سے ۱۸۶۴ء میں قازان میں طبع ھوئی .

مآخذ : (۱) V. Chauvin : *Bibliographie des ouvrages arabes ou relatifs aux Arabes*، وغیرہ، *Kalilah* (*Liège - Leipzig*) : ii، ۱۸۹۷ء ؛ (۲) J. Hertel : *Das Pañcatantra, seine Geschichte und seine Verbreitung*، لائپزگ و برلن ۱۹۱۴ء .

(C. BROCKELMANN)

کلیم، ابو طالب : ایرانی الاصل شاعر تھا ۔ ابتدائی عمر کے سوانح کچھ زیادہ نہیں ملتے، یہاں تک کہ یہ بھی معلوم نہ ھو سکا کہ اس کی پیدائش کب اور کہاں ھوئی، اس کے والد کے نام کا بھی پتا نہیں چل سکا ۔ طاھر نصر آبادی نے کلیم کو ھمدانی بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کاشان میں بہت عرصہ رھا تھا، اس لیے اسے کاشی (کاشانی) کہتے ھیں (تذکرہ نصر آبادی، ص ۲۲۰، تہران، ۱۳۱)، لطف علی بیگ آذر نے لکھا ہے کہ تذکرہ نویسوں کا اس کے وطن کے

بارے میں اختلاف ہے، بعض اسے ہمدانی اور بعض کاشی (کاشانی) لکھتے ہیں۔ آذر کے نزدیک وہ کاشانی تھا (آتشکدہ، طبع محمد علی علمی، تہران، ص ۲۵۲؛ نیز دیکھیے عبدالحمید: پادشاھنامہ، ۱ : ۳۵۳)۔ معاصر ایرانی ادیب پرتو بیضائی نے بھی اسے کاشانی ہی لکھا ہے (دیوان کلیم، طبع ایران، مقدمہ) اس لیے یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ کاشانی تھا، اگرچہ اس نے شیراز میں تعلیم پائی (عبدالحمید : پادشاھنامہ، ص ۳۵۳) اور کچھ عرصہ ہمدان میں گزارا (آتشکدہ، ص ۲۵۲) ابو طالب کلیم، جہانگیر (۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء تا ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء) کے عہد میں ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۷ء میں برصغیر پاکستان و ہند آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر کے شاہان مغلیہ کی زبان فارسی تھی اور وہ فارسی شاعری کے قدر دان بھی تھے، ادھر ایران میں صفویوں کو (بتول رضا زادرہ شفق) قصیدہ و غزل سے کوئی شغف نہ تھا۔ (شفق : تاریخ ادبیات ایران، تہران، ص ۳۶۳) ان وجوہ سے ایرانی علما و شعرا کو برصغیر میں قسمت آزمائی کی آرزو رہتی تھی۔ کلیم نے ہندوستان آ کر امیر شاہنواز صفوی (خسر اورنگ زیب) کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اس کی وفات کے بعد کلیم گولکنڈہ گیا اور میرزا محمد امین میر جملہ کے دربار سے وابستہ ہوا، لیکن اگلے ہی سال (۱۰۲۸ھ) وہ واپس چلا گیا۔ (تذکرۂ نصر آبادی، ص ۲۲۰) اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جہانگیر نے طالب آملی کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا اور اس کی شاعری کا سکہ دربار میں جما ہوا تھا اور یہ کہ نور جہاں بیگم کلیم کی شاعری کی معتقد نہ تھی (دیکھیے شیر خان لودھی : مرآۃ الخیال، ۹۰) اس لیے وہ دل برداشتہ ہو گیا تھا، مگر یہ وجہ کچھ زیادہ قابل اعتماد معلوم نہیں ہوتی۔ کلیم کا طالب آملی کے ملک الشعرا ہونے پر دل برداشتہ ہونا قرین قیاس نہیں۔ اسے یہاں آتے ہی یہ توقع کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ طالب آملی کی موجودگی ہی میں ملک الشعرا بن جاتا۔ اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب وہ وطن کو واپس جا رہا تھا تو اسے برصغیر کو چھوڑنے کا قلق ہوا، چنانچہ ایک غزل لکھی جس کے ایک شعر میں اپنے اس درد کا اظہار ان الفاظ میں کیا :

ز شوق ہند زان سان چشم حسرت برقفا دارم
کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

کہتے ہیں "جا تو رہا ہوں مگر آنکھیں پیچھے کو لگی ہوئی ہیں"۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دل برداشتہ ہو کر نہیں گیا تھا اور پھر ہند کا شوق اسے دو ہی سال میں واپس لے آیا۔ یہاں آ کر اس نے دکن کا رخ کیا اور عالم بے بسی میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ دکن میں اسے بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ بیجا پور سے گزر ہوا تو راستے میں جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہوا۔ کلیم نے اپنے دو قصیدوں میں، جن میں ایک ابراھیم عادل شاہ (۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء تا ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء) کی مدح میں ہے، اپنی اسیری کی کیفیت بیان کی ہے۔ بالآخر میر جملہ مذکور کے توسط سے شاھجہان کے دربار میں رسائی ہوئی اور محمد جان قدسی کی وفات (۱۶۴۶ء) کے بعد کلیم ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز ہوا (شیر خان: مرآۃ الخیال، ص ۱۱۹)۔

کلیم بہت سیر چشم، قانع اور خوش گفتار شخص تھا، محمد طاھر کے بیان کے مطابق بادشاہ کی طرف سے جو انعام و اکرام ملتا فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتا (تذکرۂ نصر آبادی، ص ۲۲۰)۔ جاہ و منصب سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک

مرتبہ شاہجہان نے اسے مُہرداری کا منصب سونپنا چاہا تو اس نے ایک شعر کہ کر معذرت چاہی جس کا دوسرا مصرع یہ ہے۔ "سرا مہرداری بہ از مُہرداری" کلیم کے اپنے معاصرین کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ صائب کے ایک قطعے سے واضح ہے کہ کلیم کے صائب اور میر معصوم کے ساتھ بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ قدسی اور ملک قمی کے ساتھ بھی اس کے روابط دوستانہ تھے، ملک قمی فوت ہوا تو کلیم نے ترکیب بندمیں مرثیہ لکھا جس سے اس کے قلبی تأثرات کا پتا چلتا ہے۔

کلیم پر گو شاعر تھا۔ اس نے ہر شاہی تقریب پر قصیدے کہے اور بڑے بڑے انعام پائے شاہان وقت عموماً اپنے عہد کے حالات لکھنے کا کام علما و شعرا کے سپرد کیا کرتے تھے جیسے کہ نثر میں پادشاہ نامہ لکھنے کی فرمائش عبدالحمید کو ہوئی۔ منظوم حالات لکھنے کے لیے قدسی منتخب ہوا، جس نے بڑی محنت سے ظفر نامہ لکھنا شروع کیا، لیکن زندگی نے وفا نہ کی، بالآخر کلیم نے مثنوی ظفر نامۂ شاہجہان کی تکمیل کی۔ (دیکھیے آگے) شاہجہان کو یہ مثنوی پسند آئی اور کلیم کو انعام و اکرام سے نوازا۔ کلیم کو پادشاہنامہ لکھنے کی بھی فرمائش ہوئی۔ اسے شاہجہان کے ساتھ کشمیر جانے کا اتفاق ہوا، وہاں کے مناظر اور خوشگوار آب و ہوا کا اس پر اس قدر اثر ہوا کہ یہیں ٹھیر جانے کی اجازت چاہی۔ شاہجہان نے اس کی درخواست منظور کرلی اور اس کے لیے ماہیانہ مقرر کر دیا (تذکرۂ نصر آبادی، ص ۲۲۰) کلیم نے قیام کشمیر کے زمانے میں مثنوی پادشاہنامہ کی تکمیل کی۔ آخر یہیں ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی۔ غنی کشمیری نے مادۂ تاریخ اس مصرع سے نکالا "طور معنی بود روشن از کلیم" (۱۰۶۱ھ کلمات الشعراء، مطبوعۂ شیخ مبارک علی، ص ۹۶) شیر خاں لودھی نے اس کی وفات کا سال ۱۰۶۲ھ لکھا ہے (جو درست نہیں) اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا مرقد لاہور کے نواح میں کسی دیہ میں ہے (مرآۃ الخیال، ص ۱۱۹)، لیکن یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مصنف آتشکدہ نے لکھا ہے کہ وہ خطۂ کشمیر ہی میں مدفون ہے، (مطبوعۂ ایران ۱۳۳۷ ش، ص ۲۵۲)۔

تصانیف: ظفر نامۂ شاہجہانی جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے، اسے قدسی نے لکھنا شروع کیا تھا، لیکن تکمیل اس کی کلیم نے کی۔ اس کے مضامین کچھ خلط ملط سے ہیں کیونکہ یہ ان کے مطبوعہ دیوان میں بھی ملتے ہیں اور بعض اجزا قدرے تفاوت کے ساتھ دوبارہ بلکہ سہ بارہ بھی آ گئے ہیں۔

(۱) اس کا پہلا جزو جلال الدّین محمّد طباطبائی کے دیباچے پر مشتمل ہے؛ (۲) یہ جزو آغاز داستان سال یازدہم کے عنوان سے شروع ہوتا ہے؛ (۳) اس میں ردیف وار قصائد درج ہیں؛ (۴) یہ ظفرنامہ کا طویل اور مربوط حصہ ہے، جس میں شاہجہان کی تخت نشینی اور اس کے عہد حکومت کے آغاز کے بعض واقعات قلمبند کیے گئے ہیں؛ (۵) ساقی نامہ؛ (۶) مثنوی در وصف کشمیر؛ (۷) وہی ساقی نامہ قدرے تفاوت سے؛ (۸) یہ ظفر نامہ ہی کا ایک اور حصہ ہے جو جزو ۴ سے مربوط ہے۔ اس میں ان عمارات کا، بالخصوص دہلی مسجد (تعمیر ۱۰۴۷ھ) کا ذکر آیا ہے جن کی تعمیر دکن کی مہم سے واپسی پر شاہجہان نے کرائی۔ اس کے ورق ۱-لا پر ایک مہر ثبت ہے، جس میں سال ۱۱۵۵ھ/[۱۷۴۲-۱۷۴۳ء] درج ہے۔

پادشاہنامہ: شاہجہان نے کلیم کو اپنے عہد حکومت کے حالات بصورت مثنوی لکھنے کی فرمائش کی تھی جو اس نے کشمیر کے قیام کے

دوران میں لکھی ۔ یہ مثنوی پانچ ابواب پر مشتمل ہے : (۱) شاھجہان کی ابتدائی زندگی کے حالات؛ (۲) مقدمۂ کتاب کا کچھ حصہ اور شاھجہان کے آبا و اجداد، یعنی امیر تیمور سے ھمایوں تک کے حالات؛ (۳) شاھجہان کے عہد حکومت کے ابتدائی حصے، یعنی اس کی تخت نشینی سے ظفر خان کی مہم تبت (۱۰۴۶ - ۱۰۴۷ھ) تک کے حالات؛ (۴) تمہیدی حصہ جو معراج النبی سے شروع ہو کر شاھجہان کی ولادت تک کے حالات پر مشتمل ہے؛ (۵) وصف کشمیر .

مثنوی پادشاھنامہ کا نام سپرنگر کی اودھ کیٹلاگ، ص ۴۵۴ پر شاھنشاہ نامہ کلیم لکھا ہے؛ نیز دیکھیے میونخ کیٹلاگ، ص ۴۹ ۔ حسین پرتو بیضائی نے لکھا ہے کہ یہ مثنوی ایران کے کتابخانہ ملی میں موجود ہے ۔ اس میں تقریباً ۱۵ ہزار اشعار ھیں (دیوان کلیم، مقدمہ، طبع چاپخانۂ حیدری، ایران ۱۳۳۶ ش، ص ید) .

ان دو ضخیم مثنویوں کے علاوہ کلیم نے کچھ مختصر مثنویاں بھی لکھی ھیں جن کا ذکر ذیل میں آتا ہے .

"تعریف اکبر آباد" : کلیم اکبر آباد (آگرہ) میں بھی رھا تھا، چنانچہ اکبر آباد کی تعریف میں مثنوی لکھی، اس میں بتایا ہے کہ وھاں کی گلیاں پر پیچ ھیں، آبادی گنجان ہے، عمارتیں سنگ خارا کی بنی ھوئی ھیں، پتھر کی ھر ھر سل میں فن کاروں کی مہارت نمایاں ہے ۔ معماروں کے تیشوں نے ایسے ایسے نقش کندہ کیے ھیں کہ گلی کوچے مانی کے نقش ارژنگ کا عکس معلوم ھوتے ھیں ۔ ھر عمارت کے دروازے کا ستون ایسا معلوم ھوتا ہے کہ ایک پاؤں کے بل روح فرھاد کھڑی ہے :

پپائے ھر بنائے اکبر آباد
بیک پا ایستادہ روح فرھاد

اس مثنوی میں مقامی ماحول کی عکاسی خوب کی ہے ۔ پیشہ وروں کے سلسلے میں مہاجن، بزاز، عطار، صراف، پان فروش، خیّاط اور دھوبی کا تفصیل سے ذکر آیا ہے ایک پان فروش کے متعلق لکھا ہے :

قرارے نیست بر اقرار ایشان
ورق گرداندن آمد کار ایشان

کلیم برّصغیر کے لوگوں کی مہمانداری سے متأثر نظر آتا ہے چنانچہ اسے بھی موضوع سخن بنایا ہے ۔ دربار سے تعلق کی بنا پر کلیم نے ایسے حالات بھی لکھے ھیں جن سے اس دور کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے .

"باغ جہاں آرا" : یہ مثنوی شاھزادی جہاں آرا کے باغ اور محل کی تعریف میں لکھی ہے ۔ کچھ اس طرح ذکر آیا ہے کہ یہ محل حسن و زیبائی میں ارجمند لوگوں کے نصیبے جیسا اور بلندی میں بلند فطرت لوگوں کے رفعت خیال کے مانند ہے ۔ اس میں پتھر جو لگایا گیا ہے، آئینے کے مانند تابناک اور شفاف ہے، خوشبودار پودوں کا عکس ان میں جھلکتا نظر آتا ہے گویا یہ فردوس کا کوئی ایک محل ہے، اس کے تین طرف باغ ہے اور سامنے دریا بہتا ہے، جس کی ھر ھر موج خم زلف محبوب کی طرح دلکش اور فرحت زا ہے .

کشمیر کا باغ "فرح بخش" : شاھجہان کے باغات سے اس عہد کے ذوق نفاست اور احساس تناسب کا پتا چلتا ہے ۔ لاھور کی طرح اس نے کشمیر میں بھی شالامار باغ بنوایا تھا جس کا نام بعد میں باغ فرح بخش رکھا گیا تھا ۔ باغ فرح بخش میں کلیم نے یہاں کے چناروں، شاہ نہر اور روشوں کی عملی تصویر کشی کی ہے .

"قحط دکن" : نظام الملک کے عہد میں دکن میں خشک سالی کی وجہ سے شدید قحط پڑا، جس

کی وجہ سے بہت سے لوگ فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے ۔ ساتھ ہی وبا بھی پھوٹ پڑی ۔ اس سلسلے میں کلیم نے اہل دکن کے مصائب کی تفصیل ایک مثنوی میں بڑے درد انگیز انداز میں پیش کی ہے ۔

"تعریف جنگ فیل" : شاهزاده اورنگ زیب کی هاتھی سے جنگ مشہور تاریخی واقعہ ہے، کلیم نے اس لڑائی کو بچشم خود دیکھا تھا چنانچہ اس مثنوی میں اس کی جزئیات بڑی خوبی سے پیش کی ہیں ۔

ان کے علاوہ بعض اور مثنویاں (دولت خانۂ اکبر آباد، دولت خانۂ پادشاهی، صعوبت راہ کشمیر وغیرہ) بھی لکھیں ۔

شاهجہانی دور کے آثار جو آج بھی قائم ہیں اور ایک خاص تہذیبی دور کے آئینہ دار ہیں، ان کا عکس کلیم کی مثنویوں میں نمایاں ہے ۔ مختصر مثنویوں میں کلیم کی ایک یہ خصوصیت بھی نظر آتی ہے کہ اس نے هندی الفاظ کا اس طرح استعمال کیا ہے کہ فارسی کے جملوں میں وہ بالکل قدرتی اور مانوس معلوم ہونے لگتے ہیں ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عرفی عمر بھر هندوستان میں رہا، لیکن صرف ایک هندی لفظ "جھگڑ" زبان سے نکلا، وہ بھی اس طرح کہ گویا یہ فارسی ہی کا لفظ ہے ۔ طالب آملی نے جہانگیر کا صرف ایک ایجاد کردہ لفظ "رام رنگی" ایک شعر میں باندھا، لیکن کلیم نے یہاں هند کے بعض پیشہ ورانہ الفاظ کو اپنا کر شعروں میں اس طرح استعمال کیا کہ غرابت و ثقل کا احساس بہت کم ہوتا ہے ۔ جو هندی الفاظ اس کی زبان و قلم پر آئے ہیں، گویا یہ فارسی ہی کے الفاظ ہیں، مثلاً مہاجن، تنبولی (پان فروش)، دھوبی، جھل پٹھانی، چنبہ، گڑھل، نیم، کیوڑہ، بیڑی، پان، کٹارہ، ابری وغیرہ ۔

شبلی نے لکھا ہے کہ کلیم کی مثنویاں کم رتبہ اور عامیانہ ہیں (شعر العجم : مطبوعۂ لکھنؤ، ۳ : ۲۰۱) ، لیکن اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے ۔ کلیم کی مثنویوں کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ ان کے ذریعے زمانے کی تاریخ و ثقافت کے بعض پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ادبی پیش کش کے طور پر بھی وہ بہت اچھی نہ سہی، بری بھی نہیں ۔

کلیم نے بعض قطعات بھی لکھے ہیں جو شاهی یادگاروں پر درج ہیں، ان میں سے ایک قطعہ شاهجہان کے زمانے کی ایک اهم یادگار "مرقع گلشن" ہے، جسے مرقع شاهجہانی بھی کہتے ہیں ۔ اس کا شمار بر صغیر کے ان نفائس میں ہوتا ہے، جنھیں نادر شاہ افشار حملۂ دہلی کے بعد ایران لے گیا تھا ۔ اب یہ مرقع "موزۂ سلطنتی" میں محفوظ ہے (سفر ایران کے دوران میں راقم الحروف کو یہ مرقع دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس میں ایران و هند کے بادشاہوں، مغل شاهزادوں، شاهزادیوں، عالموں اور فن کاروں کی تصویریں ہیں، جو محمّد فقیر اللہ، میر محمّد هاشم، نادر سمرقندی اور دوسرے نامور مصوروں کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں ۔ تصویریں بڑی جاذب نظر ہیں، تصویروں کے ارد گرد منقش اور طلائی حاشیوں پر بعض لکیریں اتنی باریک ہیں کہ محدب شیشوں ہی کے ذریعے دیکھی جا سکتی ہیں ۔ انسانی تصویروں میں اعضاے جسمانی، اسلحہ و پوشاک کی جزئیات، کمال مہارت سے نمایاں کی گئی ہیں ۔ تصویروں کے علاوہ نامور خطاطوں کی تحریروں کے نمونے بھی ہیں) ۔ اس کی تعریف میں کلیم نے دو قطعے لکھے ہیں ۔ ایک قطعے کا آخری شعر یہ ہے :

چندین هزار نقش بدیع انتخاب کرد
دوران کہ شد مرقع شاہ جہانش نام

دوسرے قطعے کے دو شعروں سے پتا چلتا ہے کہ مرقع گلشن کا آغاز جنت مکانی جہانگیر کے عہد میں ہوا اور تکمیل صاحبقران ثانی شاہ جہان کے عہد میں ہوئی .

فرمائشی اشعار کہنے میں کلیم کو یدطولی حاصل تھا - کوئی شاہی محل یا کسی امیر کبیر کی عمارت مکمل ہوتی، سراپردہ تیار ہوتا، سیرشاہی بن کر آتی، کوئی قلمدان یا مجلد کتاب بادشاہ کے حضور پیش ہوتی، تو کلیم کو کتبہ لکھنے کی فرمائش ہوتی اور سرخوش کے بیان کے مطابق سب شاہی اشیا پر اس کے اشعار کندہ کیے جاتے یا لکھے جاتے (کلمات الشعرا، لاہور ۱۹۴۲ء، ص ۹۴)، فرمائشی اشعار لکھنے پر شاہجہان نے اسے دوبار سونے میں تلوایا (کتاب مذکور، حاشیہ ۹۴) .

مادۂ تاریخ نکالنے میں کلیم کو بڑی مہارت تھی، اس کی تاریخوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں بعض اہم تاریخی اور تہذیبی آثار پر روشنی ڈالتی ہیں - چند تاریخیں یہ ہیں :

دارا شکوہ کی ولادت: گل اولین گلستان شاہی (۱۰۲۴ھ)

شکارگاہ کی تکمیل : صید گاہِ نشاط و مسکن عیش (۱۰۴۶ھ)

کشمیر کی شاہی عمارت :

راحت آباد اہل عرفان (۱۰۵۴ھ)

وفات ملک قمی :

بگفتا "او سر اہل سخن بود" (۱۰۲۵ھ)

اورنگ زیب کی شادی کی تاریخ :

دو گوہر بیک عقد دوزان کشیدہ (۱۰۴۷ھ)

کلیم کی غزلیات میں ہمیں وہی طرز ادا اور انداز فکر نظر آتا ہے جو اکبر اعظم کے دور کی شاعری کا خاصّہ ہے - یہ فکر و فلسفہ کا دور تھا جس سے شعرا کا متأثر ہونا قدرتی بات تھی، لیکن اس کے لیے پر پیچ خیال انگیزی یا دقت و ابہام کی کوئی تخصیص نہیں جیسا کہ ملک الشعرا بہار کا خیال ہے (سبک شناسی، ۳ : ۲۵۹ ، ۲۶۶، نیز شہابی : روابط) - بہر حال فلسفیانہ موضوع اور فلسفیانہ توجیہات کا جو انداز بیان انھوں نے اختیار کیا وہ سادہ نہیں ہو سکتا تھا - اس خاص اسلوب کی نشاندہی کلیم کے کلام میں بھی ہوتی ہے - فلسفیانہ افکار اور انداز بیان کے علاوہ انھوں نے شاعرانہ تجسیم سے بھی کام لیا - چنانچہ انھوں نے اکثر وجدانی تأثرات کو مادّی شکل میں پیش کیا - یہ خصوصیت شاہجہانی دور کے شاعروں کے کلام میں بھی نظر آتی ہے، جس کی بہت واضح مثالیں کلیم کے اشعار میں ملتی ہیں، مثلاً :

ما ز آغاز و ز انجام جہان بے خبریم
اول و آخر این کہنہ کتاب افتادہ است

کائنات کو مجسم صورت میں پیش کرنے کے لیے کلیم نے اسے "کتاب" کہا اور کائنات کے آغاز و انجام سے بے خبر ہونے کی کیفیت اس طرح ظاہر کی کہ اس کے شروع اور آخر کے صفحات موجود نہیں - یہ شعر فلسفیانہ فکر کے علاوہ تجسیم کی بھی عمدہ مثال ہے .

قوت تخیل بھی برصغیر کے اسلوب کا خاصّہ ہے - کلیم کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مناظر عالم کی ایک ایک چیز پر اس کی نظر ہے اور اس کی قوت تخیل سے یہ مناظر نئے نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتے ہیں، مثلاً

بعد ازین تاریکی شب‌ها بخود خوش کن کلیم
شکوہ کم کن در چراغ اختران روغن نماند

کلیم اور اس کے ہم عصر شعرا نے اس اسلوب خاص کی پیروی تو کی لیکن رفتہ رفتہ فلسفیانہ توجیہات کی جگہ واقعیت نے لے لی اور مقامی

تہذیب و ثقافت واقعیت کے آئینے میں جھلکنے لگی ۔ انداز بیان صاف اور سادہ ہو گیا ۔ اس اسلوب کو "تازہ گوئی" کہا گیا، چنانچہ جہانگیر اور شاہجہان کے دور کے شعرا کا طرۂ امتیاز بھی تازہ گوئی ہی ہے ۔ کلیم نے بھی قبول عام کی سند حاصل کرنے کے لیے تازہ گوئی کو شعار بنایا ۔

کز متاع سخن امروز کساد است کلیم
تازہ کن طرز که در چشم خریدار آید

کلیم کی شاعری میں مثالیہ نگاری بہت نمایاں ہے ۔ مثالیہ شاعری کی ضرورت کسی بلند تر حقیقت کو واضح کرنے کے لیے محسوس ہوئی، اس لیے شعرائے قدیم نے مثال و حکایت کا سہارا لیا چنانچہ اسے مثالیہ شاعری کہا گیا، پھر رفتہ رفتہ ایسا ہی ہوا کہ تمثیل سمٹ کر ایک شعر میں محدود ہو گئی ۔ اس قسم کے تمثیل نگار صائب اور کلیم تھے ۔ کلیم نے شعری تمثیل کے فن کو خاص طور سے بہت ترقی دی ۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ شعر کے پہلے مصرع میں وہ کوئی حقیقت یا دعوی پیش کرتا ہے، پھر دوسرے مصرع میں مثال دے کر دعوے کو ثابت کرتا ہے مثلاً :

قطع امید کردہ نخواهد نعیم دهر
شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

دعوی یہ ہے کہ جو شخص بالکل نا امید ہو جاتا ہے ، دنیوی نعمتوں کا خیال اسے نہیں آتا ۔ اس کا استدلال یوں کیا ہے کہ درخت سے جو شاخ کٹ جاتی ہے، وہ امید بہار کی منتظر نہیں رہتی ۔ کلیم کی غزلیات اور مثنویوں میں ترکیبیں بہت سلجھی ہوئی ہیں، محاورے بڑے برجستہ استعمال کیے ہیں اور انداز بیان میں بہت روانی ہے ۔

شعرا کے ایرانی تذکروں پر نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جونہیں کسی ایرانی الاصل شاعر نے سر زمین ایران کو خیر باد کہا تو تذکرہ نویسوں نے انھیں ایرانی شعرا کی ردیف سے خارج کر دیا ۔ یہاں تک کہ عرفی، نظیری، صائب، قدسی ایسے شعرا کا نام کے سوا کوئی ذکر نہیں کیا ۔ کلیم کے متعلق رضا زادہ شفق نے صرف دو چار سطروں میں اس کا ذکر کر دینا کافی سمجھا ہے ۔ دیگر معاصرین نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا البتہ مغل بادشاہ محمد شاہ کے زمانے کے ایک ایرانی تذکرہ نویس علی قلی والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ (ریاض الشعراء، قلمی ، کتابخانہ دانشگاہ پنجاب، شمارہ ۱۷ P F I) میں اس کے حالات زندگی اور اس کی مثنویوں اور غزلیات کا انتخاب بھی دیا ہے (ورق ۱۶۶ ب تا ۱۷۵ الف) اس کے علاوہ تذکرۂ نصر آبادی میں بھی کلیم کا مختصر سا ذکر آیا ہے جس کے راقم الحروف نے حوالے دیے ہیں ۔

مآخذ : (۱) عبدالحمید : پادشاہ نامہ، کلکتہ ۱۸۶۷ء، ۱ : ۳۵۳ تا ۳۵۹؛ (۲) احمد علی سندیلوی : تذکرۂ مخزن الغرائب، طبع محمد باقر، مطبوعۂ دانشگاہ پنجاب لاہور؛ (۳) میرزا محمد طاهر : تذکرۂ نصر آبادی، تہران ۱۳۱۷ھ؛ (۴) محمد افضل سرخوش : کلمات الشعراء، مطبوعۂ لاہور؛ (۵) شیر خان لودھی : مرآۃ الخیال بمبئی ۱۳۲۴ھ؛ (۶) علی قلی والہ داغستانی : ریاض الشعراء، قلمی، کتاب خانۂ دانشگاہ پنجاب، لاہور ، شمارہ ۱۷ P F I؛ (۷) لطف علی بیگ آذر : آتشکدۂ آذر، ایران ۱۳۳۷ ش، بمدد اِشاریہ؛ (۸) شبلی نعمانی: شعرالعجم، مطبوعۂ لکھنؤ، ۳ : ۲۰۵ تا ۲۳۰؛ (۹) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند، ج ۴، فارسی ادب طبع مقبول بیگ بدخشانی، شائع کردۂ دانشگاہ پنجاب، لاہور ۱۹۷۱ء؛ (۱۰) ریو : *Catalogue of the persian Mss in the British Museum*؛ (۱۱) Ethe : *catalogue of the Persian Mss in the Liberary of India Office*؛ (۱۲) شپرنگر : *A Catalogue of the Mss.........of The Libraries of the Kings of Oudh.*، [یہ مقالہ مقبول بیگ بدخشانی

نے لکھا] .

[ادارہ]

* **کلیمُ اللہ :** حضرت موسٰی علیہ السلام کا مخصوص اعزازی لقب، جس کے معنی ہیں اللہ تعالٰی سے باتیں کرنے والا، بقول الازہری (تہذیب) وہ شخص جس سے اللہ تعالٰی نے باتیں کیں (لسان العرب، بذیل مادّہ) ۔ اس لقب کی بنیاد قرآن مجید کی ان آیات پر ہے جن میں اللہ تعالٰی اور موسٰی علیہ السلام کے درمیان بلا واسطہ باتیں کرنے کا ذکر ہے، بالخصوص : وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (۴ [النساء] : ۱۶۴)، یعنی اللہ نے موسٰی سے باتیں بھی کیں ۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں مصدر (مفعول مطلق) کے اضافے کا مطلب یہ ہے کہ کلام سے اس جگہ بلا واسطہ کلام مراد ہے اور کلام کے معنی حقیقی ہیں، نہ کہ مجازی (لسان العرب ۱۵ : ۴۲۹، س ۳ ببعد، الاشعری : الابانۃ، حیدر آباد (نیز دیکھیے ۲ [البقرۃ] : ۲۵۳؛ ۷ [الاعراف] : ۱۴۳) ان آیات میں ہر جگہ یہی تصریح ہے کہ اللہ تعالٰی نے موسٰی علیہ السلام سے کلام کیا اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ تہذیب (۱ : ۱۳۰، س ۹) نے کلیم کے جو معنی بیان کیے ہیں ان میں وسعت پیدا ہو گئی ہے .

امام البیضاوی نے حضرت موسٰیؑ کے اعزازی لقب کلیم کو بمعنی مکالم قرار دیا ہے دیکھیے اس کا ایک ہم معنی لقب جو موسٰی علیہ السلام کے لیے آیا ہے، نجی ہے : وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا (۱۹ [مریم] : ۵۲)، یعنی ہم نے موسٰی کو طور کی داہنی جانب سے آواز دی اور الٰہی راز کی باتیں کرنے کے لیے نزدیک بلایا ۔ اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام البیضاوی نے نجی کو مناجی کے مساوی قرار دیا ہے .

مآخذ : [(۱) قرآن مجید؛ (۲) تفاسیر قرآن بذیل آیات مذکورہ، در متن؛ (۳) لسان العرب، بذیل مادّہ؛ (۴) کتب متعلقہ قصص القرآن و قصص الانبیاء]؛ (۵) Goldziher : *Die Richtungen der islamischen Koranauslegung*، ص ۱۲۸؛ (۶) Dozy : *Supplément*، ۲ : ۴۸۶ ب .

(D. B. MACDONALD)

* **(شاہ) کلیم اللہ جہاں آبادی :** بن نور اللہ بن احمد المعمار الصدیقی، اپنے زمانے کے سر برآوردہ چشتی بزرگ ۔ جب اسلامی معاشرہ بری طرح بد نظمی کا شکار ہو چکا تھا تو انھوں نے برصغیر پاک و ہند میں سلسلۂ چشتیہ کا احیا کیا ۔ وہ شاہجہاں آباد (دہلی) میں ۲۴ جمادی الآخرۃ ۱۰۶۰ھ/۲۴ جون ۱۶۵۰ء کو اورنگ زیب کی تخت نشینی سے آٹھ سال پہلے پیدا ہوئے ۔ اسی لیے ان کی نسبت شاہجہان آبادی ہے ۔ ان کے آباء اجداد جو پیشے کے لحاظ سے معمار تھے، اصلًا خجند [رک باں] کے باشندے تھے ۔ ان کے باپ دادا دونوں نے مشہور و معروف لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی کی تعمیر میں نمایاں کردار انجام دیا تھا ۔ آیات قرآنی اور اسماء الحسنٰی [رک باں] سے متعلق بہت سے کتبات جن سے جامع مسجد کی زینت و آرائش ہوئی ہے، ان کے والد، استاذ نور اللہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے تکمیل تعلیم مقامی علما اور فضلا سے کی جن میں شاہ ولی اللہ دہلوی [رک باں] کے چچا ابو الرضا محمّد بھی شامل ہیں ۔ [شیخ ابو الرضا اپنے زمانے کے جید عالم تھے ۔ علوم عقلی و نقلی پر کامل عبور تھا ۔ درس و تدریس کے علاوہ نماز جمعہ کے بعد وعظ کہتے تھے ۔ وعظ میں بڑی تأثیر تھی ۔ طبیعت کا زیادہ رجحان تصوف کی طرف تھا اور وحدت الوجود کے قائل تھے] ۔ حصول تعلیم کے بعد شاہ کلیم اللہ

جہاں آبادی حج بیت اللہ اور زیارات کے لیے حجاز مقدس گئے اور وہاں بہت عرصے تک ٹھیرے رہے ۔ سلسلۂ چشتیہ میں انھوں نے شیخ یحیی بن محمود الگجراتی (م ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء) کے ھاتھ پر بیعت کی جو ھجرت کرکے مدینۂ منورہ چلے گئے تھے اور وھیں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ [شیخ یحیی مدنی سے انھوں نے شرح وقایہ کا درس بھی لیا] ۔ نزھۃ الخواطر (۶ : ۱ تا ۲۳۰) کے بیان کے مطابق حجاز رھتے ھوئے شاہ کلیم اللہ نے میر محترم اور شیخ محمد غیاث کے ذریعے نقشبندی اور قادری سلسلوں میں بھی نسبت حاصل کی ۔

دہلی واپسی پر وہ ایک مسجد میں قیام پذیر ھوئے جو لال قلعے اور جامع مسجد کے درمیان اس محلے میں واقع تھی جسے بازار خانم کہا جاتا تھا ۔ یہاں انھوں نے سلسلۂ درس و تدریس شروع کیا [بازار خانم اس وقت دہلی کا سب سے زیادہ بارونق بازار تھا جس جگہ انھوں نے اپنا مسکن بنایا وہ غالبًا ان کے خاندان کو شاھجہان نے عطا کی تھی] ۔ مدرسے کی شہرت کے باعث طلبہ بڑی تعداد میں دور دور سے آتے تھے ۔ کھانے اور رھنے کا مفت انتظام تھا ۔ مدرسے کے متعلق تفصیلی معلومات دستیاب نہیں ۔ شاہ کلیم اللہ کو حدیث کے درس میں خاص دلچسپی تھی ۔ ایک مرتبہ صوفی شاعر مرزا مظہر جان جاناں ملاقات کے لیے گئے تو شاہ صاحب اپنے شاگردوں کو صحیح بخاری کا درس دینے میں مشغول تھے ۔ مدرسہ شاید اس مسجد کا ایک حصہ تھا جس میں انھوں نے قیام کیا تھا ۔ مرزا محمد اختر گورگانی کے بیان (تذکرۃ الاولیاے ھند و پاکستان، لاھور ۱۹۵۴ء، ۲ : ۲۷۲) کے مطابق بعد میں اورنگ زیب نے حکم دیا کہ شاہ صاحب کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کی جائے جس کے ساتھ چند اور عمارات بھی شامل تھیں جن میں عبادت خانہ، مجلس خانہ اور لنگر خانے کے علاوہ اھل و عیال کے رھنے کے لیے مکانات بھی تھے ۔ مرزا محمد اختر نے اس بات کا بھی اضافہ کیا ہے کہ شہنشاہ محمد معظم بہادر شاہ اول [رک بآں] اپنی حکومت کے چوتھے سال (۱۱۲۳ھ/۱۷۱۱ء) میں جب کہ وہ باغی سکھوں کے سرغنہ بندہ بیراگی کے خلاف ایک مہم میں مصروف تھا، شاہ کلیم اللہ کا مرید بنا ۔ شاہ صاحب سادگی اور توکل کی زندگی بسر کرتے تھے ۔ معتقدین اور مریدوں کی طرف سے فتوحات بھی آ جاتی تھیں، لیکن خلیق احمد نظامی تاریخ مشائخ چشت (ص ۷ تا ۳۸۶) میں تکملۂ سیر الاولیاء کے حوالے سے لکھتا ہے کہ گزر اوقات زیادہ تر حویلی کے اس کرائے پر تھی جو حویلی کے ایک حصے سے حاصل ھوتا تھا ۔ فرخ سیر [رک بآں] نے اپنے مختصر، مگر ھنگامہ خیز دور میں شاہ صاحب کی تنگ دستی کا حال معلوم کرکے انھیں مالی امداد کی بارھا پیشکش کی، مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا [اس نے حاضر ھونا چاھا، لیکن انھوں نے کہا یہ بات ھمارے لیے تصدیع کا موجب بنے گی ۔ نماز جمعہ جامع مسجد میں پڑھتے تھے ۔ وھاں بادشاہ بھی ھوتا تھا ، مگر اجازت کے بغیر بات کرنے کی ھمت نہ ھوتی تھی] ۔

شاہ صاحب اپنے مریدوں کو حکمرانوں اور بادشاھوں کے قرب سے روکتے تھے اور نصیحت کیا کرتے تھے کہ ان کے پاس نہ جایا کریں اور ان سے ملاقات نہ کیا کریں ۔ اگرچہ سماع سے وہ خود روحانی غذا حاصل کیا کرتے تھے، لیکن ان ایام میں سماع میں ھاے وھو کا جس طرح رواج پڑ چکا تھا، اسے وہ پسند نہیں کرتے تھے ۔ اپنے ایک مکتوب (نمبر ۱۱) میں وہ ناپختہ اور مصنوعی صوفیہ کی شد و مد سے ملامت کرتے ھیں، انھیں

ملحد قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں انھوں نے شریعت کو ترک کر دیا ہے ۔ وہ غیر مسلموں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کے حق میں تھے تاکہ اس طرح وہ لوگ اسلامی تعلیمات کا اثر قبول کر سکیں ۔ اسی طرح شاہ صاحب عوام کی صحبت سے ہرگز متنفر نہیں تھے ، بلکہ اسے پسند کرتے تھے ۔ [وہ حلیم الطبع اور خوش مزاج انسان تھے ۔ دشمنوں اور مخالفوں سے بھی کبھی ناراض نہ ہوتے تھے اور حسن اخلاق سے دلوں میں جگہ کرنا ان کا کام تھا] ۔ وہ وحدت الوجود جیسے پیچیدہ مسئلے پر اندھا دھند بحث مباحثے کے سخت خلاف تھے ۔ زندگی بھر وہ اعلاے کلمۃ الحق اور اسلام حقیقی، کی اشاعت کے لیے جد و جہد کرتے رہے ۔ [ان کی اس تحریک احیا کا یہ نتیجہ نکلا کہ دکن میں اسلام کی بڑی تبلیغ ہوئی اور بالخصوص پنجاب، بہاولپور اور سرحد میں ان کے سلسلے کے بعد میں آنے والے بزرگوں خواجہ نور محمّد مہاروی، قاضی محمّد عاقل، خواجہ محمّد سلیمان تونسوی، خواجہ شمس الدّین سیالوی، خواجہ غلام حیدر شاہ جلالپوری اور پیر مہر علی شاہ گولڑوی [رک باں] کی مساعی کی بدولت اسلام کو نئی زندگی نصیب ہوئی] ۔

شاہ صاحب لمبی عمر پا کر دہلی میں ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ/۱۷ اکتوبر ۱۷۲۹ء کو فوت ہوے اور اپنی خانقاہ کے صحن میں دفن ہوے جہاں آپ کے سکونتی مکانات بھی تھے ۔ ان کے سال وصال میں اختلاف ہے ۔ نزھة الخواطر (۶ : ۲۴۳) میں ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء اور ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء بتایا گیا ہے ۔ سواء السبیل کے ضمیمے (ص ۱۳۹) میں ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء اور غلام علی آزاد بلگرامی کی مآثرالکرام (حیدر آباد دکن ۱۹۱۰ء، ۱ : ۳۴) میں ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء درج ہے ۔ چونکہ بہت سے مصنفین کا اس پر اتفاق ہے اس لیے ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء کا سال وثوق سے اختیار کر لیا گیا ہے ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد وہ تمام محلہ جہاں ان کی خانقاہ واقع تھی، برطانوی فوج نے ملیامیٹ کر دیا، البتہ ان کی قبر باقی رہنے دی گئی تھی جو بدستور شکستہ حالت میں رہی اور اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی، تا آنکہ کوئی چالیس سال بعد [مذکورۂ بالا قاضی محمّد عاقل کی اولاد میں سے] خواجہ غلام فرید نے جو نواب بہاول پور [رک باں] کے مرشد طریقت تھے، اس کی تعمیر نو کے لیے معتدبہ رقم دی ۔ شاہ صاحب کے ورثا میں سے ایک نے بعد میں اس کی مرمت کرائی اور اسے از سر نو تعمیر کرایا ۔ سنگتراشی کرکے قبر کے اردگرد خوبصورت کٹھرا بنوایا گیا اور سنگ مرمر کی سلوں سے فرش بچھایا گیا ۔ ان کا مقبرہ ابھی تک موجود ہے اور لال قلعے اور جامع مسجد کے درمیان تنہا یہی عمارت ہے ۔ ہر سال ان کا عرس منایا جاتا ہے ۔ دہلی کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر [رک باں] اور شاہزادگان اس میں باقاعدگی سے شریک ہوا کرتے تھے ۔

شاہ صاحب کے خلیفۂ اعظم حضرت شاہ نظام الدّین اورنگ آبادی تھے، جنھیں تصوف کے مسائل کے متعلق انھوں نے بہت سے خطوط لکھے تھے ۔ شاہ صاحب کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں، لیکن ان کی وفات کے وقت تینوں بیٹے نابالغ تھے ۔

[مناقب فریدی میں شاہ صاحب کی تصانیف کی تعداد ۳۲ بتائی گئی ہے ۔ ان میں سے قرآن القرآن، عشرۃ کاملۃ ، سواء السبیل ، کشکول ، مرقع ، تسنیم ، الہامات کلیمی ، رسالۂ تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیہ اور شرح القانون دستیاب ہیں ۔ ان سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ بعض کتابوں میں ان کی ایک تصنیف رد روافض

کا بھی ذکر ہے ۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ علم منطق پر بھی ان کا ایک رسالہ تھا ۔ اردوے معلّی میں حکیم سیّد احمد حسن مودودی کے نام اسد اللہ خان غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب شعر بھی کہتے تھے اور ان کا کلام ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے دوران میں تلف ہو گیا تھا ۔

قرآن القرآن عربی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر ہے جسے جلالین کے ہم پایہ بتایا گیا ہے ۔ [و اللہ اعلم] فرق صرف یہ ہے کہ وہ شافعی مذہب کی ہے اور یہ حنفی کی ۔ ۱۲۹۰ھ میں مطبع احباب میرٹھ سے یہ اس طرح شائع ہوئی کہ حاشیے پر اس کا متن تھا اور آیات قرآنی کے نیچے شاہ رفیع الدّین کا ترجمہ تھا ۔ مولانا محمّد قاسم نانوتوی نے تاریخ کہی تھی ۔ عشرۃ کاملۃ، سواء السبیل، کشکول اور مرقع طبع ہو چکی ہیں ۔ یہ چاروں کتابیں اور تسنیم اور الہامات کلیمی تصوف سے متعلق ہیں ۔ عشرۃ کاملۃ عربی میں ہے اور اس میں تصوف کے دس مسائل بیان کیے گئے ہیں ۔ کشکول کا سال تصنیف ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء ہے ۔ صوفیۂ متأخرین کا یہ دستور العمل رہا ہے کہ خرقۂ خلافت دیتے ہوے یہ کتاب اور مرقع ساتھ دیا کرتے تھے ۔ تسنیم کو بھی صوفیہ نے بہت پسند کیا ۔ قاضی محمّد عاقل اس کا درس دیا کرتے تھے ۔ رسالۂ تشریح الافلاک عاملی کی شرح علم ہیئت سے متعلق ہے، جس کا ایک نسخہ نذیریہ پبلک لائبریری دہلی میں موجود ہے ۔ شرح القانون کا واحد نسخہ رامپور کے کتابخانے میں ہے ۔

ان تصانیف کے علاوہ ۱۳۲، مکتوب بھی شاہ صاحب کی یادگار ہیں جو مکتوب کلیمی کے نام سے طبع ہو چکے ہیں ۔ مسائل تصوف کے علاوہ ان سے شاہ صاحب کی تبلیغی سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے ۔ ان میں سے بعض خطوط شاہ نظام الدّین اورنگ آبادی کے علاوہ دیگر لوگوں کے نام ہیں] .

مآخذ : (۱) غلام سرور لاہوری : خزینۃ الاصفیاء، کانپور ۱۹۱۴ء، ۱ : ۴۹۴ تا ۴۹۵؛ (۲) محمّد حسین مراد آبادی : انوار العارفین، بریلی ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء، ص ۲۹۴ تا ۳۰۰؛ (۳) گل محمّد احمد پوری : تکملۂ سیر الاولیاء، دہلی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء، ص ۷۴ تا ۸۵؛ (۴) انجم الدّین: مناقب المحبوبین، رام پور ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء، ص ۵۴ تا ۶۴؛ (۵) آزاد بلگرامی : مآثرالکرام، حیدر آباد ۱۹۱۰ء، ۱ : ۴۲؛ (۶) احمد اختر مرزا : مناقب فریدی ، دہلی ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء، ص ۴۳؛ (۷) وہی مصنف : تذکرۃ الاولیاء ہند و پاکستان ، لاہور ۱۹۵۴ء، ۲ : ۲۷۱ تا ۲۷۲؛ (۸) رحمٰن علی : تذکرۂ علماے ہند، لکھنؤ ۱۸۹۴ء، ص ۱۷۲، اردو ترجمہ از ایوب قادری، کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۳۹۷ تا ۳۹۸؛ (۹) فقیر محمّد : حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۹۱۴ء، ص ۴۳۸ تا ۴۳۹؛ (۱۰) زین العابدین : تذکرۃ المعین فی ذکر الکاملین، بریلی ۱۸۹۰ء، ص ۱۳۲ تا ۱۳۴؛ (۱۱) بشیر الدّین احمد : واقعات دارالحکومت دہلی ، آگرہ ۱۹۰۹ء، ۳ : ۱۱۶ تا ۱۱۷؛ (۱۲) سیّد احمد ولی اللّٰہی : یادگار دہلی، مطبوعۂ دہلی، ص۳۴؛ (۱۳) خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت ، دہلی ۱۹۵۳ء، ص ۲۳۱، ۲۳۲، ۳۶۶ تا ۴۲۶؛ (۱۴) عبدالقادر : واقعات عبدالقادر خانی، (اردو ترجمہ بعنوان علم و عمل از ایوب قادری، کراچی ۱۹۶۰ء، ۱ : ۲۲۲)؛ (۱۵) مکتوبات کلیمی ، دہلی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء؛ (۱۶) *List of Muhammadan and Hindu Monuments*، کلکتہ ۱۹۱۹ء، ۱ : ۱۵۰ (شاہ صاحب کے مقبرے کی عمارت کی تفصیلات)؛ (۱۷) عبدالحی لکھنوی : نزہۃ الخواطر، حیدرآباد ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۸ء، ۶ : ۲۴۰ تا ۲۴۱ .

(اے - ایس بزمی انصاری و [ادارہ])

⊗ **اَلْکُلِیْنی** : ابو جعفر محمّد بن یعقوب رازی کلینی ۔ اَلْکُلِیْنی کُلَیْن کے رهنے والے تھے، کُلَیْن، رَے کا قصبه یا قریه ہے، (بار ٹولڈ، ترجمۂ حمزه سردار : جغرافیۂ ایران، ص ۱۷۹، تهران) .

رَے ابتدائی دورِ اسلام میں فتح هوا اور بنی امیه کے عہد تک والی کا صدر مقام رها ۔ بنو عباس کے خلیفه منصور نے اس پر مزید توجه کی ۔ اس کا فرزند مہدی رے آیا اور اس نے اس شہر میں محل، باغ، مسجد اور حصار بنوائے ۔ ۱۸۸ھ میں جریر بن عبدالحمید الحافظ یہاں قیام پذیر رہے ۔ خلیفه هارون الرّشید یہاں پیدا هوا ۔ امام محمّد بن حسن شیبانی رے میں فوت هوے ۔ ۱۹۲ھ میں قراءت و لغت میں نحو کے امام النسائیؒ یہاں دفن هوے ۔ ۲۵۱ھ میں محمّد بن زکریا رازی یہاں پیدا هوے (لارڈ کرزن، ترجمه علی جواهر کلام : ایران، ص ۴۶) .

رے کے قریب شاهراه قم سے مشرق کی سمت پانچ کیلومیٹر کے فاصلے پر ''کُلَیْن'' نامی قصبه واقع ہے جو ابو جعفر محمّد بن یعقوب کا وطن تھا ۔ فرهنگ جغرافیائی ایران، ۱ : ۳۰۳؛ کُلَیْن بر وزن زُبیر، تهرانی و رازی عوام کا تلفظ ہے ۔ مجدالدّین فیروز آبادی، محمّد مرتضی الزبیدی، اور دوسرے حضرات کے مابین اس کے تلفظ میں جو اختلاف ہے اس کا سبب مختلف علاقوں کے عوامی تلفظ هیں ۔ (مقدمة الکافی، ص ۴۱؛ جنة النعیم، ص ۵۱۵) ۔ [ابن الأثیر نے کُلَیْن (بضم الکاف و کسر اللام) تحریر کیا ہے (اللباب فی تهذیب الانساب، ۳ : ۴۹؛ نیز السمعانی : کتاب الانساب بذیل الکلینی) ۔ کلین کے نامور علما کا ذکر تذکروں میں آتا ہے ۔ اس کے آثار اب بھی موجود هیں .

ابو جعفر الکلینی کا خانواده فقه و حدیث میں خاص امتیاز رکھتا تھا، ان کے والد یعقوب بن اسحٰق بھی عالم تھے اور ان کے ماموں ابو الحسن علی بن محمّد بن ابراهیم بن ابان، علّان کلینی بھی محدّث و فقیه تھے ۔ اسی عالمانه ماحول میں ان کی ولادت هوئی ۔ تاریخ ولادت محفوظ نہیں ره سکی ۔ اگر ان کی عمر اوسطاً ساٹھ ستر سال مانی جائے تو ان کی ولادت ۲۶۰ اور ۲۷۰ھ کے مابین هوئی هوگی .

معلوم هوتا ہے که ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کرنے کے بعد انھوں نے رَے، قم اور نیشاپور کے نامور اساتذه کے سامنے زانوے تلمذ ته کیا ۔ الکافی کی ترتیب و تبویب سے اندازه هوتا ہے که مؤلف کو علم عقائد و کلام، معقولات و فقه میں بےمثال مہارت تھی، ان کا حافظه قوی اور بصیرت پخته تھی، نیز تاریخ و رجال، درایت و روایت، تفسیر و ادب پر عبور تھا، الکافی کا مقدمه مؤلف کی وسعت نظر، قدرت تحریر، قدرت اسلوب اور کمال فہم و بصیرت کا آئینه دار ہے ۔ ان کے علمی مرتبے اور جلالت قدر کے بارے میں نجاشی (کتاب الرجال، ص ۲۶۶) اور الطوسی (فهرست، ص ۳۲۶) نے لکھا ہے که کلینی اپنے عہد میں رے کے شیخ الاصحاب اور باوجاهت عالم اور فاضلِ حدیث تھے .

کتب رجال سے اندازه هوتا ہے که ابو جعفر محمّد کلینی کا بیشتر وقت وطن میں گزرا ۔ تیسری صدی هجری کے ربع آخر میں حمدان قرمط نے دین کی مخالفت اور اسلام دشمن سرگرمیاں تیز کیں اور عراق و ایران میں طوفان برپا کر دیا ۔ رے قرمطیوں کی آماجگاه تھا (سیاست نامه، باب ۴۷) ۔ هوسکتا ہے که علامه کلینی نے کتاب الرد علی القرامطه انھیں دنوں میں لکھی هو ۔ کچھ عرصے کے لیے وه رے کو چھوڑ کر بغداد چلے گئے ۔ مقتدر باللہ کے دور خلافت میں علّامه کلینی فقہاے امامیه کے زعیم تھے (تاج العروس، ۹ : ۳۲۲) ۔ اس عظمت کا اعتراف

بڑے بڑے علما نے کیا ہے (روضات الجنات، ۶ : ۱۰۹) .

ابو جعفر محمّد بن یعقوب کلینی نے ماہ شعبان ۳۲۹ھ/مئی ۱۹۴۱ء میں وفات پائی (کتاب الرجال، ص ۹۵م) ۔ نماز جنازہ محمّد بن جعفر ابو قیراط الحسنی نے پڑھائی ۔ ابوجعفر الکلینی، کثیر التلامذہ محدّث ھیں، رجال پر لکھی ھوئی کتابوں میں ان کے تلامذہ کے نام مذکور ھیں .

ابو جعفر محمّد بن یعقوب کلینی معروف مصنف بھی تھے، ان کی کتابیں دستبرد زمانہ سے ضائع ھو گئی ھیں، لیکن فہارس اور قدیم کتابخانوں میں ان کا سراغ ملتا ہے ۔ ان کتابوں میں سے چند یہ ھیں :

(۱) کتاب تفسیر یا تعبیر الرؤیا (الطوسی : الفہرست، ص۳۵ ؛ النجاشی: کتاب الرجال، ص۳۶۷؛ معالم العلماء، ص۸۸؛ الذریعہ، ۴:۲۰۸)؛ (۲) کتاب الرجال (النجاشی، ص ۲۶۷)؛ (۳) کتاب الرد علی القرامطہ (المسعودی : التنبیہ والاشراف، مطبوعۂ بیروت، ص ۳۹۶؛ النجاشی : الرجال، ص ۳۶۷؛ الطوسی : الفہرست، ص ۳۲۷ ؛ کشف الحجب والاستار، ص ۴۳۴)؛ (۴) کتاب الرسائل، رسائل الائمہ (النجاشی : الرجال، ص ۲۶۷؛ الطوسی : الفہرست، ص ۳۲۷)، ابن طاؤس نے کشف المحجہ میں کتاب کے معاصر نسخے کا تذکرہ اور اس کے اقتباسات نقل کیے ھیں؛ (۵) کتاب ما قیل فی الائمہ علیہم السلام من الشعر (النجاشی : الرجال، ص ۳۶۷)؛ (۶) کتاب الکافی .

اپنے ایک دوست کے خط سے متأثر ھو کر انھوں نے مقدمہ اور کتاب کافی لکھی اور یہ تمنا ظاہر کی کہ "اگر موت نے مہلت دی تو اس سے زیادہ وسیع و مکمل انداز میں کتاب لکھوں گا ۔ جس میں تمام حقوق ادا ھو جائیں گے، انشاء اللہ" (الکافی، ص ۹) .

مؤلف موصوف نے ھر بڑے عنوان کے ذیل میں چھوٹے چھوٹے عنوان قائم کیے، الاقوی فالاقوی کے اصول پر پوری کتاب یوں مرتب کر دی کہ عقائد و اخلاق اور اعمال و احکام میں جس مسئلے پر احادیث کی ضرورت ھو، عنوان دیکھیے اور حدیثیں پڑھ لیجیے ۔ عنوان اتنے واضح رکھے کہ ذیل میں جمع شدہ احادیث کا خلاصہ ھوں اور پڑھنے والا ان کا مطلب سمجھ لے ۔ اس محنت طلب اور صبر آزما کام پر شیخ نے بیس سال صرف کیے (تمام مصادر) ۔ شیخ نے بڑے عنوان کا نام "کتاب" اور ذیلی عنوانوں کا نام "باب" لکھا ہے .

"دارالکتب الاسلامیہ تہران" کا تحقیقی متن شائع ھو چکا ہے (سید ابوالقاسم الخوئی : معجم رجال الحدیث، المدخل، ص ۴۱، طبع ۱۹۷۰ء) .

عام طور پر الکافی کی تقسیم، الاصول، الفروع اور الروضہ کے نام سے کی گئی ہے ۔ خصوصیات :

(۱) الکافی سے پہلے کی تالیف میں بصائر الدرجات اور کتاب المحاسن آج بھی موجود ھیں، لیکن کافی کی جامعیت نے فقہا و محدّثین کو ھر کتاب سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیا ہے ۔ وقت تالیف سے لے کر آخر عمر تک اور ۳۲۹ سے آج (۱۳۹۴ھ) تک الکافی درس و مطالعہ، حاشیہ و شرح اور تجرید و تنقید کا موضوع ہے؛ (۲) مؤلف زمانِ ائمہ و اصحاب ائمہ اھل بیت کے قریب تھے؛ (۳) شیخ نے ھر حدیث کو کامل السند اور کامل المتن وارد کیا ہے سوائے چند احادیث و اقوال کے) جس کا سبب یا تو اصل مروی عنہ سے نقل ہے یا حوالہ عام دسترس میں تھا؛ (۴) تخریج احادیث میں وہ صحت و وضوح کو مقدم کرتے اور اسی ترتیب سے روایات نقل کرتے ھیں؛ (۵) احادیث کی تقطیع اور استخراج

حکم کر کے قاری کو اپنا پابند نہیں کرتے؛ (۶) متعارض احادیث لانے سے احتراز کرتے ہیں؛ (۷) اقرب طرق روایت کا ذکر کرتے ہیں، حتّٰی کہ بعض ثلاثیات بھی نظر آتی ہیں؛ (۸) الکافی چوتھی صدی ہجری کے بعد تک کئی کتب حدیث سے زیادہ احادیث کی حامل ہے ۔ ان حدیثوں کی تعداد صاحب لؤلؤۃ البحرین کے خیال میں ۱۶۱۹۹ یا ۱۵۹۷۷ ہے ۔ علی اکبر غفاری نے جدید طرز پر احادیث شماری کے بعد ان کی تعداد ۱۵۱۷۶ بتائی ہے (سید جواد : حاشیہ شرح الکافی، ص ۹).

چونکہ اس کتاب میں فقہا و متکلمین دونوں کے لیے بہت زیادہ مواد موجود ہے، اس لیے ہر ذوق کے علما نے اس کی شرح کی ہے، مثلاً : (۱) محمد باقر داماد (م ۱۰۴۰ھ) : الرواشح السماویہ فی شرح الاحادیث الاسامیہ (عربی)، مطبوعۂ ۱۳۱۱ھ؛ (۲) ملا صدر الدین شیرازی (م ۱۰۵۰ھ) : شرح الکافی (عربی)، مطبوعہ؛ (۳) شرح محمّد امین الاستر آبادی الاخباری (م ۱۰۳۶ھ)؛ (۴) شرح ملّا محمّد صالح مازندرانی (م ۱۰۸۰ھ) (فقہی شرح)؛ (۵) ملّا محمّد باقر مجلسی (م ۱۱۱۰ھ) : مرآۃ العقول (عربی)، ۴ جلدیں، مطبوعہ؛ (۶) ملّا محمد محسن الفیض الکاشانی (م ۱۰۹۱ھ) : الوافی (عربی)، ۳ جلدیں، مطبوعہ؛ (۷) ملّا خلیل القزوینی : الصافی، (فارسی)، مطبوعہ ۔ ارباب فہارس نے کم و بیش اٹھارہ شروح اور اکیس حواشی کا تذکرہ کیا ہے ۔ اس میں برصغیر میں لکھے ہوے ترجموں اور خلاصوں کا ذکر نہیں (جواہر کلام = فہرست کتب خطی، ص ۶۶؛ مقدمۃ الکافی، ص ۳۷)، مثلاً ظفر حسن امروہوی کا ترجمہ، ۳ جلدیں، مطبوعہ؛ نواب محمّد حسین خان : کتاب العقل، کتاب التوحید و کتاب العلم کا متن و ترجمہ، مطبوعہ، باقی غیر مطبوعہ؛ فاضل ظہور حسین کا ترجمہ و شرح کتاب الایمان و الکفر مطبوعہ؛ سید یوسف حسین امروہوی : از اول تا کتاب العقل و الجہل، مطبوعۂ ۱۹۲۷ء.

حل لغات، احوال رواۃ، جرح و تعدیل، روایات پر بکثرت کام ہوا ہے، اس لیے قدیم و جدید متعدد مطبوعات ملتے ہیں ۔ راقم مقالہ کے پاس نفیس خطی نسخوں کے علاوہ چھپے عمدہ ایڈیشن بھی ہیں ۔ بڑے کتاب خانوں میں بہت سے خطی اور مطبوعہ نسخے موجود ہیں ۔ خود راقم مقالہ نے تجرید الکافی کے نام سے الاصول کا خلاصہ اور عربی شرح لکھی ہے جو قلمی ہے.

جناب ہاشم معروف الحسینی نے دراسات فی الکافی للکلینی و الصحیح للبخاری کے نام سے ایک تقابلی مطالعہ شائع کیا ہے (بیروت ۱۳۸۸ھ) اور مجتہد اکبر سید ابوالقاسم الخوئی النجفی نے معجم رجال الحدیث کے مقدمے میں نئے اسلوب سے کتاب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے (المدخل، نجف ۱۳۹۰ھ) ۔ ثقۃ الاسلام الشیخ الحافظ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی نے الکافی لکھ کر فن حدیث کی عظیم خدمت سر انجام دی ہے.

مآخذ : (۱) حسین علی محفوظ : مقدمۃ الکافی تحقیق علی اکبر غفاری : الاصول من الکافی، ج ۱، تہران ۱۳۷۴ھ (تحقیقی مقالہ جو سو مصادر پر مبنی ہے)؛ (۲) محمد باقر الکمرئی : مقدمۂ شرح و ترجمۂ فارسی : الاصول من الکافی، ج ۱، تہران ۱۳۸۱ھ؛ (۳) سیّد جواد مصطفوی : مقدمۂ اصول کافی، ج ۱، طبع تہران ۱۳۸۹ھ؛ (۴) شیخ اسمٰعیل کجوری : جنۃ النعیم فی احوال عبد العظیم، تہران ۱۲۹۵ھ؛ (۵) ابو العباس احمد بن علی النجاشی : کتاب الرجال، بمبئی ۱۳۱۷ھ؛ (۶) ابو جعفر محمد بن حسن الطوسی : الفہرست، کلکتہ ۱۲۷۱ھ؛ (۷) وہی مصنف : رجال الطوسی، نجف ۱۳۸۱ھ؛ (۸) فضل اللہ الالٰہی : عین الغزال

فی فہرس الاسماء الرجال، تہران ۱۳۱۰ھ؛ (۹)
محمد بن علی الاردبیلی الحائری : جامع الرواۃ و ازاحۃ
الاشباهات عن الطرق و الاسناد، تہران ۱۳۳۱ھ؛ (۱۰)
الخوانساری : روضات الجنات، ج ۶، تہران ۱۳۹۰ھ؛
(۱۱) محمد تقی التستری : قاموس الرجال، ج ۸، قم
۱۳۸۷ھ؛ (۱۲) مرتضی حسین : تاریخ تدوین حدیث و
شیعہ محدثین، راولپنڈی ۱۹۰۷ء، پچاس سے زیادہ
مآخذ کے حوالے؛ (۱۳) ذوالفقار حسین : ثقۃ الاسلام
کلینی اور کافی، لکھنؤ ۱۹۶۰ء؛ (۱۴) محمد رضا
الطبسی : الشیعہ و الرجعہ، ج ۱، نجف ۱۳۷۵ھ؛
(۱۵) سید ہاشم معروف : دراسات فی الکافی للکلینی و
الصحیح للبخاری، بیروت ۱۳۸۸ھ؛ (۱۶) السید
ابو القاسم الخوئی : معجم رجال الحدیث اور المدخل،
نجف ۱۳۹۰ھ؛ (۱۷) سید محسن الامین : اعیان الشیعہ،
ج ۱، دمشق ۱۳۵۳ھ؛ (۱۸) وہی مصنف : کتاب
مذکور، ج ۴۷، بیروت ۱۳۸۰ھ؛ (۱۹) نظام الملک :
سیاست نامہ؛ (۲۰) شیخ عباس قمی : تتمۃ المنتہی
فی وقائع ایام الخلفاء، تہران؛ (۲۱) وہی مصنف :
تحفۃ الاحباب فی نوادر الاصحاب، تہران ۱۳۶۹ھ؛
(۲۲) عبداللہ المامقانی : تنقیح المقال فی علم الرجال،
نجف ۱۳۵۲ھ؛ (۲۳) محمد شفیع الموسوی : الروضۃ
البہیۃ فی الطریق الشفیعہ، تہران ۱۳۷۸ھ؛ (۲۴)
شیخ عباس قمی : فوائد الرضیہ فی احوال علماء
المذہب الجعفریہ، تہران ۱۳۶۷ھ؛ (۲۵) ابن الأثیر :
الکامل فی التاریخ، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۲۶) ابن حجر العسقلانی :
لسان المیزان، حیدر آباد دکن ۱۳۳۱ھ؛ (۲۷)
شیخ یوسف البحرانی : لؤلؤۃ البحرین، تہران ۱۲۶۹ھ؛
(۲۸) محمد حسین النوری : مستدرک الوسائل،
تہران ۱۳۲۱ھ؛ (۲۹) وہی مصنف : نہایۃ الدرایۃ،
لکھنؤ ۱۳۲۳ھ؛ (۳۰) السید رضی الدین ابن طاؤس :
کشف المحجہ الثمرۃ المہجہ، نجف ۱۳۷۰ھ؛ (۳۱)
الدرایہ، مطبوعۂ نجف؛ (۳۲) مرتضی حسین فاضل :
اوصاف الحدیث، لکھنؤ.

(مرتضی حسین فاضل)

کماخ : (کَماخ، کَمخ، یونانی : Κάμαχα) ⊙
دریاے فرات (قرہ صو) کا بہاؤ جہاں شمال مشرق سے
جنوب مغرب کی طرف ہے اور ابھی اس کا سیدھا جنوب
کی طرف رخ نہیں ہوا ہے اس حصے کے جنوبی کنارے
پر قلعۂ کماخ واقع ہے۔ اس مقام پر دریا اونچی اونچی
چٹانوں کے درمیان اس قدر تنگ راستے سے ہو کر
گزرتا ہے کہ اس شاہراہ کے لیے جو یہاں تک اس
کے ساتھ ساتھ چلتی ہے کوئی گنجائش باقی نہیں
رہتی ۔ شہر کماخ جو انیسویں صدی کے اواخر تک
بھی ایشیاے کوچک کے جنگی سامان سے آراستہ
شہروں میں شمار ہوتا تھا، ایک پہاڑی ڈھلان پر
واقع ہے۔ اور پھل دار باغات اور میوے کے تختوں سے
گھرا ہوا ہے ۔ موسم بہار میں شہتوتوں کی کثرت کی
وجہ سے یہاں ہزار ہا بٹیر کھنچ آتا ہے اور اس واقعے
کو لوگ ایک طرح سے خرق عادت سمجھتے ہیں ۔
اس کے آس پاس جنگلات میں جو کڑیاں ۔ شہتیر
وغیرہ کاٹے جاتے ہیں، انہیں دور دور بھیجنے کے لیے
مقامی لوگ ابھی تک دریا کو کام میں لاتے ہیں
اور ان کے بیڑے باندھ کر بہاؤ پر چھوڑ دیتے
ہیں اور وہ ساحل کی منڈیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔
کماخ میں نمک، پنیر، اور کتان تیار کیے جاتے
ہیں اور بہت مشہور و مقبول ہیں [تفصیل کے لیے
دیکھیے ۃ لائیڈن، بار اول بذیل مادّہ].

مآخذ : (۱) ابن الأثیر : الکامل، طبع Tornberg،
۳ : ۳۳۳؛ ۵ : ۳۲۲ ببعد؛ ۱۲ : ۳۱۲؛ (۲) الیعقوبی :
تاریخ، طبع Houtsma، ۲ : ۳۴۷؛ (۳) البلاذری :
فتوح، طبع de Goeje، ص ۱۸۴ ببعد؛ (۴) *BGA*،
۲ : ۱۲۹ ببعد ۶ : ۱۷۴؛ (۵) M. Th. Houtsma :
Recueil de textes rel. à l'hist. des Seldjoucides، ج ۳
و ۴، بمدد اشاریہ؛ (۶) یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld،

۳ : ۸۶۰؛ ۴ : ۳۰۳؛ (۷) حمداللہ المستوفی : نُزْہَۃ القلوب، طبع و ترجمہ G. Le Strange، سلسلۂ یادگار گب، ج ۲۳، بمدد اشاریہ؛ (۸) Const. Porphyrog : *De adm. imp.*، طبع بون، ۳ (۱۸۴۰ء)، ص ۲۲۶؛ (۹) J. Saint-Martin : *Mém. hist. et géogr. sur l'Arménie*، ۱ : ۲۷ بعد، ۲ : ۴۳۳، ۴۳۰؛ (۱۰) v. Hammer : *Narrative of Travels ... by Evliya Efendi*، لنڈن، ۱۸۵۰ء، ۲ : ۱۹۹ بعد؛ (۱۱) G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۱۱۸؛ (۱۲) v. Hammer : *Gesch. d. osm. Reiches*، ۱ : ۲۴۹؛ ۲ : ۴۲۰؛ (۱۳) Ritter : *Erdkunde*، ۱۰ : ۲۸۷ بعد؛ (۱۴) J. Brant، در *The Journal of the Geographical society*، ۱۸۳۶ء، (مصنف کو نہیں مل سکا)؛ (۱۵) E. Reclus : *Nouvelle Géographie Universelle*، ۹ : ۳۶۳؛ (۱۶) *Peace Handbooks*، ۱۱، لنڈن ۱۹۲۰ء، عدد ۶۲، ص ۳۳؛ (۱۶) V. Cuinet : *La Turquie d' Asie*، پیرس ۱۸۹۲ء، ص ۲۰۰ بعد.

(وو، لائیڈن، بار اول [تلخیص از ادارہ])

* **کِمَاک** : (اسے عام طور سے کِیمَاک لکھا جاتا ہے؛ [ابن خرداذبہ، نیز المقدسی نے اس کا تلفظ کَیْمَاک بتایا ہے] ان ترکوں کا نام ہے جو دریاے اِرتش کی زیریں گزرگاہ پر آباد ہیں۔ ابن خُرداذبہ (متن در BGA.، ۶ : ۲۸ و ۳۱) ایک سڑک کا ذکر کرتا ہے جو طَرَاز (حال اَوْلیا آتا) یا اس سے سات فرسخ پر کُویکت سے وہاں تک آتی ہے (۸۰ یا ۸۱ روز کی مسافت) اور گردیزی (در Barthold : *Otčet O poiezdk'e v Sredn'juju Aziju*، ص ۸۲ بعد) ایک اور راستے کی پوری کیفیت لکھتا ہے جو فاراب (اُتْرار) سے (براہ جُنْکِند؛ آج کل اس کے کھنڈر جانکِنْت کے نام سے موسوم ہیں اور سیر دریا کے دہانے کے جنوب میں واقع ہیں) آتا ہے۔ بقول المقدسی (در BGA، ۳ : ۲۷۴) چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں کماک کا ایک حصہ ترکستان کے اسلامی مقبوضات کے متصل علاقے میں آباد ہو چکا تھا۔ کماک کی تاریخی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ آگے چل کر ان میں قِپْچاق کی انتہائی کثیر التعداد قوم پیدا ہوئی (جسے یورپ میں کمان Kuman اور روسی پولوتزی Polovitzi کے نام سے پکارتے ہیں)۔ ابتدا میں یہ محض کماک کا ایک قبیلہ تھا۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی (ان کا ذکر الادریسی کے ہاں ملتا ہے تو اس کا مأخذ بعض کتابیں ہی ہو سکتی ہیں) سے کماک کا نام غائب ہو جاتا ہے اور پھر عہد مغول میں اس کا دوبارہ ذکر نہیں آتا، دیکھیے J. Marquart، در *Osttürkische Dialektstudien*، ۱۹۱۴ء، بمدد اشاریہ، بذیل مادۂ کیماک؛ تلفظ کے بارے میں دیکھیے ص ۸۹، حاشیہ ۱).

(W. Barthold)

کِمال پاشا زادہ : (شمس الدین احمد بن سلیمان بن کمال پاشا) عثمانی مؤرخ، فقیہ اور صاحب طرز انشا پرداز جسے اکثر ابن کمال پاشا بھی کہتے ہیں.

کِمال پاشا زادہ ادریانوپل کے ایک ممتاز خاندان سے تھا۔ اس کا باپ سلیمان پاشا ایک متمول رئیس تھا اور دادا کمال پاشا تھا جس نے اس کے باپ کی طرح دشمنان اسلام کے خلاف بارہا لڑائیوں میں حصہ لیا اور بڑی عزت و شہرت حاصل کی [اس کے بارے میں رك بہ سجل عثمانی]۔ کمال پاشا زادہ نے پہلے پہل بایزید کی فوج میں ملازمت کی تھی، [لیکن سرکار کے ہاں اہل علم کا اعزاز و اکرام دیکھ کر اسے عالم بننے کا شوق پیدا ہوا اور وہ] فوج کی ملازمت ترک کر کے لطفی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گیا۔ لطفی ادریانوپل

کے دارالحدیث میں قسطلانی [رک بآں]، خطیب زادہ
اور معرّف زادہ جیسے نامور اساتذہ کے ساتھ فقہ
اسلامی سے متعلق علوم کا درس دیا کرتا تھا۔ جب
کمال پاشا زادہ نے اپنی تعلیم ختم کر لی تو اسے
(ادرنہ) کے شہرۂ آفاق مدرسۂ علی بیگ میں پڑھانے
پر مقرر کر دیا گیا، لیکن اس کے تھوڑے ہی دن
بعد اسے مدرّس کے عہدے پر اسکوب میں بلا لیا
گیا اور وہاں سے آخر کار ادرنہ آ گیا اور مدرسۂ حلبیہ
میں درس دینے لگا۔ ایک مدت تک قاضی القضاۃ حاجی
حسن زادہ کی عداوت کا شکار رہا، کیونکہ وہ ہمیشہ
ایسے ذہین لوگوں سے حسد کرتا تھا جن میں ترقی کی
استعداد ہو اور ان کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹ
حائل کیا کرتا تھا۔ آخر کار سلطان نے اپنے درباری
شاعر مؤیّد زادہ (المتخلص بہ حاتمی، م ۹۲۲ھ/
۱۵۱۶ء) کی سفارش پر اس کا تقرر بطور مدرس تیس ہزار
اسپر aspers کے مشاہرے پر ادرنہ میں تاشلیق
مدرسۂ عالیہ (=مدرسۂ علی بیگ) میں کر دیا۔ مؤیّد زادہ
جیسے بااثر شخص کی سرپرستی کی بدولت اسے ہر قسم کی
آزادی حاصل ہوگئی، چنانچہ اب وہ بڑی آسانی سے کچھ
وقت تو صوفیہ میں گزارتا اور کچھ Dupnitza (بلغاریہ)
میں۔ اس طرح بڑے آرام اور اطمینان سے عثمانی
تاریخ کی تالیف کا کام کرتا جو سلطان نے اسے سونپ
رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے مختلف علوم و
فنون پر تصانیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے
کبھی فقہ پر لکھا، کبھی تاریخ پر، کبھی شاعری
پر اور کبھی بلاغت پر۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے
میں اس کے قلم سے تین سو سے زیادہ رسائل نکلے۔

سلطان سلیم اول کے عہد میں کمال پاشا زادہ
نے آخرکار ۱۵۱۶ء میں آناطولی کے قاضی عسکر
کا عہدہ حاصل کر لیا تھا۔ مصر کی مہم میں وہ اسی
حیثیت سے بادشاہ کا ہمرکاب تھا۔ دوران سفر میں
دوسرے فرائض کے علاوہ سلطان نے اسے یہ کام
اور سپرد کیا کہ علاوہ اور کتابوں کے مشہور
عرب مؤرّخ ابوالمحاسن بن تغری بردی [رک بآں]
کی ممالیک مصر پر دو تصنیفات کا ترکی میں ترجمہ
کر دے۔ ہر صبح وہ ترجمے کی ایک قسط اپنے آقا
کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔ اس ترجمے کا نام
بقول حاجی خلیفہ (عدد ۵۸۷۸ و ۱۳۶۱۶) الکواکب
الباہرۃ من النجوم الزاہرۃ تھا (اس کے لیے
دیکھیے Brockelmann : *GAL.*، ۲ : ۴۲)۔ اس موقع سے
فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے ایک فوجی ترانے کے
ذریعے سلطان کو فوج کی اس خواہش سے آگاہ کرنے
کی کوشش کی کہ وہ جلد از جلد وطن لوٹنے کے متمنی
ہیں۔ اگرچہ سلطان نے اصل مدعا بھانپ لیا، لیکن
پھر بھی اس نے شاعر کو معاف کر دیا، بلکہ بطور
اکرام پانچ سو طلائی سکے بھی مرحمت کیے (دیکھیے
J.v. Hammer : *Gesch. des osm. Reiches*، ۲ : ۵۱۹؛
H. F. v. Diez : *Denkwürdigkeiten aus Asien*، ۱ :
۲۸۳؛ نیز دیکھیے ادریس بتلیسی کی ہشت بہشت کا
ذیل (حصۂ چہارم) از ابوالفضل (مخطوطہ وی انا
نیشنل لائبریری، H.D. 16 d، ورق ۱۲۶)۔ وطن واپس
آنے پر کمال پاشا نے دارالحدیث میں اپنی پرانی مدرسی
کی خدمت سنبھال لی اور اس کے ساتھ اپنی علمی و
شاعرانہ سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ اس نے سعدی
کی گلستان و بوستان کے طرز پر فارسی میں نگارستان
لکھی (دیکھیے حاجی خلیفہ : کشف الظنون، ۶ : ۳۸۱ و
Der Islam، ۷ : ۱۱۸؛ جرمن میں اس کے اقتباسات کے لیے
دیکھیے Count v. Harrach : *Fundgr. des Orients*، ۱ :
۳۰۱ ببعد و ۲ : ۱۰۷ و ۳ : ۷۴ ببعد)۔ کمال پاشا زادہ
ایک تاریخ عثمانیہ کا مصنف بھی ہے جو ۸۸۶ھ
(بایزید ثانی کی تخت نشینی) سے لے کر ۹۳۳ھ، یعنی
ہنگری پر سلیمان اعظم کے پہلے حملے تک کے حالات
پر مشتمل ہے، مکمل تصنیف کے مخطوطات نہایت کمیاب
ہیں۔ ڈریسڈن Dresden کے کتاب خانۂ Sächsische

Landesbibliothek میں اس کے بیشتر حصص موجود ھیں (دیکھیے J.H. Mordtmann کی تحقیقات، در *Der Islam*، ۱۳ : ۱۵۳ ببعد)، لیکن وی انا میں اس کے محض چند اجزا ملتے ھیں غالبًا یہ کتاب مختلف ادوار سے متعلق علٰحدہ علٰحدہ حصوں میں وقتًا فوقتًا لکھی گئی اور شائع ھوئی (کم از کم ایک حصہ اتنا پرانا ھے کہ بایزید دوم کے عہد سے تعلق رکھتا ھے) (دیکھیے G. Flügel، کتاب مذکور، ۲ : ۲۲۰؛ اس تصنیف کے بارے میں دیکھیے حاجی خلیفہ : کشف الظنون، ۲ : ۱۱۱، عدد ۲۱۵۳)۔ قدیم عثمانی وقائع کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کے لیے اس کتاب کے مکمل نسخے کی طباعت و اشاعت بہت مفید اور قدر و قیمت کی شایان ھوگی، کمال پاشا زادہ کی بابت یہ کہنا کہ اس نے ادریس کی ہشت بہشت کا ترجمہ کیا تھا جیسا کہ علمیہ سالنامسی، ص ۳۴۷ میں لکھا ھے غالبًا کسی غلطی پر مبنی ھے۔ کمال پاشا زادہ نے Mohács کی مہم پر بڑا مفصّل و مکمّل تبصرہ لکھا جو پہلی بار Pavet de Courteillel کے فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع ھوا (*Hist. de la Campagne de Mohacz*، پیرس ۱۸۵۹ء) اس کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ ڈریسڈن پبلک لائبریری میں موجود ھے۔

اس کی شاعری کا شاہکار حکایت یوسف و زلیخا ھے جسے اس سے پہلے بھی (مثلًا حمدی نے) اور اس کے بعد بھی شعرا نے اکثر جولانگاہ سخن بنایا ھے، لیکن کمال پاشا زادہ نے جس طرز سے اس موضوع پر قلم اٹھایا ھے وہ عجیب و غریب طور پر خوش آئند ھے۔ اس کی دیگر نظمیں، جس میں اس کی نکتہ آفرینی ۔۔۔ جس کی اس کی زندگی میں سب تعریف کرتے تھے اور حذاقت ذھنی جھلکتی ھے، ایک علٰحدہ دیوان میں جمع کر دی گئی ھیں ۔ یہ دیوان ۱۳۱۳ھ میں استانبول سے شائع ھوا ۔ (دیکھیے Gibb : *History of Ottoman Poetry*، ۲ : ۳۴۷ تا ۳۶۳، جہاں اس کی ادبی سرگرمیوں کا پوری طرح جائزہ لیا گیا ھے) علاوہ ازیں اس نے علم اللغۃ پر بھی کچھ کتابیں تصنیف کیں جن میں سے دقائق الحقائق (دیکھیے G. Flügel، کتاب مذکور، ۱ : ۱۳۰) کا ذکر یہاں مناسب ھے ۔ یہ ایک معجم ھے جس میں فارسی کی مشکل تراکیب کی تشریح کی گئی ھے ۔ اس کی فقہی تصنیفات میں سے رسالۃ فی طبقات المجتہدین کا ذکر ضروری ھے جس میں فقہا کے مختلف طبقات کا بیان ھے (دیکھیے G. Flügel : *Die Klassen der hanefit rechtsgel*، در *Abh. der Kgl. Sächs. Gesellsch der Wiss.*، ۱۸۶۱ء، ۸ : ۲۶۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۳۳۶؛ اس کے قلمی نسخے جو وی انا میں ھیں، دیکھیے G. Flügel : *Die arab . . . pers. u. türk. Handschr. . . . zu Wien*، ۲ : ۶۱۲)۔

[کمال پاشا زادہ کثیر التعداد مصنف تھا ۔ اسے عربی فارسی اور ترکی زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی ۔ اس نے علوم اسلامیہ کی ہر شاخ پر کچھ نہ کچھ لکھا ھے ۔ براکلمان نے اس کی چھوٹی اور بڑی کتابوں کی تعداد ایک سو ستر بتلائی ھے اور ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ھے (تکملہ، ۲ : ۶۶۸، ۶۷۳، لائیڈن ۱۹۳۸ء) اور ان میں قابل ذکر ھدایہ، تجرید، مفتاح، تہافت وغیرہ کی شرحیں ھیں ۔ بقول سامی بے اس نے الصحیح للبخاری اور مشارق انوار کی بھی شرحیں لکھی تھیں (قاموس الاعلام، ۵ : ۳۸۸۶، استانبول ۱۳۱۴ھ)]۔ قرآن مجید پر فوائد و ملاحظات، الکشاف وغیرہ پر حواشی لکھے ھیں ۔ ان کے قلمی نسخے اکثر مشرقی کتاب خانوں کی فہرست مخطوطات میں مذکور ھیں (دیکھیے مثلًا G. Flügel، کتاب مذکور، ۱ : ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۲۵۱، ۲۹۱، ۵۲۴، ۷۱۰، ۷۱۴، ۷۲۲، ۷۲۳؛ ۲ : ۲۲۰، ۲۲۱، ۶۱۲؛ ۳ : ۱۷۹، ۲۱۵

بیعد؛ متعدد رسائل کی فہرست در Ahlwardt : Berliner Kat. ۱ : ۱۲، عدد ۹۱؛ ۹۰ رسائل کا مجموعہ در فہرست الکتب العربیة المحفوظة بالکتب خانة الخدیویة المصریة (دارالکتب المصریہ) جلد ۷، قاہرہ ۱۳۰۹ھ، ص ۳۳۵ تا ۳۴۴؛ نیز دفتر کتب خانۂ ایاصوفیہ، استانبول ۱۳۰۴ھ، عدد ۴۷۹۴، ۴۷۹۷، ۴۸۲۰؛ دفتر کتب خانۂ لالیلی [=لا له لی] جامع، استانبول ۱۳۰۰ھ، عدد ۳۶۶۵، ۳۶۴۷-۳۶۳۳، ۳۶ رسائل کا ایک مجموعہ ۱۳۱۶ھ میں استانبول (اقدام پریس) سے دو حصوں میں رسائل کے نام سے شائع ہوا تھا ۔ دیکھیے Zeitschr. d. deutsch. Morgenl. Ges، ۶۶ : ۵۲۵ .

اس نے باہ کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا تھا جیسا کہ اس کی کتاب رجوع الشیخ الی صباہ فی القوة علی الباہ (طبع قاہرہ ۱۳۱۶ھ و ۱۳۳۵ھ؛ ترکی ترجمہ طبع سنگی تاریخ ندارد، ۹۹ صفحات) سے ظاہر ہے ۔ [اس کا رسالہ ''فی تحقیق مؤنثات السماعیة'' نحو کی مشہور کتاب کافیہ کے ساتھ متعدد بار دہلی، کانپور اور کلکتے سے شائع ہو چکا ہے] .

کمال پاشا زادہ نے ۲ شوال ۹۴۰ھ/ ۱۶ اپریل ۱۵۳۴ء کو استانبول میں وفات پائی اور باب ادرنانوپل سے باہر محمود چلبی کی خانقاہ میں دفن ہوا ۔ یہاں اس کے ایک شاگرد محمود بے نے، جو مرتے وقت تک قاہرہ کا قاضی تھا، اس کی یاد میں پتھر کا ایک کتبہ نصب کرایا ۔ اس کے تابوت، کفن اور سنگ لحد پر اشعار مشتمل برمادہ‌های تاریخ عربی میں لکھے گئے جن میں سے ہر ایک سے عدد ۹۴۱ برآمد ہوتا تھا (دیکھیے حدیقة الجوامع، ۱ : ۱۸۰، ۱۸۱ اور اولیا چلبی : سیاحت نامہ، ۱ : ۳۴۵، خصوصاً ۳۰۹، دیکھیے اس کے برخلاف J.v. Hammer-Purgstall در Z.D.M.G.، ۶ : ۲۸۲ و Sitzungsber. der Wiener Ak. der Wiss.، ۱۸۵۱ء، ۶ : ۳۲۶ تا ۳۲۸، جس کی رو سے اس کی تاریخ وفات ۹۴۰ھ ہے، لیکن یہ یقیناً غلط ہے).

مآخذ : متن میں مندرجہ مآخذ کے علاوہ (۱) کمال پاشا زادہ کی زندگی کے بارے میں رک بہ تاش کوپری زادہ : شقائق النعمانیة، استانبول ۱۲۶۹ھ، ص ۳۸۱ تا ۳۸۵؛ (۲) Th. Chabert : Latifi، زیورچ ۱۸۰۰ء، ص ۹۷؛ (۳) J. v. Hammer : Gesch. des Osm. Reiches، ۳ : ۶۳۵؛ (۴) وہی مصنف : Gesch. der Osm. Dichtik، ۲ : ۲۰۵ ببعد؛ (۵) بروسلی محمد طاہر : عثمانلی مولفلری، ۱ : ۲۲۳؛ (۶) علمیہ سالنامہ، استانبول ۱۳۳۴ھ، ص ۳۴۶ ببعد؛ (۷) محمد عارف بے، در Revue Historique Ottomane، ص ۱۹۱۱ ببعد؛ (۸) C. Brockelmann : Gesch. der arab. Lit.، ۲ : ۴۴۹ تا ۴۵۳، (جہاں اس کی بیشتر تصنیفات مع عنوانات دی ہوئی ہیں)؛ [(۹) سامی بے : قاموس الاعلام، ۵ : ۳۸۸۵، ۳۸۸۶، استانبول ۱۳۱۴ھ؛ (۱۰) براکلمان، GAL، تکملہ، ۲ : ۶۶۸ تا ۶۷۳، لائیڈن ۱۹۳۸ء؛ (۱۱) محمد ثریا : سجل عثمانی؛ (۱۲) علی : کنہ الاخبار].

(FRANZ BABINGER [و سلطان بخش])

کمال خجندی : (کمال الدین مسعود) فارسی زبان کے ایک غزل گو شاعر جن کا تعلق عہد تیموری سے تھا، وہ ماوراءالنہر میں بمقام خجند پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی [بہت بڑے صوفی تھے اور شاش (ماوراءالنہر) کے ایک بزرگ خواجہ عبیداللہ کے مرید تھے ۔ حج کے لیے مکۂ معظمہ گئے اور واپسی پر تبریز میں مقیم ہو گئے ۔ تبریز کی آب و ہوا پسند تھی ۔ ابھی زندگی کی ابتدا ہی تھی کہ وہاں ایک بزرگ شیخ زین الدین خوافی سے فیض حاصل کیا ۔ سلطان حسین جلائر (۷۷۶ھ/ ۱۳۷۴ء تا ۷۸۴ھ/ ۱۳۸۲ء) [رک بہ جلایر

نے ان کے لیے خانقاہ تعمیر کرائی جس میں بڑی سادگی سے رہتے تھے۔ ایک چٹائی پر بیٹھتے اور سوتے اور ایک پتھر سے تکیے کا کام لیتے تھے۔ جامی نے نفحات الانس میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کی بزرگی کا شہرہ سن کر لوگ بڑی تعداد میں مرید ہوئے]۔ ۱۳۸۰ء میں تُقتمش خان قپچاق نے تبریز کو فتح کیا تو انہیں اپنے صدر مقام سرائے واقع دشت قپچاق لے گیا جہاں چار سال رہے، اس کے بعد پھر تبریز چلے آئے۔ ان دنوں امیر تیمور کا بیٹا میرانشاہ آذربیجان کا حاکم تھا اور تبریز میں رہتا تھا۔ [وہ پہلے محمد شیرین مغربی (م ۸۰۹ھ/ ۱۴۰۷ء) کا معتقد تھا۔ لیکن خجندی کے آنے پر میران شاہ ان کا عقیدتمند ہوگیا۔ ان کا قرض ادا کیا اور بھی ہر طرح خدمت کی۔ خجندی سے مغربی کے دوستانہ مراسم تھے۔ دونوں صوفی شاعر تھے]۔ دولت شاہ کے بیان کے مطابق انہوں نے ۷۹۲ھ / ۱۳۹۰ء میں اور خواند میر کی رو سے ۸۰۳ھ/ ۱۴۰۰ء میں وفات پائی۔ تبریز کے محلۂ فرح بخش میں دفن ہوئے اور ان کا مقبرہ مرجع عقیدت بن گیا۔ Bland نے ان کی ۱۰ غزلیات اپنی کتاب *A Century of Ghazals* (ص ۹ تا ۱۲) میں شائع کی ہیں۔ وی‌انا کی نیشنل لائبریری میں ان کے دیوان کا ایک خوبصورت قلمی نسخہ موجود ہے جس میں ان کے مطالب کو میناتوری تصاویر (Miniature) سے مصور کیا گیا ہے (G. Flugel: *Die arab., pers. u. turk. Handschr., zu Wien*، ۱ : عدد ۵۸۱)۔

[ان کا دیوان وفات کے بعد مرتب ہوا جس میں غزلیات، قطعات اور رباعیات ہیں۔ قطعات میں اس زمانے کے حالات کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ تُقتمش کے حملۂ تبریز کا ذکر قطعات اور غزلیات دونوں میں موجود ہے۔ جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خجندی اپنے صوفیانہ کمال کو مخفی رکھنے کے لیے شعر کہا کرتے تھے۔ جامی نے ان کے کلام کو سہل ممتنع کہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ شعری اسلوب میں انہوں نے حسن دہلوی (م ۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء) کا تتبع کیا، اگرچہ لطافتِ خیال میں ان سے آگے نکل گئے۔ کمال خجندی کی غزلیں شیریں ہیں اور خیالات میں تازگی ہے۔ حافظ شیرازی نے بھی ان کی تعریف کی ہے]۔

مآخذ: (۱) دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء طبع ادوارد براؤن انگلیسی، ص ۳۲۰؛ (۲) لطف علی بیگ آذر: آتش کدہ، ایران ۱۳۳۷ ش، ص ۳۱۹ و ۳۲۹؛ (۳) رضا قلی خان: مجمع الفصحاء، طبع ایران (در عہد ناصرالدین قاجار)، ۲: ۲۹؛ (۴) J. von Hammer: *Schöne Redekünste Persiens*، ص ۲۰۰؛ (۵) خواند امیر: حبیب السیر، طبع بمبئی ۱۸۵۷ء، ۳/ ۳: ۹۰؛ (۶) Sir Gore Ouseley: *Biographical Notices of Persian Poets*، ص ۱۹۲ تا ۱۹۴؛ (۷) H. Ethe در *Grundriss d. Iran. Philologie*، ۲: ۳۰۳؛ [(۸) ای۔ جی براؤن: *A Literary History of Persia*، ج ۳، کیمبرج ۱۹۶۴ء، بمدد اشاریہ؛ (۹) چارلس ریو: *A Discriptive Catalogue of Persian Manuscripts in the British Museum London*، ج ۱، ۲، ۳، آوکسفرڈ ۱۹۶۶ء، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) محمد باقر و محمد وحید مرزا: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، لاہور ۱۹۷۱ء، ج ۳، فارسی ادب ۱۰۰۰ تا ۱۵۲۶ء، ص ۲۰۰ تا ۲۲۳؛ (۱۱) جامی، عبدالرحمٰن: نفحات الانس، کانپور ۱۸۹۳ء، ص ۳۹۹]۔

(CL. HUART و [ادارہ])

کمال الدین: ابو القاسم عمر بن احمد [بن ہبۃ اللہ] ابن ابی جَرادۃ بن العدیم العُقَیلی، مؤرخ حلب، رؤسا کے ایک جلیل القدر خاندان بنو جرادۃ کا ایک فرد جس کا جد امجد ایک وبا کے باعث ۲۰۰ھ (۸۱۵ء) کے

لگ بھگ بنو عقیل کے دوسرے افراد کے ساتھ بصرے سے ہجرت کر کے شام چلا آیا اور ایک سوداگر کی حیثیت سے حلب میں آباد ہو گیا ۔ کمال الدین ذوالحجہ ۵۸۸ھ/ دسمبر ۱۱۹۲ء، (فواۃ میں ۵۸۶ھ غلط ہے) میں پیدا ہوا ۔ وہ ایک حنفی قاضی کا بیٹا تھا اور یہ عہدہ ان کے خاندان میں موروثی طور پر چار پشتوں سے چلا آ رہا تھا ۔ اس نے پہلے اپنے آبائی شہر یعنی حلب میں تعلیم پائی؛ پھر بیت المقدس میں جہاں اسے اس کا باپ ۶۰۳ھ/ ۱۲۰۶ء میں اور پھر ۶۰۸ھ/ ۱۲۱۱ء میں لے گیا تھا، پھر دمشق، عراق اور حجاز میں تعلیم پائی اور بعد میں حلب کے مدرسۂ شادبخت میں معلم ہو گیا، پھر قاضی کے عہدے پر فائز ہوا اور آخری دو ایوبی بادشاہوں الملک العزیز (۶۱۳ھ/ ۱۲۱۶ء تا ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء) اور الملک الناصر (۶۳۴ھ/ ۱۲۳۶ء تا ۶۵۸ھ/ ۱۲۶۰ء) کا وزیر بنا اور کئی بار ان کے حکم سے بغداد اور قاہرہ میں سفیر کے فرائض انجام دیے ۔ ۹ صفر ۶۵۸ھ/ ۲۶ جنوری ۱۲۶۰ء کو جب تاتاریوں نے اس کا آبائی شہر فتح کر کے تباہ و برباد کر دیا تو وہ الملک الناصر کے ساتھ مصر بھاگ گیا ۔ مگر ہلاگو نے اسے قاضی القضاۃ کے عہدے کے لیے شام واپس بلا لیا؛ مگر وہ اس حکم کی تعمیل سے قبل ہی ۲۹ جمادی الاولی ۶۶۰ھ/ ۲۱ اپریل ۱۲۶۲ء کو قاہرہ میں فوت ہو گیا ۔

کمال الدین کی اہم ترین تصنیف بُغْیَة الطلب فی تاریخ حلب ہے ۔ یعنی حلب اس کے وطن کے مشاہیر کی تاریخ جو خطیب البغدادی [رک بآں] اور ابن عساکر [رک بآں] کے نمونے پر بہ ترتیب حروف تہجی دس (اور بعض مآخذ کی رو سے ۴۰) جلدوں میں مرتب ہوئی ۔ یہ کتاب چونکہ بڑی ضخیم تھی اس لیے اس کا صاف شدہ نسخہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا نتیجہ یہ کہ تیمور کے زیر قیادت مغلوں کے حملے سے قبل ہی اس کے اجزا ہوا میں منتشر ہو چکے تھے؛ چنانچہ ابن الشِحنۃ کو بھی اس کی صرف ایک جلد کا علم ہو سکا (دیکھیے *Cat. Codd. Arab. Bibl. Acad. Lugd. Bat.*، ۲ : ۸۲) ۔ کچھ بے ترتیب اجزا پیرس (Bibl. Nat., de Slane, *Cat.*، شمارہ ۲۱۳۸)، لنڈن (*Cat. Codd. Mss. Or. in Mus. Brit.*، ۲، شمارہ ۱۲۹۰) اور غالباً قسطنطنیہ، آیا صوفیہ عدد ۳۰۳۶ (دیکھیے Horovitz : *Mitt. Sem. Or. Spr.*، برلن، ۱۰ : ۶۰ : عدد ۵۱) میں محفوظ ہیں ۔ اس کتاب کا خود کمال الدین نے ۶۳۱ھ / ۱۲۳۳ء تک کا ایک خلاصہ زبدة الحَلَب فی تاریخ حلب کے نام سے تاریخی ترتیب کے ساتھ تیار کیا ۔ لیکن اسے بھی صاف نہ کر سکا اور وفات پا گیا ۔ [پہلی جلد طبع ہو چکی ہے] ۔ پیرس کے قلمی نسخے (de Slane ایک اور قلمی نسخہ سینٹ پیٹرزبرگ میں ہے جو غالباً پیرس والے نسخے ہی کی نقل ہے، دیکھیے V. Rosen : *Not. sommaires des manuscr. arabes du Musée Asiat*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۱، ص ۹۸، عدد ۱۶۰) سے حسبِ ذیل مصنفین نے استفادہ کیا : G.W. Freytag : *Selecta ex historia Halebi*، Lantetiae Par. ۱۸۹۱ء؛ *Regnum Saahd-aldaulae in oppido Halebi* بون ۱۸۲۰؛ *Historiens Orientaux des Croisades*، ۳ : ۶۹۱ تا ۷۳۲؛ H. Derenbourge : *Vie d Ousâma (Publ. d l'Ec. des Langues or. viv.)*، سلسلۂ دوم، ۱۲/۱، ۶۹ ۵ تا ۵۸۰؛ E. Blochet : *L'histoire d' Alep de Kamaladdin*، عربی متن کے بعد فرانسیسی ترجمہ در *Rev. de l'Orient latin*، ۱۸۹۶ء، ص ۵۰۹ تا ۵۶۵؛ ۱۸۹۷ء، ص ۱۳۶ تا ۲۳۵؛ ۱۸۹۸ء، ص ۳۷ تا ۱۰۷، ۱۸۹۹ء، ص ۳۷ تا ۱۰۷؛ ۱۸۹۹ء، ص ۱ تا ۴۹ ۔ اس کے آگے کا ۶ ربیع الآخر ۹۵۱ھ (۲۸ جون ۱۰۴۴ء) تک کا

خلاصہ محمد ابن الحنبلی (م ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء) نے دّر الحبب فی تاریخ اعیان حلب کے نام سے تیار کیا دیکھیے *Cat. Codd. Mss. Or. in Mus. Brit*، عدد ۳۳۴؛ *Bibl. Bodl. Codd. Mss. Orient*، ۱، عدد ۸۱۰، ۸۳۶، دیکھیے ۲ : ۵۹۷؛ *Not. Sommaires* : V. Rosen، عدد ۲۰۳.

انیسویں صدی عیسوی میں اصل بنیادی تصنیف بغیۃ کو آگے جاری رکھنے کی دوبار سعی کی گئی : (۱) علاء الدین ابوالحسن علی بن محمد بن خطیب الناصریّۃ (م ۸۴۳ھ/۱۴۳۹ء) نے الدر المنتخب فی تاریخ حلب، لکھی - یہ کتاب شہر حلب کے بیان اور ۶۵۸ھ سے (تحریر کتاب تک کے) ممتاز باشندگان حلب کے سوانح حیات پر مشتمل ہے - Horovitz نے اس کے مخطوطات کی تفصیل *Mitt. Sem. Or. Spr.*، ۱۰ : ۶۰ بعد میں دی ہے؛ (۲) محب الدین ابو الفضل محمد بن الشحنۃ الحلبی (م ۸۹۰ھ/ ۱۴۸۵ء) نے نزھۃ النواظر فی روض المناظر کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس کے مخطوطات برلن میں ہیں (*Verz* : Ahlwardt، عدد ۹۷۹۱)، جلد ۱ لنڈن میں (*Cat. Codd. Or. in Mus. Brit* عدد ۳۳۶، ۲)؛ جلد ۲ Gotha میں (*Verz* : Pertsch، عدد ۱۷۷۲)، جلد ۳، پیرس میں (*Cat* : de Slane، شمارہ ۲۱۳۹) ہیں - اس کتاب سے ابن الشحنہ کی اولاد میں سے ایک شخص نے ۱۰۱۴ھ اور ۱۰۲۳ھ کے درمیان ایک ملخص مرتب کیا جس میں جگہ جگہ اپنے زمانے کے کوائف سے متعلق حواشی تحریر کیے؛ اس ملخص کے مخطوطات کی فہرست *Verz.* : Pertsch *d. Arab. Hdss. Zu Gotha*، عدد ۱۷۳۳ : مزید برآں *Cat. Codd. Arab. Bibl. Lugd.-Bat.*، ۲ : ۸۵، غدد ۹۵۲ میں دی ہوئی ہے - اس ملخص کو الدّر المنتخب فی تاریخ مملکت حلب کے زیر عنوان Joseph Elias Sarkis نے بیروت سے ۱۹۰۹ء میں شائع کیا - A. v. Kremer نے *Phil. Hist. Kl.*، ۴ (۱۸۵۰ء)، ۱ : ۱۲۵ بعد) اس کے اقتباسات (در *Sitzungsber d. Wien Akad.*) پیش کیے.

اس نے اپنے خاندان کی جو تاریخ الاخبار المستفادۃ فی ذکر بنی ابی جرادۃ کے نام سے یاقوت کے لیے تحریر کی تھی اس کے اقتباسات یاقوت نے اپنی تصنیف ارشاد (معجم الادباء، ۶ : ۱۸ تا ۳۰) میں دیے ہیں - منظوم کلام میں اس کا ایک مرثیہ جو اس نے حلب کی تباھی پر لکھا تھا سب سے زیادہ مشہور ہے - اس کے بعض اشعار بطور نمونہ ابوالفداء (کتاب مذ کور) نے پیش کیے ہیں - اس نے ۶۱۰ھ / ۱۲۱۳ء میں الملک الظاہر کی خدمت میں اس کے بیٹے الملک العزیز کی ولادت کے موقع پر ایک مکتوب تہنیت پیش کیا تھا جس کا نام الدراری فی ذکر الذراری رکھا تھا - یہ مکتوب مخطوطہ نوری عثمانیہ، شمارہ ۳۷۹۰ سے نقل کر کے مجموعہ، استانبول ۱۲۹۸ھ، شمارہ ۲ میں شائع کر دیا گیا ہے - آخری کتاب جو اس نے لکھی وہ الوُصلۃ الی الحبیب فی وصف الطیبات والطِّیب ہے - اس میں ہر قسم کی خوشبوئیں اور عطر تیار کرنے کی ہدایات مندرج ہیں - قلمی نسخے برلن میں (Ahlwardt : *Verz.*، عدد ۵۴۶۳)، برٹش میوزیم میں (Ellis اور Edwards : *A descr. List of the Arab Mss. .... since 1894*، لنڈن ۱۹۱۲ء : ص ۵۶، ۶۲، Or. ۶۳۸۸) اور بانکی‌پور میں (*Cat. of the Arab. and Pers. Mss. in the Orient. Lib.*، ۴ : ۱۳۶، شمارہ ۹۶) موجود ہیں - بقول یاقوت اس کا شمار مشہور ترین خوشنویسوں میں ہوتا ہے - اس کی خوشنویسی کے نمونے سینٹ پیٹرز برگ میں موجود ہیں (دیکھیے *Cat. des Mss. et Xylographes Orient. de la Bibl. Imp.*، عدد ۱۳۷).

مآخذ : (۱) یاقوت : ارشاد الاریب (سلسلۂ یادگار گب)، ۶ : ۱۸ تا ۴۶؛ (۲) ابن شاکر : فوات الوفیات، (بولاق ۱۲۹۹ھ)، ۲ : ۱۰۱؛ (۳) ابوالفداء، تاریخ،

۳ : ۶۳۳؛ (۴) ابن قتلوبغا : طبقات الحنفیة (.Abh. f. d *Kunde des Morg.*، ۲ : لائپزگ ۱۸۶۲ء)، عدد ۱۴۳؛ (۵) Weijers : *Orientalia*، ۲ : ۲۰۸؛ (۶) Wüstenfeld : *Geschichtschreiber der Araber*، عدد ۳۴۵؛ (۷) Brockelmann : *Gesch. d. Arab. Lit.*، ۱ : ۳۳۲، [تکملہ، ۱ : ۵۶۸؛ (۸) الزرکلی : الاعلام، مع مآخذ].

(BROCKELMANN)

* **کمال الدّین اِسْمٰعیل** : اصفہان کا ایک فارسی شاعر، جمال الدین عبدالرزاق کا بیٹا، ان شعرا کے زمرے میں شامل ہے جنھوں نے اصفہان کے دو مذہبی خانوادوں [آل صاعد اور آل خجند] کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھے ۔ یہ وہ خاندان ہیں جنھوں نے اصفہان میں سیاسی اور عدالتی اختیارات اپنے قبضۂ اقتدار میں رکھے۔

ان کے قصائد زیادہ تر قاضی رکن الدین صاعد بن مسعود کی مدح میں ہیں، لیکن بعض خوارزم شاہی حکمرانوں (علاءالدین تکش اور اس کے بیٹے محمد اور پوتے جلال الدین اور غیاث الدین) کے قصیدے بھی کہے، جو عراق کے حکمران تھے، نیز اتابکان فارس (سعد بن زنگی اور اس کے بیٹے ابوبکر) اور حسام الدین اردشیر شاہ ماژندران کی مدح سرائی بھی کی ۔ [کمال اسمٰعیل اپنے اشعار میں نئے مضامین اور دقیق معانی لاتا ہے، اس لیے اس کے معاصرین اسے خلاق المعانی کہتے تھے ۔ کمال الدین معمولاً بغیر تشبیب قصیدہ شروع کرتا ہے اور کبھی کبھی گریز کے بعد ممدوح کی مدح کرتے ہوے پند آمیز شعر کہتا ہے ۔ وطن سے محبت کا اظہار بھی اس کے قصیدوں میں نمایاں ہے ۔ اصفہان میں مغول کے ہاتھوں جو خرابی و تباہی ہوئی اس پر بھی آنسو بہاتا ہے ۔ اس نے اپنے والد کا جو مرثیہ کہا ہے بہت پُر درد ہے] ۔ آخر عمر میں اس نے دنیا کو ترک کر دیا اور شیخ شہاب الدین عمر بن محمد السہروردی سے بیعت کر کے صوفیانہ اور زاہدانہ زندگی اختیار کر کے شہر سے باہر سکونت اختیار کر لی تھی ۔ جب چنگیز خان کے بیٹے اوکتای کی فوج نے اصفہان فتح کیا تو اس کے مغول سپاہیوں نے ۲ جمادی الاولی ۶۳۵ھ / ۲۱ دسمبر ۱۲۳۷ء کو کمال الدین اسمٰعیل ؒ کو بڑی اذیت پہنچا کر ہلاک کر دیا، کیونکہ انھیں یہ امید تھی کہ اس کے گھر میں انھیں کوئی پوشیدہ خزانہ ملے گا ۔ اس کا دیوان بمبئی میں طبع ہو چکا ہے (تاریخ ندارد) ۔ اس کی ان پندرہ رباعیات میں سے جنھیں Salemann-Shukovski (:Persisch Grammatik) نے شائع کیا تھا، بعض کے Louis H. Gray نے انگریزی میں ترجمے کیے اور Ethel Watts Mumford (:Hundred Love *Songs*، نیویارک ۱۹۰۳ء) اور Theodosis Garrison (.*Lippincott's Mag*، ۶۵ : ۷۸۳) نے ان ترجموں کو انگریزی نظم کا جامہ پہنایا ۔

مآخذ : (۱) دولت شاہ : تذکرۃ الشعراء، ص ۱۴۸ تا ۱۵۴؛ (۲) لطف علی بیگ آذر : آتشکدہ، مطبوعہ بمبئی، ص ۱۶۷؛ (۳) رضا قلی خان : مجمع الفصحاء، مطبوعہ تہران، ۱ : ۴۸۹ تا ۴۹۹؛ (۴) J. v. Hammer : *Schone Redekünste Persiens*، ص ۱۰۹؛ (۵) حمد اللہ المستوفی : تاریخ گزیدہ، سلسلۂ یادگار گب، (۱۴)، ۱ : ۸۲۴؛ (۶) H. Ethe در *Grundriss d. Iran Philologie*؛ (۷) E.G. Browne : *A Literary History of Persia*، ۲ : ۲۶۹ : ۲ : ۵۴۰ ببعد .

([و ادارہ] CL. HUART)

کمال الدین پارسی : نور اور رؤیت کا مسئلہ فلسفے کے اہم مسائل میں سے تھا، لیکن آج فلسفے سے جدا (متصور) ہونے کی وجہ سے یہ مسائل علم طبیعیات کے بہت اہم مسائل میں شمار ہونے لگے ہیں ۔ تسلیم کرنا ہو گا کہ نور اور رؤیت ایسے

موضوعات ہیں جن کے متعلق ہر دور میں اہل فکر خصوصاً یونانی دور حکومت سے آج تک سوچتے رہے اور رنگ، نور اور رؤیت کے بارے میں تمام وہ آرا جو ابن سینا کی کتاب (علم النفس، مقالہ سوم) میں نقل ہوئی ہیں ان سب کا مأخذ یونانی فکر ہے ۔ مسلمانوں نے ان پراگندہ و منتشر مسائل کو از سر نو ترتیب دے کر ایک مستقل علم کی شکل دی ہے ۔

ابن الہیثم نے اپنے ذہن رسا کی مدد سے مذکورہ موضوعات کو بطلمیوس کی کتاب ''مناظر'' میں شامل کیا اور اس میں ان موضوعات کا بھی اضافہ کیا جو ارشمیدس نے اپنے رسالے ''محدب عدسہ'' میں بیان کیے ہیں ۔ اپنی طرف سے اس نے آنکھ (کے موضوع) کو بھی جو دیکھنے کا ایک بہت بڑا آلہ ہے، ان مباحث میں شامل کر کے ان موضوعات کے مجموعے کو کتاب المناظر والمرایا کے نام سے پیش کیا ۔

واضح رہے کہ ابن الہیثم کا کام ان موضوعات کی محض ترتیب و تدوین اور انہیں ایک اکائی کی شکل دینا ہی نہ تھا بلکہ اس نے ان میں سے ہر موضوع کا از سر نو مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں تجربے کیے جن کو اس نے '' اعتبار '' کا نام دے کر ایک مفید اور دلچسپ علم ایجاد کیا ۔

البیرونی جیسا ماہر ریاضی دان بھی جو مسائل طبیعی کا علم ریاضی کے مسائل کی طرح بڑی دقت کیساتھ مطالعہ کرتا تھا، ان مسائل (رنگ، نور اور رویت) کے متعلق تحقیق و جستجو میں دلچسپی رکھتا تھا؛ چنانچہ وہ آثار الباقیہ (ترجمۂ فارسی ص ۳۰۰) میں لکھتا ہے کہ نور اور شعاع کے موضوع پر میرے اور ابن سینا کے درمیان متعدد بار مباحثے ہوے ہیں اور ان مباحثوں کو ایک دوسرے مقام پر میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ یقینا وہ کتاب تجرید الشعاعات والانوار ہے، لیکن اس گران قدر تصنیف کے متعلق اہل علم کو کچھ معلوم ہی نہ تھا حالانکہ وہ ان چند نادر کتابوں میں سے تھی جو اسلامی عہد میں نور کے متعلق لکھی گئیں ۔ البیرونی نے اپنی ایک اور کتاب ''افراد المقال فی امر الظلال'' میں بھی رؤیت سے متعلق، ابو العباس ایرانشہری کے بیان کردہ، چند بڑے دقیق مسائل نقل کیے ہیں جو قدر و قیمت سے خالی نہیں ۔

فارس کی مردم خیز سر زمین کے ایک فاضل نے جس کا پورا نام کمال الدین فارسی ہے، اپنے فطری ذوق و شوق کی بنا پر علوم عقلی کی تحصیل شروع کی اور جیسا کہ وہ خود اپنی کتاب ''تنقیح المناظر'' کے مقدمے میں لکھتا ہے، اسے شروع ہی سے نور اور رؤیت سے متعلق مسائل کو جاننے کا بڑا شوق تھا اور وہ اکثر اس کے متعلق سوچا کرتا تھا کہ پانی اور شیشے میں چیزوں کی رؤیت، ان کی حقیقی رؤیت سے مختلف ہوتی ہے ۔ اس نے انعطاف نور کے متعلق بعض مسائل اور انعکاس و انعطاف سے پیدا ہونے والے بعض زاویوں کے بارے میں تو سن رکھا تھا، لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ان مسائل کو کونسی کتاب میں دیکھنا چاہیے اور ان افکار کا سر چشمہ کہاں ہے ۔ جب وہ قطب الدین شیرازی کی خدمت میں پہنچا تو اس نے اس نوجوان کو ابن الہیثم کی کتاب پڑھنے کا مشورہ دیا ۔ کمال الدین نے نہ صرف اس کتاب کا مطالعہ کیا بلکہ اس نے اس کتاب کی ایک تلخیص بھی تیار کی جس میں اس نے ابن الہیثم کے بیان کردہ مطالب کو اور زیادہ واضح الفاظ میں اور کہیں کہیں مزید دلائل کے ساتھ بیان کیا، دیکھیے (کتاب تنقیح المناظر، مطبوعۂ حیدر آباد، ۱ : ۴) ۔

ابن سینا حدوث نور کو آنی (عارضی) سمجھتا تھا

اور اس بات کا قائل تھا کہ جیسے ہی کوئی چیز آنکھ کے نور کے سامنے آتی ہے فوراً اس کی حالت میں ایک تبدیلی رونما ہوتی ہے جسے اس چیز کی روشنی اور نور سے تعبیر کیا جاتا ہے (الشفاء، علم النفس، مقالۂ سوم، فصل دوم)، لیکن ابن الہیثم نور کی حرکت کا قائل تھا اور اب اس حرکت کی رفتار کا یورپ والوں نے اثبات بھی کر دیا ہے ۔ ابن الہیثم نے غبار آلود اور تاریک کمرے میں جا کر یہ تجربہ کیا تھا کہ (باریک سوراخوں یا دروازوں کی درزوں کے ذریعے باہر سے آنے والی) شعاع بالکل سیدھی سمت سے حرکت کرتی ہے اور اس کی یہ حرکت ہمیشہ ایک ہی رخ کو ہوتی ہے ۔

ابن الہیثم نور کے علاوہ رنگ کی حرکت کا بھی قائل ہے ۔ اس نے لکھا ہے : ''غرض کہ رنگ ہمیشہ نور کے ساتھ ممزوج و متحرک ہوتا ہے اور چونکہ تمام رنگوں کے بارے میں جو تجربات ہوئے ہیں ان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، اس لیے سمجھ لیا گیا ہے کہ رنگوں کی خاصیت طبیعی بھی ہے اور اگر نور کے ساتھ حرکت کرنے والے مدھم رنگ نظر نہ آئیں تو اس کا سبب یہ ہوگا کہ حس (باصرہ) انھیں دیکھنے سے قاصر رہتی ہے (تنقیح المناظر، ۱ : ۵ تا ۷)؛ نیز حرکت نور کے متعلق رجوع کیجیے کتاب مذکور، ۲ : ۱۳۰، جہاں وہ انعطاف نور کے بارے میں بحث کرتا اور واضح طور پر کہتا ہے : ''ضو (یعنی نور) اجسام کثیفہ میں اس قدر تیزی کے ساتھ داخل ہوتی ہے کہ حس اس کی حرکت کو محسوس نہیں کر پاتی [البتہ یورپ والوں نے مشتری کے سیاروں کے طلوع اور غروب (کے مطالع کی مدد) سے اس حرکت کی رفتار کو معین کر دیا ہے)]۔

انگریز سائنس دان نیوٹن نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ دعوٰی کیا کہ خود نور ہی رنگ ہے اور نور و رنگ دو مختلف چیزیں نہیں ہیں، لیکن ابن الہیثم نے صریحاً لکھا ہے کہ نور اور رنگ دو الگ چیزیں ہیں جو ایک ساتھ ہوتی ہیں اور اکٹھی حرکت میں آتی ہیں ۔

رنگ کے بارے میں ابن الہیثم اور کمال الدین نے (اپنی کتابوں میں) جو بحثیں کی ہیں (اور نظریات پیش کیے ہیں) ان سے بعض ایسے اصول ہاتھ آئے ہیں جن سے (فن) نقاشی میں استفادہ کیا گیا ہے، مثلاً یہ کہ مدھم روشنی میں گاڑھے رنگ بھی مٹیالے سے نظر آتے ہیں، لیکن تیز روشنی میں (وہی رنگ) چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں (کارادوو : متفکرین اسلامی)۔ اسی طرح ان دو عالموں نے آئینۂ مقعر اور آئینۂ محدّب کے متعلق جو بحثیں اٹھائی ہیں (اور اپنی آرا بیان کی ہیں) ان کے نتیجے میں دور اور نزدیک دیکھنے والی عینک ایجاد ہوئی ہے (اس کے لیے تنقیح المناظر، کے اس حصے سے رجوع کیا جائے جو ''مرایا'' کے نام سے لکھا گیا ہے اور جہاں آئینۂ محدب اور آئینۂ مقعر کے متعلق بحث ہوئی ہے) ۔

کہا جا سکتا ہے کہ کمال الدین پیدا نہ ہوتا تو ابن الہیثم کے علمی کارنامے قصہ پارینہ ہو کر رہ جاتے ۔ اس فاضل نے تنقیح المناظر لکھ کر نہ صرف اپنا بلکہ اس عرب عالم (ابن الہیثم) کا نام بھی زندہ جاوید بنا دیا ہے ۔ اس کی کتاب یورپ پہنچی تو وہاں راسوس نے اس کی اصلاح کر کے فرانس کی ملکہ کیتھرین کی خدمت میں پیش کی (متفکرین اسلامی) ۔

کمال الدین کی تنقیح المناظر، ابن سینا کا قانون، البیرونی کا ''قانون مسعودی'' اور رازی کی ''الحاوی'' ایسی کتابیں ہیں جن کا جدید علوم اور جدید یورپ کی سائنسی ترقی میں بڑا حصہ ہے ۔ عینک، دوربین اور خوردبین کی ایجاد اور نور و رنگ کی طبیعی بحثیں انھیں دو حکما

کے بیان کردہ نظریات کا نتیجہ ہیں ۔ جدید علوم نے ان کے نظریات کی تصدیق کر دی ہے ۔ کمال الدین نے ۷۲۰ھ/ ۱۳۲۰ء میں وفات پائی ۔ کاراد وو: متفکرین اسلامی.

مآخذ : [(۱) براکلمان، تکملہ، ۲ : ۲۹۵، لائیڈن؛ (۲) F. M. Shuja : *Cause of Reflection according to Kemal Din Abl A. Hassan al Farsi*، در *Proceedings of the third Session of Idara-Maarifia, held at Delhi*، ص ۵۷ تا ۶۸، لاہور ۱۹۴۲ء].

(اکبر دانا سرشت)

* کمال رئیس : سلطان بایزید ثانی کے عہد حکومت کا ایک ترک بحری چھاپا مار اور قپودان ۔ قپودان پاشا سنان نے اسے کم عمری میں سلطان کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیا تھا ۔ اس کے بعد ایک پیش خدمت کی حیثیت سے اس نے دربار میں پرورش پائی، اس کے دور زندگی کا آغاز عزب کے سردار کی حیثیت سے ہوا ۔ پھر وہ بحیرۂ روم میں ترک تازیان کرنے لگا اور ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء میں اس نے مالٹا کے ایک شہزادے کو گرفتار کر لیا (سجل عثمانی، ۴ : ۷۸) ۔ ۸۹۶ھ/ ۱۴۹۰ء میں اس نے بایزید کے حکم سے ہسپانیہ کے ساحل پر حملہ کیا جس کی غرض یہ تھی کہ اس طریقے سے غرناطہ کے آخری ناصری سلطان مولای حسن کی مدد کی جائے جس نے اپنے آپ کو خطرات میں گھرا دیکھ کر سلطان سے مدد کی درخواست کی تھی ۔ اس حملے کا ذکر حاجی خلیفہ نے تقویم التواریخ میں کیا ہے، لیکن اس کی بحری جنگوں کی داستان (تحفۃ الکبار) میں اس کا کوئی ذکر نہیں اور بظاہر اس واقعے کا علم دوسرے مؤرخین کو بھی نہیں ہو سکا ۔ بہرحال یہ کوئی بہت زیادہ اہم واقعہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس زمانے میں سلطنت عثمانیہ مصر اور آسٹریا کے خلاف جنگوں کی وجہ سے شدید مشکلات میں مبتلا تھی ۔ ۹۰۳ھ/ ۱۴۹۷ - ۱۴۹۸ء میں کمال رئیس بحیرۂ روم کے مشرقی حصے میں دوسرے بحری چھاپا ماروں کے ساتھ مل کر لوٹ مار کرتا رہا ۔ اس نے عیسائیوں کے کئی جہاز پکڑ لیے اور اس مال غنیمت کو سکندریہ کے 'بے' کے پاس لے آیا (عاشق پاشا زادہ، ص ۲۵۰ء)، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شاید وہ سلطان کی ملازمت میں نہیں تھا، لیکن جب ترکوں کی وینس سے جنگ چھڑی (۹۰۵ھ/ ۱۴۹۹ء) تو وہ ترک بیڑے کا ایک امیر البحر تھا ۔ ترکی بیڑے میں تین مسلح اور غیر معمولی طور پر بڑے جنگی جہاز تھے (ترکی: گوکہ)، ان میں سے ایک جہاز کی کپتانی قپودان پاشا داؤد کے ہاتھ میں تھی اور باقی دو کے کپتان کمال رئیس اور براق رئیس تھے (منجم باشی نے بداق لکھا ہے، اسی طرح Leunclavius (اسے Budacus لکھتا ہے) ۔ Spienza کی بحری لڑائی (۲۸ جولائی ۱۴۹۹)ء میں وینس والوں کو دھوکا ہوا اور انہوں نے براق رئیس کے جہاز کو کمال رئیس کا جہاز سمجھ لیا جس سے وہ خاص طور پر انتقام لینا چاہتے تھے، چنانچہ براق رئیس کے جہاز پر وینس کے دو بڑے اور کئی چھوٹے جہاز حملہ آور ہوئے ۔ براق نے جلتے ہوئے نفط سے مدافعت کی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اور اس کے دشمن دونوں بھک سے اڑ گئے ۔ جزیرۂ Spienza کا نام اس واقعے کی یاد میں براق رئیس "آطہ" سی پڑ گیا ۔ اس جنگ کے بعد ترکی بیڑے نے اِنی بختی (Lepanto) پر قبضہ کر لیا ۔ اس سے اگلے سال جب ترکی بیڑے نے تورون Koron اور مودون Modon کے شہر فتح کر لیے تو کمال رئیس کو ۴۰ جہاز دے کر Navarino (ترکی : ناوارین) پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا اور اس نے اس شہر کا قلعہ وینسی سپہ سالار Contarini سے چھین لیا ۔ قاموس الاعلام، (۵ : ۳۸۸۶) کی رو سے اس نے

دسویں صدی کے آغاز میں وفات پائی - موت کا سبب یہ ہوا کہ اس کا جہاز ڈوب گیا تھا (سجلِ عثمانی).

مآخذ: (۱) مُنَجِّم باشی: صحائف الاَخبار، قسطنطینیه ۱۲۸۵ھ، ۳: ۳۲۳، ۳۲۷؛ (۲) حاجی خلیفه: تحفۃ الکبار فی اسفار البحار، استانبول ۱۱۴۱ھ، ورق ۸، ۹؛ (۳) عاشق پاشا زاده: تاریخ آل عثمان، استانبول ۱۳۳۲ھ، ص ۲۰۰؛ (۴) سعد الدّین: تاج التواریخ، قسطنطینیه ۱۲۷۹ھ، ۲: ۶۰. (۵) von Hammer: *Gesch. des Osm. Reiches*، پسٹ ۱۸۲۸ء، ۲: ۲۹۵، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۲۷، ۶۰۲؛ (۶) Leunclavius: *Annales Sultanorum Othmanidarum*، فرینکفرٹ ۱۵۹۶ء، ص ۱۹۶.

(J. H. KRAMERS)

* **کمال، محمد نامق**: ترکی کے عظیم ترین شعرا، صاحب طرز انشا پردازوں اور مصنفین میں سے ایک، جدید ترکی مصنفین کا بڑا رهنما، جدید ترکی نثر کا بانی اور عصر حاضر کا ممتاز ترین محب وطن ترک - کمال ۲۱ دسمبر ۱۸۴۰ء/۲۶ شوال ۱۲۵۶ھ کو ردوسنجق Rhodosto [کی قضا تکفورطاغی] میں پیدا ہوا جو بحیرۂ مارمورا Marmora کے ساحل پر واقع ہے - اس کا تعلق امرا کے ایک قدیم خاندان سے تھا اور اس کا سلسلۂ نسب اس کے باپ مصطفٰی عاصم بے، عالم ہیئت و نجوم، اور اس کے دادا شمس الدّین بے، سلطان سلیم ثالث کے حاجب اول، اور اس کے پردادا امیر البحر قپودان احمد راتب پاشا کی وساطت سے صدر اعظم طوپال عثمان پاشا سے جا ملتا ہے جس نے ایران کے نادر شاہ کو ہزیمت دی تھی - اس کا باپ آناطولی کے ینی شہر کا رہنے والا تھا اور ماں قونیجه Konica کی تھی جو البانیا میں واقع ہے - اس البانوی عنصر کا اثر اس کے مزاج میں سب سے زیادہ نمایاں تھا اور اسی سے اس کی انتہائی سرکشی اور جوشیلی طبیعت کا راز بہت کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے - ظاہری شکل و شباہت میں وہ بالکل کسی یورپی کی طرح تھا - وہ بلند نظر، وسیع القلب اور ایک جاذب شخصیت کا مالک تھا .

کمال کو گھر پر کسی قدر بے قاعدہ اور بے نظام تعلیم ملی - اس نے قسطنطینیه میں رُشدیّه بایزید اور 'والدہ مکتبی' میں صرف نو ماہ تک باقاعدہ درسی نظام کے مطابق تعلیم حاصل کی - اس کے نجی اتالیق نے اسے عربی، فارسی اور فرانسیسی سکھائی - ۱۸۵۲ء میں وہ اپنے دادا شمس الدین بے کے ساتھ قارص میں اور کچھ دن بعد صوفیا میں مقیم رہا اور یہیں اس نے چودہ برس کے سن میں بالکل سُنبُل زادہ [وهبی] کے انداز میں شاعری شروع کر دی - اس کے سامنے اور شاعروں کے کلام کے نمونے نہیں تھے، اس لیے دیوانِ سنبل زادہ ھی اس کے لیے نمونہ بن گیا - ۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء میں قسطنطینیه واپس آ جانے کے بعد وہ باب عالی کے دارالترجمه میں داخل ہو گیا اور تھوڑے ھی دنوں میں دبستانِ قدیم کے متبع شعرا کی جماعت کا ایک رکن بن گیا جو اس وقت بہت فروغ پا رہے تھے - اس جماعت میں نائلی، مظلوم پاشا زادہ، ممدوح فائق، حالت، هرسکی، عارف حکمت، غالب اور کاظم تھے جو زیادہ تر نفعی اور فہیم کے نقش قدم پر چل رہے تھے - کمال نے بہت جلد ان شاعروں میں ایک بلند رتبه حاصل کر لیا اور ایک مختصر سا دیوان بھی مرتب کیا، گو اس کی ان نظموں میں کچھ زیادہ تازگی اور جدت نه تھی - اپنی نظموں میں اس نے اپنا تخلص نامق رکھا - یہاں یه بات قابل توجه ہے که اس دیوان کی آخری ناتمام غزل اس کی پہلی قومی نظم ہے .

جس اسلوب انشا کا آگے چل کر وہ بانی ہوا اس کے میدان عمل میں اسے ابتدا میں داخل ہونے کا موقع 'شناسی افندی' کی وساطت سے میسر آیا - شناسی

افندی نے یورپ میں تعلیم پائی تھی اور اُس وقت وہ قسطنطینیہ میں اس کوشش میں مصروف تھا کہ ارباب فہم کو مغربی افکار و ثقافت کی طرف متوجہ کرے اور اس کے لیے بڑا ذریعہ اس کا اخبار تصویر افکار تھا جو اس کے زیر ادارت شائع ہوتا تھا ۔ کمال کے شناسی سے دوستانہ تعلقات قائم ہوے اور بہت جلد وہ پوری طرح اس کے زیر اثر آ گیا ۔ اس اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قدیم انشا پردازی کی تقلید کو چھوڑ کر مغربی انشا پردازی کی روح حاصل کرنے کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گیا ۔ کمال نے بڑی سرگرمی سے نئے افکار کو اپنانا شروع کر دیا کیونکہ ان کی اہمیت اس پر زور روشن کی طرح واضح ہو چکی تھی ۔ اب اس نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا کہ پرانی متحجر (fossilised) ترکی میں جدید ادبی، سیاسی اور سائنسی نہضت علمیہ برپا کی جائے، تاکہ ترکی کے لیے اقوام مغربی کی صف میں جگہ پیدا ہو جائے ۔ اس نے اپنی پُر آشوب زندگی کا آغاز شناسی کے اخبار کے لیے مقالات لکھنے سے کیا ۔ اس وقت سے اس نے جو کچھ لکھا کمال کے نام سے لکھا اور یہ نام لوگوں میں بہت جلد مقبول اور ہر دلعزیز ہو گیا ۔

جب ۱۸۶۴ء میں شناسی [رک بان] کو پیرس کو فرار ہونا پڑا تو وہ اپنے اخبار کی ادارت کا پورا کام نوجوان کمال کے سپرد کر گیا ۔ شروع شروع میں تو یہ کام کمال کو بہت ہی دشوار معلوم ہوا اور ایک سال تک اس نے سوا فرانسیسی ترجموں کے کوئی چیز شائع نہ کی ۔ اس کے بعد کچھ اہم سیاسی مسائل (پولینڈ کی بغاوت اور امریکہ کی خانہ جنگی) سامنے آئے ۔ ان سے اپنے اپنے اخبار کا معیار، جو بہت پست ہو چکا تھا، بلند کرنے میں مدد ملی ، چنانچہ اس نے میدان سنبھالا اور اپنے قلم سے سیاسی مقالات لکھ کر شائع کرنا شروع کیے جن سے چاروں طرف شور مچ گیا، لوگ ان مقالات کو بڑی دلچسپی سے پڑھنے لگے، اور تصویر افکار سب سے زیادہ باأثر اخبار بن گیا ۔ یہی اخبار تھا جس کے صفحات پر سب سے پہلے ''نوجوان ترک'' کی اصطلاح نظر آئی.

اب کمال حکومت وقت کے لیے روز افزوں پریشانی بنتا چلا گیا ۔ گو اس کی عمر صرف ۲۴ سال تھی، لیکن اسے قلعۂ سلطانیہ (گیلی پولی) کے متصرف فلق کا عہدہ دیا جا چکا تھا ۔ اب ارباب حکومت یہ چاہتے تھے کہ اسے ایران میں سفیر متعین کر کے قسطنطینیہ سے دور بھیج دیا جائے، لیکن کمال نے یہ عہدہ قبول نہیں کیا ۔ پھر اسے ارز روم بھیجا جانے لگا اور اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان اس سے بچائی ۔ اس وقت کمال نوجوان ترکوں کی انجمن میں شامل ہو چکا تھا جس کی بنیاد ضیا [پاشا] نے ان عناصر کے درمیان رکھی تھی جو اصلاحات کے حق میں تھے ۔ ان کا مقصد خاص یہ تھا کہ ترکی کو موجودہ پسماندہ حالت سے نکال کر وہاں ایک آئینی حکومت قائم کی جائے ۔ جب ارکان انجمن کو اپنی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہوا تو ۱۸۶۶ء میں ضیا، کمال نُوری، رفعت اور علی سُعاوی ترکی سے بھاگ کر لنڈن چلے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے ۔ اپنی اس پہلی خود اختیار کردہ جلا وطنی کے وقت کمال اپنے پہلے بچے کی پیدائش کا منتظر تھا ۔ یہ بچہ آگے چل کر شاعر علی اکرم مشہور ہوا ۔ لنڈن میں کمال نے اپنی جماعت کی ترجمانی کے لیے اخبار مُخبِر (خبر نگار) شائع کیا ۔ کچھ مدت بعد اس اخبار کو پیرس منتقل کر دیا گیا اور پھر حریت (آزادی) نے اس کی جگہ لے لی ۔ پیرس میں رہ کر کمال نے قانون اور اقتصادیات کا مطالعہ کیا اور زیادہ اہم فرانسیسی تصنیفات کو ترکی میں منتقل کیا.

قیام یورپ نے اس کے سیاسی اور ادبی ارتقا

پر بہت گہرا اثر ڈالا ۔ اس کے بعد وہ بار بار ثقافت پر قلم اٹھاتا نظر آتا ہے ۔ جب علی پاشا صدر اعظم کی وفات کے بعد نوجوان ترکوں کو وطن واپس آنے کا موقع ملا تو کمال نے نوجوان ترکوں کے مجلّۂ عبرت کی عنان ادارت سنبھالی ۔ کمال اپنے مقالوں کی بدولت، جن کی ایک مستقل اور پائدار قدر و قیمت ہے، اس مجلّے کو ترکی کے اہم‌ترین مجلات میں سے ایک بنانے میں کامیاب ہو گیا ۔ اسی زمانے میں اس نے متعدد دوسرے اخباروں اور مجلوں کے لیے بھی مقالات لکھے اور اس طرح رائے عامّہ پر اپنا پورا اثر جما لیا اور ان کے خیالات میں کامل انقلاب پیدا کر دیا ۔

کمال کی سیاسی سرگرمیاں حکومت کی نظروں میں بری طرح کھٹکنے لگیں، خصوصاً اس کے قومی ڈرامے وطن نے تو لوگوں میں بے حد جوش و خروش پیدا کر دیا ۔ مجبوراً حکومت نے اسے قبرص کے قلعے فاماغوستا Famagusta میں جلاوطن کر کے بھیج دیا ۔ ابتدا میں اسے بہت سخت قید تنہائی میں رکھا گیا اور یہیں اس نے اپنے زمین دوز حجرے میں اپنے ڈرامے عاکف بے کا منصوبہ تیار کیا اور جونہیں قید کی سختی کچھ کم ہوئی اس نے اسے لکھ کر چھپوا دیا ۔ فاماغوستا Famagusta میں وہ ۳۸ ماہ تک قید رہا، تاآنکہ سلطان مراد تخت پر بیٹھا اور اسے رہائی نصیب ہوئی اور قسطنطنیہ واپس آنے کی اجازت مل گئی، لیکن مراد کی حکومت صرف ۹۳ روز رہی ۔ اس کے بعد عبدالحمید کا دور حکومت آیا اور بہت جلد کمال کی سرگرمیوں پر پھر پابندی عائد کر دی گئی ۔ کمال نے آئین کی تشکیل میں حصہ لیا اور مدحت پاشا اور ضیا پاشا کے ساتھ مل کر اس کی تنقید و تمحیص کا کام بھی سر انجام دیا ۔

اس کی حریت پسندانہ کارروائیوں نے عبدالحمید کے دل میں اس کی جانب سے بہت زیادہ گہری بے‌اعتمادی پیدا کر دی ۔ اسے گرفتار کر کے ساڑھے پانچ ماہ تک قسطنطنیہ کے عام قید خانے میں رکھا گیا ۔ یہاں اس نے اپنا سارا وقت ترک فوج کی تاریخ کی تیاری کے سلسلے میں تاریخی کتب کے مطالعے میں صرف کیا ۔ اگرچہ عدالت نے سماعت مقدمہ کے بعد اسے رہا کر دیا تھا پھر بھی عبدالحمید نے اسے نظر بند کر کے Mytilene (ساقز Chios) بھیج دیا ۔ روس کی جنگ کا خاتمہ تباہ کن نتائج پر ہو چکا تھا ۔ ان حالات میں یہ زبردستی کی پابندی اور بیکاری کمال کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی، چنانچہ اس نے اپنے گیتوں میں اپنے الم انگیز جذبات کا اظہار کیا ہے جن کا ایک نمونہ مہاجر کا یہ دردناک گیت ہے ''اللہ اچن ایلدیر بنی'' [خدا کے لیے مجھے مار دے]۔

دو سال کی نظر بندی کے بعد جس کے دوران میں اس نے جلال اور جزمی کتابیں لکھیں اسے ساقز (Chios) کا متصرف بنا دیا گیا ۔ یہاں اس پر پھیپھڑوں کی اس بیماری کا پہلا حملہ ہوا جو آگے چل کر اس کی موت کا باعث بنی ۔ جب ساقز ایک ولایت کا صدرمقام بن گیا تو کمال کو رودس تبدیل کر دیا گیا جہاں کی ساز گار آب و ہوا میں اس کی صحت عود کر آئی اور اس کی تخلیقی قوتیں جو کسی قدر کم ہو گئی تھیں پھر بحال ہونے لگیں ۔ ایک شاندار کتاب خانے کی مدد سے جس کی توسیع کے لیے اس نے گراں قدر ذاتی خرچ پر ہندوستان، ایران، مصر اور یورپ میں اپنے کارندے مقرر کر رکھے تھے، اس نے ترکی سلطنت کی تاریخ لکھنے کی تیاریاں شروع کر دیں ۔

رودس سے اسے پھر مُتَصَرِّف کے عہدے پر ساقز بھیج دیا گیا ۔ اس نے بڑے جوش اور تندھی سے اپنا تاریخ نویسی کا کام جاری رکھا، حالانکہ اس کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی ۔ دیگر تمام

اصناف ادبی میں بھی اس نے اچھی خاصی سرگرمیاں جاری رکھیں ۔ اس کے خلاف کسی دشمن کی مخبری پر قسطنطینیہ سے فرمان صادر ہوا کہ تاریخ نویسی کا کام اور اس کی طباعت دونوں روک دیے جائیں۔ یہ ایک بڑا خوفناک وار تھا؛ چنانچہ ۲ دسمبر ۱۸۸۸ء کو اسے یہ فرمان وصول ہوا اور اسی رات Mytilene کے مقام پر اس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی ۔

اسے پہلے تو Mytilene میں مسجد کے بالکل سامنے دفن کیا گیا اور پھر اس کا بیٹا علی اکرم سنجیدہ رسوم کے ساتھ اس کی میت کو بُلَیر Bulair لے گیا جو گیلی پولی سے ۸ میل مشرق میں واقع ہے اور وہاں اسے سلیمان پاشا کے مقبرے میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا ۔ یہ اعزاز اس جلیل القدر محبِ وطن کے بالکل شایان شان تھا ۔ عبدالحمید نے کمال کا ایک شاندار مقبرہ (تربہ) تعمیر کرایا ۔ اس سے قبل سلیمان پاشا کی تربت تو زیارت گاہ تھی، اب کمال کی تربت بہت سے ترکوں کے لیے اس سے کہیں زیادہ مرجعِ ارادت بن گئی کیونکہ انھیں کمال کے اندر اپنے دلی مقاصد کی زندہ تصویر نظر آئی ۔ انجمن اتحاد و ترقی نے ۱۹۰۸ء کا انقلاب برپا کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ سالونیکا سے اس کے ارکان احترام و تعظیم کے جذبات لیے ہوئے بُلَیر Bulair پہنچے اور کمال کی قبر پر حاضر ہو کر اس مؤسسِ قصرِ حریت کی روحِ پُر فتوح کو بادب خراج عقیدت پیش کیا ۔ اس جماعت نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد جس بے نظیر اعتدال و سکون سے اپنا کام جاری رکھا وہ بھی کامل کی بلند خیالی کا اثر تھا جس کے لیے وہ تحسین و آفرین کا مستحق ہے ۔

عثمانی ادب میں کمال کو جو اعلٰی ترین اور بے مثال مقام حاصل ہے اس کا ہم جتنا بھی اونچا اندازہ کریں کم ہے ۔ اس نے اپنے معاصرین پر اور آنے والی نسل پر بہت ھی گہرا اثر ڈالا ہے ۔ اسے اپنے کام کی دشواریوں کا پوری طرح احساس تھا، لیکن اسے ہمیشہ یقین واثق تھا کہ ان مساعی کے نتائج بہت خوش آیند و مبارک ہوں گے اور یہ بات اس کی پُرجوش طبیعت کے بالکل مطابق تھی۔ اگرچہ وہ طبقۂ امرا میں پیدا ہوا تھا، لیکن سیاسی تحریکوں کی قیادت کی صلاحیت اس میں پیدائشی طور پر موجود تھی اور وہ کاملاً انقلابی تھا ۔ اس کی سرگرمیٔ عمل نیز غیر معمولی عزم و ارادہ عوام کے دلوں کو موہ لیتا تھا ۔ وہ گہرے دینی جذبے سے سرشار تھا ۔ اس کا زاویۂ نگاہ کلیۃً اسلامی تھا اور اسے اپنی قوم، اپنے ملک اور ان دونوں کے مستقبل پر پورا بھروسا تھا ۔ صحیح ثقافت اسلامیہ پر اعتقاد رکھتے ہوے، جس میں اتحادِ عالم اسلامی کے رجحانات بہت قوی تھے، اس نے اس کے حصول کی کوشش کی اور اس غرض کے لیے اصلی ابتدائی اسلام کو اپنا نصب العین قرار دیا اور درمیانی اسلامی دور کو جس سے وہ بالکل مطمئن نہ ہو سکا، قطعاً نظر انداز کر دیا ۔ حقیقی اسلام کے احیا کے لیے اس نے ضروری سمجھا کہ ترکوں میں پہلے جذبۂ حب الوطنی پیدا کرے، چنانچہ اس کے ذریعے وہ اپنی خوابیدہ قوم کے ملّی جذبات کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوا ۔ کمال پہلا شخص ہے جس نے اپنے ہم وطنوں کے دلوں کو گرمانے کے لیے سب سے پہلے تصور وطن کو جاگزیں کیا جس کی جگہ بعد ازآں ترکی لفظ یورت استعمال ہونے لگا ۔ اس کے بعد قومیت اور حریت کے تصورات بروے کار آئے اور یہی نوجوان ترکوں کے نعرے اور نصب العین بن کر رہ گئے ۔

کمال نہایت استقلال سے اپنے کام میں لگا رہا، اگرچہ حالات سخت ناہموار اور پیچیدہ تھے ۔

اس کے نزدیک اس کا مقصد مقاصد رسالت کا ایک حصہ تھا جس کی تکمیل ضروری تھی ۔ اس کا سلیقۂ تصنیف و انشا کچھ کم درجے کا نہ تھا، لیکن اس سے اس تقریباً مافوق العادة اثر کی پوری توجیہ نہیں ہوتی جو اس نے اپنی قوم پر ڈالا اور آج تک ڈال رہا ہے ۔ عثمانی ادب کے جدید ترین نقادوں کا رجحان اس طرف ہے کہ ایسے مصنف کی حیثیت سے بہت زیادہ بلند مرتبہ نہ دیا جائے، لیکن اس سے کوئی نقاد انکار نہیں کر سکتا کہ جو صفات اسے سب سے زیادہ بلند مقام عطا کرتی ہیں وہ اشتیاق حریت، حب الوطنی، بے باکانہ جرأت اظہار خیالات اور سب سے بڑھ کر اس کی قادر الکلامی ہیں ۔ جب اس نے لکھنا شروع کیا ہے اس وقت زبان کی حالت ابتر تھی، لیکن جب اس کی وفات ہوئی جو عمر طبعی تک پہنچنے سے پہلے ہی واقع ہوئی تھی تو ترکی زبان ایک حیرت انگیز ترقی یافتہ آلۂ اظہار خیالات بن چکی تھی ۔ موجودہ ترکی کی نثر نویسی کی ایجاد کا سہرا کمال کے سر ہے ۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ۔

سیاسی اور ادبی مقالات میں کمال کے استدلال میں زور اور اثرانگیزی ہوتی ہے ۔ جب وہ کسی رائے کی حمایت کرتا ہے تو یہ دونوں قوتیں اپنا کام کرتی ہیں ۔ مقالہ نگاری میں کوئی شخص بھی کمال سے نہیں بڑھ سکا ہے ۔ اس کی زیادہ طویل تصنیفات مقالات کے ایک سلسلہ وار مجموعے سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتی ہیں نہ کہ کسی ایک مربوط تصنیف سے ۔

کمال کو کس قدر نظر استحسان سے دیکھا جاتا تھا اس کا اندازہ متبعین کی کثرت تعداد سے دیا جا سکتا ہے جنھوں نے اس کے اسلوب کی نقل کی ۔

کمال کی تصانیف : کمال ابتداءً شاعر نہیں تھا ۔ اپنے دیوان کے علاوہ جو پرانی طرز میں لکھا گیا ہے، گو اس میں بھی جدید خصوصیات (حب الوطنی اور حب ابنائے وطن) کی جھلک نظر آنی شروع ہو گئی ہے اور نئی مخترعات (تھیئٹر، اسٹیمر) کے تصورات بھی پائے جاتے ہیں، غزل کے میدان میں اس نے چند ایسی زور دار نظمیں کہی ہیں جو وحی کی طرح زبانزد خلق ہو گئیں ۔ اس کی طرز کے بسرعت مقبول عام ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی تک اپنے کلام میں پرانے خیالات کی کچھ نہ کچھ طرف داری کر جاتا تھا ۔ اس کی بہت سی نظمیں اس کی تصنیفات میں بکھری پڑی ہیں اور بہت سی غیر مطبوعہ شکل میں دست بدست لوگوں کے پاس پہنچ گئیں ۔ ان تمام نظموں سے اس کا گہرا جذبۂ حب الوطنی ظاہر ہوتا ہے ۔

اپنی نظم واویلا "(اظہار تاسف، شیون) (طبع دوم ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) میں کمال اپنے وطن کے لیے آہ و زاری کرتا ہے جو کفن میں لپٹا پڑا ہے؛ اس کی نظم بارقۂ ظفر (کامیابی کی چمک) (۱۸۷۲ء) میں جو ایک بلند پایہ اسلوب میں لکھی گئی ہے، فتح قسطنطینیہ کی مدح سرائی کی گئی ہے ۔ اس کی پر جوش نظم وطن منظومی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء میں کہیں جا کر طبع ہوئی [یہ نظم جس میں نامق کمال نے ترکی کی بے بسی اور خراب خستہ حالت بہت پر تاثیر الفاظ میں بیان کی ہے ، ایک ترجیع بند کی شکل میں ہے جس میں ہر تین ہم قافیہ مصرعوں کے بعد یہ شعر آتا ہے :

وطنڭ با غرینه دشمن طیاری خنجرینی
یوق ایمش تور تاره جق بختی قده مادرینی

یعنی دشمن نے وطن کے سینے پر اپنا خنجر رکھ دیا ہے، شاید اپنی اس سیاہ بخت ماں کو بچانے والا کوئی نہیں"] .

ایک مصنف کی حیثیت سے کمال کی اصل کامیابی کا راز اس کی تمثیلی حکایات میں مضمر ہے

جو تعداد میں چھپے ھیں - ھم اسے ترکی ڈرامے کا موجد کہ سکتے ھیں - ابوالضیاء توفیق کا، جو اس کا سب سے زیادہ عقیدت مند دوست اور پیرو تھا، ڈراما اجلِ قضا (تقدیر محذور) (۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ - ۱۸۷۲ء) ترکی میں پہلا قومی ڈراما ھے اور اس کی تیاری کے سلسلے میں کمال نے نہایت خاموشی سے معاونت کی اگرچہ اس کا نام نہیں لیا گیا - اس کے بعد اس نے اپنی استعداد سے بلا شرکت غیرے کام لیا اور حسب ذیل ڈرامے لکھے :

۱ - وطن یا خود سِلِسترہ، چار ایکٹ کا ڈراما، پہلی بار ۱۸۷۲ء میں اور اس کے بعد کئی دفعہ طبع ہوا (روسی میں ترجمہ از W.D. Smirno، در *Wiestnik Ewropi* ۱۸۷۶، ۹: ۱۰۱؛ جرمن ترجمہ از L. Pekotsch، وی انا ۱۸۸۷ء) - یہ ڈراما جو عمرانی اور نفسی نقاط نظر سے اھم ھے شجاعت اور سردانگی کے ان مناظر کی تصویر کشی کرتا ھے جو ۱۸۵۴ء میں سلسترہ کی مدافعت کے وقت رونما ہوے تھے۔ اس ڈرامے نے لوگوں میں بے انتہا جوش و خروش پیدا کیا اور Famagusta میں کمال کی جلا وطنی کا سب سے بڑا باعث یہی تھا.

۲ - زوالّی چوجق (''بےچارہ لڑکا'') تین ایکٹ کا ڈراما (۱۸۷۳ء)، اس میں بچے پر والدین کے بے جا دباؤ کے برے اثرات بیان کیے گئے ھیں اور رواج کے مطابق شادیاں طے کرنے کے طریقے کی مخالفت کی گئی ھے - کمال نے اس میں نئے زمانے کے اس خیال کی تائید کی ھے کہ عورتوں کو ان کے احساسات اور عواطف میں جائز آزادی دی جائے۔ اس میں "La Dame aux Camelias" کا اثر بلاشک و شبہہ نمایاں ھے .

۳ - عاکف بے، پانچ ایکٹ کا ڈراما (۱۸۷۴ء)، اس میں ترکی بحری فوج کے ایک افسر کی حب الوطنی کی روداد لکھی گئی ھے اور اس کا مقابلہ اس کی بیوی کی بیوفائی اور تلون مزاجی سے کیا گیا ھے جو اپنے خاوند کی عدم موجودگی سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ھے .

۴ - گل نہال، پانچ ایکٹ کا ڈراما (۱۸۷۵ء) غالباً اس کی بنیاد [شیکسپیر کے ڈرامے] ھملٹ پر رکھی گئی ھے - اس میں جذبۂ انتقام کو سراھا گیا ھے اور خصوصاً استبداد کے خلاف عورت کی بغاوت اور انتقام کو قابل تحسین و آفرین قرار دیا گیا ھے .

۵ - جلال الدّین خوارزم شاہ، پانچ ایکٹ کا ایک المیہ ڈراما (۱۸۷۵ء) جس کے ساتھ عثمانی ادبیات اور ڈرامے کی ھیئت و اسلوب کے نقائص سے متعلق ایک طویل ادبی مقدمہ شامل ھے - یہ ڈراما سب سے پہلے رودوسلی صالح جمال نے ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء میں شائع کیا - اس کے بعد قاھرہ میں بغیر مقدمے کے ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء، میں شائع ھوا - فقط مقدمہ مجموعۂ ابوالضیاء، عدد ۴۱ (۱۸۸۵ء) اور کتاب خانۂ ابوالضیاء، عدد ۶۹ میں چھپا ھے - یہ ایک روحانی (المیہ) افسانہ ھے جو تاریخ ایران سے ماخوذ ھے اور ھیوگو Hugo کے *Cromwell* اور *Hernani* کے نمونے پر لکھا گیا ھے - جلال کو ترکی ادب کے روحانی دور کا نقطۂ عروج تصور کیا جاتا ھے - یہ ڈراما صرف پڑھنے کی غرض سے لکھا گیا تھا اور اس میں سلاطین آل عثمان کے نظام حکومت کے خلاف بڑی پُرجوش صداے احتجاج بلند کی گئی ھے - اس کے اس نمایاں رجحان کے باعث محتسبان حکومت اس ڈرامے پر ھمیشہ پابندیاں عائد کرتے رھے [سجاد حیدر یلدرم کے قلم سے اس کا اردو میں ترجمہ ھو چکا ھے] .

۶ - قرہ بلا (''کالی بلا'') پہلی بار ۱۹۰۸ء میں کلّیات میں شائع ھوا - یہ ڈراما ۱۹۰۸ء میں Famagusta میں لکھا گیا تھا اور اس میں ھندوستان کے ایک شہنشاہ کی بیٹی کی ایک حبشی کے ھاتھوں بےحرمتی کی حکایت بیان کی گئی ھے جو خواجہ سرا بن کر

حرم میں داخل ہو گیا تھا اور شہزادی کا عاشق بن بیٹھا ۔ مظلوم شہزادی اپنی شادی کی رات کو اس کالی بلا کو قتل کرنے کے بعد خود کشی کر لیتی ہے .

معلوم ہوتا ہے کہ Smirnow نے ایک ڈراما اناڈولی کویلری (*Anadolu Kuyleri*) غلطی سے کمال کی طرف منسوب کر دیا ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ سلطان نے اس پر اسے ایک خاص انعام دیا تھا ۔ واقعات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ کمال کے ڈراموں میں حسب ذیل کمزوریاں ہیں : بےساختگی اور تتبع فطرت کی کمی، داخلی محرکات سے متعلق روشن بیانی کا فقدان، جذباتی، حب وطن کے جوش و خروش سے متعلق ضرورت سے زیادہ رقت انگیزی اور طعن و ملامت آمیز عبارات ۔ لیکن کمال کو اپنے سامعین کی توجہ اور دلچسپی پر قابو رکھنے کا طریقہ آتا ہے اور وہ انھیں اپنے ساتھ ساتھ لیے بڑھا چلا جاتا ہے ۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ہاں ایک قسم کی نفسیاتی گہرائی ضرور موجود ہے ۔ اس زمانے میں ترکی تھیٹر بالکل ایک نئی چیز تھی ۔ اس زمانے کو اور اس کے ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کمال کے ڈراموں کو ایک عظیم الشان کارنامہ کہا جا سکتا ہے، گو ان میں ڈرامائی اور اصطلاحی نقائص موجود ہیں ۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ کمال کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ڈرامے کو عوام تک اپنے خیالات پہنچانے اور ان کے خوابیدہ احساسات کو جگانے کا ذریعہ بنایا جائے ۔ اس کے نزدیک تھیٹر "ایک ایسا ذریعۂ تفریح ہے جس سے عوام پر خاطر خواہ اثر ڈالا جا سکتا ہے".

اس نے اپنے دو ناولوں میں بھی یہی وتیرہ اختیار کیا اور ان میں بھی یہی نقائص موجود ہیں، لیکن ان میں ہم ترکی معاشرت و افکار کے مخصوص پہلوؤں کی واضح اور صاف تصاویر دیکھ سکتے ہیں ۔ طرز نگارش کے اعتبار سے بھی ان میں بہت بڑی خوبیاں موجود ہیں ۔ چنانچہ اس کے ناولوں کا اثر عوام پر بہت ہی زیادہ پڑا ۔ وہ ایک پورے دبستان فکر کے لیے نمونہ بن گئے جس کا سب سے بڑا نمائندہ وجیہی تھا ۔ وہ دو ناول یہ ہیں :

۱ - انتباہ یا خود علی بیگ سرگذشتی (بیداری یا علی بے کی سرگذشت) ۱۸۷۴ء؛ کہتے ہیں کہ اس کا اصلی نام صون پشیما نلیق تھا) ۔ یہ ایک مالدار بگڑے مزاج کی عورت کے لاڈلے فرزند کی سرگذشت ہے جو ایک طوائف کے پنجے میں پھنس جاتا ہے اور اس کے بہکانے میں آ کر اپنی معصوم محبوبہ کو بڑی بےرحمی سے ٹھکرا دیتا ہے اور بالکل تباہ و برباد ہو جاتا ہے ۔ بالآخر جب اس کی ٹھکرائی ہوئی محبوبہ اپنی جان دے کر اس کی زندگی بچا لیتی ہے تو وہ طوائف کو ہلاک کر ڈالتا ہے اور اپنی باقی ماندہ زندگی قید خانے میں گزارتا ہے .

۲ - جزمی، ایک تاریخی ناول (۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء، طبع ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء)؛ یہ کریمیا کے فرمانروا عادل گرائی اور شاہ ایران کی ہمشیرہ کی داستان محبت ہے جو سولھویں صدی میں جب عادل گرائی ایران میں قید تھا، ظہور پذیر ہوئی ۔ اصلی واقعات تاریخ سے ماخوذ ہیں ۔ جہاں تک اسلوب کی چستی اور بیان کے تنوع کا تعلق ہے، جزمی فنی اعتبار سے علمی بی سے بہت بڑھا ہوا ہے ۔ اس میں عالم اسلامی کے اتحاد کا تصور بیّن طور سے نظر آتا ہے .

کمال کی سب سے زیادہ قابل ذکر تاریخی تصنیفات حسب ذیل ہیں، (۱) اس کی سوانح عمری اوراق پریشان (بکھرے ہوئے ورق) (۱۳۰۱ھ)، جس کے ۴ حصے ہیں اور ان میں چار ناموران اسلام کی سیرتوں کا بیان ہے؛ اسلوب بیان فاضلانہ ہے

جس میں یورپی طرز انشا کا تتبع کیا گیا ہے ۔ اس تصنیف میں اس نے اپنے اسلامی رجحانات کو ترقی یافتہ صورت میں واضح کیا ہے، یہ چار نامور ہیں : صلاح الدّین ایوبی؛ آلِ عثمان میں سے سلطان محمّد ثانی اور سلطان سلیم اوّل یاووز اور امیر نوروز بیگ ۔ زبان اور علمیت کے اعتبار سے ترک اس مجموعے کو ایک کلاسیکی تصنیف کا درجہ دیتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ایک اچھی تالیف ہے جس کا بیشتر حصّہ یورپی مأخذ سے لیا گیا ہے، البتہ جہاں تک وضاحتِ مطالب اور زور بیان کا تعلق ہے، یہ اس کی بہترین تصنیف ہے؛ (۲) دورِ اِسْتِیلا؛ (۳) قنیزہ، هنگری کے قلعۂ قنیزہ (Ḳanisza) کی فتح کی داستان؛ یہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں Famagusta میں لکھی گئی اور اسی سال مصنّف کے نام کے بغیر شائع ہوئی۔

(۴) کمال کو اسلام کی قوت حیات پر پورا اور پر جوش اعتقاد تھا، تاهم اس کی تصنیفات میں اسلامی تصوّرات اور روسو (Rosseau) کے فلسفے کے درمیان، جسے وہ اختیار کرنا چاهتا تھا، مکمل هم آهنگی نظر نہیں آتی ۔ کمال نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی پیش کردہ اقدار جدید تہذیب کے بنیادی تصورات سے کسی طرح بھی کم پایہ نہیں بلکہ اگر هم بنظر غائر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ وهی تصورات هیں جنھیں اسلام نے پیش کیا تھا ۔ اسلام سولھویں صدی تک کسی طرح پسماندہ نہ تھا اور یورپ کی فوقیت اسے فقط اس وقت ماننا پڑی جب یورپ نے تجربی اور استقرائی علوم میں آگے قدم بڑھایا ۔ ارنسٹ رینان (Ernest Renan) کے اس دعوے کے رد میں کہ اسلام تعلیم کا دشمن ہے کمال نے رنان مدافعہ نامہ سی لکھی جو کلّیات میں شائع ہوئی ۔ رینان کے نظریے کے خلاف مسلمانوں کے لکھے ہوئے دیگر رسائل کی بہ نسبت کمال کے اس رسالے میں زیادہ مضبوط دلائل سے کام لیا گیا ہے ۔

(۵) مدخل، تاریخ رومائے قدیم اور تاریخ اسلام جو ۴۳۸ھ/۱۰۴۶ء تک ہے ۔ کمال نے اسے اپنی تاریخ آل عثمان کی بنیاد اور مقدمہ بنانے کی غرض سے لکھا ہے ۔ تاریخ آل عثمان میں آغاز سلطنت سے لے کر سلطان سلیم اول یاووز کی وفات (۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء) تک کے حالات درج هیں ۔

(۶) رؤیا، اس کی سب تصانیف سے زیادہ پر زور اور تصنع سے خالی تصنیف ہے جسے ردعمل کے دور میں هر ترک نے ضرور پڑھا ہو گا ۔ اس میں ان دنوں سے متعلق خواب بیان کیے گئے هیں جب وطن زنجیروں سے آزاد هو جائے گا ۔ یہ کئی بار چھپی ہے، مثلاً قاهرہ (اجتہاد) میں دوبار، ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۹ء۔

(۷) سرگذشت (۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) میں بھی ایک خواب کا حال ہے ۔

کمال بنیادی طور پر ایک جریدہ نگار تھا (رکّ بہ سطور بالا) ۔ اس نے عبرت کو ایک مثالی اخبار بنا دیا تھا ۔ اس میں اس کے جو مقالات شائع هوے وہ آج بھی بار بار طبع کیے جاتے هیں اور مجموعوں میں شامل کیے جاتے هیں ۔ اس اخبار کے گزشتہ پرچوں کو بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا جاتا ہے ۔

اس نے ایک نقاد کی حیثیت سے بھی بڑی جامعیت کا ثبوت دیا ۔ گب (Gibb) نے اس کی تنقید کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا ہے ۔ اس نے قدامت پسند ادب پر سخت جرح کی اور جدید دبستان ادب کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا ۔ اس کے مقالات میں اور مقدمہ میں نقد و کاوش کا بہت کچھ ذخیرہ ہے ۔ جب اس کے پرانے رفیق کار ضیا پاشا نے خرابات کے نام سے تین جلدوں میں ترکی ادب کا کسی قدر نامناسب سا انتخاب شائع کیا تو کمال نے پہلی دو جلدوں پر دو زور دار تنقیدی تبصرے

تخریب خرابات، ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء اور تعقیب خرابات، طبع ثانی ۱۹۰۳ء، لکھ کر شائع کیے، گب کی رائے میں ان مقالوں کا شمار ترکی کے بہترین مقالات میں ہوتا ہے۔

کمال کے مکتوبات و رسائل کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کی ترکی کے تقریباً تمام نامور سیاسی اور ادبی لوگوں سے خط و کتابت تھی ۔ افسوس ہے کہ اب تک ان کا صرف کچھ حصہ طبع ہو سکا ہے، مثلاً خطوط بنام مدحت افندی اور عرفان پاشا، اسی طرح ابوالضیاء توفیق، عبدالحق حامد وغیرہ کے نام چند مکتوبات؛ وہ عموماً بڑی بے ساختگی اور بے تکلفی سے اور زوردار طرز میں لکھتا ہے؛ کمال پہلا شخص ہے جس نے اپنی قوم کو مکتوب نگاری کے اسلوب سے روشناس کیا۔

اس کے تحریر کردہ سرکاری کاغذات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ۔ اگرچہ ترکوں کا سرکاری انداز نگارش بہت پابند رسوم اور پیچیدہ تھا، تاہم بالآخر کمال نے اس میں صفائی اور وضاحت پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ۔ اس نے اپنی مختلف سرکاری حیثیتوں سے جو منشئات مرتب کیے ان کی بہت زیادہ تعداد ہے ۔ یہ ریاست کی تشکیل اور اس کی اصلاحات پر، عوام کے حقوق پر، ان کی ذہنی اور مثالی ضروریات پر، قانون، تاریخ، معاشیات، فلسفہ اور عمرانیات پر مشتمل مقالات ہیں اور ان میں مختلف منصوبوں کی وضاحت کی گئی ہے، نیز ان میں شاہی فرامین اور نیم سرکاری دستاویزات وغیرہ بھی شامل ہیں۔

آخر میں اس کے متعدد تراجم کا بھی ذکر کر دینا چاہیے۔

بہار دانش: یہ ایک ہندی مصنف شیخ عنایت اللہ کی کتاب کا ترجمہ ہے جس کے ساتھ اس نے ایک ادبی مقدمہ بھی لکھ کر شامل کیا ہے۔

کمال نے کئی فرانسیسی مصنفین مثلاً Lamartine و Condorcet، Montesquieu، Rousseau، Victor Hugo، Volney وغیرہ کی تصنیفات کے بھی ترجمے کیے۔

اس کے بیٹے علی اکرم نے اس کی تصنیفات کے ایک مکمل مجموعے کی اشاعت کا کام شروع کر دیا تھا، لیکن وہ بیچ ہی میں ہمت ہار کر بیٹھ گیا۔ علی اکرم نے کمال کی مکمل سوانح عمری پیش کرنے کا جو وعدہ کیا تھا، وہ بھی جہاں تک مجھے معلوم ہے، پورا نہیں ہو سکا ۔ تاریخ ادب میں کمال کے مقام سے متعلق ڈاکٹر رضا توفیق نے جو مقالہ تحریر کیا تھا، افسوس ہے کہ وہ بھی تا حال شائع نہیں ہوا۔

مآخذ: متن میں مذکورہ تصنیفات کے علاوہ دیکھیے: (۱) W.D. Smirnow: *Tureckaya Ciwiliza-ciya*، در *Wiestnik Ewropĭ*، ۱۸۷۶ء، ۹: ۱۰؛ (۲) وہی مصنف: *Očerk istorii tureckoi literaturĭ*، در *Korsh's Wsepbshčaya Literatura*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۱ء، ص ۵۳۱ و بعد؛ (۳) وہی مصنف: *Obra-zcowĭya Proizwiedieniya Osmanskoi Literaturĭ*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۲۰ و بعد نیز ۳۰ تا ۳۹۳؛ (۴) Charles Wells: *The literature of the Turks*، لنڈن ۱۸۹۱ء، ص ۱۳۸ تا ۲۰۶؛ (۵) L. Bonelli: *Della lingua e letteratura con-temporanea*، در *Atti del R. Istituto Veneto di Scienze*، (۱۸۹۲ء)، ص ۱۳۶۷ تا ۱۳۷۰؛ (۶) وہی مصنف: *La moderna letteratura Ottomana*، در *Bessarione, Rivista di Studi Orientali*، ۷، ج ۳، رسالہ ۷۰، [مطبوعہ] روم ۱۹۰۳ء؛ (۷) Gibb: *A History of Ottoman Poetry*، لنڈن ۱۹۰۰ء ۔ ۱۹۰۹ء؛ (۸) P. Horn: *Türkische Moderne*، لائپزگ ۱۹۰۲ء، ص ۳۰ تا ۳۳؛ (۹) Edmond Fazy و عبدالحلیم ممدوح: *Anthologie de l'amour turque*، پیرس ۱۹۰۵ء،

ص ۱۶۱ تا ۱۹۱؛ (۱۰) I. Kúnos : *Oszmán-török nyelvkönyv*، بوڈاپسٹ ۱۹۰۵ء، ص ۵۲ تا ۶۲؛ (۱۱) K. J. Basmadjian : *Essai sur l'histoire de la Littérature Ottomane*، قسطنطینیه ۱۹۱۰، ص ۱۹۳ تا ۱۹۶؛ (۱۲) Fr. Vincze : *Nàmik Kemàl Bej*، بوڈاپسٹ ۱۹۱۱ء؛ (۱۳) Wl. Gordlewskji : *Očerki po nowoi osmanskoi literaturie*، ماسکو ۱۹۱۲ء، ص ۱۳ تا ۲۷؛ (۱۴) A. Fischer و احمد محیّ الدّین : *Anthologie aus der neuzeitlichen türkischen Literatur*، لائپزگ ۱۹۱۹ء، ص ۴ و ۲؛ (۱۵) احمد محیّ الدّین : *Die Kulturbewegung im modernen Türkentum*، لائپزگ ۱۹۲۱ء، ص ۶ ببعد؛ (۱۶) ابوالضیاء توفیق : نمونۂ ادبیات عثمانیه، قسطنطینیه ۱۳۰۸ھ، ص ۲۹۹ تا ۵۰۰؛ (۱۷) وهی مصنّف : جملۂ منتخبۂ کمال، قسطنطینیه ۱۳۱۱ھ؛ (۱۸) وهی مصنّف : کتاب خانۂ ابوالضیاء، عدد ۱۱ تا ۱۳، تخریب خرابات (۱۳۰۳ھ)؛ (۱۹) عدد ۱۹ تا ۲۰ : ادبیات؛ (۲۰) عدد ۲۸ و ۹۲ تعقیب خرابات؛ (۲۱) عدد ۶۸ بارقۂ ظفر؛ (۲۲) عدد ۹۶ مقدمۂ جلال؛ (۲۳) عدد ۸۸ تا ۸۹ : تبصیر عاکف پاشا؛ (۲۴) عدد ۹۷ : تنیزه (طبع اوّل ۱۲۹۰ھ، مصنّف نامعلوم، طبع ثانی ۱۳۰۳ھ میں کمال کا نام بطور مصنّف درج ہے، طبع ثالث از ابو الضّیاء)؛ (۲۵) ابو الضّیاء : مجموعۂ ابو الضیاء، عدد ۱۴ (۱۳۰۲ھ)؛ (۲۶) سامی : قاموس الأعلام، ۵ : ۳۸۸۴ ببعد، قسطنطینیه ۱۳۱۴ھ؛ (۲۷) علی سُعاد : نامق کماله، آشیان، قسطنطینیه ۱۳۲۴ھ ج ۱، عدد ۷، ص ۱۹۵ ببعد؛ (۲۸) کمال‌زاده علی اکرم : روح کمال، قسطنطینیه ۱۳۲۴ھ؛ (۲۹) وهی مصنّف : کلّیات کمال، قسطنطینیه ۱۳۲۶ھ؛ (۳۰) بلقور لوزاده رضا : منتخبات بدائع ادبیه، قسطنطینیه ۱۳۲۶ھ (۱۲ نثر کے اور ۲۵ نظم کے نمونے)؛ (۳۱) عبداللہ جودت : اجتهاد، ج ۲، عدد ۶ و ۷، ص ۲۲۷ تا ۲۳۰ و ۲۵۴ تا ۲۶۳، قاهره ۱۹۰۸ء؛ (۳۲) رشاد : *Kemal ile Mukhābirimiz*، قسطنطینیه ۱۳۳۲ھ؛ (۳۳) اشرف : حسب حال یا خواه اشرف و کمال، قسطنطینیه ۱۹۰۸ء؛ (۳۴) امین عثمان : حدیقة الادباء قسطنطینیه ۱۲۹۹ھ، ۳۲۷ھ؛ (۳۵) شهاب الدین سلیمان : تاریخ ادبیات عثمانیه، قسطنطینیه ۱۳۲۸ھ، ص ۳۲۵-۳۳۱؛ (۳۶) عبدالحلیم ممدوح : تاریخ ادبیات عثمانیه، قسطنطینیه، ۱۳۰۶ھ؛ (۳۷) مدحت جمال : نفائس ادبیه منظومه قسمی، قسطنطینیه ۱۳۲۹ھ؛ (۳۸) وهی مصنف : ایک ڈراما کمال؛ مکمل مجموعه ۷ جلدوں میں مرتب ہونا تھا ۔ اس کی ادارت کا بیڑا ۱۹۱۰ء/ ۱۹۱۱ء میں کمال کے بیٹے علی اکرم نے اٹھایا تھا ۔ تجویز کے مطابق اس مجموعے کو اس طرح شائع کرنے کا ارادہ تھا : سلسلۂ اول (۱) رنان مُدافعه نامه سی؛ (۲) قره بلا؛ (۳) مقالات سیاسیّه و ادبیه و رؤیا؛ (۴) وطن، گل نہال، عاکف، زوالی چوجق؛ (۵) اشعار کمال؛ (۶) جلال الدین خوارزم شاه مع مقدمه؛ (۷) و (۱۱) مکاتیب خصوصیه، خطوط کی دو جلدیں؛ (۸) اوراق پریشان مجموعه سی (سوانح فاتح، سلطان سلیم، و سلطان صلاح الدین ایوبی و امیر نوروز؛ اور دور استیلا)؛ (۹) منتخبات محررات رسمیّه؛ (۱۰) جزمی و انتباه؛ (۱۲) تعقیب و تخریب خرابات و تنقیدی مقالات سلسلۂ ثانی، مدخل (مقدمۂ تاریخ)، تاریخ اسلام و عثمانلی تاریخ؛ مزید منتشر نگارشات و متعدد تراجم وغیره؛ سلسلۂ اول میں (۱)، (۲)، (۳) چھپے حصوں میں؛ اور سلسلۂ ثانی میں سے عثمانلی تاریخ کی چار جلدیں طبع ہوئی تھیں .

(Th. Menzel)

کمان کَش : (یعنی ''تیر انداز'') علی پاشا، ایک عثمانلی صدر اعظم، آنا طولی کے ایک ضلع حمید ایلی [رک بہ حمید اوغلری] میں پیدا ہوا اور ابتدائے عمر ہی میں استانبول چلا آیا جہاں اس کی تعلیم و تربیت قصر شاہی میں ہوئی ۔ ۱۰۳۰ھ/ ۱۶۲۰ - ۱۶۲۱ء میں وہ دیاربکر کا، اور اس کے چند روز بعد بغداد کا والی مقرر ہوا ۔ اگلے سال اسے

قپّہ وزیری (وزیر قبّہ) کا عہدہ دیا گیا ۔ ذوالحجہ ۱۰۳۲ھ میں صدر اعظم مرہ حسین پاشا کے بر طرف ہو جانے پر مہر شاہی اس کے سپرد کی گئی ۔ یہ عہدہ اسے زیادہ تر شیخ الاسلام یحیی افندی کی کوششوں کی بدولت ملا تھا لیکن یہ اس کی اس مستعدی کا صلہ بھی تھا جو اس نے نا اہل اور بیوقوف سلطان مصطفی اوّل کو معزول کرنے کی کوششوں میں دکھائی تھی ۔ کمان کش علی پاشا نے جو کمزور، ڈرپوک اور معمولی نہاد کا آدمی تھا، سب سے پہلے اپنے رقیبوں اور دشمنوں سے پیچھا چھڑانے کی ٹھانی، چنانچہ اس نے وزیر گوچی محمد پاشا اور وزیر خلیل پاشا کو قید خانے میں ڈالا اور مفتی یحیی کو معزول کر دیا ۔ اس کی حرص و آز نے اسے اس پر آمادہ کیا کہ بہت ھی قابل نفرین خیانت اور چالبازی کے ساتھ شاھی خزانے کا روپیہ خورد برد کرے ۔ اس نے چاندی کے سکوں میں کھوٹ زیادہ کر دیا اور چاندی بمشکل کوئی پانچواں حصّہ رہ گئی ۔ ینی چریوں کی تنخواہ ساری کی ساری اپنی جیب میں ڈالی اور ایسے ھی اور کمینہ طریقوں سے ریاست کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی سکّوں کی قدر و قیمت گھٹا کے اور سرکاری ملازمتیں دلانے کی رشوتیں وصول کر کے چھے ماہ کے اندر اندر ھی اس نے بڑی بھاری دولت جمع کر لی ۔ جب اس نے وزیراعظم کا قلمدان سنبھالا تھا تو اس وقت سرطامس رو Sir Thomas Roe نے اس کی بابت اپنے ایک سرکاری مراسلے مؤرخہ ۲۳ اگست ۱۶۲۳ھ میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''وہ ایک خاموش اور دیانت دار آدمی ھے لیکن چونکہ ناآزمودہ ھے اس لیے اس بات میں تردد ھے کہ وہ اتنے بڑے عہدے کی ذمے داریاں سنبھالنے کے قابل ہو گا یا نہیں'' (دیکھیے *The Negotiations of Sir Th. Roe in his Embassy to the Ottoman Porte, from the year 1621 to 1628*، لنڈن ۱۷۴۰ء، ص ۱۷۳)، لیکن اس کے بعد وہ ۳ ۔ اپریل ۱۶۲۴ء کو اس کی بابت کہتا ھے کہ ''وہ اس قدر کمینہ اور لالچی ھے کہ اس نے چھے ماہ ھی میں ہر قسم کے انصاف اور عہدوں کو فروخت کر کے بےانتہا خزانہ جمع کر لیا ھے ۔ جس کے بوجھ میں دب کر وہ خاک میں ملنے کے قریب پہنچ گیا ھے'' (کتاب مذکور، ص ۲۳۰)' ور اگست ۱۶۲۴ء کی ایک وینیشی رپورٹ میں اس کی دولت کی بابت کہا گیا ھے : "somma di 700,000 scudi in contanti, *molto opportuna*" (دیکھیے J. V. Hammer : *GOR*، ۵ : ۲۱).

مملکت میں جو خوفناک صورت حال پیدا ہو چکی تھی (مثلًا ایشیاے کوچک اور مصر میں بغاوتیں، ایران کی جانب سے حملے کا خطرہ، ۲۸ نومبر ۱۶۲۳ء کو سقوط بغداد جس کی خبر سلطان سے پوشیدہ رکھی گئی، استانبول میں خوراک کا فقدان، سکّے کی قیمت میں واضح کمی، خزانے کا تہی ہونا اور ینی چریوں کا قابو سے باہر ہو جانا) اسے دیکھ کر صدر اعظم کے خلاف جو ان سب باتوں کا ذمے دار تھا، نوجوان سلطان مراد چہارم کا غیظ و غضب انتہا کو پہنچ گیا ۔ ۱۴ ۔ جمادی الآخرۃ ۱۰۳۳ھ/ ۴ مارچ ۱۶۲۴ء کو کمان کش قصر شاھی میں طلب کیا گیا اور بہ عجلت تمام اس کی گردن اڑا دی گئی، اور اس کی لاش کو مسجد عاتق علی پاشا کے بیرونی صحن میں دفن کر دیا گیا (دیکھیے حدیقۃ الجوامع، ۱ : ۱۵۰؛ J. Von Hammer : *GOR*، ۹ : ۵۷، عدد ۲۱۳) ۔ چرکس محمّد پاشا اس کا جانشین مقرر ہوا ۔ کمان کش علی پاشا کی شادی مشہور و معروف قاضی عسکر اور شیخ الاسلام بوستان زادہ محمد افندی کی بیٹی سے ہوئی تھی ۔

مآخذ : (۱) عثمان زادہ احمد تائب : حدیقۃ الوزراء، استانبول ۱۲۷۱ھ، ص ۷۲؛ (۲) حدیقۃ الجوامع، ۱ : ۱۵۰

بعد (جس میں اس کے مختصر سوانح حیات بھی درج ہیں)؛ (۳) J. v. Hammer : *GOR* بذیل کمان کش علی پاشا؛ (۴) نعیما : تاریخ، استانبول ۱۲۸۰ھ، ۲ : ۲۹۳ ببعد؛ (۵) حاجی خلیفہ : فذلکہ، ۲ : ۵۲ (سزاے موت کا ذکر)؛ (۶) سجلّ عثمانی، ۳ : ۵۲۰.

(FRANZ BABINGER)

* **کمبایت** (کھمبایت) : ہندوستان کے صوبۂ گجرات کی ایک سابقہ ریاست جو خلیج کمبایت کے دہانے پر واقع ہے، رقبہ تین سو پچاس مربع میل اور آبادی باون ہزار نفوس پر مشتمل ہے جن میں اکثریت ہندوؤں کی ہے ۔ نوابانِ کمبایت شیعی ہیں اور اپنا شجرۂ نسب والی گجرات مومن خان سے ملاتے ہیں، جس نے ۱۷۴۲ء میں وفات پائی تھی ۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ ریاست صوبۂ گجرات میں مدغم ہو گئی ہے ۔ قدیم زمانے میں کمبایت گجرات کی ایک بڑی بندرگاہ تھی اور کہا جاتا ہے کہ جب مسلمانوں نے ۱۲۹۸ء میں اسے فتح کیا تو یہ ہندوستان کا امیر ترین شہر تھا، لیکن سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ بندرگاہ مٹی سے بھر گئی اور تجارت سورت کو منتقل ہو گئی ۔ کمبایت کا ذکر المسعودی، الاصطخری، ابن حوقل اور دیگر عرب مؤرخین نے کیا ہے ۔ اب یہاں پچاس ٹن سے زیادہ وزنی جہاز نہیں ٹھیر سکتے .

مآخذ : (۱) *Imperial Gazetteer of India*، بذیل مادّہ؛ (۲) Elliat-Dawson : *History of India*، بمدد اشاریہ؛ (۳) کمبایت کے متعلق عربوں کے بیانات کے لیے دیکھیے *Gazetteer of Bombay Presidency*، ۱/۱ : ۴، ۵ ببعد؛ (۴) *Archaeological Survey of Western India*، ج ۶، لنڈن ۱۸۷۶ء.

(J.S. COTTON)

⊗ . تعلیقہ : کمبایت (کھمبایت)، خلیج کے سرے پر مغرب میں دریاے سابرمتی اور مشرق میں دریاے ماھی کے دہانوں کے درمیان سمندر سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر ہے ۔ الاصطخری کتاب الاقالیم میں لکھتا ہے کہ منصورہ واقع سندھ سے یہ بندرگاہ بارہ روز کے سفر کے برابر ہے ۔ شہر کے قریب سابرمتی اور ماھی دریاؤں کا درمیانی علاقہ سمندر کے قرب کی وجہ سے کھاری دلدل پر مشتمل ہے ۔ اس لیے شہر کا پانی بھی کھاری ہے اور اس کے غیر محتاط استعمال سے بدن پر چھالے نکل آتے ہیں ۔ تاہم نسیم بحری کے باعث شہر کی آب و ہوا خوشگوار ہے ۔ سالانہ بارش ۲۹۰۳۰ انچ ہے ۔ علاقے میں آم، لیمو، ناریل اور چاول پیدا ہوتے ہیں ۔ ریاست کھمبایت کے خشک حصوں میں کپاس کی کاشت ہوتی ہے ۔ شہر کھمبایت میں جامع مسجد ۱۳۲۵ء میں تعمیر ہوئی تھی جو بڑی خوش منظر ہے ۔ عقیق قریب کی ریاستوں میں سے نکلتا ہے اور سرخ، سفید اور زرد رنگ کا ہوتا ہے ۔ کھمبایت کے سوداگر اسے ادھر ادھر بھیجتے ہیں ۔ سورت اس کے جنوب میں ہے ۔ ان دونوں بندرگاھوں میں عرب سوداگروں کی بڑی آمد و رفت ہوا کرتی تھی . (عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا).

(ادارہ)

* **کُمبُرہ جی** : رک بہ خُمبَرہ جی .

* **الکُمَیت** : [بنو سَعْد بن ثَعْلبہ] کا عرب شاعر الکُمیت بن زید الاَسَدی ۶۰ھ/ ۶۷۹ء کے قریب کوفے میں پیدا ہوا اور ۱۲۶ھ/ ۷۴۳ء میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا ۔ اس کے کلام کا مشہور ترین مجموعہ المُذَھَّبۃ (دیکھیے نیچے) کے بعد الھاشمیّات ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اس میں رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کے خاندان بنو ہاشم کی مدح سرائی کی ہے ۔ شاعر نے سارے ہاشمیوں کو مدح و ستائش اور عزت و احترام

کا مستحق نہیں سمجھا ۔ اس کے ممدوحین میں پیغمبر خدا صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کے علاوہ ہم، حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو بھی پاتے ہیں ۔ اشعار ۱ : ۹۷، اور ۲ : ۱۰۵ بعد جو حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد کی مدح میں ہیں، شاید بنو عباسؓ کے عہد میں شامل کیے گئے ہوں گے ۔ الھاشمیات چھے قصیدوں پر مشتمل ہے، چار قصیدے طویل ہیں اور دو مختصر ۔ علاوہ ازیں ایک قطعہ ہے جس کا بیشتر حصہ قصیدے کی بطرز معین تشبیب اور چار مختصر انشید ہیں جن میں سے تین تو محض دو دو شعروں کے ہیں ۔ سب قصیدے ایک ہی زمانے کے کہے ہوے نہیں ۔ دوسرا قصیدہ سب سے قدیم معلوم ہوتا ہے ۔ انداز سے اس کا زمانہ ۹۶ تا ۹۷ھ ہونا چاہیے ۔ تیسرا قصیدہ اس سے زیادہ بعد زمانے کا نہیں ہے۔ پہلا قصیدہ ۱۰۵ھ سے پہلے کا نہیں ہو سکتا، نہ چوتھا قصیدہ ۱۱۸ھ سے قبل کا ۔ ۹ سے ۱۱ تک کے قصائد ۱۲۲ھ سے پہلے کے نہیں ہیں ۔ چھٹا قصیدہ شاید ۱۲۵ تا ۱۲۶ھ میں لکھا گیا ہو ۔ قصیدوں میں الکمیت قدیم شعرا کی طرز کا تتبع کرتا ہے ۔ اگرچہ بحیثیت شہری ہونے کے وہ صحرائی زندگی سے دور ہے، پھر بھی وہ اس اونٹ کی توصیف کرتا ہے جو اسے اپنے ممدوح کے پاس لے جاتا ہے؛ نیز وہ صحرائی سانڈ (بیل) اور قطا (بھٹ تیتر) پرندے کی تعریف کرتا ہے اور علویوں کی مدح اسی روایتی انداز میں کرتا ہے جیسے پہلے شاعر کسی بدوی سردار کی کیا کرتے تھے ۔ اس نے قرآن مجید نیز قدیم شعرا سے بہت کچھ اخذ کیا ہے ۔ چنانچہ دوسری صدی ہجری کے کوئی لغوی ابن کُناسہ نے کتاب سرقات الکمیت من القرآن (دیکھیے ابن الندیم، ص ۷۰) لکھ ڈالی ۔

گو عرب نقادوں میں الھاشمیات کو کچھ زیادہ قابل قدر اسلوب شاعری کا نمونہ نہیں سمجھا جاتا، لیکن شیعی حلقوں میں اس کی بڑی وقعت ہے ۔ معلومات کی حد تک اس کی اہمیت زیادہ‌تر اس حیثیت سے ہے کہ اس میں پہلی صدی ہجری کے آخر اور دوسری صدی کے شروع میں شیعیوں کے اعتدال پسند حلقے کے اندر مقبول عام خیالات کی تصویر نظر آتی ہے ۔ اس کے باوجود شاعر عملی طور پر علویوں کی مدد کرنے کے لیے اپنے آپ کو کبھی آمادہ نہ کر سکا، گو ان کی مدح میں وہ بہت کچھ جوش و خروش ظاہر کرتا ہے ۔ قصیدہ ۱۰، ۱۱ میں وہ اپنے آپ کو اس لیے مورد طعن و ملامت قرار دیتا ہے کہ وہ حضرت زیدؒ کی دعوت قبول نہ کر سکا، لیکن وہ اپنے زمانے کے حکمرانوں پر بڑی بے باکی سے شدید تنقید کرتا ہے ۔ وہ بنو امیہ کو یہ کہ کر سرزنش کرتا ہے کہ انہیں امت کی قیادت کا کوئی حق نہیں ہے اور وہ اپنے جاہ و اقتدار کو ذاتی اغراض کے لیے بےجا استعمال کرتے ہیں ۔ باوجود اس کے جب اس کی نکتہ چینی کی خبر خلیفہ ہشام کو پہنچی (بنو عبد شمس کے خلاف ایک طویل نظم جمھرۃ (ص ۱۸۷ بعد) میں بھی محفوظ ہے) تو کمیت نے اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے بنو امیہ کی مدح سرائی کی ۔ شاعروں میں یہ موقع شناسی (یا ابن الوقتی) کوئی شاذ و نادر واقعہ نہیں، خود کمیت اپنی اس روش کو تقیّے سے تعبیر کرتا ہے، (۳ : ۸۶؛ بقول Goldziher : *Z.D.M.G.*، ۶۰ : ۲۱۹، یہ لفظ یہاں پہلی مرتبہ شیعی اصطلاح میں استعمال ہوا ہے) اور بنو امیہ کی یہ جبری تعریف و توصیف بنو ہاشم سے متعلق اس کے اصلی خیالات و احساسات پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتی ۔

قبائل یمن کے خلاف کمیت کی نظم "المذھبۃ" طوالت کی وجہ سے نمایاں ہے ۔ اسی وجہ سے بعد میں "کمیت کی نظم سے طویل تر" ایک مثل بن گئی ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قصیدہ تین سو اشعار پر

مشتمل تھا، جن میں سے قصیدے کے جستہ جستہ اشعار کا تقریباً ایک تہائی حصہ بچ سکا ہے ۔ الهاشمیات میں یمنیوں کے خلاف کوئی معاندانہ انداز نظر نہیں آتا؛ شاعر اس بات پر زور دیتا ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی ذات گرامی کی طرح خود شاعر بھی خِندِف شاخ سے وابستہ ہے۔ ۹۷ اور ۱۰۱ھ کے درمیان الکمیت نے بنو مہلب کی شان میں جو کہ جنوبی عربوں کے اقتدار کے بڑے حامی تھے، بھی ایک مدحیہ قصیدہ لکھا ۔ شاید جذبۂ نفرت و حقارت بعد میں پیدا ہوا جو غالباً ۱۱۸ھ تک موجود نہ تھا اور الهاشمیات کا چوتھا قصیدہ لکھنے کے بعد رونما ہوا ۔ کہا جاتا ہے کہ جنوبی عرب کے کسی کلبی شاعر نے علویوں کے خلاف ایک هجویہ نظم لکھی تھی ۔ لکھنے والے کا نام خالد بن عبداللہ القسری والی عراق بتایا جاتا ہے ۔ یہ وهی شخص تھا جو جنوبی عرب کے قبائل کی امداد پر تکیہ لگائے بیٹھا تھا ۔ ان قبائل نے الکمیت کے وہ اشعار جو بنو امیہ کے خلاف تھے، خلیفہ کے روبرو پیش کیے تھے تاکہ اس کے شر سے محفوظ رهیں ۔ اس هجویہ نے الکمیت کو جنوبی عربوں کے خلاف زبان طعن دراز کرنے پر اکسایا، بہر حال یہ یقینی بات ہے کہ کمیت نے خالد کی موت کے بعد بھی اس کے خلاف هجو گوئی جاری رکھی اور اسی وجہ سے اس نے اپنی هلاکت مول لی ۔ یمنی فوج نے کمیت کو خالد کی هجو گوئی کرتے سنا تو اسے ایسی بری طرح زخمی کیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا.

مآخذ: متن مقالہ میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ: (۱) الاغانی، ۱۵ : ۱۱۳ ببعد؛ (۲) ابن قتیبہ: کتاب الشعر، طبع De Goeje، ص ۳۶۸ ببعد؛ (۳) عبدالقادر البغدادی: خزانة، ۱ : ۶۸ ببعد؛ (۴) الجاحظ: کتاب البیان و التبیین، ۱ : ۲۲؛ (۵) *Die H-schimijat des Kumait*، لائیڈن ۱۹۰۴ء؛ (۶) Noldeke : *ZDMG*، ۵۸ : ۸۸۸؛ (۷) Brockelmann : *GGA*، ص ۳۴۵ ببعد؛ (۸) M.J. de Goeje : *FA*، سلسلہ ۱۰، ۵ : ۱۵۷ ببعد؛ (۹) H. Lammens : *MFOB*، ۲ : ۴۷؛ (۱۰) C. van Arendonk : *De opkomst van het Zaidietische imamat*، لائیڈن ۱۹۱۹ء، ص ۱۴ ببعد و ۳۲؛ [(۱۱) براکلمان : تاریخ الادب العربی (تعریب)، ۱ : ۲۴۲ تا ۲۴۴؛ (۱۲) الزرکلی : الاعلام، بذیل مادہ (بالخصوص مآخذ)؛ (۱۳) ابن حزم : جمهرة انساب العرب، ۹۴، ۱۹۳].

(J. Horovitz)

* **کِنانہ** : بن خُزَیمہ بن مُدْرِکہ بن اِلْیاس بن مُضر، ایک بڑے عرب قبیلے کا نام ہے جس کی خیمہ گاهیں آغاز اسلام کے وقت مکّے کے گرد و نواح کے اس علاقے میں تھیں جو شہر کے جنوب مغرب میں تہامہ سے لے کر، جس کے متصل ان کے قرابتی قبیلے هُذَیل کی مقبوضہ اراضی تھیں، شہر کے شمال مشرق تک، جہاں ان کے سب سے قریبی رشتے دار اَسَد الخُزَیمہ آباد تھے، پھیلا ہوا تھا ۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور عرب نسابوں کی نظروں میں ان کی خاص اهمیت کا سبب یہ حقیقت تھی کہ قریش اور پھر حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کا نسب اسی قبیلے کنانہ سے جا ملتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ همیں اس کی متعدد شاخوں اور اس سے نسبی تعلق رکھنے والے کئی قابل ذکر اشخاص کے تذکرے کثرت سے ملتے هیں، اگرچہ زمانۂ مابعد کے نسابوں نے عموماً صرف چھے بڑی بڑی شاخوں کا نام لیا ہے، تاهم ابن الکلبی جمهرة النسب میں کنانہ کے حسب ذیل ۱۴ بیٹوں کا ذکر کرتا ہے: (۱) النَّضر، یعنی قیس جو قریش [رک بآن] کا مورث اعلٰی تصور کیا جاتا ہے؛ (۲) نُضَیر؛ (۳) مالک؛ (۴) ملکان (جمهرة کے ایک اچھے قلمی نسخے میں اس نام کی املا یونہیں ہے، لیکن القلقشندی کو اصرار ہے کہ اس کا تلفظ

سلکان ہے)؛ (۵) عامر؛ (۶) عمرو؛ (۷) الحارث؛ (۸) عزوان (یا عزوان)؛ (۹) سعد؛ (۱۰) عوف، (۱۱) غنم؛ (۱۲) مخرمہ اور (۱۳) جرول، کہا جاتا ہے کہ یہ تیرہ کے تیرہ بیٹے برہ بنت مر کے بطن سے پیدا ہوے تھے جو تمیم بن مر کی بہن تھی - یہی وجہ ہے کہ انھیں تمیم کے کثیر التعداد قبیلے کا قرابتی قرار دیا جاتا ہے - کنانه کا چودھواں بیٹا عبد مناۃ قبیلۂ بنو قضاعہ کی الذفراء بنت ھنی بن بلی کے بطن سے تھا، اور اسی لیے اس شاخ کو اکثر بنو قضاعہ ھی میں شمار کیا گیا ہے - زمانۂ مابعد کے نسابین ہمیشہ صرف النضر، عامر، عمرو اور عبد مناۃ ھی کا ذکر کرتے ھیں اور ان میں سے بیشتر کی ضمنی شاخیں بھی گنواتے ھیں - ملکان، عمرو اور عامر کی کسی شاخ کا ذکر نہیں ملتا، ماسوا تین کے، جو آخر الذکر کی ایک شاخ ہے - قریش کے جد امجد ہونے کی وجہ سے النضر کا بیان اس مادے میں کیا گیا ہے جو قریش کے بارے میں ہے - مالک، ثعلبہ ابن الحارث بن مالک اور اس کی ضمنی شاخوں فراس ابن غنم بن ثعلبہ اور مخدج بن عامر بن ثعلبہ اور نقیم ابن عدی بن عامر میں منقسم تھے - [بنو] عبد مناۃ غالبًا سب سے زیادہ کثیر التعداد تھے اور متعدد خاندانوں میں بٹے ہوے ھیں: (۱) غفار؛ (۲) بکر مع اپنی ضمنی شاخوں دئل اور لیث کے؛ (۳) بلحارث؛ (۴) مدلج، جنھیں کہانت میں شہرت حاصل تھی؛ (۵) ضمرہ بن بکر.

[عرب ماہرین انساب کے مطابق] یہ سب کنانه کی نسل میں سے تھے - اسلام کے ابتدائی دور میں ان کی اھمیت یہ ہے کہ ان سے اس باھمی رشتے کا پتا چلتا ہے جو کنانه کے مختلف قبائل اپنے مابین سمجھتے تھے [دیکھیے ابن حزم: جمھرة انساب العرب اور النویری: نهاية الارب] اور ممکن ہے اسی بنا پر انھیں حضرت عمرؓ کے مرتب کردہ دیوان میں درج کیا گیا ہو - دیگر تمام عربی قبائل کی طرح یہاں بھی لوگوں کا فردًا فردًا کسی خاص شاخ سے اپنا نسب ثابت کرنا کوئی مشکل نہ تھا - کنانه کے کچھ قبائل زمانۂ مابعد یعنی چھٹی صدی ہجری میں بالائی مصر میں اخمیم کے قریب یا مغربی ڈیلٹا کے علاقے میں سکونت پذیر ہو گئے تھے - انھیں بھی اپنی اصل نسل کا اتنا علم ضرور تھا، کہ وہ اصلًا کنانه کی اولاد ھیں اور مختلف زمانوں میں مصر میں نقل مکانی کر کے آئے تھے - آخری نقل مکانی طلائع بن رزیک کے دور وزارت (۵۴۹ تا ۵۵۶ھ) میں ہوئی تھی.

چونکہ بنو کنانه حرم کعبہ کے پڑوس میں رہتے تھے، اس لیے انھوں نے زمانۂ قبل از اسلام میں شہر مکہ کی تاریخ میں کچھ کم اھم حصہ نہیں لیا اور اس قبیلے کے بیرونی افراد ھی نے اس وقت آخری فیصلہ دیا جب خاندان قریش نے شہر کی حکومت بنو خزاعہ سے چھینی تھی؛ چنانچہ انھیں کے شیخ یعمر بن عوف بن کعب بن عامر بن لیث بن بکر بن عبدمناۃ کو آخری فیصلہ دینے کے لیے منتخب کیا گیا تھا جو قریش کے حق میں صادر ہوا - اسی فیصلے کے باعث اسے الشداخ (کچلنے والا) کا عرف ملا، کیونکہ اس نے اس جھگڑے کو کچل دیا تھا - [زمانه جاھلیت میں بنو کنانه نے تین مشہور جنگیں یوم الفجار اول، ثانی اور ثالث لڑنے کے علاوہ بنو خزاعہ سے کئی مرتبہ میدان جنگ میں زورآزمائی کی - تین پہاڑوں (جبل یلملم، جبل تضارع اور جبل وصیف) پر ان کا جزوی قبضہ تھا] - ان کی ایک شاخ بنو فراس صفین [کی جنگ] میں حضرت علیؓ کے خاص حامیوں میں تھی الطبری کی تاریخ میں ان کا تذکرہ آخری بار ۲۳۰ھ میں یوں آیا ہے کہ اس وقت تک ان کے ایک حصے کا مکے کے قرب و جوار میں پڑاؤ تھا، لیکن اب وہ اتنے کم زور

تھے کہ ان قبائل کی تاخت و تاراج کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے تھے جو ان دنوں زیادہ طاقتور ہو گئے تھے ۔ اس زمانے میں ان کے لیے ایک بڑے گروہ نے حوران میں اور صرخد کے قریب پڑاؤ ڈال رکھا تھا ۔ اگرچہ انہیں بطور قبیلے کے کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں، لیکن ان کے بہت سے افراد محدثین وغیرہ کی حیثیت سے معروف ہیں اور یہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں ۔

مآخذ : (۱) ابن الکلبی : جَمْہَرَۃُ النَّسب، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، Add. ۲۲۳۴۶، ورق ۴ ؛ (۲) النُوَیری : نہایة الأرب، قاہرة، ۲ : ۳۵۰ ببعد ؛ (۳) القَلْقَشَنْدی : صُبْحُ الأعشی، قاہرة، ۱ : ۳۵۰ ؛ (۳) ابن دُرَید : کتاب الاشتقاق، طبع Wüstenfeld، ص ۱۰۵ تا ۱۰۸ ؛ (۴) Wüstenfeld : *Tabellen* ؛ (۵) السَّمْعانی : کتاب الأنساب، سلسلۂ یادگار گب، ج ۲، بذیل مادّہ ؛ [(۶) عمر رضا کحالہ : معجم قبائل العرب، بذیل مادّہ، بالخصوص مآخذ] .

(F. KRENKOW)

⊗ **کُنْجَاہ** : پنجاب (پاکستان) کے ضلع گجرات سے سات میل جانب مغرب پھالیہ روڈ پر واقع ہے ۔ یہ قصبہ (رئیس) کنج پال برادر زادۂ راجہ کھسال قوم طور نے ۷۰۴ء میں آباد کیا ۔ اولاً قوم کھتری یہاں کی مالک تھی ۔ پھر کلچو قوم وڑائچ نے لکھی جنگل سے آ کر اس قصبے پر قبضہ کر لیا اور ۱۸۴۹ء تک یہاں زمینداری کا پیشہ اپنائے رکھا ۔ (وڈیرہ گنیش داس : چار باغ پنجاب، ۲۰۸ تا ۲۰۹) .

جب یہ قصبہ برباد ہو گیا تو امیر تیمور کی فتح ہندوستان کے وقت جیتو قوم جاٹ وڑائچ نے دکن سے آ کر اسے دوبارہ آباد کیا (غلام سرور مفتی لاہوری : تاریخ مخزن پنجاب، ۳۰۴) ؛ ۱۸۶۸ء تک اس میں مسلمانوں اور [ہندو] کھتریوں کے دو ہزار تیرہ گھر آباد تھے (تاریخ مخزن پنجاب، ۳۰۴) ۔ کنجاہ کی درج ذیل عمارات و باغات کا ذکر وڈیرہ، مفتی غلام سرور اور اعظم بیگ نے کیا ہے : (۱) حویلی دیوان کرپا رام ؛ (۲) حویلی بہشت آباد ؛ (۳) باغ دیوان کرپا رام مذکور ؛ (۴) باغ دیوان وتوبل والا ؛ (۵) باغ سرکاری جانب مشرق ؛ (۶) باغ سردار نہال سنگھ چھاچھی (غلام سرور مفتی لاہوری : تاریخ مخزن پنجاب ۳۰۴ ؛ وڈیرہ : چار باغ پنجاب ؛ ۲۰۹ ؛ اعظم بیگ مرزا : تاریخ گجرات ۱۰۲) .

کنجاہ کو خاص علمی و ادبی اہمیت حاصل رہی ہے ۔ یہاں کے علما و شعرا میں سے ملّا محمّد اکرم غنیمت، علّامہ صداقت اور مولوی صالح نے علم و ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ۔ بعض علما کے مختصر حالات درج ذیل ہیں :

قاضی عبدالنبی : ۱۰۸۸ھ / ۱۶۷۸ء میں کنجاہ کے قاضی تھے ۔ ان کی ایک مہر ۱۰۸۸ھ کی نقل محفوظ ہے (محمد عالم عبدالباسط : تاریخ سادات خوارزمیہ، ۷۰) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۸۸ھ / ۱۶۷۸ء تک بقید حیات تھے .

قاضی رضی الدین بن قاضی عبدالنبی : حضرت نوشہؒ کے مرید تھے ۔ پہلے وزیر آباد کے قاضی تھے (محمد حیات نوشاہی : تذکرۂ نوشاہی (قلمی)، ورق ۳۶)، پھر کنجاہ اور گجرات کی قضا بھی انہیں ملی (محمد بیگ لاہوری : الاعجاز (قلمی)، ورق ۳۶۲ ۔ یہ قصبۂ قلعدار کے بھی قاضی تھے (شیر محمّد قریشی : مقامات قطبیہ، قلمی) ؛ گجرات کے عامل بھی رہے (وڈیرہ گنیش داس : چار باغ پنجاب) ۔ ان کی تین تصانیف کے حوالے ملتے ہیں : (۱) شرح قصیدۂ بردۃ (صداقت : ثواقب ۱۶۵) ؛ (۲) رسالہ در حالات حضرت نوشہؒ (مشمولۂ رسالۃ الاعجاز تصنیف احمد

بیگ قلمی، ورق ۱۱۲ تا ۱۲۲)؛ (۳) تذکرۂ قاضی رضی الدین (محمد شیر : حدیقة الارباب فی مناقب قطب الاقطاب موسوم بہ مقامات قطبیہ قلمی) - رسالہ الاعجاز میں ان کے اشعار بھی ملتے ہیں (احمد بیگ : الاعجاز، ۱۱۹).

شیخ نظر محمّد حضرت نوشہؒ کے مرید تھے (صداقت : ثواقب (قلمی)، ورق ۱۲۵) - ان کے دو بیٹے تھے، پہلے ملّا محمّد اکرم غنیمت تھے، لیکن دوسرے کا نام معلوم نہیں ہو سکا - محمد اکرم کے دو فرزند تھے : شیخ محمّد ماہ صداقت اور شیخ محمّد - ملّا اکرم غنیمت پنجاب کے معروف فارسی شاعر تھے- نیرنگ عشق ان کی مشہور مثنوی ہے - ان کے حالات ذیل کے مصنفین نے بیان کیے ہیں : (۱) شرافت نوشاہی : (الف) شریف التواریخ ج ۳، قلمی، (ب) رقعات غنیمت، صحیفہ، لاہور جنوری ۱۹۷۳ء، (ج) غنیمت کے مزید حالات در مجلہ العلم، کراچی اپریل تا جون ۱۹۷۳ء: (۲) صادق علی دلاوری : غنیمت کنجاہی، در اورینٹل کالج میگزین، لاہور مئی ۱۹۳۲ و نومبر ۱۹۳۳ء؛ [نیز رک بہ غنیمت، محمد اکرم].

محمد ماہ صداقت کابل میں پیدا ہوے - ان کے والد، نواب ارادت مند خان شرف الدّولہ بہادر کی طرف سے تحویل خزانہ پر مقرر تھے، سہمات ملکی میں ان کے ہمراہ رہتے تھے (ثواقب، ورق ۹)- صداقت کو نظم و نثر پر کامل عبور تھا - ثواقب المناقب (در حالات و مقامات حضرت حاجی محمّد نوشہ) ان کی معروف تصنیف ہے اس کے علاوہ فتح نامۂ عبدالصمد خان، ساقی نامہ، مثنوی مہتاب، مثنوی چراغان، گل صنوبر (منثور)، قصہ کلیلہ و دمنہ، دیوان اشعار، رباعیات آبدار، مخمسات رنگین، رقعات، بیاض صداقت، لطافت هزلیات، مطلع الاسرار بھی ان کی تصانیف میں (شرافت نوشاہی : شریف التواریخ، جلد سوم، حصۂ سوم (قلمی)، ۶۸ تا ۱۰۳).

میاں جعفر بن شاہ درگاہی : شاہ محمّد غوث لاہوری (م ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) نے اپنے کنجاہ جانے اور میاں جعفر سے ملاقات کا حال لکھا ہے (رسالہ کسب سلوک، ۳۲) - میاں جعفر شاہ نے تحفۂ کنجاہ کے نام سے کنجاہ کے بزرگوں پر ایک کتاب لکھی تھی (احمد حسین قریشی : گجرات کی تمدنی تاریخ، حصۂ دوم (قلمی) ۱۳۶).

میاں شیخ محمّد ابراہیم صاحب دیوان تھے- ان کا قلمی دیوان شریف کنجاہی کے پاس ہے (احمد حسین قریشی : گجرات کا دبستان ۱۰)- شیخ یحیی نے رائے حاکم سنگھ دیوان کی فرمائش پر مثنوی نیرنگ عشق کی فارسی میں شرح لکھی تھی (شرح مثنوی غنیمت [قلمی]، کتابخانۂ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، راولپنڈی)، شیخ محمد صالح (م ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء) بن مولوی محمد یار، میاں محمد قاسم ساکن گولیکی (م ۱۲۰۲ھ/۱۸۲۷ء) اور غلام محی الدین قصوری (م ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء) سے بیعت تھے - سلسة الاولیاء (۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۰ء) ان کی مشہور تصنیف ہے - اس کے علاوہ نغمۂ توحیدی، مجموعۂ وظائف، مکتوبات اور بیاض بھی ان کی تصانیف ہیں .

حافظ غلام محی الدّین بن محمّد صالح (۱۲۰۱ - ۱۲۷۴ھ/۱۸۳۵ - ۱۸۶۷ء) کو تاریخ گوئی میں عبور حاصل تھا - مجمع التواریخ ان کی معروف تالیف ہے جس میں انھوں نے حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم سے لے کر اپنے معاصر بزرگوں کے سنین وفات نظم کیے ہیں - ان کے والد مولانا محمد صالح نے مجمع التواریخ کے نام سے ان کے قطعات تاریخ ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں مرتب کیے اور ان کے مختصر حالات بھی لکھے (غلام محی الدین : مجمع التواریخ، بخط محمّد صالح (قلمی)، ورق

۱۷ ب تا ۱۸ ب)۔

ملک علی محمد افغان ککے زئی قصیدۂ محبوبیہ کے مؤلف تھے ۔ مسلمان علما کے علاوہ کنجاہ میں کچھ ہندو اور سکھ فضلا بھی ہوے ہیں ۔ مثلاً لچھمی نرائن دبیر حس کے رقعات چھپ چکے ہیں (سید محمد عبداللہ : ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ۱۸۸)، راجا سکھ جیون اور ساحر ساز ۔

مآخذ : متن میں درج مآخذ کے علاوہ دیکھیے (۱) محمد صالح کنجاہی : بیاض محمد صالح (قلمی بخط محمد صالح)، مملوکۂ احمد حسین قریشی؛ (۲) محمد افضل سودھری : لطائف نامہ (قلمی)، مملوکۂ احمد حسین قریشی گجرات (۳) جعفر شاہ کنجاہی : کرسی نامہ (قلمی) مملوکۂ احمد حسین قریشی: (۴) منظر الدین حکیم : وقائع اسلاف ۱۲۷۳ء (در حالات خاندان میاں محمد قاسم ابو الوفا ساکن گولڑکی) قلمی، مملوکۂ احمد حسین قریشی: (۵) دبیر لچھمی نرائن : رقعات (قلمی)، کتب خانۂ دانشگاہ پنجاب نمبر ۳۰ PIX؛ (۶) احمد علی سندیلوی : مخزن الغرائب (قلمی) کتاب خانۂ دانشگاہ پنجاب؛ (۷) آرزو سراج الدین علی : مجمع النفائس (قلمی) کتاب خانۂ دانش گاہ پنجاب ۱۳۸۹ / ۳۰۳۹؛ (۸) بوٹے شاہ غلام محی الدین : تاریخ پنجاب، قلمی، کتب خانۂ دانش گاہ پنجاب، ۸/۸۶ APC III؛ (۹) احمد حسین قریشی : گجرات کی تمدنی تاریخ، حصۂ دوم، ۱۹۶۶ء، قلمی، مملوکۂ احمد حسین قریشی: (۱۰) محمد اقبال مجددی : تاریخ مغلیہ کے فارسی مآخذ (بسلسلۂ ثواقب المناقب)، مقالہ براے حصول درجۂ ایم اے تاریخ، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۲ء؛ (۱۱) غنیمت کنجاہی : دیوان غنیمت، مرتبۂ غلام ربانی عزیز، لاہور ۱۹۵۸ء؛ (۱۲) علی الدین مفتی لاہوری : عبرت نامہ، لاہور ۱۹۶۱ء؛ (۱۳) محمد اسلم پسروری : فرحت الناظرین، مترجم محمد ایوب قادری، کراچی ۱۹۷۲ء؛ (۱۴) کنھیا لال : تاریخ پنجاب، لاہور ۱۸۷۷ء؛ (۱۵) سید عبداللہ : ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، دہلی ۱۹۴۲ء؛ (۱۶) عبدالرشید کرنل : تذکرۂ شعراے پنجاب کراچی ۱۹۶۷ء؛ (۱۷) محمد لطیف : *History of the Punjab*، دہلی ۱۹۶۴ء؛ (۱۸) احمد حسین قریشی : گجرات بعہد قدیم و جدید، گجرات ۱۹۶۸ء: (۱۹) وہی مصنف : مولوی محمد صالح کنجاہی، در مجلۂ شاہین، گجرات، دسمبر ۱۹۶۸ء: (۲۰) ظہور الدین احمد : رقعات غنیمت، درمجلۂ صحیفہ، لاہور اپریل ۱۹۷۳ء ۔

(محمد اقبال مجددی)

کَنْدُوری : (نیز کَنْدُورۃ؛ فارسی)؛ کندوری کا مفہوم چمڑے یا سوتی کپڑے کا بنا ہوا دسترخوان ہے؛ [وہ رومال یا کپڑا جس میں روٹیاں لپیٹی جاتی ہیں نیز کھانا کھاتے وقت رانوں پر ڈالنے کا رومال]؛ اس سے بیوی کی نیاز بھی مراد ہے مثلاً کسی مقدس و محترم ہستی مثلاً حضرت فاطمہؓ کی نیاز ۔ آخری معنوں میں یہ لفظ بظاہر مجمع الجزائر شرق الہند میں ہندوستان سے پہنچا، اچیے [رك بآن] Acheen میں یہ لفظ تبدیل نہیں ہوا ۔ جاوا میں کسی قدر تغیر کے ساتھ کِنضری Kenduri یا کِنضرِن Kenduren کہتے ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو اصطلاح جاوا میں عام طور پر مستعمل ہے وہ صِضکہ یا صِضکہ (Ṣiḍekeh, Ṣeḍekah) ہے جو عربی لفظ صدقۃ سے نکلا ہے، یا سلمتن (Slametan) ہے جو عربی لفظ سلامت کی بگڑی ہوئی شکل ہے یا حاجت جو ایک مشہور عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ضرورت یعنی کسی دعوت میں ایک شخص کی موجودگی کی ضرورت ۔ اس کے بعد خود دعوت ہی کا یہ نام ہو گیا ۔ عام طور پر یہ ایک ایسی ضیافت ہوتی ہے جس کا کوئی دینی مقصد ہو یا کم از کم شرعی رسم و رواج کے مطابق ہو، جیسے ولیمہ جس کا کتب فقہ

میں ذکر ہے - جن موقعوں پر یہ ضیافت کی جاتی ہے وہ متعدد ہیں مثلاً مرے ہوے لوگوں کی یاد میں، گھریلو رسموں خصوصاً رسم ختنہ میں، ختم قرآن پاک، بعض مخصوص اوقات مثلاً حمل کے وقت یا فصل بونے اور کاٹنے کے وقت اور دیگر مختلف مواقع پر جیسے نئے مکان میں سکونت اختیار کرتے وقت کسی اور ضروری کام کے آغاز کے وقت یا امراض و بلیات وغیرہ سے بچاؤ کے لیے - مقررہ قاعدے کی رو سے ہر کندوری کا مذہبی رنگ ہونا چاہیے؛ غربا کو مدعو کرنا لازمی ہے؛ حرام چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے. لیکن جو مقامی عادات کی بدولت عوام میں راسخ ہو چکی ہوں ان اوامر و نواھی سے چشم پوشی کا عذر ہمیشہ ڈھونڈھ لیا جاتا ہے - ہر مکمل کندوری کو خصوصاً اسے جو متوفی رشتے داروں کا فاتحہ دلانے اور کسی ولی کے سالانہ عرس کے موقع پر منائی جاتی ہے، تلاوت قرآن، ذکر یا دعاؤں سے متبرک بنایا جاتا ہے - لیکن اوہام پرست عوام تو یہاں تک مانتے ہیں کہ اس قسم کی کندوریوں کے ذریعے متوفی کو واقعی کھانا پہنچا دیا جاتا ہے - تقریباً ہر کندوری کا آغاز دعا سے ہوتا ہے اور فاتحہ کی کندوری کا افتتاح دعاے قبور سے ہوتا ہے - اچے (Acheen) میں بعض سہیوں کو کندوری کہتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک اور لفظ کا اضافہ کیا جاتا ہے جو اس کھانے کا نام ہوتا ہے جو اس متبرک ضیافت میں دیا جاتا ہے - [نیز ایک قسم کا جنگلی گھیّا: ایک قسم کے سرخ پھل کا نام].

مآخذ: (۱) C. Snouck Hurgronje: *The Achehnese*، ۱: ۱، ۲، ۲۱۳ تا ۲۱۶، ۲۳۶؛ (۲) Th. W. Juynboll: *Handb. des Islam Gesetzes*، ص ۱۶۳؛ [(۳) فرہنگ آصفیہ؛ (۴) نور اللغات؛ (۵) فرہنگ اندراج بذیل مادّہ].

(PH. S. v. RONKEL)

* کِنْدَة: المعروف بہ کِنْدَةُ المُلوک (یعنی شاہی کندہ) - جنوبی عرب کا ایک قبیلہ جو غالبا کچھ زیادہ کثیر التعداد نہ تھا - یہ قبیلہ ظہور اسلام سے قریب کے زمانے میں اس علاقے میں آباد تھا جو حضرموت کے مغرب میں واقع ہے، عرب نسّابین ان کا سلسلۂ نسب جانتے ہیں مگر جنوبی عرب کے دوسرے قبائل کی طرح وہ بھی سراسر خیالی ہے - ان کا شجرۂ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے: ثَوْر (یعنی کندہ) بن عُفَیر بن عَدی بن الحارث بن مُرہ بن اُدَد بن زید بن یَشْجُب بن زَیْد بن عَرِیب بن زید بن کَہْلان بن سَبأ - [ابن حزم اور القلقشندی وغیرہ کے نزدیک یشجب اور عریب کے درمیان زید کا نام نہیں ہے (دیکھیے جمهرة انساب العرب، ص ۴۱۸ و ۴۱۹؛ نهایة الارب، فی معرفة انساب العرب، ص ۳۶۹؛ معجم قبائل العرب، بذیل مادّہ)] - حُجر بن عَمرو ابن معاویة بن الحارث الاصغر بن معاویہ بن الحارث الاکبر بن معاویہ بن کندہ، المعروف بہ آکِل المُرار، حِمیری بادشاہ حسّان تُبّع کا سوتیلا بھائی تھا اور شاہان حمیر کے دستور کے مطابق حسّان تبّع نے اس کے بیٹے عمرو بن حُجر کو اپنے دربار میں بطور خدمت‌گار اور ساتھ ھی بطور یرغمال رکھا ہوا تھا - جب حسّان تبّع نے اندرون عرب میں لشکر کشی کی اور متعدد قبائل کو، جو وہاں آباد تھے، مطیع کر لیا تو اس نے یمن واپس آ کر اپنے سوتیلے بھائی حُجر کو مفتوحہ قبائل کا حکمران مقرر کیا - حسان تبّع کو اس کے بھائی عمرو کی تحریک پر موت کے گھاٹ اتارا گیا - یہ جَدیس کے خلاف جو یمامہ میں رہتا تھا حسّان کی فوج کشی کے بعد کا واقعہ ہے - عَمرو نے حسّان تبع کی ایک بہن عَمرو بن حُجر کو بیاہ دی اور جب اس کا باپ حُجر مرا تو وہ اس کی جگہ وسط عرب کے قبائل کا حکمران قرار پایا اور المَکْسُور اس کا عرف ہو گیا - عمرو کا جانشین اس کا بیٹا الحارث ہوا -

ایران کے بادشاہ قُباذ کی وفات کے بعد الحارث کچھ عرصے کے لیے الحیرہ کا حاکم بھی مقرر ہوا، لیکن نوشروان کی تخت نشینی کے بعد یہ حکومت اس کے قبضے سے نکل گئی۔ الحارث کے مرنے پر وسط عرب کی سلطنت جو عملاً خود مختار ہو چکی تھی، اس کے بیٹوں میں بٹ گئی: بنو اسد پر اس کے بیٹے حُجر کی حکومت قائم رہی۔ شُرَحْبِیل [الحارث کا دوسرا بیٹا]، بنو بَکر، حَنظَلَة، عمرو بن تمیم اور رباب کے قبائل کا حاکم ہو گیا اور سَلَمَه [بن الحارث] بنو تَغْلِب، النَّمِر بن قاسِط اور سَعْد بن زید مَنَاة کے قبائل پر حکومت کرنے لگا، بنو قیس اور بنو کنانه مَعْدِیکَرِب کے زیر فرمان آ گئے۔ لیکن ابھی تھوڑا ھی عرصہ گزرنے پایا تھا کہ انھوں نے حکومت کے لیے آپس میں جھگڑنا شروع کر دیا۔ یہ جھگڑا پہلی جنگ کُلاب پر منتج ہوا جس میں عملاً عرب کے سبھی قبائل شریک تھے۔ اس مقام کُلاب کی نشان دہی ذرا مشکل ھے۔ کہا جاتا ھے کہ یہ بَصرے اور کوفے کے درمیان یمامه سے سات دن کی مسافت پر واقع تھا۔ شدید لڑائی کے بعد شُرَحْبِیل مارا گیا، لیکن اس کے حامیوں نے اس کے اهل و عیال کو بحفاظت یمن لوٹ جانے دیا۔ بہرحال اس جنگ کا آخری نتیجه یه نکلا که مختلف رئیسوں کی حکومت کے بندھن ڈھیلے پڑ گئے اور بہت سے قبائل نے خود مختاری حاصل کر لی۔ اس عرصے میں حجر نے اس جنگ میں کوئی حصه نہیں لیا اور بڑے مستبدانه انداز سے بنو اسد پر حکومت کرتا رہا۔ بوزنطی وقائع نگاروں نے ان دهاووں کا ذکر کیا ھے جو حجر Ogaros اور اس کے بھائی مَعْدِیکَرِب نے پانچویں صدی کے اواخر میں بوزنطی سرحدوں پر مارے تھے۔ حُجر بنو اسد کے ھاتھوں دھوکے سے مارا گیا۔ وہ قبیلے سے باھر گیا ہوا تھا که اهل قبیله نے آئندہ اس کی اطاعت کرنے اور اسے خراج دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر اس نے ایک فوج لے کر ان پر چڑھائی کی۔ یه فوج غالباً ان قبائل سے بھرتی کی گئی تھی جن پر اس کے اقربا حکومت کرتے تھے۔ بنو اسد نے اس کی خیمه گاہ پر اچانک حمله کر دیا اور وہ مارا گیا۔ البته اس کا بیٹا امْرُؤ القیس فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس واقعے سے عرب قبائل پر شاهان کندہ کی حکومت عملی طور پر ختم ہو گئی۔ بعد ازاں کئی سال تک امرؤ القیس ھاتھ پاؤں مارتا رہا که کسی طرح اپنے باپ کی وراثت کا کم از کم تھوڑا سا حصه ھی حاصل کر لے۔ متعدد کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد وہ بالآخر یونانی شہنشاہ سے امداد واستعانت حاصل کرنے قسطنطینیه پہنچا، لیکن یہاں بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بلکه حسب روایت اسے انقرہ میں شہنشاہ ھی کے فرستادہ آدمیوں نے زهر دے کر مار ڈالا۔ [عام روایت کے مطابق شہنشاہ نے اسے زهر میں بجھا ہوا ایک چغه بھیجا تھا جس کے پہننے سے اس کے جسم پر آبلے پڑ گئے اور بالآخر وہ مر گیا، چنانچه اسی لیے اس کا لقب ذُوالقُروح ہو گیا تھا]۔

لیکن محض یہی خاندان کندة الملوک کے نام سے مشہور نہیں تھا، کیونکه ہمیں اسلامی دور میں بہت مدت بعد تک کئی ایسے قابل ذکر اشخاص ملتے ہیں جو نہایت ممتاز رئیس ہونے کی وجه سے دربار (خلافت) میں اعلٰی عہدوں پر متمکن ہوے۔ وہ اس لیے بھی مشہور تھے که انھوں نے اسلام کے ابتدائی مبلغین کی مزاحمت کی تھی۔ ظہور اسلام کے وقت قَیس بن مَعْدِیکَرِب کو بڑا امتیاز حاصل تھا جس کی تصدیق الاعشٰی کے کلام سے ہوتی ھے۔ اس کے بیٹے الأشْعَث نے اسلام قبول کیا، لیکن پھر مرتد ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے بھیجے ہوے لشکر کے ھاتھوں اس نے شکست کھائی، گرفتار ہوا، اور بعد ازاں اسے معافی مل گئی۔ اس کے اخلاف بنو امیه کے

دور حکومت میں اہم عہدوں پر فائز تھے ۔ دیگر نامور لوگوں میں سے متنبی المقنع الکندی اور قاضی شریح [رک بآں] قابل ذکر ہیں ۔ بعض اور لوگ جو الکندی کے نام سے مشہور ہوے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس قبیلے کے موالی تھے، مثال کے طور پر فلسفی یعقوب بن اسحٰق الکندی [رک بآں] کا نام پیش کیا جا سکتا ہے ۔ شام کا ایک ضلع، نیز شہر بصرے کا ایک محلہ بھی اس قبیلے کے نام سے موسوم تھا، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ مشہور شاعر ابو نواس بصرے کے محلۂ کندہ میں پیدا ہوا تھا ۔

کندہ کی شاخوں میں سکون بن اشرس اور السکاسک کے قبیلوں کا نام بھی لیا جاتا ہے ۔ اول الذکر کی نسل سے بنو تجیب ہوے جو ان لوگوں میں سے تھے جو اول اول مصر جا کر آباد ہوے اور امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت میں پیش پیش تھے، چنانچہ حضرت عثمانؓ کا اصلی قاتل اسی قبیلے کا شخص بتایا گیا ہے ۔ آگے چل کر بنو تجیب کو اندلس میں بہت اثر و اقتدار حاصل ہو گیا اور بنو صمادح المریہ Almeria میں، بنو ذوالنون مالقہ Malaga میں اور بنو الأفطس بطلیوس Badajoz میں یکے بعد دیگرے ان علاقوں میں اپنی بادشاہت کا ڈنکا بجاتے رہے، تا آنکہ المرابطون کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے سرنگوں ہو گئے ۔

مآخذ : (۱) القلقشندی : صبح الاعشی، ۱ : ۳۲۸ ؛ (۲) النویری : نہایۃ الارب، ۲ : ۳۳۱ ؛ (۳) ابن قتیبہ : کتاب المعارف، قاہرہ ۱۳۰۰ھ، ص ۲۱۲ ؛ (۴) ابن خلدون : العبر، ۲ : ۲۴۳ تا ۲۷۷ ؛ (۵) کتاب الاغانی، ۹ : ۶۳ تا ۶۶ ؛ (۶) دیوان عبید، طبع Lyall، دیباچہ ؛ (۷) المفضلیات، طبع Lyall، بمواضع کثیرہ ؛ (۸) Wüstenfeld : *Registers Tabellen* ؛ [(۹) ابن حزم : جمہرۃ انساب العرب، ص ۴۲۵ تا ۴۳۲ ؛ (۱۰) ابن الاثیر : الکامل، ۱ : ۲۰۷ ببعد ؛ (۱۱) القلقشندی : نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب، ۳۶۴ و ۴۰۹ ؛ (۱۲) جواد علی : تاریخ العرب قبل الاسلام، ۳ : ۳۱۵ تا ۳۴۷، ۴ : ۲۶۴ ببعد ؛ (۱۳) عمر رضا کحالہ : معجم قبائل العرب، بذیل مادّہ (بالخصوص مآخذ) ؛ (۱۴) عنایت اللہ : اندلس کا تاریخی جغرافیہ، بذیل بطلیوس، وغیرہ] .

([و ادارہ] F. KRENKOW)

الکندی : [مؤرخ] ؛ ابو عمر [محمد] بن یوسف [بن یعقوب] ؛ مصر کا ایک عرب مؤرخ جس کی پیدائش ۱۰ ذوالحجہ ۲۸۳ھ / ۱۸ جنوری ۸۹۷ء کو مصر میں ہوئی جس کے مقام ولادت کا ٹھیک پتا نہیں، مگر جو بنو کندہ کے ایک قبیلے تجیب میں سے تھا جو حضرت عمروؓ بن العاص کے ساتھ مصر آیا تھا ۔ الکندی نے حدیث کی تعلیم ابن قدید (م ۳۱۲ھ / ۹۲۴ء) اور النسائی (م ۳۰۲ھ / ۹۱۴ء [رک بآں] سے پائی ۔ کہا جاتا ہے اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ خود بھی حدیث کا درس دیا کرتا تھا، مگر درحقیقت اسے سب سے زیادہ دلچسپی اپنے وطن کی تاریخ اور روایات سے تھی ۔ معلوم ہوتا ہے اس نے اپنی ساری عمر فسطاط ہی میں بسر کی اور یہیں رمضان ۳۵۰ھ / ۱۶ اکتوبر ۹۶۱ء کو اس کا انتقال ہو گیا ۔ [مگر بعض کے نزدیک اس کی وفات ۳۵۵ھ کے بعد ہوئی اور بعض کے نزدیک ۳۶۶ھ کے بعد (دیکھیے الزرکلی : الاعلام، بذیل محمد بن یوسف الکندی)] .

الکندی کی اہم تصنیفات دو ہیں : (۱) تسمیۃ ولاۃ مصر یا صرف امراء مصر اور (۲) تاریخ قضاۃ مصر یا کتاب القضاۃ ۔ اوّل الذکر میں مصر کے والیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ان کے مقرر کردہ کوتوال (والی یا صاحب الشُرطہ یا صاحب الحَرب) بھی شامل ہیں، لیکن دوسرے اعلٰی حکام شامل نہیں ۔ [دوسری کتاب میں مصر کے قاضیوں کے اخبار و احوال درج ہیں] .

ناموں کی ان سادہ سی فہرستوں میں کہیں کہیں ملک کی داخلی اور خارجی حکمت عملی کے متعلق مختصر اشارات بھی ملتے ہیں ۔ بہر حال یوں مصنف نے مصر کی تاریخ کو الاِخشید [رَكَ به اِخْشیدیه] کی وفات (۳۳۵ھ / ۹۴۶ء) تک پہنچا دیا ہے اور جس کا سلسلہ پھر کسی نامعلوم مصنف نے ۳۶۲ھ / ۹۷۲ء یعنی فاطمیوں کی آمد تک بڑھا دیا تھا ۔ کتاب مذکور کے بعض حصوں کو اول K. Tallquist نے ابن سعید کی کتاب المغرب لائیڈن ۱۸۹۹ء میں اور پھر N.A. König نے *The History of the Governors of Egypt*، نیویارک ۱۹۰۸ء میں شائع کیا ۔ الکندی نے اپنی پہلی تصنیف کے ضمیمے کے طور پر ۲۴۶ھ / ۸۶۱ء میں بکّار کے تقرر تک قضاۃ مصر کی تاریخ لکھی اور اس میں قاضیوں کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ان کے بعض اہم قانونی فیصلوں کا ذکر بھی کر دیا جس سے اسلامی قانون کے متعلق ہمیں بڑا گراں قدر مواد حاصل ہوجاتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے اس کتاب کی ترتیب ثانی میں الکندی اس کا سلسلہ اپنے زمانے تک لے آیا تھا، مگر یہ نسخہ ضائع ہو چکا ہے اور اس کے بجاے صرف دو مستزاد باقی رہ گئے ہیں : ایک احمد بن عبدالرحمٰن بن برد کا ۳۶۶ھ/۹۷۷ء تک اور دوسرا کسی نا معلوم شخص کا ۳۴۷ھ / ۹۵۹ء تا ۴۲۴ھ / ۱۰۳۳ء جس کی ابتدا میں اصل نسخوں کا کچھ حصہ شامل ہے، مگر دونوں محض سنین وار فہرستوں کی شکل میں ہیں ۔ اس کتاب کو R. Gottheil نے *The History of the Egyptian Qadis*، (پیرس ۱۹۰۸ء) کے نام سے مرتب کیا اور پھر یہ دونوں تصنیفات Rhuvon Guest کے ہاتھوں عنوان ذیل کے تحت *The Governors and Judges of Egypt or Kitab el-umara (el-wulâh) wa-Kitab el-Quḍâh of el-Kindi together with an appendix derived, mostly from Raf' el-iṣr by Ibn Ḥajar*، (سلسلۂ یادگار گب، لائیڈن ۱۹۱۲ء) نہایت خوبی سے شائع ہوئیں [(دیکھیے حسن احمد محمود : الکندی المؤرخ، مصر)].

الکندی کی دوسری تصنیفات کا علم ہمیں زیادہ تر المقریزی کی الخطط اور ابن دُقماق [رَكَ بآں] کے اقتباسات سے ہوتا ہے، مثلاً کتاب الجند الغربی یا الاَجناد [الغَربیة ؟]؛ ایک کتاب الخندق والتراویح (اس لڑائی کا بیان جو فُسطاط کے دفاع میں ابن الزُبیر کے مقرر کردہ والی ابن جَحْدَم کی تعمیر کردہ خندق کے لیے ہوئی) ؛ کتاب الخطط؛ کتاب اخبار مسجد اھل الرایة الاعظم اور کتاب الموالی ؛ سیرة السَری بن الحَکَم جس کا ذکر صرف المقریزی نے کیا ہے ۔ ارشاد الاریب (۲ : ۱۵۶) میں یاقوت نے الکندی کی ایک تاریخ کا حوالہ دیا ہے جو ۲۸۰ھ / ۸۹۳ء سے شروع ہوتی ہے اور ابن دُقماق (۴ : ۳۱۸) نے ۲۹۰ھ/۹۰۳ء کے ایک واقعے کے سلسلے میں بطور ماخذ جس کا ذکر کیا ہے ۔ السیوطی نے غلطی سے ایک مختصر سی تصنیف کتاب فضائل مصر اس سے منسوب کی ہے جو دراصل اس کے بیٹے عمر نے کافور الاخشیدی (۳۵۵ھ / ۹۶۶ء تا ۳۵۷ھ/۹۶۸ء) کے لیے لکھی تھی جسے J. Oestrup نے (*Umar b. Muhammad al-Kindis Beskrivelse of Ägypten, Udgivet og Oversatt*) در *Bulletin de l'Academie Royale de Danemark*، کوپن ہیگن ۱۸۹۶ء، شمارہ ۴ طبع کیا تھا، لیکن Nallino : *Opus Astron.* (*al Battani*، ۲ : ۳۲۵) کے مطابق الکندی نے خود اسی عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جس کے متعدد حوالے اس کے بیٹے نے دیے ہیں ۔

مآخذ : (۱) المقریزی : المُقفّی؛ (۲) الذہبی: تاریخ الاسلام؛ [(۳) السیوطی : حسن المحاضرة، ۱ : ۳۱۹؛ (۴) ابن سعید الاندلسی : المغرب فی حلی المغرب، السفر السابع، لائیڈن ۱۸۹۸ء، ص ۵ و ۴۸؛ (۵) حاجی

خلیفه : کشف الظنون، ۲۸، ۵۱۷؛ (۶) اسمٰعیل باشا : ہدیۃ العارفین، ۲ : ۳۶؛ (۷) الزرکلی : الاعلام، بذیل مادہ؛ (۸) سرکیس : معجم المطبوعات العربیۃ؛ (۹) براکلمان : تاریخ الادب العربی (تعریب)، ۳ : ۸۲ و ۸۳] .

(C. BROCKELMANN [و ادارہ])

* **الکِنْدی** : ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق، ایک عرب فلسفی، جو نسلاً جنوبی عرب سے تعلق رکھنے کی وجہ سے فیلسوف العرب کے نام سے مشہور تھا ۔ غالباً نویں صدی عیسوی کے وسط میں الکندی کوفے میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ عامل تھا ۔ اس نے بصرے اور بغداد میں تعلیم پائی جو اس کے زمانے میں تعلیم کے بڑے مرکز تھے ۔ خلفاے بنو عباس کے دربار خصوصاً المأمون اور المعتصم کے عہد میں اس نے فلسفۂ یونان کی کتابوں کے مترجم یا مرتّب، اور المعتصم کے ایک بیٹے کے اتالیق اور منجم وغیرہ کی حیثیت سے خدمات سر انجام دیں؛ چونکہ وہ دربار [خلافت] کے معتزلہ عقائد کا سچا پیرو تھا، اس لیے جب المتوکل کے عہد میں پرانے عقائد کا احیا ہوا تو اس پر بھی اثر پڑا اور اس کا کتب خانہ کچھ عرصے کے لیے ضبط کر لیا گیا ۔ ۸۷۰ء میں وہ بقید حیات تھا، کیونکہ انھیں دنوں جب سلطنت عباسیہ کو قرامطہ اور ستاروں کے ایک [منحوس] قِران سے خطرہ لاحق ہوا تو وہ سمجھتا تھا کہ یہ پیش گوئی کر سکتا ہے کہ ابھی یہ سلطنت تقریباً ۴۵۰ سال تک قائم رہے گی . . . .

الکندی کی جہاں تک رسائی ہو سکتی تھی اس نے نام نہاد ''قدیم'' یعنی یونانی علوم میں اچھی خاصی بصیرت حاصل کر لی تھی اور پھر وہ عمر بھر اپنی ادبی سرگرمیوں کے ذریعے بڑی جانفشانی سے ان کی نشر و اشاعت اسلامی دنیا میں کرتا رہا ۔ دسویں صدی ہجری میں اس کی ان سرگرمیوں کے آثار ہر شعبۂ علم، بالخصوص ریاضی اور طبیعیات میں ملتے ہیں ۔ اس کی تصنیفات میں سے بہت کم عربی میں محفوظ رہ سکی ہیں، البتہ لاطینی زبان میں ان کے تراجم نسبۃً زیادہ تعداد میں موجود ہیں اور ان میں وہ تراجم بھی شامل ہیں جو گرھارڈ قرمونی (Gerhard of Cremona) نے کیے تھے ۔ بہر صورت ہمارے پاس خاصا مواد بچ رہا ہے جس میں کچھ اقتباسات اور کچھ اس کی سوانح اور تصانیف کے حوالے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فلسفے اور سائنس کی دنیا میں اس کا کیا مقام ہے .

یونانیت ما بعد کی اصطلاح میں وہ خُذْ ما صَفَا کا قائل تھا ۔ اس نے نوفیثاغورثی ریاضی کو تمام علوم کی اساس قرار دیا اور نو افلاطونیوں کے انداز میں افلاطون اور ارسطو کے نظریات کو متحد کرنے کی کوشش کی ۔ وہ صرف طبیعیات ہی میں نہیں بلکہ طب میں بھی ریاضی کے اصولوں کا اطلاق کرنے کا شائق تھا ۔ مثال کے طور پر مرکب ادویات کا نظریہ لے لیجیے ۔ اس نے ان ادویات کے اثرات کی توضیح ان کے طبیعی خواص، گرم سرد خشک اور مرطوب کے ہندسی تناسب کی رو سے کی ۔ اسی لیے دور احیاے علوم (Renaissance) کے فلسفی کارڈن Cardan نے بھی اس کا شمار دنیا کے بارہ بہترین نکتہ رس اشخاص میں کیا ہے .

ازمنۂ وسطٰی میں الکندی کو ایک منجم کی حیثیت سے شہرت حاصل تھی ۔ اس کا نام علم نجوم کے نو حکموں (Judices) میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن اس نے محض علم النجوم کے ان مسائل ہی سے بحث نہیں کی جو ہمارے نزدیک توہمات کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ صحیح فلکیاتی پیمائشیں کیں اور حسابات لگائے ہیں .

جہاں تک کیمیا کا تعلق ہے اس کا مطالعہ الکندی کے زمانے میں بڑے ذوق و شوق سے کیا

جاتا تھا اور طبیب الرّازی نے الکندی کے مقابلے میں اس کی حمایت و مدافعت کی ۔ اس بارے میں ہمارے فلسفی نے کچھ مشکل روش اختیار کی ہے ۔ اس کے نزدیک سونا چاندی صرف کانوں سے نکالا جا سکتا تھا، جہاں دست قدرت انھیں وجود میں لاتا ہے اور ان کا بنانا انسانی کاریگری کے بس میں نہیں . . . . . .

الکندی نے علم مناظر و مرایا پر سیر حاصل بحث کی ۔ اس کی اہم ترین کتاب بلاد مشرق میں اس کے جلیل القدر جانشین ابن الہیثم کی تصنیف کے بعد سب سے زیادہ پڑھی جاتی تھی ۔ یہ کتاب زیادہ تر اقلیدس (Euclid) کی بصریات (*Optics*) کے اس نسخے پر مبنی ہے جو تھیون Theon کا تصحیح کردہ ہے ۔ اس کتاب میں الکندی نے حسب ذیل امور سے بحث کی ہے : (۱) روشنی کا گزر خطوط مستقیم میں، (۲) رویت کا براہ راست عمل، (۳) رویت کا عمل آئینے کے ذریعے، (۴) نظر پر فاصلے اور زاویۂ بصر کا اثر نیز مغالطہ ہائے بصری ۔ اس کے نزدیک روشنی کے سفر میں کوئی وقت صرف نہیں ہوتا اور رویت کرنوں کے اس مجموعے سے عمل میں آتی ہے جو آنکھوں سے نکلتا اور ایک مخروطی صورت اختیار کر کے خارجی شے کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے ۔ باقی چار حسیں تو اشیا سے اثر قبول کرتی ہیں، لیکن حسّ باصرہ اپنے موضوع کو ایک فاعلانہ اور فوری انداز میں گرفت میں لے لیتی ہے .

اس کی دوسری بڑی بڑی کتابوں کی طرح اس کی ایک مختصر تصنیف بھی صرف لاطینی ترجمے کی صورت میں ملتی ہے ۔ اس کا موضوع ہے آسمان کے نیلے رنگ کا سبب ۔ الکندی اس کی تشریح اس کتاب میں یوں کرتا ہے کہ یہ رنگ در اصل افلاک سے مخصوص نہیں بلکہ آسمان کی تاریکی اور گرد و غبار اور بخارات کے ان ذرات سے مل کر بنا ہے جو ہوا میں موجود اور سورج کی روشنی سے منور ہوتے ہیں ۔ اس کی ایک تصنیف مدّ و جزر پر بھی لاطینی ہی میں محفوظ ہے جو اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ مصنف نے اپنے نظریے کو جو اگرچہ غلط ہے، تجربات کی روشنی میں جانچا تھا .

الکندی اگرچہ بنیادی اعتبار سے ایک ماہر طبیعیات تھا لیکن اس نے عقیدۂ روح و عقل (νοῦς) پر بھی بحث کی ہے ۔ اس کی دانست میں یہ دنیا بحیثیت مجموعی ایک خارجی علت فاعلہ یعنی عقل الٰہیہ کی تخلیق ہے جس کا عمل عالم بالا سے دنیا میں کئی طرح سے نافذ ہوتا رہتا ہے ۔ خدا اور عالم اجسام کے درمیان عالم روح ہے، جس نے اجسام سماوی کے عالم کو تخلیق کیا ۔ روح انسانی عالمی روح سے نکلتی ہے ۔ جس حد تک انسانی روح جسم سے مخلوط ہے وہ اجسام سماوی کے اثرات کی ماتحت ہے، لیکن اپنی روحانی اصل اور ہستی کے اعتبار سے وہ آزاد ہے کیونکہ محض عالم عقل (νοῦς) ہی میں آزادی اور بقاے دوام ہے، لہٰذا اگر ہمیں اعلٰی ترین مقام پر پہنچنے کی تمنا ہے تو لا محالہ خوف خدا، علم اور اعمال حسنہ کا سہارا ڈھونڈنا پڑے گا جو عقل کی جاودانی مملوکات ہیں .

الکندی کے رسالۂ *De Intellectu* [رسالہ فی العقل، مطبوعۂ قاہرہ] طبع Nagi میں نظریۂ عقل ہمیں پہلی بار اس صورت میں نظر آتا ہے جو مسلمانوں کے نوافلاطونی ارسطاطالیسی فلسفے کے پورے دور میں امتیاز رکھتی ہے ۔ اسکندر الافرودیسی (Aphrodisias) (*De Amlnu*، ج ۲) کی پیروی کرتے ہوئے الکندی نے عقول اربعہ کو ایک دوسری سے ممیز کیا ہے : (۱) جو ہمیشہ مصروف عمل رہتی ہے، (۲) جو بالقوہ روح میں موجود ہوتی ہے، (۳) جسے عقل اول روح میں بروے کار لاتی ہے (یہاں تک اسکندر الفرودسی کی سہ گونہ عقل νοῦς، یعنی ποιητικός، ὑλικός،

ἐπίκτητος کے مطابق) اور (۴) عقل اثباتی ہی ڈوھم P. Duhem (Le Systeme du Monde، پیرس ۱۹۱۶ء، ۴ : ۴۰۵) کے قیاس کے مطابق مؤخرالذکر کا مطلب حِسِ حیوانی (anima Sensitiva) ہے جس کا ذکر اسی ضمن میں اسکندر الافرودیسی سیاسی نے کیا ہے، لیکن اس نے اسے عقل نہیں کہا اور نہ وہ ایسا کہ سکتا تھا ۔ میرے نزدیک تو الکندی کی چوتھی عقل سے مراد تیسری کی مؤثر کار کردگی ہے بعینہ جیسے ارسطو نے اکتسابی نیکی کے رکھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے اور اکتسابی علم اور ذہنی عمل کے درمیان تمیز کی ہے، لہٰذا زمانۂ ما بعد کی عربی اصطلاحات کے مطابق چوتھی اور پہلی عقل کے مابین یوں تمیز کی جائے گی کہ یہ عقل بالفعل ہے اور وہ عقل فعّال ۔

[الکندی کثیرالتصانیف مصنف تھا ۔ اس نے ۲۲ رسائل فلسفہ، ۹ رسائل نجوم، ۱۶ رسائل علم ہیئت، ۱۷ رسائل علم مناظرہ، ۱۱ رسائل حساب، ۲۳ رسائل علم ہندسہ، ۲۲ رسائل طب، ۱۲ رسائل طبیعیات ، ۸ رسائل علم الکرات، ۷ رسائل علم موسیقی، ۵ رسائل نفس اور ۹ رسائل منطق وغیرہ لکھے تھے (قدری حافظ طوقان : تراث العرب العلمی، ص ۱۶۶ تا ۱۷۶، قاہرہ ۱۹۶۳ء) ۔ ان میں سے فلسفیانہ رسائل کا مجموعہ دو جلدوں میں ابو ریدہ نے شائع کیا ہے (قاہرہ ۱۹۵۰ء) ۔]

مآخذ: (۱) G. Flügel: *Al. Kindi, Genannt der Philosoph der Arabes* (*Abh. f.d.k.d.m.*، ۱ : ۲) لائپزگ ۱۸۵۷ء؛ (۲) O. Loth: *Al. kindi als Astrog* (*Morgenl. Forsch. Festschr. f. Fleischer*) لائپزگ ۱۸۷۵ء، ص ۲۶۱ ببعد؛ (۳) A. Nagy: *Die Philosophischen Abhandlungen des Ja'qub ben Ishaq al-Kindi* (*Beitr. z. Gesch. d. Philos. d. M.A.*، ۲ / ۵ منشر ۱۸۹۷ء)؛ (۴) T.J. de Boer: *Zu kindi und seiner Schule* (*Arch. f. Gesch. d. Philos*، ۱۹۰۰ء، ۱۳ : ۱۵۳ ببعد؛ (۵) وہی مصنف: *Geschichte der Philosophie im Islam*، سٹٹ گارٹ ۱۹۰۱ء، ص ۹۰ ببعد؛ انگریزی ترجمہ: ص ۹۷ ببعد)؛ (۶) وہی مصنف : *Kindi wider* (*Orient. Stud. Festschr. f. Nöldeke*) Giessen، ۱۹۰۶ء، ص ۲۷۹ ببعد؛ (۷) H. Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber* (*Abhd. z. Gesch. d. Math Wiss*، ج ۱۰، لائپزگ ۱۹۰۰ء؛ [(۸) George Sarton: *Introduction to the History of Science*، مطبوعۂ بالٹی مور ۱ : ۵۵۹ تا ۵۶۰؛ (۹) قدری حافظ طوقان : تراث العرب العلمی فی الریاضیات والفلک، ص ۱۶۶ تا ۱۷۶، قاہرہ ۱۹۶۳ء؛ (۱۰) براکلمان: *G.A.L.*، تکملہ، ۱ : ۳۷۲ تا ۳۷۰، لائڈن ۱۹۳۷ء؛ (۱۱) ابن الندیم : الفہرست، ۲۵۵ تا ۲۵۶، لائپزگ؛ (۱۲) القفطی : تاریخ الحکماء، ص ۳۶۶ تا ۳۷۷، لائپزگ؛ (۱۳) عمر فروخ : من تاریخ الفکر العربی الی ایّام ابن خلدون، ص ۲۲۵ و ببعد، بیروت ۱۳۹۲ھ؛ (۱۴) محمد لطفی جمعہ : تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق و المغرب، ص ۱ تا ۷، قاہرہ ۱۹۲۷ء؛ (۱۵) احمد فؤاد الاہوانی : الکندی، فیلسوف العرب، مطبوعۂ قاہرہ]؛ (۱۶) وہی مصنف : الکندی، در *History of Muslim Philosophy*، طبع M.M. Sharif، ویز بادن، ۱ : ۴۲۱ تا ۴۳۳، ۱۹۶۳ء].

(T. de Boer [و ادارہ])

الکندی : عبدالمسیح بن اسحٰق ۔ عیسائیت کی حمایت میں مشہور عربی تصنیف: رسالۃ الی عبداللہ بن اسمٰعیل الہاشمی کے مصنف کا فرضی نام ۔ اس کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے (طبع ۱۸۸۰ء، ص ۷۴؛

دیکھیے ص ۲) کہ یہ اس مناظرے کے بارے میں ہے جو تقریباً ۲۰۴ھ/۸۱۹ء میں خلیفہ المامون کے سامنے اسلام اور عیسائیت کی متعلقہ اقدار کے بارے میں ہوا تھا، لیکن اس میں الٰہیات کے ضمن میں جو بیانات دیے گئے ہیں اور جو اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں وہ غالباً ۳۰۰ھ/۹۱۲ء سے بعد کی ہیں۔ اس کی ایک خاص مثال یہ ہے کہ حنبلی بربہاری (م ۳۲۹ھ/۹۴۰ء) کے اس نظریے کی کہ خداے تعالٰی کے عرش کے پائے پر محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا اسم مبارک کندہ ہے، الطّبری (م ۳۱۰/۹۲۳ء) کی تردید کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مسیحی الٰہیات میں اسلامی علم کلام کے تصورات مثلاً صفات ذات اور صفات فعل میں تمیز کو شامل کر لینے کی وجہ سے اس کندی کو کوئی ایسا یعقوبی مصنف بھی قرار دینے کی کوشش کی جا سکتی ہے جو ابن رشد سے پہلے کے زمانے کے رجحانات کا حامل تھا، مثلاً مشہور مصنف یحیٰی بن عَدی (م ۳۶۴ھ/۹۷۴ء)۔ البیرونی نے اس کے متن سے استفادہ کیا ہے اور اس کے مصنف کا ذکر اس کے اختیار کردہ نام نسطور کندی یعنی ''فرزند اسحٰق'' سے کیا ہے جو ایک ہاشمی یعنی ''فرزند اسمٰعیل'' سے خطاب کر رہا ہے۔

اس وکالت کا لہجہ بیشتر مقامات پر جارحانہ ہے تاہم یہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن پاک کے موجودہ متن کی تدریجی تالیف اور اس کی تنقیدی تاریخ کا خاکہ سب سے پہلی بار اسی میں پیش کیا گیا۔ اصل عربی کتاب سریانی رسم الخط میں لکھی گئی تھی (کرشنی Karshuni، مخطوطات پیرس، *Catal. Zotenbeng*، ص ۲۰۴، ۲۰۵، Gotha : *Catal. moller*، ص ۱۶۰) - ۱۱۴۱ء کے قریب پطرس الطلیطلی (Peter of Teledu) نے اس کا تجزیہ اور پھر لاطینی میں ترجمہ کیا (لاطینی مخطوطات، پیرس، عدد ۳۳۹۳، ۳۶۴۹، طبع در Bibliander : *Alcoranus*، ۱۵۴۳ء، ۱۰۲ تا ۲۰) اور پھر انیسویں صدی میں سرولیم میور اسے گمنامی سے نکال کر دوبارہ منظر عام پر لایا۔

مآخذ : (۱) Dionysius Carthusianus (م ۱۴۷۱ء)، *In Alchoran Lib. V.*، کولون ۱۵۳۳ء، ج ۲، حصہ ۱، ص ۷۰، ۲۰۰ وغیرہ؛ (۲) W. Muik : *The Apology of Al-kindy*، لنڈن ۱۸۸۲ء، ص ۵۹ بعد؛ (۳) P. Casanova : *Mohammad et la findu monde*، پیرس ۱۹۱۳ء، ص ۱۱۰ تا ۱۲۲؛ (۴) کشف الغطاء (شیعی): الدّین والاسلام ۱۳۳۱ھ ج ۲، آخر کتاب، متن اول بار Ant. Tien نے ۱۸۸۰ء میں طبع کیا (لنڈن، طابع Gibbert O. Riwington : *Turkish Mission Aid Society*، ۱۶۶ صفحات).

(L. MASSIGNON)

کَنْعان : لفظ کے عربی الاصل یا عجمی الاصل ہونے کے بارے میں علماے لغت کے ہاں اختلاف موجود ہے ، اسی طرح عربی الاصل ہونے کی صورت میں اس کے اشتقاق اور معانی کے بارے میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ ابن منظور (لسان العرب، بذیل مادّۂ کَنَع) اور مرتضٰی الزبیدی (تاج العروس، بذیل مادّۂ کَنع) نے تفصیل سے بحث کی ہے اور اسے یاقوت (معجم البلدان، ۴ : ۴۸۳، دارالصادر بیروت) نے مفصل نقل کیا ہے ۔ اس کا فصیح تلفظ کاف کی زبر (َ) اور نون ساکن کے ساتھ ہے مگر کاف کی زیر (ِ) بھی منقول ہے (تاج العروس، مادّۂ کنع).

کتب انساب و تاریخ میں کنعان نام کے تین اشخاص مذکور ہیں جن میں سے ایک حضرت نوح ؑ کا بیٹا، دوسرا ان کا پوتا اور تیسرا کنعان بابل کے مشہور بادشاہ نمرود کا باپ تھا۔ اول الذکر کنعان کے بارے میں روایات میں اختلاف بلکہ تضاد پایا

جاتا ہے، الطبری (۱ : ۱۹۹، طبع ڈخویہ) نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوحؑ کے چار بیٹوں میں سے ایک کا نام کنعان تھا۔ اس کنعان ہی کو عرب یام کہتے ہیں اور غرق بھی یہی ہوا تھا ۔ ابن الکلبی سے یاقوت (معجم البلدان، ۴ : ۴۸۳، بیروت) نے بھی یہی نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ کنعان کا نام اصل میں شالوما تھا اور یہ غرق ہو گیا تھا اور اس کی نسل آگے نہیں چل سکی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ بلاد شام میں آباد ہونے والے لوگ کنعانی کہلاتے تھے جو کنعان بن نوح سے منسوب تھے اور عربی کے مشابہ کوئی زبان بولتے تھے ۔ فیروز آبادی (القاموس بذیل مادۂ کنع) نے لکھا ہے کہ کنعان حضرت نوحؑ کا ہی بیٹا تھا ۔ شارح القاموس مرتضی الزبیدی (تاج العروس بذیل مادۂ کنّع) نے لکھا ہے کہ مشہور ماہر نسب ابن المنذر الکوفی اور ماہر لغت اللیث نے بھی یہی منقول ہے ۔ ابن خلدون (العبر، ۶ : ۹۳، ۹۷) نے بربر کو کنعان بن نوحؑ (بربر بن تملا بن مازیغ بن کنعان بن نوحؑ) کی اولاد بتایا ہے ۔

دوسرے کنعان کے سلسلے میں یاقوت (محلّ مذکور) نے لکھا ہے کہ وہ سام بن نوحؑ کا بیٹا تھا اور بلاد شام کے کنعانی اسی کنعان بن سام بن نوح کی نسل سے تھے۔ یاقوت اسے قول مستقیم حسن (صحیح اور اچھا) قرار دیتا ہے ۔ المسعودی (مروج الذهب، ۳ : ۲۹۴) کے نزدیک بلاد شام کے کنعانی کنعان بن حام بن نوحؑ کی اولاد ہیں ۔ تیسرے کنعان کے بارے میں الزبیدی (تاج العروس، بذیل مادۂ کنع) نے لکھا ہے کہ کتب تاریخ میں ایک کنعان بن کوش کا بھی ذکر ملتا ہے جو حام بن نوح کی اولاد سے تھا ۔ شاید وہی کنعان نمرود بابل کے نسب میں مذکور ہے جس کا سلسلۂ نسب بقول المسعودی (مروج الذهب، ۳ : ۲۴۰؛ نیز تاج العروس بذیل مادۂ کنّع) یوں ہے : نمرود بن کنعان بن سنجاریب بن نمرود الاکبر ابن کوش بن حام بن نوحؑ؛ بعض کتب تفسیر (البیضاوی، ۱ : ۵۱۳، طبع فلائشر) میں بھی یہی مذکور ہے کہ نمرود کے باپ کا نام کنعان تھا ۔

مآخذ : (۱) فیروزآبادی : القاموس، بذیل مادۂ کنّع؛ (۲) الزبیدی : تاج العروس، بذیل مادۂ؛ (۳) ابن منظور : لسان العرب، بذیل مادۂ؛ (۴) یاقوت الحموی : معجم البلدان، طبع دارالصادر، بیروت؛ (۵) الطبری : تاریخ الرسل والملوک، طبع ڈخویہ؛ (۶) ابن خلدون : کتاب العبر؛ (۷) المسعودی : مروج الذهب؛ (۸) البیضاوی : انوار التنزیل و اسرار التأویل، طبع فلائشر؛ (۹) عمر رضا کحالہ : معجم قبائل العرب، دمشق؛ (۱۰) الثعالبی : قصص الانبیاء، قاهره ۱۳۲۴ھ.

(ظہور احمد اظہر)

کنعان پاشا : جو صاری کنعان پاشا بھی کہلاتا ہے، سلطنت عثمانیہ کا ایک امیر البحر اعظم (قپودان پاشا) تھا ۔ پیدائش کے اعتبار سے وہ روسی (چرکس) تھا ۔ وہ ایک غلام کی حیثیت سے مصر کے عثمانلی حاکم باقیرجی احمد پاشا کے حلقۂ خدمت میں داخل ہوا ۔ جب احمد پاشا کو سزائے موت ملی تو سلطان مراد چہارم کنعان کو سرای [محل سلطانی] میں لے گیا اور وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی ۔ اسے ترقی دے کر رکاب دار آغا سی بنایا گیا (وقائع وجیہی، ورق ۹۱ - ب، مخطوطۂ وی‌انا) ۔ سلطان ابراهیم کی تخت نشینی (فروری ۱۶۴۰ء) کے بعد وہ اس کا منظور نظر ہوگیا اور اس کی بیٹی عاتکہ سلطانیہ سے شادی کی ۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسے وزیر ثالث کے عہدے پر سرفراز کر دیا گیا، لیکن ابراهیم کی وفات (۱۸ اگست ۱۶۴۸ء) کے چند ہی روز بعد اسے اقریطش (Crete) میں جلا وطن کر دیا گیا ۔ ستمبر ۱۶۵۲ء میں وہ استانبول واپس آیا اور در دانیال

کے مورچوں کا نگران مقرر ہوا - ۹ ستمبر ۱۶۰۳ء کو اوفن Ofen کا حاکم ہوا، لیکن ۲۲ ستمبر ۱۶۰۵ء کو اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور پھر ۹ فروری ۱۶۰۶ء کو سلسترہ کا حاکم مقرر ہوا - اسی سال ۳ مئی کو اسے قپودان پاشا (رکَ بآں) کا عہدہ دے دیا گیا - ۲۶ جون ۱۶۰۶ء کو اس کے زیر قیادت ترکی بیڑا وینس کے مقابلے میں بھیجا گیا، لیکن درہ دانیال میں اس نے شکستِ فاش کھائی - Lepanto کی جنگ کے بعد یہ سب سے بڑی بحری شکست تھی جس سے ترکی کو سابقہ پڑا (دیکھیے J. v. Hammer : *GOR*، ۵ : ۶۴۹ ببعد) - سلطان کے سارے غیظ و غضب کا ہدف کنعان پاشا قرار پایا، چنانچہ اسے فوراً زندان میں ڈال دیا گیا - بالآخر اس کی ہموطن خاتون سلطانہ والدہ (کو سم والدہ رکَ بآں) کی سفارش سے ۱۸ جولائی ۱۶۰۶ء کو اسے رہائی ملی، لیکن تقریباً اسی وقت اسے قپودان پاشا کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا - دو سال بعد ۲۳ جون ۱۶۰۸ء کو اسے قائم مقام (رکَ بآں) بنایا گیا، لیکن اس سے اگلے ہی مہینے (۱۶ جولائی ۱۶۰۸ء) کو پھر معزول کر دیا گیا اور قلعہ نشین فوج کا محافظ بنا کر بروسہ [بورسہ] بھیج دیا گیا (دیکھیے J. von Hammer : *GOR*، ۶ : ۳۷؛ نَعیما : تاریخ، طبع اول، ۲ : ۶۶) - یہاں سے وہ آناطولی کے باغی عبازہ حسن کے ساتھ جس سے اس نے بڑے گہرے تعلقات پیدا کر لیے تھے، کچھ ساز باز کر کے روانہ ہو گیا - نتیجہ یہ نکلا کہ اسے عبازہ کے انجام میں شریک ہونا پڑا، چنانچہ اسے ۱۷ فروری ۱۶۰۹ء کو حلب میں دغا بازی سے قتل کر دیا گیا (دیکھیے نعیما : تاریخ، ۲ : ۶۸۵) - اس کا سر ۹ مارچ ۱۶۰۹ء کو استانبول کے دیوان میں لایا گیا .

اگر یہ وہی کنعان پاشا ہے جس کا ذکر اولیا چلبی نے سیاحت نامہ (۳ : ۳۶۶) میں کیا ہے (اور وہ یقیناً کبھی Oczakov کا حاکم نہیں تھا، اسی طرح قوجہ کنعان پاشا (م ۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۲ء) بھی جسے اکثر قپودان پاشا سے ملتبس کر دیا جاتا ہے، مثلاً سجلِّ عثمانی، ۴ : ۸۳ کبھی اس عہدے پر مامور نہیں ہوا تھا) تو وہ ایک مصنف بھی تھا اور اس نے صاری صلتیق بابا (رکَ بآں) کی شان میں صلتیق نامہ نظم کیا تھا - اس کے اپنے جنگی کارناموں خصوصاً اس کی ۱۰۳۶ سے ۱۰۳۸ھ / ۱۶۲۶ء سے ۱۶۲۸ء تک کی فوجی کاروائیوں کو طُلُوعی ابراہیم افندی (ساکن قَلْقَنْدلن) نے جو شاعر بھی تھا اور فقیہ بھی اپنی نظم پاشا نامہ میں بیان کر گیا ہے - اس کا ایک نقل کردہ نسخہ موزۂ بریطانیہ (Sloane مخطوطہ ۳۵۸۴) میں موجود ہے، دیکھیے Ch. Rieu : *Catalogue of the Turk. Mss.*، ص ۱۹۱ ببعد، جس میں مضامین کا تفصیل‌دار خلاصہ بھی شامل ہے - اس امکان کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ نظم مذکورہ بالا قوجہ کنعان پاشا سے بھی متعلق ہو سکتی ہے جس کی زندگی کے واقعات بہت کچھ اپنے ہم‌نام اور ہم‌عصر کے کارناموں سے ملتے جلتے تھے (مثلاً دونوں اوفن Ofen کے والی رہے تھے) - صاری کنعان پاشا کی زندگی کے جو حالات ملتے ہیں وہ بےحد الجھے ہوے اور گڈ مڈ ہیں جیسا کہ رامز پاشا زادہ محمد کے خریطۂ قپودانانِ دریا (استانبول ۱۲۸۵ھ) کے ص ۶۵ ببعد پر مقالے سے، نیز قاموس الاعلام، ص ۳۹۰۰، کی تصریحات سے جو خریطہ ہی کی پیروی کرتا ہے ظاہر ہوتا ہے - اس مآخذ کی رو سے کنعان پاشا کو اس مدرسے کے پاس دفن کیا گیا تھا جو قرق چشمہ کے قریب ہی واقع ہے .

مآخذ : (متن میں مذکورہ تصنیفات کے علاوہ) :
(۱) A. V. Gévai در Jos v. Chmel : *Osterreich. Geschichtsforscher*، وی‌انا ۱۸۴۱ء، ۲ : ۸۲، عدد ۴۷ : (۲) وہی مصنّف *'A' Budai pasák* Bées

۱۸۳۱ء، ص ۱۴ عدد ۸۶؛ (۳) سجلِّ عثمانی، ۴ : ۸۲؛ (۴) J. von Hammer : Geschichte des Osmanischen Reiches، ۱۰ : ۹۴ء، بذیل Kenaanpascha.

(FRANZ BABINGER)

* کنغری : (اسے کنقری اور کبھی کبھی چنکری بھی لکھا جاتا ہے)، ایک اسی نام کی لوا (اداری ضلع) کا صدر مقام - یہ ضلع ولایت (صوبہ) قسطمونی Kastamuni میں قزل ایرماق (Hayls) کے ایک معاون اجی صو Gangra کے کنارے واقع ہے - یہ وہی قدیم گنگرہ Gangra ہے جو پرانے زمانے میں بھی ایک مستحکم مقام کی حیثیت سے مشہور تھا - بعض اوقات بوزنطی اسے جلاوطنی کے مقام کے طور پر استعمال کرتے تھے اور زمانۂ ما بعد میں جب عربوں اور دانشمند اوغلو حکمرانوں سے جو لڑائیاں چھڑیں ان میں اسے پھر اپنے تقریباً ناقابل تسخیر قلعے کی بدولت اہمیت حاصل ہوگئی - بوزنطیوں کے خلاف چڑھائیوں کے دوران میں بنو امیّہ کئی بار خَنْجَرۃ (بشکل دیگر جنجرۃ) تک بڑھ آئے؛ مثلاً ۹۳ھ/۷۱۱ - ۷۱۲ء میں (الطبری طبع de Goeje، ۲: ۱۲۳۶؛ ابن الاثیر، طبع Tornberg، ۴ : ۴۵۷؛ الیعقوبی، ۲ : ۳۵۰ جو اس شہر کو حصن الحدید کے نام سے یاد کرتا ہے) - ۱۰۹ھ/۷۲۷ - ۷۲۸ء میں (الیعقوبی، ۲ : ۳۹۵) اور ۱۱۳ھ/۷۳۱ - ۷۳۲ء میں (ابن العبری (Bar-Hebraeus) : Ketaba de Maktebānūt Zabed، طبع Bruns و Kirrsch، ۲ : ۱۲۵؛ دیکھیے الطبری، ۲ : ۱۵۶۱ اور Theophanes، بذیل سال ۶۲۲۴) - جب ۱۰۷۱ء میں منگرت Mangikert کی شکست کے بعد بوزنطی شہنشاہ نے مشرقی صوبے چھوڑ دیے تو سلجوق اور دانشمند اوغلو نے اس مال غنیمت کو آپس میں بانٹ لیا - سلجوق نے قونیہ میں حکومت قائم کی اور دانشمند اوغلو ایشیاے کوچک کے شمالی نصف حصے میں املسیہ سے قسطمونی تک پھیل گئے - سب سے پہلے دانشمند اوغلو کی فتوحات کے ضمن میں ہمیں ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ - ۱۰۷۶ء میں کنغری کا ذکر ملتا ہے، دیکھیے تاریخ آل دانشمند در اماسیہ لی کی حسین حسام الدّین، اماسیہ تاریخی، استانبول، ۱۳۲۲ء ۲ : ۲۸۶ بعد؛ ہزارفن : تنقیح التّوارخ، در ZDMG، ۳۰ : ۴۷۰ - ۱۱۰۱ء میں صلیبی جنگ آزماؤں کا ایک لشکر قسطنطینیہ سے سر زمین دانشمند اوغلو کی طرف روانہ ہوا تاکہ انطاکیہ کے حاکم Boemund کو جسے انہوں نے ملطیہ Malatya میں گرفتار کر کے نیکسار Niksar میں قید کر دیا تھا، رہائی دلائے - یہ لشکر انقرہ کو فتح کر کے کنغری (قدیم نام گنگرۃ) پہنچ گیا، لیکن اس کا قلعے پر حملہ ناکام ثابت ہوا اور کچھ ہی دن بعد سلجوقوں اور دانشمند اوغلو کی متحدہ فوجوں نے اماسیہ میں اس لشکر کا مکمل قلع قمع کر دیا، Albertus Aquensis : Liber، Caput؛ ابن الاثیر، طبع Tornberg، ۱۰ : ۲۰۳؛ دیکھیے ZDMG، ۳۰ : ۴۷۶؛ Chalandon : Les Comnene، ۱ : ۲۲۳ بعد) - شہنشاہ Jhon Comnenus نے اپنے طاقتور قلعہ شکن توپ خانے کی مدد سے ۱۱۳۴ء میں کنغری فتح کر لیا حالانکہ اس میں ایک سال قبل اس کا حملہ ناکام رہ چکا تھا (Niketas : Chronicle، باب ۶، دیکھیے نیز Joannes Prodromos : رکّ بہ Chalandon، کتاب مذکور ۸۳۲ بعد)، لیکن شہنشاہ کے رخصت ہوتے ہی دانشمند اوغلو نے قلعے پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور اس کے بعد بوزنطی پھر کبھی اس پر قابض نہ ہو سکے - اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ قونیہ کی سلجوق سلطنت کے زوال کے بعد کنغری قسطمونی کے اسفندیار اوغلو کے ہاتھ آ گیا اور پھر ان سے ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء (ازروے نشری) یا ۷۹۷ھ/۱۳۹۵ء (ازروے عاشق پاشا زادہ و نامعلوم الاسم

عثمانی وقائع نگار) میں بایزید اول نے ان کی مملکت کے بیشتر حصے کے ساتھ کنغری بھی چھین لیا۔ ۸۰۳ھ/ ۱۴۰۱ء میں تیمور نے اسفند یار اوغلو کو پھر یہ علاقہ واپس کر دیا، لیکن ۸۲۲ھ/ ۱۴۱۹ء میں [سلطان] محمد اول نے اسے قطعی طور پر اپنی حدود سلطنت میں شامل کر لیا (عاشق پاشازادہ: تاریخ، ص ۸۸ ببعد؛ Leunclavius : *Historiae Musul-mane Turcorum*، فرینکفرٹ ۱۵۹۱ء، کالم ۴۷۵: von Hammer کے بیانات، *Gesch. des Osman. Reiches*، ۱ : ۲۷۰، ۲۳۸ اور ۲ : ۶۷۱، غلط فہمی پر مبنی ہیں)۔ اس کے بعد ترکی حکومت کے ماتحت جو زمانۂ امن شروع ہوا تو کنغری بالکل گمنامی کے پردے میں چھپ گیا اور مؤرخین اس کا ذکر بمشکل ہی کبھی کرتے ہیں تاہم ہمیں اس شہر کا مفصل تذکرہ اولیا : سیاحت نامہ، ۳ : ۲۰۰ ببعد اور حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۶۴۰ سے مل جاتا ہے۔ یورپی سیاحوں میں سے سب سے پہلے اس کا ذکر ۱۵۵۳ تا ۱۵۵۵ء میں Dernschvan نے اپنی کتاب، *Tagebuch einer Reise nach Konstantinople und Kleinasien* طبع Babinger، میونخ ۱۹۲۳ء، ص ۱۹۶ میں کیا۔ Anisworth پہلا یورپی تھا جس نے اس سے تقریبًا تین سو سال بعد اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر اس کا مفصل حال بیان کیا۔ خود ہمارے زمانے میں بعض جرمن سیاح یہاں جاتے اور اس کے کوائف قلمبند کرتے رہے ہیں۔ وہ قلعہ جس پر اپنے اپنے زمانے میں عرب، دانشمند اوغلو، بوزنطی اور صلیبی جنگجو یورشیں کرتے رہے آج کھنڈر بنا پڑا ہے۔ قرہ تگین نے پہلے دانشمند اوغلو بادشاہ کی خاطر یہ شہر فتح کیا تھا اور لوگوں نے اب اسے ولیِ محترم مان لیا ہے۔ اس کا مقبرہ یہاں اب تک موجود ہے۔ قلعے کی پہاڑی پر حوضوں کے نظام کی جس کا تعلق زمانۂ قبل از تاریخ سے ہے اور جس کا اولیا اور حاجی خلیفہ نے تفصیلی ذکر کیا ہے، اب تک پوری تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ یہی حال مسجد طاش (طاش مسجد) یعنی مولوی درویشوں کی خانقاہ اور اس کے کتبات کا ہے جس کے بارے میں Anisworth کو بتایا گیا تھا کہ یہ عرب خلفاء کے زمانے کی یادگار ہے۔ یہاں کی چھوٹی بڑی ۲۷ مسجدوں میں سے چند ایک بوزنطی دور کی ہیں (رک بہ Cuinet)۔ جامع مسجد کو سلیمان اوّل نے ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ - ۱۵۵۹ء) میں تعمیر کرایا تھا۔

کنغری سے دو گھنٹے کی مسافت پر جنوب مشرق میں مغارۃ کے مقام پر معدنی نمک کے وسیع ذخائر(Cuinet، ۴ : ۴۲۷، اور Marcker) بہت مشہور ہیں۔ یہاں سے نکلے ہوئے نمک سے بوزنطی بھی واقف تھے جسے وہ Γαγγρηνὸν ἅλας کہتے تھے (Nicholaos Myrepsos، تیرھویں صدی کے آخر میں در De Cange : *Glossar. ad scriptores med. et inf. Graec*، بذیل مادّہ) زلزلوں کے شدید حملوں کا، جن سے عصر حاضر میں بھی اسے سابقہ پڑتا رہتا ہے، ذکر قرون وسطٰی میں بھی ملتا ہے۔ القزوینی : آثار البلاد، طبع Wüstenfeld، ص ۳۶۸ میں اسی قسم کے ایک خوفناک زلزلے کا مفصل حال بیان کرتا ہے جس نے اگست ۱۰۵۰ء میں اس شہر کو تباہ کر ڈالا تھا۔

باشندوں کی تعداد کا اندازہ ۳۰۰۰۰ تیس ہزار [چالیس ہزار] لگایا جا سکتا ہے جو ۵۰۰۰ پانچ ہزار مکانات میں آباد تھے۔ ان میں ۱۵۰ یونانی اور ۵۰ آرمینی خاندان تھے جو جنگ عظیم کے نتائج کے زیر اثر شاید اس وقت تک یہاں سے رحلت کر چکے ہوں گے۔

مآخذ : (جو اوپر نہیں دیے گئے) (۱) Ritter : *Erdkunde*، ۱۸ : ۳۰۳ ببعد؛ (۲) G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۱۵۸؛ (۳) سالنامۂ ولایت قسطمونی ۱۲۸۶ھ وغیرہ؛ (۴) Cuinet : *La Turquie d' Asie*، ۴ : ۵۵۱ ببعد؛ (۵)

Travels and Researches in Asia : W. F. Ainsworth ‹*Minor. etc.* لنڈن ۱۸۴۲ء، ۱ : ۱۰۹ ببعد؛ (٦) v. Flottwell در ‹*Petermann's Mitteilungen* تکملہ حصہ ۱۱۴ (۱۸۹۵ء)، ص ۳۸ ببعد و ۵۰ (پہاڑی پر کھنڈروں کے نقشے کے ساتھ)؛ (۷) G. Marcker در ‹*Zeitschrift der Ges. f. Erdkunde* ۱۸۹۹ء، ۳۴ : ۳٦۸ ببعد؛ (۸) R. Leonhard : *Paphlagonia*، برلن ۱۹۱۵ء، ص ٦٦ و ۱۲۰ (مع تصویر).

(J. H. MORDTMANN)

* کِنکَوَر، کَنْکَوَر، کَنْگَوَر : ایک چھوٹا سا ضلع جو اسی نام کے ایک شہر اور تقریباً ۳۰ مواضع پر مشتمل ہے - یہ ہمدان اور ترمیسین کے درمیان واقع ہے - شہر کی آبادی پانچ ہزار ہے اور اس کے نواح میں ایک مشہور قلعہ ہے جس کا نام قصر اللصوص یا قصر دزدان یعنی ڈاکوؤں کا قلعہ ہے - کہا جاتا ہے کہ اس کا یہ نام اس وجہ سے پڑا کہ فتح کے وقت مسلمانوں کے کئی مویشی چرا لیے گئے تھے، طبری، ۱ : ۲٦۳۹.

مآخذ : (۱) *B.G.A.*، ۱ : ۱۹۵؛ ۲ : ۲۰٦؛ ۳ : ۳۹۳؛ (۲) Barbier de Meynard : *Dict. de la Perse*، ص ۵۰۴ تا ۵۰۱؛ (۳) Le Strange : *Lands*، ص ۱۸۸ ببعد؛ (۴) Flaudin : *Voyage*، ۱ : ۴۰۸ ببعد.

(J. RUSKA)

* کَـنْـنَـور [کَنّانُور] : کیرالا کے ضلع مالابار میں بھارت کے مغربی ساحل پر ایک بندرگاہ - ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رو سے شہر کی آبادی پچاس ہزار نفوس پر مشتمل ہے جس میں نصف سے کچھ زیادہ مسلمان ہیں جو موپلے [رك بان] کہلاتے ہیں - یہ ہندو ماؤں کے بطن سے عرب مہاجرین کی اولاد ہیں - کننور موپلا سردار علی راجا (امیر بحر) کی اقامت گاہ بھی رہا ہے جس نے ۱۹۱۱ء میں جزائر لکادیپ سے دستبرداری کے بدلے پنشن قبول کر لی تھی - علی راجا کا مورث اعلٰی ایک ہندو تھا، جو سولھویں صدی عیسوی میں مشرف باسلام ہوا تھا - اس خاندان کے اخلاف کو اب بھی برائے نام سیادت حاصل ہے [کننور میں فوجی چھاؤنی بھی قائم ہے - شہر میں سوتی کپڑے اور بسکٹ بنانے کے کارخانے ہیں - مرچیں، ناریل اور ناریل کے رسے بھی دساور جاتے ہیں].

مآخذ : (۱) Madras District Gazetteers ‹*Malabar*، مدراس ۱۹۰۸ء؛ [(۲) Encyclopaedia of Britannica، بذیل مادہ ج ۴، ۱۹۵۰ء لنڈن].

([و ادارہ] G. S. COTTON)

کُنْیَة : (عربی) کا صحیح مطلب تو ایک ایسا اصطلاحی نام یا لقب ہے جس میں صفت سے موصوف اور جزو سے کل (صنعت مجاز مرسل) مراد لیا جائے، لیکن اس کے علاوہ یہ کسی مرد کے (یا عورت کے بھی) اپنے بڑے بیٹے کی نسبت سے نام رکھنے کے لیے بطور اصطلاح استعمال ہوتا ہے، یعنی ابو [یا امّ] فلاں - یہ ایک ایسا نام ہے جو بہت کم عربوں کے ذاتی نام کا جزو نہیں ہے (دیکھیے نیز مادۂ لقب) بلکہ بسا اوقات تو وہ محض اسی نام سے معروف ہوتے ہیں - اس رسم کے آغاز کا سبب اس قدر و قیمت میں مضمر ہے جو سامی نسل کے لوگوں کی نظروں میں اپنے بچوں خصوصاً بیٹوں کی ہوتی تھی - اس سے تدفین کے موقعوں پر اس رسم کی پابندی پر بھی روشنی پڑتی ہے جس کی رو سے یہ فرض لازمی طور پر بالخصوص بڑے بیٹے پر عائد ہوتا تھا - کنیة اور رسوم تدفین کے درمیان تعلق کی منفی شہادت اس امر میں موجود ہے کہ غلاموں کی بالعموم کوئی کنیة نہیں ہوتی تھی اور سولی نہ بنائے جانے کی صورت میں انہیں بغیر رسموں کے دفن کر دیا جاتا تھا [یعنی زمانۂ جاہلیة میں].

عربی ادب میں کنیة کو اگر ایک واقعی

اعزازی لقب کے طور پر نہیں تو کم از کم سادہ نام کی نسبت ہمیشہ زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ لسان، بذیل مادہ کی رُو سے جب کوئی پہلوان، حریف لشکر کو ایک ایک کر کے لڑنے کے لیے للکارتا تھا تو ہمیشہ اپنی شخصیت کا اعلان اپنی کنیة کے ذریعے کرتا تھا، جب کسی جنگجو سے اس کا قبیلہ استمداد کرتا ہے تو اسے اس کی کنیة سے پکارتا ہے (قیس بن الخَطِیم، طبع Kowalski، لائپزگ ۱۹۱۴ء، نا مکمّل ج ۴، س ۳۸) ایک بار (حضرت) عائشہؓ نے آنحضرت (صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم) کی خدمت میں عرض کی کہ آپ کی سب ازواج کی کنیة ہے، لیکن میری کنیة نہیں، تو آپ نے ارشاد فرمایا تم اپنی کنیة ام عبداللہ رکھ لو (احمد بن حنبل، ۶ : ۱۵۱) ۔ اس حدیث سے ہمیں ایک ایسی بات کا پتا چلتا ہے جو یوں شاید کبھی ہمارے علم میں نہ آتی اور وہ یہ کہ بے اولاد لوگ بھی اپنے لیے کوئی کنیة اختیار کر سکتے تھے ۔ بعض دفعہ کنیة کسی شخص کی ابویت کی جگہ اس کے دیگر خصائص کو ظاہر کرتی تھی ۔ ابو ھُریرة [رکّ بآں] بمعنی ''بلی کے بچوں کے باپ'' کی کنیة اس لیے پڑی تھی کہ وہ بلیوں پر بہت شفقت فرماتے تھے ۔ تاریخ کے صفحات سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ خلیفہ اول کی کنیة ''ابوبکر'' (بکر بمعنی اونٹنی کا بچہ) کی کیا وجہ تھی ۔ اکثر اوقات کنیة میں ابو کا لفظ کسی جسمانی خصوصیت کو بھی ظاہر کرتا ہے، مثلاً ابو شامة وہ شخص جس کے جسم پر کوئی پیدائشی نشان ہو ۔ بعض اوقات محض عناد کے باعث یونہیں مزاحًا یا طنزًا کنیة رکھ دی جاتی ہے، مثلاً (ابو جہل [رکّ بآں]، ابو لَہَب [رکّ بآں]، اور آخر میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کئی جغرافیائی نام بھی کنیة کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً ابو سِمْبَل [رکّ بآں]، ابو قُبَیْس [رکّ بآں]، ابو حبّة [رکّ بآں] ابوعریش [رکّ بآں] .

سب قسم کی مشرقی کتب لغات میں کنیتوں کو بالعموم ایک صنف میں مرتب کیا جاتا ہے ۔ ایسی لغات بھی موجود ہیں جن میں محض کنیتوں سے بحث کی گئی ہے .

مآخذ : (۱) Goldziher : *Der Gebrauch der Knuja als Ehrenbezeichnung* در *Muhammedanische Studien*، ۱ : ۲۶۷؛ (۲) A.J. Wensinck : *Some Semitic Rites of Mourning and Religion*، در *Verh. Ak. Wet. Amsterdam*، N.R.، ج ۱۸، شمارہ ۱، ص ۲۶ ببعد؛ (۳) Barbier de Meynard : *Surnoms et Sobriquets*، در *J. A.*، ۱۹۰۷ء، بالخصوص ۱۸۹ تا ۲۰۲ .

(A. J. Wensinck)

* **کَنِیْسَة** : (جمع کَنائس)، معبد یا مجلس، گرجا، آرامی لفظ کنشتا Kenishta [دیکھیے فارسی، کنشت، حافظ :

تنہانہ بنم کعبهٔ دل بتکدہ کردہ

در ہر قدمی صومعه‌ای ہست و کنشتی]

کا معرب ہے جس کے معنی ہیں ''جاے جلوس، مدرسہ معبد'' (دیکھیے J. Levy : *Neuhebr. und Chald. Wörterbuch*، ۲ : ۳۰۹ ببعد) ۔ عہد نامۂ جدید (انجیل) کی سریانی تفسیر (Peshitta) میں اس کی سریانی شکل کنُشتا (Kenūshtā) یونانی لفظ συναγωγή اور بعض اوقات ἐκκλησία کا ترجمہ ہے (دیکھیے Payne Smith : *Thesaurus Syr.*، ج ۱ : عمود ۱۷۷۳) ۔ اس کے مقابلے میں مسیحی مغربی ارامی لفظ کنشتا (Kenishta، συναγωγή نیز ἐκκλησία ہی کی دوسری شکل ہے (دیکھیے Soulthess : *Lex. Syropal.*، برلن ۱۹۰۳ء، ص ۹۰)، مؤخرالذکر اصطلاح تقریبًا ہمیشہ [سریانی تفسیر] پشتًا میں عیدطا سے ترجمہ کی جاتی ہے ۔ لسان العرب، ۸ : ۸۳، س ۲ ببعد، کا بیان اس حد تک تقریبًا صحیح ہے کہ کنیسة کُنشت سے مأخوذ

ہے، لیکن الخفاجی (شفاء الغلیل، قاهره ۱۲۸۲، ص ۱۹۵) اس نظریے کو رد کرتے ہوے یہ راے پیش کرتا ہے کہ اس لفظ سے ایک مخصوص مسیحی ادارہ مراد ہے اور اس کا سلسلہ کلیسا سے جا ملتا ہے جو کلیسیا (ἐκκλησία) کا مخفف ہے ۔ البستانی بھی اس لفظ کو ἐκκλησία کا معرب سمجھتا ہے (محیط المحیط، بیروت ۱۲۸۶ ص ۱۸۴۷ الف).

عربی میں کنیسة کا اطلاق یہودی اور عیسائی دونوں کے عبادت خانے پر ہوتا ہے اور مختلف لغات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے ۔ بعض لغات میں اس کے معنی صرف معبد نصارٰی اور بعض میں صرف معبد یہود لکھے ہیں (دیکھیے الجوہری : صحاح، بولاق ۱۲۸۲، ۱ : ۴۷۳ تا آخر؛ الزمخشری : اساس البلاغة، قاهره ۱۲۹۹، ۲ : ۳۱۲، س ۲۰؛ لسان العرب، محل مذکور؛ یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۳۱۴، س ۷) ۔ بقول الفیروز آبادی (القاموس، بولاق ۱۲۷۲ھ، ۱ : ۵۰۹، ۱) کنیسه کا مطلب ہے یہودیوں، عیسائیوں یا کفّار کا عبادت خانہ (متعبد)؛ دیکھیے نیز تاج العروس، ۴ : ۲۳۵ ذیل.

قدیم ادب میں لفظ کنیسه اکثر اوقات ''گرجا معبد نصارٰی'' کے معنوں میں آیا ہے ۔ ۸۸ھ / ۷۰۷ء کے لکھے ہوے دو مخطوطہ اوراق بردی (Papyrus) میں ایک خانقاہ کے گرجا کا ذکر ملتا ہے جسے مصر میں (سنیة) کنیسة ماریة کہتے تھے (*Papyri Schott-Reinhardt*، طبع I. Becker، ہائیڈل برگ ۱۹۰۶ء، ص ۱۱۱، س ۴، ص ۱۱۲، س ۴) ۔ جریر اپنی ایک ہجویہ نظم میں بنو تغلب کے کنائس کا ذکر کرتا ہے (المبرد، الکامل، طبع Wright، ص ۴۸۰، ۵)۔ حضرت عمر رض یا ان کے سپہ سالار مختلف شہروں کے باشندوں سے عام طور پر جو معاهدے کرتے تھے ان میں کنائس کے بارے میں شرائط کا صراحةً ذکر کیا جاتا تھا (البلاذری : فتوح البلدان، طبع de Goeje، ص ۱۲۳؛ الیعقوبی : تاریخ، طبع Houtsma ۲ : ۱۶۷؛ الطبری، ۱ : ۲۴۰۵، ۸ بعد، ۲۵۸۸، ۷؛ Eutychius، طبع Cheikho، ۲ : ۱۷، ۷؛ ابن عساکر : التاریخ الکبیر، دمشق ۱۳۲۹، ۱ : ۱۷۸؛ دیکھیے نیز ابو یوسف کتاب الخراج، بولاق ۱۳۰۲، ص ۸۰) ۔ حدیث میں آیا ہے کہ کس طرح حضرت امّ حبیبه رض اور حضرت امّ سلمه رض نے رسول اللہ صلّی اللہ علیه وآلہ و سلّم سے حبشه کے ایک گرجا کا ذکر کیا تھا جو بتوں سے مزین تھا (البخاری، کتاب الصلوٰة، باب ۴۸، ۵۴؛ جنائز، باب ۷۰؛ مناقب الانصار، باب ۳۷).

مزید براں کنیسة کا لفظ بعض اسما کی طرف مضاف ہو کر بھی استعمال ہوا ہے مثلاً کنیسة حنس (اسکندریه میں، یاقوت : کتاب مذکور، ۱ : ۲۵۷ س ۳۲)؛ کنیسة الغراب (جنوبی پرتگال میں، راس سینٹ ونسنٹ پر، یاقوت : کتاب مذکور، ۱ : ۳۷۷ س ۱۹؛ الادریسی: نزهة المشتاق، جزئی طبع از Dozy و de Goeje، متن ص ۱۸۰ : ترجمه ص ۲۱۸)؛ کنسیة الکف (مصر میں، اس میں حضرت عیسٰیؑ کے ہاتھ کا نشان موجود ہے، یاقوت، ۲ : ۲۲، س ۲ بعد)؛ کنیسة یوحنا و کنیسة مریم[۴] (دمشق میں، یاقوت، ۲ : ۵۹۱ س ۱۰، ۵۹۶ س ۲۳)؛ کنیسة القمامة (ریت کے تودے والا گرجا، یہ کنیسة القیامة کی جان بوجھ کر بگاڑی ہوئی شکل ہے، بیت المقدس میں المسعودی: مروج الذهب، پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء، ۱ : ۱۱۱، ۳ : ۴۰۵؛ دیکھیے نیز G. Le Strange : *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۱۴۱ بعد، ۲۰۲ بعد)؛ کنیسة الباعوتة (الباعوثة؟؛ الحیرة میں، الهمدانی : صفة جزیرة العرب، طبع D. H. Müller، ص ۱۲۷ س ۲)؛ [کنیسة السوداء، مصیصه کے قریب، دیکھیے القاموس، بذیل کنس] وغیرہ.

المقریزی معبد یہود اور نصارٰی دونوں کے

لیے لفظ کنیسة استعمال کرتا ہے (الخطط، (بولاق ۱۲۷۰ھ، ۲ : ۴۶۴ ببعد، ۵۱۰ ببعد).

اندلس اور مغرب میں یہ لفظ کنیسیة Kanisiya کی صورت میں مستعمل تھا (غالبًا iglesia کے زیر اثر)؛ مراکش اور تونس میں یہ آج تک مروج ہے (vgl. Dozy : *Supplement*، ۲ : ۴۹۳).

موجودہ زبان میں کنیسہ سے مراد گرجا ہے، اور کنیس سے معبد یہود (البستانی، محل مذکور)۔ مصری لغة کے لیے دیکھیے S. Spiro Bey: *Arabic-English Dictionary*، بار دوم، قاہرہ ۱۹۲۳ء، بذیل مادہ) .

الکنیسه یا الکنیسة السوداء شمالی شام کے سرحدی صوبے کا ایک شہر تھا جس میں ایک قلعه بھی تھا جو بالکل شکستہ اور ویران ہو چکا تھا۔ ہارون الرشید نے اسے دوبارہ درست کرایا (یاقوت ۴ : ۳۱۴؛ دیکھیے ۱ : ۹۲۷، س ۲۰، الاصطخری، .B.G.A، ۱ : ۶۳ س ۷، ۶۸، ۳)؛ vgl. le Strange : کتاب مذکور، ص ۷۷۴ ببعد)۔ المقدسی (.B.G.A، ۳، بار دوم : ۵۳ س ۹) نے ایک مقام کنیسة المجوس کا ذکر کیا ہے جو ارجان سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔ یمن میں بحیرۂ قلزم کے کنارے، زبید کے قریب ایک بندرگاہ کا نام بھی الکنیسة تھا (الفیروز آبادی، محل مذکور، تاج العروس، محل مذکور) ۔ تاج العروس کی رو سے مصر کے کئی مقامات کے ناموں میں کُنَیْسِیَه کا لفظ پایا جاتا ہے.

مسلمانوں نے گرجاؤں کے لیے جو قوانین منضبط کیے تھے، ان کے لیے دیکھیے مادۂ نصارٰی .

مآخذ: مذکورۂ بالا تصنیفات کے علاوہ دیکھیے S. Fränkel : *Die aramäischen Fremdwörter im Arabischen*، لائیڈن ۱۸۸۶ء، ص ۲۷۵.

(C. VAN ARENDONK)

کوئٹہ : (پشتو: کوَتّه Kawatta)؛ ضلع کوئٹہ [بلوچستان، (پاکستان)، رکّ بآں] کے ایک شہر اور تحصیل کا نام ۔ ضلع کوئٹہ میں تحصیل کوئٹہ، اور پشین اور چمن کی انتظامیہ سب ڈویژن شامل ہے ۔ اس کا کل رقبہ ۵۴۰۳ مربع میل اور آبادی (۱۹۵۱ء) ۲۰۹۲۲۱ ہے ۔ یہ ضلع ایک پہاڑی علاقہ ہے، جس کے شمال مغرب میں افغانستان، مشرق میں زھوب اور سبی کے اضلاع، جنوب میں درۂ بولان اور قلات ڈویژن کا علاقہ سوان، جنوب مغرب میں کوھستان چلتان اور شمال مشرق میں زرغوم کا میدان مرتفع ہے .

کوئٹے کی تحصیل خان آف قلات سے اجارہ داری پر لی گئی تھی ۔ اس کا رقبہ ۵۴۸ مربع میل ہے ۔ ۱۹۳۵ء میں کوئٹے کا شہر زلزلے سے تباہ ہو گیا تھا ۔ شہر کوئٹہ بشمول رقبہ چھاؤنی کی آبادی (۱۹۷۲ء) ۱۵۶۰۰۰ ہے ۔ بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی یہ ایک وادی ہے جس کی بلندی ۵۵۰۰ فٹ کے قریب ہے ۔ یہ ایک اہم فوجی مرکز بھی ہے ۔ ۱۹۰۷ء میں یہاں فوجی افسروں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک سٹاف کالج کھولا گیا، جہاں اب نہ صرف پاکستان بلکہ غیر ملکی فوجی افسروں کی تعلیم و تربیت بھی ہوتی ہے ۔ [قیام پاکستان کے بعد کوئٹے میں اعلی تعلیم کے لیے بہت سی سہولتیں حاصل ہو گئی ھیں ۔ مقامی ڈگری کالج نے ۱۹۷۰ء سے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لیا ہے ۔ بلوچی، بروھی اور پشتو زبان کے فروغ کے لیے بلوچی اکادمی، بروھی ادبی دیوان اور پشتو اکادمی مصروف عمل ھیں۔ اردو صحافت کو نمایاں مقام حاصل ہے ۔ کوئٹے نے صنعتی اعتبار سے بھی ترقی کی ہے ۔ یہاں سوتی تاگا اور اون بنانے کے کارخانے بھی ھیں ۔ صحت افزا مقام ہونے کے باعث یہاں گرمیوں میں بڑی چہل پہل رہتی ہے] ۔ یہاں پھلوں اور میووں کی بہت بڑی منڈی بھی ہے .

اٹھارھویں صدی کے نصف تک، جب

کوئٹہ بروھی بلوچیوں کے قبضے میں آیا ۔ کوئٹے کی تاریخ بھی غالباً وھی ھے جو قندھار کی ھے ۔ [قدیم تاریخ کے لیے رک بہ بلوچستان، قندھار]، پہلی افغان جنگ (۱۸۳۹ تا ۱۸۴۲ء) کے زمانے میں کوئٹے پر انگریزوں کا عارضی قبضہ رہا ۔ (دیکھیے W. Hough : *A Narrative of the march and operations of the army of the Indus in the expedition into Afghanistan*، ۱۸۴۰ء) اس مقام کی جنگی اھمیت سب سے پہلے جنرل جان جیکب نے تسلیم کی، جس نے ۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ کو ترغیب دی کہ اس فوجی مقام پر قلعہ گیر فوج متعین کی جائے (*Views and Opinions of General John Jacob*، طبع Pelly، ص ۳۴۰)، لیکن اس تجویز کو اس لیے مسترد کر دیا گیا کہ یہ مقام ہر طرف سے دشمن قبائل سے گھرا ہوا تھا اور اپنے اصلی مرکز سے منقطع تھا اور ایسے دور افتادہ مقام پر قلعہ گیر فوج کا رکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا ۔ دس سال بعد سر ھنری گرین، پولیٹیکل ایجنٹ اپر سندھ نے بالائی سندھ کی سرحدوں کو مستحکم کرنے کے منصوبے کے سلسلے میں یہ تجویز پیش کی کہ کوئٹے میں قلعہ گیر فوج رکھی جائے اور اس شہر کو کراچی سے بذریعۂ ریل ملا دیا جائے۔ ان لوگوں کی بدقسمتی سے، جو بلوچستان کے علاقے میں پیش قدمی کرنا چاھتے تھے، لارڈ لارنس اور اس کی کونسل نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی کیونکہ وہ سب کے سب عدم مداخلت کی حکمت عملی کے علمبردار تھے ۔ دس سال اسی طرح گزر گئے اور وائسرے کی کونسل میں ھاتھ پر ھاتھ دھرے رھنے والے ارکان کا اثر اور غلبہ کم ھو گیا ۔ ادھر خیوا [رک بہ خوارزم] کا علاقہ روسیوں نے فتح کر لیا تھا اور وہ اب ھندوستان میں داخل ھونے والے راستوں کے قریب تر آ رھے تھے ۔ اس سے پہلے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ شیر علی کی بے اعتنائی کی وجہ سے امیر افغانستان اور حکومت ھند کے درمیان جنگ کا خطرہ روز بروز بڑھ رہا تھا؛ چنانچہ ۱۸۷۶ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کوئٹے پر قبضہ کر لیا جائے ۔ ۱۸۶۳ء کے عہد نامے کی رو سے یہ بات طے پا چکی تھی کہ انگریزی فوج قلات کی حدود میں بھیجی جاسکتی ھے ۔ (ایچیسن، ۱۱ : ۲۱۲ تا ۲۱۳)؛ چنانچہ اس معاملے میں میجر (بعد میں سر رابرٹ) سنڈیمان کی کوششوں سے اس عہد نامے کی، مزید اضافے کے ساتھ، ۸ دسمبر ۱۸۷۶ء کو عہد نامۂ جیکب آباد (*Parl. Papers*، ۱۸۷۷ء، ۶۳، حدود ۱۸۰۸ء، ص ۳۱۳ تا ۳۱۶) کے نام سے تجدید ھوئی۔ وظیفے میں کچھ اضافہ کرا لینے کے بعد خان قلات نے اس بات کی اجازت دے دی کہ انگریزی فوجیں اس کے علاقے میں مقیم ھو جائیں اور قلات کے علاقے میں تار اور ریل کا سلسلہ قائم کر دیا جائے۔ اس کے بعد بلوچستان ایجنسی کا قیام عمل میں آیا ؛ اس لیے کہ ۲۱ فروری ۱۸۷۷ء کو سنڈیمان کو گورنر جنرل کا ایجنٹ مقرر کیا گیا اور اس کا صدر مقام کوئٹہ قرار پایا ۔ [نیز رک بہ بلوچستان] ۔ [۱۹۷۷ء تک تازہ ترین حالات کے لیے دیکھیے The Statesmans' Year Book، ۱۹۷۶ — ۱۹۷۷ء].

مآخذ : (۱) Administration Report of the Baluchistan Agency، (سالانہ شائع ھوتی تھی)؛ (۲) C. U. Aitchison : *Treaties, Engagements and Sanads*، ج ۱۱، ۱۹۰۹ء؛ (۳) D. Bray : *Ethnographical Survey of Baluchistan*، ۲ جلدیں ۱۹۱۳ء؛ (۴) C. C. Davies : *The problem of the N. W. Frontier*، ۱۹۳۲ء؛ (۵) *Frontier and overseas Expeditions from India*، ج ۳، ۱۹۱۰ء؛ (۶) R. Hughes-Buller : *Baluchistan District Gazetteer Series*، ج ۵، (*Quetta-Pishin District.*) ۱۹۰۷ء؛ (۷) *Parliamentary Papers, Quetta and*

Central Asia، ۱۸۷۸-۱۸۷۹ء، ج ۷۷، قلات ۱۸۷۷ء، ج ۶۳، حدود ۱۸۰۷-۱۸۰۸ء؛ (۸) T. H. Thornton : Life of Sir Robert Sandeman، ۱۸۹۵ء؛ [(۹) Ency. Britannica، بذیل مادّہ؛ (۱۰) Sqr.، The Statesman's Year Book، ۱۹۷۶-۱۹۷۷ء].

(C. Collin Davies [و ادارہ])

* **کوئل** : رَكَ بہ علیگڑھ.

* **کَوَار** : صحرائے اعظم میں نخلستانوں کا ایک مجموعہ (جنوب میں سب سے آخری نخلستان بِلْمَة ۱۸° - ۴۱′ عرض بلد شمالی اور ۱۳° طول بلد مشرقی کے درمیان ہے) جو تبستی کے بلند اور گٹھے ہوے سلسلۂ کوہ کے مغرب میں، فِزّان [رَكَ بہ] کے راستے طرابلس سے چاڈ [رَكَ بہ شاد] کے ارد گرد کے علاقے کو جانے والی تجارتی شاہراہ پر واقع ہے ۔ اس شاہراہ پر کوار فزان اور کانم کے تقریباً بیچوں بیچ واقع ہے؛ فزان سے ایک حَمَّادَة اور کانم سے ریت کے ٹیلوں کا ایک منطقہ جدا کرتا ہے ۔ یہ نخلستان پہاڑیوں کے ایک سلسلے کی بدولت ظہور میں آئے ہیں جو شمالاً، جنوباً چلا گیا ہے ۔ یہ پہاڑیاں اسے مشرقی سمت سے گھیرے ہوے ہیں اور شمال مشرق سے آنے والی خوفناک ہوا سے اسے محفوظ رکھتی ہیں ۔ ان نخلستانوں کو پہاڑ کی ایک وادی کہنا چاہیے جس کا طول شمالاً جنوباً ۵۰ میل ہے اور عرض کسی مقام پر بھی دو تین میل سے زیادہ نہیں ۔ پانی بہت ہی کم گہرائی پر نکل آتا ہے اور خاصی افراط کے ساتھ مگر عموماً کھاری ہوتا ہے ۔

کوار کی تاریخ تاریکی میں پوشیدہ ہے ۔ جس تجارتی شاہراہ پر یہ واقع ہے وہ زمانۂ قدیم میں پہلے ہی سے استعمال ہوتی تھی، اگرچہ اس کا کوئی صریح قطعی ثبوت موجود نہیں ہے ۔ بہرصورت شمالی افریقہ کی فتح کے وقت یہ مجموعۂ نخلستان موجود تھا ۔ اگر ہم ان عرب مؤرخوں کی روایات پر اعتماد کریں جو اس فتح کو اپنے بَطَل جلیل عُقْبَة بن نَافِع کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کی بابت کہا گیا ہے کہ اس نے کوار کے قلعے یکے بعد دیگرے فتح کر لیے تھے ۔ الادریسی نے بارھویں صدی عیسوی کے اندر ان علاقوں کی وساطت سے ہونے والی تجارت کی اہمیت کا کئی بار ذکر کیا ہے ۔

انیسویں صدی عیسوی میں کئی یورپین سیاح کوار پہنچے ۔ سب سے پہلے جنوری ۱۸۲۳ء میں Denham، Clapperton اور Oudney کی جماعت زائرین آئی؛ اس کے بعد Rohlfs, Barth, Vogel اور Nachtigal اور سب سے آخر میں Monteil ۔ گزشتہ صدی کے آخری سالوں میں کوار کی حالت کسی حد تک خراب ہو چکی تھی ۔ اس زمانے میں یہاں ایک شیخ (mai) کی برائے نام حکومت قائم تھی جسے وہاں کے ممتاز افراد نے منتخب کیا تھا ۔ در اصل ہر گاؤں میں اس کی اپنی ہی حکومت تھی ۔ صحرا میں تجارت کی عام کمی کے باعث کوار بری طرح متأثر ہو چکا تھا ۔ اس پر جب چاڈ کا علاقہ فرانسیسیوں کے قبضے میں آ گیا اور انھوں نے غلاموں کی تجارت کو روک دیا تو کوار کے کاروبار کا گویا دم ہی نکل گیا، کیونکہ اس کا سب سے بڑا بیوپار یہی تھا ۔ پھر جب سَنُوسی شیخ نے صحرائے اعظم میں ایک باقاعدہ ریاست قائم کرنے کا خواب دیکھا تو اس کے لیے بھی یہ مقام ناگزیر تھا ۔ ترکوں نے جنت اور تبستی کی طرح یہاں بھی اپنی حکومت تسلیم کرانے کی کوشش کی، لیکن جب جولائی ۱۹۰۶ء میں فرانسیسیوں نے چاڈ کے علاقے سے بڑھ کر کوار پر قبضہ کر لیا تو ان کوششوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اور نخلستانوں کے اس مجموعے کے باشندوں کو بھی اپنے فتنہ پرداز پڑوسیوں کے خلاف قانون مطالبۂ زر سے امن حاصل ہو گیا ۔

مآخذ : (۱) البکری : کتاب المسالک و الممالک،

طبع ڈی سلان، ص ۱۳؛ ترجمۂ ڈی سلان : الجزائر ۱۹۱۳ء، ص ۳۴؛ (۲) الادریسی : *Description de l'Afrique et de l'Espagne*، طبع و ترجمۂ ڈوزی و ڈخویہ، لائیڈن ۱۸۶۶ء، بمدد اشاریہ؛ (۳) Denham و Clapperton : *Narrative of Travels and Discoveries in Northern and Central Africa*، لنڈن ۱۸۲۶ء؛ (۴) Barth : *Travels and Discoveries in Northern and Central Africa*، لنڈن ۱۸۰۱ء، ۱ : ۴۰۳ : ۵ : ۴۲۳ تا ۴۳۰؛ (۵) G Nachtigal : *Sahârâ und Sûdân*، برلن ۱۸۷۹ء، ۳ : اشاریہ ص ۵۲۴؛ (۶) Monteil : *De St. Louis à Tripoli per le lac Tchad*، پیرس، تاریخ ندارد؛ (۷) Gadel : *Notes sur Bilma et les oasis environnementes*، در *Revue Coloniale*، جون ۱۹۰۷ء؛ (۸) H. Carbou : *La région du Tchad et du Ouadai*، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۹) E. F. Gautier : *Le Sahara*، پیرس ۱۹۲۳ء؛ (۱۰) Prévost و Mayet : *L'oasis du Kaouar et la Prehistoire du Sahara Oriental*، در *La Nature* ۱۴ مارچ ۱۹۲۵ء ص ۱۶۱ تا ۱۶۸؛ (۱۱) کنوری زبان کے بارے میں رک بہ P. Noel : *Petit Manuel Francais-Kanouri*، پیرس ۱۹۲۳ء (بلمۃ میں مرتب ھوئی).

(HENRI BASSET)

* **کوپری** : (ترکی؛ بمعنی پل؛ مشرقی ترکی میں : کوپریک) جو ''وزیر کوپری'' یعنی ''وزیر کے پل'' کے نام سے بھی مشہور ھے (وزیر کا اشارہ البانوی نسل کے مشہور وزیر اعظم کوپریلی محمد پاشا کی طرف ھے، نیز رک بہ کوپریلی)، صوبۂ سیواس میں سنجاق اماسیہ کی ایک قضا کا صدر مقام ھے ۔ یہ دریائے استاولز Astawoluz کے کنارے آباد ھے جو قزل ایرماق کا ایک معاون ھے اور اس میں دائیں جانب سے آ کر ملتا ھے۔ کوپری کی آبادی ۸۶۰۰ اور بیشتر مسلمانوں پر مشتمل ھے ۔ اس میں ۱۷ مسجدیں ھیں، دو کتب خانے ھیں جن میں سے ایک کتب خانہ کوپری زادہ فاضل پاشا نے قائم کر کے وقف کر دیا تھا، ۲ مدارس ھیں اور متعدد عمارات جنھیں کوپریلی محمد پاشا نے رفاہ عام کے لیے بنایا تھا، ۲ کاروان سرائیں ھیں اور ۵ حمام اور ۳ درویشوں کی خانقاھیں ھیں ۔ مکانوں کی چھتوں پر سرخ رنگ کے ٹائل لگے ھوے ھیں اور دود کشوں کے اوپر دھات کی ویسی ھی ٹوپیاں چڑھی ھوئی ھیں جیسی ترکی مساجد کے میناروں پر نظر آتی ھیں ۔ یہاں الحاج یوسف آغا کا ایک محل اور قلعے میں اسی کی ایک مسجد بھی ھے علاوہ ازیں قادریّہ اور خلوتیہ درویشوں کی خانقاھیں، ۱۱ کاروان سرائیں، دو عمارتیں (غربا کے لیے لنگر خانے) اور ۸ مدرسے ھیں۔ احمد پاشا کے حمام بہترین ھیں ۔ بزستان (بزاز ھٹا) یوسف آغا نے بنوایا تھا ۔ اس قصبے کی بندرگاھیں بفرہ اور سنوپ ھیں جو بحیرہ اسود پر واقع ھیں۔ اسے ایک سڑک صمسون سے ملاتی ھے جو گاڑیوں کی آمد و رفت کے لیے مناسب ھے .

کوپری صوبہ ایک دریا کا نام ھے، جو شان طاغ سے نکلتا ھے اور وزیر کوپری کے قریب قزل ایرماق [رک بآن] میں گر جاتا ھے ۔ قدیم دریا یوری‌مدون (Eurymedon) بھی جو خلیج عدالیہ میں گر کر بحیرۂ روم سے مل جاتا ھے، اسی نام سے مشہور ھے ۔ اس کے دہانے پر ایک چھوٹا سا قصبہ کوپری بازار آباد ھے .

مآخذ : (۱) علی جواد : جغرافیا لغاتی، ص ۶۸۲؛ (۲) سامی بے : قاموس الأعلام، ۵ : ۳۹۰۵؛ (۳) اولیا افندی : *Travels*، ترجمہ از v. Hammer، ۲ : ۲۱۴.

(CL. HUART)

کوپری حصار : (پل کا قلعہ)؛ ایشیائے کوچک میں صوبۂ خداوند گار کا ایک گاؤں جو ینی شہر کے قریب چوروک صو کے کنارے آباد ھے

یہاں ایک بوزنطی قلعه تھا جسے ۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء میں سلطان عثمان نے بیله جک [رک به بلجک] کی فتح کے بعد (جہاں اس نے اپنے چچا دُندار کو تیر مار کر ہلاک کر دیا تھا) تسخیر کیا تھا.

مآخذ : (۱) سامی بے : قاموس الأعلام، ۵ : ۳۹۰۶؛ (۲) J. de Hammer : *Hist. de l'empire ottoman*، فرانسیسی ترجمه از Fr, de Hellert، ۱ : ۸۷ تا ۸۹؛ (۳) Cl. Huart : *Konia, la ville des derviches tourneurs*، پیرس ۱۸۹۷ء، ص ۱۸ (پل کا منظر).

(Cl. Huart)

* **کوپریلی** : یا کو پرولو (Köprülü) : سلاطین آل عثمان کے وزرا کا ایک گھرانا؛ اس خاندان میں جو غالبًا البانوی نسل کا تھا، سلطنت عثمانیه کے انحطاط کے ابتدائی دور کے ممتاز ترین سیاستدان پیدا ہوے۔ Sieur de la Croix نے اپنی کتاب *Mémoires, Contenans diverses relations très curieuses de l'Empire Othoman* (پیرس ۱۶۸۴ء) میں لکھا ہے که اس خاندان کا بانی ایک یونانی یا عرب پادری کا بیٹا تھا اور اس بیان کو لیوپولڈ فون رانکه L. von Ranke نے بھی قبول کیا ہے۔ اغلب یه ہے که خاندان مذکور کا بانی کوئی البانوی تھا جو سولھویں صدی عیسوی میں اپنا آبائی وطن ترک کر کے آناطولی کے شہر کوپری مرزیفون میں چلا آیا تھا۔ کوپری، جسے اب عمومًا وزیر کوپری کہتے ہیں، اس زمانے کی ایک اہم آبادی تھی جس کی ایک بڑی طویل تاریخ تھی (دیکھیے حاجی خلیفه : جہان نما، ص ۶۲۰، نیچے سے س ۴ و ص ۶۲۸، س ۹ جہاں اس کا پرانا نام کدہ غرہ (قرہ کدہ در J. v. Hummer : *GOR*، ۳ : ۶ درج ہے۔ نیز اولیا : سیاحت نامه، ۲ : ۳۹۹) اور اس کی اہمیت کہیں بعد کے زمانے میں کم ہونا شروع ہوئی تھی (دیکھیے M. Kinneir : *Journey Through Asia Minor*، لنڈن ۱۸۱۸ء، ص ۲۹۸)۔ اس کے قریب طاش کوپری واقع ہے جس کی نسبت سے علما کا ایک مشہور و معروف خاندان طاش کوپری زادہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مقام کو آخرالذکر کوپری سے متمیز کرنے کے لیے آگے چل کر اس کا نام تبدیل کر کے کوپریلی کے اعزاز میں وزیر کوپری رکھ دیا گیا۔ یہیں اس البانوی تارک وطن کا پوتا محمد کوپریلی پیدا ہوا۔ اسی نے سب سے پہلے اپنے خاندان کا نام روشن کر کے دور دور تک مشہور کیا۔ اس خاندان نے جن اہم شخصیتوں کو پیدا کیا ہے، ان کی تعداد کچھ کم نہیں، ایک شخص بہجتی حسین (ساکن رزغراد Razgrad، م ۱۰۹۴ھ / ۱۶۸۳ء بمقام بلغراد) نے تاریخ سلالۂ کوپریلی کے نام سے اس خاندان کی ایک تاریخ مرتب کی تھی جس کا اصل قلمی نسخه استانبول کے کتب خانے کوپریلی (شماره ۲۱۲) میں موجود ہے۔ اس میں کوپریلی گھرانے کے حسب نسب کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ اس خاندان کے اہم ترین افراد حسب ذیل ہیں .

۱ - کوپریلی محمد پاشا، صدر اعظم ترکی یا زیادہ صحیح الفاظ میں ناظم سلطنت۔ کہتے ہیں که وہ ۹۹۱ھ/ ۱۵۸۳ء میں پیدا ہوا اور یکم نومبر ۱۶۶۱ء کو ادرنه میں فوت ہوا۔ اوائل عمر میں وہ ایک معمولی برتن دھونے والا ملازم تھا۔ پھر قصر شاہی میں طباخین خاصه کے زمرے میں داخل ہوا۔ خسرو پاشا صدر اعظم کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد وہ اس کا کیسه بردار (خزینه دار) ہوا پھر ترقی کر کے قرہ مصطفٰی پاشا [رک بآں] مرزیفونی کی ملازمت کے دوران میں اس نے میر آخور کا رتبه پایا۔ اس کے بعد وہ پیہم ترقی کے زینے پر چڑھتا گیا اور اعلٰی سے اعلٰی تر سرکاری عہدوں پر فائز ہوتا رہا، اسے دو طوغ والے پاشا کی حیثیت دے کر شام، قدس اور طرابلس کا والی مقرر کیا گیا اور ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء

میں وہ مرتبۂ وزارت پا کر قبّہ نشین ہوا، تاہم اس کے بعد وہ کوستندیل کی معمولی سی سنجاق پر ماسور ہوا جس سے بر ھم ہو کر وہ اپنے آبائی شہر میں گوشہ نشین ہوگیا۔ وہ کچھ عرصے تک باغی واردار علی پاشا کے ھاتھوں، جس کا اس نے میدان جنگ میں مقابلہ کیا تھا، اسیر رہا، اس قید سے اسے صدر اعظم اِپشیر پاشا نے رہائی دلائی اور اسے دوبارہ طرابلس کا والی مقرر کرا دیا۔ محل ماموریت میں پہنچ کر ابھی وہ اپنے فرائض منصبی سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ اس سے یہ عہدہ لے لیا گیا اور وہ ایک بار پھر کوپری میں عزلت گزین ہوگیا۔ پھر بویونی اگری (لیڑھی گردن والا") محمد پاشا صدر اعظم اسے اپنے ساتھ استانبول لے گیا، جہاں وہ جلد ھی اس کا خطرناک ترین حریف ثابت ہوا۔ ۳ ذوالحجّہ ۱۰۶۶ھ/ ۲۲ ستمبر ۱۶۵۶ء تک اسے مہر سلطانی مل چکی تھی۔ اس نے بڑی مستعدی سے مذھبی جنونیوں کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا (قب J. v. Hammer: *GOR*، ۶ : ۵ ببعد)، گزشتہ بغاوتوں کے سرغنوں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا اور یوں عوامی زندگی کو آلائش سے پاک کیا۔ حکومت کے بگڑے ھوے امور مالیہ کی اصلاح کے سلسلے میں وہ بہت ایماندار اور سخت گیر ثابت ہوا، چنانچہ اس وجہ سے اس کے متعدد دشمن پیدا ہو گئے۔ اس نے ملت عثمانی کی ھمت اور قومی حیثیت میں۔ جو پست ہو چکی تھی، ایک نئی جان ڈالی اور اھل وینس کے خلاف معرکۂ دار و گیر برپا کر کے دولت عثمانیہ کی قوت و سطوت کو بحال کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء میں اس نے امیر البحر L. Mocenigo کے خلاف در دانیال میں جنگ کی۔ اس لڑائی میں ترکی بیڑا تباہ ہو گیا اگرچہ وینس کے امیر البحر کا جہاز پکڑا گیا۔ محمد پاشا نے بوزجہ آطہ یا تینیدوس Tenedos اور لیمنوس (لمنی، Lamanos) فتح کر کے اس نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ اگلے سال یعنی ۱۰۶۸ھ/ ۱۶۵۷ء میں ٹرانسلوینیا (Transylvania، اردل) بھی فتح ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ایران کی طرف توجہ کی اور شہر ینووہ Yanuwa پر قبضہ کر لیا، پھر اس نے ان بغاوتوں کو کچلا جن سے شمالی شام اور مصر میں خطرہ پیدا ہو رہا تھا، در دانیال پر نئے قلعے تعمیر کرائے (دیکھیے مادۂ قلعۂ سلطانیہ) اور سرحدوں کے لیے بالعموم استحکامات تجویز کیے (دیکھیے فان ھامر: *GOR*، ۶ : ۸۶ ببعد)۔ اس نے سرکاری خزانہ معمور کرنے میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ ۷ ربیع الاول ۱۰۷۲ھ/ ۳۱ اکتوبر ۱۶۶۱ء کو وفات سے قبل اس نے بستر مرگ پر سلطان سے سفارش کی کہ اس کے بعد اس کے ۲۶ سالہ بیٹے احمد کو صدر اعظم بنایا جائے۔ اسے دارالحدیث کے عقب میں چنبرلی طاش ("ستون سوختہ") کے قریب دفن کیا گیا۔

محمد پاشا کا ایک برادر نسبتی قبلہ لی مصطفٰی پاشا (م ۱۰۷۴ھ/ ۱۶۶۳ء، دیکھیے سجلّ عثمانی، ۴ : ۳۹۷) تھا جس کے بیٹے قبلہ لی زادہ علی بک کو ۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۲ء میں موت کی سزا ملی (دیکھیے راشد: تاریخ، ۱ : ۲۶۱ وفان ھامر: *GOR*، ۷ : ۹۴)۔ ان کی نسل سے مؤرخ ادبیات کوپریلی زادہ محمد فواد بک ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوا (علی امیری کے سلسلۂ نسب کے لیے دیکھیے عثمانلی تاریخ و ادبیات مجموعہ سی، ۶ : ۹۷ و ۸ : ۱۱۶ ببعد؛ M. Hartmann : *Dichter der neuen Turkei*، برلن ۱۹۱۹ء، ص ۹۱ ببعد)۔

مآخذ: کتب تاریخ از (۱) نعیما؛ (۲) فان ھامر؛ (۳) Zinkeisen، اور خصوصاً: (۴) Sir Paul Rycaut و (۵) Richard knolles، نیز (۶) Andrea Valiero : *Historia della guerra di Candia*، وینس ۱۶۷۹ء،

ص ۵۲۷، (جس میں G. Brusoni کی کتاب Historia dell' ultima guerra trà Veneziani e Turchi، طبع وینس ۱۶۷۳ء، ۱ : ۲۹۲ کی طرح یہ بیان کیا گیا ہے کہ محمد کوپریلی ایک renegato Perugino di casa Ferretti تھا)؛ (۷) تاریخی ناول Histoire des Grands Vizirs Mahomet Coprogli Pascha, et Ahmet Coprogli Pascha celle des trois derniers Grands Seigneurs، پیرس ۱۶۷۶ء، بالکل فرضی ہے (یہ افسانہ جسے بار بار دہرایا گیا ہے پہلی بار ہمیں اس کتاب میں ملتا ہے کہ محمد کوپریلی نسلاً فرانسیسی تھا)؛ (۸) M. Brosch : Gesetiehten aus dem Leben dreier Grosswesire گوتھا ۱۸۹۹ء؛ (۹) L. v. Ranke : Die Osmanen und die spanische Monarchie، بار سوم لائپزگ ۱۸۷۷ء، ص ۴۰، ببعد (محمد پاشا کی شخصیت کے متعلق نہایت عمدہ تلخیص)؛ (۱۰) عثمان زادہ احمد تائب : حدیقة الوزراء، ص ۹۴ ببعد؛ (۱۱) سجلّ عثمانی، ۴ : ۱۷۳ ببعد؛ (۱۲) احمد رفیق کوپریلیلر، استانبول ۱۳۳۱ھ، حصہ ۱ : ۱۴۳ ص۔

۲ - کوپریلی زادہ فاضل احمد پاشا، سابق الذکر کا بیٹا، ترکی کا صدر اعظم، وزیر۔ کوپری میں ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء میں پیدا ہوا اور ادرنہ کے نزدیک ۲۶ شعبان ۱۰۸۷ھ / ۳۰ اکتوبر ۱۶۷۶ء کو فوت ہوا، کہا جاتا ہے کہ محمد لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اس لیے اس کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا عالم فاضل بن جائے، چنانچہ ننھے احمد کو بچپن ہی میں مشہور مؤرخ قرہ چلبی عبدالعزیز [رکّ باں] کے سپرد کر دیا گیا جو آگے چل کر شیخ الاسلام بنا۔ احمد اس کا ملازم ہو گیا اور صرف سولہ برس کی عمر میں اس نے محمد فاتح کی مسجد میں مدرس کا منصب حاصل کر لیا، یہ عہدہ دس سال تک اس کے پاس رہا اور پھر اس نے حکومت کے شعبۂ انتظامیہ میں ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے باپ کی وفات سے تین سال پیشتر اسے پہلے ارض روم کا والی بنا کر بھیجا گیا اور اگلے سال اسی عہدے پر دمشق میں متعین کیا گیا۔ یہاں سے اس نے دروزیوں کے خلاف کامیاب مہم شروع کی (دیکھیے J. von Hammer : GOR، ۶ : ۹۳) لیکن اس کے باپ کا مرض استسقا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا، اس لیے بالآخر سلطان نے اسے دارالخلافہ میں واپس بلا لیا اور شرف باریابی دینے کے بعد اسے قائمقام کے منصب پر فائز کر دیا۔ ۷ ربیع الاول ۱۰۷۲ھ / ۳۰ اکتوبر ۱۶۶۱ء کو اس کے باپ کے انتقال کے فوراً بعد مہر سلطانی اس کے سپرد کر دی گئی۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۲۶ سال تھی۔ اس نے پندرہ سال تک وزارت عظمٰی کے فرائض بڑی قابلیت اور مستعدی سے سرانجام دیے۔ وہ تعلیم اور تدبیر کے اعتبار سے اپنے باپ سے گوے سبقت لے گیا۔ اس نے اپنی وزارت کے دوران میں متعدد مہمات میں حصہ لیا۔ اس کی پہلی مہم ہنگری کے خلاف تھی جس میں اس نے نیوہوسل Neuhausel (اُجوار ujuar ۲۹ ستمبر ۱۶۶۳ء) کو فتح کیا، کئی قلعوں کا محاصرہ کیا اور زرینوار Zerénuar کو سطح زمین کے برابر کر دیا، لیکن بالآخر اس نے کونٹ مونٹی ککولی Count Monte Cuccoli کے ہاتھوں یکم اگست ۱۶۶۴ء کو سینٹ گوٹھارڈ St. Gotthard کے مقام پر جو دریاے راب Raab کے کنارے واقع ہے، شکست فاش کھائی۔ اس واقعے سے کچھ ہی عرصے پیشتر اس نے اپنے دو نسبتی بھائیوں کو سلطنت کے دو اہم ترین عہدوں پر فائز کرا دیا تھا، یعنی قپلان مصطفٰی پاشا کو امیر البحر [قپودان پاشا، رکّ باں] اور قرہ مصطفٰی پاشا [رکّ باں] کو شاہی عسکر میں قائم مقام بنا دیا گیا تھا (J. von Hammer : GOR، ۶ : ۲۲۷)۔ قپودان پاشا سید

محمد پاشا کو اس کا ایک تیسرا برادر نسبتی بیان کیا جاتا ہے - (دیکھیے *G O R* : J. von Hammer، ۶: ۳۲۳) لیکن اس بات کی صحت کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا.

۱۰۸۳/۱۶۷۲ھ کے موسم گرما میں اس نے پولینڈ کی طرف توجه کی اور کئی روز کے محاصرے کے بعد ۳ جمادی الاولی ۱۰۸۳ھ/ ۲۷ اگست ۱۶۷۲ء کو کمینیک پوڈولسک Kamiencic Podolsk پر قبضہ کر لیا جس پر شاعر نابی نے ایک نظم لکھی اس کے برعکس صدر اعظم کو اگلی یعنی چوٹن (پولش چوسم، ترکی چوتین) کی لڑائی میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور نومبر ۱۶۷۳ء رجب / ۱۰۸۴ھ میں یہ تلعه هاتھ سے نکل گیا اور احمد پاشا کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی - اس نے سینٹ گوٹھارڈ کی ہزیمت کی تلافی وسوار کے تسلی بخش صلحنامے سے کر لی (۱۰ اگست ۱۶۶۴ء) مگر اسے اگلے سال ایک نئی سہم کی تیاری کرنی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے چوٹن Chotin پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور لادیزن Ladyzin کو بھی فتح کر لیا، فاضل احمد پاشا جب شاهی لشکر گاہ کی طرف جا رہا تھا تو دوران سفر میں الهارہ یوم کی بیماری کے بعد ۲۲ شعبان ۱۰۸۷ھ/ ۳۰ اکتوبر ۱۶۷۶ء کو ارکینہ کے پل کے قریب (بور غاس اور ادرنہ کے درمیان) قرہ بیر کے کھیتوں سے ملحق ایک مکان میں انتقال کر گیا - اس کی میت استانبول لائی گئی اور اسے اس کے باپ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا، اس کی جوانمرگی کی وجه شراب‌نوشی کی کثرت اور استسقا بیان کی جاتی ہے - یہ بیماری بھی اسے زیادہ شراب پینے کے باعث لاحق ہوئی تھی (دیکھیے Pôtis *État générale de l' Empire Othoman* : de la Croix، پیرس ۱۶۹۵ء، ۲ : ۸۱) کندیہ Kindia کے محاصرے کے زمانے هی میں اسے مرگی کے دورے پڑنے لگے تھے اور وہ شکل و صورت سے ایک ایسا تھکا ماندہ بوڑھا نظر آنے لگا تھا جو زندگی سے بیزار ہو چکا ہو- اس کے بعد وہ ہر قسم کی بری عادتوں میں پڑ گیا ، اس نے اپنے گرد عورتیں جمع کر لیں (کہا جاتا ہے کہ اس کی ۸۰ بیویاں اور کنیزیں تھیں) اور پولش برانڈی کا جو ڈاکٹروں نے اس کے لیے تجویز کر رکھی تھی، بے حد مشتاق ہو گیا.

اس میں شک نہیں کہ احمد پاشا فہم و ذکا کے اعتبار سے اپنے باپ پر سبقت رکھتا تھا اور علوم و فنون سے بھی اس سے زیادہ شغف رکھتا تھا، یہاں تک کہ فوجی مہمات کے دوران میں بھی ان کی سرپرستی جاری رکھتا تھا - اس نے استانبول میں ایک بڑا جامع کتب خانہ قائم کیا تھا - (دیکھیے *Tableau* : Mouradgea d' Ohsson، ۲ : ۴۸۸) جو اب تک موجود ہے (فہرست دفتر، ص ۲۴۸ ببعد، عدد ۴، تاریخ ندارد) اور اس کی شہرت کی ایک زندہ یادگار ہے - اس کے مہر بردار حسن نے جواهر الاخبار کے نام سے اس کی سوانحعمری لکھی ہے- اس کی مہمات کے قصیدے کئی بار لکھے گئے (دیکھیے *Die Geschichtsschreiber der Osmanen* : F. Babinger، لائپزگ ۱۹۲۷ء، ص ۲۱۱ ببعد) تمام هم عصر یورپی مصنفین اس ممتاز سیاستدان کی اصابت رائے اور اس کی ذہانت اور گہری بصیرت کی تعریف و توصیف میں ایک دوسرے کے همنوا ہیں .

مآخذ : مذکور بالا مؤرخین اور (۱) M. Brosch : *Geschichten aus dem Leben dreier Grosswesire*، گوتھا ۱۸۹۹ء؛ (۲) L.v. Ranke : *Die Osmanen*، وغیرہ لائپزگ، ۱۸۷۷ء، ص ۵۷ ببعد؛ (۳) عثمان زادہ احمد تائب : حدیقة الوزراء، ص ۲۰۶ ببعد؛ (۴) ثریا، سجل عثمانی، ۱ : ۲۲۲؛ (۵) احمد رفیق : کوپریلیلری، ج ۲: استانبول ۱۳۳۱ھ، ص ۱۰۶؛ (۶) Brozzi-Berchet : *Relazione degli stati Europei*، حصہ ۲ (جس میں

bailo Nani کے relazione واقعات بالخصوص اہم ہیں)؛ (۷) J. Covell : *Early Voyages in the Levant*، لنڈن ۱۸۹۳ء (Covel نے اسے ایک مختصر سا داڑھی والا بڑی آنکھوں اور گول چہرے والا آدمی لکھا ہے، دیکھیے ۱۹۵، ۲۰۶، ۲۶۷)؛ (۸) J. Chardin : *Voyages*، ۱ : ۸۱ ببعد، ۸۷ (اس کے بیان کے مطابق وہ لنگڑاتا تھا)، دیکھیے Covel، ص ۲۰۶)؛ (۹) Sir Paul Rycaut : *Present state of the Ottoman Empire*، ص ۱۰۵ ببعد؛ (۱۰) C. Magni : *Quanto di più curioso, e vago ha potuto raccorre*، وغیرہ Parma ۱۶۷۹ء، ص ۵۶۰، ۳۷۹ ببعد؛ (۱۱) Antanio Geropoldi : *Bilancia historico-politica dell' Impero Ottomano*، وینس ۱۶۸۶ء، ص ۱۳۹ ببعد (اس کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کرنا چاہیے).

۳ - کوپریلی زادہ مصطفٰی پاشا، کوپریلی محمد پاشا کا بیٹا اور کوپریلی احمد پاشا کا بھائی تھا - وہ محمد پاشا کا دوسرا بیٹا تھا - ۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء، میں پیدا ہوا تھا - جمادی الآخرۃ ۱۰۹۱ھ / جولائی ۱۶۸۰ء میں اسے وزیر قبہ مقرر کیا گیا پھر وہ یکے بعد دیگرے بندر، سلستریا، بابا طاغ، در دانیال اور کیوس Chios وغیرہ کا مستحفظ (محافظ قلعہ) بنا - ذوالحجہ ۱۰۹۸ھ اکتوبر ۱۶۸۷ء میں اسے صدر اعظم کا نائب (قائمقام) بنایا گیا - بعد ازآں در دانیال اور کندیہ Candia میں ایک بار پھر مستحفظ کے فرائض سرانجام دینے کے بعد بالآخر ۲ محرم ۱۱۰۱ھ / ۷ نومبر ۱۶۸۶ء کو اسے مہر سلطنت تفویض ہوئی - اس وقت اس کی عمر ۵۲ برس تھی اور اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شریعتِ اسلام کا سختی سے پابند ہے. اور عیسائیوں کا مخالف ہے - اس کی طبیعت امور جنگ کی نسبت علم و فضل کی طرف زیادہ مائل تھی - ایک اطالوی معاصر لکھتا ہے کہ ''یہ صدر اعظم ایک زاہد مفتی ہے جو شراب کا دشمن اور عیسائیوں کا مخالف ہے، پابند شریعت دیانتدار، پرہیزگار اور دبلا پتلا آدمی ہے، ایک ولی اور تقیہ کی حیثیت سے لوگ اس کی عزت کرتے ہیں - وہ ایک سیاست دان ہے مگر اسے امور جنگ کا مطلق کوئی تجربہ نہیں'' (J. v. Hammer : *GOR*، ۶ : ۵۴۷) - اس سے کوپریلی زادہ مصطفٰی پاشا کی سیرت اور صفات کا بڑا واضح تصور ہمارے ذہن میں قائم ہو جاتا ہے - اس کا مقصد تھا کہ صدر اعظم کو جہاں تک ہو سکے خود مختار بنا دیا جائے، چنانچہ اس نے وزراے قبّہ کی تعداد میں تخفیف کی اور جن عہدیداروں کو وہ پسند نہیں کرتا تھا انہیں برطرف کر دیا - اس نے حکومت کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے دانشمندانہ قدم اٹھائے، مثلاً علانیہ طور پر تمباکو کا محصول مقرر کیا اور سکّے کی قیمت میں باقاعدگی پیدا کی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملکی ضروریات پر اس کی نظر کتنی گہری اور صاف تھی - اس نے اپنی اور قصر شاہی کی تمام فالتو چاندی پگھلوا کر ٹکسال میں بھجوا دی اور خود جست کے برتنوں پر اکتفا کی - ۱۶۹۰ء میں اس نے سربیا پر لشکر کشی کی، بلغراد دوبارہ فتح کیا (۸ اکتوبر ۱۶۹۰ء) اسزیک (Esseqq ہنگروی : Eszék) پر قبضہ کیا اور ۱۹ ستمبر ۱۶۹۱ء کو بلغراد کے قریب سلنکامن Salankamen کے سامنے لڑتا ہوا مارا گیا - اس کی لاش دستیاب نہ ہو سکی - اپنے بھائی کی طرح وہ بھی فاضل کے لقب سے مشہور تھا - وہ ایک ممتاز سیاستدان تھا - اس نے اپنے زمانے کی ضروریات کو بڑی اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اسی لیے اس نے کئی نئے نئے اقدامات کیے جن کی صحت پر زمانے نے مہر تصدیق ثبت کر دی.

مآخذ: جن مؤرخین کا ذکر ہو چکا ہے، ان کے علاوہ دیکھیے (۱) عثمان زادہ احمد تائب حدیقۃ الوزراء، ص ۱۱۶ ببعد؛ (۲) سجلّ عثمانی، ۴ : ۴۰۶ ببعد.

۴ - کوپریلی زادہ حسین پاشا، کوپریلی محمد پاشا کا بھتیجا سلطنت عثمانیہ کا صدر اعظم بالعموم عمر جہ زادہ یعنی ''بھتیجا'' کے نام سے مشہور ہے، حسن آغا کا بیٹا تھا جو کوپریلی محمد پاشا کا بھائی تھا - اسے اپنے چچا زاد بھائیوں کی صحبت میں سرکاری ملازمت کی تربیت حاصل کرنے کا موقع مل گیا - وہ امیر البحر (قپودان پاشا) اور حاکم کیوس کے عہدوں پر فائز رہا - ۱۱۰۸ھ / ۱۶۹۶ء کے موسم گرما میں اسے بلغراد کا دفاع سونپا گیا، سلطان مصطفٰی دوم اس کے دانشمندانہ مشوروں سے بہت متأثر ہوا اور اسے بلغراد کی حکومت سے ترقی دے کر یکم ربیع الاول ۱۱۰۸ھ / ۱۷ ستمبر ۱۶۹۷ء کو صدر اعظم بنا دیا (دیکھیے J. v. Hammer : *GOR*، ۶ : ۶۴۱ ببعد) - اس نے ایک معتدل اور امن پسندانہ حکمت عملی کے مؤید ہونے کا ثبوت دیا، اور پہلا اہم قدم یہ اٹھایا کہ ۲۶ جنوری ۱۶۹۹ء کو آسٹریا، روس، پولینڈ اور وینس کے ساتھ صلحنامۂ کارلووٹز Carlowitz طے کر لیا - اس کی رو سے آسٹریا کو قریب قریب وہ سارا علاقہ مل گیا جو ۱۵۲۶ء کے بعد سے اس کے ہاتھ سے نکل کر باب عالی کے قبضے میں جا چکا تھا - اس طرح یہ صلحنامہ آگے چل کر آسٹریا اور ترکی کے درمیان ہونے والے معاهدوں کے لیے ایک اساس ثابت ہوا - حسین پاشا علما اور شعرا کا سرپرست بھی تھا اور انھیں اکثر بڑی فراخدلی سے انعام و اکرام سے نوازا تھا - چچا زاد بھائی کی طرح اس نے بھی خزانے کی حالت سدھارنے، بری اور بحری فوجوں کو بہتر بنانے، اور خصوصاً جزیہ کم یا معاف کر کے عیسائیوں کی مشکلات کم کرنے کی کوشش کی (دیکھیے J.v. Hammer : *GOR*، ۷ : ۴۴) - اس نے مذہبی کاموں نیز رفاہ عامّہ کے لیے متعدد عمارتیں بنوائیں، مثلاً استانبول، ادرنہ گردسکہ Gradisca اور لپانتو Lapanto میں مسجدیں تعمیر کرائیں، سکول اور کالج کھولے، آبرسانی کے انتظامات کیے اور ہر قسم کے کنویں کھدوائے (قب J. v. Hummer : *GOR*، ۷ : ۴ ببعد) کہا جاتا ہے کہ جب چچا زاد بھائی کسی ذاتی بغض کی بنا پر قبلہ لی زادہ علی بیگ کے ہاتھوں مارا گیا (دیکھیے راشد : تاریخ ۲ : ۲۶۱، *Geschichte des Osmanischen Reisches* : Kantemir ہامبورگ ۱۷۴۵ء، ص ۶۱۸ ببعد میں جو کہانی درج ہے وہ بالکل غلط اور بے سروپا ہے) تو اس سانحے کا اس پر بڑا گہرا اثر پڑا - بالآخر ایک لاعلاج مرض کے باعث وہ استعفا پیش کرنے پر مجبور ہو گیا جو ۱۲ ربیع الآخر ۱۱۱۴ھ/۵ ستمبر ۱۷۰۲ء کو منظور کرلیا گیا - اس نے ادرنہ کے قریب بوچوق تپہ کی بلندیوں پر اپنی جاگیر میں گوشہ نشینی اختیار کرلی اور اس کے چند ہی روز بعد ۲۹ ربیع الآخر ۱۱۱۴ھ سلولوری کے قریب اپنی جاگیر والے مکان میں فوت ہوگیا - اسے استانبول کے بازار زین فروشاں میں ایک خاص مقبرے کے اندر دفن کیا گیا.

مآخذ : مؤرخین مذکورۂ بالا نیز (۱) عثمان زادہ احمد تائب : حدیقة الوزراء، ص ۱۲۴ ببعد؛ (۲) رامز پاشا زادہ محمد عزت : خریطۂ قپودانان دریا، استانبول ۱۲۸۰ھ، ص ۵۷ ببعد؛ (۳) سجلّ عثمانی، ۲ : ۲۰۲.

۵ - کوپریلی زادہ نعمان پاشا، کوپریلی زادہ مصطفٰی پاشا کا بیٹا اور سلطنت عثمانیہ کا صدر اعظم - اس کی ملازمت کا آغاز مختلف مقامات (ارزوم، آناطولی، نیگرو پونتہ، Negroponte کندیہ Candia کی حکومت سے ہوا - پھر وہ در دانیال کی فوجوں کا سپہ سالار مقرر ہوا - اس کے بعد ایک بار پھر اس نے کندیہ، نیگرو پونتہ بوسنہ اور بلغراد کی حکومت کے فرائض سر انجام دیے - اس کی شادی سلطان مصطفٰی دوم کی بیٹی عائشہ سلطان سے ہوئی (جون ۱۷۰۱ء، دیکھیے J. v. Hammer : *GOR*، ۷ : ۵۴) اور

شادی کے عین بعد اسے صدر اعظم بنا دیا گیا ۔ ہر شخص کو یہ امید تھی کہ وہ سلطنت کا نجات دھندہ ثابت ھوگا، لیکن اس کے عہد وزارت میں وہ امیدیں جو اس کی ذات سے وابستہ تھیں درست ثابت نہ ہو سکیں ۔ اس نے شاہ سویڈن کی حمایت میں روس کے خلاف جنگ کرنے کی مخالفت کی، چنانچہ وہ نظروں سے گر گیا اور ۱۸ اگست ۱۷۱۰ء کو اسے والی بنا کر واپس نیگرو پونتہ بھیج دیا گیا ۔ بعد ازاں اس نے یکے بعد دیگرے کندیہ، بوسنہ اور بلغراد، قبرص، ایچ ایلی، مغنشہ [رک بان] کی ولایت کی اور آخر ایک مصروف زندگی بسر کرنے کے بعد وہ بخار میں مبتلا ہو کر ۷ ربیع الاول ۱۱۳۱ھ/ ۲۱ جنوری ۱۷۱۹ء کو اقریطش (Crete) میں فوت ہو گیا ۔ اس کا بیٹا حافظ احمد پاشا نشانجی باشی تھا جو بعد ازاں کئی بار ولایت کے عہدے پر فائز ہوا (دیکھیے J. v. Hammer : *GOR*، ۸: ۱۱۵، ۱۵۳، ۱۸۵، ۲۶۴) ۔ حافظ احمد پاشا آخری کوپریلی زادہ ہے جس کا ذکر ہمیں ترکی کی تاریخ میں کسی سرکاری عہدیدار کی حیثیت سے ملتا ہے ۔ اس کے اور اس کی اولاد کے بارے میں دیکھیے سِجِلِّ عثمانی، ۱ : ۲۶۲ ببعد.

مآخذ: (۱) دلاورزادہ عمر: ذیل بر حدیقة الوزرا، ص ۱۲ ببعد؛ (۲) سِجِلِّ عثمانی، ۴ : ۵۸۶ ببعد .

حسب ذیل شجرے سے کوپریلی نام کے مختلف افراد کے باھمی رشتے کو سمجھنے میں مدد ملے گی:

خاندان کوپریلی کا شجرۂ نسب .

(FRANZ BABINGER)

* کُوپک : ایران اور ماوراء النّہر کا ایک سکّہ، کُوپکی دیناروں کا ذکر شرف نامۂ (سوانح تیمور) میں ملتا ہے، بابر (*Memoirs*، *GMS*، ص ۱۸۰) نے بھی ۳۰۰ تومان کُوپکی کا ذکر کیا ہے (نیز رك بہ ترجمہ از P. de Courteille، ۱ : ۳۲۰) Quatremère نے P. de La Civise سے جو اقتباس نقل کیا ہے، (*NE.*، ۱۴ : ۴۷، حاشیہ) اس میں وہ لکھتا ہے کہ کوپکی دینار طلائی سکّے ہیں جن کی مالیت فرانسیسی سکے کے حساب سے ۰۱۰۷ بنتی ہے، نیز دیکھیے Tavernier : *Hobson-Jobson* و Murray : *English Dict.*، بذیل مادۂ Copeck - اگرچہ ماوراء النّہری اور ایرانی کوپک ایک طلائی سکّہ تھا، لیکن ہو سکتا ہے کہ اشتقاق کے اعتبار سے یہ لفظ اور روسی کوپک ایک ہی چیز ہو، جس طرح کہ دینار اور دناریس denarius پہلے سونے کے سکے تھے، مگر بعد ازآں انحطاط پذیر ہو کر چاندی کے سکے رہ گئے.

(H. Beveridge)

* کُوتاهیه (قدیم Cotyacum) : ایشیاے کوچک کا ایک قصبہ، صوبۂ خداوندگار میں ایک سنجاق کا صدر مقام، دریاے پُرسُق کے کنارے جو سقاریہ میں گرتا ہے، واقع ہے - اس کی بلندی سطح سمندر سے ۳ ہزار فٹ ہے - آبادی ۲۲۲۶۶ ہے، جس میں ۴۰۰۰ راسخ العقیدہ یونانی اور ۳۰۰۰ ارمنی ہیں - یہاں ۴۲ مسجدیں، ۲۱ مدرسے، ۲ کتب خانے، ۱۹ درویشوں کی خانقاہیں، ۴ گرجے، ۹ کاروان سرائیں، ۱۱ حمام اور ۱۲ مٹی کے برتنوں کی دکانیں ہیں - یہ بغداد ریلوے کا سٹیشن بھی ہے - چودھویں صدی عیسوی میں یہ گرمیان اوغلی کا دارالحکومت تھا، اس زمانے کی مساجد کھنڈر بن چکی ہیں، یہاں کی دوسری قابل ذکر عمارتیں یہ ہیں : مجیدی مدرسہ (۷۰۴ھ/۱۳۰۴ع)، قرشون لی جامع (۷۷۷ھ/۱۳۷۵ - ۱۳۷۶ع)، ایک اور مسجد (۷۸۳ھ/۱۳۸۱ع)، یعقوب چلبی جامع (۸۳۷ھ/ ۱۴۳۳ - ۱۴۳۴ع)، اُولُو جامع عظیم، جس کی تعمیر گرمیان اوغلی سے منسوب کی جاتی ہے، لیکن وہ بایزید اول سے قبل کی نہیں ہے، اس میں بلندی پر بنا ہوا ایک قدیم قلعہ بھی ہے، لیکن یہ اب تباہ و برباد ہو چکا ہے - Texier نے جس سنگ مرمر کے شیر اور بوزنطی سنگین تابوت کا ذکر کیا ہے، وہ اب باقی نہیں، یہاں آق صُو، سلطان باغہ، کِپ گِیر، سلطان بایزید باغچہ سی نامی سیرگاہیں ہیں، مضافات میں گرم پانی کے چشمے ہیں - کسی زمانے میں یہ آرائشی پھولوں سے منقش روغنی مٹی کے برتن (جنھیں Rhodian Pottery کہتے ہیں) بنانے کی صنعت کا ایک اہم مرکز تھا - اس صنعت کے احیا کی کوشش کی گئی ہے، لیکن موجودہ برتن خوبصورتی میں قدیم نمونوں کے برابر نہیں.

یہ قصبہ گرمیان اوغلی کی بیٹی کو جہیز میں ملا تھا جس کی شادی بایزید اول سے ہوئی تھی - جنگ انقرہ کے بعد اس پر تیمور کا قبضہ ہو گیا (۱۴۰۲ع) - فاتح نے جب Ephesus پر پیش قدمی کی تو اپنے بیٹے شاہرخ کو والی بنا کر یہاں چھوڑ گیا (H. A. Gibbons : *The Foundation of the Ottoman empire*، آکسفرڈ ۱۹۱۶ع، ص ۱۵۶، ۲۰۸).

مآخذ : (۱) حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۶۳۲؛ (۲) علی جواد : جغرافیہ لغاتی، ص ۶۸۸؛ (۳) سامی بے : قاموس الاعلام، ۵ : ۳۹۱۰؛ (۴) Texier : *Asie Mineure*، پیرس ۱۸۸۲ع، ص ۳۹۴؛ (۵) J. de Hammer : *Hist. de l'empire ottoman*، ۱ : ۲۴۶؛ (۶) Cuinet : *Turquie d' Asie*، ص ۲۰۳؛ (۷) Cl. Huart : *Konia la ville des derviches tourneurs*، پیرس ۱۸۹۷ع، ص ۴۵ ببعد (قلعے کی تصویر).

(Cl. Huart)

* **کُوت العمارة** : العراق میں ایک مقام جو دریاے دجلہ کے بائیں کنارے، بغداد اور عمارة کے درمیان، بغداد کے جنوب مشرق میں بخط مستقیم ۱۰۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ کوت در اصل ہندوستانی لفظ کوٹ بمعنی قلعہ ہے جو العراق کے کئی اور مقامات کے ناموں کا جزو ہے، مثلاً کوت المُعمّر، اکثر اوقات کوت العمارة کو محض کوت بھی کہا جاتا ہے ۔ کوت شط الحی کے دہانے کے مقابل واقع ہے جسے الغرّاف بھی کہتے ہیں ۔ یہ ایک قدیمی نہر ہے جو دجلے کو فرات سے ملاتی ہے اور اس کا کئی مقامات پر فرات سے اتصال ہوتا ہے، مثلاً ناصریة اور سوق الشیوخ پر ۔ کوت کے شمال میں جو میدان ہیں، وہاں بنو لام کے جلیل القدر قبیلے کی ایک شاخ بنو ربیعة آباد ہے ۔ کوت کوئی پرانا شہر نہیں، اس میں اور المذار میں جس کا ذکر یاقوت نے کیا ہے، مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے (یاقوت، ۴ : ۵۰۷؛ دیکھیے Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۳۸ اور H. H. Schaeder در *Islam*، ۱۴ : ۱۷) ۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اور ۱۸۶۰ء تک یہ ایک چھوٹا سا معمولی گاؤں تھا جس کے چاروں طرف مٹی کی دیواریں بنی ہوئی تھیں (Keppel در ۱۸۲۴ء، مطابق Ritter؛ Petermann : *Reisen im Orient*، لائپزگ ۱۸۶۰ء، ۲ : ۱۰۰) ۔ لیکن جب میسرز لینچ Messers Lynch نے بغداد اور بصرے کے درمیان دخانی جہاز چلانے کی اجازت حاصل کر لی تو اس کے بعد کوت دریا کے کنارے پر ایک اہم مستقر بن گیا جس کے بعد اس کی آبادی میں معتدبہ اضافہ ہوا ۔ ترکی حکومت کے آخری دنوں (۱۸۶۱ء) میں کوت اپنی ایک ہم نام قضا کا صدر مقام تھا جو سنجاق بغداد میں شامل تھی (آج بھی عراق کی نئی حکومت میں اسے یہی حیثیت حاصل ہے) ۔ ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ اس کی آبادی کا اندازہ ۴۱۱۵ تھا (Cuinet) اور یہ تقریباً تمام تر شیعہ تھی (کوئی ۱۰۰ سنّی ہوں گے اور ۱۰۰ یہودی) ۔ اس نام کی قضا شمالی جانب کوہ لُرستان تک پھیلی ہوئی ہے ۔ پہاڑوں کے دامن میں جو میدان ہے، اسے دریاے کَلّال سیراب کرتا ہے ۔ اس میں متعدد گاؤں آباد ہیں، جن پر ترکوں کے قبضے پر ایرانی حکام کو اعتراض تھا ۔ ۱۸۶۱ء کے بعد قضا کی آبادی میں بھی اسی طرح اضافہ ہوا جو ۱۸۹۰ء کے قریب ۳۰ ہزار تک پہنچ گئی ۔ یہ آبادی (موضع کوت کے سوا) سب کی سب سنی تھی۔

کوت کا محل وقوع عسکری نقطۂ نظر سے بڑا اہم تھا، اسی وجہ سے جنگ عظیم کے دوران میں اس نے بڑا نمایاں حصہ لیا ۔ ترکوں کے خلاف پیش قدمی کرتے ہوے جنرل ٹاؤنشنڈ Townshend نے ستمبر ۱۹۱۵ء میں کوت پر قبضہ کیا ۔ کچھ ہی دن بعد اسے بغداد پر لشکر کشی کرنے کے لیے فوج کا ایک مقام بنا دیا گیا، لیکن یہ منصوبہ انگریزوں کی پسپائی پر ختم ہوا اور اس کے بعد ترکوں نے فوراً کوت کا محاصرہ کر لیا ۔ محاصرہ شروع ہونے کی تاریخ ۸ دسمبر ۱۹۱۵ء ہے ۔ کوت کو اس محاصرے سے نجات دلانے کی تمام کوششیں ناکام رہیں، چنانچہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۶ء کو اس پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا اور وہ اسے خوب مستحکم کر کے وہاں جم گئے، یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں یہ دوبارہ انگریزوں نے فتح کر لیا اور ۱۹۲۰ء میں اسے عراق کی نئی سلطنت میں شامل کر دیا گیا۔

مآخذ : (۱) C. Ritter : *Erdkunde*، ۱۱ : ۹۳۵ ببعد؛ (۲) V. Cuinet : *La Turquie d' Asie*، پیرس ۱۸۹۴ء، ۳ : ۱۳۹ تا ۱۴۲؛ (۳) von Oppenheim : *Vom Mittelmeer zum Persisehen Golf*، برلن ۱۸۹۹ء، ص ۲۸۸ ببعد؛ (۴) H. Longrigg : *Four*

Centuries of Modern Iraq، آوکسفرڈ ۱۹۲۵ء، ص ۲۹۳، ۳۱۳.

(J. H. Kramers)

* **کوتل** : (ارمنی لفظ Kothal سے، بمعنی ''دیوار، طرف، Fraenkel : *Aram. Fremdwörter*، ص ۲۲۳)، فارسی میں اس کا مطلب ہے پہاڑی درہ، دو چوٹیوں کے درمیان کی تنگ جگہ ـ یہ لفظ جو کسی فارسی لغت میں نہیں ملتا، مشرقی ترکی سے مستعار لیا گیا ہے اور وہاں ارمنی زبان سے آیا تھا ـ یہ لفظ بابر نامہ میں آیا ہے (طبع Ilminsky، ص ۹۹ س ۲۳، ۱۰۰ س ۱، ۱۷۲ س ۱۸، ۱۶۶، ۲۲)؛ نیز دیکھیے (۱) Radlof : *Opit*، ج ۲، عمود ۱۲۷۷؛ (۲) Pavet de Courtielle : *Dict. turk-oriental*، ص ۴۶۳ .

(Cl. Huart)

⊗ **کوٹ مٹھن** : ضلع ڈیرہ غازی خان کا یہ قصبہ مٹھن کوٹ کے نام سے بھی شہرت رکھتا ہے ـ پنجند اور دریاے سندھ کے مقام اتصال سے چند میل نیچے کی طرف دریاے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع ہے ـ ڈیرہ غازی خان سے ۸۰ میل کے فاصلے پر ہے اور پختہ سڑک سے ملا ہوا ہے ـ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۴۳۸۲ تھی جبکہ ۱۸۹۱ء میں ۳۶۲۴ تھی ـ بازار چوڑا ہے اور شمالاً جنوباً واقع ہے جس میں دو رویہ درخت ہیں، اس لیے عمدہ منظر پیش کرتا ہے ـ بازار کے دونوں طرف متوازی گلیاں ہیں جنھیں اسی قسم کی گلیاں عموداً کاٹتی ہیں ـ شہر سے باہر آم کے باغات ہیں ـ عین وسط میں غلہ منڈی ہے ـ یہاں سے گڑ اور نیل باہر بھیجا جاتا ہے ـ طغیانی سے بچانے کے لیے شہر کے چاروں طرف بند باندھا گیا ہے ـ یہاں ڈاک بنگلہ، تھانہ، سراے، ہسپتال، سکول اور میونسپل کمیٹی موجود ہیں.

کوٹ مٹھن ایک متبرک مقام کی حیثیت رکھتا ہے ـ اس میں قاضی محمد عاقل رک بآں کا خوبصورت مقبرہ ہے ـ قاضی صاحب چشتی بزرگ ہوے ہیں ـ ان کی اولاد میں سے خواجہ غلام فرید (م ۱۹۰۲ء) بھی یہیں دفن ہوے جن کی سرائیکی زبان میں درد بھری کافیاں مشہور ہیں ـ اس خاندان کے دیگر بزرگ بھی یہاں مدفون ہیں ـ نوابان بہاولپور اور اضلاع رحیم یار خان، ملتان، مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے معزز گھرانے ان تمام بزرگوں کے مرید تھے ـ بنا برین لوگ ہزاروں کی تعداد میں ان کے عرس میں شرکت کرتے ہیں ـ مناقب فریدی کے حوالے سے تاریخ مشائخ چشت میں درج ہے کہ قاضی محمد عاقل کے والد مخدوم شریف جب باراوائی میں آ کر آباد ہوے تو وہاں کا رئیس مٹھن خان بلوچ ان کا مرید ہو گیا ـ جہاں کوٹ مٹھن آباد ہے وہاں سے مخدوم صاحب کا گزر ہوا تو پر فضا مقام دیکھ کر انھوں نے مٹھن خان کو فرمایا کہ اس جگہ ایک شہر آباد کیا جائے جو اللہ والوں کا مسکن ہو، چنانچہ اس طرح کوٹ مٹھن وجود میں آیا اور خان کی درخواست پر مخدوم صاحب نے اسے اپنا مستقر بنایا ـ حضرت مخدوم کی موجودگی کے باعث دور دور سے علما و مشائخ وہاں جمع ہو گئے ـ ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء میں طغیانی کے باعث پرانا شہر دریا برد ہو گیا اور چند میل کے فاصلے پر ہٹ کر پھر آباد ہوا اور تمام بزرگوں کے تابوت بھی نکال کر موجودہ قبرستان میں دفن کیے گئے .

مآخذ : (۱) *Gazetteer of the Dera Ghazi Khan District*، لاہور ۱۸۹۸ء، ص ۱۹۰؛ (۲) *Bahawalpur State Gazetteer*، لاہور ۱۹۰۸ء، ص ۱۸۰؛ (۳) *Dera Ghazi Khan Census Report (1961)*، مطبوعۂ لاہور، ص ۷، ۲۲؛ (۴) خلیق احمد نظامی : تاریخ مشائخ چشت، دہلی ۱۹۵۳ء، ص ۵۷۸، ۵۷۹ [عبدالغنی، رکن ادارہ، نے لکھا].

(ادارہ)

⊗ اَلْکَوْثَر: بمعنی خیر کثیر، جو اللہ تعالٰی نے رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو عطا فرمائی (المفردات، ۴۳۹) - اس خیر کثیر سے مراد قرآن، حکمت، نبوت، دینِ حق اور ہدایت ہے جو سعادت دارین کا باعث ہے (تفسیر القاسمی، ۱۷ : ۶۲۷۶؛ تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۵۳) - بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد جنت کی ایک نہر ہے جس سے بہت سی نہریں نکلتی ہیں (المفردات : ۴۳۹) - حضرت انسؓ سے بھی روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا : هو نـهـرٌ فی الجنّة'' (صحیح الترمذی، ۱۲ : ۲۰۸) - ابن جریر نے ابو بشر سے روایت کی ہے، انھوں نے بیان کیا : ''میں نے سعید بن جبیر سے کوثر کے بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے جواب میں فرمایا : هوالخیر الکثیر الّذی أتاه اللہ ایّاہ'' (وہ خیر کثیر ہے جو اللہ نے خاص حضورؐ ہی کو عطا فرمائی ہے) تو میں نے سعید سے کہا کہ ہم سنتے تھے کہ وہ جنت میں ایک نہر ہے تو انھوں نے فرمایا : ''ھو من الخیر الّذی اعطاہ اللہ ایّاہ'' (وہ بھی اس خیر میں سے ہے جو اللہ نے خاص آپؐ کو عطا فرمائی'' (تفسیر القاسمی، ۱۷ : ۶۲۷۷) .

قرآن حکیم کی ایک سورة کا نام ہے جو صرف تین آیات پر مشتمل ہے اور پہلی آیت : اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کے لفظ الکوثر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے - ترتیب تلاوت کے لحاظ سے اس کا عدد ۱۰۸ ہے - یہ سورة الماعون [رکّ باں] کے بعد اور سورة الکافرون [رکّ باں] سے قبل مندرج ہے، مگر نزول وحی کے لحاظ سے یہ پندرھویں سورة ہے - اور سورة العٰدیٰت [رکّ باں] کے بعد مکے میں نازل ہوئی (تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۵۱) - حضرت حسن بصریؒ، عکرمہؓ، مجاہدؒ اور قتادہؓ اس کو مدنی قرار دیتے ہیں امام السیوطی نے الاتقان میں اسی قول کو صحیح ٹھیرایا ہے (الاتقان، ۱ : ۱۰)- ابن کثیر نے بھی اسے مدنی قرار دیا ہے ''وھی مدنیّة وقیل مکّیّة (تفسیر القرآن العظیم، ۴ : ۵۵۶) - غالبًا اس کی وجہ وہ روایت ہے جسے محدثین نے حضرت انسؓ بن مالک سے نقل کیا ہے کہ : ''حضورؐ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے - اتنے میں آپ پر کچھ غنودگی سی طاری ہو گئی پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا اور فرمایا : ''ابھی ابھی مجھ پر ایک سورة نازل ہوئی ہے'' - پھر بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ کر آپؐ نے سورة الکوثر کو ختم کیا اس کے بعد آپؐ نے پوچھا : ''ھل تدرون ما الکوثر؟'' (کیا تم جانتے ہو کوثر کیا ہے؟) - لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں، تو آپ نے فرمایا : ''ھُوَنھرٌ اَعْطَانِیْهِ ربی عزّ و جلّ فی الجنّة علیہ خیر کثیر . . .'' (وہ ایک نہر ہے جو میرے رب کریم نے مجھے جنت میں عطا کی ہے جہاں خیر کثیر ہے) (ابن کثیر : تفسیر القرآن العظیم، ۴ : ۵۵۶) - چونکہ حضرت انسؓ مدینے کے مقامی باشندے (انصاری) ہیں اس لیے ان کا یہ کہنا کہ یہ سورة ہماری موجودگی میں نازل ہوئی اس کے مدنی ہونے پردال ہے، لیکن اگر سورة کے مضمون نیز دوسری روایات کو [جو بسلسلۂ شان نزول نقل کی جاتی ہیں] پیش نظر رکھا جائے تو پورے وثوق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ سورة مکۂ مکرمہ میں نازل ہوئی (تفصیل کے لیے دیکھیے : تفہیم القرآن، ۶ : ۴۸۸ ببعد).

گزشتہ سورة سے اس کا ربط یہ ہے کہ اس میں دین حق کی تکذیب کرنے والوں کے چار خصائل کا ذکر کیا گیا ہے : بخل، نماز سے غفلت، ریاکاری اور معمولی ضرورت کی چیزیں لوگوں کو دینے سے گریز کرنا - سورة الکوثر میں، اس کے مقابلے میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے چار محاسن

جمیله کا ذکر کیا گیا ہے: ''الخیر الکثیر، و الحرص علی الصلاۃ و دوامہا و الاخلاص فیہا و التصدق علی الفقراء'' (یعنی خیر کثیر، نماز کے لیے رغبت اس میں مداومت اور اخلاص اور فقرا کے لیے سخاوت) (دیکھیے : تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۵۱) - امام رازی نے مدلّل طور پر اس امر کی صراحت کی ہے کہ سورۃ والضحٰی [رکّ بآں] سے سورۃ الماعون [رکّ بآں]، تک کے مضامین رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی مدح اور آپ کے شرف و منزلت کے ذکر پر مشتمل ہیں اور سورۃ الکوثر ان سب کا تتمہ ہے (التفسیر الکبیر، ۳۲ : ۱۱۹) - امام رازی نے اس سورۃ کو سب کا نچوڑ اور جامع قرار دیا ہے : ''فکانت صغیرۃ فی الصورۃ کبیرۃ فی المعنی'' (یعنی یہ سورۃ الفاظ میں چھوٹی، لیکن معانی کے اعتبار سے بہت بڑی ہے) (کتاب مذکور، ۳۲ : ۱۲۸) .

اس سورۃ کے مضمون اور اس کی جامعیّت کا صحیح اندازہ اس کے تاریخی پس منظر سے ہوتا ہے - مکّۂ مکرمہ میں رسول اکرمؐ قریش کی اذیتوں اور ایذا رسانی کو کمال صبر سے برداشت کرتے ہوے تبلیغ اسلام کا فرض منصبی ادا کر رہے تھے - پوری قوم دشمنی پر تلی ہوئی تھی آپؐ اور آپؐ کے رفقا کے لیے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی تھیں - ابتلا کے اس نازک دور میں آپؐ اپنے مٹھی بھر رفقا کے ساتھ، ان تمام مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود، دین حق کی تبلیغ کے لیے سرگرم عمل تھے پہلے آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت قاسم کا انتقال ہوا پھر چھوٹے صاحبزادے حضرت عبداللہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، دشمنوں کو مزید زبانِ طعن دراز کرنے کا موقع مل گیا - ابو لہب نے مشرکین کے مجمع کے سامنے یوں خوشی کا اظہار کیا : ''بترَ محمدٌ اللّیلۃَ'' یعنی آج رات (العیاذ باللہ) محمد کی جڑ کٹ گئی (تفسیر القاسمی، ۱۷ : ۶۲۲۸) شمر بن عطیه کا قول ہے کہ یہ الفاظ عقبۃ بن ابی معیط نے کہے تھے - ابن اسحٰق نے یزید بن رومان کے حوالے سے العاص بن وائل کا نام لیا ہے کہ وہ جب کبھی حضور اکرمؐ کا ذکر کرتا تو اس قسم کے نازیبا الفاظ استعمال کرتا، ایسے نازک اور پُرآشوب موقع پر رحمت حق نے آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی ڈھارس بندھائی اور اس سورۃ میں آپؐ کو نہ صرف خیر کثیر اور فتح و نصرت کی نوید سنائی گئی بلکہ آپ کے دشمنوں کو آپ کی مخالفت سے باز نہ آنے کی صورت میں مکمل تباہی اور استیصال کی وعید بھی سنائی گئی تاکہ آپؐ پوری دلجمعی اور مستعدی سے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف رہیں (دیکھیے، تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۵۲)، چنانچہ وحی ربّانی کا نزول ہوتا ہے : ''(اے نبیؐ) ہم نے تمھیں کوثر عطا کر دیا - پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو - بے شک تمھارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے :

الکوثر کثرت سے مبالغے کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں خیر اور بھلائیوں کی کثرت - اس میں نبوت، قرآن حکیم، علم و حکمت، دین حق اور سعادتِ دارین کی عظیم نعمتوں کے علاوہ حوض کوثر بھی شامل ہے جو قیامت کے روز میدان حشر میں آپ کو ملے گا، اور دوسرے وہ نہر کوثر بھی جو جنت میں آپؐ کو عطا فرمائی جائے گی (دیکھیے تفہیم القرآن، ۶ : ۴۹۳)، جس کے دونوں کنارے موتی کے خیمے ہیں - جس کی مٹی خالص مشک ہے (صحیح الترمذی، ۱۲ : ۲۵۸)، جس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا، دودھ سے زیادہ سفید اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے (الکشاف، ۴ : ۸۰۷)، جس کے کنارے دراز گردن والے پرندے بیٹھے ہوے ہیں جو نہ صرف خوبصورت بلکہ کھانے میں بھی بہت ہی لذیذ ہیں (دیکھیے ابن کثیر،

تفسیر القرآن، ۴ : ۵۵۸ ببعد) - ''ابتر'' دم کٹے جانور کو کہتے ھیں۔ دُم سے تشبیہ اس لیے دی گئی ھے کہ وہ پیچھے ھوتی ھے اور جانور کے لیے زینت ھوتی ھے، انہٗ یتبعہٗ و ھو زینۃٌ لہٗ، یہاں اس سے مراد یہ ھے کہ ''لا یبقی لہٗ ذکرہ و لایدوم اثرہٗ'' یعنی نہ آپ کے دشمن کا ذکر باقی رھے گا اور نہ اس کا کوئی نشان رھے گا - (تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۵۳) - تاریخ شاھد ھے کہ یہ پیشگوئی پوری ھوئی دشمنوں کی جڑ کٹ گئی - جہاں تک نبی اکرمؐ اور ان کے رفقا کا تعلق ھے ، اللہ تعالٰی نے انھیں عظیم رتبے عطا فرمائے اور ان کے ذکر کو بلند کیا - آپؐ کی شریعت باقی ھے اور ابدالآباد تک باقی رھے گی - آپؐ کا پیارا اور مبارک نام ھر ایک مسلمان کے دل و زبان پر ھے اور قیامت تک فضاے آسمانی میں عروج و اقبال کے ساتھ گونجتا رھے گا (دیکھیے ابن کثیر : تفسیر القرآن) .

مآخذ : (۱) الراغب الاصفہانی : المفردات فی غریب القرآن، مصر، بلا تاریخ؛ (۲) الزمخشری : الکشاف، لبنان ۱۹۷۴ء؛ (۳) اسمٰعیل بن کثیر : تفسیر القرآن العظیم، لاھور ۱۹۷۳ء؛ (۴) احمد مصطفٰی المراغی : تفسیر المراغی، مصر ۱۹۴۶ء؛ (۵) القاسمی : تفسیر القاسمی، مصر ۱۹۶۰ء؛ (۶) الفخرالرازی : التفسیر الکبیر، مصر، بلا تاریخ؛ (۷) صحیح الترمذی، مصر ۱۹۳۴ء؛ (۸) ابو الاعلٰی مودودی : تفہیم القرآن، لاھور ۱۹۷۵ء؛ (۹) السیوطی : الاتقان، مصر بلا تاریخ .

(بشیر احمد صدیقی)

کُوثٰی : عراق کا ایک بہت ھی قدیم شہر یہ ان نہروں میں سے جو دجلے اور فرات کو ملاتی ھیں ایک کے کنارے پر واقع ھے، اس شہر اور اس نہر کا ذکر مسماری (Cuneiform) کتبوں میں اکثر ملتا ھے. (دیکھیے حوالے در Messner : *Babylonien und Assyrien*، ۱۹۲۰-۱۹۲۵ء بمدد اشاریہ، بذیل مادۂ Kuta یا Kutû، نیز نقشہ از Schwenzner، جلد اول میں)۔ کہا جاتا ھے کہ یہ وھی شہر ھے جس کا ذکر بائبل، کتاب سلاطین، حصۂ دوم، ۱۷ : ۲۴، میں آتا ھے، جہاں سے آنے والے ان لوگوں کا ایک حصہ ھیں جنھیں شاہ اشوریہ (Assyria) نے سماریہ (Semaria) میں وھاں کے یہودیوں کو جلا وطن کر کے بسایا تھا - اس نہر کی گزرگاہ، کم سے کم اس کے مغربی حصے کی، وھی ھے جو آج کل حَبل ابراھیم کی ھے؛ جدید ترین نقشوں میں (مثلاً *Karte von Mesopotamien* [صرف سرکاری استعمال کے لیے عارضی ایڈیشن] مرتب کردۂ جرمن جنرل سٹاف محکمۂ نقشجات بہ تاریخ دسمبر ۱۹۱۷ء، پیمانہ ۱ : ۴۰۰۰۰۰، ورق ۵ ڈی) حبل ابراھیم شط النّول میں ختم ھوتی ھے۔ عرب جغرافیہ نویس اس کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اسے براہ راست دجلے میں جا گراتے ھیں (دیکھیے G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، نقشہ ۲) .

مآخذ : جو حوالے مقالے کے متن میں آ گئے ھیں ان کے علاوہ دیکھیے (۱) ابن سراپین، در *J.R.A.S.*، ۱۸۹۵ء، ص ۷۵ : (۲) ابن حوقل، در *B.G.A.*، ۲ : ۱۶۸؛ (۳) المقدسی، در *B.G.A.*، ۳ : ۲۶، ۱۲۱ ببعد؛ (۴) ابن خرداذبہ، در *B.G.A.*، ۶ : ۷، ۹، ۱۲۵، ۱۸۵، ۲۳۶ ببعد؛ (۵) ابن رستہ، در *B.G.A.*، ۷ : ۱۸۲، ۱۸۲؛ (۶) یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۳۱۷ ببعد؛ (۷) وھی مصنف : مشترک، طبع Wüstenfeld، ۲ : ۳۷۷؛ (۸) البکری : معجم، طبع Wüstenfeld، ص ۴۸۵؛ (۹) Streck : *Die alte Landschaft Babylonien*، ۱ : ۱۱، ۱۶، ۲۳؛ (۱۰) G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۶۸ ببعد؛ مسئلہ انہار پر دیکھیے (۱۱) Ritter : *Erdkunde*، ۱۱ : ۷۷۱؛ (۱۲) M. Hartmann، در وو۱. لائیڈن، بذیل مادۂ عراق؛ (۱۳) P. Sykes : *History of Persia*، ج ۱، ۱۹۲۱ء، کا نقشہ مشرقی تاریخ کے مختلف ادوار کے سمجھنے میں نہایت ھی کارآمد ھے .

(M. PLESSNER [و تلخیص از ادارہ])

* **کوچک بیرام** : رک به عیدالفطر و بیرام) .

* **کُوچُک قَینارجه** : (ترکی: گرم پانی کا چھوٹا چشمہ")، سلسٹریا (Silistria) سے ۴۰ میل جنوب میں بلغاریہ کا ایک قصبہ جو عہد نامۂ برلن (۱۳ جولائی ۱۸۷۸ء) سے پہلے سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا - اسی قصبے میں ۱۲ جمادی الاولی ۱۱۸۸ھ / ۲۱ جولائی ۱۷۷۴ء کو عبدالحمید اول سلطان ترکی اور کتھرائن (Catherine) دوم ملکۂ روس کے درمیان ایک صلح نامے پر دستخط ہوے تھے .

مآخذ : (۱) رسمی احمد افندی : خلاصة الأخبار، مترجمۂ Diez : *Wesentliche Betrachtungen*؛ (۲) واصف افندی: محاسن الآثار، ۲، ۱۸۳ و بعد؛ (۳) J. von Hammer : *Hist. de l'empire ottoman*، فرانسیسی ترجمہ ۱۶ : ۳۹۲ ببعد؛ (۴) Jouannin و von Gaver : *Turquie*، ص ۳۵۸ .

(Cl. Huart [و تلخیص از ادارہ])

* **کُوچک (میرزا) وصال** : انیسویں صدی کے ایرانی شاعر محمد شفیع کا لقب جو شیراز میں پیدا ہوا - وہ ایک اچھا خوشنویس اور موسیقار تھا جس نے ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء میں وفات پائی - اس کی تصنیفات یہ ہیں : متعدد منظومات (دیوان مطبوعۂ تہران ۱۲۷۵ھ)؛ بزم وصال جس میں وحشی کی فرہاد و شیریں کی تکمیل کی گئی ہے (مطبوعۂ تہران ۱۲۶۳ھ) اور الزمخشری کی اَطْواقُ الذَّھب ("طلائی طوق") کا فارسی ترجمہ اس کے بیٹوں وقار محمود حکیم (طبیب)، ابوالقاسم فرہنگ، داوری، یزدانی اور ہمت نے باپ کا کمال ورثے میں پایا .

مآخذ : (۱) رضا قلی خان: ریاض العارفین، ص ۳۴۷ تا ۳۵۰؛ (۲) مجمع الفصحاء، تہران ۱۲۹۵ھ، ۲ : ۵۲۸ تا ۵۴۸؛ (۳) E. G. Browne : *Hist. of Persian Literature in Modern Times*، کیمبرج ۱۹۲۴ء، ص ۳۱۶ و لوح ۹ (ص ۳۰۰ خود نوشت تحریر .

(Cl. Huart)

کُوچم خان : سائبیریا کا ایک تاتاری خان جس کے عہد میں روسیوں نے یہ ملک فتح کیا - صرف ابو الغازی (طبع Desmaisons، ص ۱۷۷) ہی وہ سند ہے جس سے ہمیں اس کے عہد اور چنگیز خان کے دیگر اخلاف کے ساتھ اس کی نسبی قرابت کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس مأخذ کی رو سے اس نے "توران" میں چالیس سال حکومت کی اور آخر عمر میں اس کی بینائی جاتی رہی تھی - ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء-۱۵۹۵ء) میں روسیوں نے اسے اس کی مملکت سے باہر نکال دیا - اس نے منعت نوغای کے ہاں پناہ لی اور انہیں لوگوں کے درمیان جان جان آفرین کے سپرد کر دی - عثمانلی ترک سیفی کی اس تصنیف میں بھی کُوچم کے متعلق حوالے ملتے ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء میں لکھی گئی تھی (لائیڈن قلمی نسخہ، شمارہ ۹۱۷، ترجمہ مخطوطے کا حوالہ دیے بغیر از Ch. Schefer جو اس کے ترجمے تاریخ وسط ایشیا (عبدالکریم بخاری *Histoire de l'Asie centrale* پیرس ۱۸۷۶ء، ص ۳۰۳ ببعد) میں بطور ضمیمہ شامل ہے) - اس میں کُوچم کی مملکت اور دارالحکومت کا نام "تُرا" لکھا ہے روسیوں نے اس قصبے پر کُوچم کی عدم موجودگی میں قبضہ کیا تھا - بعد ازاں کُوچم نے واپس آ کر ایک طویل محاصرے (ایک دو سال) کے بعد روسیوں کو باہر نکال دیا، لیکن روسی اس کے بیٹے کو قیدی بنا کر ماسکو لے گئے - ان روایات سے پتا چلتا ہے کہ سیفی کی تصنیف کا سن تالیف اس سنہ سے غالباً متأخر ہے جو کتاب کے سرورق پر درج ہے (Schefer، محل مذکور، پیش لفظ، ص iv میں تو مصنف کا سال وفات تک ۹۹۰ھ دیا گیا ہے) .

کُوچم کے دارالحکومت کا نام "اِسْکَر" (تبول اور اِرْتِش کے سنگم کے قریب) محض روسی مآخذ ہی

میں نظر آتا ہے اور صرف انھیں مآخذ کی مدد سے
اس کے عہد کے مشہور واقعات تاریخ وار ترتیب
دیے جا سکتے ہیں، کوچم نے یہ مملکت اپنے باپ
سے ورثے میں نہیں پائی تھی بلکہ اس نے اپنے
پیشرو یادگار Yādigār کو بیدخل کر کے حاصل کی تھی
۱۵۶۳ء تک شاہ سائبیریا کی حیثیت سے یادگار ہی کا
ذکر ملتا ہے، البتہ ۱۵۶۹ء میں اس کی جگہ کوچم
کا نام نظر آتا ہے۔ ۱۵۸۱ء میں روسی قزاقوں نے یرمک
کے زیر قیادت اسکر فتح کر لیا، قزاقوں کی یہ فتح
آتشیں اسلحہ کی مرہون منت تھی جن سے سائبیریا میں
کوئی شخص واقف نہ تھا۔ کوچم کا بیٹا محمد قلی
(مخمت کل) قیدی بنا کر ماسکو بھیجا گیا۔ روسیوں
سے اسکر کہیں اس وقت جا کر خالی کرایا جا سکا
جب ایک ناگہانی حملے کے دوران میں (۱۵۸۴ء یا
۱۵۸۰ء) میں یرمک مارا گیا۔ لیکن ۱۵۸۷ء میں
ہمیں بتایا جاتا ہے کہ فوجی دستے جو اسی زمانے
میں وہاں پہنچے تھے اس قصبے کے نزدیک تبولسک
(Tobolsk) کا روسی قصبہ تعمیر کر رہے تھے۔ کوچم
نے روسیوں سے آخری شکست ۲۰ اگست ۱۵۹۸ء سے
قبل نہیں کھائی۔ کہا جاتا ہے کہ نوغای نے
جن کے ہاں اس نے جا کر پناہ لی تھی اسے ان حملوں
کا انتقام لینے کے لیے ہلاک کر دیا جو اس کے
باپ نے ان پر کیے تھے۔ بخارا میں کوچم کی سفارت
بھیجے جانے اور سائبیریا میں مذہبی مبلغ بھیجنے کے
بارے میں خوارزم میں اس کے عامل عبداللہ خان
[رك بآں] کے حکم کا ذکر جس دستاویز میں ہے اور جس
سے روڈلوف (Rodloff) نے استفادہ کیا ہے (*Aus Sibirien*
بار دوم، لائپزگ ۱۸۹۳ء، ص ۱۴۶ ببعد) اسے اصلی
قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خوارزم اس زمانے میں ایک
آزاد مملکت تھا اور بخارا کے ماتحت نہیں تھا۔
روڈلوف (Rodloff) نے اس کے نام کی جو شکل Közüm
لکھی ہے وہ بھی کسی تاریخی مآخذ میں نہیں ملتی۔

مآخذ: (۱) Howorth : *History of the Mongols*، ج ۲ لنڈن ۱۸۸۰ء، ص ۹۸۲؛ نیز وہ روسی تصنیفات جن سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے؛ (۲) ہادی اطلاسی: سیبیر تاریخی، ۱۹۱۲ء، ص ۳۶، ۳۶، ۶۷ ببعد اور (۳) تبصرہ از W. Barthold در *Z.v.p.*، ۲۳: ۲۲۱ ببعد۔

(W. BARTHOLD)

* کُورانی: (نیز گُورانی)، شمس الدّین احمد بن اسمٰعیل مُلّا، نامور عثمانلی فقیہ اور مصنف مُلّا گُورانی کردستان کے ایک مقام شہر زُور (رك بآں) کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے تعلیم قاہرہ میں پائی جہاں ان کی ملاقات ملّا یکان (یعنی محمّد بن ارمغان بن خلیل، دیکھیے طاش کوپری زادہ مجدی: شقائق النعمانیہ، ۱: ۹۹ ببعد؛ سعدّ الدین ۲: ۴۳۸ ببعد) سے ہوئی۔ وہ انھیں اپنے ساتھ ایشیاے کوچک لے آئے اور سلطان مراد ثانی سے متعارف کرا دیا۔ پہلے پہل وہ قپلیجہ میں اور پھر بروسہ [بورسہ] کی جامع بایزید میں معلّم مقرر ہوے۔ بعد ازاں ان کے سپرد شہزادہ محمد کی تعلیم کر دی گئی جو آگے چل کر سلطان بنا اور ان دنوں مغنیسہ کا والی تھا دیکھیے (J. von. Hammer : *GOR*، ۲ : ۲۴۲ ببعد)۔ جب [سلطان] محمّد [ثانی]ؒ تخت نشین ہوا تو مُلّا کورانی نے پیش کردہ عہدۂ وزارت لینے سے انکار کر دیا، تاہم قاضی عسکر کا عہدہ قبول کرلیا (۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء) جب یہ عہدہ ان سے لے لیا گیا تو وہ بروسہ [بورسہ] کے قاضی اور مہتمم اوقاف کی حیثیت سے وہاں چلے گئے، لیکن سلطان کے ساتھ ان کا اختلاف ہو گیا۔ جس سے وہ ہمیشہ بےباکی سے پیش آتے تھے۔ اس پر انھیں برخاست کر دیا گیا، اور وہ واپس مصر چلے گئے جہاں سلطان قائت بے نے بڑے اعزاز و امتیاز سے ان کا خیر مقدم کیا۔ ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۷ء میں سلطان محمّد ثانیؒ نے انھیں دوبارہ طلب

کرلیا اور ۸۸۵ھ/ ۱۴۸۰ء میں استانبول کا شیخ الاسلام مقرر فرمایا ۔ یہاں ایک طویل بیماری کے بعد انھوں نے ۸۹۳ھ/ ۱۴۸۸ء میں وفات پائی ۔ سلطان بایزید ثانی نے سرکاری خزانے سے ان کے قرضے ادا کیے جن کی مالیت ۱۸۰۰۰۰ [ایک لاکھ اسی ہزار] آقچہ ہوتی تھی ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ملّا کُورانی طویل القامت اور دراز ریش شخص تھے ۔ انھیں غلطہ میں یوکسک قالدیرم کے مقام پر انھیں کی تعمیر کردہ مسجد کے صحن میں دفن کیا گیا (دیکھیے حافظ حسین: حدیقة الجوامع، ۱ : ۲۰۷؛ GOR : J. v. Hammer، ۹ : ۸۹، شمارہ ۳۳۵) ۔ استانبول کا ایک محلّہ بھی ان کے نام سے منسوب ہے، لیکن بالعموم اس کا تلفظ گورانی کیا جاتا ہے ۔ ملّا کُورانی نے متعدد نظمیں اور تفسیر کی کتابیں لکھیں جن میں اہم ترین غایة الامانی فی تفسیر سبع المثانی اور الکوثر الجاری علی ریاض البخاری ہیں ۔ یہ کتابیں البخاری کی کتاب حدیث اور اس کے علاوہ دیگر علوم قرآنی سے متعلق ہیں ۔ ملا کورانی مذھباً شافعی تھے، لیکن مراد ثانی کی درخواست پر انھوں نے حنفی مذھب اختیار کر لیا تھا ۔

مآخذ : (۱) طاش کوپری زادہ مجدی : شقائق النعمانیة، ۱ : ۱۰۲ تا ۱۱۱؛ (۲) سعد الدّین : تاج التواریخ، ۲ : ۱۳۳ تا ۳۹۳ (جہاں متعدد روایات درج ہیں)؛ (۳) بروسلی محمّد طاہر: عثمانلی مؤلّفلری، ۲ : ۳؛ (۴) علمیہ سالنامہ سی، استانبول ۱۳۳۲ھ، ص ۳۳۴ ببعد؛ (۵) G.O.R. : J. v. Hammer، ۱ : ۵۳۲، ۲ : ۲۳۳، ۵۸۹؛ (۶) G.A.L. : Brockelmann، ۲ : ۲۲۸ ببعد (مع ایک فہرست جس میں اس کی بعض تصانیف درج ہیں، محمّد طاھر کی مذکورہ کتاب میں ان کی زیادہ تفصیل موجود ہے)؛ (۷) رفعت : دوحة المشائخ، استانبول تاریخ ندارد، ص ۲۰ ببعد؛

(FRANZ BABINGER)

کُور اُوغلو : (ترکی: ''اندھے کا بیٹا'')، ایک مقبول عام رومانی داستان کا ھیرو ۔ یہ داستان نثر میں ہے لیکن بیچ بیچ میں اشعار بھی آ گئے ھیں اور اس کے فارسی اور ترکی میں اصلاح شدہ نسخے ملتے ھیں ۔ کہتے ھیں کہ کوراوغلو روشان نامی ایک تکّہ قبیلے کا ترکمان اور میرزا صرّاف کا بیٹا تھا جو شاہ عباس ثانی (۱۰۵۱ تا ۱۰۷۷ھ/ ۱۶۴۱ تا ۱۶۶۶ء) کے زمانے میں زندہ تھا ۔ کور اوغلو خراسان میں پیدا ھوا اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک اس نے وھیں زندگی بسر کی ۔ وادی سلماس (آذر بیجان) میں ابھی تک اس کے بنوائے ھوے قصر چاملی بل کے کھنڈر نظر آتے ھیں ۔ وہ ان قافلوں کو لوٹ لیا کرتا تھا جو ترکی سے ارزروم اور خوی کے راستے ایران جاتے تھے ۔ وہ ایران کے ترکمان نسل کے خانہ بدوش قبائل کا قومی بطل ہے ۔ اس کے کارناموں کی منظوم داستانیں تہواروں میں سازوں کے ساتھ گائی جاتی ھیں ۔ اس کا گھوڑا قراط بھی اس کی شہرت میں شریک ہے، جس نظم میں اس کی موت پر ماتم کیا گیا ہے اس کا شمار ان بہترین مرثیوں میں ھوتا ہے جو آج ھمیں ملتے ھیں ۔ جہاں گرد گویّے جو عاشق کے نام سے مشہور ھیں، مداریوں اور نٹوں کے ساتھ مل کر ماوراے قفقاز اور آذر بیجان کے شہروں دیہات اور چھاؤنیوں میں پھرتے رہتے ھیں اور اس رزمیہ نظم کو ٹکڑوں میں سناتے ھیں جنھیں مجلس کہتے ھیں ۔ ان لوگوں کو کوراوغلو خوان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ ترکی نظم کی رو سے کوراوغلو کے کارنامے ایشیاے کوچک میں وقوع پذیر ھوے تھے اور ان کا محل وقوع بولی (قدیم Claudiopolis صوبۂ قسطمونی میں) کے مضافات میں تھا ۔

اس کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حاکم ضلع (فارسی نظم میں سلطان مراد، ترکستان کے

ایک حصے کا فرمانروا اور ترکی میں بولی کا درہ بیگی) نے اپنے داروغۂ اصطبل کو جو ہمارے ہیرو کا باپ تھا، خراج میں آئے ہوے گھوڑوں میں سے بہترین گھوڑا لانے کے لیے کہا اور جب وہ ایک مریل سا گھوڑا لے آیا تو اس نے اس حرکت پر غضبناک ہو کر اس کی آنکھیں نکلوا دیں۔ کوراوغلو نے جس علاقے میں اپنے کارنامے دکھائے تھے اس کا رقبہ فارسی نظم میں بہت وسیع بتایا گیا ہے، اس میں یکے بعد دیگرے خراسان، آذربیجان، اریوان، نخچوان، آناطولی، قارص، شام اور مصر شامل کیے جاتے ہیں، لیکن ترکی نظم میں یہ علاقہ بولی کے ضلع سے متجاوز نہیں ہوتا .

مآخذ : (۱) A. Chodzoko ‹Popular Poetry ‹of Persia ص ۳ تا ۳۴۴؛ (۲) L. Szamatolski در ‹Aus türkischer Volks-und kunstdichtung برلن ۱۹۱۳ء، ص ۸ تا ۲۶ .

(Cl. Huart)

• **کُور دُفان** : مصری سوڈان کا ایک صوبہ جو قریب قریب ۱۶° اور ۱۰′ عرض بلد شمالی اور ۳۲° اور ۲۷′ طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے .

ہمارا خیال ہے کہ ازمنۂ وسطٰی کے عرب مؤرخین یا جغرافیہ نگاروں میں سے کسی کے ہاں بھی لفظ کُور دُفان یا جیسا کہ اکثر مقامی طور پر بولا اور قدیم دستاویزات میں لکھا جاتا ہے، کور دُفال نہیں ملتا۔ عموماً گمان گزرتا ہے کہ اس نام کو اسی نام کی ایک چھوٹی سی پہاڑی سے نسبت ہے جو العَبَیْد (۱۳°-۱۱′ عرض بلد شمالی، ۳۰°-۱۴′ طول بلد مشرقی) سے ۱۰ میل جنوب مشرق میں واقع ہے، لیکن اس لفظ کے معنوں کے متعلق، کس زبان سے یہ نکلا ہے اور گزشتہ صدی سے قبل کن علاقوں پر اس کا اطلاق ہوتا تھا، ان باتوں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا .

مآخذ : (۱) Mac-Michael : *The tribes of Northern and Central Kordofan*، ۱۹۱۲ء اور (۲) *A History of the Arabs in the Sudan*، ۱۹۲۲ء، میں قدیم ادب کے مآخذ کے علاوہ ایسا نیا مواد کافی مقدار میں موجود ہے، جس سے عربوں کے دور پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے؛ (۳) Meinhof نے *Eine Studienfahrt nach Kordofan*، ہامبورگ ۱۹۱۶ء، میں جنوبی علاقوں کی زبانوں کے بارے میں جو حالیہ تحقیقات ہوئی ہے، اس کا ملخص دیا ہے، اور دوسری باتوں کے علاوہ اس نظریے کی تردید کی ہے کہ نوبیائی گروہ سے تعلق رکھنے والی زبانیں حال ہی میں وجود میں آئی ہیں، کیونکہ اس نے بتایا ہے کہ عیسائی مذہب کی اشاعت سے قبل، جس کے باعث یونانی اور قبطی زبانوں کے مستعار الفاظ یہاں کی زبانوں میں داخل ہوے تھے، جنوبی گروہ لازمی طور پر دریاے نیل والے گروہ سے علیحدہ ہو چکا ہو گا، اس سلسلے میں دیکھیے نیز (۴) حکومت سوڈان کی سرکاری مطبوعات و مقالات از C. G. و B. Z. Saligman در *Harvard African Studies*، ۱۹۱۸ء؛ و در (۵) Hastings کی *Encyclopaedia of Ethics*، وغیرہ بذیل مادۂ نوبہ؛ و در (۶) *JRAI*، بابت ۱۹۱۰ء و در (۷) *Zeitschrift für kolonialsprachen*، ۱۹۱۰ء؛ اور (۸) وہ مختلف تبصرے جو ۱۹۱۸ء اور اس کے بعد کے *Sudan Notes and Records* میں، Mac-Michael، Newbold، Davies Hillelson the Seligmans، اور دوسرے لوگوں نے لکھے ہیں .

(J. W. Crowfoot [و تلخیص از ادارہ])

• **کوڑا** : [بھارت] ایک قدیم زوال یافتہ بستی جو شمالاً ۲۶ درجے، ۷ دقیقے، اور شرقاً ۸۰ درجے ۲۲ دقیقے، پر آگرے سے الہ آباد جانے والی قدیم شاہراہ پر واقع ہے اور آج کل بھارت کے اتر پردیش کے ضلع فتح پور کا ایک قصبہ ہے۔ سلاطین دہلی کے عہد میں کوڑا ایک صوبے کا صدر مقام تھا اور

(شہنشاہ) اکبر کے زمانے میں صوبۂ الٰہ آباد کی ''سرکار'' کا صدر مقام ۔

اکبر کا ایک تانبے کا سکہ کوڑا کی ٹکسال کا بتایا جاتا ہے، متاخر مغل بادشاہوں کے دور میں بھی رفیع الدرجات کے عہد سے کوڑا میں ٹکسال موجود تھی ۔

* مآخذ : *District Gazetteer of United Provinces of Agra and Oudh*، الہ آباد ۱۹۰۶ء، ۲۰ : ۱۵۴، ۱۵۷-۱۵۸، ۲۵۱ ببعد.

(R. B. WHITEHEAD)

* **کُوزہ گری : رک بہ فن .**

* **کُوسِم والِدہ :** نیز جو ماہ پیکر بھی کہلاتی ہے، عثمانلی خاندان کے سلطان احمد الاول (رک بآں) کی بیوی اور سلطان مراد چہارم اور سلطان ابراہیم الاوّل کی ماں تھی ۔ کوسم (لغوی معنی ''سب سے آگے چلنے والی بھیڑ''، ''جری'') یا ماہ پیکر نسلاً یونانی تھی ۔ ۱۶۳۷ء میں اس کی عمر تقریباً ۴۸ برس کی تھی اور اس اعتبار سے وہ ۱۵۹۲ء کے قریب پیدا ہوئی ہو گی ۔ معاصر تذکرہ نگاروں نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک ایسی عورت تھی جس کا حسن ادھیڑ عمر میں بھی قائم تھا ۔ اس کے خد و خال دلکش تھے، خوب چاق چوبند نظر آتی تھی اور چہرے سے کریم النفسی اور اعلٰی ذہانت کا اظہار ہوتا تھا ۔ تقریباً تیس سال تک ملک کی حکومت پر اس سیاست دان سلطانہ کا بے حد اثر رہا ۔ وہ اپنے خاوند سلطان احمد الاول کی زندگی میں بھی کاروبار حکومت میں عملی طور پر حصہ لیتی رہی تھی ۔ وہ اپنی پروقار وجاہت اور ذہانت کی وجہ سے سرکاری کاروبار چلا سکتی تھی اور پھر آگے چل کر جب اس کا نابالغ بیٹا مراد چہارم تخت نشین ہوا تو اس نے عنان حکومت بڑی مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لی ۔ پانچ برس تک وہ اس کے سر پرست کی حیثیت سے حکمران رہی ۔ جب ۱۰۴۹ھ / ۱۶۴۰ء میں مراد کے انتقال پر بزدل اور زنانہ مزاج ابراہیم الاول (۱۶۴۰ء تا ۱۶۴۸ء) تخت نشین ہوا تو کوسم والدہ داخلی مشکلات کو دور کرنے میں سرگرم رہی ۔ اس نے کریٹ [اقریطش] کی جنگ شروع کرا دی ۔ اس جنگ نے طول کھینچا اور نالائق سلطان عوام میں روز بروز غیر مقبول ہوتا چلا گیا .

کوسم والدہ نے اسے معزولی سے بچانے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی، اگرچہ اس نے سلطانہ کو بالکل بیدخل کر دیا تھا جیسا کہ اس سے پہلے مراد رابع نے کیا تھا ۔ ۸ ۔ اگست ۱۶۴۸ء / ۱۸ ۔ رجب ۱۰۵۸ھ کو ابراہیم معزول کیا گیا اور چند دن بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ تین سال بعد جب نابالغ محمّد چہارم تخت نشین ہوا، تو عمر رسیدہ والدہ کوسم اور ابراہیم کی بیوہ تُرخان خدیجہ کے درمیان رقابت پیدا ہو گئی جس کے دوران میں کوسم پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے سلطان کے بھائی سلیمان کو تخت دلانے کے لیے محمد چہارم کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے، آخر کار ینی چریوں کی ایک بغاوت میں جو ۱۶ رمضان ۱۰۶۱ھ / ۲ ستمبر ۱۶۵۱ء کو محل میں برپا ہوئی اسے بڑے الم ناک انجام کا سامنا کرنا پڑا، یعنی ایک پردے کی ڈوری سے اس کا گلا گھونٹ دیا گیا ۔ وہ اپنے شوہر کے پہلو میں دفن کی گئی ۔ ترکوں کے دلوں میں کوسم والدہ کی یاد آج تک تازہ ہے اور وہ اس کا بڑا احترام کرتے ہیں کیونکہ اس نے متعدد اداروں کی بنا رکھی تھی اور ان کی وجہ سے اس کا نام اب تک زندہ ہے ۔ وہ ایک شریف النفس اور عالی همت خاتون تھی ۔ اس میں ایک ملکہ کے اوصاف حقیقی معنوں میں موجود تھے ۔ وہ انتہائی ذہین، نیک دل، اور بڑی مضبوط سیرت کی مالک تھی ۔ اس نے پانچ شاہی جاگیروں کی ساری سالانہ آمدنی جو اس کی واحد ملکیت تھیں، حسب ذیل کاموں

کے لیے وقف کر دی تھیں: ایک سرائے کی تعمیر جو اس کے نام سے موسوم تھی (والدہ خان، جو ۲ مارچ ۱۹۲۶ء کو منہدم ہو گئی)، سقوطری میں اپنے نام کی ایک جامع مسجد کی تعمیر، استانبول میں ایک اور مسجد (والدہ جامعی) کی تعمیر جو اس نے شروع کی تھی، لیکن اسے والدہ کوچک نے مکمل کرایا، مصر میں آب رسانی، مکے میں غربا کی امداد، ایسے مقروضین کے قرضے کی ادائی جو خود ادا کرنے کے قابل نہ ہوں، اور بیواؤں اور یتیموں کی امداد کے انتظامات کیے۔ (نعیما: تاریخ، ۲: ۲۹۸، ۳۱۰؛ J. v. Hammer: *G.O.R.*، ۵: ۵۴۷، جہاں اس کے خیراتی کاموں کی تفصیلات درج ہیں)۔

مآخذ: (۱) J. v. Hammer اور (۲) Zinkeisen کی تواریخ، جن میں عثمانلی (خصوصاً نعیما اور حاجی خلیفہ) اور یورپی ماخذ (وینس کے baili کی *Relazioni*) سے استفادہ کیا گیا ہے؛ نیز دیکھیے (۳) احمد رفیق: قادینلر سلطنتی، ۲ جلد، استانبول ۱۳۳۲ھ اور ۱۹۲۳ء۔

(FRANZ BABINGER)

* **کوسہ میخال**: (ترکی: میخال بے ریش)، عثمانلی سپہ سالار جو ایک نو مسلم یونانی تھا۔ جب والی اینونو In. Önü کے ایک دھاوے کے دوران (۶۹۸ھ / ۱۲۹۹ء) میں شہزادۂ عثمان نے جو بعد ازاں سلطان بنا، اسے گرفتار کیا تو اس وقت وہ اماسیہ (Mysia) میں ادرنہ کی مشرقی جانب کوہ اولمپس کے دامن میں ایک مستحکم شہر خرمن قیا کا والی تھا۔ جب عثمانلی اپنے باپ ارطغرل کا جانشین ہوا تو کوسہ میخال کو سلطان کے بے تکلف دوست کی حیثیت حاصل ہو گئی، چنانچہ اسی کے مشورے پر سلطان نے لفکہ، ینیجہ، آق حصار، گیوہ، تکنور بنار، مودرنی، بیلہ جک پر قبضہ کیا (۶۹۹ھ / ۱۳۰۰ء)۔ جب کوسہ میخال مشرف باسلام ہو گیا (۷۰۶ھ / ۱۳۰۶ء) تو اور خان کی مہمات کا انتظام اس کے سپرد کیا گیا۔ نوجوان شہزادے کے ساتھ جنگی معاملات کے لیے جو مجلس شوریٰ تھی وہ اس کا ایک رکن تھا اور اسی نے سقوطِ بروسہ کے بارے میں گفت و شنید کی تھی (۷۲۶ھ / ۱۳۲۶ء)۔

اس کی اولاد میخال اوغلو (میخال کے بیٹے) کے نام سے مشہور ہوئی اور ایک عرصے تک آقنجی (scouts) کی قیادت ان کے ہاں باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہی۔ اس کے ایک بیٹے نے بایزید اول کے بیٹے شہزادۂ سلیمان کا ساتھ دیا، لیکن بعد ازاں اپنی خدمات محمد کو پیش کر دیں۔

کوسہ میخال کے دوسرے بیٹے یخشی بیگ نے موسیٰ کے مقابلے میں محمد کی حمایت اور اس کے ہراول دستے کی کمان کی۔ اس کے برعکس ایک میخال اوغلو محمد بیگ جو یخشی بیگ کا بھتیجا تھا اور روم ایلی کے بیگلر بیگ کی حیثیت سے موسیٰ کی جماعت میں شامل تھا، شہزادۂ مذکور کی شکست کے بعد توقاد کے مقام پر گرفتار ہوا اور پھر ۹۲۷ھ / ۱۵۲۱ء میں ہنگری والوں کے خلاف سلیمان اول کی مہم کے دوران میں کوسہ میخال ہی کی نسل کے ایک شخص کو ٹرانسلوینیا کو تاخت و تاراج کرنے کے لیے بھیجا گیا۔

مآخذ: (۱) سعد الدین: تاج التواریخ، قسطنطینیہ ۱۲۷۹ھ، ص ۱۹، ۲۳، ۲۸؛ (۲) قرہ چلبی زادہ: روضۃ الابرار، بولاق ۱۲۴۸ھ، ص ۳۰۱؛ (۳) سامی بے: قاموس الاعلام، ۵: ۳۹۲۱؛ (۴) J. v. Hammer: *Hist. de l'Empire Ottoman*، ترجمۂ Hellert، ۱: ۶۳، ۷۷، ۱۰۲، ۱۲۹، ۱۴۷، ۲: ۱۴۳، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۶، ۵: ۱۰۔

(CL. HUART)

کوشک: (فارسی لفظ کوشک کا ترکی تلفظ؛

اس کا عربی مشتق جوسق ہے جس میں اس لفظ کی ایک غیر مصدقہ شکل گوشک یا گوشہ بمعنی کونا مضمر ہے)؛ کسی کشادہ باغ میں بنی ہوئی ایک الگ تھلگ سی عمارت ـ خلفا کے دیہاتی محلات (ان کے شہری محلات کے مقابلے میں) اس نام سے پکارے جاتے تھے ، مثلاً سامرّا کا جوسق الخاقانی، جس کا نقشہ Herzfeld نے دیا ہے (*Mitteilung über die Arbeiten der Sweiten Kampagne von Samarra*، در *Isl.*، ۱۹۱۴ء، ۵ : ۲۰۳) ـ قاہرہ میں گورستان القرافہ میں اس قسم کے چند ایک کوشک موجود تھے، جنھیں قصر (جمع : قصور) بنی کہا جاتا تھا (المقریزی : خطط، ۲ : ۴۵۲) ـ یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں جیسا کہ ابن بطوطہ، ۳ : ۲۱۲، کی ایک عبارت سے ظاہر ہوتا ہے ـ

(CL. HUART)

* **کوطہ** : رک بہ کوثہ ـ

* **الکوفہ** : ایک زمانے میں بہت مشہور و معروف شہر تھا، بابل کے کھنڈروں کے جنوب میں ، دریاے فرات [رک بہ الفرات] کی مغربی شاخ کے کنارے، جو آگے چل کر ان دلدلوں میں غائب ہوجاتی ہے جو واسط کے مغرب میں ہیں ـ جنگ قادسیہ [رک باں] کے بعد حضرت عمرؓ کے حکم سے عربوں نے یہاں ایک مضبوط اور دفاعی اعتبار سے مستحکم چھاؤنی تعمیر کی تاکہ نئے نئے مفتوحہ صوبوں کے لوگوں کو زیادہ آسانی سے قابو میں رکھا جاسکے ـ یہ نو آبادی جسے الکوفہ کا نام دیا گیا، اور البصرہ [رک باں] جو اس سے کچھ پہلے کی بستی تھی ان دونوں کو فوجی اسباب کی بنیاد پر دریا کے مغربی کنارے پر بسایا گیا تاکہ دارالخلافہ مدینہ اور ان فوجی مرکزوں کے درمیان حمل و نقل پر طبعی رکاوٹیں اثر انداز نہ ہو سکیں ـ بصرہ تو ایسی جگہ آباد کیا گیا جہاں پہلے ہی ایک گاؤں الخُرَیبۃ موجود تھا، چنانچہ کچھ عرصے بعد یہ گاؤں بصرے کے مضافات میں شامل ہوگیا لیکن کوفہ بالکل نئی آبادی تھی جس کی بنیاد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے بعض مؤرخین کی راے میں ۱۷ھ/ ۶۳۸ء میں رکھی تھی، مگر بعض کا خیال ہے کہ یہ ۱۸ھ بلکہ ۱۹ھ سے قبل نہیں رکھی گئی تھی ـ عربی لفظ کوفہ کے عام معنی ہیں ''ریت کا گول ٹیلا''ـ لہٰذا اس نام سے پتا چلتا ہے کہ شہر کا قدیم ترین حصہ اسی نوع کی بلندی پر بسایا گیا ہو گا ـ بہر حال اس کی کچھ اور توجیہات بھی پیش کی جاتی ہیں (دیکھیے یاقوت، ۴ : ۳۲۲)ـ عرب جغرافیہ نگاروں کی رو سے کوفہ دریاے فرات کے کنارے ایک وسیع میدان کے بہت بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا ـ اس کا محل وقوع بصرے سے زیادہ صحت افزا سمجھا جاتا تھا ـ قرب و جوار کے علاقے کی اہم پیداوار کھجور، نیشکر اور کپاس تھی ـ جوں جوں عرب مشرق کی جانب بڑھتے گئے، کوفے کی اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا ـ وہاں کے سپہ سالار عساکر کو امیرالمؤمنین کے سیاسی نمائندے کی حیثیت بھی حاصل ہوتی تھی اور وہاں کا نظم و نسق بھی وہی سنبھالتا تھا ـ ان دونوں نئے شہروں یعنی کوفے اور بصرے کے والی عموماً علٰحدہ علٰحدہ ہوا کرتے تھے، لیکن بعض اوقات ان کا ایک دوسرے کے ساتھ الحاق بھی کر دیا جاتا تھا ـ اس بارے میں رک بہ العراق ـ حکمران عربوں اور ان کی ایرانی رعایا کے نزدیک کوفہ رفتہ رفتہ بہت اہم ہوگیا ـ اسی اعتبار سے یہاں کی آبادی بھی بڑی تیزی سے بڑھنے لگی ـ عرب سپاہیوں کے علاوہ سوداگروں، کاریگروں اور دوسرے مزدوروں کے خاندان جو بیشتر ایرانی النسل تھے، یہاں بڑی تعداد میں آباد ہو گئے ـ ابتداءً یہ چھاؤنی محض خیموں اور قدیم وضع کی سکونت گاہوں

پر مشتمل تھی ۔ ایک مسجد اور چند دوسری سرکاری عمارتیں بھی تھیں، مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہاں پڑاؤ مستقل ہو گیا اور کچے گھر بن گئے، بالآخر (عام بیانات کی رو سے) زیاد بن ابیه کے عہد ولایت میں (یعنی تقریباً ۵۰ھ/ ۶۷۰ء کے بعد) ایک باقاعدہ شہر خشتی مکانوں سے تعمیر کیا گیا ۔ کوفے کے باشندے کچھ تو مختلف عرب قبائل کے افراد تھے، خصوصاً جنوبی عرب کے بدوی اور کچھ ایرانی عناصر تھے ۔ ان کی عسکری قابلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ علاوہ ازیں کوفیوں کو اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں اور ان کارناموں کے باعث جو انھوں نے علوم اسلامی کے میدان میں سرانجام دیے، ایک خاص امتیاز حاصل ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی کردار کے اعتبار سے وہ مُتَلَوِّن مزاج اور ناقابل اعتبار تھے ۔ یہی چیز آگے چل کر سیاسی زندگی کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوئی اور بڑی حد تک ان خانہ جنگیوں کا سبب بنی جو خلافت کے خوش‌آئند ارتقا میں سد راہ بنیں ۔ خود حضرت عمرؓ جن کی وجہ سے یہ شہر وجود میں آیا تھا، کوفیوں کی سرکشی سے ناخوش تھے ۔ یہ لوگ کبھی مطمئن نہیں ہوتے تھے اور خلیفه کے مقرر کردہ عامل کی ہمیشه کوئی نہ کوئی شکایت کرتے رہتے تھے ۔ جب بھی حضرت عمرؓ ان کی خواهشات کی پذیرائی کرتے، ان کے مطالبات زیادہ ناقابل برداشت ہو جاتے، حتی کہ اپنے عہد خلافت کے آخری چھے سال میں انھیں تین بار کوفے کے عامل بدلنے پڑے ۔ حضرت عثمانؓ کی مخالفت میں جو سازش خفیه طور پر مدت سے ہو رہی تھی، جب ۳۴ھ / ۶۵۵ء میں آشکار ہوئی تو سب سے پہلے کوفیوں ہی نے حضرت علیؓ کی بیعت کا اعلان کیا ۔ ۳۶ھ / ۶۵۶ء میں جنگ جمل ہوئی اور حضرت علیؓ اپنے مخالفوں کی متحدہ فوجوں پر غالب آنے کے بعد کوفے چلے گئے تو یوں معلوم ہونے لگا کہ یہی شہر اب دارالخلافه بن جائے گا، لیکن جب صفین کے میدان میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویهؓ کا مقابلہ ہوا تو عراقی شامیوں سے مات کھا گئے ۔ حضرت علیؓ کے ہاتھوں فتح ہوتے ہوتے رہ گئی، کیونکہ عین اس وقت جب آپ کی گرفت مضبوط تھی اور آپ نے تحکیم پر رضامندی کا اعلان فرما دیا تھا، خوارج آپ کا ساتھ چھوڑ گئے ۔ ۴۰ھ / ۶۶۱ء میں حضرت علیؓ کو دغا سے شہید کر دیا گیا تو کوفی مجبور ہو گئے کہ حضرت معاویهؓ کو امیر المؤمنین تسلیم کر لیں ۔ نئے خلیفه کے اولوالعزم عامل پہلے زیاد بن ابیه اور پھر ان کا فرزند عبیداللہ جسے ۵۵ھ/۶۷۴-۶۷۵ء میں بصرے کا امیر بنایا گیا تھا اور پھر حضرت معاویهؓ کی وفات کے بعد کوفه بھی اسی کے تحت کر دیا گیا، ان دونوں نے بڑے تدبر کے ساتھ فتنه جو کوفیوں کو قابو میں رکھا ۔ جب حضرت حسینؓ بن علیؓ نے اپنے بہت سے عراقی پیرووں کی التجا قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور مکۂ مکرمه سے کوفے روانه ہوے، تو عبیداللہ کے زبردست اقدامات کی وجه سے کوفیوں کے باغیانه رجحانات بڑی آسانی سے دبا دیے گئے ۔ محرم ۶۱ھ/ اکتوبر ۶۸۰ء میں حضرت حسینؓ نے کربلا میں جام شہادت نوش فرمایا ۔ دوسرے اموی خلیفه یزید الاول کی موت کے بعد ایک بار پھر خانه جنگی ہوئی ۔ چونکه حضرت علیؓ کے چھوٹے بیٹے حضرت محمد بن الحنفیه کوفے کی شیعی جماعت کی قیادت قبول کرنے پر تیار نہیں تھے، اس لیے کوفیوں نے حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کی بیعت کر لی ۔ اس وقت حضرت عبداللہؓ کی خلافت کا اعلان سارے حجاز میں ہو چکا تھا اور کئی برس تک اموی حکمران مروان اور ان کے بیٹے عبدالملک کے ساتھ خلافت کے بارے میں ان کا جھگڑا چلتا رہا ۔ ۶۶ھ / ۶۸۵ء میں ایک بیباک

طالع آزما مختار بن ابی عبیدؓ [رکّ بآں] کوفے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ اور اب ایک مستقل دہشت انگیزی کا دور دورہ شروع ہوا ۔ جو تقریباً ڈیڑھ سال جاری رہا؛ یہاں تک کہ عرب آبادی نے مصعب بن زبیر سے مدد کی درخواست کی جنھیں ان کے مدعی خلافت بھائی عبداللہ بن زبیر نے بصرے کا عامل مقرر کیا ہوا تھا ۔ کوفے کے نزدیک جنگ حروراء [رکّ بآں] (۶۷ھ / ۶۸۷ء) میں مختار شکست کھا کر مارا گیا ۔ مصعب نے باغیوں سے سخت انتقام لیا ۔ الغرض عراق کی سیاسی تاریخ کی تشکیل میں عربوں اور ایرانیوں کے اختلاف کی بہ نسبت مختلف عرب قبائل کے موروثی مجادلات نے زیادہ اہم حصہ لیا ۔ جب مصعب امویوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے (۷۲ھ / ۶۹۱ء) تو کوفے کو سر اطاعت خم کرنا پڑا اور خلیفہ عبدالملک بلا مخالفت شہر میں داخل ہوگئے ۔ ۷۵ھ / ۶۹۴ء سے ۹۵ھ / ۷۱۴ء تک سارے عراق کا نظم و نسق حجاج بن یوسف [رکّ بآں] کے پر زور ہاتھوں میں رہا ۔ اس نے ہر قسم کی مقاومت کو ختم کرنے کے لیے واسط میں ایک نیا دارالحکومت قائم کیا جہاں سے وہ کوفہ اور بصرہ دونوں کو قابو میں رکھ سکتا تھا ۔ خالد بن عبداللہ القسْری کے طویل دور ولایت (۱۰۵ تا ۱۲۰ھ / ۷۲۴ تا ۷۳۸ء) میں عام طور سے عراق میں امن و آسودگی کا دور دورہ رہا، لیکن ۱۲۷ھ / ۷۴۵ء میں خوارج نے کوفے پر قبضہ کر لیا اور انھیں نکال باہر کرنے میں خلیفہ مروان ثانی کی فوجوں کو دو برس لگ گئے ۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد بنو عباس میدان میں نمودار ہوئے ۔ خراسان کے اموی عامل نصر بن سیّار کو شکست ہوئی اور ۱۳۲ھ / ۷۴۹ء میں کوفے کے اندر وہ بغاوت پھوٹ پڑی جس کی ایک مدت سے تیاری ہو رہی تھی ۔ عباسیوں کو شہر پر قبضہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی ۔ کوفہ دارالخلافہ بنایا گیا اور اسے تقریباً بیس برس تک یہ حیثیت حاصل رہی ۔ اگرچہ اس دوران میں عباسی فرمانرواؤں نے کوفے کے بجائے زیادہ‌تر اپنی سکونت یا تو ہاشمیہ میں رکھی جو فرات کے کنارے کوفے سے کچھ دور شمال میں ہے یا پھر انبار میں۔ بعدازاں جب بنوعباس کے دوسرے خلیفہ المنصور نے نئے دارالخلافت بغداد [رکّ بآں] کی بنیاد رکھ دی تو کوفے کی اہمیت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی ۔ بہر کیف کافی مدت تک اسے خاصی بڑی چھاؤنی کی حیثیت حاصل رہی اور علمی مرکز ہونے کی شہرت بھی ۔ یہ شہرت یہاں کے باشندے دوسری صدی ہجری کے نصف اول ہی میں حاصل کر چکے تھے اور انھوں نے اسے پانچویں صدی ہجری تک قائم رکھا، مگر سیاسی حالات تبدیل ہو چکنے کے باوجود کوفیوں کے دلوں میں علویوں کی ہمدردی نئی نئی تحریکوں میں شریک ہونے کے پرانے اشتیاق اور باغیانہ رجحانات میں کمی نہ آئی، چنانچہ ۱۹۹ھ/ ۸۱۵ء میں حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ایک شخص محمد بن ابراھیم جو ابن طباطبا کے نام سے بھی مشہور ہے کوفے میں نمودار ہوا اور اپنا دعوائے خلافت تسلیم کرانے کی کوشش کی ۔ والی کو شہر سے نکال دیا گیا اور بہت سے معتقد مدعی خلافت کے گرد جمع ہو گئے ۔ اگرچہ اس کا انتقال اسی سال ہو گیا، مگر یہ خطرناک بغاوت بڑی کوششوں سے فرو ہو سکی ۔ المستعین [رکّ بآں] کے عہد میں علویوں نے ایک بار پھر کوفے میں اختلال پیدا کیا ۔ ۲۵۰ھ / ۸۶۴-۸۶۵ء میں یحیٰی بن عمر العلوی نے ہر قسم کے اراذل و انفار کو ساتھ لے کر حکومت کے خلاف بغاوت برپا کر دی، عامل کو فرار ہونا پڑا اور بغاوت بڑی تیزی سے پھیل گئی، تاہم بہت جلد امن و امان قائم ہو گیا ۔ کچھ

عرصے بعد اس شہر میں جو ہمیشہ سے شورش پسند چلا آ رہا تھا ایک اور علوی نے حکومت قائم کر لی، مگر اس کا عہد بھی قلیل المیعاد ثابت ہوا۔ ۲۵۶ھ / ۸۷۰ء میں علی بن زید نے کہ وہ بھی اسی طرح آل علی میں تھا، کوفے میں خلافت کا دعوی کیا اور عامل کو نکال دیا۔ بعد ازاں اس نے شاہی افواج کے سپہ سالار الشاہ بن میکال کو شکست فاش دی جو اسے کچلنے کے لیے بھیجا گیا تھا، لیکن جب نئی فوج نے پیش قدمی کی تو اسے کوفہ خالی کرنا پڑا۔ جب قرامطہ نے مغربی عراق اور شام کو تاخت و تاراج کیا تو کوفہ بھی نہ بچ سکا۔ ۲۹۳ھ/۹۰۶ء میں یہ لوگ شہر میں داخل ہوے اور پھر ۳۱۲ھ / ۹۲۴ - ۹۲۵ء میں قرامطہ کے مشہور قائد ابو طاہر نے فتح کر کے اسے تاراج کر دیا۔ اسی طرح ۳۱۵ھ/۹۲۷ء اور ۳۲۵ھ/۹۳۷ء میں بھی وہ غارت ہوا۔ چوتھی صدی میں تیزی کے ساتھ خلافت کے انحطاط سے کوفے پر بھی زوال آیا۔ اگرچہ آل بویہ نے جو ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء میں دارالخلافت بغداد پر قابض ہونے کی وجہ سے سیاسی اقتدار حاصل کر چکے تھے، شیعہ ہونے کے باعث کوفے یا یوں کہنا چاہیے کہ اس کی نواحی آبادی نجف کی بہبود میں خاص دلچسپی لی تھی؛ کیونکہ روایت کے مطابق نجف میں مزارات مقدس واقع تھے، لیکن وقت کے ساتھ آل بویہ کی قوت بھی کمزور پڑ گئی۔ ۳۷۵ھ/۹۸۵ - ۹۸۶ء میں قرامطہ نے ایک بار پھر کوفے پر قبضہ کر لیا اور گیارہ برس بعد بہاء الدولہ [رك باں] نے دوسرے مقامات کے ساتھ اسے بھی بطور جاگیر المقلّد بن المسیّب کو عطا کر دیا۔ بعد ازاں یہ بنو مزید کے قبضے میں آیا، لیکن جب ان لوگوں نے ۴۹۵ھ/ ۱۱۰۱ - ۱۱۰۲ء میں اس کے شمال میں اپنا نیا دارالحکومت حلّة تعمیر کر لیا اور تیزی کے ساتھ وهاں رونق بڑھنے لگی تو پرانا دارالحکومت رفتہ رفتہ ہر قسم کی اہمیت سے محروم ہوتا چلا گیا۔ کوئی ۹۰ برس بعد جب ابن جبیر یہاں پہنچا ہے تو قدیم دیواریں گرائی جا چکی تھیں اور زوال کے دوسرے آثار بھی کوفے میں ہویدا تھے۔ عہد مغول کے بعد تو وہ سرعت کے ساتھ زاویۂ خمول میں چلا گیا۔ ابن بطوطہ جب اپنی سیاحت کے دوران میں یہاں آیا ہے تو اس کا بیشتر حصہ ویران ہو چکا تھا۔ اس کا بڑا سبب قرب و جوار کے بنو خفاجة کے بدویوں کی ترکتاز تھی، البتہ اس کی تحریروں سے اتنا پتا ضرور چلتا ہے کہ یہاں کی مسجد اس وقت تک اچھی حالت میں محفوظ تھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی بنائی ہوئی قدیم سرکاری عمارات میں سے (قصرالامارة) کی محض بنیادیں باقی رہ گئی تھیں۔ اس کے انحطاط کی توثیق حمد اللہ مستوفی قزوینی کی کتاب نزهة القلوب سے بھی ہوتی ہے جو ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ - ۱۳۴۰ء میں لکھی گئی تھی۔ ایام ما بعد میں ہمیں صرف نجف کا ذکر ملتا ہے جو اس کے نواح میں واقع تھا اور جسے ایک شیعی زیارتگاہ کی حیثیت سے اہمیت حاصل رہی۔ آج کل اسے عموماً مشہد علی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کوفے کے قرب و جوار کے بارے میں Neibhur نے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:

"ارد گرد کا سارا علاقہ صحرا ہے اور شہر میں کسی قسم کی آبادی نہیں۔ یہاں کی سب سے زیادہ قابل ذکر چیز وہ جامع مسجد ہے جہاں حضرت علیؓ کے زخم کاری لگا تھا، لیکن اب اس کی بھی صرف چار دیواری ھی باقی رہ گئی ہے."

عربی لسانیات کے سلسلے میں کوفی علما نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کے بارے میں رك بہ عرب (ادبیات)۔ کوفے کے فرخندہ ترین ایّام میں بصرے کی طرح علوم اسلامیہ کے دوسرے شعبوں میں بھی وهاں خاصی سرگرمی کا اظہار کیا جاتا تھا،

خصوصاً ۶۳ھ/۶۸۳ء کے بعد سے جب جنگ حرۃ ہوئی اور رسالت مآب صلّی اللّٰہ علیہ و آلہ و سلّم کے کئی پرانے صحابی جو روایات اسلامیہ میں سند سمجھے جاتے تھے، نقل مکانی کر کے عراق آئے اور یہاں کے اھم‌ترین شہروں میں سکونت پذیر ہو گئے، ان راویان حدیث میں سے یہاں صرف دو کا ذکر کافی ہے، یعنی مشہور و معروف عبداللّٰہ بن مسعود کا جو السابقون الاوّلون میں سے ہیں اور جنہیں اھل کوفہ کا رہبر و معلم بنا کر بھیجا گیا تھا اور عامر بن شَراحِیل الشَّعْبِی (م تقریباً ۱۰۳ھ/۷۲۲ء) بھی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ [کوفے کے اعاظم رجال میں امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) اور محمد بن العلاء بن کُرَیب الھمدانی الکوفی (م ۲۴۳ھ) بھی قابل ذکر ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ فقہ حنفی کے بانی و امام ہیں اور اسلامی دنیا کی اکثریت ان کی فقہ پر عامل ہے۔ ابن کریب کا شمار حفّاظ حدیث میں ہے۔ ان سے صحاح ستہ کے مؤلفین نے حدیث کی روایت کی ہے]۔

مآخذ: (۱) *B.G.A.* (سلسلۃ جغرافیۃ العربیہ)، طبع de Goeje، ۱: ۲۷، ۶۹، ۸۲، ۸۵؛ ۲: ۳۳، ۱۵۷، ۱۶۲ببعد، ۱۶۶ببعد، ۲۱۱، ۲۱۳؛ ۳: ۳۳ ببعد، ۱۵۳، ۱۶۰، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۲۵ ببعد، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۳تا ۱۳۵، ۲۵۹، ۲۹۳، ۳۱۶؛ ۵: بالخصوص ۱۶۲تا ۱۸۷؛ ۶: ۱۲۵، ۱۲۹، ۱۴۴، ۲۳۳؛ ۷: ۷۴ ببعد، ۱۷۷، ۱۸۰، ۱۸۲، ۲۰۱، ۲۶۴، ۳۰۸ تا ۳۱۱؛ ۸: بمواضع کثیرہ؛ (۲) ابن جبیر، رِحلۃ، بار ثانی طبع Wright و de Goeje، ص ۲۱۱تا ۲۱۳؛ (۳) یاقوت، طبع Wüstenfeld، ۴: ۳۲۲ تا ۳۲۷؛ (۴) ابوالفداء: تقویم، طبع Reinaud و Guyard، دیکھیے اشاریہ؛ (۵) البلاذری، طبع de Goeje، بالخصوص ص ۲۷۵تا ۲۸۹؛ (۶) ابن سعد: طبقات، ۶: ۱ تا ۶؛ (۷) الطبری، طبع de Goeje، رک بہ اشاریہ؛ (۸) ابن الاثیر: الکامل، طبع Tornberg بمواضع کثیرہ؛ (۹) ابن بطوطہ: الرحلۃ، طبع پیرس، ۲: ۹۳تا ۹۶؛ (۱۰) حمداللّٰہ مستوفی قزوینی: نزھۃ القلوب، طبع Le Strange، ص ۳۰ تا ۳۳، ۶۶، ۱۰۰، ۲۱۰؛ (۱۱) Niebuhr: *Reisebeschreibung*، ۲: ۲۶۱ ببعد؛ (۱۲) Le Strange: *The Lands of Eastern Caliphate*، ص ۳، ۲۱، ۲۵ ببعد، ۷۴ ببعد، ۸۱ تا ۸۳؛ (۱۳) Caetani: *Annali dell' Islam*، دیکھیے اشاریہ۔

(K.V. ZETTERSTEIN)

کُوفِیَّۃ: (شام کی مقامی بولیوں میں کَفیِہ، Guche: *Dict*، ص ۷۷۵؛ Burckhardt: *Notes on the Bedouins* ص ۲۷؛ G. Fesquet: *Voyage en orient*، ص ۱۸۰) ۔ یہ عربی لفظ لاطینی نژاد (Romance) زبانوں سے مأخوذ ہے (اطالوی: cuffia؛ ھسپانوی: cofia؛ پرتگالی coifa؛ فرانسیسی: coiffe, coëffe)؛ یہ ایک ریشمی رومال کا نام ہے جسے مکۂ معظمہ کے علاقے تک بادیۂ شام میں بسنے والے بدوی سر کی پوشش کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اسے سیاہ رنگ کے اونٹ کے بالوں کی ایک ڈوری کی مدد سے سر پر ٹکایا جاتا ہے جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شوخ رنگ کی ڈوریاں بندھی ہوتی ہیں اور جسے عَگّال (کلاسیکی: عقال) کہتے ہیں۔ یہ رومال چوکور شکل کا ہوتا ہے؛ اس کا رنگ زرد یا زرد و سبز ہوتا ہے اور اسے اس طریقے سے سر پر رکھتے ہیں کہ اس کا ایک کونا پشت پر اور باقی دونوں کونے سامنے شانوں پر لٹکتے رہیں۔ پہلے اس مربع رومال کو طے کر کے دوھرا کرتے ہیں تاکہ اس کی تکون بن جائے جسے درزیوں کی اصطلاح میں کَلی (gore) کہتے ہیں۔ شانوں والے کونے منہ پر ڈالے جا سکتے ہیں تاکہ سورج کی کرنوں، سرد ہوا اور بارش سے بچاؤ ہو سکے، یا جب یہ مقصود ہو کہ آدمی پہچانا نہ جا سکے، تو چہرہ چھپایا جا سکے، جو تاگے کپڑے کے کنارے سے باھر نکلے

ہوے ہوتے ہیں انھیں بٹ کر ڈوریاں بنا لیتے ہیں جو ایک لمبیٔ جھالر کی طرح نظر آتی ہیں (J.B. Fraser : *Travels in Koordistan*، ۱ : ۲۲۸) ۔ مصر کے مملوک سلاطین بھی سر کے لیے یہی لباس استعمال کرتے تھے ۔

مآخذ : (۱) R. Dozy : *Noms des vêtements*، ص ۳۹۰ ؛ (۲) Lane : *Thousand and one Nights*، ۱ : ۱۳۰، ۶۱۳ ؛ (۳) A Socin (Baede er) : *Palestine and Syria*، ص xiv، ۱۹۱۲ء ؛ (۴) Buckingham : *Travels in Mes potamia*، ۲ : ۱۹۵ ؛ (۵) Ker Porter : *Travels*، ۲ : ۲۹۲، ۲۹۳ ؛ (۶) R.P. Jaussen : *Coutumes des Arabes au pays de Moab*، ص ۳۲، حاشیہ ۳، (سیاہ اور بعض اوقات سفید رنگ کا) ؛ (۷) M. Tilke : *Orientalische Kostüme*، برلن ۱۹۲۳ء، لوحہ ۲۹ ۔

(Cl. Huart)

* کَوْکَب : [ع] ؛ ستارہ، علم ہیئت کی ایک عام اصطلاح، جس کا اطلاق کسی مُنوّر جرم فلکی پر کیا جاتا ہے ۔ وہ پانچ سیارے (عطارِد تا زُحل) جن کا علم عربوں کو تھا الکواکب الخمسہ (المُتحیّرہ) کہلاتے تھے ۔ ثابت ستاروں (الکواکب الثابتہ) کے مقابلے میں سورج چاند اور ان پانچ سیاروں کے لیے عام اصطلاح الکواکب الجاریہ یا الکواکب السیّارہ یعنی متحرک ستارے استعمال کی جاتی ہے ۔ کوکب شمالی الدّبّ الاصغر کے ستارہ عہ (اے) کا نام ہے جو افلاک کے قطب شمالی سے قریب‌ترین ہے ۔ البیرونی کے ہاں اسے "طَرَفُ الذَّنَب و ھو جَدْیُ القِبلۃ" (دم کا سرا، یعنی قبلہ [دریافت کرنے] کا بزغالہ کہا گیا ہے ۔ اس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ قطب شمالی (سمت شمال) کے علم سے اس کی قطعاً متقابل جنوبی سمت دریافت کی جا سکتی ہے جو قبلے کے رخ (سمت القبلہ) کے مترادف ہے ۔ قبلہ دریافت کرنے کا یہ طریقہ صرف انھیں علاقوں کی صورت میں صحیح ہے جو مکّے کے تقریبا شمال میں واقع ہیں (دیکھیے Reinaud کی یاداشت اس کی *Geographie d'Aboulféda* کی تمہید میں، ص cxcv : یا la Mecque est au midi de la Syrie, ainsi que d'une partie de la Mesopotamie et de l'Egypte (!) le mot Kiblah est devenue pour les musulmans de ces contrées, le synonyme de midi et il a été employé ailleurs avec la meme acception" [چونکہ مکّہ شام کے جنوب میں ہے جیسے کہ عراق عرب اور مصر کے ایک حصے کے بھی (!)، لہٰذا لفظ قبلہ ان ملکوں کے مسلمانوں کے ہاں جنوب کا ہم معنی ہو گیا ہے اور دیگر مقامات میں بھی انھیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے] ۔ آخر میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ قیفاوس Cepheus کے ستارے عہ (a) بہ (B) اور یہ (n) الغ بیگ کے قول کے مطابق کَواکِبُ الفِرْق یعنی (بھیڑوں کے) گلّے کے ستارے بھی کہلاتے تھے ۔

ثابت ستاروں کی فہرست جو کئی عرب مصنّفین کے ہاں پائی جاتی ہے جدول الکواکب کہلاتی ہے ۔

مآخذ : (۱) البیرونی : القانون المسعودی، مخطوطات عربی، برلن، ۸، ۲۷۵، ص ۱۹۴ الف ؛ (۲) L. Ideler : *Untersuchungen über den Ursprung und die Bedeutung der Sternnamen*، برلن ۱۸۰۹ء، ص ۳ و ۴۴ ؛ (۳) قبلے کے متعلق دیکھیے C. Schoy : *Abhandlung von Al Ḥasan ibn al-Hasan ibn al-Haitam (Al-hazen) über die Bestimmung der Richtung der Qibla*، ZDMG، ۱۹۲۱ء، ص ۲۰۲ تا ۲۰۴) ؛ (۴) وھی مصنف : *Abhandlung von al-Faḍl b. Ḥātim an Nairizi über die Richtung der Qibla* (arab. Hdschr. N. 2457,17 der Bibl. nat. in Paris)، در S.B. Bayr. Ak.، حصۂ

ریاضیات و طبیعیات، ۱۹۲۲ء، ص ۵۵ تا ۶۸؛ (۵) وهی مصنف: *Gnomonik der Araber*، برلن ۱۹۲۳ء، ص ۳۳ تا ۴۴ .

(C. SCHOY)

* کَوکبان : جنوبی عرب میں چند مقامات کا نام ہے .

(۱) ایک عبادت گاہ کا نام جس کا ذکر کتبۂ هالوے (Halévy) عدد ۶۸۶، ۳ تا ۴ میں ہے؛ اس کتبے کو J. Halévy نے عدن میں ایک عمارت سے نقل کیا تھا (مِحرابان کوکبان) دیکھیے نیز J. Hommel: *Grundriss der Geographie und Geschichte des alten Orients*، ۲، لائپزگ ۱۹۲۵ء، ص ۷۰۷ .

(۲) ناعِط کے شمال میں ظَفار کے قریب ایک قلعے کا نام ۔ اسے کوکبان (دو ستارے) یعنی قلعه ستاره اس لیے کہتے تھے که اس کے بیرونی جانب آرائش کے لیے چاندی کی دھاریاں بنائی گئی تھیں اور چھت سفید پتھر کی سلوں سے پاٹی گئی تھی ۔ اندرونی حصے میں سرو کی لکڑی کے تختے منڈھے گئے تھے اور فرش پر رنگ برنگ کی پچی کاری کی گئی تھی اور انواع و اقسام کے جواهر سلیمانی اور نیلم جڑے گئے تھے جو رات کے وقت ستاروں کی طرح چمکتے تھے ۔ یه طرفه عمارت لامحالة جنّوں کی طرف منسوب کی جاتی تھی ۔ اس قلعے کا ذکر شاید کتبۂ گلیسر Glaser عدد ۲۳۸، ۳ (بیت و کوکبان) میں بھی آیا ہے جو اس کے مضافات میں بیت غُفر سے حاصل هوا تھا ۔ کہتے هیں که یه قلعه ابھی تک قائم ہے .

(۳) اس نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں وادی سَلامَة کے دائیں جانب حَجة کے شمال مشرق میں بڑی چٹان پر آباد ہے اور اسے اسی نام کے دوسرے مقامات سے متمیز کرنے کے لیے کوکبان حجة کے نام سے یاد کرتے هیں .

(۴) اسی نام کے ایک صوبے کا صدر مقام ہے جو صَنْعاء کے شمال مغرب میں واقع ہے ۔ کوکبان کا شہر سطح سمندر سے ۸۷۵۰ فٹ کی بلندی "۱۵° '۳۱ "۲۴ عرض بلد شمالی میں واقع ہے اور اس پہاڑ کی ماهی پشت کے جنوبی حصے پر آباد ہے جو اس شہر کی بائیں جانب طویلے کی طرف تقریباً نصف میل جنوب مشرق سے شروع هوتا ہے اور کئی گھنٹے کی مسافت تک جنوب مشرق سے شمال مغرب کو چلا گیا ہے یه مَصانِعة کی وسیع سطح مرتفع کا ایک حصه ہے اور جبل ضِلاع کے نام سے مشہور ہے . . .

کوکبان اب تقریباً بالکل غیر آباد هو چکا ہے اگرچه اس کے مکانوں میں جو کافی بربادی کے باوجود اب تک شاندار هیں تقریباً ۳۰ هزار انسان رہ سکتے هیں، لیکن اب یہاں مشکل سے ۱۰۰ نفوس رہتے هیں ۔ شہر سے گرد و نواح کے علاقے، وادیوں اور زرخیز کھیتوں، خصوصاً شِبام کے میدانوں، صنعاء کے میدان کے ایک حصے اور آس پاس کی پہاڑیوں کا نہایت خوبصورت منظر دکھائی دیتا ہے .

(۵) کوکبان السّباعه مَخوید میں، شہر کوکبان نمبر ۴ کے مغرب میں واقع ہے، لیکن یه علاقۂ طَویله میں شامل ہے اور ایک چھوٹی سی جگه ہے جس کی کوئی خاص اهمیت نہیں .

مآخذ : (۱) J. Halévy : *Rapport sur une mission archéologique dans le Yémen*، *J.A.*، ۱۸۷۲ء، سلسله ۶، جلد ۱۹ : ۲۶۶؛ (۲) (۱) : D.H. Müller : *Die Burgen und Schlösser Südarabiens nach dem Iklil des Hamdâni*، جلد ۱، *S.B. Ak. Wien*، ۱۸۷۹ء، ۹۳ : ۳۵۴، حاشیه ۱، ۳۹۹ وحاشیه ۴، ۳۷۰، ۳۸۱، ۴۱۱؛ (۲) یاقوت : مُعجم، طبع وُستنفلٹ، ۳ : ۳۲۲، ۴ : ۳۲۷ (اس میں نیز اگلی کتاب میں یه غلط لکھا ہے که قلعه، صَنْعَاء کے قریب جبل کوکبان پر واقع تھا)؛ (۳) مَراصِدُ الاِطِّلاع، طبع T. G. J. Juynboll، ۲

لائیڈن ۱۸۰۵ء، ص ۵۲۳؛ (۴) : E. Osiander ،Zur himjarischen Alterthums-und Sprachkunde در ZDMG، ۱۸۵۶ء، ۱۰ : ۲۵، ۲۶؛ (۵) : E. Glaser ،Geographische Forschungen im Yemen 1883، ورق ۱ے الف (قلمی نسخہ)؛ (۳) : (۱) C. Niebuhr : Beschreibung von Arabien، کوپن ہیگن ۱۷۷۲ء، ص ۲۰۲؛ (۲) E. Glaser : Geographische Forschungen im Yemen 1883، ورق ۵۸ب (قلمی نسخہ) : (۴) : (۱) الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع ڈی ایچ مُلّر) لائیڈن ۱۸۸۴ء تا ۱۸۹۱ء، ص ۱۰۷، ۱۹۵؛ (۲) D.H. Müller : Die Burgen und Schlösser Süd-arabiens، ۱ : ۳۵۲، حاشیہ ۲، ۳۵۳؛ (۳) یاقوت : معجم، طبع وُسْتَنْفِلْث، ۳: ۵۵۳، ۳۰۶؛ (۴) : ۳ C. Niebuhr : Baschreibung von Arabien، کوپن ہیگن ۱۷۷۲ء، ص ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۵۲، ۲۵۵؛ (۵) C. Ritter : Die Erdkunde von Asien، ۱/۲، حصہ ۱۲، کتاب ۳، برلن ۱۸۴۶ء، ص ۲۱۱، ۲۲۸، ۲۳۴؛ (۶) A. Sprenger : Die Post-und Reiserouten des Orients, Abhandl. f.d. Kunde des Morgenlandes، ۳ / ۲، لائپزگ ۱۸۶۴ء، ص ۱۳۶، ۱۵۳؛ (۷) وہی مصنف : Die alte Geographie Arabiens، Bern ۱۸۷۵ء، ص ۴۷؛ (۸) Ch. Millingen : Notes of a Journey in Yemen، در JRGS، ۱۸۷۴ء، ۴۴ : ۱۲۳؛ (۹) E. Glasser : Geographische Forschungen im Yemen 1883، ورق ۸ الف، ۱۵ الف تا ۵۵ ب، ۱۲۴ب (قلمی نسخہ)؛ (۱۰) وہی مصنف : Meine Reise durch A'rhab und Häschid، در Petermann's Mittilungen، ۱۸۸۴ء، ۳۰ : ۱۷۳؛ (۱۱) وہی مصنف : Von Hodeida nach San'a vom 24. April bis 1. Mai 1885، کتاب مذکور، ۱۸۸۶ء، ۳۲ : ۳۳؛ (۱۲) A. Deflers : Voyage au Yemen، پیرس ۱۸۸۹ء، ص ۶۸ تا ۷۲؛ (۱۳) E. Glaser : Skizze der Geschichte und Geographie Arabiens، برلن ۱۸۹۰ء، ۲ : ۱۵۱؛ (۱۴) W. B. Harris : A Journey through the Yemen، ایڈنبرا ۱۸۹۳ء، ص ۲۰، ۲۱؛ (۱۵) H. Burchardt : Reiseskizzen aus dem Yemen، در Zeitschr. d. Gesellsch. f. Erdkunde zu Berlin، ۱۹۰۲ء، ص ۶۰۳؛ (۱۶) M. Hartmann : Der islamische Orient, Berichte und Forschungen، ۲، Die Arabische Frage، لائپزگ ۱۹۰۹ء، ص ۵۳۵؛ (۱۷) H. Krumpholz : Eduard Glaser's astronomische Beobachtungen im Yemen im Jahre 1883، در S.B. Ak. Wien (Math. naturw. Klasse)، ۱۹۱۱ء، عدد ۱۲۰، حصہ ۲ الف : ص ۱۹۲۱، ۱۹۲۲؛ (۱۸) F. Stuhlmann : Der Kampf um Arabien zwischen der Türkei und England, Hamburgische Forschungen، ۱، برنسوک ۱۹۱۶ء ص ۱۷؛ (۱۹) احمد راشد : تاریخ یمن و صنعاء، قسطنطنیہ ۱۲۹۱ھ؛ (۲۰) E. Glaser : Geographische Forschungen im Yemen 1883، ورق ۴۵ الف (قلمی نسخہ) .

(ADOLF GROHMANN [تلخیص از ادارہ])

کوکبری: ابوسعید مظفرالدین بن علی بن بکتگین فرمانروائے اربل، خاندان بکتگین کا سب سے مشہور بادشاہ تھا ۔ کوکبری محرم ۵۴۹ھ/اپریل ۱۱۵۴ء میں [قلعۂ موصل میں] پیدا ہوا، جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ ۱۴ برس کا تھا ۔ اگرچہ وہ اپنے بھائی یوسف سے بڑا تھا لیکن اتابک مجاہد الدین قایماز یوسف کو اپنی زیر نگرانی تخت دلوانے میں کامیاب ہو گیا ۔ اس پر کوکبری نے اربل چھوڑ دیا اور پہلے بغداد اور پھر موصل چلا گیا ۔ یہاں سیف الدین غازی بن مودود زنگی نے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے اپنی ملازمت میں لے لیا ۔ آگے چل کر سیف الدین نے یا ایک اور روایت کے مطابق اس کے بھائی اور وارث تخت عزالدین مسعود نے اسے حران کا شہر بطور جاگیر عطا کر دیا ۔ صلاح الدین کا

وفادار ملازم ہونے کی وجہ سے اسے ۵۷۸ھ/۱۱۸۲-۱۱۸۳ء میں الرُّھا اور آگے چل کر سُمَیساط بھی مل گیا۔ ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں صلاح الدین نے اسے ایک پرانے الزام کی بنا پر قید کر دیا، لیکن بہت جلد رہا کر دیا، کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ اگر کوکبری کے ساتھ زیادہ سختی کا برتاؤ کیا گیا تو عراق عرب کے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ شعبان۔ رمضان ۵۸۶ھ/اکتوبر ۱۱۹۰ء میں یوسف کی وفات کے بعد کوکبری کو اپنے سابقہ مقبوضات کے عوض اِربل اور شہرزور کی حکومت مل گئی؛ [دشمنوں کے خلاف محاذ آرا رہا اور کئی معرکے سر کیے۔ علم حدیث سے بھی بڑا شغف تھا۔ نیز حجاز میں کئی آثار حسنہ اپنی یادگار چھوڑے] ۔ لاولد ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے تمام علاقے عباسی خلیفہ المُستنصر کو دے دیے جانے کی وصیّت کر دی۔ کوکبری رمضان ۶۳۰ھ / جون ۱۲۳۳ء میں فوت ہوا۔ نیز رکّ بہ بکتگین؛ اِربل۔

مآخذ: (۱) ابن خلّکان، طبع Wüstenfeld، شمارہ ۵۵۸؛ ترجمہ از de Slane، ۲ : ۵۳۵؛ (۲) ابن الاثیر: الکامل، طبع Tornberg، ج ۱۱، ۱۲، بمواضع کثیرہ؛ (۳) Weil : *Geschichte der Chalifen*، ۳ : ۳۸۷، ۳۹۰، ۳۹۹، ۴۳۸، ۴۴۹، ۴۶۸؛ (۴) Lane-Poole : *The Mohammadan Dynasties*، ص ۱۶۵؛ [(۵) احمد السعید سلیمان: تاریخ الدول الاسلامیہ، ص ۴۴۳، (قاہرہ ۱۹۷۲ء)]؛ [(۶) ابن تغری: النجوم الزاہرۃ، ۶ : ۲۸۲].

(K. V. ZETTERSTÉEN [و ادارہ])

کُوکَہ : بورنو [رکّ باں] کا صدر مقام، ۱۲ درجے ۵۵ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۱۳ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرقی (گرین وچ) پر واقع ہے۔ اس قصبے کی بنیاد شیخ محمد الکانمی نے ۱۸۱۴ء میں بحیرۂ شاد سے ۹ میل مشرق کی جانب ایک ریتلے میدان میں رکھی۔ یہاں جب baobab adawsonia digitata اُگتا ہے جسے کنوری میں کُوکہ کہتے ہیں، اس لیے مقامی باشندوں نے اس نسبت سے اس کا نام کُووکوا (کُکَوہ) یا کیکوہ (کوکہ کا شہر) رکھ دیا۔

مآخذ: (۱) Denham و Clapperton : *Narrative of Travels* . . . .، لنڈن ۱۸۲۸ء؛ (۲) H. Barth : *Reisen und Entdeckungen*، ج ۲، باب ۸؛ (۳) Rohlfs : *Quer durch Afrika*، لائپزگ ۱۸۷۴ء، ج ۲، باب ۱۷؛ (۴) Nachtigal : *Sahara und Sudan*، ج ۱، کتاب ۳؛ (۵) Monteil : *De Saint Louis a Tripolis par le Tchad*، پیرس ۱۸۹۴ء، باب ۱۲؛ (۶) J. Marquart : *Benin*، لائیڈن ۱۹۱۳ء، بمواضع کثیرہ؛ (۷) A. Schultze : *Das Sultanat Bornu*، Essen، ۱۹۱۰ء (انگریزی ترجمہ مع ضمیمہ جات از P. A. Benton، آوکسفرڈ ۱۹۱۳ء).

(G. YVER [و تلخیص از ادارہ])

کوکچہ : رکّ بہ بدخشان۔

کُوکَلْتاش : خان جہاں میرزا عزیز کوکل تاش (= بادشاہ کا رضائی بھائی، کوکہ = دودھ پلانے والی کا بیٹا، دودھ شریک بھائی)۔ میر شمس الدین محمد خان کا، جو اکبری عہد میں خان اعظم اور ''اتکہ'' کہلاتا تھا، چھوٹا بیٹا تھا۔ وہ اکبر اعظم کا ہم عمر تھا۔ اکبر نے اس کی والدہ جیجی اتکہ کا دودھ پیا تھا، اس لیے وہ اس کا دودھ شریک بھائی تھا۔ بچپن میں وہ ساتھ کھیلتے بھی رہے۔ اکبر نے ہمیشہ اسے اپنا قرب بخشا اور عزت افزائی میں کمی نہ آنے دی۔ اکبر اس کی والدہ کا اپنی والدہ ہی کی طرح خیال رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس سے کبھی جسارت اور بے باکی ہو جاتی تو اکبر اسے نظر انداز کر دیتا اور کہا کرتا تھا: ''میان من و عزیز جوی شیر واسطہ است، از آں نمی توان گذشت'' (میرے اور عزیز کے درمیان دودھ کا رشتہ ہے جسے میں نظرانداز نہیں کر سکتا)

(صمصام الدوله شاهنواز خان : مآثرالامرا، ۱ : ۶۷۵ ، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ، کلکتہ ۱۸۶۹ء).

پنجاب عرصے سے بطور جاگیر میرزا عزیز کے بزرگوں، یعنی اتکہ خیل کے قبضے میں چلا آتا تھا - اکبر نے ان کی جاگیر میں کچھ تغیر و تبدل کر دیا ، بہرحال دیپال پور کی جاگیر میرزا عزیز ھی کے پاس رھی - سولھویں سال جلوس اکبری (۹۷۸ھ/ ۱۵۷۱ء) میں جب اکبر شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد واپس ہوا تو راستے میں میرزا عزیز کی درخواست پر بادشاہ نے اس کے ھاں قیام کیا (ابوالفضل : اکبر نامہ، ۲ : ۳۶۲) - میرزا نے اس تقریب پر ایک عظیم‌الشان جشن منعقد کیا (تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب مذکور، ۶۷۵) - محمد غزنوی نے جشن کی تاریخ مصرع ذیل سے نکالی :

''میہمانان عزیزند شہ و شہزادہ'' (۹۷۸ھ)، (اکبر نامہ، ۲ : ۳۶۳ - ۳۶۴) .

مصنف طبقات اکبری لکھتا ہے کہ ایسی پر تکلف ضیافتیں کم ھی ہوئی ھیں - سترھویں سال جلوس جب احمد آباد گجرات اکبر اعظم کے تصرف میں آیا تو وھاں کی حکومت دریاے مہندری کی سرحد تک میرزا عزیز کے سپرد ہوئی (مآثرالامرا، ۱ : ۶۷۶) اور اکبر خود قلعہ سورت کی تسخیر کی طرف متوجہ ہوا - اتنے میں باغی امرا یعنی محمد حسین میرزا اور شاہ میرزا نے شیر خان فولادی کے ساتھ مل کر نہروالہ (پٹن) کا محاصرہ کر لیا - میرزا عزیز قطب الدین خان اور بعض دوسرے امرا کے ساتھ پٹن آیا اور باغیوں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا (اکبر نامہ، ۳ : ۲۳ تا ۲۶) - ۲ صفر ۹۸۱ھ/۴ جون ۱۵۷۳ء کو اختیارالملک اور محمد حسین میرزا نے احمد آباد پر قبضہ کرنے کی سازش کی لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی بلکہ تصادم میں وہ جان سے بھی ھاتھ دھو بیٹھے.

بیسویں سال جلوس اکبری میں جب بادشاہ نے ''آئین داغ'' رائج کرنا چاھا تو اس نے امرا کو طلب کیا - امرا نے اس آئین پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا - بادشاہ نے میرزا عزیز کو ، جسے وہ بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا، بلا کر راے پوچھی تو اس نے بھی ناخوشی کا اظہار کیا - بادشاہ اس سے سخت ناراض ہوا اور کچھ عرصے کے لیے منصب سے معزول کر کے اسے آگرے کے باغ ''جہاں آرا'' میں نظر بند کر دیا (مآثرالامرا، ۱ : ۶۸۰) آخر تیسویں سال جلوس میں نظر بندی کی معیاد ختم ہوئی - پچیسویں سال جلوس (۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء) میں میرزا پنج ہزاری منصب اور ''اعظم خان'' کے خطاب سے سرفراز ہوا (مآثرالامرا، ۱ : ۶۸۰) - ملک کے مشرقی علاقے میں جب مفسدین کی شورش اور مظفرخان صوبیدار بنگالہ کے قتل کی اطلاع دارالسلطنت میں پہنچی تو اسے ایک بڑے لشکر کے ساتھ بھیجا گیا - میرزا عزیز نے اگرچہ صوبۂ بہار کی شورش کے خیال سے بنگال کا رخ تو نہ کیا، لیکن علاقے کے انتظام اور سرکش گروہ کی سرکوبی کے لیے سعی بلیغ کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہ حاجی پور میں قیام پذیر ہوا.

چھبیسویں سال جلوس میں اکبر کابل کی مہم سر کر کے واپس ہوا اور فتح پور پہنچا تو میرزا باریابی کا شرف حاصل کر کے طرح طرح کی نوازشوں سے سرفراز ہوا - ستائیسویں سال جلوس اکبری میں جباری ، خبیطہ اور ترخان دیوانہ بنگال سے بہار آئے اور حاجی پور کو اپنے تصرف میں لے لیا - وھاں وہ رعایا پر طرح طرح کے ظلم بھی کرنے لگے - میرزا کو حکم ہوا کہ بہار کے مفسدیں کو مناسب سزا دینے کے لیے حملہ کرے - اگرچہ میرزا کے پہنچنے سے پہلے ھی یہ احسان فراموش فتنہ پرداز شاھی فوج کے دستوں کے ھاتھوں کیفر کردار کو پہنچ چکے تھے، لیکن موسم برسات مانع ہونے کی وجہ سے میرزا خود

اس وقت وهاں نه پهنچ سکا ۔ بہر حال برسات ختم هوتے هی اٹھائیسویں سال جلوس اکبری کے شروع میں وه اله آباد ، اودھ اور بہار کے جاگیرداروں کے همراه بنگال کو روانه هوا ۔ یہاں اس نے معصوم خان کابلی اور قاقشالوں پر اپنی سیاسی فراست سے قابو پا لیا (مآثرالامرا، ۱ : ۶۸۱) ۔ یہاں کی آب و هوا ناموافق هونے کی اطلاع اس نے بادشاہ کو پہنچائی تو حکم صادر هوا که اس علاقے کو شہباز خان کنبوه کے جو عنقریب پهنچ جائے گا، سپرد کر کے اپنے علاقے بہار کو واپس هو جائے ۔ اس سال جب اکبر اله آباد روانه هوا تو میرزا حاجی پور سے چل کر بادشاہ کے حضور پہنچا اور اسے گڑھ اور رائے سین کی جاگیر عطا هوئی (ص ۶۸۱).

اک[illegible]یں سال جلوس اکبری ۹۹۳ھ/ (۱۵۸۵-۶[illegible]ء) میں میرزا کو دکن کی مہم پر بھیجا گیا، لیکن رفقا کی دو روئی کی وجه سے نامناسب توقف هو گیا اور فوج کم هوتی گئی اور غنیم جو خائف تھا، قوی دل هو گیا اور جنگ کے ارادے سے آگے بڑھا ۔ میرزا مقابلے کی تاب نه پا کر برار کی جانب نکل گیا ۔ ایلچ پور کو خالی پا کر اس نے وهاں لوٹ مار کی اور کثیر مال غنیمت کے ساتھ گجرات کو روانه هوا ۔ غنیم نے اس کا تعاقب کیا تو میرزا نے رفتار تیز کر کے نذر بار پہنچ کر دم لیا اور یه سارا علاقه غنیم کے تصرف میں آ گیا ۔ نذر بار سے وه تنہا گجرات [illegible] که وهاں فوج جمع کرے ۔ وهاں کے حاکم خانخاناں نے بڑی گرم جوشی سے تھوڑے هی عرصے میں لشکر فراهم کر دیا، لیکن لوگوں میں طرح طرح کی بےسروپا باتیں کی وجه سے اس نے لشکر کشی کا اراده کر دیا (مآثرالامرا، ۱ : ۶۸۲) ۔ بتیسویں سال جلوس شاهی میں میرزا کوکه کی بیٹی شاهزادهٔ سلطان مراد کے عقد ازدواج میں آئی ۔ اس تقریب میں عالی شان جشن منعقد هوا ۔ چونتیسویں سال جلوس اکبری کے آخر میں گجرات کی حکومت خانخاناں سے لے کر میرزا کوکه کے سپرد کی گئی ۔ پینتیسویں سال جلوس میں میرزا احمد آباد پہنچا تو اس وقت سلطان مظفر نے جام، زمیندار کچھاور حاکم جونا گڑھ کی مدد سے شورش بپا کی ۔ میرزا کوکه نے چھتیسویں سال جلوس اکبری میں ان کی طرف رخ کیا اور ایک خون ریز جنگ کے بعد دشمن کو شکست دی ۔ اگلے سال پھر جام اور دوسرے زمیندار متفق هو گئے اور سومنات اور سوله بندرگاهوں پر قبضه کر کے جونا گڑھ کا محاصرہ کرلیا جو سورت کا صدر مقام تھا ۔ یہاں بھی میرزا کی سیاسی فراست بروےکار آئی اور سلطان مظفر کو جو دراصل شورش کا محرک تھا، اس کے حلیف حاکم کچھ نے میرزا کے حوالے کر دیا ۔ اس طرح یه شورش ختم هو گئی.

بادشاہ نے انتالیسویں سال جلوس (۱۰۰۱ھ/ ۱۵۹۲-۱۵۹۳ء) میں میرزا کوکه کو طلب کیا ۔ تو اس نے مزاج شاهی کو موافق حال نه پا کر حجاز جانے کا اراده کیا ۔ کہا جاتا ہے که وه بادشاہ کو سجده کرنے، داڑھی منڈوانے اور بعض دوسری نئی رسوم بجا لانے کی پابندی نہیں کرتا تھا ۔ داڑھی بھی اس کی خاصی لمبی تھی؛ اس لیے بادشاہ کے سامنے جانے سے معذرت کر دیا کرتا تھا ۔ حج کو روانه هونے سے پہلے میرزا کوکه نے بندر دیو فتح کر کے شہرت حاصل کی ۔ آخر میں بندر بلاول سے جو سورت کے قریب ہے، اپنے چھے بیٹوں اور چھے بیٹیوں کو ساتھ لے کر جہاز پر سوار هوا ۔ عبدالقادر بداؤنی نے قطعهٔ تاریخ لکھا جس کے مندرجهٔ ذیل مصرع سے تاریخ نکلتی ہے : بگفتا ''میرزا کوکه بحج رفت'' (۱۰۰۲ھ / ۱۵۹۳-۱۵۹۴ء؛ مآثر الامرا، ۱ : ۶۸۳) ۔ کہتے هیں که میرزا نے حرمین میں زر کثیر صرف کیا ۔ وهاں کے شرفا و اعیان کی تواضع کی ۔ حضرت رسالت

مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے روضۂ مبارک کے اخراجات کا پچاس سال کا تخمینہ کر کے شریف مکہ کے حوالے کر دیا اور پتھر خرید کر اس مقام مقدس کے لیے وقف کر دیے (کتاب مذکور، ۶۸۴؛ نیز دیکھیے ذخیرۃ خوانین، ۱:۸۰، ۸۱)۔ ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۴-۱۵۹۵ء میں عزیز میرزا حج کعبہ کے بعد واپس آیا۔ بادشاہ کے حضور پہنچا تو اس کا منصب اور صوبۂ بہار کی جاگیر بحال کر دی گئی۔ چالیسویں سال جلوس میں اسے بادشاہ کی وکالت اور مہر شاہی کے رکھنے کی عزت حاصل ہوئی۔ اکتالیسویں سال جلوس میں صوبۂ ملتان میرزا کی جاگیر میں مقرر ہوا۔ اسی سال کے آخر میں شاہزادۂ سلیم (جہانگیر) کے بڑے بیٹے کے ساتھ جو راجا مان سنگھ کا بھانجا تھا، میرزا کی بیٹی کا عقد ہو گیا تو ان دونوں امرا نے حکومت کی ترقی میں سعی بلیغ کی۔ پہلے سال جلوس جہانگیری میں جب شاہزادۂ خسرو نے فرار ہو کر اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تو اس کی یہ حرکت میرزا کے ایما پر محمول کی گئی جس کی وجہ سے وہ کچھ عرصہ زیر عتاب رہا۔

شاہ نواز کا بیان ہے: کہتے ہیں کہ میرزا عزیز کفن پہن کر دربار میں آیا کرتا تھا۔ خیال تھا کہ اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ اسے اپنی زبان پر اختیار نہ تھا، جو منہ میں آتا کہہ بیٹھتا تھا۔ ایک رات اس نے امیر الامراء (شریف خان) سے سخت کلامی کی۔ جہانگیر وہاں سے اٹھا اور تخلیے میں مشورہ کیا۔ امیر الامراء نے کہا کہ اسے قتل کرنے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ بعض اور امرا نے بھی یہی رائے دی، کسی نے یہ بھی کہا کہ بنا بر میرزا سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی کہ اسے واجب القتل سمجھا جائے، اگر اسے ہلاک کر دیا گیا تو ایک دنیا اسے مظلوم سمجھے گی۔ اس سے جہانگیر کے غصے کو کسی قدر تسکین ہوئی۔ اسی اثنا میں بادشاہ کی مادر مہربان سلیمہ بیگم نے پردے کے پیچھے سے باواز بلند کہا: ''حضرات بیگمات میرزا کوکہ کی سفارش کے لیے جمع ہیں۔ آپ تشریف لا سکیں تو بہتر ہے، ورنہ وہ سب باہر آ جائیں گی'' مجبوراً بادشاہ نے حرم سرا میں جا کر ان سب کی سفارش سے میرزا عزیز کی خطا معاف کر دی (مآثر الامراء، ۱: ۶۸۶، ۶۸۷)۔ کسی موقع پر میرزا عزیز نے راجا علی خان حاکم خاندیس کے نام ایک اہانت آمیز خط لکھا جو جہانگیر کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ جہانگیر نے خط پڑھ کر کہا: ''اس وقت بھی محبت کا وہ واسطہ، جو عرش آشیانی (اکبر اعظم) تجھ سے رکھتے تھے، مانع ہے، ورنہ کل تجھے قتل کرا دیا جاتا''۔ بہرحال منصب اور جاگیر سے معزول کر کے اسے نظربند کر دیا گیا۔ آخر تیسرے سال جلوس جہانگیری میں اس کی خطا معاف ہوئی اور گجرات کی صوبیداری اسے سونپ دی گئی۔ نویں سال جلوس جہانگیری میں وہ پھر زیر عتاب آیا اور اسے گوالیار میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک سال بعد رہائی ہوئی تو اسے پہلی تحریر یہ ملی کہ بادشاہ کے حضور میں بغیر اجازت کوئی بات نہ کرے، اس لیے کہ اسے زبان پر اختیار نہیں۔ (کتاب مذکور، ۶۸۸)۔

اٹھارھویں سال جلوس جہانگیری میں میرزا عزیز کو شاہزادۂ خسرو کے بیٹے سلطان داور بخش کی اتالیقی اور ہمراہی کے لیے مقرر کیا گیا، لیکن وہ انیسویں سال جلوس ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۴ء میں فوت ہو گیا۔ شاہنواز کا بیان ہے کہ وہ بڑائی کے اظہار اور درشت گوئی میں یکتا تھا۔ بہت مغلوب الغضب شخص تھا، لیکن خوش گفتار بھی تھا۔ وہ نماز کا پابند لیکن دین کے معاملے میں متعصب ضرور تھا؛ اس وجہ سے اس نے لامذہبی میں اکبر کی پیروی نہ کی۔ اس معاملے میں وہ بےباکی سے اکبر کے

طریق کار کو برا کہتا تھا۔ زمانہ سازی اس میں قطعاً نہ تھی (مآثرالامرا، ۱: ۹۰-۶)۔ وہ کثیرالاولاد تھا اور اس کی اولاد میں سے بعض اعلیٰ مناصب پر سرفراز ہوے۔

مآخذ: (۱) عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ، مطبوعۂ نولکشور، لکھنؤ ۱۸۸۳ء؛ (۲) ابوالفضل: اکبر نامہ، مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ؛ (۳) محمد ہاشم خان المخاطب بہ خافی خان: منتخب اللباب، مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ؛ (۴) صمصام الدولہ شاہنواز خان: مآثر الامرا، مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ؛ (۵) محمد حسین آزاد: دربار اکبری؛ (۶) نور الدین جہانگیر: تزک جہانگیری؛ (۷) شیخ فرید: ذخیرۃ الخوانین، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۸) خواجہ نظام الدین بخشی: طبقات اکبری، کلکتہ ۱۹۳۱ء؛ (۹) دیگر معاصر تواریخ کے ضروری اقتباسات کے لیے دیکھیے Elliot و Dowson : *History of India as told by its own historians*؛ (۱۰) T. W. Beale : *The Oriental Biographical Dictionary*، ۱۸۹۴ء؛ (۱۱) A. V. Smith : *Akbar the great Moghal*، آوکسفرڈ ۱۹۱۷ء [مقبول بیگ بدخشانی رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

* **کولوم بشار**: Colomb-Bechar؛ صحراء کے ضلعے کا بڑا شہر (Organisation Commune des Regions Sahariennes): جو ۷ اگست ۱۹۵۷ء کے ایک حکم کی بنا پر نیا بنایا گیا ہے۔

یہ شہر بالکل جدید ہے۔ فرانسیسی قبضہ ہونے سے پہلے، جو ۱۳ نومبر ۱۹۰۳ء میں قائم ہوا، معدودے چند گاؤں جن کی کوئی تاریخی وقعت نہیں، وادی بشار (Oued Becher) کے کناروں پر ادھر ادھر تعمیر ہو گئے تھے اور ندی سے چند کھجوروں کے ایک جھرمٹ سے جھنڈ کی پرورش ہوتی تھی۔ ۱۸۵۷ء سے کپتان ڈی کولوم Captain de Colomb نے اس علاقے کے حالات کی تفتیش شروع کی۔ اسی کے نام پر یہ نیا شہر بسا ہے اور بشار کا لفظ اس لیے بڑھایا گیا کہ مقامی روایت کے مطابق پندرھویں صدی عیسوی کے کسی ترکی سلطان (؟) نے ایک مسلمان کو اس علاقے کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ جب اپنے سفر سے واپس آیا تو صاف پانی شیشے کے برتن میں ساتھ لایا، اس لیے اس کو یہ لقب (بشّار) دیا گیا جو ب ـ ش ـ ر (خوشخبری لانا) سے بنا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے وقت اس شہر کے قریب جو کوئلے کی کانیں ۱۹۱۷ء میں دریافت کی گئی تھیں، ان سے ۱۹۴۱ء سے پوری طرح کوئلا نکالا جانے لگا۔ اسی زمانے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بحر متوسط سے نائجر Niger تک ریل چلائی جائے۔ اس ریل سے اس شہر کی ترقی کی اور تحریک ہوئی۔ جنگ کے وقت سے ارد گرد کے کوئلے کے میدان سے کوئلے کی پیداوار کی مقدار تخمیناً ۳۰۰۰۰۰ ٹن سالانہ رہی ہے؛ ۱۹۵۶ء میں یہاں حرارت سے بجلی پیدا کرنے کا Thermo-electric کارخانہ بنانے کے منصوبے تیار ہوے اور علاقے کے اندر اہم معدنی ذخیرے دریافت کیے گئے، آخری بات یہ ہوئی ہے کہ حکومت فرانس نے "کولوم بشار" اور آس پاس کے علاقے میں تحت الارادہ فضائی خدنگ (= میزائل) کی مشق کا مرکز تیار کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ۱۹۰۶ء کی ۷۰۰ کی آبادی بڑھتے بڑھتے ۱۹۵۴ء میں ۱۱۵۰۰ سے زیادہ ہو گئی جس میں (۱۹۵۴ء کی مردم شماری کے مطابق) ۳۳۵۰ یوروپی تھے۔

مآخذ: (۱) L. Geard : *L'oasis de Colomb-Becher* در *Arch. de l'Inst. Pasteur d'Algerie* ۱۹۳۳ء؛ (۲) *Bull Comite Afrique Francaise* ۱۹۳۱ء (شمارہ ۴ تا ۷)؛ (۳) A. G. P. Martin : *Les oasis sahariennes* الجزائر ۱۹۰۸ء؛ (۴) Lyautey :

Vers le Moroc. Letters du Sud-Oranais، (۱۹۰۳ - ۱۹۰۶ء)؛ پیرس ۱۹۳۲ء؛ (۵) I. Eberhardt : Dans l'Ombre chaude de L'Islam، پیرس ۱۹۲۶ء؛ (۶) J. P. Cambo : Le "Combinat" de Colomb-Bécher، در Encycl. Mens. d'O-M، ضمیمه، شماره ۴۷ تک (جولائی ۱۹۵۴ء) : دسمبر، شماره ۳۰ .

(R. LE TOURNEAU)

* **کُومُوک** : [= قُومُوق]؛ ایک ترک قبیله جو داغستان (رک بآں، خصوصاً ۹ : ۱۶۸ ببعد، جہاں قازی قُومُوق یا غازی غموق کے لزگیون Lezgians کے بارے میں معلومات درج ھیں اور وہ سیاسی احوال بھی جن کے تحت اس قوم کی ایک جماعت نے اپنے اعزہ سے علٰحدگی اختیار کر کے ترکوں کا اثر قبول کرلیا) کے شمالی حصے میں آباد ھے۔ قاضی قوموک [قوموق] کے حکمرانوں (شامخالوں) نے دسویں صدی، ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں آھسته آھسته اپنی حدود سملکت اپنے اس قدیم صدر مقام سے آگے بڑھائیں جو ساحل کے شمال مشرقی جانب پہاڑوں کے درمیان موضع کمخ میں قائم تھا .

مآخذ : (بالخصوص رک به مآخذ بذیل مادۂ داغستان ان کے علاوہ) (۱) B. Čobanzade (ب- چوبان زاده) Zamietki o yazikiei slovesnosti Kumikov، در Izv. vost. fak. Azerb. gos. Universitetà، ۱، باکو ۱۹۲۶ء، ص ۹۵ ببعد) اس کے ص ۱۳۸ پر مآخذ تا ۱۹۲۶ء درج ملذ بازه دیکھیے؛ (۲) A. Samoilovic در Zap. ۲۱ : ۱۰۲۰ ببعد .

(W. BARTHOLD)

* **کُومِیه**: ازمنۂ وسطٰی میں المغرب کے اھم ترین قبائل میں شمار ھوتا تھا۔ ایک زمانے میں یه لوگ صطفورة کے نام سے مشہور تھے، نسلاً فاتن کے واسطے سے مادغیس الابتر کی اولاد تھے ۔ روایت یه ھے که کومیة جس کے نام سے قبیله موسوم ھے، اس کے دو بھائی تھے، لمایه اور مطغرة؛ جن کی نسل سے بہت سے گھرانے وجود میں آئے اور ان میں سے بعض آج بھی موجود ھیں ۔ کومیة کے اھم ترین نمائندہ قبائل جو الجزائر کے شمال مغرب میں تلمسان اور ارشقول (رشغن) کے درمیان رھتے ھیں، حسب ذیل ھیں : بنو عابد، انھیں کی نسل سے الموحدون کے خاندان کا پہلا خلیفه عبدالمؤمن [رک بآں]، ھنین اور ندرومة کے درمیان تاجرة کے مقام پر پیدا ھوا؛ بنو ندرومة جنھوں نے اپنے نام سے ایک اھم شہر منسوب کیا؛ بنو صغارة جن کی نمائندگی آج کل ماتیلة کر رھے ھیں، بنو الول جن کا ایک گھرانا سیفة اب تک موجود ھے ۔ کومیة نے اپنے آپ کو عبدالمؤمن کا عقیدت مند ثابت کر دیا که وہ انھیں میں سے تھا ۔ الموحدون کے لشکر کا دوسرا جُند (دسته) انھیں پر مشتمل تھا، لیکن بالآخر ھسپانیه اور شمالی افریقه کی جنگوں میں اس حکمران خاندان کو سپاھی مہیا کرتے کرتے انھوں نے اپنا خاتمه کر لیا ۔ جب وہ زناتة کو خراج (رک بآں) دینے پر مجبور ھو گئے تو ان میں سے چند ایک نے ایک دوسرے فریق اولہاصة سے اتحاد کر کے الجزائر کے شمالی مغرب میں ترارة کے طاقتور وفاق کی تشکیل کر لی .

مآخذ : R. Basset : Nédromah et les Traras، پیرس ۱۹۰۱ء اور دیگر مصنفین جن کا حواله وھاں دیا گیا ھے .

(RENÉ BASSET)

کُوُنگ: لفظ کُونگ کہونگ کی بگڑی ھوئی شکل ھے ۔ یه ایک جگه کا مقامی نام ھے جو ساحل عاج Ivory Coast کی موجودہ فرانسیسی نوآبادی کے شمال میں اس حد فاصل کے قریب واقع ھے جو کوموے Comoe اور بندمه کے ایک معاون نزی Nzi کے طاس کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ھے .

مآخذ: (۱) Cap. Binger : Du Niger au Golfe

de Guinée par le pays de Kong et le Mossi، پیرس ۱۸۹۲ء، باب ۶ و ۱۳ اور ضمیمہ ۵ کا آخری حصہ؛ (۲) M. Monnier : *France Noire*، پیرس ۱۸۹۴ء، باب ۹، ۱۰ و ۱۱؛ (۳) A. Mévil : *Samory*، پیرس، بدون تاریخ [۱۸۹۹ء] باب ۸ و ۱۰؛ (۴) Salvan : *Cercle de Dabakala*، در *La Côte d'Ivoire*، ص ۳۳۴ تا ۳۶۴، اشاعت Gouvernement Général de l'Afrique occidentale Fraçaise، پیرس ۱۹۰۶ء.

(MAURICE DELAFOSSE [و تلخیص از ادارہ])

⊗ **کُوِّرَتْ** : [قرآن مجید کی سورۃ التکویر کا ایک نام]: کُوِّرت تکْوِیر سے صیغۂ ماضی مجہول ہے جو کَوْر (ک و ر) سے مشتق ہے۔ بقول امام راغبؒ اصفہانی، الکور کے معنی کسی چیز کو عمامے کی طرح لپیٹنے اور اس کو اوپر تلے گھمانے کے ہیں: ''کَوْرُ الشّی ادارتُہ و ضمّ بعضہ الی بعضٍ کَکَوْرِ العِمامۃ'' (المفردات: ۴۵۹؛ طنطاوی جوہری: الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، ۲۵ : ۸۰)؛ چنانچہ کُوِّرت کے معنی ہیں لپیٹی گئی، یعنی وہ سورت جس میں (کائنات کے مختلف مظاہر کی تباہی اور ان کے) لپیٹنے کا ذکر آیا ہے یا اس روز کا ذکر ہے جس دن سورج کی لمبی لمبی شعاعیں، جن سے سورج کے ارد گرد ہزاروں میل تک فضا میں دھوپ اور روشنی پھیلتی ہے، لپیٹ کر رکھ دی جائینگی اور آفتاب بےنور ہو جائیگا (سیّد قطب: فی ظلال القرآن، ۳۰ : ۶۰).

قرآن حکیم کی یہ سورت ۲۹ آیات پر مشتمل ہے اور مکۂ مکرمہ میں نازل ہوئی (الرّازی: التفسیر الکبیر، ۳۱ : ۶۷؛ الدّر المنثور، ۶ : ۳۱۸؛ تفسیر المراغی، ۳۰ : ۵۲). اس کی پہلی آیت ''اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ۝'' کے لفظ کُوِّرَتْ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔ ترتیب تلاوت کے لحاظ سے اس کا عدد ۸۱ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا عدد ۷ ہے۔ جو تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَہَبٍ [رلک به اللهب] کے بعد اور سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَی [رلک به الاعلی] سے پہلے نازل ہوئی (الاتقان، ۱ : ۱۰؛ تفسیر المراغی، ۳۰ : ۵۲). اس کے مضامین اور اسلوب سے بھی اس امر کی داخلی شہادت ملتی ہے کہ یہ مکۂ مکرمہ میں نازل ہونیوالی ابتدائی دور کی سورتوں میں سے ہے۔ ترتیب تلاوت کے لحاظ سے، گزشتہ سورۃ [عبس] سے اس کا ربط یہ ہے کہ سورۃ [عبس] کے آخری حصے میں انسان کی توجہ اس کی اصل حقیقت پر غور کرنیکی طرف مرکوز کی گئی ہے۔ انسان کی تخلیق، اس کی پرورش، زندگی میں خداوندی نعمتوں کی فراوانی، اس کے بعد اس کی موت اور قبر اور پھر حشر و نشر کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نفخ صور اور روز قیامت کی ہیبت اور ہولناکیوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اس روز انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بیٹوں سے بالکل بیگانہ، محض اپنی فکر میں لگا ہوگا (۸۰ [عبس] : ۱۸-۴۲)؛ چنانچہ گزشتہ سورت اور زیر نظر سورت دونوں قیامت کے احوال اور اس کی ہولناکیوں کو کھول کر بیان کرتی ہیں، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ زیر نظر سورت اپنی ماقبل سورت سے کہیں زیادہ جامع اور مفصل ہے۔ ابن کثیر نے ترمذی کے حوالے سے حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم نے فرمایا: ''مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ کَاَنَّہٗ رَاْیَ عَیْنٍ فَلْیَقْرَاْ اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ وَ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ'' (تفسیر القرآن العظیم ۴ : ۴۷۴) الترمذی: الجامع، ۱۲ : ۲۳۳) یعنی (جس کو یہ بات بھلی لگے کہ وہ قیامت کے دن کو اس طرح دیکھے جیسا کہ بچشم خود مشاہدہ کیا جاتا ہے تو وہ سورۃ کورت اور سورۃ انفطار اور سورۃ انشقاق پڑھے)۔ امام ترمذی نے ہشام بن یوسف سے بعینہ اسی مضمون کی دوسری روایت بھی بیان کی ہے، جس میں صرف سورۃ کورت

کا ذکر ہے اور دوسری دو سورتوں انفطار اور انشقاق کا ذکر نہیں کیا گیا (الترمذی : الجامع، ۱۲ : ۲۳۳)۔

اس سورت کی اہمیت اور جامعیت کا اندازہ اس کے تاریخی پس منظر سے کیا جا سکتا ہے ۔ یہ سورت نزول وحی کے اعتبار سے تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ کے بعد نازل ہوئی ۔ تبلیغ اسلام کا یہ وہ ابتدائی دور ہے جس میں رسول کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی دعوت کو ناکام بنانے کے لیے ابو لہب اور اس کے ساتھی پورا زور صرف کر رہے تھے ۔ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم اور آپ پر ایمان لانے والے صحابۂ کرام پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا تھا اور اذیت رسانی کی ہر ممکن صورت اختیار کی جا رہی تھی ۔ ابو لہب مکۂ مکرمہ میں حضور اکرم کا قریب ترین ہمسایہ تھا، چنانچہ وہ اور اس کے ساتھی گھر میں بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کو چین نہ لینے دیتے تھے ۔ آپ جہاں کہیں بھی دعوت حق کے لیے تشریف لے جاتے، معاندین آپ کے پیچھے پیچھے جاتے اور لوگوں کو دعوتِ حق کے قبول کرنے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتے (سید ابوالاعلٰی مودودی : تفہیم القرآن، ۶ : ۲۵۰ ببعد) ۔ زیر نظر سورت میں معاندین کی توجہ کو قیامت کی ہولناکیوں اور آخرت میں اپنے اعمال کی جوابدہی کی طرف مبذول کیا گیا ہے اور رسول اکرم کی بے داغ اور تابندہ زندگی کو جو انھوں نے انھیں مشرکین میں بسر کی ہے، دلیل و برہان کے طور پر پیش کر کے انھیں قرآن اور صاحب قرآن کے پیغام ہدایت کو قبول کرنے کی تلقین کی گئی ہے (دیکھیے سید قطب : فی ظلال القرآن، ۳۰ : ۳۸)۔

اس سورت کے مضامین کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلے حصے میں سورت کے آغاز سے ارشاد خداوندی ''عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ'' تک قیامت کی ہولناکیوں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے؛ دوسرے حصے میں ستاروں، رات اور صبح کی آمد کی قسم کھا کر، یعنی انھیں گواہ ٹھیرا کر یہ اعلان کیا گیا ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالٰی کی طرف سے کمال صفات سے متصف ایک فرشتے کے توسّط سے رسالت مآب پر نازل کیا گیا ہے ۔ یہ حصہ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ'' لا سے شروع ہو کر سورت کے آخر پر ختم ہوتا ہے (الجواهر فی تفسیر القرآن الکریم، ۲۵ : ۸۰؛ سید قطب : فی ظلال القرآن، ۳۰ : ۸۵ ببعد) ۔ ڈاکٹر محمد محمود حجازی نے ستاروں، رات اور صبح کی قسم کھانے کو اللہ تعالٰی کی عظیم قدرتوں کی طرف اشارہ قرار دیا ہے تاکہ انسان اس حیرت انگیز نظام پر غور و فکر سے کام لے (التفسیر الواضح، ۳۰ : ۲۲) ۔ سورت کی پہلی چھے آیات میں ان ہولناکیوں کا ذکر ہے جو قیامت سے قبل رونما ہوں گی اس کا صحیح نقشہ ابیؓ بن کعب نے اس طرح کھینچا ہے کہ ''لوگ بازاروں میں ہوں گے جب کہ آفتاب بے نور ہو جائے گا ۔ ستاروں کی مدھم سی روشنی رہ جائے گی ۔ لوگ اسی حالت میں ہوں گے کہ پہاڑ زمین پر آ گریں گے ۔ لوگ اسی پریشانی میں ہوں گے کہ ستارے بھی ٹوٹ کر گر پڑیں گے اور جنّ و انس پر اضطراب کی انتہائی پریشان کن کیفیت طاری ہو گی اور بد حواسی سے بھاگیں گے؛ نفسی نفسی کا یہ عالم ہو گا کہ مویشی، جانور، پرندے، درندے باہمی خلط ملط ہو کر بھاگ رہے ہوں گے ۔ لوگ اسی حالت میں ہوں گے کہ زمین تھر تھر کانپنے لگے گی اور انتہائی خوفناک آواز سے پھٹ جائے گی ۔ لوگ اسی حالت میں ہوں گے کہ ایک تیز آندھی آئے گی اور لوگوں کو ہلاک کر دے گی (الجواهر فی تفسیر القرآن الکریم، ۲۵ : ۸۰) ۔ اس کے بعد کی آیات میں قیامت کے واقع ہونے کے بعد کی ہولناکیوں کا ذکر کیا گیا ہے (دیکھیے کتاب مذکور)، جس میں عرب معاشرے کے بگاڑ کی

ایک انتہائی گھناؤنی رسم کی طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ اپنی بیٹیوں کو کس بربریّت سے زندہ دفن کر دیتے تھے تاکہ وہ اپنے زعم کے مطابق، عار سے محفوظ رہیں ۔ ابن کثیر نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کے حوالے سے قیس بن عاصم کا واقعہ بیان کیا ہے جس نے اپنے جرم کا اعتراف کر کے حضور اکرمؐ سے یہ درخواست کی کہ وہ اس جرم کا کیا کفّارہ ادا کرے تو حضورؐ نے اسے اونٹوں کی قربانی کرنے کے لیے کہا ۔ (تفسیر القرآن العظیم، ۴ : ۴۷۸) ۔ المراغی نے عرب معاشرے میں اس قسم کی قساوتِ قلبی کو تفصیل سے بیان کیا ہے تفسیر المراغی، ۳۰ : ۵۵) ۔ [جمال الدین] القاسمی نے الدّارمی کے حوالے سے جو روایت بیان کی ہے وہ اس قدر درد ناک ہے کہ اس نے لکھا ہے کہ حضور اکرمؐ نے جب سنا تو بے اختیار رو پڑے، آپ نے اسے دوبارہ بیان کرنے کے لیے کہا ۔ جب اس نے اعادہ کیا تو حضورؐ اسقدر روئے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی اور آپ نے اسے فرمایا : انَّ اللهَ قد وضعَ عنِ الجاهلیّة ما عملُوا ۔ فاستأنف عملک (تفسیر القاسمی، ۲۷ : ۶۰۷۲))، یعنی بے شک اللہ تعالٰی نے جاہلیت کے سابقہ اعمال سے در گزر فرمائی ہے پس تو اب سے نیک عمل کا آغاز کر [بعض محققین نے لکھا ہے کہ دوسرے معاصی کو چھوڑ کر اس کا ذکر آثارِ قیامت و احوال حشر میں کرنے سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ سب سے پہلے پرسش خون کی ہوگی اور خون کے مقدمات میں اس دفعہ کے مجرم سب سے پہلے پیش ہوں گے (عبدالماجد دریابادی : تفسیر ماجدی، ص ۱۱۶۸، مطبوعۂ لاہور)] ۔ سورت کے آخر میں رسالت محمّدی کا یقین دلایا گیا ہے اور قرآن حکیم کی حقانیت کی طرف توجہ مرکوز کی گئی ہے کہ ایسے جامع اور کامل ضابطۂ ہدایت کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ جس کا لانے والا امین ہے جسے اللہ تعالٰی نے ہر قسم کی خطا، لغزش اور خیانت سے محفوظ رکھا ہے (الرازی : التفسیر الکبیر ۳۱ : ۷۴) پس ہر وہ شخص جو ہدایت کا طالب ہے، اسے خود کو قرآن حکیم سے وابستہ کر لینا چاہیے (ابن کثیر : تفسیر القرآن العظیم، ۴ : ۴۸۰) .

مآخذ : (۱) الراغب الاصفہانی : المفردات فی غریب القرآن، مطبوعہ قاہرہ؛ (۲) السیوطی : الاتقان، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۳) السیوطی : الدرالمنثور، قاہرہ ۱۳۱۴ھ؛ (۴) الرازی : التفسیر الکبیر، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۵) ابن کثیر : تفسیر القرآن العظیم، لاہور، ۱۹۷۳ء؛ (۶) سید قطب : فی ظلال القرآن، مطبوعۂ بیروت؛ (۷) طنطاوی جوہری : الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، قاہرہ ۱۳۵۰ھ؛ (۸) محمد مصطفٰی المراغی : تفسیر المراغی، قاہرہ ۱۹۴۲ء؛ (۹) محمد جمال الدین القاسمی : تفسیر القاسمی، مصر ۱۹۱۴ء؛ (۱۰) محمد محمود حجازی : التفسیر الواضح، قاہرہ ۱۹۶۸ء؛ (۱۱) ابوالاعلٰی مودودی : تفہیم القرآن، لاہور ۱۹۷۰ء؛ (۱۲) ابو عیسٰی الترمذی : الجامع السنن، قاہرہ ۱۹۳۴ء؛ (۱۳) [عبدالماجد دریا بادی: تفسیر ماجدی، ص ۱۱۶۸، لاہور ۱۹۰۲ء].

(بشیر احمد صدیقی)

کوہاٹ : پاکستان (صوبۂ سرحد) کا ایک شہر اور ضلع، رقبہ ۲۶۹۳ مربع میل، ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی ۳۰۰۶۸۲ نفوس ہے ۔ مغربی پاکستان کے شمال مغربی صوبۂ سرحد میں واقع ہے ۔ اس کے شمال اور شمال مغرب میں کوہ سفید کا مشرقی سلسلہ ہے، مغرب میں تورغر کا پہاڑی سلسلہ ہے اور جنوب میں چورب غر کی پہاڑیاں ۔ مشرق میں دریاے سندھ بہتا ہے ۔ کوہاٹ پہاڑی علاقہ ہے، جس میں نشیب و فراز زیادہ ہیں، اوسط بلندی دو ہزار فٹ کے قریب ہے ۔ اس علاقے میں بے شمار موسمی ندیاں بہتی ہیں جن میں کوہاٹ توی اور

تیرا توی کے دریا بھی شامل ھیں ۔ بارش غیر یقینی ہے، اوسط مقدار ۱۶٫۸ء ہے ۔ اس ضلع میں تین تحصیلیں ھیں: کوہاٹ، تیری اور ھنگو ۔ اس علاقے میں بنگش اور خٹک نامی دو پٹھان قبیلے آباد ھیں ۔ قبیلۂ بنگش میراں زئی کی وادی اور ضلع کے مغربی حصے میں آباد ہے اور خٹک اس ضلع کے مشرقی حصے میں دریاے سندھ کے کنارے تک پھیلے ھوے ھیں ۔ یہاں کے لوگوں کی عام زبان پشتو ہے ۔

عام پیشہ زراعت ہے ۔ باجرہ، گندم، جوار چنے اور جو کی پیدوار ھوتی ہے ۔ ٹوکریاں، چٹائیاں اور چمڑے کا مال بنانا، کپڑا بننا یہاں کی دستکاریاں ھیں ۔ جنوبی سلسلۂ کوہ کے وسطی حصوں میں ۔ یعنی بہادر خیل اور جٹہ اسمٰعیل میں نمک کے بہت بڑے ذخیرے ھیں ۔ بہادر خیل کے قریب نمک کانوں سے نکالا جاتا ہے ۔

کوہاٹ (آبادی ۱۹۰۱ء میں ۳۰۸۹۱) پشاور سے ۳۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے، یہاں فوجی چھاؤنی ہے ۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ ایک مستحکم مقام ہے، جو درۂ توم کے راستوں کی حفاظت کرتا ہے ۔

مآخذ : (۱) *Imperial Gazetteer of India*، *Provincial Series N.W.F.P.*، کلکتہ ۱۹۰۸ء، ص ۱۶۷ ببعد.

(R. WHITEHEAD)

⊗ تعلیقہ : کوہاٹ کو پختہ سڑک کے ذریعے ایک طرف پشاور اور دوسری طرف بنوں کے ساتھ ملایا گیا ہے ۔ مشرق میں دریاے سندھ پر پل تعمیر کرکے ریلوے لائن راولپنڈی تک پہنچائی گئی ہے ۔ اس طرح قصبے کا رابطہ بیرونی علاقوں سے قائم ہو گیا ہے ۔ میٹرک تک تعلیم مفت ہونے کے باعث پڑھنے کا شوق بڑھ رہا ہے ۔ یہاں ایک ڈگری کالج بھی ہے ۔ پاکستان بھر کی بری، بحری اور ہوائی افواج کے کمیشن کے امیدواروں کے آخری انتخاب (ISSB) کا مرکز بھی یہیں ہے ۔ جس نے شہر کی اھمیت میں اضافہ ھو گیا ہے امرود، انار، سیب، خوبانی وغیرہ پھل بھی علاقے میں پیدا ھوتے ھیں اور ادھر ادھر بھیجے جاتے ھیں [عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

کوہ بابا : کوہ بیک، کوہ مالک سیاہ، کوہ سفید، کوہ سیاہ، کوہ تافتان ۔ افغانستان کا سب سے بڑا کوہستانی نظام ھندو کش اور اس کا وہ عظیم مغربی سلسلہ ہے جو کابل کے مغرب میں واقع کوہ کوہ بابا اور اس دہرے سلسلے پر مشتمل ہے جسے دریاے ھری رود، جو مغربی سمت میں ھرات کی جانب اور اس کے پاس سے بہتا ہے، تقسیم کرتا ہے اور جس کا پانی بھی بہہ کر اس میں جاتا ہے ۔ کوہ سفید اس دہرے سلسلے کا جنوبی حصہ ہے ؛ شمالی سلسلہ مشرق سے مغرب کی طرف جاتا ھوا علی الترتیب پیرو پے می سس (Paropamisus) کوہ بیک اور کوہ سیاہ کے نام سے مشہور ہے، سفید کوہ اس اہم سلسلۂ کوہ کا بھی نام ہے ۔ یہ وادی جلال آباد کو جو دریاے کابل پر واقع ہے، وادی کرم اور آفریدی تیراہ سے جدا کرتا ہے، اس کی بلند ترین چوٹی ''سکا رام'' سطح سمندر سے ۱۵۶۰۰ فٹ بلند ہے ۔ ایران سے ملنے والی بلوچستان کی مغربی سرحد پر پہاڑوں کے جو متوازی سلسلے ھیں، وہ کوہ تافتان کے نام سے موسوم ھیں، ان کی انتہائی بلندی ۱۳۵۰۰ فٹ ہے اور یہ شمال مغربی سمت پھیلتے ھوے کوہ مالک سیاہ سے جا ملتے ھیں جو سیستان کے مغرب میں واقع ہے ۔

کوہ بابا کی بلند چوٹیوں سے افغانستان کے دریاؤں یعنی ھری رود، ھلمند اور دریاے کابل کے سر چشمے نظر آتے ھیں اور یہ چوٹیاں ۱۷۰۰۰ فٹ کی بلندی تک جا پہنچتی ھیں (شاہ فولادی کی بلندی :

۱۶۸۷۰ فٹ ھے) ۔ یہ سلسلۂ کوہ ان پہاڑوں کا ایک حصہ ھے جو جغرافیائی اعتبار سے براعظم ایشیا کو تقسیم کرتے ھیں ۔ یہ پہاڑ، ناھموار اور بے آب و گیاہ ھیں، ان پر چڑھنے کے لیے مشکل ھی سے کوئی راستہ ملتا ھے ۔ سر ٹومس ھولڈچ Sir Thomuas Holdich نے *The Gates of India* میں اس خطے کے بارے میں لکھا ھے کہ یہ ایک بنجر سطح مرتفع ھے جس میں نشیب و فراز بہت ھیں اور جسے پہاڑوں کے تنگ سلسلے کاٹتے ھیں ۔ ان پہاڑوں کی چوٹیاں ۱۲ ھزار سے ۱۴ ھزار فٹ تک بلند ھیں ۔ یہاں موسم سرما طویل اور شدید ھوتا ھے ۔ اس موسم میں یہاں سے گزرنا غیر ممکن ھو جاتا ھے یہاں مغلوں کی ایک مختصر سی آبادی ھے جو بڑی عسرت اور تنگی کی زندگی بسر کرتی ھے ۔ ھری رود مذکورۂ بالا عمودی اور ھموار ڈھلانوں والے پہاڑوں کے درمیان ایک گہری اور تنگ گھاٹی میں سے گزرتا ھوا ھرات کی جانب بہتا ھے ۔ پہاڑوں کے ان سلسلوں کی بلندی بتدریج کم ھوتی چلی جاتی ھے، حتٰی کہ وہ مشہد کے قریب ایران کے میدانوں میں نظر نہیں آتے ۔

وسطی افغانستان کے پہاڑوں میں ابھی تک عملی طور پر کوئی تحقیق نہیں ھو سکی ۔

مآخذ : رک بذیل مادۂ افغانستان .

(R. B. WHITEHEAD)

⊗ **کوہ مکلی** : یہ بحیرۂ عرب کے ساحل اور کوہ مکران کو ملانے والے ھاڑہ اور پب وغیرہ پہاڑوں کی سب سے چھوٹی شاخ ھے ۔ یہ ٹھٹھہ (سندھ) کے بالکل متصل اور تقریباً بارہ میل لمبی ھے ۔ جس کے چھے مربع میل کے رقبے میں مشرقی ممالک کا سب سے بڑا گورستان ھے ۔ اس میں موجود مقبرے بہت ممتاز ھیں ۔ تحفۃ الکرام میں ھے کہ قدیم زمانے میں یہاں سہسہ لنگ کے تالاب پر عالیشان محلات بنے ھوے تھے، جو اب نابود ھو چکے ھیں (ترجمۂ اردو، ص ۵۶۶) ۔ ۷۱۱ء سے پہلے یہاں ایک ھندو برھمن خاندان کی حکومت تھی ۔ محمد بن قاسم کی آمد سے یہاں کی حکومت عربوں کو ملی ۔ ۱۰۲۶ء میں محمود غزنوی کے وزیر عبدالرزاق نے ٹھٹھہ کو فتح کیا اور خلیفۂ بغداد کے مقرر کردہ عرب حاکموں کو یہ جگہ چھوڑنی پڑی ۔ اس کے کچھ عرصے بعد سومرہ لوگ ٹھٹھہ پر قابض ھوے جن سے فیروز تغلق کے عہد میں عمر بن بینو، سمّہ خاندان کے ایک سردار نے ۱۳۵۱ عیسوی کے قریب اقتدار حاصل کیا ۔ سموں کا خطاب جام تھا ۔ انھوں نے کوہ مکلی پر ساموئی میں اپنا صدر مقام بنایا جو ٹھٹھہ سے تین میل شمال مشرق میں تھا ۔ انھیں کے عہد سے مکلی کو غیر معمولی اھمیت حاصل ھوئی ۔

بارش کے موسم میں یہاں کے جا بجا تالاب پانی سے لبریز ھو جاتے ھیں اور ھر طرف ھریالی ھی ھریالی نظر آتی ھے ۔ پہلے یہ ھوا کرتا تھا کہ ٹھٹھے کے لوگ دل بہلانے کے لیے گروہ در گروہ مکلی پر اس طرح محفلیں جمایا کرتے تھے جیسے قریب کے دوسرے باغات میں ۔ سمہ عہد تھا اور غالباً جام جونا کا زمانہ، جب شیخ حماد جمالیؒ ابن شیخ رشید الدین نے مکلی پر ساموئی کے زیریں حصے میں عبادت کے لیے خانقاہ قائم کی جو بالآخر سلوک و معرفت اور علوم ظاھری کی تعلیم کا مرکز بن گئی ۔ جب جام تماچی کو سندھ کی حکومت ملی تو وہ ایک کثیر رقم بطور نذر لے کر شیخ حماد جمالی کی خدمت میں حاضر ھوا اور دعا کی التماس کی ۔ انھوں نے فرمایا کہ اس رقم سے میری خانقاہ کے متصل ایک مسجد تعمیر کرا دو ۔ اس نے مسجد تعمیر کرائی جو مسجد مکلی کے نام سے مشہور ھوئی اور بعد میں تمام پہاڑی بھی اسی نام سے موسوم ھوئی ۔ شیخ

موصوف نے تعمیر مسجد کے بعد سمون سے کہا کہ آئندہ سے جو لوگ فوت ہوں ان کی قبریں اس مسجد کے آس پاس ہی بنوائیں، چنانچہ سلاطین سمّہ اور دوسرے لوگ یہاں دفن ہونے لگے، ورنہ اس سے پہلے سمون کا قبرستان پیرآر (پیر پٹھو) تھا۔ مسجد کی چار دیواری جام نظام الدین عرف جام نند کے مقبرے کے سامنے خستہ حالت میں موجود ہے۔ اعجاز الحق قدوسی نے مسجد مکلی کا سال تعمیر ۷۹۲-۷۹۳ھ/ ۱۳۸۹-۱۳۹۰ء بتایا ہے (دیکھیے : تاریخ سندھ، ج ۲، حاشیہ ص ۳۱۹)۔ شیخ حماد جمالیؒ جب فوت ہوے تو ان کا مزار بھی وهیں بنا جہاں ان کی خانقاہ تھی۔ ان کا مقبرہ مکلی میں جام نند کے مقبرے کے قریب اور مسجد مکلی کے برابر نہایت خستہ حالت میں نظر آتا ہے لیکن تحفة الکرام کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ شیخ حماد جمالیؒ سے پہلے میاں لال جو مخدوم لعل شہباز قلندر (م۶۷۳ھ/ ۱۲۷۴ء) کے سگے یا چچیرے بھائی تھے، یہاں دفن ہو چکے تھے۔ ان کی قبر شیخ جیو کے مزار کے مشرق میں ہے (دیکھیے : تحفة الکرام، ص ۷۰۲)۔ اس طرح یہ پہاڑی اولیاے کرام اور سلاطین و اسرا کا ایک ایسا قبرستان بن گئی جو اپنی عظمت اور تاریخ کے اعتبار سے ممتاز ہے۔

مکلی کی وجہ تسمیہ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک پاکدامن، خدا رسیدہ خاتون جس کا نام مکلی تھا، مسجد کی محراب کے زیر سایہ مدفون ہیں، ان کی وجہ سے شیخ حماد نے مسجد کو مسجد مکلی کے نام سے موسوم کیا پھر رفتہ رفتہ قبرستان کا بھی یہی نام پڑ گیا۔

سمّہ حکمرانوں کا عہد سلطنت ۷۵۱-۹۲۶ھ/ ۱۳۵۰-۱۵۱۹ء تک رہا اور اگر اس میں سلطان فیروز شاہ بن سلطان نظام الدین جام نندہ کا وہ زمانہ بھی شامل کر لیا جائے جو اس نے شاہ بیگ ارغون کے ماتحت گزارا تو پھر یہ عہد سلطنت شوال ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء تک رہا [دیکھیے : تاریخ معصومی، ص ۶۳-۶۵] - ۱۷۷ سال کے اس عرصے میں بعض نامور اولیاے کرام اس قبرستان میں دفن ہوے۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ (م ۱۲۶۲ء) کی اولاد میں سے شیخ نعمت اللہ ٹھٹھے میں آئے، یہ صاحب کمال بزرگ تھے۔ ٹھٹھے میں وفات پائی اور مکلی میں دفن ہوے۔ ان کے فرزند شیخ جیو (جیہ) بھی مقتدر ولی اور عارف تھے۔ تذکرۂ صوفیاے سندھ میں انہیں چراغ مکلی، کہا گیا ہے اور تحفة الکرام میں وفور تجلیات کے باعث مکلی کا دریا۔ ہر ماہ کے پہلے پیر کو مزار پر عقیدتمندوں کا بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ رات عبادت میں گزرتی تھی اور وجد و سماع کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ پوری مکلی پہاڑی پر سب سے ممتاز درگاہ انہیں کی ہے۔ اس وقت ان کے مزار پر ایک بڑا گنبد ہے جس میں کئی قبریں ہیں۔ ان کی درگاہ کے عقب میں ان کے والد کی قبر ہے۔ شیخ طلحہ بھی شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی اولاد میں سے تھے۔ کامل ولی تھے اور مکلی ہی میں مدفون ہیں۔ شیخ حمادؒ کی خانقاہ کے عقب میں ایک بزرگ قاضی عبداللہ بن تاجو کا مزار ہے۔ قطب الاقطاب سید محمد حسین پیر مراد ۸۹۳ھ/ ۱۴۸۷ء میں فوت ہوے۔ جن کا سلسلۂ نسب بیسویں پشت میں حضرت امام موسی کاظمؒ سے ملتا ہے، انھوں نے ٹھٹھے میں مسجد صفہ تعمیر کرائی۔ ان کی تبلیغی کوششوں سے ہزاروں لوگ مستفیض ہوے۔ مکلی میں ان کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ سمّہ عہد کے اختتام کے قریب سید محمد مہدی جونپوری ۹۰۶ھ/ ۱۵۰۰ء میں سندھ آئے اور مکلی پہاڑی پر اقامت پذیر ہوے۔ متعدد مقتدر

اصحاب ان کے مرید بنے ۔ بعد میں میر محمد یوسف رضوی بھکر کی سکونت ترک کر کے ٹھٹھے آئے اور عبادت و ریاضت کے لیے مکلی میں اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں سید محمد مہدی جونپوری ٹھیرے تھے ۔ ان کا شجرۂ طریقت سید صاحب موصوف سے ملتا تھا ۔ ہر شخص میر صاحب کی بزرگی اور ولایت کا معترف تھا ۔ فارسی کے شاعر بھی تھے ۔ مکلی پر ان کا مزار ہے ۔

ابتدائی زمانے ھی میں سمّہ عہد کے قریب قریب مخدوم بلالی (م ۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء) شیخ حسین صفائی (م ۹۳۱ھ/ ۱۵۲۴ء)، سید عیسی لنگوٹی (م ۹۳۱ھ/۱۵۲۴ء)، مخدوم احمد (م ۹۳۴ھ/ ۱۵۲۷ء) ، مخدوم رکن الدین عرف مخدوم مٹو (م ۹۴۹ھ/ ۱۵۴۲ء)، مخدوم میران بن مولانا یعقوب (م ۹۴۹ھ/ ۱۵۴۲ء)، سید علی ثانی شیرازی (م ۹۷۱ھ/ ۱۵۶۳ء)، مخدوم جمعه (م ۹۸۱ھ / ۱۵۷۳ء کے قریب)، مخدوم اسمٰعیل سوسرہ (م ۹۹۸ھ / ۱۵۸۹ء) اور مخدوم نوح ھالائی (م ۹۹۸ھ / ۱۵۸۹ء) بھی مکلی کے قبرستان میں دفن ھوے ۔ یہ تمام اعلٰی پائے کے بزرگ تھے ۔ غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے سیّد شاہ منبہ اور شاہ عبداللہ حسنی کے مزارات مکلی پہاڑی پر ھیں ۔ ثانی الذکر ۱۰۹۳ھ/ ۱۶۸۲ء کے لگ بھگ فوت ھوے ۔ سندھ میں سیّد عبداللہ صحابی کے لقب سے مشہور ھیں ۔ ہر خاص و عام کا آج بھی ان کے مزار پر ھجوم رھتا ھے ۔ مزار کی جدید عمارت ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء میں تعمیر ھوئی اور سارے مکلی میں یہی ایک عمارت نئی وضع کی نظر آتی ھے ۔ اس قبرستان میں بعد کے دفن ھونے والے بزرگوں میں مخدوم ابوالقاسم معروف حضرت نقشبندی (م ۷ شعبان ۱۱۳۸ھ/ ۱۰ اپریل ۱۷۲۶ء) کا مقام بڑا بلند ھے ۔ سندھ میں سلسلۂ نقشبندیہ کو غیر معمولی فروغ انھیں کی وجہ سے حاصل ھوا ۔ مستجاب الدعوات تھے ۔ ان کے مریدین اور خلفا کی تعداد کثیر ھے ۔ ایک بزرگ نے انھیں ''خورشید مکلی'' کہا ھے، شاعر بھی تھے ۔

مکلی میں دفن ھونے والے چند بزرگوں کا سطور بالا میں نام لیا گیا ھے ورنہ میر علی شیر خان تحفة الکرام میں لکھتے ھیں کہ بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق سوا لاکھ اولیاے کرام یہاں مدفون ھیں [دیکھیے : ص ۵۹۷] ۔ اگر اس تعداد کو مبالغہ آمیز کہا جائے تو ضلع ٹھٹھہ کی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں جو تعداد بتائی گئی ھے، وہ قرین قیاس نظر آتی ھے ۔ اس میں کہا گیا ھے کہ مکلی میں تین ہزار اولیا اللہ کی قبریں ھیں ۔ اور ان میں ''۴۷'' ایسے ھیں جن کا سندھ میں بڑا احترام کیا جاتا ھے ۔ سندھ سے متعلق کتب کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے ایسے بزرگوں کے نام مل جاتے ھیں جن کے مزارات مکلی پہاڑی پر ھیں ۔ سندھ میں طریقت کے تین سلسلے قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ قائم رھے ھیں اور ان تینوں سلسلوں کے بزرگ اس قبرستان میں مدفون ھیں ۔ مزید معلومات کے لیے ذیل میں دیے ھوے مآخذ کے علاوہ دیکھیے مکلی نامہ اور حواشی مکلی نامہ مرتبۂ حسام الدین راشدی.

صوفیہ کے علاوہ علما و فضلا بھی مکلی پر مدفون ھیں ۔ ان میں سے ایک محمد معین ھیں جو صوفی با صفا ھونے کے علاوہ غیر معمولی تبحر علمی کے مالک تھے ۔ عربی اور فارسی کی بعض کتابیں ان کی یادگار ھیں ۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے ۔ ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء میں فوت ھوے اور اپنے شیخ مخدوم ابوالقاسم کی پائنتی دفن ھوے ۔ مخدوم محمد ھاشم (م ۱۷۶۱ء) بھی علم و فضل میں شہرت رکھتے تھے ۔ مکلی کے قبرستان میں مزار

ہے ۔ اسی طرح میر علی شیر قانع ٹھٹھوی (م ۱۷۸۸ء) ہیں جو خاندان شکر اللّٰہی کے قبرستان مکلی میں دفن ہیں۔ میر عظیم الدین عظیم درباری شاعر تھے ۔ ۱۸۳۳ء میں فوت ہوئے اور مکلی میں دفن ہوئے ۔ مقبروں کے علاوہ مکلی پر مسجدیں بھی ہیں۔ چنگیز خان کی اولاد میں سے تنہا خسرو خان چرکسی نے ٹھٹھہ، مکلی اور شہر کے گرد و نواح میں متعدد مسجدیں اور درگاہیں تعمیر کرائی تھیں ۔ قدیمی مساجد کے علاوہ مکلی کے قبرستان کی بھی ایک مسجد ہے ۔

اب مکلی کے قبرستان میں دفن ہونے والے سلاطین اور امرا کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ہے ۔ سطور بالا میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ شیخ حماد جمالی نے سلاطین سمہ سے کہا تھا کہ آئندہ فوت ہونے والوں کو مسجد مکلی کے آس پاس دفن کیا کریں ۔ چنانچہ اس کے بعد تمام جام صاحبان وہاں دفن ہوئے ۔ ان میں سے جام نظام الدین عرف جام نندو (۱۴۶۰ تا ۱۵۰۸ء) کا مقبرہ بہت نمایاں ہے ۔ اس کا دور حکومت سمہ حکمرانوں کا سنہری زمانہ تھا ۔ اس کے مقبرے کا کچھ حصہ اب خستہ حالت میں ہے ۔ اس کے باوجود سنگتراشی کے اس فن کا یہ بہترین نمونہ ہے جسے نیم خود مختار عرب حکمرانوں نے پندرھویں صدی عیسوی میں اسلامی اور مغربی ہند کے فن کے امتزاج سے ٹھٹھے میں فروغ دیا ۔ مذکورۂ بالا مسجدیں بھی اسی فن تعمیر کی نمائندگی کرتی ہیں ۔ ان کے علاوہ میرزا عیسٰی ترخان اور ان کی اولاد کے مقبرے ہیں ۔ میرزا عیسٰی ترخان زیریں سندھ کا پہلا ترخان حکمران تھا ۔ ان کے مقبرے کا عکس دس رُپے (روپے) کے نوٹ کی پُشت پر چھپتا رہا ہے ۔ حکمرانوں کے ان مقبروں کے ساتھ محکمۂ آثار قدیمہ نے میرزا جانی بیگ ترخان، مرزا غازی بیگ ترخان، میرزا طغرل بیگ، نواب امیر خان خلیل اور دیوان شرفہ خان کے مقبروں کو محفوظ قدیمی عمارات قرار دے دیا ہے اور کتبے لکھوا دیے ہیں ۔ فن تعمیر کے اعتبار سے دیوان شرفہ خان کے مقبرے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا گنبد سرخ اینٹوں سے بنا ہوا ہے جس میں نیلے سبز رنگ کی مینا کاری کی گئی ہے دوسرے مقبروں کے گنبد سفید ہیں ۔ مغلوں کی حکومت شروع ہوئی اور ان کے مقرر کردہ صوبیدار ٹھٹھے آنے لگے تو بعض یہاں فوت ہوئے اور مکلی پہاڑ پر دفن ہوئے ۔ ان کے مقبرے مکلی کے ممتاز مقبروں میں شامل ہیں۔

الغرض صوفیہ اور علما کے مقابر، سلاطین اور شاہی صوبیداروں کی شاندار قبریں، ان پر محراب نما یا گنبد نما چھتیں مکلی پہاڑی پر اپنی عظمت اور شان دکھاتی نظر آتی ہیں ۔ ان کے درمیان خستہ حال گنبد اور حجرے اور سیکڑوں سنگین تابوت یا قبریں موجود ہیں ۔ چودھویں سے اٹھارھویں صدی عیسوی تک سندھ میں جو فن تعمیر رائج رہا، اس کے بھی یہاں بےمثال نمونے ملتے ہیں ۔ پہاڑی میں سے ایک سڑک بنائی گئی ہے جس پر سے ادھر ادھر مزارات پر جانا آسان ہے ۔ قبرستان کی تاریخی عظمت کے زیر نظر سیاح لوگ یہاں آتے جاتے رہتے ہیں ۔ جنگ شاہی ریلوے سٹیشن سے پکی سڑک پہنچتی ہے ۔ پہاڑی پر قومی شاہراہ کے ساتھ ساتھ ہاشم آباد کے نام سے ایک مضافاتی بستی تعمیر ہوئی ہے جو ٹھٹھے سے دو میل دور ہے ۔ ضلع کے انتظامی دفاتر اسی جگہ واقع ہیں ۔

مآخذ : (۱) میر علی شیر قانع : تحفۃ الکرام، مترجمۂ اختر رضوی، کراچی ۱۹۵۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۲) میر محمد معصوم : تاریخ معصومی، مترجمۂ اختر رضوی، کراچی ۱۹۵۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۳) اعجاز الحق قدوسی : تاریخ سندھ، ج ۲، لاہور ۱۹۷۴ء، بمدد اشاریہ؛ (۴)

اعجاز الحق قدوسی : تذکرۂ صوفیاے سندھ، کراچی ۱۹۵۹ء؛ (۵) *Gazetteer of the Province of Sindh*، کراچی ۱۹۰۷ء، بمدد اشاریہ؛ (۶) *Thatta District Census Report,* "*Census of Pakistan, 1961*"، مطبوعۂ کراچی [یہ مقالہ عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

⊗ **کوہِ نُور** : کم از کم ایشیائی ممالک میں جو شہرت کوہ نور کو حاصل ہے وہ شاید کسی دوسرے ہیرے اور قیمتی پتھر کو حاصل نہیں، حالانکہ دوسرے قیمتی پتھروں کے مقابلے میں نہ تو یہ وزن میں زیادہ بڑا ہے، نہ کوئی اور خاص امتیازی شان رکھتا ہے - وجہ غالبًا یہ ہے کہ قدیم زمانے ہی سے اس کی قدر و قیمت کے متعلق عجیب عجیب افسانے مشہور رہے - جن کا ذکر آگے آئے گا.

اس میں شک نہیں کہ سلطنت مغلیہ کے خزانے میں بابر کی پانی پت کی فتح سے لے کر نادر شاہ کے حملے تک اس سے زیادہ وزنی ہیرے کا پتا نہیں چلتا - (دیکھیے *The Mughal Treasury of the Indian Mughuls*، ص ۲۳۰ تا ۲۳۵) تاہم خزانۂ شاہی سے باہر ہندوستان ہی میں بعض ایسے ہیرے تاریخوں میں مذکور ہیں جو وزن میں کوہ نور سے کہیں زیادہ تھے اور جن میں سے ایک کی قیمت شاہجہان کے زمانے میں ساڑھے چار لاکھ روپے بتائی جاتی تھی (کتاب مذکور، ص ۲۳۶ تا ۲۳۷) - دنیا میں بہت سے ایسے ہیرے ہیں جن سے وزن اور قیمت کے لحاظ سے کوہ نور مقابلہ نہیں کر سکتا (کتاب مذکور، جدول ۳، ص ۲۴۲ تا ۲۴۹) - کوہ نور صحیح معنوں میں اس ہیرے کا نام ہے جو ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے کے وقت دہلی کے خزانۂ شاہی میں موجود تھا اور اب انگلستان کے شاہی جواہرات میں شامل ہے - اس ہیرے کی تاریخ ۱۷۳۹ء سے لے کر آج تک باوثوق اور معتبر کتب تواریخ پر مبنی ہے - سلسلۂ ثبوت کی تمام کڑیاں مضبوط ہیں اور اس پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے. ۱۷۳۹ء سے قبل کی تاریخ بھی معتبر حوالوں پر مبنی ہے، مگر کہیں کہیں ثبوت کی کڑیاں کمزور ہیں اور محققین میں جا بجا اختلاف ہے اس لیے ترتیب تاریخی کو نظر انداز کر کے یہ بہتر ہو گا کہ ہم آخری حصے کو پہلے قلمبند کریں، کیونکہ اس کی بنیاد مضبوط ہے.

''کوہ نور'' کا ذکر تاریخ میں نادر شاہ کے زمانے میں آیا ہے - نادر شاہ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا اور وہ دہلی کے خزانوں پر متصرف ہوا تو اس وقت ایک بڑا ہیرا اس کی نظر سے گذرا - اس کی چمک دمک سے نادر شاہ ایسا متأثر ہوا کہ اس لیے اس کا نام ''کوہ نور'' رکھ دیا - اس وقت سے اس کا یہی نام مشہور ہے (عمدۃ التواریخ از موہن لال، دفتر دوم، ص ۱۳۱).

۱۷۴۷ء میں نادر شاہ مارا گیا اور یہ ہیرا اس کے بعد بہت سے بادشاہوں کے ہاتھوں سے منتقل ہوتا ہوا شاہ شجاع کے پاس پہنچا - شاہ شجاع کے تخت کابل پر بیٹھنے کے بعد الفنسٹن Elphinstone جب اس سے ۱۸۰۹ء میں پشاور میں ملا تو اس نے شاہ شجاع کو یہ ہیرا اپنے بازو پر باندھے ہوئے دیکھا.

شاہ شجاع اور اس کے بھائیوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں اور اِن کا سلسلہ نہ صرف کابل تک محدود رہا بلکہ کشمیر اور پنجاب تک پھیل گیا - حتی کہ شاہ شجاع قید ہوا اور اسے جان کا خطرہ لاحق ہو گیا - اس کی بیوی وفا بیگم نے (جو اس وقت لاہور میں تھی) رنجیت سنگھ (م ۱۸۳۹ء) سے وعدہ کیا کہ اگر رنجیت سنگھ شاہ شجاع کو رہائی دلوا دے تو وہ کوہ نور اسے دے دیگی - آخر کار شاہ شجاع نے رہائی پا کر بہت پس و پیش کے بعد کوہ نور

رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیا۔

ایک انگریز مصنف کا بیان ہے کہ رنجیت سنگھ اسے اکثر پہنا کرتا تھا۔ (ظفر نامۂ رنجیت سنگھ از دیوان امر ناتھ، طبع سیتا رام کوہلی)، ص ۱۷۰، ۱۷۱)، مرتے وقت رنجیت سنگھ نے وصیت کی کہ یہ ہیرا جگن ناتھ کے مندر کو دیا جائے، مگر اس خواہش کی تعمیل نہ ہو سکی۔ ۱۸۴۹ء میں جب دلیپ سنگھ نے تخت چھوڑا تو یہ ہیرا انگریزی حکومت کو دے دیا گیا۔ آخر کار اگلے سال ملکۂ وکٹوریہ کو نذر کر دیا گیا۔ ۱۸۵۱ء میں لنڈن کی ایک بڑی نمائش میں یہ ہیرا رکھا گیا۔ اس وقت اس کا وزن ۱۸۶۰.۶ (قیراط انگریزی (= 589.52 grs. Troy) تھا۔ ۱۸۵۲ میں اسے لنڈن میں دوبارہ تراشا گیا جس پر ۳۸ دن اور ۸۰۰۰ پاونڈ خرچ ہوئے۔ اس تراشے سے اس کا وزن ۱۸۶.۰۶ قیراط انگریزی سے گھٹ کر ۱۰۶$\frac{1}{16}$ قیراط انگریزی (اور بقول ایک دوسرے مصنف کے ۱۰۲$\frac{1}{4}$ قیراط) رہ گیا۔ اب ہم ۱۸۳۹ء سے قبل کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں: بابر نامہ میں مذکور ہے کہ جب مصنف (بابر) نے پانی پت کی جنگ میں ابراہیم لودی کو شکست دی جس میں گوالیار کا راجہ بکرماجیت مارا گیا تھا تو ہمایوں اس کے آنے سے پہلے آگرے پہنچ گیا۔ اس وقت بکرماجیت کے کنبے نے کچھ جواہرات ہمایوں کی نذر کیے، ان میں یہ ہیرا بھی تھا، جو ہمارا موضوع بحث ہے۔ جب بابر آگرے پہنچا تو ہمایوں نے یہ ہیرا بابر کی خدمت میں پیش کیا، لیکن بابر نے اسے ہمایوں ہی کو دے دیا۔ اس کی قیمت کے متعلق بابر نامہ کے مختلف نسخوں اور ترجموں میں بے حد اختلاف ہے اور ابو الفضل کا بیان ان سب سے الگ ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے *Imperial Treasury of the Indian Moghuls*، ص ۱۸۳ و حاشیہ ۲)۔ ایک روایت کے مطابق اس ہیرے کی قیمت تمام دنیا کے روزانہ خرچ کے نصف کے برابر ہے (ایک اور روایت کے مطابق تمام دنیا کے ایک دن کے خرچ کے برابر ہے)۔ اور ایک تیسری روایت یہ ہے کہ اس کی قیمت تمام دنیا کی اڑھائی دن کی خوراک کے مساوی ہے۔ اس کے وزن کے بارے میں بابر لکھتا ہے کہ یہ ۸ مثقال ہے، جو برابر ہے، ۲۲۱.۰۶ جوہری رتی = ۵۸۹.۴۴ گرین کے (اوزان کے متعلق مصنف ھذا نے اپنی کتاب، باب ۱، حصہ ۱، ص ۱۱۷ تا ۱۳۴ پر مفصل بحث کی ہے)۔ یہ صحیح طور پر پتا نہیں چلتا کہ یہ ہیرا گوالیار کے راجاؤں کے قبضے میں کیسے آیا۔ البتہ اتنا سراغ ملتا ہے کہ اسی وزن کا ایک ہیرا ۱۲۹۴ء سے قبل مالوے کے راجاؤں کے پاس تھا۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ ۱۲۹۴ء میں علاء الدین نے اپنے چچا جلال الدین خلجی کے عہد میں مالوے پر حملہ کیا اور اس کو فتح کر کے اجین کے خزانوں پر قابض ہو گیا (دیکھیے N. Story : *Maskelyne's article, the Kohi-Nur*، تنقیدی مقالہ در *Nature*، ۸ اکتوبر ۱۸۹۱ء، ص ۵۵۶)۔ قیاس ہے کہ شاہی جواہرات کے زمرے میں وہ ہیرا بھی خلجیوں کے خزانے میں آ گیا ہوگا۔ مگر پھر بھی یہ ثابت نہیں کہ یہ علاء الدین خلجی کے قبضے سے گوالیار کے راجاؤں کے پاس کیسے پہنچا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر پھرتا پھراتا مارواڑ کے قریب پہنچا تو راجا مالدیو کا ایک کارکن سوداگر کے بھیس میں ہمایوں کے خیمے میں آیا اور اس نے اس ہیرے کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہمایوں اس کی چال سمجھ گیا۔ ابوالفضل لکھتا ہے ''حضرت جہانبانی فرمودند کہ بایں مشتری خاطر نشان کنید کہ امثال این جواہر گرانبہا

بخریدن بہم نمی رسد ۔ یا بجوہر شمشیر آبدار بدست افتد کہ رائے جہان آرائے باو انضمام یافتہ باشد یا بعنایت پادشاہان والا میسر مے شود'' ۔ (اکبر نامہ دفتر اول، ص ۱۸۰) ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ہیرے کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی ۔ پھر ہمایوں ہندوستان کی فتح سے مایوس ہو کر ایران پہنچا تو شاہ ایران نے ہمایوں کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا ۔ ہمایوں نے احسان مندی کے طور پر یہ ہیرا مع ۲۵۰ بدخشی لعلوں کے شاہ طہماسپ کے پیش کر دیا "*Babar's Diamond*" : Beveridge در *Asiatic Quarterly Review* جنوری تا اپریل ۱۸۸۹ء، ص ۳۷۰ تا ۳۸۹) ۔ ایک طرف ابوالفضل اس تفصیل کے دوران میں لکھتا ہے کہ ان تحائف کی قیمت اس سے چار گنا زیادہ تھی جو ہمایوں کے استقبال اور تواضع پر خرچ ہوا، دوسری طرف خور شاہ سفیر ابراہیم قطب شاہ والی گولکنڈہ کا بیان ہے کہ شاہ طہماسپ کی نظروں میں یہ الماس کچھ زیادہ نہیں جچا ۔ یہی سفیر لکھتا ہے کہ شاہ ایران نے یہ الماس تحفے کے طور پر برہان نظام شاہ والی احمد نگر کے پاس آقائے اسلام سہتر جمال کے ہاتھ بھیج دیا ۔ اس الماس کے اس طرح ہندوستان واپس آنے کی تائید تاریخ فرشتہ سے بھی ہوتی ہے ۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ ہیرا دوبارہ مغلوں کے خزانۂ شاہی، میں داخل ہوا اور داخل ہوا تو کیسے؟ ۔ قیاس ہے کہ جب اکبر نے ۱۶۰۰ء میں احمد نگر کو فتح کیا تو یہ ہیرا دوسری قیمتی اشیاء کے ساتھ اکبر کے خزانے میں آ گیا ہو گا ۔ تاہم اگر یہ خزانۂ شاہی میں دوبارہ داخل ہوتا تو تاریخوں میں اس کا کہیں نہ کہیں ذکر آتا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بقیہ عہد اکبر، نیز جہانگیر یا شاہجہان کے زمانے میں اس کی کوئی خبر نہیں ملتی ۔ ایسے مشہور ہیرے کا ذکر ضرور آنا چاہیے تھا ۔ بالخصوص ملا عبدالحمید کے پادشاہ نامہ میں جہاں ۲۰ جلوس کے آخر میں خزانۂ شاہی کے قیمتی جواہرات پر ایک بسیط تبصرہ ہے (پادشاہ نامہ ۲ : ۳۹۱)، وہاں اس کا ذکر ہونا چاہیے تھا، مگر نہیں ہے ۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مورخین ایک خاص ہیرے کا ذکر کرتے ہیں جس کا بیان شاہجہان کے زمانے کی تاریخوں میں پایا جاتا ہے ۔

بادشاہنامہ کی جلد ۳ طبع محمد وارث میں مذکور ہے کہ ۱۸ صفر ۱۰۶۶ھ کو جب میر محمد سعید میر جملہ کو ہندوستان کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا تو اس نے کچھ قیمتی جواہرات شاہجہان کی نذر کیے۔ ان میں ایک ہیرا تھا جس کا وزن ۲۱۶ جوہری رتی تھا اور بادشاہی حکم سے اس کی قیمت ۲۱۶۰۰۰ روپیہ مقرر ہوئی [دیکھیے شاہ نواز خان : مآثر الامراء، لاہور ۱۹۷۰ء، اردو ترجمہ، ۳ : ۸۴۴] کیونکہ اس کا وزن کوہ نور کے وزن کے قریب ہے اس لیے بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ وہی بابر والا ہیرا تھا جو دکن میں موجود تھا اور میر جملہ کے ہاتھ آ گیا اور اس نے لا کر بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا ۔ مگر اس مصنف کے خیال میں اس ہیرے کا نہ کوہ نور سے کوئی تعلق ہے اور نہ بابر والے ہیرے سے ۔ بابر والا ہیرا اور کوہ نور وزن میں برابر ہیں۔ یعنی ۲۲۱۰۶ جوہری رتی ۔ میر جملہ والے الماس کا وزن جو غالباً جواہر خانے کے رجسٹروں سے لیا گیا ہو گا، ۲۱۶ جوہری رتی ہے ۔ یعنی اول الذکر سے ۵۰۶ رتی یا ۱۵ گرین کم ۔ یہ ممکن نہیں کہ جس ہیرے کا وزن ۱۶۵۵ء میں ۲۰۶ رتی ہو تو وہ ۱۸۵۱ء میں ۲۲۱ رتی سے زیادہ ہو جائے ۔ آخری نتیجہ یہ ہے کہ اغلباً بابر والا الماس اور کوہ نور ایک ہی ہیں۔

مآخذ: متن میں درج ہیں۔

(شیخ عبدالعزیز)

* کُوی: (kiöy) ایک لفظ جو مغربی ترکی میں گاؤں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہ وہ شکل ہے جس میں فارسی لفظ کوی (دیکھیے Bittner: *Der rin Fluss der Arabischen und Persischen auf das Turkische*، *S.B. Ak. wien.* ج ۱۴۲، شمارہ ۳۰ ص۵۹۰) یا غالباً صحیح طور پر لفظ کُوی (Vullers: *Lioulcon*، برہان قاطع، ص ۵۹۰) کو ترکی زبان میں مستعار لیا گیا ہے جس کے اصلی معنے راستہ یا گلی کے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے جغرافیائی ناموں کی فہرست میں ہمیں ایسے متعدد مقامات کے نام نظر آتے ہیں جن میں کوی کی ترکیب موجود ہے جیسے بوغاز کوی، ارمنی کوی، وغیرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلجوقی عہد سے پہلے ان ناموں کا وجود نہ تھا۔ ایک کھلے گاؤں کے مفہوم میں لفظ کوی قصبے کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے ایک چھوٹا شہر۔ مشرقی ترکی میں مقامات کے ناموں میں گاؤں کے معنوں میں ہمیشہ لفظ کند استعمال ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات اس مؤخرالذکر لفظ کی جگہ کوی بھی استعمال ہوتا ہے (دیکھیے مثلاً Ritter: *Erdkunde*، ۱۰: ۲۲۱ ببعد؛ چنانچہ قاضی کند جو الموصل کے قریب واقع ہے قاضی کوی ہو گیا ہے۔

(J. H. Kramers)

⊗ الکویت: دولت الکویت (State of Kuwait) آزاد و خود مختار عرب امارات جو جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ *The Encyclopaedia of Britannica*، انڈکس، ۱۹۷۴ء، ۵: ۹۵۷)۔ اس کے مشرق میں خلیج فارس ہے اور شمال میں عراق ہے جس کا علاقہ ریاست کے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ ریاست کے مغرب ہی میں سعودی عرب واقع ہے جس کا علاقہ ریاست کے جنوب تک پھیلا ہوا ہے (*World Muslim Gazetteer*، کراچی ۱۹۷۵ء: ۳۰۳)۔ ریاست الکویت کا رقبہ ۶۸۸۰ مربع میل = ۱۷۸۱۸ مربع کلو میٹر ہے *The New Encyclopaedia Britannica*، انڈکس۔ ۱۹۷۴ء، ۵: ۹۵۶ نیز کتاب مذکور ۱۰: ۵۴۷)۔

عبدالعزیز الرشید نے الکویت کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے اسے لفظ "کوت" کا اسم تصغیر قرار دیا ہے: تاریخ الکویت: ۳۰، مطبوعۂ بیروت) اس کا اطلاق قلعے کی طرز پر بنے ہوئے ایک ایسے چوکور مکان پر ہوتا ہے جسے کسی ضرورت کی بنا پر تعمیر کیا گیا ہو اور پھر اس کے اردگرد اس کی نسبت بہت چھوٹے چھوٹے مکان تعمیر کیے گئے ہوں۔ اور اس مکان سے دخانی جہاز اور کشتیاں، لنگر انداز ہو کر، زاد راہ حاصل کرتی ہوں، نیز یہ مکان پانی کے قریب واقع ہو خواہ وہ سمندر ہو یا دریا یا بُحیرہ (کتاب مذکور: ۳۰) چنانچہ ایک چھوٹے سے قلعے کے موجود ہونے کی بنا پر اسے "کویت" کا نام دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعے کو محمد لصکۃ بن عریعر نے تعمیر کروایا تھا اور بعد میں اسے قبیلۂ الصّباح کو دے دیا تھا۔

طبعی حالات: الکویت زیادہ تر میدانی صحرا پر مشتمل ہے جس میں چند نخلستان ہیں۔ یہ باور کیا جاتا ہے کہ کویت کا ساحل، قدیم زمانے سے اب تک، کئی حوادث و تغیرات سے گزر چکا ہے۔ ہزاروں برس پہلے کویت کی ساحلی پٹی زیر آب تھی۔ موجودہ کویت کا علاقہ ریت اور سنگریزوں پر مشتمل ہے۔ ساحل سے پرے متعدد چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن میں سب سے بڑا بوبیان Bubiyan ہے۔

آب و ہوا: کُویت میں شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ کبھی موسم گرما میں مئی سے اکتوبر تک کے مہینوں میں موسم مرطوب رہتا ہے۔ اکتوبر سے

اپریل تک کے مہینوں میں اکثر و بیشتر ایک سے سات انچ کے مابین سالانہ بارش ہوتی ہے۔ جب بارش کھل کر ہوتی ہے تو پورے صحرا میں، مارچ اور اپریل کے مہینوں میں، سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ اگست میں درجۂ حرارت ۹۰ ہوتا ہے جب کہ جنوری میں ۶۰ درجے رہ جاتا ہے۔ موسم گرما میں بعض دفعہ درجۂ حرارت ۱۲۵ تک جا پہنچتا ہے(World Muslim Gazetteer، ۱۹۷۵ء ایڈیشن: ۳۰۳؛ The New Encyclopaedia Britannica، ۱۰ : ۵۳۸) نومبر کے اواخر میں رات کو خاصی شبنم پڑتی ہے اور صبح کے وقت ہوا میں خاصی نمی آ جاتی ہے (زہرا : Kuwait Wasmy Home، ص ۱۲۳ لنڈن ۱۹۵۸ء.

آبادی : ۱۹۷۲ء کے اندازے کے مطابق، کویت کی آبادی ۸۱۵۰۰۰ تھی (The New Encyclopaedia Britannica، انڈکس، ۵ : ۹۵۶ نیز کتاب مذکور ۱۰ : ۵۳۷) ۱۹۷۳ء کے سرکاری اندازے کے مطابق کویت کی آبادی ۹۱۶۲۰۰ ہے۔ سو فیصد لوگ مسلمان ہیں اور سرکاری زبان عربی ہے (World Muslim Gazetteer، ۱۹۷۵ء ایڈیشن : ۳۰۳).

دارالسلطنت : کویت کا دارالسلطنت کویت ہے جو ملک کا سب سے بڑا اور سب سے اہم شہر ہے اگرچہ حوالی (Hawalli) آبادی کے اعتبار سے کویت شہر سے بڑھ گیا ہے۔ ملک کی زیادہ‌تر آبادی شہروں میں آباد ہے۔ مجموعی اعتبار سے کویت دنیا کی اعلٰی متمدن ریاستوں میں سے ایک ہے (The New Encyclopaedia Britannica، ۱۰ : ۵۳۷) جہاں دنیا کے ہر خطے سے آئے ہوئے انجینیر، ڈاکٹر، ٹھیکیدار اور تاجر مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ پانی سے محروم یہ خطہ اس حد تک قابل رشک بن چکا ہے کہ آج وہاں کے لوگ کشید کیا ہوا سمندر کا پانی پیتے اور ایرکنڈیشنڈ عمارات میں کام کرتے ہیں (کتاب مذکور ۱۰ : ۵۳۸).

تاریخ : اگرچہ کُویت زمانۂ خلافت کی ابتدا ہی سے مسلمان سلطنت کا حصہ رہا ہے لیکن وہاں مستقل آبادی نہیں رہی۔ اور اسی بنا پر اس کی قدیم تاریخ پردۂ اخفا میں ہے۔ اس کے سوا کہ نخلستانوں میں، صحرا نورد عرب، چند مہینوں کے لیے خیمہ زن ہو جاتے جب کہ بارش کا موسم ہوتا اور نخلستان سرسبز ہوتے (World Muslim Gazetteer ۱۹۷۵ء، ص ۳۰۳)۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں عنزہ قبیلے کے چند خاندان عرب کے اندرونی علاقے سے ہجرت کر کے خلیج کے ساحل پر آباد ہونا شروع ہو گئے (The New Encyclopaedia Britannica، ۱۰ : ۵۳۷)۔ عنزہ عرب کے قبیلوں میں سے ایک مشہور قبیلہ ہے اور آل الصبّاح، آل خلیفہ و آل سعود اسی قبیلے کی شاخیں ہیں۔ (تاریخ الکویت، طبع بیروت، ۳۱) اور انہیں لوگوں سے موجودہ کویت کی قوم کی ابتدا ہوئی، کویت کے اکثر لوگ اسی قبیلے کے مشہور خاندانوں کی اولاد ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے World Muslim Gazetteer، ۱۹۷۵ء، ص ۳۰۳)۔ ۱۷۵۶ء میں یہاں کے آباد کاروں نے الصبّاح قبیلے سے ایک شیخ کے تقرر کا فیصلہ کیا (The New Encyclopaedia Britannica ۱۰ : ۵۳۷) جو ان کے امور کا تصفیہ کرے اور عثمانی ترک خلیفہ سے معاملات میں ان کی نمائندگی کرے جس کے زیر اثر یہ علاقہ تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں شیخ الصبّاح ثانی کو منتخب کیا [۱۷۵۶ تا ۱۷۷۲ء]۔ صبّاح خاندان کی قیادت میں آبادکاروں کو بڑی تقویت و ترقی حاصل ہوئی اور ۱۷۶۵ء تک آبادی دس ہزار باشندوں تک پہنچ گئی جن کے قبضے میں ۸۰۰ کشتیاں یا چھوٹے جہاز تھے اور جن کا گزارہ تجارت، ماہی گیری اور سمندر

سے موتی نکالنے پر تھا *World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۵ء، ص ۳۰۳).

۱۷۷۶ء میں ایران اور ترکی کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ ایرانیوں نے بصرے پر قبضہ کر لیا جو ۱۷۷۹ء تک رہا۔ اسی اثنا میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا ڈاک کا خشکی کا راستہ، بصرے سے کویت تبدیل کر لیا۔ اس طرح بصرے کی بہت سی تجارت کویت منتقل ہو گئی۔ حکومت برطانیہ نے اس علاقے پر ترکی کے قبضے کو اس وجہ سے تسلیم کر لیا کہ ترکی نے برطانیہ کے تجارتی مفادات کو، بحیرۂ روم سے ہندوستان تک کے راستے پر جو خلیج سے گزرتا تھا، تحفظ دیا۔ کویت کے شیخ عبداللہ الصّباح نے جو عثمانی ترکوں کو خراج ادا کرتا تھا، ۱۸۷۱ء میں بصرے کے ترکی گورنر کا قائم مقام (ایجنٹ) کا خطاب قبول کیا۔ اس کے جانشین شیخ مبارک نے، اس خوف سے کہ مبادا ترک کویت پر قابض ھی نہ ھو جائیں ۱۸۹۹ء میں حکومت برطانیہ کے ساتھ ایک معاھدے پر دستخط کیے اور برطانیہ کے زیر حفاظت آنا منظور کر لیا (کتاب مذکور، ۳۰۵)۔ اس معاھدے کے مطابق، شیخ نہ تو بصورت تفویض نہ بصورت رھن اور نہ کسی اور ھی طریق سے، کسی ملک کو بھی، ماسوا حکومت برطانیہ کے اپنا علاقہ سپرد نہیں کر سکتا تھا اور نہ کسی دوسری حکومت ھی سے، حکومت برطانیہ کی اجازت حاصل کیے بغیر، کوئی معاھدہ کر سکتا تھا (تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ الکویت، مطبوعۂ بیروت، ۸۳)۔ نتیجۃً حکومت برطانیہ نے کویت کے تمام امور خارجہ کی نگرانی خود سنبھال لی (*The New Encyclopaedia Britannica*، ۱۰ : ۵۶۷)۔ کویت پر برطانیہ کی نگرانی نے ایک نئے بین الاقوامی تصادم کو جنم دیا۔ ۱۸۹۹ء میں جرمنوں کو بغداد ریلوے کے ضمن میں کچھ مراعات حاصل ہوئیں اور انہوں نے اپنا ایک تحقیقاتی وفد عراق بھیجا تا کہ ریلوے کے راستے (روٹ) کے بارے میں نقشہ تیار کرے جس میں تجویز یہ تھی کہ کویت کو آخری سٹیشن بنایا جائے، لیکن انگریزوں نے مخالفت کی تا کہ کویت پر برطانوی محافظت (Protectrate) قائم ھو سکے (V. Lutsky : *Modern History of Arab Countries*، ۳۰۸ ببعد، ماسکو ۱۹۶۹ء)۔ ایچ آر پی ڈکسن کے بیان کے مطابق لارڈ کرزن نومبر ۱۹۰۳ء میں کویت پہنچے اور برطانوی روابط کو مستحکم کیا، جس کے نتیجے میں ۱۹۰۳ء میں شیخ مبارک اس امر پر آمادہ ھو گئے کہ کویت میں کسی دوسری حکومت کو ڈاک خانہ قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جون ۱۹۰۴ء میں کویت میں ایک برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کا تقرر عمل میں آیا (Dickson : *Kuwait and Her Neighbours* : ۱۴۰، لندن ۱۹۵۶) ۱۹۰۹ء میں ترکی اور حکومت برطانیہ کے مابین مذاکرات ھوے۔ جس میں کویت کو خود مختاری حاصل ھو گئی۔ شیخ سالم نے جو شیخ مبارک کا ۱۹۱۷ء میں جانشین ھوا، پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی حمایت کی جس سے برطانیہ اور کویت کے روابط میں تعطل پیدا ھو گیا۔ شیخ سالم کے بعد ۱۹۲۱ء میں شیخ احمد جابر الصباح جانشین بنا جو حکومت برطانیہ کا دوست تھا۔ شیخ احمد نے ۱۹۳۴ء میں U.S.A. کی گلف آئل کارپوریشن اور اینگلو پرشین آئل کمپنی کو مشترکہ طور پر مراعات دیں۔ جنھوں نے کویت آئل کمپنی کی تشکیل کی۔ ۱۹۳۶ء میں گہری کھدائی شروع کر دی گئی اور اس سے قبل کہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ھوتا دوسری جنگ عظیم شروع ھو گئی۔ جنگ کے اختتام پر تیل کی صنعت پر پھر توجہ دی گئی اور چند برسوں میں کویت ایک قدیم طرز کی بندرگاہ سے ایک ترقی پذیر جدید طرز کا شہر بن گیا جس کا انحصار

تیل کی صنعت سے حاصل ہونے والے محاصل پر تھا۔ شیخ احمد جسے بجا طور پر موجودہ کویت کا معمار کہا جا سکتا ہے، کے دنیا سے رخصت ہونے پر صباح خاندان کے گیارھویں حکمران فضیلت مآب شیخ عبداللہ السالم الصباح فروری ۱۹۵۰ء میں جانشین ہوئے World Muslim Gazetteer، ص ۳۰۵، ۱۹۷۵ء)۔

شیخ عبداللہ کی پالیسی یہ رہی ہے کہ تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی کو عوامی بہبود پر خرچ کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۵۱ء میں رفاہی کاموں، تعلیمی اور طبی منصوبوں کا ایک جامع پروگرام تیار کیا۔ جس نے کویت کو ایک فلاحی مملکت میں بدل دیا۔ ۱۹ جون ۱۹۶۱ء کو حکومت برطانیہ سے ۱۸۹۹ء کا معاہدہ منسوخ کر دیا گیا اور کویت کو مکمل آزادی و خود مختاری حاصل ہو گئی The New Encyclopaedia Britannica، ۱۰ : ۵۳۷)۔ اس کے چھے روز بعد حکومت عراق کے وزیراعظم نے کویت کو عراق کے جزو لاینفک (Integral Part) ہونے کا دعوٰی کیا۔ اس کے خیال میں کویت سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا اور جغرافیائی، لسانی اور تمدنی اعتبار سے کویت اور عراق ایک ہی ملک ہیں جسے حکومت برطانیہ نے دو خطوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حملے کے خدشے کے پیش نظر کویت کے حکمران نے برطانیہ سے مدد کی درخواست کی۔ جولائی کے آغاز میں برطانوی فوج کو کویت میں اتار دیا گیا۔ ۲۰ جولائی کو عرب لیگ نے اسے آزاد امارت کے طور پر تسلیم کر لیا اور اپنا رکن بنا کر اس کی آزادی و خود مختاری کو تسلیم کر لیا اور عراقی دعوے کی تردید کر دی۔ تقریباً دو برس بعد ۱۴ مئی ۱۹۶۳ء کو کویت اقوام متحدہ کا رکن بن گیا (The New Encyclopaedia Britannica، ۱۰ : ۵۳۷)۔ اسی اثنا میں ۱۹۶۲ء میں کویت عالمی بنک اور انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (بین الاقوامی مالی فنڈ) کا رکن پہلے ہی بن چکا تھا۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں نئی عراقی گورنمنٹ نے کویت کی مکمل خود مختاری تسلیم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کویت سے اس کے تعلقات سازگار ہوتے چلے گئے۔ ایک معاہدہ طے پایا جس کے مطابق عراق نے ۱۲۰ ملین گیلن پانی روزانہ کویت کو سپلائی کرنا منظور کیا۔ نومبر میں ایک تجارتی اور اقتصادی معاہدہ طے پایا، جس میں دو طرفہ کسٹم ڈیوٹی ختم کر دی گئی (World Muslim Gazetteer، ۱۹۷۵ء، ص ۳۰۶)۔ شیخ عبداللہ السالم الصباح کے فوت ہونے کے بعد ۲۴ نومبر ۱۹۶۵ء کو امیر صباح السالم الصباح، جو پہلے وزارت عظمٰی پر فائز تھے حکمران بنے۔ ان کی جگہ شہزادہ جابر وزارت عظمٰی پر فائز ہو گئے (کتاب مذکور، ۳۰۷)۔ [شیخ صباح السالم الصباح کی وفات پر جنوری ۱۹۷۸ء کو شیخ جابر الاحمد الجابر الصباح نے عنان حکومت سنبھالی]۔

اقتصادی جائزہ : زراعت : کھجور کی کاشت کے علاوہ ملک کے چند حصوں میں سبزیاں، اناج اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ کویت کو غذا کے معاملے میں زیادہ انحصار درآمد پر کرنا پڑتا ہے۔ حکومت نے ایک تجرباتی زرعی فارم کا اہتمام کیا ہے۔

صنعت : ۱۹۵۵ء میں حکومت نے اینٹیں تیار کرنے کا ایک کارخانہ ساڑھے سات لاکھ پونڈ کی مالیت سے قائم کیا، جہاں یومیہ ایک لاکھ اینٹیں تیار ہوتی ہیں۔ کویت میں ریت اور چونے کے ذخائر بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں ایک پیٹرو کیمکل انڈسٹریز کمپنی قائم کی گئی جو کھاد تیار کرتی ہے۔ ایک نئے کارخانے کے اضافے کے بعد اب کویت میں سالانہ ۱۰ لاکھ ٹن کھاد تیار ہونے لگی ہے۔ شعیبہ کے علاقے میں اور بھی صنعتیں قائم کی گئی ہیں۔

بجلی : بجلی تمام تر تیل اور قدرتی گیس سے حاصل کی جاتی ہے - ۱۹۶۷ء میں بجلی کا اندازہ ۱,۳۳۴,۸۵۸,۰۰۰ کلوواٹ تھا.

ماہی گیری : خوراک کی گھریلو ضروریات پوری کرنے کے لیے ماہی گیری ایک اہم ذریعہ ہے - نیز اس سے جانوروں کے لیے چارا بھی حاصل کیا جاتا ہے - سالانہ کوئی پانچ ہزار ٹن مچھلی پکڑی جاتی ہے - چار مختلف کمپنیاں ماہی گیری کا اہتمام کرتی ہیں - موتی حاصل کرنے کی صنعت اب زوال پذیر ہو رہی ہے.

مویشی : کویت کے بدوی لوگ اونٹ، بھیڑ، بکری اور گدھے پالتے ہیں - مقامی مویشیوں کے گوشت سے خوراک کا ایک حصہ حاصل کیا جاتا ہے - حکومت نے ۹۰ ایکڑ کا ایک تجرباتی زرعی فارم قائم کیا ہے جس میں ڈیری فارم اور پرورش حیوانات کے مراکز بھی شامل ہیں - ملک سے کسی حد تک کھالیں اور چمڑا برآمد کیا جاتا ہے.

برآمدات : برآمدات کا ۹۰ فیصد حصہ تو تیل اور پٹرولیم کی مصنوعات پر مشتمل ہے - اس کے علاوہ موتی، مچھلی، بال، کھالیں اور چمڑا برآمد کیے جاتے ہیں - ۱۹۷۱ء میں کویت نے ۱۳۹ ملین بیرل - صاف شدہ پٹرولیم کی مصنوعات برآمد کیں جو ۱۰۱۴ ملین بیرل کروڈ آئل (خام تیل) اور ۱۰.۵ ملین رقیق مائع (Liqui Fied) پٹرولیم گیس کے علاوہ تھیں - ۱۹۷۲ء میں کویت کی کل برآمدات ۱۶۷۱.۵ ملین امریکی ڈالر (سولہ ارب پاکستانی روپے سے زائد) تک پہنچ گئی تھیں (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۵ء، ص ۴۱۵).

تیل : کویت کی پوری معیشت اور اقتصادی ترقی کا انحصار ملک کے تیل کے بڑے بڑے ذخیروں سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ہے - کویت میں ۷۱ بلین بیرل، تیل کے ذخائر موجود ہیں - جو ریاستہاے متحدۂ امریکہ کے ذخائر سے دگنے ہیں اور پوری دنیا کے ذخائر کا ۲۰.۳ فیصد ہیں - کویت کی تیل سے حاصل ہونے والی سالانہ آمدن ۱۹۷۳-۱۹۷۴ء میں ۱۷۰۰ ملین ڈالر تک پہنچ چکی ہے جب کہ ۱۹۵۰ء میں یہ صرف ۲۰۰ ملین ڈالر تھی - ۱۹۴۶ء میں کویت نے پہلی بار، تیل برآمد کیا اور تیل کی پیداوار میں اسقدر اضافہ ہوا کہ ۱۹۵۳ء میں کویت پوری دنیا میں چوتھے نمبر پر سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا ملک شمار ہونے لگا - تیل پیدا کرنے والے ممالک میں ذخائر کے اعتبار سے کویت کو اولیت حاصل ہے (*The New Encyclopaedia Britannica*، ۱۰ : ۵۴۷) - ۱۹۶۴ء میں کویت نے رضاکارانہ طور پر پیداوار میں کچھ تخفیف کی ہے - اب بھی کویت دنیا میں چھٹے نمبر پر سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا ملک ہے اور اس کی تیل کی پیداوار تین ملین بیرل یومیہ ہے (*World Muslim Gazetteer*، ص ۴۱۱، ۱۹۷۵ء) - قدرتی گیس اور پٹرولیم گیس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب مذکور، ص ۴۱۳؛ بنکنگ، انشورنس اور فنانس کے امور کی تفصیلات کے لیے دیکھیے کتاب مذکور، ص ۴۱۶؛) [نیز *The Statesman year-Book* ۱۹۷۶ء - ۱۹۷۷ء بذیل مادّہ].

سکہ : کویت میں نیا کویتی دینار مروّج ہے - ایک کویتی دینار ۱.۰۱۷ پونڈ سٹرلنگ کے برابر ہے - اور تقریباً تین امریکی ڈالر ۳۲۷.۰ کے برابر ایک دینار کو ۱۰۰۰ فلس میں تقسیم کیا گیا ہے.

بجٹ : ۱۹۶۹-۱۹۷۰ء میں بجٹ کے محاصل ۳۰۲/۵۰ ملین کویتی دینار تھے - ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء میں محاصل کا تخمینہ ۵۳۶ ملین کویتی دینار تھا جس میں ۵۰۶ ملین کویتی دینار کے محاصل صرف تیل (کل کا ۹۴ فیصد) پر مشتمل تھے تفصیلات کے لیے دیکھیے کتب مذکورہ.

پانی کا مسئلہ : کویت کے بعض لوگ آج بھی یہ ذکر کرتے ھیں کہ پانی کی قلت کے پیش نظر وہ کبھی عراق سے پانی درآمد کرتے رہے ھیں - پانی کی فراھمی کے لیے ۱۹۵۳ء میں کویت میں سمندر کے پانی کو کشید کرنے کا ایک پلانٹ (Kuwait Seawater Distillation Plant) کا پہلا حصہ مکمل ھو گیا تھا، جس سے یومیہ دس لاکھ گیلن پانی فراھم ھوتا تھا۔ اب اس میں مزید یونٹ مکمل کیے گئے ھیں جس سے ساٹھ ملین (چھے کروڑ) گیلن پانی یومیہ فراھم ھوتا ھے - پوری دنیا میں نمکین پانی کو مقطر کرنے کا یہ سب سے بڑا پلانٹ ھے - ریاست کے شمال میں الروضتین کے مقام پر کنووں سے تازہ پانی دارالحکومت میں فراھم کیا جاتا ھے .

آئین : کویت کے حکمران یا امیر کا جانشین بننے والے کے لیے یہ لازم ھے کہ وہ مرحوم مبارک الصباح کے خاندان سے ھو - ھر حکمران کی تخت نشینی کے ایک سال کے اندر اس کے ولی عہد کا نامزد کیا جانا بھی لازمی قرار دیا گیا ھے- سرکاری مذھب اسلام اورسرکاری زبان عربی ھے - انتظامیہ کے جملہ اختیارات امیر کو حاصل ھیں جو ان اختیارات کو وزرا کی کونسل کے ذریعے سے استعمال کرتا ھے جو ایک وزیر اعظم کی قیادت میں کام کرتی ھے - امیر کو مارشل لاء نافذ کرنے کا اختیار بھی حاصل ھے، لیکن اس ضمن میں اسے اسمبلی کی منظوری لینا پڑتی ھے .

ایک قومی اسمبلی کا جو ۵۰ افراد پر مشتمل ھوتی ھے - چار سال کے لیے انتخاب کیا جاتا ھے جو کویت کے پڑھے لکھے، ۲۱ سال سے زائد عمر والے مردوں کے ووٹوں سے عمل میں آتا ھے - ملازمین اور پولیس والے انتخاب میں حصہ نہیں لیتے - ملک میں سیاسی جماعتیں نہیں - امیدوار انفرادی حیثیت سے انتخاب لڑتے ھیں - اگر اسمبلی کوئی بل منظور کر کے امیر کے پاس بھیج دیتی ھے تو امیر کو یہ اختیار حاصل ھے کہ وہ بل مذکور اسمبلی کو نظرثانی کے لیے بھجوا دے اور اگر آئندہ اجلاس میں ممبران کی دو تہائی اکثریت اسے پھر منظور کر لے یا اس سے آئندہ نشست میں سادہ اکثریت اسے منظور کر لے تو اس کو قانون کی حیثیت حاصل ھو جاتی ھے - اسمبلی کسی وزیر کے لیے عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر سکتی ھے - البتہ وزیر اعظم کے سلسلے میں اسے یہ اختیار حاصل نہیں - اس صورت میں اسمبلی امیر تک رسائی حاصل کر سکتی ھے اور امیر یا تو وزیر اعظم کو برخاست کر دیتا ھے یا اسمبلی ھی توڑ دیتا ھے .

جو آئین ۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء کو نافذ ھوا وہ تمام شہریوں کے لیے قانونی مساوات کا حق تسلیم کرتا ھے - اس طرح آئین میں انفرادی آزادی کے حق کی ضمانت دی گئی ھے جس سے کویتی باشندوں میں تحفظ کے احساس کو پیدا کرنے کے لیے بڑی مدد ملی ھے .

کویت کے مجموعۂ قوانین میں اکثر و بیشتر مصری قانونی نظام کی پیروی کی گئی ھے - جرائم کے مسائل میں چھوٹے چھوٹے مقدمات کا فیصلہ عام عدالتوں کے مجسٹریٹ کرتے ھیں جب کہ سنگین جرائم کا فیصلہ بڑی عدالتوں میں طے پاتا ھے - ان فیصلوں کے بارے میں اپیل کی سماعت کے لیے ایک اور عدالت قائم کی گئی ھے (World Muslim Gazetteer، ۱۹۷۵ء، ص ۳۰۸ ببعد).

تعلیمی ترقی : ۱۹۳۶ء میں پورے کویت میں صرف ایک سکول تھا جس میں فقط ۳۰۰ طلبہ تھے اب کنڈر گارٹن، ابتدائی اور ثانوی سکول کثرت سے قائم کر دیے گئے ھیں - ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء میں تعلیم لازمی کر دی گئی - اب ۲۷۰ اسکولوں میں ایک لاکھ ساٹھ ھزار طلبہ زیر تعلیم ھیں - اساتذہ کی

تعداد گیارہ ہزار ہے ۔ حکومت کویت کی پالیسی کے مطابق کویتی باشندوں کے لیے کنڈر گارٹن سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیم مفت ہے ۔ طلبہ کو کتابیں، خوراک اور طبی سہولتیں مفت فراہم کی جاتی ہیں ۔ ۱۹۷۳ء میں کویت میں پرائیویٹ سکولوں کی تعداد ۶۶ تھی جن میں ۳۳،۱۷۱ طلبہ زیر تعلیم تھے اور اساتذہ کی تعداد ۷۷۵ تھی ۔ ثانوی سکولوں کے علاوہ ایک ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ (لڑکوں کے لیے)، دو ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (ایک لڑکوں کے لیے اور ایک لڑکیوں کے لیے)، ایک دینی مدرسہ (Religious Institute)، ایک ٹیکنیکل سیکنڈری سکول (لڑکیوں کے لیے اور ایک اور تربیتی ادارہ (Post-Secondery Teachers Training College) ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں قائم کیے گئے ہیں ۔ سات تعلیمی ادارے مختلف النوع معذور طلبہ کے لیے قائم کیے گئے ہیں ۔ وزارت تعلیم نے اپریل ۱۹۶۶ء میں ان سات اداروں کو ایک وسیع ادارے میں مدغم کرنے کے لیے اقدام کیا ہے ۔ بڑی کثیر تعداد میں کویتی طلبہ کو وظائف دے کر بیرونی ممالک میں حصول تعلیم کے لیے بھیجا جاتا ہے ۔ جن میں سے اکثر مصر، لبنان، امریکہ اور برطانیہ میں زیر تعلیم ہیں ۔ ۱۹۶۲ء میں کویت یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی (*The New Encyclopaedia Britannica*، ۱۰ : ۵۳۹) .

اس طرح عرب ممالک سے اس وقت ہونے چھے سو طلبہ وظیفہ پاکر کویت کی ثانوی اور انٹرمیڈیٹ سطح پر زیر تعلیم ہیں ۔ تعلیم بالغاں کے ۹۴ مرکز ہیں جہاں ۲۳۹۴۳ افراد زیر تعلیم ہیں اور ۱۱۷ اساتذہ جزوقتی کام کر رہے ہیں ۔ وزارت تعلیم، اس کے علاوہ، ۳۸ پرائیویٹ سکول اور تعلیمی اداروں کی بھی نگرانی کرتی ہے جہاں ۱۰،۰۰۰ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ وزارت تعلیم نے، ساحل عُمان پر ۳۵ سکول اس کے علاوہ قائم کیے ہیں جہاں ۱۰۵۳۹ طلبہ تعلیم کے حصول میں مصروف ہیں (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۵ء، ص ۴۱۸ ببعد) .

مدارس : کویت کے مشہور مدارس میں المدرسة المبارکیه، المدرسة الاحمدیه، مدرسة السعادة الجمعیة الخیریة، المکتبة الاهلیة قابل ذکر ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے : تاریخ الکویت، ۲۸۸ ببعد .

فلاحی مملکت اور تعمیر و ترقی : کویت اپنے تیل کے عظیم ذخائر کی بدولت اپنے باشندوں کی فلاح و بہبود کو مرکز توجہ بنائے ہوئے ہے ۔ سماجی خدمات کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے ۔ تعلیم مکمل طور پر مفت ہے اس وقت کویت میں ۳۵ ہسپتال اور ۸۳ کلینک ہیں ۔ ہر ۸۰۰ آدمی کے لیے ایک ڈاکٹر ہے اور ہر ۱۱۱ افراد کے لیے ہسپتال کا ایک بستر ہے ۔ کویت کے اندر اور ارد گرد سڑکوں کا جال بچھایا جا رہا ہے ۔ شویخ (Shuwaikh) کے مقام پر ایک بندرگاہ تعمیر کی گئی ہے جو کویت شہر سے دو میل مغرب میں ہے ۔ اس میں بیک وقت آٹھ بڑے بار بردار جہاز اور کئی چھوٹے جہاز لنگر انداز ہو سکتے ہیں ۔ شعیبه کے مقام پر ایک دوسری بندرگاہ ہے جو کویت شہر کے جنوب میں واقع ہے ۔ ان دونوں بندرگاھوں کو ۵۰ ملین امریکی ڈالر کے صرف سے جدید بنایا جا رہا ہے ۔ کویت میں بین الاقوامی پروازوں کے لیے ایک ہوائی اڈا بھی موجود ہے .

عالمی سیاست میں اہم کردار : کویت نے عرب اور غیر عرب مسلم ممالک کو بڑی فیاضی سے مالی امداد دی ۔ اس نے جنگ فلسطین ۱۹۶۷ء کے متأثر ممالک کی دل کھول کر مدد کی ہے ۔ کویت کی مجموعی امداد جو اس نے رمضان ۱۹۷۳ء کے بعد مختلف ممالک کو دی، ۳۰۰ ملین ڈالر تک پہنچ گئی ہے ۔ اسی طرح کی

مالی امداد فلسطینی فدائیین کو بھی دی گئی۔ [کویت کی تعمیر و ترقی میں اہل پاکستان نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب ہزاروں پاکستانی کویت میں ملازم ہیں اور اسے اعلی درجے کی فلاحی مملکت بنانے میں شب و روز مصروف ہیں]۔

وزارت اوقاف: حکومت کویت عالم اسلام کے مسائل میں بڑی دلچسپی لیتی ہے، بالخصوص بیرونی ممالک میں مسلم اقلیتوں کے مسائل پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ مذہبی امور کے انتظام اور انصرام کے لیے وزارت اوقاف ہے جو اسلامی ادب اور قرآن حکیم کی طباعت پر سالانہ زر کثیر خرچ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں مسلم تنظیموں کو امداد بھی مہیا کرتی ہے۔ کویت اسلامی سیکرٹریٹ، اسلامی وزرائے خارجہ کانفرنس اور اسلامی بنک کا بھی رکن ہے۔ ۱۹۷۰ء میں کویت نے عالم اسلام کے وزرائے اوقاف کی بین الاقوامی کانفرنس کا اہتمام کیا تھا تاکہ مسلم ممالک میں باہمی تعاون سے ان سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹ م: ۱۹۷۵ء)۔

اگست ۱۹۷۷ء کے ایک اعلان کے مطابق کویت کی وزارت اوقاف، قاہرہ کی جامعۃ الازہر کی طرز پر ایک اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے پر بھی غور کر رہی ہے۔

مآخذ: (۱) عبدالرشید: تاریخ الکویت، مطبوعۂ بیروت؛ (۲) *Kuwait and his neighbours*، مطبوعۂ لنڈن؛ (۳) *Kuwait was my home*، مطبوعۂ لنڈن؛ (۴) *The New Encyclopaedia Britannica*؛ (۵) *World Muslim Gazetteer*، بذیل مادہ؛ کراچی ۱۹۷۵ء۔

(بشیر احمد صدیقی)

* کہانی: (= افسانہ، مختصر افسانہ) رک بہ کنایہ، حدیث، روایۃ، سمر، قصہ [نیز اردو، عربی، وغیرہ]۔

کَہرُبا: (کاہ رُبا) وہی ہے جسے انگریزی میں amber کہتے ہیں۔ فارسی لفظ کے معنی تنکے کو کھینچنے یا لوٹ لینے والا ہیں۔ عام طور، پر جیسا کہ القزوینی میں ہے، اس کی یہ مخصوص خاصیت بیان کر دی جاتی ہے، لیکن اس پر کوئی رائے زنی نہیں کی جاتی، البتہ ابن الکبیر نے اتنا لکھا ہے کہ اگر اسے کسی قدر رگڑ لیا جائے تو یہ بڑی تیزی اور شدت سے تنکوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کشش کو شاعری میں استعارۃً عشاق کی باہمی کشش کے بیان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

کاہربا کی کچھ مقدار تو بلغار کے بحیرۂ بالٹک سے متصل علاقہ کسن (Kasin) سے لائی جاتی تھی اور اسے لوگ جوز رومی کی گوند سمجھتے تھے، اور کچھ مقدار ہسپانیہ سے آتی تھی۔ الغافقی، جس نے دونوں قسموں کا ذکر کیا ہے، بتاتا ہے کہ یہ سکھیوں، تنکوں وغیرہ کو پکڑ لیتا ہے۔

قدیم زمانے کے کاہ ربا سے بنے ہوئے زیورات اب مشرق میں باقی نہیں رہے البتہ الوشاء زردکاہ ربا کے بعض نمونوں کا ذکر کرتا ہے جو عورتیں زیورات کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ اسی طرح کیمیا گر الجلدکی کاہ ربا میں کھدے ہوئے نقوش کی بابت کہتا ہے کہ یہ بطور طلسمی تعویذوں کے استعمال ہوتے تھے۔ موجودہ زمانے میں اس سے تسبیح کے دانے اور ''سگار ہولڈر'' بنائی جاتی ہیں۔ یہ دوا کے طور پر ہمیشہ کثرت سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ جس طرح انگریزی میں الیکٹرون electron سے الیکٹرسٹی electricity نکلا ہے، اسی طرح مشرقی زبانوں میں کہربا سے [بجلی کا نام] کہربائیۃ بن گیا۔ بسا اوقات کاہ ربا کو سندروس سے، جو بقول الانطاکی رگڑے ہوئے تنکوں کو کھینچتا ہے، ملتبس کر دیا جاتا ہے، لیکن دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کے باہمی فرق پر زور دیا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) قب G. Jacob، در *Zeitschr. der Deutsch. Morgenl. Gesellsch*، ۴۳ (۱۸۸۹ء)، ص ۳۱۳ ببعد؛ ج ۴۵ (۱۸۹۱ء)، ص ۶۹۱ ببعد؛ (۲) Schneider : وہی کتاب، ج ۴۵ (۱۸۹۱ء) ص ۲۳۹ ببعد؛ (۳) E. Wiedemann : *Beiträge z. Gesch. der Naturwiss*، ج ۲، در *Sitzungsber. der Physik-mediz. Soz in Erlangen*، ج ۳۵ (۱۹۰۳ء)، ص ۳۱۴ ببعد؛ (۴) *Archiv f. d. Gesch. d. Naturw. u. Technik*، ج ۱ (۱۹۰۹ء)، ص ۲۱۱.

(E. WIEDEMANN)

⊗ **اَلْکَہْف :** بقول امام راغب اصفہانی الکہف کے معنی پہاڑ میں غار کے ہیں ۔ اس کی جمع کہوف آتی ہے : ''الکھفُ الغارُ فی الجبل و جمعہ کھوفٌ'' (المفردات، ۴۵۸) .

یہ قرآن حکیم کی ایک سورت کا نام ہے جو ۱۱۰ آیات پر مشتمل ہے (تفسیر القاسمی، ۲۱ : ۳۰۲۰؛ فی ظلال القرآن، ۱۵ : ۶۷) ۔ اس سورت کی دسویں آیت : اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَہْفِ (۱۸ [الکہف] : ۱۰) کے لفظ الکہف کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔ ترتیب تلاوت کے لحاظ سے اس کا عدد ۱۸ اور نزول وحی کی ترتیب کے اعتبار سے، اس کا عدد ۶۹ ہے ۔ یہ سورۃ الغاشیہ [رك بآں] کے بعد اور سورۃ النحل [رك بآں] سے پہلے نازل ہوئی (الاتقان، ۱ : ۱۰) ۔ پوری سورت مکۂ معظمہ میں نازل ہوئی اور اسی رائے کو علما کے ایک بہت بڑے گروہ نے اختیار کیا ہے (تفسیر المراغی، ۱۵ : ۱۱۳)، لیکن بعض کے قول کے مطابق، پہلی آٹھ آیات : صَعِیْدًا جُرُزًا تک (۱۸ [الکہف] : ۱ تا ۸) اور ارشاد باری : وَ اصْبِرْ نَفْسَکَ الاٰیۃ (۱۸ [الکہف] : ۲۸) اور اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے لے کر سورت کے آخر تک (۱۸ [الکہف] : ۱۰۷ تا ۱۱۰) مکی ہونے سے مستثنٰی ہیں (الاتقان، ۱ : ۱۶؛ تفسیر القاسمی، ۱۱ : ۴۰۲۰)، لیکن درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ پوری سورت مکی ہے۔ ابن کثیر نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ پوری سورت مکۂ معظمہ میں نازل ہوئی ''الکہفُ کُلّھا مکیّۃ'' (تفسیر القرآن العظیم، ۳ : ۱۰۱) ۔ سیّد امیر علی نے قُرطبی کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ یہ سورۃ تمام مفسرین کے قول کے مطابق مکّی ہے (تفسیر مواہب الرحمن، پارہ ۱۵ : ۲۱۶).

گزشتہ سورت سے اس کا ربط یہ ہے کہ اوّلاً، سورۂ بنی اسرائیل کا آغاز تسبیح سے ہوتا ہے اور اس سورت کا آغاز تحمید سے ہوتا ہے اور کلام میں دونوں اکٹھے استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ : فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ (۱۱۰ [النصر] : ۳) یا سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ میں ان کا استعمال ساتھ ساتھ ہوا ہے: ثانیاً گزشتہ سورت خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا پر ختم ہوئی ہے جب کہ اس سورت کا آغاز حمد و ثنا سے ہو رہا ہے؛ ثالثاً، گزشتہ سورت میں یہود کے، روح کے بارے میں، استفار پر انہیں مخاطب کر کے یہ کہا گیا ہے : وَ مَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا'' (۱۷ (الاسراء : ۸۵) جب کہ اس سورت میں حضرت موسٰی علیہ السّلام اور حضرت خضر علیہ السّلام کا قصّہ بیان کر کے انسانی علم کی محدودیت اور اللہ تعالٰی کے علم کی وسعتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؛ رابعاً، سابقہ سورت میں یہود کو یہ بتایا گیا ہے : وَ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِہٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْکُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَۃِ جِئْنَا بِکُمْ لَفِیْفًا (۱۷ [بنی اسرآءیل] : ۱۰۴) جب کہ اس سورت میں فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَہٗ دَکَّآءَ ۚ وَ کَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا سے لِّلْکٰفِرِیْنَ عَرْضًا تک (۱۸ [الکہف] : ۹۸ تا ۱۰۰) کے ارشاد باری میں بھی اللہ تعالٰی کی عظیم قدرتوں اور کفار کے عبرتناک انجام کا ذکر کیا گیا ہے ۔ (دیکھیے تفسیر المراغی، ۱۵ : ۱۱۳).

احادیث میں اس سورت کے فضائل کثرت سے بیان کیے گئے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے : ابن کثیر : تفسیر القرآن العظیم، ۳ : ۷۰ - ۷۱؛ تفسیر مواھب الرحمن، پارہ ۱۵ : ۲۱۸) - امام رازیؒ نے ابن عباسؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ و سلّم نے فرمایا : اَلَا اَدُلُّکُمْ علٰی سورۃ شَیّعَھَا سبعونَ الف مَلَک حینَ نَزَلَتْ ھی سورۃ الکھف ''(کیا میں تمھیں ایک ایسی سورت نہ بتاؤں کہ اس کے نزول پر ستر ہزار فرشتے اس کے جلو میں آئے - یہ سورت الکہف ہے) (التفسیر الکبیر، ۲۱ : ۷۳).

اس سورت کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم اس کے تاریخی پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہیں - سورت کی داخلی شہادت سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ وہ دور ہے جب قریش مکّہ نے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ و سلّم اور آپؐ کے صحابۂ کرام پر دست ظلم دراز کر رکھا تھا - ہر ممکن صورت میں اذیت رسانی کی جاتی - رسالتؐ مآب اور آپؐ کے رفقا پر مکمل معاشی اور معاشرتی مقاطعے سے دباؤ ڈالنے اور دعوت و تبلیغ سے باز رکھنے کے لیے آپؐ اور آپؐ کے خاندان کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا تھا - [قریش مکہ نے یہود کے اشارے سے جو چند سوالات کیے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اصحاب کہف کون اور کیا تھے - قرآن مجید اس کے جواب میں ان کا صحیح قصّہ بیان کرتا ہے (تفسیر ماجدی، ۶۰۲، مطبوعۂ لاھور] المختصر ایسے پُر خطر اور نازک دور میں مسلمانوں کو جو مظالم کی چکّی میں پسے جا رہے تھے تشفّی دی گئی ہے کہ پہلے اھل ایمان پر بھی ابتلا و مصائب کا دور اس سے بھی سخت تر گزرا ہے، لیکن انھوں نے انتہائی صبر و استقامت سے کام لیا اور انجام کار کامیاب و کامران ہوے - دوسری طرف قریش مکّہ کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ ان سے کہیں زیادہ طاقتور اور مقتدر اقوام ظلم کی بنا پر بالآخر تباہ و برباد ہو گئیں، لہٰذا انھیں حق کو قبول کر لینا چاہیے ورنہ ان کا انجام بھی عبرتناک ہو گا (دیکھیے تفہیم القرآن، ۳ : ۶ تا ۸).

اس سورت کا مرکزی مضمون عقائد و افکار کی تصحیح ہے - شرک کی مذمت بیان کر کے توحید کے تصور کو راسخ کیا گیا ہے اور وحی کی ضرورت و اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے؛ چنانچہ سورت کا آغاز حمد و ثنا اور اثبات وحی سے ہوتا ہے اور اختتام بھی توحید کے بیان، شرک کی مذمت اور اثبات وحی و رسالت پر کیا گیا ہے - سورت میں قصوں کا عنصر غالب ہے - ابتدا میں اصحاب الکہف کا قصہ آتا ہے اس کے بعد اصحاب جَنّتَین کا قصہ آتا ہے، پھر آدمؑ و ابلیس کے قصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے - درمیان میں حضرت موسٰی علیہ السّلام اور حضرت خضر علیہ السّلام کا قصہ مذکور ہوا ہے اور آخر میں ذوالقرنین کا قصہ بیان ہوا ہے گویا سورت کا بڑا حصہ، ۱۱۰ میں سے ۷۱ آیات، انھیں قصص پر مشتمل ہے - (دیکھیے فی ظلال القرآن، ۱۵ : ۷۶).

ان میں پہلا اہم قصہ اصحٰب الکہف کا ہے - یہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے اور جنھیں پیش آیا تھا وہ عیسائی موحّدین تھے (ترجمان القرآن، ۲ : ۳۹۶) - اس قصے کی قدیم ترین شہادت ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے مواعظ میں ملتی ہے جو ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں، سریانی زبان میں، لکھے گئے تھے - گبن نے انھیں تاریخ زوال و سقوط دولت روم کے باب ۳۳ میں اسی مأخذ کے حوالے سے ''Seven Sleepers'' (سات سونے والوں) کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ ابن جریر طبری اور دیگر قدیم مفسرین کی روایات سے ملتا جلتا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے : تفہیم القرآن، ۳ : ۱۲ ببعد) - اس کا

خلاصہ ہے کہ قیصر ڈیسیس یا دقیانوس (م ۲۵۱ء) کے زمانے میں جب مسیح ؑ کے پیرووں پر سخت ظلم و ستم ہو رہے تھے تو یہ سات نوجوان ایک غار میں پناہ گزین ہو گئے تھے اور ان پر غنودگی طاری ہو گئی تھی ۔ تقریباً تین سو برس گزرنے کے بعد قدرت خداوندی سے یہ بیدار ہوے تو پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السلام کی پیرو بن چکی تھی؛ تاہم ایک گروہ میں آخرت کے عقیدے کا انکار پایا جاتا تھا ۔ اس واقعے کے پیش آنے پر ان کے عقیدے کی تصحیح ہو گئی ۔ ابوالکلام آزاد نے الکہف (غار) کے اندرونی منظر کی دہشت انگیزی کا نقشہ خوب کھینچا ہے (دیکھیے ترجمان القرآن، ۲ : ۳۹۸) ۔ انھوں نے وَ لَبِثُوْا فِیْ کَہْفِہِمْ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا (۱۸ [الکہف] : ۲۵) کو قرآن کی تصریح کے بجاے لوگوں کا قول قرار دیا ہے اور ارشاد خداوندی قُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا'' (۱۸ [الکہف] : ۲۶) کو بطور دلیل پیش کیا ہے، نیز حضرت ابن عباس رض کا ایک تفسیری قول اس کی تائید میں پیش کیا ہے (وہی کتاب، محل مذکور) ۔ ابوالاعلٰی مودودی نے بھی اسی راے کو اختیار کیا ہے (دیکھیے تفہیم القرآن، ۳ : ۲۱) ۔

دوسرا اہم قصہ حضرت موسٰی ؑ اور حضرت خضر ؑ کا ہے ۔ جمہور علما کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اس میں مذکور حضرت موسٰی ؑ بن عمران، نبی بنی اسرائیل ہیں (تفسیر المراغی، ۱۵ : ۱۷۲) ۔ الجامع الترمذی میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ موسٰی ؑ بنی اسرائیل ہی موسٰی صاحبِ خضر ہیں (الجامع الترمذی، ۱۲ : ۲ تا ۷) ۔

خَضِر (بفتح الخاء و کسر ھا و کسر الضاد و سکونھا) کے متعلق اکثر یہی باور کیا جاتا ہے کہ وہ نبی تھے (التفسیر المراغی، ۱۵ : ۱۷۲) ۔ مفسرین نے ''فتی موسٰی ؑ'' کا نام یشوع بن نون بیان کیا ہے [جو حضرت موسٰی ؑ کے عزیز خاص و خادم خاص تھے ۔ یہ سفر کہاں پیش آیا، اس کے متعلق اختلاف ہے، اغلب یہ ہے کہ یہ سفر جزیرہ نماے سینا کے دوران قیام میں پیش آیا جو بحرِ قلزم کے شمالی دو شاخہ کے اتصال کی جگہ ہے] ۔

القاسمی نے اس خیال کو باطل قرار دیا ہے کہ خضر ابھی زندہ ہیں ۔ انھوں نے لکھا ہے کہ خضر ؑ فوت ہو چکے ہیں اور اس کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو رسول اکرم ؐ کے حضور میں حاضر ہوتے اور آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے ۔ نیز ابن عباس رض کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ''لَمْ یَذْکُرْ أحدٌ مِنَ الصَّحابۃِ انّہٗ رأی الخضِرَ'' (کسی بھی صحابی رض نے اس امر کا ذکر نہیں کیا کہ اس نے خضر ؑ کو دیکھا ہے) (تفسیرِ القاسمی، ۱۱ : ۴۰۹۴) ۔ [مزید تفصیلات کے لیے رک بہ الخَضِر] ۔

تیسرا اہم قصہ ذوالقرنین کا ہے جو بقول ابوالکلام آزاد ۵۵۹ ق م میں ایک غیر معمولی شخصیت کے طور پر ابھرا ۔ یہ پارس کے ھخامنشی خاندان کا ایک نوجوان گورش تھا جسے یونانیوں نے سائرس، عبرانیوں نے خورش اور عربوں نے کے خُسرو کے نام سے پکارا ۔ اسے پہلے پارس کے تمام امیروں نے اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا ۔ پھر بغیر کسی خونریزی کے میڈیا کی مملکت پر فرمانروا ہو گیا اور اس طرح دونوں مملکتوں نے مل کر ایران کی ایک عظیم الشان شہنشاہی کی صورت اختیار کرلی (ترجمان القرآن، ۲ : ۴۰۲) ۔ ابوالکلام آزاد نے اس امر پر دلائل پیش کیے ہیں کہ قرآن کا ذوالقرنین سکندر مقدونی نہیں ہوسکتا ۔ (کتاب مذکور، ۳۹۹ ببعد؛ نیز دیکھیے تفہیم القرآن، ۳ : ۴۲ ببعد) ۔ ابوالکلام آزاد نے بائبل کی ایک کتاب دانی ایل کے رؤیا کے حوالے سے (نیز دیکھیے کتاب مقدس : ۸۲۴) بالخصوص حقائق اور موجودہ اکتشافات کی روشنی میں اس پر بڑی مبسوط بحث کی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے : ترجمان القرآن، ۲ : ۴۰۰ تا ۴۳۰؛

[نیز رَكَ به ذوالقرنین]).

ان قصوں میں بالخصوص حضرت موسیؑ و حضرت خضرؑ اور اصحاب الکہف کے قصوں میں جہاں توحید کے تصور کو راسخ کیا گیا ہے، وھاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ غیب کا علم اللہ کے پاس ہے جو لامحدود قدرتوں کا مالک ہے اور جو حکیم و مدبر ہے اور جس کے اسرار و حِکَم کی معرفت سے بشری نگاھیں کوتاہ رہ جاتی ھیں۔ البته قدرت بقدر ضرورت، بعض حکمتوں سے پردہ اٹھا کر انھیں آشکارا کر دیتی ہے تاکہ انسان اپنی کوتاھی اور محدود علم کا اعتراف کرتے ھوے، غرور علمی کا شکار نہ ھونے پائے (دیکھیے فی ظلال القرآن، ۱۵: ۱۰۸؛ ۱۶: ۲۰).

مآخذ: (۱) الراغب الاصفہانی: المفردات فی غریب القرآن، مطبوعۂ قاھرہ؛ (۲) السیوطی: الاتقان، مطبوعۂ قاھرہ؛ (۳) الرازی: التفسیر الکبیر، مطبوعۂ قاھرہ؛ (۴) ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، لاھور ۱۹۷۳ء؛ (۵) محمد جمال الدین القاسمی: تفسیر القاسمی، قاھرہ ۱۹۵۹ء؛ (۶) سیّد قطب: فی ظلال القرآن، مطبوعۂ بیروت؛ (۷) احمد مصطفی المراغی: تفسیر المراغی، قاھرہ ۱۹۶۳ء؛ (۸) سید امیر علی: تفسیر مواھب الرحمٰن، لکھنؤ ۱۹۴۰ء؛ (۹) ابو الکلام آزاد: ترجمان القرآن، لاھور ۱۹۳۶ء؛ (۱۰) ابوالاعلٰی مودودی: تفہیم القرآن، لاھور ۱۹۷۶ء؛ (۱۱) الترمذی، قاھرہ ۱۹۳۴ء؛ (۱۲) الخطیب التبریزی: مشکٰوۃ المصابیح، دمشق ۱۹۶۱ء.

(بشیر احمد صدیقی)

اَلْکُہّان: [(ع)]؛ کاھن کی جمع؛ دوسری جمع کَہَنَہ ہے۔ کاھن کا مؤنث کاھنه ہے اور کاھن کے پیشے کو کہانت کہا جاتا ہے۔ [لسان میں ہے: رجلٌ کاھن من قوم کہنة و کُہّان و حرفته الکہانة (لسان، بذیل مادّہ)]۔ عرب جاھلیة کے ھاں غیب دان اور پیش گو کا نام ہے۔ [لسان میں ہے: الکاھن الذی یتعاطی الخبر عن الکائنات فی مستقبل الزمان و یدّعی معرفة الاسرار، یعنی کاھن وہ ہے جو زمانۂ آئندہ سے متعلق امور کی خبر بہم پہنچائے نیز ایسے اسرار کے علم کا دعوٰی ھو)۔ عبرانی میں اس کا نظیر کوھن Kōhen اور آرامی میں کاھن Kähen اور کاھنا Kahna (مذھبی قائد) ھیں۔ یہ لفظ عبرانی یا آرامی لفظ کا معرب نہیں ہے۔ بلکہ قدیم عربی زبان کے اصل مادے سے تعلق رکھتا ہے۔ Nöldeke اس کے خلاف کہتا ہے: *Neue Beiträge zur Semitischen Sprachwissenschaft*، ص ۳۶، حاشیہ ۶) کیونکہ یہودیوں کا کوھن (Kohen) یا کاھن (Kähen) عربی کاھن سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اغلب ہے کہ یہودیوں کے ھاں کوھن کسی وقت غیب دان کے معنوں میں استعمال ھوتا رھا ھو گا، لیکن بعد میں وہ ایک دانشمند، فیصل اور خاص کر ذابح قرابین اور معلم تورات کی حیثیت سے نظر آتا ہے، برخلاف اس کے عرب کاھن کی بابت جو کبھی مذھبی پیشوا نہیں ھوا (فان کریمر کی رائے اس کے خلاف ہے۔ دیکھیے حصۂ زیریں مآخذ ص ۴۷ بعد اور نیز ولہاوزن بھی اس کے خلاف ہے، ۱۳۴ اور دیگر صفحات)۔ ھم یہ نہیں کہ سکتے کہ اس نے کبھی یہ عہدے سنبھالے ھوں اور نہ اس کا پوجا اور پوجا گھروں کے ساتھ کبھی مستقل تعلق رھا۔ بلکہ یہ معلوم ھوتا ہے کہ وہ اپنی کار گزاریوں میں کبھی کسی عہدے وغیرہ کا پابند نہ تھا۔ کاھن کا مبدأ البتہ شامنیوں (شامنی مذھب کے پروھتوں) معالجوں، اور افسوں گر پجاریوں میں ملتا ہے، لیکن جب پہلے پہل قدیم عربی حکایات میں، حدیث میں، اس سے زیادہ ندرت کے ساتھ اشعار جاھلیة میں ھمارا ان سے سابقہ پڑتا ہے وہ تو خام شامنیت کی سرحد سے آگے نکل چکے

ہوتے ہیں، ان کی غیب دانی کا دارومدار استغراقی
کشف پر ہے ۔ یہ بھی درست ہے کہ رات کو انھیں
ایسے خواب نظر آتے ہیں، جن سے آئندہ کے احوال او۔
دیگر اشیا اور واقعات جو معمولی بشر کی آنکھوں سے
اوجھل ہوتے ہیں ان پر کسی قدر روشن ہو جاتے
ہیں (المسعودی : ۳ : ۳۲۹، ۳۹۴ بعد؛ شپرنگر
Sprenger، ۱ : ۱۲۶ بعد وغیرہ)، لیکن یہ لوگ
درحقیقت صاحب کشف و کرامت نہیں ہیں ۔
ان کے الہام کی اصل جنّی یا شیطانی ہے ۔ کوئی
جن یا شیطان (Saikoriov) جسے ان کا ''تابع''
''صاحب''، ''مولٰی'' یا ''ولی'' اور بالعموم رئّی یا
رِئّی (غالبًا غیب دان) کہا جاتا ہے ۔ ان کے اندر
بولتا ہے ۔ ان کے وجدانی استغراق کا یہ تجسم جو
پہلی نظر میں ان کو قدیم طرز کے شاعر (لفظی معنی
جاننے والا) کے ساتھ جس کی بابت یہ مان لیا گیا
ہے کہ جنّ انھیں، فوق العادۃ، سحری علم
عطا کرتے ہیں مرتبط کرتا ہے ۔ ان کو ایک
خارجی حقیقت نظر آتا ہے حتّٰی کہ کاہن کو
اس کا خیالی جن حقیقی متکلم معلوم ہوتا ہے اور وہ
خود اپنے آپ کو اس کا مخاطب محسوس کرتا ہے ۔
وہ صاف طور پر دیکھتا ہے کہ ایک روح اس کے پاس
آ رہی ہے، اس کے قدم کی آواز سنتا ہے اور اس کے
بولنے کی آواز اس کے پاس دور ہی سے آنے لگتی ہے ۔
وغیرہ وغیرہ (Sprenger : کتاب مذکور؛ Holscher،
ص ۱۸۰) ۔ [لسان میں، جہاں کاہن کے اس مفہوم کی
وضاحت کی گئی ہے جو عربوں کے ہاں سمجھا جاتا تھا،
یہ بتا دیا گیا ہے کہ کاہنوں کا ایک گروہ یہ دعوٰی
کرتا تھا کہ اس کا ''تابع جنّی'' یا ''رئی'' انھیں
خبریں بہم پہنچاتا ہے اور دوسرا گروہ یہ کہتا تھا
کہ ہم امور کو ان کے پیشگی اسباب وغیرہ کے
ذریعے پہنچاتے ہیں ۔ لسان کے الفاظ یہ ہیں ۔
فمنھم من کان یزعم انّ لہ تابعًا من الجنّ و رئیا یلقی
الیہ الاخبار و منھم من کان یزعم انّہ یعرف الامور
بمقدمات اسباب یستدل بھا علی مواقعھا (دیکھیے
لسان، بذیل مادّہ) ۔ بہر نوع لسان میں اس بات کا
کوئی تذکرہ نہیں کہ کاہن لوگ یہ دعوٰی بھی
کرتے کہ ان کا تابع جنّی خارجی پیکر کے ساتھ ان
سے ملاقی اور ہمکلام ہوتا انھیں نظر آتا تھا وغیرہ] ۔
سچ مچ ان سوکلوں (یا جنوں) کے اپنے
علٰحدہ نام بھی ہوتے تھے (اسی طرح جیسے
کہ شاعروں کے جنوں کے نام ہوتے تھے ۔ دیکھیے
یاقوت : معجم، طبع وسٹنفلٹ، ۴ : ۹۱۴ س ۱۴
بعد اور الجاحظ : ۴ : ۶۹؛ van Vloten، ۸ : ۶۵)
کاہنوں کے اقوال سجع یعنی چھوٹے چھوٹے مقفّی نثر کے
جملوں کی شکل میں ہوتے تھے جو عام طور پر ایک
ہی قافیے پر ختم ہوتے تھے یا کبھی شاذ و نادر ایک
جملہ چھوڑ کر پہلے جملے کا قافیہ دہرایا جاتا تھا
جیسا کہ عربستان میں ابتدائی زمانے سے آئندہ کی
خبریں دینے والوں اور ساحروں کے ادنٰی اور اعلٰی ہر
طبقے میں رواج چلا آتا تھا ۔ (بہت شاذ و نادر طور پر
باقاعدہ شعر بھی استعمال کر لیا جاتا ہے، مثلاً
الاغانی، بار اول، ۱۱ : ۱۶۱ س ۱۳)؛ سجع کے علاوہ
ایک مخصوص ترنم جس میں یہ اقوال ادا کیے جاتے
ہیں کاہن کے ملفوظات کی ایک خصوصیت ہے (ابن
ہشام، ۱ : ۱۷۱ س ۲ اور اسی موضوع پر، ۲ : ۵۸) ۔
اس حیثیت سے سجع کے ابتدائی معنے شاید محض
دندنہ یا تغرید کے یا کسی ایسی ہی آواز کے
ہوں گے جو جن مفروض کی ہو سکتی ہے ۔ سجع کا
فعل دوسری جگھوں میں جنّوں کی دوی اور طنین کے
لیے استعمال کیا گیا ہے اور کبوتر کی آواز اور اونٹوں
کے بلبلانے کے لیے تو باقاعدہ مستعمل ہوا ہے
(مثال کے طور پر دیکھیے عہد عتیق میں ۔ اشعیا
باب ۲۹، آیت ۴) ۔ کاہن، جن میں سے اکثر کو
جعلساز کہا جا سکتا ہے بالعموم اپنے اقوال کو

مشکل اور مبہم الفاظ میں پیش کرتے ھیں۔ (کاھنوں کے ملفوظات کے لیے دیکھیے مثلاً ہولشر Holscher ۸۷ ببعد، ۹۵ ببعد؛ المسعودی : ۳ : ۳۸۷ ببعد؛ الابشیہی : باب ۶۰؛ الاغانی، ۱۱ : ۱۶۱ س ۱۰ ببعد) .

زمانہ قبل اسلام کی اجتماعی اور انفرادی دونوں زندگیوں میں کاھنوں کو بڑا دخل تھا۔ تمام قبائلی اور ملکی اھم معاملات میں ان سے استفسار کیا جاتا تھا بالخصوص جنگی مہموں اور غارتوں کے وقت جن میں بالعموم وہ خود بھی حصہ لیتے تھے اور کبھی بذات خود ان کی قیادت بھی کرتے تھے (دیکھیے عہد نامہ عتیق میں ڈیبورہ Deborah) ۔ اسی لیے بادشاہ اور ملکہ اپنے اپنے نجومی اور پیش گو رکھا کرتے تھے *Die Burgen und Schlosser* : D. H. Muller *Sudarabiens nach dem Iklil des Hamdani*، ۱ : ۴۳ اور الطبری، طبع ڈخویہ، ۱ : ۷۶۲ س ۵) اور ھر قبیلے کا اپنا ایک کاھن یا کاھنہ، نیز ایک شاعر اور ایک خطیب ھوتا تھا ۔ نجی زندگی میں یہ کاھن خاص طور پر ھر قسم کے جھگڑوں اور قانونی بحثوں پر بطور حاکم کے فیصلے کرتے تھے؛ چنانچہ کاھن کا تصور حَکَم کے تصور سے بالکل ملا ھوا تھا (الحطیئۃ، قصیدہ ۱۷، شعر ۷؛ الابشیہی، قاھرہ ۱۳۲۱ھ، ۲: ۷۳ س ۱)۔ ان کے فیصلے خداوندی فیصلے خیال کیے جاتے تھے جن کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے ساتھ ھی وہ خوابوں کی تعبیر دیتے، گم شدہ اونٹوں کا پتا بتاتے، زنا کا راز فاش کرتے، دیگر جرائم اور بدکرداریوں بالخصوص چوریوں اور قتل وغیرہ کا پتا بتاتے تھے ۔ ان کارگزاریوں میں وہ اخبار غیب کے ادنی درجے پر اتر آتے تھے جو عَرّاف یا مُعَرِّف کے لیے مقرر ھے (دیکھیے وو، لائیڈن، بار اول، ۱ : ۴۰۶ ب اور دیکھیے ابن الأثیر : النہایۃ، ۳ : ۴۰؛ الجاحظ، ۶ : ۶۲ س ۵ نیچے سے؛ المسعودی، ۳ : ۳۵۲) ۔ اس قسم کے کاموں کے لیے انھیں کچھ رقم بطور اجرت اکرامیہ دی جاتی تھی جسے اسلام میں حرام قرار دیا گیا ھے (حلوان؛ البخاری : الصحیح، طبع (Krehl-Juynbol) ۲ : ۳۳ و ۵۵ اور مواضع کثیرہ؛ [تاج العروس، بذیل مادۂ حلو، والحُلوان بالضم اجرۃ الدلال خاصۃً عن اللحیانی و ایضا اجرۃ الکاھن و منہ الحدیث عفی عن حلوان الکاھن] البتہ لوگ ان کو اجرت دینے سے پہلے ان کی پیشگوئی کی طاقت کا امتحان کر لیتے تھے .

اس قسم کے مردوں اور عورتوں کا طبعًا اثر بہت ھوتا تھا اور وہ اکثر اپنے قبیلے کی حدود سے باھر اور دور دور تک تجاوز کر جاتا تھا ۔ یہ نہیں تھا کہ کاھن بالکل ادنی طبقے کے لوگوں سے چنے جاتے ھوں بلکہ بعض اوقات یہ لوگ بڑے ممتاز گھرانوں کے ھوتے تھے اور کبھی کبھی قبیلے کا سردار ھی ان کا کاھن بھی ھوتا تھا (Lammens، ص ۲۰۴ و ۲۰۷؛ الجاحظ، ۳ : ۶۲؛ van Vloten، ۷ : ۱۸۳؛ نیز ولہاوزن، ص ۱۳۴ جس نے غلطی سے یہ کہ دیا ھے کہ ان اونچے خاندان کے کاھنوں کو ان کا عہدہ ورثے میں ملتا تھا) ۔ بہر حال یہ لوگ اپنے قبیلے کے سردار اور عقلمند طبقے کے افراد ھوتے تھے (دیکھیے الجاحظ : البیان، باب اسماء الکُہّان و الحکام و الخطباء والعلماء من قحطان= قبیلۂ قحطان کے کاھنوں حاکموں ۔ خطیبوں اور علما کے نام، ۱ : ۱۳۶ نیچے سے۔ دیکھیے نیز کتاب مذکور، ص ۱۱۳ سطر ۱۰ ببعد، طبع قاھرہ ۱۳۳۳ھ، ۱ : ۱۹۲؛ ۱۵۹).

دونوں صنفوں کے چند مشہور کاھن یہ تھے : سطیح الذئبی شام میں اور شِق بن صَعب البَجَلی، (اور ان دونوں کا ذکر بالعموم ایک ساتھ آتا ھے اور دونوں یکساں فرضی معلوم ھوتے ھیں). غالبًا انھیں کے برابر غیر تاریخی یمنی شہزادی

طریقہ، جو Cassandra سے مشابہت رکھتی ہے۔ قبیلۂ مذحج کا المأسور الحارثی ۔ قبیلۂ ربیعہ کا سردار عمرو بن جُعَید الأفکل، قبیلۂ قریش کی سوداء بنت زھرہ، اور بنی قضاعہ کی زرقاء بنت زھیر وغیرہ (ولہاؤزن، ص ۱۳۶؛ المسعودی: ۳ : ۳۵۲، ۳۶۴ مواضع کثیرہ؛ فان فلوٹن ۔ ۷ : ۱۷۲، ۱۷۴، ۱۸۰ وغیرہ) ۔ جنوبی عرب کے کاھن خاص طور پر بڑی شہرت رکھتے تھے (الأغانی، ۸ : ۵۱ س ۴)۔

من حیث الاستعمال کاھن کا مترادف لفظ حازی (جمع حزاۃ اور حازۃ اور حازُون، مؤنث حازِیَۃ جمع حوازی) کچھ کم رائج نہیں ہے ۔ ظاھر ہے کہ یہ عبرانی لفظ Haza کا مترادف ہے ۔ لیکن اس کے خالص عربی لفظ ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے ۔ دوسری جانب ضروری ہے کہ ھم کاھن کو، جس کے، مافوق العادۃ علم کا دارومدار جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ۔ اندرونی الہام، پر ہے ان لوگوں سے بالکل ممتاز سمجھیں ۔ جو ادنی قسم کی پیشگوئی اور جادو کے کرتب دکھاتے پھرتے ھیں اور جن کا دارومدار خارجی اور فنی ذرائع پر ھوتا ہے ۔ جو مقررہ امور عادیہ کی مشق سے حاصل ھو سکتے ھیں اور بالفاظ دیگر ان معمولات پر کاربند ھو کر/کا جو چاہے انہیں سیکھ سکتا ہے، یعنی عائف یا زاجر جو پرندوں کی اڑان کو پہچانتا ہے ۔ قائف، حارز اور حزّار جو نشان قدم دیکھتا ہے ۔ عرّاف یا مُعَرِّف پانی کی جگہ بتانے والا (اصطلاحوں کے لیے بیان بالا بھی دیکھیے)، منجم ستارہ شناس، الناظر فی اسرار الکف، ھاتھ کی لکیریں دیکھنے والا ۔ خاطّ جو زمین پر کھنچی ھوئی لکیروں سے قسمت کا حال بتاتا ہے الضّارب یا الطّارِق بالحصا جو کنکریاں ڈال کر پیش گوئی کرتا ہے اور جھاڑ پھونک کرنے والا ساحر یا راقی کبھی کبھی ان لوگوں کو بھی لفظ کا غلط استعمال کرتے ھوے کاھن کہ دیا جاتا ہے ۔ اس کا رواج غالبًا اس وقت ھوا جب اسلام نے اعلٰی درجے کی کہانۃ کا خاتمہ کر دیا اور فقط بیرونی کرتب ٹونا، جھاڑ پھونک اور سحر باقی رہ گئے [مقالہ نگار کی یہ بات محل غور ہے کہ اسلام نے فقط اعلٰی درجے کی کہانۃ کا خاتمہ کیا اور یہ کہ کہانۃ کی ادنی اقسام باقی رہ گئیں ۔ معلوم نہیں اس بات کی سند مقالہ نگار کے پاس کیا ہے؟ ۔ جب کہ ابن الأثیر نے کہا ہے کاھن سے رجوع کی ممانعت والی حدیث میں عراف اور منجم وغیرہ تک شامل ھیں ۔ قال ابن الأثیر و قولہ فی الحدیث من اتی کاھنا یشتمل علی اتیان الکاھن والعرّاف والمنجّم (دیکھیے لسان، بذیل مادّہ) میں یہاں پھر اس بات پر اصرار کرنا چاھتا ھوں (گو ویل ہاؤزن نے ص ۱۳۴ اور دیگر مواضع میں اس سے اختلاف کیا ہے) کہ کاھن، یہودیوں کے کوھن کی طرح، خدائی آوازوں کا دھرانے والا نہ تھا ۔ یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ھم ''کوھن، کو کبھی تیروں کے ذریعے سے قسمت کا فیصلہ (استقسام) کرتے ھوے نہیں پاتے۔

قرآن مجید میں حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کے کاھن ھونے سے صاف طور پر انکار کیا گیا ہے (۵۲ [الطّور] : ۲۹؛ ۶۹ [الحاقّۃ] : ۴۲؛ ۸۱ [التکویر] : ۲۲ ببعد) لیکن [ابتداے نبوت کی بعض باتیں مثلًا آغاز وحی کی کیفیت استغراق اور سچے خواب بظاھر کاھنوں کی مذعومہ کیفیات سے مشابہ دکھائی دیتے ھیں]۔

مشرکین مکّہ نے ابتداءً آپؐ کو کاھن ھی سمجھا اور آپؐ کے اس دعوے سے کہ میرا کاھن سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، بلکہ میں اللہ کا رسول اور پیغمبر ھوں، ان پر شروع میں کوئی اثر نہ ھوا ۔ آپ کے جھوٹے نقّالوں مثلًا مسیلمہ، طلیحہ [جو بعد میں مسلمان ھوگئے اور زمانۂ اسلام میں وفات ھوئی رک بہ طلیحہ] اور بالخصوص

اسود عنسی نے جس سے سجاح [یہ بھی بعد ازاں تائب ہوگئی تھیں اور زمانۂ اسلام میں انتقال کیا رکّ بہ سجاح] بھی، جو اس جرگے کی ایک مؤنث فرد ہے، پیچھے نہیں ہے - اپنا کھیل کاھنوں کے بھیس میں کھیلا عرب کے لوگ پشتینی کافر اور مشرک تھے - وہ چاہتے تھے کہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو معمولی کاھن کہ کر ان سے اپنا پیچھا چھڑا لیں، لیکن بعد میں ان کی بہت جلد آنکھیں کھل گئیں - حیرت اور افسوس تو ان کے حال پر ہے جو عالم اور عقلمند ہوتے ہوے آنکھیں بند کر کے نصف النہار کے سورج کا انکار کرتے رہے .

اسلام نے توحید کا ڈنکا بجاکر محمد صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم پر ہر قسم کی وحی کے خاتمے کا اعلان کر کے اور شرع کے مقرر قانون کے ذریعے تمام معاشی رسوم و رواج کو ایک ضابطے کے ماتحت لا کر قدیم کاھنوں کا خاتمہ کر دیا - لیکن حقیقت میں یہ کام رفتہ رفتہ پورا ہوا کیونکہ ہم ۱۳۲ھ تک میں ایک کاھن کا ذکر سنتے ہیں (الطبری، ۳ : ۲۱ س ۱) موجودہ عربستان میں کہنۃ (کاھنوں) کی بابت دیکھیے لینڈ برگ : *La Langue arabe et sesdialectes*، ۷۰، اسلامی شمالی مغربی افریقہ میں کاھنہ عورتوں کی بابت دیکھیے Doutte، ص ۳۲ ببعد) غالبًا محمد صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو کاھنوں کے اقوال کے مافوق العادۃ ہونے میں کبھی تردّد نہ ہوا [مقالہ نگار کا یہ خیال درست نہیں، احادیث نبوی سے بھی کہیں اس کی تائید نہیں ہوتی]، لیکن جب آپ نے جنوں کو شیاطین کے مرتبے میں اتار کر ان کے علم کو آسمان سے سرقہ کیا ہوا قرار دیا جس کی شکل کو مسخ کر کے اور بہت کچھ اپنی طرف سے ملا جلا کر وہ کاھنوں کو دیتے تھے (۷۲ [الجن] : ۸ ببعد؛ ۳۷ [الصّٰفّٰت] : ۷ ببعد؛ ۱۱۴ [النّاس] : ۱ تا ۶)، ابن ھشام : سیرۃ : ۱۳۱ ببعد) - اس سے کاھنوں کی پیش گوئیوں کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا - اسی سلسلے میں وہ احادیث سامنے آئیں - جن میں اھل اسلام کو کاھن کے پاس جانے سے منع کیا گیا ہے - (السیوطی : الجامع الصغیر، باب من اتی کاھنًا : البخاری، ۲ : ۳۳-۵۵ بمواضع کثیرہ نیز دیکھیے ابن عباس کا قول : اِیّاکُم و الکِہانۃ وغیرہ - درالزمخشری : الکشاف، سورۃ لقمان ۳۱ آیت ۳۴).

مآخذ : (۱) Wellhousen : *Reste arabischen Heidentums*، بار دوم، ص ۱۳۴ ببعد، ص ۱۴۳، ۲۰۶ ببعد؛ (۲) شپرینگر : *Das Leben und die Lehre des Mohammad*، بار دوم، ج ۱، بالخصوص ص ۲۵۵ ببعد؛ (۳) فان کریمر : *Studien zur vergliechunden Culturgestichte Vorzüglich nach arabischen Quellen*، ج ۳ اور ۴، (*Sitzungsb. der Phil-hist. kl. der Wiener Akademie*، ۱۲۰ نمبر ۸) ص ۳۷ ببعد؛ (۴) Van Vloten : *Dämonen Geister und Zauber bei den alten Arabern. Mitteilungen aus Djâhitz, Kitab al-Haiwân*، در *Wiener Zeitxhr. f. die Runde dis Morgenlondes*، ج ۷، ص ۱۶۹ ببعد، ص ۲۳۳ ببعد، ج ۸، ص ۵۹ ببعد؛ (۵) Goldziher : *Abkandl zur arab. Philologie*، ۱ : ۱۸ ببعد، ص ۶۹ و ۱۰۷ ببعد؛ (۶) Lagrange : *Etudes sur les religions semitiques*، بار دوم، ص ۲۱۸ ببعد؛ (۷) Doutte : *Magie et Religion dans l'Afrique du Nord*، ص ۲۸ ببعد؛ (۸) D. B. Macdonald : *The Religious life and Attitude in Islam*، ص ۲۰ تا ۳۳ بمواضع کثیرہ؛ (۹) Hölscher : *Die Profeten*، *Untersuchangen zur Religionsgeschichte Israels*، ص ۷۹ ببعد؛ (۱۰) Lammens : *Le berceau de l'Islam*، ۱ : ۲۰۳ ببعد، ص ۲۰۷؛ (۱۱) Schrieke : *Die Himmelsreise Muhammads* در

Islam der، م : ۲۲ بعد؛ (۱۲) الجاحظ : کتاب الحیوان، بمواضع کثیرہ (دیکھیے : V. Vloten)؛ (۱۳) المسعودی : مروج الذّھب، طبع Barbier de Meynard اور Pavet de Courteille، ۳ : ۳۴۷ بعد؛ (۱۴) القزوینی : عجائب المخلوقات، طبع Wüstenfeld، ص ۳۱۸ بعد؛ (۱۵) ابن خلدون : مقدمہ، طبع Quatremére : *Not. et Extr.*، ۱۶ : ۱۸۱ بعد، ترجمۂ ڈی سلان، ۱۹ : ۲۰۶ بعد (طبع قاھرہ ۱۳۲۷ھ، ص ۱۱۲ بعد)؛ (۱۶) الابشیھی : المستطرف، باب ۶۰.

(A. FISCHER)

* کیا : کیایا [رك بہ کتخدا].

* کَیْخُسْرو : ایران کا ایک اساطیری بادشاہ جو کیانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ سیاوَخش کا بیٹا تھا ۔ سیاوخش نے اپنے باپ کیکاؤس کے ھاں سے بھاگ کر توران میں پناہ لی اور وھاں کے بادشاہ افراسیاب [رك بآں] کی دختر سے شادی کر لی ۔ کیخسرو اپنے باپ کی وفات کے بعد پیدا ھوا اور اسی ملک توران میں قَـلّو (بامیان کے نزدیک ایک وادی ھے) کے پہاڑی علاقے میں پرورش پائی ۔ وہ اس بات سے بےخبر تھا کہ وہ شاھی نسل سے ھے، لیکن آخر اس پر یہ راز منکشف ھو گیا ۔ سات سال کی عمر میں وہ کمانیں بنا لیا کرتا تھا اور جب دس سال کا ھوا تو نہ شیر سے ڈرتا تھا اور نہ چیتے سے ۔ اس کے بعد افراسیاب کا وزیر پیران اسے اپنے گھر لے گیا ۔ ایک ایرانی امیر گودرز کو جو کاوہ آھنگر کی نسل سے تھا، خواب میں معلوم ھوا کہ ایران کے تخت و تاج کا وارث دشمنوں کے ملک میں موجود ھے، چنانچہ اس نے اس کی تلاش میں اپنے بیٹے گیو کو روانہ کیا ۔ گیو توران پہنچا اور کیخسرو سے اس کی مڈ بھیڑ بالکل اتفاقی طور پر ھو گئی اور اس کے بازو کا سیاہ نشان جو کیانیوں کی امتیازی علامت تھی، دیکھ کر اسے پہچان لیا اور اسے اور اس کی ماں فَرنگِس کو اپنے ساتھ ایران لے آیا.

یہاں پہنچ کر کیخسرو کو اپنے چچا فَارِیبُرز سے مقابلہ کرنا پڑا، جو وارث تخت و تاج ھونے میں اس کا حریف تھا ۔ یہ مسئلہ طے کرنے کے لیے کیکاؤس نے فیصلہ کیا کہ تخت اسی کو ملے گا جو قلعۂ بہمن دز فتح کرے گا، یہ قلعہ اردبیل [رك بآں] کے قریب تھا اور اس پر اَھْرمَن کی حکومت تھی ۔ فاتح آخر کیخسرو ھی کو ھونا تھا، چنانچہ وہ آسمانی قوتوں کی مدد سے اس مہم میں کامیاب ھوا اور وھاں مقدس ”آگ آذرگُشْنَسْپ“ کے اعزاز میں ایک آتشکدہ تعمیر کیا ۔ شاہ ایران ھونے کے بعد اپنی مملکت کا دورہ کرنے سے کیخسرو کو ان تباہ کاریوں کا علم ھوا جو تورانیوں نے ایران میں کی تھیں ۔ چنانچہ اس نے قسم کھائی کہ انتقامی جنگ کے ذریعے توران کو برباد کر کے چھوڑے گا ۔ اس نے تمام امرا کا تعاون حاصل کر کے توران پر فوجی حملے شروع کر دیے ۔ پہلی مہم میں تو اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لیکن جلد ھی پانسہ پلٹ گیا ۔ اس نے جنگ کی قیادت خود سنبھالی ۔ افراسیاب کو خاقان چین کی اعانت کے باوجود آخر کار فرار ھونا پڑا ۔ کیخسرو نے سمندر پار تک اس کی جستجو کی افراسیاب آذر بیجان [رك بآں] کے پہاڑوں کے ایک غار میں چھپا ھوا تھا اور اس کی یہ پوشیدہ پناہ گاہ خارق عادت و سائل کے بغیر ڈھونڈی نہیں جا سکتی تھی ۔ بالآخر وہ گرفتار ھوا اور اس کا سر قلم کر دیا گیا ۔ اس طرح سیاوخش کے قتل کا انتقام پورے طور پر لے لیا گیا.

کیخسرو نے اپنے دادا کیکاؤس کا چالیس روز تک ماتم کیا، اس کے بعد اس کا جانشین ھو کر امن و امان کے ساتھ حکومت کی ۔ اس کے عہد سلطنت میں کوئی اس سے زیادہ نمایاں واقعہ پیش نہیں آیا کہ اس نے ایک اژدھے کو جس نے اصفہان اور فارس کے درمیان کُوشید کے سرخ پہاڑ میں اپنی

جگہ بنا لی تھی، ہلاک کیا (حمزۃ الاصفہانی، طبع Gottwaldt، ص ٣٦، برلن، ص ٧) ۔ کیخسرو نے آخر عمر میں خدا سے التجا کی کہ اسے بہشت میں جگہ دی جائے ۔ اس کے بعد اس نے لُہراسپ کو اپنا جانشین مقرر کیا پھر ایک چشمہ (چشمہ حیات جاودان ''آب روشن'') میں غسل کرکے پہاڑوں کی طرف روانہ ہوا اور انہیں میں کہیں غائب ہو گیا ۔ جو لوگ اس کے ساتھ گئے تھے، وہ برف کے طوفان میں ہلاک ہو گئے ۔ یہ امر واضح ہے کہ کیخسرو کی شخصیت اوستا کے بطل ہاؤسرونہ Haosravanh سے ملتی ہے جو ہندی ایرانی اساطیر سے تعلق رکھتا ہے .

مآخذ : (١) فردوسی : شاهنامه، طبع Vullers، ٢ : ٦٧٠ تا ٦٧٩، ٧٠١ تا ٧٠٣، ١٠٠٧ و ٣ : ١٣٣٢؛ طبع و ترجمۂ Mohl، ٢ : ٣١٦ تا ٣٣٠، ٣٦٢ تا ٣٦٥، ٣٧٦ و ٤ : ٢٧٣؛ (٢) الطبری : *Annales*، طبع de Goeje، ١ : ٦٠٣ ببعد؛ (٣) الثعالبی : غرر اخبار ملوک الفرس، طبع و ترجمہ Zotenberg، ص ٢١٣، ٢١٨ تا ٢٢٣ [(٤) ثعالبی : شاهنامه، مطبوعۂ تہران، ص ١٣٢٨ - ١٣٢٩ھ، ص ٩٧، ٩٩ تا ١١٠]؛ (٥) Dubeux : *La Perse*، پیرس ١٨٤١ء، ص ٢٤٨ تا ٢٦١؛ (٦) Fr. Spiegel : *Eranische Alterthumskunde*، ١ : ٦٠٩، ٦٥٦ ببعد؛ (٧) وهی مصنف : *Awestâ und Shâhnâme*، در *Deutsch. Morg. Gesellsch.*، ٤٥ (١٨٩١) : ١٩٦؛ (٨) *Gründr. d. iran Philologie*، ٢، بمدد اشاریه، بذیل *Kavi*؛ (٩) Th. Nöldeke : *Das iranische Nationalepos*، بار دوم، (برلن - لائپزگ) ١٩٢٠ء، ص ١، ٣، ٥، ١٢، ٣٥، ٣٩ ببعد، ٥٠، ٥٢، ٥٥، ٦٠ ببعد .

(Cl. Huart)

کَیخُسرو : ایشیاے کوچک کے تین سلجوقی فرمانروا اس نام کے ہوے ہیں :

کیخسرو اول : غیاث الدین بن قلج ارسلان ۔ ٥٨٨ھ / ١١٩٢ء میں قلج ارسلان دوم بڑھاپے اور ناتوانی کے عالم میں فوت ہوا تو اس وقت اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کیخسرو کے ہاں تھا، جو اس کی زندگی میں برغلو (یعنی اُلبُرلُو) کا والی تھا ۔ کیخسرو نے اپنے باپ کی موت کی خبر پوشیدہ رکھی اور اس خبر کو فقط اس وقت ظاہر کیا جب وہ اس کا جنازہ لے کر قونیہ پہنچ گیا، غرض یہ تھی کہ وہاں خود اسے سلطان تسلیم کرکے اس کی اطاعت اختیار کی جائے ۔ اس کے بھائیوں نے جن میں سے ہر ایک سلجوقی سلطنت کے الگ الگ حصے پر حکومت کر رہا تھا، اس کی بس اسی قدر پروا کی جتنی وہ اپنے باپ کی اس کے آخری دنوں میں کیا کرتے تھے ۔ بہرحال کچھ مدت بعد (بعض کے نزدیک ٥٩٢ھ / ١١٩٦ء اور بعض کے نزدیک ٥٩٠ھ میں) ہی وہ اس قابل ہوے کہ ان میں سے کوئی اس سے قونیہ لے لے ۔ آخرکار رکن الدین سلیمان [رک بآں] قونیہ فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا اور کیخسرو کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی ۔ اس نے ارمینیا کے بادشاہ لیون Leon اور ہمسایہ ممالک مثلاً مَلَطْیہ، حَلَب، اور آمد کے فرمانرواؤں کی مدد سے اپنا تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کئی بار کوشش کی مگر ناکام رہا ۔ اس کے بعد، وہ ادھر ادھر سرگردان پھرتا رہا (دیکھیے اس کی اپنی کہی ہوئی نظم در ابن بیبی، ص ٩ ببعد)، تاآنکہ قسطنطینیہ میں الکسیس Alexius سوم نے اس کا خیر مقدم کیا ۔ اسی زمانے میں اس نے ایک ممتاز یونانی ماروزومز Maurozomes کی بیٹی سے شادی کی ۔ اس کے چند ہی دن بعد ٦٠٠ھ / ١٢٠٤ء میں اس کے بھائی کی وفات ہو گئی اور اسے قونیہ واپس آنے کا موقع ہاتھ آیا ۔ وجہ یہ تھی کہ چند امرا اس کے متوفی بھائی کے بیٹے قلج ارسلان سوم کی حکومت سے جو ابھی نابالغ تھا، مطمئن نہیں تھے ۔

اس سازش میں خاندان دانشمندیہ [رکّ باں] کے بعض افراد نے بڑا حصہ لیا کیونکہ دانشمندیہ کو قلج ارسلان دوم نے تاج و تخت سے محروم کر دیا تھا۔ اب اس کے باوجود کہ قاضی الترمذی نے اس کے خلاف فتوی دے دیا تھا کہ وہ تخت نشینی کے قابل نہیں، کیونکہ اس کی ماں عیسائی ہے اور کفار سے اس کے گہرے مراسم ہیں، تاہم کیخسرو قونیہ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس فتوے کی بدولت قاضی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ابن الأثیر (الکامل، طبع Tornberg، ۱۲ : ۱۹۰ و قاہرہ ۱۳۰۳ھ / ۱۱ : ۹۳) کے بیان کے مطابق کیخسرو نے ۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء میں طرابزون Trebizond کا محاصرہ کر لیا، لیکن بظاہر اس کو کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ ۶۰۳ھ / ۱۲۰۷ء میں اس نے الدوبراندینی Aldobrandini سے انطالیہ کی اہم بندرگاہ چھین لی۔ اسی قبضے کے وقت سے سلجوقیوں کے روابط اھل وینس سے شروع ہوتے ہیں، جنھیں اس نے تجارت کا پروانہ عطا کیا (دیکھیے Heyd : *Gesch. des Levantehandels* ۱ : ۳۳۴)۔ ۶۰۵ھ/۱۲۰۸ء میں اس نے الملک الظاہر شاہ حلب کے ساتھ مل کر ارمنیوں پر چڑھائی کی اور پرتس Pertus کا قلعہ فتح کر لیا۔ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں وہ جنگ خوناس میں اور غالبًا تھیوڈور لیسکارس Theodore Lascaris کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ دیکھیے Nicephoros Gregoras طبع Bonn، ۱ : ۱۷ تا ۲۰؛ اور Georg. Acropolita طبع Bonn، ص ۱۶؛ اور پھر اسی کے بارے میں Houtsma، در *Verslagen en Mededeelingen der Kon Akad van Wetensch*، Afd. Letterk. سلسلۂ سوم، ۹ (۱۸۹۳ء) : ۱۳۸ ببعد۔

کیخسرو دوم : غیاث الدنیا و الدین بن کیقباد، ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء میں اپنے باپ کے قتل ہو جانے کے بعد تخت نشین ہوا، حالانکہ اس کے باپ نے اپنے دوسرے بیٹے عزالدین کو جو ایوبی شہزادی کے بطن سے تھا، اپنا جانشین مقرر کیا [رکّ بہ کیقباد اول]، جس کی وجہ بقول وسٹنفلٹ بظاہر یہی تھی کہ کیخسرو ایک داشتہ کے بطن سے تھا (جیسا کہ قیصریہ میں اس کے لوح مزار سے پتا چلتا ہے۔ یہ داشتہ ماہ پری خاتون کے نام سے مشہور تھی)۔ اس کے علاوہ وہ ایک حقیر شخصیت کا آدمی تھا، لیکن یہ بات ضرور تھی کہ اس کے باپ نے داؤد شاہ کو معزول کر کے اسے ارزنجان کا والی مقرر کر دیا تھا [رکّ بہ کیقباد] اور اجیر عیسائیوں کے بل بوتے پر وہ تخت کا امیدوار تھا۔

ان عیسائی اجیر سپاھیوں نے امیر سعد الدین گوبک Göbäk کے ساتھ مل کر کیخسرو کی بادشاہت کا اعلان مکمل کرا ھی دیا۔ بد نصیب عزالدین، اس کی ماں اور ایک اس کا چھوٹا بھائی سب راستے سے ھٹا دیے گئے۔ اس صورت حال سے فقط خوارزمی [رکّ بہ کیقباد اول] غیر مطمئن تھے۔ انھوں نے اطاعت احکام سے انکار کر دیا اور ملحقہ ایوبی حکومت کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے کے لیے سلجوقی مملکت کی حدود سے نکل گئے۔ کیخسرو نے مصلحۃً یہ کیا کہ ایوبیوں کے ساتھ صلح کر لی اور دوسری شادی کے ذریعے حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ اس تقریب میں مشہور مؤرخ کمال الدین نے شاہ حلب کے بااختیار وکیل کی حیثیت سے اس کی نمائندگی کی۔ کیخسرو کاروبار حکومت کی طرف توجہ دینے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ اس لیے امیر سعد الدین نے سارے اختیارات اپنے ھاتھ میں لے کر وحشت و بربریت کا دور قائم کر دیا۔ امیر مذکور نے تو یہاں تک کیا کہ وہ اپنے آپ کو کیخسرو اول کا بیٹا ظاھر کرنے لگا۔ غرض اس کی

چیرہ دستیاں اتنی بڑھ گئیں کہ بالآخر سلطان کو اسے فریب سے قتل کروانا پڑا ۔ اس کے بعد سلطان نے گرجستان کی حسین شہزادی تمر سے شادی رچائی [رک بہ کیقباد اول] اور اس کی تصویر سکوں پر کندہ کرانے کی خواہش بھی ظاہر کی ۔ یہ خیال جب اسے مجبوراً ترک کرنا پڑا تو دلی سکون کی خاطر شیر اور نکلتے ہوئے سورج کا نشان منتخب کر لیا جو آج بھی بصورت شیر و خورشید ایران کا قومی نشان ہے ۔ تھوڑے ہی عرصے میں ترکمانوں کے شورش بپا کرنے پر سلطنت کی داخلی کمزوریوں کا پتا چل گیا (۶۳۸ھ/ ۱۲۴۱ء) ۔ یہ بغاوت بابا اسحٰق ولی کے ظہور کے ساتھ وابستہ تھی جس کے مبلغوں نے سارے ملک کا دورہ کر کے مجالس وعظ میں سلطان اور امرا کی عیاشانہ زندگی کی خوب مذمت کی ۔ تھوڑے ہی دنوں میں شُمَیساط اور مَلَطْیہ کے اضلاع سے مسلح دستے سیواس، توقات اور اماسیہ Amasia کی طرف بڑھے اور ترکی سپہ سالاروں کو جو ان کے مقابلے کے لیے، بھیجے گئے تھے، مار بھگایا ۔ اس پارسا بابا کو سزاے موت دینے سے اس کے پیرووں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی کیونکہ لوگ اسے ملہم من اللہ مانتے تھے ۔ جب سرحد ارز روم پر متعین فوجوں کو جن میں اجیر عیسائی سپاھی شامل تھے، بلایا گیا، تب کہیں جا کر بڑی خونریزی کے بعد باغیوں کی سرگرمیوں کا خاتمہ ہوا (دیکھیے روئداد، در Vincent de Beauvais، کتاب ۳۰، باب ۱۳۹، ۱۴۰) ۔ یہاں اس دینی رہنما کو بابا روئیسول Roissole (= رسول اللہ) لکھا ہے ۔ المقریزی، *Histoire d' Egypte Makrizi*، مترجمۂ Blochet پیرس ۱۹۰۸ء ص ۳۷۴، میں ال بابا لکھا ہے (ال غالباً عربی حرف تعریف ال کی تحریف ہے یا الیاس کا مخفف ہے کیونکہ الیاس بابا کا نام بھی ملتا ہے) ۔ (دیکھیے کو پرولو زادہ محمد فؤاد، الک متصوفلر، ص ۲۳۲) ۔ ابھی اس

مصیبت سے پوری نجات نہیں ملی تھی کہ ۶۳۹ھ/ ۱۲۴۱ء میں بایجو نویان **Baidju Noyon** اپنے مغولی لشکر کے ساتھ ارز روم کے سامنے آ دھمکا اور سرحد پر متعین افواج سے شدید جنگ کے بعد شہر میں بہت لوٹ مار کی ۔ مُہذّب الدین وزیر اور اس کے نائب شمس الدین اصفہانی نے بڑی سرعت سے کثیر تعداد میں ایک لشکر جمع کیا اور مال و دولت کے ذریعے آرمینی اور ایوبی اجیر سپاھیوں کی خدمات حاصل کیں اور مغول کے مقابلے پر نکلے، لیکن ترک سپاھیوں کی نا اہلی اور کم ھمتی کے باعث کوزہ داغ **Közädagh** کے مقام پر شکست کھائی (۶ محرم ۶۴۱ھ/ ۲۶ جون ۱۲۴۳ء) ۔ اس کے بعد بایجو نے سواس پر یلغار کی، لیکن وھاں کے لشکر نے ھتیار ڈال دیے جس کی وجہ سے یہ مقام غارت گری سے بچ گیا ۔ مگر قیصریہ کو اس نے بزور شمشیر فتح کیا ۔ وھاں بہت لوٹ مار ھوئی اور قتل عام بھی ھوا ۔ اس کے بعد بایجو اپنے سرمائی مستقر کو چلا گیا اور وزیر اس سے ایک عارضی صلح طے کرنے میں کامیاب ھو گیا ۔ لیکن اس کی تکمیل خان اعظم کی توثیق پر موقوف تھی ۔ انھیں دنوں اوگدائی **Ugedei** کا انتقال ھو گیا اور اگلی وریلتائی [مغول کی مجلس شوریٰ] ۱۲۴۶ء تک منعقد نہ ھو سکی (دیکھیے صفحات سابقہ، در ۱: ۶۸۲ الف) ۔ اس لیے ترکوں کو چند سال کے لیے امن نصیب ھو گیا ۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ھوے ھوشیار شمس الدین نے باتو خان **Batu** کے پاس متعدد ممتاز ترکوں کی معیت میں پُر تشریفات سفارت لے جا کر اس کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی ۔ اس میں وہ پوری طرح کامیاب رھا، چنانچہ واپسی پر اسے عہدۂ وزارت مل گیا جو مہذب الدین کی وفات پر خالی ھوا تھا ۔ نا اھل سلطان نے جو کوزہ داغ کی لڑائی کے بعد یونانیوں کے ھاں بھاگ جانے

کے لیے تیار بیٹھا تھا، اب کچھ کمر ہمت باندھی اور ۱۲۴۵ء میں ارمنیوں پر لشکر کشی شروع کر دی ۔ اسے ارمنیوں کے خلاف سخت رنجش تھی، کیونکہ انھوں نے اس کی ماں کو جس نے ان کے بادشاہ کے پاس پناہ لی تھی، اس کے خزانوں سمیت مغول کے حوالے کر دیا تھا ۔ اس مہم کا مقصد اس موقع پر طرسوس کو فتح کرنا تھا، لیکن برسات کا موسم شروع ہونے کی وجہ سے اس سے ہاتھ اٹھانا پڑا، بہر حال ملک کو نہایت وحشت ناک طریقے سے تاخت و تاراج کرنے کے بعد فوج واپس آ گئی ۔ ارمنیوں نے ایک صلح نامے کی رو سے سالانہ خراج ادا کرنے اور بَرَگَنَہ Bragana کا شہر حوالے کرنے کا عہد کیا ۔ جب ان کے سردار دوبارہ سلطان کے دربار میں پہنچے تو وہ ایک ہفتہ پہلے اچانک وفات پا چکا تھا ۔

مآخذ (۱) : دیکھیے بذیل مادّۂ کیکاؤس: (۲) اس سلسلے میں Vincent de Beauvais اور عہد مغول کے مؤرخین خاص طور پر اہم ہیں ۔

کیخسرو سوم : غیاث الدین بن رکن الدین قِلِج ارسلان اگرچہ ابھی کمسن ہی تھا، لیکن کامل الاقتدار ''پروانہ معین الدین سلیمان'' [رکّ بآں] نے اس کے باپ کے قتل ہونے کے فوراً بعد اس کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا ۔ اس کے عہد حکومت میں ایشیاے کوچک میں جو واقعات رونما ہوے، ان کا ذکر بذیل مادّۂ سلیمان زیادہ مناسب ہوگا ۔ پروانہ کے قتل (۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء) کے بعد بہت جلد کیخسرو کی حکومت بھی ختم ہو گئی، کیونکہ کمسنی کے باعث وہ تاتاریوں کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا ۔ اس کا بھتیجا مسعود [رکّ بآں] جب اپنے باپ کی وفات کے بعد ایشیاے کوچک واپس آیا تو (خان اعظم) اباقا [رکّ بآں] کی عنایات حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ۔ یہاں تک کہ ۶۸۱ھ ہی سے اس کے نام کے سکے ہمیں ملتے ہیں ۔ بد نصیب کیخسرو بالکل تاتاری شہزادے اور مدعی تخت قَنقُرطائی Ḳanḳuraṭai کے زیر اقتدار تھا ۔ تبعاً قنقرطائی کے زوال پر اس پر بھی عتاب ہوا اور ۶۸۲ھ / ۱۲۸۳ء میں ایلخان احمد کے حکم سے ارزنجان میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔

(وِو لائیڈن، بار اوّل)

کَیسان : ابوعَمْرة بنو عُرَینہ کا مولٰی جن کا تعلق بَجیلہ (رکّ بآں) سے تھا ۔ وہ المختار کے زمانے میں کوفے کے موالی [رکّ بہ مادّہ مولٰی] کے رہنماؤں اور اس کے مقربین میں سے تھا ۔ المختار نے اسے محکمۂ پولیس (حرس، شُرطة) کا حاکم اعلٰی مقرر کر دیا تھا ۔ اس منصب کے بل پر اس نے [حضرت امام] حسین رض کا انتقام لینے میں باین صورت حصہ لیا کہ جن لوگوں نے حضرت امام رض کے خلاف تلوار اٹھائی تھی، انھیں جہاں ممکن ہوا قتل کیا اور ان کے مکانات تباہ کیے ۔ المختار کے حکم سے اس نے عُمر بن سعد بن ابی وقاص کا سر تن سے جدا کیا جو اس فوج کا سپہ سالار تھا جو [امام] حسین رض کے خلاف بھیجی گئی تھی ۔ جنگ مذار (۶۷ھ / ۶۸۶ء) میں کیسان کے ہاتھ میں موالی کی قیادت تھی ۔ غالباً وہ اسی گھمسان کی لڑائی میں مارا گیا ۔ بقول الکَشّی کیسان کے طرز عمل کی بدولت اہالی کوفہ میں ایک مثل بن گئی تھی : وہ اس شخص کی نسبت جو اپنے مال سے محروم ہو چکا ہو، کہا کرتے تھے کہ اس کے گھر میں ابو عَمرة داخل ہو گیا ہے؛ دیکھیے الدِّینَوری، ص ۲۹۷، س ۵؛ یعنی ابو عمرة سے اس کی ملاقات ہو گئی ہے ۔ الکشی کے ہاں ایک شعر ملتا ہے جس میں اس کی ہجو کی گئی ہے ۔ چونکہ محمّد بن الحنفیہ فرقۂ کیسانیہ کے امام تھے، اس لیے بعض اوقات کیسان کو ان کا مولٰی یا شاگرد بھی بتایا جاتا ہے ۔

(C. Van Arendonk)

* کَیْسانِیّه : کیسان کے لفظ کا استعمال سب سے پہلے اس شیعہ گروہ، المَوالی کے لیے ہوا جن کا سرگروہ کیسان ابو عمرہ تھا (دیکھیے وو لائیڈن بذیل مادّۂ کیسان) اور جس کی حمایت المختار نے کی، لیکن بعد میں اس کا مصداق وسیع تر ہو گیا ۔ اور اس میں وہ لوگ بھی شامل کر لیے گئے جنھوں نے ان خیالات کو مانا جو مختار کے زیر قیادت شیعہ گروہ میں پھیل چکے تھے اور جن کا اثر بعد میں بھی بہت دن تک رہا ۔ جب کچھ مدت گزرنے پر گمنام شخص کَیسان عملاً بھلا دیا گیا تو کیسان کی توجیہ یہ کی جانے لگی کہ یہ مختار کا لقب تھا اور قدیم تر طبقۂ کیسانیہ کا دوسرا نام اس وجہ سے مختاریہ ہو گیا ۔ اس کے ساتھ ہی کیسانیہ کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ کیسان کی طرف جو حضرت علیؓ کا مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھا، منسوب ہے ۔ یہ غلام جنگ صفین (الطبری : ۱ : ۳۲۹۳ س ۱۰) میں قتل ہوا ۔ کہا گیا ہے کہ مختار نے اپنے عقائد اسی سے اخذ کیے تھے ۔ کیسانیہ کو خشبیہ [رکّ باں] بھی کہتے ہیں کیوں کہ یہ ایک خاص قسم کی لکڑی (خشب) کا ڈنڈا ہتیار کے طور پر اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔

مختار کے ہم عصر کیسانی لوگ اسے ایک خاص قسم کا دانائے راز سمجھتے تھے اور اسے ایک حد تک پیغمبر مانتے تھے ۔ ان کے ہاں عبادت کی ایک خاص صورت بھی ضرور رائج ہوئی جس کو یمنی قبائل نے اختیار کیا تھا اور جسے سبائی کہا گیا ہے، یعنی حضرت علیؓ کی طرف منسوب ایک کرسی کی ، جس کو یہودیوں کے تابوت العہد کے مشابہ ٹھیرایا گیا تھا، پوجا کرنا اور اس سے مشیر غیبی کا کام لیتا ۔ ان کے ہاں حضرتِ امام حسینؓ کے جانشین محمد بن الحنفیہ [رکّ باں] تھے جنھیں مختار نے محض ایک رسمی امام بنا رکھا تھا ۔ الشہرستانی نے بیان کیا ہے، کہ کیسانی محمد بن الحنفیہ کو تمام علوم کا مالک مانتے تھے اور کہتے تھے کہ انھوں نے دو سیدوں (یعنی الحسنؓ اور الحسینؓ) سے تمام باطنی، تاویلی اور مخفی علم نیز کرہ ہائے افلاک اور ارواح کا علم حاصل کر لیا تھا ۔ کچھ زمانے کے بعد ایسے کیسانی پیدا ہوے جنھوں نے ابن الحنفیہ کو اپنے باپ (حضرت علیؓ) کا بلاواسطہ جانشین امام قرار دیا اور اس طرح الحسن اور الحسین کو درمیان سے بالکل خارج کر دیا ۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے ایک روایت پیش کی کہ جنگ جمل میں حضرت علیؓ نے جھنڈا محمد بن الحنفیہ کے سپرد کیا تھا ۔ غالباً یہ عقیدہ امامیوں اور زیدیوں کے عقیدے کے مقابلے میں پیدا ہوا ۔

ابن الحنفیہ کی وفات پر جو غالباً ۸۱ھ/۷۰۰ء میں ہوئی، کیسانیوں میں پھوٹ پڑ گئی ۔ ایک گروہ نے ابن الحنفیہ کے بیٹے علی کو امامت کا منصب دیا اور ایک نے اس کے بیٹے ابوہاشم [رکّ باں] کو امام مانا کیونکہ وہ اس کو اپنے باپ کے مخفی علم کا وارث سمجھتے تھے ۔ ان کا لقب ہاشمیہ ہوا، لیکن ابوہاشم کی وفات (۹۸ھ/۷۱۶-۷۱۷ء یا ۹۹ھ/۷۱۷-۷۱۸ء) کے بعد جانشینی کے مسئلے پر ان کی کئی شاخیں ہو گئیں ۔ اس وقت عباسیوں نے اس خیال کی اشاعت شروع کی کہ ابو ہاشم نے اپنی وفات سے پہلے امامت کے جملہ حقوق محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس [رکّ باں] کی طرف منتقل کر دیے تھے ۔

کیسانیہ کا ایک گروہ محمد بن الحنفیہ کی موت کا قائل نہیں ۔ ان کے خیال میں وہ رضوی [رکّ باں] پہاڑ کے خفیہ غار میں پوشیدہ ہیں، جہاں سے وہ ایک دن مہدی [رکّ باں] کے نام سے اپنے پیرؤوں کے قائد بن کر نکلیں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے ۔ کیسانی شاعر الکُثَیِّر [رکّ باں] اور السیّد الحِمیری [رکّ باں]

نے ان کے پوشیدہ مقام پر فروکش ہونے کو حضرت عیسیؑ کے قیام کے حالات سے ملایا ہے ۔ غَیبۃ [رکّ بآن] اور رجعۃ [رکّ بہ رجوع] کے عقیدے کو ایک شخص ابو کَرِب (کُرَیب) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس کے متّبعین کو اس کے نام پر کَرِبیہ (کُرَیبیّہ) [رکّ بآن] کہتے ہیں ۔

الشہرستانی کا بیان ہے کہ تمام کیسانی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دین صرف ایک آدمی کی اطاعت کا نام ہے ۔ بذریعۂ تاویل [رکّ بآن] افتا اور استنباط مسائل کا حق ان لوگوں کی طرف جو لائق رہنما ہیں، منتقل کر دیا جاتا ہے ۔ اس عقیدے نے بھی کیسانیوں ہی میں جنم لیا کہ نئے حالات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے قضاے الٰہی بدل سکتی ہے [رکّ بہ بداء] ۔ مخفی امام کی رجعت کے عقیدے کے علاوہ ان میں سے بعض لوگ تناسخ [رکّ بآن] کے قائل تھے ۔

امامیہ [رکّ بآن] اور زیدیہ [رکّ بآن] کے ہوتے ہوے فرقۂ کیسانیہ کو کوئی دیر پا زندگی نصیب نہ ہوئی ۔ ابن حزم نے اپنے زمانے ہی میں کیسانیہ کو ایک مردہ فرقہ قرار دیا ۔ عقیدۂ غیبت اور رجعت کا عَلویّہ کی طرف جن کی حمایت زیدیہ نے کی تھی، منسوب کیا جانا غالبًا کیسانیہ ہی کے اثر کا نتیجہ سمجھنا چاہیے ۔ ایک قابل توجہ وثیقہ بھی، جس میں قرامطی عقائد پائے جاتے ہیں (دیکھیے لا، لائیڈن بذیل مادّۂ قرامطہ)، ممکن ہے، کیسانی ہی حلقوں سے نکلا ہو ۔ اس میں ایک شخص احمد بن محمد بن الحنفیہ نامی مہدی اور پیغمبر ہونے کا مدعی نظر آتا ہے (الطبری : ۳ : ۲۱۲۸ ببعد؛ ابن الاثیر : الکامل، ۷ : ۳۱۱ س، ۱۶ ببعد؛ *Expose de la religion des Druzes* : de Sacy پیرس، ۱۸۳۸ء، ۱ (دیباچہ) : ۱۷۷ ببعد)، لیکن محمد بن الحنفیہ کے بیٹوں میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کا نام احمد ہو (دیکھیے ابن سعد : الطبقات، ٥ : ٦٧؛ احمد بن علی الداوٗدی الحسنی : عمدۃ الطالب فی انساب ابی طالب، بمبئی ۱۳۱۸ھ، ص ۳۱۹ ببعد) ۔

مآخذ : (اس مقالے کے لیے بھی جو اس سے پہلے ہے دیکھیے) : (۱) الطبری، طبع ڈخویہ، ۲ : ٥۹۸ ببعد، بالخصوص ٦۳۴ س ۸ ببعد، ٦۳٦ س ۱۱ ببعد، ٦٦۲ س ۸ ببعد، ٦۷۱ س ۱، ٦۷۳ س ۱۰ ببعد، ۷۰۲ ببعد، ۷۲۱ س ۸ ببعد؛ (۲) الدینوری : الاخبار الطوال، لائیڈن ۱۸۸۸ء، ص ۲۹۸، ۳۰۰، ۳۰٥ اور ۳۰۸؛ (۳) المسعودی : مروج الذہب (پیرس ۱۸٦۱ تا ۱۸۷۷ء)، ٥ : ۱۸۰ ببعد، ۲۲٦، ۲۲۷، ۲٦۸، ۴۷٥ و ٦ : ٥۸ و ۷ : ۱۱۷؛ (۴) ابن قتیبہ : کتاب المعارف، طبع وستنفلٹ، ص ۳۰۰؛ (٥) ابن عبد ربہ : العقد الفرید، قاہرہ ۱۲۹۳ھ، ۱ : ۲٦۷ ببعد، ۲٦۹ س ٦ ببعد؛ (٦) الکشّی : کتاب الرجال، بمبئی ۱۳۱۷ھ، ص ۸٥؛ (۷) الاغانی، ۷ : ۳، س ۱۹، و ۴ میں ۱٥ ببعد، ٥، س ۱۷، ۲۲ و ۹، س ۲٦ ببعد؛ ۸ : ۳۲، س ۸ ببعد، ۳۳؛ (۸) الخوارزمی : مفاتیح العلوم، لائیڈن ۱۸۹۰ء، ص ۲۹ ببعد؛ (۹) عبدالقادر البغدادی : الفَرق بین الفِرق، قاہرہ ۱۳۲۸ھ، ص ۱۹، ببعد، ۲۷ تا ۳۸، ٥۳ س ۱۴ ببعد؛ (۱۰) ابن حزم : الفصل فی الملل والاہواء والنحل، قاہرہ ۱۳۱۷ تا ۱۳۲۱ھ، ۴ : ۹۴، س ۲ ببعد، ۱۷۹ س ۲۰ ببعد، ۱۸۰ س ۷ ببعد، ۱۸۲، س ۷، ۱۷ ببعد، ۱۸۴ س ۱۰ تا ۱۲؛ (۱۱) ابوالمعالی : بیان الادیان، در *Chrest. Persane* : Schefer، ج ۱ (*Publ. de l'École des Langues or. viv.*، سلسلہ ۲، ۷)، ص ۱٥۷ ببعد؛ (۱۲) الشہرستانی : الملل والنحل، طبع Cureton، ص ۱۰۹ ببعد؛ (۱۳) المقریزی : الخِطَط، بولاق ۱۲۷۰ھ، ۲، ۳٥۱ ببعد؛ (۱۴) ابن خلّکان : وفیات الاعیان، طبع وستنفلٹ، عدد ٥۷۰ (ص ۹۱)؛ (۱٥) ابن خلدون : المقدمہ، قاہرہ ۱۳۲۷ھ، ص ۲۱۹ ببعد؛ (۱٦) الجوہری : الصحاح، بولاق ۱۲۸۲ھ، ۱ : ۴۷۴، س ۲۱ ببعد؛ (۱۷)

لسان العرب، ے : ۸۶، س ۱۶ بعد؛ (۱۸) تاج العروس، ۳ : ۲۳۸، س ۱۳؛ (۱۹) Barbier de meynard : *Le Seld Himyarite*، در *Jonrn. As.*، سلسلہ ہاے ہفتم، ۳ (۱۸۷۴ء) : ۱۶۲ بعد، ۲۳۰ بعد؛ (۲۰) H. D. Van Gelder : *Moḥtar de valsche Prfoeet*، (لائیڈن ۱۸۸۸ء)، ص ۸۲ بعد؛ (۲۱) G. van Vloten : *Recherches sur la Domination arabe, le Chiitisme* وغیرہ (*Verhand. der Kon, Akad. v. Wetensch., Afd. Letterkunde.*، ایمسٹرڈم ۱۸۹۴ء، ج ۱، عدد ۳)، ص ۱۴ بعد؛ (۲۲) J. Wellhausen : *Die religiös-politischen Oppositionsparteien im alten Islam (Abhandl. d. Kön. Gesellsch. d. Wissensch. zu Göttingen*, Phil. Hist. Kl. n. F., *v. No. 2*)، ص ۴۷ بعد؛ (۲۳) E. Blochet : *Le Messianisme dans l'hétérodoxie musulmane*، (پیرس ۱۹۰۳ء)، ص ۳۲ بعد؛ (۲۴) Isr. Friedlaender : *The Heterodoxies of the Shiites according to Ibn Ḥazm* (*Journ. of the American Orient. Soc.*، ج ۲۸ و ۲۹ بمدد اشاریہ، بذیل محمد بن الحنفیہ؛ (۲۵) H. Banning : Keisan (*Muḥammad ibn al-Ḥanafīja*)، Diss Erlangen ۱۹۰۹ء، ص ۴۶ تا ۵۳؛ (۲۶) F. Buhl : *Alidernes Stilling til de Shi'itiske Bevaegelser under Umajjaderne (oversight over det Kgl., Danske vidnskabernes Selskabs Forhandlinger*، ۱۹۱۰ء، عدد ۵)، ص ۳۶۳ بعد؛ (۲۷) C. Van Arendonk : *De opkomst van het Zaidietische Imamaat in Yemen*، لائیڈن ۱۹۱۹ء، ص ۱۱ تا ۱۳ ۔

(C. VAN ARENDOHK)

کَیْقُباد : ایران کا ایک اساطیری بادشاہ جو خاندان ''کیان'' سے تھا ۔ اَوستا میں اس کا نام کَوِی کَوَاتہ (Kavi Kavāta) دیا گیا ہے، لیکن اس کے سوا اس سے متعلق اور کسی چیز کا ذکر نہیں ہے ۔ روایات میں سے اس کی بابت بس یہی واقعہ محفوظ ہے کہ وہ یزتس (Yazatas) کا بہت شکر گزار تھا کہ اس نے اس کی مملکت کو عظیم الشان بنایا اور ایران کے تخت حکومت پر دوبارہ اس کے صحیح النسب بادشاہوں کو لا بٹھایا ۔ اس سلسلے میں فقط شاہنامۂ فردوسی ھی ایک ایسا مأخذ ہے جس سے مدد لی جا سکتی ہے ۔ سر زمین ایران کو افراسیاب تورانی کے حملوں سے بچانے کے لیے رستم کے باپ زال پہلوان نے کامل غور و فکر اور موبذ کے صلاح مشورے کے بعد کیقباد کے حق میں فیصلہ کیا جو ان دنوں البرح البرز (Hare-berezaiti) کے پہاڑوں میں رہا کرتا تھا؛ چنانچہ زال نے اپنے بیٹے کو اس کی تلاش میں البرز بھیجا ۔ جب وہ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ کیقباد اپنے ھنس مکھ دوستوں کے درمیان ایک ضیافت میں بیٹھا ہوا ہے ۔ وہ تعظیم بجا لایا ۔ نئے بادشاہ نے پہلے ھی خواب میں دیکھ لیا تھا کہ دو سفید بازوں نے اس کے سر پر ایک زریں دستار رکھ دی ہے ۔ اس طرح گویا وہ سنارت کی کی آمد سے مطلع ھو چکا تھا ۔ اگرچہ اس نے انسانوں سے دور الگ تھلگ رہنے میں بڑی کوشش کی تھی، لیکن قسمت نے قاصد کو پھر بھی اس کے راستے پر ڈال دیا ۔ ایرانی فوج کا سپہ سالار مقرر ھو جانے کے بعد رستم نے افسراسیاب کو کامل شکست دی ۔ افراسیاب یقیناً گرفتار ھو جاتا، لیکن اس کی کمر کی پیٹی جسے پکڑ کر اسے اٹھائے لا رہے تھے اتفاقاً ٹوٹ گئی اور وہ بھاگ نکلا ۔ اس فتح کا یہ نتیجہ نکلا کہ دونوں ملکوں میں صلح ھو گئی اور اس کی رو سے ایران کو پھر اپنی پرانی سرحد دریاے جیحوں تک کی ساری سر زمین مل گئی ۔ کیقباد نے اپنا عہد حکومت سلطنت کی تنظیم، اس کے طول و عرض کا دورہ کرنے، نئے شہر بسانے اور ان بہادروں پر اعزاز و اکرام نچھاور کرنے میں بسر کیا جنھوں نے

سلطنت کو دوبارہ قائم کیا تھا ۔ یہ بہادر رستم ۔ قارن وغیرہ تھے ۔ سو سال تک حکومت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

مُجمل التواریخ (*Journ. Asiat.*)، سلسلهٔ سوم، جلد ۱۱ (۱۸۴۱ء، ص ۳۲۱) میں لکھا ہے کہ کیقباد البرز سے نہیں بلکہ ھمذان کے پہاڑ الوند سے آیا تھا اور حمزہ اصفہانی (طبع Gottwaldt، ص ۳۰) نے فقط اس کے شہروں کے بسانے کا ذکر کیا ہے بالخصوص جیحوں کے کنارے آبادیاں بسانے کا اور اصفہان کی توسیع کا ۔ بندھش Bundihish میں اس کے عہد حکومت کی معیاد سو سال کے بجاے پندرہ سال لکھی ہے ۔

مآخذ : (۱) فردوسی : شاھنامه، طبع Vullers، جلد ۱، ص ۲۹۰ تا ۳۱۰، طبع و ترجمهٔ Mohl، جلد ۱، ص ۴۵۲ تا ۴۸۴؛ (۲) الثعالبی : غرر اَخْبار ملوک الفرس، طبع و ترجمهٔ Zotenberg، ص ۱۳۷ تا ۱۴۰، ۱۴۴ تا ۱۵۴؛ (۳) الطبری، طبع لائیڈن، ۱ : ۵۳۳ ببعد؛ (۴) Fr. Spiegel : *Erânische Alterthumskunde*، ۱ : ۵۸۱ ببعد؛ (۵) وهی مصنّف : *Avestâ und Shâhnâme*، در *Zeitschr. d. Deutsch. Morgenl. Gesellsch.*، جلد ۴۵ (۱۸۹۱ء)، ص ۱۹۰؛ (۶) Dubeux : *La Perse* (پیرس ۱۸۴۱ء)، ص ۲۳۳؛ (۷) *Gundr. d. iran. Philol*، ۲ : ۹۵، ۱۳۴، ۱۶۹، ۱۷۴، ۳۳۶، ۴۱۰؛ (۸) Nöldeke : *Das iran Nationalepos*، بار دوم، (برلن ۔ لائپزگ ۱۹۲۰ء)، ص ۵، ۵۰، ۵۵.

(Cl. Huart)

کَیْقُبَاد : ایشیاے کوچک کے تین سلجوقی فرمانرواؤں کا نام :

کیقباد اول : علاءالدنیا والدین ابوالفتح کیقباد بن کیخسرو ۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے (بذیل مادۂ کیکاؤس اول) کہ کیقباد کو اس کے بھائی کے عہد حکومت میں کس نے اور کیوں قید کر لیا تھا ۔ ۶۱۶ھ / ۱۲۱۹ء میں اس کے بھائی کی وفات پر نہ صرف قلعه گذر پرت Gudharpert کے دروازے کھلے جہاں وہ قید تھا، بلکه اسے سلجوقوں کے تخت پر بھی بٹھا دیا گیا تھا ۔ معلوم ھوتا ہے کہ سارے ترک امیر اس فیصلے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ انھوں نے اس کے ایک اور بھائی کَیفرِیدُون کی طرفداری کا اعلان کر دیا، لیکن کیقباد صدر مقام قونیه پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا اور تھوڑے ھی عرصے میں شورش پسند امرا کو بےدست و پا کر دیا ۔ غالباً عیسائیوں کی امدادی فوج نے اسے قابل قدر امداد دی کیونکہ ابن بیبی لکھتا ہے کہ امیر کمنینس (Comnenus) نے ان واقعات میں بڑا حصہ لیا تھا ۔ Vincent de Beauvais کے ایک بیان سے (کتاب ۳۰، باب ۱۴۴) جس میں اگرچه کیقباد کا نہیں اس کے جانشین کے عہد حکومت کا ذکر ہے، یہ پتا چلتا ہے کہ طرابزون Trebizond اور نیقیه Nicaea کے شہنشاھوں اور شاہ Lampron نے ایک عہد نامے کی رو سے حلف اٹھا رکھا تھا کہ وہ اپنی کچھ فوج سلجوقیوں کی امداد کے لیے وقف کر دیں گے ۔ یہ یقینی ہے کہ کیخسرو اول اور کیکاؤس اول دونوں کے عہد حکومت میں اس عہد نامے کی شرائط پر عمل ہوتا رہا ہے اور اس کی تجدید میں شاید ایک ھی ترمیم ہوئی اور وہ بھی کیکاؤس اول کے عہد سے پہلے نہیں کہ اس میں مذکورۂ بالا عیسائی علاقوں کے آرمینی عیسائی بھی شامل ہو گئے ۔ کیقباد کے عہد میں اس کی تجدید ہوئی ۔ کیقباد کے ابتداے عہد ھی میں ارمینیه کے بادشاہ لیون Leon دوم کا انتقال ہو گیا (۱۲۱۹ء) اور اس کی بیٹی ایزابیلا (Isabella) نے انطاکیه کے کیتھولک بادشاہ کے بیٹے سے شادی کر لی ۔ اس وجه سے ارمنوں کے درمیان بڑا اختلاف راے پیدا ہو گیا ۔ اس کا نتیجه

یہ نکلا کہ مخالف سرداروں نے قسطنطین شاہ لیمپرن (Lampron) کی زیر قیادت جمع ہو کر شہزادے کو گرفتار کر لیا اور اسے زہر دے دیا اور اس کی بیوہ کو قسطنطین کے بیٹے ہیثم (Haithum) سے بیاہ دیا ۔ اب انطاکیہ کے بادشاہ سے لڑائی ناگزیر ہوگئی ۔ سینٹ جان کے فدائیوں اور جانبازوں کو روم سے احکام پہنچ گئے کہ وہ اس میں قطعاً حصہ نہ لیں ۔ اس لیے Bohemund ارمنوں کے خلاف کوئی زیادہ کاروائی نہ کر سکا اور بقول ابن الأثیر اس کی نوبت آ گئی کہ اسے کیقباد کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑا ۔ بہر حال عیسائیوں کے باہمی نزاع سے فائدہ اٹھاتے ہوے کیقباد نے بحیرۂ روم کے کنارے اور دوسرے علاقوں میں ارمینیہ کے قلعے فتح کر لیے جن میں Galonoros یا Candelor یا Scandalor کے قلعے شامل تھے ۔ مؤخرالذکر قلعے کو اس نے اپنا سرمائی مقام قرار دیا اور وہاں عمارتیں تعمیر کر کے اسے ایک خاصی اہم بندرگاہ بنا دیا ۔ اور اسی کے نام پر اس جگہ کا نام الایہ (عَلَائِیَّة) پڑ گیا ۔ ان حالات کے اندر شاہ لیمپرن (Lampron) کے لیے بجاے خود اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ کیقباد کو فرمانرواے اعلٰی تسلیم کر لے اور جنگ کی صورت میں اپنی فوجوں سے اس کی مدد کرے ۔

آمد اور حصن کَیْفَة کے ارتقی فرمانروا مسعود نے جسے ۶۱۹ھ/۱۲۲۲ء میں اپنے باپ کے انتقام پر ان شہروں کی حکومت حاصل ہوئی تھی ، خطبے سے کیقباد کا نام خارج کرنے اور اپنے ہمسایہ ایوبی بادشاہوں کے ساتھ عہد و پیمان کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی حرکت کی بدولت کاختہ (Kiakhta) اور چمشکزک (Cemishkezek) کے قلعوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ۔ الاشرف (دیکھیے جلد ۱، ص ۲۲۲ ب) نے اس کی مدد کے لیے جو فوجی دستے روانہ کیے انھیں محاصرہ کرنے والی فوج نے منتشر کر دیا لیکن کیقباد نے فوراً ہی ان کے سپہ سالار کو جو گرفتار کر لیا گیا تھا اعزاز و اکرام کے ساتھ سرفراز کر کے رہا کر دیا کیونکہ اس کی کامیابی بڑی حد تک ایوبیوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے پر منحصر تھی ۔ فی الواقع اس نے یہاں تک کیا کہ ایک ایوبی شہزادی سے شادی کی درخواست کر دی اور اس کی درخواست قبول بھی کر لی گئی اور کچھ مدت بعد شادی ہوگئی ۔ ۶۲۲ھ / ۱۲۲۵ء میں ارزنجان کے بادشاہ بہرام شاہ نے ساٹھ سال حکومت کرنے کے بعد وفات پائی اور ارز روم کے سلجوقی بادشاہ طغرل شاہ کی وفات بھی اسی زمانے میں ہو گئی ۔ کیقباد نے سوچا یہ اچھا موقع ہے کہ ان دونوں فرماں رواؤں کی زمینوں پر جہاں ممکن ہو قبضہ کر لیا جائے ۔ بہرام شاہ کے جانشین داؤد شاہ نے جلال الدین خوارزم شاہ ، حشیشین کے مقتداے اعظم علاءالدین اور الاشرف سے عہد موافقت کر کے اس خطرے کو ٹالنے کی حتی القدور کوشش کی ۔ لیکن وہ ناکام رہا ۔ کیقباد نے اسے دبا کر اپنی مملکت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا ۔ اور ایسی ہی کامیابی اسے خاندان منگوچک کے ایک رکن مظفر الدین محمد کے مقابلے میں نصیب ہوئی جو کاغانیہ (Coghonie) (شبین قرہ حصار) پر حکومت کرتا تھا ۔ لیکن اس سے قبل کہ کیقباد ارز روم پر قبضہ کرے اسے جلال الدین کے ساتھ جو شاہ ارز روم کا حلیف تھا ایک پر صعوبت جنگ کرنی پڑتی تھی ۔ اس سلسلے میں پہلے تو ان دونوں بادشاہوں کے درمیان کئی بار سفیر آئے گئے لیکن بالآخر کیقباد نے الاشرف سے اتحاد کر لیا جو اس وقت شہر خلاط (Khilat) پر قبضہ کرنے کے لیے جلال الدین سے لڑ رہا تھا ۔ خوارزم شاہ (جلال الدین) اس کی اطلاع پاتے ہی بڑی تیزی سے آگے بڑھا تاکہ اس کے دونوں حریفوں کے لشکر باہم ملنے نہ پائیں ۔ لیکن ۲۸

رمضان ۶۲۷ھ / ۱۰ اگست ۱۲۳۰ء (دیکھیے *Actes du 10e Congrès internat. des Orientalistes*، ۳ : ۱۹) کو اسے ایک دهشت خیز شکست هوئی اور اس سے اسی وقت ارزروم [رَكَ بآں] کے بادشاہ کی قسمت کا بھی فیصلہ هوگیا ۔ اس کا علاقہ کیقباد نے اپنی مملکت میں شامل کر لیا ۔ ۶۲۹ھ/۱۲۳۲ء میں گرجستانیوں سے جنگ ایک صلحنامے کے ذریعے بسرعت ختم کر دی اور اسی کی رُو سے ملکہ رُسدان Russudan نے اپنی بیٹی کی کیقباد کے بیٹے کیخسرو سے شادی کر دینے پر رضا مندی کا اظہار بھی کر دیا ۔ اس دوران میں تاتاری ایک بار پھر ان علاقوں میں آ چکے تھے ۔ جلال الدین ختم هو چکا تھا اور خوارزمیوں کے بڑے بڑے گروہ ادھر ادھر تاخت و تاراج کر کے اپنے هاتھ رنگتے پھرتے تھے ۔ اس وقت کیقباد نے خِلاط کے ضلع پر، جو جلال الدین کی شکست کے بعد الاشرف کو مل چکا تھا، لیکن اس نے اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا، قبضہ کرنے اور خوارزمی لٹیروں کے جتھوں کو تنخواہ دار سپاهیوں کی حیثیت سے ملازم رکھنے کا فیصلہ کر لیا ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر کے فرمانروا الکامل کے زیر قیادت تمام ایوبی شاہزادے کیقباد کے خلاف متحد هو گئے ۔ بہت جلد ان کی فوجیں ایشیاے کوچک کی سرحد پر جا پہنچیں، لیکن وہ ملک کے اندر داخل هونے کے لیے دَرّوں کو فتح کرنے میں ناکام رهیں ۔ علاوہ بریں تھوڑی هی مدت میں ایوبی سرداروں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا ۔ بالآخر انھیں اسی بات پر قناعت کرنی پڑی کہ ترکوں کی پیش قدمی سے شہر خرتبرت Khartbart کو بچائیں، لیکن ترکوں کو بڑھنے سے روکنا ان کے بس کا روگ نہ تھا ۔ حما کا ایوبی فرمانروا المظفر جس پر مدافعت کا انتظام آ پڑا تھا، پکڑا گیا ۔ اور اس کے ساتھ هی وهاں ارتقی حکومت کا بھی خاتمہ هو گیا ۔ اس کے بعد ۶۳۱ھ/۱۲۳۴ء سے یہ شہر سلجوقیوں کے قبضے میں آ گیا ۔ اب کیقباد نے حرّان، الرُّہا اور رَقّہ کا محاصرہ کرکے انھیں فتح کر لیا (۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء)، لیکن وہ پھر تھوڑے هی دنوں میں ایوبیوں کے قبضے میں چلے گئے ۔ اسی طرح آمِد کا محاصرہ بھی ناکام رها ۔ ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء میں جب کیقباد ایک نئی مہم شروع کرنے والا تھا اسے قیسریہ میں زهر دے دیا گیا ۔ کہا گیا هے کہ یہ اس کے بیٹے کیخسرو کے حکم سے هوا کیونکہ کیقباد نے اس کے بجاے اپنے ایک اور بیٹے کو جو ایوبی شہزادی کے بطن سے تھا اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا ۔

کیقباد کے پر شوکت عہد حکومت میں مملکت سلجوق نے انتہائی وسعت اور خوشحالی حاصل کی کیونکہ کیقباد محض ان تھک حوصلے والا مرد میدان هی نہیں تھا بلکہ اس نے عالیشان عمارتوں کی تعمیر کا کام بھی هاتھ میں لیا جن کے آثار آج بھی قونیہ، سیواس، علائیہ اور دوسرے مقامات میں سلطان کی یاد تازہ کرتے هیں ۔ اس نے تجارت کے لیے اپنے ملک کے دروازے کھولنے اور وهاں کے قدرتی وسائل کو ترقی دینے میں انہماک سے کام کیا ۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ اطالویوں کی درخواست پر ایک مہم لے کر کریمیا بھی گیا ۔ یہی وجہ هے کہ اس زمانے میں اس کی سلطنت دنیا کی امیر ترین سلطنت سمجھی جاتی تھی ۔

مآخذ : (۱) اوپر دیکھیے مادّۂ کیکاؤس کے نیچے؛ (۲) نیز دیکھیے ۔ جلال الدین سے جنگ کے بارے میں النسوی: سیرۃ السلطان جلال الدین منکبرتی (طبع *de l'Ecole des Langues Or. Viv*، سلسلۂ سوم، جلد ۹، ۱۰) عربی متن و فرانسیسی ترجمہ از Hondas؛ (۳) بنو منگو چک کے بارے میں: V. Berehem : *Matériaux pour un Corpus Inscript. Arab.*، ۳ : ۵۵ ببعد؛ (۴) Houtsma در *Keleti Szemle*، ۱۹۰۳ء، ص ۷۷ ببعد ۔

(وو لائیڈن، بار اول)

کیقباد دوم : علاءالدین بن کیخسرو، جیسا کہ مادّۂ کیکاؤس دوم کے ذیل میں مختصرًا بیان کیا جا چکا ہے، اس نے اپنے دو بھائی کیکاؤس اور قلیج ارسلان کے ساتھ مل کر حکومت کی ۔ یہاں ہمیں فقط ایک سکّے کی طرف توجہ دلانی ہے جس کو غالب ادھم نے تقویم مسکوکات سلجوقیہ، شمارہ ۱۱۳، میں بیان کیا ہے اس پر سال ۶۶۳ھ اور فقط کیقباد کا نام درج ہے حالانکہ کیقباد اس سے آٹھ سال قبل وفات پا چکا تھا ۔

کیقباد سوم : علاءالدین کیقباد بن فرامرز بن کیکاؤس کو غازان خان نے ۶۹۷ھ/۱۲۹۸ء میں تخت نشین کیا ۔ اس کی تاریخ کے بارے میں جو معلوم ہے وہ وثوق کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر ہے ۔ اس کا نام ۷۰۱ھ تک کے ایک سکّے پر موجود ہے جس سے منجّم باشی کا یہ بیان غلط معلوم ہوتا ہے کہ ۷۰۰ھ میں اسے دوبارہ معزول کر دیا گیا تھا، دیکھیے V. Berchem : *Materiaux*، ۳ : ۹۲ حاشیہ، لیکن چونکہ مسعود کا ایک سکّہ بھی ۷۰۰ھ کا ہے اس لیے قرین قیاس ہے کہ اس سال ان دونوں شہزادوں نے سلطان کا لقب اختیار کر رکھا تھا، لیکن دوسری طرف یہ بات یقینًا غلط ہے کہ کیقباد ۶۸۳ھ میں بھی سلطان تھا ۔ یہ بات اس سند سے مأخوذ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کیقباد نے عثمان غازی کو عطا کی تھی (فریدون بیگ : منشآت، ۱ : ۴۸ تا ۵۵) ۔ اسی طرح وہ اندازہ بھی غلط ہے جو جنابی میں درج ہے اور جس کی رو سے کیقباد کا عہد حکومت ۲۰ سال ۳ ماہ ۱۳ دن بتایا جاتا ہے ۔

(وو لائیڈن، بار اوّل)

کیقباد معزّالدین، شاہ دہلی، ناصر الدّین بغرا حاکم بنگالہ کا بیٹا تھا ۔ بغرا غیاث الدّین بلبن شہنشاہ دہلی کا دوسرا بیٹا تھا ۔ اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمّد خان کی وفات پر جو مغولوں کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، بلبن نے اپنے دوسرے بیٹے بغرا خان کو جو ان دنوں بنگالے کا صوبیدار تھا اپنا جانشین نامزد کیا، لیکن وہ اپنے باپ کے دربار کی پابندیاں برداشت نہ کر سکا؛ چنانچہ جب ۱۲۸۷ء میں تخت خالی ہوا تو وہ بنگال گیا ہوا تھا ۔ امرا نے اس کے بیٹے کیقباد کو بادشاہ بنا دیا ۔ کیقباد تخت نشینی کے وقت بمشکل اٹھارہ سال کا تھا ۔ اس کی تعلیم و تربیت میں اس کے دادا نے بڑی سختی سے کام لیا تھا: چنانچہ پابندیوں سے اچانک آزاد ہوتے ہی اس نے بے لگام ہو کر عیاشانہ زندگی اختیار کی ۔ اس نے اپنے چچا زاد بھائی محمّد کے بیٹے کیخسرو کو قتل کرا دیا ۔ وزیر خطیر الدین کا منصب چھین لیا ۔ اس کی برطرفی کے بعد دہلی کے کوتوال کا بھتیجا اور داماد نظام الدین مملکت کا سب سے بڑا صاحب اقتدار بن گیا ۔ کیقباد کے ابتدائے عہد میں مغولوں کے ایک جتھے کو جو ہندوستان میں گھس آیا تھا شکست دی گئی ۔ ان میں سے جو گرفتار ہوئے ان سے بڑا ظالمانہ سلوک کیا گیا اور کثیر التّعداد مغولوں کو جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور ہندوستان میں بس گئے تھے قتل کر دیا گیا ۔

۱۲۸۸ء میں بادشاہ کا باپ بغرا خان بنگال سے روانہ ہوا تاکہ تخت دہلی پر اپنا فائقانہ حق جتائے، لیکن جب دریائے گھاگرا کے کنارے کیقباد اسے ملنے آیا تو اس نے اپنا طرز عمل بدل دیا ۔ ملاقات جانبین سے شفقت اور محبت بھری تھی اور باپ نے از روے نصیحت ذاتی طور پر اپنے بیٹے کو اس کی غلط روی پر تنبیہ کی اور نظام الدین کی ہوس پرستی سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا، اگرچہ ان نصیحتوں سے نوجوان بادشاہ کی بری عادتوں کی کوئی اصلاح نہیں ہوئی ۔ تاہم ان کا یہ اثر ہوا کہ اس نے اپنے وزیر کو زہر دے کر اپنے راستے سے ہٹا دیا ۔

۱۲۸۸ء کے اواخر میں کیقباد پر اس کی عیاشی کی بدولت فالج گرا اور وہ صاحب فراش ہو گیا ادھرملک میں انتشار، ابتری اوز پراگندگی پھیل گئی ۔ ملک جلال الدین فیروز خلجی نے جو انہیں دنوں برن کا عامل مقرر کیا گیا تھا دارالسلطنت میں امن و امان قائم کرنے کی کوشش کی ۔ ترک امرا نے اسے شک و شبہہ کی نظر سے دیکھا ۔ حالات بھی شبہات کے مساعد تھے اور کیقباد کے کمسن بچے شمس الدین کیومرث کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا ۔ ان دونوں جماعتوں میں نزاع و جدال جاری رہا اور بادشاہ نزار و درماندہ بستر علالت پر پڑا رہا ۔ بالآخر فیروز خلجی کو اپنے مخالفوں پر غلبہ حاصل ہوا اور وہ تخت پر متمکن ہوا ۔ بدبخت کیقباد کو جون ۱۲۹۰ء میں قتل کر دیا گیا اور اس کی لاش دریائے جمنا میں پھینک دی گئی۔

مآخذ : (۱) برنی : تاریخ فیروز شاہی؛ (۲) بدایونی : منتخب التواریخ، ترجمہ G.S.A. Ranking؛ (۳) نظام الدین احمد : طبقات اکبری؛ (۴) فرشتہ : گلشن ابراھیمی (بمبئی ۱۸۳۲ء)؛ (۵) *The Cambridge History of India*، ج ۳ .

(T. W. HAIG)

* **کیکاؤس** : ایران کا ایک افسانوی بادشاہ جو کیانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۔ اوستا میں اسے ”کوا اُچا“ Kava uça کہا گیا ہے ۔ فردوسی اسے کیقباد کا فرزند مانتا ہے، دوسرے مآخذ اسے کیقباد کا پوتا بتاتے ھیں ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک جنگجو بادشاہ تھا جو فوج لے کر مازندران میں گھس گیا ۔ مازندران دیووں کا ملک تھا جس کا محافظ دیو سفید تھا ۔ اس نے رات کے وقت کیکاؤس اور اس کی فوج پر آسمان سے پتھر برسائے [اور کیکاؤس کو قید کر لیا] ۔ بادشاہ کو قید سے چھڑانے کے لیے زال کا بیٹا رستم روانہ ہوا ۔ اسے راستے میں سات معرکے [ھفتخوان] سر کرنا پڑے جنھیں نظم فارسی میں بہت شہرت حاصل ہو چکی ہے (دیکھیے مادۂ رستم) ۔ دیو سفید کا سوتے میں کام تمام کر دیا گیا اور اس کے دل کے خون سے بادشاہ اور اس کی فوج کی بینائی بحال ہو گئی ۔ اس بادشاہ کو ایک اور لڑائی لڑنے کے لیے هاماوران جانا پڑا جو ایران کے جنوب میں واقع ہے اور ممکن ہے کہ وہ یمن (حمیر) ہو کیونکہ یہاں پہنچنے کے لیے بادشاہ مکران سے براہ سمندر جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوا تھا ۔ اپنی منچلی طبیعت کی بدولت وہ کوہ قاف [رك بآں] تک جا پہنچا جس کے متعلق یہ اعتقاد تھا کہ اس پہاڑ نے ساری دنیا کا احاطہ کر رکھا ہے ۔ اس نے شاہ هاماوران کی دختر سودابہ (الثّعالبی سُودانہ، عربی سُعدٰی بنت ذوالاذعار) سے شادی کی ۔ ایک بار جب وہ اپنے خسر سے ملنے گیا ہوا تھا تو اسے غدّاری سے گرفتار کر کے سمندر کے کنارے ایک قلعے میں قید کر دیا گیا ۔ یہاں بھی اسے رہائی دلانے کے لیے رستم ھی پہنچا۔

چونکہ کیکاؤس دیووں پر فرمانروا تھا، اس لیے اس نے ان کی قوت سے یہ فائدہ اٹھایا کہ البرج میں قلعے تعمیر کرائے (الثّعالبی، ص ۱۶۵، مینار بابل؛ نیز حمزۃ الاصفہانی، طبع Gottwaldt، ص ۳۵ مُجمل التّواریخ، *Journ. Asiat.* سلسلۂ سوم، ۱۱ (۱۸۴۱ء) : ۳۲۵) ۔ اس جبری محنت کا انتقام لینے کے لیے ان دیووں میں سے کسی نے بادشاہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ آسمان پر چڑھنا ممکن ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے بادشاہ نے جوان عقاب سدھائے اور چار عقابوں کو اپنے تخت کے چار کونوں پر باندھ کر ستاروں کی جانب پرواز شروع کی، جب عقاب تھکنے لگے تو وہ پھر نیچے اتر آئے اور آمُل [رك بآں] کے قرب و جوار میں ایک جنگل کے بیچوں بیچ بادشاہ کو زمین پر پھینک دیا ۔ یہاں سے امرا نے جو اس کی تلاش میں سرگرداں تھے

اسے ڈھونڈ نکالا - کیکاؤس کے ایک بیٹے سیاوخش (سیاوش، چیاور شانہ) پر اس کی سوتیلی ماں سودابہ نے، جس کی ناجائز خواہشوں کو اس نے ٹھکرا دیا تھا، یہ الزام لگایا کہ اس نے اس کی عصمت پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے - سیاوخش نے آگ کی آزمائش سے گزر کر اپنی بے گناہی ثابت کی اور وہ ایک تنگ جگہ سے لکڑیوں کے دو شعلہ زن انباروں کے درمیان صحیح سالم گزر گیا - اس کے بعد نوجوان شہزادے نے تورانیوں سے لڑنے کی اجازت چاہی اور بلخ [رك بآن] کے قریب ان سے مقابلہ کیا - سیاوخش کی موت کی اطلاع پاکر جو اب افراسیاب [رك بآن] کا داماد بن چکا تھا اور سودابہ کی سازشوں کا شکار ہو چکا تھا، رستم نے ایران پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا - اس دلیر پہلوان نے بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے ملکہ کو موت کے گھاٹ اتارا اور پھر اپنے ملک کا انتقام لینے کے لیے توران پر چڑھ دوڑا۔

کیکاؤس نے ایک سو پچاس سال حکومت کی اور عمر کا آخر سال اس نے عزلت میں گزارا اور اپنا تخت اپنے پوتے سیاوخش کے بیٹے کیخسرو [رك بآن] کے حوالے کر دیا۔

مآخذ: (۱) فردوسی : شاهنامه، طبع Vullers، ۱ : ۳۱۵، ۲ : ۶۳۷؛ طبع و ترجمهٔ Mohl، ۱ : ۳۸۶ ببعد، ۲ : ۱ تا ۵۰۷؛ (۲) الطبری : تاریخ، ۱ : ۵۹۷ ببعد؛ (۳) الثعالبی : غرر و اخبار ملوک الفرس، طبع و ترجمهٔ Zotenberg، ص ۱۵۳ تا ۲۳۳؛ (۴) Fr. Spiegel : *Erânische Alterthumskunde*، ۱ : ۵۸۳ ببعد؛ (۵) وهی مصنف : *Awestâ und Shâhnâme* در *Zeitschr. d. Deutsch. Morg. Gesellsch.*، ۴۵ (۱۸۹۱ء) : ۱۹۰؛ (۶) Dubeux : *La Perse* (پیرس ۱۸۴۱ء)، ص ۲۳۳ ببعد؛ (۷) J. Darmesteter : *Etudes iraniennes* (پیرس ۱۸۸۳ء)، ۲ : ۲۱۱ ببعد؛ (۸) *Gründr. d. iran. Philologie*، ج ۲، اشاریه رك بذیل Kavi؛ (۹) Th. Nöldeke : *Das iranische Nationalepos*، بار دوم (برلن - لائپزگ ۱۹۲۰ء)، ص ۱، ۸، ۴۳، ۵۲، ۵۵، ۶۰۔

(CL. HUART)

کیکاؤس : ایشائے کوچک کے دو سلجوق فرمانرواؤں کا نام :

کیکاؤس اول : السلطان الغالب عز الدنیا و الدین کیکاؤس بن کیخسرو، برهان امیر المؤمنین، نے ۶۰۶ھ تا ۶۱۶ھ / ۱۲۱۰ء تا ۱۲۱۹ء حکومت کی - اس نے Theodore Lascaris سے صلح کر لی (دیکھیے کیخسرو اول)، کیونکہ اسے اپنے چچا طغرل شاہ والی ارزروم اور اپنے بھائی کیقباد کی دستبرد سے جو اس کے مقابلے میں خود تخت کے دعویدار تھے، اپنے حقوق کی حفاظت مقصود تھی - ارمنوں کو جو Lifun (Leon) کے زیر قیادت تھے اور جنھوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے هرقلیه Heraclea اور لارنده Larenda پر قبضہ کر لیا تھا اور قیصریه کو لوٹ لیا تھا، ایک معقول رقم دے کر عارضی طور پر پیچھے ہٹ جانے پر آمادہ کر لیا - کچھ عرصے بعد طغرل شاہ بھی ارزروم میں جا بیٹھا لیکن کیقباد جو قلعۂ انقرہ (Anguria) پر قابض ہو چکا تھا مدت دراز تک ڈٹا رہا اور اس نے کئی سال محصور رہنے کے بعد بمجبوری ہتیار ڈالے۔ اس پر اسے عارضی طور پر قلعہ منشر (آج کل سزرہ Mizere، ملطیہ کے جنوب مشرق میں دیکھیے Defremery: *Hist. des Croisades, Documents Arméniens*، ۱۴۳، حاشیہ ۳) میں قید کر دیا گیا - کیکاؤس ایک کامیاب یورش کی بدولت طربزون (Trebizond) کے بادشاہ کیرالکس Kir Aleks کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اسے اپنی رہائی حاصل کرنے کے لیے سینوپ Sinope کی اہم بندرگاہ اس کے حوالے کرنے اور سالانہ خراج کی

ادائی منظور کرنا پڑی (۶۶۱ھ/۱۲۱۴ء) - شہر انطالیہ جسے کچھ ہی عرصے پہلے کیخسرو نے لے لیا تھا اور مسیحی سرداروں کی مدد سے قلعے کی محافظ ترک فوج وہاں سے نکال دی تھی، دوبارہ نئے سرے سے فتح کر لیا گیا - ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں کیخسرو نے ارمنوں کے ملک پر چڑھائی کر دی اور قلعہ جبان Gaban کا محاصرہ کر لیا (ابن بی بی نے اس کی جگہ چن چین Činčin اور گان چین Gānčin دو قلعوں کا ذکر کیا ہے) محاصرہ اٹھانے کے لیے جو فوج بھیجی گئی، اس میں کانسٹیبل کنسٹنٹائن Constable Constantantine اور کئی رؤسائے مملکت شامل تھے - ترکوں نے اس فوج کو شکست فاش دی اور کانسٹیبل مع چند رؤسا اور سرداروں کے گرفتار کر لیا گیا - اس کے بعد کیکاؤس ملک کو تاخت و تاراج اور بالکل ویران کرنے کے بعد قلعے پر قبضہ کیے بغیر قیصریہ واپس چلا گیا - اب ارمنوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ صلح کے لیے اور قیدیوں کی رہائی کے لیے منت سماجت کریں - ان کی یہ دونوں درخواستیں قبول کرلی گئیں، لیکن ان کے بادشاہ کو یہ عہد کرنا پڑا کہ وہ خراج ادا کرے گا اور لولوہ Lu'lu'a اور لوزد Lawzad کے اہم سرحدی قلعے، جہاں سے کیلیکیا Cilicia کے دروں کی نگرانی ہو سکتی تھی، حوالے کر دے گا - جب ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں کیکاؤس کا حلیف حلب کا ایوبی بادشاہ الملک الظّاہر فوت ہو گیا تو کیکاؤس نے سمیساط کے ایوبی فرمانروا الملک الافضل سے یہ طے کر لیا کہ وہ اسے اپنا فرمانروائے اعلٰی تسلیم کرتے ہوئے حلب پر قبضہ کر لے - شروع شروع میں یہ تجویز کامیاب ہوتی نظر آئی - ترک فوجوں نے بلا دقت مرزبان (کمال الدّین، ترجمہ Blochet، ص ۱۵۸، برج الرّصاص کا ذکر کرتا ہے، علٰی ھذا یاقوت، طبع Wüstenfeld، ۲ : ۶۰۳؛ یاقوت تلّ خالد کا اضافہ کرتا ہے)، رغبان، تلّ باشر اور منبج پر قبضہ کر لیا، لیکن کیکاؤس نے ان شہروں کو الافضل کے حوالے کرنے کے بجائے، جو از روے معاہدہ لازم تھا، وہاں ترک فوجی حاکم مقرر کر دیے - اس طرح دونوں حلیفوں میں پھوٹ پڑ گئی - اہل حلب نے موقع پا کر الملک الاشرف (رک باں) سے مدد مانگی، جس کی فوجوں نے تلّ قبّاسین (یاقوت، ۴ : ۸۶۹) پر ترکوں کے ہراول دستے کو شکست دی - اس کے بعد کیکاؤس ہٹ کر ابلستین چلا گیا اور الاشرف نے ترک دستوں کو ان قلعوں سے نکال دیا جن پر وہ قابض ہو گئے تھے - کیکاؤس نے اس شکست پر، جسے وہ خود اپنے امیروں کی غداری کا نتیجہ سمجھتا تھا، غضب ناک ہو کر ان میں سے کئی ایک کو پھانسی پر لٹکا دیا اور باقی ماندہ کو ایک عمارت میں بند کر دیا، جسے یاقوت ربض طرطوش کے نام سے یاد کرتا ہے - اس کے بعد اس عمارت کو آگ لگا دی گئی اور وہ سب کے سب جل کر مر گئے - کچھ عرصے بعد اسے تپ دق کا مرض لاحق ہو گیا اور ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء میں وہ فوت ہو گیا - اسے ایک شفا خانے میں دفن کیا گیا جو اسی نے سیواس میں تعمیر کیا تھا - اس کا کتبۂ مزار، جو ۶۱۷ھ میں کندہ کیا گیا تھا، آج بھی محفوظ ہے؛ دیکھیے v. Berchem: *Matériaux pour un Corpus Inscriptionum Arabicarum*، حصہ ۳، ص ۵ ببعد .

مآخذ : (۱) سب سے بڑا مأخذ ابن بی بی ہے؛ اس کی تاریخی تصنیف کے اقتباس کے لیے دیکھیے *Recueil de Textes relatifs à l'Histoire des Seldjoucides*، ج ۴ (ترکی ترجمہ، در کتاب مذکور، ج ۳)؛ اس کے علاوہ اہم کتابیں یہ ہیں : (۲) Barhebraeus [ابن العبری] : *Chronicon Syriacum*؛ (۳) کمال الدین

زبدۃ الحلب وغیرہ (فرانسیسی ترجمہ از E. Blochet : *Histoire d'Alep*، پیرس ۱۹۰۰ء)؛ (۴) *Historiens des Croisades, Documents Arméniens*، ج ۱ (پیرس ۱۸۶۹ء)؛ (۵) عام تواریخ مصنفۂ ابن الاثیر، ابن الخلدون، النّویری، خواند میر، منجّم باشی، اور دوسری تصنیفات جو ابھی مخطوطات کی شکل میں ھیں؛ سکّوں کی فہرستیں: (۶) *British Museum Cat. of Oriental Conis*، ج ۳ (۱۸۷۷ء)؛ (۷) غالب ادھم: *Numismatique Seldjoucides* (قسطنطنیہ، ۱۸۹۲ء)؛ (۸) احمد توحید: *Cat. des Monnaies du Musée Impérial Ottoman*، حصہ ۴ (قسطنطنیہ ۱۹۰۳ء)؛ (۹) Huart: *Epigraphie arabe d'Asie Mineure*، در *Revue Sémit*، ج ۲ و ۳؛ (۱۰) J. H. Löytved: *Konia, Inschriften der Seldschukischen Bauten*، برلن ۱۹۰۷ء؛ (۱۱) خلیل ادھم: قیصریۃ شہر مبانی اسلامیہ و کتابہ لری (استانبول ۱۳۳۴ھ)؛ دیکھیے نیز (۱۲) Fallmarayer: *Gesch. des Kaisertums von Trapezunt*، میونخ ۱۸۲۷ء؛ (۱۳) F. Sarre: *Reise in Kleinasian*، برلن ۱۸۹۶ء؛ (۱۴) وھی مصنّف: *Konia, Seldschukische Baudenkmäler* (برلن ۱۹۲۱ء)؛ نیز رکّ بہ سلجوق (مآخذ).

۲ - کیکاؤس دوم، عزّالدّنیا و الدّین بن کیخسرو دوم: جب ۶۴۳ھ / ۱۲۴۵ء میں کیخسرو دوم (رکّ بآں) نے وفات پائی تو اس کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے علاءالدّین کیقباد کو سلطان بننا چاھیے تھا، جس کی ماں گرجستان کی شہزادی تمر تھی، لیکن اس کی عمر صرف سات سال تھی۔ اس کے دو بڑے بھائی اور بھی تھے، یعنی عزّالدّین اور رکن الدّین قلج ارسلان، مگر وہ بھی ابھی بچے تھے۔ عزّالدّین سب میں بڑا تھا اور اس کی ماں ایک یونانی پادری کی بیٹی تھی (Frater Simon، در *Vincent de Beauvais*، کتاب ۳۱، باب ۲۶، لیکن اس نے عزّالدّین اور رکن الدّین کو باھم ملتبس کر دیا ھے)۔ متوفی سلطان کے وزیر شمس الدّین اصفہانی نے، جس کے ھاتھ میں سارا اقتدار تھا، عزّالدّین کی طرف داری کا اعلان تو کر دیا، لیکن باقی دونوں بھائیوں کو نظر انداز کرنے کی فی الحال اسے جراءت نہ ھوئی کیونکہ آخری فیصلہ مغل خوانین کے ھاتھ میں تھا۔ یہی وجہ ھے کہ جب رکن الدّین متعدد ترک امرا کے ھمراہ خان اعظم کے اردو کی جانب اس عظیم قورولتای (مجلس شوری) (۱۲۴۶ء) میں شریک ھونے کے لیے، جہاں کیوک کے خان اعظم ھونے کا اعلان کیا گیا، روانہ ھوا تو کیکاؤس اسے روک نہ سکا، لیکن اس دوران میں وزیر (جسے Frater Simon نے Losyr لکھا ھے) اس فکر میں لگا رہا کہ ساری طاقت اپنے ھاتھ میں لے لے؛ چنانچہ اس نے عزّالدّین کی والدہ سے شادی کر لی، جس سے ترک امرا بہت جھنجلائے اور اپنے مقصد کے اتمام کے لیے کئی امیروں کو لقمۂ اجل بنا دیا، جن میں Vincent کے بیان کے مطابق ایک امیر Salefadinus یعنی شرف الدّین محمود والی ارزنجان بھی شامل تھا۔ یہ شخص عیسائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا اور فرانسیسی اور جرمن زبانیں سمجھتا تھا (وھی کتاب، باب ۲۷)۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیر سے بیزار امرا نے کیوک کے سامنے اس کے خلاف شکایت پیش کی اور اس نے انھیں ایک یرلیق [فرمان] عطا کیا، جس کی رو سے رکن الدّین کو سلطان مقرر کر دیا گیا۔ مزید برآں خان نے یہ بھی حکم دیا کہ وزیر کو مقتول کے اقارب کے حوالے کر دیا جائے۔ اس نے صلح کی قطعی شرائط بھی عائد کر دیں۔ سلجوقیوں کے لیے طے ھوا کہ وہ ھر سال بطور خراج ۱۲۰۰۰۰۰ بیزنت bezants، ۵۰۰ hyperpres، ۵۰۰ ریشمی زربفت کی قبائیں، ۵۰۰

گھوڑے، ۵۰۰ اونٹ اور ۵۰۰ دوسرے چھوٹے جانور بطور خراج ادا کریں گے اور ان سب کے علاوہ دیگر ایسے تحفے تحائف بھی نذر کریں گے جن سے خراج کی کل مالیت دوگنی ہو جاتی تھی - یہ Vincent کی بیان کردہ کہانی ہے (باب ۲۸) - اس سلسلے میں دیکھیے نیز Barthold، در *Zapiski Wost. Otd. Imp. Arkh. Obshč.*، ۲۸ : ۱۲۸؛ d'Ohsson : *Hist. des Mongols*، ۳ : ۸۳ .

رکن الدین جب ایشیاے کوچک واپس پہنچا تو اسے سلطان تسلیم کر لیا گیا - خان اعظم کے احکام کے مطابق وزیر کو اس کے دشمنوں کے سپرد کر دیا گیا، جنھوں نے ۶۴۶ھ/۱۲۴۹ء میں اسے قتل کر دیا - ہمیں ۶۴۶ھ/ ۱۲۴۹ء کے ایسے سکے ملتے ہیں جن پر رکن الدین کا نام ہے - خان اعظم فوت ہوا تو اس کا جانشین سنگو قاآن کہیں ۱۲۵۱ء میں پوری طرح اقتدار سنبھال سکا - اسی لیے ترک امیروں نے یرلیق [فرمان] کی پروا نہ کی اور آپس میں یہ طے کر لیا کہ کیخسرو کے تینوں بیٹے مل کر حکومت کریں؛ چنانچہ ۶۴۷ سے ۶۵۰ھ تک کے سکوں پر تینوں کے نام ملتے ہیں، فقط ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء اس سے مستثنی ہے - اس سال رکن الدین نے قیصریہ میں صرف اپنے نام کے سکے ضرب کرائے کیونکہ اس شہر کے صوباشی [کوتوال] صمصام الدین نے بلاشرکت غیرے اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا - رکن الدین کے سلطان ہونے کے بعد رکن الدین اور عزالدین کے درمیان بہت عرصے تک گفت و شنید جاری رہی، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا - آخر ان کے درمیان بزور شمشیر فیصلہ ہوا - رکن الدین گرفتار کر لیا گیا اور اسے پہلے اسناسیه اور بعد ازاں برغلو بھیج دیا گیا - اسی دوران میں منگوقاآن نے حکم بھیجا کہ عزالدین اس کی خدمت میں حاضر ہو، لیکن عزالدین کا جی نہ چاہا کہ یہ خطرناک سفر اختیار کرے - بنابریں اس نے اپنے بھائی علاءالدین کیقباد کو بیش قیمت تحائف دے کر روانہ کیا، لیکن یہ شہزادہ راستے ہی میں مارا گیا - خان اعظم نے یہ پتا چلانے کے لیے کہ اس قتل میں کس کا ہاتھ تھا، تفتیش کرائی، لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا - ۶۵۴ھ میں آق سرای کے مقام پر عزالدین اور مغل سپہ سالار (نویان) بیجو کی فوجوں کے مابین مقابلہ ہوا، جس میں عزالدین کو شکست ہوئی اور اسے مجبوراً Theodore Lascaris کے پاس پناہ لینی پڑی - اس کے بعد رکن الدین کو محبس سے نکال کر سلطان تسلیم کیا گیا (دیکھیے ۶۵۵ھ کے سکے) - بیجو ابھی اپنی مغل فوج کو پوری طرح ہٹانے بھی نہ پایا تھا کہ عزالدین قونیہ میں لوٹ آیا - ان دنوں رکن الدین قیصریہ میں تھا - طویل گفت و شنید اور اس دوران میں دونوں بھائیوں کی فوجوں کے درمیان گاہ بگاہ جھڑپوں کے بعد یہ طے پایا کہ ملک کو باہم تقسیم کر دیا جائے : قزل ایرماق سے مشرق میں رکن الدّین حکومت کرے اور مغرب میں عزالدین اور اس کے بعد دونوں بھائی عہد نامے کی توثیق کے لیے ہلاکو کے پاس جائیں، جو ان دنوں تبریز کے گرد و نواح میں فروکش تھا - یہ تمام باتیں عمل میں آ گئیں، لیکن اس کے بعد جلد ہی مغلوں کو پتا چلا کہ عزّالدّین ان کے جانی دشمنوں، یعنی مصر کے مملوکوں کے ساتھ گفت و شنید کر رہا ہے اور انھوں نے اس کی حکومت کو ختم کر دیا ہے، لیکن عزالدین کو بھاگنے کا موقع مل گیا، چنانچہ اس نے انطالیه کا رخ کیا اور وہاں سے اپنے رشتے داروں اور چند وفادار امیروں کے ساتھ سمندر کے راستے قسطنطنیه جا پہنچا، جو لاطینی سلطنت کے زوال کے بعد ایک بار پھر یونانیوں کے ہاتھ لگ

گیا تھا ۔ اسے یقین تھا کہ وہاں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا کیونکہ اس کی ماں عیسائی تھی، لیکن بہت جلد ان ترکوں کی موجودگی شہنشاہ کے لیے پریشان کن ثابت ہوئی ۔ کہتے ھیں کہ انھوں نے یہ سازش شروع کی کہ شاہ قسطنطینیہ کو قتل کر کے عزّالدّین کو شہنشاہ بنایا جائے ۔ جب سلطان کے عیسائی ماموں نے اس سازش کا بھانڈا پھوڑا تو یونانیوں نے سلطان کو فورًا جلا وطن کر کے اینوس بھیج دیا اور اس کے ملازمین کو یا تو بطور ترک سپاھیوں (Turkopols) کے شاھی افواج میں بھرتی کر لیا گیا، یا قید کر کے قتل کر دیا گیا (۶۶۲ھ/۱۲۶۴ء) ۔ چھے سال بعد (۶۶۸ھ/ ۱۲۶۸ - ۱۲۶۹ء) عزّالدّین کو منکوتمر کی فوجوں نے، جو اس نے قسطنطینیہ کے خلاف بھیجی تھیں، اینوس سے رہا کر کے قریم (کریمیا) پہنچا دیا ۔ یہاں اس نے برکہ خان کی ایک بیٹی سے شادی کی اور ۶۷۸ھ/ ۱۲۷۹ - ۱۲۸۰ء) میں فوت ھو گیا ۔ اس کے بیٹے مسعود کے بارے میں علٰحدہ مقالہ دیکھیے ۔

مآخذ : (۱) دیکھیے گزشتہ مادّے کے مآخذ ۔ یہاں خاص طور پر اہم یہ ھیں : (۱) Vincentuis Bellovacensis : *Speculum historiale*، کتب ۳۰ و ۳۱، باب ۲۶، ۲۷؛ (۲) نیز مغل اور بوزنطی مؤرخین (Nicephorus Gregoras اور Georgius Acropolita)؛ (۳) W. v. Tiesenhausen : *Recueil de matériaux relatifs à l'histoire de la Horde d'or*، ۱ : ۳۸۲ ۔

(CL. HUART)

* **کیکاؤس** : بن سکندر بن قابوس بن وَشمگیر، عُنصر المَعالی، والیِ جُرجان و طبرستان، جس کا تعلق آلِ زیار [رَكَ بآں] سے تھا ۔ اس نے پہلے دو جلیل القدر سلجوقی سلاطین، طُغرل بیگ اور الپ ارسلان کے ھم عصر اور باجگذار کی حیثیت سے ۴۴۱ھ/ ۱۰۴۹ء تا ۴۶۲ھ/۱۰۶۹ء) حکومت کی ۔ اپنی تصنیف قابوس نامہ، جس کی وجہ سے اس کی شہرت ہوئی، کے خاتمے پر اس نے اپنی عمر ۶۳ برس لکھی ھے ۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے یہ کتاب ۴۷۵ھ/۱۰۸۲ - ۱۰۸۳ء) میں لکھنی شروع کی تھی، لہٰذا اس کا سن پیدائش ۴۱۲ھ/ ۱۰۱۹ - ۱۰۲۰ء کے قریب ھوگا ۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۳۰ برس کے لگ بھگ ھو گی اور اپنی وفات سے خاصی مدت پہلے وہ حکمرانی سے دست بردار ھو گیا ھوگا ۔ ھمیں وہ اسباب معلوم نہیں جن کی بنا پر اس نے تخت و تاج چھوڑا ۔ بہر حال جہاں اس سے اس کی پختگی عقل ظاھر ھوتی ھے، وھاں اس شدید تلخی کا بھی پتا چلتا ھے جس کا اظہار اس کی تصنیف میں نمایاں طور پر ھوا ھے ۔

قابوس نامہ بادشاھوں کے لیے ان اھم ترین ''ھدایت ناموں'' میں سے ایک ھے جو فارسی زبان میں اب تک باقی چلے آتے ھیں ۔ یہ کتاب مصنف نے اپنے بیٹے گیلان شاہ کے لیے لکھی اور اس کا نام اپنے دادا قابوس بن وشمگیر [رَكَ بآں] کے نام پر رکھا، جو فرمانروا اور مصنّف، دونوں حیثیتوں سے یکساں مشہور ھے ۔ یہ ملکی حکمت عملی کی ایک تلخیص ھے، جسے ۴۴ ابواب میں ترتیب دیا گیا ھے ۔ اس کا بیشتر حصہ فلسفۂ اخلاق اور اقتصادیات سے تعلق رکھتا ھے، جس میں متعدد پیشوں کی بابت مباحث بھی شامل ھیں ۔ سیاسیات کے بارے میں صرف آخر کے چند ابواب میں بحث کی گئی ھے ۔

اس کتاب کا عمومی بیان براؤن E. G. Browne کی *A Literary History of Persia*، ۲ (۱۹۰۰ء) : ص ۲۷۶ تا ۲۸۷، میں ملتا ھے ۔ کتاب سے عیاں ھے کہ ترتیب مباحث میں مصنف نے بلا شبہہ ایک حد تک یونانی فلسفۂ اخلاق کا تتّبع کیا ھے اور اسی جیسے مرکزی تصّورات اخذ کیے ھیں، لیکن دوسری

جانب کتاب کی ترتیب اور اس کی مثالیں تقریباً تمام فارسی الاصل ہیں .

اس کے متن کا کوئی تحقیقی نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا - ۱۲۷۵ اور ۱۲۸۵ھ میں دو نسخے، جو تہران سے لیتھو میں طبع ہو کر شائع ہوئے ہیں، ان کا مقابلہ مخطوطات سے کرنے کی ضرورت ہے۔ ترکی زبان میں اس کتاب کے تین تراجم ہوئے ہیں، جن میں سے دو ابھی تک موجود ہیں، لیکن یہ بھی تنقید و تنقیح متن کے لیے کافی نہیں کیونکہ ان میں کئی اضافے اور تغیرات شامل ہیں - ان میں سے پہلے ترجمے کی تاریخ کی تعیین اب نہیں کی جا سکتی - دوسرا ترجمہ مراد ثانی کے لیے مرجمک احمد بن الیاس نے ۸۳۵ھ/ ۱۴۳۲ء میں ختم کیا - اس کے پینتیسویں باب (متعلقۂ شاعری) کو Wickerhauser نے بعنوان *Wegweiser zum Verständniss der türkischen Sprache* (۱۸۵۳ء) میں طبع کیا، ص ۲۶۲ تا ۲۶۵) اور ترجمہ بھی کیا (ص ۲۸۷ تا ۲۹۰) - تیسرا ترجمہ نظمی زادہ مرتضی نے حسن پاشا والی بغداد کے لیے ۱۱۱۷ھ / ۱۷۰۵ - ۱۷۰۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا - H. F. v. Diez نے دوسرے اور تیسرے ترجمے کا تین مخطوطات کی مدد سے ایک مفصل مقدمے کے ساتھ جرمن ترجمہ تیار کیا (دیکھیے مآخذ) - اصل فارسی متن کے پہلے ۲۲ ابواب کا ایک ناقص نسخہ بمبئی میں ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا، جو سر تا سر نسخۂ تہران مطبوعۂ ۱۲۸۵ھ پر مبنی تھا، (قابوس نامہ، از عنصر المعالی، مع وافر فرہنگ از منشی حلیل الرحمٰن) - ۱۸۸۲ء میں Querry نے مکمل فارسی متن کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا.

مآخذ : (۱) *Manuel de Généalogie* : v. Zambaur، ص ۲۱۰، مع مآخذ (ص ۲۱۱) : (۲) وہ تصانیف جن کا ذکر مادہ میں درج ہے: (۳) *G. I. Ph.* : Geiger Kuhn، ۲ : ۳۲۷ تا ۳۴۹؛ (۴) *Buch des Kabus* : Heinr. Friedr. v. Diez، برلن ۱۸۱۱ء؛ (۵) Plessner : *Der des Neupythagorers Bryson*، ۱۹۲۸ء، ص ۵۵ تا ۵۸ و ۲۶۰ تا ۲۶۲ (تنقید بر متن).

(M. PLESSNER)

* **کَیْل** : پیمائش کے لیے سب سے عام اصطلاح - خصوصی معنوں میں یہ خشک اشیا مثلاً ہر قسم کے غلے اور دالوں کے پیمانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بالآخر اس کے معنی (''کَیْلہ'' کی طرح) ایک خاص پیمانے کو پر کر دینے والی مقدار (یا اس مقدار کے وزن) کے ہو گئے - اس کے دیگر معانی یہ ہیں : پیمانہ، صحیح پیمانہ، آزمودہ، منضبط اور مستند سرکاری پیمانہ (یا وزن) - اس معنی میں یہ مصر کے بلّوری اوزان (مثلاً درہم کیل) اور اوراق بردی میں بطور کیل الدیموس ملتی ہے (کیل الدیموس : غلے کا مشہور سرکاری پیمانہ جسے ٹیکس لگانے کے لیے عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور جو ''قنقل'' سے، جس کا مطلب بظاہر متفاوت مقامی پیمانہ ہے، بالکل مختلف ہے) - محدود متعین پیمانے کے لیے کیلہ معمولی لفظ ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کیل کا لفظ بھی بغیر کسی امتیاز کے ایک متعین مقدار کے پیمانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے - کیلہ عربوں کے مقداری پیمانوں کے متعارف سلسلے میں نہیں ہے (دیکھیے قَفِیز) بلکہ جیسا کہ دوسری زبانوں میں پیمائشی اصطلاحیں داخل ہوئی ہیں، اسی طرح عربی میں بھی یہ لفظ بازار سے قانونی زبان میں داخل ہو گیا ہے - اسی وجہ سے ہم کیلہ کو پیمانوں کے نظام میں بمقدار معین کہیں بھی منسلک نہیں پاتے - ایران کے ایلخانی فرمانروا غازان کے عہد حکومت (۶۹۴ھ/ ۱۲۹۵ء تا ۷۰۳ھ/ ۱۳۰۴ء) میں پہلی بار کیلہ کو غلے کی تجارت کے لیے ایک مستند پیمانہ قرار دینے کی کوشش

کی گئی ۔ رشید الدّین ہمیں بتاتا ہے کہ اس بادشاہ نے تبریز کے کَیلے کو ناپ کا معیاری پیمانہ قرار دیا اور اس کا وزن ۲۶۰۰ درہم (۸۰۸ء۸ کیلو گرام = ۱۹ پونڈ) مقرر کر دیا ۔ اس کے بعد یہ ضابطہ جاری ہوا کہ ایسے پیمانے جن میں آنے والے غلے کی مقدار مذکورۂ بالا وزن کے مطابق ہو، ہر قسم کے غلے (جو، گندم، چاول، مٹر، لوبیا، تل، باجرہ وغیرہ) کے لیے تیار کیے جائیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بھی آج کل کی طرح تجارتی لین دین میں پیمانے کے بجائے وزن ہی سے کام لیا جاتا تھا ۔ ترکی مملکت میں بھی غلے کی تجارت کے لیے کیلہ سرکاری اکائی تھا اور استانبول کا کیلہ، جس کا وزن ۳۵ پونڈ تھا (۳/۴ ۷ گیلن)، حکمًا سرکاری معیاری پیمانہ قرار دیا گیا تھا، لیکن ہر تجارتی مرکز کا (جیسا کہ اب بھی معمول ہے) اپنا مقامی کیلہ تھا، جو معیاری کیلہ سے بہت مختلف تھا ۔ یہی بات ''کیلجہ'' کی بابت بھی درست ہے، جس کا ذکر آگے آتا ہے ۔

مآخذ : دیکھیے بذیل کیاجة.

(E. von Zambaur)

* **کَیلَجَة** : وزن کا ایک پیمانہ جو بعض جگہ مستعمل ہے اور جو وزن کے لحاظ سے مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔ اس کا وزن ۱/۲ سے ۲ پاؤنڈ تک (یا کیلوگرام میں ۳/۴ سے ۱/۲ ۳ پائنٹ تک) ہے ۔ یہ اصطلاح اتنی قدیم ہے کہ تیسری صدی ہجری میں بھی موجود تھی ۔

مآخذ : (۱) Sauvaire : *Matériaux*، در *Journ. As.*، سلسلہ ۸، ۸ (۱۸۸۶ء) : ۱۲۶ ببعد؛ (۲) S. Lane-Poole : *Arabic Glass Weights in the British Museum*، شمارہ ۳۷، ۵۱ : (۳) Becker : *Papyri Schott-Reinhardt*، ۱ : ۳۱، ۴۲؛ (۴) الطّبری، طبع de Goeje : *Glossarium*، ص cdxxxiv و cdlxii؛ (۵) Behrnauer : *Institutions de Police chez les Arabes*، در *Journ. As.*، سلسلہ ۵، ۱۶ (۱۸۶۰ء) : ۱۳۱؛ (۶) الخوارزمی : مفاتیح العلوم، طبع Van Vloten، ص ۱۵ .

(E.v. Zambaur)

* **کیمیا** : رکّ بہ الکیمیا .

* **الکیمیا** : رکّ بہ علم (الکیمیا) .

* **الکَیّال** : احمد الکَیّال الخصیبی، تیسری صدی ہجری کا ایک فلسفی، جس کے ہاں اسمٰعیلی اور غناسطی رجحانات ملتے ہیں ۔ الشہرستانی اس کی عربی و فارسی تصنیفات سے واقف تھا ۔ اس نے ان کے جو اجزا پیش کیے ہیں، ان کا رسائل اخوان الصفا سے مقابلہ کرنا چاہیے (دیکھیے الشہرستانی، الملل، قاہرہ ۱۳۱۷ھ/ ۲ : ۱۷، ۱۸) .

(L. Massignon)

⊗ گ : (ف) اسم مذکر؛ فارسی کا چھبیسواں، اردو کا چالیسواں اور (بروے فرہنگ آصفیہ، مادۂ گ) ہندی کا تیسرا حرف (ग) ۔ حرف ''گ'' عربی میں نہیں آتا ۔ حساب جمل میں ''گ'' کے عدد ۲۰ ہیں، جو ''ک'' کے اعدد کے برابر ہیں ۔ اہل ایران ''گ'' کو کاف فارسی کہتے ہیں (اسے کاف عجمی بھی کہا جاتا ہے)، لیکن اہل ماوراءالنہر ''گ'' کو کاف تازی ہی کہتے ہیں (دیکھیے محمد پاشا : فرہنگ آنند راج ، مادۂ گ) اور ''ک'' کو ''گ'' سے بدل دیتے ہیں، جیسے کُشاد = گُشاد؛ کشاورز = گشاورز؛ جہانکشا = جہانگشا؛ پرکار = پرگار؛ کلابتوں = گلابتوں وغیرہ .

ہندی حرف ''گ'' فارسی زبان میں کبھی اول، کبھی وسط اور کبھی آخر میں حروف ذیل سے بدل جاتا ہے: ب، ج، د، خ، غ، م، ڈ، و، ی (فرہنگ آصفیہ، مادۂ گ) .

کبھی کسی لفظ میں ''گ'' کی تحفیف ہو جاتی ہے، لیکن معنی میں فرق نہیں آتا، مثلًا اگر = ار .

اب ہم بعض ایسے الفاظ کا ذکر کرتے ہیں جن میں ''گ'' خاص خاص حروف سے بدل جاتا ہے، مثلًا درج ذیل الفاظ میں ''گ''، ''ب'' سے بدل گیا ہے : گرِیوَن (بیماری کا نام جسے عربی میں قوبا اور ہندی میں داد کہتے ہیں) = برِیوَن (وھی بیماری)؛ گُلگونہ (غازہ) = بلغونہ (غازہ) .

بعض اوقات ''گ'' کو شفہی (بہی؛ وہ صوت جو ھونٹوں کو بند کرکے یا قریب لا کر پیدا ھو) حروف سے بدل دیتے ھیں (دیکھیے F. Steingass : *Persian and English Dictionary*)، مثلًا ''گُمرک'' (= محصول چنگی) کو بصورت ''جمرک'' معرب کیا گیا ہے .

''ج'' سے بدلنے والے بعض اور الفاظ درج ذیل ھیں : لگام = لجام (گھوڑے کی باگ ڈور)، گُوال (بالیدگی، نشو و نما کرنے والا) = (معرب) جُوال (یہ لفظ لُغت ژند یا ژند سے ہے، شاید یہ جوبال کا مخفف ہے دیکھیے فرہنگ آنند راج، مادۂ گ) .

کبھی ''گ'' کو کسی حلقی حرف (حلق سے نکلنے والی صوت کا حرف) مثلًا غ سے بدل دیا جاتا ہے (دیکھیے F. Steingass)، مثلاً گیلواج بمعنی چیل (= گلیواز) = غلیواج؛ لگام = لغام؛ گُلولہ (بمعنی گولی، گولا، غُلّا) = غلُولہ؛ لژگاؤ (ایسی گاے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی دم سے پرچم بناتے ھیں) = گژگاؤ = غز گاؤ؛ گُلالہ = غُلالہ (خم دار زلف)، کمال اسمٰعیل :

ع ھر سال رنگ عارض و بوی گلالہ است

ع بس لطیف است در غُلالہ لاد

''ل'' سے بدلنے والے ''گ'' کا لفظ : گلگُونہ = لغُونہ (آرائش و گلگونہ)

''واو'' سے بدلنے والا ''گ'' کا لفظ : گُراز (خوک، سور) = وُراز.

''ی'' سے بدلنے والے ''گ'' کے الفاظ: آذرگُون (ایک قسم کی شقیق، جس کے کنارے بہت سرخ ہوتے ہیں اور درمیان سے سیاہ ہوتی ہے) = آذریُون؛ رشید الدین وطواط :

همیشه تا که بود در فراق عاشق را
دلی چو آذر و رخسارهٔ چو آذر یون

پُوردگان = پُوردیان = خوردیان (معرب فورد جان)، بمعنی پانچ الحاقی دن، جو ایرانی سال کے آخر میں بڑھائے جاتے ہیں؛ زرگُون= زریُون، قطران تبریزی :

آن درختی کش تو باری باد زریون جاودان
گو بدانش باغ دولت را همی زریون بود

حرف ''گ'' کسی ذاتی معنی میں نہیں آتا، البتہ کسی لفظ کے آخر میں کبھی نسبت کے طور پر ''گ'' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، مثلاً شنگ، بمعنی شوخ و ظریف (شوخ و شنگ)، یہ لفظ شن اور گ کا مرکب ہے : شن کا مطلب ہے ناز، کرشمہ اور ''گ'' نسبت کے طور پر آیا ہے ۔ اسی طرح غیریژنگ، غریژن اور گ کا مرکب ہے : غریژن کا مطلب ہے تالاب کی تہ میں جمی ہوئی سیاہ رنگ کی کیچڑ اور ''گ'' نسبت کو ظاہر کرتا ہے .

مآخذ : متن میں درج ہیں (مقبول بیگ بدخشانی رکن ادارہ نے لکھا) .

(ادارہ)

* **گابون** : Gabon، ان چند افریقی ممالک میں سے ایک ہے جن میں اسلام آبادکاروں کے قافلوں کے ذریعے متعارف ہوا ۔ کہیں ۱۸۴۳ء میں جا کر سب سے پہلے سینی گالی سپاہیوں (وولوف Wolofs یا تکولُرز Tukulors) کو قلعۂ د، اومیل Fort d'Aumale کے محافظ دستے کے ساتھ اور پھر لیبرویل Liberville میں سطح مرتفع پر واقع کیمپ میں متعین کیا گیا ۔ ان میں سے بعض سپاھیوں نے اپنی ملازمت کے مکمل ہونے پر گابون میں اقامت اختیار کر لی، جہاں وہ زیادہ تر اگوی Ogoué، نگونی Ngounie یا فرنان واز Fernan Vaz کی سمندری جھیل کے ساتھ ساتھ تجارت کرتے تھے ۔ انہوں نے گابون کی عورتوں سے شادیاں کر لیں، جو شادی کے بعد بھی عیسائی ہی رہیں اور ان کے بچے عام طور پر سینٹ میری مشن کے کیتھولک سکولوں میں پڑھتے رہے .

استعماری پیدل فوج کا ایک حفاظتی دستہ زیادہ تر سینی گال اور فرانسیسی سوڈان کے رہنے والے بندوقچیوں پر مشتمل تھا ۔ مقصد یہ تھا کہ فوج میں مسلمانوں کے نئے نئے دستے متواتر بھرتی ہوتے رہیں؛ تاہم وہ دو یا تین سال یہاں ٹھیرتے تھے اور اس کے بعد واپس اپنے وطن چلے جاتے تھے اور ان کی جگہ ھوسا Hausa اور دیولہ Dyula قبائل کے پھیری والوں اور دکانداروں کو لینی پڑتی تھی ۔ ان مسلمانوں میں سے بعض نے جنگلی دیہاتیوں کی خوش اعتقادی سے فائدہ اٹھا کر نجومیوں یا جادوگروں کا پیشہ اختیار کر لیا .

گابون کے باشندوں میں سے جو مشرف باسلام ہوے ان کی مجموعی تعداد چند درجن سے زیادہ نہیں.

۱۹۵۹ء کے ان اعداد و شمار میں، جو ڈاکار Dakar کے پاپائی ضلع میں کام کرنے والے (عیسائی) تبلیغی اداروں کے سالنامے میں دیے گئے ہیں، مسلمانوں کی تعداد دو ہزار بتائی گئی ہے (یہ شمار غالبًا اصل سے کم ہے) ۔ ان میں سے ۱۰۹۰ دریا کے دہانے کے ضلع میں، ۲٦٦ وولیونیم Woleu Ntem میں، ۱۷۵ سمندر کے قریب واقع اوگو Ogoue میں، ۸۰ اوندو Ivindo میں، ۳۱ نگونی Ngounie میں، ۲۱ اگوئی لولو Ogoué Lolo میں، ۱۰ نیانگا Nyanga میں اور ۳ بالائی اگو Upper Ogoue میں آباد ہیں. مسلمانوں کی قلت کا اندازہ مسجدوں کی تعداد

سے لگایا جا سکتا ہے جن میں سے ایک پورٹ جینٹل Port Gentil میں ہے، ایک لمبارینی Lambaréné میں اور دو لیبرویل Libreville میں، جن میں سے سب سے بڑی مسجد فرانسیسی حکومت کے خرچ پر بنائی گئی تھی۔

گابون کے مسلمان، جو کل آبادی کا چار فیصد ہیں، صرف استعماری دور میں انتظامیہ کے ماتحت ملازمین کی حیثیت سے اہم تھے۔ مسلمان اب بھی یہاں متوسط تجارتی طبقے کی حیثیت سے تھوڑی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

مآخذ: (۱) گابون سے متعلق مختلف تصانیف میں کچھ سطریں؛ (۲) مندرجۂ بالا مقالے کی اہم معلومات ابیے راپوندا واکر Abbé Raponda-Walker نے مقالہ نگار کو مہیا کی ہیں؛ [نیز دیکھیے: (۳) گلزار احمد: تذکرۂ افریقہ، معارف لمیٹڈ کراچی، ۱۹۶۰ء، ص ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷ الف]۔

(R. CORNEVIN)

گارڈافوئی: (Guardafui) افریقہ کی انتہائی مشرقی راس، جسے عربی میں "راس عسیر" کہتے ہیں۔ اس نام کی اصل کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یقینی بات صرف اتنی ہے کہ اس میں حفون (Opone) کا نام مضمر ہے بلاشبہہ اس سے تقریباً ۶۰ میل جنوب میں ایک اور راس ہے جسے عرب جرد (گرد) حفون کہتے ہیں، لیکن اس میں شبہہ ہے کہ آیا یہ جرد یا گرد جس کا عربی زبان میں کوئی مطلب نہیں نکلتا، یورپین سے تو مستعار نہیں لیا گیا کیوں کہ اس کا قدیم ترین نام جو پرتگیزوں نے رکھا تھا، اس کا سلسلہ ایک حد تک ورد سے ملایا جا سکتا ہے اور یہ لفظ ضروری نہیں کہ عربی الاصل ہی ہو۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں یہ نام کسی راس کے بجائے پورے علاقۂ حفون (ارض حفون) کو ظاہر کرتا ہو اور پرتگیزوں نے صرف راس کے لیے محدود کر دیا ہو۔

مآخذ: Yule و Burnell : *Hobson Jobson*، ص ۳۶۸ ببعد۔

(ادارہ بار اوّل)

گارسیف: گرسیف [آگرسیف: بربری: اجرسیف، فرانسیسی: گرسیف Guercif]، مشرقی مراکش میں ایک قصبہ، جو تازہ سے ساٹھ کیلو میٹر مشرق میں تافرالما کے لق و دق میدان میں دریاے مُلّو اور دریاے ملویہ کے سنگھم کے درمیانی قطعۂ زمین پر واقع ہے۔ (اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ بربری زبان میں "جر" "درمیان" اور "اسیف دریا" کے معنوں میں آتا ہے)۔

Marmol نے گرسیف اور بطلمیوس کے Galapha کو ایک ہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ غیر اغلب ہے، چونکہ اس یونانی جغرافیہ نویس نے موخرالذکر مقام Molochat (ملویہ) کے مشرق میں بتایا ہے، لہٰذا صحیح نام تاوریرت ہی ہو سکتا ہے۔

گرسیف کی بنیاد بنو ابی العافیہ کے ہاتھوں تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں پڑی تھی۔ یہ مکناسہ کا بربری قبیلہ تھا جو وادی ملویہ میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتا تھا۔ بعد ازاں یہ قصبہ موسیٰ بن ابی العافیہ (م ۳۲۷ھ/۹۳۸ء) اور اس کے اخلاف کے مقبوضات کا صدر مقام قرار پایا۔ موسیٰ بن ابی العافیہ کے بیٹوں نے بنو ادریس اور بنو فاطمہ کے ساتھ جنگوں میں بڑی شہرت حاصل کی۔

گرسیف (اجرسیف) کی تجارتی اور جنگی اہمیت کا باعث اس کا محل وقوع تھا۔ یہ دو راستوں کے مقام اتصال پر واقع تھا، جن میں سے ایک فاس سے تلمسان اور دوسرا سجلماسہ سے ملیلہ کو جاتا تھا۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں البکری نے لکھا تھا کہ یہ ایک آباد قصبہ

(ترنید العامرۃ) ہے، لیکن جب ۴۷۳ھ/۱۰۸۰ء میں المرابطی سلطان یوسف بن تاشفین نے اس کو فتح کر کے برباد کر دیا تو اس کی سابقہ اہمیت جاتی رہی۔ الادریسی بھی اس مقام سے نا آشنا تھا۔

ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں بربروں کے خانہ بدوش قبائل بنو مرین نے جو زناتہ کی شاخ تھے، گرسیف میں آمد و رفت شروع کر دی۔ یہ قبائل گرمیوں میں صحرا کے بالمقابل پہاڑی علاقوں سے اتر کر زیریں ملویہ وادی میں گرمیوں کا سارا موسم گزارتے، گرسیف میں وہ اناج کا ذخیرہ کر لیتے اور موسم خزاں کی آمد پر صحرائی چرا گاھوں میں جانے سے پیشتر باھمی ملاقات کر لیتے تھے۔ العقاب کی جنگ کے بعد جب مرابطی سلطنت زوال پذیر ہو گئی، تو بنو مرین اس سے فائدہ اٹھاتے ہوے ملویہ کی زیریں وادی میں آباد ہو گئے اور انھوں نے گرسیف پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۶۳۶ھ/۱۲۳۸ء میں جب مرابطی فوج تلمسان سے پسپا ہو کر فاس واپس آ رہی تھی تو بنو مرین اس سے فائدہ اٹھاتے ہوے ملویہ کی زیریں وادی میں آباد ہوگئے اور انھوں نے گرسیف پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس وقت انھوں نے اس مقام پر گھات لگا کر مرابطی فوج کو تباہ و برباد کر دیا۔ ۱۲۷۵ء میں بنو مرین نے سارے مراکش پر قبضہ کر لیا، لیکن ملک کی مشرقی سرحدوں پر تلمسان کے زیّانی حکمران خطرہ بنے رہے۔ (اب) تاوریرت اور دیدو [رک باں] کے ساتھ گرسیف بھی فوجی چھاؤنی (ثغر) بن گیا، جس کی وجہ سے مراکش کے اندرونی علاقوں پر یلغار مسدود ہو گئی۔ ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء میں ابو سعید مرینی نے گرسیف کی فصیل دوبارہ بنوا دی۔ بعد ازاں جب شہریوں نے بغاوت کر دی تو ابو عنان نے حملہ کر کے شہر کو آگ لگا دی اور شہر پناہ کے بعض حصے گرا دیے۔

ابو عنان کی وفات ۷۵۹ھ/۱۳۵۸ء پر گرسیف مرادہ کے مستحکم قلعے (ملویہ کے کنارے جانب شمال مغرب بندرہ کیلو میٹر کے فاصلے پر) سمیت سویدی عربوں کے نامور سردار ونزمار بن عریف کی جاگیر بن گیا۔ یہ بنو مرین کے حامی بدوی قبائل کا سالار لشکر اور حکمران خاندان کا مشیر کار تھا۔ تلمسان کے حکمران ابو حمّو نے بارہا گرسیف پر حملے کیے اور کئی دفعہ مستحکم مقامات پر قبضہ کر کے ان کو برباد کر دیا۔

جب ترکیہ اور فرانس کے درمیان الجزائر کی سرحد اوجدہ سے آگے جانب مشرق قرار پائی تو مصریوں اور عاویوں نے (اقامت کے لیے) تا وریرت کو ترجیح دی۔

۱۹۱۲ء میں فرانس نے گرسیف پر قبضہ کر لیا اور اوجدہ سے آنے والی ریلوے لائن پر سٹیشن بننے سے اسے کچھ اھمیت بھی حاصل ہو گئی۔ جب ریلوے لائن کی توسیع تازہ اور بعد ازاں فاس تک کی گئی تو اس قصبے کی رونق جاتی رہی۔ مسون سمیت گرسیف ھوّارہ قبائل کا ایک اھم مرکز ہے۔ گرمیوں میں یہ قبائل اپنے مویشی لے کر ان اطراف میں آ نکلتے ھیں اور بھیڑیں وغیرہ پالتے ھیں۔

مآخذ: (۱) البکری: المُغرب فی ذکر بلاد افریقیہ والمغرب، بمدد اشاریہ، الجزائر ۱۹۱۱ء؛ (۲) *Leo Africanus* طبع شیفر، متن ۲، ۲۷، ۳۲۹، ترجمۂ Epaulard ۲۹۹.

(G. S. Colin)

گازرون: رک بہ کازرون.

گاگوز (Gagauzes): ایک ترکی نسل کی قوم ہے جو ایک خالص ترکی زبان بولتی ہے مگر عیسائی مذھب کی پیرو ہے۔ ان کی تعداد کم ہے۔ یہ لوگ متفرق نوآبادیوں میں رھتے ھیں اور آج کل زیادہ تر بیسربیا میں بکھرے ہوے ھیں (یہ

وگ بیشتر اس مثلث میں رہتے ہیں جو اسمٰعیل لفراد اور کگل کو خطوط کے ذریعے ملانے سے بنتی ہے، نیز دیوار تراجن (Trajans wall) کے ضلع ور بندر اور اکرمن میں) - یہ لوگ متعدد علاقوں یں بکھرے پڑے ہیں۔

مآخذ : (۱) W. Radloff : *Čtenlja v Imp. Obshč istor. i drevn. Ross*، ۱۸۳۶ء، شمارہ ۱ : (۲) A. A. Sokalski : *Bolgarskija Kolonii v Bessarabii i Novorossijskom Kraje, journal ministerstva vnutren djel*، ۱۸۳۸ء، شمارہ ۲۱ : (۳) A. Zashčuk : *Materialy dlja geografi i statistiki Rossii Bessarabskaja oblast*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۲ء؛ (۴) G. Golubovski : *Pečeniegi Torki i Polovcy do nashestvija Tatar. Istorija juzhnorusskich stepej* Kiev ۱۸۸۴ء)؛ (۵) P. Draganoff : *Zapiski imp. russk. geogr. obshč po otdjel Etnogr*, جلد ۹ تا ۱۳ جلد ۲۲، شمارہ ۱ (*Makedonsko slavjanski sbornik*)؛ (۶) Constantin Jiriček : *Sitzungsber. d. Kgl. böhm Gesellsch d. Wiss*، ۲۱ جنوری ۱۸۸۹ء، اور *Das Fürstentum Bulgarien*، Wien ۱۸۹۱ء؛ (۷) Pecz : *Osterr. Monatsschr. f.d. Orient*، ۱۸۹۴ء؛ (۸) V. Moshkoff : *Proben der Volkslitteratur der Türkischen stämme*، طبع W. Radloff X. Teil : *Mundarten der bassarabischen Gagausen* (۱) متن و فرہنگ؛ (۲) ترجمہ (روسی)؛ (۹) Gheorghe Popescu-Ciocanel در *Revue du Monde Musulman*، جلد ۱ (۱۹۰۶ء)، ۱۹۶ : (۱۰) Djansizoff : *Revue historique publiée par l'institut d'Histoire Ottomane*، Heft ۱۸ (دسمبر ۱۹۱۲ء).

(TH. MENZEL [و تلخیص از ادارہ])

گاور : (G. Aur) = گبر [رک بآں].

گاور طاغی (جبل برکت) : کوہ اماؤس (Amanus) اور زیادہ صحیح الفاظ میں اس سلسلۂ کوہ کے شمالی حصے کا نام ۔

گایوس Gayos : ایک قبیلہ جو آچیے (Atjeh) [رک بآں] میں آباد ہے ۔

گب : ای - جے - ڈبلیو، E. J. W. Gibb، [۱۸۵۷ء میں] سکاٹ لینڈ کے ایک شریف اور متمول گھرانے میں پیدا ہوا - [ایڈنبرا یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کی تحصیل کی اور عربوں اور ترکوں کے علوم و آداب اور تاریخ و فلسفہ میں تخصص حاصل کیا - گلاسکو یونیورسٹی میں محفوظ عربی، سریانی اور عبرانی مخطوطات کی ایک فہرست تیار کی جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلّے (JRAS، ۱۸۹۹ء) میں شائع ہوئی] - گب کو ترکوں کے ادبیات اور خصوصاً ان کی شعر و شاعری کے ساتھ بڑا شغف تھا - اسی بے پناہ شوق کی بدولت انھوں نے ترکی شعر و شاعری کی ایک مبسوط تاریخ *A History of Ottoman Poetry*، (لنڈن ۱۹۰۰ تا ۱۹۰۹ء) کے نام سے چھے جلدوں میں لکھی - اس کتاب کی اشاعت کے دوران میں بعمر ۴۵ سال، ۱۹۰۱ء میں مصنف کا انتقال ہو گیا اور ان کی وفات کے بعد اس کتاب کی اشاعت کو پروفیسر ای - جی - براؤن نے مکمل کیا جو گب کے ذاتی دوست تھے اور ان کے علم و فضل اور ان کی تصنیف کے مداح تھے - گب نے بیشتر ترکی شعرا کے حالات لکھے ہیں اور اس تفصیل، استیعاب اور ناقدانہ بصیرت سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب تمام دنیا کے لٹریچروں میں اپنے موضوع پر ایک منفرد اور بے مثال تصنیف سمجھی جاتی ہے ۔

پروفیسر براؤن نے متوفی کی والدہ کو مشورہ دیا کہ ان کے فرزند عزیز کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ایک فنڈ قائم کر دیا جائے، جس سے ان مشرقی علوم کی کتابیں شائع ہوتی رہیں جن علوم کے ساتھ

مرحوم کو خاص شغف تھا ۔ اس نیک دل خاتون نے پروفیسر ممدوح کا مخلصانہ اور دانشمندانہ مشورہ قبول کیا، اور اس مقصد کے لیے پانچ هزار پاونڈ کی رقم سے Gibb Memorial Series کے نام سے ایک اشاعتی وقف قائم کر دیا اور اس رقم میں خداوند کریم نے ایسی برکت ڈالی کہ اس سے عربی فارسی اور ترکی کی بیسیوں کتابیں شائع هو چکی هیں اور ابھی تک شائع هو رهی هیں اور اس طرح سے مسلمانوں کے بہت سے علمی خزانے منظر عام پر آچکے هیں ۔

مآخذ : (۱) ابوالقاسم سحاب: فرهنگ خاور شناسان، طبع ایران، ص ۳۰۳ ؛ (۲) نجیب العقیقی : المستشرقون، ۲ : ۴۹۱ ؛ (۳) A. J. Arberry : *British Orientalists*، ص ۱۹) ۔

(شیخ عنایت اللہ)

③ **گِبْ** (هملٹن) : (سر اے ۔ آر هملٹن گب Sir A. R. H. Gibb) انگلستان کا مشہور مستشرق جس نے عربی زبان و ادب کی نمایاں خدمات انجام دیں، ۱۸۹۵ء میں اسکندریہ (مصر) میں پیدا هوا، لیکن عربی زبان کی تعلیم لنڈن کے سکول آف اوریئنٹل سٹڈیز میں حاصل کی ۔ یہاں اسے ایک دوسرے نامور مستشرق سر ٹامس آرنلڈ (Sir Thomas Arnold) کے علاوہ شیخ عبدالرزاق حسنین مصری ایسے اساتذہ سے بھی استفادے کا موقع ملا جنھوں نے اس کے ذوق علمی کو پختہ کرنے میں نمایاں حصہ لیا ۔ ۱۹۲۱ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد گب اسی مدرسے میں لیکچرار بن گیا ۔ ۱۹۳۰ء میں وہ لنڈن یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر مقرر هوا اور ۱۹۳۷ء میں مارگولیتھ کی وفات کے بعد آوکسفرڈ میں عربی زبان و ادب کا صدر شعبہ قرار پایا ، جہاں وہ ۱۹۵۵ء تک کام کرتا رها ۔ اس کے بعد وہ فورڈ (امریکہ) میں شعبۂ دراسات شرق الاوسط کا صدر مقرر هوا ۔ اس نے ۱۹۷۵ء میں وفات پائی ۔

گب عربی لکھنے اور بولنے میں اهل زبان کی سی قدرت رکھتا تھا ۔ براؤن، آرنلڈ اور نکلسن کی طرح اس کا شمار معتدل مزاج مستشرقین میں هوتا هے ۔ اس نے ممالک عربیہ، مثلاً مصر، شام، لبنان، فلسطین اور مغرب اقصی کی بھی سیر و سیاحت کی تھی اور وهاں کے ادبا سے اس کے ذاتی مراسم بھی تھے ۔ ان ممالک کے علمی ادارے بھی اس کے قدر دان اور مرتبہ شناس تھے، چنانچہ وہ مجمع اللغہ (قاهرہ) اور مجمع العلمی العربی (دمشق) کا اعزازی رکن تھا ۔ اسے عربی زبان کے جدید ادب اور مسلمانوں کی سیاسی، دینی اور اصلاحی تحریکوں سے بڑی دلچسپی تھی ۔

تصانیف : اس کی مشہور تصانیف درج ذیل هیں : (۱) *The Arab conquest in Central Asia*، لنڈن، ۱۹۲۳ء؛ (۲) *Arabic Literature an introduction*، لنڈن ۱۹۲۶ء؛ (۳) سفر نامۂ ابن بطوطہ کا انگریزی ترجمہ Ibn Battuta : *Travels in Asia and Africa*، ج اول، طبع لنڈن ۱۹۲۹ء، ج ثانی کیمبرج ۱۹۶۲ء؛ باقی اجزا زیر طباعت هیں؛ (۴) ذیل تاریخ دمشق لابن القلانسی (متن و ترجمہ)، لنڈن ۱۹۳۲ء؛ (۵) *Whither Islam*، لنڈن ۱۹۳۲ء؛ (۶) *Mohammedanism* : *An Historical Survey*، لنڈن ۱۹۵۳ء؛ (۷) *Islamic Society and the West*، آوکسفرڈ ۱۹۵۰-۱۹۵۷ء؛ اس نے مختصر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لنڈن ۱۹۵۳ء، کی تدوین و ترتیب میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا ۔ اس کے علاوہ اس نے بیسیوں مقالات عربی زبان و ادب، تصوف، اسلامی تاریخ اور مشاهیر رجال کے بارے میں لکھے تھے ۔ ان میں قابل ذکر مصر جدید کے ادبا اور نثر نگاروں کے فکر و فن اور اسلوب پر *Studies in contemporary Arabic Literature* کے نام سے BSOS (۱۹۲۹ تا ۱۹۳۰ء)

لنڈن میں شائع ہوے تھے - پھر یہ مقالات اس کے مجموعۂ مقالات (Studies on the civilization of Islam) میں شائع ہوے ہیں .

مآخذ : (۱) نجیب العقیقی، المستشرقون، ۲ : ۵۵۱ تا ۵۵۳، قاہرہ ۱۹۶۵ء ؛ (۲) Webster : *Biographical Dictionary*، (نذیر حسین رکن ادارہ نے لکھا).

(ادارہ)

گَبْر : ایک اصطلاح جو فارسی ادب میں بالعموم کسی قدر تحقیر آمیز انداز میں زرتشتیوں کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے - اس کے اشتقاق کی بابت ابھی تک لسانیات کے ماہر کوئی متفقہ فیصلہ نہیں کر پائے - اس کے متعلق بہت سی تجاویز پیش کی گئی ہیں، مثلاً (الف) عبرانی لفظ جبھر habher (''ساتھی'') سے، قدوشین کے مفہوم میں ۲۷-الف ؛ (ب) آرامی - پہلوی گبرا (پڑھیے مرت) سے، خاص طور پر موغ - مرتان mog marton (''مجوسی Magi'' (جو موغ - گبرا - آن لکھا جاتا ہے) کی ترکیبوں میں (ج) عربی لفظ ''کافر'' کی فارسی تعریف سے - پہلے دو اشتقاق تو قیاس سے بہت بعید ہیں، عربی لفظ کافر سے اس کا اشتقاق سب سے زیادہ قابل قبول ہے - فارسی ادب میں اس لفظ کے ساتھ تحقیر کے لیے اکثر ''ک'' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے (گبرک، ج گبرکان) فارسی میں اس لفظ کی شکل گور (gawr, gaur) کردی شکلیں، گبیر (ارمنوں کے لیے)، گور (زردشتیوں کے لیے)، گاویر (یورپیوں، خاص طور پر روسیوں کے لیے)، ترکی کا مشہور لفظ گاور gavur (کافر) بھی معروف ہیں - فارسی ادب میں اس لفظ کا استعمال محض ثانوی حیثیت سے عام معنوں میں ''کافروں'' کے لیے ہوتا ہے - قدیم متون میں یہ لفظ خاص اور اصطلاحی طور پر زردشتیوں کے لیے استعمال ہوا ہے - [= دیکھیے سعدی : اگر صد سال گبر آتش فروزد : چو یکدم اندر آن افتد بسوزد] - اس سے عربی لفظ، جو غالباً اس کے پیچھے کارفرما ہے، کی فارسی تحریف سمیت، پتا چلتا ہے کہ اس کا ماخذ خالص زبانی - بہت قدیم زمانے سے متعلق ہے، یقینی طور پر اس دور سے پہلے کا جس میں نئے فارسی تحریری ادب کی تخلیق کے وقت فارسی زبان میں نئے عربی الفاظ بکثرت داخل کیے گئے تھے .

مآخذ : (۱) *Gr. I. Ph.*، ۲ : ۶۹۷ ؛ (۲) برہان قاطع، طبع ایم - معین، بار دوم، تہران ۱۳۴۲ھ شمسی، ۳ : ۱۷۷۳ تا ۱۷۷۴، ۱۸۵۰ ؛ (۳) ایم - معین : مزدیسنا و تاثیر آن در ادبیات پارسی، تہران ۱۳۲۶ھ، ص ۳۹۵ تا ۳۹۶ (اور طبع جدید دو جلدوں میں، تہران ۱۳۳۸ھ) ؛ (۴) اکبر دہخدا : لغت نامہ، کراسہ ۳، تہران ۱۳۳۰ھ شمسی/۱۹۵۶ء، ص ۹۴ تا ۱۰۰ .

(A. Bausani)

گَبْن : جس کی صحیح شکل گبنپرٹ Gabnopert ہے (دیکھیے ابو الفرج : *Chron. Sry*، طبع Bruns، ص ۳۲۹)؛ یہ آرمینیا کے ملک میں ایک پہاڑی قلعہ ہے، جو دریاے جیحان کے معاون تکرصو پر واقع ہے - آج کل اسے گبن کہتے ہیں اور یہ مرعش کی سنجاق میں اندریں کی قضا میں شامل ہے - آرمینیا کے بادشاہ یہاں اپنے خزانے محفوظ رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت پناہ لیتے تھے، مثلاً آخری بادشاہ لیون Leon ششم والی لوسگنان Lusignan ۱۳۷۴ء میں یہاں محصور ہو گیا تھا، لیکن نو ماہ کے محاصرے کے بعد اسے مملوک سلطان الملک الاشرف شعبان کی اطاعت قبول کرنا پڑی .

(وَ وَ لائیڈن، بار اول)

گِبَّن : ایڈورڈ، Edward Gibbon (۱۷۳۷ - ۱۷۹۴ء) مشہور برطانوی مؤرخ، مستشرق، مصنف *The History of Decline and Fall of the Roman Fmpir*، (۱۷۷۶ تا ۱۷۸۸ء).

[ادارہ]

* گُجرات: پنجاب، (پاکستان): کے راولپنڈی ڈویژن، کا ایک ضلع جو ۳۳ درجے اور ۳۲ درجے ۸ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۳ درجے، ۱۷ دقیقے اور ۷۴ درجے، ۳۰ دقیقے طول بلد شرقی کے درمیان واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۲۲۰۸ مربع میل ہے اور ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۱۱۰۸۶۷۵ ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے جس کے جنوب مشرق میں دریاے چناب ہے اور جہلم شمال مغرب کی جانب بہتا ہے، کوہ ہمالیہ کی بیرونی پہاڑیاں شمال مشرق میں ہیں اور ضلع شاہ پور اس کے جنوب مغرب میں ہے، اس ضلع کا بہت سا قدیمی بنجر علاقہ، اب زیر کاشت آ چکا ہے کیونکہ جہلم کی نہریں اور معاون نہریں اس کو سیراب کرتی ہیں۔

سکندر اعظم اس ضلع میں سے گزرا تھا۔ موجودہ شہر جہلم کے نزدیک اس نے دریاے جہلم ھیڈ سپس (Hydaspês، ونستہ، ویہٹ یا جہلم) کو عبور کیا اور پہاڑی رستوں سے گزرتے ہوے دریاے چناب کو اس مقام پر عبور کیا، جہاں وہ پہاڑوں سے نکل کر میدان میں داخل ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضلع، پورس Porus کی مملکت کا وسطی علاقہ تھا۔ اس کے بعد یہ ضلع موریا اور کوشان حکمرانوں کی سلطنت کا ایک حصہ بنا لیکن گپت خاندان کی سلطنت میں اس کا شامل ہونا معلوم نہیں ہوتا اور نہ ھرش کی مملکت ھی کا کبھی حصہ بنا، گوجروں کے قبیلے کی اکثریت اور خود اس کے نام سے اغلب معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کا شمول اس بڑی گورجارا سلطنت میں ہو جس کا صدر مرکز راجپوتانے میں بھین مال تھا۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ مقامی راجا عرصۂ دراز سے مرکزی حکومت سے جس کا دارالسلطنت قنوج [رك بآں] تھا، اپنا تعلق منقطع کر چکے تھے، جب کہ نویں صدی میں گوجر دیس جو گجرات کے ضلع کے تقریباً مطابق تھا جمّوں کے حکمران نے مہاراجا کشمیر کے حوالے کر دیا تھا۔ بعد کے زمانے میں یہ سر زمین سب حملہ آوروں کے لیے شارع عام بن گئی، جس میں محمود، محمّد بن سام، تیمور، بابر اور نادر شاہ کی فوجیں شامل ہیں۔ اس ضلع کے باشندے خواہ وہ جاٹ ہوں، راجپوت یا گوجر، رفتہ رفتہ سب مسلمان ہو گئے، سکھ مذہب نے کچھ زیادہ ترقی نہیں، کی اس لیے زیادہ تر یہ مسلمانوں ھی کا علاقہ ہے۔

اگرچہ سکھ مذہب یہاں کچھ زیادہ نہیں پھیلا، تاہم جب احمد شاہ دُرّانی وسط پنجاب کو چھوڑ کر چلا گیا تو سکّھوں نے گجرات کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ بھنگی مسل نے دریاے جہلم تک اپنا قبضہ جما لیا اور ۱۷۶۸ء میں تو وہ آگے بڑھ کر راولپنڈی تک پہنچ گئے تھے۔ بھنگی مسل کے قائم کردہ مقامی علاقے کو رنجیت سنگھ نے بہت جلد اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ اس کی موت کے بعد گجرات کا علاقہ ۱۸۴۹ء تک برابر سکھ حکومت میں شامل رہا۔ اس وقت یہاں نہایت خونریز لڑائی شروع ہو گئی جسے دوسری سکھ جنگ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سعد اللہ پور، چلیانوالہ اور گجرات کی لڑائیاں اسی ضلع کی حدود میں ہوئیں اور جنرل گف Gough کو جو کامیابی مؤخرالذّکر مقام پر ہوئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا پنجاب برٹش انڈیا میں مدغم کر لیا گیا۔ پاکستان کے قیام کے وقت اس کو مغربی پنجاب کی حدود میں شامل کیا گیا۔

شہر گجرات جس کے قریب یہ جنگ ہوئی تھی، اب ضلع کا صدر مقام ہے، اس کی آبادی ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۹۶۹۷ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ شہر کوفت گری damascended work کی صنعت کے لیے مشہور ہے اور یہاں گلی اور روغنی یا چینی کے برتنوں کا کاروبار بھی ہوتا ہے۔ یہاں طلبہ

اور طالبات کے کالج ہیں اور صوبائی سول سروس کے امیدواروں کو یہاں تربیت دی جاتی ہے۔ گجرات شہر میں حضرت شاہ دولا کا مزار ہے جو اپنے نیم دیوانہ درویشوں (جنھیں شاہ دولا کے چوہے کہتے ہیں) کے لیے مشہور ہے، جن کے سر بےحد چھوٹے ہوتے ہیں۔

[تقسیم ہند سے پہلے گجرات فرنیچر کی صنعت کے لیے بہت مشہور تھا۔ جس میں میزیں اور آرام کرسیاں خاص طور پر بہت پسند کی جاتی تھیں۔ Captain Daves نے لکھا تھا کہ یہاں کا فرنیچر بالخصوص کرسیاں پنجاب بھر میں منگوائی جاتی ہیں۔ شیشم کے بنے ہوئے پہیے وغیرہ یہاں خوب بنتے ہیں جو دوسرے شہروں میں منگوائے جاتے ہیں۔ گجرات کے قصبوں میں دروازوں اور کارنسوں پر کنھدائی کا کام نہایت عمدہ ہوتا ہے (پرانی طرز کے مکانوں میں اس کام کی مہارت کے نمونے اب بھی کہیں کہیں دیکھنے میں آتے ہیں) (دیکھیے *Punjab District Gazetteer*، جلد ۲۵ اے، لاہور ۱۹۲۱ء، ص ۱۰۳، ۱۰۵)۔ پیتل کے برتن بھی یہاں بہت عمدہ بنتے ہیں۔ ضلع گجرات کے شہر جلال پور جٹاں میں شالیں بہت اچھی بنتی ہیں، جو پاکستان بھر میں پسند کی جاتی ہیں۔ سوہنی مہینوال کا قصۂ عشق بھی سر زمین گجرات سے متعلق ہے، جسے متعدد شعرا نے نظم کیا جن میں ہاشم شاہ اور احمد یار خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مشہور شاعر غنیمت (م ۱۶۸۸ء) گجرات کے قصبۂ کنجاہ کا رہنے والا تھا۔ مثنوی نیرنگ عشق اس کی بہت مقبول یادگار ہے۔ اس مثنوی کے علاوہ وہ صاحب دیوان بھی تھا جو غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے]۔

مآخذ : (۱) V. A. Smith : *Early Hist. of India*، طبع دوم، اوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ص ۵۹ تا ۶۲؛ (۲) گزیٹیر ضلع گجرات، لاہور ۱۹۲۱ء؛ (۳) Ibbetson : *Outlines of the Punjab Ethnography*، کلکتہ ۱۸۸۳ء؛ (۴) Cunningham : *Hist. of the Sikhs*، لندن ۱۸۴۹ء۔

(M. Longworth Dames [و ادارہ])

⊗ تعلیقہ : ضلع گجرات میں سے شاہراہ اعظم گزرتی ہے جس کی وجہ سے آج کل (۱۹۷۸ء) لاہور، راولپنڈی اور پشاور تک لاری کے ذریعے سفر بڑا آسان ہے۔ ریلوے کی لائن بھی اس میں سے گزرتی ہے اور لالہ موسیٰ جنکشن سے برانچ لائن ملکوال جاتی ہے، جہاں سے ادھر خوشاب میانوالی اور اس سے نیچے ایک طرف سرگودہ کو ریل گاڑیاں جاتی ہیں۔ گجرات کے لوگ ذہین اور چاق چوبند ہوتے ہیں۔ جاٹوں کی مختلف اقوام کے علاوہ یہاں زیادہ تر گوجر اور اعوان لوگ آباد ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع کی آبادی ۱۳۲۶۰۱۲ تھی۔ فی مربع میل اوسط آبادی ۵۹۱ تھی اور اس لحاظ سے پاکستان میں اس کا ساتواں مقام تھا۔ تقسیم ملک کے بعد شہری آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مشہور قصبوں کی بھی خاصی تعداد ہے مگر بڑا شہر گجرات ہے جو ضلع کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں اس کی آبادی ۵۸۷۲۱ تھی۔ گجرات شہر میں متعدد بنک ہیں، بجلی کے پنکھے بنانے کے کئی کارخانے ہیں، چمڑا رنگنے کا ایک کارخانہ ہے، چینی کے عمدہ قسم کے ظروف بکثرت بنتے ہیں۔ صنعتی اور تجارتی لحاظ سے شہر کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ زنانہ اور مردانہ تعلیمی درسگاہیں ہیں۔ ایک صنعتی سکول بھی ہے۔ قصبۂ شادیوال میں کولمبو پلان کے تحت ۱۳۵۰۰ کلوواٹ بجلی تیار ہوتی ہے، جس سے ضلع کی صنعتی پیداوار بڑھ گئی ہے (عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا)۔

[ادارہ]

* **گجرات:** (بھارت) یہ لفظ اپنے وسیع معنوں میں اس سارے ملک یا علاقے کے لیے استعمال ہوتا ہے جہاں گجراتی زبان بولی جاتی ہے، محدود معنوں میں جو صحیح بھی ہیں، یہ نام اس وسطی میدان سے منسوب ہے جو دریاے نربدا کے شمال میں خلیج کچھ اور کاٹھیاواڑ کے مشرق میں واقع ہے .

گجرات کے میدان کے شمال میں صحراے مار واڑ ہے اور مشرق میں ان بلوری پہاڑیوں کا سلسلہ ہے جو کوہ آبو کے جنوب مشرق سے شروع ہو کر وندھیاچل کے مغربی بڑھے ہوے حصوں سے جا ملتی ہیں۔ وسطی علاقے میں رسوبی زمینیں ابھی حال ھی میں بنی ہیں اور یہ علاقہ ہندوستان میں سب سے زیادہ زرخیز علاقوں میں سے ایک ہے ۔ یہاں کی خاص زراعتی پیدوار کپاس ہے .

جب ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار تھا تو علاقۂ گجرات میں صرف وھی علاقہ شامل نہ تھا جسے اس زمانے میں سورٹھ کہتے تھے، بلکہ سورت تک کا سارا ضلع اسی میں شامل تھا اور جنوب کی جانب بمبئی بھی اسی میں تھا۔ مشرق میں ایک حصہ خاندیس اور مالوے کا ، اور راجپوتانے کا جنوب مغربی گوشہ ۔ انہل واڑا کے گرد شمال میں شامل تھا ۔ مسلمانوں کو اس علاقے کا علم اس وقت ہوا جب ۱۰۲۴ء میں سلطان محمود غزنوی ملتان سے انہل واڑا پہنچا اور وھاں جا کر سومناتھ کے مشہور مندر کو جو سورٹھ کے جنوب مشرق میں ساحل سمندر پر واقع تھا، مسمار کیا ۔ ۱۱۷۸ء میں شہاب الدین کو انہل واڑا میں زک اٹھانا پڑی لیکن ۱۶ سال کے بعد دہلی کے نائب السلطنت قطب الدین ایبک نے اس ہزیمت کا بدلہ لیا ۔ اس سے پوری ایک صدی کے بعد الغ خان نے اس سر زمین پر قبضہ کر لیا ۔ یہ شخص سلطان علاء الدین خلجی کا ایک سپہ سالار تھا۔ ۱۳۴۷ اور ۱۳۵۱ء کے درمیانی عرصے میں سلطان محمد تغلق نے سندھ سے گجرات کے علاقے پر کئی یلغاریں کیں اور آخر الامر وھیں فوت بھی ہو گیا ۔ اس کے جانشین سلطان فیروزشاہ نے اس ملک میں اپنا اقتدار قائم کیا، جو اس زمانے سے برابر مسلمان والیوں کے ماتحت رہا ۔ ان حکمرانوں میں سے ایک کا نام ظفر خان تھا جو گجرات میں خودمختار حکمران بن گیا اور جس نے مظفر خان کا لقب اختیار کیا ۔ یہ اس وقت ہوا جب دہلی کی مرکزی حکومت کو تیمور نے کچل کر رکھ دیا تھا ۔ یہ حکمران ایک سپہ سالار تھا ۔ اس نے اپنے عہد میں سومنات کو تیسری مرتبہ تباہ کیا اور ایدر ، دھار اور مانڈو کو بھی مطیع و منقاد کر لیا ۔ اس نے شاہ دہلی کو بھی جونپور کے ابراھیم شرقی کے حملے سے بچایا ۔ اس کا پوتا احمد اوّل اس کا جانشین ہوا جس نے ۱۴۱۳ء میں احمد آباد بسایا ۔ ان حکمرانوں نے مختلف مواقع پر چمپانیر، جُونا گڑھ ، ایدر ، چتّوڑ اور کچھ پر حملے کیے اور اپنی طاقت بہت کچھ بڑھالی لیکن ان کے خاندان کے زوال کے قریب انھیں ترکوں اور پرتگیزوں نے بے حد تنگ کیا ۔ ۱۵۷۳تا۱۵۷۰ء میں شہنشاہ اکبر نے اس ملک پر حملہ کیا اور وہ بنفس نفیس احمد آباد، بڑودہ کھنبایت (Cambay) اور سورت تک آیا ۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر مرھٹوں کے عروج کے زمانے تک یہ ملک شاھان دہلی کے مأمور کردہ والیوں کے زیرنگین رہا ۔ اس کے بعد انگریز آ گئے ۔ انھوں نے ملک کے اس حصے میں مسلمانوں کے اقتدار کو بالکل ختم کر دیا ۔ اس حصۂ ملک کا مالی بندوبست مشہور و معروف وزیر مالیات ٹوڈرمل نے کیا تھا ۔ اس علاقے کے مشہور ترین والیوں میں سے یہ تھے : مرزا عزیز کوکلتاش جو اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا ؛ مرزا خان جو بعد میں خان خاناں کے جلیل القدر خطاب سے سرفراز ہوا ؛ شہزادۂ خرم جو بعد میں شاھجہان کے لقب سے بادشاہ ہوا

۱۶۱۸ تا ۱۶۲۲ء یہاں کا حکمران رہا۔ شہزادۂ اورنگ زیب ۱۶۴۴ء میں یہاں نائب السلطنت تھا اور اس کے بھائی داراشکوہ نے ۱۶۴۸ تا ۱۶۵۲ء یہاں حکومت کی ۔ اس کے بعد مراد شاہ ۱۶۵۴ تا ۱۶۵۷ء اس کا حاکم رہا ۔ ۱۶۵۹ء سے لے کر ۱۶۶۲ء تک مہاراجا جسونت سنگھ والی جودھ پور یہاں گورنر رہا ۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں مرھٹے روز بروز زیادہ باغی ہوتے چلے گئے اور اس کی وجہ سے حکومت کا زور دن بدن گھٹتا چلا گیا اور ملک میں انتشار پیدا ہو گیا ۔ ملک عنبر نے ایک مرتبہ سورت کو تاخت و تاراج کیا اور سیوا جی نے دو مرتبہ ۔ مسلمانوں نے پانی پت کی جنگ ۱۷۶۱ء کے بعد ایک مرتبہ احمد آباد پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے ۔ اتنے میں گائیکواڑ نے پیشوا سے الگ ہو کر انگریزوں سے شرائط طے کر لیں اور انگریزوں نے ۱۸۱۸ء میں علاقۂ گجرات کے اصلی بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا ۔

مآخذ : (۱) سکندر بن محمّد : مرآت سکندری، طبع بمبئی ۱۸۰۱ء؛ (۲) علی محمد خان : مرآت احمدی؛ (۳) میر ابو تراب ولی : تاریخ، طبع Dénison Ross، ۱۹۰۹ء؛ (۴) محمد بن عمر الغ خانی، ظفر الوالہ بمظفّر وآلہ، طبع Denison Ross، ۱۹۱۰ء؛ (۵) *Rás Mālā Hindoo Annals of the Province* : Forbes *of Goozerat*، ۱۸۵۶ء؛ (۶) Elliot : *Historians of India*، (۷) Bailey : *History of Gujarat*؛ (۸) بمبئی گزیٹیر (*Hist. of Gujarat*، ج ۱، حصہ ۱).

(H. C. FANSHAWE)

⊗ تعلیقہ : قدیم الایام سے برصغیر پاک و ہند کے ساتھ عربوں کے تعلقات چلے آتے ہیں اور اس کی وجہ بحیرۂ عرب اور خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ ساتھ عربوں کی جہاز رانی ہے۔ سید سلیمان ندوی اپنی تصنیف عرب و ہند کے تعلقات میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع یازدھم، مادۂ سنسکرت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مہاراجا اشوک نے اپنے کتبوں میں جس خروشتی رسم الخط کو استعمال کیا داھنی جانب سے لکھا جاتا تھا اور بظاھر کسی سامی زبان سے مأخوذ تھا ۔ اس قسم کے کتبات گجرات میں بھی تھے (عرب و ھند کے تعلقات، الٰہ آباد ۱۹۳۰ء، ص ۸ تا ۱۰) ۔ سیّد صاحب موصوف نے انھیں قدیمی تعلقات کی بنا پر قرآن مجید میں تین خالص ھندوستانی الاصل الفاظ ۔۔۔ مِسْک، زَنْجبیل، کافور کی نشاندھی کی ھے (کتاب مذکور، ص ۲۷) ۔ یہ لفظ عربوں کی ھندوستان سے تجارت کی قدامت پر دلالت کرتے ھیں۔ شروع ھی سے عرب تاجر گجرات میں آتے رہے تھے ۔ مؤرخ مسعودی (مروج الذھب، جلد اوّل، طبع لائیڈن، ص ۲۵۴) لکھتا ھے کہ جب وہ ۳۰۲ھ میں گجرات کی بندرگاہ کھمبایت [رك بآن] میں آیا تو یہاں کا راجا ھندو تھا اور مسلمانوں سے مذھبی معاملات پر بحث و مناظرہ کیا کرتا تھا ۔ محمد عوفی بھی اپنی جوامع الحکایات و لوامع الروایات میں ایک ھندو راجا کا ذکر کرتا ھے جس نے کھمبایت کی جامع مسجد میں ھندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر ھونے والے مظالم کے سلسلے میں حق رسی سے کام لیا تھا (دیکھیے جوامع کا انگریزی ترجمہ ۔ مطبوعۂ لنڈن ۱۹۲۹ء، ص ۱۸) ۔ سندھ پر عربوں کی حکومت تھی تو منصورہ سے کھمبایت تک آمد و رفت عام تھی۔ اس لیے سندھ اور گجرات سے مسلمانوں کا خاص تعلق رھا ہے۔ گجرات اور سندھ کا دنیا میں سب سے پہلا نقشہ ابن حوقل بغدادی نے ۳۳۴ھ / ۹۴۳ء میں تیار کیا تھا (نقشے کے لیے دیکھیے عرب و ھند کے تعلقات، فہرست مضامین ص ۲۶ کے بعد) ۔ مسلمانوں نے مسلسل صدیوں تک گجرات پر حکومت بھی کی۔ اس لیے عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ گجراتی زبان میں مخلوط ھو گئے، جنھیں وھاں کے ادیب اور

شاعر آج تک استعمال کرتے ہیں (دیکھیے ابو ظفر ندوی: تاریخ گجرات، طبع ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۳۳ تا ۳۵) ۔ گجرات کے لوگ اردو بھی بولتے ہیں ۔ تقسیم ملک کے بعد گجرات بھارت میں شامل ہوا البتہ گجرات کاٹھیاواڑ کی ریاستوں جونا گڑھ، مانودر اور مانگرول نے پاکستان [رک بآں] کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا تھا مگر بوجوہ اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا ۔ گجرات کی آب و ہوا صحت افزا ہے ۔ اوسطاً تقریباً ۳۰ انچ بارش ہوتی ہے ۔ یہاں گیہوں، باجرا، کپاس، چاول، آم اور امرود کی زیادہ پیداوار ہوتی ہے ۔ عقیق پایا جاتا ہے جو کھمبایت میں آ کر جلا پاتا ہے ۔

آغاز اسلام کے وقت سے مسلمان گجرات کاٹھیاواڑ میں عرب تاجروں کی قدیمی روش کے مطابق بسلسلۂ تجارت آ گئے تھے ۔ محمد بن قاسم کی آمد سے سندھ میں عربوں کی حکومت قائم ہو گئی اور پھر کوئی تین سو سال بعد محمود غزنوی کی فتوحات کا دور شروع ہوا اور وہ گجرات کاٹھیاواڑ تک پہنچا ۔ ۱۲۹۹ء میں علاءالدین خلجی نے یہاں مسلمانوں کے اقتدار کا آغاز کیا اور ۱۴۰۷ء تک یہاں خلجی اور تغلق گورنر حکومت کرتے رہے جن کا تقرر دہلی سے ہوتا تھا ۔ اس کے بعد ۱۵۷۳ء تک ان اطراف میں سلاطین گجرات کی حکومت رہی جو اصلاً گوجر [رک بآں] تھے اور مقامی گوجر آبادی سے انھیں نسلی مناسبت تھی ۔ ۱۵۷۳ء میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کی فتح گجرات کے بعد ۱۷۵۸ء تک یہاں مغل صوبیدار آتے رہے ۔ اس سال مرہٹوں نے مومن خان صوبیدار کو شکست دے کر احمد آباد پر قبضہ کر لیا اور یہاں مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا ۔ اگرچہ آغاز اسلام سے مسلمان یہاں پہنچ چکے تھے، لیکن ان کے اقتدار کا زمانہ کوئی چار سو ساٹھ سال بنتا ہے ۔ ان صدیوں میں مسلمانوں نے اپنی طرز کی تعمیرات وغیرہ سے گجرات کاٹھیاواڑ کا عام منظر بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا ۔ تہذیب و تمدن میں بنیادی قسم کے مستقل اثرات چھوڑے اور پرانی گجراتی زبان کی جگہ رائج الوقت گجراتی [رک بآں] کو فروغ دیا ۔ ان باتوں کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہے ۔ یادگاروں سے ایک قوم کے تمدن کا اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ اس لیے پہلے انھیں کا ذکر کیا جائے گا ۔

مسلمان جہاں پہنچے وہاں مساجد اور مقابر کی تعمیر شروع ہو گئی ۔ ابو ظفر ندوی تاریخ گجرات میں لکھتے ہیں کہ ۷۵۰ء کے قریب خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں سندھ کے گورنر ہشام بن عمر تغلبی نے گندھار (کاٹھیاواڑ) پر حملہ کیا اور بدھ مدرسے کی جگہ مسجد تعمیر کی ۔ یہ غالباً گجرات کی پہلی مسجد تھی جو عربوں نے تعمیر کرائی ۔ ۹۱۵ء میں ابو الحسن علی مسعودی گجرات میں آیا ۔ راجا ولبھ رائے کی حکومت تھی جس کا دارالخلافہ مانکھیر تھا ۔ وہ لکھتا ہے کہ اس راجا کے ملک میں مسلمانوں کی مسجدیں ہیں ۔ ۹۵۱ء میں ابو اسحٰق ابراہیم اصطخری ہند پہنچا ۔ وہ اس راجا کے شہروں میں جامع مسجدوں کا ذکر کرتا ہے اور تاسہل، سنان، صیمور اور کھنبایت [رک بآں] کا خاص طور پر نام لیتا ہے ۔ ابن حوقل بغدادی ۹۷۶ء میں آیا ۔ وہ بھی اصطخری کے بیان کی تائید کرتا ہے ۔ بھروچ میں ایک وسیع اور عظیم جامع مسجد سنگین ۴۵۸ھ/۱۰۶۵ء میں تعمیر ہوئی جب کہ یہاں کوئی اسلامی سلطنت نہ تھی ۔ ۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء میں اس شہر میں ایک مدرسہ قائم ہو چکا تھا جو بعد میں مولانا اسحٰق کے مدرسے کے نام سے مشہور ہوا اور کوئی ۱۹۲۰ء میں آ کر ختم ہوا ۔ سومنات، یعنی دیوپٹن میں منگرولی شاہ کا مقبرہ ہے جہاں دھوم دھام سے عرس منایا جاتا ہے ۔ یہ بزرگ اصلاً

عراقی تھے ۔ منگلور آئے اور وہاں سے سومنات کے مسلمانوں تاجروں کی آبادی میں آ کر رہنے لگے ۔ کہتے ہیں انھوں نے محمود غزنوی کو خط لکھا تھا کہ سومنات آ کر مسلمانوں کو مختلف مصائب سے نجات دلائے ۔ منگرولی شاہ کے مقبرے میں کئی قبریں ہیں ۔ سلطان شمس الدین اِلْتُتمِش کے زمانے میں بھی گجرات پر حملہ ہوا اور ایک مسجد کی بنا قائم ہوئی۔ جوناگڑھ میں مائی گھڑونچی کی مسجد ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء میں تعمیر ہوئی تھی جو اب شکستہ حالت میں ہے ۔ ان کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت شروع ہونے سے پہلے مسجدوں، مدرسوں اور مقبروں کی تعمیر کا آغاز گجرات کاٹھیاواڑ میں ہو چکا تھا اور یہاں کے معاشرے میں مسلمانوں کے تمدنی اور تہذیبی اثرات پھیلنے لگ گئے تھے ۔

جمادی الاولی ۶۹۹ھ / فروری ۱۲۹۹ء میں علاءالدین خلجی نے گجرات فتح کیا اور سلطان نے اپنی طرف سے ایک ناظم گجرات مقرر کیا، جو ۱۳۰۰ سے ۱۳۱۶ء تک وہاں رہا ۔ اس وقت سے اس علاقے میں دہلی کا اقتدار شروع ہو گیا ۔ بعد میں خلجیوں اور تغلقوں کے دور میں لگاتار دہلی سے ناظموں کا اسی طرح تقرر ہوتا رہا ۔ نئی عمارات تعمیر ہوئیں اور جس جدید فن تعمیر کا یہاں ارتقا ہوا وہ ہندوستان کے فنون لطیفہ کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ گجرات کا علاقہ جب سلطنت دہلی میں شامل ہوا تو علاءالدین خلجی کے ماتحت حسنِ اتفاق سے دہلی کا فن تعمیر اپنے کمال کا اظہار کر چکا تھا ۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ اسی سلطان نے تعمیر کرائی تھی ۔ دہلی سے جو معمار گجرات میں آئے انھوں نے دیکھا کہ ایک عجیب و غریب قسم کا حسین و جمیل فن تعمیر یہاں رائج ہے جس میں بڑی توانائی پائی جاتی ہے۔ جن ہندو معماروں نے کسی زمانے میں سومنات اور کوہ آبو وغیرہ کے مندر بنائے تھے ان کی اولاد اس فن میں ان دنوں کم درجے کی مہارت نہیں رکھتی تھی ۔ فاتحین نے ان ہندو معماروں کو بھی اپنے شاہی معماروں کے ساتھ نئی عمارتیں بنانے کا کام سپرد کیا ۔ اس طرح اسلامی روایات مقامی فن تعمیر میں شامل ہو گئیں ۔ اس لیے خلجیوں کے فن تعمیر میں جو آہنگ و تناسب اور ذوق کا کمال پایا جاتا تھا وہ شروع ہی میں یہاں کے فنی تصورات میں بنیادی حیثیت اختیار کر گیا اور فن تعمیر میں ایک جدید مکتب کا آغاز ہوا جو بعد میں سلاطین گجرات کے زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ۔ خلجی اور تغلق سلاطین کے عہد میں گجرات کے اس جدید فن تعمیر میں جو تبدیلی رونما ہوئی وہ اس عہد کے آثار سے نمایاں ہے (*A History of Gujrat* : Commissariat، ج ۱، انڈیا ۱۹۳۸ء، ص ۶۲، ۶۳).

الپ خان گورنر گجرات (۱۳۰۰—۱۳۱۶ء) نے انہل واڑا پٹن کے قدیمی شہر میں سنگ مرمر کی عالی شان خوشنما اور وسیع جامع مسجد بنائی جس کے ستونوں کی اتنی کثرت تھی کہ شمار نہیں ہو سکتے تھے ۔ اس گورنر نے ڈڑی کے قلعے کو اہتمام سے تعمیر کرایا اور اس کے عہد میں پٹن میں سرور نامی ایک امیر نے ایک تالاب بنوایا جو اب بھی اس کے نام سے مشہور ہے (ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۳۳۶، ۳۳۸، ۳۴۰) ۔ پتلاد ضلع بڑودہ نزد کھنبایت میں اس گورنر کے زمانے میں ایک مسجد تعمیر ہوئی جو برباد ہوئی تو اس کا کتبہ جس پر رمضان ۷۱۳ھ/دسمبر ۱۳۱۳ء کی تاریخ کندہ ہے، اس شہر میں واقع بابا ارجن شاہ کے مقبرے میں منتقل ہو گیا ۔ شاہ صاحب کی تاریخ وفات رجب ۶۳۳ھ/مارچ ۱۲۳۶ء ہے۔ مقبرے کا کتبہ سنگ مرمر کی سل پر خوبصورت خط نسخ میں لکھی ہوئی عربی میں موجود ہے۔ بابا ارجن شاہ کے مقبرے

میں ۷۲۳ھ / ۱۳۲۳ء کا فارسی اور سنسکرت دو زبانوں میں کتبہ ہے جو پہلے تغلق سلطان کے صوبۂ گجرات پر تسلط کی یادگار ہے۔ اس کتبے سے پتا چلتا ہے کہ مزار کے لیے کنویں کے ساتھ جاگیر عطا ہوئی تھی۔ پتلاد کے ان کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں گجرات میں عربی اور فارسی کا رواج ہو چکا تھا وہاں سنسکرت بھی استعمال ہو رہی تھی۔

کھنبایت [رکّ بآن] میں علاءالدین خلجی کے عہد کا امیر اختیار الدولہ ''بحربک'' شہید کے سنگ مرمر کے تعویذ پر عربی زبان میں ۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء کا خط نسخ میں کتبہ ہے۔ کھنبایت کی جامع مسجد سلطان محمد بن تغلق کے عہد کے پہلے سال، یعنی ۱۳۲۵ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہ اپنے عمدہ تناسب، وسیع داغ بیل اور کھلے پیش منظر کے لحاظ سے ممتاز ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کے اثرات گجراتی اسلوب تعمیر پر مرتب ہوے ہیں۔ مسجد کے تین اطراف میں ستونوں والی غلام گردشیں ہیں۔ درمیانی محراب کے اوپر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ اس کا گنبد کلاں منقش ہے۔ صحن میں سامنے وضو کے لیے بڑی آراستہ مسقف جگہ ہے۔ جامع مسجد کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا دو سقفی عمر بن احمد الکزیرونی (م ۱۳۳۳ء) کا مقبرہ ہے جس کا گنبد گر چکا ہے۔ نیچے دو خوبصورت قبریں ہیں جن پر آیات قرآنی اور کلمۂ طیبہ کندہ ہیں۔ کھنبایت کی عیدگاہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ۱۳۸۱ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کا کتبہ سفید سنگ مرمر پر ہے۔ لوگ اب بھی یہاں عید کے روز جمع ہوتے ہیں۔ ابن بطّوطہ یہاں ۱۳۴۲ء میں آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ کھنبایت کے تمام دولت مند سوداگروں کے گھروں کے ساتھ مساجد ہیں۔ اس نے بعض سوداگروں کے نام بھی لکھے ہیں۔ وہ کاٹھیاواڑ کی بندرگاہ گوگھا میں بھی گیا اور ایک پرانی مسجد میں نماز ادا کی۔ اس نے یہاں حیدری فقیروں کا ایک گروہ دیکھا۔

بھڑوچ کی جامع مسجد سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی۔ چھت پر منبت کاری کی گئی ہے اور قسم قسم کے شاندار نقش و نگار ہیں۔ تمام برصغیر میں اس سے بہتر مزین سقف نہیں ملتی۔ درمیانی محراب کے اوپر آیات و احادیث درج ہیں۔ یہ کھنبایت کی جامع مسجد سے چھوٹی ہے، لیکن اسلامی ہندی فن تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ یہاں کی عیدگاہ ۱۳۲۶ء میں تعمیر ہوئی تھی اور سب سے پرانے اسلامی آثار قدیمہ میں سے ایک ہے۔ گجرات میں اپنی قسم کی یہ سب سے نفیس عمارت ہے۔ منبر بلند ہے اور دروازہ بڑا دلکش۔ بھڑوچ کی عیدگاہ اور کھنبایت کی جامع مسجد تعمیر کرانے والا ایک ہی شخص ملک الشرق فخر الدولہ والدین محمد بوتماری تھا۔

دھولکا نزد احمد آباد میں بھی اس عہد کی بڑی خوبصورت مسجد ہے جو ۱۳۳۳ء میں تعمیر ہوئی تھی اور ہلال خان قاضی کی مسجد کہلاتی ہے۔ باقی گنبدوں کے مقابلے میں اس کا درمیانی گنبد سات فٹ زیادہ بلند ہے۔ اس کے نیچے چھوٹے چھوٹے ستون بنائے گئے ہیں جن کی درمیانی جگھوں کو سنگتراشی کر کے آرائشی کام سے پُر کیا گیا ہے۔ مسجد کے ایک طرف عورتوں کے لیے پردے کا انتظام ہے۔ درمیانی دیوار مشبّک ہے۔ اس کی اپنی محراب اور الگ دروازہ ہے۔ اس کی سطح باقی مسجد سے تقریباً تین فٹ بلند ہے۔ مسجد کی تمام محرابیں سنگ مرمر کی ہیں اور سنگتراشی کا کام بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ چھت کے تختوں کی تراش خراش بھی نفاست سے کی گئی ہے۔ مسجد کا منبر سنگ مرمر کا ہے جس پر اہرام نما سقف ہے۔ منبر کی سیڑھیوں کے پہلوؤں پر مربع تختے ہیں جن پر ہندسی اشکال بنی ہوئی ہیں۔ یہ برصغیر کے انتہائی خوبصورت

منبروں میں سے ایک ہے ۔ مسجد کے مینار نہیں ۔ ان کے بجائے درمیانی محراب کے دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے برج ہیں ۔ مشرق کی طرف سے صحن میں داخل ہونے کے لیے ۳۲ ستونوں پر قائم خوبصورت غلام گردش ہے ۔ مسجد سے ملحقہ یہ انتہائی فنکارانہ تعمیر ہے ۔ مسجد کا کتبہ درمیانی محراب کے قریب ہے ۔ اس کے معمار کا نام عبدالکریم لطیف تھا ۔ دھولکا کی ایک مسجد کا نام تنکا مسجد ہے، جو فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ۱۳۶۱ء میں تعمیر ہوئی تھی ۔ اس میں زینت و آرائش کا کام اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا پندرھویں صدی عیسوی میں احمد شاہی سلاطین کی بنوائی ہوئی مسجد میں ہے ۔ تنکا مسجد میں عربی اور فارسی میں کچھ کتبے موجود ہیں ۔

منگلور (سورتھی) میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ایک پر شکوہ جامع مسجد ۱۳۸۳ - ۱۳۸۴ء میں بنی تھی ۔ یہ کاٹھیاواڑ کی نفیس ترین مسجد شمار ہوتی ہے ۔ میناروں کے بغیر یہ ایک وسیع عمارت ہے ۔ صحن کے ارد گرد غلام گردش ہے اور درمیان میں سیڑھیوں والی باولی ہے ۔ شہر کے باھر مسجد رحمت ہے جو ۱۳۸۲ - ۱۳۸۳ء میں تعمیر ہوئی تھی ۔ ۱۳۸۶ء میں بننے والی ایک راولی مسجد بھی ہے ۔ ۱۳۹۰ء میں یہاں حصن سنگین حصار، بھی تعمیر ہوا تھا ۔ ۱۳۹۷ - ۱۳۹۸ء میں شہر کے ارد گرد دیوار بنائی گئی تھی جس کا کتبہ موجود ہے ۔ یہاں سیدنا سکندر (م ۸۲۰ھ/۱۴۲۱ء) کا مزار ہے جو اوچ (بہاولپور) کے مخدوم جہانیاںؒ [رک باں] کے مرید تھے ۔ ان کے تبرکات اب بھی موجود ہیں جنھیں وہاں کے مسلمان مقدس سمجھتے ہیں ۔ سید صاحب فیروز شاہ تغلق کی افواج کے ساتھ کاٹھیاواڑ آئے تھے ۔ ایک گاؤں ان کی خانقاہ کے لیے عطا ہوا جس کا نام مخدوم پور پڑ گیا ۔ سادات منگلور ان کی اولاد میں سے ہیں ۔ سید سکندر کی زندگی میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت منگلور تشریف لائے تھے اور ایک مسجد کی بنیاد رکھی گئی تھی (ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، ص ۱۷، ۳۲، ۱۹۴، ۴۲۰) ۔ موضع مالن علاقۂ پالن پور میں محمد تغلق کے عہد میں سنگ سفید سے ایک جامع مسجد تیار ہوئی تھی۔

مندرجۂ بالا کوائف سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ خلجیوں اور تغلقوں کے زمانے میں گجرات کے شہروں میں مساجد کے حسن میں کیسے جمالیاتی عنصر کا اضافہ ہوا تھا، کس طرح نئے کنویں بننے لگے تھے، ملک کی مدنی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہو رہے تھے اور وھاں کی زبان کس قسم کے نئے ذخیرۂ الفاظ کو اپنے اندر جگہ دے رھی تھی ۔ اب ہم سلاطین گجرات کے زمانے کے آثار کا مطالعہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ انھوں نے اس ملک کو آراستہ کرنے کے لیے کیا کچھ کیا ۔

۱۴۰۷ء سے سلاطین گجرات کا زمانہ شروع ہوتا ہے جو ۱۵۷۳ء تک رہا ۔ گجرات کا پہلا سلطان مظفر شاہ تھا جو اگرچہ ۱۳۹۲ء سے یہاں بطور صوبیدار کام کر رہا تھا مگر اس نے اعلان آزادی ۱۴۰۷ء میں کیا اور اس طرح اس سنہری دور کا آغاز ہوا جو تاریخ گجرات میں ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ یہ سلاطین نسلاً گوجر تھے ۔ سلطان کے والد نے محمد تغلق کے عہد میں اسلام قبول کیا تھا اور دہلی دربار میں وجیہ الملک کا خطاب پایا تھا ۔ اس لیے گجرات کے گوجر ان کی اپنی نسل کے لوگ تھے اور سلاطین اپنے آپ کو غیر ملکی تصور نہیں کرتے تھے ۔ انھوں نے اپنی عظمت کے ایسے نشانات باقی چھوڑے ہیں کہ پانچ صدیوں سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی آج اہل عالم انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں ۔ انھوں نے نئے شہر تعمیر کرائے، فصیلیں

بنوائیں، مضافاتی آبادیوں کا سلسلہ قائم کیا، حوض، باؤلیاں اور جھیلیں بنیں، محل تعمیر ہوے، عالیشان مسجدیں بنوائی گئیں، مقبرے بنوائے گئے اور فنِ تعمیر اپنے کمال کو پہنچا ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مقبروں کی تعمیرات بھی فرح بخش تھیں ۔ صرف دریا خان کے مقبرے واقع احمد آباد کی فضا غم انگیز ہے ۔ ان تمام جدید کارناموں کی وجہ سے ملک بھر کے نقشے میں بڑی خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی ۔ احمد شاہ اول کا عہد (۱۴۱۱ـ۱۴۴۲ء) اس لحاظ سے بڑی شہرت رکھتا ہے، لیکن محمود بیگڑے کا عہد (۱۴۵۸ـ۱۵۱۱ء) سنہری زمانہ کہلانے کا مستحق ہے ۔ اس کے بعد ہر قسم کی روایات تنزل پذیر ہو گئیں ۔ بعد کے ایام میں یہاں عشرت گاہیں بنیں ۔ ان میں جدت تو تھی، لیکن عہدِ عروج والی علوشان مفقود تھی ۔ اپنے مقام پر ان کا بھی ذکر کیا جائے گا۔

احمد نگر (موجودہ نام ہمت نگر) میں احمد شاہ اول نے قلعہ تعمیر کرایا ۔ اس شہر میں قاضی کی باؤلی تاریخی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس میں دو کتبے ہیں ۔ ۱۴۱۷ء کا عربی میں ہے اور ۱۵۲۲ء کا دیو ناگری میں ۔ بعد میں اساروا اور ادلج میں بھی باؤلیاں بنیں، لیکن ان کا نقشہ مختلف تھا ۔ احمد نگر میں نولکھ کنڈ کی عمارت بڑی دلچسپ ہے ۔ یہ دریاے ہتھ منی کے کنارے پر زیر زمین پتھر کا محل ہے جس کے درمیان پانی کا ایک گہرا تالابچہ ہے ۔ محل کے دو طرف مسقف رستے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی دور میں قلعے کی خواتین ایک زیر زمین رستے کے ذریعے دریا کی طرف اس کنڈ میں جایا کرتی تھیں ۔ گرمی کے موسم کے لیے یہ ایک ٹھنڈی جگہ تھی مگر اب کوئی نہیں جاتا ۔ قلعے سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو سلطان احمد شاہ کے بھائی یا بیٹے نے بنوائی تھی ۔ فن مقامی احمد آبادی ہے، کھڑکیوں کے چوکھٹوں میں سنگتراشی سے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔

احمد آباد کا شہر سلطان احمد شاہ کی غیر فانی شہرت کا موجب ہے ۔ انہل واڑا پٹن چھے صدیوں تک گجرات کا دارالحکومت رہا تھا ۔ سلطان نے ۱۴۱۱ء میں اپنے مرشد شیخ احمد کھتوؒ کے کہنے پر دریاے سابرمتی کے مشرق میں اساول کے پرانے قصبے کے قریب احمد آباد تعمیر کرا کے اسے اپنا دارالحکومت بنایا ۔ احمد نام والے چار پاکباز اور نیک سیرت اشخاص یعنی شیخ احمد کھتوؒ، سلطان احمد شاہ، قاضی احمد جدؔ اور ملک احمد نے اس کی چار حدود قائم کیں ۔ ۱۴۱۳ء میں یہاں بھدرا کا قلعہ تعمیر ہوا جس کے دو برج لنڈن ٹاور کی قسم کے ہیں ۔ قلعہ مربع شکل کا ہے جس کے کئی دروازے ہیں ۔ اس میں دو مسجدیں ہیں ۔ ایک جنوب مغربی کونے میں ہے جو احمد شاہ نے بنوائی تھی ۔ دوسری شمال مشرقی کونے میں سیدی سید کی خوبصورت مسجد ہے جو اکبر کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی ۔ عہد عالمگیری کے صوبیدار محمد امین خان کا روضہ بھی قلعے کی چار دیواری کے اندر ہے ۔ مغلیہ دور میں کابل اور قندھار کے بعد یہ سب سے مضبوط قلعہ شمار ہوتا تھا ۔ محمود بیگڑے نے ۱۴۸۷ء میں شہر کے ارد گرد فصیل بنوائی جس کا محیط چھے میل ہے، ۱۸۹ برج ہیں اور چھے ہزار کنگرے ۔ اس میں پختہ اینٹیں استعمال ہوئی ہیں اور اس کی تعمیرات مضبوطی اور بلندی کے لحاظ سے دہلی اور شاہجہان آباد کی عمارتوں کا مقابلہ کرتی ہیں ۔ صدیاں بیت جانے کے باوجود اچھی حالت میں ہے ۔ ابتدا میں اس کے بارہ دروازے تھے مگر اب زیادہ ہیں ۔ تجارت کے لیے مانک چوک مشہور ہے ۔ سلاطین اور ان کے امرا نے یہاں بڑے شاندار تعمیری آثار چھوڑے ہیں ۔ ان کی وجہ سے سولھویں صدی عیسوی کے اختتام تک احمد آباد ہندوستان کے عظیم اور حسین ترین شہروں

میں شمار ہونے لگا ۔ ہفت اقلیم مصنفہ ۱۵۹۳ء میں امین احمد رازی اس شہر کی صفائی، رونق، آثار کی نفاست، شہر کی عظمت اور گلیوں کی ترتیب اور کشادگی کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ علی محمد خان مصنف مرآۃ احمدی اسے زینت البلاد اور عروس مملکت کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ سلطان محمود دوم (۱۵۳۷ - ۱۵۰۴ء) نے بارہ کوس کے فاصلے پر اپنا دارالحکومت محمود آباد تعمیر کرایا ۔ سڑک کے دو رویہ اس طرح آبادی تھی کہ معلوم ہوتا تھا دو نہیں ایک شہر ہے ۔ آب و ہوا کی موزونیت کی وجہ سے سنہری اور ریشمی منسوجات مثلاً کمخواب، مخمل، زربفت وغیرہ تیار ہوتے تھے جو اپنے رنگ اور حسن کی وجہ سے ہندوستان بھر میں بے مثال تھے اور ایران، توران، روم اور شام کو بھیجے جاتے تھے ۔ ابوالفضل بھی آئین اکبری میں اس کی خوشحالی کی تعریف کرتا ہے اور اس کی تین سو ساٹھ مضافی آبادیوں کا ذکر کرتا ہے جن میں سے چوراسی بڑی بارونق تھیں ۔ اس نے شہر کی ایک ہزار مساجد بتائی ہیں جن کے مینار اور کتبے شاندار تھے ۔ وہ کہتا ہے شہر کی زینت کا موجب بالخصوص اس کی مساجد ہیں۔ فرشتہ نے بھی کہا ہے کہ احمد آباد دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں سے ہے ۔

احمد آباد کے آثار میں سے پہلے احمد شاہ اول کی مسجد بھدرا تعمیر شدہ ۱۴۱۴ء کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ عربی میں کتبہ مرکزی محراب کے اوپر ہے۔ ملوک خانہ جو اب زنانہ گیلری کہلاتا ہے ۲۰ ستونوں پر قائم ہے۔ اس کے مشرق اور جنوب میں مشبک پردے ہیں۔ ملوک خانہ میں احمد شاہ کی عبادت کے لیے عالیشان شاہیانہ بنا ہوا ہے جس کے ستون آراستہ ہیں ۔

شہر کی جامع مسجد ۱۴۲۴ء میں تعمیر ہوئی ۔ یہ احمد آباد کی سب سے وسیع اور عظیم الشان عمارت ہے جو بارہ سال میں مکمل ہوئی تھی ۔ ''سہ دروازہ'' کے قریب ہے ۔ یہ برصغیر کی سب سے بڑی مساجد میں سے ہے ۔ ماہر نقادوں کی رائے ہے کہ یہ مشرق کی ایک انتہائی خوبصورت عمارت ہے۔ اس کا منظر مرعوب کن ہے۔ کتبہ عربی زبان میں ہے جو سب سے بڑی مرکزی محراب میں موجود ہے۔ اس میں حروف کو دیدہ ریزی سے بڑی رعنائی کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ کیا گیا ہے۔ ابتدا میں دو بلند مینار اس کی زینت کو دوبالا کرتے تھے جن کا تناسب اور ساتھ ہی نقش و نگار کا کام بڑا دلکش تھا ۔ جون ۱۸۱۹ء کے زلزلے میں یہ مینار گر پڑے اور مسجد اپنی ایک نمایاں فنی خصوصیت سے محروم ہو گئی ۔ ان کی چار چار منزلیں تھیں اور اگر ایک مینار میں جنبش نمودار ہوتی تھی تو درمیانی چھت کو متأثر کیے بغیر دوسرا بھی اسی طرح مرتعش ہو جاتا تھا ۔ یہی صفت احمد آباد کی سیدی بصر کے میناروں میں بھی پائی جاتی تھی جس کی تصدیق ہندوستان کے محکمۂ آثار قدیمہ کی ۱۹۰۵ء کی ایک رپورٹ سے ہوتی ہے ۔ یہ احمد آباد کی مساجد کا ایک محیر العقول وصف تھا ۔

جامع مسجد کا صحن وسیع ہے۔ درمیان میں پانی کا حوض ہے ۔ اس کے ارد گرد تین طرف مسقف غلام گردشیں ہیں پندرہ بڑے بڑے گنبد ہیں، دو سو ساٹھ خوبصورت مینار ہیں ۔ مسجد کے سامنے کے حصے کی ترکیب اس قدر قابل تعریف، متنوع اور اپنے حصوں کی لحاظ سے ایسی متناسب ہے کہ اس کی وسعت تمام عمارت کے حسن اور اس کے تأثر میں اضافہ کرتی نظر آتی ہے۔ تمام عمارت نفیس بھربھرے پتھر کی بنی ہوئی ہے، فرش معمولی قسم کے سفید سنگ مرمر کا ہے ۔ ایک کونے میں ملوک خانہ (شاہی گیلری) ہے جسے مشبک چلمن کے ذریعے علحدہ کیا گیا ہے اور جہاں پہنچنے کے لیے علحدہ

رستہ ہے ۔

سانک چوک میں احمد شاہ کا مقبرہ: جامع مسجد کے مشرق میں ایک رواق کے ذریعے اس احاطے میں پہنچتے ہیں جہاں احمد شاہ کا مقبرہ ہے ۔ روضہ گنبد والی ایک عظیم عمارت پر مشتمل ہے، جس کے درمیان میں ایک بڑا کمرہ ہے، کونوں میں چار مربع شکل کے کمرے ہیں، جن کے درمیان ستونوں والے عمیق برآمدے ہیں۔ بڑے کمرے کے وسط میں سلطان اعظم کی قبر ہے، جس کے پہلووں میں اس کے بیٹے محمد ثانی اور پوتے قطب الدین احمد شاہ ثانی کی قبریں ہیں اور تینوں خوبصورتی سے تراشیدہ سفید سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔ ساتھ والے کمروں میں جو قبریں ہیں، وہ بےشک و شبہہ شاہی خاندان کے افراد کی ہوں گی ۔ مقبرے کے ارد گرد کی تمام زمین میں قبریں ہیں ۔ احمد شاہ کے مقبرے کو ''بادشاہ کا حضیرہ'' کہا جاتا ہے ۔ اغلباً اس کی تعمیر جامع مسجد کے بعد احمد شاہ نے خود کرائی تھی ۔ اس کے مشرق میں ''رانی کا حضیرہ'' ہے جہاں اس خاندان کی بیگمات مدفون ہیں۔ سب سے اہم قبر بی بی مغلی کی ہے جو محمود بیگڑہ کی ماں تھی ۔ سفید سنگ مرمر کی اس قبر کے ساتھ سیاہ سنگ مرمر کی مرکی بی بی کی قبر ہے جو بی بی مغلی کی بہن تھی ۔ سیاہ قبر پر شروع میں سیپ کا جڑاؤ کام کیا گیا تھا ۔ دونوں قبریں فن تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہیں ۔ ان کی جزئی تزئین بڑی عمدگی سے کی گئی ہے ۔ دونوں بہنیں جام صاحب سندھ کی بیٹیاں تھیں۔

یہ عہد احمد شاہ اول کی مذہبی اور مقابر سے متعلق تعمیرات کا ذکر تھا ۔ سلاطین اور ان کے جانشینوں کے محلات کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا ۔ اس عہد کی غیر مذہبی عمارات کی یادگار صرف تِن دروازہ (سہ درہ) ہے جو جامع مسجد کی طرح شان اور تجمّل رکھتا ہے۔ اس کے حسن کا باعث اس کے کامل درجے کے متناسب قوسی دروازے ہیں جن کے درمیان اعلٰی درجے کے مزیّن پشتے ہیں۔ تِن دروازہ کی موٹائی ۳۷ فٹ ہے اور اونچائی ۴۲ فٹ سے کچھ زیادہ ۔ مسطح چھت ہے جس کے دونوں طرف تین شہ نشین کھڑکیاں ہیں ۔ یہ ایک وسیع صحن کا رفیع الشان دروازہ تھا جسے میدان شاہ کہا جاتا تھا اور برجوں کے قریب قلعے کے اصلی دروازے تک چلا جاتا تھا ۔ اس کے اطراف میں کھجور اور ترنج کے درختوں کی قطاریں تھیں ۔

احمد آباد کی اسلامی تعمیرات برصغیر کی فنون لطیفہ کی تاریخ میں بڑا اہم مقام رکھتی ہیں ۔ مسلمانوں نے یہاں کی جین مت کی تعمیرات سے بہت کچھ اخذ کیا اور پھر اپنے ملّی فکر و فن کو بروے کار لا کر اس میں شاندار اضافہ کیا ۔ تعمیرات کے لیے پتھر زیادہ تر احمد نگر (ھمت نگر) اور اجمیر وغیرہ سے حاصل کیا گیا تھا ۔ احمد آباد کی مساجد کا فنی حسن تین خصوصیات رکھتا ہے: عمارت میں روشنی پہنچانے کا عجیب و غریب طریقہ ، حسیں و جمیل مینار ، اور پتھر کے کٹاو کا نفیس آرائشی کام ۔ کھڑکیوں کا ایک پیچیدہ نظام تھا جس کے ذریعے منعکس روشنی نیچے سے اندر جاتی تھی اور بارش بھی داخل نہیں ہوتی تھی ۔ یہ طریقہ برصغیر میں اور کہیں رائج نہ تھا اور گجرات کے معماروں نے خود ایجاد کیا تھا ۔ جہاں تک میناروں کا تعلق ہے سلطان احمد شاہ کی مسجد میں ان کی حیثیت کنگروں سے زیادہ نہ تھی مگر ایک صدی کے اندر اندر بعد کی مساجد میں ان کے نقشے اور جزئی تزئین میں ایسا کمال درجے کا حسن پیدا ہو گیا کہ قاھرہ میں بھی ان کی مثال نہیں ملتی ۔ تعمیرات کی آرائش اور تزئین کے لیے سنگتراشی میں بھی ماہرین فن نے مختلف مدراج میں سے گزرتے

ہوے جو خوشنما نمونے بنائے (مثلاً مرزا پور میں ملکہ کی مسجد میں) انھیں بھی دنیا بھر میں اپنی قسم کے ہر زمانے کے فنی نمونوں میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے ۔ البتہ اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ عالمگیر شہرت والی سیدی سید کی مسجد میں پچھلی طرف کھڑکیوں کے نفیس و نازک نمونے برصغیر کے لیے فی الواقع سرمایۂ افتخار ہیں ۔ ان امور کی بنا پر احمد آباد کا شہر زینت البلاد کہلاتا تھا ۔

سر کھیج نزد احمد آباد میں متعدد شاندار عمارات تعمیر ہوئیں ۔ شاہی خاندان کے روحانی پیشوا شیخ احمد کھتو کا یہاں مقبرہ ہے ۔ منتخب التواریخ میں ہے کہ جب ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے حملہ کیا تو شیخ صاحب نے باشندگان دہلی کی بیش بہا خدمات انجام دی تھیں ۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے احمد آباد کا شہر انھیں کے مشورے پر آباد ہوا تھا ۔ ان کا مقبرہ ۱۴۴۶ء میں سلطان قطب الدین احمد کے عہد میں مکمل ہوا ۔ ۱۰۰ فٹ مربع عظیم الشان مقبرہ ہے اور گجرات میں سب سے بڑا ہے ۔ اسے ایک بلند چبوترے پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں ایک طرف سے سولہ ستونوں پر قائم نفیس شہ نشین سے گزر کر پہنچا جاتا ہے ۔ بیرونی دیواروں پر تختے لگے ہوے ہیں اور پتھر کی بنی ہوئی مختلف نمونوں کی مشبک جعفری دار کھڑکیاں ہیں ۔ روضے کے اوپر بہت بڑا مرکزی گنبد ہے ۔ تابوت کو باقی اندرونی حصے سے جدا کرنے کے لیے خوبصورت نمونوں والے پیتل کے تختے استعمال کیے گئے ہیں ۔ مقبرے کے ساتھ ہی مسجد ہے ۔ فنی نمونے کے لحاظ سے یہ عجیب عمارت ہے اور موتی مسجد آگرہ کے بعد حسنِ سادہ کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں اس کی نظیر نہیں ۔ نہایت ہی پرسکون مقدس فضا ہے ۔ شیخ صاحب کے تقدس کے باعث سر کھیج کے لوگ یہاں دفن ہونا پسند کرتے تھے ۔ قبر گاہ میں میناروں کے بغیر چھوٹی سی خوبصورت قلندر مسجد ہے ۔ جن بارہ قلندروں نے احمد آباد کی تعمیر میں مدد کی تھی ان میں سے بابا علی شیر کا مقبرہ یہیں ہے ۔ اس جگہ روضوں اور تعمیرات کا ایک مربوط سلسلہ ہے ۔ غزالی مشہدی جیسے فاضل اور فصیح البیان صوفی کی قبر بھی یہیں ہے ۔ اکبر نے اسے ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا ۔

عبادت اور تسکینِ قلب کے لیے محمود بیگڑے کو سر کھیج کا مقام بڑا پسند تھا ۔ اس کا طویل عہد احمد آباد کے فن تعمیر کا سنہری زمانہ ہے ۔ سر کھیج میں اس نے کئی عمارتیں بنوائیں ۔ حرم اور محل کی تعمیر کرائی جو اب ویران کر دیے گئے ہیں، تاہم برآمدوں اور شہ نشینوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عمارتوں میں خنکی اور استراحت کو ملحوظ رکھا گیا تھا ۔ اس نے یہاں ساڑھے سترہ ایکڑ کی ایک خوبصورت جھیل بنوائی جس کے جنوب مشرق میں، شیخ احمد کھتو کے مقبرے کے سامنے، محمود بیگڑے نے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے مقبرہ تعمیر کرایا ۔ ایک قبر رانی راجبائی کی ہے ۔ بیگمات کی اور قبریں بھی ہیں ۔ فنِ تعمیر ہند اسلامی ہے ۔ اس تمام مربوط سلسلۂ تعمیرات کی وجہ سے یہاں بہت سے عالی شان آثار قدیمہ یک جا دیکھے جا سکتے ہیں ۔

حوضِ قطب : احمد آباد کے رائے پور دروازے سے جنوب مشرق میں ایک میل سے بھی کم فاصلے پر ہے ۔ سلطان قطب الدین نے تعمیر کرایا اور ۱۴۵۱ء میں مکمل ہوا ۔ ہندوستان بھر میں اس سے بڑا کوئی حوض نہیں ۔ یہ ۳۴ ضلعوں کی کثیر الاضلاع ہے، جس کا رقبہ ۷۲ ایکڑ ہے ۔ اردگرد سیڑھیاں ہیں ۔ پہنچنے کے لیے ڈھلان والے چھے رستے ہیں جن کے سروں پر بارہ بارہ ستونوں پر قائم

مربع تیے ہیں۔ جھیل کے درمیان میں جزیرہ ہے، جہاں باغ لگایا گیا تھا، جسے باغ نگینہ کہتے تھے ۔ ساحل سے جزیرہ اڑتالیس چھوٹی چھوٹی محرابوں پر بنے ہوئے پل سے ملا ہوا ہے ۔ غت منڈل کے نام سے وہاں فرحت منزل بھی ہے ۔ حوض قطب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ پانی کی نالی بھی فن کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس سے احمد آباد والوں کی جمال دوستی کا پتا چلتا ہے ۔ نالی کے دونوں سروں پر احمد آباد کی مسجدوں کے میناروں کی کرسیوں کی مانند پشتے ہیں اور ان کے ساتھ تراشیدہ پردے ہیں اور چھے فٹ قطر والے تین سوراخ ہیں جن کے کنارے بڑے خوبصورت ہیں ۔

سلک شعبان کا روضہ : تعمیر ۱۴۵۲ء، احمد آباد کے مشرق کو موضع رکھیال میں دو میل کے فاصلے پر سلطان قطب الدین احمد کے ایک معزز درباری کا روضہ ہے ۔ کتبہ فارسی میں ہے جس میں عربی کی آمیزش ہے۔ مقبرہ محفوظ حالت میں ہے۔ ملک شعبان کی قبر کے علاوہ اور قبریں بھی ہیں ۔ اس کے ساتھ باغ شعبان تھا جس میں درخت اور کنویں تھے ۔ روضے سے قریب ہی جھیل بھی تھی جو ملک شعبان نے بنوائی تھی ۔ احمد آباد سے رکھیال کی ان تمام عمارات تک ایک سڑک تھی جس کے دو رویہ درخت تھے۔

حضوری شاہ کی مسجد : احمد آباد میں ملک شعبان نے ۱۴۵۲ء میں تعمیر کرائی۔

وتوا کا مقبرہ : احمد آباد کے قریب ایک گاؤں میں سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں[ؒ] کے پوتے سید برہان‌الدین قطب عالم کا روضہ ہے ۔ ان کی وفات ۱۴۵۳ء میں ہوئی ۔ سید صاحب شاہان گجرات کے مرشد تھے ۔ محمود بیگڑے نے شاندار مقبرہ تعمیر کرایا ۔ اس میں محرابیں ہی محرابیں ہیں اور گنبد بھی اوپر تعمیر شدہ محرابوں پر بنایا گیا ہے ۔ مقبرہ اب اچھی حالت میں نہیں۔ سید صاحب مرحوم کی یادگار یہاں ایک متحجّر لکڑی ہے جسے بڑے احترام سے دیکھا جاتا ہے ۔

عثمان پور میں مسجد اور مقبرہ : مضافات احمد آباد میں قطب عالم[ؒ] کے خلیفہ سید عثمان، خطاب شمع برہانی (م ۱۴۵۹ء) کا مقبرہ اور ان کی مسجد سلطان محمود بیگڑے نے تعمیر کرائے ۔ مسجد کے مینار بڑے خوبصورت ہیں۔ کاریگروں نے حسین و جمیل نقوش سے انہیں مزیّن کیا تھا۔

دریا خان کا روضہ : واقع احمد آباد، اینٹوں کی بہت بڑی عمارت ہے ۔ دہلی دروازے کے شمال میں ایک میل کے فاصلے پر ہے ۔ ایک رئیس دریا خاں نے تعمیر کرایا تھا ۔ مربع شکل کی بارعب عمارت ہے ۔ درمیانی گنبد ہے ۔ گنبد والے چوڑے برآمدے ہیں ۔ ہر طرف پانچ محراب‌دار رستے ہیں۔ دیواریں مضبوط ہیں۔ تمام عمارت محراب‌دار ہے ۔ یہ الف خان بھکائی کی دھولکہ والی مسجد کی مانند ہے جو غالباً اسی معمار نے بنائی تھی اور اب ویران ہے ۔ اس کی فضا غم انگیز ہے اور باقی مقابر کی طرح فرح بخش نہیں ۔

فتح جونا گڑھ کی یادگاریں : محمود نے چار سالہ جنگ کے بعد ۱۴۷۰ء میں کاٹھیاواڑ کو مکمل طور پر فتح کیا تو وہاں جونا گڑھ اور اپر کوٹ کے ارد گرد فصیل بنوائی جو کم از کم ۱۹۳۸ء تک بالکل صحیح حالت میں تھی ۔ علاوہ بریں اس نے اپر کوٹ کی چوٹی پر ایک مسجد بھی تعمیر کرائی جو اب بھی وہاں موجود ہے ۔ سلطان نے اس شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کیا اور بجا طور پر اس کا نام مصطفٰی آباد رکھا۔

خان جہاں کا مقبرہ : احمد آباد میں مانک چوک کے قریب ہے، خان جہاں جونا گڑھ کا آخری راجپوت حکمران تھا جس نے ایک بخاری بزرگ شاہ عالم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ۔ اس کی قبر پر

پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ آٹھ فٹ مربع کا یہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔

محمود آباد: محمود بیگڑے نے احمد آباد سے جنوب مشرق میں اٹھارہ میل کے فاصلے پر اپنے نام کی مناسبت سے نیا شہر تعمیر کرایا۔ دریا کے ساتھ مضبوط بند باندھے گئے۔ محل کے علاوہ خوبصورت عمارات اور وسیع باغات بنوائے گئے۔ بعد میں سلطان محمود سوم نے اسے اپنی سکونت کے لیے منتخب کیا اور اس میں ہرنوں کے لیے اپنا مشہور کھلا باغ بنوایا۔

سولیہ قلعہ: محمود بیگڑا نے مستطیل سطح مرتفع پر مشتمل پواگڑھ کی چوٹی پر پتھر کا قلعہ تعمیر کرایا۔ دروازے کا نام نقار خانہ ہے اور اوپر چڑھتے ہوئے چمپانیر کے اسلامی شہر کے کھنڈروں میں جامع مسجد نیلا گنبد، دیگر مسجدیں اور کئی حوض نظر آتے ہیں۔ گھنے جنگل قدرتی مناظر کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

محمد آباد: چمپانیر کے قدیم ہندو شہر کے قریب محمود بیگڑے نے ١٤٨٤ء میں نیا شہر آباد کیا۔ نام محمد آباد رکھا اور اسے شہر مکرم کا خطاب دیا۔ شہر کے ارد گرد فصیل بنائی جس کا نام جہاں پناہ تھا، قلعہ تعمیر ہوا، محل اور خوبصورت جامع مسجد کی تعمیر ہوئی۔ امرا نے بھی بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں۔ وسیع باغات تھے جن میں فوارے اور جھرنے تھے۔ آم اور صندل کے درخت لگوائے گئے۔ یہ شہر پچاس سال تک گجرات کا دارالخلافہ رہا، لیکن اب ویران ہو چکا ہے۔ اس ویران شہر کے مختلف تاریخی آثار دلکش اور قابل دید ہیں۔ جامع مسجد تو انتہائی خوبصورت فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس میں مرکزی گنبد کے نیچے ایک دوسرے کے اوپر ستونوں کی تین قطاریں ہیں، جن کے درمیان سنگتراشی کرکے بالا خانے بنائے گئے ہیں۔ مسجد کے فرش پر کوئی ١٧٢ ستون ہیں جنھیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ان پر گیارہ بڑے بڑے گنبد ہیں۔ اعلیٰ درجے کی جزئیات اور تزئین کے لحاظ سے مشرق کی تمام اسلامی عمارتوں کے ساتھ اس جامع مسجد کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مسجد ٩١٤ھ/١٥٠٨ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ محکمۂ آثار قدیمہ نے باقی مساجد کے ساتھ اس کی مرمت کرا دی ہے۔ ان میں نگینہ مسجد خالص سفید پتھر کی بنی ہوئی ہے اور بڑی خوبصورت ہے۔ ایک یک میناری مسجد بھی ہے۔

رسول آباد کی عمارات: احمد آباد سے جنوب کو ایک میل کے فاصلے پر رسول آباد ہے جسے اب سید شاہ عالم کے مقبرے کے باعث شاہ عالم کہتے ہیں۔ ان کے اور ان کی اولاد کے دو خوبصورت روضوں کے علاوہ مسجد اور جماعت خانہ ہے۔ دونوں روضوں کا نقشہ آنکھوں کو فرحت بخشتا ہے۔ شاہ عالم کا روضہ بڑا متناسب اور انتہائی خوبصورت ہے۔ روضے پر کتبے سے سال تعمیر ٩٣٨ھ/ ١٥٣١ء برآمد ہوتا ہے۔

حافظ خان کی مسجد: محمود بیگڑے کے ایک نامور امیر کی مسجد احمد آباد میں دہلی دروازے کے قریب ہے۔ میناروں پر خوبصورتی سے سنگتراشی کی گئی ہے۔ مسجد کتبے کے مطابق ٨٩٧ھ/ ١٤٩٢ء میں مکمل ہوئی۔

بی بی اچھوت کوکی کی مسجد: ١٤٧٢ء میں تعمیر ہوئی۔ احمد آباد کے شمال میں حاجی پور میں واقع ہے اور اس عہد کے فن تعمیر کا یہ عمدہ نمونہ ہے۔

باغ فردوس: احمد آباد سے مشرق میں چھے میل کے فاصلے پر سلطان بیگڑے نے لگوایا۔ ارد گرد دیوار تھی۔ آم کے علاوہ اور کئی قسم کے پھل دار درخت تھے۔ اس نے احمد آباد کے علاوہ مصطفیٰ آباد (جونا گڑھ) اور محمد آباد (چمپانیر) کے ارد گرد بھی

فصیلیں بنوائیں .

رانی روپ ستی کی مسجد : بی بی اچھوت کوکی اور رانی سپاری کی مسجدوں کی طرح یہ بھی بڑی خوبصورت مسجد ہے - میناروں پر آرائش کا کام (بالخصوص طاقچوں میں نقش و نگار) متنوع اور جمیل ہے - مسجد میں روشنی کے لیے کھڑکیاں بنائی گئی ھیں اور انھیں آنکھوں سے اوجھل رکھنے کے لیے جو چھجا بنایا گیا ہے، اس کا تاثر بڑا خوشگوار ہے .

باولیاں : (سیڑھیوں والے کنویں) : محمود بیگڑے کے زمانے میں احمد آباد کے شمال مشرق میں اساروا کی مضافاتی آبادی میں بائی حریر کا کنواں اور احمد آباد سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر شمال میں ادلاج گاؤں میں اس سے بھی زیادہ خوبصورت کنواں بنا - یہ ''واو'' کہلاتے ھیں - یہ جمیل اور پرشکوہ تھے اور خاص نقشے کے مطابق بنائے گئے تھے - سیڑھیوں کے درمیان ستون دار گیلریاں ھیں جن کی قطاریں گہرائی کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ھیں - ان پر اعلٰی درجے کے نقش و نگار ھیں - غربی ھند کے ان جیسے کنووں (یعنی باولیوں) کی دنیا میں مثال نہیں . بائی حریر کا کنواں ۱۴۹۹ - ۱۵۰۰ء میں بنا تھا - بائی حریر نے ایک مضافاتی آبادی حریر پور بھی بنوائی تھی اور وھاں مسجد بھی سیڑھیوں والے کنویں کے مغرب میں تعمیر کرائی تھی - اس کا روضہ بھی وھاں ہے .

رانی سبرائی (سپاری) کی مسجد : ۱۵۱۴ء میں تعمیر ھوئی - احمد آباد کے فنِ تعمیر کا یہ انتہائی خوبصورت نمونہ ہے - یہ مسجد سلطان محمود بیگڑہ کی بیوہ رانی سبرائی نے بنوائی تھی جو شاھزادۂ ابوبکر خان کی والدہ تھی - طول و عرض کم یعنی صرف ۴۸ × ۱۹ فٹ ھونے کے باوجود اسے احمد آباد کا نگینہ کہنا چاھیے - یہ اپنی قسم کی دنیا کی نفیس ترین عمارات میں سے ہے - میناروں کی ساخت بڑی عمدہ ہے - ان کے اندر سیڑھیاں نہیں ھیں - اذان کے لیے گیلری بھی کوئی نہیں - ان کی حیثیت خالصةً آرائشی ہے - مشرق و مغرب میں کسی ایسی عمارت کا تلاش کرنا مشکل ہے، جس کے مختلف حصوں میں اس قدر ہم آھنگی ھو . اور جس میں توازن، موزونیت اور تناسب آرائش مل کر اتنا شاندار اثر پیدا کر رہے ھوں - عمارت کا مختصر ھونا بھی اس کے لیے خوبی کا موجب ثابت ھوا ہے - نفاست سے تراشے ھوے سنگی اجزا اور منبت کاری کے نگینے کی طرح نقش و نگار چونکہ صنف لطیف کے حسن کی یاد دلاتے ھیں یہ کسی بڑی اور مردانہ عمارت میں اتنے فائدہ مند ثابت نہیں ھو سکتے تھے - کتبے میں معمول کے مطابق دیگر عبارات کے علاوہ رانی سبرائی کا نام اور سال تعمیر ۹۲۰ھ / ۱۵۱۴ء درج ہے - مسجد کے سامنے رانی کا مقبرہ ہے - یہ ایک خوبصورت عمارت ہے جس کے ارد گرد جالی دار دیواریں ھیں جو مقامی اسلوب کی نمائندگی کرتی ھیں .

۱۵۱۴ء تک احمد آباد میں عہد سلاطین کے فن تعمیر پر تبصرہ :شہر کی بنیاد ۱۴۱۱ء میں قائم ھوئی اور محمود بیگڑے کے زمانے تک اس کا فن تعمیر باقاعدہ ارتقا پذیر رہا - نشو و نما اور ارتقا کے اس دور میں جینی اور اسلامی عناصر کا امتزاج ھوا - ابتدائی مساجد میں، مثلاً بھدرا والی احمد شاہ کی مسجد میں دونوں عناصر کے امتزاج میں کامیابی نظر نہیں آتی، لیکن ۱۴۲۴ء میں جب جامع مسجد تعمیر ھوئی تو ان میں بڑی خوبی سے آھنگ و امتزاج پیدا ھو گیا - میناروں اور محرابوں کو چوڑے ھندووانہ بغلی رستوں کے ساتھ بڑی کامیابی کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے - اس صدی کے وسط میں تمام غیر ملکی اثرات سے کنارہ کشی اختیار کر لی گئی اور سرکھیج اور وتوا میں ھندو طرز کی عمارات بنیں - اسلامی عناصر بہت ھی کم تھے - ۱۴۶۵ء سے بعد محمود

بیگڑے کی حکومت کے اختتام تک ملی جلی طرز کی مساجد تعمیر ہوئیں ۔ ہندوانہ اور اسلامی عناصر کا امتزاج، مثلاً بی بی اچھوت کوکی کی مسجد (۱۴۷۲ء) میں، ایسا کامل ہے کہ امتیاز کرنا مشکل ہے ۔ ۱۵۱۴ء میں رانی سپاری کی مسجد بنی جسے احمد آباد کا نگینہ کہا جاتا ہے ۔ اس میں خالص ہندوانہ اثر ترک نہیں ہوا ۔ سولھویں صدی کے دوسرے عشرے کے بعد احمد آباد میں تعمیر ہونے والی عمارات کا فنی اسلوب پست ہو گیا ۔ گویا رانی سپاری کی مسجد کے بعد احمد آباد کے فن تعمیر کا تخلیقی دور ختم ہو گیا [رك بہ فن : تعمیر، ص ۸۲۴، ۸۲۵].

اس کے بعد اگرچہ فن انحطاط پذیر ہو گیا مگر عمارات پھر بھی بنتی رہیں ۔ ان میں سے بعض قابل تعریف تھیں، مثلاً چمپانیر کے قریب ھلول میں سلطان سکندر اور اس کے بھائیوں کا مقبرہ ۱۵۲۷ء میں بنا جس کے ستون نفیس ہیں اور پیش دہلیز خوبصورت ہے ۔ روضے بھی تعمیر ہوے ۔ احمد آباد میں سیدی سعید کی مسجد ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں بنی ۔ اس کی کھڑکیوں پر نقش و نگار پتھر کو تراش کر بنائے گئے ہیں ۔ اقلیدسی نمونے ہیں ۔ بیل بوٹے بڑے نفیس ہیں سارا کام اس طرح ہے جیسے یونانی یا قرون وسطی کے معماروں نے کیا ہے ۔ سلطان بہادر (۱۵۲۶ - ۱۵۳۷ء) نے بھڑوچ کی فصیل تعمیر کرائی اور خواجہ سفر نے ۱۵۴۰ء میں سورت کا قلعہ بنوایا ۔ ستمبر ۱۵۷۳ء میں سلطان مظفر ثالث کے زمانے میں اکبر نے گجرات کو فتح کر کے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا ۔ عہد مغلیہ میں یہاں کوئی قابل قدر عمارت نہ بنی، لیکن اس بیان کو ختم کرنے سے پہلے نامناسب نہ ہوگا کہ ایک عشرت گاہ کا ذکر کیا جائے ۔

سلطان محمود ثالث نے ۱۵۴۶ء میں دارالخلافہ محمود آباد میں منتقل کیا اور وہاں چھے میل کے رقبے میں آھو خانہ تعمیر کرایا ۔ اس کے ہر کونے میں خوشنما شہ نشین بنوائے جہاں عورتیں ایسی چیزیں بیچا کرتی تھیں جن کا تعلق آرائش حسن سے ہوتا ہے ۔ درخت کے تنوں کو مخمل و دیبا سے آراستہ کیا جاتا تھا اور ان کی شاخوں کو اطلس و کمخواب سے ڈھانپا جاتا تھا ۔ اس عمارت کے مزین گوشوں میں سلطان اپنی بیگمات کے ساتھ سکونت رکھا کرتا تھا ۔ اس باغ کی تفصیلات طبقات اکبری اور مرآۃ سکندری میں موجود ہیں ۔ یہ زوال کے آثار تھے ۔

عہد مغلیہ میں صوبیدار آتے رہے تا آنکہ مرھٹوں نے ۱۷۵۸ء میں احمد آباد پر قبضہ کر لیا ۔

لازماً مذکورۂ بالا تمام عمارتوں کے تہذیبی اثرات گجرات میں پھیلتے چلے گئے ۔ ان تعمیرات کے نام لوگوں کی زبانوں پر رواں تھے ۔ مساجد میں منبر و محراب اور مکتبوں سے دین اسلام اور اسلامی تہذیب کی تبلیغ ہو رہی تھی ۔ بود و باش اور تمدن و معاشرت میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ جس طرح عمارتوں میں جینی اثرات کے ساتھ اسلامی رجحانات دخیل کار ہوے اور ان کا بڑا لطیف امتزاج ہوا، رسوم و رواج کے لحاظ سے بھی ایک مشترکہ تمدن کی بنیاد پڑی ۔ گجرات میں جو لباس کمر تک پہنا جاتا ہے وہ مسلمانوں ھی کا تحفہ ہے ۔ عدالتی لباس بھی اسلامی تھا ۔ ایرانی روایات بھی مسلمانوں کا اقتدار قائم ہونے پر گجرات میں باقاعدہ پہنچتی رہیں ۔ اس لیے ایرانی خصوصیات بھی گجرات کے معاشرے میں رواج پذیر ہوئیں ۔ مسلمانوں کے زمانۂ اقتدار میں عربی اور فارسی زبانیں عام استعمال ہوتی تھیں ۔ عربی زبان تو عرب تاجروں کی وجہ سے زمانۂ قبل از اسلام سے یہاں وارد ہو چکی تھی ۔ کھنبایت [رك بآں] اور گجرات کی بندرگاھوں میں عرب

تاجر زمانۂ قدیم سے سکونت رکھتے تھے ۔ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھڑوچ پر حکم بن العاص نے حملہ کیا ۔ خلیفہ ہشام کے عہد میں سندھ کا مستقل گورنر جنید بن عبد الرحمن مری بھی بھڑوچ پر حملہ آور ہوا ۔ اور پھر ۷۰۷ء کے قریب خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں سندھ کے گورنر ہشام بن عمر تغلبی نے گجرات پر حملہ کیا اور بدھ مدرسے کی جگہ مسجد تعمیر کی (ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۱۹۹) ۔ عربی زبان کا اس طرح گجراتی پر اثر بڑھتا چلا گیا ۔ فارسی زبان یہاں محمود غزنوی کے ساتھ آئی جب اس سلطان نے ہندو بادشاہ بھیم دیو کے زمانے میں گجرات پر حملہ کیا ۔ چھوٹے بھیم دیو کے زمانے میں شہاب الدین غوری نے بھی گجرات کو فتح کرنے کی کوشش کی ۔ قطب الدین ایبک بھی ۵۹۳ھ / ۱۱۹۶ء میں گجرات آیا ۔ جب سلطان شمس الدین التتمش [رک بآں] کا زمانہ تھا تو اس وقت بھی گجرات پر حملہ ہوا اور ایک مسجد کی بنیاد رکھی گئی ۔ اس لیے علاء الدین خلجی کی فتح گجرات سے کوئی تین سو سال پہلے فارسی زبان گجرات میں پہنچ چکی تھی اور اپنے لسانی اثرات پھیلا رہی تھی ۔ اس کے بعد مسلمانوں کے کئی صد سالہ اقتدار نے عربی اور فارسی دونوں کے ہزاروں الفاظ گجراتی [رک بآں] زبان میں داخل کر دیے اور مشترکہ تمدنی رسوم و رواج کے ساتھ مشترکہ زبان کی نشوونما ہوئی ۔ گجرات ودیا سبھا بھدرا احمد آباد نے ان دونوں زبانوں کے ان الفاظ کی طویل فہرست ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع کر دی ہے جو گجراتی میں داخل ہوے ہیں (ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، ص ۴۳) ۔ ان میں سے بعض الفاظ اپنی اصل شکل ترک کرکے بالکل گجراتی بن چکے ہیں ۔ لوگ انھیں بے دریغ روز مرہ کی بات چیت میں استعمال کرتے ہیں اور فرق معلوم کرنا دشوار ہے ۔ ادب میں بھی اسی اقتدار کے اثرات نظر آتے ہیں ۔ امیر خسرو [رک بہ خسرو دہلوی ص ۹۳۳ ؟] کی فارسی میں مثنوی عشیقہ یا دول رانی خضر خان گجرات ہی کی ایک حقیقی داستان ہے جو علاء الدین خلجی کے زمانے میں وقوع پذیر ہوئی ۔ یہ مثنوی ۱۳۱۶ء میں تصنیف ہو کر اس سلطان کے نام معنون ہوئی تھی ۔ بعد میں اسی سلطان کے حبلۂ گجرات کے متعلق ۱۳۰۰ء میں پرانی گجراتی میں ایک نظم کھاندے پر بھاندھا (کنہاد دی پرابندھ) ایک شخص پدمنا بھا (پدما نابھ) نے لکھی جو چھپ چکی ہے ۔ عربی فارسی کی آمیزش سے جو نئی گجراتی زبان پیدا ہوئی اس میں ہندو اور مسلمان اہل قلم لکھتے رہے ہیں۔

مآخذ : (۱) سلیمان ندوی : عرب و ہند کے تعلقات، الہ آباد ۱۹۳۰ء؛ (۲) ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، دہلی ۱۹۵۸ء؛ (۳) محمود شیرانی : پنجاب میں اردو، لاہور ۱۹۶۳ء؛ (۴) M. S. Commissriat : *A History of Gujarat*، انڈیا، ۱۹۳۸ء، ج ۱ بمدد اشاریہ؛ (۵) A. M. A. Shushtery : *Outlines of Islamic Culture*، بنگلور، ۱۹۵۴ء، ص ۱۹۶، ۱۹۷؛ (۶) Abdullah Chaghatai : *Gujarat Architecture*، در *A History of Muslim Philosophy*، ج ۲، جرمنی ۱۹۶۶ء، ص ۱۱۰۳، ۱۱۰۴ (عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا).

(ادارہ)

گُجْراتی : زمانۂ حال کی ایک انڈو ۔ آریائی مقامی زبان، جسے مغربی ہندوستان [صوبۂ گجرات، کاٹھیاواڑ، کچھ] میں نوّے لاکھ سے زائد انسان بولتے ہیں، اور دس لاکھ سے زائد وہ لوگ بھی جو گجرات چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصوں میں آباد ہو گئے ہیں، یہی زبان بولتے ہیں۔ اس کا اپنا ایک قابل طباعت رسم الخط ہے جو دیونا گری کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے، اور اس کے ادب کا سراغ

چودھویں صدی عیسوی تک ملتا ہے۔ یہ مغربی ہند کی سب سے بڑی تجارتی زبان ہے اور اس حیثیت سے جو جماعت بھی اسے استعمال کرے،اس کے مطابق یہ اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہے۔ کوچ میں یہ سرکاری اور ادبی زبان کی حیثیت میں رائج ہے [پارسی سب یہی زبان بولتے ہیں] ۔گجرات کے مسلمانوں کا اکثر حصہ اردو بولتا ہے، لیکن ان میں سے وہ لوگ جو نو مسلموں کی اولاد ہیں گجراتی بولتے ہیں اور اس طبقے کے تعلیم یافتہ افراد اپنی دیسی زبان کے الفاظ میں بکثرت اردو(اور اس کے توسط سے عربی اور فارسی) الفاظ کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ [عربی اور فارسی کے بعض الفاظ اپنی اصلی شکل ترک کر کے گجراتی الفاظ بن گئے ہیں جو روز مرہ کی بات چیت میں بے دریغ استعمال ہوتے ہیں اور تحریروں میں بھی عام مستعمل ہیں۔ گجرات کی عدالتوں میں رائج تقریباً تمام اصطلاحات عربی یا فارسی سے لی گئی ہیں۔ عدالتوں میں جو لباس پہنا جاتا ہے اس کی ایک ایک چیز کا نام عربی اور فارسی سے لیا گیا ہے ۔ گجرات میں مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں ناگر اور کایستھ لوگ اعلی عہدوں پر فائز تھے اور فارسی زبان سیکھتے تھے ۔ ناگروں میں فارسی زبان میں گفتگو کرنا ایک فیشن تھا ۔ ان کی وجہ سے بھی فارسی عربی کے الفاظ گجراتی میں داخل ہوئے اور لسانی اعتبار سے گجراتی زبان مالدار ہو گئی (دیکھیے ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۳۴، ۳۵)] ۔ مسلمانوں نے ادبی خیالات کے اظہار کے لیے گجراتی کو بہت ہی کم استعمال کیا ہے، اس مقصد کے لیے وہ فارسی (اور قریب العہد زمانۂ حال میں اردو) کو کام میں لاتے ہیں ۔ گجراتی زبان سندھ تک بھی پہنچی ہے اور ضلع تھرپارکر کے نزدیک کے جنوبی علاقے میں بولی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں گجراتی بولنے والوں کی تعداد تیس ہزار ہے (*Linguistic Survey of India*، جلد ۹، حصہ ۲، ص ۳۲۴ ببعد)۔ *Linguistic Survey of India* میں کم و بیش ڈیڑھ سو گرامر اور لغت کی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے ۔ ان میں سے بعض درج ذیل ہیں جن سے ان کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے گا ۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے ص ۳۳۳ تا ۳۳۷)

Dossabhaee Sorabjee : *Idiomatical sentences in the English, Hindustanee, Goozratee and Persian Languages*، بمبئی ۱۸۴۳ء؛ محمد کاظم مرزا و نو روجی فردنزی : گجراتی انگلش ڈکشنری، بمبئی ۱۸۴۶ء؛ Faulkner, A. : *The orientalist's grammatical vade Mecum: being an Easy introduction to the Rules and Principles of the Hindustani, Persian, Gujrati Languages*، بمبئی ۱۸۵۴ء؛ Young, R. : *Gujrati Exercises, or a new Mode of learning to read write or speak the Gujrati language on the Ollendorffian System*، ایڈنبرا ۱۸۶۵ء؛ وہی مصنف: *English Gujrati dictionary*، ایڈنبرا ۱۸۸۸ء؛ عبدالحلیم : *Idiomatic sentences in English, Hindustani and Guzerati*، بمبئی ۱۸۷۲ء؛ Jamaspi Dastur Minocheherji Jamasp : *Pahlavi, Gujrati and English Dictionary*، دو جلد، لنڈن ۱۸۷۷ء؛ Asana : K.R., Nanjiani : *Select Persian Proverbs with their English, Gujrati and Hindustani equivalents, including sayings and Familiar Quotations*، بمبئی ۱۸۹۳ء؛ Daryasinhā :P., *A collection of Proverbs and sayings in English Gujrati, Sanskrit, Persian and Marathi with their explanations in Hindi*، بمبئی ۱۸۹۸ء؛ مسلمانوں نے جو چند کتابیں گجراتی زبان میں تصنیف کی ہیں ان میں سے زیادہ تر عربی، فارسی اور اردو کتب کے تراجم ہیں، یا مذہبی رسائل اور مذہبی تعلیم و تدریس کی ابتدائی کتب ۔ گجراتی زبان میں ایک رزمیہ نظم کھاندے ہر

بھاندھا ہے جو ۱۴۵۵ء میں پدما نابھ نے لکھی تھی اور جس میں علاءالدین خلجی کے حملے کا ذکر ہے ۔ پرانی گجراتی زبان ہے مگر واقعات سب فرضی ہیں یہ نظم چھپ چکی ہے۔ گجراتی کے ادب و شعر پر مسلمانوں کے اس اثر کے علاوہ خود مسلمان شاعروں کی تخلیقات کا ذکر بھی معنی خیز ہے ۔ شیخ محمد خوب ۹۸۶ھ کی تصنیف اپنی مثنوی خوب ترنگ کو گجراتی بولی کی نظم بتاتے ہیں ۔ شاہ علی محمد جیو گام دھنی کی جواہر اسرار اللہ کو بھی گوجری گجراتی تصنیف کہا گیا ہے ۔ محمد امین کی مثنوی یوسف زلیخا ۱۱۰۹ھ میں بعہد عالمگیر نظم ہوئی تھی ۔ وہ بھی اسے اسی زبان کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ شاہ برھان صاحب جانم (م ۹۹۰ھ) نے اپنے کلام میں کئی جگہ اپنی زبان کو گجری (یعنی گجراتی) کہا ہے، اس لیے کہ ان کے زمانے میں فارسی و عربی کے الفاظ بیشتر مقامی لہجہ اختیار کر چکے تھے اور شاہ صاحب مروجہ لہجے میں لکھ جاتے ہیں ۔

حافظ محمود شیرانی نے اپنی تصنیف پنجاب میں اردو کے علاوہ اپنے مقالات میں بھی گوجری یا گجراتی زبان کے متعلق بحث کی ہے ۔ نومبر ۱۹۳۰ء و فروری ۱۹۳۱ء کے اورینٹل کالج میگزین میں انھوں نے اردو کی تعمیر میں دائرہ کے مہدویوں کے حصے کا ذکر کرتے ہوے گوجری/گجری کے مسئلے کی طرف ضمناً اشارہ کیا ہے ۔ مگر اس سے پہلے وہ گوجری یا گجراتی اردو سولھویں صدی عیسوی میں کے عنوان سے اگست ۱۹۳۰ء کے اورینٹل کالج میگزین میں ایک مستقل مقالہ لکھ چکے تھے ۔ امیر خسرو (م ۱۳۲۵ء) نے اپنی ایک رباعی میں گجراتی/گوجری کے الفاظ استعمال کیے ہیں [دیکھیے رسالۂ قومی زبان، کراچی، اکتوبر ۱۹۷۷ء مقالہ گوجری زبان] ۔ اس لیے میراں جی شمس العشاق، برھان الدین جانم، علی محمد جیوگام دھنی، میاں خوب محمد چشتی، ملا وجہی اور ولی دکنی کا کلام گوجری/گجراتی کے مطالعے کی غرض سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ دکن کے شعراے اردو ہیں اور حافظ محمود شیرانی کا قول ہے کہ گوجری اور دکنی زبانیں آپس میں اس قدر مشابہ ہیں کہ انسان کو ان میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے [دیکھیے مقالات حافظ محمود شیرانی، ج ۲، لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۱] .

مآخذ : (۱) *Linguistic Survey of India*، ج ۹ : حصہ ۲، ص ۳۲۳ و ببعد (کلکتہ ۱۹۰۸ء)؛ (۲) J. F. Blumhardt : *Catalogue of Gujarati Printed Books in the library of the British Museum* لنڈن ۱۸۹۲ء؛ (۳) وھی مصنف : *Catalogue of the library of the India office Marathi and Gujarati Books*، ج ۲، حصہ ۵، لنڈن ۱۹۰۸ء؛ (۴) ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، دہلی ۱۹۰۸ء، ص ۳۴، ۳۵، ۱۴؛ (۵) محمود شیرانی : پنجاب میں اردو، لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۵۳، ۵۵، ۲۳۷، ۲۳۸؛ (۶) M. S. Commissariat : *A History of Gujarat*، الہآباد ۱۹۳۸ء، ص ۴].

(M. Longworth Dames [و ادارہ])

گجرانواله : رک به گوجرانواله.

گداله : ایک مختصر سا بربر قبیلہ جو صحرا نشین صنہاجہ کے بڑے نسلی گروہ سے تعلق رکھتا ہے (بربری حرف صوتی گ کو عربی رسم خط میں عام طور پر ج سے لکھا جاتا ہے، لیکن ابن خلدون نے غیر زبانوں کے الفاظ کو عربی رسم خط میں منتقل کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس کے مطابق وہ اسے بطور کاف لکھتا ہے جس کے اوپر یا نیچے اصلی مخطوطے میں شاید کوئی حرکت diacritical point بھی دی گئی تھی) ۔ یہ لوگ اس علاقے کے جنوبی

حصے میں رہتے تھے جو اب ماری ٹینیا Mauretania کہلاتا ہے اور سینی گال کے شمال میں سمندر سے متصل واقع ہے۔ جنوب میں ان کے علاقے کی سرحد زنگیوں (Negroes) کی سرزمین سے ملتی تھی، شمال کی جانب ماری ٹینیا کے موجودہ ادرار میں ان کے ''بھائی بند'' لَمتُونہ اور مَسوفہ آباد تھے۔

مآخذ: قدیم مؤرخین اور جغرافیہ نگاروں کی تصانیف کے علاوہ، دیکھیے (۱) A. Huici Miranda: *Un fragmento inédito de Ibn ʿIdarī sobre los Almoràvides*، در *Hespèris-Tamuda*، ج ۲: ۱، ۱۹۶۱ء، ص ۴۳؛ (۲) P. Marty: *l'émrat des Trazas*.

(G. S. COLIN)

⊗ **گرامی**: شیخ غلام قادر؛ [برصغیر پاکستان و ہند میں آخری دور کے ممتاز ترین فارسی شاعر] - غلام صمدانی نے ان کا وطن بلگرام بتایا ہے (تزک محبوبیہ: ۲: ۱۴۷)، لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ جالندھر (بھارت) میں پیدا ہونے کی سند ان کے کلام سے ملتی ہے:

نظم دلکش بخواں بہ طرز دگر
مولد تست شہر جالندھر

گرامی ۱۸۵۷ء سے چند سال قبل پیدا ہوے۔ ان کے والد کا نام سکندر بخش تھا جو ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے اور نیل کی رنگائی کا کام کرتے تھے۔ گرامی نے محلے کی مسجد میں قرآن مجید کی تعلیم پائی پھر انھیں بستی دانشمندان (جالندھر) میں خلیفہ ابراہیم کے مکتب میں داخل کیا گیا وہاں فارسی کی متداول کتابیں گلستان، بوستان اور سکندر نامہ وغیرہ پڑھیں، تحصیل علم کا شوق کشاں کشاں لاہور لے آیا - چودہ برس کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں داخل ہوے اور فارسی کے امتحانات منشی عالم اور منشی فاضل پاس کیے۔ پھر وکالت کا امتحان دیا اور اس میں بھی کامیابی حاصل کی۔

تعلیم سے فارغ ہو کر گرامی نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا - کچھ عرصہ امرتسر کے ایم - اے - او ھائی سکول میں فارسی پڑھائی، پھر کپورتھلے کے کسی مدرسے میں چلے گئے - وھاں دل نہ لگا تو لدھیانے کے گورنمنٹ ھائی سکول میں فارسی کے مدرس ہو گئے - لدھیانے میں ان دنوں واربرٹن سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا، جسے فارسی سیکھنے کا بہت شوق تھا اور وہ اکثر گرامی کو بلا کر ان سے فارسی میں گفتگو کیا کرتا اور ان سے فارسی اشعار سنا کرتا تھا - اس نے گرامی کو پولیس میں سارجنٹ بھرتی کر لیا، لیکن انھوں نے بہت جلد یہ ملازمت ترک کر دی - اس کے بعد معاش کی تلاش میں وہ کبھی لاھور، کبھی پٹیالے، کبھی رام پور اور کبھی مالیر کوٹلے پھرتے پھراتے رہے، مگر کہیں ڈھب کی ملازمت ملی، نہ کہیں دل ھی لگا - لاھور میں وہ چار سال نواب فتح علی خان قزلباش کے معلم و اتالیق رہے۔

گرامی کو شاعرانہ مزاج قدرت کی طرف سے ودیعت ھوا تھا - بچپن ھی سے شعر کہتے تھے - ملازمت کی تلاش میں جب پٹیالے گئے تو وھاں کے وزیر اعظم خلیفہ محمد حسین نے ان کا کلام سن کر کہا کہ اس جنس کی قدر یہاں نہیں ھوگی، بہتر ہے کہ حیدرآباد چلے جائیے؛ چنانچہ انھیں کی ترغیب سے گرامی نے حیدرآباد دکن جانے کے لیے نظام کے اتالیق، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے چھوٹے بھائی میجر سید حسن بلگرامی کو وسیلہ بنایا - حیدر آباد پہنچے تو انھیں سید غلام حسنین بلگرامی مرحوم کی جگہ شاعر خاص مقرر کر دیا گیا - اسی موقع پر انھوں نے تاریخ کہی تھی: ''گرامی بحضور آید'' (۱۳۰۷ھ) - چند سال بعد انھیں ملک الشعرا کا خطاب ملا۔

گرامی ۱۹۱۶-۱۹۱۷ء تک حیدر آباد میں رہے اور خوب ٹھاٹھ سے رہے ۔ انھوں نے وھیں کی طرز بود و ماند اختیار کر لی تھی ۔ میر محبوب علی خان اور میر عثمان علی خان دونوں کا زمانہ دیکھا اور ہر عہد میں محبوب و مقبول رہے ۔ کئی دفعہ انعام و اکرام بھی حاصل کیے ۔ گرامی کی شادی کے موقع پر دو سیر پختہ سونا سرکاری خزانے سے دیے جانے کا حکم صادر ہوا ۔ شادی ہوشیار پور کے شیخ قمر الدین کی دختر نوراں بھری سے ہوئی، جو بعد میں اقبال بیگم کہلائی ۔ شادی کے بعد گرامی نے جالندھر کے بجاے ہوشیار پور ھی کو مستقر بنا لیا ۔ خود کہتے ھیں: ''گرامی از شہر ہوشیار پور زن گرفت و بجاے آن کہ زن را بہ شہر خود بیاورد خودش بہ شہر زن منتقل شد'' (یعنی لوگ تو جورو بیاہ کر لاتے ھیں، گرامی کو جورو بیاہ لے گئی) ۔ یہاں گرامی نے ایک شاندار حویلی تعمیر کرائی جس کی پیشانی پر یہ سجع کندہ تھا: ''سر جلوۂ اقبال گرامی منزل'' ۔ گرامی کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہوشیار پور کے پڑھے لکھے نوجوانوں اور با مذاق لوگوں نے ''بزم گرامی'' کے نام سے ایک مجلس مشاعرہ قائم کی، جس کی سرپرستی میں مشاعرے ہوتے تھے اور گرامی بھی اس میں اپنا کلام سناتے تھے ۔ گرامی ذیابیطس کی وجہ سے بہت پریشان رہتے تھے، جسے وہ حیدر آباد ھی سے لائے تھے ۔ اس پریشانی میں شعر کی طرف بھی طبیعت مائل نہ ھوتی تھی ۔ رباعیات زیادہ تر اسی زمانے میں [illegible] ۔ آخر ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو بروز [illegible] صبح تین بجے صبح داعی اجل کو لبیک کہا اور ہوشیار پور کے قبرستان کندن شاہ بخاری میں دفن کیے گئے ۔ علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان نے ان کی وفات پر پُر درد مرثیے کہے ۔ دیوان گرامی اور رباعیات گرامی دو شعری مجموعے انتقال کے بعد شائع ھوے، مگر بہت سا کلام ضائع ھو گیا ۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں ''گرامی جہانگیری بہار کا آخری پھول ھے جو ذرا دیر کے بعد شاخ سے پھوٹا'' (مکتوب اقبال بنام گرامی، ۹ فروری ۱۹۲۲ء) ۔ ان کا کلام بحیثیت مجموعی بالخصوص غزل میں نظیری کے کلام سے ایک نسبت رکھتا ھے (مخزن، لاھور، جون ۱۹۲۷ء) ۔

مآخذ: (۱) غلام صمدانی: تزک محبوبیہ، ۲: (۲) محمد حسین آزاد: مکتوبات آزاد، لاھور ۱۹۲۷ء، ص ۳۰۶ ۔

(محمد عبداللہ قریشی)

گِرَای: تاتاری فرمانرواؤں کا ایک خاندان جس نے تین صدیوں (نویں سے بارھویں صدی ھجری / پندرھویں سے اٹھارویں صدی عیسوی) تک جزیرہ نماے قریم (کریمیا) پر حکومت کی ۔ اس خاندان کی ابتدا اور اس کے بانی حاجی گرای بن غیاث الدین بن تاش تیمور، آلتون اردو کی سلطنت کے ایک شہزادے کے کارناموں کے بارے میں ھمیں بہت ناکافی اور متناقض معلومات ملتی ھیں ۔ اس کے قدیم ترین سکے سال ۸۴۵ھ / ۱۴۴۱-۱۴۴۲ء کے ھیں ۔ کہا جاتا ھے کہ اس نے اس سے بہت پیشتر لتھوانیا اور پولینڈ کے بادشاھوں کی مدد سے اپنی حکومت کی بنیاد رکھی تھی اور وہ انھیں پر بعد ازاں مرتے دم تک (۸۷۱ھ / ۱۴۶۶ء) بھروسا کرتا رھا ۔ گرای کے نام کے بارے میں ھمیں کسی قسم کی قابل اعتبار معلومات حاصل نہیں ۔ ایک مقامی روایت کی رو سے شہزادے کا اتالیق قبیلۂ گرای سے تعلق رکھتا تھا (قبیلے کا یہ نام وسط ایشیا میں اب تک ملتا ھے، وھاں اُس کا تلفظ کِرای کیا جاتا ھے) ۔ احمد رفیق پاشا اپنی لغت (ص ۱۰۴۳) میں مآخذ کا حوالہ دیے بغیر

لکھتا ہے کہ گرای ایک مغولی لفظ ہے، جس کا مغولی زبان میں تلفظ گرای ہے اور یہ مستحق، شائستہ اور اَحق [اهل] کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے حاجی اس نام کو اپنے اخلاف میں منتقل کرنے کا ارداہ نہیں رکھتا تھا؛ چنانچہ اس کے صرف ایک بیٹے منگلی نے گرای کا لقب اختیار کیا اور وہ نہ تو اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور نہ وہ اس کے فوراً بعد تخت نشین ہوا ۔ اس کے برعکس منگلی کے زمانے سے گرای خاندان شاہی کے ہر فرمانروا کے نام کا جزو قرار پا گیا ۔ ترکوں کے کَفّہ کو فتح کر لینے کے بعد (۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء) قریم صرف برائے نام سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گیا ۔ جنوبی ساحل تو براہ راست ترکی حکومت کے ماتحت آ گیا، لیکن باقی ماندہ علاقے پر گرای ہی باب عالی کے باجگذار کی حیثیت سے قابض رہے ۔ بایں ہمہ یہ بات قطعیت کے ساتھ کبھی واضح نہ ہو سکی کہ کفہ میں متعین پاشا اور خان کے مابین اور خان اور باب عالی کے مابین تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ اسلام گرای ثانی کے عہد (۹۹۲ھ / ۱۵۸۴ء تا ۹۹۶ھ / ۱۵۸۸ء) کے بعد کہیں جا کر خطبۂ جمعہ میں خان کے نام سے پہلے سلطان کا نام لیا جانے لگا ۔ ابتدائی خوانین (حاجی گرای ، نور دولت اور منگلی گرای ، ترکی فتح سے قبل) اپنے سکّوں پر سلطان کا لقب استعمال کرتے تھے؛ بعد میں انھوں نے صرف خان کے لقب ہی پر اکتفا کر لیا ۔ اُزبکوں اور قازاقوں کی مانند ان کے ہاں بھی لفظ سلطان کے معنی ایک ایسے شہزادے کے ہوتے تھے جو حکمران خاندان سے تعلق تو رکھتا ہو لیکن خود اس کے ہاتھ میں عنانِ حکومت نہ ہو ۔ گرای کے سکّوں اور دستاویزات کی ایک خصوصیت ان کی مُہر (تمغا) ہے، [جس کی شکل بڑی حد تک انگریزی حرف T سے ملتی جلتی ہے] ۔ بہت سے خوانین نے کبھی تو خود مختارانہ طور پر اور کبھی سلطان ترکیہ کے نام پر اپنی حکومت جزیرہ نما کی سرحدوں سے پرے کے علاقے میں بھی قائم کر لی، یعنی شمال میں ماسکو تک اور مشرق میں والگا اور بحیرۂ خَزَر تک ۔ ۱۷۳۶ء میں جزیرہ نما پر پہلی بار روسیوں کا عارضی قبضہ ہوا ۔ ۱۷۷۱ء میں اسے مستقل طور پر فتح کر لیا گیا اور اگرچہ صلحنامۂ کوچک قینارجہ (۱۷۷۴ء) اور عہد نامۂ آئینہ لی قاوق (۱۷۷۹ء) کی شرائط کے مطابق یہ طے ہوا تھا کہ تاتاری باشندے آزادانہ طور پر خان کا انتخاب کیا کریں گے اور خان باب عالی اور روس دونوں کے اثر سے آزاد ہو کر ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے اپنے ملک پر حکومت کیا کرے گا، لیکن روسیوں نے اسے پھر بھی خالی نہ کیا ۔ ۱۷۸۳ء میں قریم کو سلطنت روس میں شامل کر لیا گیا، جس سے گرای کی حکومت ختم ہو گئی ۔ بَختی گرای [قاموس الاعلام (ص ۳۶۵۷) میں بخت گرای] آخری گرای تھا جس کے نام کے ساتھ لقب خان استعمال ہوا، اس نے جزیرۂ متیلین Mytilene میں رمضان ۱۲۱۵ھ / جنوری ۱۸۰۱ء میں وفات پائی (نیز رک بہ باغچہ سرای، جہاں مآخذ دیے گئے ہیں).

[اس خاندان کے حکمران علم و ہنر کے قدردان اور سرپرست تھے، چنانچہ ان میں سے ایک شاہین گرای ترکی کا اچھا شاعر تھا ۔ گب نے اس کی ایک غزل مدوّر نقل کی ہے جس کا ہر شعر ''ی'' سے شروع ہوتا ہے اور ''ی'' ہی پر ختم ہوتا ہے، مثلاً پہلا شعر یوں ہے کہ:

یاد گلوب عاشقک منزلینه تیلسه جامی نه
اتیمه می گون یوزک دیده سنی روشنای

اور آخری شعر یوں ہے کہ:

یاره ایدر اهل عشق طورمیوب عرض هنزد
نوبت عوض هنر سنده می شاهین گرای

(W. Barthold)

* **گرج** : رک به کُرج.

* **گرجستان** : رک به کُرج.

* **گُرچانی** : ایک بلوچ قبیله، جس کے کچھ افراد ضلع ڈیرہ غازی خان کے میدانوں میں اور کچھ اس کے قریب کوہ سلیمان کی پہاڑیوں ماری اور درا گل اور شم اور پھیلاوغ کے بلند میدانوں میں آباد ھیں ۔ یه لوگ مخلوط النسل ھیں ۔ ان میں سے بعض سندھی راجپوتوں کی نسل کے ڈوڈائی ھیں اور باقی خالص نسل کے رند بلوچ ۔ ان کے سردار کا خاندان ڈوڈائی جماعت سے تعلق رکھتا ھے ۔ ماضی میں یه قبیله بے حد شورش پسند تھا اور اپنے اکثر ھمسایوں اور سکھوں کے ساتھ نبرد آزما رھا ۔ ۱۸۴۸ء میں انھوں نے سکھوں کے خلاف جنگ میں ایڈورڈس Edwardes کا ساتھ دیا ۔ لشاری اور دُرکانی گروہ پہاڑی ھیں اور بہت ھی دشوار گزار پہاڑی علاقے میں آباد ھیں.

مآخذ : (۱) Longworth Dames : *The Baloch Race*، لندن ۱۹۰۴ء؛ (۲) Edwardes : *A Year on the Punjab Frontier*، لندن ۱۸۵۰ء.

(M. LONGWORTH DAMES)

* **گَردیزی** : ابو سعید عبدالحیّ بن الضّحاک بن محمود، ایک ایرانی مؤرخ، جس کے حالات زندگی کے بارے میں ھمیں کچھ معلوم نہیں ۔ جیسا که اس کی نسبت سے ظاھر ھے وہ گردیز میں پیدا ھوا تھا (گردیز کو عموماً عربی میں کردیز لکھا جاتا ھے مثلاً یاقوت، ۴ : ۲۵۸، لیکن بعض اوقات جردیز بھی لکھا جاتا ھے، جیسا که العُتبی : تاریخ الیمینی میں از اول تا آخر آیا ھے ۔ اس سے اس امر کی تصدیق ھوتی ھے که اس کا تلفظ گ کے ساتھ ھے) ۔ یه مقام غزنه سے ایک دن کی مسافت پر ھندوستان جانے والی سڑک پر واقع ھے (المقدسی، طبع de Goeje، ص ۳۴۹) ۔ گردیزی کی زینُ الاخبار عبدالرشید غزنوی کے عہد حکومت (۴۴۱ھ/ ۱۰۴۹ء تا ۴۴۴ھ / ۱۰۵۳ء) میں لکھی گئی تھی ۔ اس میں شاھان ایران، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیه وآله وسلّم اور ان کے خلفاءؓ ۴۲۳ھ / ۱۰۳۱ء تک کی خراسان کی مفصل تاریخ، یونانی علوم (در معارف رومیان) پر مقالات اور مختلف اقوام کے تاریخ وار سلسلۂ واقعات اور ان کی مذھبی رسوم کے حالات شامل ھیں ۔ اس میں ایک باب ترکوں کے متعلق ھے، جس سے وسط ایشیا کے جغرافیے کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات بہم پہنچتی ھیں اور ایک ھندوستان پر ھے ۔ گردیزی نے تاریخی مآخذ کے قطعاً حوالے نہیں دیے ۔ ترکوں سے متعلق باب کے سلسلے میں اس نے ابن خرداذبه، الجیہانی اور ابن المقفّع کے بیانات پر بھروسا کیا ھے ۔ وہ بتاتا ھے که اس نے ھندوستانی تہواروں کے بارے میں معلومات البیرونی سے حاصل کی تھیں؛ اسی بنا پر اسے البیرونی کا شاگرد سمجھا جاتا ھے ۔ گردیزی نے مشرق کی تاریخ نویسی کو بہت کم متأثر کیا ھے اور اس کا حوالہ شاذ و نادر ھی دیا جاتا ھے (دیکھیے Rieu : *Catalogue*، ص ۲۲۰ ب) ۔ ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء کا لکھا ھوا ایک قلمی نسخه کتابخانۂ بوڈلین Bodleian (Ouseley ۲۴۰) میں موجود ھے ۔ مغربی مصنفین نے عموماً اسی کو استعمال کیا ھے اور اکثر اوقات اسے واحد مخطوطه سمجھا جاتا ھے (حتّٰی که *Grundr. d. Iran Phil.*، ۲ : ۳۰۶، میں بھی) ۔ اس مخطوطے میں سے ترکوں سے متعلقه باب کو دوبار شائع کیا گیا ھے (W. Barthold : *Otčet o Poïezdke v srednyuyu Aziyu*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۷ء، ص ۷۸ ببعد؛ Géza Kuun : *Keleti Kútfők*، ۱۸۹۸ء، ص ۵ ببعد و *Keleti Szemle*، ۱۹۰۳ء، ص ۱۷ ببعد) اور ترجمه ھوا ھے (روسی اور ھنگاروی زبان میں) ۔ ایک اور مخطوطه کیمبرج King's Coll. Library (شمارہ ۲۱۳) میں موجود ھے، جس کی طرف

۱۸۶۸ء میں Morley نے توجہ دلائی تھی (.Journ *R. As. Soc.*، ۳ : ۱۲۰) ۔ مقالۂ هذا کا مصنف ثابت کر چکا ہے (*TurKestan v epokhu mongolskago nashestviya* ۲ : ۵۲۰) کہ مخطوطۂ Ouseley، شمارہ ۲۴۰، لازمی طور پر King's College کے نسخے، عدد ۲۱۳، کی نقل ہوگا ۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ راورٹی Raverty نے کونسا نسخہ استعمال کیا تھا (طبقات ناصری، ص ۱۰۹) ۔ سخاؤ Sachau اور ایتھے Ethé نے (*Catalogue*، ص ۹ ببعد) زین الاخبار کے مضامین کا سیر حاصل تجزیہ کیا ہے (دیکھیے تاریخی ابواب کے اقتباسات، در Barthold : *Turkestan*، ۱ : ۱ ببعد اور تصحیحات، ۲ : ۵۱۳؛ نیز گردیزی نے البیرونی کی کتاب الہند سے جو اقتباسات نقل کیے هیں ان کے بارے میں دیکھیے Sachau : *Alberuni's India*، انگریزی ترجمہ، ۲ : ۳۶۰ و ۳۹۷؛ گردیزی اور سلامی کے باهمی تعلق کے متعلق دیکھیے W. Barthold، در *Orientalische Studien The Nöldeke dargebracht*، ۱ : ۱۷۳ ببعد ۔

(W. Barthold)

* گِرگا : بالائی مصر کا ایک صوبہ (مدیریۃ)، ضلع (مرکز) اور شہر ۔ اس کے نام کا اشتقاق غیر یقینی ہے ۔ غالباً گرگا میں ولی گرگس (St. George) کا نام پنہاں ہے ۔ علی مبارک نے اس کا تعلق ذگرگا اور دِگرگا کے ناموں سے بتایا ہے، جو اسی ضلع میں معروف هیں (دِگرگا کا ذکر ابن جیعان، ص ۱۸۹، اور ابن دقماق، ۵ : ۲۷، نے بھی کیا ہے) ۔ معلوم هوتا ہے کہ قدیم مصری مآخذ گرگا سے واقف نہیں تھے، چنانچہ القضاعی نے کُوَرات کی فہرست میں اس کا ذکر نہیں کیا، تاهم یاقوت کے هاں یہ نام نظر آتا ہے ۔ صوبے کے طور پر اس کا نام پہلی بار *Description de l' Egypte*، ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۸ء، میں آتا ہے ۔ روک ناصری مصنفۂ ۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء تک میں یہ نام نہیں ملتا، لہٰذا گرگا کا صوبہ پہلی بار غالباً دور عثمانیہ میں بنا هوگا ۔ خدیوون کے عہد میں صوبۂ گرگا کا صدر مقام سوہاگ بنا دیا گیا اور شہر گرگا کی حیثیت گر کر محض ایک ضلع کے صدر مقام کی رہ گئی ۔ یہ شہر لکڑی اور چمڑے کی صنعتوں کی وجہ سے مشہور تھا اور یہ کام دیگر مصری صنعتوں کی مانند عیسائیوں کے هاتھ میں تھا ۔ اس شہر کی کثیر عیسائی آبادی اس کی قدامت کی دلیل ہے ۔ جب تک حجاج کے قافلے قُصَیر کے راستے سے جاتے رہے یہ شہر خوشحال رہا کیونکہ یہاں کے لوگ حاجیوں کو کھانے پینے کی چیزیں خصوصاً بقسماط (بسکٹ) مہیا کرتے تھے ۔ راستے کی تبدیلی کے ساتھ ہی گرگا پر زوال آنے لگا (دیکھیے یہی حال عَیذاب [رکّ باں] کا هوا) ۔ محمد علی کے عہد میں اس شہر کو، جس کی تعمیرات بہت عمدہ تھیں، دریاے نیل کی طغیانی سے نقصان پہنچا، لیکن اسمعیل کے عہد میں حفاظتی تدابیر اختیار کر کے اسے تباهی سے بچا لیا گیا ۔ ۱۹۲۷ء میں شہر کی کل آبادی ۱۹۸۹۳ تھی، جس میں ۵۴۴۳ قبطی تھے اور صوبے کی کل آبادی ۵۰۰۰۰۷ تھی۔

مآخذ: (۱) علی مبارک: خطط جدید، ۱۰ : ۵۳؛ (۲) یاقوت : معجم، ۲ : ۴۸؛ (۳) Boynet Bey : *Dictionaire Geographique de l' Egypte*، ص ۲۱۴، بذیل Guerga؛ (۴) Baedeker : *Egypte*، ج ۵، بمدد اشاریہ.

(G. H. Becker)

گُرگان : رکّ بہ جُرجان.

گُرگانج : (عربی جرجانیہ)، شمالی خوارزم کا ایک شہر ۔ شہر کے محل وقوع اور دریاے جیحون کے معاون کے بارے میں، جو اس کے پاس سے گزرتا ہے، رکّ بہ آمودریا ۔ اگرچہ اس کا ذکر پہلی بار عربوں کے هاں ملتا ہے لیکن یہ بلاشبہہ

زمانۂ قبل از اسلام میں بسایا گیا تھا ۔ خُوارزم کے قدیم ترین چینی نام یوی کین Yüe Kien کا سراغ بلا شبہہ گرگانج کے نام میں ملتا ہے ۔ عرب فتح (۹۳ھ/۷۱۲ء) سے متعلق مآخذ میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ عربوں نے ملک کے شمالی حصے کو کس حال میں پایا تھا ۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں خوارزم دو خود مختار سلطنتوں میں تقسیم ہو گیا ۔ خوارزم شاہ کا علاقہ، جس میں اس ملک کا قدیم پای تخت کاث شامل تھا، اور امیر گرگانج کا علاقہ ۔ البیرونی (*Chronology*، طبع Sachau، ص ۳٦) کے بیان کی رو سے جو شاہی خاندان کاث میں رہتا تھا اسے عرب فتح کے بعد شاہی خطاب (شاهیة) محض برائے نام حاصل رہا ۔ اس کے بعد اصل حکومت (ولایة) کبھی تو اس خاندان کے ارکان کے ہاتھوں میں رہی اور کبھی دوسرے کے، حتّٰی کہ آخری فرمانروا کے عہد میں شاهیة اور ولایة دونوں قطعی طور پر اس کے ہاتھ سے جاتی رہیں ۔ سخاؤ (*Sitz. Ber. Wien. Ak.*، ۷۳ : ۹۹۴) نے اس بیان سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ قدیم خاندان کاث میں رہتا تھا اور عرب والی گرگانج میں اور اس دو عملی کی وجہ سے سیاسی اعتبار سے شمالی علاقے کی جنوبی علاقے سے علٰحدگی عمل میں آئی تھی ۔ ۳۸۵ھ / ۹۹۵ء میں امیر گرگانج کاث فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس خاندان کا تختہ الٹ دیا جو زمانۂ قبل از اسلام سے اس پر حکومت کرتا رہا تھا ۔ اس طرح اس نے خوارزم کو ایک بار پھر ایک سلطنت کے ماتحت منظم کر کے خوارزم شاہ کا لقب اپنے خاندان میں منتقل کر لیا ۔

چوتھی / دسویں صدی کے عرب جغرافیہ دانوں نے گرگانج کو خوارزم کا دوسرا بڑا شہر بیان کیا ہے (دیکھیے W. Barthold : *Turkestan*، ۲ : ۱۳٦ ببعد؛ G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۴۴۷ ببعد)؛ کاث کے قدیم شہر کے مقابلے میں تجارت اور صنعت کے اعتبار سے گرگانج اس زمانے میں بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا ۔ دونوں سلطنتوں کے متحد ہو جانے کے بعد کاث اور گرگانج اس مملکت کے دو دارالحکومت بیان کیے جاتے ہیں جن کو مساوی مراعات حاصل تھیں، لیکن آخری بادشاہوں اور والیوں کے عہد میں کاث کی رونق گرگانج کے مقابلے میں بالکل ماند پڑ گئی ۔ گرگانج کی انتہائی خوشحالی کا زمانہ چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی اور ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے خوارزم شاہوں کے عہد کے مطابق ہے (یاقوت ۲ : ۵۴، ۴۸٦؛ ۴ : ۲٦۰ ببعد)۔ اس خاندان کے بارونق پایۂ تخت کے بارے میں جو معلومات میسر ہیں نامکمل ہیں ۔ اس زمانے میں گرگانج سے تین فرسخ کے فاصلے پر ایک اور شہر تھا جسے ''گرگانج خرد'' کہتے تھے ۔ مغلوں کے محاصرے اور شہر کی فتح (٦۱۸ھ/۱۲۲۱ء) کا جو حال الجوینی نے قلمبند کیا ہے اس سے ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے گرگانج کے جغرافیے سے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں، دیکھیے متن در Schefer : *Chrestomathie Persane*، ۲ : ۱۳٦ ببعد؛ اور دیگر مآخذ سے موازنہ، در W. Barthold : *Turkestan*، ۲ : ۴٦۷ ببعد؛ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر شہر کو مسمار کر دیا گیا، بند تباہ کر دیے گئے اور سارے ضلع میں آمو دریا کا سیلاب آ گیا ۔ اس کے برعکس دیگر مآخذ (الجُوزجانی : طبقات ناصری، ترجمہ Raverty، ص ۲۸۱، ۱۰۰۰؛ دیکھیے نیز عبدالکریم بخاری، طبع Schefer، ص ۸۷) کی رو سے بہت سی عمارتیں جن میں سلطان تکش کا مقبرہ بھی شامل تھا، تباہی سے بچ گئیں۔ ایک مینار پر ایک کتبہ ملا ہے (دیکھیے تصویر در H. Landsdell : *Through Russian Central Asia*، ص

۵۱۷) جس میں تاریخ تعمیر ۴۰۱ھ/۱۰۱۰-۱۰۱۱ء) دی گئی ہے، اسے کاتانوف Katanow نے (Zapiski vost. otd. arkh. obshč، ۱۴ : ۱۵ ببعد) شائع کیا ہے۔ اس سے دراصل یہ پتا چلتا ہے کہ مغل عہد سے پہلے کے گرگانج کے بعض آثار آج بھی باقی ہیں۔ تجارتی شہر کے بارے میں جو چند سال بعد ایک اور مقام پر آباد ہوا رک بہ اُرگنج.

مآخذ : مقالہ میں درج ہیں .

(W. BARTHOLD)

* **گرم سیر :** (فارسی) فارس اور کرمان کے گرم ساحلی علاقے کو کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں سرد پہاڑی علاقوں کو سرد سیر کہتے ہیں۔ عرب جغرافیہ نگاروں نے ان الفاظ کو جروم اور سرود یا صرود کی شکلوں میں معرّب کر لیا ہے .

* **گرمیان اوغلو :** ایک ترکمانی (حکمران) خاندان کا نام ہے جس نے سلجوقی سلطنت کے زوال کے بعد، خود مختاری اختیار کر کے کوتاهیه Kiutahia کو جسے قدیم زمانے میں Cotyaeum کہتے تھے، اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا، اصل میں گرمیان ایک قبیلے کا نام تھا جس کا بعد ازاں اس شاہی خاندان پر اطلاق ہونے لگا (دیکھیے Houtsma : Recueil، ۴ : ۲۲۹، ۲۳۲، ۳۲۶ ببعد، ۳۳۲ ببعد) - والی کوتاهیه Cotyaeum (KantaKuzenos، جلد ۲ : ۸۲) کا ذکر عثمان اور صُرخان اور منتشیه وغیرہ کے ساتھ ملتا ہے جو بوزنطینی سلطنت کے ایشیائی مقبوضات پر حملہ آور ہوئے تھے۔ اس نے دیگر مقامات کے علاوہ کُلّہ اور دریاے مینڈر کے کنارے طرابلس پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے الاشہر (Philadelphia) کو بھی فتح کرنے کی کوشش کی، لیکن Katalans اور Almugavars کے ساتھ جنگ میں شکست فاش کھائی (۱۳۰۴ء مگر Muralt کی رو سے ۱۳۰۶ء) (دیکھیے Pachymeres، ۲ : ۴۲۱ ببعد، Muntaner، نواح ۲۰۵)۔ ترکی مآخذ کے مطابق ارطغرل کے زمانے میں "علی شیر"، گرمیان کا والد" افیون قرا‌حصار پر حکومت کرتا تھا (نشری اور اس کے ناقل) - ابن بطوطہ کا ایک معاصر شہاب الدین، علی شیر کے بیٹے گرمیان کو کوتاهیه کے حکمران کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس بیان کی تصدیق گرمیان خان کے ۷۰۷ھ/۱۳۰۷ء کے ایک سکے سے ہوتی ہے جو شہر گرمیان میں مضروب ہوا تھا (اسمعیل غالب نے اپنے سلجوقی سکّوں کے مجموعے کی فہرست، شمارہ ۱۷۵ میں اسے یکتا قرار دیا ہے).

چودھویں صدی عیسوی کے اواخر تک کی خاندان گرمیان کی تاریخ کے متعلق ہماری معلومات افسوسناک حد تک محدود ہیں۔ منجّم باشی، جلد ۳، ص ۴۳ ببعد نے حکمرانوں کی حسب ذیل فہرست دی ہے : گرمیان بیگ، علی شیر بیگ، علَم شاہ، علی، یعقوب، لیکن یہ ہم‌عصر مؤرخین کے بیانات اور دیگر دستاویزات کے مطابق نہیں۔ ہمیں کوتاهیه کے ایک کتبے سے جو ۷۷۹ھ/۱۳۷۷ء میں لکھا گیا تھا یہ پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں سلیمان شاہ گرمیان پر حکومت کرتا تھا اور وہ محمد کا بیٹا اور یعقوب کا پوتا تھا۔ خلیل ادھم کے بیان کے مطابق یہ یعقوب وهی "امیر اعظم" یعقوب بن علی شیر ہے جس کا انقرہ کے کتبے مکتوبۂ ۶۹۹ھ/۱۲۹۹ء میں ذکر آیا ہے۔ ممکن ہے کہ یعقوب کا باپ علی شیر وهی علی شیر حاکم گرمیان ہو جس کا بوزنطینی اور عثمانی مؤرخین نے ذکر کیا ہے، لیکن وہ کریم الدین علی شیر نہیں ہو سکتا (Houtsma : Recueil، جلد چہارم ۴، ص ۲۹۹) جو قلج ارسلان چہارم کے عہد میں (۶۵۵ تا ۶۶۳ھ) مارا گیا تھا۔ اس کے پوتے یعقوب ثانی کی دستاویز وقف کی رو سے محمد نے کوتاهیه اور سیماو (Simav) فتح کیے تھے۔ اس کے با اس

کے جانشین سلیمان شاہ کے دورِ حکومت میں قراحصار اور ڈینزلی کے اضلاع گرمیان کی ریاست میں شامل کر لیے گئے ۔ سلیمان شاہ (ترکی مؤرخین اسے محض گرمیان اوغلی لکھتے ھیں) نے اپنی بیٹی خاتون سلطان کی شادی ۷۸۳ھ / ۱۳۸۱ء میں .مراد اول کے بیٹے بایزید کے ساتھ کر دی اور اسے جہیز میں اپنی ریاست کے بڑے بڑے شہر جن میں صدر مقام بھی شامل تھا، دے دیے ۔ اس کے بیٹے یعقوب (ثانی) کو جو ۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء میں اس کی جگہ تخت نشین ہوا تھا، با یزید نے ۷۹۳ھ / ۱۳۹۱ء میں قید کر کے روم ایلی میں اِپسلہ کے مقام پر نظر بند کر دیا اور اس کی ساری ریاست ضبط کر لی ۔ یعقوب اِپسلہ سے فرار ہو کر تیمور کے پاس چلا گیا اور جنگ انقرہ کے بعد ان تمام چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی مانند جن کی ریاستیں بایزید نے چھین لی تھیں، اس کی ریاست بھی تیمور نے واگذار کر دی تھی ۔ جب تیمور آناطولی سے رخصت ہوا تو یعقوب کو بایـزید اول کی میّت اور اس کے قیدی بیٹے موسیٰ چلبی کا محافـظ مقرر کر گیا ۔ یعقوب نے ان دونوں کو محمد چلبی کی تحویـل میں دے دیا ۔ محمد چلبی اور مراد ثانی سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ تادم مرگ بغیر کسی خرخشے کے اپنی ریاست پر قابض رہا ۔ جب وہ اولاد نرینہ چھوڑے بغیر انتقال کر گیا تو مراد ثانی نے اس کی جائداد بحق سرکار ضبط کر لی ۔ محمود ثانی کی جانشینی کے موقع پر ۱۴۵۳ء میں ایک مدعی حکومت نے علم بغاوت بلند کیا اور قرامان اوغلو نے اس کی اعانت کی مگر یہ بغاوت جلد ھی دبا دی گئی ۔ اس وقت گرمیان کے علاقے کو گرمیان اور قراحصاری صاحب کی دو سنجاقوں میں تقسیم کر دیا گیا، ۱۴۵۳ء میں کوتاھیہ آناطولی کے بیگلر بیگ کا صدر مقام بن گیا ۔ حسب ذیل شجرۂ نسب کی بنیاد اس مواد پر ہے جو دستیاب ہو سکا ہے ۔

علی شیر (۷۰۰ھ کے قریب)
|
گرمیان خان (۷۰۰ تا ۷۳۰ھ کے قریب) = یعقوب اول
|
محمد
|
سلیمان شاہ (۷۷۹ھ کے قریب)
|
یعقوب ثانی (۷۹۰ تا ۷۹۳ھ؛ ۸۰۵ تا ۸۳۲ھ)

اس سلسلے میں بہترین مأخذ حلیل اذھم ہے (در *Revue Historique publiee par l' Institut d' Histoire Ottoman I*، ص ۱۱۲ ببعد؛ سلیمان شاہ اور یعقوب ثانی کے انتہائی کمیاب سکّوں کا ذکر احمد توحید نے *Catalogue of the Moh. Coins in the Ottoman Museum* کے حصۂ چہارم، ص ۲۹۴ ببعد و ۵۲۹ میں کیا ہے .

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ھیں.

(J. H. MORDTMANN)

گَـزُولی : رکّ بہ جَـزُولی.

گَـزہ (Gaza) : رکّ بہ غـزّۃ .

گَکّھـڑ : قبیلۂ گکھڑ پنجاب میں راولپنڈی، اٹک اور جہلم اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ضلع ہزارہ، نیز چناب کے مغرب میں ریاست جموں کے علاقوں میں آباد ہے ۔ یہ سب لوگ (مذھبًا) مسلمان ھیں اور برصغیر کے شمال مغربی پہاڑی علاقوں اور دامن کوہ کے اضلاع کی زراعت پیشہ اقوام میں انھیں ایک بلند معاشرتی مقام حاصل ہے اور عام طور پر راجپوت نسل کے قبیلوں سے علٰحدہ سمجھے جاتے ھیں ۔ ان میں سے بعض اپنے آپ کو مغل کہتے ھیں، لیکن راجا جہاندار خان (ہزارہ گکھڑوں کے سردار) کا دعوٰی تھا کہ وہ نوشیروان اور یزدگرد کی اولاد میں سے ھیں اور ان کا لقب کیانی ہے ۔ وہ بیان کرتے تھے کہ ان کے اسلاف

ایران سے نکل کر چینیوں کے ماتحت تبت پر حکومت کرتے رہے، پھر انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور کابل چلے آئے ۔ بالآخر وہ محمود غزنوی کے ساتھ برصغیر میں داخل ہوے ۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان مصدقہ نہیں ہے، لیکن اس میں گکھڑوں کے ہاں کی ایک مشہور روایت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ ان کی ابتدا وسط ایشیا سے ہوئی تھی ۔ بہت اغلب ہے کہ گکھڑ ان اقوام میں سے ایک ہوں جو عہد کشان سے لے کر ہپتالیوں (ہیاطلہ، Epthalites) کے زمانے تک برصغیر میں داخل ہوتی رہیں ۔ لیکن اس امر کا کوئی قطعی اور بین ثبوت دستیاب نہیں ہوتا ۔ کننگھم Cunningham کی رائے میں وہ کشان (Kushans) ہی تھے ۔ زمانۂ مابعد کے اکثر مؤرخین انھیں وہی قوم سمجھتے رہے ہیں جس کا ذکر تاریخ فرشتہ، ترجمۂ Briggs، ۱ : ۴۶، ۱۸۲ میں گکّر (Gukkurs) کے نام سے کیا گیا ہے ۔ اس قوم نے ۳۹۹ھ/۱۰۰۸ - ۱۰۰۹ء میں محمود غزنوی کے مقابلے میں ہندو راجاؤں کی متحدہ افواج میں شمولیت اختیار کی تھی ۔ اس کے بعد ۶۰۲ھ/۱۲۰۵ - ۱۲۰۶ء میں محمد بن سام کے خلاف بھی یہ قوم لڑی ۔ فرشتہ نے اس کے قتل کا الزام ان پر عائد کیا ہے؛ تاہم ہمارے پاس اس بات کے لیے مضبوط دلائل موجود ہیں کہ قبیلۂ زیر بحث کا نام گکھڑ کے بجائے کوکر (برائے کھوکھر) پڑھنا چاہیے ۔ جہاں تک ۶۰۲ھ کے واقعات کا تعلق ہے Raverty (طبقات ناصری، ترجمہ، ۱ : ۴۸۵ حاشیہ) نے اس پر مکمل بحث کی ہے۔ تاہم جہاں تک محمود غزنوی کے زمانے میں ۳۹۹ھ کے واقعات کا تعلق ہے یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جس بہادر دستے نے پشاور کے قریب اس کی فوج پر شبخون مارا تھا وہ کھوکھر نہیں بلکہ گکھڑ ہی تھے، کیونکہ یہ مقام گکھڑوں کے علاقے کے قریب واقع ہے ۔ اس کے برعکس کھوکھر وسطی پنجاب کے رہنے والے ہیں ۔ بہرحال پرانی تاریخوں مثلاً تاریخ یمینی یا طبقات ناصری میں اس قوم کا کہیں ذکر نہیں ملتا ۔ ہمارا واحد مأخذ فرشتہ ہے جو اس کے نام کو کھکر کی صورت میں قلمبند کرتا ہے ۔ ممکن ہے کہ بلبن نے کوہ جود [کذا] (Salt Range) کے پہاڑی قبیلوں پر جو حملہ کیا تھا وہ انھیں کے خلاف ہو ۔ شہنشاہ بابر کے زمانے میں گکھڑ ایک بار پھر گمنامی کے پردے سے باہر نکلے ۔ ۹۲۵ھ/۱۵۱۹ء میں بابر نے کوہ جود [کذا] کے دو گکھڑ سرداروں کے باہمی جھگڑے میں مداخلت کی ۔ اس نے ان کا قلعہ پرہالہ فتح کر لیا اور باقی خان گکھڑ نے اس کی اطاعت قبول کر لی، لیکن بعد ازاں وہ پھر باغی ہو گیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ قبیلے کی سرداری اس کے حریف سردار تاتار خان کے کنبے ہی میں رہی جس کی بابر نے اعانت کی تھی، اور جیسا کہ آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے اکبر کے عہد میں تاتار خان کے بیٹے سلطان سارنگ اور سلطان آدم اس قبیلے پر حکمران تھے اور سارنگ خان کا پوتا نظر خان پنج صدی (بعد ازآں ۱۰۰۱ھ میں یک ہزاری) کے منصب پر فائز تھا ۔ جہانگیر اپنی تُزک میں اس سفر کا حال بیان کرتا ہے جو اس نے ۱۰۱۶ھ میں گکھڑوں کے علاقے میں کیا تھا ۔ اس نے نظر خان کے باپ سید خان کی ایک بیٹی سے شادی بھی کی تھی ۔ وہ لکھتا ہے کہ گکھڑوں کا علاقہ راولپنڈی اور حسن ابدال کے درمیان درۂ مارگلا تک پھیلا ہوا ہے ۔ سکھوں کی حکومت میں [illegible] خاصے مصائب اٹھانا پڑے، لیکن اس کے بعد وہ پھر سنبھل گئے ہیں اور اب اچھی حیثیت رکھتے ہیں ۔ انگریزی حکومت میں انھیں خاص طور پر فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا ۔

گکھڑ پانچ قبیلوں میں منقسم ہیں : ہکیال، اسکندرال، فیروزال، آدمال اور سارنگال ۔ یہ نام ان

کے آباء و اجداد کے ناموں پر رکھے گئے ہیں ۔ مؤخر الذکر دونوں قبیلے عہد اکبری کے سرداروں آدم اور سارنگ کی اولاد سے ہیں ۔ سارنگال ہزارہ اور اٹک میں اور آدمال راولپنڈی اور جہلم میں آباد ہیں ۔ ان کے سرداروں کا لقب پہلے سلطان تھا، لیکن سکھوں کے زمانے سے راجا ہے ۔ مرحوم راجا جہانداد خان سی ۔ آئی ۔ ای اپنے زمانے کے نامور لوگوں میں سے تھے ۔ ان کی جگہ ۱۹۰۶ء میں ہزارہ کے گکھڑوں کا سردار ان کا بیٹا علی حیدر خان بنا ۔

مآخذ : (۱) Ibbetson : *Out-lines of Panjab Ethnography*، (کلکتہ ۱۸۸۳ء)، ص ۳۰۰؛ (۲) Griffen : *Panjab Chiefs*، (لاہور)؛ (۳) فرشتہ : تاریخ، لیتھو طبع لکھنؤ، ۱ : ۴۶ تا ۵۸ (ترجمہ Briggs، ۱ : ۱۳۶ و ۱۸۲)؛ (۴) Elliot and Dowson : *History of India*، ج ۲، ضمیمہ، ص ۴۴۴؛ (۵) ابوالفضل : آئین اکبری، Blochmann ۱ : ۴۸۶ (کلکتہ ۱۸۷۳ء)؛ (۶) Massy : *Chiefs and Families of the Panjab*، (الٰہ آباد ۱۸۹۰ء)، ص ۴۲۴؛ (۷) طبقات ناصری، ترجمۂ انگریزی از Raverty، ۱ : ۴۸۱ ببعد (لنڈن ۱۸۸۱ء)؛ (۸) تزوک بابری، ترجمۂ Erskine، لنڈن ۱۸۲۶ء، ص ۲۶۹؛ (۹) Cunningham : *Later Indo-Scythians Num. Chron.*، ۱۸۹۳ء، ص ۹۴ .

(M. LONGWORTH DAMES)

⊗ **تعلیقہ : گکھڑ قوم کا پاکستان و ہند کی تاریخ** میں ایک خاص مقام ہے ۔ اس قوم کی تاریخ "کیگوہر نامہ" کے عنوان سے رایزادہ دیوان دُنی چند نے لکھی تھی جو ڈاکٹر محمد باقر کے اہتمام سے پنجابی ادبی اکیڈمی نے ۱۹۶۵ء میں لاہور سے شائع کی ہے ۔ کتاب فارسی میں ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا تعارف انگریزی میں کرایا ہے اور انھوں نے گکھڑوں کی تاریخ مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانے تک بیان کر دی ہے ۔ اپنے تعارف کے بعد انھوں نے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج ۴۰، حصۂ اول، ۱۸۷۱ء، ص ۶۷ تا ۱۰۷ سے لے کر گکھڑوں کی وہ تاریخ بھی شامل کر دی ہے جو J. G. Delmerick نے انگریزی میں لکھی تھی اور جس میں فاضل مقالہ نگار نے گکھڑ سلاطین اور سرداروں کا بقید تاریخ ذکر کیا ہے ۔ ان تینوں مآخذ سے استفادہ کرکے ذیل میں اس قوم کی مختصر تاریخ درج کی جاتی ہے ۔

۱۰۲۱ تا ۱۷۷۳ء نیلاب (سندھ) سے چناب تک گکھڑ وسیع علاقے کے مالک رہے ہیں ۔ وہ اپنا نسب کیگوہر (کَےگوہر) سے شروع کرتے ہیں جو کَےقباد اور کَےکاؤس شاہان ایران کا معاصر اور اصفہان کا حکمران تھا ۔ سلطان کیگوہر کے بیٹے نے تبت فتح کیا اور اپنے لڑکے سلطان تبت کے حوالے کیا ۔ کئی نسلوں تک یہ سلاطین تبت پر حکمرانی کرتے رہے اور پھر ان میں سے سلطان قاب نے کشمیر فتح کیا ۔ یہاں بھی کئی نسلوں تک یہ حکمران رہے ۔ ان کے تیرھویں سلطان رستم کو کشمیریوں نے بغاوت کرکے قتل کر دیا ۔ اس کا لڑکا سلطان قابل، بھاگ کر کابل چلا گیا جسے فتح کرکے اس نے وہاں حکومت قائم کی ۔ ناصرالدین سبکتگین نے لمغان کے مقام پر ۹۷۶ء میں سلطان قابل سے لڑائی کی ۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان دوستانہ مراسم قائم ہوگئے ۔ قابل خان نے سبکتگین کی ملازمت اختیار کر لی اور جب محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس کا بیٹا گکھڑ شاہ ساتھ تھا ۔ تسخیر ہند کے بعد اسے کابل سے لے کر سندھ ساگر دو آب کی حدود تک کا علاقہ عطا ہوا ۔ اس نے بعد میں دریاے جہلم کے کنارے پر اس قصبے کو اپنا دارالحکومت بنایا جسے اب رام کوٹ کہتے ہیں ۔ وہ ۱۰۲۷ء میں فوت ہوا ۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا بج شاہ ہوا ۔ جب سلطان معزالدین محمد بن سام نے حملہ کیا تو سلطان مَنگ خان گکھڑ حکمران تھا ۔ منگ خان کی اولاد میں

سے ملک بوگا خان نے رھتاس میں ایک آزاد حکومت قائم کی جہاں اس نے بوگیال قبیلے کا آغاز کیا جو اب بھی رھتاس اور ڈومیلی میں آباد ہے ۔ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور کے خلاف گکھڑوں کے سردار ملک قاد خان اور اس کا بیٹا گل محمد لڑے ۔ اسی گل محمد نے ۱۴۳۶ء میں گلیانہ شہر آباد کیا ۔ بابر نے گکھڑوں کا ذکر اپنی توزک میں کیا ہے ۔ اس نے ان کے دارالحکومت پھروالہ [پرہالہ] کو فتح کیا ۔ گکھڑ حکمران ھاتھی خان کو شکست ہوئی، لیکن اس نے بابر کے ساتھ صلح کر لی اور سلطان کا خطاب پایا ۔ ھاتھی خان کی وفات پر سلطان سارنگ خان ۱۵۲۵ء میں گکھڑوں کا سردار بنا ۔ دہلی تک مہم کے دوران میں خدمات کے صلے میں بابر نے اسے چناب سے نیلاب (سندھ) تک کا علاقہ عطا کیا ۔ بابر کے اس احسان کو یاد رکھتے ہوے سارنگ خان نے رھتاس کے قلعے کی طرف شیر شاہ سوری کے زمانے میں چھیڑ چھاڑ جاری رکھی اور آخر کار سلیم شاہ سوری نے تخت نشین ہونے پر حملہ کر کے سارنگ خان اور اس کے سولہ بیٹوں کو ۱۵۴۶ء میں ایک لڑائی میں تہ تیغ کر دیا ۔ سلطان سارنگ خان کا مقبرہ روات (نزد راولپنڈی) میں ہے ۔ اس فتح کے باوجود سلیم شاہ گکھڑوں کی مزاحمت کو ختم نہ کر سکا ۔ سلطان آدم خیل اپنے بھائی سارنگ خان کا جانشین بنا ۔ ھمایوں آیا تو اس نے شہزادۂ کامران کو اس کے حوالے کر دیا جو سلیم شاہ سوری کی طرف سے مایوس ہو کر اس کے پاس آیا ہوا تھا ۔ ھمایوں نے پھروالہ کے قلعے میں کامران کی آنکھیں نکلوا دیں ۔ باھمی نزاع کے باعث گکھڑوں میں افراتفری مچ گئی اور شہنشاہ اکبر نے ان کا علاقہ مختلف گکھڑ سرداروں کے درمیان تقسیم کر دیا ۔ ان ایام میں شادمان خان گکھڑ نے اکبر کے خلاف بغاوت بھی کی ۔ گکھڑ سرداروں میں سے کئی ایک جہانگیر، شاھجہان اور عالمگیر کی افواج میں مختلف مناصب پر فائز رہے ۔ جب احمد شاہ ابدالی نے پوٹھوھار کے علاقے پر قبضہ کیا تو اس نے سلطان مقرب خان کو ڈنگلی اور پھروالہ کا پرگنہ دیا، تخت پڑی (آکبر آباد) کا پرگنہ سہابت خان اور علی خان کو اور راولپنڈی کا پرگنہ نوازش علی خان کو ۔ سلطان مقرّب خان آخری آزاد گکھڑ حکمران تھا ۔ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ وہ کئی مہموں میں شامل رہا اور اس سے نواب کا خطاب بھی حاصل کیا ۔ اس کے زمانے میں گکھڑ اس قدر طاقتور تھے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھے ۔ وہ ۱۷۶۳ء میں سکھوں سے گجرات میں لڑتا ہوا کام آیا ۔ یہ خبر سن کر احمد شاہ ابدالی نے نواب سر بلند خان کو بھیجا ، مگر سکھوں نے اسے اور نواب مقرب خان کے بیٹوں کو شکست دی اور گکھڑوں کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا ۔ اس طرح ۱۷۷۳ء میں گکھڑ قبیلے کی حکومت ۷۵۲ سال بعد ختم ہو گئی جس کا آغاز ۱۰۲۱ء میں ہوا تھا .

کیگوھر نامہ سے بہت سے قلعوں اور قصبوں کی تاریخہاے تعمیر کا بھی پتا چلتا ہے ۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گکھڑ خواتین کی شادی مغل شہزادوں سے ہوئی تھی ۔ اس کتاب سے اس امر کا بھی علم ہوتا ہے کہ گکھڑ سردار کیسے اعلٰی سیاسی شعور کے مالک اور صاحب تدبیر تھے ۔ مذکورۂ بالا سلطان شادمان خان (م ۱۶۶۸ء) اپنے زمانے میں فارسی زبان کا مشہور شاعر بھی تھا ۔ اس کی فارسی شاعری کے سلسلے میں دیکھیے تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند، ج ۴، فارسی ادب ۲، طبع لاھور ۱۹۷۱ء ص ۳۷۲ تا ۳۷۷ ۔ (عبدالغنی، رکن ادارہ نے لکھا).

(ادارہ)

گُل : (فارسی)، گلاب کا پھول (لیکن عام پھول کو بھی گل کہ دیا جاتا ہے ۔ اور پھولوں

کی مختلف اقسام کے ناموں کے ساتھ بھی لفظ گل لایا جاتا ہے) ۔ گلاب کو مشرقی (اردو ۔ فارسی) شاعری میں بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اسی وجہ سے اس کا نام فارسی، ترکی اور هندوستانی [اردو] کتابوں کے عنوانات میں اکثر نظر آتا ہے ۔ گل اور بلبل کے باهمی تعلقات پر پیشتر بحث ہو چکی ہے [رك بہ بُلبُل] لہٰذا ایسی متعدد نظمیں موجود ہیں جن کا عنوان گل [یا] بلبل ہے [یعنی جن کے عنوان میں لفظ گل آتا ہے ۔ اسی طرح بلبل یا عندلیب بھی بعض عنوانات میں سے ہے ۔ عندلیب (شاہ ناصر، والد خواجہ میر درد دہلوی) کی ایک کتاب کا نام نالۂ عندلیب ہے اور بطور تخلص بھی یہ لفظ استعمال ہوا ۔ عندلیب کی جمع عنادل] ۔ لیکن گُل کی اور بھی کئی چیزوں سے نسبت ہے ۔ مثلاً گل استعارۂ محبوب؛ اردو میں اور فارسی میں بھی عجیب بات، انوکھی خلاف توقع بات مثلاً این گل دیگر شگفت میں ۔ دیگر استعمالات کے لیے دیکھیے فرہنگ آنند راج (فارسی) فرہنگ آصفیہ و نور اللغات (اردو)] دیکھیے اشاریہ *Grundriss*، جلد ۲ و در *der Iran. Phil.*، جلد ۲ و در Gibb : *History of Ottoman Poetry*، [جو ترکیبیں بھی قابل توجہ ہیں مثلاً گل و مل، سبزہ و گل ۔ اور] گل و صنوبر وغیرہ ۔ قصوں کہانیوں میں یہ نام بطور عنوان آتے ہیں ۔ گل و صنوبر کا ذکر Ethe نے *Grundriss der Iran* میں کیا ہے، هندوستانی [اردو] اور هندوستان کی دیگر مقامی زبانوں میں اس قصے کے لیے دیکھیے *Histoire de la Litter Hindouie*، جلد ۱، ص ۱۰۵ بعد؛ اسی مصنف نے اس نظم کا ایک مکمل فرانسیسی ترجمہ *Revue Orient et Americ*، جلد ۷، ص ۶۹ تا ۱۲۰ میں شائع کیا ۔ اس کے اصل نسخے جو بلاد مشرق میں شائع ہوئے ہیں ان کے لیے دیکھیے Ethe کتاب مذکورۂ بالا ص ۳۲۲ ۔

(CH. HUART [و ادارہ])

⊗ تعلیقہ : دراصل فارسی، اردو اور ترکی شاعری میں گل (و گلزار) کی ایک تہذیبی اہمیت ہے جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ شبلی نعمانی نے شعر العجم، ج ۴، ص ۱۷۰، ۱۷۱ طبع انوار المطابع لکھنو ۱۳۲۱ھ میں ان محاورات کا ذکر کیا ہے جن میں گل کا لفظ کسی ترکیب اور جملے میں شامل ہو کر خاص معانی پیدا کرتا ہے ۔

فارسی شاعری میں الفاظ گل و گلزار کا بکثرت استعمال، شبلی کی رائے میں تو اس امر کا غماز ہے کہ ایران میں پھولوں کی (سبزہ و گل) کی بڑی کثرت ہے جس کا شاعری میں بھی عکس ابھرتا ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایران کا خاصا حصہ ریگستان اور صحرا ہے جیسا کہ جغرافیہ نگاروں اور اکثر سیاحوں نے لکھا ہے (ملاحظہ ہو سیّد عبداللہ : فارسی زبان و ادب، طبع مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۷ء مقالۂ گل و گلزار کی تہذیبی اہمیت ، ص ۷۵-۸۴) اور گل و گلزار کا بکثرت تذکرہ بہتات کی بنا پر نہیں بلکہ سبزہ و گل کی کمی کی بنا پر ہے اور یہ کمی ان کی تمنا کا اظہار کرتی ہے ۔ یوں عام ایرانی پھولوں اور سبزہ وچمن کے شائق ہوتے ہیں ۔ محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب سخندان فارس طبع استقلال پریس لاہور (ص ۳۶۸، ۳۷۲ تا ۳۷۵، ۵۱۴) میں گل کی بہار اور اس کے ساتھ بلبل کی چہک کا ذکر بڑے رومانی انداز میں کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ایرانی گھروں میں باغیچے آراستہ کرنے کے عادی ہیں اور یہ ان کے ذوق کا حصہ ہے ۔

فارسی اور اردو ادب میں مختلف پھولوں کا ذکر اور ان کی صفات و خواص کا جو تذکرہ ہے اس لیے پھولوں کی اقسام، ان کے رنگوں کی نوعیت، اور دیگر کوائف پر ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے ۔ بعض لوگ گل و بلبل کے استعارے کا ذکر تحقیر سے کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ

شعراے فارسی، اردو و ترکی نے اس ایک استعارے
کے توسط سے سیکڑوں بلند حقائق بیان کیے ہیں
(تفصیل کے لیے دیکھیے سید عبداللہ : مقالۂ گل و
گلزار کی تہذیبی اہمیت در کتاب فارسی زبان و ادب،
طبع مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۷ء) [سید عبداللہ
رئیس ادارہ نے لکھا]. (ادارہ)

* **گل بابا** : ایک بکتاشی درویش ـ وہ مرزِفون
(مرزیوان ایشیاے کوچک میں سیواس کی ولایت میں)
کا باشندہ تھا ـ اس نے ترکوں کی کئی جنگوں میں
حصہ لیا جو سلطان محمد ثانی، سلطان بایزید ثانی،
سلطان سلیم اول اور سلطان سلیمان ثانی کے عہد
حکومت میں لڑی گئیں اور بوڈا (اوفِن Ofen) کے
محاصرے کے دوران ۲۹ ربیع الآخر ۹۴۸ھ/۲۱
اگست ۱۵۴۱ء کو شہر کی فصیل کے نیچے ایک
جھڑپ میں شہید ہو گیا (پیچوی، ۱ : ۲۷۲) ـ اسے
اسی مقام پر دفن کرنے کے بعد جہاں وہ شہید ہوا
تھا، سلطان سلیمان ثانی نے اعلان کر دیا کہ وہ
شہر کا محافظ ولی [گوزجی سی = نگران] ہے ـ باب
خروس Khoros کے باہر ولی بے کے گرم پانی کے
چشموں کے قریب ایک بکتاشی خانقاہ بھی اسی کے
نام سے منسوب کی گئی، اس خانقاہ کو غازی میخال کی
اولاد نے خیراتی مقاصد کے لیے قائم کیا تھا ـ اس ولی
کا مزار بوڈاپسٹ میں موجود ہے ـ یہ ترکن گسی
Turkengasse ترک کوچہ Törökutcza میں واقع
ہے ـ اس کی شکل ہشت پہلو ہے ـ اس کے گنبد
پر سیسے کی چادریں اور لکڑی کے چوکے لگے ہوے
ہیں ـ چوٹی پر ایک لالٹین ہے اور اس کا بیرونی حصہ
بینوں سے ڈھکا ہوا ہے ـ Toth Béla نے اپنی تصنیف
Szájról Szájra میں اس ولی پر بحث کی ہے.

مآخذ : اولیا چلبی، سیاحت نامہ، ۶ : ۲۲۵،
۲۴۴، (اس کا ماخذ وہ معلومات ہیں جو اسے اپنے والد
سے حاصل ہوئیں).

(CL. HUART)

* **گلبدن بیگم** : شہنشاہ بابر کی بیٹی، ہمایوں کی
سوتیلی بہن اور اکبر کی پھپی؛ اس کی ماں دلدار
بیگم تھی جس کا اصلی نام صالحہ سلطان تھا اور جو
سلطان محمود میرزا فرمانرواے سمرقند کی بیٹی تھی ـ
گلبدن کی ولادت شہر کابل میں ہوئی تھی اور
جیسا کہ وہ اپنی دلآویز سرگذشت میں بتاتی ہے
دسمبر ۱۵۳۰ء کے آخری ہفتے میں جب اس کے
والد کا انتقال ہوا تو اس کی عمر آٹھ برس کی تھی،
لہٰذا وہ ۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء میں پیدا ہوئی ہو گی ـ
جب اس کا والد ہندوستان فتح کرنے گیا تو وہ کابل
ہی میں مقیم رہی لیکن ۱۵۲۹ء میں وہ اس کے پاس
پہنچ گئی، چنانچہ جب اس کا انتقال ہوا تو وہ
آگرے ہی میں تھی، ۱۵۳۹ء میں بھی وہیں
تھی، جب ہمایوں شکست کھا کر بنگال سے واپس
آیا ـ معلوم ہوتا ہے اس وقت اس کی شادی خضر
خواجہ خان سے ہو چکی تھی جو چغتائی خاندان کا
ایک فرد اور یونس خاں کا پرپوتا تھا ـ ریو Rieu
بیان کرتا ہے کہ اس کی شادی ۹۴۲ھ/۱۵۳۰ء میں
ہوئی تھی لیکن معلوم نہیں کہ اس نے کس سند پر
یہ لکھا ہے ـ اپنے خاوند سے جو ہمایوں اور اکبر
کا ایک عہدیدار تھا اور ایک زمانے میں پنجاب
کا صوبیدار بھی رہا، اس کے ہاں کم از کم ایک بیٹا
محمد یار اور ایک بیٹی پیدا ہوئی ـ جب ہمایوں
ہندوستان سے نکلا تو وہ اس کے ساتھ ایران نہیں
گئی بلکہ اپنے بھائیوں کامران اور ہندال کے پاس
افغانستان میں رہی اور ۱۵۴۵ء تک پھر ہمایوں
سے نہیں ملی ـ ہمایوں کی وفات تک وہ کابل چھوڑ
کر ہندوستان نہیں آئی، یہاں وہ اپنے بھتیجے
[اکبر] کے عہد حکومت کے دوسرے سال یعنی
۱۵۵۷ء میں پہنچی تھی ـ ۱۵۷۶ء میں وہ اپنی
بھتیجی سلیمہ بیگم اور خاندان شاہی کی دوسری
خواتین کے ہمراہ حج کے لیے مکۂ معظمہ گئی ـ واپسی

کے سفر میں عدن کے قریب ان کا جہاز تباہ ہو گیا اور وہ ۱۵۸۱ء یا ۱۵۸۲ء سے قبل واپس نہ آ سکی (بداؤنی، ترجمہ از Lowe، ص ۲۱۶) - ۱۵۹۰ء میں وہ اکبر کی والدہ کے همراہ شہنشاہ سے ملنے کابل گئی۔ الزبتھ ملکۂ انگلستان کی وفات سے چند ھی روز بعد ۶ ذوالحجہ ۱۰۱۱ھ / ۱۷ مئی ۱۶۰۳ء کو وہ آگرے میں وفات پا گئی - اس وقت قمری سال کے حساب سے اس کی عمر ۸۲ سال تھی - اس کی صحیح تاریخ وفات ریو Ricu کی *Catalogue* ۳ : ۱۰۸۳ میں دی گئی ھے - اس کا بے حد احترام کیا جاتا تھا - اکبر نے اس کا جنازہ خود اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا۔

گلبدن کے بارے میں دلچسپ بات یہ ھے کہ اس نے اپنی جو سرگذشت لکھی، اس کتاب کا نام ھمایوں نامہ ھے اور مسز اے بیورج Mrs. A. Beveridge نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے اسے طبع اور ترجمہ کیا (لنڈن ۱۹۰۲ء) - بدقسمتی سے اس کا جو واحد نسخہ دستیاب ہو سکا ھے، وہ وھی ھے جس کا ذکر ریو Rieu نے *Catalogue of Persian Mss* ۱ : ۲۴۷ میں کیا ھے، لیکن یہ نسخہ ناسکمل ھے اور آخری جملے کے وسط میں ختم ہو جاتا ھے - اس نے یہ سرگذشت اکبر کی درخواست پر لکھی تھی تاکہ اس کے معتمد ابوالفضل کو اپنی تاریخ کے لیے سواد مل سکے۔ غالباً یہ ۱۵۸۷ء کا واقعہ ھے - اس کی کتاب اس لحاظ سے بہت گرانقدر ھے کہ اس میں [بابر اور ھمایوں کی] گھریلو زندگی کی تفصیلات، مصنفہ کی ایک دلآویز تصویر اور ھمایوں کے زمانے کی درباری زندگی کا بیان شامل ھے - اکبر نامہ کی تیسری جلد میں کئی واقعات کے سلسلے میں گلبدن کے حوالے موجود ھیں۔

(H. BEVERIDGE)

* **گُلبَرگہ** : رک بہ احسن آباد، گلبرگہ۔

* **گُلپایگان** : ایران کا ایک شہر جو دریاے قوم کی زرخیز وادی اور کوھستان زاگروس Zagros کے دامن میں واقع ھے۔ عرب جغرافیہ نگار اسے جرباذ خان یعنی گر باذ خان لکھتے ھیں - حاجی خلیفہ (جہان نما، ص ۲۹۹) ان دونوں شکلوں سے واقف ہونے کے باوجود دربایگان لکھتا ھے لیکن یہ گربایگان کی جگہ غالباً کتابت کی غلطی کے باعث لکھا گیا ھے۔ موجودہ زمانے ھی میں اس مقام کا ذکر کثرت سے سننے میں آیا ھے - عرب جغرافیہ نویسوں نے اس کا ذکر محض اصفہان سے ھمذان جانے والی سڑک پر ایک پڑاؤ کی حیثیت سے کیا ھے - اگرچہ گلپایگان ایک ایرانی صوبے کا صدر مقام ھے جس کی زرعی پیداوار مقامی ضرورتوں کو پورا کرتی ھے اور اس کے علاوہ وھاں سے افیون، تمباکو اور کپاس بھی برآمد کی جاتی ھے، تاهم اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ھے کہ اس پر ادبار طاری رھا ھے - اس کے بارہ تا پندرہ ھزار باشندوں میں کچھ یہودی بھی ھیں جن کے تقریباً ۱۰۰ خاندان یہاں آباد ھیں۔

مآخذ : (۱) یاقوت، معجم، ۲ : ۳۰ ؛ (۲) *The Lands of the Eastern Caliphate* : Le Strange، ص ۲۱۰ ؛ (۳) *Erdkunde* : Ritter، ۹ : ۶۳ ؛ (۴) *La Perse d' Aujourd'hui* : Aubin، ص ۳۱۰ ببعد؛ (۵) قزوینی، طبع Wüstenfeld، ۲ : ۲۳۳ ؛ (۶) Schefer : سیاست نامہ، تکملہ، ص ۱۹۲ ؛ (۷) Brugsch : *Reise nach Persien*، ۲ : ۲۵ ببعد۔

(CL. HUART)

گُل خانہ : یا گُل خانہ سیدانی، یہ ان باغات کے ایک حصے کا نام ھے جو استانبول میں قدیم شاھی محل کے مشرق میں بحیرۂ مارمورا کے کنارے واقع ھیں۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ھے کہ پرانے زمانے میں دربار کے لیے گلاب کی مٹھائیاں جس جگہ تیار کی جاتی تھیں وہ یہیں واقع تھی - تاریخ میں اس مقام کو سلطان عبدالمجید کے اس

مشہور و معروف فرمان کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے جسے عام طور پر خطِّ شریف کہا جاتا ہے اور جس میں اصلاحات کا اعلان کیا گیا تھا ۔ یہ فرمان ۲۶ شعبان ۱۲۵۵ھ / ۳ نومبر ۱۸۳۹ء بروز یکشنبہ اسی مقام پر عوام کے سامنے سنایا گیا تھا ۔ دیکھیے تفصیلات Rosen : *Geschichte der Türkei*، ۲: ۱۳ ببعد؛ لطفی: تاریخ، ۶ : ۵۹ ببعد؛ خاص اس جگہ کے بارے میں دیکھیے White : *Three years in Constantinople*، ۱ : ۱۱۰ اور *Revue Histor. publ. par l' Inst.d' Hist. Ott.*، ۱ : ۲۹۱ ببعد ۔

(J. H. MORDTMANN)

الگلدکی (جلدکی) : علی بن ایدمر بن علی ۔ دیگر مآخذ کی رُو سے عزّالدین ایدمر بن علی ۔ علوم مخفی بالخصوص کیمیا گری کے بارے میں متعدد کتابوں کا مصنّف، ان کتابوں کی تفصیل Brockelmann نے *Gesch. der. arab. Litterat* ۲ : ۱۳۹ میں دی ہے اور حسب ذیل کو مطبوعہ بتایا ہے : المصباح فی اسرار علم المفتاح، ۱۳۰۲ء، اور نتائج الفکر فی احوال الحجر، بولاق، تاریخ ندارد؛ اس کی زندگی کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہوئے ہیں، نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ وثوق سے ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنی ایک کتاب ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء میں دمشق میں اور ایک اور ۷۴۲ھ (جیسا کہ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے، ۷۴۳ھ نہیں) میں قاہرہ میں لکھی تھی، عموماً اس کا سنہ وفات ۷۴۳ھ / ۱۳۴۲ء بیان کیا جاتا ہے تاہم Brockelmann نے ۷۶۲ھ/۱۳۶۱ء بتایا ہے ۔

مآخذ : رک بہ Brockelmann، کتاب مذکور.

(M. LONGWORTH DAMES)

گلدٰ : رک بہ صنف.

گلزار عبدالعلی : (حافظ جھنڈا) ان کے بارے میں پنجابی زبان و ادب کی تاریخیں اور تذکرے خاموش ہیں ۔ فقط احمد حسین قریشی قلعداری نے اپنی کتاب ''پنجابی زبان کی مختصر تاریخ'' مطبوعۂ میری لائبریری، لاھور میں چند معلومات بہم پہنچائی ہیں جن میں انہیں گوجرانوالہ کی ایک معروف شخصیت قرار دیا ہے ۔ علاوہ ازیں وہ بتاتے ہیں کہ ان کے نام سے ایک ''دیوان گلدستہ حافظ جھنڈا'' شائع ہو چکا ہے جو بہت ضخیم ہے ۔ اس کلام کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا کلام پختہ اور اعلٰی پائے کا ہے ۔ کلام سے اصلاحی رنگ نمایاں ہے ۔ اس کی وجہ ان کی مجاھدانہ شخصیت ہے .

مآخذ : متن میں مذکور ہیں.

(شہباز ملک)

گلستان : ایرانی شاعر سعدی شیرازی کی مخلوط نظم و نثر میں ایک مشہور و معروف اخلاقی کتاب ۔ یہ ایک ''مقدمہ'' اور آٹھ ابواب (سیرت پادشاہان، اخلاق درویشان، فضیلت قناعت، فوائد خاموشی، عشق و جوانی، ضعف پیری، تاثیر تربیت، آداب صحبت اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، اس کی بہت سی حکایات شاعر کے ذاتی تجربات کے متعلق معلومات بہم پہنچاتی ہیں، گلستان ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء میں، یعنی ان کی کتاب بوستان سے ایک سال پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچی ۔ اس کا انتساب فارس کے اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی اور اس کے بیٹے سعد کے نام سے کیا گیا ہے ۔ اس کی بہت سی طبعات حسب ذیل لوگوں کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہیں: F. B. Eastwick Hereford ۱۸۵۰ء؛ Johnson ایضاً ۱۸۶۳ء؛ J. T. Platts، لنڈن ۱۸۷۴ء ۔ اس کے ترجمے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں ۔ ترجموں میں سے حسب ذیل کا تذکرہ کر دینا چاہیے : لاطینی : از G. Gentius : (*Rosarium Politicum*)، ۱۶۵۱ء، ۱۶۵۵ء)؛ فرانسیسی : از D. Allégre (۱۷۰۴ء)؛

Gaudin (۱۷۸۹ء، ۱۷۹۱ء)؛ Semelet (۱۸۳۴ء)؛ Defrémery (۱۸۵۸ء)؛ Franz Toussaint مع مقدمہ از Comtesse de Noailles، ۱۹۱۳ء)؛ جرمن : از A. Olearius : Persianisches Rosenthal، (۱۶۵۴ - ۱۶۶۰ء)؛ Schummel (۱۷۷۵ء)؛ B. Dorn (۱۸۲۷ء)؛ Ph. Wolff (۱۸۴۱ء)، K. H. Graf (۱۸۴۶ء)، G. H. F. Nesselmann (برلن ۱۸۶۴ء)؛ انگریزی : از Gladwin (فارسی متن مع ترجمہ، کلکتہ ۱۸۰۶ء، ۱۸۰۹ء)؛ Dumoulin (۱۸۰۷ء؛ J. Ross (۱۸۲۳ء)، Eastwick (۱۸۵۲ء)، J. T. Platts (لنڈن ۱۹۷۳ء) E. H. Whinfield (فارسی متن مع ترجمہ و حواشی، لنڈن ۱۸۸۰ء) Edw. Arnold (۱۸۹۹ء)؛ رومانوی : از Gh. Popescŭ Ciocanel (Ploesti ۱۹۰۶ء)؛ پولش : از Biberstein Kazimirsky (پیرس ۱۸۷۶ء)؛ اطالوی : از Gherardo de Vincentlis (منتخبات، نیپلز ۱۸۷۳ء)، عربی از جبرائیل بن یوسف المخلّع (۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء)، اردو : از میر شیر علی افسوس زیر نگرانی جان گلکرائسٹ Gohn Gilchrist (باغ اردو، کلکتہ ۱۸۰۲ء).

مآخذ : (۱) H. Ethé در .Grundr. der Iran. Philol.، ۲ : ۲۹۳ تا ۲۹۶، ۲۹۷، ۳۰۵؛ [(۲) حالی : حیات سعدی، طبع لاہور؛ (۳) شبلی : شعر العجم، طبع اعظم گڑھ].

(CL. HUART)

گُلِستان : تتار (حکومت ایلیزوت پول Elisavetpol میں) کا ایک مقام، اس صلح نامے کی وجہ سے مشہور ہے جو یہاں ۱۸۱۳ء میں مکمل ہوا (''صلح نامۂ گلستان'')، نپولین کی شہ پر فتح علی شاہ نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا، اسلاندوز اور لنکران کے مقامات پر روسی سپہ سالار کوتلیریوسکی Kotliarevsky کی فتوحات کے بعد عہد نامۂ گلستان کی ۱۲ (۲۴) اکتوبر ۱۸۱۳ء کو تکمیل ہوئی جس کے مطابق قرہ باغ، شکی، شیروان، دربند، قوبہ، باکو اور تالش کی ریاستوں (Khanates) پر روسیوں کا قبضہ ہو گیا۔ گنجہ [رک بآں] کی ریاست پہلے ہی سے روسیوں کے قبضے میں تھی۔ اسی سلسلے میں ایران نے وعدہ کیا کہ وہ بحیرۂ خزر میں جنگی جہاز نہیں رکھے گا۔

(A. DIRR)

گُلشنی : ایک ترکی شاعر، صارو خان (ایشیائے کوچک، ولایت آیدین میں) پیدا ہوا۔ وہ سلطان محمد ثانی کا ہم عمر تھا جس کے نام اس نے اپنی کتاب منتسب کی۔ وہ راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا، اس کے مقالات منظوم اخلاقی مکالمات کے ایک سلسلے پر مشتمل ہیں جن کی توضیح حکایات کے ذریعے کی گئی ہے۔

مآخذ : (۱) Gibb : Ottoman Poetry، ۲ : ۳۴۸؛ (۲) v. Hammer : Osm. Dichtkunst، ۱ : ۲۸۶.

(CL. HUART)

گُلشنی : (شیخ ابراہیم) خلوتی سلسلے کے ایک مشہور و معروف صوفی جو آذربیجان میں پیدا ہوئے، تبریز میں تعلیم پائی، اور جب شاہ اسمعیل نے شیعہ مذہب کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا تو وہ ترک وطن کر کے قاہرہ چلے گئے۔ جب اس شہر پر ترکوں کا قبضہ ہوا تو سلطان سلیم اول ان کے ساتھ انتہائی عزت سے پیش آیا، ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸ - ۱۵۲۹ء میں سلطان سلیمان کی دعوت پر وہ قسطنطینیہ گئے جہاں ان کا غیرمعمولی احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ ان کا انتقال قاہرہ میں ۹۴۰ھ/ ۱۵۳۳ - ۱۵۳۴ء میں ہوا۔ انھوں نے فارسی میں ۴۰ ہزار ابیات پر مشتمل ایک صوفیانہ مثنوی، جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی کے جواب میں لکھی۔ ان کے متعدد شاگردوں میں سے خاص طور پر

قابل ذکر یکیجہ واردرا کا شاعر اُصولی اور ایک صوفی یوسف المعروف بہ ''سینہ چاک'' ہیں ۔ انھوں نے ایک سلسلے کی بنیاد رکھی تھی، جو ان کے نام پر گلشنی، یا بعض اوقات ان کے استاد اور مرشد دِدہ عمر روشنی کی نسبت سے ''روشنی'' بھی کہلاتا ہے ۔ یہ سلسلہ اپنے مخصوص عمامے کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے، جس میں آٹھ بل دیے جاتے ہیں۔

مآخذ : (۱) Gibb : *Ottoman Poetry*، ۲ : ۳۷۴؛ (۲) M. d' Ohsson : *Tableau*، ۴ : ۶۲۵، ۶۳۰.

(Cl. Huart)

• گِلگِت . پاکستان کے شمالی علاقوں میں ایک ایجنسی کا نام، جو براہ راست مرکزی حکومت پاکستان کے ماتحت ہے ۔ اس ایجنسی کے صدر مقام کا نام بھی گِلگِت ہی ہے، جو دریاے گلگت پر واقع ہے ۔ اس کے گرد ایک بہت بڑا سلسلۂ کوہ ہے ۔ یہ شہر اس درے کے بالکل مقابل میں ہے، جو ھُنزہ کو جاتا ہے ۔ اس سے پرے شمالی مشرقی کوہ ہندوکش، اسے وخان سے اور مزطاغ مملکت چین سے علیحدہ کرتا ہے ۔ یہاں شین نسل کے لوگ آباد ہیں اور شینا زبان بولی جاتی ہے، جو پشاچہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے؛ یہ نسل غالبًا زیادہ تر آریائی ہے، لوگ بڑے اچھے زراعت کار، شکار اور کھیل کود کے شوقین، خوش مزاج اور خوش باش ہیں ۔ گلگت کو جانے والے راستے دریاے گلگت کے ساتھ ساتھ بنجی کے قریب تک جاتے ہیں، جہاں یہ دریاے سندھ میں جا ملتا ہے ۔ ایک راستہ تراگ بل اور برزل سے ہوتا ہوا کشمیر تک جاتا ہے ۔ اسی طرح ایک راستہ چلاس میں سے گزر کر ایبٹ آباد کو اور وہاں سے درہ بابوسر اور وادی کاغان تک پہنچ جاتا ہے ۔ اب راولپنڈی سے یہاں تک ہوائی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری ہے ۔ گلگت میں تمام آبادی شیعہ مسلمانوں کی ہے، لیکن وہ کٹر یا متعصب نہیں ۔ اس کی قدیم تاریخ کی بابت بہت کم معلومات حاصل ہیں ۔ قدیم ''پرانوں'' کے زمانے کی فہرست کے مطابق چین یا شین درداسیوں کے ساتھ شامل ہیں ۔ البیرونی لکھتا ہے کہ گلگت کے لوگ ترکی بولتے ہیں اور ان کے بادشاہ کو بھٹہ شاہ کہتے ہیں۔ یہ بات بعید الاحتمال معلوم ہوتی ہے کہ وہ ترکی بولتے ہوں، لیکن شین لوگ اب تک ہندوستان کے مغلوں سے اپنی قرابت داری ظاہر کرتے ہیں۔ ابھی حال ہی کے زمانے تک گلگت کا علاقہ ترخانی خاندان کے بادشاہوں کے زیر نگین تھا ۔ یہ خاندان پرانے زمانے کے ایک بادشاہ کی اولاد میں سے ہے، جو چودھویں صدی میں حکومت کرتا تھا اور جس نے یہاں اسلام کی بنیاد قائم کی تھی ۔ اس زمانے سے پہلے بادشاہ کا لقب ''را'' ہوا کرتا تھا ۔ لیکن اس کے بعد یہ لقب ''شاہ راے'' میں تبدیل کر دیا گیا ۔ اس ملک کو بھی اگلے وقتوں میں ''سارگین'' کے نام سے موسوم کیا کرتے تھے ۔ بعد میں گلگت نام استعمال ہونے لگا۔

۱۸۴۱ء میں گلگت ایجنسی کے جائز اور آخری بادشاہ کریم خان کو گوہر رحمٰن (یا گوہر امان)، نے جو یاسین کے ''خوش وقتی'' خاندان کا ایک رکن تھا، ملک سے باہر نکال دیا اور خود علاقے کا مالک بن بیٹھا ۔ وہ نہایت ظالم اور جابر حکمران ثابت ہوا ۔ جلا وطن شہزادے نے کشمیر کے سکھ حاکم کے ہاں پناہ لی، جس نے ۱۸۴۲ء میں گلگت پر چڑھائی کی اور کریم خان کو پھر تخت دلوا دیا ۔ اب وہ سکھ سلطنت کے ماتحت حکومت کرنے لگا، اور جب گلاب سنگھ ڈوگرا ۱۸۴۶ء میں کشمیر کا مہاراجا بن گیا تو گلگت کا علاقہ بھی دوسرے سکھ مقبوضات کی طرح اس کی حکومت میں آ گیا ۔

۱۸۵۲ء میں گوھر رحمٰن نے دوبارہ حملہ کر کے ڈوگروں کو، جو ھنزہ پر حملہ آور ھوے تھے اس علاقے سے نکال دیا اور کریم خان مارا گیا۔ ۱۸۶۰ء میں ڈوگرے پھر قابض ھوگئے اور اس کے کچھ عرصے بعد انھوں نے خرد سال علی داد خان کو "را" مقرر کر دیا، جو ناگر کے حکمران کا بیٹا تھا؛ لیکن وہ ترخانی خاندان کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ سب سے پہلے گلگت ایجنسی بڈلف Biddluph کے ماتحت ۱۸۷۷ء میں قائم ھوئی اور اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں ڈیورنڈ Durand کے ماتحت اس کی تجدید ھوئی۔ ۱۸۹۵ء میں جنگ چترال کے دوران میں ایک فوجی دستے نے، جس نے چترال پر درہ شندر کے راستے پیش قدمی کی تھی، گلگت پر قبضہ کر لیا تھا (رک بہ چترال).

[گو یہ علاقہ ریاست کشمیر کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا لیکن مقامی سرداروں کے ساتھ روابط قائم رکھنے کا کام گلگت میں مقیم انگریز ایجنٹ ھی کیا کرتا تھا۔ تقسیم کے بعد یہ علاقہ پاکستان میں شامل ھوگیا۔ یہ علاقہ بے حد فوجی اھمیت کا حامل ھے۔ حکومت پاکستان اس علاقے کو ترقی دینے کے لیے بہت کوشاں ھے۔ اس کا نظم و نسق مرکزی حکومت کی وزارت امور کشمیر کے ماتحت ھے۔ آزاد حکومت جموں و کشمیر کے لیے وزارت کی طرف سے مقرر کردہ مشیر اعلٰی ھی گلگت ایجنسی و بلتستان کے ریذیڈنٹ کے فرائض سرانجام دیتا ھے].

مآخذ: Biddulph : Tribes of the Hindoo Koosh، کلکتہ ۱۸۸۰ء؛ (۲) Holdich : The Indian Borderland، لنڈن ۱۹۰۱ء؛ (۳) Capt. W. R. Robertson : Chitral Expedition، کلکتہ ۱۸۹۸ء؛ (۴) Grierson : The Pisāca Languages، لنڈن ۱۹۰۶ء؛ (۵) Pakistan Year Book 1975، کراچی ۱۹۷۵ء.

(M. LONGWORTH DAMES)

گمرون: Gamron، جیسے گومرون Gomron وغیرہ بھی لکھا جاتا ھے (دیکھیے لاٰ انگریزی، طبع اول ۱: ۶۹۲ ببعد)؛ خلیج فارس کے کنارے ایک بندرنہ، جسے شاہ عباس اوّل کے عہد حکومت سے بندر عباس کہا جاتا ھے، لاٰ انگریزی ۱: ۶۹۵ - ۱ میں جو مآخذ دیے گئے ھیں، ان میں Yule and Burnell : Hobson Jobson، بذیل مادّہ Gombroon، کا اضافہ کر لیجیے.

(M. LONGWORTH DAMES)

گُناہ: (فارسی؛ عربی: جُناح)، رکّ بہ سیّئۃ.

گنج شکر: رکّ بہ فریدالدین گنج شکر.

گنج العلوم عین الدین: رکّ بہ عین الدین.

گَنْجہ: عربی جَنْزَۃ، جلیساوت پول Jelisawet pol ۱۸۰۴ء سے (مقامی باشندے آج بھی صرف قدیم نام ھی استعمال کرتے ھیں)۔ ارمن مصنف موسی کلنکتوچی Moses KalanKatuači کے بیان کے مطابق (ترجمہ از Patkanian، ص ۲۷۰؛ دیکھیے J. Marquart : *Osteuropäische und* Ostasiatische streifzuge، ص ۴۶۲) یہ شہر سب سے پہلے عربوں کی حکومت میں ۸۴۵ء کے لگ بھگ میں اور حمد اللہ قزوینی (در Schefer، سیاست نامہ، تکملہ، ص ۲۲۷) کی رائے میں ۳۹ھ (غالبًا یہ ۲۳۹ھ=۸۵۳ء-۸۵۴ء ھے) میں آباد ھوا تھا۔ پرانے عرب جغرافیہ دانوں، مثلًا ابن خرّداذبہ اور الیعقوبی کے ھاں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ معلوم ھوتا ھے کہ اس کا نام آذربیجان کے زمانۂ قبل از اسلام کے دارالحکومت پر رکھا گیا تھا (جس کے آثار اب تخت سلیمان کے کھنڈروں کی صورت میں موجود ھیں [رکّ بہ آذربیجان]۔ الاصطخری (طبع ڈخویہ، ص ۱۸۷، ۱۹۳) نے گنجہ کے متعلق صرف اتنا بتایا ھے کہ یہ ایک چھوٹا سا شہر ھے اور برذعہ سے تفلس جانے والی سڑک پر واقع ھے۔ اس کے بیان کے مطابق برذعہ اور گنجہ کا درمیانی فاصلہ ۹ فرسخ اور

یاقوت (۲ : ۱۳۲) کی رو سے ۱۶ فرسخ تھا - برذعہ [رک بآن] کے زوال کے بعد گنجہ اران [رک بآن] کا دارالحکومت قرار پایا - تقریباً ۳۴۰ھ / ۹۵۱ - ۹۵۲ء سے بنو شدّاد یہاں حکمران رہے لیکن سلطان ملک شاہ (۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء - ۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء) نے ان کا تختہ الٹ کر گنجہ بطور جاگیر اپنے بیٹے محمد کو دے دیا - ۵۳۳ھ / ۱۱۳۸ - ۱۱۳۹ء [یہی صحیح تاریخ ہے، جو عماد الدین الاصفہانی (*Recueil des Textes*، طبع Houtsma، ۲ : ۱۹۰) میں درج ہے - باقی تفصیل کے لیے رک بہ 1[1] لائیڈن].

مآخذ : متن میں مذکور ہیں .

(W. BARTHOLD)

* گَنْدُو : Gando، مغربی سوڈان میں فلبہ Fulbe لوگوں کی سلطنت؛ رک بہ پل .

* گندھارا : رک بہ قندھار.

* گَنْڈا پور : [گنڈا پور] ایک افغان قبیلے کا نام، جو ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان [پاکستان] کے علاقے داماں میں آباد ہے - کہا جاتا ہے کہ نسلی اعتبار سے یہ قبیلہ سیّد ہے اور بختیاری قبیلے کی طرح (جو خود بھی سیّد ہونے کا دعوی کرتے ہیں) ابتداءً قبیلۂ استرانہ سے وابستہ تھا - درانی بادشاھوں کے عہد حکومت میں یہ لوگ میدانوں میں اتر آئے اور داماں میں آباد ہو گئے - ان کا علاقہ جنوب میں درابن سے لے کر شمال میں پہاڑ پور تک پھیلا ہوا ہے - کلاچی ان کا مرکزی شہر ہے اور ان کا سردار بھی وھیں رھتا ہے - زمین بنجر ہے، لیکن کہیں کہیں پہاڑی ندی نالوں، خصوصاً دریاے گومل کے معاونین کے ذریعے آبپاشی ہو جاتی ہے - ان کے نام گنڈا پور کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ سترائی Storai (استرانہ قبیلے کا جد امجد، جس کے نام پر یہ قبیلہ مشہور ہوا) کے بیٹے ترائی نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف شیرانی قبیلے کی ایک لڑکی سے شادی کر لی تھی - اس وجہ سے اس کا نام گندا پور یعنی ''گندا بیٹا'' پڑ گیا - اس کہانی سے بلاشبہہ اس حقیقت کا پتا چلتا ہے کہ یہ قبیلہ مخلوط النسل ہے - گنداپور اگرچہ ابتدا میں شورش پسند لوگ تھے، لیکن اب یہ ایک امن پسند قبیلہ ہے - یہ سارا قبیلہ پاکستانی علاقے میں رھتا ہے اور ان کی زبان قندھاری طرز کی پشتو ہے .

مآخذ : (۱) محمد حیات خان : افغانستان (حیات افغانی) مترجمۂ Priestley، لاهور ۱۸۷۴ء؛ (۲) H. Edwardes : *A Year on the Panjab Frontier*، لنڈن ۱۸۵۱ء؛ (۳) Raverty : *Notes on Afghanistan*، لنڈن ۱۸۸۰ء.

(M. LONGWORTH DAMES)

گَنْگا : (پاکستان و ہند کے مؤرخوں کے ہاں گنگ، نیز کنگ) بالائی ہند [رک بہ ہند] کا سب سے بڑا دریا، جو گڑھوال کے ضلع میں کوہ ہمالیہ سے تقریباً ۳۱۰۰ میٹر کی بلندی سے نکلتا ہے اور اتر پردیش، بہار اور بنگال سے گزرتا ہوا خلیج بنگال میں جا گرتا ہے - اس کی لمبائی تقریباً ۲۵۰۰ کیلومیٹر ہے؛ آخری ۵۰۰ کیلومیٹر بنگال کے ڈیلٹا میں ہیں - ڈیلٹا سے اوپر اس میں یکے بعد دیگرے رام گنگا، جمنا [رک بآن]، گومتی، گوگرا، سون، گنڈک اور کوسی دریا بھی شامل ہو جاتے ہیں - پریاگ (الہ آباد [رک بآن]) کے مقام پر جمنا کے سنگھم کے اوپر ایسے پایاب عبور کیا جا سکتا ہے - ڈیلٹا گوڑ [رک بآن] کے جنوب سے شروع ہوتا ہے، جو انتہائی مغربی نہر ہے اور مرشد آباد [رک بآن] کے قریب سے گزرتی ہے - اپنے بالائی حصے میں یہ بھاگی رتھی اور زیریں حصے میں ہوگلی [رک بآن] کے نام سے معروف ہے - بڑی (مشرقی) نہر، جو پدما کے نام سے بھی معروف ہے،

گوالندا کے جنوب مشرق میں بہتی ہے، گوالندا میں یہ (بنگال) جمنا، یعنی برھما پترا کے زیریں حصے میں داخل ہو جاتی ہے ۔ سنگھم کے مقام پر دریا کا دہانہ چوڑا ہو جاتا ہے، جسے اب مگھنا کہتے ہیں، جو انتہائی مشرقی نہر کی حیثیت سے نوا کھلی کے نزدیک خلیج بنگال میں گر جاتی ہے ۔ ڈیلٹا کا شمالی حصہ زرخیز ہے اور دلدلی سندربن (نمک اور کشتی بنانے کی لکڑی) اس کا جنوبی طاس ہیں ۔ ہوگلی اس کی بڑی تجارتی نہر ہے ۔ ریلوے لائن آنے سے قبل گنگا اپنے معاونین سمیت نہایت اہم ذریعۂ آمد و رفت تھا (*Memoir of a map of Hindoostan*: J. Rennel، بار سوم، لنڈن ۱۷۹۳ء، ص ۳۳۵ ببعد) ۔ اس کے کنارے آباد اکثر بڑے بڑے شہروں مثلاً قنوج، الہ آباد، فیض آباد، بنارس، پٹنہ، منگر، راج محل [رک باں] کی زمینیں پتھریلی ھیں ۔ آبپاشی بالائی اور زیریں گنگائی نہروں کے ذریعے ہوتی ہے، جن کا سرچشمہ ہردوار میں ہے ۔

اس کے زیریں حصے میں اس کے بہاؤ کے ساتھ سطح زمین کی بلندی میں ایک سے تین سنٹی میٹر فی کیلو میٹر کی کمی واقع ہوئی ہے، اس لیے مون سون کے دباؤ سے اس کی گزرگاہ میں تغیر واقع ہونے کا بڑا امکان ہوتا ہے؛ مثال کے طور پر مسلمانوں کی فتح بنگال سے پہلے بڑی ندی اپنے موجودہ مقام پر جنوب کی جانب رخ کرنے کے بجائے مالوے کے مشرقی جانب بہتی تھی، اور پھر گوڑ کی طرف بہتی ہوئی اپنے مہاند کی موجودہ گزرگاہ کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف رخ کرتی تھی (دیکھیے E. V. West-macott، در *JASD*، ۱۸۷۵ء، ص ۷ ببعد) ۔ ۷۳۹ھ/۱۳۳۸-۱۳۳۹ء میں گوڑ کے بجائے پانڈوا کو بنگال کا دارالحکومت بنایا گیا ۔ یہ تبدیلی اسی قسم کے ایک تغیر کی وجہ سے عمل میں آئی تھی ۔ اسی طرح اس کے بعد ۸۵۰ھ / ۱۴۴۶ء میں گوڑ کی عدالت کو ٹانڈے میں منتقل کیا گیا تھا ۔ گنگا اور اس کے ڈیلٹائی معاونوں کی موجودہ گزرگاھوں اور ان گزرگاھوں کے درمیان فرق جو Rennell کے نقشے میں دکھایا گیا ہے (کتاب مذکور، ص ۳۴۵، ۳۶۴) وہ حیران کن ہے ۔ گزرگاہ میں تغیر کی بابت مزید تفصیلات کے لیے رک بہ ھوگلی.

ہندووں کے نزدیک گنگا ایک مقدس دریا ہے، جس کا منبع بہشت میں بتایا جاتا ہے؛ جہاں سے یہ نکل کر سات ندیوں کے مرکز کی حیثیت سے، زمین میں آیا ہے ۔ سنسکرت کی کتابوں، متسیا پران، وایوپران، رامائن وغیرہ میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے، وہ البیرونی : کتاب الہند (انگریزی ترجمہ از سخاؤ E. Schau، لنڈن ۱۸۸۸ء، ۱ : ۲۶۱) میں بھی درج ہے ۔ سنگموں پر اور خاص طور پر الہ آباد میں، جب سورج برج دلو (Aquarius) میں ہوتا ہے، اس کے پانی سے نہانا مذہبی اعتبار سے بہت اہم سمجھا جاتا ہے ۔

مآخذ : متن مقالہ میں مذکور حوالوں کے علاوہ دیکھیے *Imperial Gazetteer of India*، طبع ۱۹۰۸ء، بذیل مادۂ گنگا.

(J. BURTON-PAGE)

گِنی : (Guinea)، مغربی افریقہ کے ساحل پر ایک علاقہ ۔ یاقوت (معجم، ص ۴، ۳۰۷) نے ایک علاقہ کناوۃ (گناوۃ) کا ذکر کیا ہے، جس کا نام اس کی رائے میں وہاں کے باشندوں کے نام پر پڑ گیا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ گناوۃ ایک بربری قبیلہ تھا، جو سیاہ فام لوگوں کے ملک (بلاد السودان) میں داخل ہو کر غانۃ [رک باں] کے پڑوس میں آباد ہو گیا تھا ۔ بظاہر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جنۃ [رک باں] کے نام کا جو اشتقاق عام طور پر کیا جاتا ہے وہ غلط ہے ۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے Mraquart پہلا شخص تھا، جس نے یاقوت کی اس عبارت کی طرف توجہ دلائی.

گنی کے لوگوں میں اسلام پھیلنے کے بارے میں دیکھیے مقالہ از Westermann : *Die Welt des Islams*، ۱ : ۸۵ ببعد اور جن کتابوں کا اس میں حوالہ دیا ہوا ہے، مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے مادۂ سوڈان [سوڈان].

(CL. HUART)

* **گَو:** (Gao)، رک بہ گوگو.

گَوَاد: Guad، گوادی Guadi : رک بہ واد، وادی .

* **گَوَالیار:** پہلے وسط ہند میں یہ ایک مقامی ریاست تھی، اب اسے مدھیا پردیش (بھارت) کے صوبے میں شامل کیا گیا ہے، سردی کے موسم میں یہ شہر صوبے کا صدر مقام ہوتا ہے ۔ گوالیار، کوہ وندھیاچل کی ایک عریض اور مرتفع چٹان پر جو ریتلے پتھر کی بنی ہوئی ہے، واقع ہے۔ میدان سے یہ چٹان کوئی تین سو فٹ بلند ہے اور کوئی دو میل تک شمالاً پھیلتی چلی گئی ہے ۔ اس کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ نصف میل کے قریب ہے ۔ پرانا شہر قلعے کے دامن میں آباد ہے لیکن ''لشکر'' یعنی اصلی پایۂ تخت کوئی دو میل پرے جنوب میں واقع ہے .

اس کی آبادی بشمول ''لشکر'' ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۰۵۷۷۳ تھی ۔ ۱۰۲۳ء میں قلعے پر سلطان محمود کے حملے کا خطرہ پیدا ہوا لیکن ۱۱۹۶ء میں دہلی میں سلطان شہاب الدّین غوری کے نائب قطب الدین ایبک نے پریہاروں سے لڑ کر اس قلعے پر قبضہ کر لیا ۔ پریہار راجپوتوں نے اس سے قبل کچھواہا راجپوتوں کو یہاں سے نکال دیا تھا ۔ چودہ سال کے بعد پریہاروں نے اس پر پھر قبضہ کر لیا لیکن ۱۲۳۲ء میں التتمش نے اسے دوبارہ فتح کر لیا، گو اس کا محاصرہ طویل عرصے تک قائم رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلعے کی ساری محصور عورتوں نے قلعے کے جوہر نامی تالاب میں، جو قلعے کے شمالی حصے کے آخر میں تھا، ڈوب کر جان دے دی ۔ قلعے پر قبضہ کر لینے کے بعد سلطان نے سوریا دیوا کا مندر جو اس پہاڑی کے جنوب کی طرف سورج کنڈ کے قریب واقع تھا، مسمار کرا دیا ۔ تیمور کے حملے کے وقت جو عام گڑ بڑ ہوئی تو تونواره راجپوتوں نے اس مقام پر قبضہ کر لیا اور وہ ۱۵۱۸ء تک اس پر قابض رہے، اس کے باوجود کہ اس دوران میں مالوے کے ہوشنگ شاہ، جونپور کے حسین شاہ شرقی، اور دہلی کے لودھی بادشاہ کئی دفعہ اس پر حملہ آور بھی ہوے ۔ گزشتہ سوا سو سال میں یہ شہر بہت مشہور ہو گیا بالخصوص راجہ مان سنگھ کے عہد میں جس نے مان سندر (محل) اور قلعے کے اندر جانے کا صدر دروازہ تعمیر کرایا ۔ شہنشاہ بابر ۱۵۲۶ء میں گوالیار آیا ۔ ۱۵۴۲ء میں پٹھان بادشاہ شیر شاہ سوری کے زمانے میں تو یہ شہر عملی طور پر کل ہندوستان کا پایۂ تخت بنا رہا ۔ اسلام شاہ سوری ۱۵۵۳ء میں یہیں فوت ہوا تھا ۔ اکبر کے تخت نشین ہونے کے بعد ہی اس شہر نے اطاعت قبول کر لی تھی حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا مقبرہ جو قلعے کے دامن میں ہے نیز دہلی میں شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ ہندوستان کے مغلیہ فن تعمیر کا ابتدائی اہم نمونہ شمار ہوتا ہے ۔ مغل بادشاہوں کے عہد میں اس قلعے کو سرکاری قید خانے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا [چنانچہ جہانگیر کے عہد میں حضرت مجدّدؒ الف ثانی بھی کوئی ایک سال تک یہاں قید رہے] اور شاہی خاندان کے بہت سے شورش پسند اراکین نئی چوکی کی کال کوٹھڑیوں میں، جو قلعے کے شمال مغرب میں واقع ہیں اور جنھیں ''دھوندا پول'' کہا جاتا ہے جان بحق ہوے [بظاہر مغلیہ دور سے پہلے بھی

گوالیار کے قلعے سے قید خانے کا کام لیا جاتا تھا، چنانچہ علاءالدین خلجی کے بڑے بیٹے خضر خان کو بھی یہیں قید کیا گیا تھا، دیکھیے خسرو دہلوی: مثنوی خضر خان و دولرانی] ۔ مغل گورنر معتمد خان نے گنیش دروازے کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی اور نُور ساگر تالاب کو اور زیادہ گہرا کرا دیا ۔ اس نے رشی ''گوالی پا'' کا مندر بھی منہدم کرا دیا جس کے نام پر کہتے ہیں کہ اس چٹان کا نام مشہور ہوا ۔ یہاں کی جامع مسجد ایک خوبصورت عمارت ہے، اس کی تعمیر ۱۶۰۵ء کے قریب شروع ہوئی اور ساٹھ سال بعد مکمل ہوئی ۔ جہانگیری مندر (تقریباً ۲۰۹ فٹ × ۱۰۰ فٹ) چوتھے مغل شہنشاہ کے عہد میں مان سنگھ کے محل کے شمال میں تعمیر ہوا ۔ اس کا مقام وہی تھا جو سوری شہنشاہوں کے محل کا تھا ۔ شاہجہانی مندر (۵۰ فٹ × ۱۷۰ فٹ) بھی پھر اسی طرح شمال میں اس جگہ تعمیر ہوا جہاں کبھی ہمایوں کا محل تھا ۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مرہٹوں کی شکست کے بعد یہ قلعہ پہلے تو جاٹوں کے قبضے میں چلا گیا پھر اس پر مرہٹے غالب آ گئے ۔ ۱۷۹۱ء میں انگریزوں کا قبضہ ہوا ۔ بہت سے تغیرات کے بعد انگریز ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۸۶ء تک اس پر قابض رہے اس وقت سے لے کر تقسیم ہند تک یہ مہاراجا سندھیا کے قبضے میں چلا آتا تھا [گوالیار آج کل بھارت کے صوبۂ مدھیا پردیش کی سات قسمتوں میں سے ایک کا مرکز ہے، اور اس کی آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے تین لاکھ سے زائد تھی] ۔

مآخذ: (۱) *Gwalior State Gazetteer*، کلکتہ ۱۹۰۸ء؛ (۲) *Archaeological Survey of India*، سلسلۂ اول، ج ۲ (۱۸۶۲ء تا ۱۸۶۵ء).

(H. C. Fanshawe)

* **گُوجَر** (گُجَر، گَجر) : ایک قوم کا نام ہے جو شمالی برصغیر پاکستان و ہند میں دور دور تک آباد ہے ۔ یہ جاٹوں اور راجپوتوں سے ملتی جلتی ہے اور ان کی قرابت دار بھی ہے ۔ گوجر بھی جاٹوں اور راجپوتوں کی طرح غالباً سِتھین Scythian قوم کے ان وارثین کی نسل میں سے ہیں جو چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوئے ۔ ان کی جسمانی خصوصیات ظاہر کرتی ہیں کہ وہ خالص ہندی آریائی نسل سے ہیں اور ان میں دراوڑی خون کی آمیزش مطلق نہیں ہوئی، ڈی ۔ اے ۔ سمتھ (*Journ. As. Soc.*، ۱۹۰۹ء) اے ۔ ایم ۔ ٹی ۔ جیکسن (*Bombay Gazetteer*، ۱۸۹۶ء، ج ۱: حصہ ۱) اور ڈی ۔ آر بھنڈارکر (*Epigraphic Notes and Questions*، جلد ۳) نے ثابت کیا ہے کہ گورجارے شمالی ہندوستان میں ۵۰۰ء کے قریب سفید ہُنوں کے ساتھ یا ان کے بعد داخل ہوئے تھے ۔ گورجاروں کا ذکر سب سے پہلی مرتبہ بانا کی کتاب ہرش چرت میں آیا ہے، جو انھیں ہُنوں کی طرح ہرش کے باپ کا دشمن قرار دیتا ہے ۔ انھوں نے کوہ آبو کے قریب بھین مال کو صدر مقام بنا کر ایک طاقتور ریاست قائم کر لی ۔ اسی مملکت کی جنوبی شاخ نے جنوبی گجرات کو گجرات کا نام دیا اور وسطی حصے کے حکمران خاندان رفتہ رفتہ راجپوت قبیلے بن گئے ۔ چنانچہ پرتیہار یا پریہار ذات کے راجپوت دراصل گوجر ہیں لیکن گورجاروں کی کثیر تعداد آج کل کے گوجروں کی صورت میں پائی جاتی ہے جن کی آبادی کا دور دور تک منتشر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی فرمانروائی کا دائرہ کس قدر وسیع تھا ۔ گوجر بیشتر گلہ بانوں کی ایک قوم تھی جو جنگ و پیکار اور لوٹ کھسوٹ کی دلدادہ تھی اور آج کل بھی بہت سے گوجروں میں یہ رجحانات پائے جاتے ہیں ۔ مستقل مزاج زراعت کاروں کی حیثیت سے وہ

اپنے قرابت دار جاٹوں کی سی شہرت کے مالک نہیں ، تاهم انهوں نے عمومی حیثیت سے اقامت کی زندگی اختیار کر لی ہے۔ ہند کے انتہائی شمال مغربی حصے میں ، خاص کر ہزارہ، جموں، کانگڑہ اور سیھال کے پہاڑوں کے بیرونی کناروں پر گوجر تا حال خانہ بدوش چرواهوں اور گلہ بانوں کی زندگی بسر کر رہے هیں اور اپنی مخصوص بولی بولتے هیں جو گوجری یا گجری کہلاتی ہے ۔ گریئرسن Grierson نے اس بولی اور مشرقی راجپوتانے کی میواتی بولی میں زبردست مماثلت دریافت کی ہے ۔ اس سے ظاهر هوتا ہے کہ جب گوجر حکمران تھے اور ان کا مرکز راجپوتانے میں تھا تو انهوں نے اس ملک کی زبان اختیار کر لی ۔ اس بولی کو ان کی سب سے کم تہذیب یافتہ بیرونی شاخ نے آج تک محفوظ رکھا ہے، حالانکہ وہ پنجابی بولنے والوں اور مغربی پہاڑی بولیاں بولنے والوں کے درمیان الگ تھلگ بود و باش رکھتے هیں ۔ پشاور میں گوجر کے لفظ کو اکثر اوقات عام گلہ بان کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ سکونت پذیر گوجروں کی بھاری تعداد موجودہ ضلع گجرات میں آباد ہے اور وهاں کی آبادی کا ایک اهم عنصر ہے ۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کی رو سے ان کی تعداد ۱۱۱۰۰۰ هزار نفوس تھی ۔ هزارہ میں ان کے سکونت پذیر اور گلہ بان عناصر کی تعداد ۹۱۶۷۰ تھی ۔ ان دونوں ضلعوں میں نیز سارے شمالی اور مغربی پنجاب میں وہ سب کے سب مسلمان هیں ۔ مشرقی جانب یعنی هوشیارپور میں اور جمنا کے دونوں طرف کے اضلاع میں جو پنجاب اور صوبہ جات متحدہ میں واقع هیں گوجر بھاری تعداد میں پائے جاتے هیں لیکن یہاں ان کی اکثریت هندو چلی آ رهی ہے ۔ پنجاب میں گوجروں کا شمار ۳۹۶۲۲۷ اور صوبجات متحدہ [اُترپردیش] میں ۳۴۴۰۰۰ ہے سارے برصغیر میں ان کی تعداد ۲۱۰۳۰۰۰ ہے اور وہ مذکورۂ بالا اضلاع کے علاوہ خاص طور پر راجپوتانہ، وسط ہند اور بمبئی میں پائے جاتے هیں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ میدانی علاقوں کے گلّہ بان گوجروں کو اکبر کے عہد میں اس بات پر مجبور کیا گیا تھا کہ وہ دیہات میں آباد هو کر سکونت اختیار کریں اور یہ کہ انہیں دنوں پنجاب کے علاقۂ گجرات نے اپنا یہ نام پایا ۔ گوجروں کے مشرف باسلام هونے کو اورنگ زیب کے عہد کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے، لیکن اودھ کی روایت اسے تیمور کے زمانے سے منسوب کرتی ہے جو بہت غیر اغلب سی بات ہے ۔ شمالی گجرات اور جنوبی گجرات کے علاوہ گوجرانوالہ (پنجاب) کا نام بھی اسی قوم کے نام پر رکھا گیا حالانکہ اس ضلع میں ان کی تعداد زیادہ نہیں ۔ مزید برآں انهوں نے ضلع سہارنپور کے ایک حصے کو بھی جو پہلے گجرات کہلاتا تھا اپنا نام دیا ۔ گجراتی زبان [رکّ بآں] کو جنوبی گجرات کی وجہ سے یہ نام ملا ورنہ یہ زبان گوجر قوم کے ساتھ کسی قسم کا واسطہ نہیں رکھتی ۔

مآخذ : (۱) Ibbetson : *Outlines of Panjab Ethnography*، (کلکتہ ۱۸۸۳ء)؛ ص ۲۶۲ ببعد؛ (۲) Crooke : *Tribes and Castes of N. W. Provinces and Oudh*، ۲ : ۴۳۹ ببعد (کلکتہ ۱۸۹۶ء)؛ (۳) V. A. Smith : *Early History of India*، طبع ثانی ص ۳۰۲؛ (۴) وهی مصنّف : *The Gujaras of Rajputana and Kanaudj* در *Journ. Roy. As. Soc.*، ۱۹۰۹ء؛ (۵) H. D. Watson : *Gazetteer of Hazara Dist.*، (لنڈن ۱۹۰۸ء) ص ۳۰.

(M. LONGWORTH DAMES)

تعلیقہ : گوجر ایک بڑی قوم ہے ۔ سکندر نامۂ نظامی میں اس کا خزرانیوں کے نام سے

ذکر کیا گیا ہے، جنھیں وحشی لوگوں سے بچانے کے لیے سکندر نے پہاڑوں کے درے بند کیے تھے - نظامی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں - انھوں نے سکندر سے التماس کی ـــــ

درین پا سگه رخنهائے که هست
عمارت کند تا شود سنگ بست
مگر زآفتِ آن بیابانیان
براحت رسد کارِ خزرانیان
بفرمود شه تا گزر هائے کوه
به بندند خزرانیان هم گروه

دوسرے ممالک میں اس قوم کو خُزر، جُزر، چُرز، گنور بھی کہا گیا ہے (دیکھیے محمد عبدالمالکؒ : شاہان گوجر، اعظم گڑھ ۱۹۳۴ء، ص ۴۸) - برصغیر میں پہلے پہل یہ لفظ گُرجر کی صورت میں استعمال ہوا پھر گوجر ہو گیا - یہ لوگ گرجستان (وسط ایشیا) سے آئے تھے - بحیرۂ خزر کا یہ نام شاید اس لیے پڑ گیا کہ اس کے ارد گرد خزر، یعنی گوجر آباد تھے، جو سیتھین قبائل سے تھے اور مختلف اوقات میں آتے رہے تھے - پرانوں میں ایک گوجر لڑکی گائتری سے برھما کی شادی کا ذکر آیا ہے (شاہان گوجر، ص ۶۲) - ان میں سے جو درۂ بولان سے آئے تھے وہ آگے بڑھ کر گجرات کاٹھیاواڑ میں آباد ہو گئے - کابل کی طرف سے آنے والے پنجاب، کشمیر، شمالی راجپوتانہ اور گنگا کے دو آبے میں رہنے لگے - ان کے نام پر شمال مغربی برصغیر میں بہت سی بستیاں، قصبے اور شہر آباد ہوے جو اب تک موجود ہیں - پنجاب میں گوجرانوالہ واضح طور پر انھیں سے متعلق ہے - علاوہ بریں پنجاب میں ضلع کا اور بھارت میں صوبے کا نام گجرات انھیں کی وجہ سے رکھا گیا - ان کی آمد پر گجرات پہلے گُرجر استرا، کہلایا، یعنی گوجروں کا ملک جو ہولے ہولے یہ صورت اختیار کر گیا - صوبے کا ابتدائی نام راٹ تھا -

گوجر آج کل بھی ان تمام علاقوں میں آباد ہیں - ان کی بہت سی گوتیں (Sub. Castes) ہیں - تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ گوجر، جاٹ اور راجپوت فی الجملہ ایک ہیں - آریاؤں کی طرح یہ بھی وسط ایشیا سے ریوڑ چراتے آئے - پہاڑی علاقوں مثلاً پنچھ، سوات، دیر اور ایبٹ آباد میں ان کا آج بھی یہی پیشہ ہے، لیکن باقی علاقوں میں یہ اچھے زراعت پیشہ ثابت ہوے اور انھوں نے اور پیشے بھی اختیار کیے - یہ لوگ تنومند اور خوبصورت ہونے کے علاوہ بہادر تھے اور یہ ضرب المثل مشہور رہی ہے کہ گوجری عورت اور شیرنی کا دودھ پیو گے تو شجاع بنو گے - گوجر سکنری زبان ساتھ لائے تھے جو بتدریج اس نرم لہجے کی گوجری زبان میں تبدیل ہو گئی جسے یہ لوگ وہاں بولتے ہیں جہاں اکٹھے رہتے ہوں - یہ راجپوتانے کی زبان گوجری سے مشابہت رکھتی ہے - اس بات کا ذکر گریئرسن نے بھی کیا ہے : *Linguistic Survey of India*، ج ۹، حصۂ ۴، دہلی ۱۹۶۸ء، ص ۱۵ -

گوجر سورج کی پرستش کرتے آئے تھے - ان کو ہندو معاشرے میں شامل کرنے کے لیے برھمنوں نے کوہ آبو پر قربانی کی آگ سے ان کو پوتر کرنے کا انتظام کیا جس میں سے کہا جاتا ہے چار عظیم گوجر پرھار، پرمار، چوھان اور سولنگی نمودار ہوے اور پھر ان میں سے کئی عظیم المرتبت حکمران پیدا ہوے - پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں جنوب مغربی راجپوتانے میں گوجروں کی سلطنت تھی - چھٹی صدی عیسوی میں گوجروں کی منمال کی سلطنت عظمی اور بھڑوچ کی سلطنت صغری موجود تھیں - ان ایام میں یہ گورجارے کہلاتے تھے - اس وقت یہ ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے نمودار ہوے - انھوں نے وسیع علاقے میں قدم جمائے اور بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں - چینی سیاح ھیون سانگ ۶۴۰ء میں

راجپوتانے کے ایک بڑے حصے پر گورجاروں کی حکومت بتاتا ہے۔ وہ ان کے تاریخی شہر لبھی پور میں بھی گیا ۔ آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی کے متعدد گوجر حکمرانوں کے کتبے دستیاب ہوے ہیں جن سے ان کی سلطنت اور دارالخلافه وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ ۸۴۰ء میں قنوج میں راجه بھوج کی حکومت تھی ۔ کتبوں سے اس راجا کے شجرۂ نسب کا بھی پتا چلتا ہے ۔ گوجروں کا گرھوار خاندان ۱۱۹۳ء تک قنوج میں حکمران رہا ۔ اس کا خاتمہ محمد غوری نے کیا ۔ انہل واڑہ میں ان کے سولنکی خاندان کا خاتمه علاء الدین خلجی کے ہاتھوں ہوا ۔

عرب سیاح آئے تو انھوں نے بھی گوجر حکومتوں کا ذکر کیا ۔ چنانچه سلسلة التواریخ، فتوح البلدان، المسالک و الممالک، مروج الذهب میں ان کا بیان موجود ہے ۔ (دیکھیے شاهان گوجر، ص ۵۱۴ تا ۵۲۸) ۔ کتاب الہند میں البیرونی نے بھی ذکر کیا ہے۔ سلاطین گجرات جنھوں نے اس ملک میں اسلامی تہذیب و تمدن کے شاندار آثار چھوڑے ہیں ۔ نسلاً گوجر تھے ۔ ان کے جد اعلٰی گوجروں کی تانک گوت سے تھے ۔ سہارن نام تھا، مشرف باسلام ہوے، فیروز شاہ تغلق کے معتمد اهلکار بنے اور وجیہه الملک خطاب پایا ۔ ان کا بیٹا ظفر خان گجرات کا صوبیدار مقرر ہوا، جو بعد میں مظفر خان کے لقب سے سلطان بنا (دیکھیے : Commissariat : *A History of Gujrat*، طبع انڈیا ۱۹۳۸ء، ص ۳۸؛ نیز شاهان گوجر، ص ۳۳۳ تا ۳۳۶) ۔ اس مظفر شاہی گوجر خاندان کا خاتمه جلال الدین اکبر مغل شہنشاہ نے کیا ۔ ابوالفضل نے بھی گوجروں کا ذکر آئین اکبری میں کیا ہے ۔ فارسی زبان کے شاعر شاہ فقیر اللہ آفرین لاہوری گوجر تھے (آزاد بلگرامی : خزانۂ عامره، نولکشور پریس کانپور ۱۸۷۱ء، ص ۲۸) ۔ احسن القصص والے پنجابی زبان کے شاعر مولوی غلام رسول بھی گوجر تھے ۔ اسلام قبول کرنے کے بعد گوجروں میں بہت سے علماء، فضلا، اولیا اور شعرا ہوے ہیں ۔ الغرض ہر زمانے میں اس قوم کے لوگ اعلٰی صفات کے مالک رہے ہیں ۔ نیز گریئرسن کی محولۂ بالا جلد حصۂ چہارم، ص ۸ تا ۱۰؛ متن میں دیے گئے مآخذ کے علاوہ دیکھیے ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۸۱، ۸۲، ۸۶ تا ۱۰۸ [عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا]۔

(اداره)

گوجرانواله : پاکستان کے لاہور ڈویژن کے ایک ضلع اور شہر کا نام ہے، ضلع کا کل رقبه ۲۳۰۱ مربع میل ہے اور اس کی آبادی ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱،۳۶،۹۳۳ تھی ۔ یہ ضلع دریاے راوی اور دریاے چناب کے درمیان ایک ہموار میدان میں واقع ہے، لیکن اس کی حدود دریاے راوی تک نہیں پہنچتیں ۔ گجرات کی طرح اس کا نام بھی قبیلۂ گوجر سے منسوب ہے، لیکن اب اس کی آبادی میں گوجر عنصر کچھ زیادہ نہیں ہے ۔ اس ضلع کا نام شہر کے نام کی وجه سے پڑ گیا جو گوجروں نے آباد کیا تھا ۔ اب یہاں زیادہ تر آبادی راجپوتوں بالخصوص (بھٹی) جاٹوں اور ارائیوں کی ہے یہاں مقام تکی پر بدھ آثار ملتے ہیں ۔ تکی وہی مقام ہے جسے چینی سیاح هیون سانگ Hiouen Thsang [کذا] نے Tsē-Kiē لکھا ہے ۔ شاہ کوٹ کے کھنڈر جو جنوب میں واقع ہیں غالبًا هن بادشاہ مہر اُکل Mihirakula کے آباد کردہ شہر ساکله کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ مغل شہنشاہوں کے عہد میں یہ علاقه خوش حال تھا، چنانچه یہاں کئی اور قصبے آباد ہوگئے ۔ ایمن آباد (صحیح امین آباد) کا قصبه محمّد امین نے، اور حافظ آباد کا قصبه حافظ نے آباد کیے تھے؛ یہ دونوں اکبر کے عہد میں گذرے ہیں اور شیخوپورہ (صحیح شکوہ پورہ) شاہجہان کے بیٹے

دارا شکوہ نے آباد کیا تھا جس نے وھاں ایک نہر بھی کھدوائی ۔ اس وقت اس کا دادا جہانگیر بھی زندہ تھا۔ اٹھارھویں صدی میں یہ علاقہ بالکل برباد اور ویران ھو گیا ۔ اس کے بعد سکھ یہاں آ کر آباد ھو گئے ۔ رنجیت سنگھ گوجرانواله میں پیدا ھوا تھا۔ اس نے اپنے باپ مہان سنگھ کی یاد میں یہاں ایک مڑھی بھی تعمیر کرائی ۔ ضلع گوجرانواله کے بڑے بڑے شہر گوجرانواله (آبادی بموجب مردم شماری ۱۹۰۱ء=۲۹۳۸۳) اور وزیر آباد (آبادی ۱۹۰۱ء=۱۸۰۶۹) ھیں۔ گوجرانواله مغربی پاکستان کا ایک شہر ہے، جو کئی قسم کی صنعت و حرفت کا مرکز ہے مثلاً ظروف مسی، پارچہ بافی، سیوں کا مربع اور اچار، چمڑے کی رنگائی؛ نہر اپر چناب حافظ آباد اور وزیر آباد تحصیلوں کے ایک بہت بڑے رقبے کو سیراب کرتی ہے ۔ وزیر آباد کی چھریاں، چاقو مشہور ھیں۔

یہ ضلع قاعدے سے دو حصوں میں تقسیم ھو سکتا ہے جن میں سے ایک وہ نشیبی علاقہ ہے جو زرخیز زمینوں پر مشتمل ہے اور دوسرا دریاے چناب اور ڈیک نالے کے درمیانی اونچے میدان، نہروں کی تعمیر کی وجہ سے مغربی پاکستان کا یہ سب سے زیادہ زرخیز ضلع ہے، اب تھور (کھار، سیم) زراعت کے لیے ایک مصیبت بن گئی ہے ۔

مآخذ : (۱) مقامی گزیٹیر اور بندوبست کی رپورٹیں؛ (۲) امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، پنجاب سیکشن ۱۹۰۸ء ۔

(M. LONGWORTH DAMES)

⊗ تعلیقہ: موجودہ صدی (بیسویں) کا ربع اول ختم ھو رھا تھا کہ شیخوپورہ کو علیحدہ ضلع بنا دیا گیا ۔ قیام پاکستان کے بعد گوجرانواله ایک صنعتی شہر بن گیا ہے اور اس کے دونوں طرف شاھراہ اعظم کے ساتھ ساتھ صنعتی علاقہ پھیل رھا ہے جس کے اپنے علیحدہ مسائل ھیں ۔ دھان اور ظروف سازی وغیرہ کے کارخانے ھیں۔ ریلوے لائن سے مشرق کی طرف زیادہ تر سرکاری دفاتر ھیں۔ اس طرف کی آبادی کو شہر سے ملانے کے لیے سٹیشن کے ساتھ زاویۂ قائمہ بناتا ھوا بالا بالا (Overhead) ایک لمبا سا پل تعمیر کیا گیا ہے ۔ ھائی سکولوں کے علاوہ شہر میں ڈگری کالج بھی ہے ۔ ضلع گوجرانواله مردم خیز ہے۔ بعض اچھے اچھے شعرا اور اہلِ علم اصلاً یہیں کے رہنے والے تھے ۔ گوجرانوله پہلوانوں کے لیے مشہور ہے ۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد شہر سے شمال مغرب کی طرف تین چار میل کے فاصلے پر فوجی چھاؤنی قائم کی گئی ہے ۔ راولپنڈی سرگودھا، شیخوپورہ، لاھور اور سیالکوٹ کی طرف جانے کے لیے لاریوں کا ایک بہت بڑا اڈا شہر کے ساتھ شمال کی طرف بنایا گیا ہے۔ ان تمام امور کے باعث گوجرانوله جدید زمانے کا ایک ترقی پذیر شہر بن چکا ہے ۔ (عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا) ۔

(ادارہ)

گُوْر خان : قرہ‌ختائی [رک باں] کے فرمانرواؤں کا ایک لقب، مسلم مصنفین نے اس لفظ کا مطلب خان خاناں بتایا ہے لیکن Grigoryew (*Vostočny Turkestan*، ۱ : ۳۹۸) نے یہ تاویل رد کر دی ہے اور گور خان کو تاتاری گورگن (داماد) کا مترادف قرار دیا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ سلطنت قرہ ختائی کے بانی نے یہ لقب اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ لیو (Liao) خاندان (شمالی چین میں) کے سابق شہنشاھوں کا رشتے دار تھا، لیکن تاحال ایسی کوئی تحریری سند نہیں مل سکی جس سے اس نظریے کی تصدیق ھو سکے۔ اسی طرح ھمیں یہ بھی بخوبی معلوم نہیں ھو سکا کہ ختائی کی زبان کس حد تک تاتاری سے ملتی جلتی تھی یا اس نے کہاں تک تاتاری الفاظ قبول کر لیے تھے اور آیا گورگن کا گورخان کی شکل میں بدل جانا اس زبان کی بعض صوتی خصوصیات کا

رھین منت تھا ۔ بلاشبہہ قرہ ختائی کے متعلق فارسی بیانات سے یہ ظاہر ھوتا ھے کہ گورخان کے دربار میں داماد کے لیے چینی لفظ فوما (fu-ma) استعمال کیا جاتا تھا (دیکھیے Defrémery کا حاشیہ اس کی طبع میر خواند، *Histoire des Sultans du Kharezm*، سے متعلق، ص ۱۲۳)، گورخان کے حریف جاموقہ (دیکھیے ۔ مادۂ چنگیز خان) نے تیرھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں، بظاھر قرہ ختائی کے بادشاھوں کی نقل کرتے ھوے، گورخان کا لقب اختیار کر لیا تھا، زمانۂ مابعد میں یہ لقب نظر نہیں آتا ۔

(W. BARTHOLD)

* **گور دُوس :** اسی نام کی 'قضا' کا صدر مقام جو ولایت آیدین کی سنجاق صارُو خان میں واقع ھے ۔ یہ قالینوں (خصوصاً سجّادہ، یعنی جا نماز) کی صنعت کی وجہ سے مشہور ھے ۔ ابتدا میں یہ قرہ سی اوغلو کی حکومت میں شامل تھا اور ۱۳۹۰ء میں دوسرے علاقے کے ساتھ ھی یہ بھی سلطنت عثمانیہ کے قبضے میں چلا گیا ۔ جدید شہر کی آبادی تقریباً ۰۰۰ ۵ ھے جس میں ۰۰۰ ۴ مسلمان ۰۰۰ ۱ یونانی ھیں۔

مآخذ : (۱) مُنجّم باشی : ۳ : ۳۶ ؛ (۲) جہان نما، ص ۶۳۵ ؛ (۳) Cuinet: *Turquie d' Asie* ۳ : ۵۵۶ ببعد.

(J. H. MORDTMANN)

* **گورگانی :** فخرالدین اسعد گور گانی ویس و رامین دربار شاھی سے تعلق رکھنے والی پہلی عشقیہ مثنوی کا مصنف ھے ۔ ذبیح اللہ صفا [تاریخ ادبیات ایران، ج ۲، ۳۶۱] کا خیال ھے کہ اس کی امتیازی حیثیت یہ ھے کہ مصنف نے ایک ادبی اسلوب کا آغاز کیا، اور اس کی پیروی میں منظوم داستانوں کا ایک سلسلہ شروع ھو گیا، جن میں سے بیشتر قابل توجہ ھیں ۔ اس کی زندگی کے صرف وھی مختصر سے حالات معلوم ھیں، جن کا اس کی نظم سے پتا چلتا ھے ۔ اس کے سوانح نگاروں نے جو حالات لکھے ھیں، وہ برائے نام ھیں ، لیکن وہ اس بات پر متفق ھیں کہ نظم (ویس و رامین) اس کی تصنیف ھے (سوا دولت شاہ سمرقندی کے جو غلطی سے نظامی نام کے شعرا میں سے کسی ایک کی بتاتا ھے) .

عوفی نے گورگانی کی تین غزلیں درج کی ھیں (طبع محجوب، دیباچہ، ۱۳) ۔ باقی غزلیں اس کی ناپید ھیں ۔ شمس قیس (معجم، طبع میرزا محمد و ای، جی، براؤن، ۸۰) لکھتا ھے کہ نظامی (گنجوی) کی خسرو و شیریں بحر ھزج مسدس محذوف میں ھے اور فخرالدین اسعد کی ویس و رامین بھی اسی بحر میں ھے ۔ بعد میں (۱۴۰) وہ مصنف کا ذکر فخری کہ کر کرتا ھے جو شاید اس کا تخلص تھا ۔ اس نظم کے آخری شعر سے پتا چلتا ھے کہ وہ نظم کی تکمیل کے وقت جوان تھا ۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی (طبع مینوی، ۳۶۸، ترجمہ ۲۷؛ طبع محجوب، ۳۵۰، ترجمہ ۲۷؛ ترجمہ Massé، ۴۳۳؛ نیچے سے) بیان کرتا ھے (جس سے احساسات عشق بیان کرنے میں اس کی مہارت کا پتا چلتا ھے) ''کتنے ھی دن سے واردات عشق مجھ پر گزری ھیں، لیکن ایک دن بھی خوشی کا میسر نہیں آ سکا''.

گورگانی نے یقیناً فلاسفۂ عرب و ایران کے خیالات (دیکھیے دیباچہ ویس و رامین، موضوع خالق لازوال اور اس کی مخلوق) اور فلکیات کا مطالعہ کیا تھا (وصف شب، طبع مینوی، ۸۰؛ طبع محجوب ۹۰، ترجمہ ۲۷) ۔ دیباچے میں سلطان طغرل بیگ اور اس کے وزیر عمید ابوالفتح مظفر کی تعریف کی ھے جسے سلطان نے اصفہان فتح کرنے (۴۴۳ھ / ۱۰۵۰ء) کے بعد اصفہان کا حاکم مقرر کیا تھا ۔ عمید ابو الفتح گورگانی کا سرپرست تھا ۔ عمید نے بعض منصب بھی اس کے سپرد کیے تھے ۔ عمید سے گفتگو کے دوران جیسا کہ اس نے تفصیل سے بتایا ھے،

اس نے یہ کہا (مینوی ٢٥ تا ٢٧؛ محجوب، ١٨ تا ٢١؛ ترجمہ ٦، ٧) کہ یہ موضوع اسے ویس و رامین کی داستان عشق سے ملا ہے، جو پہلوی خط میں محفوظ ہے۔ ''یہ ایک مسلسل عشقیہ داستان ہے لیکن افکار و خیالات سے تہی اور عجیب و غریب (متروک) الفاظ پر مشتمل ہے ۔ گویا یہ ایک منثور داستان ہے جو رنگینی بیان سے محروم ہے (شاید نظم کے جارجین ترجمے کی طرح)'' ۔ حاکم اصفہان نے گورگانی کو فرمائش کی کہ ''اسے فارسی میں ترجمہ کر دے اور اسے وہ زینت دے جو تختۂ گل کو ماہ اپریل میں دی جاتی ہے'' ۔ گورگانی نے یہ کام شروع کر کے ٤٤٧ھ / ١٠٥٥ء میں یا اس سے تھوڑی دیر بعد اس کی تکمیل کر دی ۔ اس کی یہ مثنوی بحر ہزج میں ہے اور ٨٩٠٠ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہی بحر بعد کے شعرا نے عشقیہ مثنویوں کے لیے اختیار کی ۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا گورگانی پہلوی زبان جانتا تھا ؟ حاکم اصفہان سے گفتگو کا جو ذکر آیا ہے اگرچہ واضح نہیں تاہم اس کے پیش نظر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ پہلوی زبان جانتا تھا ۔ اس کے ایک شعر کے مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پہلوی زبان سے وہ آشنا تھا، خواہ اس کا یہ علم مکمل نہ بھی ہو ''جو شخص پہلوی جانتا ہو، خراسان اس مقام کا پتا دیتا ہے جہاں سے ہم روشنی حاصل کرتے ہیں (طبع مینوی محجوب باب ٤٨، ج ٤)۔ گورگانی حاکم اصفہان سے اپنی نے گفتگو میں داستان کی بے کیفی اور پہلوی زبان کے عجیب الفاظ کا ذکر کیا تھا ۔ اس سوال کے لیے کہ کیا اس نے پہلوی متن سے براہ راست استفادہ کیا یا فارسی ترجمے کے ذریعے دیکھیے محجوب : دیباچہ ص ٢٠ ۔ بہرحال یہ بہت اہم بات ہے کہ اس نے پہلوی کی اصل داستان کو نئی زندگی دی ورنہ بلا شبہہ وہ پہلوی اکثر کتابوں کی طرح کی ناپید ہو جاتی ۔

اس مثنوی میں خصوصاً خیر و شر کی طاقتوں کی بار بار آنے والی تلمیحات، مقدس آتشکدوں (جن کے نام بھی آتے ہیں) اور ان کی دیکھ بھال، مہینوں کے قدیم نام، جشنوں کی تقریبات اور روایتی خصوصیات کے اذکار سے ایران قدیم کی ثقافت نمایاں ہے ۔ اس میں کڑی آزمائش کے ایک مقدمے کا بھی حال بیان کیا گیا ہے اور رشتہ داروں کے مابین ایک شادی جو ایران قدیم کے شاہی خانوادے ہی کی خصوصیت تھی کا بھی ذکر آیا ہے ۔ نظم کا موضوع المیہ محبت ہے ۔ ویس و رامین کے پہلے ایڈیشن ہی میں اس کی مماثلت ''Isenll Tristan'' سے واضح ہو گئی تھی اس لیے اب کوئی ضرورت نہیں کہ مثنوی مذکور کا تجزیہ کیا جائے دیکھیے (Massé ٩٥٥) ۔ ممکن ہے کہ اس رومان کی بنیاد تاریخی واقعے پر ہو Minorsky نے یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ اس مثنوی میں غالباً اشکانی عہد کے سات شاہی خانوادوں میں سے ایک کی شہزادی اور اشکانی خاندان کے ایک شہزادے کی واردات عشق نظم کی گئی ہیں ۔

گورگانی کی اس نظم میں کچھ آثار واقعی ایسے بھی ہیں، جن سے اس زمانے کے رسم و رواج اور لوک گیتوں کا حال جاننے میں مدد ملتی ہے ۔ اس کا اسلوب نگارش بعض اوقات بہت مؤثر اور دلنشین معلوم ہوتا ہے (ترجمہ، ٢٠، ٢١) بالخصوص اس وقت جب کہ وہ دوسرے شعرا کی طرح صنف نازک کے حسن و خوبی کو رسمی انداز میں بیان کرتا ہے (دیکھیے باب ٣٧، ترجمہ ٩٠) ۔ محجوب نے متعدد تصورات اور قدیمی محاورات (دیباچہ، ٥٥، ٥٦) اور بعض متروکات کی نشان دہی کی ہے جو خاص خاص معنوں میں استعمال ہوئے ہیں (دیباچہ، ٣٤) اور بعض ایسے الفاظ بھی بتائے ہیں جو پہلوی وضع سے قریب تر ہیں (دیباچہ، ٤٣) ۔ اس مثنوی کا اثر دیرپا ثابت ہوا ۔ محجوب نے وہ مماثلت بھی بتائی ہے

جو گورگانی اور بعد کے شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے ۔ کچھ ان خیالات کا بھی ذکر کیا ہے، جو گورگانی سے دوسرے شعرا نے لیے ہیں (دیباچہ ff 98) دس جذباتی خطوط جو ویس نے رامین کو لکھے (مینوی، ص ۳۴۷ تا ۳۸۳؛ محجوب : ۲۰۹ تا ۲۸۶؛ ترجمہ ۳۱۸ تا ۳۰۱) ۔ ان کی تقلید اوحدی، ابن عماد، عارفی، عماد فقیہ (دس خطوط)، امیر حسینی، کاتبی اور سلیمان ساوجی (۳۰ خطوط) نے کی ہے ۔ زیادہ اہمیت اس مماثلت کی ہے جو ویس و رامین اور خسرو و شیریں نظامی کے انداز میں پائی جاتی ہے ۔ غالبًا نظامی، گورگانی ہی سے متأثر ہوا تھا اگرچہ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے غالبًا نظامی کا ارادہ یہ تھا کہ اس کے ماہرانہ اور انتہائی مرصع اسلوب کا تقابل گورگانی کے سادہ اور متین اسلوب سے کیا جا سکے ۔

مآخذ : ایڈیشن (۱) Nassau Lees و منشی احمد علی (Bibl. Ind.) کلکتہ ۱۸۶۴ء ۔ یہ برصغیر پاکستان و ہند کے ایک مسودے پر مبنی ہے؛ (۲) مینوی ، تہران ۱۳۱۴ھ/ ۱۹۳۵ء میں جو تین مسودوں پر مبنی ہے جن میں Bibl. Nat. Paris کا مسودہ بھی شامل ہے اور اس سلسلے کا بہترین مسودہ ہے : (۳) محمد جعفر محجوب، تہران ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۵۹ء ۔ یہ سابق دو مسودوں پر مبنی ہے؛ (۴) H. Massé، ترجمہ فرانسیسی میں مع مقدمہ، پیرس ۱۹۵۹ء؛ (۵) گرجستانی تصرف، *Visramiani*، ترجمہ از O. Wardrop (اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ، نیا سلسلہ، xxxiii،لنڈن ۱۹۱۴ء)؛ مطالعات : (۵) ذبیح اللہ صفا : تاریخ ادبیات در ایران، تہران ۱۳۳۶ھ / ۱۹۵۸ء، ج ۲، بمدد اشاریہ؛ (۶) *Gr.. I. Ph.*، بمدد اشاریہ؛ (۷) K. H. Graf. تجزیہ اور اقتباسات جو جرمن میں بصورت نظم ترجمہ کیے گئے ہیں، در *ZDMG*، ۲۳ (۱۸۶۹ء)، ۳۷۵ تا ۴۳۳؛ (۸) V. Minorsky : *Note sul wis u Rāmīn a Parthia*، *Romance, in BSOAS xi/4*، ۱۹۴۶ء؛ (۹) صادق ہدایت، در پیام نو، تہران ۱۳۲۴ھ/۱۹۴۶ء، شمارہ ۱، ۲؛ (۱۰) ایم مینوی، در سخن، تہران ۱۳۳۳ - ۱۳۳۴ھ/۱۹۵۶ء، شمارہ ۱، ۲؛ (۱۱) A. Bausani : *Storia della letteratura persiana*، میلان ۱۹۶۰ء، ۶۲۱ تا ۶۲۶؛ (۱۲) J. Rypka : *Iranische Literaturgeschichte*، لائپزگ ۱۹۵۹ء، ۱۶۷ - ۱۶۸ ۔

(H. Massé)

گوڑ : بنگال کا پرانا پایۂ تخت جو مالدا کے ضلع (مغربی بنگال) میں عرض البلد ۲۴ درجے ۵۴ دقیقے شمال اور طول البلد ۸۸ درجے ۸ دقیقے مشرق میں دریاے گنگا کے مشرق میں اسی دریا کے ایک تنگ اور متروک دھارے کے کنارے واقع ہے اور مالدا کے شہر سے کوئی بارہ میل کے فاصلے پر آباد ہے ۔ گوڑ کا نام بہت قدیم ہے اور فرشتہ لکھتا ہے کہ صدیوں پہلے اس شہر کی بنیاد ایک ہندو شنکل نامی نے ڈالی تھی، بعد کے زمانے میں اسے لکھنوتی کہنے لگے جو ''لکشمن وتی'' کی ایک مختصر شکل ہے اور یہ نام بھی بنگال کے ایک ہندو راجا کے نام سے لیا گیا ہے ۔ ۱۱۹۷ء یا ۱۱۹۸ء میں مسلمانوں کا اس پر قبضہ ہوا ۔ ۱۲۴۳ء ۔ ۱۲۴۴ء میں منہاج الدین یہاں آیا جو اپنی تصنیف طبقات ناصری (Raverty کا ترجمہ، ۱ : ۵۸۴) میں اس شہر کا کچھ حال لکھتا ہے ۔ وقتاً فوقتاً یہ شہر بنگال کے مسلمان بادشاہوں کا پایۂ تخت بنتا رہا گو وہ اس مقام یعنی گوڑ کے علاوہ پانڈوا میں بھی رہا کرتے تھے جو گوڑ سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر شمال مشرق میں ہے ۔ ۱۵۳۸ء میں شہنشاہ ہمایوں بھی یہاں مقیم رہا، اس نے اس شہر کا نام جنت آباد رکھ دیا کیونکہ وہ گوڑ کے نام کو منحوس سمجھتا تھا جو فارسی زبان میں گور یا ضریح سے ملتا جلتا ہے ۔ شہنشاہ اکبر کے سپہ سالار

منعم خان نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن ۱۵۷۵ء میں اسے یہ شہر خالی کرنا پڑا کیونکہ یہاں وبا پھیل گئی تھی۔ سب سے آخر میں آخری بار جو شہزادہ یہاں رہا، وہ سلطان شجاع تھا جو سترھویں صدی کے وسط میں یہاں آیا تھا۔ اب یہ شہر بالکل کھنڈر ہو چکا ہے لیکن اس میں ایک عالی شان تالاب موجود ہے جسے ''ساگر دیگھی'' کہتے ہیں۔ مسجدوں کے آثار باقیہ کی حفاظت حکومت کرتی ہے۔

امپریل گزیٹیر آف انڈیا کی جلد ۱۲ میں گوڑ کا مفصل حال درج ہے۔ سولھویں صدی میں یہاں پرتگیزی بھی آئے تھے اور ۱۶۸۳ء میں سرولیم ھیجز William Hedges بھی آیا تھا۔ اس نے اپنے روزنامچے میں (Hakluyt Soc. 1887 - 89) اس شہر کا ذکر کیا ہے۔ اس سے قبل کے حالات کی تفصیل کے لیے دیکھیے Henry Creighton: *Ruins of Gaur Described*، لنڈن ۱۸۱۷ء، لیکن J. H. Ravenshaw کی تصنیف گوڑ جو اس کی بیوہ نے شائع کی، زیادہ صحیح حالات کی حامل ہے (لنڈن ۱۸۷۸ء)۔ *Archaeological Reports of India*، جلد ۱۵ میں بھی اس کا ذکر ہے۔ نیز دیکھیے Dr. Buchanan: *Eastern India* اور *A Note on Maj. Francklin's art. Description of Gaur*، جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ج ۶۳، جزو ۱، ص ۸۵ بعد؛ اور اسی رسالے میں الٰہی بخش کی تصنیف خورشید جہاں نما پر تنقید ج ۶۴، جزو ۱، ص ۱۹۴؛ بنگال کے مسلمان بادشاھوں کی تاریخ اور گوڑ کے کچھ حالات کے متعلق دیکھیے، غلام حسین: ریاض السلاطین، ترجمہ از عبدالسلام، کلکتہ ۱۹۰۲ء اور Stewart: *Hist. of Bengal*.

(H. BEVERIDGE)

* **گوک آلپ ضیاء**: ترک مفکر جن کا اصلی نام محمد ضیا تھا، ۱۸۷۵ یا ۱۸۷۶ء میں دیار بکر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۱ء کے بعد سے وہ اپنے ادبی نام (گوک آلپ) سے معروف ہو گئے۔ ضیاء نوجوان ترکوں کے وطن پرستانہ اور آئین پسندانہ تصورات سے اپنے والد کی بدولت آشنا ہوئے جو انھیں ایک جدید وضع کے ھائی سکول میں داخل کرنے کے بعد جہاں وہ جدید علوم اور فرانسیسی زبان کی تعلیم حاصل کر سکیں، انتقال کر گئے۔ گوک آلپ نے اپنے چچا سے عربی، فارسی اور اسلامی علوم نقلیہ کی تحصیل کی اور مسلمان فقہا، فلاسفہ اور صوفیہ کی تصانیف سے استفادہ کیا۔ ان کے دماغ میں راسخ العقیدہ مذھب، تصوف اور جدید علوم کے باھمی تصادم نے، جس میں ان کے چچا کی جانب سے ان کی استانبول جا کر اعلٰی تعلیم حاصل کرنے کی مخالفت سے مزید اضافہ ہو گیا، انھیں خود کشی کرنے پر آمادہ کر دیا، لیکن ان کے ہم شہری ڈاکٹر عبداللہ جودت [رک بآں] نے، جو عمر میں ان سے بڑے تھے، انھیں اس ارادے سے باز رکھا۔ ان کی بعد کی زندگی ان تینوں اثرات کے مابین ذھنی کشمکش کا ایک ھنگامہ نظر آتی ہے جسے تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ان کی انقلاب پسندی اور آزاد خیالی کے دور کا آغاز استانبول میں مدرسۂ بیطاری میں داخلے اور خفیہ انجمن اتحاد و ترقی کا رکن بننے سے ہوا، ۱۸۹۷ء میں انھیں گرفتار کرلیا گیا، ایک سال قید کی سزا ھوئی اور واپس دیار بکر بھیج دیا گیا۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد ضیاء دیار بکر میں سرکردہ عثمانیت پسند، آزاد خیال مصنّف اور خطیب بن گئے۔ ان کی ایک نصب العین پسند، ھمدرد خلق اور قوم پرست ھستی میں تبدیلی جو ان کی زندگی کے دوسرے دور کی نشاندہی کرتی ہے، سیلونیکا میں وقوع پذیر ھوئی، جہاں وہ ۱۹۰۹ء میں ''انجمن اتحاد و ترقی'' کے ایک اجتماع میں نمائندے کی حیثیت سے گئے تھے اور اس انجمن کی مرکزی مجلس

کے کارکن منتخب ہو جانے کے بعد وہیں مقیم ہو گئے۔ یہاں وہ اہل قلم کے ایک گروہ کے شریک کار بن گئے جن کا تعلق گنج قلملر اور یکی فلسفہ مجموعہ سی نامی اخباروں سے تھا ۔ یہ لوگ زبان اور ادب کو ایک عوامی رنگ دینے اور ایک نئے نصب العین کی نشو و نما میں دلچسپی رکھتے تھے جو اس معاشرتی تبدیل ہیئت میں رہنمائی کر سکے، جس کی ابتدا ان کے خیال میں ۱۹۰۸ء کے انقلاب سے ہوئی تھی ۔ اس گروہ نے دو مختلف رجحانوں کی پرورش کی ؛ ایک مادّی اور اشتراکی، اور دوسرا نصب العینی اور قوم پرستانہ ۔ گوک آلپ ان میں سے دوسرے رجحان کے رہنما بن گئے اور پہلا رجحان جلد ہی ختم ہو گیا ۔

۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۹ء تک گوک آلپ استانبول میں رہے ۔ یہ ان کی زندگی کا مؤثر ترین دور تھا ۔ قازان، قریم اور آذربیجان سے جو پڑھے لکھے لوگ ہجرت کر کے آئے تھے، ان سے شناسائی کی بدولت گوک ضیاء کی وطن پرستی میں پین تورانی رنگ بڑھ گیا، اگرچہ وہ ان لوگوں کے نسل پرستانہ رجحانات کے حامی نہ تھے ۔ وہ سلطنت عثمانیہ کے ترکوں کے مابین ابتداءً قوم پرست اور نصب العین پسند ہی رہے، جنھیں ان کے نزدیک اس انقراض پذیر سلطنت کی غیر ترک قومیتوں کے افکار کے مقابلے کے لیے احساس قومیت پیدا کرنے کی ضرورت تھی ۔ ان کا کلیدی تصور ثقافت کو تمدن سے جدا سمجھنا تھا جس کی تعریف وہ یوں کرتے تھے کہ وہ ان اقدار اور اداروں پر مشتمل ہے جو کسی تمدن میں مشترک طور پر شامل اقوام کو ایک دوسری سے ممیز کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک جدید ترکی قوم کی تشکیل مشرقی تمدن کے دائرے سے مغربی تمدن کے حلقۂ اثر میں منتقل ہو کر عمل میں آئے گی، اس تبدیلی میں اسلام کے وہ عناصر جو ترکی ثقافت کا جزو لاینفک بن چکے ہیں، ایک زندہ روحانی قوت کی حیثیت سے باقی رہیں گے، ترک قوم صرف اس حد تک مغربی رنگ اختیار کرے گی، جہاں تک کہ وہ جدید تمدن کو اپنی ثقافت اور اپنے مذہب سے ہم آہنگ بنانے میں کامیاب ہو سکے گی ۔ مقالات کے ایک سلسلے کے ذریعے اور ان لکچروں کی مدد سے جو وہ جامعۂ استانبول میں بحیثیت معلم عمرانیات دیتے رہے، انھوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کی مزید تشریح و توضیح کی تاکہ یہ بتائیں کہ اسے ان اصلاحات میں کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے جن کی تعلیم، زبان، خاندان قانون، معاشیات اور مذہب میں ضرورت تھی ۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد انگریزوں نے گوک آلپ کو کئی اور ترک سیاست دانوں اور روشن خیال لوگوں سمیت مالٹا میں جلا وطن کر دیا ۔ ۱۹۲۱ء میں رہائی کے بعد وہ اس قومی تحریک میں شامل ہو گئے جس کی قیادت مصطفٰی کمال کر رہے تھے ۔ اگرچہ وہ کمال پاشا کی اصلاحات کی مکمل تائید کرتے رہے، تاہم وہ زیادہ انتہا پسند کمالی حکومت کے ایک ممتاز ترین نصب العین پرست کا مرتبہ حاصل نہ کر سکے ۔ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی ۔ اس وقت وہ بویوک مجلس ملّی کے رکن تھے ۔

گوک آلپ شعر بھی کہ لیتے تھے، لیکن دراصل وہ مضمون نویس تھے۔ ان کی واحد کتاب: ترک مدنیتی تاریخی، جسے انھوں نے اپنے انتقال سے کچھ عرصے پہلے لکھنا شروع کیا تھا، ناتمام رہ گئی، اس کی ایک جلد جو زمانۂ قبل از اسلام سے متعلق ہے، ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی (استانبول ۱۳۴۱ھ) ۔ بحیثیت مفکر انھیں پوری ترک قوم میں شہرت حاصل ہوئی لیکن ان کے بعض تصورات کمال پاشا کی اصلاحات سے ماند پڑ گئے، بعض کو مصطفٰی کمال کی مخالف پین تورانی جماعت نے توڑ مروڑ کر پیش کیا، اور بعض کو ان کے

انتقال کے بعد یکسر رد کر دیا گیا ۔ جدید ترکی کا ایک غیر مذہبی قومی ریاست کی حیثیت سے قیام بہت حد تک اسی تعیین جہت Orientation کا رہین منت ہے جسے گوک آلپ کے تصورات نے مرتب کیا تھا ۔ ان تصورات کا ایک غیر ارادی اثر ترکی کے باہر ہوا، مثلاً معلوم ہوتا ہے کہ ساطع الحصری نے، جو ۱۹۱۹ء میں عرب قومی تحریک میں شامل ہونے اور ترکی کو خیر باد کہنے سے پہلے ان کے بے تعصب مخالفین میں سے تھا، اس نے گوک آلپ کے نظریۂ قومیت ان کے معاشرتی فلسفے، ان کی غیر مذہبیت اور ان کے قومی تعلیم کے تصور کو اپنا لیا۔

مآخذ: گوک آلپ کی شائع شدہ ادبی تصانیف: (۱) قزل الما، استانبول ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۴ء؛ (۲) یکی حیات، استانبول ۱۹۱۸ء، ۱۹۴۱ء؛ (۳) آلتین عشق، استانبول ۱۳۳۹ھ / ۱۹۴۲ء؛ (۴) ضیاء گوک آلپ کلیاتی، ج ۱ : شعرلر و خلق مثعلری، طبع F.A. Tansel، انقرہ ۱۹۵۲ء، ان کے مضامین کے مجموعے: (۵) ترک لشمک، اسلام لشمک، معاصر لشمک، استانبول ۱۹۱۸ء؛ (۶) ترکجی لیگنگ اساسلری، انقرہ ۱۳۳۹ھ، استانبول ۱۹۴۰ء: (۷) ترک تورہ سی، استانبول ۱۳۳۹ھ: (۸) طوغرو یول، انقرہ ۱۹۳۹ء؛ (۹) ماثنا مکتوبلری، طبع علی نزهت گوکسلی، استانبول ۱۹۳۱ء؛ (۱۰) ضیا گوک آلپ و چنار آلتی، طبع علی نزهت گوکسلی، استانبول ۱۹۳۹ء: (۱۱) فرقہ ندر، طبع (E. B. Şapalyo) زنگولاق ۱۹۴۷ء: (۱۲) ضیاء گوک آلپ حیاتی، صنعتی، اثری، طبع علی نزهت گوکسل، استانبول ۱۹۵۲ء؛ (۱۳) یکی ترکہ یننن هدفلری، انقرہ ۱۹۵۶ء؛ (۱۴) ضیاء گوک الپن ایلکیازی حیاتی ۱۸۹۴ - ۱۹۰۹ء، طبع شوکت بیسان اوغلو، استانبول ۱۹۵۶ء؛ (۱۵) *Turkish Nationalism and Western civilisation. selected essays of Ziya Gokalp*، ترجمہ و طبع نیازی برکس، لنڈن و نیویارک ۱۹۵۹ء، ان کی زندگی اور تصانیف پر مضامین اور کتابیں : (۱۶) نیازی برکس *Ziya Gokalp, his contribution to Turkish Nationalism*، در *MEG*، ج ۸، (۱۹۵۴ء) ص ۳۷۵ تا ۳۹۰؛ (۱۷) J. Deny : *RMM Ziya Goek Alp*، در RMM، ج ۶۱ (۱۹۲۵ء)، ص ۱ تا ۴۱؛ (۱۹) کاظم نامی دو رو: ضیاء گوک آلپ، استانبول ۱۹۴۹ء؛ (۱۹) امین علی شیرگل : برنکر آدینک رومانی، استانبول ۱۹۴۱ء؛ (۲۰) ضیاء الدین فخری : *Ziya Gokalp, sa vie et sa sociologie*، پیرس ۱۹۳۵ء؛ (۲۱) A. Fischer : *Aus der religiösen Reformbewegung*، لائپزگ ۱۹۲۲ء؛ (۲۲) Richard Hartmann : *Ziya Gokalp's grundlagen des turkischen Nationalismus*، در OLZ ج ۲۸ (۱۹۲۵ء) عمود ۵۷۸ تا ۶۱۰؛ (۲۳) Uriel Heyd : *Foundations of Turkish Nationalism : the life and teachings of Ziya Gokalp*، لنڈن ۱۹۵۰ء، (دیکھیے ص ۱۷۳، گوک آلپ کے لیتھو گراف شدہ یونیورسٹی لکچروں اور غیر شائع شدہ تصانیف کے لیے)؛ (۲۴) احمد محیی الدین : *Die kulturbewegung im modernen Turkentum*، لائپزگ ۱۹۲۱ء؛ (۲۵) علی نزهت گوکسل : ضیاء گوک آلپ : حیاتی واثرلری، استانبول ۱۹۴۹ء؛ (۲۶) صنت اورلی (عرفی) : ضیاء گوک آلپ و مفکورہ، استانبول ۱۹۲۳ء؛ (۲۷) Ettore Rosse : *Uno scrittore turco contemporaneo : Ziya Gokalp*، در *Om*، ج ۴ (۱۹۲۴ء) ص ۵۷۴ تا ۵۹۵؛ (۲۸) Enver B. Sapolyo : ضیاء گوک آلپ اتحاد و ترقی و مشروطیت، استانبول ۱۹۴۳ء؛ (۲۹) عثمان طولغہ : ضیاء گوک آلپ و اقتصادی فکرلری، استانبول ۱۹۴۹ء؛ (۳۰) جاوید الجوتنقل : ضیاء گوک آلپ حقندہ بربلیوگرافیا دینہ میسی، استانبول ۱۹۴۹ء؛ (۳۱) جاوید ا طوتنقل : ضیاء گوک الیک دیار بکر غزتہ لرندہ چقان یاز یلری، استانبول ۱۹۵۳ء: (۳۲) ترک یوردو، ۱۳۴۰ھ، سال ۳، ع

شمارہ ۳؛ (۳۳) ح، اولکن: ضیاء گوک آلپ، غیر مؤرخ.
(نیازی برکس)

گوک تپہ: (نیلی پہاڑی)، ایک ترکمانی قلعہ جو اسکوبیلیو Scobelew کی مہم (۱۸۸۰ - ۱۸۸۱ء) کی وجہ سے مشہور ہو گیا۔ یہ نام دراصل اس قلعے کا تھا جو بعد ازاں کہنہ گوک تپہ کے نام سے مشہور ہوا اور جسے ۱۸۷۹ء میں ترکمانوں نے خالی کر دیا تھا۔ زیادہ وسیع مفہوم میں اس سارے نخلستان کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا جس میں قبیلۂ تِکّہ نے روسیوں کی آمد پر اپنی تمام فوجیں جمع کر لی تھیں۔ سب سے مستحکم قلعہ دِنگل تپہ تھا جس کی ۱۸۷۹ء میں بڑی کامیابی سے مدافعت کی گئی۔ اسکوبیلیو Scobelew کی آمد سے کچھ ہی مدت پہلے اس قلعے کے استحکامات کو بہتر بنانے کے لیے کئی مستحکم مورچے (کہا جاتا ہے کہ انگریز افسر بٹلر کی زیر ہدایت) تعمیر کر لیے گئے تھے، لیکن محصورین (تقریباً ۲۰۰۰ آدمی جو کسی ایک رہنما کے ماتحت نہیں تھے) کے پاس صرف ایک توپ تھی جو ۱۸۶۸ء میں ایرانیوں سے چھینی گئی تھی۔ دوران محاصرہ میں دو ہلکی توپیں روسیوں سے بھی چھین لی گئیں لیکن ترکمان ان سے کچھ کام نہ لے سکے۔ روسی فوج کی تعداد ۸۰۰۰ تھی اور ان کے پاس ۷۰ توپیں تھیں۔ ۱۲ (۲۴) جنوری ۱۸۸۱ء کو بیس دن کے محاصرے کے بعد گوک تپہ ایک عام حملے کے بعد فتح ہو گیا اور چار دن کے لیے سپاہیوں کو لوٹ مار کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ جو ترکمان محاصرے یا لوٹ مار کے دوران میں ہلاک ہوئے ان کی تعداد ۶۰۰۰ سے ۸۰۰۰ تک بیان کی جاتی ہے۔ روسیوں کو وسط ایشیا میں جو فتوحات حاصل ہوئی تھیں، ان سب کی نسبت انھیں کہیں زیادہ قربانیاں دے کر یہ کامیابی نصیب ہوئی۔ ان کے ہلاک یا زخمی سپاہیوں کی مجموعی تعداد ۱۰۰۰ سے زیادہ تھی۔ علاوہ بریں گوک تپہ کے سامنے لڑی جانے والی لڑائیاں ہی صرف ایسی تھیں جن میں روسی فوج سے اس کے جھنڈے اور توپیں چھینی گئیں، دیکھیے ان جنگوں کے تازہ ترین بیانات *Istoriya zawoyewaniya* :M. Teremjew *Srednei Azii*، ۱۰۷ ببعد.

گوک تپہ آج کل ٹرانس کسپین ریلوے کے اس سٹیشن کا نام ہے جو دِنگل تپہ کے نزدیک [اَشخ آباد (اشک آباد، اشخ آباد) سے تیس میل مغرب میں] تعمیر کیا گیا ہے۔ یہاں ۱۸۸۰ - ۱۸۸۱ء کی مہم سے متعلق ایک عجائب گھر بھی ہے اور جب گاڑی (دس پندرہ منٹ کے لیے) اس سٹیشن پر ٹھیرتی ہے تو مسافر اسے دیکھنے جاتے ہیں.

(W. BARTHOLD)

گوکچای: ترکی گوکچہ تِنگز (''نیلا سمندر'') ارمنی سِونگہ (سِوْ۔ وَنک سے ''سیاہ حجرہ'') روسی آرمینیا (حکومت اِروِن یا اَرِیوان) میں میٹھے پانی کی ایک جھیل۔ یہ سطح سمندر سے ۶۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور ۶۲ مربع میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے، اس کے پانی کا نکاس ایک ندی میں زنگہ کے ذریعے ہوتا ہے جو دریاے اَرَکس Araxes میں جا گرتی ہے۔ جیسا کہ Le Strange نے اشارہ کیا ہے (*The Lands of the Eastern Caliphate* ص ۱۸۳) یہ نام پہلی بار حمد اللہ القزوینی کے ہاں نظر آتا ہے۔ عہد تاتار سے قبل کے [المستوفی] مسلمان مآخذ میں اس جھیل کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جس خانقاہ پر اس کا ارمنی نام رکھا گیا ہے، وہ اس کے شمال مغربی کنارے پر ایک جزیرے میں واقع ہے۔ آج کل گوکچای اس لیے مشہور ہے کہ یہاں مچھلیوں کی بہتات ہے (Trout، ترکی اشخَن، ارمنی گِگَرکُنی Gegarkuni)، دیکھیے Weidenbaum : *Putevoditel po Kawkazu*، ص ۳۱.

(W. BARTHOLD)

* **گُوکسُون** : (قدیم کُکُسُس Cucusus)، ایشیائی ترکی میں ایک گاؤں، صوبۂ حلب کی ''سنجاق'' مرعش کی قضا ''اندرین'' کے ایک 'ناحیہ' کا صدر مقام - یہ چکنی مٹی کے پہاڑوں سے گھرے ہوئے ایک نشیبی اور دلدلی میدان میں واقع ہے اور صرف درختوں کے تنوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں پر مشتمل ہے - بلندیوں پر آج بھی کئی ارمنی قلعوں کے کھنڈر موجود ہیں۔ اس کے ارد گرد کا تقریباً سارا علاقہ صحرا ہے۔ سینٹ کری سوسٹم St. Chrysostom، نے اپنی جلا وطنی کے دوران میں ۴۰۴ء میں کچھ عرصہ یہاں گزارا - پہلی صلیبی جنگ میں فرنگیوں نے تین روز گوکسُون (کوکسون Cocson، کوسور Cosor) میں بسر کیے تھے، کیونکہ انھیں یہاں خاصا سامان رسد مل گیا تھا۔

* **مآخذ** : (۱) Ch. Texier : *Asie Mineure*، ص ۵۸۰؛ (۲) Michaud : *Hist. des Croisades*، طبع ہفتم، ۱ : ۱۳۲ ۔

(CL. HUART)

* **گُوک صُو** : ''نیلا دریا''، ترک متعدد دریاؤں کو اس نام سے پکارتے ہیں۔ ان میں سے مشہور ترین دریائے سلفکہ ہے جسے ارمینک صو بھی کہتے ہیں - قدما اسے کلیکڈنس Calycadnus اور از منۂ وسطٰی کے مصنفین سلف Saléph کہتے تھے، جس میں ۱۰ جون ۱۱۹۰ء کو شہنشاہ فریڈرک غرق ہو گیا تھا۔

مآخذ : (۱) Ritter : *Erdkunde*، ۱۹ : ۲ ص ۳۰۶ ببعد.

(CL. HUART)

* **گُوکلان** : ایک ترکمانی قبیلہ جو دریائے گورگن اور اترک (رک بآں) کی بالائی گذرگاہوں کے درمیان کے پہاڑوں، یعنی ایرانی علاقے میں آباد ہے، لیکن اس کے بعض افراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ روسی علاقے میں، یعنی خیوا، قرہ قلعہ اور کندر میں آباد ہیں۔ یہ قبیلہ حسب ذیل شاخوں میں منقسم ہے : چکر، کرک، بایندر، کیئی، ینگک، سغری، قرہ، بلخان، ای دَرویش، ارککلی اور شیخ خوجہ - گوکلان کی کل تعداد کا صحیح صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا - Schuyler ان کی کل آبادی ۲۰۰۰ کبتکہ = ۱۰۰۰۰ افراد بتاتا ہے اور Vambéry بھی اس سے متفق ہے، لیکن اس کے برعکس Yate کے خیال میں یہ صرف ۲۰۰۰ کبتکہ (= ۱۰۰۰۰ نفوس) ہے - Vambery نے جن دوسرے بیانات کے اقتباس پیش کیے ہیں، ان میں اس سے زیادہ تعداد درج ہے - اس کی توجیہ یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ اندازے بہت قدیم زمانے میں لگائے گئے تھے اور اس دوران میں ان کی تعداد کم ہو گئی ہے - گوکلان خانہ بدوش نہیں، بلکہ کاشتکاری کرتے اور ریشم کے کیڑے پالتے ہیں، خاصے خوشحال ہیں اور شاہ کو سالانہ خراج کی ایک مقررہ رقم ادا کرتے ہیں - قطعی طور پر یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ وہ ان علاقوں میں کب سے آباد ہیں، لیکن غالباً وہ عہد سلاجقہ میں یہیں موجود تھے، ان کے ہمسایوں یعنی یموتوں Yomuts سے جو مغرب میں آباد ہیں اور بجنرد کے کردوں سے اکثر لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں - گوکلان بظاہر تساہل پسند مسلمان ہیں لیکن اپنے مذہبی مقتداؤں (خوجہ گان) کا بےحد احترام کرتے ہیں۔

مآخذ : (۱) Vambéry : *Das Türkenvolk*، ۳۹۳ ببعد؛ (۲) Schuyler : *Turkistan*، ۲ : ۳۸۲؛ (۳) Yate : *Khurasan and Sistan*، ص ۲۱۲ ببعد؛ (۴) Sykes : *Ten Thousand Miles in Persia, etc.*، ص ۱۸۰، ملاحظہ ہوں (مختلف بیانات).

(CL. HUART)

* **گوگو** : Gogo، سوڈان کا ایک شہر، دریائے نائیجر کے کنارے، ٹمبکٹو سے تقریباً ۲۰۰ میل

مشرق میں، ۱۶° ۱۲′ ۳″ عرض بلد شمالی اور ۲۴′ ۳″ ۰ طول بلد مشرقی (گرینوچ) پر واقع ہے ۔ عرب جغرافیہ دانوں کے یورپی مترجمین نے "گوگو" کئی طریقوں سے لکھا ہے ۔ لیو افریکانس (Leo Africanus) کے ہاں ہمیں اس کی حسب ذیل صورتیں ملتی ہیں Kaogha، Caucau، Kaokao اور Gago؛ البکری (Description de l' Afrique، ترجمہ de Slane، ص ۳۹۹) اس کی ایک عجیب و غریب توجیہہ پیش کرتا ہے کہ "یہاں کے باشندے کہتے ہیں ان کا شہر گوکو (Kao Kao) کے نام سے اس لیے مشہور ہو گیا کہ ان کے ڈھولوں سے یہ آواز بہت صاف نکلتی ہے" ۔ ہوڈس Houdas کے نزدیک (تاریخ السوڈان، ترجمہ، ص ۶، حاشیہ ۳) یہ سب "کوکوئی کوریہ" Kookoy Korya کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں، جس کا مطلب ہے "بادشاہ کا شہر" ۔ ان دو اسما میں سے پہلے کو لے کر اس مقام کا نام رکھ دیا گیا۔

گوگو سلطنت سنغئی (Songhai) (دیکھیے مادہ های سوڈان، سنغئی) کا صدر مقام تھا ۔ اس کی بنیاد ساتویں صدی عیسوی میں پڑی ۔ جب دیہ (زا) الایمان دریاے نائیجر کے کنارے کگیہ (عرب مصنفین کے ہاں کُکیۃ) میں مقیم ہو گئے تو سنغئی کی ایک جماعت "سِہر کو قرن" کو جو ان علاقوں میں آباد تھی شمال کی طرف نقل مکانی کر کے ایک نیا شہر گوگو بسانا پڑا ۔ یہ شہر دریا کی بالائی جانب تقریباً سو میل کے فاصلے پر اس کے بائیں کنارے پر آباد کیا گیا۔[. . . تفصیل کے لیے دیکھیے وو لائیڈن بذیل مادہ]۔

مآخذ: (۱) البکری: Description de l'Afrique Septentrionale، ترجمہ de Slane، ص ۳۹۹؛ (۲) الیعقوبی: Historiae، طبع Houtsma، جلد ۱، ص ۲۲۰؛ (۳) الادریسی، ترجمہ ڈخویہ، ص ۳؛ (۴) ابن بطوطہ: Voyages، ترجمہ Defrémery، جلد ۴، ص ۳۹۵؛ (۵) Leo Africanus، کتاب ۷، طبع Schefer، جلد ۳، ص ۲۹۸ بعد؛ (۶) السعدی: تاریخ السودان، ترجمہ Houdas، پیرس ۱۹۰۶ء (Public de l' Ecole des Langues orient viv، سلسلۂ چہارم، جلد ۱۳)؛ (۷) H. Barth: Reisen، جلد ۴، ص ۴۰۵ بعد، جلد ۵، باب ۹، ص ۲۱۶ بعد؛ (۸) نزہت الہدی، Hist. de la Dyn saadienne au Maroc، طبع Houdas، متن ص ۸۸ تا ۹۰، ترجمہ ص ۱۵۰ تا ۱۶۶ (Publ. de l' Ecole des Lang orient viv، سلسلۂ سوم، جلد ۲ و ۳)؛ (۹) Hourst: La Mission Hourst، (پیرس ۱۸۹۸ء)، ص ۱۵۸ بعد؛ (۱۰) E. F. Guatier: A. travers le Sahara français in La Géographie، ۱۵ فروری ۱۹۰۷ء؛ (۱۱) F. Dubois: Tombouctou la mystérieuse (پیرس ۱۸۹۷ء)، باب ۷؛ (۱۲) M. Delafosse: Haut Sénégal et Niger، سلسلۂ اول، جلد ۲، L. Histoire، پیرس ۱۹۱۲ء۔

(G. Yver)

(۱) نیز دیکھیے: M. Hartmann: Zur Geschichte der westlichen Sudan, Mitteil. des Seminars f. orient Sprachen، جلد ۱۵ (۱۹۱۲)، حصہ ۳، Afrik. Stud. ص ۱۵۵ بعد؛ (۲) ایضاً، Kuga und Kugu Orientalist. Litteraturzeitung، ۱۹۱۱ء، عمود ۳۶۵ بعد؛ (۳) H. von Mžik: Kūgā, Kūgā und Gāna، وہی کتاب، ۱۹۱۲ء، عمود ۱۹۳ بعد؛ (۴) J. Marquart: Die Benin Sammlung des niederländ. Reichsmuseums f. völkerkunde in Leiden (لائیڈن ۱۹۱۳ء)، ص ۵۹ تا ۱۰۷ و اشاریہ۔

ہارٹمن Hartmann کے خیال میں البکری کا "کوغہ"، گوگو تھا اور دیگر جغرافیہ دانوں کا کوگو وادای کا ملک ہے۔

مارکوارٹ Marquart نے بتایا ہے کہ (Benin-

Sammlung، ص ۱۰۶) کہ سوڈان میں کم از کم سات مقامات ایسے ہیں جن کے نام ایک ہی طرح یا قریب قریب ایک جیسے لکھے جاتے ہیں، اور پھر وہ ان پر تفصیلی بحث کرتا ہے۔

(ادارۂ [و] لائیڈن)

* **گول:** (ترکی) بہت سے ساکن پانی کا اجتماع، جھیل یا جوہڑ، نیز یہ ایشیائی ترکی کے دو ناحیوں کا نام ہے، ان میں سے ایک کوپرو کی قضا (سنجاق، اماسیہ، ولایت سیواس) میں ہے اور اس میں ۴۳ گاؤں شامل ہیں، دوسرا ولایت قسطمونی کے صدر مقام کے ساتھ منسلک ہے اور اس میں ۶۱ گاؤں ہیں۔

مآخذ: (۱) سالنامہ ۱۳۲۵ھ، ص ۸۲۰، ۸۳۳۔

(CL. HUART)

* **گولٹہ:** Goletta، تونس کی ایک بندرگاہ نیز رك بہ تونس۔

* **گولت سیہر:** (Ignaz Goldziher) اسحاق گولت سیہر ایک مشہور مستشرق، جو ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۲۱ء میں فوت ہوا۔ وہ قومیت کے لحاظ سے ہنگیرین Hungarian اور مذہباً یہودی تھا۔ یورپ میں اسلامی علوم کے مطالعے کی تحریک میں اس کا بڑا حصہ ہے اور اس نے حدیث نبوی کے مطالعے پر خاص توجہ مبذول کی۔

گولت سیہر ۱۸۵۰ء میں ہنگری کے شہر بوڈاپسٹ Buda-Pest میں پیدا ہوا، اور تحصیل علم کے لیے اپنے شہر کی یونیورسٹی میں داخل ہوا، جہاں اس نے مشہور مستشرق وامبیری Vambery سے استفادہ کیا جو ترکستان میں ایک درویش کے لباس میں سفر کر چکا تھا۔ بعد ازاں وہ لائپزگ (جرمنی) یونیورسٹی میں آ گیا، جہاں اس نے وہاں کے مشہور عربی دان پروفیسر فلائشر Fleischer سے تلمذ حاصل کیا اور اس کے فیض صحبت سے عربی زبان پر عبور حاصل کیا اور اس کی نگرانی میں کام کر کے ۱۸۷۰ء میں ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی۔ اس نے شام اور مصر کا سفر بھی کیا، اور کچھ عرصے کے لیے جامع الازہر کے درس میں بھی شریک رہا۔

گولت سیہر نے جرمن اور فرانسیسی مجلّوں میں بہت سے تحقیقی مضامین لکھے لیکن اس کی سب سے مشہور کتاب *Muhammdanische Studien*، یعنی Muh. Studies ہے جو اس نے جرمن زبان میں دو جلدوں میں لکھی تھی۔ اس کی دوسری جلد میں علم حدیث سے بحث کی گئی ہے، اور حدیث نبوی کی جمع و تدوین کی تاریخ کے علاوہ وضع حدیث کے اسباب و محرکات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ نقد حدیث اہل اسلام کے لیے کوئی نئی بات نہیں کیونکہ علمائے سلف نے کمزور حدیثوں کو خود ہی چھانٹ کر الگ کر دیا ہے اور کھوٹے کھرے کی پہچان کے اصول قائم کر دیے ہیں لیکن تنقید حدیث کا کام اگر اغیار کے ہاتھوں انجام پائے تو یہی تنقید بسا اوقات تنقیص حدیث کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور موضوع حدیثوں کا باربار ذکر کرنے سے پڑھنے والا شخص حدیث کے سارے ذخیرے سے بدظن ہو جاتا ہے۔

گولت سیہر کی دوسری اہم کتاب *Die Richtungen der Islamischen Koran ausbergung* ہے۔ یہ ان لیکچروں کا مجموعہ ہے جو اس نے ۱۹۱۸ء میں علم تفسیر کے ارتقاء اور مفسّرین کے طبقات کے مخصوص رجحانات پر دیے تھے۔ امام السیوطی نے مفسرین کے طبقات کی ترتیب بلحاظ زمانہ کی تھی، لیکن گولت سیہر نے ان کے طبقات ان کے مخصوص رجحانات کے اعتبار سے قائم کیے۔ مثلاً ان کے نزدیک ایک گروہ ایسے علما کا ہے جنھوں نے قرآن مجید کی تفسیر اسلامی روایات اور احادیث کی روشنی میں کی ہے، جیسے امام الطبری وغیرہ۔ ایک

طبقہ معتزلی عقائد کے مفسرین کا ہے جن کے سرخیل علّامہ الزّمخشری ہیں اور ایک گروہ متصوفہ (مثلاً امام القُشیری) کا ہے اور سب سے آخر میں زمانۂ حال کے مفسرین ہیں جو عہد حاضر کے طرز خیال اور نظریات سے متأثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید کو اسی انداز میں سمجھا ہے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ایک مصری فاضل عبدالقادر نے اس کتاب کو مذاهب التفسیر الاسلامی کے نام سے عربی میں ترجمہ کر دیا ہے، جس کا مطالعہ مسلمان علما کے لیے از بس مفید ہے۔

کیمبرج اور وی انا کی یونیورسٹیوں نے گولت سیہر کو ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری عطا کی اور دنیا کی بہت سی علمی مجالس نے اسے اپنا اعزازی رکن بنایا۔

گولت سیہر نے جو کثیر تعداد میں مضامین، مقالات اور مستقل کتابیں لکھیں ہیں، برنارڈ ہیلر B. Heller نے ان کی فہرست تیار کر کے ایک کتاب کی شکل میں ۱۹۲۷ء میں پیرس سے شائع کر دی تھی۔

مصادر: (۱) ابوالقاسم سحاب: فرہنگ خاور شناسان (مطبوعۂ ایران)، ص ۱۴۷، ۱۴۸؛ (۲) *Die Arabischen Studein in Encyclopaedia* :Fuck, J. (لائپزگ ۱۹۰۰ء)، ص ۲۲۶ تا ۲۳۱؛ (۳) *Bibliographie des ouvres de Iqnaz* : Barnard Heller *Goldziher*، پیرس ۱۹۲۷ء۔

(شیخ عنایت اللہ)

* **گولڈن ھورڈ:** Golden Horde (رکّ بہ مادّۂ قپچاق مغول)۔

* **گولڑوی:** رکّ بہ گولڑہ شریف نیز مہر علی پیر۔

⊗ **گولڑہ شریف:** راولپنڈی سے گیارہ میل کے فاصلے پر کوہ مارگلا کے دامن میں ایک قصبے کا نام گولڑہ ہے۔ راولپنڈی سے پشاور کو جاتے ہوئے یہ ریلوے کا دوسرا سٹیشن ہے۔ قصبہ سٹیشن سے ہٹ کر شمال کی جانب پہاڑ کے دامن میں کوئی دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ قطب شاہی اعوانوں کی آبادی ہے جو ایک قصبے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اسے گولڑہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں بابا گولڑہ کی اولاد آباد ہے جو حضرت قطب شاہ کے نویں بیٹے تھے۔ تاریخ الاعوان (طبع دین محمد پریس لاہور ۱۹۰۶ء، ص ۲۹ تا ۳۲) کے مطابق قطب شاہ حضرت علی کرم اللہ تعالٰی وجہہٗ کے تیسرے فرزند محمد بن حنفیہ کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے بزرگ مدینۂ منورہ سے ھجرت کر کے ہرات آئے اور پھر غزنی پہنچے۔ میر قطب شاہ کے والد شاہ عطاء اللہ سبکتگین کے سالار لشکر تھے۔ میر قطب شاہ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے اور جہاد کرتے رہے۔ بابا گولڑہ کا نام عبداللہ گولڑہ تھا۔ نسب ناموں میں انھیں گوھر علی، گورڑہ اور گوھر شاہ بھی لکھا جاتا ہے (تاریخ الاعوان، ص ۱۴)۔ ان کی والدہ ایک راجپوت چوھان راجا چھتری کی لڑکی بیان کی جاتی ہے۔ ان کا قیام سون سکیسر ضلع سرگودھا میں بھی رہا، خوشاب سے سکیسر جاتے ہوئے چڑھائی کے بعد جب وادی میں داخل ہوتے ہیں تو ایک مقام وہاں بھی ہے جسے ''بابا گولڑہ'' کہا جاتا ہے۔ وہاں نشان کے طور پر پتھروں کا ڈھیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بابا نے چند روز وہاں گزارے تھے۔ راولپنڈی تحصیل میں گولڑہ کے علاوہ اعوانوں کے اور بھی متعدد گاؤں ہیں۔ ۱۸۹۳-۱۸۹۴ء کے راولپنڈی ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں یہاں کے لوگوں کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں۔ ۱۸۶۵ء میں لاہور سے طبع ہونے والی گرفن کی تصنیف پنجاب کے رؤسا (انگریزی) میں بھی گولڑہ کے اعوانوں کے متعلق کچھ اسی طرح

کا ذکر ہے (ص ۱۷۵) - گولڑہ کے اس سے زیادہ تاریخی حالات دستیاب نہیں ہو سکے - البتہ راولپنڈی کے متعلق یہ پتا چلتا ہے کہ انند پال کو شکست دینے کے بعد سلطان محمود غزنوی یہاں سے گزرا تھا (امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، جلد ۲۱، ص ۲۶۳) - انیسویں صدی کے آغاز میں شاہ شجاع اور شاہ زمان راولپنڈی میں پناہ گزین ہوئے تھے - سکھوں کی فوج نے گجرات کی لڑائی کے بعد ۱۴ مارچ ۱۸۴۹ء کو راولپنڈی میں ہتیار ڈالے تھے (محولۂ بالا امپیریل گزیٹیر، ص ۲۷۲) - اس کے بعد یہ شہر، اس کا مضافاتی علاقہ اور یہ صوبہ یعنی پنجاب انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا - ٹیکسلا کا مشہور قدیمی شہر گولڑہ سے مغرب کی طرف ہے، بنا بریں بدھوں کے آثار اس علاقے میں ملتے ہیں - ان کوائف سے واضح ہوتا ہے کہ گولڑہ کے ارد گرد تاریخ بگڑتی اور بنتی رہی ہے - اب راولپنڈی کے قریب اسلام اباد میں دارالحکومت بن جانے سے گولڑہ ایک بار پھر تاریخ ساز ماحول میں آ گیا ہے - دارالحکومت قصبے کی شرقی حدود کے ساتھ واقع ہے - گولڑہ کی موجودہ شہرت کی وجہ یہ ہے کہ یہاں حضرت پیر مہر علی شاہ قدس سرہ العزیز ایسے نامور چشتی بزرگ ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوے - پیر مہر علی شاہ گیلانی سید تھے - ان کے آباو اجداد پہلے ساڈھورہ ضلع انبالہ میں رہتے تھے - ان کے والد کا نام پیر نذرالدین تھا - ان کے جد امجد پیر روشن الدین فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد یہاں گولڑہ میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے تھے - اس علاقے میں جو سادات پہلے سے آباد تھے، وہ زیادہ تر شیعہ تھے - پیر نذر الدین بڑے متقی بزرگ تھے، مگر اپنے علم و فضل اور روحانی مرتبے کے لحاظ سے ان کے فرزند پیر مہر علی شاہ کو جو شہرت نصیب ہوئی اس کی وجہ سے اس موضع کی شہرت لازوال ہو گئی - پیر مہر علی شاہ نے یہاں چشتیہ سلسلے کی ایک مشہور خانقاہ قائم کی، عمارات بننے لگیں، درسگاہ قائم ہوئی، شاندار مسجد بنی اور دور دراز سے ہر پائے کے لوگ حصول فیض کے لیے پہنچنے لگے - ان کا انتقال ۲۹ صفر ۱۳۵۶ھ / ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء کو ہوا اور تدفین اگلے روز مسجد شریف کے جنوب کی طرف باغ میں ہوئی - عالیشان مقبرہ تعمیر ہوا جس پر آیات، احادیث اور اقوال کندہ ہیں - وسیع مجلس خانہ بھی قریب بنایا گیا ہے جہاں ہر روز باقاعدگی سے قوالی ہوتی ہے - ہر سال ۲۹ صفر کو عرس منایا جاتا ہے - ہزاروں مرید پاکستان، ہندوستان، سعودی عرب اور دیگر ممالک سے حصول ثواب کے لیے شامل ہوتے ہیں - اس عرس کے ختم ہونے پر دوسرا عرس میلاد النبی کے سلسلے میں بھی شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے - اس کے بعد ۱۱ ربیع الآخر کو حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا عرس بڑے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے - تینوں مواقع پر زائرین کی سہولت کے لیے سپیشل گاڑیاں چلائی جاتی ہیں۔

گولڑہ شریف میں سکھوں کی تحصیل اور قلعے کے کھنڈر اور آثار اب تک موجود ہیں - سٹیشن جنکشن ہے جہاں سے کوہاٹ کو گاڑی جاتی ہے اور تھانہ، نیشنل بنک، ہسپتال، ڈاک خانہ، تارگھر، ٹیلیفون آفس بھی بن چکے ہیں - یہ قصبہ راولپنڈی اور اسلام آباد سے پختہ سڑکوں کے ذریعے ملا ہوا ہے، جن پر بسیں چلتی رہتی ہیں - حضرت پیر مہر علی شاہ کے مزار کے علاوہ حضرت پیر روشن دین شاہ، پیر سید رسول شاہ، پیر فضل دین شاہ، اور سید پیر نذر دین شاہ کے مزارات ہیں - آستانۂ عالیہ کی مسجد اور دیگر عمارات بھی قابل دید ہیں - اور قصبہ اب بھی رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنا ہوا

ہے (دیکھیے فیض احمد : مہر منیر، ص ۵۲۰، لاہور ۱۹۶۹ء) ۔ (پیر مہر علی شاہؒ کے بعد ان کے فرزند، پیر غلام محی الدینؒ گدی نشین ہوے ۔ ان کا انتقال ۱۹۷۵ء میں ہو گیا ۔ اب ان کے صاحبزادے شاہ غلام محی الدین گدی نشین ہیں) مآخذ مقالے میں درج ہیں [عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا] ۔

(ادارہ)

* **گُولِک بوغاز** : قُدما کے مشہور درۂ Pylae Ciliciae [= Cicilian Gates] کا ترکی نام ۔ یہ نام اس کے قریب کے ایک مقام گولک سے لیا گیا ہے جس کی آبادی Cuinet کے بیان کے مطابق ارد گرد کے دیہات کو ملا کر ۱۸۰۰ تھی ۔ ارمنی نوشتوں میں ہمیں گولک کے بجاے گُگْلَگ Guglag ملتا ہے جسے لاطینی میں Gogulat یا Coqelaquus بنا لیا گیا، تاہم لاطینی وقائع نگار ہمیشہ Porta Judae ھی لکھتے ھیں ۔ عرب وقائع نگاروں کے ہاں ہمیں محض دَرْب یا دَرْبُ السَّلامة ملتا ہے ۔ زیادہ تفصیلی بیانات کے لیے مندرجۂ ذیل تصانیف دیکھیے ۔

مآخذ : (۱) Ritter : *Erdkunde*، ج ۱۹، حصہ ۲، ص ۲۷۳ ببعد؛ (۲) Ramsay : *Historic Geogr. of Asia Minor*، ص ۳۴۹ ببعد؛ (۳) Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۱۳۳ ببعد؛ (۴) Cuinet : *La Turquie d' Asie*، ۲ : ۴۹ ۔

(A. DIRR)

گُولکُنڈہ : ایک قدیم شہر اور قلعے کا نام جو کسی زمانے میں مسلمان بادشاھوں کی سلطنت تِلِنگانہ کا صدر مقام تھا ۔ ابتدا میں اس شہر کے محل وقوع پر کچی مٹی کا ایک قلعہ تھا جو ہندو راجاؤں نے کسی زمانے میں تعمیر کرایا ہو گا اور جسے بعد میں دکن کے بہمنی خاندان کے بادشاھوں نے مستحکم کیا اور اس کی زیب و زینت میں اضافہ کیا ۔

سلطان محمود شاہ بہمنی نے ۱۴۹۵ء میں سلطان قلی قطب الملک کو مغربی تلنگانہ کا حاکم مقرر کیا ۔ اس نے گولکنڈے کو اپنا انتظامی صدر مقام بنایا ، قلعے کی چار دیواری اور دیگر استحکامات کو پتھر سے دوبارہ تعمیر کیا ، اور اس نئے شہر کا نام محمد نگر رکھا ۔ لیکن یہ نیا نام اس شہر کے قدیم نام کی جگہ نہ لے سکا ۔ ۱۵۱۲ء میں وہ خود مختار ہو گیا اور اس نے گولکنڈے کو اپنا پاے تخت بنایا، چنانچہ قطب شاھی بادشاھوں کا صدر مقام ۱۵۹۱ء تک یہی شہر رہا ۔ اس سال میں محمد قلی قطب شاہ نے جو اس خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا بھاگ نگر کا شہر جو پرانے قلعے سے سات میل کے فاصلے پر واقع ہے، تعمیر کرایا جس کا نام بعد میں حیدرآباد ہو گیا ۔ بادشاہ اپنے درباریوں سمیت اس شہر میں آ گیا ۔ گولکنڈہ اپنی اصلی حالت میں قلعے سمیت قائم رہا اور جب کبھی کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق ہوتا تو بادشاہ اپنے درباریوں سمیت یہاں آ جایا کرتا تھا ۔ عبداللہ قطب شاہ جو اس خاندان کا ساتواں بادشاہ تھا، ۱۶۵۶ء میں اسی جگہ اورنگ زیب کے ہاتھوں محصور ہوا جو ان دنوں سلطنت مغلیہ کی جانب سے دکن میں وائسراے تھا ۔ لیکن اسے اپنے والد کے احکام سے مجبور ہو کر محاصرہ اٹھا لینا پڑا ۔ جب اورنگ زیب خود تخت پر بیٹھا تو وہ اس کام میں مشغول ہو گیا کہ دکن میں جو دو ریاستیں باقی بچ رہی تھیں ان کا بھی خاتمہ کر دے ۔ اس نے ۱۶۸۷ء میں بیجا پور پر قبضہ کر لینے کے بعد ابوالحسن قطب شاہ کا جو گولکنڈے میں قطب شاھی خاندان کا آٹھواں اور آخری بادشاہ تھا، محاصرہ کر لیا ۔ آٹھ مہینے کے محاصرے کے بعد قلعہ سر ہو گیا اور بادشاہ کو گرفتار کر کے دولت آباد بھیج دیا گیا جہاں بارہ سال کے بعد وہ فوت ہو گیا ۔

جنوبی ہندوستان میں گولکنڈے کا شہر ہیروں

اور جواہرات کی منڈی ہونے کی وجہ سے مشہور تھا، کیونکہ جس ریاست کا یہ پایۂ تخت تھا اس میں اس قسم کی کانیں بہت تھیں ۔

مآخذ : (۱) T.W. Haig : *Historic Land-marks of the Deccan*.

(T. W. HAIG)

* **گُوم** : (عربی تحریر میں قوم) شمالی افریقہ کے عرب علاقوں میں مسلح گھڑ سواروں کے دستے یا قبیلے کے لڑنے والے آدمیوں کو جس نام سے پکارا جاتا ہے اس کی یہی صورت اور تلفظ ہے ۔ اس کے مشتق گُومَۃ کا مطلب ہے گُوم کی فوجی جماعت یا دستے یا ''ایک دلیرانہ یلغار، شورش یا بغاوت'' ۔ عربی میں اس کی جو تحریری صورت ''قوم'' ہے وہ بھی شمالی افریقہ کی بولیوں میں ''لوگ، قوم، قبیلہ'' وغیرہ کے معنوں میں پائی جاتی ہے (Beaussier : *Dict pract. arab-fransais des dialetes parles en Algerie et en Tunisie*) ۔ تاہم یہ بات ذہن نشیں کر لینی چاہیے کہ تحریری عربی میں قوم کے معنی ''دشمن'' یا ''لوٹ مار پر جانے والے لوگوں کی ایک جماعت'' بھی ہو سکتے ہیں (Dozy : تکملہ، جلد ۲ : ص ۴۲۴ ب) ۔

ترکوں نے الجزائر اور تونس کی قدیم بربر ریاستوں کے گُوم کو فوج میں سرکاری عہدے دیے ۔ انہوں نے ملک میں اپنے فوجی قبضے کے نظام کا دارو مدار انہیں پر رکھا تھا ۔ انہوں نے تمام قبائل کو ''مخزن'' یعنی امدادی افواج اور رعِیّۃ میں بانٹ رکھا تھا ۔ مخزن اکثر محاصل سے آزاد تھے اور رعِیّۃ کو تمام ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے ۔ جب مؤخرالذکر جماعت سے تعلق رکھنے والے ایک یا زیادہ قبائل ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیتے تھے یا کسی وجہ سے بغاوت برپا کر دیتے تھے تو ترک فوج بڑی تیزی سے باغیوں کے علاقے میں جا پہنچتی تھی ۔ یہ فوج اپنی تعداد کی کمی کو گوم کے گھڑ سواروں کے انتہائی تیز رفتار دستوں سے پوری کرتی تھی [. . . . تفصیل کے لیے دیکھیے لاو لائڈن بذیل مادّہ] .

مآخذ : (۱) W. Esterhāzy : *De la domination turque dans l' ancienne d' Alger*، (پیرس ۱۸۴۰ء)، ص ۲۶۱ بعد؛ (۲) Soualah : *Cours moyen d' arabeparlé*، (الجزائر ۱۹۰۹ء) ص ۱۰۰؛ (۳) Larcher : *Legislation Algérienne*، (پیرس ۱۹۰۳ء)، جلد ۱، شمارہ ۲۹۸، ص ۲۱۷؛ (۴) Menerville : *Dict. de Législation Algérienne*، ص ۲۰؛ (۵) *Circulaire du Gouverneur Géneral de l' Algérie* مورخہ ۲۱ تا ۲۵ مارچ ۱۸۶۷ء؛ (۶) Hugues et Lapra : *Code Algérien*، (پیرس ۱۸۷۸ء)؛ (۷) *Arrêté du Gouvern. Général de l'Algérie 11th December 1872*، بار چہارم ۔ موجودہ انتظامات کے لیے دیکھیے *Circulaire du Gouvern. Général de l' Algérie du 29 April 1910.*

(A. COUR)

* **گُومُش خانہ** : ''چاندی گھر'' (جدید یونانی میں اس کا ترجمہ Αργυρούπολις کیا جائے گا) ولایت طرابزون (Trapezunt) کی ایک سنجاق کا صدر مقام جو ۱۹۱۳ء تک Chaldia کے یونانی اسقف اعظم کا مرکز رہا ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صرف ۲۵۰ برس پہلے آباد ہوا تھا اور اولیا (۲ : ۳۴۳) کے بیان کے مطابق یہ مقام وہی جانِچہ ہی ہے جو سلیمان اول سے عثمان دوم تک چاندی کے سکوں کی ٹکسال کی وجہ سے مشہور رہا ۔ گومش خانہ پہلے پونٹس Pontus کے ساحلی علاقوں میں کان کنی کا مرکز تھا اور قدیم زمانے میں بھی اپنی چاندی کی وجہ سے مشہور تھا ۔ اٹھارھویں صدی (سلطان محمود اول کے عہد) میں یہاں کچھ عرصے کے لیے غُروش ضرب کیے گئے ۔ ۱۸۲۸ء ۔ ۱۸۲۹ء کی جنگ کے دوران روسی عارضی طور پر ضلع گومش خانہ پر

قابض ہو گئے ۔ ان کے جانے کے بعد یونانی باشندوں کا بڑا حصہ جو زیادہ تر کانوں میں کام کرتا تھا ترک وطن کر گیا اور کان کنی کی صنعت پر زوال آ گیا ۔ حال میں یورپی کمپنیوں نے سیلاب زدہ کانوں میں کام شروع کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن ان میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ۔ یہاں چاندی ملا سیسا نکلتا ہے ۔ موجودہ آبادی . . . ۳ کے قریب ہے جس میں نصف یونانی ہیں، پانچ یونانی گرجاؤں کی قیمتی آرائش و زیبائش اس زمانے کی یادگار ہے جب یہاں کی یونانی آبادی . . . ۵ کنبوں پر مشتمل تھی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قدیم باشندے کس قدر خوشحال تھے (دیکھیے (۱) جہاں نما ص ۶۲۲، ۶۲۳؛ (۲) Hamilton : *Researches*، ۱ : ۲۳۴ ببعد؛ (۳) Triantaphyllides : ΤαΠουτικα، ص ۹۷ ببعد؛ (۴) Sava Joannides : Ιστορία ΤραΠεζοῦντος، ص ۱۴۱، ۲۴۸ ببعد؛ (۵) Cuinet : *La Turquie d' Asie*، ۱ : ۱۲۲ ببعد؛ منظر در (۶) Texier : *Descr. de l' Armenie, la Perse etc.* پلیٹ ۲).

(J. H. Mordtmann)

گومل : ایک دریا کا نام جو پاکستان کی شمال مغربی سرحد میں افغانستان کے سلسلۂ کوہستان سے نکلتا ہے اور جنوب مشرق کی جانب بہتا ہوا درّۂ گومل کے ذریعے وادی سندھ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے دریائے سندھ سے اتصال سے پہلے توی، کندر اور ژوب کے پانی بھی اس میں آ ملتے ہیں۔ اس کا پانی شدید طغیانی کے بغیر دریائے سندھ تک نہیں پہنچتا کیوں کہ یہ سارا پانی نہری آبپاشی کے سلسلے میں ختم ہو جاتا ہے۔

پاکستان۔افغان سرحد پر درّۂ گومل ایک اہم درّہ ہے ۔ اس دریا نے بھی اس کے ساتھ ساتھ اپنے گزرنے کا راستہ بنا لیا ہے ۔ اس کی وجہ سے یہ آسانی ہو گئی ہے کہ راستے میں ہر جگہ پانی مل سکتا ہے۔ اس درّے کی زیادہ سے زیادہ بلندی ۳۰۱۲ فٹ (نزد دومنڈی) ہے [اس درّے کے نام کی مناسبت سے ڈیرہ اسمٰعیل خان (پاکستان) میں گومل یونیورسٹی قائم کی گئی ہے].

مأخذ : *Imp. Gaz. of India*، ۱۹۰۸ء، ج ۳ .

(M. Longworth Dames)

گوهر شاد آغا (بیگم) : امیر تیمور کے بیٹے ⊗ میرزا شاهرخ کی بیوی ان نامور خواتین میں سے ہے جن کا تدبر اپنے زمانے میں ضرب المثل تھا ۔ تمام مآخذ کی رو سے ان کا نام علم و فن کے عظیم قدر دانوں میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔ موزۂ ہرات کے ایک کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ کے والد کا نام امیر الکبیر غیاث الدین تھا۔ اس کی شاہانہ شان و شوکت کے سلسلے میں دو واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ ۸۲۲ھ/۱۴۱۹ - ۱۴۲۰ء میں اس کے بیٹے میرزا محمد جوکی بہادر کی شادی بادشاہ مغولستان کی دختر مہرنگار آغا سے ہوئی ۔ گوهر شاد آغا نے جشن کا جس پیمانے پر انتظام کیا، اسے دیکھ کر مؤرخین وقت نے حیرت کا اظہار کیا ہے۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اس کا بیٹا میرزا الغ بیگ حاکم ماوراء النہر سمرقند میں رہتا تھا ۔ اس نے اپنی والدہ کو سمرقند آنے کی دعوت دی ۔ میرزا محمد جوکی بہادر کو لے کر وہ اوائل ربیع الاوّل ۸۲۳ھ / مارچ ۱۴۲۰ء میں ماوراء النہر گئی ۔ میرزا الغ بیگ نے حوالی بخارا میں، خوش آمدید کہنے کے لیے شاهانہ جشن منعقد کیا ۔ اس سے پہلے ۸۲۰ھ / ۱۴۱۷ - ۱۴۱۸ء میں میرزا الغ بیگ ہرات آیا تھا اور گوهر شاد آغا نے اس کا شاندار استقبال کیا تھا ۔ ان امور سے واضح ہوتا ہے کہ مہد علیا گوهر شاد آغا کو شہزادوں کے معاملات میں بڑا دخل حاصل تھا ۔ گوهر شاد کو میرزا علاء الدولہ سے بڑی محبت تھی ۔ اس بات سے رنجیدہ خاطر ہو کر میرزا عبداللطیف ربیع الاول ۸۵۰ھ / اگست

گوہر شاد آغا (بیگم)

۱۴۴۱ء میں سمرقند چلا گیا کہ کیوں دوسرے فرزندوں کی طرف توجہ کم ہے۔ مگر میرزا عبداللطیف سے خود شاہرخ کو بہت لگاؤ تھا ۔ اس نے گوہر شاد سے کہا کہ میرے فرزند ارجمند کو تمہارے سلوک نے مجھ سے جدا کر دیا ہے ۔ چنانچہ گوہر شاد نے سمرقند کا سفر اختیار کیا، میرزا الغ بیگ نے حسب معمول عزت و احترام میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا اور گوہر شاد ۸۴۵ھ / مارچ ۱۴۴۲ء میں میرزا عبداللطیف کو ساتھ لے کر واپس ہرات آئیں۔ شاہرخ بڑا خوش ہوا (دیکھیے میر خواند : روضة الصّفا، مطبوعۂ بمبئی ۱۲۷۱ / ۱۸۵۴ - ۱۸۵۵ء ج ۶، ص ۲۳۹، ۲۴۰).

شاہرخ رمضان ۸۰۷ھ/جولائی ۱۴۰۴ء میں تخت نشین ہوا اور اس نے شہر ہرات کو اپنا دارالسلطنت مقرر کیا۔ جوں جوں اسے عروج حاصل ہوتا گیا، گوہر شاد آغا کا ستارۂ اقبال بھی بلند ہوتا رہا۔ شاہرخ کی ایک اور بیوی آق سلطان آغا بھی تھی، لیکن اسے کوئی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ شاہرخ نے مشہد مقدس کو خوبصورت بنانے کے لیے بڑی کوشش کی ۔ گوہر شاد آغا نے بادشاہ کے نیک عزم کی تکمیل میں بڑی عالی ہمتی اور بلند نظری سے اس کا ساتھ دیا ۔ اس نے وہاں حضرت امام علی ابن موسی الرّضا کے قبے کے نزدیک عالیشان مسجد جامع تعمیر کرائی جو اپنے فنی کمال کے ساتھ اب بھی موجود ہے اور اس کا شمار دنیا کی عمدہ ترین مساجد میں ہوتا ہے ۔ ۸۲۱ھ / ۱۴۱۸-۱۴۱۹ء میں شاہرخ مشہد مقدس کی زیارت کے لیے گیا اور مسجد کو دیکھ کر بہت خوش ہوا ۔ مسجد انہیں ایام میں مکمل ہوئی تھی۔ مسجد کے دروازے کی محراب پر ملکہ کے بیٹے میرزا بایسنغر کے ہاتھ کا خط ثلث میں کتبہ ہے جس کے آخر میں لکھا ہے : کتبۂ راجیاً الی اللہ بایسنغر بن شاہرخ بن تیمور گورکان فی ۸۲۱ - اس بات سے یہ واضح ہے کہ یہ سارا کنبہ بڑا باذوق تھا ۔ مسجد جامع کا فنی حسن بے نظیر سمجھا جاتا ہے ۔ راہنمای مشہد میں لکھا ہے کہ "بدون شک جامعی است کہ ہیچ یک از مساجد ایران باآن نمیتواند سر برابری داشتہ باشد. . . ہیچوقت از نماز گزار و عبادت کنندہ خالی نیست. . . گوہر شاد آغا ہمسر میرزا شاہرخ پسر تیمور با این اقدام نام خود را در تاریخ عالم اسلام مخلد و جاویدان ساختہ است. . . مسجد گوہر شاد از جنبۂ قدمت تاریخی و زیبائی ساختمان و ظرافت بنا و کاشیہاے نفیس و قیمتی کہ دارد یکی از جالب توجہ ترین بناہای مذہبی اسلام بشمار میرود، (ص ۱۲۹، ۱۳۰) [میر علیشیر نوائی : مجالس النفائس (تہران ۱۳۲۳ش، ص ۱۰۴) میں مولانا حاجی کا ذکر کرتے ہیں جو مشہد مقدس میں گوہر شاد بیگم کی مسجد جامع میں خطیب تھے، سنی العقیدہ تھے اور حضرت امام علی موسی رضا کے روضۂ منورہ میں بڑے معروف تھے۔ مسجد جامع کے علاوہ حضرت امام رضا کے احاطۂ مزار میں ملکہ گوہر شاد نے دو بڑے ایوان بھی تعمیر کرائے تھے جو دارالحفاظ اور دارالسیادت کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بھی نفیس کاشی کاری سے مزین تھے ۔ دارالسیادت قبۂ شریف کی بائیں طرف ہے اور دارالحفاظ قبۂ شریف اور دارالسیادت کے مابین واقع ہے جس کے مشرقی دروازے سے مسجد میں داخل ہوتے ہیں اور مغربی سمت کا دروازہ دارالسیات کی طرف کھلتا ہے۔ تیسرا دروازہ مغرب کی طرف ہے۔

گوہر شاد نے ہرات میں بھی عمارات تیار کرائیں ۔ ۸۲۰ھ / ۱۴۱۷ء میں ہرات کے شمال میں جوے انجیر کے کنارے ملکہ کے مدرسے کی بنیاد رکھی گئی ۔ ساتھ ہی مسجد جامع اور بیت المغفرہ نامی گنبد تعمیر ہوا ۔ ملکہ نے ان کے لیے وقف قائم کیے ۔ ساری عمارات کی تکمیل ۸۴۱ھ / ۱۴۳۷ -

۱۴۳۸ء میں ہوئی۔ مسجد اور مدرسے کی رسم افتتاح کے لیے ۸ صفر ۸۳۶ھ/ ۴ اکتوبر ۱۴۳۲ء کو بروز جمعہ شاہرخ خود گیا ۔ اس کے نام کا خطبہ شیخ شہاب الدین بن شیخ رکن الدین بن شیخ اسلام شیخ شہاب الدین بسطامی نے پڑھا ۔ محمد شفیع لاہوری مصحح مطلع سعدین و مجمع بحرین، مطبوعۂ لاہور ۱۹۴۹ء، ص ۱۳۶۳ پر منشآت عبداللہ مروارید خطی نسخۂ کتابخانۂ پنجاب یونیورسٹی ورق ۳۰ ب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بیت المغفرہ اور مسجد جامع کے حفّاظ کی تنخواہیں بعد میں بھی جاری رہیں۔ اور سلطان حسین میرزا بایقرا (۸۷۳ھ/ ۱۴۶۹ء تا ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۶ء) کے زمانے میں خواجہ حافظ حسین علی حفّاظ کی ایک جماعت کے ساتھ اس کام پر مقرر تھا ۔ موصوف نے ان کی تعیناتی کے حکم کا متن دے دیا ۔ میر علیشیر نوائی مجالس النفائس (ص ۷۶، ۹۱، ۹۲، ۲۵۳، ۲۶۶) میں مدرسۂ مہد علیا گوہر شاد بیگم کے ایک مدرس مولانا کمال الدّین مسعود شیروانی کا ذکر کرتے ہیں ۔ ظہیر الدّین بابر بابر نامہ میں ہرات کی سیر گاہوں میں گوہر شاد آغا کے مدرسے، بیت المغفرہ اور مسجد جامع کا ذکر کرتا ہے ۔ وہ ہرات میں ۹۱۲ھ میں گیا تھا ۔ خلیلی افغان آثار ہرات (مطبوعۂ ہرات ۱۳۰۹ شمسی، ص ۱۷۸) میں لکھتے ہیں کہ گوہر شاد آغا کی مسجد اور اس کے مدرسے کا اب ہرات میں وجود نہیں ۔ امیر عبدالرّحمٰن نے ایک انگریز انجینئیر کے کہنے پر انہیں گرا دیا تھا ۔ گوہر شاد آغا کا تعمیر کردہ گنبد البتہ باقی ہے جس میں وہ خود، شاہرخ، اس کے بیٹے بایسنغر اور محمد جوکی بہادر اور دیگر تیموری شہزادے مدفون ہیں ۔ چہار مینار جو ان عمارات سے متعلق ہیں، ابھی باقی ہیں ۔ ان کی بلندی ۱۲۰ تا ۱۵۰ قدم ہے ۔ طامس ولیم بیل لکھتا ہے کہ بیت المغفرہ کا گنبد سنہری ہے ۔ موزۂ ہرات میں ایک کتبہ ہے جو خطاط جعفر جلال (اضافت ابنی) کا لکھا ہوا ہے اور مدرسۂ مہد علیا گوہر شاد سے متعلق ہے۔ جملہ معلومات کا وہ بہت بڑا ماخذ ہے ۔ مدرسے کی عمارت پر میرک ہروی نے کئی کتبے لکھے تھے۔

اپنے زمانے کی اس برگزیدہ خاتون کا حشر بڑا المناک ہوا ۔ ۲۵ ذوالحجہ ۸۵۰ھ/ ۱۲ مارچ ۱۴۴۷ء کو شاہرخ فوت ہو گیا ۔ اسے مذکورۂ بالا گنبد میں دفن کیا گیا ۔ اس موقع پر میرزا عبداللّطیف ابن میرزا الغ بیگ گورگان نے گوہر شاد آغا اور ترخانیوں کو تاراج کرایا اور پھر قید کر لیا اس بنا پر کہ ان کی ہمدردیاں میرزا علاء الدّولہ سے ہیں ۔ میرزا علاء الدّولہ نے لڑ کر انہیں آزاد کرایا ۔ پھر سلطان ابو سعید کا زمانہ آیا تو اپنے خلاف مزاحمت ختم کرانے کے لیے وہ ہرات آیا اور قلعے کا قبضہ نہ ملنے پر گوہر شاد سے بڑے اچھے ماحول میں ملاقات بھی کی، لیکن اسے بھکایا گیا کہ وہ تو خفیہ طور پر میرزا سلطان ابراہیم سے ساز باز کر رہی ہے ۔ انہیں ایّام میں سلطان ابراہیم کے حریف میر شیر حاجی نے سلطان ابو سعید کو کہلا بھیجا کہ مہد علیا کے ہوتے ہوے وہ ان کے پاس یعنی سلطان ابو سعید کی خدمت میں ہرات حاضر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سلطان نے اس نامور خاتون کو ۹ رمضان المبارک ۸۶۱ھ/ ۳۱ جولائی ۱۴۵۷ء کو قتل کرا دیا اور اس کا پچاس سال کا اندوختہ لوٹ لیا گیا ۔ بعد میں میرزا یادگار محمد نے اپنی جدہ کا انتقام لینے کے لیے اپنی تلوار کے وار سے سلطان ابو سعید کو ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۷ - ۱۴۶۸ء میں قتل کر دیا جب اوزون حسن نے سلطان کو گرفتار کر کے اسی کے حوالے کیا تھا۔

مآخذ: (۱) کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی : مطلع سعدین و مجمع بحرین، لاہور ۱۹۴۹ء، ص ۳۰۲؛

۳۷۹، ۳۸۷، ۳۲۵، ۶۴۵، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۸۱ ببعد؛ (۲) غیاث الدین خواند امیر : حبیب السیر، بمبئی ۱۸۵۷ء، ۳ : ۳، ص ۱۳۱، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۷، ۱۷۷، ۱۹۰، ۱۹۱؛ (۳) براؤن، ای جی : *A Literary History of Persia*، ج ۳، کیمبرج ۱۹۲۸ء بمدد اشاریہ؛ (۴) بیل، ٹی ۔ ڈبلیو : *An Oriental Biographical Dictionary*، لنڈن ۱۸۹۴ء، بذیل مادّہ؛ (۵) ظہیر الدین بابر : *The Memoirs of Babar*، ج ۲، ترجمہ انگریزی بیورج، ص ۳۰۵؛ (۶) میر علی شیر نوائی: مجالس النفائس، تہران ۱۳۲۳ش، ص ۷۶، ۹۱، ۱۰۴، ۵۲۳ - ۲۶۶؛ (۷) میر خواند : روضۃ الصفا، ج ۶ تہران ۱۳۳۹ ش، ص ۱۳، ۱۹، ۲۷؛ (۸) غلام رضا ریاضی : رہنمای مشہد، مشہد ۱۳۳۴ ش ص ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۲۹ - ۱۳۲؛ [عبد الغنی رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

* **گھیبا** : راجپوت نسل کا ایک مسلمان قبیلہ جس کا جودھرا قبیلے سے تعلق ہے اور تحصیل پنڈی گھیب ضلع اٹک پنجاب کے خاصے بڑے علاقے میں آباد ہے ۔ اگرچہ یہ کوئی بہت بڑا قبیلہ نہیں تاہم معاشرتی اعتبار سے اس کے افراد کو خاصا اونچا مقام حاصل ہے ۔ وہ پنوار راجپوتوں کی ایک شاخ ہیں اور ٹوانہ اور سیال قبائل کے رشتے دار ہیں۔ روایت کے مطابق ان کے بانی (دھارا نگر کے ایک راجپوت) راے شنکر پنوار کے تین بیٹے ٹیو، سیو اور گھیو تھے ۔ ان میں سے پہلا ٹوانوں کا، دوسرا سیالوں کا اور تیسرا گھیبوں کا جد امجد تھا ۔ گھیبے قریب قریب خود مختار ہی رہے حتی کہ رنجیت سنگھ نے انھیں مغلوب کر لیا ۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے کس زمانے میں اسلام قبول کیا تھا ۔ [ٹوانے اور سیال پنجاب میں غالبًا پندرھویں صدی عیسوی کے ختم ہونے سے پیشتر آئے ہوں گے اور گھیبے ان دونوں کے کچھ عرصے بعد آئے اور دریاے سندھ اور سوان کے درمیانی وسیع اور پہاڑی علاقے میں آباد ہو گئے اور اسے اپنے ہمسایہ اعوانوں، گکھڑوں اور جودھروں سے سکھوں کے زمانے تک بچائے رکھا ۔ افغان حملہ آوروں نے بھی انھیں مطیع نہ کیا کیونکہ یہ شاھراہ سے دور رہتے تھے ۔ نیز جب وہ گزر رہے ہوتے تھے تو گھیبے انھیں خراج ادا کر دیتے تھے ۔ ان میں سے ایک راے جلال سکھوں کے زمانے میں تھا جس نے اپنے علاقے کا انتظام خوب کیا ہوا تھا ۔ ۱۸۳۰ء میں راے محمد نے بالا کوٹ کی لڑائی میں سید احمد شہید کے خلاف سکھوں کی امداد کی تھی ۔ یہ قوم پرجوش، توانا، اور سخت کوش ہے]۔

مآخذ : (۱) *Imp. Gazetteer of India*، فصل متعلقہ پنجاب ۱۹۰۸ء؛ [(۲) گرفن ومیسی : تذکرۂ رؤساے پنجاب، لاھور ۱۹۱۱ء، ص ۲۶۷، ۳۰۰، ۳۰۱؛ (۳) *A Glossary of the Tribes and Castes*، ج ۲، لاھور ۱۹۱۱ء، ص ۲۸۵]۔

(LONGWORTH DAMES [و ادارہ])

گَیخَاتُو : ایران کے ایلخانی خاندان کا ایک مغل شہزادہ (۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء تا ۶۹۴ھ/۱۲۹۵ء) جو ارغون [رک بآں] کا بھائی اور جانشین تھا ۔ اس کا لقب ایرن جین دورجی (در وصاف تورجی) یعنی ''سب سے قیمتی موتی'' تھا جو اسے تخت نشینی کے بعد اپنے بدھ راھبوں (وصاف کی رو سے چینی راھبوں) سے ملا تھا اور جسے وہ اپنے سکوں پر کندہ کرواتا تھا ۔ وصاف کی رو سے گیخاتو کے عہد حکومت میں جو کرنسی نوٹ جاری کیے گئے تھے، ان پر بھی یہی نام لکھا گیا تھا ۔ تخت نشینی سے پہلے وہ ایشیاے کوچک کا حاکم تھا ۔ اس کے پیشرو کے برعکس اس کے دور حکومت میں مسلمانوں کو خاص طور پر مراعات حاصل ہو گئیں ۔ صدر الدین احمد الخالدی (جو اپنے مولد کی نسبت سے الزنجانی اور اپنے کاغذی

سکّے کے ناکام تجربے کی وجہ سے الچاوی کے نام سے بھی مشہور تھا) جسے ۶ ذوالحجہ ۶۹۱ھ / ۱۸ نومبر ۱۲۹۲ء کو صاحب دیوان (وزیر) مقرر کیا گیا تھا صدر جہان کے خطاب سے نوازا گیا، اور دہ ہزاری کا فوجی منصب عطا کیا گیا۔ اس کے بھائی قطب الدین احمد کو قاضی القضاۃ کی حیثیت سے قطب جہان کا خطاب حاصل تھا۔ صدر جہان نے کاروبار سلطنت سے مغل امیروں کو سراسر بے دخل کر دیا تھا۔ شاہی جاگیروں کے لگان ''اینجو'' اور عام ریاستی لگانوں ''دلا'' میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ وزیر کو اس عہدے سے علحدہ کرنے کے سلسلے میں امیروں کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ گیخاتو کے حکم سے سازشیوں کو وزیر کے حوالے کر دیا گیا لیکن اس نے انھیں معاف کر دیا اور آئندہ اس قسم کی شکایات پیش کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی۔ اس خاندان کے دیگر حکمرانوں خصوصاً اپنے پیش رو ارغون کے برعکس گیخاتو نے اپنے مختصر عہد حکومت کو کسی طرح کے ظلم وستم سے داغدار نہیں کیا، لیکن دوسری طرف اس نے اپنی فضول خرچی اور ہر کہ و مہ پر نوازشات کر کے ریاست کا حال پتلا کر دیا۔ جانوروں کی ایک متعدی بیماری ''موت'' پھیل جانے سے حالات اور بھی خراب ہوگئے۔ دربار کے اخراجات پورے کرنے کے لیے خزانۂ شاہی کو قرض لینا پڑا لیکن اسے واپس ادا کرنے کی اس میں سکت نہ تھی، ان حالات سے مجبور ہو کر مغربی ایشیا میں پہلی اور آخری بار چینیوں کے نمونے پر کاغذی سکہ (چاو) جبراً چلانے کی کوشش کی گئی (۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء) لیکن اس اقدام سے مشکلات اور بڑھ گئیں اور بادشاہ اور اس کے وزیر کا وقار بہت کم ہو گیا۔ دو ہی ماہ بعد یہ نوٹ واپس لے لیے گئے اور جیسا کہ Dorn : *Grunder. d. Iran. Phil.*، ۲ : ۵۰۵ نے بتایا ہے، فارسی زبان میں چاو کا لفظ بھی باقی نہ رہا۔ یورپ کے کرنسی نوٹوں کو ہمیشہ عربی نام ''قائمہ'' سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن بارھویں / اٹھارھویں صدی تک لفظ چاو فارسی زبان میں ملتا تھا اور اس کے معنی ''جعلی سکہ'' لیے جاتے تھے (F. Tuefel : *Quellenstudien zur neueren Geschichte der chanate*، ص ۴۷).

گیخاتو کو تخت سے اتارنے اور قتل کرنے کے بارے میں دیکھیے بائیدو، ۱ : ۵۹۱ .

مآخذ: (۱) تاریخ وصاف، مطبوعہ ہند، ص ۲۵۹ ببعد؛ (۲) D. Ohsson : *Histoire des Mongols*، ۴ : ۸۲ ببعد؛ (۳) Hammer-Purgstall : *Geschichte der Ilchane*، ۱ : ۳۹۶ ببعد؛ (۴) Howorth : *History of the Mongols*، ۳ : ۳۵۷ ببعد .

(W. BARTHOLD)

* گیزہ: (جیزۃ) مصر کا ایک شہر .

⊗ گیسو دراز: ''سید محمد حسینیؒ گیسو دراز چشتی''۔ نام محمد، لقب صدرالدین، کنیت ابوالفتح، عرف گیسو دراز تھا۔ ان کے والد ابن یوسف عرف راجو قتال تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت امام حسینؓ تک پہنچتا ہے۔ آبائی وطن خراسان اور حنفی المذہب چشتی المشرب تھے۔ بارھویں پشت کے جد ابوالحسن جندی قبل فتح دہلی غالباً راے پتھورا کے زمانے میں (۵۳۶ / ۱۱۴۱ تا ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء) مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ ہرات سے دہلی آئے، ایک معرکے میں شہید ہوے۔ ان کے والد سید یوسف المتخلص بہ راجہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ (م ۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ء) کے مرید تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں کامل تھے۔ ۷۲۸ - ۷۲۹ھ میں محمد تغلق کے عہد میں جدید پاے تخت دولت آباد میں دیگر اولیاء اللہ کے ساتھ گئے۔ ۷۳۱ھ / ۱۳۳۰ء میں ان کی وفات ہوئی۔ مدفن خلد آباد میں ہے۔ گیسو دراز دہلی میں پیدا ہوے تھے، سنہ ولادت میں

اختلاف ہے ۔ یعنی ۷۲۰ھ (لطائف)؛ ۷۲۱ھ (سیر محمدی)؛ ۷۲۳ھ (تاریخ حبیبی)؛ ۷۲۵ھ، مگر (بقول مقالہ نگار) ۷۲۱ھ زیادہ مستند ہے ۔ سکونت بداؤں دروازۂ سہر ولی (جوامع) تھی ۔ دولت آباد گئے تو نو سال کے تھے ۔ ابتدائی تعلیم والد اور نانا سید علاءالدین میر میراں کے مرید شیخ نظام الدین بداؤنی سے پائی ۔ لڑکپن ھی سے نہایت متقی اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے ۔ خواجہ برھان غریب نے ایک خاص محفل میں فرمایا : ''شما را نعمتے از آخوند مولانا محمود برسد، حیران بودیم کجا ما و کجا دہلی (جوامع)'' ۔ گیسو دراز ۷۳۵ھ/۱۳۳۵ء میں والدہ کے ساتھ دولت آباد سے چل کر دہلی آ گئے ۔ اس وقت خواجہ گیسو دراز کی عمر پندرہ سال تھی ۔ سولھویں سال حضرت خواجہ نصیر الدین روشن چراغ دہلی کے مرید ہوے ۔ حظیرۂ شیر خان (جہاں پناہ) میں مجاھدہ اور ریاضتیں کیں اور حسب ایماے پیر کہ ''ما را با تو کارہا ست'' ۱۹ سال کی عمر میں قاضی عبد المقتدر شریحی الکندی، تاج الدین بہادر، شرف الدین کیتھلی (سیر محمدی) اور عماد الدین تبریزی (حدائق الانس) جیسے متبحر علما سے صرف و نحو، اصول فقہ، حدیث تفسیر، معقول و منقول وغیرہ، کی تکمیل کی اور علم باطنی میں بھی مدارج اعلٰی طے کیے ۔ حظیرۂ شیر خان میں ملا نصیرالدین تھانیسری دانشمند، شیخ آدم مولانا عمر وغیرہ سے علمی مباحثے ھوا کرتے تھے ۔ آپ کی تصانیف مدح و فضیلت صحابہؓ سے مملو ھیں ۔ مرشد نے انھیں اپنی وفات سے چند روز قبل ۷۵۷ھ میں خلافت سے سرفراز فرمایا ۔ اس وقت ان کی عمر ۳۶ سال سے کچھ زائد تھی ۔ مرشد کی مسند سنبھالنے کے بعد چوالیس سال رشد و ھدایت کے کام میں بسر کیے ۔ یہ بیان غلط معلوم ھوتا ھے کہ روشن چراغ دہلوی کے بعد دہلی کا تابناک دور ختم ھو گیا (مشائخ چشت) کیونکہ سلطان فیروز تغلق اور بڑے بڑے علما مولانا حسین دہلوی، نصیرالدین قاسم، مولانا معین الدین توھانی، شیخ زادہ نور الدین اجودھنی، فرزندان و بزرگان شیخ فرید گنج شکر، کے علاوہ ھزار ھا اشخاص ان کے مرید و معتقد تھے جن کی زندگی کا مقصد رشد و ھدایت تھا ۔

گیسو دراز نے ۴۰ سال کی عمر میں بی بی رضا خاتون سے عقد کیا ۔ ماہ محرم ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء تا ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء میں انھوں نے امیر تیمور کے حملے اور دہلی کی تباھی کی پیشین گوئی کی اور خود مع متعلقین سلطان ناصر الدین کے عہد میں دولت آباد چلے گئے ۔ اثناے سفر میں امرا، سلاطین، علما و فضلا اور صوفیہ نے ان کا خیر مقدم کیا ۔

دولت آباد میں عضدالدولہ صوبیدار نے حسب الحکم سلطان فیروز بہمنی ان کا استقبال کیا اور نذر پیش کی ۔ بالآخر وہ گلبرگہ گئے اور متصل قلعۂ گلبرگہ مقیم رھے ۔ اور یہاں تقریباً بیس اکیس سال تک ارشاد و ھدایت کے بعد بتاریخ ۱۶ ذوالقعدہ ۸۲۵ھ/یکم نومبر ۱۴۲۲ء واصل بحق ھوے ''مخدوم دین و دنیا'' (سیر محمدی) اور ''مہ سپہر ولایت بودند'' (مجمع الاولیا) وفات کی تاریخیں ھیں ۔ ان کا عالیشان مقبرہ مع خانقاہ سلطان احمد شاہ بہمنی (۸۳۸ھ) نے بنوایا جو ان کا مرید و معتقد تھا ۔ انھیں خصوصاً خواجہ احمد دبیر سے بہت الفت تھی، کہا کرتے تھے ''(باعث) آمدن من در دکن احمد دبیر است'' (شوامل) ۔ احمد دبیر نے قبل ۸۲۵ھ شہادت پائی ۔

اولاد : دو بیٹے سید محمد اکبر عرف میاں بڑے (۷۶۳ - ۸۱۲ھ) اور سید یوسف عرف سید محمد اصغر اور تین صاحبزادیاں تھیں ۔ بی بی فاطمہ ستی (م ۸۰۳ھ بمقام سلطان پور)، بی بی بتول منسوب بہ سید سالار لاھوری، اور بی بی امۃ الدین ۔ گیسو دراز کے اخلاف اب بھی دکن میں موجود

ہیں، تاریخ محمدیہ، روضتین (روضۂ بزرگ و خرد)، ایک مدرسۂ دینیہ اور ایک کتابخانہ ان کی یادگار ہے ۔ عرس دھوم دھام سے منایا جاتا ہے ۔ سلاطین دکن ان کا بہت احترام کرتے تھے ۔

خلفا : ان کے چالیس کاملین تھے (سیر محمدی و تبصرة الخوارقات) .

بعض اقوال : (۱) الشریعة افضل من الحقیقة؛ (۲) "دیوانہ باش و با خدا هشیار با محمد" (محبت نامہ) ۔ شاہ کمال (: شواہل) نے اس کی اس طرح ترجمانی کی ہے : "عینیت سے مست ہوں اور غیریت سے ہوشیار"؛ (۳) "ماهیت او تعالی عین ذات اوست"۔ (ماهیت حق، غیر ماهیت خلق ہے (شاہ کمال)؛ (۴) "قهره لطفه، لطفه قهره"، معرفت جمع اضداد کا نام ہے (شاہ کمال)؛ (۵) لا تجلّی فی صورة مرّتین : (تجلی کو تکرار نہیں، حقیقت کو تبدل نہیں" (شاہ کمال)؛ (۶) الواحد فی الواحد، باینهمه صورت دوئی باقیست : (اسمار الاسرار) ۔ دو ذات ایک وجود (شاہ کمال)؛ (۷) سالک کے لیے دو چیزیں لازم ہیں : تزکیۂ نفس و توجّہ تام، (مراد انہماک و مواظبت)؛ (۸) شغل ارّہ تجلی جلالی ہے ۔ جسم پرزے پرزے ہو جاتا ہے اور تجلی رحمانی سے اصلی حالت [پر لوٹ آتا ہے] (اجودھن میں شیخ منور فضل سے حضرت گیسو دراز کا چشم دید واقعہ مشہور ہے)؛ (۹) "عشق جانِ کائنات است، عشق لاعین و لاغیر است، باچشم (....)،" ۔ گیسودراز کو شیخ ابن العربی سے بعض مسائل میں اختلاف تھا، علامہ جمال الدین مغربی، شیخ نصیر الدین تھانیسری، اور میر اشرف جہانگیر سمنانی سے مباحثے ہوے ۔ مگر نفس توحید وجودی (وحدة الوجود) میں اختلاف نہ تھا .

تصانیف : گیسو دراز کی ۱۰۵ تصانیف بیان کی جاتی ہیں ۔ مشہور تصانیف میں سے بعض (جو مستند ہیں اور حیدر آباد میں طبع ہو چکی ہیں، درج ذیل ہیں .

(۱) شرح آداب المریدین (شیخ عبدالقاهر سہروردی) و خاتمہ بفارسی (عربی قلمی، پٹنہ لائبریری)؛ (۲) شرح زبدة الحقائق (تمہیدات عین القضاة ہمدانی)؛ (۳) شرح رسالہ قشیریہ (شیخ عبدالکریم ہوازن القشیری)، (۴) حدائق الانس؛ (۵) شرح الہامات غوث اعظم الموسوم بہ جواهر العشاق؛ (۶) استقامة الشریعة بطریقة الحقیقة، تالیف ۷۹۲ھ؛ (۷) اسمار الاسرار تالیف قبل ۸۲۵ھ؛ (۸) شرح فقہ اکبر (امام ابو حنیفہ)؛ (۹) دیوان گیسو دراز، الموسوم بہ "انیس العشاق" تقریباً تین ہزار بیت؛ (۱۰) رسالہ برهان العاشقین؛ (مختصر چیستان، دو صفحہ) جس کی مختلف شرحیں سید محمد کالپوی، عبدالواحد بلگرامی اور شیخ رفیع الدین محدث وغیرہ نے لکھی ہیں؛ (۱۱) جوامع الکلم (ملفوظات) مرتبۂ سید محمد اکبر حسینی فرزند گیسو دراز، تالیف ۸۰۲-۸۰۳ھ، مطبوعہ؛ (۱۲) مکتوبات گیسو دراز ۔ مرتبۂ ابو الفتح علاءالدین قریشی گوالیری ۔ تالیف ۸۰۲ھ؛ (۱۳) تفسیر ملتقط ۔ (کتبخانہ شیخ علاءالدین جنیدی، گلبرگہ صدر المشائخ)، غیر مطبوعہ؛ (۱۴) وجود العاشقین، قلمی مکتوبۂ محمد علی معمار ۲۲، جلوس محمد شاہی ۔ کتب خانۂ آصفیہ (مطبوعہ) .

تصنیفات جن کا ملفوظات وغیرہ میں ذکر ہے اور ان کا درس بھی دیا ہے .

(۱) تفسیر بطرز کشاف؛ (۲) حواشی کشاف (میر محمدی)؛ (۳) ترجمۂ مشارق، تالیف ۸۱۰ھ (تاریخ حبیبی)؛ (۴) شرح فصوص الحکم (جوامع الکلم)؛ (۵) حواشی قوت القلوب؛ (۶) شرح رسالۂ ابن العربی؛ (۷) شرح قصیدۂ حافظیہ؛ (۸) شرح تعرف؛ (۹) ضرب الامثال.

قدیم اردو کی تصنیفات: معراج العاشقین،

اور رسالۂ شکار نامہ (نثر) ان سے منسوب ہیں .

مآخذ : (۱) حمید شاعر قلندر: خیرالمجالس، ۷۵۴ - ۷۵۶ھ، قلمی، کتبخانۂ آصفیۂ حیدر آباد؛ (۲) مخدوم زادہ سید اکبر حسینی : جوامع الکلم، قلمی، کتبخانۂ آصفیۂ حیدر آباد ۸۰۲ - ۸۰۳ھ؛ (۳) سید محمد حسینی گیسو دراز: حدائق الانس، مطبوعۂ حیدر آباد، قبل ۸۲۵ھ؛ (۴) میر محمد علی سامانی: سیر محمدی، مطبوعۂ الٰہ آباد ۱۳۴۷ھ؛ (۵) ملفوظ سید یداللہ حسینی: محبت نامہ، قلمی، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد ۸۴۳ھ؛ (۶) عبد العزیز بن شیر ملک: تاریخ حبیبی، قلمی، کتبخانۂ (شیخ علاءالدین سجادۂ شیخ روضہ گلبرگہ، ۸۴۹ھ؛ (۷) ابو الفتح قریشی گوالیاری: مکتوبات گیسو دراز، قلمی، کتبخانۂ آصفیہ حیدرآباد ۸۵۲ھ: (۸) نظام حاجی غریب یمنی: لطائف اشرفی، مطبوعہ، (نویں صدی هجری)؛ (۹) سید من اللہ حسینی نبیرہ گیسو دراز: شوامل الجمل در شمائل الکمل ملفوظ۔ خاص قلمی نسخۂ ابو محمد عمر الیافعی حیدر آباد، ۸۲۳ — ۸۷۷ھ؛ (۱۰) سید علی اللہ عرف سید بابو: تبصرۃ الخوارقات، قلمی کتبخانۂ آصفیۂ حیدرآباد، (۹۸۱ هجری)؛ (۱۱) شیخ عبد الحق محدث دہلوی : اخبار الاخیار، مطبوعۂ مجتبائی دہلی، ۱۳۰۹ھ؛ (۱۲) علی اکبر: مجمع الاولیاء، کتبخانۂ نواب سالار جنگ، حیدرآباد، ۱۰۴۳ھ؛ (۱۳) جہان نما علی شاہ: تاریخ محمدیہ (خاندان گیسو دراز)، مطبوعۂ عزیز دکن حیدرآباد - (۱۳۰۸ - ۱۳۱۸ھ)؛ (۱۴) بشیر الدین احمد دہلوی : وقایع دہلی، مطبوعہ؛ (۱۵) عبد الحق: اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ، مطبوعۂ کراچی، طبع ثانی ۱۹۵۳ء؛ (۱۶) سید احمد خان: آثار الصنادید، مطبوعہ.

(سخاوت مرزا [تلخیص از ادارہ])

* **گیگا** : [گیغہ، گیقۃ] (Gega)، ایک البانوی قبیلہ رک بہ آرووالق .

* **گیلان** : صحیح معنوں میں گیلون، Gelae کا ملک) سلسلۂ کوہ البرز کے شمال اور بحیرۂ خزر کے جنوب میں ایران کا ایک صوبہ - اس کے مشرق کی جانب طبرستان یا مازندران ہے اور اس کی شمالی حد دریائے کُر اور اَرَس (Araxes) کے مقام اتصال تک پھیلی ہوئی ہے - تاہم ملکی تقسیم کے اعتبار سے اسے روس سے اَستارہ ندی علٰحدہ کرتی ہے - اس کا صدر مقام رِشت ہے - اس کا اندرونی علاقہ دلدلی ہے (لہٰذا عوام اس ملک کے نام کا اشتقاق گل (کیچڑ) سے کرتے ہیں) یہ جنگلوں اور شہتوت کے گھنے باغوں سے پٹا ہوا ہے - اس کا پہاڑی علاقہ دَیلَم کے نام سے مشہور ہے - یہاں کے باشندے اپنے آپ کو گیلَک کہتے ہیں - لاهیجان کے قریب سَفید رُود سمندر میں جا گرتا ہے، ابریشم بافی کی صنعت یہاں عام ہے اور زراعت میں چاول کی کاشت کو اہمیت حاصل ہے .

یہاں کی مسلسل مرطوب ہوا کے اثر سے طبیعت میں سستی پیدا ہوتی ہے، معتدل اور مرطوب موسم سرما کے دوران میں بھی گرم ہوائیں چلنے لگتی ہیں اگر بلندی سے نگاہ دوڑائی جائے تو جنگل ایک بے کنار ہرے بھرے سمندر کا منظر پیش کرتے ہیں، ان جنگلوں میں ایک خاص قسم کا شیر پایا جاتا ہے .

حال ہی میں جو اصلاحات عمل میں آئی ہیں، ان کی وجہ سے گیلان ایک اول درجے کی خود مختار ولایت بن گیا ہے، اس کا دارالحکومت رِشت ہے اور بندرگاہ انزلی [رک بآں] جو محض ایک گاؤں ہے، گیلان کی کل آبادی تقریباً دو لاکھ پچاس ہزار ہے (تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق سترہ لاکھ) اور محاصل ۲۰۲۷۸ تومان، صوبہ چار بلوکوں میں منقسم ہے (۱) تَوالِش (صدر مقام کرگانہ رُود)؛ (۲) لاهیجان؛ (۳) لنگہ رود (جس میں رُودسَر اور رانِکَہ شامل ہیں) اور منجل (مع رحمت آباد) پہلے یہ

حسب ذیل پانچ اضلاع پر منقسم تھا : رانکُو، لاھیجان، رشت، فُومن اور گسکر ـ ایک زمانے میں فُومن دارالحکومت سمجھا جاتا تھا اور اس کے اھم ترین مقامات تُولِم، لاھیجان، بِمَشْہر، کُوتَم، سُلُوس اور جیشم تھے، تاھم مقامی باشندے صرف اس کی یہ جغرافیائی تقسیم تسلیم کرتے ھیں کہ سفید رُود صوبے کو دو ضلعوں میں تقسیم کرتا ہے : بیہِ پس (ضلع رشت) اور بیہِ پیش (ضلع لاھیجان) ـ ملک کی مقامی بولی میں بیہِ دریا کو کہتے ھیں (احمد رازی : هفت اقلیم، منقول در شیفر Schefer : *Chrest. Pers.*، ۲ : ۱۰۳ [مخطوطۂ شیرانی کتاب خانۂ پنجاب یونیورسٹی، ورق ۳۴۵ الف] دیکھیے (۱) Melgunof، ص ۲۳۰، حاشیہ؛ (۲) Dorn : *Caspia*، ص ۴۶) ـ گیلان ایک مدت تک آزاد رہا اور پھر اسے ھُولاگو نے فتح کر لیا ـ اس نے ۱۲۲۷ء میں شمیران کے دفاعی استحکامات منہدم کر کے زمین کے برابر کر دیے ـ بالآخر صفویوں کے زمانے میں یہ صوبہ ایران میں شامل ھو گیا ـ عبّاس اوّل کے عہد میں رشت دارالحکومت تھا ـ تالِش جو شمال میں ہے، اس سے علیحدہ کر دیا گیا اور اس کا بیشتر حصہ "عہد نامۂ گلستان" (۱۸۱۳ء) کے تحت روس کے حوالے کر دیا گیا.

یاقُوت نے جِیلان نامی ایک قبیلے کا ذکر کیا ہے جو اِصْطَخر سے نقل مکانی کر کے بحرین چلا گیا تھا ـ امرؤ القیس کے ایک شعر کی رو سے انھوں نے کان کنوں اور معماروں کی حیثیت سے وھاں کے حکمرانوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی (Van Vloten : *Wien. Zeitschr. f.d. Kunde d. Morgenl.*، ۸ : ۶۲، ۱۸۹۴ء)، جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ غالباً گیل تھے.

معلوم ھوتا ہے کہ قدیم بادشاہ گیل (عربی جیل) کا لقب اختیار کرتے تھے (دیکھیے (۱) فرهنگ الطَبَری؛ (۲) المَسْعُودی : مروج، ۱ : ۳۰۹؛ (۳) ناصر خُسرو : سفر نامہ، ص XXII و ۱۶) .

مآخذ : (۱) *Bibl., Geogr. Arab.*، ج ۱ (الاصْطَخری)، ص ۲۰۳ و ۲۰۵؛ ج ۲ (ابن حَوقل)، ص ۲۶۷ ببعد؛ ج ۳ (المقدسی)، ص ۱۵ و ۳۵۵ و ۳۶۰ و ۳۶۷ ببعد)؛ (۲) یاقوت ۲ : ۱۷۹؛ (۳) Dorn : *Muhamm. Quellen zur Geschichte der Südlichen Küstenländer des Kaspischen Meeres*، ج ۲، ۳، ۴ : (۴) Barbier de Meynard : *Dict. Geogr. hist. et litt. de la Perse*، ص ۱۸۷ ببعد؛ (۵) Alex. Chodzko : *Le Ghilan et les Marais caspiens* (*Nouv. Annales des Voyages*، ۱۸۴۹ ـ ۱۸۵۰ء)؛ (۶) G. Melgunof : *Das südliche Ufer des Kaspischen Meeres, etc.*، (لائپزگ ۱۸۶۸ء)، ص ۲۲۷ تا ۲۸۸؛ (۷) Fr. Spiegel : *Erânische Altertumskunde*، ۱ : ۷۷؛ (۸) Dorn : *Caspia*، بمواضع کثیرہ، دیکھیے اشاریہ؛ (۹) Marquart : *Erânšahr*، ص ۱۳۴ ببعد؛ (۱۰) Ch. Schefer : *Chrestomathie persane*، ۲ : ۸۲ ببعد؛ (۱۱) *Revue du Monde musulman*، ۲۲ (۱۹۱۳ء) : ۲۸۲ .

(Cl. Huart)

ل

⊗ ل : حرف لام، عربی حروفِ تہجی کا تیئیسواں، فارسی حروف تہجی کا ستائیسواں اور اردو حروف تہجی کا بیالیسواں حرف جس کی عددی قیمت از روے ابجد تیس ہے ۔ سیبویہ (کتاب سیبویہ، طبع قاہرہ، ۱۳۱۷ھ، ص ۴۰۵) اور ابوالبرکات ابن الانباری (اسرار العربیۃ، طبع دمشق ۱۹۵۷ء، ص ۴۲۰ ببعد) کے بیان کے مطابق عربی حروف تہجی کے لیے جو سولہ مخارج مقرر ہیں، ان میں سے آٹھواں مخرج (ادا کرنے کی جگہ) حرفِ لام کے لیے مختص ہے جو زبان کے داہنے کنارے سے لے کر زبان کی نوک کے آخر تک کے اس حصے پر مشتمل ہے جو ضواحک، ناب، رباعیہ اور ثنیہ دانتوں کے اوپر بالائی تالو کے ساتھ ٹکراتا ہے (وَمِنْ حَافَةِ اللِّسَانِ اِلٰی مُنْتَہٰی طَرَفِ اللِّسَانِ مَا بَیْنَہَا وَ بَیْنَ مَا یَلِیْہَا مِنَ الْحَنَکِ الْاَعْلٰی وَمَا فَوْقَ الضَّاحِکِ وَالنَّابِ وَالرُّبَاعِیَۃِ وَالثَّنِیَّۃِ مَخْرَجُ اللَّامِ، کتاب سیبویہ، ص ۴۰۵، طبع قاہرہ، ۱۳۱۷ھ).

صوتی اعتبار سے لام حروف مجہورہ (جَہر سے، یعنی نمایاں اور سخت انداز میں ادا ہونے والے) میں سے ہے اور ان کی ضد حروف مہموسہ (ھمس سے، یعنی دھیمی اور نرم آواز سے ادا ہونے والے) ہیں جن کا مجموعہ اس جملے میں ہے : سَتَشْحَثُکَ خَصَفَۃٌ یعنی اس کا رنگ تجھے تیز بنا دے گا؛ اس مجموعے سے باہر والے تمام حروف مجہورہ ہیں ۔ ایک اور صوتی صفت کے لحاظ سے لام کو حروف مُذْلَقَہ یا حروف الذَّلْق [نیز حروف الذَّلَاقۃ]، یعنی تیز آواز سے ادا ہونے والے حروف میں شامل کیا گیا ہے (اور ان کا مجموعہ اس جملے میں ہے : فَرَّ مِنْ لُبٍّ : وہ عقل سے بھاگا) ۔ حروف مذلقہ کی ضد حروف مُصْمَتَہ (صَمت سے، یعنی چپکے سے ادا ہونے والے حروف) ہیں (ابن الانباری : اسرار العربیۃ، طبع دمشق ۱۹۵۷ء، ص ۴۲۲؛ کتاب سیبویہ، طبع قاہرہ، ۱۳۱۷ھ، ص ۴۰۵) ۔ ابن منظور (لسان العرب بذیل مادّہ) نے حروف ذَلْق صرف تین (راء، لام اور نون) بتائے ہیں، گویا اس کے نزدیک فاء میم اور باء حروف ذلق کے ضمن میں نہیں آتے؛ الزبیدی (تاج العروس، بذیل مادّہ) کا بیان ہے کہ چونکہ حروف ذَلْق تیزی سے ادا ہوتے ہیں، انسانی زبان کو زور صرف کرنا پڑتا ہے اور گفتگو میں آسان لگتے ہیں، اس لیے کلام عرب میں کوئی خُماسی کلمہ (پانچ حرفی کلمہ) ان سے خالی نہیں ہوتا ۔

قواعد لسانی کے اعتبار سے لام حروف عاملہ میں سے ہے اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں : ایک لام بحیثیت حرف جَر اور دوسری لام جازم کے طور پر ۔ لام جب حرف جر کے طور پر استعمال ہو تو

کبھی تو اسم پر داخل ہوتا ہے اور کبھی فعل پر عمل کرتا ہے؛ جب اسم پر داخل ہو تو کئی ایک معانی اور مقاصد کے لیے آتا ہے: (۱) انتہاء کے لیے جیسے کُلٌّ یَجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی، یعنی ہر ایک مقررہ مدت کی انتہا تک چلتا ہے؛ (۲) ملکیت کے لیے جیسے اَلْمَالُ لِزَیْدٍ: مال زید کی ملکیت ہے، ملکیت کا لام اگر اسم ضمیر کے شروع میں آئے تو مفتوح ہوتا ہے جیسے لَکَ (تیرا، تیرے لیے) اور لَہٗ (اس کا، اس کے لیے)، لیکن ضمیر واحد متکلم کے ساتھ مکسور آئے گا جیسے لِیْ (میرا، میرے لیے)؛ (۳) شبہ ملکیت جیسے اَلْبَابُ لِلدَّارِ (دروازہ گھر کا یا گھر کے لیے)؛ (۴) تعدیہ کے لیے جیسے وَھَبْتُ لِزَیْدٍ مَالاً: میں نے زید کو مال بخشا؛ (۵) تعلیل کے لیے جیسے جِئْتُ لِاِکْرَامِکَ: میں تیری عزت کے لیے آیا ہوں؛ (۶) لام زائدہ جارہ جیسے لِزَیْدٍ ضَرَبْتُ: میں نے زید کو مارا (شرح ابن عقیل علی الالفیة، ص ۹۸ تا ۹۹؛ اسرار العربیة، ص ۲۵، ۲۶۱)؛ (۷) لام قسم جیسے [لَتُبْلَوُنَّ فِیْۤ اَمْوَالِکُمْ وَ اَنْفُسِکُمْ (۳ [اٰل عمرٰن]: ۱۸۶)، یعنی تمھارے مال و جان میں تمھیں ضرور آزمایا جائے گا؛ (۸) لام استحقاق، جیسے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (۱ [الفاتحة]: ۱)، ساری تعریف اللہ کے لیے ہے؛] (۹) لام اختصاص جیسے اَلْجَنَّةُ لِلْمُؤْمِنِ: جنت مومن کے لیے مختص ہے؛ (۱۰) لام صیرورة جیسے خُلِقَ الْاِنْسَانُ لِلْعِبَادَةِ، انسان عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، (السیوطی: البہجة المرضیة فی شرح الالفیة، ص ۹۹ تا ۱۰۱).

جب حرف لام مکسورہ فعل پر داخل ہوتا ہے تو یہ معنی دیتا ہے: (۱) تعلیل: جیسے، یَاْکُلُ الْاِنْسَانُ لِیَعِیْشَ، انسان کھاتا ہے تاکہ زندہ رہے؛ (۲) تاکید نفی کے لیے، اسے لام جُحُود (انکار) بھی کہتے ہیں جیسے، مَاکَانَ زَیْدٌ لِیَدْخُلَ دَارَکَ: زید کو تو تیرے گھر میں، داخل ہی نہیں ہونا تھا۔ لام بمعنی اِلَّا بھی آتا ہے (ابن الانباری: کتاب الانصاف، مطبع لائیڈن ۱۹۱۳ء، ص ۲۴۵).

لام بطور حرف جازم جیسے ''لام امر'' یا ''لام طلب'' بھی کہتے ہیں، جیسے وَ لْیَحْکُمْ اَھْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْہِ ؕ (۵ [المائدة]: ۴۷) یعنی اہل انجیل کو چاہیے کہ جو احکام اللہ نے اس میں نازل فرمائے ہیں اس کے مطابق حکم دیا کریں؛ کبھی لام غیر عاملہ بھی ہوتا ہے، جسے کبھی تو ''لام تاکید'' یا ''لام ابتدا'' کا نام دیا جاتا ہے، جیسے لَزَیْدٌ اَفْضَلُ مِنْ عَمْرٍو، یعنی زید یقیناً عمرو سے افضل ہے؛ کبھی اسے ''لام الجواب'' کہا جاتا ہے، جو لَوْ (اگر)، لَوْلَا (اگر ایسا نہ ہوتا) اور قسم کے جواب میں آتا ہے، جیسے لَوْعُدْتُمْ عُدْنَا (تم نے دوبارہ کیا تو ہم بھی کریں گے)، لَوْلَا عَلِیٌّ لَھَلَکَ عُمَرُؓ (اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو گئے ہوتے)، وَاللّٰہِ لَزَیْدٌ کَرِیْمٌ (بخدا زید تو سخی ہے) (کتاب الانصاف، ص ۲۴۷، ۲۶۴)؛ [مزید تفصیلات کے لیے نیز دیکھیے: (۱) مجد الدین الفیروز آبادی: بصائر ذوی التمییز، ۴: ۴۰۸ تا ۴۱۲ (قاہرہ ۱۹۶۹ء)؛ (۲) معجم متن اللغة، ۵: ۱۳۳ تا ۱۳۵ (بیروت ۱۹۶۱ء)].

مآخذ: (۱) ابن منظور: لسان العرب، بذیل مادّہ؛ (۲) الزبیدی: تاج العروس، بذیل مادّہ؛ (۳) ابوبکر ابن الانباری: کتاب الانصاف، لائیڈن ۱۹۱۳ء؛ (۴) ابن عقیل: شرح ابن عقیل علی الالفیة، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۵) السیوطی: البہجة المرضیة فی شرح الالفیة، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۶) وہی مصنف: شرح شواہد المغنی، قاہرہ ۱۹۵۶ء؛ (۷) ابو البرکات عبدالرحمٰن ابن الانباری: اسرار العربیة، دمشق، ۱۹۵۷ء؛ (۸) سیبویہ: کتاب سیبویہ، قاہرہ، ۱۳۱۷ھ.

(ظہور احمد اظہر)

اَللَّات: زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا ایک مشہور بت جسے طائف کے شہر میں بنو ثقیف نے

پرستش کے لیے ایک بتخانے میں رکھا ہوا تھا ۔ یہ بت سفید پتھر کا بنا ہوا تھا اور اسے نقش و نگار سے خوب آراستہ کیا گیا تھا ۔ اسلام سے پہلے عربوں میں بت پرستی کا عام رواج تھا ۔ عربوں کے دیگر مشہور بتوں (= اصنام) میں عزّی، منات اور ھبل خاص طور پر قابل ذکر ھیں.

اللّات کے بارے میں مختلف اقوال ھیں : ابن جریر نے ایک قول یہ بیان کیا ھے کہ عربوں نے اللہ تعالٰی کے ناموں کے چند مؤنث نام بنا کر بتوں کے نام رکھ لیے تھے اور اللہ کا مؤنث اللّات بنا لیا؛ دوسرا قول ابن الکلبی (م ۲۰۴ھ) کا ھے کہ بنوثقیف کا ایک شخص صِرمۃ بن غنم ستو بنا کر حاجیوں کی مہمان نوازی کیا کرتا تھا (کتاب الاصنام؛ لسان العرب؛ بذیل مادۂ لت)؛ جب وہ مر گیا تو لوگ اس کی قبر پر جمع ہونے لگے اور اسے پوجنا شروع کر دیا (ابن کثیر : تفسیر) ۔ لغوی طور پر اللات لتّ، یلتّ (بمعنی پانی یا مکھن میں ستو ملانا) سے اسم فاعل ھے (لسان العرب)، جس کے معنی ھیں ستو تیار کرنے والا ۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ھے کہ اللات ایک آدمی تھا جو حاجیوں کے لیے ستو تیار کرتا تھا (الصحیح، کتاب التفسیر، بذیل سورۃ النجم [۵۳]، باب ۲).

عرب بالخصوص بنو ثقیف اس بت کا بڑا احترام کرتے تھے ۔ اسے ایک پہاڑ کی چٹان پر نصب کر رکھا تھا ۔ حرم کعبہ کی طرح اس علاقے کو بھی مقدس اور حرمت والا قرار دیتے اور اس پر چادر اور غلاف چڑھاتے اور اس کا طواف کرتے تھے ۔ بنو مالک بن ثقیف کا خانوادہ آل ابی العاصی اس کے متولی تھے (جمھرۃ، ص ۴۹۱).

قرآن مجید میں اللہ تعالٰی نے اللات اور دوسرے دو بتوں کا ذکر یوں فرمایا ھے : اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۙ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (۵۳ [النجم]: ۱۹ تا ۲۳)، یعنی بھلا تم لوگوں نے لات اور عزی کو دیکھا اور تیسرے منات کو (کہ یہ بت کہیں خدا ہو سکتے ھیں) ؟ (مشرکو!) کیا تمھارے لیے تو بیٹے ہوں اور اللہ کے لیے بیٹیاں؟ یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ھے ۔ یہ (بت) تو صرف نام ھی نام ھیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے گھڑ لیے ھیں۔ خدا نے تو ان کی کوئی سند نازل نہیں کی ۔ یہ (کافر) لوگ محض ظن (فاسد) اور خواھشات نفس کے پیچھے چل رہے ھیں، حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ھدایت آچکی ھے۔ اللہ تعالٰی نے ان آیات میں واضح طور پر فرما دیا کہ یہ بت جنھیں تم نے خدا سمجھ رکھا ھے ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ تم نے خود ھی انھیں خدا کی بیٹیاں قرار دے دیا ھے ۔ یہ سب کچھ تمھاری اپنی افترا ھے اور من گھڑت باتیں ھیں .

حدیث میں ان بتوں کو طاغیۃ (جمع : طواغیت) بھی کہا گیا ھے ۔ جب بنو ثقیف نے اسلام قبول کر لیا تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے حضرت ابو سفیانؓ بن حرب اور مغیرہؓ بن شعبہ کو اس بت کے انہدام کے لیے روانہ فرمایا ۔ ابن حزم نے منہدم کرنے والوں میں حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا نام لکھا ھے (جمھرۃ، ص ۴۹۱) ۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے اسے منہدم کرنا شروع کیا تو بنو ثقیف کی بعض عورتیں اس انہدام کے خلاف احتجاج کرتے ہوے ننگے سر چیخ پکار کرتی ہوئی نکل آئیں ۔ بہر حال حضرت مغیرہؓ نے اللات کو منہدم کر دیا اور بت خانے میں نذر و نیاز

کا جمع شدہ مال و زر لے کر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی خدمت میں حاضر ہوے۔

بنو ثقیف کے سردار حضرت عروہؓ بن مسعود کے ذمے کچھ قرض تھا ۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اس مال میں سے وہ قرض ادا کر دیا جائے ۔ اسی طرح اس مال میں سے حضرت قاربؓ بن الاسود بن مسعود کا قرض بھی ادا کیا گیا ۔ یہ دونوں صحابی بنو ثقیف سے پہلے مشرف باسلام ہو چکے تھے (جوامع السیرۃ، ص ۲۵۸).

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم نے لات اور عُزّی کی قسم کھانے سے منع فرما دیا اور حکم دیا کہ جو کوئی حلف اٹھاتے وقت لات یا عزی کا نام لے تو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا پھر سے اقرار کرے اور آئندہ کبھی لات کی قسم نہ کھائے (البخاری : الصحیح، کتاب التفسیر، سورۃ النجم، باب ۲؛ ابن کثیر : تفسیر).

مآخذ : (۱) قرآن مجید (۵۳ [النجم] : ۱۹ تا ۲۳)؛ (۲) البخاری : الصحیح، کتاب التفسیر، سورۃ النجم، باب ۲؛ (۳) ابن کثیر : تفسیر، بذیل سورۃ النجم؛ (۴) ابن منظور: لسان العرب، بذیل مادۂ ل ت؛ (۵) ابن حزم :جوامع السیرۃ، ص ۲۵۷، ۲۵۸؛ (۶) وهی مصنف : جمهرة انساب العرب، ص ۲۹۱؛ [عبدالقیوم رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

* **لاذقیه :** شمالی شام کی ایک بندرگاہ ہے ۔ اس کا بانی سلوقوس اول ہے جس نے اس کا نام اپنی والدہ Laodike کے نام پر رکھا ۔ سلطنت سلوقی کے آخری دور میں یہ اس اتحاد اربعہ کا رکن تھا جو شام کے چار سب سے اہم شہروں یعنی انطاکیه Antiocheia، افامیه Apameia، سلوقیه Seleuceia، اور لاذقیه Laodiceia کے درمیان ہوا تھا ۔ جسٹینین اول کے عہد میں اسے تھیوڈوریئس کے نئے صوبے کا صدر مقام بنا دیا گیا تھا۔

جب عربوں نے حمص کے والی حضرت عُبادۃؓ بن الصامت الانصاری کی زیر سرکردگی شہر پر فوج کشی کی تو یہاں کے باشندوں نے جم کر مزاحمت کی ۔ عبادۃؓ نے لاذقیه کے قریب پڑاؤ ڈال دیا اور اتنی گہری خندقیں کھدوائیں جن میں سوار بھی بغیر دکھائی دیے آگے بڑھ سکتے تھے ۔ وہ نمائشی پسپائی کے بعد رات کو واپس آئے اور اہل شہر کو بے خبری میں آ لیا، جنھوں نے بلا تامّل شہر کا بڑا دروازہ کھول رکھا تھا ۔ اس طرح عُبادۃؓ شہر میں داخل ہوگئے ۔ پھر قلعے پر حملہ کیا گیا اور عبادۃؓ نے اس کی فصیل پر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا ۔ عیسائی رعایا کا ایک حصہ البُسَیْد (البلاذری، طبع De Goeje، ص۱۳۳ سطر ۴ میں الیُسَیْد ہے جس کی تصحیح کر لینی چاہیے : Ed. Schwarz، در Wellhausen : *Z.D.M.G.*، ج ۴۰، ص ۳۶۶) بھاگ گیا ۔ انھوں نے شہر میں واپس آنے کی درخواست کی جسے خراج کے طور پر ایک معیّنہ رقم کی ادائی پر منظور کر لیا گیا ۔ گرجا پر انھیں کا قبضہ رہا ۔ عبادۃؓ نے ایک نئی مسجد بنوائی جس میں بعد کو توسیع کی گئی (البلاذری : کتاب مذکور، ص ۱۳۲ ببعد) ۔ تقریباً ۹۷ھ (بقول البلاذری: ۱۰۰ھ) میں یونانیوں نے بحری بیڑے کے ساتھ لاذقیه کے ساحل پر حملہ کیا، شہر کو جلا ڈالا اور اس کے باشندوں کو قیدی بنا کر لے گئے (البلاذری : کتاب مذکور، Brooks : *J.H.S.*، ۱۸۹۸ء، ۱۸ : ص ۱۹۵) ۔ حضرت عمر (ابن عبدالعزیزؒ) نے شہر کو از سر نو تعمیر و مستحکم کیا ۔ اور باشندوں کو زر فدیہ دے کر قید کرنے والوں سے چھڑایا ۔ عمرؓ کی وفات کے بعد یزید [ابن عبدالملک] نے شہر کی بحالی کی تکمیل کی ۔ ایک دوسری روایت کے مطابق یزید نے اس شہر کے استحکامات کی تجدید کی اور حفاظتی فوج میں اضافہ

کیا: (البلاذری: کتاب مذکور و مسعودی: مروج الذہب، پیرس، ۸: ۲۸۱)۔

Nicephoros Phokas نے یہ قصبہ اور شام کا سارا شمالی علاقہ ۹۶۸ء میں بوزنطیوں سے فتح کر لیا (یحیی بن سعید الانطاکی، طبع Kračkovsky و Vasiliev در Patrolog. Oriental.، ۱۹۲۴ء، ۱۸: ۸۱۶)۔ یحیی بن سعید کے قول کے مطابق جس کا بیان Rosen کے نزدیک اللاذقیہ کی ایک مقامی روایت سے لیا گیا ہے، ۹۸۰ء میں شہنشاہ باسل دوم نے یہاں کا حاکم ایک شخص کُرمُرک نامی کو بنایا۔ اس نے طرابلس پر فوج کشی کے دوران میں جو فاطمیوں کے قبضے میں تھا، بڑی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ جب نزّال اور ابن شاکر کی ماتحتی میں عربوں نے شہر کا محاصرہ کیا تو اس نے باہر نکل کر حملہ کیا اور اسی کے دوران میں گرفتار ہوا اور قاہرہ میں اس کا سر اڑا دیا گیا (Rosen: Zapiski Imp. Akad. Nauk، ۴۴: ۱۶ ببعد و ۱۰۳ ببعد)۔ Michael Burtzes (=البُرجی) نے ۹۹۲ء میں شہر میں مسلمانوں کی ایک بغاوت فرو کی اور انھیں بلاد روم کی طرف نکال دیا (یحیی، طبع Rosen، کتاب مذکور، ص ۳۰، ۲۳۷)۔ ۱۰۸۶ء میں اللاذقیہ بنو مُنقذ شیزری کے قبضے میں تھا (Derenbourg: Ousâma، ص ۲۷ ببعد) مگر انھیں بھی اسے ملک شاہ سلجوقی کے حوالے کر دینا پڑا۔ اگست ۱۰۹۸ء میں شہر پر نارمنڈی کے کونٹ نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یہ شہر جلدی جلدی مختلف ہاتھوں میں جاتا رہا۔ پہلے بوزنطیوں نے اس پر قبضہ کیا، پھر ٹارنٹو کے بہمنڈ Bohemund of Tarento کے ہاتھ آیا۔ دوبارہ اس پر بوزنطیوں کا تسلط ہو گیا اور آخر کار ۱۸ ماہ کے محاصرے کے بعد انطاکیہ کے Tancred نے اسے فتح کر لیا (Röhricht: Gesch. des Kgrs. Jerusalem، ص ۴۴، حاشیہ ۸)۔ ۱۱۰۳ء میں ہم پھر یونانیوں کو خشکی اور تری کی طرف سے شہر کا محاصرہ لیے ہوئے پاتے ہیں۔ معاہدۂ دول Devol (۱۱۰۸ء) میں بہمنڈ Bohemund نے شہنشاہ Alexius Comnenos کو دوسرے علاقوں کے علاوہ اسے بھی στρατηγίς دینے کا وعدہ کیا (Anna Comnena: Alexias، بون، ۲: ۲۴۱، سطر ۶) اس کے بعد جلد ہی Tancred نے پیزا کے ایک بحری بیڑے کی مدد سے شہر پر قبضہ کر لیا جو اس دوران میں پھر مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ ۱۱۳۶ء میں حلب کے حاکم نے اسے فتح اور تاراج کیا۔ ۱۱۵۷ء اور ۱۱۷۰ء میں یہاں دو سخت زلزلے آئے جن میں صرف شہر کا بڑا یونانی گرجا ہی محفوظ رہا۔ ۲۳ جولائی ۱۱۸۸ء کو شہر پر صلاح الدین نے قبضہ کر لیا (عماد الدین: فتح، ص ۱۴۱؛ ابو شامہ: کتاب الروضتین، طبع قاہرہ ۱۲۸۷-۱۲۸۸ھ، ۲: ۱۲۸؛ Hist. Orient. des Crois، ۴: ۳۶۱)۔ ۱۱۹۷ء کے موسم خزاں میں بہمنڈ Bohemund سوم اللاذقیہ یا کم از کم ایک حصۂ شہر کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۲۲۳ء میں اہل حلب نے شہر یا اس کے قلعے کو ان عیسائیوں کے خوف سے تباہ کر دیا جو پانچویں جنگ صلیبی میں حصہ لینے آ رہے تھے، لیکن اس کے بعد بھی (۱۱۹۷ء سے) آدھے شہر پر فرنگیوں کا قبضہ رہا۔ ۱۲۷۵ء میں بیبرس نے فرنگیوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس حصۂ شہر کو اس کے حوالے کر دیں۔ ۱۲۸۱ء میں اللاذقیہ پر سُنقر امیر دمشق کا قبضہ ہو گیا اور سلطان کو معاہدے (۴ جون) کے ذریعے اس شہر سے مجبورًا دست بردار ہونا پڑا، لیکن سنقر کے زوال کے بعد ایک اور امیر نے اسے بیبرس سے واپس لے لیا (۲۰ اپریل ۱۲۸۷ء)۔ اس کے جلد ہی بعد ایک

اور زلزلے کی وجہ سے شہر کے متعدد مضبوط برج یعنی برج کبوتر، روشنی کا مینار اور سمندر کے بروج بالکل تباہ ہو گئے ۔ دفاعی مورچوں کی تباہی کا کام بڑے بڑے قلعہ شکن آلات نے مکمل کر دیا ۔

اللاذقیہ کا ضلع جو اب تک آل ایوب کے ماتحت حلب کا ایک حصہ شمار ہوتا تھا (یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ج ۴ : ۳۳۸ و ابن الشحنہ، طبع بیروت ص ۲۳۱) تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں طرابلس کے نئے صوبے میں شامل کیا گیا ۔ (عمری : التعریف، ص ۱۸۲، در R. Hartmann : *Z.D.G.M.*، ۱۹۱۶ء، ص ۵۰۳؛ خلیل الظاهری: زبدة، طبع Ravaisse، ص ۴۸؛ دیوان الانشاء، پیرس، نسخهٔ خطی، عربی ۴۴۳۹، ورق ۹۴، ۱۵۲، ۲۴۳، در van Berchem : *Voyage en Syrie*، ص ۲۰۹، حاشیہ ۳؛ القلقشندی : صبح الاعشی، ۴ : ۱۴۵، ترجمہ Gaudefory-Demombynes : *La Syrie*، ص ۱۱۳ ببعد) ۔ عرب جغرافیہ نویس اور مؤرخ شہر کی بہت سی ایسی قدیم عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو سلامت رہ گئی تھیں ۔ وہ دو قلعوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو ایک پہاڑی پر واقع تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط تھے ۔ اس پہاڑی سے پورا شہر زیر قدم دکھائی دیتا تھا (بہاء الدین، در *Hist. Or. des Crois*، ۳ : ۱۱۰) ۔ شہر کے ایک بڑے دروازے کا بھی ذکر ملتا ہے جسے بہت سے آدمی مل کر کھولتے تھے (البلاذری، وہی کتاب، ص ۱۳۲) ۔ دیر الفاروس کی شاندار خانقاہ بھی تھی (المسعودی: مروج الذہب، ۸ : ۲۸۱؛ الدمشقی، طبع Mehren، ص ۲۰۹؛ ابوالفداء : تقویم، ترجمہ Reinaud-Guyard، ۲/۲ : ۳۵؛ در ابن بطوطہ، ۱ : ۱۸۳، الفاروس)، جو ''تل فاروس'' کے نام سے موسوم تھی ۔ یہ ٹیکرا اب بھی شہر کے شمال میں اسی نام سے مشہور ہے (M. Hartmann : *Z.D.P.V.*، ۱۴ : ۱۶۶ و نقشہ) ۔

Raoul کے Caen نے لاذقیہ کی مختصر کیفیت لکھی ہے (*Gesta Tancredi*، باب ۱۴۴؛ Röhricht نے *Z.D.P.V.*، ۱۰ : ۳۱۶ میں فرنگی مأخذوں سے شہر کی عمارات کی ایک فہرست مرتب کی ہے) ۔ زلزلوں اور اس غارتگری کے باوجود جو شہر کو صدیوں کے دوران میں اکثر پیش آتی رہیں، یہ بہ ظاہر مکمل طور پر کبھی ویران اور غیر آباد نہیں رہا ۔ اس کے نفیس اور اونچے مکانات اور سنگ مرمر کی سیدھی سڑکیں ابن الأثیر اور ابو شامہ (*Hist. Or. des Crois*، ۱ : ۷۲۰ و ۴ : ۳۶۱) نے دیکھی تھیں ۔ ان کا بیان ہے کہ انہیں شہر کی غارتگری کے دوران میں بڑا نقصان پہنچا تھا (دیکھیے نیز الیعقوبی، طبع ڈخویہ *B.G.A.* ۷ : ۳۰۸) اور یہ اس شہر کی شان و شوکت کا پتا دیتی ہیں ۔

اس شہر کی سیدھی سڑکوں اور مربع نقشے (دیکھیے Th. Schreiber در *Festchrift für H. Kiepert*، ۱۸۹۸ء، ص ۳۳۵ تا ۳۴۸) کو رومی سلطنت کے معماروں سے منسوب کیا جاتا ہے (A. v. Gerkan : *Griech. Stadtanlagen*، ۱۹۲۴ء، بمواضع کثیرہ)، لیکن حال میں Cultrera نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ قدیم یونان کے ابتدائی دور ہی میں موجود تھے اور بہت پہلے، یعنی Miletus کے Hippodamos نے (پانچویں صدی عیسوی) میں اسے قدیم مشرق کے فن تعمیر سے حاصل کیا تھا (*Architettura Ippodamea*، در *Memorie dell' Accad. dei Lincei*، سلسلہ ۵، ج ۱۷، ص ۳۰۴، ۳۳۴ ببعد، ۳۷۴؛ Cumont : *Fouilles de Doura Europos*، پیرس ۱۹۱۶ء، ص xix، حاشیہ ۴، ۲۵ ببعد، ۳۸۴) ۔

مآخذ : (۱) الخوارزمی : کتاب صورة الارض، طبع v. Mzik، در *Bibl. arab. Hist. u Geogr.*، ۳ : ۱۹ عدد ۲۶۲؛ (۲) الفرغانی *Element. Astron.* طبع Golius، ص ۳۸؛ (۳) البتانی : الزیج الصابی، طبع Nallino :

Pubbl. del R. Osservat di Brera in Milano XL.، ۲ : ۳۹ و ۳۰۳ : ۲۳۷، عدد ۱۲۲ ؛ (۴) الیعقوبی، B.G.A.، ۷ : ۳۲۴ ببعد؛ (۵) البلاذری، طبع ڈخوید، ص ۱۳۲ ببعد؛ (۶) یاقوت : معجم، طبع وسٹنفلٹ، ۴ : ۳۳۸؛ (۷) صفی الدین : مراصد الاطلاع، طبع Juynboll، ۳ : ۱؛ (۸) الدمشقی، طبع Mehren، ص ۲۰۹؛ (۹) ابوالفداء، طبع Reinaud، ص ۲۵۷؛ (۱۰) یحیی بن سعید الانطاکی، طبع Rosen، ص ۱۶ ببعد، ۳۰، ۱۵۳ ببعد ۲۳۷، در Zapiski Imp. Akad. Nauk، ۱۸۸۳ء، ۲۳؛ (۱۱) المسعودی : مروج، ۸ : ۲۸۱؛ (۱۲) ابن بطوطه : تحفة النظار، طبع پیرس، ۱ : ۱۷۹ تا ۱۸۳؛ (۱۳) ابوالفداء: تاریخ، طبع Reiske، ۱ : ۲۲۶، ۳ : ۲۶۴، ۳۶۴؛ ۴ : ۸۸، ۱۰۸، ۳۱۶؛ ۵ : ۳۰۲؛ (۱۴) المقریزی : Hist. des Sult. Mamlouks، ترجمه Quatremère، ۲ / ۱ : ۳۰، ۲۰۵، ۲۲۱؛ (۱۵) کمال الدین، در Z.D.M.G. : Freytag، ۱۱ : ۲۲۸، بمواضع کثیره؛ (۱۶) الادریسی، طبع Gildemeister، در Z.D.P.V.، ۸ : ۲۳؛ (۱۷) خلیل الظاهری : زبده، طبع Ravaisse، ص ۴۸؛ (۱۸) عمری : التعریف....، ص ۱۸۲، در Z.D.M.G. : R. Hartmann، ۷۰ : ۳۰؛ (۱۹) الجیعان ابوالبقاء، در R. L. Devonshire، B.I.F.A.O.، ۱۹۲۱ء، ۲۰ : ۱۰؛ (۲۰) K. Ritter ؛ Erdkunde، ۱/۱۷ : ۹۲۷ تا ۹۳۲؛ (۲۱) Renan : Mission de Phénicie، ص ۱۱۱ ببعد، ۸۰۲؛ (۲۲) M. Hartmann : Das Liwa el-Ladhkije، در Z.D.P.V. ۱۸۹۱ء، ص ۱۵۱ تا ۲۰۵ مع نقشه، گوشوارۂ ششم ؛ (۲۳) Le Strange : Palestine under the Moslems، ص ۴۹۰ تا ۴۹۲؛ (۲۴) Caetani : Annali dell' Islām، ۳ : ۴۹۴، ۷۹۹، ۸۰۲؛ (۲۵) van Berchem : J. A.، ۱۹۰۲ء، ص ۴۲۵؛ (۲۶) van Berchem اور Fatio : Voyage en Syrie، ۱، در M.I.F.A.O. ۱۹۱۳ء جلد ۳۷ : ۲۸۹ ببعد؛ (۲۷) Gaudefroy-Demombynes : La Syrie à l'époque des Mamelouks، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۱۳ ببعد؛ (۲۸) Probst : Die Geogr. Verhältn، Syriens u. Paläst. nach Wilh v. Tyrus، لائپزگ ۱۹۲۷ء، ۱ : ۲۵ ببعد؛ (۲۹) Das land der Bibel، ۴، ج ۵/۶؛ (۳۰) قدیم شهر پر دیکھیے راقم کا مقاله Laodikeia، عدد ۱، در Pauly-Wissowa : Realenzykl، ج ۱۲، عمود ۷۱۳ تا ۷۱۸.

(E. Honigmann)

(۲) فرانسیسی میں عموماً La'taquié یا Lattakie کہلاتا ہے، اگست ۳۱، ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی انتداب کی قائم کردہ خود مختار حکومت Etat des Gouvernement de Lattaquié (Alaouites) کا صدر مقام بنا؛ ۱۴ مئی ۱۹۳۰ء کو Haut-Gommissaire نے اس کے آئین کا نفاذ کیا ۔ یہ شہر جو پہلی عالمی جنگ سے قبل ویران اور غلیظ نظر آتا تھا، اب ایک صاف ستھرا اور رو به ترقی شہر بن گیا ہے ۔ اس کی آبادی کوئی ۲۰ ہزار ہے [۱۹۶۸ء میں ۶۷۶۰۴] جن میں اٹھارہ ہزار سنّی مسلمان، چار سو آرتھوڈکس یونانی، ایک ہزار ارمنی، پانسو مارونی (Maronites)، تین سو رومن کیتھولک، اور تین سو ستر پروٹسٹنٹ تھے ۔ علوی ریاست کا رقبہ، (فرانسیسی انتداب کے مجموعی رقبے، یعنی ایک لاکھ ساٹھ ہزار کلو میٹر میں سے) صرف چھے ہزار پانسو مربع کلومیٹر ہے اور آبادی دو لاکھ ساٹھ ہزار ۔ یہ رقبہ اس خط سے شروع ہوتا ہے جو سرسری طور پر راس البسیط سے جسر الشغر کنار نہر العاصی (oronets) تک پھیلا ہوا ہے اور جنوب کی طرف سو میل کے فاصلے پر نہر الکبیر (Eleutheros) تک چلا جاتا ہے ۔ اس کی مشرقی سرحد کا فاصلہ ساحل سے اوسطاً چالیس میل ہے اور کہیں کہیں یہ نہر العاصی کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اس کی معاون نہر ساروت کی طرف مڑ جاتی ہے ۔

اس ریاست میں دو سنجاقین ہیں : Lattaquie اور طرطوس جو ایک بلدیہ ہے، اور رواد، نیز ایک خود مختار میونسپلٹی Lattaquie .

سنجاق لاذقیہ (Sandjak Lattaquie) پانچ قضاؤں پر مشتمل ہے : لاذقیہ (Lattaquie)، جبلہ ، مصیاف، بانیاس اور الحفّہ (بابنا کے جنوب میں Lattaquie سے شمال مشرق کی طرف) - قضائے لاذقیہ (Lattaquie) کی آبادی ۳۰ ہزار ہے جس میں پچیس ہزار کے قریب سنّی ہیں، بیس ہزار علوی، چار ہزار تین سو آرتھوڈکس یونانی ، ایک ہزار دو سو ارمنی، چھے سو مارونی، چار سو پچاس پروٹسٹنٹ (ان میں سے زیادہ تر وہ مقامی لوگ ہیں جنھوں نے امریکی مبلّغین کی مساعی سے اپنا مذہب تبدیل کر لیا ہے) اور تین سو رومن کیتھولک ہیں، علوی لوگ زیادہ تر پہاڑوں پر آباد ہیں اور لاذقیہ (Lattakie) کے گرد جو ساحل کی آبادی ہے وہ مشترک نوعیت کی ہے .

موجودہ لاذقیہ (Lattakie) پرانے شہر کے مشرق کی جانب واقع ہے، جس کی دہری فصیلیں اب بھی بعض مقامات پر پہچانی جا سکتی ہیں- شہر کے شمال مغرب میں وہ شہر خموشاں ہے جس کا ذکر ریناں Renan نے ۱۸۶۰ء میں کیا - یہ کوئی ایک ہزار گز وسیع ہے اور Boulevard Billote سے کچھ زیادہ دور نہیں - شہر کی شمالی جانب ایک بڑے گرجا کے کھنڈر ہیں اور مشرق کی جانب ایک قدیمی نہر کے - قلعہ (chateau de laiche) شہر کے اسی نام سے موسوم ہے جو صلیبیوں نے رکھا تھا - یہ قدیمی شہر سے مشرق کی جانب اور موجودہ شہر سے شمال مشرق کی طرف ایک پہاڑی پر واقع تھا - شہر کے اندر مشہور ترین قدیمی یادگار Tetrapylon (چوبرجی) ہے جو اس دوراہے پر واقع ہے جہاں شمالاً جنوباً چلنے والی ایک ستون دار سڑک اس سڑک سے ملتی ہے جو اس سے نسبۃً چھوٹی ہے اور شرقاً غرباً چلتی ہے- اس سے ۵۰۰ گز کے فاصلے پر ایک عمارت ہے جس کے ستون قرنتی (Corinthian) ہیں اور جو Temple of Bacchus بھی کہلاتی ہے [یعنی دیر باکوس (عیاشی کے دیوتا کا مندر)] اور ''کنیسۃ المعلقہ '' بھی جو ایک پرانے گرجا کی بنیادوں پر تعمیر کیا گیا تھا - شہر کے مغربی جانب قدیمی بندرگاہ کا ایک تنگ راستہ ہے، جس کی حفاظت ان برجوں کے ذریعے ہوتی ہے جو صلیبیوں نے چودھویں صدی مسیحی میں پرانے ملبے سے تعمیر کیے تھے - موجودہ بندرگاہ کے مقابلے میں قدیمی بندرگاہ مشرق اور جنوب کی جانب زیادہ دور تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کا ایک حصہ چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا [آج کل لاذقیہ جمہوریہ شام کے پانچ بڑے شہروں میں سے ایک ہے جن میں اس کے علاوہ دمشق ،حلب ، حمص ، حماۃ اور دیر الزور شامل ہیں] .

مآخذ : (۱) P. jacquot : *Létat-des Alaouites* (*Gouernment de Laitaquie*)، بار دوم، بیروت ۱۹۳۱ء.

(E. Honigmann)

لاذیق :(لادیق ایشیائے کوچک میں چند قصبوں کا نام.

۱- قدیم ''لادیق سوختہ'' ؛ اس قصبے کا یہ نام غالباً ان بھٹیوں کی وجہ سے ہو گیا جو پارہ نکالنے والے علاقے میں اس کے ارد گرد تھیں اور یہ ان کا مرکز تھا - یہ کرمان بنی قونیہ کے شمال کی طرف اس فوجی سڑک پر واقع تھا جو ایشیائے کوچک کے درمیان سے گذرتی تھی - حاجی خلیفہ بھی اس کے جدید نام یورگان لادیق یا کرمان کے لاذقیہ سے واقف ہے .

مآخذ : (۱) حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۶۱۱ ؛ ببعد، (۲) ابن بی بی، طبع Houtsma، در *Recueil de textes*

relat. à l' hist. des Seljoucides، ۳ : ۲۳، ۲۵ = ۴ : ۸، ۹ ؛ (۳) Cramer : Asia Minor، ۲ : ۳۳ ؛ (۴) Hamilton : Travels in Asia Minor (۵) Ramsay: Class. Review، ۱۹ : ۳۶۷ بعد ؛ (۶) Sarre : Reise in Kleinasien، ص ۲۰ ؛ (۷) Le. Strange : The Lands of the Eastern Caliphate کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۱۳۶ و ۱۴۹ .

۲ - لاذق (حاجی خلیفہ : لاذقیہ) قدیم Laodicea ad Lycum جرمیان کے جنوب مشرقی حصے میں واقع تھا ۔ البتّانی اسے یونانی مآخذ کی پیروی میں ''لاذقیہ نروجس'' (لکھتا ہے) حالانکہ بطلمیوس اس کا وقوع کاریہ Caria میں بتاتا ہے ۔ ابن بطوطہ کے قول کے مطابق یہ ایک بڑا شہر تھا جس میں جامع مسجدیں، خوبصورت باغ، رواں ندیاں اور چشمے اور عمدہ منڈیاں تھیں ۔ وہاں کی یونانی عورتیں اون [سوت، قطن] کی خوشنما اور پائدار چیزیں بناتی تھیں جن پرزری کا کام ہوتا تھا ۔ ابن بطوطہ اہل شہر کی مہمان نوازی کی تعریف لیکن ان کی اخلاق باختگی کی مذمت کرتا ہے ۔ اس شہر کی تاریخ کے لیے (جو اب اسکی حصار کہلاتا ہے) دیکھیے مادّہ دِ کزلی .

مآخذ : (۱) البتانی : Opus astronomicum، طبع Nallino ۲ : ۳۹ و ۳ : ۲۳۷ (شمارہ ۱۱۶) ؛ (۲) ابن بطّوطہ : تحفۃ النظّار (مطبع پیرس) ۲ : ۲۷۰ بعد ۳۵۷ ؛ (۳) حمد اللہ المستوفی : نزھتہ القلوب مطبوعۂ بمبئی، ص ۱۶۲ ؛ (۴) علی یزدی، مطبوعۂ کلکتہ، ۲ : ۴۴۸ بعد ؛ (۵) حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۶۳۱ بعد ؛ (۶) Le Strange : The Lands of the Eastern Caliphate، ص ۱۳۵ و ۱۵۳ بعد ؛ (۷) Sarre : Reise in Kleinasien، برلن ۱۸۹۶ء، ص ۱۲ .

۳- لاذیق، جو اماسیہ کے جنوب میں واقع تھا .

مآخذ : (۱) ابن بی بی، طبع Houtsma، بمراتی کثیرہ؛ (۲) Le Strange : The Lands of the Eastern Caliphate ص ۱۳۶ .

(E. Honigmann)

لار : فارس کے جنوب مشرق میں بلوک لارستان کا صدر مقام ۔ لارستان اور اس کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں ۔ بظاہر یہ وہی خطہ ہے جس کو ہَفتان بوخت اژدھا کی سر زمین کہتے تھے ۔ یہ اژدھا ارد شیر پاپکان کے ہاتھوں مارا گیا تھا ۔ ایرانی اساطیر کے مطابق اردشیر کا دشمن دہ الار میں رہتا تھا ۔ یہ کوجران کے رستاق میں واقع تھا جو صوبۂ اردشیر خرّہ (طبری : ج ۱ : ص ۸۲۰) کا ایک ساحلی رستاق تھا (رساتیق السیف) ۔ Nöldeke کارنامک (ص ۵۰) کے ترجمے میں گلار (؟) اور کوچاران کے متبادل الفاظ لاتا ہے ۔ شاھنامہ، طبع Mohl، ۵ : ۳۰۸ میں کجاران آیا ہے ۔ آخری بات یہ کہ ساتویں صدی کے ارمنی جغرافیے میں ایران کے ایک شہر خجھرستان (خوژیہرستان) کا ذکر ملتا ہے (دیکھیے Marquart : Erānšahr، ص ۴۴) ۔ لار کے نام کے شروع میں الف کا سابقہ جزیرۂ لار کے نام سے قبل بھی پایا جاتا ہے (دیکھیے بیان ذیل) ۔ Marquart کے خیال میں کُجھران قلعۂ دیگ دان ہی ہے جو سیراف کے قریب واقع ہے ۔ اس کے برعکس فارس نامۂ ناصری میں کُوجَر ۔ کُوھُجَر کا ذکر آتا ہے جو لارستان سے متصل بلوک گلّہ دار میں واقع ہے ۔ یہ بلوک ابن بطوطہ کے ہاں قدیم زمانے کا فال / پال / بال ہے، چنانچہ خنج بال = خنج + بال) ۔ ایک بیت کے مطابق جو فردوسی سے منسوب کیا جاتا ہے (دیکھیے Vullers : Lexicon بذیل مادّۂ لاد) مگر شاہ نامہ کے معروف نسخوں میں کہیں نہیں ملتا، اس شہر کو ابتدا میں لا . کہتے تھے (جسے گرگین میلاد نے فتح کیا جو دور کیخسرو کیانی کا ایک پہلوان تھا) ۔ وہ بیت یہ ہے :

صفاهان بگودرزِ کشواد داد
بگرگینِ میلاد هم لاد داد؛ مؒ)

د کے ر سے تبدیل ہو جانے کی یہ ایک نہایت عجیب مثال ہے جو ارمنی اور نواح بحیرۂ خزر کی تاتی بولی میں خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی ہے (Darmesteter : Et.-Iraniennes، ۱ : ۳۷) - فارس نامۂ ناصری (ص ۲۸۱) میں ایک اور روایت بھی دی ہے کہ لار کے لوگ فارس میں دماوند (دیکھیے سطور ذیل) سے آئے تھے کیونکہ وھاں کی سردی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

عرب جغرافیہ دان لار کا ذکر ھی نہیں کرتے اور یہ اس لیے کہ ان قدیم راستوں کا گزر یہاں سے نہیں ہوتا تھا جو فارس کے اہم شہروں کو سیراف اور قیس یا (براہ‌فسا اور فرگ) ہرموز سے ملاتے تھے (دیکھیے نزھۃ القلوب، ص ۱۸۵ و ۱۸۷) - حمد اللہ مستوفی کے نزدیک لار سمندر کے کنارے ایک ولایت ہے اور صرف ابن بطوطہ ھی اس کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ ایک بڑا اہم شہر ہے جس میں چشمے اور بہت سے دریا اور باغات ہیں۔

لار کے مقامی شاہی خانوادے مذکورہ قبل بیت کو سند مان کر اپنا سلسلہ نسب گرگین بن میلاد سے ملاتے تھے جس میں یہ ظاھر کیا گیا ہے کہ لار کا شہر گرگین کو کیخسرو نے عطا کیا تھا - ان کی تاجپوشی کے لیے بھی ان کا آبائی تاج ھی استعمال ہوتا تھا اور یہ بھی اس مال غنیمت میں شامل تھا جو ۱۰۱۰ء میں صفویوں کے ھاتھ آیا۔

لار کا پہلا حکمران جس نے اسلام قبول کیا (نواح ۲۰۰ھ) جلال الدین ایرج تھا - امیر قطب الدین مؤید پاقوی (۵۹۴ھ تا ۶۳۸ھ) کے عہد سے تاریخوں کا سلسلہ زیادہ قابل اعتماد ہو جاتا ہے - اس کے چودہ جانشینوں کے نام معلوم ھیں، لیکن یہ یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس ترتیب سے حکمران ہوے [تفصیل کے لیے دیکھیے وو لائیڈن بذیل مادّہ]۔

مآخذ : (۱) Defrémery : Voyage d' Ibn Batoutah dans La Perse، پیرس ۱۸۴۸ء، ص ۷، ۸۱؛ (۲) قاضی احمد غفاری : جہان آرا؛ مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ عدد ۱۴۱ ورق ۱۰۵ الف - ب - اس کتاب کی ایک نقل کے لیے مقالہ نگار محمد خان قزوینی کا متشکر ہے؛ (۳) اسکندر منشی : عالم آرای، طہران ۱۳۱۴ھ، ص ۴۲۴ تا ۴۲۸؛ (۴) منجّم باشی : صحائف، ۲ : ۶۶۶ (بہ تتبع فاضل نیشابوری (؟) و غفاری) ھفت اقلیم رازی، اقلیم ثالث بذیل لار؛ (۵) حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۲۶۱؛ (۶) شیخ علی حزین : تذکرہ، طبع بلفور (Belfour)، لندن ۱۸۳۱ء، ص ۸۰، ۱۷۹ تا ۲۱۷ و ۲۳۶؛ (۷) حسن فسائی : فارس نامۂ ناصری، طہران ۱۳۱۴ء؛ ۲ : ۱۸۱ تا ۲۹۱ (ایک عمدہ تصنیف جو قیمتی مواد سے بھر پور ہے)؛ (۸) عہد صفویّہ کے سیاحوں کے حوالوں کے لیے دیکھیے (و) Ritter : Erdkunde، ۸ : ۷۳۶ و ۷۴۹ و ۷۵۷ اور (ب) Curzon : Persia، ۲ : ۱۱۴؛ (ج) A. Dupre : Voyage en Perse، پیرس ۱۸۱۹ء، ۱ : ۳۲۴؛ (د) Stack : Six months in Persia، لنڈن ۱۸۸۲ء، ۱ : ۱۳۳ تا ۱۴۵؛ (۹) جنوبی ایران کا نقشہ، پیمانہ ۱ : ۲،۰۰۰،۰۰۰ (International Series)، مطبوعۂ Survey of India، ۱۹۱۲ء۔

۲- خلیج فارس کا ایک جزیرہ جو اب ابو شعیب [شیخ شعیب در لیسترینج] کے نام سے پکارا جاتا ہے، Nearchus اپنے جہاں گردی دورے میں میں اس مقام سے گزرا ہے مگر کسی نام کا ذکر نہیں کرتا - یونانیوں نے صید مرواريد کی بہت تعریف کی - ابن خرداذبہ اس جزیرے کو اَلار کہتا ہے - Le Strange کے قول کے مطابق اس کے لیے

عرب جغرافیہ دانوں کے ہاں اللاّن اور لان کی اختلافی قراءتیں بھی موجود ہیں - فارس نامہ، طبع Le Strange، ص ۱۴۱ میں اسے کورۂ اردشیر خرہ سے متعلق لکھا ہے - یاقوت (۴ : ۳۴۱) کا بیان ہے کہ یہ جزیرہ قیس اور سیراف کی بندرگاہ کے درمیان واقع ہے - اس کا رقبہ ۱۳ × ½ ۲ میل ہے - اس کے مشرق میں شِتوار (چِتوار) کا چھوٹا سا جزیرہ واقع ہے - لار سے تقریباً دس میل شمال کی جانب فارس کے ساحل پر نخیلو کی چھوٹی سے بندرگاہ ہے - ہمیں یہ معلوم نہیں کہ آیا شہر اور جزیرہ لار کے ناموں میں کوئی تعلق ہے - لارک (چھوٹے لار) نام کا ایک جزیرہ ہرموز کے جزیرے کے جنوب میں واقع ہے۔

مآخذ: (۱) Tomaschek : *Die Kustenfahrt Nearchs*، در *Sitzber. Wiener Akad*، (ج ۱۲۱)، ۱۸۹۰ء، ص ۵۵ .

۳- مازندران کی ایک مرتفع وادی جو ہزارپی کے منابع پر واقع ہے- لار کی بلندی ۸۵۰۰ سے ۶۵۰۰ فٹ کے درمیان ہے - یہ دماوند کے مغرب میں ہے - سردیوں میں وادی غیر آباد ہو جاتی ہے - گرمیوں میں یہاں خانہ بدوش لوگ اپنے خیمے نصب کر دیتے ہیں - طہران کے لوگ بھی یہاں گرمیاں گزارنے آ جاتے ہیں - Stahl کو (*Peterm. Mitteil* Ergänzungsheft، عدد ۱۱۸، ۱۸۶۹ء ص ۶۱۹) دریاے لار کے دائیں کنارے پر قدیم بستیوں کے نشانات ملے ہیں- بعض اوقات یہ مقام لاریجان کہلاتا ہے جو لاریج کی جمع ہوگی، یعنی لار کے باشندے - اسی اشتقاق سے عربی اللارز کی بھی تشریح ہو جاتی ہے (البلاذری، ص ۸ اس صفحے پر کوئی ذکر اللارز کا نہیں ہے؛ م) جو طبرستان کا ایک ضلع ہے (مگر وہ ابن رستہ کی فہرست ص ۱۴۹ میں موجود نہیں) - اللارز المصمغان کے مقبوضات میں شامل تھا جس پر ۱۳۱ھ/۷۴۸ء میں ابو مسلم نے قبضہ کر لیا تھا (Marquart : *Ērānšahr*، ص ۱۲۷ تا ۱۳۷) - معلوم ہوتا ہے لاریجان کا نام خصوصیت کے ساتھ لار کی مرتفع وادی کے نیچے اس مقام کو دیا گیا تھا جو زمانۂ حاضرہ میں پلور کے پل کے نزدیک واقع ہے - دیکھیے ابن اسفند یار کی تصنیف میں دہ فلول مترجمۂ Browne : *G.M.S.*، ص ۶۷ - لاریجان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آبادی کے اعتبار سے یہ طبرستان کا قدیم ترین علاقہ ہے - روایت ہے کہ اس علاقے کا گاؤں ورکہ فریدون کی جنم بھومی تھی - Stahl نے دماوند کی ڈھلانوں پر ایک میلا ہوتے دیکھا ہے جو ضحاک کی یاد میں منایا جا رہا تھا (۱۱ اگست؛ دیکھیے Morier : *Second Journey*، ص ۳۰۷) - اسپہبدوں کے دور حکومت میں لاریجان میں ایک خاص مرزبان مقیم تھا (ابن اسفند یار، کتاب مذکور، ص ۱۰ و ۱۸۳ و ۲۰۰) - ضلع لاہیجان (لاری جان) کے متعلق دیکھیے مادۂ لاہیجان - شپگل Spiegel (*Varena*)، در *Z. D. M. G.* ۱۸۷۶ء ۳۲ : ۷۱۶ تا ۷۲۶) کا خیال تھا کہ ورک (ابن اسفند یار ص ۱۰)، ورکہ فریدون = Thraētaona کا وطن) اور اوستائی خطہ Varena میں کچھ تعلق ہے - ورکہ کے متعلق تو یہ معلوم نہیں کہ کہاں واقع تھا البتہ لاریجان میں وانہ نام کا ایک گاؤں موجود ہے- فارسی بولیوں میں رکے غائب ہونے پر دیکھیے *Grundriss d. iran Phil. i/ii* ص ۳۰۱ و ۵۵۹ .

(V. Minorsky)

لاَرِدَہ : (لریدہ)، قدیم اِیلرِدہ Ilerda؛ شمالی اندلس میں ایک شہر سرقسطہ اور برشلونہ کے مابین اسی نام کے صوبے کا صدر مقام ہے جس کی آبادی تقریباً ۲۹۰۰۰ نفوس ہے - یہ دریاے سگری Segre (عربوں کا وادی

ثغر کے دائیں کنارے پر ۶۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے (یاقوت نے معجم البلدان میں اس لفظ کو غلطی سے لریدہ Lerida کا دوسرا نام بتایا ہے) اور ارغون کے میدانوں کے مدخل پر ایک اہم جنگی مقام ہے۔

لاردہ پر، جو بلاشبہہ اصل کے اعتبار سے ہسپانوی ہے، ۴۹ قبل مسیح میں جولیس سیزر نے اس خانہ جنگی کے دوران میں جو اس کے اور پومپئی Pompay کے درمیان ہوئی تھی، قبضہ کر لیا۔ ۵۴۶ء میں وہاں ایک کونسل کا اجلاس ہوا۔ آٹھویں صدی کے نصف اول میں اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس کا اور سرقسطہ کا حال ایک ہی سا رہا ہے اور الثغر الاعلیٰ (Upper Irantera) کی حفاظت کے لیے یہ ایک اہم مقام رہا ہے۔ بعد میں یہ سرقسطہ کے بنو ہود کی خود مختار سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ سلیمان بن ہود المستعین باللہ (م ۱۰۴۶ء) کی وفات پر مملکت کی جو تقسیم ہوئی، اس میں یہ اس کے بیٹے یوسف کے حصے میں آیا، لیکن سرقسطہ کے فرمانروا احمد المقتدر نے اسے پھر لے لیا۔

مآخذ: الادریسی: صفۃ الاندلس، طبع Dozy و de Goeje، متن ص ۱۹۰، ترجمہ، ص ۲۳۱؛ (۲) ابوالفداء: تقویم البلدان، ص ۱۸۰ تا ۱۸۱؛ (۳) یاقوت: معجم البلدان، ۴: ۳۱۳؛ (۴) ابن عذاری: البیان المغرب، ج ۳، طبع E. Levi - Provençal، پیرس ۱۹۲۷ء، دیکھیے اشاریہ؛ (۵) محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، ص ۲۴ تا ۲۸۔

(E. Levi Provençal)

* • **لارندہ**: ایشیاے کوچک کا ایک شہر (جو ایک حکمران خاندان کے نام پر جو یہاں چودھویں صدی عیسوی مسیحی میں حکومت کرتا تھا، قرمان بھی کہلاتا ہے) اسی نام کی قضا اور قونیہ کی سنجاق کا صدر مقام۔ قونیہ اس شہر سے جنوب مشرق کی طرف ۳۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ شہر سطح سمندر سے چار ہزار فٹ بلند ہے اور اس میں دو ہزار مکان، ساڑھے سات ہزار باشندے، ایک سو پانچ مسجدیں، اکیس جامع مسجدیں، درویشوں کی چار خانقاہیں، پانچ سو پندرہ دکانیں، تیس گودام، نو قہوہ خانے، چار کاروان سرائیں، چودہ نانبائیوں کے تنور، سات حمّام، پانچ چکیاں، ایک فوجی گودام، ایک سو دس فوّارے، ایک پارک، ایک یونانی سکول، دس مسلم سکول اور اکیس مدرسے ہیں۔ اس میں ایک ویران قلعے، کچھ مسجدوں اور دوسری تاریخی یادگاروں کے کھنڈر بھی ہیں جن میں سب سے پرانے قرمان اوغلو کے زمانے کے ہیں (ایک مسجد امیر موسیٰ کی بھی ہے جس کے ستون قدیم عمارتوں سے لیے گئے تھے)۔ یہ شہر ۱۴۶۶ء میں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا تھا۔

شمال کی طرف قرہ طاغ ہے جسے قرون وسطیٰ کی ویران خانقاہوں کے کھنڈروں نے ڈھک رکھا ہے بن بر کلیسہ = ۱۰۰۱ گرجا۔

مآخذ: (۱) علی جواد: جغرافیاے لغاتی، ص ۶۰۶؛ (۲) حاجی خلیفہ: جہان نما، ص ۶۰۶؛ (۳) ابن بطوطہ، پیرس، ۲: ۲۸۴؛ (۴) سامی بے: قاموس الاعلام، ۵: ۳۶۶۳، بذیل مادّہ قرمان؛ (۵) Texier: *Asie Mineure*، ص ۶۵۸۔

(Cl. Huart)

لاری: (لَرِن) ایک چاندی کا سکّہ جو سولھویں اور سترھویں صدی میں خلیج فارس اور بحر ہند میں رائج تھا۔ اس کا نام لارستان (رک بآں) کے دارالحکومت لار (رک بآں) کے نام سے ماخوذ ہے، جہاں یہ سب سے پہلے مضروب ہوا۔ دیکھیے Pedro Texeira (*Travels*) Hakl. Soc. ۱۹۰۲ء، ص ۲۴۱)، یہ مصنف کہتا ہے "لار کا شہر بھی ہے جس کے نام پر یہ سکّہ لاری (Laris)

کہلاتا تھا جو خالص ترین چاندی کا بنایا جاتا تھا عمدگی سے سانچے میں ڈھلا ہوا یہ سکہ تمام مشرق میں رائج تھا - Sir Thomas Herbert ۱۶۲۷ء میں لار کا ذکر کرتے ہوے (Some Years' Travels، لنڈن ۱۶۶۵ء، ص ۱۳۰) کہتے ہیں ''اس بازار کے قریب لرن (Larnes) ڈھالے جاتے ہیں جو مشہور قسم کے سکے ہیں۔'' لرن کا وزن تقریباً ۷۴ گرین (۴،۹ گرام) تھا اور اپنی خالص چاندی کی وجہ سے بہت مشہور تھا - یہ قیمت میں دس انگریزی پنس (Herbert) یا فرانسیسی کراؤن کے پانچویں حصے (Tavernier) یا ساٹھ پرتگیزی رایس (reis) کے برابر تھا .

لَرن وضع قطع میں دوسرے سکّوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ چاندی کی کوئی چار انچ لمبی پتلی سلاخ ہے جسے موڑ کر دوہرا کر دیا گیا ہے اور پھر اس کے دونوں طرف عام سکّوں کی طرح ٹھپّے سے نقش کندہ کر دیے گئے ہیں - William Barret نے ۱۵۹۴ء میں البصرہ کے سکّوں کا حال بیان کرتے ہوے اس کا اچھا نقشہ کھینچا ہے اور اس کی بہت تعریف کی ہے (Principal Voyages : Hakluyt، گلاسگو ۱۹۰۴ء، ۶ : ۱۲) - وہ کہتا ہے ''مذکورہ لرن ایک عجیب سکہ ہے کیونکہ یہ عیسائی ملکوں کے دیگر تمام رائج سکّوں کی طرح گول نہیں بلکہ چاندی کی ایک چھوٹی سی سلاخ ہے، اتنی موٹی جتنا بط کے پر کا قلم، جس سے ہم لکھتے ہیں اور لمبائی میں اس کا کوئی آٹھواں حصہ جسے اس طرح موڑا جاتا ہے کہ دونوں سرے عین وسط میں آ ملتے ہیں اور اس جگہ ترکی حروف میں مہر لگی ہوتی ہے - یہ جزائر ہند میں بہترین رائج الوقت سکہ ہے اور چھے لرن ایک ڈوکٹ Ducat کے برابر ہوتے ہیں'' .

ایران کے شاہ عباس اعظم نے لار کی سلطنت کو سر کر لیا تو وہاں سے ان سکوں کا اجرا ختم ہو گیا (Voyages : Chardin، ایمسٹرڈم ۱۷۳۵ء، ۳ : ۱۲۸)، مگر وہ اس قدر مقبول ہو چکے تھے کہ بحر ہند کی دوسری ریاستوں نے بھی اسی نمونے کے سکے اختیار کر لیے - سولھویں صدی کے نصف آخر میں شاھان ہرمز کے علاوہ شاھان ایران نے شیراز سے اور سلاطین عثمانیہ نے بصرے سے لَرن جاری کیے - ہندوستان میں بیجاپور کے عادل شاھی خاندان اور دوسرے حکمرانوں نے سترھویں صدی میں اسی طرح کے سکے مضروب کیے۔ مغربی ہندوستان میں بھی لرن کئی مقامات سے دستیاب ہوئے ہیں، جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کا رواج وہاں کس قدر عام تھا - جزائر مالدیپ کے سلطان نے سترھویں صدی کے اوائل میں اپنے الگ لرن مضروب کیے جیسا کہ F. Pyrard de Laval کے سفر نامے (Voyage، Hakl. Soc. ۱۸۸۷ء، ۱ : ۲۳۲ ببعد سے پتا چلتا ہے - سیلون میں بھی نہ صرف وہاں کے باشندوں نے بلکہ کولمبو کے پرتگیزی تاجروں نے بھی یہی سکے ڈھالے۔ اس جزیرے میں ان کو بل دے کر کچھ مچھلی پکڑنے کے کانٹے سے مشابہ بنا دیا گیا ہے جس سے مچھلی کانٹا fish hook روپے کی اصطلاح نکلی۔ ان سکوں پر یا تو کوئی نقش ہوتا ھی نہیں اور یا عربی خط کی بھدی سی نقلیں کندہ ہیں۔ سیلون میں یہ ''مچھلی کانٹا'' سکہ اٹھارھویں صدی تک چلتا رھا - لرن کی نوع کا ایک مسخ شدہ سکہ اب بھی خلیج فارس کے عرب ساحل پر الحسا میں موجود ہے (Heart of Arabia : Philby، ۲ : ۳۱۹) جہاں اسے طویلہ یعنی ''لمبا'' (سکہ) کہتے ہیں - یہ فقط ایک انچ لمبا ہوتا ہے اور تانبے کا نہیں تو بہت کھوٹی چاندی کا ہوتا ہے اوراس پر کسی نقش کی کوئی علامت نظر نہیں آتی - Palgrave (Journey etc.، لنڈن ۱۸۶۵ء، ۲ : ۱۷۹) نے اس کا حال بیان کیا ہے، نیز لکھا ہے کہ ایک ضرب المثل

ہے ''حسا کے سکّے کی مانند'' طویل جس کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے جو مقامی سکّے کی طرح گھر سے باہر کسی مصرف کا نہ ہو۔

مآخذ: (۱) Yule : *Hobson-Jobson*، بذیل مادّہ؛ (۲) H. W. Codrington در *Numismatic Chronicle*، لنڈن ۱۹۱۴ء، ۱۶۲ تا ۱۶۳؛ (۳) وہی مصنف: *Ceylon Coins and Currency*، کولمبو ۱۹۲۴ء، اشاریہ بذیل مادّہ؛ (۴) O. Codrington : *Journal of the Bombay Branch, R. A. S.*، ۱۸ : ۳۶، ۳۷؛ (۵) J. Allan در *Numismatic Chronicle*، لنڈن ۱۹۱۲ء، ص ۳۱۹ تا ۳۲۴؛ (۶) H. H. Wilson : وہی کتاب؛ (۷) R. Knox : *Historical Relation of Ceylon*، گلاسگو ۱۹۱۱ء، ص ۱۸۰، ۱۵۶؛ (۸) Tavernier, Chardin اور دوسرے سیّاح۔

(J. ALLAN)

* **لاز**: جنوبی قفقاز کی ایک قوم (قدیم آئبیری نسل جو اب جارجی کہلاتی ہے) جو اس وقت بحیرۂ اسود کے سواحل کے جنوب مشرقی کونے پر آباد ہے۔ لاز کی قدیم تاریخ بوجہ اس تذبذب کے جو قفقاز کے نسلی نظام تسمیہ پر مسلط ہے پیچیدہ ہو گئی ہے، ایک ہی نام صدیوں کے دوران میں مختلف گروہوں (یا جماعتوں) پر بولا جاتا رہا ہے - یہ امر کہ Phasis کا اطلاق دریاے رئین پر بھی ہوتا تھا اور دریاے چوروخ Čorokh، (یعنی قدیم Akampsis) پر بھی یہاں تک کہ دریاے Araxes کے منابع پر بھی، بہت سی مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔

قدیم ترین یونانی مصنف لاز کا بالکل ذکر نہیں کرتے - یہ نام فقط سنہ عیسوی شروع ہونے کے بعد ہی ملتے ہیں (Pliny : *Nat - Hist*، ۴ : ۴؛ Arrian : *Periplus*، ۱۱ : ۲؛ بطلمیوس ۵ : ۹، ۵) - لزوئی Lazoi کا قدیم ترین مسکن جو معلوم ہو سکا ہے، وہ شہر لازوس Lazos یا ''قدیم لازک "Lazik" ہے جس کی جگہ Arrian مقدس بندرگاہ (Noworossiisk) سے ۶۸۰ سٹیڈیا Stadia (تقریباً ۸۰ میل) جنوب کی طرف اور ۱۰۲۰ سٹیڈیا (تقریباً ۱۰۰ میل) پِتیس Pityus سے شمال کی طرف معین کرتا ہے، یعنی تاپے Tuapse کے قرب و جوار میں - کیسلنگ Kiessling کی راے میں لزوئی Lazoi کرکٹائی Kerketai کا ایک جزء ہے؛ یہ کرکٹائی ابتدائی عیسائی صدیوں میں زی گونی Zygoi یعنی چرکس [رک بآن] کے غلبے سے دب کر جنوب کی طرف ہجرت کر آئے تھے - زی گونی Zygoi وہی ہیں جو اپنے آپ کو adighe (adzîghe) کہتے ہیں؛ کیسلنگ کرکٹائی کو ایک جارجی قوم خیال کرتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ Arrian کے زمانے (دوسری صدی قبل مسیح) میں، لزوئی پہلے ہی سے سخم Sukhum کے جنوب میں بس رہے تھے - طربزون کے مشرق میں ساحل کے ساتھ ساتھ آباد قومیں بالترتیب یہ تھیں: کولچی Colchi اور سنّی Sanni؛ میچی لونز Machelones؛ Heniochi؛ Zydritae؛ لزائی Lazai، شاہ ملسّس Malassus کی رعایا، جو روما کا شاہی اقتدار تسلیم کرتا تھا؛ Apsilae؛ Abacsi (دیکھیے Abkhaz)؛ Sanigae سباسٹو پولس (= سخم Sukhum) کے قرب میں۔

آئندہ صدیوں میں لاز نے اس قدر اہمیت اختیار کر لی کہ تمام قدیم کول چس (Colchis) کا نام بدل کر لازیکا Lazica کر دیا گیا [. . . . . . تفصیل کے لیے دیکھیے وو لائیڈن بذیل مادّہ]۔

مآخذ: بڑے بڑے بوزنطی مآخذ مندرجۂ ذیل مقامات میں ملیں گے: (۱) Dietrich : *Byzantinische Quellen zur Länder-und völkerkunde*، لائپزگ ۱۹۱۲ء، ۱ : ۵۲ تا ۵۸؛ (۲) Dubois de Montpéreux : *Voyage autour du Caucase*، پیرس ۱۸۳۹ء، ۲ : ۴۳ اور اٹلس، سلسلہ ۱ : نقشہ ۱۴؛

ازبکید کے میدان جنگ کا نقشہ؛ (۳) Vivien de St. Martin : *Etudes de geographie ancienne*، پیرس ۱۸۵۲ء، ۲ : ص ۱۹۶ تا ۲۱۸؛ (۴) Hermann : *Lazique de Procope* و *Lazai* : *Etude sur la*؛ Kiessling : *Heniochoi*، در *Real-Encyclopädie* از Pauly-Wissowa، ۲۳ : ص ۱۰۳۲، اور ۸ : ۲۵۸ تا ۲۸۰؛ (۵) Koch : *Wanderungen im Oriente*، ویمر ۱۸۴۶ - ۱۸۴۷ء، ۲ : *Reisen im pontischen Gebirge*؛ (۶) Bianchi : *Viaggi in Armenia*، *Kurdistan e Lazistan*، میلان ۱۸۶۳ء (مصنف نے اصلی لازستان کو نہیں دیکھا)؛ (۷) Kazbek : *Tri mesiatza v turetskoi Gruzii, Zap. Kawk Otd Geogr. obšč*، تفلس ۱۸۷۵ء، ۱۰ / ۱ : ص ۱ تا ۱۳۰؛ (۸) Deyrolle : *Lazistan et Armenie*، *Tour du monde*، ۱۸۷۵ - ۱۸۷۶ء؛ (۹) Vivien de. St. Martin : *Lazistan*، در *Nouv. Dict. Geogr. Universelle*، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۱۰) Proskuriakow : *Zametkio Turtsli Zap. Kowk. Otd Geogr. Obšč*، تفلس، ۱۹۰۵ء، ۲۰؛ (۱۱) N. Y. Marr : *Iz poezdki v turétskii Lazistan, Bull. de L'Akad Imp. des Sciences*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۰ء ص ۵۴۷ تا ۶۰۷، ۶۳۲؛ (۱۲) N. Y. Marr : *Gruzin pripiski greč. Ewangelia iz koridii*، وهی کتاب ۱۹۱۱ء، ص ۲۱۷؛ (۱۳) N. Y. Marr : *Krešceniye armian etc., Zap.*، ۱۹۰۵ء، ۲۶ : ۱۶۵ - ۱۷۱؛ (۱۴) G. Vechapeli : *La Georgie Turque*، برن ۱۹۱۹ء، ص ۱ تا ۵۲ (جارجیا کے قوم پرستوں کا زاویۂ نگاہ)۔

''لز'' زبان پر دیکھیے (۱) G. Rozen : *Über die sprache d. Lazen, Abh B. Ak. W.* Phil. hist. Class ۱۸۴۳ء، ص ۱ تا ۳۸؛ (۲) Peacock : *Original vocabularies of 5 West-Cauc. Languages J.R.A.S* ۱۸۸۷ء، ۱۹ : ص ۱۴۵ تا ۱۵۶؛ (۳) Adjarian : *Etude sur la langue laze M.S.L.* ۱۸۹۹ء، ۱۰ : ص ۱۴۵ تا ۱۶۰، ۲۲۸ تا ۲۴۰، ۳۶۴ تا ۴۰۱، ۴۰۵ تا ۴۴۸؛ (۴) N. Marr : *Grammatika čanskago (Lazskago) yazika* سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۰ء، ۲۸ : ۲۴۰، (Grammar Christomathie and Glossary)؛ (۵) Kipshidze : *Dopeln. Swědeniya o. č anskom yazike*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۱ء۔

(V. MINORSKY [و تلخیص از ادارہ])

لازار [= لَعْزَر؛ عربی بائیبل میں : لِعَازَر؛ فارسی ایلعازر؛ انگریزی : Lazarus]؛ ایک نام جس کا ذکر صرف دو انجیلوں میں ہے : (۱) ایک مُردہ جسے یسوع مسیح (حضرت عیسیٰ[ع]) نے زندہ کر دکھایا؛ یہ شخص حضرت عیسیٰ[ع] کا دوست اور مریم اور اس کی بہن مرتھا کا بھائی تھا ۔ حضرت عیسیٰ[ع] نے اسے اس کی موت کے بعد چوتھے دن قبر سے زندہ کیا ۔ یوحنا کی انجیل کے مطابق یہ حضرت عیسیٰ[ع] کا سب سے آخری بڑا معجزہ تھا (انجیل یوحنا، باب : ۱۱ — ۱۲)؛ (۲) ایک فقیر اور مفلوک الحال شخص جو ایک نہایت ہی امیر شخص کے دروازے پر پڑا رہتا، اس کے دستر خوان سے بچے کھچے ٹکڑے کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتا ۔ کبھی کبھی تو کتے بھی آ کر اس کے زخموں کو چاٹنے لگتے ۔ موت کے بعد اسے حضرت ابراهیم[ع] کے قریب جگہ ملی اور اس امیر شخص کو عذاب میں مبتلا ہونا پڑا ۔ ایک تمثیل (انجیل لوقا، باب ۱۶ : ۱۹ تا ۳۱) .

اناجیل اربعہ میں حضرت عیسیٰ[ع] کے معجزات کا ذکر بڑے شد و مد کے ساتھ آتا ہے ۔ ان اناجیل میں ان کے لاتعداد معجزات کا ذکر ہے : ان کا کوڑھیوں کو شفا دینا، فالج زدہ اور مرگی کے مریضوں کو ٹھیک کر دینا، مادر زاد اندھوں کو بینائی عطا کرنا، گونگوں کو گویائی بخش دینا، اپاهجوں، لنگڑوں اور سوکھے ہوئے اعضا والے

مریضوں کو تندرست کر دینا، بخار کے مریضوں کا بخار اتار دینا، پانی کے بھرے ہوے مٹکوں کو مے میں تبدیل کر دینا، فقط پانچ روٹیوں اور دو مچھلیوں کو پانچ ہزار افراد کے پیٹ بھرنے کے لیے کافی بنا دینا، بلکہ ان میں سے بہت کچھ بچا بھی لینا، فقط روٹیوں اور چند مچھلیوں کو چار ہزار اشخاص کی بھوک مٹانے کے لیے کافی بنا دینا، جھیل کے طوفان کو روک دینا، پانی پر چلنا، آئندہ واقعات کی اطلاع دینا، مردوں کو زندہ کرنا اور خود مردوں کا جی اٹھنا اور بعض دیگر معجزات کا ذکر ہے (حوالے کے لیے دیکھیے، اناجیل اربعہ: متی، مرقس، لوقا، یوحنّا).

یہ حیرانی کی بات ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے تعلق میں لازار کا ذکر صرف یوحنّا ہی نے کیا ہے اور اسے مریم اور مرتھا [= مرثا] کا بھائی قرار دیا ہے۔ لازار کے جی اٹھنے کے بعد وہ اس کا ذکر بھی کرتا ہے کہ حضرت یسوع عید فسح [= الفِصح] کی تقریب سے چھے دن پہلے بیت عَنیا (Bethany) میں آئے اور مرتھا اور مریم کے گھر ایک دعوت میں شریک ہوے۔ لازار کھانے کی میز پر حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ بیٹھا۔ مریم نے بیش قیمت عطر حضرت عیسیٰؑ کے پاؤں پر ڈالا اور اپنے بالوں سے آپ کے پاؤں پونچھے (دیکھیے باب ۱۲: ۱ تا ۴).

مرقس کا بیان اس سے مختلف ہے۔ اس میں حضرت یسوعؑ کا شمعون (= سِمْعان) کوڑھی کے ہاں ٹھیرنے کا ذکر ہے۔ عطر ڈالنے والی عورت کا نام نہیں لیا گیا اور نہ لازار ھی کا ذکر ہے۔ (دیکھیے مرقس، باب ۱۴: ۱ تا ۹).

انجیلیات کے ماھرین کو اس تضاد نے کشمکش میں ڈال رکھا ہے۔ (دیکھیے E. A. Abbot: "LAZARUS" در *Encyclopaedia Biblica*، مطبوعہ لنڈن، (۳: ۲۷۴۴ تا ۲۷۵۱)، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں لازار پر کوئی علحدہ مضمون نہیں لکھا گیا.

اناجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے رفع آسمانی سے قبل صرف تین مُردوں کے زندہ کرنے کا ذکر ہے: اول رئیس کی بیٹی جسے پہلی تین انجیلوں والے نقل کرتے ھیں؛ دوسرے والدین کا وہ مردہ اکلوتا بیٹا جس کا ذکر لوقا (باب ۷: ۱۱ - ۱۷) کرتا ہے اور تیسرا لازار جسے صرف یوحنا نقل کرتا ہے.

قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کا ذکر عمومی طور پر کیا ہے۔ ان معجزات میں اللہ تعالٰی کے حکم سے مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر بھی ہے (۳ [آل عمرٰن]: ۴۹)، لیکن قرآن حکیم نے کہیں بھی نام لے کر لازار کے جی اٹھنے کا ذکر نہیں کیا۔ احادیث اور تفاسیر کی جملہ کتابیں بھی لازار یا لِعازر کے ذکر سے خالی ھیں.

طبری نے اپنی تاریخ میں بھی کہیں اس معجزے کا ذکر نہیں کیا۔ ویسے وہ عمومی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر کرتا ہے (الطبری: تاریخ الامم و الملوک، ۱: ۳۳۴ تا ۳۴۳، قاھرہ ۱۳۵۷ھ)؛ تاھم ثعلبی یوحنّا کی انجیل کا ھی تتبع کرتے ہوے لکھتا ہے: "اَلعَازَر مر گیا، اس کی بہن نے حضرت عیسیٰؑ کو خبر بھیجی؛ حضرت عیسیٰؑ اس کی وفات سے تین دن (یوحنّا میں چار دن مذکور ھیں) بعد آئے اور متوفی کی بہن کے ساتھ اس کی قبر پر گئے جو چٹان میں تھی۔ انھوں نے اسے زندہ کر اٹھایا".

ابن الأثیر الجزری نے اپنی کتاب الکامل فی التاریخ میں عیسائی اور یہودی روایات کا سہارا لیتے ہوے نہ صرف عازر کے جی اٹھنے کا بیان کیا ہے بلکہ سام بن نوح، حضرت عزیر اور یحیی بن زکریا کے زندہ ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ مسلمان اھل علم نے ابن الأثیر کے اس بیان کی تردید کی ہے۔

(ابن الأثیر الجزری : الکامل فی التاریخ، ۱ : ۱۸۰، حاشیۂ شیخ عبدالوهاب النجار، قاہرہ ۱۳۷۸ھ).

مآخذ : (۱) قرآن مجید ؛ (۲) صحاح ستہ ؛ (۳) محمد ابن جریر الطبری، جامع البیان عن تأویل القرآن (قاہرہ ۱۹۰۵ء)، ۶ : ۳۴۳ تا ۳۴۷)؛ (۴) وہی مصنف : تاریخ الأمم و الملوک (قاہرہ ۱۳۰۵ھ)، ۱ : ۳۴۳ تا ۳۴۴)؛ (۵) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم (لاہور ۱۳۹۲ھ)، ۱ : ۳۶۴ تا ۳۶۵؛ (۶) ابن الأثیر الجزری : الکامل فی التاریخ (قاہرہ ۱۳۷۸ھ)، ۱ : ۱۸۰؛ (۷) الثعلبی : قصص الانبیاء (قاہرہ ۱۳۲۵ھ)، ص ۳۰۷؛ (۸) E.A. Abbot : LAZARUS، در *Encyclopaedia Biblica*، ۳ : ۲۷۴۳ تا ۲۷۵۱؛ (۹) اناجیل اربعہ : متی، مرقس، لوقا، یوحنا؛ (۱۰) *The New English Bible*، لنڈن ۱۹۶۱ء؛ (۱۱) A. R. Buckland : *The Universal Bible Dictionary*؛ (۱۲) رحمۃ اللہ کیرانوی : اظہار الحق (اردو ترجمہ : بائیبل سے قرآن تک، کراچی ۱۳۸۸ھ)، ۱ : ۲۱۳ تا ۲۲۴).

(امان اللہ خان)

* **لالہ زاری** : رک بہ محمد لالہ زاری.

⊗ **لام** : رک بہ ل.

* **لام، بنو** : ایک خانہ بدوش عرب قبیلہ جو دریاے دجلہ کے زیریں حصے (علی غربی؛ علی شرقی، عمارہ) میں آباد بتایا جاتا ہے.

خورشید آفندی (وسط انیسویں صدی عیسوی) کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق بنی لام کے ۴۰۰۰ خاندان دجلے کے غربی حصے میں (عمارہ اور شط الحی کے مابین) اور ۵۰۰۰ شرقی حصے میں ایرانی سرحد کے ساتھ ساتھ مندلی سے لے کر دلدلی علاقے (خور) تک جس میں کرخہ ندی گم ہو جاتی ہے، آباد تھے - بنو لام کے ۱۷۵۰۰ خاندان ۱۷۸۸ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان ایران چلے گئے (پشت کوہ کے جنوبی حصے یعنی والیان حویزہ کے علاقے میں)؛ کچھ گروہ کرخہ کے مشرق اور فلاحیہ میں جا بسے.

بنو لام کا دعوی ہے کہ ان کے بزرگ شروع میں نواح مکہ سے آئے تھے (Lyclama a Nijeholt : *Voyage*، ۳ : ۲۲۵) اور ان کا نام دراصل ان کے قبیلے کے سردار فرج لام کے نام پر مشہور ہے - بنو لام جن میں سے بیشتر شیعی تھے، حویزہ کے والیوں (المشعشع، سادات عرب، رک بآں) کے ساتھ، جو صفوی عہد میں ایرانی سیاست میں عملی حصہ لیتے رہے، دوستانہ تعلقات رکھتے تھے - سنہ ۱۶۶۸، ۱۷۱۵، ۱۷۳۲ء اور ۱۷۳۸ء میں بنو لام نے حویزہ کے سردار کی انگیخت پر بغداد کے پاشاؤں کے خلاف بغاوت کی - ان کے تعلقات پشت کوہ کے لور والیوں سے زیادہ خوشگوار نہ تھے، جنھوں نے انھیں بیات، دیہ لران اور بکسایہ نامی گانوں سے محروم کر دیا تھا، لیکن بالعموم بنو لام کے اپنے لور ہمسایوں سے خاصے اچھے مراسم تھے.

علی رضا پاشا نے ۱۸۳۶ء میں اور نجیب پاشا نے ۱۸۴۳ء کے بعد بنو لام کو بھاری شکستیں دیں - ایران کی مرکزی حکومت نے بھی (۱۸۴۱ء میں معتمدالدولہ کی مہمیں) بنو لام کو کرخہ کے بائیں ساحلی علاقے سے باہر نکال دیا، لیکن شمال میں اور مشرق میں پشت کوہ کے پہاڑوں کی اور جنوب میں خور (دلدلی علاقے) کی پناہ حاصل ہونے کی وجہ سے وہ اتنے محفوظ تھے کہ ۱۹۱۴ء تک بنو لام نے ترکی اور ایران کے درمیان اپنا ایک خود مختار علاقہ قائم رکھا - عمارہ، پاے پل اور دزفول کے درمیان بنو لام اور سگوند لوروں کی موجودگی کے باعث اس سیدھے راستے سے تجارتی آمد و رفت مسدود تھی.

انیسویں صدی میں اس قبیلے کا باہمی اتحاد ختم ہو گیا - دریاے دجلہ کے دائیں اور بائیں کناروں پر ہر گروہ کا ایک الگ شیخ ہونے لگا - ۱۸۲۱ء میں جندیل کے باہمت بیٹے مذکور (متکور) کو شیخ عرار کی

معزولی کے بعد اپنے گروہ کا سردار بننا نصیب ہوا، لیکن Layard نے یہ دیکھا کہ اس زمانے میں بھی اس کا اپنے حریفوں پر کوئی اقتدار نہ تھا ۔ لیڈی بلنٹ Lady Blunt نے شیخ مزبان اور اس کے بیٹے بنی کا ذکر کیا ہے ۔ شیخ غضبان ولد بنی نے ۱۹۱۴ء کی لڑائی کی ابتداء میں اھواز میں انگریزی فوج پر حملہ کیا لیکن جلد ھی اس کا کام تمام کر دیا گیا.

مآخذ: (۱) دیکھیے نیز البطیحہ؛ (۲) Layard: *A Description of the Province of Khuzistan*، در *J.R.G.S.* ۱۸۴۶ء، ص ۳۰ تا ۴۸؛ (۳) A. v. Kremer: *Nachrichten über d. am. linken Ufer d. Tigris wohnenden Araberstamm d. Beni Lam*، در *S. B. Ak. Wien*، ۱۸۵۰ء، ص ۲۰۱ تا ۲۰۴ (عمدہ بیان اور مقبول عام گیتوں: دُوَیر، عتابه اور تطویح) کے نمونے؛ (۴) خورشید افندی: سیاحت نامۂ حدود، روسی ترجمہ، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۷ء، ص ۷۶ تا ۸۱؛ (۵) Lady A. Blunt: *A Pilgrimage to Najd*، لنڈن ۱۸۸۱ء، ۲: ۱۱۳ تا ۲۲۳، (بنداد، علی غربی، دزفول، شوستر، بہبہان، دیلم)؛ (۶) Huart: *Histoire de Bagdad*، پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۱۴۴؛ (۷) Longrigg: *Four Centuries of Modern Iraq*، آوکسفرڈ ۱۹۲۵ء؛ [(۸) عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، بذیل مادہ].

(V. MINORSKY)

لامس صو: (ترکی زبان کا لفظ جس کے معنی ھیں لامس کی ندی؛ عربی: لامس)؛ ولایت کیلیکیا (Cilicia) کی ایک ندی جو کوہ طارس (Taurus) سے نکلتی ھے۔ اس کا منبع آیاش اور مرسینہ کے درمیان طرسوس سے ایک دن کی مسافت پر واقع ھے ۔ قدیم زمانے میں یہ ندی کوھستانی کیلیکیا اور میدانی کیلیکیا کے درمیان حدّ فاصل کا کام دیتی تھی ۔ اس کے کنارے پر کئی بار یونانیوں سے قیدیوں کے تبادلے ھوے اور زرِ فدیه کی ادائی عمل میں آئی ۔ ان تبادلوں میں سے پہلا ھارون الرشید اور قیصر نقفورس اوّل Nicephorus کے عہد میں ۱۸۹ھ / ۸۰۵ء میں عمل میں آیا؛ دوسرا اسی خلیفه اور اسی قیصر کے عہد میں ۱۹۲ھ / ۸۰۸ء میں؛ تیسرا خلیفه الواثق اور قیصر میخائل ثالث Michael "دائم الخمر" (the Drunkard) کے عہد میں محرم ۲۳۱ھ (ستمبر ۸۴۵ء) میں؛ چوتھا ۲۴۱ھ / ۸۵۶ء میں اور پانچواں ۲۴۶ھ / ۸۶۰ء میں اسی قیصر اور خلیفه المتوکل کے عہد میں؛ چھٹا ۲۸۳ھ / ۸۹۶ء میں خلیفه المعتضد اور قیصر الیون سادس Leo VI کے عہد میں؛ ساتواں جو "فداء الغدر" کہلاتا ھے، اسی قیصر اور خلیفه المکتفی کے عہد میں ۲۹۲ھ / ۹۰۵ء میں؛ آٹھواں تین سال بعد ۲۹۵ھ / ۹۰۷ء میں؛ نواں ۳۰۵ھ / ۹۱۷ء میں خلیفه المقتدر اور قیصر قسطنطین Constantine Porphyrogenetos کے عہد میں؛ دسواں ۳۱۳ھ / ۹۲۵ء میں انھیں حکمرانوں کے عہد میں؛ گیارھواں ۳۲۶ھ / ۹۳۸ء میں اسی قیصر اور خلیفه الراضی کے عہد میں؛ بارھواں ۳۳۵ھ / ۹۴۶ء میں المطیع کے عہد خلافت میں سیف الدوله الحمدانی امیر حلب کی وساطت سے طے پایا ۔ اس دریا پر اس جگہ کوئی پایاب راستہ یا پل تھا جسے تاوان دے کر چھڑائے ھوے قیدی عبور کیا کرتے تھے ۔ سمندر کے قریب اس دریا پر اسی نام (Lamus) کا ایک شہر بھی آباد تھا.

مآخذ: (۱) الطبری، طبع de Goeje، ۳: ۷۰۶، ۷۰۷، ۱۳۳۹، ۱۳۵۳، ۱۴۲۶، ۱۴۴۹، ۲۱۵۳، ۲۲۵۴، ۲۲۸۰؛ (۲) المقریزی: الخطط، ۲: ۱۹۱ ببعد؛ (۳) البلاذری: فتوح، ۱۹۸؛ (۴) ابن مسکویه: تجارب الامم، ۶: ۴۸۶، ۵۳۲، در

Fragmenta Historicorum Arabicorum، طبع de Goeje لائیڈن (۱۸۷۱ء)؛ (۵) ابن الاثیر: الکامل، طبع Tornberg، ۷ : ۱۶؛ (۶) *N. E.* : Silvestre de Sacy، ۱۸۱۰ء، ج ۸، منقول درالمسعودی: مروج، ۹ : ۳۰۶ تا ۳۶۲، ۳۷۵ عدد ۳۶ و ۶۵؛ (۷) المسعودی: تنبیه، ص ۱۸۹ تا ۱۹۶، مترجمهٔ Carra de Vaux : *Livre de l'Avertissement* ص ۲۴۱، ۲۵۵ ببعد؛ (۸) Huart ; *Histoire des Arabes*، پیرس ۱۹۱۳ء، ۲ : ۱۱۸ ببعد: (۹) Fr. Beaufort : *Karamania*، ۱۸۱۷ء، ص ۲۴۴، فرانسیسی ترجمه از Eyriés : *Caramanie*، پیرس ۱۸۲۰ء، ص ۱۸۳، ۲۳۳؛ (۱۰) V. Langlois : *Voyage dans la Cilicie*، پیرس ۱۸۶۱ء، ص ۱۰۵ (رومی کاریز کی تصویر).

(C. HUART)

* **لامعی**: ترکی کے شاعر شیخ محمود بن عثمان بن علی النقّاش کا تخلّص ۔ وہ سلطان سلیمان اوّل کے ابتدائی عہد کا مشہور صوفی مصنف اور شاعر تھا ۔ یہ نہ صرف ترکی سلطنت کی انتہائی سیاسی ترقی کا زمانہ تھا، بلکہ اس دور میں علم و ادب کو بھی غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ۔ لامعی برسہ [بورسه] میں پیدا ہوا ۔ اس کا باپ سلطان بایزید کے خزانے کا دفتر دار تھا ۔ تیمور لنگ اپنی یورش کے بعد اس کے دادا کو ماوراءالنہر لے گیا، جہاں اس نے نقاشی، زردوزی اور مصوری کا فن سیکھا ۔ وہاں اس فن کا بہت چرچا تھا ۔ لامعی کے دادا نے اپنی واپسی پر ایشیاے کوچک میں پہلی نقش دار زین سے عوام کو روشناس کیا ۔ لامعی کا تصوف کی طرف میلان تھا ۔ وہ ملاّ اخوین اور ملاّ محمّد بن الحاجی حسن زاده سے دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد شیخ عارف باللہ سیّد احمد البخاری نقشبندی کا مرید ہو گیا ۔ اس نے ساری زندگی صوفیانہ طور پر کامل سکون اور گوشہ نشینی میں گزار دی اور دنیوی تفکرات سے آزاد رہا، کیونکہ اسے سلطان سلیم اور سلطان سلیمان کی سرپرستی حاصل رہی جو اکثر اسے اور اس کے کثیر خاندان کو نوازتے رہتے تھے ۔ وہ برسہ میں اپنی وفات ۹۳۸ یا ۹۴۰ھ/ ۱۵۳۲ یا ۱۵۳۳ء تک تصنیف و تالیف ھی میں مشغول رہا اور برسہ کے قلعے میں اپنے دادا کی بنا کردہ مسجد میں دفن ہوا .

اس کی تصانیف نثر و نظم تنوع اور خوبی کے اعتبار سے واقعی حیرت انگیز ہیں، لیکن اس کی تحریروں میں طبع زاد مواد کم ہے اور ترجمے و تضمینات زیادہ ، جو اس دور کی خصوصیت تھی جس میں فارسی نمونوں کی غلامانہ تقلید کو تصنیف و تالیف کا انتہائی کمال سمجھا جاتا تھا ۔ لامعی نے عموماً جامی کے کلام کی پیروی کی جو اس دور میں ایران کے مشہور ترین شاعر متصور ہوتے تھے ۔ جامی کی تقلید کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں نقشبندی سلسلے سے وابستہ تھے؛ چنانچہ اس لحاظ سے لامعی کو ''جامی روم'' کہتے تھے ۔ وہ تمام ترکی مصنفوں سے زیادہ پر نویس تھا ۔ اس کی رومانی طرز کی نو مثنویاں یادگار ہیں ۔ ترکی ادب میں لامعی کی خاصی اھمیت ہے مگر فان ھامر von. Hammer نے اس ضمن میں بہت مبالغے سے کام لیا ہے ۔ اس نے اپنی کتاب *Gesch. d. Osm. Dichtkunst* (۲ : ۲۰ تا ۱۹۵) میں لامعی پر طویل ترین مقالہ لکھا ہے .

لامعی کا طرز تحریر نسبةً صاف اور سادہ ہے ۔ اس میں اس بے جا عبارت آرائی کا کوئی نشان نہیں ملتا جو بعد کے دور کی نظموں پر قدما کی روش کی مصنوعی تقلید کی وجہ سے غالب ہے، لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ جو حسن و خوبی اس کے کلام میں ہے وہ زیادہ تر ان فارسی نمونوں کی وجہ سے ہے، جو اس کے پیش نظر تھے، اسی لیے ضیا پاشا نے اپنی

کتاب خرابات میں اسے ناقابل التفات سمجھا۔
شرف الانسان میں اس کی تصانیف کی تعداد ۴۲ دی گئی ہے، لیکن حقیقةً وہ اس سے زیادہ ہے۔ اس کی تصانیف نثر میں حسب ذیل ہیں: جامی کی کتب تصوف کا ترجمہ: نفحات الانس (تراجم صوفیۂ کرام، جس کا ذیلی عنوان فتوح المجاهدین لترویح قلوب المجاهدین ہے) اور شواهد النبوة (مطبوعۂ قسطنطنیہ ۱۲۹۳ھ) "شرف الانسان" خود لامعی کے نزدیک اس کا شاہکار ہے اور یہ عربی کے رسائل اخوان الصفا کے بائیسویں جزو کا ترکی ترجمہ ہے۔ ان رسائل کی کل تعداد ۵۱ ہے اور اس جزو کا عنوان انسان اور حیوان کے مابین کشمکش ہے (طبع و ترجمہ از Dieterici، برلن ۱۸۸۵ء لائپزگ ۱۸۷۹ و ۱۸۸۱ء: *Thier und Mensch vor dem konige der Genien*)۔ اس کی دینی کتابیں حسب ذیل ہیں: معمّا اسماء الحسنٰی، خدا کے ۹۹ ناموں پر میر حسین نیشاپوری کے سو اشعار کا ترجمہ اور ان کی شرح اور مفتاح النّجات فی خواص السّور والآیات۔ اس نے کتب ذیل بھی لکھیں: مکتوبات کا ایک مجموعہ مسمّی بہ منشآت، شرح دیباچۂ گلستان سعدی، عبرت نما (حکایات اور تمثیلی کہانیوں کا ایک مجموعہ جو قسطنطینیہ میں لیتھو میں چھپا بلا تاریخ) اور مجمع اللطائف یا لطائف نامہ (ایک مجموعہ جو جرأت آمیز حکایات پر مشتمل ہے اور جو بالکل Boccaccio کی Decameron کے انداز پر ہے۔ لامعی کے بیٹے عبداللہ لامعی نے جو خود بھی مشہور شاعر تھا، اس کتاب کی تکمیل کی)۔ آخر میں خالص شاعری کی طرف توجہ کرتے ہوے، اس نے دو مناظرے مخلوط نظم و نثر میں لکھے، (یہ انداز مناظرہ بعد میں بہت مقبول ہوا): ایک مناظرۂ بہاروشتا (گرمی و سردی میں مناظرہ)، مطبوعۂ قسطنطنیہ ۱۲۹۰ھ اس کتاب کا عنوان ہے "مناظرۂ سلطان بہاربا شہریار شتا") اور دوسرا مناظرۂ نفس و روح ہے۔

لامعی کی منظوم تصانیف میں جن کی اہمیت نسبةً بہت زیادہ ہے، اس کا ضخیم دیوانُ ہے، جس میں تقریباً دس ہزار ابیات ہیں اور جس میں حسن کلام اور طبع زاد افکار کا وافر حصہ ہے۔ قصائد اور غزلیات کے علاوہ اس میں شہر انگیز بورسہ بھی شامل ہے (جو ۱۲۸۸ھ میں قسطنطینیہ میں علٰحدہ چھپا ترجمہ از Pfizmaier: *Verherrlichung der Engiz Bursa*، وی انا ۱۸۳۹ء۔

اس کی مثنویاں اثر دوام رکھتی ہیں۔ ان میں سے بعض کہانیاں فارسی روایات سے مأخوذ ہیں، اور انھیں عوام پسند رنگ میں پیش کیا گیا ہے، مثلاً سلامان وابسال (سلطان سلیم کے نام سے منتسب ہے) جو جامی سے اخذ کی گئی ہے اور ویسہ و رامین (سلطان سلیمان کے نام منتسب ہے) جو فخر جرجانی (م ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء) سے مأخوذ اور نظامی العروضی السمرقندی کا ترجمہ ہے؛ وامق و عذرا جس کا ترجمہ عنصری (م ۴۴۱ھ/ ۱۰۴۹ تا ۱۰۵۰ء) کی اصل فارسی مثنوی سے سلطان سلیمان کی خواہش پر کیا گیا (ترجمہ از von Hammer وی انا، ۱۸۳۳ء)، فرہاد نامہ (ترجمہ از von Hammer: *Stuttgart*، ۱۸۱۲ء)؛ ہفت پیکر (جس کی بنا ہاتفی کی ہفت منظر پر ہے، جو خود نظامی کی ہفت پیکر سے مأخوذ ہے)۔ اس نے دو تمثیلی ڈرامے 'گوی وچوگان' اور 'شمع و پروانہ' بھی لکھے (آخر الذکر شاید اہلی شیرازی کے فارسی اصل سے لیا گیا ہے)۔ ان کے علاوہ لامعی نے دو دینی مثنویاں بھی لکھی ہیں جن کے نام یہ ہیں: مقتل حضرت امام حسین[4] جس سے شیعیوں کے تعزیے کی یاد تازہ ہوتی ہے (نسخۂ خطی مصور در کتب خانہ عاشر (افندی، عدد ۴۹۲) اور منقبت (یامناقب) اویس القرنی۔

آخر میں اس کی سیاسی تمثیلیں ھیں، یعنی حسن وَ دل جو فتّاحی نیشاپوری کی اصل فارسی اور آھی کے ترکی ترجمے سے لی گئی ھے اور جس کا ترجمہ، تشریح اور آھی کے ترکی ترجمے سے مقابلہ *Husn-u-dil persische Allegorie von* : R. Dvorak *Fattahi aus Nisapur*، نے کیا ھے، اور خرد نامہ اور جابر نامہ.

مآخذ: (۱) مذکورہ تصانیف کے علاوہ دیکھیے، سہی: ہشت بہشت، قسطنطینیہ ۱۳۲۵ء، ص ۵۰؛ (۲) لطیفی: تذکرہ، قسطنطینیہ ۱۳۱۴ھ، ص ۲۹۰ تا ۲۹۴؛ طاش کوپری زادہ: (۳) شقائق النعمانیہ، ترجمہ از مجدی، قسطنطینیہ ۱۲۶۹ھ، ص ۳۱۴ تا ۳۳۴، ۵۰۳؛ ترجمہ از O. Rescher، قسطنطینیہ ۱۹۲۷ء، ص ۲۸۰ تا ۲۸۱؛ (۴) اسمٰعیل بلیغ: گلدستۂ ریاض، بروسہ ۱۳۰۲ھ، ص ۱۷۶ تا ۱۸۰؛ (۵) محمد ناجی: اسامی، قسطنطینیہ ۱۳۰۸ھ، ص ۲۷۰؛ (۶) محمد ثریّا: سجلّ عثمانی، قسطنطینیہ ۱۳۱۵ھ، ۴: ۸۶؛ (۷) سامی: قاموس الأعلام، ۵: ۳۹۷۳؛ (۸) بروسہ لی محمد طاہر: عثمانلی مؤلفلری، قسطنطینیہ ۱۳۳۳-۱۳۳۴ھ، ۲: ۳۹۴؛ (۹) Gibb: *A History of Ottoman Poetry*، ج ۳؛ (۱۰) Wickerhauser: *Chrestomathie*، وی انا ۱۸۵۳ء، ص ۳۷۹ تا ۳۸۱، ۳۰۵ تا ۳۰۸؛ (۱۱) Smirnow: *Obrazcovyja Proizwedenija Osmanskoj Literatury*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۳ء، ص xiv، ۲۳۸ تا ۲۴۱؛ (۱۲) Basmadjian: *Essai sur l'histoire de la litterature ottomane*، قسطنطینیہ ۱۹۱۰ء، ص ۵۴ تا ۶۴؛ (۱۳) برلن، وی انا، لنڈن، میونخ، گوتھا اور قسطنطینیہ وغیرہ کے قلمی نسخوں کی فہرستیں؛ (۱۴) حاجی خلیفہ: کشف الظنون، طبع Flügel، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء.

(TH. MENZEL)

⊗ **اللّان**: ایک قوم، اللّان وهی لّان توم ھے جس کا قدیم اعراب نے الان نام رکھا تھا۔ اسی میں بطور سابقہ ال حرف تعریف لگا کر اللّان بنا لیا گیا۔ قفقاز کے موجودہ Ossetians لوگ انھیں لوگوں کی یادگار ھیں۔ اسلامی فتوحات کے ابتدائی دور میں یہ لوگ کوہ کزبک کے ارگرد آوز (سریْت) کے مغرب اور جارجیا (جُرز) کے شمال میں آباد تھے۔ انھیں کے نام پر عرب درۂ دریل کو باب اللان کہتے تھے۔ بعض عرب مصنفین (یاقوت اور ابوالفداء) نے قوم الان کا نام علان اور العلان لکھا ھے۔ بہر حال اسلامی مآخذ میں یہ نام بصورت الان (بالتخفیف) ابن الاعثم (الاعصم) الکوفی۔ دیکھیے Zeki Velidi Togan : *Ibn Fadlans Reiseberi Cht* ۔ اور اللان (بالتشدید) (دیکھیے حدود العالم، طبع Facsimile، ورق ۳۸ الف و ناحیات اللان و داراللان) پایا جاتا ھے۔ انھیں لوگوں کا جو ایرانی النسل تھے، ایک اور نام آس بھی ھے۔ ھو سکتا ھے کہ یہ لفظ اس قبیلے کے ایک فرقے کا نام ھو۔ یہ دونوں نام یونانی اور لاطینی مآخذ میں اس قبیلے کے لیے استعمال ھوے ھیں، جو ارل خزر کے نواح میں آباد تھے (دیکھیے W. Tomaschek : *Kritik der ältesten Nachrichten über den Skythischen morden*، ۱ : ۲۸۱)؛ Ἀλανάρση کے واسطے جن کی سکونت Moganor کے پہاڑی علاقوں میں دکھائی گئی ھے، دیکھیے اس مصنف کی *Zur historischen Topographie Von Persian* ۲۶ (Issoi 'Agiavoi) ایران کے مشرق میں بسنے والے قبائل اور بالخصوص طخاری قبیلے کے تاریخی مسائل میں دلچسپی لینے والے محقق الان اور آس قبیلے کے لوگوں کو بہت اھمیت دیتے ھیں، جو خوارزم کے نواح اور عام وسطی ایشیا میں بستے تھے (دیکھیے G. Haloun : *Zur Üetsi Frage, ZDMG*، ۹۱، ورق ۲۴۳)۔ خوارزم کے نواح میں بسنے

والے الان قبائل کا ذکر ایرانی قصہ کہانیوں میں داخل ہو گیا (دیکھیے ایف - دلف : *Glossar Zur Firdozi's Sch hnamee* بہ ذیل مادۂ الن و الن دز)؛ چنانچہ آج کل بھی اس علاقے کے بعض جغرافیائی نام اس قبیلے کی یاد دلاتے ہیں (مثلاً *Alan-Kuduk* جو روسی نقشوں میں Barsakilmes کی دلدل کے پاس دکھایا گیا ہے) - البیرونی کی تحدید نہایات الاماکن (فتح لائبریری کا واحد نسخہ عدد ۳۳۸۶) میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ الان اور آس قبائل نواحی خوارزم میں آباد تھے - اس کا خیال ہے کہ دریاے آمو ازمنۂ قبل از اسلام میں نواح خوارزم سے گزر کر طاس Özboy پر بہتا ہوا بحیرۂ خزر میں جا گرتا تھا - اس زمانے میں اس طاس کا نام ''مزدبست'' اور سارے علاقے کا نام ''ارض البعناکیہ'' (سرزمین پچناکیاں) تھا - اس طاس مزدبست میں لان اور آس قبائل کے کچھ لوگ آباد تھے - بعدہ جب دریاے آمو نے اپنی گزرگاہ بدلی اور وہ بحیرۂ ارل میں گرنے لگا جس سے مزدبست کا علاقہ خشک ہو گیا تو یہ لوگ گھر بار چھوڑ کر ساحل خزر پر جا آباد ہوے اس بات کے ثبوت میں کہ یہ قبائل اولاً ایرانی خوارزمیوں اور پچناکی ترکوں کے درمیان بستے تھے، البیرونی یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اس کے عہد میں وہ ایک ایسی زبان بولتے تھے جو خوارزمی اور پچناکی زبان سے مرکب تھی۔

[.... تفصیل کے لیے دیکھیے وو لائیڈن، بذیل مادہ)]۔

مآخذ : (۱) J. Kulakovskiy : *Alani po Klass icheskim i Vizantiyskin istachnikam*، ۱۸۹۹ء؛ (۲) Bleichsteiner : *Das Volk dev Alanen Bertchte dis Fors chungsinstintntes F. Osten und Orient*، ۲ Wien ۱۹۱۸ء؛ (۳) Hannes Skold : *Die Lund : Ossetischen im Ungarischen*، ۱۹۳۰ء؛ (۴) حدود العالم (طبع مع ترجمۂ انگریزی : V. Minorsky ۴۴۴)؛ (۵) ابھی حال ہی میں J. Marmatta : *Studies in the Language of the Iranian Tribes in South Russia, Acta Orientalic*، ۱ : بوڈا پسٹ ۱۹۵۱ء، ۲۶۱ - ۲۷۴ ۔

(A. Zeki Velidi Togan [و تلخیص از ادارہ])

زیادات و تصحیحات

جلد ۱۷

زیادات

صفحه	عمود	سطر	زیادات
۳۱۳	۱	۱۰ کے بعد	شیخ نظر محمد ثواقب المناقب کی تصنیف (۱۱۲٦ھ / ۱۷۱۴ء) سے پہلے وفات پا چکے تھے (شرافت نوشاہی : شریف التواریخ، مخطوطہ، ۳ : ۵۱۵)۔
۳۱۴	۱	۲۱ کے بعد	۔ ان کا انتقال ۱۱۴۸ھ / ۱۷۳۵ء میں ہوا۔
۳۱۵	۱	۷ کے بعد	کنجاہ کی دیگر ممتاز شخصیات میں غنیمت کے چچا شیخ ابوالبقاء اور فارسی شاعر اور قاضی کنجاہ قاضی خوشی محمد کے علاوہ اولیا و مشائخ میں شیخ مٹھا مجذوب (م ۱۰۸٦ھ / ۱٦٦۵ء)، اور میاں ادھم (مرید شاہ محمد غوث)، شعرا میں لطف اللہ موھب، شیخ محمد زاھد قادری (دیوان مملوکہ شریف کنجاھی) اور موتی رام پروانہ اور انشا پردازوں میں منشی بھوج راج روشن بھی قابل ذکر ھیں۔

تصحیحات

صفحه	عمود	سطر	غلط	صواب
۲	۲	۲۲	حضرث	حضرت
۱۴	۲	۳۰	ڈیفریری	ڈیفریمری
۱۵	۱	۲۷	سعد بن	سعدین
۲۱	۲	۲۳	مبنت کاری	منبت کاری

صفحہ	عمود	سطر	غلط	صواب
٢٢	٢	٢٨	حسین	حسن
٢٣	١	١	جعفر	جعفرالصادق
٢٣	١	١	محمد	محمد النقی
٢٣	١	٣	اور عمارات پر	اور عمارت پر
٢٧	١	١	قلما	قلّما
٣٠	٢	١١	یاب	باب
٣١	١	٨	ہے	ہیں
٣١	٢	٢٣	جن جس میں	جن میں
٣٢	٢	١٥	نوحس	نوحی
٣٢	٢	١٩	البرمکی	البرمکی
٣٢	٢	٢٢	نہامہ	تہامہ
٣٣	١	١	خلیل	خیل
٣٣	٢	٢٦	نصحیت	نصیحت
٣٦	٢	٣٣	مدارس	مدراس
٥٦	٢	٨	بکانگو	کانگو
٨٣	٢	٨	اثباب	اثبات
٨٩	١	٢	اشترکیۂ	اشتراکیۂ
٨٩	١	١٣	بالکار خود مختار	بالکل
٩١	١	٣١	کر دیا گیا	کر دیا
١٠٢	٢	١	کا پرورش	پرورش
١٠٣	٢	٢٣	کے متعلق	متعلق
١٢٨	٢	٢٣	لمغرفة	لمعرفة
١٣٥	٢	٨	٥٣ درجے	٩٣ درجے
١٣٧	٢	٢٧	صتعتوں	صنعتوں
١٣٣	١	٢	قادم	تا دم
١٣٥	١	١٩	بنو فارم	بنو دارم
١٣٥	١	٢٥	تہذیین	تہذیبیں
١٣٦	١	١٩	علیهم، السماء	علیهم السماء
١٣٧	١	٢٦	ناصر الدین الله	ناصر لدین الله
١٣٩	١	٣٠	خیر آباد	خیر پور(میرس)
١٣٩	٢	١٧	مدینة الحسین اور مختصر	مدینة الحسین او مختصر

صفحه	عمود	سطر	غلط	صواب
۱۳۹	۲	۱۸	تاریخ کربلا	تاریخ الکربلاء
۱۳۹	۲	۲۲	فاضل : تاریخ	مرتضی حسین فاضل : کربلا، تاریخ و تعمیر، در ہفت روزۂ رضاکار، لاہور، محرم ۱۳۹۱ ھ
۱۵۳	۱	۳	جالی	جاتی
۱۶۱	۱	۲۹	ذکر ہے	ذکر کیا ہے
۱۷۳	۲	۲۱	چچا	چچا
۱۷۷	۱	۳۲	ور	اور
۱۸۵	۲	۲۵	کر	کو
۱۸۶	۲	۱۷	سے آئے	آئے
۱۸۷	۱	۱۲	ملاطیه	ملطیه
۱۸۹	۲	۷	ایڑون	ایروں
۱۸۹	۲	۲۹	ملاطیه	ملطیه
۱۹۲	۲	۱۳	بارے	بارے میں
۱۹۶	۲	۸	رو	روسے
۱۹۹	۱	۱۶	سر دریا	سیر دریا
۲۰۲	۲	۱۵	غچنۂ	غنچۂ
۲۰۵	۱	۱۶	عربرن	عربوں
۲۱۱	۱	۱۹	قرأت	قراءت
۲۲۰	۱	۱۳	قاموس اعلام	قاموس الاعلام
۲۲۲	۱	۱۲	اریون	اریوان
۲۳۰	۱	۸	رائج تھے	رائج
۲۳۳	۲	۹	سنجاقوں	سنجاق
۲۳۷	۱	۸	ہیں	ہے
۲۳۹	۲	۱۲	ابیل	اپیل
۲۵۱	۲	۲	کے درمیان	درمیان
۲۵۳	۲	۲۱	کر دے گئے	کر دیے گئے
۲۵۵	۲	۳۲	کرنانک	کرناٹک
۲۷۳	۲	۳۱	وغیرہ ہم	وغیرہم
۲۷۳	۲	۲	مدتوں	مدتوں سے
۲۷۸	۱	۱۶	ملک بخارا	بخارا

صفحہ	عمود	سطر	غلط	صواب
۲۸۱	۲	۳۰	یبغو	یبغو کے
۲۸۲	۱	۱۳	۱۵۰۰ فٹ	۱۵۰۰۰ فٹ
۲۸۷	۱	۲۶	آنٹرت	آنٹریت
۲۸۹	۲	۱۷	علحدہ	علیحدہ
۲۹۶	۲	۲۱	ابراهیم پہلے صدر.	ابراهیم صدر
۲۹۹	۲	۲۹	۱۹۷۹ء	۱۹۷۸ء
۳۰۳	۲	۲	انھیں ان کی	انہیں کی
۳۰۵	۲	۱۰	جشتیہ	چشتیہ
۳۰۹	۲	۲۵	شرینی	شیرینی
۳۱۲	۲	۱۹	ھ۔ غلام	غلام
۳۱۲	۲	۲۱	احمد اللہ	احمد اللہ
۳۱۹	۲	۱۴	گیا۔ بقول	بقول
۳۲۰	۲	۱۷	کی یوسف	یوسف
۳۲۰	۲	۲۵	انجیل	بائبل
۳۲۱	۲	۲۳	گیے	گئے
۳۲۳	۱	۲	خضرت	حضرت
۳۳۵	۲	۲۲	سوپ	سوپ ڈٹ
۳۵۴	۲	۲۹	لا الہ اللہ	لا الہ الا اللہ
۳۵۵	۲	۲۴	الاایجاد	الایجاد
۳۷۹	۲	۱۷	آباء اجداد	آباو اجداد
۳۹۸	۲	۱۴	سنمبل	سنبل
۴۱۳	۱	۲۳	۷۵۴ء	سمت ۸۱۰
۴۱۳	۲	۲۶	محمد بیگ لاهوری	احمد بیگ لاهوری
۴۱۳	۲	۳۰	حولے	حوالے
۴۱۳	۲	۳۲	رسالۃ الاعجاز	رسالہ الاعجاز
۴۱۴	۱	۹	محمد اکرم	اس نامعلوم صاحبزادے
۴۱۴	۲	۱۰	دیون	دیوان.
۴۱۴	۲	۲۴	(۱۲۰۱ - ۱۲۷۴ھ / ۱۸۳۵ - ۱۷۶۷ء)	(۱۲۰۱ھ/۱۸۳۵ء تا ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء)
۴۱۵	۱	۵	حس کے رقعات حھپ	جس کے رقعات چھپ
۴۳۳	۱	۱۲	[رک بہ]	[رک بان]

صفحہ	عمود	سطر	غلط	صواب
۳۳۳	۲	۵	ھونی	ھونے
۳۴۸	۲	۱۱	منعت	منغت
۳۶۷	۲	۲۶	گُوْ تنگ	کُوْ ننگ
۳۶۸	۱	۱۵	ضہم	ضہم
۳۱۸	۱	۲۷	المنشور	المنثور
۳۸۶	۲	۲۳	بنائی جاتی	بنائے جاتے
۳۸۷	۱	۳۰	الایۃ	الآیۃ
۳۹۱	۱	۳۱	پہنچانے	پہچانتے
۳۹۸	۲	۲۲	وریلتانی	قورلتای
۵۰۰	۱	۲۹	لیتا	لینا
۵۰۲	۲	۱۹	کی آمد	آمد
۵۰۲	۱	۳۰	کیقباد معز الدین، شاہ دہلی	کیقباد، معزالدین : شاہ دھلی
۵۱۵	۲	۱	بہی	لبی
۵۲۳	۲	۱۲	سرگودہ	سرگودھا
۵۳۱	۲	۲۶	کی لحاظ	کے لحاظ
۵۵۶	۱	۲۵	قنقار	قنقاز
۵۶۵	۱	۲۲	وجہیہ	وجیہ
۵۶۸	۱	۲۵	کورذانی حاتم اصفہان سے اپنی نے گفتگو میں	کورذانی نے حاکم اصفہان سے اپنی گفتگو میں
۵۶۸	۱	۳۱	پہلوی	پہلوی کی
۵۶۸	۱	۳۲	کی طرح کی	کی طرح
۵۷۵	۱	۸	توجیہہ	توجیہ
۵۷۵	۱	۲۳	جاعت	جماعت
۵۸۲	۲	۲۵	دارالسیات	دارالسیادت
۵۸۵	۱	۲۶	ایشا	ایشیا

فہرست عنوانات

(جلد ۱۷)

ناشر .... مسٹر عبدالقادر قریشی، رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور

مقام اشاعت .... لاہور

سال طباعت ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء

مطبع .... جدید اردو ٹائپ پریس، ۳۹ چیمبرلین روڈ، لاہور

طابع .... مرزا نصیر بیگ، ناظم مطبع

.... صفحہ ۱ تا ۶۴

مطبع .... مطبع عالیہ، ۱۲۰۔ ٹمپل روڈ، لاہور

طابع .... سید اظہار الحسن رضوی، ناظم مطبع

.... صفحہ ۶۵ تا ۱۲۶

مطبع .... نیولائٹ پریس، ۳۰۔ افتخار بلڈنگ بہاول شیر روڈ، چوبرجی، لاہور

طابع .... چوہدری محمد سعید، ناظم مطبع

.... صفحہ ۱۲۷ تا ۳۸۴

مطبع .... پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور

طابع .... :مسٹر جاوید اقبال بھٹی، ڈی جی آر ٹیکنالوجی، اے ایم آئی او پی (لندن) ناظم مطبع

.... صفحہ ۳۸۵ تا آخر و سرورق

بار ثانی: مئی ۲۰۰۴ء/ ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

زیر نگرانی: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

Urdu

Encyclopaedia of Islam

Under the Auspices

of

THE UNIVERSITY OF THE PUNJAB LAHORE
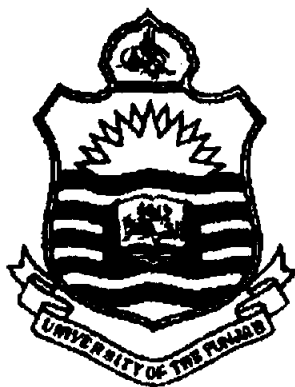
Vol.17

(Kaaf ...... Allan)

Reprint...... May 2004/ Rabi-II. 1425